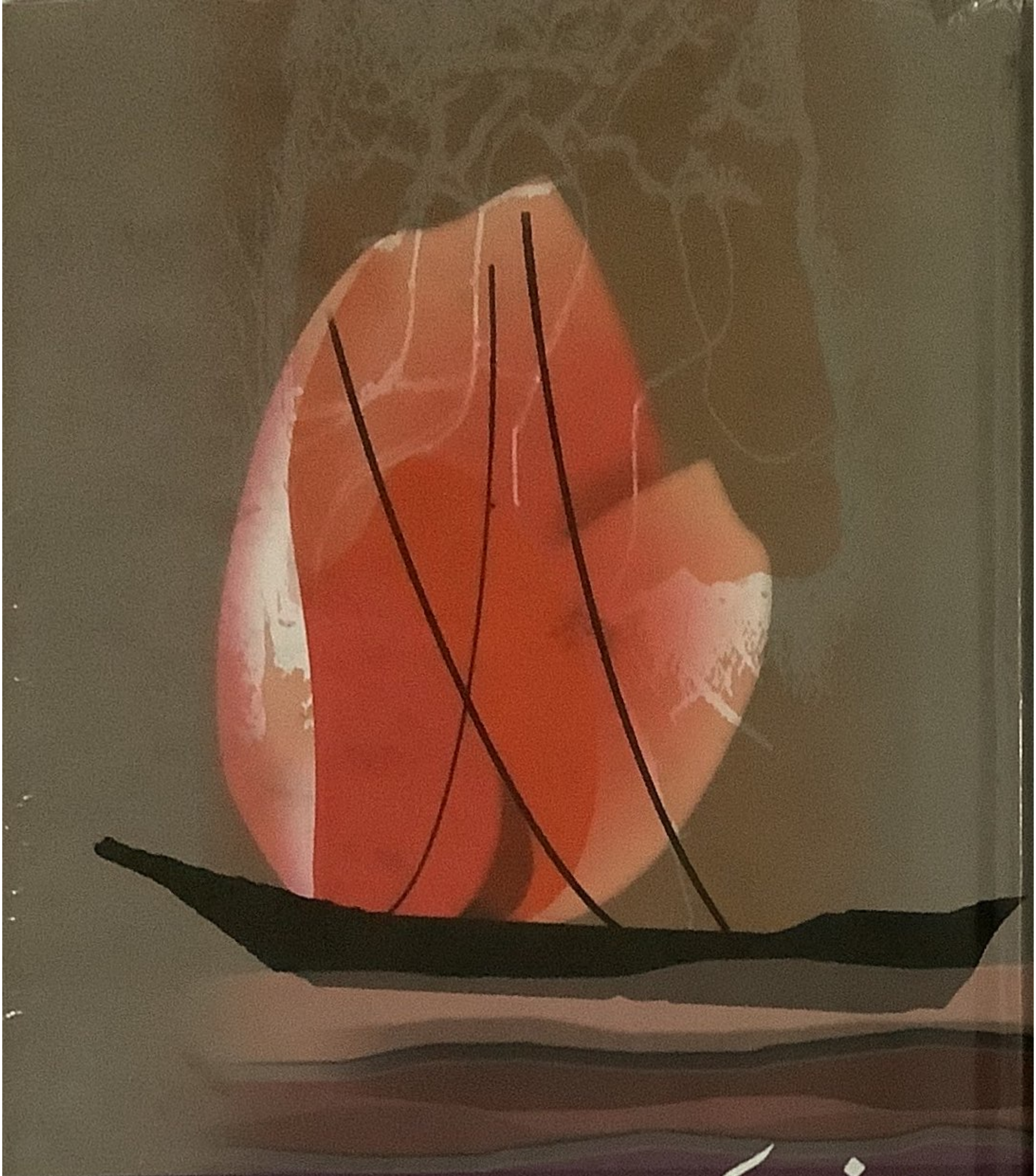


خوشبو کی ہجرت

ناول

صلاح الدین عادل

شیخ صلاح الدین صاحب کا مزاج شروع سے دیو مالائی تھا۔ غالباً 1966ء میں میں نے ان کے ناول کا پہلا باب پڑھا تو مجھے احساس ہوا کہ انہوں نے حکایت اور دیو مالا کے امتزاج سے ایک انوکھا طرزِ تحریر ایجاد کیا ہے جو عجیب سحر انگیز ہے۔ اس زمانے میں جادوئی حقیقت بیان کرنے والا گینگ ابھی منظرِ عام پر نہیں آیا تھا (بلکہ مارکیز کا مشہور ناول **ایک صدی کا سناٹا** بھی اس وقت صرف ہسپانوی زبان میں چھپا تھا)۔ اس لحاظ سے شیخ صاحب نے ایک نئے انداز کی دریافت کی تھی۔ یہ بیحد مسرت کا مقام ہے کہ اُردو افسانوی ادب، جو مجموعی طور پر پہلے ہی نادار ہے، اس فکر انگیز ناول کے چھپنے سے کچھ کم بے حیثیت ہو گیا ہے۔

عبداللہ حسین

سرورق: محمود الحسن جعفری

خوشبو کی ہجرت

(ناول)

صلاح الدین عادل

ناصر کاظمی سوسائٹی
لاہور
(اپریل2008ء)

گزارشات

صلاح الدین عادل ادبی حلقوں اور عام زندگی میں شیخ صلاح الدین کے نام سے جانے جاتے تھے۔ 1982 میں ان کی کتاب **ناصر کاظمی: ایک دھیان** نے قارئین کو بہت متاثر کیا۔ پچاس اور ساٹھ کی دہائیوں میں وہ باقاعدگی سے ٹی ہاؤس، کافی ہاؤس جاتے رہے۔ کچھ عرصہ **سویرا** کے مدیر بھی رہے۔ ان کے طویل مضمون 'تخلیق کا ہنر' اور انتظار حسین، ناصر کاظمی، حنیف رامے، صلاح الدین محمود اور سلیم الرحمان کے ساتھ ان کے مکالموں کا، جو **سویرا** میں شائع ہوئے، بہت چرچا ہوا۔ اہلِ علم و ادب شیخ صاحب کو ایک دانشور کے طور پر جانتے تھے اور ان کی بات کو بہت اہمیت دیتے تھے۔ شیخ صاحب لگی لپٹی رکھے بغیر اپنی رائے کا اظہار کرتے تھے۔ چنانچہ بعض لکھنے والے ان سے خفا ہو جاتے، اگرچہ ان کی دلی خواہش ہوتی کہ شیخ صاحب ان کی کسی تحریر کی تعریف کریں۔ شیخ صاحب کی تعریف نہ صرف ایک واقعہ ہوتی بلکہ ایک سند کا درجہ رکھتی۔

راوی اور پھر دیگر رسائل میں شیخ صاحب کے ناول کے اجزا کی اشاعت کے بعد ہم نوجوان دوستوں کا پورا گروپ اس صاحبِ طرز ادیب کی شخصیت اور فن کی جانکاری میں سرگرداں ہوا جس کے بھرپور مواقع ناصر کاظمی کے گھر باقاعدگی سے ہونے والی نشستوں میں ملتے رہے۔ اس گروپ میں ہمارے علاوہ حسن سلطان کاظمی، وحید رضا بھٹی، انیس اکرام فطرت، مقسط ندیم، ضمیر حسین نقوی، ڈاکٹر امجد پرویز اور محمود الحسن جعفری شیخ صاحب کی ملاقات کو اکثر حاضر رہنے لگے۔ شیخ صاحب ہر سال دو مارچ اور پھر 15 محرم (ناصر کاظمی کی تاریخ وفات) کو کرشن نگر ناصر کاظمی کے گھر ضرور آتے اور پھر ان پرجوش نوجوانوں سے گھنٹوں محوِ گفتگو رہتے۔ سال کے دوران میں بھی یہ نوجوان دوست، اکیلے، دو کیلے، یا پھر اکٹھے شیخ صاحب کے گھر طویل نشستوں کے لیے جاتے رہتے۔ یہ ملاقاتیں سالہا سال ان کے سمن آباد، جیل روڈ، مسلم ٹاؤن اور گلبرگ والے گھر میں جاری رہیں۔ اور اس گروپ کے بہت سے لوگوں کو شیخ صاحب نے اپنے دوست ہونے کے درجے پر فائز کر دیا۔

ان طویل رفاقتوں میں ناول خوشبو کی ھجرت کا ذکر کسی نہ کسی طور ضرور آتا رہا، مگر اس پر بحث ان حصوں پر محیط رہتی جو مختلف رسائل میں طبع ہوتے رہے۔ اس سے زائد کی جھلک کبھی دیکھنے کو نہ ملی۔ 1980 کی دہائی تک شیخ صاحب اپنے روایتی ٹھہراؤ کے ساتھ بتاتے رہے کہ ناول لکھا جا رہا ہے مگر عمر کی آخری دہائی میں وہ بھرپور اطمینان سے جواب دیتے کہ ناول تحریر ہو چکا ہے۔ ناول کی اشاعت کے سوال پر ہمیشہ ان کا جواب ایک ہی رہا کہ یہ ان کا مسئلہ نہیں۔ اور جواب کی گھمبیرتا کو دیکھ کر ہمیں کبھی ہمت نہ پڑی کہ اس کو اپنا مسئلہ بتائیں۔

سن 2000 میں شیخ صاحب کی رحلت کے بعد ان کے چھوٹے بھائی، جناب شیخ سجاد حسن نے، جو ایک بلند مرتبہ افسر، ماہر قانون دان اور علم و ادب کے توانا رہرو ہیں، شیخ صاحب کے کم عمر دوستوں کے اس گروپ کو ان کا علمی اور ادبی وارث قرار دیتے ہوئے ان کی لائبریری اور مسودات پر مشتمل گراں قدر سرمایہ ہمارے حوالہ کر دیا۔ شیخ صاحب کی لائبریری کی بابت بہت سوچ بچار کے بعد فیصلہ ہوا کہ اسے پنجاب یونیورسٹی کے شعبہ فلسفہ کی لائبریری میں منتقل کر دیا جائے جہاں اب اس کے لیے ایک گوشہ مخصوص کر دیا گیا ہے۔

شیخ صاحب کے مسودات، بالخصوص ان چار سادہ سی کاپیوں، کو جن میں ہماری دانست میں اپنے وقت کی اہم ترین تحریر محفوظ تھی اور جو ہماری عزیز ترین متاع تھی، ہم نے بے پایاں خوشی اور ذمہ داری سے ناصر کاظمی کے گھر ان کے بیٹے حسن کے پاس منتقل کر دیا۔ ناول کی اشاعت ہمارے لیے ایک چیلنج بن چکا تھا۔ حسن نے 1400 سو قلمی صفحات کی صاف ستھری فوٹو کاپیاں کروا کر مختلف دوستوں میں تقسیم کیں تا کہ وہ اس کی اشاعت کے مراحل کے بارے میں کوئی رائے قائم کر سکیں۔

شیخ صاحب کے اپنے ہاتھ کے تحریر کردہ مسودہ کے مطابق انہوں نے اس ناول کی تصنیف کے سفر کا آغاز 2 اکتوبر 1954 کو کیا اور 29 اکتوبر 1974 کی تاریخ کو دو دہائیوں پر پھیلا ہوا یہ طویل سفر اختتام پذیر ہوا۔ اس کے بعد وہ تا زندگی اس میں تصحیح و ترمیم کا کام کرتے رہے جس طرح گوئٹے اپنا شہ کار فاؤسٹ برسہا برس لکھتا رہا۔

شیخ صاحب نے جب اس ناول کا آغاز کیا تو انہوں نے اس کا نام خوشبو کی

ھجرت رکھا تھا مگر جب اردو شاعری کی روایت کے بارے میں شیخ صلاح الدین، انتظار حسین، ناصر کاظمی اور حنیف رامے کا مکالمہ شائع ہونے لگا تو، بقول شیخ صاحب، ''ناصر نے کہا کہ آپ جو ناول لکھ رہے ہیں وہ تو پتہ نہیں کب مکمل ہوگا اور کب چھپے گا، فی الحال ہمیں اس کا عنوان چاہیئے۔'' سو یہ مکالمہ 'خوشبو کی ہجرت' کے عنوان سے **سویرا** میں شائع ہوا۔ اس کے بعد شیخ صاحب نے ناول کو **خوشبو کی گلیاں** کا عنوان دیا مگر انہوں نے مسودے میں پہلا نام حذف نہیں کیا تھا۔ بہت بحث مباحثے کے بعد ہم نے **خوشبو کی ھجرت** کو ہی ترجیح دی اور فیصلہ کیا کہ ناول کو اسی نام سے چھپنا چاہیئے۔

شیخ صاحب کا تحریر کا طریقہ یہ دکھائی دیتا ہے کہ وہ جب کسی تخلیق کا حتمی مسودہ لکھ لیتے تھے جو ان کی دانست میں اشاعت کے لیے موزوں ہوتا تھا تو وہ تبھی اسے اپنے دوستوں کو پڑھنے کو دیتے تھے۔ اسی بنا پر مکمل ناول انہوں نے اپنی زندگی میں اپنے کسی دوست کو پڑھنے کے لیے نہیں دیا تھا۔ اس ناول پر اگرچہ وہ تمام عمر نظرِ ثانی کرتے رہے مگر ماسوا ان حصوں کے جو رسائل و جرائد میں چھپ چکے ہیں باقی مسودہ حتمی شکل میں نہیں تھا اس لیے اس میں ایڈیٹنگ ضروری تھی۔ ہم نے مسودے میں انہی مقامات پر ترامیم کی ہیں جہاں ایسا کرنا ناگزیر تھا۔ بعض جگہ تقدیم و تاخیر سے کام لینا پڑا ہے تو بعض مقامات پر تکرار کو حذف کیا ہے۔ شیخ صاحب نے ناول کو تین حصوں میں تقسیم کیا تھا۔ حصہ اول اور دوم تو اسّی سے بھی کم صفحات پر محیط تھے مگر حصہ سوم سات سو سے زیادہ صفحات پر پھیلا ہوا تھا۔ ہم نے اس طویل حصے کو مزید حصص میں تقسیم کیا ہے اور اسی طرح بعض نئے ابواب قائم کیے ہیں۔ بایں ہمہ اس ناول کی موجودہ ترتیب کی ذمہ داری ہم تینوں پر عائد ہوتی ہے۔

اس ضخیم ناول کی تدوین اور کتابت گزشتہ دو سال سے جاری ہے۔ اس کی صحت لفظی کے لیے مقدور بھر محنت کی گئی ہے۔ ہم نے کمپیوٹر پر خود بیٹھ کر ایک ایک غلطی کو درست کیا ہے۔ ناول میں ہندی اور سنسکرت زبان کے کئی الفاظ آئے ہیں اور کچھ اپنی زبان کے الفاظ کا استعمال ایسا انوٹھا ہے اور پھر پیرایہ بھی ایسا غیر روایتی کہ ہر لفظ خصوصی توجہ کا حق دار ٹھہرا۔ اس سرگزشت سے مقصود تحسین ذات نہیں بلکہ احوال واقعی ہے۔ دراصل اس کتاب کا شکوہ اس سے کم درجہ کی محنت پر صاد کر ہی نہیں سکتا تھا۔

ہم نے حتی الامکان کوشش کی ہے کہ کتاب میں کوئی غلطی نہ رہنے پائے مگر اس کے باوجود کچھ اغلاط یقیناً باقی رہ گئی ہوں گی۔ اگر کوئی قاری ان کی نشان دہی کرے گا تو ہم شکر گزار ہوں گے اور کوشش کریں گے کہ آئندہ اشاعت میں انہیں درست کر دیا جائے۔

اس ناول کے جو ابواب اور اجزا مختلف رسائل و جرائد میں چھپ چکے ہیں ان کی تفصیل یہ ہے:

اس ناول کی ایک کہانی پہلی بار گورنمنٹ کالج لاہور کے مجلّہ **راوی** (مدیر باصر سلطان کاظمی) میں 'آدرش' کے عنوان سے شائع ہوئی۔ یہ ناول کے حصہ ہفتم کے تیسرے باب کا ایک جزو ہے۔

صلاح الدین محمود نے، جب وہ **سویرا** کے مدیر تھے، اس ناول کے دو ابواب شائع کیے تھے جن پر کوئی عنوان نہیں تھا۔ پہلا باب جو **سویرا** میں شائع ہوا وہ اس ناول کا آخری باب ہے۔ **سویرا** میں شائع ہونے والا دوسرا باب اس ناول کے حصہ ہشتم کے دوسرے باب پر مشتمل تھا۔

احمد مشتاق اور ڈاکٹر سہیل احمد خان نے **محراب** میں اس ناول کے دو حصے شائع کیے۔ پہلا 'دکھ کی کایا۔ حسن کا عذاب' کے عنوان سے شائع ہوا وہ ناول کے حصہ چہارم کا آٹھواں باب ہے۔ 'صلیبِ آرزو' کے عنوان سے شائع ہونے والی کہانی حصہ سوم کے چھٹے باب پر مشتمل ہے۔

تخلیقی ادب میں مشفق خواجہ نے 'چتر شالا اور طوفان' کے عنوان سے جو کہانی شائع کی تھی وہ حصہ ہشتم کا تیسرا باب ہے۔

ناول نگار کی چار دہائیوں پر پھیلی ہوئی محنت اور ہماری دو برس کی کاوش کا یہ ثمر قارئین کے ذوق مطالعہ کی نذر ہے۔ ہم اس مرحلہ پر ناول کے ادبی مقام پر کوئی رائے نہیں دینا چاہتے مگر اتنا کہے بغیر چارہ نہیں کہ اس ناول میں بیان کے اتنے مختلف پیرائے استعمال کئے گئے ہیں کہ ہر حصے میں نثر کا لحن اور آہنگ جدا جدا ہے۔ خیالات اور جذبات کے اظہار؛ ماحول، کرداروں؛ مرئی اور غیر مرئی چیزوں کی description کے لئے ایسے ایسے پیرائے استعمال کئے گئے ہیں جو نامانوس ہوتے ہوئے بھی بھرپور تاثر کے حامل ہیں۔ اس

ناول کے ایک کردار نے ایک دوسرے کردار کی گفتگو کے بارے میں جو کچھ کہا وہ اس نثر پر بھی صادق آتا ہے: ''اس کی زبان سے سیدھے سادے فقرے بھی عجیب طلسم معلوم ہوتے۔ وہ جانے بوجھے لفظوں کو اتنے نئے نئے رشتوں میں سمو دیتا کہ اکثر یہ خیال آتا کہ وہ بالکل اجنبی زبان میں بات کر رہا ہے۔'' اکثر ایسا ہوا ہے کہ کئی بڑے مصنفوں کی تحریریں پڑھ کر شروع شروع میں نقادوں نے کہا کہ یہ تو زبان ہی کوئی اور ہے۔ مثلاً ڈی ایچ لارنس کے بارے میں اُس کے اوّلین تجزیہ نگاروں نے لکھا کہ یہ تو انگریزی ہی نہیں۔

اس ناول میں انسانی رشتوں، انسانوں کا فطرت اور حیوانوں سے تعلق، محبت، نفرت، رشک، دوستی، ہجر، وصال، دیہات کے لوگوں پر شہر اور شہر کی زندگی کا اثر، فرد اور معاشرے کا تعلق، تنہائی، شخصیت کی نشوونما، انسانی زندگی میں گناہ کا تفاعل، ایک آئیڈیل معاشرے کی ضرورت اور اس کے بارے میں مختلف تصوّرات، مختلف کرداروں کا اپنے اپنے ادیان، نظریات اور فلسفوں کی روشنی میں اس آئیڈیل معاشرے کے قیام کے لئے سوچ بچار اور کوشش کرنا۔ یہ موضوعات نئے نہیں لیکن شیخ صاحب اور ان کے کرداروں نے انہیں نئے انداز سے tackle کیا ہے۔

پروفیسر محمود الحسن جعفری نے اس کتاب کا دیدہ زیب ٹائٹل بنایا ہے جو ناول کی روح کو اجاگر کرنے کی کامیاب کوشش ہے۔

ممتاز اشاعتی ادارے، کلاسیک، کے دانشور مالک آغا امیر حسین نے اس کتاب کو چھاپنے میں ادب دوستی کے ساتھ ساتھ اپنی وسیع القلبی کا بھی ثبوت دیا ہے۔ ہم ان کے شکر گزار ہیں کہ انہوں نے ہماری وقت بے وقت مداخلت اور بار بار کی تصحیح کو خوش دلی سے برداشت کیا ہے۔

ہمیں یقین ہے کہ اس شاہکار تخلیق کے بارے میں مستقبل میں بہت کچھ لکھا جائے گا، فی الوقت ہم آپ کو اس کے براہِ راست مطالعے کی دعوت دیتے ہیں۔

(ڈاکٹر) ساجد علی　　باصر سلطان کاظمی　　جاوید اقبال اعوان

حصہ اول

پہلا باب

وہ اس پل پل ابھرتی، ڈھلکتی سڑک سے، گاؤں سے آتے اور گاؤں کو جاتے، سینکڑوں ہی بار گزرا تھا مگر آج یہ سڑک اسے بہت ہی عجیب اور اجنبی لگ رہی تھی۔ یوں لگ رہا تھا کہ سڑک خاص اس سفر کے لیے بچھائی گئی ہے، سفر کے طے ہونے کے ساتھ ساتھ موٹر کے پچھلے پہیوں سے لپٹتی چلی آ رہی ہے اور منزل پر پہنچتے ہی لپٹ کر صفحۂ ہستی سے مٹ جائے گی اور سڑک کے دونوں طرف گہری سبز، سبز، پیلی سبز، مدھم پیلی، روشن پیلی گھاس، گھاس میں کالے، سرخ اور پیلے پھول جیسے کسی اجنبی دیس کے مرد، عورتیں، بچے، اُجلے رنگین کپڑے پہنے ہل ہل، لہک لہک، مدھم مدھم، نیچے نیچے سُروں میں کوئی گیت گا رہے ہوں۔ بہت کوشش کے باوجود وہ فیصلہ نہ کر سکا کہ وہ گیت لوری تھی یا شادیانہ۔ کیا وہ کسی ملک کا شہزادہ تھا جو اپنے خوابوں کی حسینہ کو کسی اجنبی دیس میں تلاش کرنے آ نکلا تھا اور اس دیس کے لوگ اسے دیکھ کر بیک وقت خوش اور اداس ہو رہے تھے؟ گھاس کے تختوں سے ورے صاف چٹیل میدانوں میں پستہ قد، چھتری دار، درخت نیم دائروں میں یوں رقصاں تھے جیسے رقص کرتے کرتے ایک ہی جست میں ہوا میں بلند ہو جائیں گے، غائب ہو جائیں گے۔ اس میدان میں ننھے ننھے، بڑے بڑے پانی کے تھالوں میں نیلے نیلے، گھومتے

جزیرے پھیلے ہوئے، گہرے اور اتھاہ پانیوں میں آبادیوں، خاموش آبادیوں، کا سراغ دے رہے تھے۔ یہ سانس لیتی ہوئی سڑک، یہ گھاس کے تختے، یہ صاف، چٹیل، گھومتا ہوا، وسیع وعریض میدان پانی میں تحلیل ہو رہا تھا۔

تقی کو اپنے دماغی توازن پر شک ہونے لگا۔ اس نے انگشتِ شہادت اور انگوٹھے سے پپوٹوں، ماتھے کی جلد کو سہلانا شروع کیا۔ اپنے ماحول پر کوشش سے شعوری نگاہ کی۔ ڈرائیور پھسلتی سڑک پر نظریں جمائے، ڈرائیونگ ویل پر دونوں ہاتھ رکھے، ملے بغیر موٹر چلانے میں مگن تھا۔ متین صاحب چپ چاپ، ساکت بیٹھے تھے۔ ان کے چہرے کے نقوش ایک دوسرے میں گم تھے۔ ان کی آنکھیں بند تھیں، ان کے ماتھے پر کوئی شکن نہ تھی۔ ان کی بانہیں رانوں پر خاموش، بے سدھ پڑی تھیں۔ ان کا دایاں ہاتھ بائیں ہاتھ کی کھلی ہوئی ہتھیلی پر انگلیاں پھیلائے، کنول کا پھول بنائے پڑا تھا۔ اسے اب یقین ہو چلا تھا کہ اس کا دماغی توازن بگڑ رہا تھا۔ اس احساس سے بچنے کے لیے اس نے شعوری طور پر کل رات سے لے کر اس وقت کے تمام واقعات کو ذہن میں دہرانا شروع کیا۔

پرسوں شام اس نے اپنے تمام کام ختم کر لئے تھے اور اسے سات آٹھ دن کچھ نہ کرنا تھا۔ اس نے دوستوں کے ساتھ اگلے دن پکنک منانے کا پروگرام طے کیا۔ صبح کھانے کا سامان تیار کرا اور برتن ساتھ لے، شہر سے دور، دریا کنارے، درختوں کے سایہ میں، دوستوں کے ساتھ ڈیرے جا لگائے۔ پہلے پہر سے پچھلے پہر تک ہنستے ہنساتے، کھاتے پیتے، مذاق کرتے، ریکارڈ بجاتے، عشق کی کہانیاں کہتے، آپ بیتیاں کہتے، دن گزار کر وہ سب سرِ شام شہر کو لوٹے۔ سامان نوکروں کے سپرد کر کے وہ سب سینما دیکھنے چلے گئے۔ فلم بڑی مزے دار تھی۔ اس میں دکھ سکھ، قہقہے، آنسو، حسن، عشق، حسینائیں، غرض سب کچھ تھا۔

سینما سے نکل، دوستوں سے رخصت ہو کر وہ ہیروئن کے سنہری بالوں، نیلی نیلی آنکھوں میں کھویا، سیٹی بجاتا گھر کی طرف چل نکلا۔ وہ سوچ رہا تھا کہ کل دوپہر وہ گاؤں چلا جائے گا، ایک ہفتہ رہنے کے بعد وہ تازہ دم ہو کر ایک بار پھر کاروبار کی تفصیلات طے کرنے کے قابل ہو جائے گا۔ گھر کی دہلیز پر پاؤں رکھتے ہی اس کا دل ایک پل کے لیے ڈوبا اور

ایک دم اچھلا۔ وہ جلد جلد سیڑھیاں چڑھ کمرے میں پہنچا۔ کمرے کی ہر چیز پر نگاہ کی، مطمئن ہو کر کپڑے اتارنے شروع کئے۔ کپڑے اتار چکا تو نوکر کے کھانا لانے کا انتظار کرنے لگا۔ نوکر کھانا لایا تو اس نے اس سے کہا کہ اس نے اس سے کچھ کہنا ہو تو کہہ دے کیونکہ وہ کل گاؤں چلا جائے گا۔ نوکر نے اسے بتایا کہ ابھی اس کے پاس اس کی واپسی تک کے لیے پیسے تھے۔ نوکر وہیں زمین پر بیٹھ کر اس کے کھانا کھا لینے کا انتظار کرتے کرتے کسی سوچ میں کھو گیا اور پھر ایک دم چونک کر ایک خط اس کے بستر کے سرہانے کے نیچے سے نکال کر اس کو دیا۔ اس نے خط پر لکھے ہوئے پتے سے اندازہ کر لیا کہ یہ اس کی ماں کا خط تھا۔ اس کی ماں اسے کبھی کبھی خط لکھتی تھی جس میں اکثر شہر سے کچھ چیزیں لانے کی فرمائش ہوتی تھی۔ اس نے یہی سوچ کر خط کو الگ رکھ لیا اور پھر کھانا کھانے میں مشغول ہو گیا۔ کھانا کھا، ہاتھ دھو، تولیے سے ہاتھ منہ صاف کر کے، آرام کرسی پر بیٹھ، سگریٹ سلگا، اس نے ہاتھ کی سست گام جنبش کا حظ لیتے ہوئے خط اٹھایا، لفافہ چاک کیا اور خط نکال کر پڑھنا شروع کیا۔ اس کا اندازہ صحیح تھا۔ اس کی ماں نے کچھ خورد و نوش کا سربند سامان، کچھ ریشمی کپڑے اور کچھ مذہبی کتابیں منگوائیں تھیں۔ خط کے آخر میں ایک فقرے میں ذکر تھا کہ عالمہ نے دورے کی حالت میں فحش کلامی شروع کر دی تھی۔ اس ننھے سے فقرے نے اس کا سب مزہ، سب سکون چھین لیا۔ عالمہ نہ صرف اس کی پھوپھی زاد تھی بلکہ اس کی بچپن کی ساتھی تھی۔ عالمہ کو اس نے سالہا سال کی کوشش سے اس قابل بنایا تھا کہ نہ صرف وہ ادب کے شہ پاروں کو پڑھ سکے بلکہ اس کے ساتھ ان پر بحث کر سکے، سر دھن سکے۔ عالمہ ذہین تھی، بلند ہمت تھی، صحت مند تھی، گُن کاری تھی، گھوڑوں سے نہ صرف اسے عشق تھا بلکہ اس عشق میں عالمہ بھی برابر کی شریک تھی۔ جب پہلی بار عالمہ کو ہسٹیریا کا دورہ پڑا تھا تو غم کے باوجود اسے یقین تھا کہ وہ اس عارضے سے شادی کے بعد نجات پالے گی۔ مگر عالمہ اور فحش۔ یہ ناتا اس کے گمان سے بالا تھا۔ اس بات کے علم سے اسے تو اپنی کمر ٹوٹتی ہوئی محسوس ہوئی۔ وہ رات بھر نہ سو سکا۔ صبح سے بہت پہلے وہ کپڑے پہن گھر سے چاندنی میں نکل آیا۔ شہر خاموش تھا، کتے خاموش تھے، ہوا ابھی سو رہی تھی۔ وہ چلتے چلتے ریل کی پٹڑیوں کے قریب پہنچ کر رکا۔ اسے ریل کی پٹڑیوں، ریل کے متحرک، روشنیوں کے شہر میں بہت ہی حسن نظر آتا تھا۔ رات کی

خاموشیوں میں ابھرتی، پھیلتی، گم ہوتی ہوئی ریل کے انجن کی کوک اسے بے سدھ کر دیتی تھی۔ وہ گھنٹوں اس درد بھرے لطف میں کھوئے رہنے کے باوجود کبھی نہ تھکتا تھا۔ اس دن بھی پٹڑیوں سے ذرا دور ہٹ کر درخت کے ساتھ ٹیک لگا وہ گاڑی کا انتظار کرنے لگا۔ وہ ایک طویل، بے خیال، بے لفظ سوچ میں کھو گیا۔ کہیں دور سے آتی ہوئی انجن کی کوک نے اسے چونکایا۔ وہ بے صبری سے انجن کی روشن آنکھ کا انتظار کرنے لگا۔ دور موڑ کے اس پار انجن کی آنکھ سے روشنی کی ایک سڑک نکل کر اس کی طرف تھرکتی ہوئی پھسلنے لگی۔ گاڑی زن سے گزر گئی۔ روشنی کی سڑک اس پار گم ہو گئی۔ انجن کی کوک کو آہستہ خرام ہوا صبح کے دیس کے اس پار لے گئی۔ وہ اٹھا، بددلی سے اجالے اندھیروں کی طرف سے اندھیرے اجالوں کی طرف چل دیا۔ انجن کی کوک ابھی تک اس کے کانوں میں گونج رہی تھی۔ کوک کی آواز الفاظ کی صورت میں اس کے پردۂ ذہن پر ابھرنے لگی۔ اس نے بڑی کوشش کی کہ ان الفاظ کو پڑھ لے مگر وہ ناکام رہا۔ پھر چلتے چلتے اسے محسوس ہوا کہ الفاظ کسی انسانی صورت میں ڈھل رہے ہیں صورت روشن ہوتی گئی اور قریب آتی گئی۔ پھر اس نے سنا کہ کوئی، نہیں وہی صورت، اسے پکار رہی تھی: ''تقی! تم سوچ میں کھوئے ہو! کیوں؟ کیا بات ہے؟ کسی سے عشق کر بیٹھے ہو؟، ہوں؟'' اسے اپنی اس حماقت پر کافی غصہ آیا کہ اتنی دیر میں وہ متین صاحب کی دماغ میں بسی ہوئی صورت کو پہچان نہ سکا۔ پیشتر اس کے کہ وہ اپنی حماقت کے لیے معذرت پیش کرتا وہ کہنے لگے ''تقی میاں، تمہارے گاؤں جانے کی دعوت آج قبول کر سکتا ہوں۔ فرصت کے چند دن ہیں، پھر نہ جانے کب ایسی فرصت نصیب ہو۔'' پھر کچھ وقفے کے بعد کہنے لگے۔ 'آج دوپہر کو ہی چلیں؟ طے ہے نہ؟ کہاں رہتے ہو؟ گیارہ بجے کے قریب پہنچ جاؤں؟''

متین صاحب نے یہ تمام باتیں ایسے فیصلہ کن انداز میں کہیں کہ وہ سوائے گھر کا پتہ بتانے کے کچھ اور نہ کہہ سکا۔ وہ کچھ اور کہنے کی سوچ ہی رہا تھا کہ متین صاحب الوداع کہہ بہت دور جا چکے تھے۔

ایک جھٹکا لگا اور تقی خیال کے جہاں سے لوٹ آیا۔ شاید کار کا پہیہ کسی اینٹ یا روڑے

سے ٹکرایا تھا۔ سڑک گرتی پڑتی بھاگی چلی جا رہی تھی، ایک متین صاحب بالکل پہلے کی طرح چپ چاپ اور ساکت بیٹھے تھے۔ گھاس کے تختے، چٹیل میدان، پستہ قد، چھتری دار درخت، پانی کے تھالوں میں نیلے جزیرے اب بھی نیم دائروں میں اُچھل اُچھل کر رقصاں تھے۔

وہ ایک بار پھر احساسات میں، خیالات میں، سپنوں میں کھو گیا۔ اس نے دیکھا:

چاند کے بغیر، تاروں بھرے، آسمان کے نیچے، پانی آسمان میں اور آسمان پانی میں گم ہے۔ پانی پر دور ایک ڈونگا بہتا جا رہا ہے۔ قریب آیا تو اس نے دیکھا کہ اس ڈونگے میں وہ ہے، متین صاحب ہیں اور لبادوں میں ملبوس ایک بے سدھ، بے حرکت، بیٹھا ہوا جسم۔ وہ خیال ہی خیال میں ہنسا کہ دیکھو جی شعور میں بیتے ہوئے واقعات کیسے کیسے روپ دھارے سپنوں میں آتے ہیں۔ پھر آسمان پر بادل چھا گئے اور پانی پر اندھیرا۔ تہہ در تہہ بادلوں کے ننھے ننھے، گہرے گہرے روزنوں میں تارے جھلملانے لگے۔ سین ایک بار پھر بدلا۔ آسمان پر بادل تھے نہ تارے۔ ڈونگے میں اس کے سوا کوئی نہ تھا۔ دور افق پر آگ پاؤں چلتی ہوئی اس کی طرف بڑھنے لگی۔ اس کے قریب آ کر رک گئی، ایک ننھے سے پانی کے قطعہ میں مرکوز ہو گئی۔ آگ نے انسانی صورت اختیار کرنی شروع کی۔ پیر بنے، ٹخنے بنے، پنڈلیاں بنیں پھر رانیں، ناف، کولہے، چھاتیاں۔ اس نے آنکھیں بند کر لیں۔ وہ عالمہ کو عریاں نہ دیکھنا چاہتا تھا۔ کچھ دیر بعد جھجکتے جھجکتے اس نے نظر اٹھائی تو اس نے دیکھا کہ انسانی صورت عالمہ نہ تھی، فردوس تھی۔ فردوس کی مسکراتی ہوئی صورت نے خواب کو پریشان کر دیا اور وہ شعور کے جہاں میں لوٹ آیا۔ وہ سوچنے لگا کہ اتنے برسوں کے بعد فردوس کا خیال؟ ایک ہی دن میں متین صاحب سے ملاقات اور فردس کا خواب میں عریاں مسکراتے ہوئے آنا، یہ شعور و خواب کا میل ضرور رنگ لائے گا۔

دور مغربی افق پر جواں سال دن، خون میں لت پت، لالہ رخسار شام کی گود میں پڑا دم توڑ رہا تھا۔ تقی اس خیال کے آتے ہی بے نام لطف میں کھو گیا۔ دور اس کے گاؤں کے اینٹوں کے بھٹے کا دھواں فضا میں پھیل رہا تھا اور چکی کی گم ہوتی ہوئی کوک صاف سنائی دے رہی تھی۔ اپنے گاؤں کی سرحد نظر آتے ہی اس کا ذہن پریشان، خواب آلودہ خیالات سے

خالی ہو گیا۔

چوڑی چکلی سڑک اور اس کے گاؤں کی بلند سطح کے درمیان کی کچی سڑک پر بارش کی وجہ سے بہت کیچڑ ہو رہا تھا۔ موٹر کو کیچڑ میں لت پت کرنا بلکہ دھنسا لینا کوئی معقول بات معلوم نہ ہوتی تھی۔ لہٰذا تقی نے معذرت کرتے ہوئے متین صاحب کو بتایا کہ اس مقام سے آگے انہیں پیدل چلنا پڑے گا۔ متین صاحب جواب دیئے بغیر گاؤں کی بلند منڈیر پر چڑھ گئے۔ تقی نے ڈرائیور کو کار کے متعلق ہدایات دیں اور متین صاحب کے پیچھے لپکا۔ جونہی اس نے گاؤں کی سرحد کے اندر قدم رکھا تو بھٹے کی چمنی سے نکلتا ہوا دھواں فضا میں ٹھٹک گیا۔ گھروں کو جاتے ہوئے جانور اور کسانوں کے قدم ہوا میں معلق ہو گئے، جانوروں کی گردنوں میں بندھی ہوئی گھنٹیوں کی صدا گھنٹیوں میں گھٹ کر رہ گئی۔ وقت تھم گیا۔

تقی نے جیب سے رومال نکال کر پسینہ پونچھا، ہتھیلیوں سے آنکھوں کے پپوٹوں کو، کانوں کو سہلایا، بدن کو جھنجھوڑا۔ نظر اٹھا کر متین صاحب کے چلتے ہوئے جسم کو دیکھا۔ متین صاحب یوں چلے جا رہے تھے کہ جیسے گاؤں کی ہر سڑک سے، ہر ذرے سے، کھڑی فصل کے ہر پتے سے واقف ہوں۔ وہ چلتے چلتے رک گیا۔ چکی کی کوک، گھنٹیوں کی صدا، جانوروں کی ڈکارنے کی، کسانوں کی جانور ہانکنے کی آوازیں آہستہ آہستہ، بہت آہستہ آہستہ اس کے کانوں تک پہنچنے لگیں۔ بھٹے کی چمنی میں سے نکلتا ہوا دھواں فضا کے سفر پر ایک بار پھر چل نکلا۔

دوسرا باب

''آپ چاند سے باتیں کر رہے تھے'' رافعہ نے کمرے میں داخل ہوتے ہوئے کہا۔ ''یہ بڑا اباتونی ہے، جھوٹا ہے، بدتمیز ہے، آپ اسے منہ نہ لگائیں۔'' ''کیوں'' متین صاحب نے مڑتے ہوئے کہا ''تمہیں چاند پسند نہیں''۔ ''ہے تو مگر آج، ابھی ابھی، میری اس سے کُٹی ہو گئی۔ دیکھئے نا کہنے لگا 'تمہاری عالمہ آپا کے دلہا آج آئے ہیں۔ جانتی ہو کون؟' میں

نے کہا ’’تقی بھائی جان‘‘۔ تو ہنستے ہوئے کہنے لگا ’’نہیں!‘‘ میں نے پوچھا ’’تو پھر کون؟‘‘ کہنے لگا ’’متین صاحب۔‘‘ دیکھئے ایسی باتیں بھلا مذاق میں کہی جاتی ہیں؟‘‘ میں غصہ ہوئی تو کھل کھلا کر ہنس دیا۔ ’’میں کُٹی نہ کرتی تو کیا کرتی‘‘۔ ’’تم نے ٹھیک کیا۔ بھلا یہ عالمہ آپا تمہاری کون ہیں۔‘‘ ’’آپ بھی کمال کرتے ہیں یہ بھی نہیں جانتے؟ صفیہ پھوپھی کی بیٹی ہے۔ بڑی اچھی ہیں۔ میرے ساتھ اکثر گڈیوں کا بیاہ رچاتی ہیں۔‘‘ رافعہ اتنا کہہ کر چپ ہوگئی اور کن انکھیوں سے چاند کو تکنے لگی اور پھر آپ ہی بڑبڑائی ’’اب تو لاکھ منتیں کرے میں تجھ سے نہ بولوں گی۔ بھلا ایسا جھوٹ بھی بولا کرتے ہیں بدتمیز کہیں کا‘‘ پھر متین صاحب کی طرف متوجہ ہوکر پوچھنے لگی۔ ’’کیوں جی یہ لوگ بیمار کیوں ہوجاتے ہیں۔‘‘ ’’جی چاہتا ہے اس لئے۔‘‘ متین صاحب بے دھیانی میں بولے۔ ’’میں پہلے ہی سوچتی تھی مگر عالمہ آپا کا جی کیوں چاہتا ہے۔ وہ اکثر بیمار رہتی ہیں۔ پہلے تو ایسا نہیں تھا......مگر بھیا کے آتے ہی پھر ٹھیک ہوجاتی ہیں۔ کیا وہ نہیں چاہتیں کہ بھیا شہر جائیں؟ آخر وہ ان کے ساتھ شہر کیوں نہیں چلی جاتیں؟ نا بھئی......وہ بیمار ہی اچھی۔ پھر مجھ سے گڈیوں کا بیاہ کون رچائے گا۔ میں امی سے کہوں گی کہ بھیا اور عالمہ آپا کا بیاہ کردیں۔ دونوں شہر نہ جائیں۔ آپا اور میں گڈیوں کا بیاہ رچائیں۔‘‘

’’تم چاند سے اب صلح کرلو۔‘‘ متین صاحب بولے اور پھر کھڑکی سے ہٹ کر آرام کرسی پر بیٹھ گئے۔ شب خوابی کے کُرتے سے سگریٹ کیس نکالا اور سگریٹ نکالی، سلگا کر پینے لگے اور سگریٹ کیس کو ساتھ کی میز پر رکھ دیا۔ رافعہ بھی اب کھڑکی سے ہٹ کر میز کے قریب آ گئی تھی۔ سگریٹ کیس پر بنے ہوئے نقش دیکھنے لگی۔ ایک سوار ایک بڑے میدان میں سے گزر رہا تھا۔ چاندنی کھلی تھی۔ کہیں کہیں دور دور درخت تھے۔ رافعہ اس منظر کو بڑے غور سے دیکھ رہی تھی۔ سوچتے سوچتے بولی ’’متین صاحب! یہ سوار اس چاندنی میں کہاں جارہا ہے۔‘‘ ’’شاید کسی سفر سے واپس گاؤں کو لوٹ رہا ہے جہاں اس کی تمہارے جیسی پیاری ایک بیٹی ہو جو چاند سے پوچھ رہی ہو کہ اس کے ابا کب گھر پہنچیں گے۔‘‘ ’’آپ کا گھر کہاں ہے؟ آپ کی دلہن ہے؟ وہ کیسی ہے؟ کیا وہ بھی عالمہ آپا کی طرح ہاتھوں

کومہندی نہیں لگاتی ؟ آج وہ آپ کا انتظار کر رہی ہوگی''۔''میرا گھر بہت دور ہے آسمان کے اس پار، جہاں کوئی بیمار نہیں۔ جہاں چاند جھوٹ نہیں بولتا، میری کوئی دلہن نہیں۔ میرا کوئی انتظار نہیں کرتا۔ میں ہی انتظار کرتا ہوں''متین صاحب کی آواز بہت دور سے آ رہی تھی۔رافعہ ان کی گود میں چڑھ گئی تھی۔اور لیٹ کران کے بولتے ہوئے ہونٹوں کو تک رہی تھی۔ تکتے تکتے وہ سوگئی۔چاندنی میدان پار کر کے کھڑکی سے کود کر کمرے میں داخل ہو چکی تھی۔متین صاحب رافعہ کو گود میں لئے بیٹھے نہ جانے کیا سوچ رہے تھے،چھت سے لٹکے ہوئے گیس لیمپ سے کیا باتیں کر رہے تھے۔شاید کسی کا انتظار تھا ان کو۔

تقی کے والد کب سے دروازے میں بت بنے کھڑے تھے۔سکوت کو توڑنے کی ہمت باندھتے تھے مگر پھر بات کو زبان سے لوٹا دیتے۔ بالآخر متین صاحب نے ہی انہیں موقع مہیا کیا۔وہ آرام کرسی سے اٹھے اور رافعہ کو دوشالے میں لپیٹ دوسرے کمرے میں بچھے ہوئے بستر پر لٹا دیا۔ وہاں سے لوٹتے ہی کرنل صاحب پر نظر پڑی''آپ کب سے کھڑے ہیں''متین صاحب نے حیرت سے پوچھا''۔''معلوم نہیں شاید ابھی ابھی آیا تھا یا پھر شاید کافی دیر ہوگئی ہے۔''توقف کے بعد پھر بولے''رافعہ آپ سے گھنٹوں میں مانوس ہوگئی ہے...... میں آپ کا بہت ممنون ہوں کہ آپ یہاں چلے آئے۔میں نے اکثر تقی کو کہا کہ کبھی آپ کو یہاں آنے کی دعوت دے مگر وہ ہمیشہ آپ کی مصروفیت کا عذر کرتے، ٹالتا رہا۔تقی آپ کو بہت مانتا ہے۔اس کی باتوں سے اندازہ ہوتا ہے کہ آپ فلسفی ہیں، منطقی ہیں، ولی ہیں، آپ کے سر کے پیچھے ہالہ ہوگا۔مگر آپ تو اچھے بھلے انسان ہیں اور بقول تقی کی والدہ کے آپ قہقہہ لگانا بھی جانتے ہیں۔آپ کے قہقہے کی آواز فضا میں گم ہو جانے کے بعد بھی سنائی دیتی ہے...... آپ اصطبل کب گئے تھے؟

''آتے ہی تقی گھوڑوں سے تعارف کرانے لے گیا تھا۔ رافعہ بھی ساتھ گئی تھی''۔

''رافعہ کہتی تھی کہ بہادر نے آپ کو پہچان لیا اور اس نے آپ سے باتیں کی تھیں۔'' کہتی تھی کہ میں نے خود دیکھا کہ بہادر انہیں کن انکھیوں سے دیکھ دیکھ، چپکے چپکے، کھسر پھسر کرتا رہا اور جب متین صاحب نے اس کے سر پر ہاتھ پھیرا تو گردن جھکا چپ ہوگیا۔ بچے بھی عجیب

باتیں کرتے ہیں۔'' کرنل صاحب چپ ہوگئے اور کچھ دیر کے بعد وہ متین صاحب کے پاس کھڑے ہوکر باہر چاند کو دیکھنے لگے۔ کچھ دیر وہ دونوں چپ چاپ کھڑے رہے۔ کرنل صاحب نے ایک لمبا سانس لیا اور بستر کی طرف بڑھے اور رافعہ کو بستر سے اٹھاتے ہوئے کہنے لگے ''آپ آرام کیجئے۔ تقی نہ جانے کب لوٹے گا۔ پھوپھی کا لاڈلا ہے نا۔ پھوپھی کے پاس بیٹھا باتیں کرر ہا ہوگا۔ اس کی پھوپھی کا کوئی بیٹا نہیں ہے صرف ایک بیٹی ہے۔ مگر وہ بھی......'' فقرے کو نامکمل چھوڑ کر کرنل صاحب کمرے سے باہر نکل گئے۔ ان کی بھرائی ہوئی آواز ایک لمحہ کے لیے کمرے میں گونجی اور گم ہوگئی۔ متین ابھی تک اسی طرح چپ، پیٹھ پیچھے ہاتھ باندھے، چاند کو تکے جا رہے تھے۔ چاندنی اب تمام کمرے میں پھیل چکی تھی۔ کمرے کی ہر چیز پر ایک چمک آچکی تھی اور ایسا لگ رہا تھا کہ تمام چیزیں ایک ساتھ بول اٹھیں گی اور آپس میں باتیں کرنی شروع کردیں گی۔ ایک لمبے عرصے کی خاموشی کے بعد دیواروں سے چاندنی اترنی شروع ہوئی۔ فرش پر ایک بار پھر سائے بڑھنے لگے اور چاندنی کو کھڑکی کی طرف دھکیلنے لگے، دھکیلتے چلے گئے۔ چاندنی آہستہ آہستہ پیچھے ہٹ رہی تھی۔ چاندنی کھڑکی کی چوکھٹ پر پیر جمانے کی کوشش کرنے لگی مگر سائے بڑھتے رہے۔ چاندنی ہٹتی گئی۔ اب میدان میں بھی کافی دور تک سائے بڑھ چکے تھے۔

متین صاحب کھڑکی سے ہٹ کر پلنگ کی طرف بڑھے۔ کچھ دیر پلنگ کی پٹی پر بیٹھنے کے بعد وہ پلنگ پر دراز ہوگئے۔ تکیے پر اوپر تلے کھلی ہتھیلیوں پر سر رکھے وہ کافی دیر سوچتے رہے اور پھر دیوار کی طرف منہ موڑ سو گئے۔

تیسرا باب

''متین صاحب مجھے اب بھی یقین نہیں آتا کہ عالمہ کا فخش سے کسی بھی سطح پر کوئی رشتہ ہوسکتا ہے۔ مگر پھوپھی اور پھوپھا جھوٹ کیسے بول سکتے ہیں۔ عالمہ کے متعلق جھوٹ بولنے کی کس کو جرأت ہوسکتی ہے۔ پھوپھی کہتی تھی کہ فخش سے عالمہ کے چہرے کے نقوش میں کوئی

الجھاؤ، کوئی سقم پیدا نہیں ہوتا، اس کے چہرے پر وہی دمک قائم رہتی ہے (جو اس کے چہرے کی خصوصیت ہے) اور یہ کہ عالمہ کے منہ سے فحش سن کراہت، نفرت یا اس سے ہمدردی کے جذبات پیدا ہونے کی بجائے دل پر ایک ہیبت، ایک رعب طاری ہوجاتا ہے...... معلوم ہوتا ہے کہ اس فحش کلامی سے جذب کی ایسی اتھاہ کیفیت پیدا ہوتی ہے کہ اسے یزدانی جذب کا نام ہی دیا جاسکتا ہے۔

خود عالمہ کو بھی اس بات کا احساس ہے کہ وہ دورہ پڑنے کی حالت میں کسی ایسی کیفیت اور سُرور سے روشناس ہوتی ہے جس سے تھکن کی بجائے ایسی قوت پیدا ہوتی ہے کہ اگر وہ چاہے تو بیٹھے بیٹھے ہوا میں بلند ہوسکتی ہے اور ہوا کی بلندیوں میں قائم رہ سکتی ہے۔ پھر اسے اس بات کا بھی احساس ہے کہ یہ عارضہ عذاب نہیں، امتحان ہے، رحمت ہے جو اسے کئی ناگوار حادثوں سے بچائے ہوئے ہے۔ جب میں پھوپھی کے پاس سے اٹھ کر عالمہ کے کمرے میں داخل ہوا تو وہ اس وقت آرام کرسی پر کھڑکی کے پاس اس طرح بیٹھی تھی جیسے وہ آسمان اور زمین کی تمام اشیاء کی سرگوشیاں سن رہی ہو۔ اس کا سر کرسی کی پٹی کے ساتھ لگا تھا۔ اس کا جسم کرسی پر نیم دراز تھا۔ اس کی بانہیں، اس کی کہنیاں، اس کے ہاتھ، اس کے باقی جسم اور گود کے ساتھ زاویۂ حادہ بنائے اس سکون سے پڑے تھے جیسے انہوں نے دنیا کے تمام کام کر لئے ہوں اور اب ایک طویل عرصہ کے لیے آرام کر رہے ہوں۔ اس کے کھلے ہوئے، نرم، گداز مگر طاقت ور، ہاتھ اس کی متوازی رانوں کے درمیان اس طرح سے پڑے تھے جیسے ہنسوں کا جوڑا آنکھیں بند کئے آرام کر رہا ہو۔

جونہی میں نے کمرے کی دہلیز کے اندر پہلا قدم رکھا تو اس نے نہایت نرم، مدھم مگر نہایت واضح آواز میں کہا 'اگر آپ مجھے ملے بغیر چلے جاتے تو مجھے بہت دکھ ہوتا۔ شاید آپ نے کبھی نہیں سوچا کہ میرا کوئی بھائی نہیں، میری کوئی بہن نہیں، سہیلی نہیں، ہمجولی نہیں، ایسا کوئی نہیں جس سے میں دل کی بات اس امید پر کرسکوں کہ سمجھی جاسکے گی۔ میرے لیے آپ ہی سب کچھ ہیں۔ میں نے آپ کو کبھی ماموں زاد اور استاد نہیں سمجھا۔ میں آپ کو اپنے امن اور سکون کا امین سمجھتی ہوں۔ آپ کو مجھ پر ترس نہیں کھانا چاہیے۔ میں جانتی ہوں کہ فحش

کسی کی زبان سے بھلا نہیں لگتا مگر تنہائی کے اس نشان کو خوشی سے قبول کرتی ہوں۔ مجھے یقین ہے کہ میرے اندر ایک نیا جہاں، ایک نئی سطح جنم لے چکی ہے۔ اس دنیا میں زندہ رہنے کے لیے بہت ہی گہرے اور ہمہ گیر جذب کی ضرورت ہے اور یہ جذب اس ٹھٹھرے ہوئے ماحول میں کبھی میسر نہیں آ سکتا۔ اس ماحول میں انسانوں کے رشتے حیوانی رشتوں سے الگ نہیں ہیں۔ جس جذب کی مجھے ضرورت ہے وہ یا تو ایسے انسان کے ملاپ سے ممکن ہے جو مجھ میں اور میں اس میں اس طرح گھل مل جاؤں جس طرح آنکھوں میں نیند یا قطرہء باراں زمیں میں ...... یا پھر فحش میں۔ میرے گرد و پیش ایسا انسان کہاں ہے؟ مجھے اس کا کب سے انتظار ہے؟ ایسا لگتا ہے جیسے کسی سطح پر میری موت کے بعد ہی ایسا انسان میسر آئے گا۔ مجھے اس احساس بلکہ یقین سے گھبراہٹ نہیں ہوتی۔ میں اپنی تقدیر پر نہ صرف قانع ہوں بلکہ مجھے اب یہ بھانے لگی ہے کبھی کبھی یہ احساس ایسا وجد طاری کرتا ہے کہ مجھے زمین و آسمان کے درمیان جو کچھ ہے اس کی مدھ بھری سرگوشیاں صاف صاف سنائی دینے لگ جاتی ہیں......

اس لیے میں التجا کرتی ہوں کہ آپ میرے لیے غم نہ کریں اور امی کو بھی سمجھائیں کہ وہ میرے بغیر زندگی گزارنا سیکھنے کی کوشش کریں۔ مجھے نہ جانے کب بلاوا آ جائے اور مجھے الوداع کہنے کی بھی فرصت نہ ملے۔ اگر ایسا ہو تو آپ وعدہ کیجئے کہ آپ امی کو میری غیر حاضری محسوس نہ ہونے دیں گے اور پھر میں یہ بھی تو چاہتی ہوں کہ جو جگہ آپ کے دل میں میرے لیے ہے وہاں ہمیشہ دوستی رہے۔ میں آپ کی بیوی بن کر وہ سب کچھ کھو دوں گی جو مجھے آپ سے ملتا ہے۔'

'یہ تمام گفتگو میری سمجھ میں نہ آتے ہوئے بھی میرے دل و دماغ میں اس طرح مل گئی ہے کہ مجھے اس سے بچنے کی کوئی ضرورت محسوس نہیں ہوئی۔ مگر ایسا کیوں ہے؟ کیا عالمہ انسان نہیں؟ وہ واضح اور بیّن قسم کے دکھ کو اس طرح کیوں قبول کئے ہوئے ہے جیسے یہ بہت بڑی نعمت ہو؟ اگر وہ انسان ہے تو پھر میں کیا ہوں؟ شہروں میں، گاؤں میں چلتے پھرتے، ہل چلاتے، فصل بوتے، فصل کاٹتے، موسمی گیت گاتے ہوئے لوگ کیا ہیں؟ مجھے یقین تو نہیں ہے

کہ آپ حسب معمول ان تمام رازوں سے پردہ اٹھا سکیں گے مگر میں کسی ایسے انسان سے بھی تو نہیں واقف جو آپ سے زیادہ اس کی اہلیت رکھتا ہو۔ مجھے اس احساس پر بھی تو بہت حیرانی ہو رہی ہے کہ آپ کی صلاحیتوں پر یہ شک کیوں اور یہ شک پہلے کیوں نہ ہوا......

متین صاحب! آپ میری باتیں سن رہے ہیں نا؟ آپ چپ کیوں ہیں؟ بے سدھ کیوں ہیں۔ مجھے آپ سے ڈر لگنے لگا ہے۔ آپ پہلے تو کبھی اتنے خاموش نہ تھے۔ کیا آپ بھی عام انسانوں کی طرح عشق میں مبتلا ہیں؟''

متین صاحب نے کوئی جواب نہ دیا۔ تقی مسلسل ٹکٹکی باندھے ان کی طرف دیکھ رہا تھا۔ اس نے اپنے آپ کو متین صاحب کی بے سدھتا میں گم ہوتے ہوئے محسوس کیا۔ کچھ لمحوں کے بعد اسے یوں لگا کہ اس نے دیکھا ہو کہ متین صاحب کے چہرے سے، بدن سے گوشت الگ ہو رہا ہو، ہڈیاں پانی بن رہی ہوں اور پھر وہ پانی کا ایک ننھا سا، روشن سا قطرہ بن گئے ہوں۔ اس کا جی چاہا کہ جھک کر اس قطرے کو کسی ظرف میں محفوظ کر لے مگر اس نے اپنے آپ میں حرکت کی قوت مفقود پائی۔ پھر وہ قطرہ پھیلنا شروع ہوا، بڑھا، جونک بنا، سانپ بنا، ہڈیوں کا ایک ڈھچر، پھر اس ڈھچر پر آہستہ آہستہ گوشت چڑھنا شروع ہوا، جسم نے گھوڑے کی اور پھر انسانی شکل اختیار کی۔ متین صاحب کے چہرے کی زردی دمکتی ہوئی سرخی میں تبدیل ہوئی۔ جسم میں ایک پھیلتا ہوا ارتعاش پیدا ہوا، لب ہلے، بالآخر نیچے سروں میں ایک آواز آنے لگی ''انسان ایک جسم تو ہے مگر جسم کی طرح محدود نہیں۔ اس جسم کے اندر کئی عالم ہیں۔ ہر عالم میں الگ اصول جاری وساری ہیں۔ ہر انسان بیک وقت ان تمام عالمین میں زندہ نہیں رہتا۔ ہمارے گردو پیش کے لوگ حیاتیاتی طور پر زندہ نظر تو آتے ہیں مگر ان پر ان کے اندر موجود عالمین کے دروازے کبھی نہیں کھلتے اور جب کھلتے ہیں تو بجائے کسی نئے عالم میں زندگی پانے کے وہ حیاتیاتی سطح پر نیم مردہ ہو جاتے ہیں۔ انسانوں کی ایک بہت بڑی اکثریت مردہ ہے جو اپنی ناک کے نیچے کی چیزیں دیکھنے کی بھی صلاحیت نہیں رکھتی۔

مگر کچھ لوگ ہر دور، ہر زمانے میں، ایسے بھی ہوتے ہیں جو حیاتیاتی عالم سے مسلسل ہجرت کرتے ہوئے اپنے اندر کے عالموں میں بار بار جنم لیتے ہیں اور ہر جنم اپنے ساتھ

تکلیف اور دکھ کی حالتیں لئے ہوتا ہے۔ یوں ہجرت کا سفر اپنی ذات میں کافی اندوہناک ہوتا ہے۔ ایسے لوگوں کے ایسے جنم کو لوگ عارضہ سمجھتے ہیں مگر ایسا نہیں ہے۔ ان لوگوں کے جیون ساتھی بھی ایسے ہی انسان ہو سکتے ہیں جو ان کے ہر نئے جنم کے ساتھ خود بھی جنم لے سکیں اور اسی عالم میں جنم لے سکیں جس میں انہوں نے جنم لیا ہو۔

عالمہ بھی انہی لوگوں میں سے معلوم ہوتی ہے اور چونکہ اس وقت تک تم ہی اس کے قریبی ہو اس لیے تم پر لازم ہے کہ تم اس کے امین بنو اور جب اس کا صحیح ساتھی اسے مل جائے تو امانت اس کے سپرد کر دو۔''

تقی کو اپنے اندر ایک طوفان کروٹ لیتے ہوئے محسوس ہوا۔ یہ احساس دھندلے سے یقین میں بدلنے لگا کہ وہ خود کسی اسی قسم کے عالم میں جنم لے رہا ہے۔ اس نے اپنے آپ کو جھنجھوڑا، زبردستی آنکھیں وا کیں، گردوپیش پر نگاہ کی ہر شے پر ایک پرسکون کیفیت طاری تھی۔ برآمدے سے قدموں کی چاپ سنائی دے رہی تھی شاید کوئی ان کے کمرے کی طرف آ رہا تھا۔ کچھ دیر کے بعد ملازمہ کو لئے رافعہ کمرے میں داخل ہوئی۔ ملازمہ ناشتہ کے برتن اٹھائے ہوئے تھی۔ رافعہ بڑھ کر متین صاحب کی گود میں چڑھ گئی۔ ملازمہ نے میز پر برتن لگا دیئے اور باہر چلی گئی۔

رافعہ متین صاحب کی گود میں چپ چاپ بیٹھی تھی۔ متین صاحب نہایت اطمینان اور انہماک سے کھانے میں مشغول تھے۔ بار بار لقمہ منہ میں ڈالنے سے پہلے تقی کے ہاتھ فضا میں رک جاتے۔ وہ سوچ رہا تھا کہ لوگ آسانی سے بڑے سے بڑا مسئلہ حل کر لینے کے باوجود کسی غیر انسانی ماحول کی مشکلات سے دوچار ہونے پر کیوں مُصر ہوتے ہیں؟ عالمہ اور متین اپنی اپنی جگہ مطمئن بھی ہیں، کسی انتظار میں بھی۔ لیکن وہ خود کیوں انتظار میں ہے؟ عالمہ کا مسئلہ اب حل طلب نہ تھا۔ وہ اپنی زندگی جس ڈھرے پہ چاہے چلا سکتا تھا مگر اسے ایسا معلوم ہو رہا تھا جیسے جس ڈھرے پر وہ آج تک نہایت اطمینان سے چلتا آ رہا تھا اس پر اب چلنے کی ہمت اس میں نہ ہو گی کیونکہ اس نے ان راستوں اور منزلوں کی دھندلی سی تصویر دیکھ لی تھی جن کو صرف 'زندہ' انسان ہی طے کر سکتے تھے اور وہ 'زندہ' انسان سے کم درجہ اور سطح پر رہنا

گوارہ نہ کرسکتا تھا۔ مگر اس سطح پر وہ کیسے سفر کر سکے گا؟ کیسے جی سکے گا؟ کون اس کا ساتھی ہوگا؟

متین صاحب؟ نہیں! اس طویل گفتگو کے بعد ایسا سوچنے کی کیا گنجائش تھی؟ عالمہ اب بھی وہی عالمہ تھی۔ وہی آنکھیں اور ان آنکھوں میں وہی اجلا پن، وہی گہرائی۔ اس کی آنکھوں میں جھانک کر اب بھی یہی معلوم ہوتا تھا کہ جیسے شیشے کے دیس میں آ گئے ہیں جہاں ہر چیز ساکت ہے، شفاف ہے مگر اس میں ایک بل کھاتی ہوئی گہرائی ہے۔ اب صرف اس میں اتنا فرق تھا کہ اس ساکت دیس میں حرکت کا بیّن احساس ہوتا تھا۔ اس حرکت کو نام دینے کی وہ بہت کوشش کرتا رہا مگر کامیاب نہ ہوسکا اور اس کی سوچ لاشعور سے شعور میں منتقل ہونے لگی۔ اسے اپنے گردوپیش کا احساس ہونے لگا۔ میز پر صرف رافعہ بیٹھی اسے کن انکھیوں سے دیکھ رہی تھی۔ اس کی آنکھوں میں حیرانی اور اطمینان کے سائے اور روشنیاں ایسے گھل مل رہے تھے جیسے...... جیسے...... اسے ایک بار پھر ناکامی ہوئی اور اپنے آپ پر جھنجھلاہٹ۔ آخر وہ اپنے احساسات کو نام کیوں نہیں دے سکتا تھا اس کے ذہن پر، اس کے لاشعور پر، کون سا پردہ پڑا تھا؟ کون اس کے لاشعور اور شعور کے درمیان دیوار بنا کھڑا تھا؟ اسے ایک دم خیال آیا کہ آخر متین صاحب کہاں چلے گئے ہیں؟ رافعہ آج چپ کیوں ہے؟ وہ کرسی سے اٹھا اور اس نے سامنے سے بائیں اپنی نگاہوں کو شعوری کوشش سے نہایت آہستہ آہستہ پھرایا اور پھر آہستہ، نہایت آہستہ، اس نے اپنے پاؤں پر پیچھے کی طرف گھومنا شروع کیا۔ دیوار پر جانوروں کی بھس بھری کھالیں ٹنگی ہوئی تھیں۔ ان کی گردنیں اسے بڑی سوچ کی نظروں سے تک رہی تھیں۔ متین صاحب کہاں تھے۔ وہ نہایت پریشانی کی حالت میں کمرے کی واحد کھڑکی، قدآدم کھڑکی، کی طرف مڑا۔ ابھرتے ہوئے سورج کی دھندلائی ہوئی، بکھرتی ہوئی پہلی کرنیں یورش کرتی ہوئی کمرے کے اندر بڑھی چلی آرہی تھیں۔ اس روشنی کی طرف منہ کئے کوئی کھڑا تھا۔ اس کھڑے ہوئے جسم سے کرنیں اس طرح آر پار ہو رہی تھیں جیسے وہ جسم شیشے کا ہو جس پر پردہ پڑا ہو۔ روشنی اور شیشے کے اس منظر سے اس کے دل پر ہیبت طاری ہونے لگی۔ پھر آہستہ آہستہ روشنی اور دھند علیحدہ علیحدہ ہونے لگے۔

کرنیں ایک گتھا ہوا، معین اور محدود راستہ بنانے لگیں اور سورج اور کمرے کے درمیان کھڑا جسم تمام کرنوں کو اپنے جسم میں جذب کرنے لگا، نئے غیر شفاف سانچے میں ڈھلنے لگا۔ اس نے اپنی آنکھوں کے سامنے روشن مجسمے کو گوشت پوست کا انسان بنتے دیکھا۔ اس انسان کا جسم، اعضاء، اسے جانے پہچانے ہوئے لگ رہے تھے۔ متین صاحب کے اس روپ سے اس کے ذہن میں زن سے عریاں فردوس کی تصویر ابھر آئی اور اس کے تصور کے تمام آفاق پر محیط ہوگئی۔ اس نے ایک گہرا، لمبا، بہت ہی لمبا، سانس لیا۔ اس کے ذہن کی پھانس آہستہ آہستہ نکل رہی تھی، شعور اور لاشعور کے درمیان والی دیوار ہٹ رہی تھی اور اس نے شعوری طور پر جان لیا کہ اسے فردوس کے تصور سے اب نپٹنا ہوگا۔ مگر کیسے؟ کہاں؟ کب؟

اس سوچ کے ملک میں اس کا دل تنگ ہونے لگا، اس کا دم گھٹنے لگا۔ اس نے پوری کوشش کی کہ وہ جانے پہچانے جہان میں لوٹ جائے۔ اسے اپنی کوشش کامیاب ہوتی ہوئی معلوم ہوئی اور اس کے کانوں میں ایک جانی پہچانی مگر پھر بھی اجنبی آواز آ رہی تھی۔ اسے اب شعوری احساس ہو رہا تھا کہ یہ آواز اس کی اپنی آواز تھی، نہایت بلند، گونجتی ہوئی پھیلتی ہوئی...... متین صاحب آپ شکار پر چلیں گے؟ داؤد نگر آئے اور شکار نہ کیا! میرے آباؤ اجداد اس ہتک کو کبھی معاف نہ کریں گے۔ چلیں گے نا؟ تیاری کراؤں؟''

روشنی سے ابھرتی ہوئی آواز نے جواب دیا ''ہاں! ضرور! کب؟ ابھی؟''

تقی نے ملازم کو آواز دی اور گھوڑے اور دیگر ضروری سامان مہیا کرنے کے متعلق ہدایات دیں۔

چوتھا باب

سورج کی مسلسل پھیلتی ہوئی روشنی میں گھوڑوں پر سوار، شانوں سے بندوقیں لٹکائے، کارتوسوں سے بھری پیٹیاں باندھے، گھوڑوں کو آہستہ آہستہ چلاتے، متین صاحب اور تقی خاموش چلے جا رہے تھے۔ زمین کی ابھرتی ڈھلکتی سطح پر فصل کٹے ہوئے کھیت، کہیں کہیں

کھیتوں میں کھڑی فصل، سو رہے تھے۔ دور شمال کی طرف سے مغرب کی طرف بڑھتے ہوئے پہاڑ، گہری دھند میں چمکتی ہوئی برف سے ڈھکے ہوئے پہاڑ ان کو اپنی طرف بڑھنے کی دعوت دے رہے تھے۔ وہ آہستہ آہستہ پہاڑوں کی طرف بڑھتے رہے، پہاڑ دور ہوتے رہے۔ اکا دکا کسان تقی کو پہچان کر سلام کرتا ہوا گزر جاتا، کھو جاتا۔ دور درختوں کے ایک جھنڈ میں پرندوں کے پھڑ پھڑانے کا شور صاف سنائی دیتا تھا۔ اور اس جھنڈ سے پرے درختوں کی ٹیڑھی میڑھی قطاریں بڑھتی ہوئی افق میں کھو رہی تھیں۔ ان درختوں کے جھنڈ اور درختوں کی ٹیڑھی میڑھی قطاروں کے درمیان پیاز کے کھیتوں میں پھیلا ہوا پانی چاندی کی طرح چمک رہا تھا۔ ان کھیتوں سے بھی پرے ایک بہت بڑا، جھیل نما، جوہڑ تھا۔ جس کے کنارے فضا میں اڑتے ہوئے اجلے اجلے بگلے اور دوسرے ننھے ننھے پرندے شور کر رہے تھے۔ دونوں گھوڑوں سے اتر، گھوڑوں کی لگامیں تھامے، دھیرے دھیرے، درختوں کی آڑ لیتے ہوئے، جوہڑ کی طرف بڑھنے لگے۔ جھنڈ میں پہنچ کر انہوں نے گھوڑوں کو باندھ دیا اور خود بندوقیں لے کر پیدل چھپ چھپا کر جوہڑ کی اُور بڑھنے لگے۔

اب وہ جوہڑ ان کی مار میں تھا۔ انہوں نے بوٹ اتار دیئے اور پتلونوں کے پائنچے اوپر گھٹنوں تک چڑھا لئے۔ ابھرتی ہوئی، گھاس بھری زمین پر وہ لیٹ کر بڑھنے لگے۔ انہوں نے ایک ساتھ فائر کئے۔ پانی پر پتھروں کی بارش ہوئی۔ پانی کی چمکتی ہوئی سطح پر ارتعاش پیدا ہوا اور پانی پر پھیلتی ہوئی روشنی فضا میں بڑی تیزی سے بکھرنے لگی۔ دونوں زمین سے اٹھے اور بندوقیں چھوڑ پانی پر سے پھڑ پھڑاتے ہوئے پرندے اکٹھے کرنے لگے۔ ان بکھرتے، پانی پر بھاگتے، پرندوں کو جمع کرنے میں کچھ زیادہ دیر نہ لگی اور ان کو وہ ذبح کر کر شانوں سے لٹکے ہوئے تھیلوں میں ڈالتے گئے۔

پانی سے نکل، بندوقیں اور بوٹ اٹھا، درختوں کے جھنڈ کی طرف واپس بڑھنے لگے۔ جھنڈ میں پہنچ وہ درختوں کی چھاؤں میں درختوں سے ٹیک لگا کر بیٹھ گئے۔ بیٹھتے ہی تقی نے محسوس کیا کہ اس نے شکار کو اپنے خیالات سے فرار کے ایک ذریعے کے طور پر استعمال کیا تھا، کیونکہ نہ تو متین صاحب اور نہ وہ خود شکار کا رسیا تھا۔ والد کے افسر دوستوں کے ساتھ اپنی

زمینداری کی روایات کو نبھانے کی خاطر، کسی بڑے سرکاری افسر کی خوشنودی کے لیے، شکار کر لینے کے باوجود اس کو فطرت کے امن کو کارتوسوں کے شور سے تہ و بالا کرنے میں کوفت ہوتی تھی۔ وہ اکثر ایسے موقعوں پر دوسروں سے الگ ہو کر کہیں درختوں کی چھاؤں میں، کھڑی فصل کے سایہ میں، گھاس پر لیٹ جاتا اور پھیلی ہوئی نیلی فضا میں ایسی تصویر، ایسی موہنی مورت کو ڈھونڈنے کی کوشش کرنے لگتا جو اس کی فرصت سے معمور زندگی میں رنگ، آوازیں، گیت، آدرش کی انجانی، مگر ضروری منازل کی طرف مسلسل بڑھنے کا احساس بھر دے۔ گھنٹوں اس طرح لیٹنے سے اس کے جسم میں ایک کسک سی بھر جاتی، اس کا جسم بھاری ہو جاتا اور اس کا جی چاہتا کہ وہ یونہی لیٹا لیٹا، سوچتا سوچتا نیلے آسمان کے نیچے مر جائے اور ایسے ہی درختوں کے درمیان اس کی قبر ہو، اکیلی، سنسان مگر پھولوں سے لدی ہوئی۔ مگر وہ موت کی خواہش کی اتھاہ گہرائیوں میں سے ہمیشہ ابھر آتا۔ دوپہر سے شام ہونے لگتی، کرنیں درختوں کے پتوں پر اپنا آخری رقص کرتی ہوئی بلندیوں کی طرف بلند ہوتی ہوئی گم ہو جاتیں۔ لوٹتے ہوئے شکاریوں کی تیز گفتگو، ملازموں کی پکارتی ہوئی آوازیں، اسے گھاس کے فرش سے اٹھ کھڑے ہونے پر مجبور کر دیتیں اور وہ طوعاً و کرہاً واپس گھر کی طرف روانہ ہو جاتا۔ آج اسے موت کا خیال نہ آ رہا تھا۔ وہ زندگی چاہتا تھا، بھرپور، فطرت پر اور خود اپنے پر محیط ہوتی ہوئی زندگی۔ اسے بڑی شدت سے یہ احساس ہو رہا ہے کہ اسی نیلی نیلی فضا میں، اسی پرسکون، ابھرتی، ڈھلکتی زمین پر اسے اپنی آنے والی بھرپور زندگی کی نشانیاں ملیں گی۔ مگر کیسے؟ کیا متین صاحب چٹکی بجا یا جیب سے ایک بال نکال سورج کو دکھا کھٹ سے ایک نئی دنیا آباد کر دیں گے؟ ان بولتے ہوئے خیالات کا اسے کہیں سے بھی جواب نہ مل سکا۔ وہ گھبرا کر اٹھ کھڑا ہوا۔ متین صاحب اپنے گھوڑے پر زین کس رہے تھے۔ وہ چلنے کے لیے بالکل تیار تھے۔ اس نے بھی ان کی پیروی میں چلنے کی تیاری کی۔

ایک بار پھر وہ گھوڑوں پر سوار چمکیلے پہاڑوں کی طرف بڑھنے لگے۔ وہ جھنڈ، وہ درختوں کی ٹیڑھی میڑھی قطاریں، وہ سونے سے بھرا جوہڑ، سب بہت پیچھے رہ گئے۔ اب ایک بہت بڑا میدان تھا جہاں دور دور کہیں درخت نہ تھا۔ اس میدان سے ورے مشرق کی

طرف ایک بن اور مغرب کی طرف سے آبادی سے اٹھتا ہوا دھواں نظر آتا تھا۔ گھوڑوں کا منہ پھیر دیا۔ وہ آبادی کی طرف بڑھنے لگے۔

اب وہ آبادی کے مکانوں کو الگ الگ دیکھ سکتے تھے۔ مکانوں کی آبادی کے درمیان ایک بہت پھیلی ہوئی بلند عمارت صاف نظر آ رہی تھی۔ اس بلند عمارت سے روشنی کی ایک گھومتی ہوئی سڑک میدان میں اتر رہی تھی۔ یہ سڑک شمال مشرق سے گھوم کر ان کی طرف آ رہی تھی۔ پھر وہ سڑک بالکل ان کے سامنے آ کر رک گئی جیسے دعوت دے رہی ہو کہ آؤ تمہیں بلندیوں کی طرف لے چلوں۔ سڑک اتنی تیز، چمکدار روشنی سے بنی ہوئی تھی کہ نظریں خود بخود اٹھنے لگیں۔ گھوڑے گھبرا کر زمین کوٹنے لگے، ان کے نتھنوں سے پھنکاریں نکلنے لگیں۔ انہوں نے آہستہ سے گھوڑوں کو مشرق کی طرف موڑ دیا۔ اب روشنی کی سڑک پھر گھومنے لگی اور پھر سڑک زمین کی طرف آنے کی بجائے ایک دم اپنے منبعے کی طرف لپٹتی ہوئی لوٹ گئی۔

تقی پر اس حادثے سے خوف طاری ہو گیا اور وہ آنے والی مصیبت سے مقابلہ کرنے کے لیے اپنی ہمت بندھانے لگا۔ وہ انہی خیالوں میں گھرا تھا کہ کہیں دور سے گھوڑے کے ٹاپوں کی صدا آنے لگی۔ اس نے نظر اٹھا کے دیکھا تو آبادی کی جانب سے کوئی سرخ و سیاہ لباس پہنے، گھوڑا سرپٹ دوڑاتے، ان کی طرف بڑھ رہا تھا۔ اس نے متین صاحب کو دیکھا تو وہ سوار پر نظریں جمائے بے جھجک آبادی کی طرف بڑھ رہے تھے۔ آہستہ چلتے چلتے انہوں نے اپنے گھوڑے کو ایڑ لگائی اور سوار کی طرف تیزی سے بڑھنے لگے۔ سوار اور وہ جب قریب پہنچے تو انہوں نے اپنے گھوڑے روک لئے اور آپس میں کچھ باتیں کرنے لگے۔ اتنی دیر میں تقی بھی گھوڑا سرپٹ دوڑا کر ان کے قریب پہنچ گیا۔ آبادی سے آنے والے نے سیاہ تہبند پر سرخ عبا اور عبا پر چمکدار پیتل کے جڑے میں بند چمڑے کی پیٹی پہن رکھی تھی۔ اس کے جسم اور چہرے سے رعب برس رہا تھا۔ وہ اپنی گونج دار آواز میں کہہ رہا تھا!

''سرکار نے مجھے فرمایا: میدان میں دو سوار چلے آ رہے ہیں اور انہیں سادات پور کی سرحد کے اندر قدم رکھنے سے پہلے ہمارے مہمان ہونے کی دعوت دو اور انہیں لینے کو فوراً پہنچو۔

پھر اس نے تقی سے اپنا تعارف کرایا۔ میرا نام چاند خان ہے اور میں درگاہ جلال شاہ کا

ادنیٰ سپاہی ہوں میرے جیسے سینکڑوں درگاہ کے غلام ہیں مگر سرکارِ شاہ مجھ پر مہربان ہے۔''

سوار نے آبادی کی طرف گھوڑا پھرایا۔ تقی نے متین صاحب کی طرف دیکھا۔ متین صاحب کی آنکھوں نے اسے کچھ نہ کہا۔ متین صاحب نے اپنا گھوڑا سوار کے گھوڑے کے ساتھ ساتھ چلانا شروع کر دیا۔

پانچواں باب

سادات پورا اپنے گردوپیش کے میدانوں سے بلند سطح پر آباد ہے۔ عام لوگوں کے کچی پکی اینٹوں کے بنے مکان خواص کے مکانوں سے کافی پرے ہٹ کر بنے ہوئے ہیں۔ عام اور خاص آبادی کے درمیان ایک بڑا میدان ہے۔ جہاں سال کے سال عرس کے موقع پر بہت بڑا میلہ لگتا ہے۔ تقی اور متین صاحب سادات پور کی سرحد میں داخل ہو کر میدان کو عبور کر رہے تھے تو پکی اینٹوں کی عمارتوں کی طرف سے ایک بَرّاق سے گھوڑے پر بیٹھا ایک نہایت ہی وجیہہ نوجوان سفید پشمینہ کے کھلے کھلے، ڈھیلے ڈھالے، لبادوں میں ملبوس چلا آ رہا تھا۔ قریب آتے ہی اس نے دونوں کو خوش آمدید کہا اور اپنا تعارف کرایا۔ وہ سرکارِ درگاہ کا نواسہ تھا اور نام ہادی ولی تھا۔ اس نے چاند خان کو ہدایت کی کہ وہ ان کے پہنچنے سے پہلے مہمانوں کی آمد کی اطلاع کرے اور دیگر ضروری کاموں سے فارغ ہو کر انہیں سیادت منزل کے دروازے پر ملے۔

اب وہ پکے مکانوں کے درمیان ایک گلی کی سڑک پر پہنچ چکے تھے۔ گلی میں سرد ہوا چل رہی تھی۔ مکانوں سے کوئی آواز نہ آ رہی تھی۔ گلی پتھر کے بڑے بڑے چوکوں سے بنی ہوئی تھی اور ان چوکوں پر گھوڑوں کے سموں سے ایک بہت ہی باوقار شور اٹھنے لگا۔ گلی پار کر کے وہ ایک وسیع و عریض صحن میں پہنچے۔ گلی کے عین سامنے صحن کے دوسری طرف ایک بند دروازہ تھا اور دروازے کے دونوں طرف صحن کے شمال اور جنوب تک ایک بلند دیوار کھنچی چلی گئی تھی۔ دروازے پر چاند خان اور دو اور ملازموں نے ان کے گھوڑوں کی لگامیں تھام لیں۔

تینوں گھوڑوں سے اتر کر پھر ایک صحن میں داخل ہوئے۔ صحن کیا تھا گلزار تھا جہاں قسم قسم کے پھول کھل رہے تھے۔ صحنِ گلزار کے چاروں طرف معینہ فاصلوں پر درخت تھے جو صحن پر کھلتی ہوئی کھڑکیوں کو چھپائے ہوئے تھے۔ دروازے سے اصل عمارت تک پہنچنے کے لیے پکی رنگدار چوکوں کی ایک روش تھی۔ روش کو عبور کر کے وہ عمارت میں داخل ہو گئے۔ داخل ہوتے ہی ایک نہایت لمبا برآمدہ تھا، جس میں ہر وقت اندھیرا رہتا ہوگا کیونکہ دیواروں پر بجلی کے خوبصورت، دھیمے رنگوں کے فانوس لگے تھے۔ تقی اس دور دراز گاؤں میں بجلی دیکھ کر حیران ہونے لگا تو ان کے نوجوان ساتھی نے اسے بتایا کہ کچھ ماہ پہلے سادات منزل کے لیے اپنا بجلی گھر بنوایا تھا اور آنے والے عرس کے موقع پر درگاہ پر بھی بجلی کی روشنی کا انتظام ہوگا۔ اس لمبے برآمدے کو طے کرتے ہوئے ایک اور غلام گردش میں داخل ہوئے اور اس کے اختتام پر وہ ایک دروازے پر پہنچے۔ ہادی ولی نے کہا کہ ''اس کمرے میں مجھے داخل ہونے کی اجازت نہیں۔ لہٰذا آپ خود ہی داخل ہو جائیے۔'' کمرے میں داخل ہوئے تو کمرے میں ایک دم روشنی ہو گئی۔ کمرے میں کوئی نہ تھا۔ ایسا سجا ہوا کمرا انہوں نے اپنی زندگی میں پہلے کبھی نہ دیکھا تھا۔ دیواریں ریشمی پردوں، منقش قالینوں میں ملبوس تھیں۔ چھت پر نقش ونگار بنے ہوئے تھے اور وہ دمکتے ہوئے چہرے کی طرح منوّر تھی۔ پاؤں ریشمی قالینوں میں دھنسے جاتے تھے۔ میزوں پر یورپ کے بہترین علمی رسالے رکھے تھے۔ ابھی وہ اس صنم خانہ کو حیرت سے دیکھ ہی رہے تھے کہ کسی نے السلام علیکم کہا۔ کمرے کی دائیں دیوار میں ایک دروازے میں سے ایک ادھیڑ عمر کا باریش، باوقار، بلند قامت انسان داخل ہو رہا تھا۔ اس نے انہیں بیٹھنے کو کہا۔ وہ مخملی دیوانوں پر سنبھل کر بیٹھ گئے۔ تقی نے کن انکھیوں متین صاحب کی طرف دیکھا۔ ان کے چہرے پر ہمیشہ کی طرح سکون تھا۔ مگر لبوں پر ایک اجنبی اجنبی، ہلکی ہلکی مسکراہٹ تھی۔ اس مسکراہٹ نے اس کے مضطرب، سرد ہوتے ہوئے، جسم پر گرم گرم لبادہ ڈال دیا۔ اب وہ آنے والے کی طرف انہماک سے دیکھنے لگا۔ آنے والے نے بتایا کہ وہ سادات پور کا مالک اور درگاہ جلال شاہ کا سجادہ نشین زمان شاہ ولی ہے۔ شاہ نے کچھ دیر چپ رہنے کے بعد کہا کہ اب وہ کچھ دیر آرام کر لیں۔ منہ ہاتھ دھو کر کھا پی لیں تو وہ پھر کچھ باتیں کریں گے۔ اتنے میں ایک بوڑھے ملازم نے آ کر اطلاع کی کہ

مہمانوں کے لیے پانی وغیرہ کا بندوبست کر دیا گیا۔ شاہ نے مصافحہ کیا اور رخصت چاہی۔ شاہ کمرے سے اسی دروازے کی راہ واپس چلے گئے اور وہ ملازم کے ساتھ بائیں دیوار کے دروازے سے ایک نئے برآمدے میں جا نکلے۔ کچھ دیر چلنے کے بعد ملازم ایک دروازے پر رکا۔ دروازہ کھول کر الگ کھڑا ہو گیا۔ جس کمرے میں وہ اب داخل ہوئے وہ پہلے کمرے کی طرح سجا ہوا تھا۔ فرق یہ تھا کہ یہاں ایک طرف سونے کے لئے کاؤچ نما پلنگ تھے۔ کمرے کے وسط میں کچھ چھوٹی میزوں کے چاروں طرف دائرے میں آرام دہ کرسیاں رکھی تھیں۔ ایک کونے میں ریشمی پردے سے پارٹیشن سی بنی ہوئی تھی۔ مغربی دیوار میں ایک ڈاٹ میں ریشمی پردے لٹک رہے تھے۔ ملازم نے انہیں بتایا کہ ان ریشمی پردوں کے پیچھے غسل خانہ ہے۔ جہاں ان کے لیے ہاتھ منہ دھونے کا انتظام تھا۔ دونوں منہ ہاتھ دھو کر باہر آئے تو ریشمی پردوں والے پارٹیشن کے پردے ہٹا کر اس کے پیچھے ایک بڑی میز پر کھانا، تازہ اور خشک پھل لگے تھے۔ متین صاحب مستطیل میز کی چھوٹی طرف ایک کرسی پر بیٹھ گئے اور بہت سکون سے اپنی پلیٹ میں کھانا ڈال کر کھانے لگے۔ تقی حیران کھڑا ان کو تک رہا تھا۔ انہوں نے بغیر بولے اس کو ہاتھ کے اشارے سے بیٹھنے کے لئے کہا۔ وہ بھی ان کی پیروی میں کھانے لگا۔

کھانا کھا چکنے کے بعد ہاتھ دھو، متین صاحب ایک کرسی پر نیم دراز ہو گئے۔ اتنے میں ایک نوجوان ملازم ایک سنہرے منقش ڈبے میں ان کے لیے سگریٹ لے آیا۔ سگریٹ کا یہ برانڈ انہوں نے کہیں نہ دیکھا تھا۔ شاید شاہ صاحب اپنے لئے خاص قسم کا برانڈ بنواتے تھے۔ متین صاحب سگریٹ سلگا، آنکھیں بند کیے، ٹانگوں کو اپنی پوری لمبائی میں پھیلا، کرسی کے اندر گم ہو گئے۔ تقی کرسی پر بیٹھنے کی بجائے ایک پلنگ پر دراز ہو گیا۔ وہ سوچنے لگا کہ اس نے تمام بچپن اپنے گاؤں میں ہی گزارا تھا مگر اس کو اس طلسمی آبادی، اس حویلی، اس درگاہ کا کیوں پتہ نہ چلا اور اسے یہاں اگر آنا ہی تھا تو متین صاحب کے ساتھ کیوں؟ آخر اس میں کیا مصلحت ایزدی ہو سکتی ہے۔ اس سوال کا کوئی جواب نہ سوجھا تو اس نے سوچ کا کانٹا بدل دیا۔ فردوس کا خیال ایک بار پھر اس کو ستانے لگا۔

فردوس کے اور اس کے آباء واجداد میں بہت گہرے تعلقات تھے۔ ان کی ولی پور کی ایک اعلیٰ آبادی میں بہت بڑی کوٹھی تھی۔ جب وہ بی اے میں داخل ہونے کے لیے ولی پور گیا تو وہ فردوس کے ہاں جا کر ٹھہرا تھا۔ وہاں مہینوں رہنے کے بعد اس کی اور فردوس کی پہلی ملاقات ہوئی۔ اس دن فردوس کی سالگرہ کی پارٹی تھی۔ ایک ہنگامہ تھا۔ مہمانوں کے لیے کوٹھی پبلک پارک بنی ہوئی تھی۔ ان مہمانوں میں اس کے کالج کی بھی کئی سینئر لڑکیاں تھیں جن میں سے کچھ کو وہ جانتا تھا۔ وہ ان کو ساتھ لئے کوٹھی کے تمام کمرے دکھاتا پھرا۔ شام ہوئی تو مہمان ہال کمرے میں کھانے کے لیے جمع ہو گئے۔ ایک شور برپا تھا۔ سالگرہ کیک کے گرد سب لوگ نہایت خاموشی سے جمع ہو گئے۔ پھر کیک پر پیوست موم بتیوں کو نہایت خشوع و خضوع سے ایک ایک کر کے جلایا گیا۔ فردوس نے کیک پر جھک کر ایک ہی لمبے سانس سے ان سب کو بجھا دیا۔ کیک کاٹنے اور بانٹنے کی افراتفری میں وہ میز سے ہٹ کر باغ میں چلا گیا۔ ایک ہی گھر میں رہتے ہوئے دو انسان مہینوں نہ ملیں! اس خیال سے اسے اس شام پہلی بار تنہائی کا احساس ہوا۔ اس کا جی بہت چاہا کہ وہ صبح اٹھتے ہی والد کو لکھے کہ وہ نواب آغا کے ہاں سے ہوسٹل میں اٹھ آنا چاہتا ہے۔ مگر پھر اسے خیال آیا کہ وہ ایسا کرنے کی جرأت کیسے کر سکے گا۔ نواب آغا سے نظریں کیسے ملا سکے گا۔

اپنے خیالات سے وہ جاگا تو اسے احساس ہوا کہ کوئی اس کے سامنے والی مرمریں کرسی پر پاؤں رکھے، گھٹنے پر بانہیں ٹکائے اسے غور سے دیکھ رہا ہے۔ وہ گھبرا کر اٹھا۔ فردوس نے کرسی سے پاؤں اتار کر فرش پر رکھتے ہوئے کہا کہ ''آپ کیوں چلے آئے؟ کیا آپ کو میری سالگرہ کی خوشی نہ تھی؟ اگر نہ تھی تو اس کا اظہار کرنے میں کون سا خوبی کا پہلو تھا؟''

وہ کچھ دیر تک چپ رہا اور پھر کہنے لگا۔ ''حاشا! یہ بات نہ تھی۔ آپ کا شک بے بنیاد ہے۔ اس ہنگامے میں میرا دل اداس ہو گیا تھا لہٰذا یہاں چلا آیا۔ میری حرکت اگر آپ کو نہیں بھائی تو میں معافی چاہتا ہوں۔''

فضا میں ایک لے ابھری، قہقہے سے بھرپور ہوئی۔ فردوس کا دمکتا ہوا چہرہ ایک لمحے کے لیے روشن ہوا اور وہ ہنستے ہنستے کہنے لگی ''صاحب! آپ تو بہت جلدی ڈر گئے۔ میں نے تو

محض بات کرنے کی خاطر بات کی تھی۔ میں جانتی ہوں کہ بہت سے لوگوں میں آپ کا دل گھبراتا ہے۔ آپ کے کالج کی لڑکیاں بھی آپ کی تنہائی پسندی کی شکایت کر رہی تھیں کہ مہذب، باوضع، خوش مذاق ہونے کے باوجود تمہارے تقی میاں نے اپنے گرد گھنیرے بادلوں کا ایک ہالہ بنا رکھا ہے۔ بات کرتے ہوئے یہ احساس ہوتا ہے کہ جیسے ان تک بات ہی نہیں پہنچی، اور جب جواب دیتے ہیں تو لگتا ہے کہ بات سنے بغیر گھڑا گھڑایا جواب دے دیا ہے حالانکہ بات کا صحیح جواب دیتے ہیں۔ ضرور کسی کے عشق میں مبتلا ہیں۔ تقی صاحب! کیا یہ صحیح ہے؟'' اس نے ایک لمبا سانس لیتے ہوئے جواب دیا ''صاحب! عشق کیا ہے؟ یہ تو میں نہیں جانتا مجھے تو کسی لڑکی سے دلچسپی بھی نہیں ہے۔''

''یہ تو اس سے بھی تشویشناک بات ہے۔'' فردوس نے بات کاٹتے ہوئے کہا۔

''اس میں آخر تشویش کی کیا بات ہے۔ لوگوں سے بات کرتے ہوئے یہ احساس ہوتا ہے کہ ان میں اور مجھ میں زمان ومکان کی بہت سی دوریاں حائل ہیں۔ جن جذبات کو وہ اہم سمجھتے ہیں وہ اپنے لئے کبھی مسئلہ ہی نہیں بنے اور جو میں سوچتا ہوں، چاہتا ہوں، اس کا ان کو کبھی احساس نہیں ہوا۔ اس بعد کے احساس کے باوصف اور باوجود اپنے گردوپیش کے لوگوں سے کیسے گھل مل سکتا ہوں۔''

''آیئے! اندر چلیں، سردی ہو رہی ہے۔ بہت تھک گئی ہوں۔ باتیں کرنے کو جی چاہ رہا ہے۔ ایک گھر میں رہنے کے باوجود ہم اجنبی ہیں اور اجنبیوں سے ملاقات میں، سنتے ہیں، کافی لطف ہوتا ہے۔ وہ فردوس کے ساتھ اندر اٹھ آیا۔ کسی عورت کے کمرے میں داخل ہونے کا اس کے لیے یہ پہلا موقع تھا۔ دیواروں پر لگے ہوئے سبز بلوریں پیالوں، آتشدان کی آگ کی روشنی میں دمکتی ہوئی نئے یورپی مصوروں کی چند تجریدی تصویریں، صورت گروں کے مجسمے، فرنچ ونڈو کے پاس پڑا ہوا گرانڈ پیانو، دروازوں، کھڑکیوں کے آگے لٹکے ہوئے دبیز، سرخ، ریشمی پردے، سبز ریشمی کپڑے میں منڈھا ہوا فرنیچر اس کی سادگی اور نفاست کا دھیمے سروں میں اعلان کر رہا تھا۔

وہ آتش دان کے پاس کمر والے دیوان پر چپ چاپ ساکت بیٹھ گیا۔ فردوس نے

ریشمی پردوں میں چھپی ہوئی ایک الماری سے سگریٹ کا ڈبہ نکال کر اس کے سامنے کی میز پر رکھ دیا۔ اس نے فردوس کو تکتے ہوئے سگریٹ سلگایا بائیں ٹانگ دائیں ٹانگ پر رکھ کر دراز ہوگیا۔ کچھ دیر دونوں چپ چاپ بیٹھے رہے۔ پھر فردوس نے پوچھا کہ اسے مغربی موسیقی سے کوئی دلچسپی ہے۔ اس نے جواب دیا کہ وہ نہایت خاموشی سے سن سکتا ہے اگر چہ لطف اندوز ہونے کا اس کو دعویٰ نہیں۔ فردوس اٹھی اور پیانو کی سفید اور سیاہ طربوں سے پٹ اٹھا ایک چوکھٹ کے سہارے کھڑا کر دیا۔ پھر اس نے طربوں کو کھڑے کھڑے پیار، پھسلتی ہوئی تیزی کے ساتھ انگلیوں سے سہلایا۔ ایک نغمہ، ایک لے، خاموشی کے سینے سے ابھری اور فضا میں جذب ہوگئی۔ کچھ دیر فردوس یونہی کھڑی کھڑی سوچتی رہی، طربوں کو سہلاتی رہی۔ پھر دھیرے سے، اعتماد سے، بغیر کمر کے گدے دار سٹول پر بیٹھ گئی۔ ایک لمحہ کے لیے فضا میں اس کے ہاتھ بلند ہوئے اور کھڑکی سے چھنتی ہوئی چاندنی اس کے ہاتھوں پر لرزی، اس کے ہاتھ گرے اور گرتے ہی طربوں پر اس کی انگلیاں آہستہ آہستہ، تیز تیز، نرمی سے، رک رک کر چلنے لگیں۔ فردوس کے شانے پر سوئے ہوئے بال جاگے، اس کے سر اور گردن کی جنبش کا ساتھ دینے لگے۔ اب چاندنی اس کی بانہوں، اس کے سر کے دائیں حصے کے بالوں اور شانوں کے ساتھ آنکھ مچولی کھیلنے لگی۔ اس کے ہاتھ تاریکی میں تھے، طربیں تاریکی میں تھیں، تاریکی سے اٹھتا ہوا نغمہ بلندیوں کی طرف اٹھ رہا تھا۔ نغمہ عروج پر پہنچ کر اس کے دل اور دماغ میں اس سرعت سے داخل ہوتا کہ اس کا دم گھٹنے لگتا اور وہ تلملا کر چیخنا چاہتا تھا مگر اس کی آواز، اس کی قوت ارادی بھی نغمے میں جذب ہو چکی تھی۔ وہ بے بس، بے سدھ پڑا نغمے کی لہروں پر پہلو بدلتا رہا، بدلتا رہا۔ چاندنی پیانو اور فردوس سے ہٹ کر تمام کمرے میں پھیل رہی تھی۔ آتش دان میں آگ ٹھنڈی ہو چکی تھی اور کمرے میں آہستہ آہستہ سردی پھیل رہی تھی۔ ایک دم نغمہ ٹھٹکا، تیز ہوا، رکا، اور فضا میں جذب ہوگیا۔ نغمہ، پیانو اور فردوس تاریکی میں لپٹے ہوئے کہیں عالمِ غیب میں بے سدھ پڑے، سسک رہے تھے۔

اس کے حواس اس کے جسم میں چٹخنے لگے۔ اس نے اپنی پھیلی ہوئی ٹانگوں کو اکٹھا کیا، ٹانگوں پر زور دے کر وہ کرسی میں اکڑوں بیٹھ گیا اور لمبے لمبے سانس لینے لگا۔ نغمے کی دنیا

سے اپنے شعور کی دنیا میں دوبارہ جنم لینے میں اسے بہت تکلیف ہو رہی تھی۔ اس تکلیف کی شدت سے اس کی آنکھیں دھندلا گئی تھیں، اس کا گلا رندھ گیا تھا۔ وہ فردوس سے رخصت کی اجازت لینا چاہتا تھا، مگر آواز اس کے سینے میں کہیں گم ہو گئی تھی۔ اسی کشمکش میں اس نے نظریں اٹھائیں کہ دیکھے کہ فردوس کہاں ہے۔ اس نے دیکھا کہ فردوس اس کے سامنے والے کاؤچ کی گہری کرسی میں دھنسی بیٹھی تھی۔ وہ ایک دم اٹھی، اس کے قریب آئی، اس کی ٹھوڑی پر انگلی رکھ کر اس کے چہرے کو اپنی طرف اٹھا، ہمدرد، پیار بھرے لہجے میں کہنے لگی۔

''آنکھوں میں آنسو! کیوں؟ میں نے تمہیں مارا تو نہیں۔ میں نے تو تمہاری تنہائی کے احساس کو کم کرنے، تمہیں بہلانے کے لیے یہ سب سوانگ رچایا تھا۔ مجھے معلوم نہ تھا کہ تم اتنے حساس ہو کہ نغمے سے بھی تمہارے دل کو ٹھیس لگ سکتی ہے۔ اس کے لیے میں معافی چاہتی ہوں۔''

اس نے رندھی ہوئی آواز میں، آہستہ آہستہ، رک رک کر جواب دیا۔ ''ان آنسوؤں سے، اس رندھی آواز سے، تمہیں غلط اندازہ نہیں کرنا چاہیے۔ میں اتنا نرم و نازک نہیں ہوں کہ نغمے سے کملا جاؤں۔ میں زمینداروں کی اولاد ہوں۔ میں نے زمین اور آسمان اور تاروں کے مجبور دکھ کو بہت قریب سے دیکھا ہے۔ مجھے منہ زور گھوڑوں پر قابو پانے میں فرحت ملتی ہے۔ نغمہ ایک ساتھی ہو سکتا ہے اس کا مجھے کبھی خیال بھی نہ آیا تھا۔ نغمہ، نغمے کا خالق، نغمے کو فضا میں جنم دینے والا، نغمے کے جہاں میں زندہ ہو جانے والی مخلوق کے قرب کے احساس سے میرے دل و دماغ میں مسرت کے ایک سیلاب نے جنم لیا اور اس جنم سے میرے جسم میں سخت درد ہوا جس سے میرے آنسو نکل آئے، میری آواز رندھ گئی۔

اس کی آواز کمرے کی فضا میں جذب ہو گئی۔ اس کے تنفس کی لے فردوس کے تنفس کی لے میں گھلنے ملنے لگی۔ اس احساس سے اسے حیا آنے لگی اور اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ اس نے فردوس سے رخصت چاہی۔ فردوس نے بیٹھے بیٹھے ہی اپنا ہاتھ بڑھا دیا۔ اس نے اپنا دایاں ہاتھ اس کے ہاتھ میں دیا تو فردوس نے اپنا دوسرا ہاتھ اس کے ہاتھ پر رکھ دیا اور کہنے لگی ''جب بھی اداس ہو جاؤ تو میرے پاس چلے آیا کرو۔ وعدہ کرو کہ تم ہچکچاؤ گے نہیں اور......

مجھے اجازت دو کہ جب بھی میں چاہوں تمہاری تنہائی میں مخل ہوسکوں......وعدہ ہوا نا؟''

تقی نے سر سینے کی طرف جھکا کر اشارے سے اثبات میں جواب دیا۔اس نے کوشش کی کہ فردوس کے ہاتھوں سے اپنا ہاتھ نکال لے مگر فردوس اس کا ہاتھ چھوڑے بغیر کہنے لگی ''آؤ تمہیں تمہارے کمرے تک چھوڑ آؤں، بیٹھے بیٹھے تھک گئی ہوں، ٹانگوں میں سکت کا احساس نہیں، تمہارے کمرے تک جاتے سکت لوٹ آئے گی۔ پھر تم پر پیار بھی تو آرہا ہے۔ تمہیں پتہ ہے کہ تم مجھ سے پورے چالیس دن چھوٹے ہو۔ جی تو چاہتا ہے کہ تمہیں گود میں اٹھا کر لے جاؤں مگر تمہیں اٹھا نہ سکوں گی۔ اٹھا سکتی تو تمہیں پلنگ پر لٹا کر، تھپک تھپک کر، لوری دے کر سلاتی......بہرحال تمہیں چھوڑ آنا تو ممکن ہے۔''

کمرے سے باہر نکلتے ہی اس نے کہا''آج میرے ساتھ نہ جائیں۔ مجھے شرم سی آرہی ہے۔ چالیس دن بڑے ہونے کا آپ ناجائز فائدہ اٹھا رہی ہیں۔ میں بچہ تو نہیں ہوں کہ آپ مجھے میرے کمرے تک چھوڑنے جائیں۔آج میں خود ہی اپنے کمرے تک جانا چاہتا ہوں۔اس ننھی سی خواہش کو پورا کرنے میں آپ میری مدد کریں۔''

اس کے بعد فردوس کبھی کبھی اسے اپنے کمرے میں بلا لیا کرتی تھی، اس کے کمرے میں وقت بے وقت چلی آیا کرتی۔ بلاتی بھی تب، آتی تھی جب، وہ خاموش اپنا کام کرتی رہتی اور جب تقی انتظار کرتے کرتے تھک جاتا تھا کہ اب کوئی بات کرے گی تو وہ نہایت سکون بھری آواز میں اسے بتایا کرتی کہ اس سے ملنے میں، اس کے پاس بیٹھنے سے اس کے تمام جسم کو ایک فرحت، ایک آرام ملتا ہے، جو اس کی روزمرہ کی مصروف زندگی کے بعد نہایت ضروری تھا۔اس کو بہت غصہ آتا تھا کہ کیا وہ آرام کرسی ہے۔ بستر ہے، پلنگ ہے؟ مگر اس خیال سے کہ اگر اس سے اپنے احساسات کا ذکر کردیا اور اس نے آنا، ملنا بند کردیا تو وہ بالکل تنہا رہ جائے گا۔ وہ اپنے اس غصے کو دبائے رکھتا۔اس قُرب سے اس میں آہستہ آہستہ فردوس کے متعلق ایسے احساسات جاگنے لگے جن سے اسے ڈر لگنے لگا اور وہ ان کو چھپانے کے لیے کوشاں رہنے لگا۔مگر احساسات تھے کہ سمجھانے سے اور مچلتے تھے شور کرتے تھے، وہ اس کشمکش سے گھبرانے لگا۔فرار چاہنے لگا۔

اس کشمکش کے دوران میں متین صاحب سے اس کی پہلی ملاقات ہوئی۔ وہ متین صاحب کے متعلق بہت سی باتیں سن چکا تھا۔ کالج میں، شہر کی معاشرتی زندگی میں، متین صاحب نہ صرف مشہور تھے بلکہ عزت اور پیار کی نگاہوں سے دیکھے جاتے تھے۔ وہ تھے تو فلسفہ جیسے خشک مضمون کے پروفیسر مگر اس نے لوگوں، طالب علموں، سے ان کی خوش مذاقی، مزاح اور حکمت کی بڑی داستانیں سن رکھی تھیں۔ اس نے کبھی نہ سوچا تھا کہ کبھی وہ بھی متین صاحب کی محفل میں جا سکے گا۔

ایک دن وہ کالج لائبریری میں بیٹھا پڑھ رہا تھا کہ کسی نے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر کہا کہ آپ کا ہی نام تقی ہے؟ آپ کے حسن، بے رُخی، ذہانت اور شرافت کا بہت شہرہ ہے میرا نام متین ہے۔ میں اس کالج میں فلسفہ کا پروفیسر ہوں۔ آج میرے ساتھ چائے پیجئے۔ اب آپ کیا کر رہے ہیں؟ کوئی ضروری کام ہے، نہ ہو تو ابھی میرے ساتھ چلئے۔''

متین صاحب کی آواز میں، جسم کے سکون میں، کچھ ایسی قوتیں تھی کہ اس کو انکار کی ہمت ہی نہ ہوئی اور وہ ان کے ساتھ چل دیا۔ اس دن کے بعد اس کا اکثر فرصت کا وقت متین صاحب کے کمرے میں، ان کی لائبریری میں کٹنے لگا۔ ان کو ہر بات میں دلچسپی تھی۔ ان کے کمرے میں ہر قسم کا آدمی آتا: حسین لڑکے، ذہین لڑکے، بدصورت مگر ذہین لڑکیاں، خوبصورت، خوش مذاق، طرحدار لڑکیاں۔ متین صاحب جب ان سے باتیں کرتے تھے تو معلوم ہوتا کہ وہ اپنے سامعین میں کھوئے ہوئے ان کے دل و دماغ کے تمام کے تمام کونے کھدروں میں چھپی حسین صلاحیتوں کو باہر نکال نکال کر دکھانے میں مشغول ہیں۔ غور سے دیکھنے سے یہ احساس ہوتا تھا کہ یہ کام ان کے لیے بہت ہی آسان تھا جسے وہ بے دھیانی میں بھی خوش اسلوبی سے کر سکتے تھے۔

آہستہ آہستہ وقت کٹتا رہا اور اسے تنہائی کا احساس بہت کم ہونے لگا۔ ان کے سایے میں فردوس کا خیال اس کے دل و دماغ میں سو گیا۔ وہ اب بھی کبھی کبھار فردوس سے ملتا تھا۔ ان ملاقاتوں میں سکون ہوتا، امن ہوتا، آرام ہوتا۔ اسے ایسا لگنے لگا کہ اس کو سب کچھ میسر ہے۔ اسے کسی چیز کی ضرورت نہ تھی۔

کچھ عرصے کے بعد فردوس نے اسے بلانا،اس کے کمرے میں آنا چھوڑ دیا۔اس نے اپنی معاشرتی مصروفیتوں کو اتنا بڑھالیا تھا کہ اب اس کی زندگی کا بیشتر حصہ ریل گاڑیوں میں گزرتا۔آج اس کانفرنس میں جانا ہے تو کل اس کانگرس میں۔کبھی کبھار اس کے متعلق کوئی بات،کوئی سکینڈل سننے میں آجاتا۔نوجوان اس کے حُسن،اس کی ذہانت،اس کے اعتماد کا شکار ہونے لگ گئے۔

اس عرصہ میں اس کے والد نے زمینداری کے ساتھ ساتھ کاروبار بھی شروع کردیا اور اس کام میں اپنی مدد کے لیے اس کو واپس بلا لیا۔اس نے آخری امتحان دیدیا تھا اب صرف نتیجے کا انتظار تھا۔اس نے متین صاحب سے مشورہ کیا اور اپنے والد کا حکم بجالایا۔کاروبار کے ہنگاموں،مصروفیتوں میں اس کو اتنا وقت نہ ملتا تھا کہ وہ فردوس کی زندگی کے وسیع دائرے کو کبھی کہیں سے چھو سکے۔

تقی اس طویل سفرِ درون سے اب تھک چکا تھا۔اس نے تکیے سے سر اٹھا کر متین صاحب کی طرف دیکھا۔وہ آرام کرسی پر اسی طرح دراز تھے۔میز پر راکھ دان میں جلے سگریٹوں کا ڈھیر نہ دیکھ کر اسے حیرانی سی ہوئی۔اس طول طویل عرصے میں انہوں نے صرف تین سگریٹ پیئے تھے۔کیا وہ بھی اس کی طرح کسی سفرِ درون پر نکل گئے تھے۔وہ پلنگ سے اٹھا اور پاؤں لٹکا کر وہیں بیٹھا متین صاحب کے متوجہ ہونے کا انتظار کرنے لگا۔مگر متین صاحب تھے کہ متوجہ ہی نہ ہوتے تھے۔وہ سوچ ہی رہا تھا کہ وہ متین صاحب سے پوچھے کہ اب کیا ارادے ہیں کہ بوڑھے ملازم نے کمرے میں داخل ہو کر نہایت ادب سے انہیں بتایا کہ سرکار نے انہیں یاد کیا ہے۔تقی نے اطمینان کا سانس لیا اور اٹھا اور غسل خانے میں جا کر منہ پر پانی کے چھینٹے مارے۔بالوں کو پانی لگایا۔جیب سے کنگھی نکال کر بال درست کئے۔جب باہر آیا تو متین صاحب تیار کھڑے تھے۔کہنے لگے ''چلو۔''

چھٹا باب

''تقی صاحب آپ ادھر قریب آ جائیے اور ڈاکٹر صاحب! آپ ادھر میرے کاؤچ پر میرے پاس بیٹھئے۔''

تقی 'ڈاکٹر صاحب' پر چونکا اور اس نے مڑ کر دروازے کی طرف دیکھا۔ شاہ صاحب نے مسکراتے ہوئے کہا ''میرا خطاب آپ کے دوست سے تھا۔''

''مجھ سے'' متین صاحب کہنے لگے۔ ''میں تو فلسفہ کا استاد ہوں۔''

''ہوسکتا ہے۔ مگر میری آنکھیں دھوکا نہیں کھا سکتیں۔ جن نپے تلے قدموں سے، جس پرسکون، پراعتماد جلدی سے آپ گلی سے کمرے میں داخل ہوئے، جس انداز سے آپ کی بانہیں، ہاتھ اور انگلیاں آپ کے جسم سے الگ تھلگ نظر آ رہی تھیں اور کرسی پر بیٹھنے سے پہلے آپ کے ہاتھ فضا میں پھڑ پھڑائے تھے اس طرح صرف ایک تجربہ کار ڈاکٹر اور سرجن ہی چل سکتا ہے، اسی کے ہاتھ اور بانہیں قوت اور اعتماد کا مظہر ہوسکتی ہیں اور جس طرح آپ کے ہاتھ فضا میں پھڑ پھڑائے تھے وہ تو ایسے تھا جیسے ایک سرجن کامیاب آپریشن کے بعد آخری اوزار اپنے مددگار ڈاکٹر یا نرس کے سپرد کر رہا ہو۔ شاہ صاحب نے ایک ایک لفظ کو اس طرح ادا کیا کہ تقی کے دل میں شک کی گنجائش ہی نہ رہی تھی۔ وہ متین صاحب کی طرف حیرانی اور جواب طلب نگاہوں سے مسلسل تکے جا رہا تھا جیسے کہہ رہا ہو کہ اس سے بات چھپا کر متین صاحب نے اس پر مسلسل بے اعتمادی کا اظہار کیا ہو۔

متین صاحب کچھ دیر تو نظریں جھکائے، چپ رہے اور پھر بولنے لگے۔ ان کی آواز بدلی ہوئی تھی اور اتنی آہستہ اور مدھم کہ سننے کی تمام قوتوں کو اکٹھا کرنا پڑتا تھا۔ وہ کہہ رہے تھے:

''میں واقعی پہلے ڈاکٹر اور سرجن تھا۔ میں لندن میں ایسٹ اینڈ میں پریکٹس کرتا تھا۔ میں ایک کامیاب سرجن اور ہر دل عزیز ڈاکٹر تھا۔ ایک دن بہت رات گئے میں کلینک بند کر رہا تھا کہ میرا ایک جاننے والا رابرٹ زخمی حالت میں میرے پاس آیا اور اسے فوری امداد کی ضرورت تھی۔ میں نے باہر ہال کمرے میں اسے دیکھا۔ اس کی حالت مخدوش تھی۔ فوراً آپریشن سے وہ بچ سکتا تھا۔ میں نے اپنے اسسٹنٹ کو پانی گرم کرنے کے لیے کہا اور خود

آپریشن کی تیاری کرنے لگ گیا۔

آپریشن میں پورا ایک گھنٹہ خرچ ہو گیا مگر مجروح کی جان بچ گئی۔ اس رات میں سو نہ سکا۔ میں نہ جانے کیوں تذبذب کے عالم میں تھا۔ جیسے میں نے ان جانے میں کوئی گناہ کیا ہو۔ رابرٹ کو میں بوجوہ پسند نہ کرتا تھا۔ اس کا ذریعہ معاش پسندیدہ نہ تھا۔ اگرچہ اس کا میری ایک عزیز دوست مریم سے میل جول تھا۔

مریم قریب ہی کے ایک ریستوران میں ملازم تھی۔ اس علاقہ کے تمام بچے اسے بہت پسند کرتے تھے۔ ریستوران کے گاہکوں میں وہ عزیز تھی۔ وہ شکل وصورت کی اچھی تھی۔ وہ مجھ سے خاص شفقت سے پیش آتی تھی کیونکہ بقول اس کے میں جوان تھا۔ کامیاب ڈاکٹر تھا مگر پھر بھی ایسٹ اینڈ میں پریکٹس کرتا تھا اور غریب دوست تھا۔ وہ ایک دو دفعہ میرے ساتھ تھیٹر بھی گئی تھی۔ میں اس کی شرافت کا معترف تھا۔

کچھ عرصہ بعد مجھے مریم کی موت کی خبر ملی۔ اس رات کے واقعہ اور مریم کی موت کو میرے ذہن نے ایک ہی لڑی میں پرو دیا لازم وملزوم، سبب اور اثر کی حیثیت سے۔ میں کسی طرح بھی اپنے آپ کو قائل نہ کر سکا کہ ان دو واقعات کا آپس میں کوئی رشتہ نہیں۔

مریم کی موت کے چند ماہ بعد میری رابرٹ سے ملاقات ہوئی تو اس نے مجھے مریم سے اس آخری ملاقات کا احوال سنایا جس میں اس نے مریم کے دل ودماغ میں ایسی کیفیت پیدا کر دی تھی کہ وہ مرنے کے سوا کچھ نہ کر سکتی تھی۔

رابرٹ کی بات نے میری سوچ کی ہر سطح پر ایک کہرام مچا دیا اور مجھے ہر لمحہ یہ احساس ستانے لگا کہ مریم کی موت میں میں بھی شریک تھا۔ اُس دن اگر میں پولیس میں رپورٹ کر دیتا تو شاید مریم بچ جاتی اور اگر اس کا زخم نہ سیتا تو وہ یوں اور اس طرح نہ مرتی۔ اس احساس کو میں اپنے ذہن سے، دل سے نکال نہ سکا۔

میں نے پریکٹس بند کر دی اور ارادہ کیا کہ اب ڈاکٹری کو ہمیشہ کے لیے خیر باد کہہ دوں۔ انگلینڈ سے سوئٹزرلینڈ چلا گیا۔ وہاں سے میں نے فلسفہ کی ڈاکٹریٹ حاصل کی اور واپس اپنے دیس لوٹ آیا۔ میں پچھلے دس سال سے فلسفہ پڑھاتا ہوں۔ میں اس کام میں

خوش ہوں۔ مجھے اب کبھی مریم کی موت کا خیال نہیں ستاتا۔ معاشرے میں میری عزت ہے۔شاگرد، دوست، جاننے والے مجھ سے پیار کرتے ہیں۔''

''مگر دل اور تخیل کی وسعتوں میں خاموشی ہی خاموشی، تنہائی ہی تنہائی۔ لوگ وہاں آتے ہیں، یادیں چھوڑ جاتے ہیں مگر یہ صورتیں، یہ یادیں، اتنے پھیلے ہوئے تخیل کو کیسے بھر سکتی ہیں۔ اور بھر نہ سکیں تو ویرانی اور تنہائی اور خاموشی کے احساس کے سوا ہو کیا سکتا ہے'' شاہ صاحب نے محاکمہ کرتے ہوئے فرمایا۔

متین صاحب اب پھر کہیں کھو چکے تھے۔ آج اور صرف آج تقی نے متین صاحب کو پریشان ہوتے دیکھا تھا۔ ان کے ماتھے پر پہلی بار شکنیں ابھر آئی تھیں۔ وہ ڈرنے لگا کہ شاید آج کوئی بہت بڑا راز کھلنے لگا ہے، کوئی بہت بڑا واقعہ پیش آنے والا ہے۔

شاہ صاحب کچھ دیر تو چپ رہے اور پھر فرمانے لگے'' کیا آپ نے غور کیا کہ آپ کے اس فیصلے سے کتنے لوگوں کو آپ نے راحت و آرام سے محروم کیا، کتنے آدمیوں کے دکھ اور درد میں اضافہ کیا، کتنے آدمی محض اس وجہ سے گمراہ ہو گئے کہ آپ نے اپنی زندگی کا دھارا اور طرف موڑ دیا تھا۔ کتنے گھروں، خاندانوں کے چراغ محض آپ کی شخصیت کی غیر حاضری سے جل نہ سکے۔ کتنی جانیں تھیں جو آپ ہی بچا سکتے تھے۔ تمام انسان رشتوں کے نظام میں اس طرح جکڑے ہیں کہ اگر رشتے کی ایک مرکی بھی اپنے مقام سے ہٹ جائے تو نہ صرف اس مقام پر جہاں اسے ہونا چاہیے تھا نظام درہم برہم ہو جاتا ہے بلکہ اس مقام پر بھی جہاں اسے نہیں ہونا چاہیے۔ خود اپنے آپ پر آپ نے ظلم کیا۔ ہوسکتا ہے کہ آپ کو وہ سب کچھ جس کی آپ کو تلاش ہے اس راہِ حیات پر سفر کرتے ملتا جو آپ چھوڑ آئے ہیں۔ وہی راہ سچی راہ ہو۔ آپ کو چاہئے کہ آپ اپنے فیصلے پر نظر ثانی کریں۔ جو کام آپ فلسفہ کے استاد کی حیثیت سے سرانجام دیتے ہیں وہ کام آپ ڈاکٹر کی حیثیت سے یقیناً بہتر طور پر کر سکتے ہیں۔ جب ایک شخص مریض کی حیثیت سے آپ کے پاس آتا ہے تو وہ حیات کے دھارے سے الگ ہو کر آتا ہے۔ وہ سننے اور قبول کرنے کے لیے زیادہ تیار ہوتا ہے کیونکہ وہ ہر حالت میں اچھا ہو کر ایک بار پھر حیات کے دھارے کے ساتھ ساتھ چلنا

چاہتا ہے۔ ڈاکٹر اگر فلسفی بھی ہو تو انسان کے نظامِ بدن اور نظامِ روح کے رشتوں کو آسانی سے دیکھ سکتا ہے اور ان باہمی رشتوں کے الجھاؤ اور سقم کو بہتر طور پر دور کر سکتا ہے......

اس لیے آپ کو جلد از جلد اس راہ پر لوٹ جانا چاہیے جس سے آپ اتنے عرصے سے ہٹے ہوئے ہیں۔''

شاہ صاحب یہ کہہ کر خاموش ہو گئے۔ انہوں نے اپنا سر سینے کی طرف جھکا لیا۔ اب کمرے میں خاموشی ہی خاموشی تھی۔ سورج کی آخری کرنیں کھڑکیوں میں سے داخل ہو رہی تھیں۔ کرنیں کمرے میں اب اتنی دور بڑھ آئی تھیں کہ متین صاحب کے تمام جسم پر انہوں نے ایک نور کی زرہ بُن دی تھی۔ اس روشنی کی چمک اور نرم نرم حدت سے متین صاحب کے بے سدھ جسم نے ایک پھریری لی اور انہوں نے اپنی رانوں پر پڑے ہوئے ہاتھوں کو اٹھا کر کاؤچ کے بازو اور کمر پر رکھ دیا اور ان کے چہرے سے یہ ظاہر ہو رہا تھا کہ وہ کچھ کہنے کا ارادہ کر رہے ہیں۔ ارادہ کرنے کی کشمکش کچھ دیر جاری رہی اور پھر اس کشمکش نے فیصلے کی صورت اختیار کی اور اس کی بعد گویائی کی۔

متین صاحب کہنے لگے ''شاہ صاحب کیا یہ ممکن ہو سکے گا کہ کوئی مجھے درگاہ تک لے جائے؟''

''ہاں! آخر کیوں نہیں؟ کب؟ ابھی؟''

''نہیں! ابھی نہیں۔ چاند نکل آئے تو''

''بہت اچھا اس کا ابھی انتظام ہو جاتا ہے......تقی صاحب یہ بہتر ہوگا اگر متین صاحب اکیلے جائیں۔ کیوں کیا خیال ہے متین صاحب!''

''یوں ہی بہتر ہوگا۔''

شاہ صاحب نے آہستہ سے تالی بجائی۔ بوڑھا ملازم حاضر ہوا۔ شاہ صاحب نے ہادی ولی کو بلانے کو کہا۔ کچھ دیر کے بعد ہادی ولی آ گیا اور آ کر شاہ کے حضور سینے پر ہاتھ باندھ کر کھڑا ہو گیا۔ شاہ صاحب بولے ''متین صاحب چاند نکلنے کے بعد درگاہ پر حاضر ہونا

چاہتے ہیں۔ چاند خان سے کہو کہ وہ گھوڑوں کا بندوبست کرے اور خود بھی تیار ہو جائے۔''

اتنا کہتے ہی شاہ صاحب اٹھے اور رخصت چاہی اور تقی سے فرمایا کہ وہ اس رات انہی کا مہمان رہے۔ دونوں سے رخصت ہو کر وہ ہادی ولی کے ساتھ اپنے کمرے میں واپس چلے گئے۔

ساتواں باب

سیادت منزل کے کنگورے تک چاند چڑھ آیا تھا۔ ہادی ولی نے متین صاحب کو ان کے کمرے سے لیا اور گھوڑوں پر سوار ہو کر خانۂ سیادت سے گلی کی طرف بڑھے۔ چاندنی گلی کے مکانوں سے، چھتوں سے، اتر کر گلی میں اندھیرے کو سائے میں بدلنے میں کوشاں تھی۔ رات کی خاموشی میں پتھریلے فرش پر گھوڑے خود اپنے سموں کے آہنگ سے بدک رہے تھے۔ گردنیں موڑ موڑ کر پیچھے کی طرف دیکھنے کی کوشش کرنے لگے تھے۔ سوار گھوڑوں کی گردنوں پر تھپکیاں دیتے ہوئے ان کو بے جھجک آگے کی طرف بڑھنے کے لیے اکسا رہے تھے۔ اب وہ پتھریلے فرش کو پیچھے چھوڑ کر کھلے میدان میں چاندنی پر سایوں کے نقش بناتے مٹاتے ہوئے تیز تیز بڑھ رہے تھے۔ دونوں خاموش تھے۔ دونوں کی نظریں دور گنبدِ درگاہ کے چمکتے ہوئے کلس پر تھیں۔ دونوں الگ الگ ارادوں سے درگاہ کی طرف بڑھ رہے تھے۔

ہادی ولی اس سے پہلے کبھی اس طرح رات کے سناٹے میں اپنے جدِّ امجد کے حضور حاضر نہ ہوا تھا۔ اس کے لیے یہ سفر عجب کیف کا سفر تھا کہ آج وہ اپنے بزرگِ بزرگان کے حضور بغیر کسی کی شفاعت سے حاضر ہونے کے لیے بڑھ رہا تھا اور اسے یقین تھا کہ آج وہ جو کچھ بھی مانگے گا اس کا رب اسے دیگا۔ اور وہ سوچ رہا تھا کہ وہ کیا مانگے۔ آخر بہت کشمکش کے بعد اس نے فیصلہ کر لیا کہ وہ اپنے رب سے کہے گا کہ جو کچھ بھی اس کے لیے بہتر ہے وہ اسے مل جائے۔

متین صاحب آج پورے دس سال کے بعد ایک بار پھر تذبذب سے ہمکنار ہو رہے

تھے۔ ان کو حیرانی ہو رہی تھی کہ کیسے انہیں اپنے گناہوں کا اتنے بڑے عرصے تک احساس نہ ہوسکا اور وہ حیران ہو رہے تھے کہ اگر وہ تقی کے ساتھ شکار پر نہ آتے تو وہ نہ جانے ابھی کتنا عرصہ اور گناہ میں گم اور اس گمراہی میں مطمئن رہتے۔ وہ سوچتے تھے کہ اپنے رب سے وہ کیا کہیں اور کیا ان کا رب ان کے تمام گناہوں کو جو انہوں نے انجانے میں نجانے کتنے لوگوں سے کئے تھے اور ان گناہوں کو جو انہوں نے خود اپنی اصلح صلاحیتوں کے خلاف کئے معاف کر دیگا اور اگر ایسا ہو تو کیا ان کو اتنی بڑی نعمت کو قبول کرنے کا حق ہے اور اگر حق نہیں ہے تو کیا ان کو حق پہنچتا ہے کہ وہ اس ملنے والی نعمت کو قبول کرنے سے انکار کر دیں۔ اور کیا وہ لوگ جن کے خلاف انہوں نے گناہ کئے ہیں ان کو معاف کر دیں گے۔ اگر وہ یہ جان لیں کہ انہوں نے ان لوگوں کو کتنی نعمتوں سے جو ان لوگوں کو صرف انہی کے واسطے سے ملنی تھیں محروم کیا اور ان سب سوچوں سے بڑی سوچ اور سب سے بڑا دکھ تو انہیں یہ ہو رہا تھا کہ اپنے ننھے سے دکھ سے بچنے کے لیے انہوں نے خود اپنے لیے وہ دکھ خریدا جو انہیں باقی تمام عمر اس احساس سے ہوگا کہ وہ دس سال گناہ کی زندگی پر مطمئن رہے۔

متین صاحب کو چاندنی میں سے ایک دم سائے میں آ جانے کے احساس نے چونکایا۔ وہ اب درگاہ کی دیوار کے سائے میں آ چکے تھے۔ ہادی ولی گھوڑے سے اتر چکا تھا اور گھوڑے کی لگام تھامے دھیرے دھیرے درگاہ کے دروازے کے طرف بڑھ رہا تھا۔ کچھ لوگ دروازے میں سے نکل رہے تھے۔ شاید ملازم تھے جو ان کے گھوڑوں کے سموں کی آوازوں کو سن کر باہر نکل آئے تھے۔ ان لوگوں نے آگے بڑھ ہادی ولی کے گھوڑے کی لگام پکڑ لی اور اس کے قدموں کی طرف جھک گئے۔

متین صاحب بھی گھوڑے سے اتر پڑے اور ہادی ولی کی پیروی میں اس کی طرف بڑھنے لگے۔ گھوڑے کی باگیں ملازموں کے سپرد کر کے، جوتے اتار، ننگے پاؤں درگاہ میں داخل ہوئے۔ درگاہ کے چوکور، مرمریں صحن کے عین بیچوں بیچ ایک گنبد والی عمارت بلند ہو رہی تھی۔ عمارت کی دیوار کے گرداگرد ایک دیوار حصار کی صورت میں کھینچی ہوئی ہے۔ وہ احترام سے آہستہ آہستہ گنبد والی عمارت کی طرف بڑھے۔ اب وہ عین گنبد کے دروازے

کے قریب آ پہنچے تھے۔ اتنے میں اندر سے ایک سبز پوش، سفید ریش بزرگ نے بڑھ کر ان کا استقبال کیا۔ ہادی ولی کا ماتھا چوما، متین صاحب سے مصافحہ کیا اور دونوں کو اندر لے گیا۔ تینوں نے قبر پر فاتحہ کہا، کچھ دیر چپ چاپ کھڑے رہے پھر متین صاحب کو خیال میں غرق دیکھ کر پچھلے پاؤں واپس دروازے سے صحن میں نکل گئے۔

متین پر کچھ دیر تو چاندنی اور اندھیرے کے میل سے رعب طاری رہا۔ گنبد کی دیوار میں بنی ہوئی جالیوں میں سے چاندنی چھن رہی تھی قبر پر اور اس کے گرد اگرد نور ہی نور تھا مگر گنبد کی دیواروں کے ساتھ ساتھ اندھیرا، بہت اندھیرا، ڈرانے والا اندھیرا۔ پھر نور نے آہستہ آہستہ ان کے دل و دماغ سے گناہ اور احساسِ گناہ کی تمام غلاظتوں کو دھونا شروع کیا۔ متین صاحب محسوس کر رہے تھے کہ کوئی ان کے دل کو نہایت نرمی سے دبا رہا ہے تا کہ اس میں پھنسی غلاظت نکل جائے۔ اس دباؤ سے ان کی آنکھیں بند ہونے لگیں اور ان پر ایک گہری غنودگی چھا گئی۔ جب انہیں ہوش آیا تو انہوں نے سنا کہ خود ان کے لبوں سے رب کے حضور تک پہنچنے والی دعا نکل رہی تھی۔

''اے روحِ ربوبیت! میں مدتوں تیری راہ سے ہٹا رہا۔ میں مطمئن رہا کہ تیری ہی راہ پر چل رہا ہوں۔ میں نے تیری سپرد کردہ نعمتوں کو حقدار تک نہ پہنچایا۔ میں نے خود اپنے آپ پر مسلسل ظلم کیا اور اس کا احساس تک نہ کیا۔

اب مجھے ایسے کان عطا کر کہ میں اپنے گردوپیش میں تمہیں چلتے پھرتے محسوس کر سکوں۔ مجھے ایسی ہمت دے کہ میں تیری راہ پر تیرے پیچھے پیچھے چل سکوں اور پھر کبھی اس راہ سے نہ ہٹوں۔''

اس دعا کے بعد ان کے لب پھر آپس میں مل گئے، سل گئے۔ شاید ان کو کچھ اور کہنے کی ضرورت نہ تھی۔ متین صاحب کے دل میں کوئی وسوسہ نہ رہا تھا۔ اب وہ پرامن تھا۔ انہوں نے آہستہ آہستہ قبر کی طرف منہ کئے پیچھے دروازے کی طرف ہٹنا شروع کیا۔ دروازے سے نکل کر وہ مسلسل اسی طرح ہٹتے ہٹتے باہر درگاہ کے دروازے تک چلے آئے۔ ملازم نے جوتے آگے بڑھائے، انہوں نے درگاہ کی سیڑھیوں پر بیٹھ کر تسمے باندھے۔ ہادی ولی چلنے

کے لیے بالکل تیار کھڑا تھا۔ متین صاحب بھی گھوڑے پر سوار ہوئے۔ متین صاحب نے گھوڑے کا رخ بجائے سادات پور کے اندر جانے کے، باہر جانے کے لیے موڑ لیا۔ ہادی ولی نے آہستہ سے انہیں بتایا کہ سادات پور کو پیچھے چھوڑے جا رہے ہیں۔ متین صاحب نے اعتماد اور اطمینان سے کہا میں جانتا ہوں۔ مجھے اب وہاں نہیں جانا۔ اب ہم اس سامنے والے بَن میں گزر کر اس پار جائیں گے۔''

''ہم؟'' ہادی ولی بولا۔

''ہاں ہم'' متین صاحب نے جواب دیا۔

''مگر اس بن میں سے تو کوئی دن میں بھی نہیں گزرتا ہے۔''

''آج اس بن کو ہمارے قدموں کی چاپ کو ضرور سننا ہے۔''

''جیسے آپ کی مرضی۔''

حصہ دوم

پہلا باب

بن کے لمبے تڑنگے چوکیدار فضا میں ہیبت پھیلانے میں مگن کھڑے تھے۔ ان کی ہیبت سے چاندنی بھی ٹھٹک ٹھٹک کر چل رہی تھی۔ گھوڑے قریب پہنچے تو پھنکارتے ہوئے پیچھے ہٹے۔ سواروں نے گھوڑوں کو ایک چکر دیا اور بن میں داخل ہو گئے۔ لمبی لمبی گھاس نے بن کی تمام راہوں پر مخملی پردے ڈال رکھے تھے۔ درختوں کے گھنے پتوں سے چاندی چھن چھن کر اندھیرے فرش پر روشن روشن نقش بنا رہی تھی۔ سوار ان اجلے اجلے نقوش کو مشعلِ راہ بناتے ہوئے آہستہ آہستہ آگے بڑھنے لگے۔ گھاس گھوڑوں کی ٹاپوں کو اپنے اندر جذب کر رہی تھی۔ بن کے اندر خاموشی کا راج تھا۔ کہیں سے بھی سرسراہٹ نہیں ہو رہی تھی۔ اس خاموش طلسم کو توڑتے ہوئے ہادی ولی نے کہنا شروع کیا۔

''آج سے تیس سال پہلے مہابت خان کے گاؤں کی ایک لڑکی اپنے محبوب کے ساتھ بھاگ نکلی۔ مہابت خان کی ایک مدت سے لڑکی پر آنکھ تھی مگر لڑکی کسی طرح بھی راہ پر نہ آتی تھی۔ گاؤں سے بھاگنے کی خبر مہابت خان کو بروقت مل گئی۔ اپنے ملازمین کو ساتھ لئے وہ ان کے تعاقب میں نکل پڑا۔''

متین صاحب ہادی ولی کی باتوں کو ان سنی کر کے گردن نیہوڑائے اپنے ہی خیالات میں گم تھے۔ وہ سوچ رہے تھے کہ انہوں نے جب سے سوچ کو اپنے اندر جگہ دی تھی تب سے وہ نہ جانے کس تلاش میں بھٹک رہے تھے۔ انہوں نے اپنی چالیس سالہ زندگی میں کئی

تجربے حاصل کیئے، بےشمار یادیں، کتنی ہی موہنی مورتیں، کتنی ہی قابلِ غور باتیں، بے معنی، دکھ بھری، سُکھ بھری، مگر حسین باتیں ان کے تخیل نے محفوظ کر لی تھیں۔ مگر ان کو کبھی بھی جی بھرنے کا احساس نہ ہوا۔ انہیں ہمیشہ تشنگی اور ویرانی کا احساس رہا۔ آہستہ آہستہ ان کے ذہن میں گزری ہوئی یادیں، باتیں، موہنی مورتیں، نئے روپ لئے، ہجوم کیے آنے لگیں۔ انہوں نے اپنے تخیل سے قوتِ ارادی اور شعور کو ہٹالیا تاکہ ایک بار وہ ان سب کو اکٹھے دیکھ لیں۔ شاید آبادی کا، سیری کا احساس ایک لمحہ کے لیے ہو سکے۔

جس دن میٹرک کا نتیجہ نکلنا تھا، اس دن وہ اذان کے بعد بہت دیر تک سوتا رہا۔ اس کی ماں نے اس کو جھنجھوڑ جھنجھوڑ کر اٹھایا۔ اس کی ماں کی آواز میں اس دن بہت طمطراق تھا۔ وہ حیران تھا کہ ایسا کیوں۔ اس نے پلک اٹھائی۔ اس کی ماں کا چہرہ دمک رہا تھا۔ اس کی آنکھوں میں چمک تھی۔ وہ بار بار کہہ رہی تھی ''خدا کا لاکھ لاکھ شکر ہے کہ آج کا دن نصیب کیا۔ تمہارے جنتی والد آج زندہ ہوتے تو ان کا قد آج اور بھی بڑا نظر آتا۔'' یہ سب سن کر بھی اس کی سمجھ میں نہ آ رہا تھا کہ آخر اتنی بھی خوشی کیوں۔ آخر اس نے ماں کو امتحان ختم ہوتے ہی بتا تو دیا تھا کہ اس کو وظیفہ ضرور ملے گا۔

''اٹھو نا۔ جلدی جلدی منہ دھو لو۔ بابو وحید تمہیں کتنی دیر سے بلا رہے ہیں۔ تمہیں ناشتہ پر بلایا ہے۔''

وہ حیران تھا کہ آج سب اس پر کیوں جاں نثار کر رہے ہیں۔

''بابو وحید کہتے ہیں کہ اخبار میں تمہاری تصویر پہلے صفحہ پر چھپی ہے اور تم سارے صوبے میں اول آئے ہو۔ اتنے نمبر آج تک کسی طالب علم نے نہیں لئے۔''

اسے ایسی خوش بختی کا یقین اس وقت تک نہ آیا جب تک اس نے خود اپنی آنکھوں سے اخبار نہ دیکھ لیا۔

اس دن میڈیکل کالج کا ہال بھرا ہوا تھا۔ اگلی کئی صفوں کی نشستوں پر لڑکیاں ہی لڑکیاں بیٹھی تھیں، اس کے کالج کی، مباحثے میں حصہ لینے والے دوسرے کالجوں کی۔ ڈائس

پر مباحثے میں حصہ لینے والے طالب علم اور جج اور کالج کے پرنسپل اور دوسرے پروفیسران بیٹھے تھے۔ کئی لوگ بول چکے تھے۔ کسی دوسرے کالج کا طالب علم مباحثے کے موضوع کے خلاف بول رہا تھا۔ اس کی آواز، اس کا لہجہ، اس کا تلفظ بہت اچھا تھا مگر اس کے پاس وزنی دلائل نہ تھے۔ اس خیال سے اس کی ہمت بندھی۔ مقرر نے اپنی تقریر ختم کی اور وہ اپنی نشست پر واپس جا بیٹھا۔ ہال میں ہر ایک پر سکوت طاری تھا۔ اس کے کالج کے طالب علموں، پروفیسروں اور پرنسپل کے چہروں پر اضطراب اور مایوسی کے نشان ابھر رہے تھے۔

اس کا نام پکارا گیا۔ وہ اٹھا، اس کے قدم بہت بوجھل ہو رہے تھے۔ بڑی مشکل سے میز تک پہنچا۔ کچھ دیر خاموش کھڑا رہا۔ سب لوگ اس کی طرف دیکھ رہے تھے۔ مباحثے کی ہار جیت کا فیصلہ اس پر تھا۔ اس نے دھیرے دھیرے فضا میں اپنی آواز کو بلند کیا۔ اس کے الفاظ کی منظّم فوج ذہنوں پر یلغار کرتی ہوئی بڑھی۔ ''اگر ہم مرد اور عورت کے جسموں پر تقابلی نظر ڈالیں، یہ ہمارے لیے کچھ مشکل نہیں کیونکہ ہم طبیب ہیں، تو صاف نظر آئے گا کہ عورت آدم کے جسمانی ارتقاء کی اگلی منزل ہے کیونکہ عورت کا جسم مرد کے جسم کے مقابلے میں جامع اور مکمل ہے۔ اسی طرح اگر دونوں کے جسموں کے اندر پنہاں صلاحیتوں کا، ان کے نفسوں کا مطالعہ کیا جائے تو صاف نظر آئے گا کہ عورت کی بیرونی اور اندرونی ساخت اس طرح کی ہے کہ وہ ہر طرح کے تناؤ کو برداشت کر لینے کی زیادہ صلاحیت رکھتی ہے اور اس تناؤ کو وہ اپنی شخصیت کی نشو ونما کے لیے کھاد کے طور پر استعمال کرنے پر قادر ہے۔ صرف وہی عورتیں ایسا کرنے میں ناکام ہوتی ہیں جو مرد بننے اور مرد کی نقالی کرنے کی کوشش کرتی ہیں۔ مرد اور عورت کی ابتدائی صورتوں میں، جب وہ بچہ اور بچی ہوتے ہیں، اتنی مماثلتیں نظر آتی ہیں، ہوتی ہیں، کہ دونوں بحیثیتِ مجموعی ایک ہی صنف معلوم ہوتے ہیں جس سے ارتقاء دو مختلف صنفیں وجود پاتی ہیں۔ دونوں میں انسی اور نسائیت کے تمام عناصر موجود ہوتے ہیں جن کے امتزاجی ارتقا کی بجائے معاشرتی قدروں کے مطابق مرد میں نسائی اجزاء کی نفی پر زور دیا جاتا ہے اور عورت میں انسی اجزاء کی نفی پر زور دیا جاتا ہے''۔ اس نے بولتے بولتے سامنے بیٹھی ہوئی لڑکیوں کی طرف جو نگاہ کی تو ان کے چہرے کھل رہے تھے۔

ان کو کائنات میں اپنی اہمیت کا احساس ہو رہا تھا۔ جب وہ تقریر کے آخری حصے کے فقروں کو ادا کر رہا تھا ''عورت نے پہلی بار زمین کو کاشت کیا، اس سے فصلیں اگائیں، جانوروں کو رام کیا، آدم زادوں کو جانوروں کے گوشت کے ساتھ گندم کے مزے سے آشنا کرایا۔ اس نے زمین سے آدم کا رشتہ مضبوط کیا، زمین سے آسمان کی طرف دھوئیں کی صورت اپنا پیغامِ شکر بلند کیا۔ زبان کو تخلیق کیا اور آدم زادوں کو زبان سکھائی اور مربوط طور پر بولنا، کلام کرنا سکھایا۔ آج تک زبان کی امین و محافظ عورت ہی ہے۔ جب عورت پر مرد کا ظلم حد سے گزر جاتا ہے تو عورت زبان کی حفاظت کے قابل نہیں رہتی یا انتقاماً زبان کی حفاظت سے ہاتھ کھینچ لیتی ہے تو زبان پر انحطاط آتا چلا جاتا ہے۔ زبان کی روشنی تاریکی میں بدل جاتی ہے اور اس کے معنی کی وضاحت دھندلانے لگتی ہے جس کے سبب تصورات کی حدود گڈمڈ ہونے لگتی ہیں۔ یہ کیفیت انسان کے جذبات کو اندھا کرنا شروع کر دیتی ہے۔ لہٰذا انسان کسی معاملے میں بھی صحیح سوچ، صحیح جذبے اور صحیح عمل پر قادر نہیں رہتا اور اس کی تہذیب بربریت کی طرف سفر کرنے لگتی ہے اور جلد ہی پسماندگی اس پر محیط ہو جاتی ہے اور غلامی کی زنجیروں میں جکڑی جاتی ہے اور حیوانیت کے درجے سے بھی نیچے گر جاتی ہے۔ یہی حال اب ہمارا ہے۔ اس جہنم سے نکل آنا بہت ہی مشکل ہے۔ اس جہنم سے نکل جانے کا ایک ہی حل ہے کہ عورت کی محکومیت کو ختم کیا جائے۔ اس کی صلاحیتوں کی نشوونما کی جائے تاکہ وہ ہم مردوں کی آزادی کے لیے زبان کی تاریکیوں کو اجالے میں بدل دے اور ازسرِ نو الفاظ کے معنی میں حدود صاف نظر آنے لگیں اور تصورات کی حدود بھی بحال ہو جائیں، اور عورت پھر زبان کی امین اور محافظ بن جائے اور مردوں کو روشن زبان، لسانِ مبین، سے آشنا کرائے، اس کو ان کے ذہن و دماغ میں جاگزیں کرے۔ مرد کو انسان بنائے اور اسے نئی رفعتوں سے ہم کنار کرے اور پھر عورت اور مرد اس زمین اور اس فضا میں سانس لینے والوں کے لئے امن کا ماحول پیدا کر دیں۔ اسی صورت انسان کی صلاحیتوں کی نشوونما اور اس کے ارتقا میں ارتفاع آتا چلا جائے گا ورنہ اولادِ آدم حیوانوں کے درجے سے بھی نیچے گر جائے گی''، تو تمام لڑکیاں کھڑی ہو چکی تھیں اور وہ تالیاں بجا رہی تھیں۔ ان کے تمتمائے ہوئے چہرے، ان کی تشکر بھری آنکھوں میں ایک چمک تھی۔ ان کی گردنوں میں وقار پیدا ہو گیا تھا۔

اس قلبِ ہیئت کا باعث خود اس کی ذات ہے اس احساس سے خود اس کے دل و دماغ میں بے پایاں سرور پیدا ہو گیا تھا۔ وہ جب واپس جا کر کرسی پر بیٹھ گیا تو کئی منٹوں تک ہال میں خاموشی طاری رہی۔ ہال کے دروازوں پر، ہال پر کھلتے ہوئے برآمدوں کی کھڑکیوں میں لوگ ہی لوگ جمع تھے، خاموش، مبہوت۔ ایک لمبے وقفے کے بعد ججوں نے اپنا فیصلہ سنایا کہ اتنی منفرد، پروقار تقریر انہوں نے اس سے پہلے کبھی نہ سنی تھی۔

اس فیصلہ کے ساتھ ہی اس کے کالج کے نمبر مقابلہ میں حصہ لینے والے تمام کالجوں کے علیحدہ علیحدہ نمبروں سے بڑھ گئے اور اس کے کالج نے پہلی بار مباحثہ کی ٹرافی جیت لی۔

اس تقریر کے بعد اس کے کمرے میں لڑکوں کا، لڑکیوں کا ایک ہجوم تمام دن رہتا۔ اس کو پڑھنے کی فرصت بہت کم ملنے لگی۔ اس کی تلافی کے لیے وہ رات گئے تک پڑھتا رہتا۔ کالج میں وہ ہر لڑکی کا محبوب تھا۔ مگر کوئی لڑکی اس کے ذہن، اس کے تخیل، اس کے دل کو بھر نہ سکی۔

طاہرہ بڑے باپ کی بیٹی تھی۔ اس کو سب کچھ میسر تھا۔ اس کے سنہرے، گھنیرے، لمبے بال اس کی دن چڑھنے، ڈھلنے کے ساتھ ساتھ رنگ بدلتی ہوئی بڑی بڑی آنکھیں، اس کے لباس کی متانت بھری شوخی، اس کے بھرے بھرے دراز قد پر کون نہ مرتا تھا۔ مگر اس کو موٹر کار کا دروازہ کھولے، کتابیں بانہوں میں اٹھائے، فٹ بورڈ پر ایک پاؤں رکھے اسی سے باتیں کرنے میں لطف آتا تھا۔ اسے کبھی یقین نہ آ سکا کہ اس کی دلچسپی محض اس وجہ سے نہ تھی کہ وہ خوش شکل نہ تھا، خوش پوش نہ تھا اور اس کے ساتھ اس طرح گھل مل کے باتیں کرنے سے کالج کے تمام لڑکوں کے منہ پر ایک طمانچہ مارنے کی گونج پیدا ہوتی تھی۔ کبھی اسی طرح گھنٹہ بھر باتیں کرنے کے بعد وہ اسے ضد کر کے گھر لے جاتی۔ بہت تکلف سے، اصرار سے اس کی خاطر کرتی۔ اپنے بھائی، بہنوں، والدین سے بڑے فخر اور تشکر بھرے لہجے میں اس کا تعارف کراتی۔ وقت یونہی کٹتا رہا۔ وہ طاہرہ کے گھر کا ایک فرد بن گیا۔

ایک دن وہ صبح صبح کالج پہنچی، اس کو لیکچر روم سے اٹھا، ہوٹل میں لے گئی اور اپنے ایک دور دراز کے عم زاد سے عشق کی کہانی کہہ سنائی اور اس سے مدد کی طالب ہوئی کہ وہ اس کے

والدین کو شادی پر رضامند کرے۔ اس کی آنکھوں میں اعتماد، التجا کے جذبات اس طرح گھلے ملے تھے کہ اس سے رہا نہ گیا اور اس کی مرضی کے مطابق عمل کرنے پر رضامند ہوا۔ جب اس کی والدہ سے اس نے بات چھیڑی تو پہلے تو نہ سمجھتے ہوئے خوش ہوئی مگر یہ جان کر کہ وہ کسی اور کے رشتہ کے لیے کہہ رہا ہے اس پر ناراض ہوئی۔ کچھ دنوں تک وہ تذبذب میں رہا کہ طاہرہ کے گھر جانا اس کے لیے مناسب ہوگا کہ نہیں۔ وہ فیصلہ نہ کر سکا۔ اس کشمکش کے دنوں میں ایک دن طاہرہ کا والد اس کے ہوسٹل کے کمرے میں شام کے وقت آیا اور اس سے ملتجی ہوا کہ وہ طاہرہ کو سمجھائے کہ اپنی ضد سے باز آ جائے۔ کیونکہ اس لڑکے میں مردانہ حسن کے سوا کچھ نہ تھا۔ اس نے طاہرہ کو بہت سمجھایا مگر وہ نہ سمجھی اور ایک دن وہ اس لڑکے کے ساتھ چلی گئی۔

دوسرا باب

''الواس زور سے چیخا کہ لڑکی ڈر کر پاگلوں کی طرح جھنڈ سے نکل کر بھاگی۔ مہابت خان کی رائفل فضا میں بلند ہوئی۔ زوردار آواز گونجی اور لڑکی وہیں ڈھیر ہوگئی۔ لڑکے نے بندوق سے تڑاک تڑاک کئی گولیاں چلائیں۔ مہابت خان اور اس کے چار ساتھیوں کو ڈھیر کیا اور پھر خود مہابت خان کے ایک ساتھی کی گولی سے گرا اور مر گیا۔ اس دن کے بعد اس بن میں کبھی کوئی پرندہ نہ دیکھا گیا۔ پرندے اس بن کے اوپر سے بھی نہیں گزرتے۔ آج نہ جانے کتنے برسوں کے بعد اس بن میں کوئی آواز سنائی دے رہی ہے۔''

ہلکی ہلکی ہوا چلنی شروع ہو چکی تھی۔ چاند اب بالکل ان کے سروں کے اوپر تھا۔ ہر طرف چاندنی اور سائے ایک دوسرے کا تعاقب کر رہے تھے۔ سائے دور دور تک پھیلتے، تاریکی میں تحلیل ہوتے ہوئے سائے۔ چاندنی کھلی کھلی روشوں پر سمٹ آئی تھی۔ درختوں نے ڈر کر اپنے سایوں کو واپس بلا لیا تھا۔ ان کے گھوڑوں کی رفتار اور چال میں ایک مستی کی کیفیت آ چلی تھی۔ متین کا سیاہ گھوڑا اپنی اگلی ٹانگوں سے فضا میں نیم دائرہ بنا رہا تھا اور اس

قابلیت پر داد کا خواہاں تھا۔ لمبی لمبی گھاس پر پتوں کے ڈھیر، بیسیوں خزاؤں میں اترے ہوئے پتوں کے ڈھیر، ان ڈھیروں پر گھوڑوں کی پُر یقین ٹاپوں، نرم نرم، دھیمی دھیمی ٹاپوں کی آواز موسیقی پیدا کر رہی تھی۔ موسیقی چاندنی اور سایوں میں ملبوس اونچے اونچے درختوں پر چڑھ چڑھ کر بلندیوں کی طرف اٹھ رہی تھی۔ بے ترتیب راہیں کبھی درختوں میں، کبھی سایوں میں گم ہو رہی تھیں۔ اس بے منزل سفر سے متین صاحب کے تخیل میں ایک مدت کے بعد جذب اور ابھرتے ہوئے الحان کی کیفیت طاری ہو رہی تھی۔ یہ کیفیت کسی روپ میں ڈھلنے سے مفر تھی۔ ایک بے الفاظ، بے صورت سوچ جنم لے چکی تھی۔ اس میں پناہ کی لذت اور درد اور امید اور یقین کا علم تھا۔ متین صاحب کا جی چاہ رہا تھا کہ بڑے زور سے نعرہ لگائیں، گھوڑے کو ایڑ لگائیں۔ گھوڑا فضا میں بلند ہو اور آسمانوں پر حملہ آور ہو پھر یہ تمام بن، یہ زمین، یہ فضا، یہ پستیاں، یہ بلندیاں تمام کے تمام ان کے تخیل کے اختیار میں آ جائیں اور وہ ان سب کو تحلیل کر کے اپنی آدرشی عورت، اپنی ساتھی کا روپ، اس کی مورت اور اس کی روح تخلیق کریں۔

''متین صاحب!...... کیا پرندے، جانور بھی ظلم کی چھاؤں سے بدکتے ہیں اور جہاں ظلم ہو، جہاں ظلم ہو چکا ہو وہاں سے ہجرت کر جاتے ہیں۔ ایسا کیوں؟ انسان تو ایسا نہیں کرتے۔ کیا ان کو ظلم کی پہچان نہیں۔''

منظر کو وہ کالج میں آتے جاتے ہر روز دیکھتے، صحت مندی اور حیا کا ایسا امتزاج انہوں نے اپنے کالج بلکہ اور بھی کسی کالج میں نہ دیکھا۔ نظریں جھکا کر چلنا تو ہر عورت جانتی ہے مگر اس طرح چلنے میں دعوتِ نظارہ اور داد چاہنے کا پہلو تو صاف جھلک جاتا ہے۔ مگر منظر کی عادت بنی بے خودی، متانت اور اعتماد کی آئینہ دار تھی۔ کسی بھی لڑکے کو اس سے مذاق کرنے، بات کرنے اور خیال ہی خیال میں عشق کرنے کی خواہش کرنے کی بھی جرأت نہ ہوتی تھی۔ تمام لڑکے، پروفیسر، لیبارٹری کے اسسٹنٹ اور دیگر ملازمین اس کی ایک مقدس کتاب کی طرح عزت کرتے تھے۔ کلاس میں کتنا ہی شور ہوتا منظر کے داخل ہوتے ہی ایک خاموشی

طاری ہو جاتی تھی۔ کالج کی جس روش پر وہ چل رہی ہوتی اس پر چلنے کی کسی میں ہمت نہ ہوتی۔ جب کوئی لڑکا مذاق ہی مذاق میں کسی دوسرے کو ایسا کرنے کے لیے کہتا تو بات کے منہ سے نکلتے ہی دونوں ایک ایسے احساس میں جکڑ لئے جاتے جس کو گناہِ کبیرہ کا احساس ہی کہا جا سکتا ہے۔

ایک دن متین صاحب اپنی سوچ میں محو کالج کے برآمدے میں تیز تیز، کچھ گنگناتے ہوئے، گزر رہے تھے۔ برآمدے کے مڑنے کے ساتھ ہی وہ بھی مڑے تو ان کا اور منظر کا آمنا سامنا ہوا۔ منظر مسکرائی۔ اس مسکراہٹ میں طنز نہ تھی، داد کی خواہش نہ تھی، غرور نہ تھا، صرف حیرانی، ایسی حیرانی جس میں خوشی بھی تھی۔

''آپ گنگنا بھی سکتے ہیں؟...... میرے لیے یہ کافی حیرانی اور خوشی کی بات ہے...... میں تو آج تک آپ کو خیالات کا، اچھے، الگ، ضروری خیالات کا جسمانی روپ ہی سمجھتی رہی۔ سوچا کرتی تھی کہ آدمی خیالات کے سہارے کیسے جی سکتا ہے۔ آدمی میں خون، دل، تخیل بھی ہوتا ہے مگر اس آدمی میں یہ سب کہاں چھپا ہوا ہے۔ جب بھی کوئی بات اس آدمی کے منہ سے نکلتی ہے الگ ہوتی ہے، ضروری اور زندگی کے حساس ترین لمحوں سے متعلق ہوتی ہے۔ مگر اس شخص کی روزمرہ زندگی میں اس کا اظہار کیوں نہیں۔ اس آدمی میں کوئی چھپی، ڈھکی بات کا بھی تو احساس نہیں ہوتا۔ بالکل کھلی کتاب ہے۔''

''کھلی کتاب کو دیکھ کر یہ اندازہ کیوں لگا لیا جائے کہ اس کتاب کو پڑھا بھی جا سکتا ہے، سمجھا جا سکتا ہے۔ اس کو پڑھنے کے لیے قریب جانا پڑے گا، نئی زبان سیکھنی پڑے گی، ایسا کیوں نہ سوچا......''

دونوں اس طرح باتیں کرتے کرتے چپ ہو گئے۔ ایک دوسرے کے سامنے چپ کے چپ کھڑے رہ گئے۔ منظر ایک دفعہ پھر مسکرائی۔ مسکراہٹ اس کے ہونٹوں سے ہوتی ہوئی اس کے تمام جسم میں پھیل گئی۔ متین صاحب نے فضا میں دونوں ہاتھ، ہتھیلیوں کو ایک دوسرے کے ساتھ متوازی رکھتے ہوئے، اٹھائے اور کہا:

''اگر یہ برآمدہ مڑ نہ جاتا تو آپ سے ملاقات کیسے ہوتی۔ آپ کو اکثر دیکھتا تھا مگر اس

لیے بات کرنے کی خواہش کا اظہار نہ کیا کیونکہ مجھے ہمیشہ احساس رہا کہ روزمرہ کی زندگی میں ایسا جذب کہاں ہوسکتا ہے جس جذب سے آپ سے ملا جانا چاہیے۔ آج قدرت نے ہی وہ کیفیت پید کردی تھی لہٰذا ملاقات ہوگئی۔''

ان کی یہ ملاقات آخری نہ تھی۔ اس کے بعد اکثر ملتے، کالج میں، کالج سے باہر۔ سینما میں، کسی ریسٹوران میں۔ نہ منظر اس کے ہوسٹل آئی اور نہ متین صاحب کو اس نے گھر آنے کی دعوت دی۔

جس دن انہوں نے ایم بی بی ایس کا آخری امتحان بھی پاس کرلیا اس دن شام کو گھر جانے کے لیے سامان لے کر جب وہ اسٹیشن پہنچے تو انہوں نے دیکھا کہ منظر ایک ادھیڑ عمر کی عورت کے ساتھ سیڑھیوں سے پلیٹ فارم پر اتر رہی تھی۔ متین صاحب کو دیکھ کر ٹھٹکی، ایک لمحہ کے لیے کسی سوچ میں اس ادھیڑ عمر کی عورت کا ہاتھ پکڑے متین صاحب کی طرف بڑھتی ہی چلی آئی۔

متین صاحب ان کو اپنی طرف آتے دیکھ کر ان کی طرف بڑھے۔ منظر نے متین صاحب سے اپنی والدہ کا تعارف کرایا۔ منظر کی والدہ کی آواز میں تجربہ تھا، شستگی تھی مگر اس کے ساتھ ساتھ اس میں جھجک تھی۔ جو جھجک سے زیادہ شرمساری تھی۔ اس احساس کی متین صاحب کوئی توجیہہ نہ کرسکے۔ تعارف کی گفتگو کے بعد فوراً کچھ لمحوں کے لیے سب پر ایک سکوت چھایا رہا۔ متین صاحب نے فوراً محسوس کیا اور اپنے آپ کو سنبھالا اور گفتگو کو ایسے ڈھرے پر چلانا شروع کیا کہ فضا میں ایک کھچاؤ کی جو کیفیت پیدا ہو چلی تھی چھٹ گئی۔ منظر کی والدہ کو انہوں نے اپنی طرف اس طرح متوجہ کرلیا کہ کچھ دیر کے بعد وہ متین صاحب کو بے جھجک بیٹا کہنے لگی۔ متین صاحب نے ایک بار جو منظر کی طرف دیکھا تو اس کے آنکھوں میں شانتی تھی، اظہار تشکر تھا اور ایک اطمینان تھا۔

گاڑی چلنے کا سمے آ گیا۔ انہوں نے ایک دوسرے کو الوداع کہا کیونکہ منظر اور اس کی والدہ مخالف سمت کو جا رہے تھے اور ان کی گاڑی دوسرے پلیٹ فارم پر آ رہی تھی۔ جاتے جاتے منظر نے متین صاحب سے کہا ''آپ سے یورپ جانے سے پہلے تو شاید اب کوئی

ملاقات نہ ہو سکے۔ اس کو آخری ملاقات ہی سمجھئے، کہا سنا معاف کر دیجئے گا......

جب ہم پہلی بار ملے تھے تو بھی ہم مخالف سمتوں کو جا رہے تھے اور آج بھی۔ شاید ہمیشہ ہی ایسا ہو' یہ کہہ کر منظر نے اپنا ہاتھ متین صاحب کی طرف بڑھایا۔ متین صاحب نے اس کا ہاتھ اپنے دونوں ہاتھوں میں لے لیا اور بے سوچے ہی کہتے چلے گئے۔

''یورپ جانے سے پہلے ایک ملاقات تو ضرور ہو گی چاہے اس کی کتنی ہی قیمت دینی پڑے......''

ابھی وہ کچھ اور بھی کہتے مگر گاڑی چل دی اور منظر ہاتھ چھڑا کر کھڑکی کو دیکھتی رہی۔ متین صاحب گاڑی سے کافی دیر تک اس کو اسی طرح کھڑے دیکھتے رہے۔

وہ کافی دن اپنے ماموں کے پاس اپنی والدہ کے ہمراہ رہے۔ حکومت کی طرف سے یورپ جانے کی تاریخ کے متعلق اطلاع آنے کا انتظار کرتے رہے۔ تمام دن شہر سے باہر کھیتوں میں گھومتے، چاند نکل آتا تو گھر لوٹتے۔ آخر ایک دن اطلاع آ ہی گئی۔ یورپ پہنچنے کی تاریخ بالکل قریب آ چکی تھی۔ وہ جانے سے پہلے تمام دوستوں، پروفیسروں سے ملنے کے لیے کالج پہنچے، کچھ سے ہوسٹل میں اور کچھ سے ریستوران میں۔ منظر سے وہ ملنا چاہتے تھے مگر اس کا کسی کو پتہ نہ تھا۔ وہ بہت پریشان تھے۔ ایک دن وہ گھر سے تمام دن نہ نکلے۔ شام ہونے کو تھی کہ ملازم نے اطلاع کی کہ کوئی ان سے ضروری ملنا چاہتا ہے۔ ڈرائنگ روم میں پہنچے تو ایک بوڑھا آدمی کاؤچ سے اٹھا۔ اس کے چہرے پر مردنی چھائی تھی۔ اس کے جسم میں اٹھنے کی طاقت نہ تھی۔ وہ اتنا بوڑھا تو نہ تھا شاید مصیبت زدہ ہو۔ یہ سوچتے ہوئے وہ بوڑھے کی طرف بڑھے۔ اس سے ہاتھ ملایا اور اسی کے پاس بیٹھ گئے۔ وہ فوراً ہی بولنے لگا۔ ''میں منظر بی بی کا ملازم ہوں۔ وہ سخت بیمار ہیں، ڈاکٹروں نے جواب دیدیا ہے۔ اب نہ جانے کس گھڑی کا انتظار ہے کہ دکھ نہیں کٹتا۔ اس کی والدہ تو کئی دن سے کہہ رہی تھی مگر منظر ہمیشہ منع کر دیتی تھی۔ آج میں چھپ کر بغیر اطلاع کے چلا آیا ہوں کہ شاید آپ ہی کا انتظار ہو۔ اب اس کا دکھ دیکھا نہیں جاتا...... آپ چلیں گے نا''

متین صاحب نے کپڑے پہنے اور بوڑھے کے ساتھ چل دیئے۔

کن کن رستوں سے وہ منظر کے ہاں پہنچے ان کو آج بھی یاد نہ تھا کچھ دیر وہ ڈیوڑھی میں کھڑے رہے پھر منظر کی والدہ آئی اور ان کو اندر لے گئی۔ ایک اجلے اجلے کمرے میں اجلے اجلے ریشمی بستر پر نحیف و نزار منظر پڑی تھی۔ اس کا جسم اب صرف ہڈیوں کا پنجر تھا۔ اس کی آنکھیں بند تھیں۔ وہ نہایت آہستہ آہستہ کوشش سے سانس لے رہی تھی۔ وہ پلنگ کے پاس رکھی ہوئی کرسی پر شور اٹھائے بغیر بیٹھ گئے اور منظر کے چہرے کی طرف دیکھنے لگے۔ منظر نے پلک سے پلک اٹھائی۔ متین صاحب کو دیکھا۔ ایک تیزی سے گزرتے ہوئے لمحے کے لیے اس کے چہرے پر سرخی جھلکی۔ اس نے سرہانے سے سر اٹھانے کی کوشش کی۔ مگر کہنیوں میں طاقت نہ تھی۔ سر دھم سے سرہانے سے جا لگا۔ اس نے متین صاحب کی طرف بے بسی سے دیکھا اور مسکرائی۔ اس کی مسکراہٹ میں اب بھی وہ سب کچھ تھا جو ہمیشہ ہوتا تھا۔ اس نے اپنا بایاں ہاتھ چادر سے باہر نکالا۔ متین صاحب نے اپنا دایاں ہاتھ اس کے ہاتھ پر رکھ دیا۔ اس ہاتھ میں اک اکڑاؤ تھا جو ان کے ہاتھ رکھتے ہی نرمی میں بدل گیا۔ وہ مسلسل منظر کے چہرے کی طرف تکے جا رہے تھے اور منظر بھی پلکوں کی آڑ سے انہیں دیکھ رہی تھی۔ اس کے ہونٹوں سے مسکراہٹ غائب ہو رہی تھی۔ اس کے ہونٹ کئی بار تھرتھرائے، کھلے اور پھر بند ہو گئے۔ سانس تیز ہوئی، رکی اور پھر چلنے لگی۔ وہ شاید کچھ کہنا چاہتی تھی مگر آواز سینے میں ہی گم ہو جاتی تھی۔ متین نے کرسی اور قریب کر لی اور اپنا دایاں ہاتھ اس کے ماتھے پر رکھ دیا، رکھے رہنے دیا۔ ماتھے پر پسینہ آنا شروع ہو گیا۔ اس کی آنکھیں بند ہونے لگیں۔ کچھ عرصہ آنکھیں بند رہیں۔ وہ دم سادھے، چپ چاپ پڑی رہی۔ پھر اس نے ایک لمبا سانس لیا اور اس نے آنکھیں کھول دیں۔ اس کے لب کھلے اور وہ کہنے لگی۔

''آپ اس دن اگر میری والدہ سے نہ ملتے تو میں آرام سے، امن میں مر سکتی تھی مگر اب یہ خیال محال نظر آتا ہے......''

انہوں نے اس کے منہ پر ہاتھ رکھ دیا ''میں یورپ جاتے ہی تمہیں وہاں بلا لوں گا۔ وہاں تم کچھ ہی مہینوں میں صحت یاب ہو جاؤ گی۔''

دونوں ایک دوسرے کی طرف دیر تک دیکھتے رہے اور کچھ نہ بولے۔ منظر نے پہلو

بدلا اور اس کے تمام جسم میں ایک کپکپی سی دوڑ گئی۔ وہ شاید اپنے جذبات پر قابو پانے کی کوشش کر رہی تھی اور شاید دھیرے دھیرے رو بھی رہی تھی۔ متین صاحب اپنی کرسی پر مضطرب ہو گئے اور اس اضطراب میں انہوں نے انجانے میں کرسی کو کھسکایا۔ آواز سے منظر کا تمام جسم تن گیا اور وہ بولنے لگی۔ اس کی آواز میں جھنجھلاہٹ، کرب اور اپنی کمزوری پر غصہ آنے کی ملی جلی کیفیات گھلی ملی تھیں۔ متین صاحب کو اس آواز پر پیار آیا اور ان کا بہت جی چاہا کہ وہ منظر کے چہرے کو اپنی طرف پھیر کر اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر اس کی پیشانی، اس کی آنکھیں، اس کے رخسار، اس کے ہونٹ چوم لیں اور کہیں: ''میری بھولی! مجھے تم سے ہمدردی کم اور پیار اس سے کہیں زیادہ ہے۔ مجھے تمہارا حسن، تمہارا جسم، تمہارے خیالات، تمہاری تنہائی پسندی، تمہاری اقدار، سپردگی سب کی سب عزیز ہیں۔ میں تمہارے لیے تمام عمر بغیر امید وصل جہنم کا دکھ سہہ سکتا ہوں۔'' مگر وہ یہ کہہ نہ سکے کیونکہ منظر جو کچھ کہہ رہی تھی وہ ان کے تخیل پر اس طرح چھا رہا تھا کہ وہ سننے کے علاوہ اپنی تمام صلاحیتیں کھو چکے تھے۔ منظر کہہ رہی تھی۔

''......جس دن اسٹیشن پر آپ سے ملی تھی اس سے کچھ ہی دن پہلے مجھے معلوم ہوا کہ جن کو میں والدین سمجھتی تھی وہ میرے والدین نہ تھے۔ کوئی نہ تھا جس کو میں یقین کے ساتھ اپنا والد کہہ سکتی تھی۔ میں نے گناہ میں جنم لیا تھا اور گناہ کی کمائی سے میرا گوشت پوست میرا خون جوان ہوا تھا۔ مجھے اپنی تمام زندگی فریب نظر آنے لگی۔ مجھے سب سے زیادہ غم تو اس کا تھا کہ میں نے آپ کو دھوکا دیا......''

اس نے ہاتھ اٹھاتے ہوئے ان کو کچھ نہ کہنے سے باز رکھا اور کہتی چلی گئی۔

''میں جانتی ہوں کہ آپ کہنے والے تھے کہ مجھے آخر اپنے جنم کا کیسے پتہ ہو سکتا تھا۔ میں کہتی ہوں کہ مجھے آخر اس کا پتہ کیوں نہ تھا۔ کیوں مجھے احساس نہ ہوا کہ جن کو میں والدین سمجھتی رہی وہ میرے حقیقی والدین نہ تھے اور جو کچھ وہ مجھ پر خرچ کرتے رہے وہ سب اس گناہ کی پیداوار تھا جس گناہ میں میں نے جنم لیا۔ کیا اس بے بصری میں خود میرے شعور کا کوئی حصہ نہ تھا؟ اگر تھا تو مجھے اس کا کفارہ دینا ہی ہوگا۔ اتنے بڑے گناہ کا کفارہ موت کے

سوا کیا ہوسکتا ہے۔ مجھے مر ہی جانا چاہیے۔۔۔'' وہ اب تھک چکی تھی۔ لمبے لمبے سانس لے رہی تھی۔ اس کا سارا جسم چھپے ہوئے زخموں سے دکھ رہا تھا۔ وہ بہت ہی دکھ میں تھی۔ متین صاحب کو اس دکھ کا کوئی مداوا نہ سوجھ رہا تھا۔

''موت سے کسی بات کا مداوا نہیں ہوتا۔ یہ زندگی کے تقاضوں سے فرار تو ہوسکتا ہے، دکھوں سے نجات تو دلا سکتی ہے مگر مداوا نہیں کرتی۔ مداوے کے لیے زندگی کی اشد ضرورت ہے۔ اس زندگی میں تخلیقی اعمال سرانجام دے کر ہر گناہ کا مداوا کیا جا سکتا ہے۔ صرف ایک عمل ایسا ہے جس کا مداوا ممکن نہیں وہ ہے مومن کا بے خطا قتل۔ یہ جرم اور گناہ تم نے نہیں کیا۔ لہٰذا جس گناہ میں بھی تم اپنے آپ کو ملوث سمجھتی ہو اس کا مداوا ایسے اعمالِ خیر ہیں جن سے یہ گناہ دھل جائے۔ تم نے ایم بی بی ایس کا امتحان پاس کرلیا ہے۔ کسی غریبوں کی بستی میں اپنا مطب کھول لو اور ان کی خدمت کرتی چلی جاؤ۔ ان کی دعاؤں، ان کی ان خوشیوں سے، جو تمہاری خدمت کے بعد ان میں جاگیں گی، تم میں خیر رچنے لگے گا۔ تم ہمہ تن خیر بنتی چلی جاؤ گی۔ مرنے کی آرزو اللہ کے قانون سے ناامیدی ہے۔ اس کا قانون رحمت و برکت کا قانون ہے۔ خیر قوت وثبات بخشتا ہے، شخصیت بنانے میں مددگار رہتا ہے۔ جب شخصیت بن جائے تو انسان کی انسانیت کا ارتقا شروع ہو جاتا ہے جو ہر دم ارتفاع کی طرف بڑھتا چلا جاتا ہے۔ یہ ارتفاع پذیر ارتقا جنت کی ہواؤں کو زمین پر اتار لاتا ہے اور زندگی حیاتِ جاوداں کی طرف رواں ہو جاتی ہے۔ حیاتِ جاوداں کا آغاز اسی جہانِ رنگ و بو سے ہو جاتا ہے۔ جب اس کا آغاز ہو جائے تو خیر کے اثرات معاشرے میں پھیلنا شروع ہو جاتے ہیں۔ انسان کو احسن التقویم پیدا کیا گیا ہے۔ وہ کتنا ہی اپنے مقام سے گر جائے اس میں، اس وقت تک اس تقویم کا اثر رہتا ہے جب تک اس میں حق کو سمجھنے، قبول کرنے، اس پر عمل پیرا ہو جانے کی سب سکت ختم نہ ہو جائے اور اس کے کانوں اور اس کے دل پر مہریں نہ لگ جائیں۔ تمہارا یہ حال نہیں ہے۔ تم نے اپنی ذات کی کارفرمائی سے اپنی کالج کی تعلیم کے دوران میں ہر دل میں عزت و احترام کے، حیا اور حسن کے، جذبات جگائے اور مسلسل جگائے۔ تماری ذات اس عرصہ میں حیا اور الوہی حسن کا استعارہ بن گئی جس نے دیکھنے

والے کو قائل کیا کہ اس حیاتِ ارضی پر خیر کی زندگی ممکن ہی نہیں، آسان ہے۔ مشکل ہے باطل اور حق میں امتیاز کرنا اور حق پر غور وفکر کے بعد ایمان لانا۔ تمہاری زندگی ایمان کی زندگی تھی۔ اگر تمہاری ماں نے تمہیں گناہ کی زندگی میں جنم دیا تو تمہارے لیے یہ جاننا لازم ہے کہ اس نے ایسا کیوں کیا، کس نیت سے کیا۔ اگر اس نے تمہیں اس زندگی میں شریک کرنے کے لیے جنم نہیں دیا تو پھر اس کی نیت میں کھوٹ نہیں تھا۔ وہ شاید حالات سے مجبور تھی۔ جنم کے بعد اس نے تمہیں گناہ کی زندگی سے محفوظ رکھنے کی کوشش کی اور محفوظ رکھا۔ تمہیں اس کا ممنون ہونا چاہیئے تھا نہ کہ اس کو مطعون کرنا۔ تم اپنے آپ کو روبصحت کرو تا کہ تمام کوائف کو جان سکو۔ اپنا جو حال تم نے بنالیا ہے مجھے لگتا ہے کہ وہ صرف vanity کا نتیجہ ہے۔''

ان میں اس کے دکھتے ہوئے جسم، چہرے کے بکھرتے ہوئے نقوش کو دیکھنے کی ہمت نہ تھی مگر وہ نہ تو آنکھیں بند کرنا چاہتے اور نہ منہ پھیر لینا چاہتے تھے کہ کہیں اس ننھے لمحے میں ان سے ہمیشہ ہمیشہ کے لیے رخصت نہ ہو جائے۔ وہ اس کے دم بدم ابھرتے ڈھلکتے ہوئے سینے کو برابر تکے جا رہے تھے کہ منظر کی حیات کے تمام اجزا ان چھوٹے چھوٹے قطعات میں ہمیشہ ہمیشہ کے لیے جدا ہونے کے لیے جمع ہو رہے تھے۔

منظر نے ایک بار پھر اپنی تمام قوتوں کو اکٹھا کر کے قوتِ گویائی میں تبدیل کیا اور ملتجی آواز میں کہنے لگی۔

''متین صاحب وعدہ کیجیئے کہ آپ فوراً یہاں سے چلے جائیں گے اور پھر کبھی میرے متعلق کسی سے کچھ جاننے کی کوشش نہ کریں گے۔ میں جانتی ہوں کہ ایسا کرنے میں آپ کو بہت دکھ ہوگا مگر آخر یہ خواہش آپ کے سوا کون پوری کر سکتا ہے۔ میں ان تمام راحتوں کا جو میری ذات سے آپ کو ملیں ان سب کا اجر اس صورت چاہتی ہوں......''

منظر نے جلد جلد لمبے لمبے سانس لئے اور ان کی طرف دیکھے بغیر پھر بولنے لگی۔

''میں جانتی ہوں کہ آپ اس حادثے کے بعد کوئی ایسی حرکت نہ کر بیٹھیں گے جو آپ کی بلند ترین اقدار کے مطابق نہ ہو مگر پھر بھی آپ سے وعدہ چاہتی ہوں کہ اس حادثہ کی وجہ سے آپ اپنی زندگی کی ڈگر میں کوئی تبدیلی نہ کریں گے۔''

اتنا کچھ کہہ چکنے کے بعد تو منظر بالکل نڈھال ہوگئی تھی۔ اس کی آنکھیں بند ہونے لگیں۔ اس کے تنفس میں ناہمواری آ چلی تھی۔ اس کے جسم کا تناؤ ڈھیلا ہو گیا......اور وہ سو گئی۔

متین صاحب اس گفتگو سے مبہوت ہو گئے تھے۔ انہوں نے کئی بار اٹھنے کی کوشش کی مگر ٹانگوں نے ساتھ نہ دیا۔ وہ تھک کر آنکھیں بند کیے نہ جانے کتنی دیر تک پٹی سے سر لگائے چپ چاپ پڑے رہے۔ اس عرصہ میں کوئی بھی تو کمرے میں نہ آیا۔ آنکھ کھلی تو منظر اسی طرح سوئی ہوئی تھی۔ اس کے سینے کے زیر و بم میں ایک ہم آہنگی تھی۔ اس کے سانس لینے سے ایک بہت ہی دھیمی دھیمی موسیقی کا گمان ہو رہا تھا۔ وہ گھٹنوں پر ہاتھ رکھ کر اٹھے۔ ان کے جسم نے ایک جھری جھری لی۔ وہ منظر کے چہرے کی طرف جھکے اس کے چہرے پر زردی اور نقاہت کے باوجود ایک رعب، ایک سکون تھا۔ انہوں نے یکلخت اپنے آپ کو سیدھا کیا اور آہستہ آہستہ پھونک پھونک کر قدم رکھتے کمرے سے باہر نکل آئے۔ باہر کے کمرے میں بھی کوئی نہ تھا۔ ڈیوڑھی میں کوئی نہ تھا۔ وہ گلی میں پہنچے تو انہوں نے ایک لمبا سانس لیا اور اس کے بعد وہ گھر کیسے پہنچے ان کو یہ آج بھی یاد نہ آ رہا تھا۔

تیسرا باب

ان کا گھوڑا چلتے چلتے رک گیا تھا۔ انہوں نے پلک اٹھا کر دیکھا۔ سامنے ایک روشن سی ٹہنی پر ایک گلہری ان کو حیرانی سے تک رہی تھی، ٹہل رہی تھی۔ سامنے کے درختوں میں ایک ترتیب تھی، گنجان نہ تھے اور ان کو اپنا رستہ صاف دکھائی دے رہا تھا۔ ہوا اب زور زور سے چل رہی تھی اور چلتے ہوئے شور کر رہی تھی۔ اوپر درختوں پر پتے گنجان نہ تھے بلکہ بعض درختوں کی ٹہنیاں تو بالکل ننگی ہو رہی تھی۔ ان میں ننھی منھی کونپلوں کی ایک فوج ابھر رہی تھی اور چاندنی میں ان چمکتی ہوئی کونپلوں سے متین صاحب کو ایک قُرب سا محسوس ہونے لگا۔ انہوں نے گھوڑے کی گردن کو سہلایا اور وہ پھر چلنے لگا۔ ہادی ولی ان سے آگے نکل گیا تھا اور

اپنی زین پر سے مڑ مڑ کر دیکھ رہا تھا۔ وہ کچھ دیر یونہی آہستہ آہستہ آگے پیچھے چلتے رہے۔ اب درختوں کے درمیان کی بے ترتیب روش چوڑی ہونے لگی تھی اور اس روش پر چلتے ہوئے انہوں نے محسوس کیا کہ شاید آندھی آنے والی ہے مگر ایسی کوئی بات نہ تھی۔ محض رات گزرنے کے ساتھ ساتھ ہوا کی خنکی اور اس کی تندی میں اضافہ ہو رہا تھا۔ درختوں سے آخری پتے لہک لہک، مٹک مٹک کر دائرے بناتے ہوئے زمین پر، ان پر، گر رہے تھے۔ متین صاحب نے محسوس کیا کہ جیسے وہ اپنے ملک ہی میں ظالم کو شکست دے کر فاتح کی حیثیت سے داخل ہو رہے ہیں اور ان کے ہم وطن ان پر پھول برسا رہے ہیں۔ انہوں نے گھوڑوں کی رانوں کو ذرا زور سے دبایا۔ گھوڑوں نے اپنی رفتار تیز کی۔ گرے ہوئے پتوں نے ٹاپوں کی وجہ سے آوازِ احتجاج بلند کی اور وہ آواز بلند ہوتی چلی گئی، بن میں پھیلتی گئی اور پھر دھیرے دھیرے آواز مدھم مدھم ہوتے ہوئے سو گئی۔ اب ان کے سامنے ایک کھلا ہوا صحن تھا جس کے چاروں طرف بلند قد، ننگے ننگے، جھومتے ہوئے درخت تھے اور ان درختوں کی ٹہنیاں بکھرتی ہوئی ساکن چاندنی میں ارتعاش پیدا کر رہی تھیں اور اس صحن کے بیچ ایک تلیّا تھی جس کی سطح آئینہ کی طرح ہموار تھی اور پگھلی ہوئی چاندی کی طرح چمک رہی تھی۔ بھاگتے ہوئے گھوڑوں نے اس تلیّا کے عین کنارے پر پہنچ کر اپنے سم زمین میں گاڑ دیئے اور ان کی اگلی ٹانگیں زمین کی طرف زاویے بناتی ہوئی جھک گئیں اور ان کی گردنیں پانی کے اوپر تک جا پہنچی تھیں۔

ہادی ولی اور متین صاحب اپنے عکس کو کافی دیر تک دیکھتے رہے۔ نیلے آسمان، دمکتے ہوئے تاروں کی سطوت اور شوکت پانی میں اور بھی نکھری ہوئی تھی۔ چاند کا سفر پانی میں صاف دکھائی دے رہا تھا۔ چاند مغرب کی طرف اتر رہا تھا۔ اس کی کرنیں پانی کے دیس سے ہوتی ہوئی فضا میں تنگنائیں بناتی ہوئی بلندیوں میں گم ہو رہی تھیں۔ ان کے سائے اس عظمت اور شوکت کے پس منظر میں انسانوں کے شکوہ اور تسخیر کا علم بلند کر رہے تھے۔ ہادی ولی کو اس احساس سے ڈر لگنے لگا۔ ڈر اس کے تمام جسم، اس کی روح تک میں حلول کر گیا تھا۔ اس کا ڈر اس کی رانوں کی راہ سے گھوڑے میں منتقل ہو رہا تھا۔ گھوڑے نے پھنکارنا

شروع کیا۔ کہیں سے ہوا کا ایک تیز اور تند جھونکا وہاں آ نکلا۔ تلیّا کی سطح پر ایک ہل چل ہوئی۔ آسمان اور تاروں اور چاند کے عروج کو ایک دھچکا لگا اور سطوت وشوکت کی سلطنت لرزنے لگی۔ فضاء میں بلند ہوتی ہوئی تنکنا ئیں ڈگمگا ئیں، درختوں کے سائے کانپنے لگے۔ ہادی ولی کا خوف لمحہ بہ لمحہ بڑھنے لگا۔ سردی اور خوف سے اس کے دانت بجنے لگے۔ وہ متین کی طرف متوجہ ہوا۔

''بلندیوں اور سطحوں کی سلطنتیں لرزنے لگی ہیں۔ نہ جانے اس ہنگامے اور افراتفری میں کیا ہو...... میں واپس چلا۔ اب تو راستہ صاف ہے۔ آگے آپ خود چلے جایئے۔ مجھے اب اجازت دیجئے۔ اس سے آگے میں تو ایک قدم نہ جاؤں گا۔''

اتنا کہتے ہی ہادی ولی نے گھوڑے کو ایک ایڑ لگائی اور تلیّا میں سے دندناتا ہوا گزر گیا اور متین صاحب کے دیکھتے ہی دیکھتے یہ جا وہ جا، نظروں سے اوجھل ہوگیا۔ وہ نہ تو اس راستے سے گیا تھا جس راستے سے وہ آئے تھے نہ جنوب کو جس طرف داؤ دنگر تھا۔ نہ اس طرف جس طرف متین صاحب کا دل ان کو کھینچے ہوئے لے آیا تھا اور لئے جارہا تھا بلکہ وہ تو پہاڑوں کی جانب چلا گیا تھا۔

تلیّا کے پانی کی سطح بالکل بکھر گئی تھی۔ کرنیں پانی کی شکنوں کی تاب نہ لا کر واپس لوٹ رہی تھیں، پھر آہستہ آہستہ چاند، تاروں، نیلے آسمان اور درختوں کے سایوں نے پانی کی سطح کی طرف لوٹنا شروع کیا۔ ڈگمگاتے ہوئے، ڈرتے ڈرتے اور پھر ایک دم پانی کی سطح پر انہوں نے اپنے نقش ثابت قدمی کے ساتھ جما دیئے۔

متین صاحب پر اس برہمی کا کوئی اثر نہ تھا۔ ان کے دماغ اور دل میں اسی طرح یقین اور خواہش سفر موجود رہی اور انہوں نے گھوڑے کی باگیں موڑیں اور درختوں کے نیچے نیچے چاندنی پر نقش بناتے ہوئے مغرب کی طرف بڑھتے رہے۔ کچھ دیر ان کی آنکھیں چاندنی اور سایوں کے کھیل کو دیکھتی رہیں۔ ان کے کان پتوں کی فریاد سنتے رہے۔ پھر ان کی آنکھیں دیکھ سکنے کے باوجود نہ دیکھ رہی تھیں۔ ان کے کان سن سکنے کے باوجود کچھ نہ سن رہے تھے۔ اب وہ پھر اپنے ذہن میں ابھرتی ہوئی لہروں کو دیکھنے لگے، ابھرتی ہوئی، چھاتی

ہوئی، آوازوں کو سننے لگے۔

لارا برٹ ہارٹ نے جب ان کے ہسپتال میں میٹرن کا چارج لیا تو کسی کے وہم میں بھی نہ تھا کہ میٹرن ادھیڑ عمر کی نہ ہو گی مگر جب انہوں نے اس کو ہسپتال کے وارڈز میں، برآمدوں میں چلتے پھرتے دیکھا تو ان کو ایک بار تو سخت اچنبھا ہوا۔ چھریرے بدن کے باوجود اس کو دیکھ کر بھی اس کے دبلے پتلے ہونے کا احساس نہ ہوتا تھا۔ اس کی ہڈیوں پر گوشت اس خوبی سے چڑھا ہوا تھا کہ کہیں فالتو بھی نظر نہ آتا تھا اور جسم بھرا بھرا بھی دکھائی دیتا تھا۔ اس کی نیلی منور آنکھیں، شانوں تک پہنچتے ہوئے کٹے ہوئے بال، لمبی روشن روشن گردن، تنگ تنگ کپڑوں کے خلاف احتجاج کرتا ہوا سینہ، اس کے گول گول گھٹنوں سے ذرا نیچے تک ننگی، مضبوط ٹانگیں سب کچھ دلکش تو ضرور تھا مگر ان کو صرف نگاہوں ہی سے چھونے کی خواہش ہوتی تھی۔ جب بھی اس کو ہاتھوں سے چھونے کا خیال آتا تو یہ احساس ہوتا کہ اس کا جسم آگ میں خوب سرخ ہوتے ہوئے لوہے کا ستون بن جائے گا اور ہاتھ جل جائیں گے، آنکھیں گرمی اور چمک سے اندھی ہو جائیں گی۔ چلتے ہوئے اس کے پاؤں ایک دوسرے کے بعد اس طرح اٹھتے تھے کہ اعلان کر رہے ہوں کہ ہمیں اپنی منزل کا پتہ ہے اور ٹانگوں میں اتنی طاقت ہے کہ پہنچ سکیں۔ مگر اس کے باوجود اس کی چال میں ایک لا ابالی پن، ایک بے دھیان خود استغراقی کا عالم ہوتا تھا۔ اس سے بات کرنے کے لیے ٹھہرنے کے ساتھ یہ احساس ہوتا تھا کہ ابھی آواز آئے گی کہ وہ گھر پر نہیں ہے۔

وہ اکثر سوچتے تھے کہ ایسی دلبر عورت پر کیا افتاد پڑی کہ اپنے ملک سے، اپنے ملک کے بہترین جوانوں سے اتنی دور چلی آئی تھی۔ شاید وہ انسانوں میں رہتے ہوئے بھی تنہا رہنا چاہتی تھی۔ یا شاید رومانی شوق میں اپنے جوان رعنا کو ڈھونڈنے آئی تھی۔ اس کا شہزادہ کہیں بیمار ہو جائے اور اس کو علاج کے لیے ہسپتال آنا پڑے اور وہ اس کی خدمت کر کے اس کو صحت یاب کرے اور اس کے صلے خود اسی کو پالے۔

ڈاکٹر، مریض، اس کی ماتحت نرسیں سب نہ صرف اس سے پیار کرتے تھے بلکہ اس کی

عزت کرتے تھے اور اس سے ڈرتے تھے۔ اس کی آنکھوں میں ہلکی ہلکی طنز، ناراضگی کو برداشت کرنے کی جرأت نہ تو مریضوں میں تھی نہ ڈاکٹروں میں اور نہ نرسوں میں۔ اس کو کوئی پیٹھ پیچھے برا نہ کہتا۔ صرف ہسپتال سے منسلک میڈیکل کالج کے بنے سنورے چھوکرے اس سے ناراض تھے کہ وہ ان سے بڑے بوڑھوں کی سی باتیں کرتی تھی۔ کبھی کسی پر بہت مہربان ہوئی تو اس کو لباس پہننے کے سلیقہ پر کچھ کہہ دیا، ٹائی کی گرہ ٹھیک کر دی۔ ایسے چھوکرے اس کے چھپے ہوئے ناسور تلاش کرنے میں کوشاں رہتے تھے۔ اس کی کوئی کمزوری ڈھونڈتے تھے۔ مگر اس نے کسی طرح سے frustrated ہونے کا کوئی ثبوت بہم نہ پہنچایا۔ کچھ مہینوں کے بعد لوگوں نے لارا کو اس کے تمام انوکھے پن کے ساتھ قبول کر لیا اور اس کے جسم اور اس کے کردار، اس کی دلکشی کو دلوں میں، ذہنوں میں چھپا لیا اور یوں اک سکون آور اضطراب کو اپنا مقدر بنا لیا۔

متین کو لارا میں ہمیشہ لاشعوری طور پر دلچسپی رہی۔ اس کو یہ احساس ہوتا کہ وہ کسی کی متلاشی ہے۔ اسے کس شے کی، کس کی تلاش تھی وہ جاننا چاہتا تھا مگر یہ خواہش کبھی بھی عمل کی محرک نہ بن سکی۔ وہ اپنے کام اتنی خوش اسلوبی سے کرتی تھی اور ان میں مگن رہتی تھی کہ کسی کو بھی اس سے کسی سطح پر بھی گفتگو کرنے کی ضرورت اور خواہش محسوس نہ ہوتی۔ وہ اس طرح اپنے گردوپیش کے لوگوں سے بے تعلق رہنے میں آزاد تھی۔ اس کے قریب ترین لوگ وہ بچے ہوتے جو مریض کی حیثیت سے ہسپتال میں داخل ہوتے یا کسی مریض کے پاس آتے تھے وہ ان سے گھل مل جاتی اور ان کے دلوں میں اس طرح گھر کرتی کہ وہ اس کے متعلق کسی سے بات کرنا ضروری نہ سمجھتے تھے جب ہسپتال سے فارغ کر دیئے جاتے تو ایسے بچے اپنے دلوں میں ایک اجنبی مہمان کو گھر لے جاتے جو ان کا تنہائی کا ساتھی ہوتا۔ اس کی اس عادت سے مریض ممنون ہوتے اور اس ممنونیت کا صلہ اس کے متعلق پوری طرح خاموش رہ کر دینا مناسب خیال کرتے۔

متین صاحب ان دنوں میڈیکل کالج کی پڑھائی کے آخری سال میں تھے اور ہسپتال میں ان کا آنا جانا اکثر رہتا تھا۔ ان دونوں کا اکثر کسی نہ کسی وارڈ میں معائنہ کے وقت سامنا

ہو جاتا مگر ان کی یہ ملاقاتیں بالکل سرسری اور پیشہ ورانہ قسم کی ہوتیں۔ ہسپتال سے باہر ان دونوں کی کبھی ملاقات نہ ہوتی۔ مگر ایک دن ان کی ملاقات ہوئی اور وہ ملاقات کئی ملاقاتوں کا پیش خیمہ بنی۔

ایک دن ان کو اپنی پسندیدہ خوشبو ختم ہونے کا احساس عین اس وقت ہوا جب انہیں ایک اہم دعوت میں شریک ہونے کے لیے جانا تھا اور حاضری کے وقت میں مشکل سے ایک گھنٹہ باقی تھا۔ وہ جلدی جلدی تیار ہوئے کہ جاتے ہوئے کیمسٹ سے لے کر لگا لیں گے۔ وہ وہاں پہنچے تو انہوں نے سیلز مین سے کہا اور عین اسی وقت مغربی لباس میں ملبوس ایک عورت نے بھی ایک دوسرے سیلز مین سے اس خوشبو کے لیے فرمائش کی۔ دکان میں اس وقت اس خوشبو کی ایک ہی شیشی تھی لہٰذا دونوں سیلز مین تذبذب میں تھے کہ کس کو انکار کریں۔ ایک گوری عورت تھی اور ایک ان کا پرانا گاہک۔ لہٰذا انہوں نے آپس میں یہی فیصلہ کیا کہ دونوں گاہک آپس میں فیصلہ کریں۔ بتانے پر دونوں گاہک ایک دوسرے کی طرف متوجہ ہوئے۔ دونوں ایک دوسرے کو دیکھ حیران ہوئے۔ دونوں نے ایک دوسرے کی طرف بڑھتے ہوئے مصافحہ کیا، باتیں کرنے لگے۔ سیلز مین اپنے کاموں کی طرف متوجہ ہو گئے۔ ’’آپ بھی؟ میرا ہمیشہ سے خیال تھا کہ اس خوشبو کو یہاں پسند کرنے والا کوئی دوسرا نہ ہو گا مگر یہ جان کر خوش ہوں کہ اس معاملے میں رقابت آپ سے ہے۔‘‘

’’میرے احساسات بھی کچھ اسی طرح کے ہیں۔‘‘ تیار ہونے سے کچھ لمحے پہلے مجھے پتہ چلا کہ میری خوشبو ختم ہے۔ گھر سے سیدھا یہاں چلا آ رہا ہوں اور پون گھنٹے میں مجھے ڈاکٹر مجیب کے ہاں عشائیہ پر جانا ہے۔ خوشبو ہوتی تو میں ذرا دیر سے نکلتا اور سیدھا ڈاکٹر صاحب کے ہاں چلا جاتا...... میری خوش بختی ہے کہ مجھے بھی وہی خوشبو پسند ہے جو آپ کو ورنہ آپ سے ذاتی قسم کی ملاقات کی تو کوئی صورت نہ تھی...... آپ نے کہیں جانا تو نہیں؟‘‘

’’نہیں میں تو اب یہاں سے گھر ہی جاؤں گی۔ میں نے اپنی تمام خریداری کر لی ہے۔‘‘

’’تو پھر میرے ساتھ چائے پیجیے۔‘‘

''شکریہ۔ میں بھی طویل خریداری سے تھک گئی ہوں۔ ہمیشہ ہی تھک جاتی ہوں اور اس ماہانہ خریداری کے بعد تو ہمیشہ ہی کسی غیر معروف چائے خانے میں چائے پینا پسند کرتی ہوں۔''

''آیئے''

دونوں قریب ہی کے چائے خانے میں چلے گئے۔ یہاں بہت کم لوگ تھے۔ منیجر نے معزز گاہوں کی خاطر کے لیے معمول سے اچھی چائے کا بندوبست کیا۔ دونوں چائے پیتے رہے۔ ایک دوسرے کو تعجب سے، مسرّت سے، مسکرا مسکرا کر دیکھتے رہے۔ دونوں کو یقین نہ آتا تھا کہ وہ ایک دوسرے کے قریب بیٹھے چائے بھی پی سکتے تھے۔ کبھی کبھار اپنی جذباتی کیفیت کو چھپانے کی خاطر ایک دوسرے سے بہت ہی سرسری اور بے معنی بات کر لیتے اور پھر اس کی بے معنویت پر ہنس دیتے۔ پون گھنٹہ یوں ہی گزر گیا۔ لارا نے متین کو یاد دلایا کہ ڈاکٹر مجیب کے عشائیہ میں صرف پانچ منٹ رہ گئے ہیں اور ان کے لیے ضروری ہے کہ وہ حسبِ معمول وقت پر پہنچ جائیں۔

اس ملاقات کے بعد دونوں ایک دوسرے کو ہسپتال کے باہر کسی نہ کسی جگہ بغیر کسی Appointment کے مل جاتے اور گھنٹوں ایک دوسرے کے ساتھ اکٹھے رہتے۔ دونوں کو اپنی جگہ احساس تھا کہ وہ دوسرے سے ملنے کی کوشش اور خواہش سے ملتے ہیں اور ان کی یہ ملاقاتیں حادثاتی نہیں ہیں۔ مگر ایک دوسرے سے اس احساس کو وہ چھپائے رکھنے کی شعوری کوشش کرتے۔ کچھ عرصہ بعد انہوں نے باقاعدہ وقت مقرر کر کے ملنا شروع کر دیا۔ کبھی سینما، کبھی کسی ریستوران میں، کبھی کسی سوشل تقریب پر مگر اس اہتمام کے ساتھ کہ کالج میں، ہسپتال میں کسی کو کانوں کان خبر نہ ہو۔ اس اہتمام کا ان کو احساس بھی تھا اور اس کی وجہ بھی ان دونوں کی سمجھ میں نہ آتی تھی۔ ایک دن ان دونوں کو احساس ہوا کہ اس طرح تکلف سے، اہتمام سے غیر معروف ریستورانوں میں ملنا، کسی سینما میں الگ الگ پہنچنے اور پھر ساتھ ساتھ بیٹھنے سے ان کے دلوں کو تسکین نہیں ہوتی اور کوئی ایسا ذریعہ تلاش کرنا چاہیے کہ بغیر روک ٹوک، تکلف یا اہتمام سے مل سکیں۔ انہوں نے طے کیا کہ کہیں سے موٹر کا انتظام کریں

اور چھٹی کے دن شہر سے دور گاؤں میں دریا کے کنارے پکنک کیا کریں۔

اب وہ ہر چھٹی کے دن صبح سویرے اپنے پسندیدہ ریستوران میں ناشتہ کر کے شہر سے باہر نکل جاتے۔ کسی گاؤں میں درختوں کے سایہ میں ڈیرے ڈال دیتے۔ کھیتوں میں پھرتے، کسانوں کے پاس کھیت کی منڈیر پر بیٹھ کر باتیں کرتے، ان سے ان کی روزمرہ کی زندگی کے متعلق معلومات حاصل کرتے، ان سے لوک گیت سنتے، ان کو شہر کے قصے سناتے، سیاسی خبریں سناتے۔ لارا ان کو صاحب لوگوں کے دیس کی باتیں سناتی، کسان اس کو اپنی زبان بول لینے پر داد دیتے۔ ان کو خود اپنی زبان اجنبی لہجہ میں بہت ہی لطف دیتی تھی۔ کبھی کبھی وہ ان کی فرمائش پر اپنے ملک کے لوک گیت سناتی اور پھر ان کے لیے متین کی مدد سے اس کا ترجمہ سناتی۔ کسان ان لوک گیتوں کے مماثل اپنے گیت سناتے۔ کسان حیران ہوتے کہ کیا صاحب لوگوں کے کسان بھی انہی کی طرح کے جذبات رکھتے ہیں۔ دونوں کی دوستی کسانوں سے اس حد تک بڑھی کہ وہ ان دونوں کے تخلیہ کے محافظ بن گئے۔ جہاں بھی درختوں کے سائے میں وہ بیٹھ جاتے اس طرف کوئی کسان نہ جاتا تھا۔ دونوں ننگے پاؤں مٹی میں بھاگتے، پھرتے کبھی الگ الگ درختوں کے نیچے ایک دوسرے سے ناراضگی کا بہانہ کر کے سو جاتے اور پھر خود اپنے آپ پر زور زور سے قہقہے لگا کر ہنستے۔ کسان ان کے قہقہے سن کر ایک لمحہ کے لئے کام کرتے کرتے رک جاتے اور پھر اپنے کام میں مشغول ہو جاتے۔ تمام دن اس طرح ہنس بول، گا کر گزارنے کے بعد دونوں ایک رہٹ پر پہنچ جاتے، ہاتھ، منہ، پیر دھوتے۔ رہٹ پر بیٹھ کر پاؤں پونچھتے، منہ صاف کرتے، بوٹ پہنتے اور پھر کچھ لمحوں کے لیے دونوں چپ چاپ ساتھ ساتھ لیٹ جاتے۔ ایک دوسرے کے جسم کے قرب اور حرارت سے ایسی طاقت حاصل کرتے کہ ہفتہ بھر اپنے اپنے کاموں میں مشغول رہتے۔ جب ایک دوسرے سے ملتے تو اس طرح کہ جیسے محض کاروباری واقفیت ہے۔

یہ سلسلہ کئی مہینوں تک جاری رہا۔ وہ اس ہفتہ واری ملاقاتوں پر مطمئن تھے مگر ایک اتوار کو جب لارا متین کو ملی تو اس کے ہونٹوں کے کونوں کے خم کسی گہری سوچ سوچنے اور کسی

فیصلہ پر نہ پہنچ سکنے کی غمازی کر رہے تھے۔ کار چلاتے ہوئے متین نے کئی بار کن انکھیوں سے لارا کو دیکھا وہ چپ، گم سم تھی۔ کبھی کبھی اپنی چپ کو چھپانے کے لیے یکا یک بولنے لگتی۔ اس یکا یک بولنے میں اتنی شدت، ندامت اور جھنجھلاہٹ ہوتی کہ وہ خود اس کے احساس سے گھبرا جاتی اور پھر چپ ہو جاتی۔ متین فکر مند ہونے لگا مگر اس کو اس موضوع پر بات چھیڑنے کا مناسب موقع مہیا نہ ہو سکا۔ وہ لارا کے outbursts کو قبول کرتے ہوئے اس سے سرسری قسم کی باتیں کرتا رہا اور اسی طرح وہ اپنی تھاہ پر پہنچ گئے۔ کار کا انجن چپ ہو چکا تھا۔ متین کار سے اتر چکا تھا مگر لارا کسی سوچ میں کھوئی ہوئی دنیا سے بے خبر، بے حرکت بیٹھی تھی۔ متین نے آہٹ کے بغیر کار سے کھانے پینے کا سامان، دری، تکئے نکالے اور زمین پر سلیقہ سے رکھ دیئے اور خود لارا کی نظروں سے اوجھل چپ چاپ سگریٹ پینے لگا۔ کچھ عرصہ کے بعد کسانوں کی اونچی اونچی آوازوں سے لارا کو اپنے گرد و پیش کا احساس ہوا اور اس نے ڈر کر متین کو پکارا۔ کار کا دروازہ کھول کر جلدی سے اتری، چاروں طرف نگاہ دوڑائی اور متین کی سمت بھاگی اور اس سے لپٹ کر زار زار رونے لگی اور روتے روتے بولی۔

''مجھے ابھی ابھی یوں لگا کہ تم مجھے چھوڑ کر کہیں ہمیشہ کے لیے چلے گئے۔''

وہ کافی دیر تک متین کے سینے سے لگی روتی رہی۔ متین اس کے آنسو پونچھتا رہا مگر چپ رہا۔ پھر لارا نے اس کے سینہ سے سر اٹھایا اور اپنی قوتِ ارادی کے بکھرے ہوئے اجزا کو اکٹھا کیا اور اپنی قمیض کے بازو سے آنسو پونچھے، متین کو دیکھا اور دیکھ کر لجاتے ہوئے مسکرائی، پھر نظریں جھکائیں اور متین کا ہاتھ پکڑ کر بچھی ہوئی دری کی طرف بڑھنے لگی۔ دونوں دری پر بیٹھ گئے۔ لارا متین کی رانوں پر سر رکھ کر آنکھیں بند کر کے لیٹ گئی اور آنکھیں کھولے بغیر بولنے لگی۔

''جو کچھ میں کہنے والی ہوں اس میں جذباتیت قطعی نہیں۔ میں نے پورے پانچ دن اس مسئلے پر غور کیا ہے اور جو فیصلہ بھی کیا ہے اس سے بہتر فیصلہ تو اس زندگی میں ممکن نہیں۔ میں چاہتی ہوں کہ تم میری بات چپ چاپ بغیر احتجاج کے سن لو...... دو مہینے ہوئے میرے والد کا انتقال ہو گیا تھا۔ والدہ نے مجھے دیر سے اطلاع دی تا کہ میں پریشانی میں کوئی ایسی

حرکت نہ کر بیٹھوں جس پر بعد میں پشیمان ہونا پڑے۔...... وہ ہماری دوستی سے آ گاہ ہیں شاید اسی لیے اطلاع کرنے میں اتنی دیر کی اور واپس آنے سے منع کیا ہے۔ لکھتی ہیں کہ اگر اس ملک میں تمہیں زندگی کی خوشیاں میسر آ سکتی ہیں تو وہیں رہو۔ تمہارا والد میرے لئے اتنا چھوڑ گیا ہے کہ میں تاحیات کسی پر بوجھ نہ بن سکوں۔ خود مجھ میں اتنی طاقت ہے کہ اپنی روزی خود مہیا کر سکوں، مگر میں اپنی والدہ کو کیسے چھوڑ سکتی ہوں۔ اس کا میرے بغیر آخر کون ہے۔ میں یہ بھی جانتی ہوں اور اچھی طرح کہ میں تمہیں ہر سطح پر سیر نہیں کر سکتی اور یہ احساس کہ تمہیں کسی ایک سطح پر سیر نہیں کر سکتی مجھے برداشت نہ ہوگا اور میری زندگی میں ایک زہر بھر جائے گا اور یہ زہر پھر تمہاری زندگی میں حلول کر جائے گا۔ اتنا بڑا گناہ کرنے کی مجھ میں ہمت نہیں ہے لیکن مجھے یہ بھی تو گوارا نہیں کہ زندگی سے فرار اختیار کروں اور شادی نہ کروں اور یہ چاہتی بھی نہیں اور مجھے پورا پورا یقین ہے کہ میری پاکبازی اور عصمت کا تمہارے علاوہ کوئی اور حقدار نہیں ہو سکتا ہے۔ میں یہ بھی جانتی ہوں کہ تم سے کسی طرح سے بھی نکاح کے بغیر جنسی تعلقات کی خواہش کرنا زیادتی ہے۔ مگر میں چاہوں گی کہ میری خاطر تم یہ گناہ کر لو۔ یہ محرومی نہ صرف جنسی نوعیت کی ہوگی بلکہ اس محرومی سے جو روحانی دکھ مجھے ہوگا اس سے روحانی طور پر زندہ رہ سکنا میرے لیے تو ناممکن ہو جائے گا......

اس بے باکی سے جو صدمہ تمہیں پہنچا ہو میں اس کے لیے معذرت چاہتی ہوں اگرچہ اس پر مجھے ندامت بالکل نہیں ہے اور میں ممنون ہوں گی اگر مجھ سے ندامت کی امید نہ رکھو۔ یہ خواہش میری بہت گہری روحانی ضرورت ہے۔ تم سے یہ تمام کچھ اس لیے کہہ رہی ہوں کہ صرف تم ہی اس گناہ کو پوری پاکبازی کے ساتھ کر سکتے ہو اور اگر تم گناہ کی خواہش نہ بھی کرو تو مجھے یقین ہے تم جو کچھ بھی کرو گے اس میں پاکبازی اس حد تک ہوگی کہ اس گناہ پر تم کو تمہارا پروردگار بھی مطعون کرنا پسند نہ کرے گا......''

متین نے لارا کے ماتھے سے پسینہ پونچھا اور اپنا ہاتھ اس کے ماتھے پر رکھ دیا۔ متین کے ہاتھ رکھنے سے لارا کے جسم میں ٹھنڈک پہنچنی شروع ہوئی اور اس نے ایک جھرجھری لی اور آنکھیں کھولیں۔ کچھ لمحے تو وہ متین سے نظریں چراتی رہی مگر پھر حوصلہ کر کے متین کی

نظروں سے نظریں ملائیں۔ متین صاحب کے چہرے پر کسی قسم کی الجھن کے آثار نہ تھے، خوشی نہ تھی، غم نہ تھا، ترس نہ تھا۔ ایک اتھاہ سپردگی کا عالم تھا۔ اس سپردگی کے جذبے سے ان کے چہرے پر نجابت چھا رہی تھی۔ لارا اس نجابت کی تاب نہ لا سکی اور اٹھ کر بیٹھ گئی۔ متین کے شانوں پر ہاتھ رکھ دیئے اور پھر شانوں سے ہاتھ پھسلائے، بازو پھسلائے اور متین کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالے اپنے چہرے کو ان کے چہرے کے بالکل قریب لے گئی۔ ان کے چہرے کی کیفیت میں کوئی تغیر پیدا نہ ہوا۔ ان کے تنفس کی رفتار میں کوئی فرق نہ پڑا۔ لارا نے فوراً اپنے لب ان کے لبوں سے پیوست کر دیئے۔ متین صاحب نے اپنے بازوؤں سے لارا کی کمر کو سہارا دیتے ہوئے لارا کو اپنی رانوں پر لٹا دیا۔

اس دن کے بعد ان دونوں میں کس سطح پر بھی پردہ نہ رہا۔ انہوں نے ایک دوسرے کے ہر ابھینائے کو اپنے میں جذب کر لیا اور ایک وقت وہ بھی آیا کہ ان دونوں کو ایک دوسرے میں کوئی امتیاز نہ رہا اور اس کے بعد وہ جسمانی اور مکانی بعد کو برداشت کرنے کے لیے اپنے آپ میں طاقت پانے لگے۔

لارا نے انگلستان واپس جانے کی ساری تیاریاں مکمل کر لیں۔ اس نے متین سے کہا کہ وہ اس کے ساتھ کراچی تک چلے اور جب تک جہاز نہیں چلتا اس کے ساتھ رہے۔ وہ کراچی پہنچے اور ایک دوست کے فلیٹ میں ٹھہرے۔ وہ تمام دن سمندر کنارے نہاتے، کشتی کی سیر کرتے۔ موٹر بوٹ میں کراچی کے قریبی جزیروں میں پکنک مناتے۔ گراموفون پر مغربی موسیقی کے ساگر جگاتے، والز کی دھنوں پر گھنٹوں باہم ناچتے رہتے۔ متین نے ناچ میں اتنی مہارت پیدا کر لی تھی کہ لارا کو یہ یاد بھی نہ رہا کہ وہ کراچی آنے سے پہلے ناچ سے بے بہرہ تھے۔ والز کی لے کے ساتھ جسم سے جسم ملا کر تھرکتے ہوئے ان میں ہیجان کی کوئی شمہ بھر کیفیت پیدا نہ ہوتی۔ موٹر بوٹس میں سیر کرتے ہوئے اجنبیوں کو وہ نئے نئے بیاہے دولہا دلہن لگتے تھے۔ ان کی عریاں ٹانگوں، عریاں بانہوں، نیم عریاں بدن میں اتنی پاکیزگی رچی ہوئی دکھائی دیتی ان کو اچنبھا تک نہ ہوتا اور وہ ان کی وارفتگی پر حیران ہوتے، رشک کرتے۔ انہوں نے کبھی سوچا بھی نہ تھا کہ عریانی ہیجان کے بغیر بھی ہو سکتی ہے۔ کچھ ہی

دنوں میں ساحل کے ملاحوں میں ان کی پاکیزہ عریانی مسلسل سوچ اور تجسس کا موضوع بن گئی اور جب وہ کچھ دنوں کے بعد ان جزیروں میں نہ آئے تو انہوں نے اپنے آپ کو قائل کرنے کی کوشش کی کہ اس جوڑے کو انہوں نے خواب میں ہی دیکھا ہوگا یا پھر وہ دیوی دیوتا تھے جو انسانی دنیا میں بھٹک آئے تھے۔

ان کی راتیں ایک دوسرے کو مسلسل تکتے رہنے، ایک دوسرے کے ہر ابھینائے کو اپنے اندر پیدا کرنے کی کوشش میں گزرتیں۔ ریڈیو یا گراموفون پر موسیقی کا مسلسل ترنم ان کی حرکات میں جذب ہوتا رہتا اور ان کو یہ احساس تک نہ رہتا کہ موسیقی خود ان کی حرکات سے الگ وجود بھی رکھتی ہے۔ رات دن جلدی جلدی گزرتے رہے اور لارا کو لے جانے والا جہاز بندرگاہ پر لگ گیا۔ ان کی خود وارفتگی میں اضافہ ہوتا گیا انہوں نے ایک دوسرے کے روپ اور روح کی سیاحت اس اہتمام سے کرڈالی کہ ان کے روپ اور روح کے الگ الگ عالم ایک مسلسل کھلے ملے ہوئے منظر کی شکل اختیار کر گئے۔ ان کی آخری اکٹھی رات نے جذب، پاگل پن اور شعوری استغراق کے گھال میل، ایک ہمہ گیر احساس کو جنم دیا جس میں ان دونوں کے روپ اور روح کے اجزا شامل تو تھے مگر اس کا وجود ان کی شخصیتوں سے الگ اور اس کی حیات کی ڈگر ان کی زندگیوں سے الگ اور مختلف تھی۔ اس تیسرے وجود نے ان کی اس آخری رات کو ایک منزل میں تبدیل کرنے میں مدد دی جہاں سے وہ اپنے الگ الگ سفر کو جی داری اور اعتماد سے شروع کر سکتے تھے۔ وہ دونوں پلنگوں پر پڑے تاریکی میں بغیر بولے سانس لیتے رہے اور اس تاریکی میں ان کے سانسوں کی بہت ہی نیچے سروں میں اٹھتی موسیقی آہستہ آہستہ کمرے کو معمور کرتی رہی۔ ان کے جسموں کی حدت فضا میں تحلیل ہوکر ایک دوسرے کے جسمانی بُعد کو قرب میں بدل رہی تھی۔ جسم کی حدت، تنفس کی موسیقی نے ان کے اعصاب پر غنودگی طاری کردی اور وہ سو گئے اور ایک دوسرے سے دور، دور ہوتے گئے۔

متین صاحب جب صبح اٹھے تو کمرے میں سورج کی روشنی بھر چکی تھی۔ سڑکوں سے اٹھتا ہوا شور ان کے شعور تک پہنچ رہا تھا۔ دوسرے پلنگ پر بستر سلیقے سے طے کئے رکھا،

کمرے کی ہر چیز قرینے سے رکھی ہوئی۔ میز پر تھرموس، چائے کے برتن، کھانے کے بسکٹ جالی دار ڈولی سے ڈھکے رکھے تھے اور تھرموس کے سہارے ایک نیلا، اجلا اجلا لفافہ انتظار کی گھڑیاں گن رہا تھا۔ متین صاحب جلدی سے اٹھے تکیہ کے نیچے سے گھڑی نکال کر وقت دیکھا۔ لارا کے جہاز کو بندرگاہ چھوڑے تین چار گھنٹے ہو چکے تھے۔ لارا اس کمرے سے اپنے تمام نشانات اپنے ساتھ لے گئی تھی۔ اس کا جو کچھ بھی تھا وہ خود ان کے اپنے اندر تھا۔ انہوں نے میز کے قریب جا کر سجے ہوئے برتنوں پر ایک ٹھٹکی، پھسلتی، لوٹتی ہوئی نگاہ ڈالی۔ خط کو دیکھا اس پر کسی کا پتہ نہ تھا۔ وہ میز سے منہ پھیر کر غسل خانے کی طرف چل دیئے، غسل خانے میں ان کی تمام چیزیں سلیقہ سے رکھی تھیں، ان کا بالوں میں لگانے کا پسندیدہ تیل، ان کی پسندیدہ خوشبو، ان کا ٹوتھ پیسٹ، ان کا برش سب کے سب نئے تھے۔ وہ حیران تھے کہ یہ سب کچھ لارا نے کب خریدا تھا۔ شاید وہ یہ سب کچھ کراچی پہنچنے سے پہلے خرید چکی تھی۔ تو اس نے اس آخری دن کا پروگرام پہلے سے تیار کر رکھا تھا۔ نہا دھو، ڈریسنگ روم میں آئے۔ وہاں ان کے کپڑے، ان کے بوٹ، جرابیں، ٹائی سب اسی قرینے سے رکھے تھے جس قرینے سے وہ ان کو رکھنے کے عادی تھے۔ ان دنوں کی وارفتگی میں وہ اپنا قرینہ اور عادات بالکل بھول چکے تھے۔ لارا نے ان کو اپنی جانی پہچانی زندگی میں واپس لوٹ جانے کے لیے راستوں کا تعین اور سنگ ہائے میل کا بندوبست کر دیا تھا۔ انہوں نے کپڑے پہنے، خوشبو لگائی۔ تھرموس سے چائے انڈیلی، بسکٹ کھائے اور پھر آرام سے کرسی پر دراز ہو گئے۔ سگریٹ کیس سے سگریٹ نکال کر سلگایا۔ نیلے نیلے، اجلے اجلے لفافے کو کھولا۔ ایک خالی صفحہ تھا۔ اس بے لفظ خط نے متین صاحب کے اندر ممنونیت کا ایک بے پایاں جذبہ پیدا کیا اور اس کی رفتار اور شدت سے ان کی آنکھیں دھندلا گئیں اور وہ چیخ چیخ کر رونے لگے، روتے رہے، روتے رہے، آنکھیں بند کئے کرسی پر گھنٹوں پڑے رہے۔ ان کے دل میں، ان کے دماغ میں، ان کے تخیل میں، ان کے لاشعور میں کوئی ہلچل نہ تھی، کامل سکون تھا، سکوت تھا۔

چوتھا باب

ان کا گھوڑا رک گیا۔ چاروں طرف درخت اس ترتیب سے اُگے تھے کہ ایک چوراہا سا بن گیا تھا اور اس چوراہے کے چاروں کھونٹ گلیوں میں بالکل اندھیرا تھا۔ اس کے اوپر درختوں کی ٹہنیوں نے چھت سی بنا رکھی تھی جس میں سے روشنی کی ایک کرن تک نہ گزر سکتی تھی اس چھت سے پرے پرے، ہر طرف چاندنی کا نزول ہو رہا تھا۔ متین صاحب نے ایک لمحہ کے لیے سوچا اور گھوڑے کو مغرب کی طرف بڑھایا۔ کچھ دیر اس تاریک گلی سے گھوڑا گزرتا رہا اور پھر گھوڑے نے تاریکی سے چاندنی میں گردن نکالی۔ متین صاحب اب بھی تاریکی میں تھے۔ گھوڑا ایک بار پھر رک گیا تھا۔ ہر طرف لمبی لمبی گھاس، جھاڑیاں اگ رہی تھیں اور راستہ نظروں سے اوجھل ہو رہا تھا۔ متین صاحب رکابوں میں پاؤں جما کر کھڑے ہو گئے مگر راہ نہ پائی۔ اب وہ گھوڑے کی پیٹھ پر کھڑے ہو گئے۔ ان جھاڑیوں میں تنگ سی گلی پر نظر پڑی جو ان کی طرف سے تو بند تھی مگر دور تک چوڑی ہوتی ہوئی چلی گئی تھی۔ متین صاحب گھوڑے سے اترے اور تھیلے سے بڑا چاقو نکالا۔ جھاڑیوں میں چھپی ہوئی گلی کی طرف بڑھے۔ جھاڑیوں کو کاٹ کاٹ کر راستہ بنایا اور اس راستے کو گلی کے ساتھ ملا دیا اور پھر گھوڑے کی طرف واپس آئے اور سوار ہو کر اس گلی میں سے گھوڑے کو جھاڑیوں کے کانٹوں سے بچاتے بچاتے بڑھنے لگے۔ اوپر درختوں پر چمکدار پتے چاندنی کو آئینہ دکھا کر شرما رہے اور چاندنی کبھی تو پتوں تک پہنچ کے فضا میں واپس لوٹ جاتی اور کبھی بن کے صحن میں اتر آتی تھی۔ اب وہ جھاڑیوں کی گلی کو بہت پیچھے چھوڑ آئے تھے مگر بن ابھی تک ختم ہونے میں نہ آتا تھا۔ درخت صحن اور فضا کے درمیان گلیاں، چھتیں بناتے ہوئے دور تک چلے جاتے تھے وہ بڑھتے رہے، بڑھتے رہے اور کہیں قریب سے پانی کا دھیما دھیما شور ان کی طرف بڑھنا شروع ہوا۔

جب وہ باسل سے فلسفہ کی ڈگری لے کر دیس کو لوٹے تو انہیں ایک مشہور کالج میں

لیکچراری فوراً ہی مل گئی۔ان کا پرانا مکان برسوں سے ان کے پرانے ہمسایے کے بیٹے کے پاس کرایہ پر تھا جس کو خالی کرانا انہوں نے مناسب نہ سمجھا اوراپنے مکان کے پچھواڑے کے محلے میں ایک نئے نئے بنے ہوئے مکان میں آباد ہو گئے۔اس محلے کے اکثر لوگ وہ ہندو تھے جو کئی پشتوں سے وہاں آباد تھے اور ان کے خاندان کو پشتوں سے ایک شریف، مرنجاں مرنج خاندان کی حیثیت سے جانتے تھے اوران کے خاندان کا احترام کرتے تھے۔ خود ان کے اس ہندو آبادی کے کئی خاندانوں سے بچپن کے مراسم تھے۔جن خاندانوں سے ان کے مراسم نہ تھے وہ بھی ان کی ذات میں ان کے بچپن سے دلچسپی لیتے رہے تھے اور اس دلچسپی کا اظہار ہمیشہ آنکھوں کی چمک اور مسکراہٹ سے کرتے رہتے تھے۔ان کو ہمیشہ یہ احساس دلاتے رہتے تھے کہ وہ ان کی ہمسائیگی سے خوش تھے اور وہ ان لوگوں کو اپنا محفوظ ماحول سمجھ سکتے تھے۔اس محفوظ فضا کے بنانے میں نہ صرف بڑے بوڑھوں،ادھیڑ عمر مردوں اورعورتوں کا عمل دخل تھا بلکہ جوان مردوں اورعورتوں،نو جوان لڑکے بالےاورلڑکیوں کا بھی خاصہ حصہ تھا۔ بچے تو خاص طور پران سے متاثر نظر آیا کرتے تھے کیونکہ وہ ان کو دیکھ کر ہمیشہ شرما جایا کرتے مگر ان کی شرماہٹ میں ایک خوشی کا سماں موجود ہوتا تھا۔ان کے جسم کے ابھینایوں سے محسوس ہوا کرتا کہ جیسے ان کے دل میں خواہش ہو کہ ان کو چھوا جائے،ان کی چٹکی بھری جائے،ان کو تھپتھپایا جائے۔

اس محلے کے لوگ صبح سویرے ہی اپنے اپنے کاموں کو نکل جاتے اوراندھیرا ہو چکتا تو گھروں کو لوٹتے۔ دن چڑھ چکتا تو بچے،لڑکے،لڑکیاں سکولوں، کالجوں کو چلے جاتے۔ دوپہر کے وقت محلے میں، آس پاس کی گلیوں میں سنسناہٹ چھا جاتی۔کبھی کبھی کسی مکان میں ہارمونیم کی آواز آتی اور اکثر اس کے ساتھ ساتھ گنگنانے کی آواز جو کبھی کبھی گانے کی شکل بھی اختیار کر لیتی تھی۔گانا نیچے سروں میں شروع ہو کر اتار چڑھاؤ کے ساتھ خاموشی کی آغوش میں سو جاتا اور گلیاں پھر سے سنسان ہو جاتیں۔ ہوا چلتی تو دیواروں سے بغلگیر ہو ہو کر خاموشی کا، سناٹے کا ماتم کرتی ہوئی گزرتی، گرے پڑے، پھٹے پرانے کاغذوں کو ایک عجیب لے کے ساتھ فضا میں بلند کرتی، تیراتی اور پھر ایک دم سے اپنا سہارا نکال لیتی اور

کاغذ لڑکھڑاتے ہوئے گلی کے فرش پر آ رہتے۔

اس سنسان اور خاموشی کے وقت متین صاحب کالج سے لوٹتے تو گنگناتی ہوئی کوئی آواز، ہارمونیم کی لے، ستار کی جھنجھناہٹ انہیں سوچ کی وارفتگی سے چونکا کر بیدار کر دیتی اور ان کے قدم ایک لمحے کے لیے رکتے، ان کی نظریں مکانوں کی کھڑکیوں کی طرف اٹھ جاتیں۔ کبھی کبھی کسی کھڑکی میں کوئی موہنی نہا کر بال سکھا رہی ہوتی، کنگھی کر رہی ہوتی، کسی ہمسائی سے باتیں کر رہی ہوتی۔ ان کی نظریں آپس میں ملتیں اور وہ گھبرا کر، نظریں جھکا، تیز تیز قدم اٹھاتے ہوئے گھر کی دہلیز پار کر، جلد جلد سیڑھیاں چڑھ، اپنے کمرے میں جا کر دم لیتے۔

کبھی کبھی گلی میں نہ تو آواز ہی ہوتی، نہ کوئی لے، نہ کوئی نغمہ صرف ہوا کی دھیمی دھیمی روتی ہوئی سسکیاں بھرتی ہوئی فریاد۔ اِس بے لفظ فریاد سے بے تاب ہو جاتے اور نظریں اٹھا کر کھڑکیوں کو تکتے، آسمان کو تکتے۔ کھڑکیاں خالی، آسمان میں کوئی پتنگ تک نہ ڈولتی دیکھ کر وہ نظریں جھکا کر کھڑے کھڑے سوچ میں کھو جاتے پھر کسی کے قدموں کی چاپ کو اپنی طرف بڑھتے ہوئے سن کر قدم اٹھاتے ئے ہوئے گھر کو چل دیتے۔ اس بے دھیان تیزی میں ان کا اکثر کسی آتی ہوئی جوان سال چھوکری، طرحدار عورت سے موڑ گھومتے ہی آمنا سامنا ہو جاتا اور وہ دونوں ایک لمحہ کے لیے ایک دوسرے کو اچانک دیکھ کر ٹھٹک جاتے۔ لڑکی یا عورت آنکھیں جھکا اور ہونٹوں پر مسکراہٹ تھرکا، پاس سے لہکتی ہوئی گزر جاتی اور جب گلی میں ہوا چل رہی ہوتی تو مخالف سمت سے آتی ہوئی عورت کا لباس ہوا کے زور سے اس کے جسم کے ابھرتے ہوئے، ڈھلکتے ہوئے نقوش کو اور ابھار دیتا، نمایاں کر دیتا اور وہ اس حالت کا تاثر متین صاحب کے چہرے پر دیکھ کر لجاتی، اٹھلاتی، گھبراتی، مسکراتی، دھیرے دھیرے قدم اٹھاتی ان سے ٹکراتے ٹکراتے بچتی ہوئی گزر جاتی اور اس حادثے سے بیدار ہوتے خیالات اور مچلتے ہوئے جذبات کو قابو میں لانے میں ان کو بہت دیر لگتی۔ گھر پہنچ کر وہ بے دھیانی سے جلد جلد کھانا کھا کر اپنے بستر پر کپڑے اتارے بغیر جا پڑتے اور گھنٹوں لذتِ احساس سے مدہوش، بے سدھ پڑے رہتے۔ وہ اسی طرح شام کے

اندھیروں تک پڑے رہتے۔ شام کی پہنائیوں میں سے بلند ہوتے ہوئے ہارمونیم کی لے کے ساتھ اٹھتے ہوئے نغمے کی آواز، دور سے آتی ہوئی گھنٹیوں کا مترنم شور اور فضا میں بلند ہوتی ہوئی، پھیلتی ہوئی، چھاتی ہوئی اذان کی صدا انہیں لذتِ احساس کے بندی خانہ سے رہائی دلاتی اور وہ اٹھ کر منہ دھو، کپڑے پہن، کھانا کھا، دوستوں سے ملنے، اپنی سوشل ذمے داریوں سے عہدہ برآ ہونے کے لیے ایک بار پھر گھر سے نکل پڑتے۔ جب وہ رات گئے گھر کو لوٹتے تو گلی کے کتے بھی بھونک بھونک کر سو چکے ہوتے۔ مگر ہمیشہ ایسا ہی نہ ہوتا۔ مہینوں میں ایسا بھی ہوتا کہ محلّہ میں کہیں شادی رچی ہوتی اور بیاہ والے گھر سے گھروں کو لوٹتی ہوئی، خواب سے چور اور مجبوراً قدم اٹھاتی ہوئی، سجی دھجی، بچیاں، نوجوان لڑکیاں؛ جوانی اور خوابوں سے معمور چھب دکھاتی، جھانجنیں بجاتی جوان عورتیں، متین صاحب کو حیرانی سے مڑ مڑ کر تکتی ہوئی گزر جاتیں۔

جب کبھی کسی دعوت، کسی محفل سے اٹھتے ہوئے ان کو بہت دیر ہو جاتی تو وہ اپنے روزمرہ کے راستے کی بجائے ایک دوسرے راستے کو اختیار کرتے جو ان کے سفر کو چھوٹا کر دیتا۔ یہ رستہ اگرچہ ایک گلی پر مشتمل تھا جو اس علاقے کے کاروباری بازار سے منسلک تھی اور تانگے اور موٹریں اس بازار سے اس گلی میں آ سکتی تھیں کہ گلی خاصی چوڑی تھی۔ گلی میں مسلمانوں کے فارغ البال طبقے کے لوگوں کے گھر تھے جہاں سارا دن گہما گہمی کی کیفیت رہتی تھی کیونکہ اس طبقے میں ایک حصہ ایسے لوگوں کا تھا جو صرف گرمیوں کے موسم میں دور دراز کے علاقوں میں کاروبار اور محنت مزدوری کرنے چلے جاتے تھے اور سردیوں کے موسم میں اپنے گھروں کو لوٹ آتے تھے اور اس موسم کو صرف اپنی چھ سات مہینوں کی کمائی سے خوش خوراکی، خوش لباسی اور خوش گپی میں گزارنے کے عادی تھے۔ لہٰذا سردیوں کے موسم میں وہ محلے کے تھڑوں، بیٹھکوں کو اپنے قہقہوں اور خوشی کے نعروں سے معمور کرتے رہتے اور صبح سویرے اور سہ پہر کے وقت خریداری کرتے، خوش گپیاں کرتے نظر آتے۔ رات کے وقت کسی سینما، کسی مجرے والی کے ہاں سے آتے، مختلف جھرمٹوں میں فقرے بازی کرتے نظر آتے۔ کبھی کبھی یہ فراخ سی گلی بالکل خالی نظر آتی جس پر ایک ندی کا گمان

ہوتا جس میں پانی کی بجائے خاموشی اور سنسناہٹ بہہ رہی ہو۔

ایک دفعہ تو اس قسم کی اتفاقی ملاقات قیامت تھی۔ جس دن ان کے باقاعدہ پروفیسر ہونے کا اعلان ہوا تو ان کے طالب علموں نے ان کے اعزاز میں دعوت دی اور دعوت کا ہنگامہ رات ایک دو بجے تک رہا۔ لہٰذا وہ روزمرہ کے راستے کی بجائے اس چوڑی سی گلی کے رستے گھر کی طرف روانہ ہوئے۔ ابھی وہ اندھیرے میں ملبوس گلی میں داخل ہی ہوئے تھے کہ سامنے سے جوان عورتوں اور نوجوان لڑکیوں کا ایک جھرمٹ کاغذی شمعدانوں میں موم بتیاں اٹھائے چلا آ رہا تھا۔ وہ واپس نہ مڑ سکے تاکہ عورتیں اور لڑکیاں ان کے وجود کا نوٹس نہ لیں۔ لہٰذا وہ چلتے رہے اور جب ان کا اس جھرمٹ سے آمنا سامنا ہوا تو موم بتیوں کی روشنی میں زیور سے سجے ہوئے روشن چہرے جن پر حیا اور مان کے جذبات کھل رہے تھے اور ان چہروں پر دمکتی ہوئی آنکھوں میں شرارت اور اعتماد کا ایک عجب سا امتزاج لرز رہا تھا، جیسے طنز کر رہا ہو کہ تم کیا کر سکتے ہو۔ تم بے بس ہو صرف دیکھ سکتے ہو خاموش، چاہو تو داد دے سکتے ہو مگر خاموشی سے۔ ان کے جسم ان کو للکارتے تھے اور ان کی چال کا مستانہ پن ان کی مردانگی کو متاثر کر رہا تھا۔ ان جوان جسموں، دمکتے چہروں اور روشن اور شوخ آنکھوں کے جھرمٹ نے ان پر رعب طاری کر دیا اور وہ چپ چاپ اور مبہوت اس جھرمٹ کے پاس سے گزر گئے۔

یہ سب کچھ اتنا اچانک تھا کہ ان کے روزمرہ کی اس ہم آہنگی میں خلجان اور ہیجان پیدا ہو گیا جو ان کے حواس، جذبات اور احساسات اور عقل و وجدان کے درمیان رہتی تھی۔ ان کی جسمانی سنسناہٹوں میں ناقابل برداشت شدت آ گئی۔ ان کے دل و دماغ پر نسوانی جسم کو چھونے کی خواہش چھا گئی، ان کے نورِ بصیرت پر تاریکی محیط ہو گئی، ان کے خون میں حدت اتنی بڑھ گئی کہ ان کے حواس جلنے لگے۔ ان پر دیوانگی کا عالم طاری ہوا چاہتا تھا کہ ان کے اندر سے ایک دوسری اور متخالف طاقت ابھری اور ان کے حواس، احساسات اور جذبات کو احساسِ جمال کی صورت اکٹھا کرنے لگی اور اس احساسِ جمال کو ایک واضح شکل میں ڈھالنے لگی، ان کی عقل اور وجدان کو ایک تقویت دینے لگی۔ دونوں قوتوں میں تصادم ایک

تناؤ کی صورت میں بدل گیا اوران میں کشمکش جاری ہوئی۔تیزی سے احساسِ جمال کی قوت کا قابو دوسری طاقت پر بڑھتا چلا گیا اوران کے اندر شعور نفس کی طرف سے ماحول کی طرف مائل ہونے لگا۔انہوں نے محسوس کیا کہ وہ اپنے محلے میں داخل ہوا چاہتے ہیں۔ یکا یک ڈھولک کی خاموش ہوتی ہوئی دھمک اورنسوانی قہقہوں کی کھنک نے بلندیوں سے اتر کر ان کی سماعت پر دستک دی اور وہ چونکے۔ ماحول پر نظر کی۔وہ گھر تک کا راستہ نصف سے کم ہی طے کر پائے تھے انہوں نے محسوس کیا کہ اپنے آپ پر قابو پا چکے تھے۔انہوں نے اطمینان کا سانس لیا اور تیزی سے قدم اٹھانے لگے۔نصف رستہ طے کر لینے کے بعد گلی میں وہ موڑ آ گیا جہاں سے گلی کے آخر میں ان کے گھر کی ایک جھلک سی نظر آنے لگتی تھی جو ہر قدم کے ساتھ کبھی واضح اور غائب ہو جاتی تھی۔وہ موڑ مڑے ہی تھے ان کے بالکل سامنے ذرا سے فاصلے پر ایک بھر پور جسم مگر نازک اندام، سادہ شکل کی دلپذیر لڑکی، ایک ہاتھ میں مٹی کا روشن دیا اٹھائے خوابوں میں لپٹی مستانہ وار چلی آ رہی تھی۔وہ ٹھٹکے اور ایک ہوک ان کے منہ سے نکلی۔ چراغ کی لو ہوا کی نرم نرم تھپکیوں سے لرز رہی تھی اور اس لرزتی ہوئی روشنی میں اس کا سرخ دمکتا چہرہ سونے کے آویزوں اور ماتھے کے جھومر کی چمک کے ساتھ لذتِ حسن کا قصیدہ خواں تھا۔اس چہرے میں حیا اور خوف کے احساسات یکا یک ابھرے اور اس کے سادہ نقوش حسین بنے، آفت بنے۔متین صاحب اب اس کے بہت ہی قریب پہنچ چکے تھے مگر وہ اب بھی خوابوں کے سندر بن میں کھوئی ہوئی تھی۔اس نے نظریں اٹھائیں اور متین صاحب پر صدیاں بیت گئیں۔وہ متین صاحب کو اپنے مقابل بالکل قریب دیکھ کر ڈری، لرزی، ڈگمگائی، اس کے ہاتھ سے چراغ گرا، اس گرے ہوئے چراغ کی ننھی سی صدا کو ہوا اڑا کر کہیں سے کہیں لے گئی۔اس نے لڑکھڑاتے ہوئے متین صاحب سے کترا کر گزر جانے کی کوشش کی اس کا پاؤں گلی میں بہتی نالی کے کنارے پر پڑا اور چکر کھا کر گرنے کو تھی کہ متین صاحب نے اس کو بازوؤں میں لے لیا۔ان کے بازو اس کے جسم کے گداز اور تناؤ سے آشنا ہوتے ہی فضا میں اس کے جسم کے گرد ایک قوس بناتے ہوئے ان کی رانوں سے آ لگے اور پھر فوراً اس کے گرتے ہوئے جسم کے گرد حائل ہو گئے۔اس کا گرم چہرہ ان کے سینے سے لگا، اس کے بالوں سے لڑکھڑا کر اٹھتی ہوئی، ہجرت کرتی ہوئی خوشبو ان کی ناک اور

دماغ میں چھانے لگی۔اس کے سینے کا زیرو بم ان کے جسم کی لرزش میں گھلنے لگا۔اس کے ریشمی کپڑوں کی ملائمی ان کے بازوؤں کو مفلوج کرنے لگی۔وہ دونوں کچھ دیر جسم کی حدت، خوشبو کے عالم، تنفس کی گرمی اور موسیقی میں گم کھڑے رہے۔لڑکی کے جسم میں سے جنبش کی ایک تیز و تند لہر اٹھی اور ان کے مفلوج بازوؤں کے بند کو توڑتی ہوئی گزر گئی۔لڑکی ان کے بازوؤں سے آزاد ہو کر پائل کی جھنکار کو فضا میں چھوڑتی پاس ہی کے مکان کے سایہ میں گم ہو گئی۔

متین صاحب مٹتی ہوئی خوشبو کی مہک، کم ہوتی ہوئی حدت کی، لذت کی تیز و تند لہر کے تھپیڑوں، گم ہوتی ہوئی پائل کی جھنکار کے غیر مرئی محل میں حیران حیران پھرتے رہے، پھرتے رہے۔تا آنکہ ان کی ٹانگیں ان کا، ان کی لذت کا بوجھ اٹھانے سے انکار کرنے لگیں اور وہ گرنے سے بچنے کے لیے ایک مکان کی دیوار سے ٹیک لگا کر زور زور سے لمبے لمبے سانس لے کر شعور، ہمت کو پکار پکار کر واپس بلانے کی کوشش کرنے لگے۔جسم میں طاقت لوٹنے لگی تو ایک دوسرے مکان کے لمبے چوڑے تھڑے پر لیٹ گئے، لیٹے رہے، تھڑے کے فرش کی ٹھنڈک ان کے کپڑوں سے ہوتی ہوئی ان کے جسم کے کونے کھدروں میں گھسنے لگی تو ان کے شعور نے اس لذت اور بے بسی کے خلاف بغاوت کر دی۔

یہ احساسِ شکست کہ ان کا تمام علم، ان کی تربیتِ ذات، احساسِ جمال کی مسلسل آبیاری، اور خیر و شر کی تمیز کا برسوں کی کوشش پیہم سے حاصل کیا ہوا استحکام آج چند لمحوں میں دوبار چکنا چور ہوا اور ان کا برسوں کا ریاض ان کی مدد نہ کر سکا اور وہ جنسی لذت میں بہہ گئے۔ اور ہر بار نسوانی جسم سے اٹھتی ہوئی خوشبو اور سڈول جسم کے لمس سے پیدا ہونے والی حدت ان کو شکست دیتی چلی گئی۔اور اس شکست کے شدید احساس کے ساتھ لذت کا احساس اس طرح مدغم ہوتا رہا اور احساس دلاتا رہا کہ شکست ان کو ایک انجانا سکون مہیا کر رہی ہے جو کئی سطح پر ان کو بھلا سا لگتا رہا جس سے ایک نشہ آور کیفیت ان کے اندر محیط ہوتی چلی گئی۔انہیں بڑی شدت سے احساس ہوا کہ ان کا تمام علم، برسوں کی تربیتِ ذات، اور خیر و شر کی تمیز کا برسوں کے پیہم ریاض سے حاصل کیا ہوا استحکام آج دوبار چند لمحوں میں ان کے جنسی لذت

کے حصول کے احساس کے سامنے ٹھہر نہ سکے اور ان کو شکست سے روشناس کرا دیا۔ اس شکست کے احساس نے ان کے خود شناسی کے احساس کو اتنی سخت ٹھیس پہنچائی کہ وہ بڑی کوشش کے باوجود اس کا مقابلہ نہ کر سکے۔

وہ ایک جست میں اٹھے اور ٹانگیں تھڑے سے لٹکا کر ایک لمحے کے لیے رکے پھر گلی کے فرش پر کود ے اور پھونک پھونک کر قدم اٹھاتے، بڑی مشکل سے گھر کی دہلیز تک پہنچے۔ پہنچ چکے تو ان کا دل سنبھلا کہ خوشبو، ملبوس کی ملائمی، گداز، تنے ہوئے جسم کی حدت، پائل کی جھنکار اب ان کا تعاقب نہیں کر سکتی اور وہ اطمینان سے قدم اٹھاتے، سیڑھیاں چڑھ، اپنے کمرے میں پہنچے۔ کپڑے اتار، بستر ٹھیک ٹھاک کر، تکیے پر سر رکھ کر لیٹ گئے۔ لیٹے ہی تھے کہ خوشبو کی مہک، ملبوس کی ملائمی، گداز تنے ہوئے جسم کی حدت، آویزوں اور جھومر کی چمک کی روشنی میں دمکتے ہوئے چہرے کی جھلک، پائل کی جھنکار نے ان کے دل و دماغ پر آخری شورش کی اور وہ ایک طویل غنودگی میں کھو گئے۔

جب ان کو ہوش آیا تو ان کی پھوپھی اماں نے ان کو بتایا کہ شدید تیز بخار کے سبب وہ دو دن بے ہوش پڑے رہے۔ ڈاکٹروں کی تشخیص تھی کہ وہ کسی منظر سے دہشت زدہ ہو گئے تھے۔ پھوپھی اماں کا، جو اب ان کے گھر کا انتظام سنبھالتی تھیں، یہ خیال تھا کہ انہوں نے بھوت دیکھ لیا تھا۔ چند دن بعد وہ اس قابل ہوئے کہ گھر سے قدم نکال سکیں ان کی پھوپھی نے ان سے وعدہ لیا کہ وہ اب رات گئے گھر نہ لوٹیں گے۔ کچھ عرصہ بعد انہوں نے کالج کے پاس ایک چھوٹی سی کوٹھی کرایہ پر لے لی اور اس میں آباد ہو گئے احساسِ شکست، لذتِ جنس کو انہوں نے انسانی ذات کے ارتقاء کی لازمی منازل تسلیم کر لیا۔

پانچواں باب

گھوڑے کی رفتار کے ایک دم تیز ہو جانے کے احساس نے انہیں چونکا دیا۔ انہوں نے دیکھا تو نہ وہ بن تھا نہ درخت، ایک وسیع و عریض میدان تھا جس کی سطح مغرب کی طرف

برابر بلند ہوتی جا رہی تھی۔ انہوں نے بن میں مڑ کے دیکھا تو بن کے درخت بہت دور رہ گئے تھے۔

چاند کی کرنیں اب گھاس پر ٹیڑھی ٹیڑھی پڑ رہی تھیں آسمان پر سفیدی کہیں نہ تھی۔ آسمان بالکل نیلا نیلا ہو رہا تھا۔ اس نیلے رنگ میں ایک دھج تھی، ایک گہرائی تھی، اس گہری نیلاہٹ میں تارے اپنے گرد کرنوں کا جال بن رہے تھے۔ ہوا بالکل تھم گئی تھی۔ پانی کا گنگناتا ہوا شور اب ان کے بالکل قریب تھا۔ وہ مغرب کی طرف بلند ہوتی ہوئی سطح پر چڑھنے لگے۔ انہوں نے اپنے کالے گھوڑے کی گیلی گیلی گردن پر بڑی ممنونیت اور پیار سے ہاتھ پھیرنا شروع کیا۔ گھوڑے نے گردن موڑ کر ان کی توجہ کا آنکھوں آنکھوں سے شکریہ ادا کیا اور پھر منہ مغرب کی طرف کر کے بڑھتا چلا گیا۔ اب وہ میدان کی آخری بلندی پر پہنچ چکے تھے۔ ان کے سامنے میدان کی ڈھلوان کی طرف نیچے پتھریلے فرش پر، چاندنی میں دو ندیاں شمال اور مغرب کے پہاڑوں سے بہتی ہوئی چلی آ رہی تھیں اور جنوب کی طرف کچھ دور جا کر ایک دوسرے میں مل کر ایک دریا کی شکل اختیار کر رہی تھیں۔ ان ندیوں سے دور ایک سفید اور بھورے رنگ کے گھوڑے پر سواری کے لباس میں ملبوس شاید کوئی عورت آ رہی تھی۔

اب متین صاحب کی آنکھیں بالکل کھل چکی تھیں۔ ان کا شعور بیدار تھا، ان کی رانوں میں طاقت کی ایک بہت بڑی لہر اٹھ رہی تھی وہ دور سے آتے ہوئے سوار اور اس کے سائے کو چاندنی میں نقش بناتے، مٹاتے دیکھ کر سخت متعجب ہوئے۔ سوار اب ایک ندی کو عبور کر کے ندیوں کے درمیان سرسبز قطعۂ زمین میں آ چکا تھا۔ ان کے گھوڑے کے جسم میں ایک تناؤ پیدا ہوا، اس کے کان کھڑے ہوئے۔ انہوں نے غور سے دیکھا تو سبزہ میں ایک پھن دار سانپ پھن اٹھائے شمال کی جانب سے بڑی تیزی سے گھوڑے کی پچھلی ٹانگوں کی طرف بڑھا آ رہا تھا۔ متین صاحب نے گھوڑے کے پیٹ کے ساتھ، اپنی ران کے نیچے لٹکی ہوئی تھیلی سے بندوق نکالی، بندوق کا تالہ کھولا اور نشانہ باندھ کیے بعد دیگرے دو گولیاں چلائیں۔ سانپ کا پھن فضا میں ریزہ ریزہ ہو کر بکھر گیا۔ گھوڑے پر سوار ڈرا، گھوڑے نے

اگلی ٹانگوں کو اٹھایا، پھنکارا پھر شمال کی طرف منہ کر کے ایک دائرہ بنایا۔ ہوا کو دھکیلتے ہوئے متین صاحب کی طرف تیزی سے بھاگنا شروع کیا۔ سوار کے ہاتھ سے باگیں چھوٹ چکی تھیں۔ اس کی رانیں گھوڑے کے پیٹ کے دونوں طرف پیوست ہوگئی تھیں۔ اس کی کمر گھوڑے کی پیٹھ کی طرف پیچھے کی طرف جھک گئی تھی۔

گھوڑا سرپٹ چلا آ رہا تھا۔ مگر اس کی تیز رفتاری میں طویل تربیت صاف صاف نظر آ رہی تھی۔ اس کی تربیت، اس کی تیز رفتاری، خرامِ ناز کا روپ بنی ہوئی تھی۔ اس کے چاروں پاؤں ایک ساتھ ہوا میں بلند ہوتے اور پھر زمین پر آتے تھے۔ چاندنی اور ندیوں کی چمک میں اڑتا ہوا سفید، بھورا گھوڑا، طاقت اور فن کا امید افزا اور مسرت انگیز روپ، چاندنی کے تخت پر ہوا کی لہروں کے سہارے متین صاحب تک پہنچ رہا تھا۔ ان کی سوچ، ان کا تخیل، ان کی قوتِ ارادی، اس روپ کی رعنائیوں سے مبہوت ہوگئی۔ ان کو اچھی طرح سوجھ رہا تھا کہ سوار کی موت واقع ہوسکتی ہے اگر گھوڑے کی رفتار کو سکون میں نہ بدلا گیا مگر ان کے لاشعور سے کوئی طاقت ان کو ہلنے، گھوڑا بڑھانے، آواز دینے سے روک رہی تھی اور ان کے ذہن ہی ذہن میں ذمہ داری اور لطف ولذت کے احساسات ایک دوسرے کو اپنے مقام سے ادھر ادھر نہ ہٹا سکے۔

گھوڑا ب متین صاحب کی جائے قرار اور ندی کے درمیان کا میدان طے کر چکا تھا۔ وہ سنگلاخ زمین سے گزر کر نرم نرم گھاس پر آ چکا تھا۔ متین صاحب کے لاشعور سے ایک زور کی لہر اٹھی، شعور میں ہلچل کی، خیال میں ڈھلی، اور آواز بن کر متین صاحب کے ہونٹوں کو چیرتی ہوئی فضا میں پھیلی! ''ہالٹ!''

گھوڑے کے قدم ہوا سے ایک دم زمین پر آئے اور آتے ہی زمین میں گڑ گئے، سوار کے تنے ہوئے جسم میں نرمی پیدا ہوئی، رانوں میں جنبش ہوئی، کمر آگے کی طرف جھکی، ہاتھ گردن پر ڈگمگاتے ہوئے جمے، پاؤں رکابوں سے نکلے اور سوار نے اپنی دائیں ٹانگ کو اٹھانے کی کوشش کی اور اس کوشش میں گھوڑے کی بائیں جانب آہستہ سے پھسلا اور آرام سے گھاس پر آ رہا۔

متین صاحب گھوڑے سے اترے اور بلند سطح سے تیز تیز بھاگتے ہوئے، گرے ہوئے سوار کے پاس پہنچے، گھوڑے کی گردن کو پیار سے سہلایا اور اس کو باگوں سے پکڑ کر ایک طرف لے گئے اور اس کو کمر پر تھپکی دی۔ گھوڑا اپھنکارا اور پھر نرم نرم گھاس پر ناز سے خرام کرنے لگا۔

گھوڑے سے فارغ ہو کر متین صاحب گرے ہوئے سوار کی طرف متوجہ ہوئے۔ سوار آسمان کی طرف منہ کئے بے حس پڑا تھا۔ جب متین صاحب نے سوار کو پہلی نظر میں دیکھا تو انہوں نے اسی وقت اندازہ لگا لیا کہ عورت ہے۔ عورت کے سر پر سرخ اور پیلا ریشمی رومال بندھا تھا۔ اس کے ماتھے پر پسینے کی بوندیں چاندنی سے برسرِ پیکار تھیں۔ اس کی بائیں آنکھ اور رخسار کے درمیان اس کی ناک کا سایہ ایک پراسرار ترغیب کو جنم دے رہا تھا۔

متین صاحب زمین پر گھٹنوں کے بل جھک گئے۔ انہوں نے سرخ پیلا رومال اس کے سر سے کھولا۔ رومال سے اس کے ماتھے اور چہرے سے پسینہ پونچھا۔ کچھ سوچ کر جلد جلد اپنے گھوڑے کی طرف بڑھے جو اب بلندی سے اتر کر ان کے پاس ہی پھر رہا تھا۔ تھیلے سے موم جامہ اور جانماز نکالا اور پھر سوار کی جانب بڑھے۔ موم جامہ گھاس پر بچھا کر اس پر جانماز بچھائی اور سوار کو اس کے اوپر لٹا دیا۔ اس کے کوٹ کے بٹن کھولے، گریبان کھولا، بوٹ اتارے، جرابیں اتاریں، اس کے پاؤں اور ہاتھوں کی ہتھیلیوں کی مالش کی اور اس کو الٹا کر اسکی کمر کی آہستہ آہستہ مالش کی۔ سوار کے جسم میں حرکت ہوئی انہوں نے مالش کرنا بند کر دیا۔ پاؤں میں جرابیں دوبارہ پہنا دیں، بوٹ پہنائے، گریبان کے بٹن بند کئے، رومال اس کے سر پر رکھ دونوں کناروں کو اس کی ٹھوڑی کے نیچے باندھ، گھاس پر بیٹھ کر اس کے ہوش میں آنے کا انتظار کرنے لگے۔

سوار نے آنکھیں کھولیں اور فوراً بند کر لیں، شاید چاندنی برداشت نہ ہوئی۔ پھر اس نے اٹھنے کی کوشش کی۔ متین صاحب نے اس کے ہاتھ ہاتھوں میں لے کر اٹھا کر بٹھایا اور خود اس کی کمر کے ساتھ کمر لگا کر بیٹھ گئے۔ وہ اسی طرح بیٹھے رہے، خاموش ساکت، جسموں کی گرمی نے عورت کو گویائی بخشی۔

''آخر آپ کو کیا سوجھی کہ تڑتڑ گولیاں چلانی شروع کردیں۔ مجھ سے، میرے گھوڑے سے کیا عداوت تھی؟ اس چاندنی میں گولی چلاتے ہوئے آپ کے دل نے کیوں نہ روکا......''

متین صاحب نے اس کی بات کو نرم نرم دھیمی، پرسکون آواز سے کاٹتے ہوئے کہا ''گولی نہ چلاتا تو اس وقت نہ آپ ہوتیں نہ آپ کا گھوڑا......''

''کیوں؟ چاندنی نگل جاتی؟'' اب اس کی آواز میں ایک لٹک آچکی تھی۔

''نہیں! سانپ کاٹ لیتا۔''

''سانپ؟'' اس کی آواز کانپی

''جی ہاں سانپ۔ چوڑے چکلے پھن والا سانپ۔ وہ آپ کے گھوڑے کی شمال کی طرف سے پھن اٹھائے تیزی سے بڑھ رہا تھا۔ گولی نہ چلاتا تو کیا کرتا؟''

ایک بار پھر وہ چپ تھے۔ عورت کے جسم میں ایک کپکپی دوڑنے لگی۔ متین صاحب نے اس سے پوچھا کہ وہ خود اپنے گھوڑے پر سوار ہو کر جانا پسند کرے گی یا وہ اس کو اپنے گھوڑے پر پیچھے بٹھا کر گھر تک چھوڑ آئیں۔ وہ ایک دم اٹھی اور اپنے گھوڑے کو بلایا۔ رکاب میں پاؤں رکھنے کی کوشش کرنے لگی تو بانہوں نے، ٹانگوں نے جواب دے دیا اور متین صاحب کو تکنے لگی۔ متین صاحب نے اس کو اٹھا کر اپنے گھوڑے پر بٹھایا اور خود بھی اس پر سوار ہو گئے۔ عورت ان کی کمر سے سر لگائے بیٹھی تھی۔ متین صاحب نے اس کے دونوں ہاتھ پکڑ کر اپنے پیٹ پر باندھ لئے۔ سفید بھورا گھوڑا سر جھکائے ان کے آگے آگے روانہ ہو گیا، اور وہ اس کے پیچھے پیچھے چلنے لگے۔ آگے پیچھے چلتے ایک بلند قامت پہاڑ کی کمر کے سامنے پہنچے۔ وہ کمر کے سایہ میں چلتے چلتے ایک پہاڑی کے دامن میں پہنچے۔ اس پہاڑی کے اوپر ایک عمارت کی کھڑکیوں سے روشنی ٹمٹماتی نظر آ رہی تھی۔ عورت کا گھوڑا پہاڑی کے گرد چکر کاٹ کر سڑک پر آیا اور اس سڑک سے ایک اوپر چڑھتی ہوئی سڑک پر چڑھنے لگا۔ دونوں گھوڑوں کی ٹاپوں سے خاموشی گونجنے لگی۔ اس گونج میں کسی کے قدموں کی آواز بھی شامل ہو گئی۔ شاید کوئی ان کی طرف آ رہا تھا۔

بھورا سفید گھوڑا سڑک کا موڑ مڑ چکا تھا اور ان کی نظروں سے اوجھل ہو گیا۔ اس کے ٹاپوں کی آواز رکی اور ایک سسکی اور پھر ایک چیخ خاموشی کو چیرتی ہوئی دور نکل گئی۔ اتنے میں متین صاحب بھی موڑ پار کر چکے تھے۔ بھورے سفید گھوڑے کی باگیں ایک بوڑھے آدمی نے تھام رکھی تھیں اور وہ رو رہا تھا۔ گھوڑے کے قدموں کی آواز سن کر اس نے سر اٹھایا۔ متین صاحب کی طرف سوالیہ انداز میں دیکھا۔ متین صاحب نے گھوڑا روکا۔ گھوڑے کے رکتے ہی عورت کے جسم میں حرکت ہوئی۔ عورت کا سر ان کی کمر سے پھسلنے لگا، اس کے ہاتھ ان کے پیٹ سے کھل کر ان کی رانوں پر اٹکتے ہوئے گرے۔ وہ ایک دم زین میں مڑے اور عورت کو گرنے سے بچالیا۔

بوڑھا عورت کو گرتے دیکھ کر ایک دم ان کی طرف بڑھا اور عورت کو اپنی گود میں لے لیا۔ اتنے میں ایک لڑکا بھی آنکھیں ملتا ملتا ان کی طرف بڑھا۔ بوڑھے نے اس کو سر کے اشارے سے گھوڑوں کو سنبھالنے کو کہا اور خود عورت کو اٹھائے عمارت کی طرف بڑھنا شروع کر دیا۔ متین صاحب نے بوڑھے سے کہا کہ بابا تھک جاؤ گے میں اٹھائے لیتا ہوں تمہاری بی بی کو۔

''آج اپنی بی بی کی خدمت کا موقع نجانے کتنے برسوں کے بعد ملا ہے۔ ورنہ بی بی تو مجھے کام کو ہاتھ نہیں لگانے دیتیں۔ سمجھتی ہیں میں بہت بوڑھا ہو گیا ہوں مگر میرے بازوؤں میں اب بھی اتنی طاقت ہے کہ بی بی کو اسی طرح اٹھا سکوں جس طرح اسے بچپن میں اٹھائے پھرتا تھا۔''

عورت کے بوجھ سے بوڑھے کی کمر جھک گئی تھی مگر وہ اپنے بوجھ سے دستبردار نہیں ہونا چاہتا تھا اور جلد جلد قدم اٹھائے چلا جا رہا تھا۔ عمارت کے قریب پہنچے تو ایک ادھیڑ عمر کی عورت ان کی منتظر کھڑی تھی اس نے بڑھ کر ایک کمرے کا دروازہ کھول دیا۔ بوڑھے نے عورت کو بستر پر لٹا دیا۔ متین صاحب نے ادھیڑ عمر کی عورت کو کہا کہ وہ فوراً دودھ گرم کر کے لائے اور اس کے بعد گرم پانی لائے۔ بوڑھا اب ہانپ رہا تھا اور فرش پر بیٹھ گیا تھا۔

متین صاحب نے بے ہوش عورت کے بوٹ اتارے، جرابیں اتاریں اور اس کو

لحاف اوڑھا دیا۔ اتنے میں عورت واپس آ گئی۔ انہوں نے اس کو بتایا کہ وہ اس کے کپڑے اتار کر اس کو دودھ پلانے کی کوشش کرے۔ کمرے میں آگ جلائے اور گرم پانی کی بوتلیں بستر میں رکھ دے اور تمام دروازے بند کر دے اور روشن دان کھول دے۔ ہدایات دے کر وہ کمرے سے باہر نکل آئے تو چاندنی پھیل چکی تھی، سائے بڑھ رہے تھے۔ مغرب کی طرف اجالا ہو رہا تھا۔ مکان کے صحن میں استادہ درختوں کی اونچی اونچی ٹہنیوں پر کرنیں قبضہ جمانے میں کوشاں نظر آ رہی تھیں۔

وہ سڑک سے نیچے اترنے لگے اور موڑ پر پہنچ کر اصطبل میں داخل ہوئے اور لڑکے سے اپنے گھوڑے پر زین کسوا، سوار ہو کر اُجالے اندھیروں میں کھو گئے۔

حصہ سوم

پہلا باب

داؤدنگر پہنچے تو دن آفاق کی سرحدوں کو اپنی سلطنت میں شامل کر رہا تھا۔ لوگ گھروں سے نکل کر کھیتوں کو آ رہے تھے۔ ڈھور ڈنگروں کے گلے کی گھنٹیوں کی صدائیں ہوا کے سینے سے کھیل رہی تھیں۔ نرم نرم زمین پر گھاس کے پٹھوں پر شبنم کی بوندوں میں شفق پھول رہی تھی۔ راہگیروں سے سلام علیکم، وعلیکم کرتے متین آغا منزل کے قریب پہنچ گئے۔ رافعہ نے کھڑکی سے انہیں دیکھا اور پکاری ''آپ کہاں تھے۔ بھیا کہاں ہیں۔ ہم نے آپ کی تلاش میں بہت لوگ دوڑا رکھے ہیں''۔

متین صاحب جواب دیئے بغیر اصطبل کی طرف مڑ گئے اور گھوڑا رکھوالے کے سپرد کر کے اپنے کمرے کی طرف چلے۔ رافعہ ان کی ٹانگوں سے لپٹ گئی۔ انہوں نے اس کو گود میں اٹھالیا اور کمرے میں داخل ہو گئے۔ رافعہ ان کو سوچ میں دیکھ کر خود بھی چپ رہی اور ان کے چہرے کو بڑے غور سے دیکھنے لگی، ان کے نقوش کو بولنے کی دعوت دینے لگی مگر نقوش تھے کہ شاید سوئے ہوئے تھے۔ رافعہ کو جرأت نہ ہوئی کہ ان کو بیدار کرنے کی کوشش کرے۔ متین صاحب نے رافعہ کو ایک کرسی پر آرام سے بٹھا دیا۔ بندوق سے گولیاں نکال کر اس کو حفاظت سے رکھا۔ دوسرے کمرے میں جا کر سواری کے کپڑے اتار کر روزمرہ کے کپڑے پہنے۔ غسل خانے میں جا کر منہ ہاتھ دھویا، بالوں کو پانی لگا کر کنگھی کی اور پھر رافعہ کے پاس آ گئے اور ایک دوسری کرسی پر دراز ہو گئے۔ اتنے میں ناشتہ آ گیا۔ رافعہ بولی ''میں آپ کے لئے چائے بناتی ہوں۔ میں بہت اچھی چائے بناتی ہوں۔ بھیا کی چائے میں ہی بنایا کرتی

ہوں۔'' متین صاحب خاموشی سے ناشتہ کرتے رہے۔ اٹھے ہاتھ دھوئے اور دوشالہ اوڑھا اور رافعہ سے کہنے لگے'' آؤ! باہر کھیتوں میں سیر کریں۔''

باہر کھیتوں میں نمی تھی۔ رافعہ کے بوٹ اور جرابیں بھیگ گئیں مگر وہ کچھ نہ بولی۔ وہ متین صاحب کی خاموشی کا شاید احترام کرنا چاہتی تھی۔ وہ ان کی انگلی پکڑے ساتھ ساتھ چلی جارہی تھی کچھ سوچنے لگی اور سوچتے سوچتے بے دھیانی میں کہنے لگی۔

''میں نے آپ کے کہنے کے مطابق چاند سے صلح کر لی ہے اس نے وعدہ کیا ہے کہ وہ اب جھوٹ نہیں بولے گا۔''

متین صاحب اب بھی چپ ہی رہے اور اسی رفتار سے چلتے رہے۔

کھیتوں کے درمیان، کھڑی فصلوں کی اُوٹ میں ایک عمارت نظر آ رہی تھی۔ عمارت کے پیچھے قبرستان تھا، اس کے ایک طرف باغ تھا اور اس کے آگے لکڑی کی جالی دار چھت کے اوپر پھول دار بیلیں چڑھی تھیں اور اس کے سایہ میں بید کی چند کرسیاں بچھی تھیں۔ وہ ایک کرسی پر بیٹھ گئے اور رافعہ کو اٹھا کر گود میں بٹھالیا۔ جہاں ان کی کرسی رکھی تھی وہاں چھت پر چوڑے چوڑے پتوں نے سایہ کر رکھا تھا اور سورج کی کرنیں پتوں سے آنکھ بچا کر کبھی کبھی نیچے فرش پر اتر آتی تھیں اور پھر کھٹ سے واپس لوٹ جاتی تھیں۔ رافعہ کرنوں کے اس معصوم کھیل میں دلچسپی لیتے لیتے اس میں مگن ہوگئی۔ کچھ دیر میں اس کا جی اس کھیل سے بھر گیا اور وہ ایک بار پھر متین صاحب کے چہرے کو دیکھنے لگی۔ اب اس میں صبر نہ رہا، وہ گود سے اتر گئی۔ اس کا خیال تھا کہ متین جاگ جائیں گے مگر وہاں تو جنبش تک نہ ہوئی۔ اس نے آنکھیں مٹکاتے ہوئے لٹک سے کہا'' آخر یہ بھی کیا ہوا۔ چپ ہیں تو چپ ہی ہیں۔ آخر آپ بولتے کیوں نہیں۔ بات کیجئے نا۔ میرا دل گھبرا رہا ہے......اوہ میں تو بھول ہی گئی تھی۔ اے جی! آپ بھیا کو کہاں چھوڑ آئے ہیں۔'' اس نے متین صاحب کا ہاتھ پکڑ کر زور زور سے ہلایا۔

متین صاحب سوچ سے جاگتے ہی بولے'' تم کیا کہہ رہی تھی؟'' ''میں پوچھتی ہوں آپ میرے بھیا کو کہاں چھوڑ آئے ہیں۔ وہ عالمہ باجی کے ہاں تو نہیں گئے۔ شام ان کے

ہاں سے سلام آیا تھا۔'' ''مجھے صحیح صحیح معلوم نہیں کہ وہ اس وقت کہاں ہیں۔'' ''ہیں؟ آپ کو معلوم نہیں تو کس کو معلوم ہوگا۔ میں ساتھ گئی ہوتی تو مجھے معلوم ہوتا۔'' ''بات یہ ہے رافعہ کہ ہم کل سادات پور چلے گئے۔ وہاں ایک بہت بڑا مقبرہ ہے۔ پتہ ہے نا مقبرہ کیا ہوتا ہے؟''

رافعہ مسکرائی۔ اس کی آنکھیں کہہ رہی تھیں کہ متین صاحب آپ بھی بس بہت بدھو ہیں۔ میں اتنی بڑی لڑکی اور مجھے پتہ نہ ہو کہ مقبرہ کیا ہوتا ہے!

''وہاں کے پیر صاحب کے یہاں مہمان رہے۔ میں تو شام کو ہی چلا آیا تھا۔ تقی کو انہوں نے ٹھہرا لیا تھا۔ وہ اب شاید وہاں سے چل پڑا ہوگا۔ آ ہی جائے گا۔ آخر تمہاری طرح بچہ تو نہیں کہ کھو جائے گا۔''

''ہوں، میں اور کھو جاؤں، ایسا کیسے ہوسکتا ہے۔ میں تو سارے گاؤں سے واقف ہوں۔ سب لوگ مجھے جانتے ہیں۔''

''مگر تمہارے گاؤں کے علاوہ بھی تو بہت سے گاؤں ہیں۔ وہاں تو تمہیں کوئی نہیں جانتا۔''

رافعہ سوچ میں پڑ گئی۔ سوچتی سوچتی باغ کی طرف بڑھی۔ ایک پھول سی تتلی اڑی اور رافعہ اس کے تعاقب میں نکل گئی۔

کہیں دور سے تقی کی آواز آنے لگی وہ رافعہ کو پکار رہا تھا۔ اس کے جواب میں رافعہ نے اسے بتایا کہ متین صاحب مہمان خانے کے باہر، باغ میں، بیلوں کے نیچے بیٹھے ہیں۔ پھر ایک دم تمام فضا میں خاموشی چھا گئی۔ کہیں دور سے کسانوں کے باتیں کرنے کی آوازیں آ رہی تھیں۔

سورج کی گرمی اب متین صاحب کی کرسی کے قریب پہنچنے لگ گئی۔ متین صاحب اٹھے اور ٹہلنے لگے۔ پھر قبرستان کا لکڑی کا دروازہ کھول کر قبرستان میں داخل ہو گئے اور قبروں کے کتبے پڑھنے لگے۔ ایک کتبے پر الفاظ مٹ رہے تھے اور وہ جھک کر اس کو پڑھنے کی کوشش کرنے لگے مگر باوجود کوشش کے وہ الفاظ کو پڑھ نہ سکے۔ وہ اٹھ کر کھڑے ہو گئے اور ان کے کانوں میں دبے دبے قہقہے کی صدا آنے لگی۔

''متین صاحب اس قبرستان میں کیا کر رہے ہیں۔ابھی سے موت میں اتنی دلچسپی؟ آیئے! گھر چلیں۔آج دوپہر کا کھانا میری پھوپھی کے یہاں ہے۔''

متین قبرستان سے نکل آئے اور تقی کے ساتھ گھر کی طرف چل دیئے۔

دوسرا باب

''میں معذرت خواہ ہوں کہ میں نے آپ کو آزمائش میں ڈال دیا۔مگر مجھے عالمہ بہت ہی عزیز ہے اور اس کے کسی طرح میں کام آسکوں تو مجھے بہت ہی خوشی ہوگی اور عالمہ کے والدین اس کی حالت سے بہت پریشان ہیں۔وہ نہ تو بیمار ہے اور نہ صحت مند۔وہ کسی غیر سے یہ بیان بھی تو نہیں کر سکتے چاہے غیر ڈاکٹر ہی کیوں نہ ہو۔عالمہ کے متعلق صحیح علاج ایک نیک، حکیم قسم کا ڈاکٹر ہی کر سکتا ہے اور میں آپ کے سوا کسی ایسے آدمی کو جانتا ہی نہیں۔یہ میں مانتا ہوں کہ آپ نے اپنے پیشے کو عرصہ ہوا خیر باد کہہ رکھا ہے مگر آپ کے لئے بقول شاہ صاحب ایک بار پھر اپنا اصلی پیشہ اختیار کرنا لازمی ہے۔میرے لئے عزت اور فخر کا باعث ہوگا اگر آپ اپنے پیشے کی طرف لوٹنے کا آغاز عالمہ سے کریں۔عالمہ کا مرض بھی تو ایسا ہے کہ آپ کی تمام صلاحیتوں کو للکارتا ہے۔اس کا صحیح علاج آپ کی آئندہ زندگی کا فیصلہ بھی تو ہوسکتا ہے۔''

''ہوسکتا ہے مگر مجبوری کے حالات کے تحت ایسا کرنا مجھے مناسب نظر نہیں آتا۔''

''آپ کی شکایت بجا ہے۔''

''مجھے تم سے تو کوئی شکایت نہیں۔صرف اس بات سے ذرا سی جھنجھلاہٹ ضرور ہے کہ آخر اتنی جلدی زندگی کی آئندہ ڈگر کا فیصلہ کیوں کیا جائے اور وہ بھی مجبوری کی حالت میں۔مجھے پہلے بتا دیا ہوتا تو میں اپنے آپ کو ذہنی اور جذباتی طور پر اس فرض کے لیے تیار کر لیتا۔بس اتنی سی بات تھی جس کو تم نے شکایت سمجھا۔ایسا نہیں ہے۔''

''خود مجھے اس بات کا پتہ ہوتا تو یقیناً آپ سے پیشتر ہی ذکر کر دیتا۔ میں تو سادات پور سے واپسی پر پھوپھی کے ہاں سے ہوتا آیا تھا۔ انہوں نے آپ کے متعلق پوچھا تو میرے منہ سے نکل گیا کہ آپ ڈاکٹر ہیں۔ پوچھنے لگیں کہ ''آپ میرے دوست کیسے ہیں۔ ان کا خیال ہے کہ میرا دوست عمر میں مجھ سے اتنا بڑا کیسے ہوسکتا ہے۔تب مجھے آپ کے متعلق بہت سی باتیں بتانی پڑیں کہ ان کی تسلی ہو جائے۔ان میں وہ باتیں بھی شامل ہیں جو شاہ صاحب کے یہاں ہوئی تھیں اور کل کے تمام واقعات۔ان کی تسلی ان تمام باتوں سے ہوئی کہ نہیں میں نہیں کہہ سکتا مگر وہ چپ ہو گئیں اور اس کے بعد اس معاملے میں کوئی سوال نہ کیا۔ان تمام باتوں سے انہوں نے کیا کچھ اخذ کیا میں نہیں جانتا۔انہوں نے اس خواہش کا اظہار کیا ہے کہ عالمہ کا علاج آپ ہی کریں۔''

تقی بات کرتے کرتے اٹھ کر ٹہلنے لگا، ٹہلتا رہا اور ٹہلتے ٹہلتے وہ بڑی تیزی سے اپنے پاؤں پر گھوما اور متین صاحب کی طرف بہت سوال طلب نگاہوں سے تکتے بولا۔

''آپ یہ بتائیے کہ عالمہ کی بیماری کا علاج ہو بھی سکتا ہے یا نہیں؟ اگر ہوسکتا ہے تو کتنی دیر میں؟ کیا اس دیر میں وہ زندگی کی نعمتوں سے محروم تو نہ رہے گی اور ٹھیک ہو جانے کے بعد اس میں اتنی طاقت اور جرأت باقی رہے گی کہ زندگی کی نعمتوں میں سے اپنا حصہ حاصل کر سکے؟''

متین کے لبوں پر ایک مسکراہٹ سی تیرنے لگی اس میں بیم و رجا، شک اور یقین، جرأت اور فرار کے احساسات ایک روپ میں ڈھل رہے تھے جس کے متعلق تقی نے فیصلہ کرتے ہوئے جھجک محسوس کی اور اس جھجک کی رو میں فرار کی صورت اختیار کرنے میں تقی نے کوئی قباحت نہ سمجھی۔

اسی مسکراہٹ کے عالم میں متین صاحب نے لرزتی ہوئی آواز میں جواب دینے کی کوشش کی۔''اس کا جواب تمہیں خود عالمہ نے بہت پہلے دے رکھا ہے۔اس نے اپنی بیماری کا خود تجزیہ کیا ہے اور اس کے لئے جو علاج وہ لازمی سمجھتی ہے وہی صحیح ہے۔میری یہ رائے نہ صرف بحیثیت ڈاکٹر کے ہے بلکہ اس میں میری تمام صلاحیتوں کی سوچ شامل ہیں۔اس

سے زیادہ کچھ کرنے کی کوشش نہ صرف فضول ہے بلکہ عالمہ کے دکھ میں اضافہ کرنے کا باعث بن سکتی ہے''۔

تقی کے لئے اس تجزیہ اور تجویز کردہ علاج کو قبول نہ کرنے کا کوئی جواز نہ تھا مگر پھر بھی وہ اس کو قبول کرنے کے لئے تیار نہ تھا۔ کیونکہ وہ اس سلسلے میں کچھ بھی تو نہ کر سکتا تھا۔ یہ خیال اس کے لئے بہت ہی تکلیف دہ تھا کہ وہ عالمہ کو اس کی حالت پر چھوڑ دے اور کچھ نہ کرے۔ وہ اس تذبذب کے عالم سے نکلنے کی کوشش کرتا مگر اسے بار بار ناکامی ہوتی رہی۔ ایک لمحہ اس کے ذہن میں ایک خیال اور ایک سوال اتنی تیزی سے آیا کہ اسے احساس ہوا کہ اس خیال کے اظہار میں ہی اس کے لئے تذبذب سے رہائی کا راستہ نکل سکتا ہے۔ وہ اس احساس کو سیدھے سادھے سوال کی شکل دینا چاہتا تھا مگر اس کی کوئی راہ نہ مل رہی تھی اور اس سے تنگ آ کر اس کا اظہار کر ہی دیا۔

''متین صاحب!......کل آپ شاہ صاحب کے یہاں سے سرِ شام ہی چل دیئے تھے مگر گھر آپ صبح کی سرخی کے بعد پہنچے۔ اتنی دیر آپ کہاں رہے۔ ہادی ولی ۱۲ بجے واپس پہنچ گیا تھا۔ آپ کہاں رہے؟''

متین صاحب کے چہرے کے نقوش سے تو کچھ ظاہر نہ ہو رہا تھا مگر جواب دینے میں جتنا وقت وہ لے رہے تھے اس سے تقی نے یہی اندازہ لگایا کہ وہ اس کے سوال کا جواب یا تو دینا نہیں چاہتے تھے یا پھر اس طرح جواب دینا چاہتے تھے کہ تفصیلات سے بچا جائے۔ آخر ان کے لبوں میں جنبش ہوئی اور انہوں نے جچے تلے الفاظ میں پوری شعوری کوشش سے کہنا شروع کیا ''ایک حادثہ ہو گیا تھا۔ راہ میں ایک سوار اور ایک پھن دار سانپ سے مڈبھیڑ ہو گئی۔ سانپ کو مار ڈالا اور سوار کو گھر پہنچانا ضروری تھا۔''

''سوار! سانپ! اتنی رات گئے؟ چاندنی میں؟ کہاں؟

''ندیوں کے پاس''

''کون تھا''

''میں تو نہیں جانتا اور نہ ہی پوچھنے کا موقع تھا اور نہ مناسب تھا''

''کہاں چھوڑ کر آئے تھے اس سوار کو''

''ندیوں سے جنوب مشرق کی طرف ایک بلند پہاڑی پر ایک بہت بڑی عمارت ہے۔ وہاں۔''

''پہاڑی پر عمارت ہے؟ او! دھنش محل! دھنش محل میں اس سے کون ہوسکتا ہے؟ وہ تو ایک مدت سے غیر آباد ہے...... جس سوار کو آپ وہاں چھوڑ کر آئے تھے وہ جوان تھا یا بوڑھا؟''

متین صاحب مسکرائے اور پوچھا ''یہ تجسس کیوں؟ سوار نہ بوڑھا نہ جوان بلکہ ایک عورت تھی۔''

''عورت اور سوار اور اتنی رات گئے چاندنی میں سانپ کی زد میں! (مجھے ایسا سوال کرنا تو نہیں چاہیے۔ میں نے آپ کو مذاق کرتے شاید ہی دیکھا ہو)

''ہاں عورت۔ ایسی عورت جو پلک سے پلک اٹھانے میں انسان پر صدیاں بتا سکتی ہے''

''پلک! انسان! صدیاں! ایسی عورت دھنش محل میں؟

کچھ سوچ کر وہ بہت ہی اونچی، بھرائی ہوئی آواز میں پکارا

''آغا جی! آغا جی!

آغا جی نے کمرے میں داخل ہوتے ہوئے پوچھا ''مجھے تو تم نے ڈرا ہی دیا تھا۔ آخر کیا بات ہے۔''

''آغا جی فردوس دھنش محل کب آئی تھی؟''

''ایک ماہ سے کچھ دن اوپر ہی ہو گئے ہونگے۔ کیوں؟''

''مجھے آپ نے کیوں نہیں بتایا؟''

''اس کی یہی خواہش تھی''

''کیوں؟ مجھ سے آخر یہ سلوک کیوں''

''وہ جب سے یورپ سے آئی ہے پریشان ہے۔ وہ یورپ سے سیدھی یہاں آئی۔''

''فردوس اور پریشان! آخر یہ کیسے ہوسکتا ہے اور کیوں!

میں ابھی دھنش محل جاتا ہوں''

پیشتر اس کے کہ آغا صاحب اس سے کچھ کہہ سکیں یا روک سکیں وہ تیزی سے باہر نکل گیا۔

تقی کے باہر جاتے ہی متین صاحب آغا جی کی طرف دیکھنے سے گریز کرنے کی کوشش کرنے لگے۔ آغا جی جس حالت میں کھڑے تھے کھڑے رہے، حیران، خاموش؛ ان کا جسم فرش پر جم گیا تھا۔ سہ پہر کی روشنی میں ان کے چہرے کی پیلاہٹ، ان کے جسم کا سکون، مغربی کھڑکی سے آتی ہوئی ہلکی ہلکی ہوا میں ان کے کپڑوں پر پڑتی ہوئی سلوٹیں موت اور حیات کا مہیب منظر پیش کر رہی تھیں۔ متین صاحب ڈرنے لگے کہ اس سکتے کے عالم میں کہیں آغا صاحب چل نہ بسیں۔ اس ڈر اور ڈر سے جنم لیتے ہوئے خیالات سے ان کا دم گھٹنے لگا اور وہ کرسی میں اضطراب سے ادھر ادھر ہلنے لگے۔ انہوں نے اپنے گریبان کے بٹن کھول دیئے اور تیز سانس لینے لگے۔ اسی کشمکش میں ان کا سانس ان کے سینے میں الجھ سا گیا اور انہوں نے اس کو سینے سے نکالنے کی کوشش میں اپنے پاؤں فرش کے ساتھ اڑیسے اور اس اڑس میں ان کی کرسی فرش سے رگڑ کھاتے ہوئے چرچرا کر پیچھے کو ہٹی اور اس چرچراہٹ کی آواز سے آغا جی چونکے، ان کے جسم میں حرکت پیدا ہوئی اور انہوں نے متین صاحب کے اضطراب کو دیکھا اور مسکرا کر ان کے اضطراب کو مٹانے کی کوشش کی مگر ان کی مسکراہٹ میں اتنی آورد تھی، اتنا پھیکا پن تھا کہ خود ان کو اس کا فوراً ہی احساس ہو گیا اور انہوں نے منہ پھیر کر کمرے میں ٹہلنا شروع کیا۔ ان کے دونوں ہاتھ کمر کے پیچھے ایک دوسرے میں جکڑے گئے تھے، ان کی کمر آگے کی طرف جھک گئی تھی۔ اس طرح ٹہلتے وہ شاید اپنے بوجھ کا اندازہ کر رہے تھے۔ وہ ٹہلتے رہے، ٹہلتے رہے اور متین صاحب کا اضطراب بڑھتا رہا اور ان کی آنکھیں آغا جی کے قدموں کا تعاقب کرتی رہیں، ان کی نظروں کو اپنی طرف متوجہ کرنے کی خواہش کا اظہار کرتی رہیں مگر آغا جی تھے کہ نظریں اٹھاتے ہی نہ تھے، ملاتے ہی نہ تھے اور

ٹہلتے چلے جا رہے تھے، چپ چاپ، حزیں، صبر کے متلاشی۔

متین صاحب اپنے اضطراب کو اپنے قابو میں لانے میں ناکام رہے اور اس خیال سے کہ پیشتر اس کے کہ وہ بے قابو ہو کر کچھ کر بیٹھیں وہ کمرے سے نکل جانے کے لئے کرسی کے دونوں بازوؤں کو زور سے پکڑے اٹھنے کے لئے تیاری کرنے لگے۔ وہ ابھی پوری طرح کھڑے ہونے نہ پائے تھے کہ آغا جی ان کی طرف مڑے اور انہوں نے متین صاحب پر نہایت ہی سست خرام نگاہ ڈالی۔ اس نگاہ میں بولنے کی خواہش اور متین صاحب سے بیٹھنے کی التجا تھی۔ وہ اسی طرح تکتے رہے، تکتے رہے۔ متین صاحب اس مسلسل ٹکٹکی سے اپنے متعلق یہ سوچنے پر مجبور ہو گئے کہ ان کو کسی راز میں شریک کرنے میں قباحت ہے اور اگر ہے تو کیوں۔ ابھی اس تجرید کی پہلی ہی منزل میں تھے کہ آغا جی کے کھانسنے کی آواز نے ان کی تمام حسوں کو واپس شعور کی طرف بلا لیا۔ ان کی آنکھوں میں حزن اور کرب کی جگہ اب عجز تھا اور جرأت کی ایک جھلک۔ وہ ٹہلتے ٹہلتے رک گئے تھے متین صاحب کو اپنی طرف متوجہ دیکھ کر وہ پھر ٹہلنے لگے اور متین صاحب سے مخالف سمت میں بڑھتے ہوئے کہنے لگے۔

"تقی کبھی فردوس کے بہت ہی قریب تھا۔ جب وہ بی اے میں داخل ہونے کے لئے ولی پور گیا تو فردوس کے گھر ہی ٹھہرا تھا اور ایم اے پاس کرنے تک ان کے پاس رہا۔ اس کے خاندان سے ہمارے بہت ہی پرانے اور گہرے تعلقات ہیں۔ اس کے آباؤ اجداد ہمارے ضلع کے سب سے بڑے جاگیردار تھے۔ اس جاگیر کا بندوبست پشت ہا پشت سے ہمارے خاندان کے افراد ہی کے سپرد رہا۔ اور اب بھی سارا انتظام میں ہی کرتا ہوں۔ اس کے دادا کافی عرصہ یورپ رہنے کے بعد جب دیس واپس لوٹے تو پھر جاگیر پر نہ آئے اور ولی پور میں رہائش اختیار کی اور وہیں کاروبار کرنے لگے۔

جب فردوس کے والد کی شادی ہوئی تو وہ میاں بیوی کچھ عرصے کے لئے یہاں آئے تھے۔ ان کے لئے خاص طور پر دھنش محل کی مرمت کی گئی اور اس کی عمارت میں موجودہ دور کی آسائشیں مہیا کرنے کی خاطر بہت سی تبدیلیاں کی گئیں۔ ان کو دھنش محل سے اتنا پیار ہو گیا کہ وہ ہر سال بہار کے موسم میں دو تین ہفتے کے لئے یہاں آتے تھے۔ مگر ایک بار ایسا

حادثہ ہوا کہ وہ یہاں پھر کبھی نہیں آئے اور دھنش محل ویران ہو گیا۔ صرف اس کے اصطبل کی عمارت میں گھوڑوں کے فارم کے اوورسیئر رہتے رہے۔ بائیس سال تک اس عمارت میں کوئی آ کر نہ رہا۔ دو ماہ ہوئے مجھے فردوس کے والد نے چٹھی لکھی کہ دھنش محل کو ٹھیک ٹھاک کرا دیا جائے کیونکہ فردوس یورپ سے سیدھا یہاں آ کر رہنا چاہتی ہے۔ چٹھی پڑھتے ہی میرے دل کو ایک دھچکا لگا۔ میں چاہنے لگا کہ وہ اپنا ارادہ ترک کر دے مگر فردوس کے آنے سے ہفتوں پہلے اس کا سامان یہاں آنے لگا، کمروں میں سجنے لگا۔ اس کے آنے سے پہلے اس کی ایک یورپی ساتھی یہاں آ کر ٹھہری رہی۔ اس کی نگرانی میں تمام کمروں میں آسائش کے تمام اسباب مہیا کئے گئے۔ اس کے بعد وہ ایک دم چلی گئی اور فردوس نہ آئی۔ اس کے والد کی طرف سے کوئی اطلاع نہ ملی۔ میں نے بھی ان کو کوئی خط نہ لکھا۔ سوچا کہ شاید اس طرح فردوس یہاں نہ آئے گی اور ہونے والے حادثے سے بچ جائے گی۔

ہونے والے حادثے کا یہ شدید احساس وہم نہ تھا بلکہ اس کے لئے باقاعدہ جواز تھا اور ہے۔ اسی دھنش محل میں فردوس کے دادا نے جان دے دی جب کہ ان کے پاس کوئی نہ تھا۔ دنوں کوئی نہ آیا کیونکہ ان کی تنہائی میں ان کی اپنی خواہش کے بغیر مخل ہونے کی کوئی جرأت نہ کر سکتا۔ ان کا ایک بوڑھا ملازم بھی ان کے بلائے بغیر ان کے کمرے میں جانے کا خیال تک اپنے ذہن میں لانے کی جسارت نہ کر سکتا تھا۔ اس کو بلائے ہوئے کئی دن ہو گئے تو وہ پریشان سا ہو گیا اور کمرے میں جانے کے لئے دو دن مسلسل ہمت باندھتا رہا اور آخر ایک رات اس نے سوچ لیا کہ جو ہو سو ہو وہ ان کے کمرے میں جا کر خود ان کو اپنی آنکھ سے دیکھ کر، بات کر کے آئے گا۔ ڈرتے ڈرتے وہ کمرے میں داخل ہوا تو اس نے دیکھا کہ صولت آغا ایک آرام کرسی پر پشمینے کی چادر اوڑھے دراز تھے۔ کرسی کی پٹیوں کے نیچے بنائی ہوئی کمانی دار دو فالتو پٹیاں نکال کر سامنے کو ایک تکون کی صورت ملی کھڑی تھیں، اس پر ان کی دونوں ٹانگیں دراز تھیں۔ ان کے دونوں ہاتھ ان کی گود میں پڑے تھے۔ ان کے دائیں گھٹنے پر ایک کتاب رکھی تھی۔ (جب میں نے وہاں پہنچ کر کتاب اٹھائی تو دیکھا کہ وہ Marcus Aurelius کی Meditations تھی۔ اُن کا سر کمرے کے دروازے کے مقابل مغربی

کھڑکی کی طرف تھا۔اس سے میں نے قیاس کیا کہ جب انہوں نے مطالعہ شروع کیا ہوگا تو سورج مغرب کی طرف اتر رہا ہوگا اور اندھیرا ہونے سے پہلے ان کا انتقال ہوگیا ہوگا۔) وہ بہت دیر کھڑا ان کو تکتا رہا اور ایک بارگی اس کو احساس ہوا کہ وہ سانس نہیں لے رہے۔ وہ آگے بڑھنا چاہتا تھا مگر مارے ڈر کے اس کے قدم دہلیز کے اندر جاتے ہی نہ تھے۔اس نے احتیاطاً کھانسا مگر کرسی پر کوئی جنبش نہ ہوئی۔اس نے ایک بار پھر کھانسا، ذرا بلند آواز میں اور ایک لمبے عرصہ کے لئے۔مگر صولت آغا خاموش پڑے رہے۔اس کے ذہن میں ایک شک سا پیدا ہوا کہ شاید صولت آغا مر گئے تھے۔مگر اس نے مارے ڈر کے اس خیال کو سختی سے دبا دیا۔اور آخر ہمت کو باندھ وہ صولت آغا کی کرسی کی طرف بڑھنے لگا اس نے اپنی آنکھیں آدھی بند کر لیں تا کہ اگر صولت آغا آنکھ کھول کر اس کی طرف دیکھیں تو وہ ان سے آنکھ نہ ملائے۔وہ بڑھتے بڑھتے کرسی کے بالکل قریب پہنچ گیا۔ان کی ٹانگوں میں، ان کے ہاتھوں میں کوئی جنبش نہ ہوئی۔ان کی پاٹ دار آواز نہ جانے کہاں گم ہوگئی تھی۔اس کو آغا کے چہرے کی طرف دیکھنے کی جرأت ہی نہ ہوسکی۔ وہ ڈرتے ڈرتے آغا کے قدموں میں بیٹھ گیا۔ بیٹھتے ہی ان کی چادر اس کے جسم سے پھسل کر گری اور اس کی دہشت سے ایک چیخ نکل گئی اور اس نے گردن اٹھا کر جو آغا کے چہرے کی طرف دیکھا تو آنکھیں نیم وا تھیں اور بے نور۔ ان کے چہرے پر سیاہی چھا گئی تھی۔اس نے ایک دم ہاتھ بڑھا کر ان کے ٹخنوں کو چھوا۔ وہ لکڑی ہو چکے تھے۔ان میں سے ٹھنڈک کا ایک جھونکا اٹھا اور اس کے ہاتھ سے ہوتا ہوا اس کے تمام جسم میں حلول کر گیا اور اس کے دل کے گرداگرد برف سی جمنے لگی، اس کے منجمد ہوتے ہوئے ذہن میں ایک خیال برق کی طرح کوند گیا۔''آغا جی مر گئے ہیں'' اس خیال نے اس کو بالکل پاگل کر دیا اور وہ کمرے سے پاگلوں کی طرح چیختا ہوا گاؤں کی طرف بھاگا۔تمام گاؤں اس کی چیخیں سن کر جاگ اٹھا۔ جب دھنش محل پہنچے تو آغا جی کا سر کرسی کی پشت پر بازو کی طرف ڈھلک گیا تھا۔ اور ان کا اکڑا ہوا دھڑ کرسی کی پشت سے اٹھا ہوا تھا جیسے اٹھنے کی کوشش میں منجمد ہو گئے تھے۔شہر سے ڈاکٹر بلایا تو پتہ چلا کہ ان کو مرے ہوئے ایک ہفتہ ہوگیا تھا۔اس حادثہ کے بعد دھنش محل بالکل ویران رہا، کھنڈر بن گیا۔

دھنش محل جب پھر آباد ہوا تو فردوس کی والدہ کو کھا گیا۔ ان کی شادی کو پانچ سال ہو گئے تھے۔ وہ ہر سال یہاں آتے اور سرخی اور شادابی لے کر واپس جاتے۔ آخری سال جب وہ یہاں آئے تو ایک رات (انہی دنوں کی بات ہے) میں ان کے ہاں رات کے کھانے پر مدعو تھا۔ کھانا کھا چکے تو مجھے اپنا یورپ سے نیا نیا لایا ہوا ریڈیو بجا کر دکھانے لگے۔ کافی دیر مغربی موسیقی سنتے رہے۔ بارش کی وجہ سے ریڈیو بند کیا تو دیکھا کہ فردوس کی والدہ کمرے میں نہ تھی۔ کافی رات ہو چکی تھی سوچا کہ اپنے کمرے میں ہوں گی۔ صبح جب فردوس کی والدہ ناشتے پر نہ پہنچیں تو آغا میاں جب ان کے کمرے میں گئے تو وہ وفات پا چکی تھیں۔ بقول آغا میاں ان کی موت کا کوئی جواز نہ تھا کیونکہ یورپ سے واپسی سے پہلے ان کا ڈاکٹروں کے ایک بورڈ نے مکمل معائنہ کیا تھا اور ان کو بالکل صحت مند قرار دیا تھا۔ ان کو کوئی آزار یا دکھ نہ تھا جس کا آغا میاں کو علم ہو۔ دکھ کا تو سوال پیدا ہی نہیں ہوتا تھا۔ وہ ہمیشہ خوش باش رہتی تھیں۔ ان میں بہت ہی جرأت اور ہمت تھی۔ ان کا ذہن بہت اعلیٰ تھا۔ ان کو ہمیشہ اپنے جذبات پر قابو رہا۔ وہ کبھی کسی پر ناراض نہ ہوتی تھیں۔ ان کا اپنے ملازموں کے ساتھ بہت اچھا سلوک تھا۔ ان کے ملازم ان کی پرستش کرتے تھے۔ ان کی موت سے ان کے ملازمین کو بہت دکھ ہوا۔ ان کا ایک نوجوان ملازم تو گاؤں ہی چھوڑ کر چلا گیا اور آج تک معلوم نہیں ہوا کہ کہاں گیا۔ اس کی والدہ اس کے غم میں مرتے مرتے بچی۔ آغا میاں کے نیک سلوک نے اس کو موت کے چنگل سے بچا لیا۔ وہ اب اس جاگیر کی ایک متبرک اور مقدس ہستی ہے۔

سوچتا ہوں کہ وہی دن ہیں۔ فردوس جب سے آئی ہے پریشان ہے۔ مجھ سے بھی ایک ہی بار ملی ہے۔ کسی سے ملنا نہیں چاہتی۔ آخر اسے کیا ہوا ہے۔ اب تقی وہاں چلا گیا ہے......''

بولتے بولتے ان کی سانس پھول گئی ان کے چہرے کے نقوش کئی بار بکھر بکھر کر نئے نئے روپ بدل چکے تھے۔ وہ ٹہلتے ٹہلتے شاید تھک چکے تھے۔ وہ کھڑکی کی چوکھٹ کا سہارا لیے، کھڑکی کے شیشوں پر سر رکھے ہانپ رہے تھے۔ ان کی کمر میں بار بار کرب کے بگولے

اٹھ رہے تھے اور اس کرب سے پیدا ہوتی ہوئی حرکت سے متین صاحب کے دل میں خواہش پیدا ہونے لگ گئی تھی کہ وہ اٹھیں اور آغا جی کو اپنے سینے سے لپٹا لیں اور ان کو تسلی دیں اور اعتماد سے کہیں کہ ان کے ہوتے ہوئے کوئی حادثہ پیش آ ہی نہیں سکتا۔ مگر ان کی آواز ہی لبوں سے نہ نکل سکی اور وہ کرسی میں بڑے اضطراب سے تلملاتے رہے۔

آغا جی کی کمر میں ایک اٹھان سی پیدا ہوئی اور انہوں نے کھڑکی کی چوکھٹ سے ہاتھ اٹھائے، کمر سیدھی کی، سیدھے کھڑے ہوئے، بڑھے اور متین صاحب کی طرف سوالیہ انداز میں دیکھتے رہے۔ متین صاحب ان کی نگاہ کی گرمی کی تاب نہ لا سکے اور ایک دم اٹھ کھڑے ہوئے۔ کچھ کہنا چاہتے تھے کہ آغا جی کی آواز نے ان کو اپنی طرف متوجہ کیا۔ آغا جی پوچھ رہے تھے ''تقی کو فردوس کے یہاں ہونے کا خیال کیسے آ سکتا ہے۔ آپ نے اس سے ذکر کیا؟ آپ کو کیسے معلوم ہے؟''

''کل رات میری اس سے ندیوں کے پاس ملاقات ہوئی اور میں اس کو دھنش محل چھوڑ کر آیا تھا۔''

متین صاحب کے جواب سے آغا جی کو جیسے قرار آ گیا ہو۔ اور وہ کھڑکی سے پلٹ کر ایک آرام کرسی میں دراز ہو گئے۔ متین صاحب پھر کرسی میں دھم سے بیٹھ گئے اور پٹی پر سر رکھ کے کسی سوچ میں کھو گئے۔

تیسرا باب

ایک بن تھا مہیب، جس کے درخت تھے عجیب، جس کے پتوں سے اٹھتا تھا دھواں، دھوئیں سے جب سورج کی کرنیں گزرتی تھیں تو گم گم ہو جاتیں، ٹیڑھی ہو ہو جاتیں۔ دھوئیں سے گزر کر فضا کو سنوارتی ہوئی فرش پر دھیمے دھیمے، دھیرے دھیرے قدم رکھتی ہوئی اتر آتیں، شاید ڈرتی تھیں کہ بن جاگ نہ جائے۔ دھوئیں، سنورتی ہوئی فضا، موتیوں سے دمکتے ہوئے مخملی فرش کے درمیان، ٹیڑھی میڑھی، گم ہوتی، پھر ہویدا ہوتی ہوئی گلیوں کا جال

دور تک بچھتا چلا گیا تھا۔ ان گلیوں میں کوئی چلتا پھرتا نظر نہ آتا تھا، گلہری بھی تو کہیں نہ تھی۔ اس سنسان سندر بن میں ایک ہلکی ہلکی مہک سستا رہی تھی۔ جانے کہاں سے آتی تھی، کتنی دور سے آئی تھی، دور کہاں جانے والی تھی۔ درختوں پر سہانے رنگوں کے پھل جانے کس کے انتظار میں سو رہے تھے۔ کبھی کبھی گلیوں پر کسی اڑتے ہوئے پرندے کا سایہ چپکے سے گزر جاتا۔

اس بن میں درختوں کے سایوں سے بچتی، لہکتی ہوئی ایک چھریرے بدن کی عورت لٹک لٹک کر، مٹک مٹک کر قدم اٹھاتی چلی جا رہی تھی۔ کبھی اس درخت سے کبھی اس درخت سے سرگوشیاں کرتی، پھر اپنے ہی آپ مسکراتی، زیرِ لب گنگناتی ہوئی رک جاتی، کچھ سوچتی اور آگے بڑھ جاتی۔ اس کی بانہوں میں کانچ کی رنگ برنگی چوڑیاں ایک دوسرے کے ساتھ کولہے سے کولہا ملائے کسی سہانے خواب میں مست سو رہی تھیں۔ اس کے دائیں ہاتھ میں ایک بانسری تھی۔ جب وہ ہاتھ اٹھا کر بانسری کو دیکھتی تو اس کی چوڑیاں خواب سے چونک چونک اٹھتیں اور بن کی کسی سنسان گلی میں ایک لمحے کے لئے ایک شور اٹھتا اور گم ہو جاتا۔ چلتے چلتے جب کبھی اس کے ہاتھ بے دھیانی میں لبوں کے قریب پہنچتے تو رک جاتے۔ وہ بانسری کے چھیدوں کو غور سے، مسرت سے، ڈر سے دیکھتی اور اپنے سانس کی رفتار کو بہت ہی سست کر دیتی۔ شاید بانسری کی اصلی دھن ابھی اپنے سفر سے نہ لوٹی تھی۔ یہ سوچ کر اس کے ہاتھ، چوڑیوں کو جھنجھناتے ہوئے اس کی رانوں کے ساتھ لپٹ لپٹ جاتے اور وہ لمبے لمبے ڈگ بھرتی ہوئی ایک گلی سے دوسری گلی میں داخل ہو جاتی، پیچھے مڑ کر دیکھتی، پھر کچھ دیر چل لینے کے بعد مڑتی کہ شاید اس کے پیچھے کوئی حسین شہزادہ نہ آ رہا ہو اور ایک لمبا گہرا سانس لیتی اور اس کے قدم رک جاتے۔ اس کا اگلا قدم گلی کے فرش پر پوری طرح جم جاتا ہے اس کا پچھلا قدم آدھا فرش پر اور ایڑی فضا میں معلق ہو جاتی۔ اس کی معلق ایڑی میں ریشمی دھاگوں میں بندھی، شلوار کے تنگ تنگ پائنچوں میں گٹھی ہوئی پائل چمکتی ہوئی صاف صاف دکھائی دیتی تھی۔ وہ اس طرح دھندلائی، دمکتی ہوئی گلیوں میں گزرتی ہوئی ایک کھلے صحن میں آ گئی جس کے چاروں طرف لامبے لامبے، اونچے درخت احاطہ کئے تھے۔ وہ اس

صحن میں بالکل بے دھیانی سے چلی آئی تھی۔ اور فضا کی عریانی سے وہ چونک اٹھی۔ اس نے چاروں طرف نظر دوڑائی۔ اس کی نظر درختوں کی دیوار سے ٹکرا کے اوپر کی طرف اٹھی، اٹھتی گئی، درخت لمبے ہوتے گئے۔ دھندلا دھندلا، نیلا نیلا، آسمان اونچا ہوتا گیا۔ اس کی نظر تھک گئی اور ایک دم سے صحن کے فرش پر آ رہی۔ وہ گھبرا گئی تھی، اس کے سرخ، شفاف ماتھے پر پسینے کی بوندیں ابھر آئی تھیں۔ اس کے گھبرائے ہوئے، پسینے میں نہائے ہوئے، چہرے پر کسی یاد سے ایک نور سا چھا گیا، اس کے ہاتھوں میں جنبش ہوئی، ہاتھ اوپر کو اٹھے، بانسری ہونٹوں سے لگی۔ اس نے ایک لمبا سا سانس لیا اور بانسری میں پھونکا۔ ایک نرم نرم مگر تیکھی آواز گونج گئی اور پھر اس کی لے اونچی ہوتی رہی، تیکھی ہوتی رہی۔ اس نے بانسری بجاتے بجاتے کن انکھیوں سے دیکھا۔ درخت اب بونے ہو رہے اور ان کی دیواروں میں درزیں پیدا ہونے لگ گئی تھیں۔ درزیں دروازے بن رہے تھے جو گلیوں میں کھلتے تھے۔ بانسری کی لے سے بن جاگ اٹھا، فضا کانپنے لگی، آسمان لرزنے لگا۔ ان کی مدد کے لئے بادل اور برق اٹھ دوڑے۔ بادل گرجنے لگے، برق چمکنے لگی، درخت ڈرنے لگے۔ اس افراتفری کو دیکھ کر عورت نے بھاگنا شروع کیا۔ وہ گلیوں میں گم ہوتی، نکلتی ہوئی ایک شاہراہ پر آنکلی جہاں سے دور عین سامنے کی طرف برق کی روشنی میں آسمان صاف نظر آ رہا تھا۔

بھاگتے بھاگتے کبھی رک جاتی، مڑ کر دیکھتی، اوپر کی طرف تکتی اور بانسری میں ایک بار پھر پھونکتی، اس کی لے سے بن، فضا، آسمان، بادل، بجلی ایک بار پھر تلملا اٹھتے، چیختے، دھاڑتے، آنکھیں دکھاتے۔ وہ پھر بھاگتی۔

اب وہ بن کو پار کرنے ہی والی تھی کہ بادل اس زور سے گرجا کہ اس کا دل دہل گیا۔ اس کے قدم زمین نے پکڑے لئے۔ پھر بجلی کوندی۔ اس کی چمک اتنی روشن تھی کہ سامنے پھیلتے ہوئے منظر کی ایک ایک تفصیل اس پر وا ہوگئی۔ بن کے پار ایک وسیع میدان تھا۔ اس میدان اور بن کے درمیان نیچی سطح پر دریا بہہ رہا تھا۔ دریا کے عین وسط میں ایک ناؤ تھی۔ اس ناؤ میں ایک نوجوان تھا۔ نوجوان زور زور سے ناؤ کھینچتا بن کے دہانے کی طرف بڑھ رہا تھا۔ اس کی آس بندھی، اس کا ڈر کم ہوا اور تیز تیز قدم اٹھاتی دریا کی طرف بڑھی۔ وہ دریا

کے قریب ہوتی گئی۔اب وہ پانی میں گرتے ہوئے، پانی سے اٹھتے ہوئے چپوؤں کی آواز صاف صاف سن رہی تھی۔دریا کی طرف سے آتی ہوا میں ایک تندی تھی۔اس تند ہوا میں اس کا قدم اٹھانا محال ہو گیا مگر وہ دریا کے کنارے کی طرف بڑھتی رہی۔جب اس کے قدموں نے دریا کے کناروں کو چھوا تو بجلی بہت زور سے کڑکی اور کڑکتے ہوئے،فضا کو چیرتی ،شعلہ دکھاتی ہوئی دریا کی طرف اس ناؤ کی طرف گرنے لگی۔اس کا دل مسوس گیا اور اس کے دل سے ایک ہوک اٹھی اور چیخ بنی۔اس کے کانوں نے چیخ سنی اور اس کی آنکھوں نے نوجوان کے چہرے کو بجلی کی سرخ سرخ روشنی میں دیکھا۔

فردوس نے بھی سرخ سرخ روشنی میں عورت اور مرد دونوں کو پہچان لیا۔عورت فردوس خود تھی اور نوجوان جس کی طرف بجلی لپکی آرہی تھی ،تقی تھا۔اس احساس کے شور نے اس کے جسم میں ایک لرزا پیدا کر دیا اور چیختی ہوئی خواب سے چونک پڑی۔اس کی چیخ کو سن کر ملازم کمرے کی طرف دوڑے۔انہوں نے دیکھا کہ وہ کانپ رہی ہے اس کا چہرہ پسینے میں شرابور تھا اور اس کے ہونٹوں پر ایک فقرہ رقص کر رہا تھا۔

''تقی پر بجلی گری،تقی پر بجلی گری!

بابا عمر خاں اس کی طرف بڑھا اور پوچھا''بی بی کیا ہوا۔ڈراؤنا خواب دیکھا۔ہوں۔اچھا ہوا مصیبت خواب میں ہی بیت گئی۔''

فردوس نے کوئی جواب نہ دیا۔اس کے حواس ابھی درست نہ ہوئے تھے۔وہ بار بار اپنا فقرہ غیر شعوری مجبوری کے تحت دہراتی جاتی تھی ''تقی پر بجلی گری،تقی پر بجلی گری''

بابا عمر دراز کے شعور نے اب فقرہ قبول کر لیا تھا اور وہ حیران ہوا کہ آج اتنے برسوں کے بعد بی بی کے لبوں پر تقی کا نام آیا ہے اور نام کے ساتھ اتنے مہیب حادثے کی خبر۔اس نے سوچتے سوچتے،تسلی دینے کی کوشش کی۔

''بی بی تقی صاحب کو میں نے کچھ گھنٹے ہوئے کسی کے ساتھ،گھوڑے پر گھر کی طرف جاتے دیکھا تھا۔وہ تو گھر میں شاید آرام کر رہے ہونگے ان پر بجلی کیسے گر سکتی ہے۔نہ بادل، نہ مینہ،بجلی کہاں سے گر سکتی ہے۔خواب ہی تو دیکھا ہے......گرم پانی لاؤں۔منہ ہاتھ دھولو۔

تم نے تو رات سے کچھ نہیں کھایا۔ تمام رات، تمام دن تو بیہوش پڑی رہیں۔ اب تو سورج ڈھل رہا ہے۔ ہمت کرو۔ اٹھو کچھ کھا لو۔ پھر میرے کندھے پر ہاتھ رکھ کر برآمدے میں کچھ دیر ٹہل لینا۔''

ابھی بابا نے بات پوری ہی نہ کی تھی کہ اصطبل کا چوکیدار لونڈا کمرے میں چپکے سے داخل ہوا اور فردوس کی ملازمہ خاص کو اشارے سے ایک طرف بلایا۔ اس سے کچھ کھسر پھسر کی۔ ملازمہ نے اس کو ٹھہرنے کیلئے کہا اور خود فردوس کی طرف متوجہ ہو کر کہنے لگی۔

''کوئی تقی صاحب آئے ہیں، ملنے پر اصرار کرتے ہیں''

پیشتر اس کے کہ فردوس جواب دے تقی کمرے میں داخل ہو چکا تھا۔

فردوس خواب کی تعبیر کو اتنی جلدی غلط ہوتے دیکھ کر ڈری اور سوچنے لگی کہ خواب کی تعبیر کچھ اور ہونی چاہیے۔ فوراً سوچ کا کانٹا بدل کر وہ شعوری طور پر تقی سے اپنی حالت چھپا لینے پر مستعد ہو گئی۔

''تم کو میرے یہاں آنے کا پتہ کس نے دیا۔ صرف آغا جی جانتے تھے اور انہوں نے مجھ سے وعدہ کیا تھا کہ تمہیں نہیں بتائیں گے۔''

''مجھے آغا جی نے نہیں بتایا۔ مجھے کسی نے نہیں بتایا۔ میں نے خود اندازہ کیا کہ متین صاحب سے کل رات صرف تمہاری ہی ملاقات ہو سکتی تھی۔''

فردوس متین کے نام سے ٹھٹکی اور حیرانی سے تقی کو تکنے لگی۔ تقی کو اس کی نظر سے اندازہ ہو گیا کہ وہ متین صاحب کے نام پر حیران ہو رہی تھی اور اس نے فوراً معذرت کرتے ہوئے کہا ''متین صاحب میرے محسن ہیں، دوست، بھائی ہیں، آقا ہیں۔ آج کل وہ میرے پاس کچھ دنوں کے لئے آئے ہوئے ہیں۔ ابھی ابھی رات کے حادثے کے متعلق انہوں نے سرسری سا ذکر کیا تھا۔ میرے ذہن نے فوراً جان لیا کہ رات کے حادثے میں تمہارے علاوہ کوئی اور ہو ہی نہیں سکتا۔ پھر میں نے آغا جی سے پوچھ لیا اور تمہیں تو پتہ ہے کہ آغا جی جھوٹ نہیں بولتے۔ لہٰذا انہیں بتانا پڑا۔''

وہ ابھی کچھ اور بھی کہنا چاہتا تھا مگر وہ کہہ نہ سکا۔اس کی زبان رک گئی تھی۔ وہ خاموش ہو گیا۔اس نے فردوس کی طرف دیکھا۔ وہ اس کی آنکھوں میں اس کی حالت کو پڑھ لینا چاہتا تھا مگر فردوس کی آنکھوں میں کہر آلود گہرائیوں کے سوا کچھ نہ تھا۔ اس کے چہرے پر ایک شعوری بے کیفی چھائی تھی۔ وہ اس کی نگاہوں کی تاب نہ لا سکا اور اس نے نظریں جھکا لیں اور اپنے ہاتھوں کی انگلیوں سے خلا کو چھیڑنے لگا۔ اپنے اضطراب سے شعوری کوشش سے آگاہ ہوتے ہی اس نے اپنے ہاتھوں، انگلیوں اور جسم کو ساکت کر لیا اور آنکھیں بند کر کے فردوس کی آواز کا انتظار کرنے لگا۔ اس کی آنکھوں کو بند ہوتے دیکھ کر فردوس کے ضبط کی طنابیں ڈھیلی پڑنے لگیں اور اس کی لاشعوری سوچ نے ایک بار پھر اس کے ذہن پر سایے محیط کر دیئے۔ وہ نہ جانے اس سوچ میں کتنی دیر گم رہتی۔ اگر اس کی ملازمہ خاص اس کے لئے یخنی کی پیالی نہ لے آتی۔ میز پر برتنوں کو رکھنے کی آواز سے دونوں چونکے اور انہوں نے ایک دوسرے کی طرف آنکھوں کے کناروں سے دیکھا اور دونوں نے ایک دوسرے کے چہروں پر جو کچھ دیکھا اس کو دیکھ کر حیا سے سرخ ہو گئے۔ فردوس نے ایک ہی جھٹکے میں پھر اپنے آپ پر قابو پا لیا اور بولی ''تم اس وقت چائے تو ضرور پیو گے۔ ہمیشہ پیتے تھے'' پھر ملازمہ کو مخاطب ہو کر چائے لانے کے لئے کہا۔ اب پھر وہ ایک دوسرے کا سامنا کرنے پر مجبور تھے اور دونوں نہ جانتے تھے کہ بات کہاں سے شروع کی جائے۔ آخر فردوس نے سکوت سے تنگ آ کر گفتگو کا آغاز کر ہی دیا۔ ''یہ متین صاحب تمہارے کب سے دوست ہیں۔ جب تم کالج میں پڑھتے تھے تو تم نے کبھی ان کا ذکر نہیں کیا۔ ان سے تعارف نہیں کرایا۔ شاید بہت بعد میں ملاقات ہوئی تھی؟''

''نہیں تو۔ ابھی میں کالج میں ہی تھا تو ان سے ملاقات ہو گئی تھی۔ ہمارے کالج میں فلسفہ کے پروفیسر تھے۔''

''اوہ! تو یہ وہ مشہور متین ہیں۔ ان کے متعلق اکثر بہت کچھ سنا مگر کبھی ملاقات کا موقع ہی پیدا نہ ہوا۔ اور تم نے بھی تو بخل سے کام لیا۔''

''یہ بات نہیں۔ تمہیں اپنی مصروفیتوں سے فرصت ہی کب تھی۔ تمہارے لئے تو میرا

وجود ٹرکش باتھ سے زیادہ وقعت نہ رکھتا تھا۔''

''' ایسا الزام لگاتے ہوئے تمہیں شرم آنی چاہیے۔ میں تم سے بڑی ہوں۔تم مجھے ہمیشہ ہی عزیز رہے۔ جب تمام دنیا سے تھک جاتی تھی تو تمہارے ہی پاس تو بیٹھتی تھی۔ گھنٹوں ہی تو بیٹھتی تھی۔ تمہیں وہ کمرے کی گرم گرم خاموشی کیسے بھول سکتی ہے۔ تمہیں وہ نظمیں، وہ نغمے کیسے بھول سکتے ہیں جن میں صرف میں اور تم ہی شریک تھے۔ میں ہی تو ہمیشہ تمہارے پاس جاتی تھی۔ تمہیں اپنے پاس بلاتی تھی۔ مجھے اب خیال آتا ہے کہ تم تو میرے کمرے میں اپنے آپ کبھی نہ آئے تھے۔ان سب باتوں کے باوجود تم مجھ پر الزام لگانے سے نہیں چوکے۔''

''اگر میری بات سے تمہیں دکھ پہنچا تو میں اس کی معذرت چاہتا ہوں میرا مطلب بات کرنے سے صرف یہ تھا کہ میں تمہارے لیے ایک ضرورت تو تھا مگر تمہارا ساتھی یا دوست نہ تھا۔تم نے مجھے اپنے کاموں میں، منصوبوں میں، شریک کرنے کی کبھی ضرورت نہ سمجھی۔''

فردوس اس بات پر مسکرائی اور پھر ہنستے ہوئے بولی

''میں نہیں چاہتی تھی کہ تمہاری تنہائیوں میں میرے سوا کوئی شریک ہو اور میں یہ بھی تو چاہتی تھی کہ میرے بہترین لمحوں میں صرف تم ہی شریک رہو۔مگر مجھے تو آج پتہ چلا کہ تمہاری تنہائیوں میں کون جاگزیں تھا۔ پھر بھی خوش ہوں کہ وہ شخص متین صاحب تھے جن کی شہرت اس زمانے میں بہت تھی اور شاید اسی لئے مجھے کبھی ان سے ملاقات کا خیال نہیں آیا۔ اس زمانے میں تو ان کے گھر پر، سنتے تھے کہ، ایک ہجوم رہتا تھا۔ ہجوم میں اپنے آپ کو گم کر لینا تو مجھے کبھی قبول نہ تھا۔''

وہ بولتے بولتے کسی سوچ میں کھوگئی۔ چونکی تو تقی کو دیکھ کر مسکرائی اور پرگداز آواز میں جلد جلد بولنے لگی۔

''عجیب بات ہے کہ متین صاحب سے ملاقات ہو اور مجھے یہ احساس تک نہ ہو کہ ایسے شخص سے ملاقات ہو رہی ہے جس سے ملنے کے لئے لوگ راہیں تلاش کرتے تھے۔ اگر رات متین صاحب نہ آجاتے تو میں نہ جانے مٹی کے کس ڈھیر کے نیچے دبی ہوتی۔ تمہیں تو

متین صاحب نے بتایا ہوگا کہ رات کیا ہوا۔''

''نہیں تو۔کیا ہوا تھا؟''

''کل رات میں بالکل نہ سو سکی۔ یوں تو میں اکثر رات جاگتی ہی رہتی ہوں۔ سالہا سال سے اپنا تو یہی عالم ہے مگر رات اس جاگنے میں اضطراب اور ایک ڈر بھی شامل تھا۔ دل یہی چاہتا تھا کہ باہر ندی کے کنارے چاندنی کا سماں دیکھوں۔ دل کو بہت سمجھایا مگر اضطراب بڑھتا ہی رہا۔ کوئی تین بجے اضطراب پاگل پن کی حالت تک پہنچ گیا۔ میں اٹھی، اٹھ کر سواری کے کپڑے پہنے، چپکے سے ثاقب کو اصطبل سے نکالا۔ اس پر زین کسی اور نکل پڑی۔ کافی دیر تک چاندنی میں بے راہ، بے مقصد پھرتی رہی۔ ندیوں کے سنگم کے درمیان کی زمین پر اُگے ہوئے سبزے کو دیکھتی رہی۔ مجھے اس بات کا شدید احساس ہو رہا تھا کہ مجھے کسی کا انتظار کرنے پر مجبور کیا جا رہا ہے۔ ثاقب پر بھی ایک اضطراب کی کیفیت مسلسل طاری رہی مگر جب میں اس کو سبزے کے قریب لے گئی تو اس کا اضطراب ختم ہو گیا۔ میرے اپنے دل میں سکون داخل ہونے لگا۔ میں واپسی کی سوچ رہی تھی کہ ثاقب کے بدن میں ایک جھرجھری سی پیدا ہوئی۔ میں نے اس کے کانوں کی طرف دیکھا وہ مڑ رہے تھے۔ کانوں سے جو نگاہ افق کی طرف اٹھائی تو سامنے ٹیلے پر سیاہ گھوڑے پر کوئی گھوڑے کے ساتھ سِلا ہوا بیٹھا تھا۔ گھوڑا ابھی زمین پر اس طرح جما کھڑا تھا جیسے ابھی زمین پر اگا ہو اور زمین ہی کا ایک روپ ہو۔ مجھ پر خوف سا طاری ہوا اور میں سمجھی کہ شب بیداری سے آنکھوں کی پتلیوں پر بوجھ بڑھ رہا ہے جس سے نظر فریب کھا رہی ہے۔ منظر میں سوار وسوار کوئی نہیں۔ یہ سب تھکے ہوئے ذہن کی تخلیق ہے۔ ابھی میں ان سوچوں میں تھی کہ ایک تڑاکا ہوا اور میرے پاس سے کوئی چیز سن سے گزر گئی۔ پھر فوراً ہی ایک اور تڑاکا ہوا۔ میں بہت ڈری اور میرے گھٹنے ثاقب کے پیٹ میں پیوست ہو گئے۔ ثاقب نے اس کو اشارہ سمجھا اور سرپٹ بھاگا۔ یہ سب کچھ اس تیزی سے ہوا کہ میرے ہاتھوں سے باگیں نکل گئیں اور جھٹکے سے میری کمر ثاقب کی پیٹھ کی طرف جھک گئی۔ میرے سامنے موت کی صورت پھرنے لگی مگر میں اب تک حیران ہوں کہ میری کمر اس جھٹکے سے ٹوٹ کیوں نہ گئی۔ میری کمر میں اتنا بل

کیسے آ گیا کہ وہ ایک حد سے آگے جھک ہی نہ سکی۔ ثاقب بھاگتا چلا گیا۔ میرے جسم میں اتنی طاقت نہ تھی کہ میں آگے کی طرف جھک کر باگیں پکڑ لیتی۔ میری زبان حلق کے ساتھ چپک گئی تھی۔ میں نے کئی بار ہالٹ کہنے کی کوشش کی مگر الفاظ خیال سے آواز میں نہ ڈھل سکے۔ سوار اس تمام عرصہ میں اپنی جگہ پر جما کھڑا رہا۔ جب ثاقب ٹیلے کے عین نیچے پہنچا تو اس کے قدم ڈگمگائے اور اس کی رفتار میں کمی آ گئی مگر وہ ٹیلے پر چڑھ ہی گیا۔ جب سوار کے قریب پہنچا تو سوار نے ہالٹ اس تمکنت سے کہا کہ ثاقب رک گیا۔ میری رانوں کی گرفت ڈھیلی ہوئی اور رکابیں میرے پاؤں سے نکل گئیں اور میں پھسل کر زمین پر آ رہی اور بیہوش ہوگئی۔ ہوش میں آئی تو کوئی میرے تلوؤں اور ہتھیلیوں کی مالش کر رہا تھا۔ اس نے مجھے سہارا دے کر اٹھایا اور میری کمر کے ساتھ کمر لگا کر بیٹھ گیا۔ اس حرکت سے میرے جسم میں طاقت واپس آنے لگی اور مجھے یہ احساس ہو چلا کہ میں بالکل سلامت بچ گئی ہوں۔ اجنبی نے میری حالت کو دیکھتے ہوئے گھر تک چھوڑ آنے کیلئے ارادہ ظاہر کیا۔ میں ثاقب پر سوار ہونے لگی تو میرا دل بیٹھ گیا، میری طاقت جواب دے گئی۔ اجنبی نے مجھے اپنے پیچھے گھوڑے پر سوار کیا اور ثاقب کے پیچھے اپنا گھوڑا ڈال دیا۔ میرے جسم میں بالکل طاقت نہ رہی تھی اور میں نے اس نزاری کے عالم میں اپنا سر اجنبی کی کمر کے ساتھ لگا دیا اور سو گئی۔ جب آنکھ کھلی تو اپنے کمرے میں تھی اور سورج ڈھل رہا تھا اور اس کے بعد تم آ گئے۔"

اتنے میں چائے آ گئی۔ فردوس نے چائے بناتے بناتے اپنے آپ کو جذباتی اور ذہنی طور پر تقی کی سوالیہ نظروں کا سامنا کرنے کے لیے تیار کر لیا۔ اب وہ اس بات کے لئے بھی تیار تھی کہ تقی سے اپنے ماضی کی ڈھکی چھپی باتوں اور واقعات کا ذکر نہایت صاف گوئی سے کر ڈالے۔ اسکی اس کوشش کے ساتھ اس کے دل میں ایک نیا سوال پیدا ہو رہا تھا کہ اس کو اپنے قیامِ یورپ کے دوران میں تقی کا خیال کیوں نہیں آیا۔

چوتھا باب

''میں ابھی ابھی سوچ رہی تھی کہ میں چھ سال یورپ میں سرگرداں رہی مگر مجھے ایک بار تمہارا خیال نہیں آیا مگر اب جب تم میرے سامنے بیٹھے ہو تو مجھے سردیوں میں آتشدان کے پاس بیٹھنے کا حظ مل رہا ہے۔ یہ یقیناً اجنبی ملاقات کا نتیجہ نہیں ہوسکتا کیونکہ میں اب اس قسم کی ملاقاتوں کی اتنی عادی ہو چکی ہوں کہ ان سے کسی طرح پر کسی قسم کا حظ اٹھا ہی نہیں سکتی۔ اس کی وجہ سطحی تو ہونی نہیں چاہیے...... کیا یہ ممکن نہ تھا کہ آج جو احساس میرے دل میں جاگ رہا ہے وہ یورپ جائے بغیر ہی اپنے دیس میں جاگ جاتا اور جو دکھ یورپ میں اٹھائے وہ نہ اٹھاتی۔ میں یہ سوال تم سے محض تمہاری سوالیہ نظروں سے بچنے کے لئے نہیں کر رہی۔ اس کی بہت ہی اشد ضرورت ہے کہ یہ سوال کروں اور پھر تم سے کروں۔ تم ہی میری تنہائیوں کے شریک رہے ہو۔ معلوم ہوتا ہے کہ کسی حکیم طاقت نے تمہیں زندگی کی آلائشوں سے اسی لئے محفوظ رکھا کہ تم میرے لئے ان سوالوں کو حل کرو......

ہاں! ہاں! میں سمجھتی ہوں کہ زندگی میں دکھوں سے تم بھی آشنا ہوئے ہو گے مگر مجھے اس بات کا پورا پورا یقین ہے کہ دکھ کی آلائشوں سے تم ضرور بچا لئے گئے ہو گے۔ تمہارے چہرے پر اب بھی پہلی سی معصومیت اور سکون ہے، اطمینان ہے۔ فرق شاید اتنا ہے کہ اس اطمینان میں اب علم بھی شامل ہے: وہ علم جو حکمت کے قریب ہے۔

''مجھ پر جس اعتماد کا اظہار تم نے کیا ہے اس کے لئے میں ممنون ہوں اور ڈرتا ہوں کہ میں اس اعتماد کا اہل ہوں بھی کہ نہیں۔ اتنا مجھے احساس ضرور ہے کہ تمہارے سوالوں کا جواب میں دے سکتا ہوں۔ اس سے تمہارے لئے سوال حل ہونگے، یہ میں نہیں کہہ سکتا۔

جس ماحول میں ہم دونوں نے تعلیم پائی اور جس سماج میں ہم نے اپنی صلاحیتوں کو مشہود کرنے کی کوشش کی اس میں جذب و وجد ممکن ہی نہ تھا اور جذب و وجد کے بغیر زندگی کو صرف حیوانوں کی سطح پر اپنایا جا سکتا تھا۔ تمہیں حیوانی سطح کی تمام آسائشیں مہیا تھیں، تمہاری صلاحیتیوں کے امتزاج سے جو نظام بن سکتا تھا وہ اس سطح سے ماورا تھا۔ وہاں جتنے جذب و

وجد کی ضرورت تھی وہ صرف اقتدار اور اس سے اخذ کردہ نشے سے ہی ممکن ہوسکتا تھا۔ جب اقتدار اپنی ذات میں مطمح نظر نہ ہوتو آدمی مرئی، سماجی سزاؤں سے تو بچ سکتا ہے مگر غیر مرئی دکھوں سے اس کی آشنائی لازمی ہے اور ان دکھوں کا علاج حرکت، اجنبیت اور اشیاء کے روپ کے بہاؤ میں کھو جانے سے ممکن نہیں۔ اس کیلئے ضروری ہے کہ آدمی انسان بنے اور ان راہوں کو تلاش کرلے جن راہوں سے گزر کر آدمی انسان بن سکتا ہے......

انسان بیک وقت جسم بھی ہے اور جسم اور جسم کی ضروریات سے ماورا بھی۔ جسم کی سطح پر اس کی دنیا مادی قوانین میں جکڑی ہوئی ہے اور ان کی تابعداری لازمی ہے۔ آدمی کو صرف اتنا ہی اختیار ہے کہ وہ ان قوانین سے انحراف کرکے بھی جی سکتا ہے۔ اس سطح پر جینے کے لئے یا جانوروں کی طرح جینے کے لئے آدمی اپنے آپ کو آزادیٔ نفس کی ضروریات سے بچا لے اور مادہ کے قوانین کا بالکل تابع ہو جائے اور اپنے اندر ایسا میکانکی نظام پیدا کرلے کہ بغیر سوچے سمجھے مادہ کے قوانین کے ساتھ نہ صرف ہم آہنگ ہو جائے بلکہ اس میں جذب ہو جائے، اسی کا ایک روپ بن جائے۔ تمہارے لئے، میرے لئے یا ہر اس آدمی کے لئے جو انسان بننے کے لئے کوشاں ہے یہ سب کچھ ممکن نہیں تھا اور نہ ہے۔ ہمیں اپنے نفس کی آزادی بہت ہی عزیز ہے۔ ہم اپنی انسانی خصوصیات سے نہ صرف آشنا ہونا چاہتے ہیں بلکہ ان کے استعمال سے مادہ کو ایک قدر میں بدل لینا چاہتے ہیں۔ یہ راہ، میں جانتا ہوں اور شاید تمہیں بھی اس کا علم ہے، بہت ہی کٹھن ہے۔ اس آزادی کے استعمال سے آدمی خود اپنے سماجی مظاہر سے اس کو غائب بھی کرسکتا ہے اور ایک سطح پر وہ تمام مظاہر کو اپنے اندر اقدار کے ایسے نظام میں بھی ڈھال سکتا ہے جس کے مفردات اپنی انفرادیت پوری طہارت اور نجابت کے ساتھ قائم رکھتے ہوئے نظام میں اس طرح جذب بھی ہوں جیسے نینوں میں نیند۔ یہی انسان کی سب سے بڑی حاجت ہے اور اس حاجت کو پورا کرنے کے لئے یہ بھی تو ضروری ہے کہ اس ممکن نظام کی تمام کڑیوں کو فرداً فرداً سمجھ لیا جائے۔

انسان کئی مختلف النوع نظاموں سے مرکب ہے اور ان سے ماورا بھی ہے۔ ہر نظام اپنے روپ اور شکل میں ایک عالم ہے۔ ہر عالم میں مختلف قوانین جاری اور ساری ہیں۔

انسان بیک وقت ان تمام عالموں میں جی لینے کا اہل تو ہے مگر ایسا کر لینے میں ہر انسان نہ کامیاب ہوسکتا ہے نہ اس پر قادر ہے۔اس کے لئے یہ تو ممکن ہے کہ وہ ایک وقت میں اپنے اندر کے ایک عالم میں جنم لے، بڑھے پھولے اور پھر کسی اور عالم میں جنم لے۔ایک عالم سے دوسرے عالم میں جنم لینے کے لئے انسان کی تمام ممکن قوت درکار ہوتی ہے اور اس قوت کو پوری قدرت سے استعمال کرنے کیلئے پورے انسان کو اپنی تمام صلاحیتوں کو بروئے کار لانے کی ضرورت ہوتی ہے۔اور یہ صرف اسی وقت ممکن ہے کہ تمام صلاحیتیوں کی انفرادی ساخت کو کسی ایسی شکل میں ڈھال دیا جائے جو ان میں سے کسی ایک کی نہ ہو۔اس پورے عمل کی جو شکل بنتی ہے اس کو میں نے اپنے لئے جذب و وجد کا نام دے رکھا ہے۔انسان جب پوری طرح اپنی صلاحیتوں کو ضرورت کے وقت جذب و وجد میں تبدیل کر لینے پر قادر ہوجاتا ہے تو وہ جب چاہے ایک عالم سے دوسرے عالم میں آمد و رفت کا سلسلہ جاری کر لے۔

تمہیں ان سب باتوں کا شاید شعوری احساس نہ تھا اسی لئے تم ایک سماج سے دوسرے سماج میں جذب ہونے کے لئے سرگرداں پھرتی رہیں۔ان تمام سماجوں نے اپنے اپنے لئے جذب و وجد حاصل کرنے کے طریقے بنا لئے ہیں مگر ان طریقوں سے جذب و وجد کے عالم میں کبھی کبھار ہی داخل ہوا جا سکتا ہے اور کچھ لمحوں کے لئے وہاں قیام کیا جا سکتا ہے۔ان سماجوں کے لوگ ان چند لمحوں پر اکتفا کر لینے کے عادی ہو چکے ہیں اور اس عرصے کو طول دینا ناممکن سمجھتے ہیں اور سماجی اقدار کے نقطہ نظر سے غیر ضروری اور نقصان دہ بھی۔انسان کچھ لمحوں کے قیام سے مطمئن نہیں ہوسکتا ہے۔وہ ہر سطح پر اپنی تمام صلاحیتوں کے ساتھ جینا چاہتا ہے اور اس جینے پر قدرت بھی حاصل کرنا چاہتا ہے۔یہ سطح سماجی طور پر اسی سماج میں ممکن ہوسکتی ہے جو ایسی زندگی کے نظام کو قبول کرتا ہے یا پھر ایسے سماج میں جس میں سماجی محرکات کی رفتار اتنی مدھم ہو کہ محرکات کے پورے نظام سے عہدہ برا ہونے کے لئے انسانی صلاحیتوں کو بہت ہی تھوڑی قوت صرف کرنی پڑتی ہو اور اس نظام کو ہر قسم کی رفتار دی جاسکتی ہو اور اس نظام کو ایک نئے نظام میں تبدیل کرنے کے لئے جمود کی ضرورت بہت

ہی کم عرصہ کے لئے ہو۔

اس قسم کا سماج یورپ میں کہیں نہیں صرف اپنے دیس میں ہی ہے۔ اگر یہاں ایسے لوگ ایک دوسرے کو غیر سماجی اور اقداری رشتوں میں منسلک کر لیں تو بہت ہی قلیل مدت میں سماج کو ایسے نظام میں تبدیل کیا جا سکتا ہے جہاں آدمیوں کے لئے انسان بننا اور انسان کی طرح جی لینا اتنا مشکل نہ ہو کہ انسان بننے کی کوشش میں ہی آدمی موت سے ہم کنار ہو جائے۔''

بولتے بولتے تقی کے چہرے پر سرخی آ گئی تھی۔ اس سرخی میں اتنی دمک تھی کہ فردوس کو اس کا تمام جسم نور میں تحلیل ہوتا دکھائی دے رہا تھا۔ اس کے تمام جسم میں حرارت کا احساس اتنا شدید ہو گیا تھا کہ اسے ایک لمحے یہ بھی خیال ہوا کہ وہ کرسی میں بیٹھی بیٹھی پگھل جائے گی، بہہ جائے گی، کسی اور میں جذب ہو جائے گی۔ جونہی تقی کی گفتگو ختم ہوئی اس کو یوں لگا کہ اس کے خون میں، اس کے گوشت میں، اس کے دماغ کے خلیوں میں تبدیلی کا ایسا عمل جاری ہو گیا ہے جو اس کے تمام جسم کے خلیوں کے نظام کو ایک نئے نظام میں بدل دے گا۔ اس آنے والے حادثے کے احساس نے اس کے ذہن میں خوف بھرے کیف کی کیفیت پیدا کر دی تھی اور وہ اپنے آپ کو اس کیف کو چپ چاپ برداشت کر لینے پر قادر نہ سمجھتی تھی اور اس احساس سے بچنے کے لئے وہ اپنی آواز کے رستے سے فرار کی خواہاں تھی مگر اس کے ذہن میں ایسا خیال پیدا ہی نہ ہو رہا تھا جس کو آواز کی شکل دی جا سکتی ہو۔ وہ مضطرب تھی مگر خاموش، وہ بار بار تقی کی آنکھ بچا کر تقی کو دیکھتی تھی۔ اس کے جسم میں ایک مورت کا سا سکون آ چکا تھا۔ اس کے چہرے کو دیکھنے سے احساس ہوتا کہ مورت میں جان بھی ہے۔ اس کے چہرے سے یہ ظاہر ہو رہا تھا کہ خود اس کو اپنی گفتگو پر حیرانی ہو رہی تھی مگر اس حیرانی میں پریشانی کا شائبہ تک نہیں تھا۔ اس حیرانی کے ساتھ اس کے چہرے پر خوشی اور مسرت کا الاؤ سا جل رہا تھا۔ جانے کتنی دیر جلتا رہا۔ فردوس اس کی آگ تاپتی رہی اور سوچتی رہی اور کن انکھیوں سے تقی کو تکتی رہی۔ ایک بار جو اس نے تقی کی طرف دیکھا تو وہ بھی اس کو تک رہا تھا۔ دونوں کی نظریں ملیں۔ فردوس اپنی نظر کو تقی کی نظر سے چھڑا لینا چاہتی تھی مگر اس کی نظر میں وہ

طاقت نہ تھی جو تقی کی نظر میں تھی۔اس نے سوچا کہ تقی سے فاوَل کیا جائے۔اس خیال کے آتے ہی وہ دل ہی دل میں ہنسی اور سوچنے لگی کہ کیا بات کی جائے۔سوچتے سوچتے،بغیر فیصلہ کئے،ارادہ کئے،اس کے ہونٹوں سے آواز نکلنی شروع ہوئی۔

''متین صاحب کو میری طرف سے دعوت دیجئے کہ کل دوپہر کے کھانے اور سہ پہر کی چائے میں میرے ساتھ شریک ہوں۔رات کے کھانے میں اگر تم بھی شریک ہوسکو تو بہت ممنون ہونگی۔'' متین کا نام سنتے ہی تقی کے چہرے سے الاوَ کی روشنی کم ہوئی اور اس نے کرسی میں پہلو بدلا اور پورے شعور کے ساتھ فردوس کی بات سننے لگا۔

''میں متین صاحب کو تمہارا پیغام پہنچا دوں گا اور تمہاری دعوت کو قبول کرنے کے لئے زور دوں گا۔امید ہے کہ میری خواہش کو رد نہ کریں گے۔ان کے قبول یا رد کی خبر تمہیں پہنچا دوں گا......

میں یہی چاہتا ہوں کہ تم ان سے ملو وہ نہ صرف انسان ہیں بلکہ انسانِ حکیم ہیں۔مجھے کل ہی پتہ چلا ہے کہ وہ کسی زمانے میں بہت ہی کامیاب ڈاکٹر بھی تھے۔وہ اب اپنے پہلے پیشہ کو پھر سے اختیار کررہے ہیں۔تمہیں ضرور کوئی مفید مشورہ دے سکیں گے۔''

تقی ایک بار پھر کسی سوچ میں کھو گیا۔وہ حیران ہو رہا تھا پچھلے دو دنوں کے حادثوں کے بعد بھی کسی نئے حادثے کی گنجائش ہوسکتی ہے۔وہ اپنے اس سوال کا کوئی تسلی بخش جواب نہ ڈھونڈ سکا۔مگر اس کا جواب اسے ڈھونڈنا ضرور تھا۔اس لئے وہ اپنے بستر میں لیٹ کر اندھیرے میں اس کے متعلق سوچنا چاہتا تھا۔وہ اس فیصلے کے بعد کرسی سے اٹھ کھڑا ہوا اور فردوس سے رخصت کی اجازت کا خواہاں ہوا۔فردوس بھی شاید یہی چاہتی تھی۔اس نے تھوڑے سے اصرار کے بعد اجازت دے دی۔تقی کمرے کے باہر کے دروازے کی طرف مڑا اور کچھ قدم چلنے کے بعد کچھ سوچ کر رکا اور فردوس کو دیکھا کہ وہ کھڑے کھڑے کسی سوچ میں گم ہوگئی تھی۔اس کا چہرہ برف سے ڈھکے ہوئے پہاڑوں کے درمیان دھڑ ادھڑ جلتی ہوئی وادی بن چکا تھا۔اس عالم میں فردوس کو اپنی طرف متوجہ کرنا مناسب نہ سمجھتے ہوئے اس نے اپنے قدم دروازے کی طرف بڑھا دیئے اور کمرے سے باہر نکل گیا۔

پانچواں باب

متین صاحب صبح عالمہ کو دیکھ کر، اس کی والدہ کو ضروری ہدایات دے کر چلے آئے مگر تقی کو وہیں رہنا پڑا کیونکہ عالمہ کی والدہ کا یقین تھا کہ اس کی موجودگی عالمہ کے لئے تسلی اور تشفی کا باعث ہوگی۔ تقی خود بھی اسے یوں چھوڑ کر جانا نہ چاہتا تھا اگر چہ اس کا دل یہ بھی چاہتا تھا کہ وہ متین صاحب کے ساتھ فردوس کے یہاں چلا جائے کیونکہ وہ اپنے خواب کی تعبیر جلد از جلد دیکھ لینا چاہتا تھا۔

متین صاحب وہاں سے چلے تو سیدھا دھنش محل کا رخ کیا-- تمام راستہ اپنے گرد و پیش کے مناظر سے بے خبر، گھوڑے کو اس کی مرضی پر چھوڑے۔ گھوڑے کو شاید علم ہو گیا تھا کہ متین صاحب کو کہاں جانا ہے۔ وہ آہستہ خرامی کے ساتھ دھنش محل کی طرف بڑھتا رہا تا آنکہ وہ گھوڑوں کے فارم کے پاس جا کر رک گیا۔ گھوڑے کے رکنے سے متین صاحب بھی اپنی سوچ سے جاگے۔ انہیں اپنے آپ کو دھنش محل کے قریب دیکھ کر حیرانی سی ہوئی اور وہ سوچنے لگے کہ انہوں نے تمام راستہ کیا سوچتے گزارا مگر کوئی خیال بھی تو نہ تھا جس نے رستے بھر کسی وقت بھی ان کے شعور میں ایک لمحے کے لئے بھی قیام کیا ہو۔ ان کا دل و دماغ شاید کسی آنے والے سلسلہء خیال کے لئے بالکل خالی ہو گیا تھا۔ اس احساس سے وہ اپنے آپ مسکرائے اور ان کے دل نے چاہا کہ آئینہ ہوتا تو وہ اپنی مسکراہٹ کو دیکھ سکتے اور اندازہ لگا سکتے کہ خود ان پر کیا بیت رہی ہے۔ ان بے مقصد اور بظاہر بے معنی، احساسات اور خیالوں سے انہوں نے ایک ہی جھٹکے میں رہائی حاصل کرنے کے لئے اپنے پورے ارادے سے نظریں اٹھائیں اور فارم کے وسیع میدان پر گاڑ دیں۔ ہرے بھرے میدان میں رنگ برنگے گھوڑے، گھوڑیاں، بچے کلیلیں کر رہے تھے۔ انہیں صبح کی ہوا میں تن و توش کی صحت کو برقرار رکھنے کے لئے بالکل آزاد چھوڑ دیا گیا تھا۔ یہ شاید ان کے لئے معمول تھا۔ ان کے جسموں میں، ان کے بالوں میں سورج کی نرم نرم سنہری کرنوں سے ایک چمک آ گئی تھی جو تمام فضا میں ایک ہیجانی کیفیت پھیلا رہی تھی۔ ایک کونے میں کالے اور سنہری گھوڑوں کا

جھرمٹ مستی اور ناز سے کسی شے کی طرف متوجہ تھا۔اس جھرمٹ کے پرے کیا تھا ان کا دل چاہا کہ دیکھیں۔ وہ لوہے کے جنگلے کے ساتھ ہوتے ہوئے اپنے گھوڑے کو اس جھرمٹ کے بالکل قریب لے گئے۔ انہوں نے دیکھا کہ گھوڑے ایک دائرے میں فردوس کے ہاتھوں سے دانہ کھا رہے تھے۔فردوس سواری کا لباس پہنے تھی، پیتل کی بالٹی اس کے قریب رکھی تھی۔ وہ مٹھی بھر دانہ نکالتی اور باری باری کسی ایک گھوڑے کے منہ کے قریب لے جاتی اور گھوڑا اس کے چہرے پر ایک نگاہ ڈالتا اور پھر جھک کر اس کی ہتھیلی پر سے کھانا شروع کر دیتا۔متین صاحب کی آمد کا احساس نہ تو گھوڑوں کو ہی ہوا اور نہ فردوس کو۔ وہ چپ چاپ کھڑے کافی دیر تک اس عجیب، سہانے اور نشہ آور منظر کو دیکھتے رہے۔ان کا گھوڑا ابھی کچھ عرصہ تک تو چپ چاپ کھڑا رہا اور پھر نہ جانے کیوں وہ پھنکارا اور اس کی پھنکار سے جھرمٹ میں ایک جنبش ہوئی، کچھ گھوڑوں نے گردنیں پھرا کر سیاہ گھوڑے اور اس کے سوار کی طرف خشمگیں نظروں سے دیکھا۔ان کی اس حرکت نے فردوس کو بھی جنگلے کی طرف متوجہ کیا۔متین صاحب کو دیکھ کر اس نے انہیں پکارا اور باتیں کرتی کرتی، بالٹی اٹھائے ان کی طرف چلی۔''ہیلو۔اچھا کیا آپ چلے آئے۔ میں تو سوچتی تھی کہ آپ عین کھانے کے وقت پر ہی پہنچیں گے۔ میں نے فیصلہ کیا تھا کہ اگر آپ نے ایسا کیا تو دل میں آپ کے لئے جو جگہ بنائی ہے اسے کسی اور طرح پر کرنے کی کوشش کروں گی۔''

اب وہ بالکل ان کے قریب آ گئی تھی۔اس نے بالٹی رکھ دی۔ ہتھیلی دانوں سے بھر کے جنگلے سے ہاتھ باہر نکال کر متین صاحب کے گھوڑے کے منہ کے قریب لے گئی۔گھوڑے کی آنکھوں میں ایک چمک آ گئی اور اس نے فردوس کی آنکھوں میں دیکھا اور پھر اطمینان سے اس کی ہتھیلی میں رکھے ہوئے دانوں کو آہستہ آہستہ کھانا شروع کیا۔

''تقی آپ کے ساتھ نہیں آیا''

''نہیں۔اس کی پھوپھی زاد بیمار ہے۔وہ وہیں ہے۔ میں بھی وہیں سے آ رہا ہوں۔''

''آپ وہاں گئے تھے؟ کیوں؟ پھر ہنستے ہوئے بولی''بیماری کا فلسفہ سے کوئی تعلق ہے؟''

''ہے تو۔ مگر میں تو وہاں طبیب کی حیثیت سے گیا تھا''

''ڈاکٹر کی حیثیت سے؟''

''فلسفہ پڑھانے سے بہت پہلے میں ڈاکٹر ہی تھا۔''

''عجیب بات ہے۔ مجھے تو اس کا گمان بھی نہ ہوسکتا تھا۔ میں نے تو کبھی بھی آپ کے متعلق یہ بات نہ سنی تھی۔ جب میں ولی پور میں پڑھتی تھی اس وقت تو کہیں نہ کہیں آپ کا ذکر آجاتا تھا مگر فلسفی کی حیثیت سے۔ بہت لوگ آپ کے مداح تھے۔ مجھے اکثر آپ کے ذکر سے چڑ ہوتی تھی اور حیرانی بھی۔ ایک فلسفی کے اتنے جاننے والے اور وہ سب کے سب مداح۔ اور ہاں! تقی نے تو کبھی بھی آپ کا ذکر نہیں کیا۔ حالانکہ مجھے اس نے کل بتایا کہ وہ آپ کے بہت قریب تھا۔''

اس سوالیہ گفتگو پر متین صاحب مسکرا دیئے اور بولے ''آپ کی سب باتوں کا جواب گھوڑے پر بیٹھے بیٹھے دے دوں؟''

''اوہ! میں بھی کتنی بے وقوف ہوں! آپ چلئے، میں ابھی آپ کو آلیتی ہوں۔'' اتنا کہہ وہ پلٹی اور رکھوالے کو آواز دیتے، وہ میدان سے لوہے کے دروازے کے ذریعے نکلی۔ متین صاحب کے پیچھے دھنش محل کی سڑک پر چڑھنے لگی۔

چھٹا باب

''ہاں تو آپ نے بتایا نہیں کہ ڈاکٹری آپ نے کب چھوڑی اور کیوں۔ میرا یہ سوال محض تجسس نہیں۔ آپ کے جواب سے ہوسکتا ہے خود میرے اپنے ذاتی مسائل پر کچھ روشنی پڑے اور ان کے حل کی کوئی سبیل نکل آئے۔ میں یہ بھی جانتی ہوں کہ اس قسم کا ذاتی سوال کرنے کا مجھے بظاہر کوئی حق نہیں پہنچنا چاہیے مگر پرسوں کے حادثے کے بعد آپ سے ایک ایسا رشتہ تو یقیناً پیدا ہو گیا ہے جو بہت کم انسانوں میں ہوسکتا ہے۔ پھر آپ فلسفی بھی تو ہیں اور طبیب بھی۔ حقیقت کو جاننا اور بیمار کا علاج دونوں ہی آپ کے فرائض میں شامل ہیں۔''

''آپ کے سوال کے جواب میں جو کچھ بھی مجھے کہنا ہے وہ کوئی ایسا راز نہیں جس کے بتانے میں مجھے کوئی دکھ ہو یا حجاب آئے۔ان لوگوں کے سوا جو میرے ساتھ طب پڑھتے رہے آپ شاید دوسری شخص ہیں جس نے مجھ سے یہ سوال کیا ہے۔عجیب بات ہے یہ سوال پچھلے دو دنوں میں ایک ہی علاقے میں دو بالکل ہی مختلف قسم کے انسانوں نے کیا۔ایک نے مجھے اپنی زندگی کے دھارے کو ایک بار پھر بدل لینے پر قائل کر دیا۔اب نہ جانے آپ کا سوال میری زندگی کے ساتھ کیا کرے گا۔

اس لمبی تمہید کی میں معافی چاہتا ہوں۔اب میں کوشش کرونگا کہ ان تمام واقعات کا تمام تفصیلات سے ذکر کروں جنہوں نے مجھے مجبور کیا کہ میں ڈاکٹری چھوڑ کر فلسفہ کا پروفیسر بنوں۔

''مجھے لندن گئے ہوئے پانچ سال ہو چکے تھے۔ میں ان دنوں ایسٹ اینڈ میں پریکٹس کرتا تھا۔ میری پریکٹس صرف ایشیائی لوگوں تک محدود نہ تھی بلکہ یورپ کے مختلف ملکوں کے انقلابات کے پناہ گزینوں کے اکثر افراد میرے پاس علاج معالجے کے لیے آیا کرتے تھے۔میں ان لوگوں میں کافی مقبول تھا۔ان دنوں اس پریکٹس کے علاوہ میری کوئی دلچسپی نہ تھی۔میرے مریض زندگی کے اتنے متنوع پہلو مجھے دکھاتے تھے کہ ان کے متعلق غور کرنا ہی بہت بڑی مہم ہوتی تھی۔ان کے آزار صرف جسمانی ہی نہ ہوتے بلکہ ان جسمانی دکھوں میں معاشی تنگ دستی اور ان کی حاجتوں اور آرزوؤں کے درمیان صلاحیتوں اور معروضی امکانات کے درمیان جو گہری خلیج ہوا کرتی،ان کے جسمانی آزاروں کو جذباتی، نفسیاتی اور روحانی سانحوں میں بدل دیتی اور ان سانحوں کا علاج وہ میرے جیسے سستے ڈاکٹر کے علاوہ کہاں ڈھونڈھ سکتے تھے۔میں نہ صرف میسر تھا بلکہ ان کا ہمدرد اور غمگسار تھا۔ان کو میں سمجھتا تھا اور وہ مجھے سمجھتے تھے، میری ہمدردی میں ان کو کوئی حائل نظر نہ آتا اور مجھے اپنا دوست سمجھ لینے میں ان کو کوئی عار محسوس نہ ہوتا تھا۔ پیسے نہ بھی ہوتے تو وہ بے دریغ میرے کلینک میں چلے آتے۔میرے اور ان کے درمیان رشتوں کا ایک ایسا تانا بانا بن گیا تھا جو مریض اور ڈاکٹر کے عمومی رشتوں سے ماورا تھا۔یہ رشتے محض انسانی ہمدردی کے رشتے ہی

نہ تھے بلکہ ان میں ایک گہرا مابعدالطبیعیاتی عنصر بھی تھا جو ان کی زندگیوں اور میری زندگی کو ایک حصار میں لیے رہتا جس کے سبب میں اور میرے مریض ایک طرح کے مضطرب امن میں رہتے۔

اپنے دیس میں میرا کوئی نہ تھا، ماں تھی جو کچھ سال پہلے مر چکی تھی، ایک ماموں تھا جس سے مجھے کبھی لگاؤ نہ رہا تھا۔ میرے والد ہم ماں بیٹے کے لیے کافی جائداد چھوڑ گئے تھے جس سے ہماری خوراک، لباس اور میری تعلیم کا خرچ پورا ہو جاتا تھا۔ ہاں! کچھ یادیں ضرور وابستہ تھیں اپنے دیس سے مگر تھیں وہ بہت اندوہناک جن کو بھلا دینے میں ہی بھلائی تھی۔ روحانی سکون اور توازن تھا، لہٰذا انہیں بھلا بیٹھا تھا۔

سارا دن اور رات کا ایک لمبا حصہ مریضوں کو دیکھنے، ان کے لیے نسخے لکھنے میں صرف کر دیتا۔ کبھی کبھی دوپہر کے وقت جب سب لوگ کھانا کھانے کے لیے کاروبار چھوڑ ریستورانوں میں چلے جاتے تو میں ایک آرام کرسی پر جو گھنٹوں بانہیں وا کئے میرا انتظار کرتی رہتی دراز ہو کر کمر سیدھی کر لیتا اور اگر میری مالکہ مکان مجھے کھانا بھجوا دیتی تو کھا لیتا۔ میں کھانا اپنے مطب کی مالکہ مکان کے یہاں کھایا کرتا تھا، اس کا اصرار تھا کہ دوپہر کا کھانا اس کے یہاں سے کھایا کروں اور اس کے عوض اس کے خاندانی ڈاکٹر کے فرائض انجام دیا کروں، جس کی نوبت بہت ہی کم آیا کرتی کیونکہ وہ اور اس کا خاندان بہت صحت مند تھا، جسمانی اور روحانی طور پر۔

جب کبھی صبح سے دوپہر کے دوران مریضوں کا ہجوم کم ہوتا –ایسا کم کم ہوتا تھا– تو میں کھانے کے لیے ایک روسی ریستوران میں چلا جایا کرتا۔ اس ریستوران میں ایک خوبی تھی کہ وہاں سب لوگ، سب ملازم اور اکثر گاہک، مجھے جانتے تھے اور مجھے جلد ہی فارغ کر دیا کرتے تھے مگر کچھ عرصہ بعد مجھے ان جانی پہچانی صورتوں نے اپنی طرف زیادہ ہی متوجہ کرنا شروع کر دیا اور میرے پاس ان میں دلچسپی لینے کے لیے نہ تو فرصت تھی اور نہ ہمت، میں اپنی فرصت اور ہمت صرف اپنے مریضوں کے لیے مخصوص رکھنا چاہتا تھا۔ لہٰذا میں اس قریب کے ریستوران کو چھوڑ کر ایک دور کے ہنگیروی ریستوران میں دوپہر کے کھانے کے

لیے یا کبھی کبھی رات کے کھانے کے لیے، بہت رات گئے جانے لگا، وہی کبھی کبھار۔ یہاں ایک ویٹرس تھی جو لندن کی ویٹرسوں سے بہت مختلف تھی، جس کو گاہکوں سے ملنے والی ٹپ سے زیادہ ان کی آسودگی کا خیال رہتا تھا۔لہٰذا گاہکوں میں مقبول تھی اور لوگ اس سے احترام سے پیش آتے تھے اور اپنے اس طرزِ عمل سے بہت مطمئن نظر آیا کرتے۔ بچے خاص طور پر اس سے بہت مانوس تھے، عمر کچھ زیادہ نہ تھی یہی کوئی تیس بتیس کے لگ بھگ۔ پہلے پہل تو اس نے میری طرف خاص توجہ نہ دی۔ آتی تھی، آرڈر ایسے لحن میں طلب کرتی کہ آسودگی کا احساس فوراً جنم لیتا، کھانے کی چیزیں بڑی دلجمعی سے رکھتی، بلکہ سجاتی اور چلی جاتی اور پھر جب کھا چکتا تو بڑے اطمینان سے آتی، برتن اٹھاتی، کھانے کے تسلی بخش ہونے کے بارے میں پوچھتی اور چلی جاتی۔ اس کی خوش خلقی اور خوش اخلاقی شاکی ہونے کا کبھی موقع نہ دیتی۔ اس کے رویے سے ایک الجھن سی ہوتی، نجانے کیوں۔ شاید میں اس سے التفاتِ خاص کا متمنی تھا۔ اس کی شخصیت سے اک مستغنی رشتے کا احساس ہوتا، جیسے سورج ہر ایک کے لیے روشنی اور گرمی بکھیرتا ہے مگر کسی سے شکریے کا طلب گار نہیں۔ اس کا یہ گرم استغنا دل کو اپنی طرف کھینچتا اور میں وقت نکال کر ہفتے میں ایک آدھ بار وہاں جانے لگا۔

ایک دن جب میں ریستوران میں داخل ہوا تو چند سفید فام روسیوں اور ان کے ساتھ موجود ان کے پوتوں نے مجھے پہچان لیا اور اپنی میز سے اٹھ کر مجھے گھیر لیا اور اصرار کیا کہ ان کے ساتھ کھانے میں شریک ہو جاؤں۔ مجھ میں ان کے خلوص نے انکار کرنے کی جرأت پیدا ہی نہ ہونے دی۔ اس دن مجھے دوپہر کے کھانے سے فارغ ہونے میں دیر ہوگئی اور واپس پہنچا تو خاصے مریض پریشان نظر آئے کہ میرے معمول میں رخنہ پیدا ہو گیا تھا۔ اگلی بار جب میں وہاں گیا تو وہی لوگ موجود تھے اور ان کا اصرار ویسا تھا اس بار ان کا خلوص مجھے اپنے پاس بیٹھنے پر مجبور نہ کر سکا۔ میں نے ان کو قائل کر لیا کہ تنہا بیٹھ کر کھانا کھانا میرے لیے کتنا ضروری تھا کیونکہ اس سے مجھے ایک آرام ملتا تھا اور دوبارہ کام میں جت جانے کی طاقت اور ہمت۔

اس دن مریم......ویٹرس کا یہی نام تھا......نے مجھے حیرانی اور غور سے دیکھا اور دیکھتی

رہی اگرچہ اس کے معمول کے طرزِ عمل میں فرق نہ آیا۔ جب میں الگ ایک کونے کی میز پر جا بیٹھا اور اطمینان سے سانس لینے لگا تو وہ دوسرے لوگوں کی حاجت روائی سے فارغ ہو کر میری طرف بڑھ آئی۔

''مجھے معلوم نہ تھا کہ آپ غریبوں کے ملجا ہیں، ان کے زخموں پر مرہم رکھتے ہیں، ان کے جسمانی آزاروں کا ہی نہیں ان کے نفسیاتی اور روحانی آزاروں کا بھی علاج کرتے ہیں۔ آپ کے مریض آپ کے مداح اور ممنون ہی نہیں، آپ کے چاہنے والے اور جاں نثار بھی ہیں۔ آپ خوش نصیب ہیں کہ انسانوں کے لیے اتنا کچھ کر گزرنے پر قادر ہیں...... مجھے پہلے معلوم ہو جاتا تو آپ کی طرف زیادہ توجہ دیتی۔''

اس دن کھانے میں مجھے بہت ہی مزا ملا اور خوشی بھی۔ اس کے بعد میں اپنی مصروفیت کی وجہ سے وہاں نہ جا سکا۔ جب ہفتے عشرے کے بعد وہاں پہنچا تو میں نے دیکھا کہ وہ بہت خوش ہوئی ہے۔ اس نے دوسرے گاہکوں کو معمول کی خوش اخلاقی، خوش خلقی سے فارغ کیا، مگر کسی قدر جلدی سے۔ دوسرے گاہکوں کو احساس ہوا کہ نہیں مگر مجھے یہی محسوس ہوا۔

''ڈاکٹر! آج بہت مدت کے بعد آئے۔ لندن سے باہر گئے ہوئے تھے۔''

نہیں تو۔ کچھ مریض زیادہ تھے اور کچھ ان کی حاجتیں زیادہ توجہ طلب تھیں۔''

''کتنے خوش نصیب ہیں آپ کے مریض!''

ایسی بھی کوئی بات نہیں۔ یہ تو ہر ڈاکٹر کا فرض ہے میں بھی ادا کر رہا ہوں۔''

''فرض اور ہمدردلگن میں بڑا فرق ہوتا ہے۔ آپ کے مریض آپ کی غیر حاضری میں اکثر آتے رہے اور آپ کے متعلق پوچھتے رہے۔ ان کے تجسس میں خود غرضی نہ تھی۔ ایک لگاؤ تھا جو محبت سے دور نہ تھا۔ ان کی گفتگو سے عیاں تھا کہ وہ زندگی کی نعمتوں میں آپ کو بھی شریک کرنا راحت گردانتے تھے۔''

''یہ ان کی انسان دوستی ہے کہ میرے متعلق نیک جذبات کا اظہار کرتے تھے۔''

وہ کھانا لانے کے لیے چلی گئی کیونکہ اسے معلوم تھا کہ میں اس کے ریستوران کے کون

سے کھانوں کو پسند کرتا تھا اور اس دن کونسا کھانا سب سے اچھا تھا۔ جب وہ میز پر کھانا لگا چکی تو لمحہ بھر توقف کے بعد بولی:

''مجھے بھی اپنے مریضوں میں شامل کرلیں۔ مگر علاج میری حاجت نہیں۔ آپ کی خدمت کی خواہش میری چاہت ہے۔ امید ہے آپ باقاعدگی سے آتے رہیں گے''۔ اس کے بعد وہ دوسرے گاہکوں میں مصروف ہوگئی۔ مگر فارغ ہوتے ہی وہ میری میز پر حاضر تھی۔ برتن اٹھا کر اور بل کی رقم لے کر چلی گئی اور بقایا واپس کرنے آئی تو کہنے لگی:

''آپ جیسے نیک لوگ میرے تجربے میں کبھی نہیں آئے۔ آپ آتے رہے تو زندگی بغیر حزن اور خوف کے بسر کرنے کی ایک صورت نکل آئے گی۔'' اس کے لحن میں جذبات کی گرمی کے علاوہ ایک گہرے دکھ کی چاشنی بھی تھی جو نمایاں تو نہ تھی مگر میری چھٹی حس نے اس کو محسوس کرلیا۔

اس کے بعد میں جب بھی وہاں گیا تو کھانا بہت لطف لے کر اور وقت صرف کر کے کھایا کہ اس سے مریم کے ساتھ ایک بھرپور محفل کا احساس ہوتا تھا۔ میرے وہاں جانے میں غیر شعوری طور پر آہستہ آہستہ وقفے کم ہوتے چلے گئے۔ مریضوں کا ہجوم تو ویسا ہی رہا مگر مریضوں کی حاجتیں کم وقت طلب کرتی رہیں اور وہاں جانے کے لیے وقت میسر آتا ہی رہا۔ کسی نہ کسی ہفتے تو ایک آدھ دن ہی ناغہ ہوتا اور کسی دن دوپہر کے علاوہ رات کو بھی چلا جاتا اگرچہ اس وقت وہ ڈیوٹی پر نہ ہوتی مگر پھر بھی اس سے محفل ہونے کا احساس رہتا۔

ان ملاقاتوں کے سبب میں نے پہلی بار آنکھوں ہی آنکھوں میں باتیں کرنا سیکھا اور اس میں مہارت حاصل کرلی۔ میں جاتا تو اس کو گاہکوں میں مصروف پاتا۔ ہر گاہک کو وہ یہ احساس دینا جانتی تھی کہ اس کے پاس دوسرے گاہکوں کی نسبت زیادہ دیر حاضر رہی ہے۔ اس نے شاید ہی کسی گاہک کو یہ احساس ہونے دیا ہو کہ وہ میرے پاس حاجت روائی کے سوا ایک لمحہ بھی زیادہ ٹھہرتی ہو۔

اس کی آنکھیں بہت خوبصورت تھیں مگر وہ ان کے حسن کو لوگوں سے چھپا لینے میں بہت ماہر تھی۔ وہ آنکھیں اس طرح کھولتی تھی کہ احساس ہوتا تھا کہ اس کی آنکھیں اس کے

چہرے کے تناسب سے چھوٹی ہیں مگر جب بھی وہ میرے روبرو ہوئی میں نے محسوس کیا کہ اس کی آنکھیں اس کے چہرے پر سجتی ہیں۔ یہ میری نظر کا قصور یا کرشمہ نہ تھا۔ خود اس کو اپنی آنکھوں کے حسن کا شعور تھا اور اس نے اپنی کوشش سے ان کے حسن کو چھپانے کا فن سیکھا تھا۔ اگر وہ ایسا نہ کرتی تو اس کے چہرے کا حسن ہر ایک کی توجہ کے دامن کو کھینچتا اور وہ اس فطری استغنا کو برقرار نہ رکھ پاتی۔

ایک دن میں نے اس سے پوچھ ہی لیا کہ وہ اپنی آنکھوں کے حسن کو چھپائے کیوں رکھتی ہے۔ پہلے تو وہ حیران سی ہوئی، پھر مسکرائی، آنکھوں کو پوری طرح کھولا، اس کے چہرے پر ایک ہلکی سی لہر دوڑ گئی، پھر اس نے آنکھوں کو چھوٹا سا کرلیا، منہ پھیر، کچھ کہے بغیر چلی گئی۔ کچھ دیر بعد وہ کافی لے آئی اور کہنے لگی۔ اس کے الفاظ آج تک میرے دل و دماغ کی فضاؤں میں گونجتے ہیں:

''ان آنکھوں کا حسن، میرے چہرے کا حسن (ان آنکھوں کا میرے چہرے کے حسن سے خاص اور گہرا تعلق ہے، یہ میں جانتی ہوں) خالقِ کائنات کی خاص عنایت اور انعام ہے اور اس انعام سے میں صرف اس شخص کو روشناس کرا سکتی ہوں جو اس بات کا قائل ہو کہ یہ انعام ہے اور خالقِ کائنات کا انعام ہے اور اس انعام کا احترام کرنا جانتا ہو۔ اگر اس انعام کو ہر کسی پر وا کر دوں تو ایک خلقت میرے پیچھے لگ جائے اور میں بدنام ہو جاؤں۔ مجھے اپنی عزت اور نیک نامی بہت عزیز ہے۔ ان آنکھوں کو ذرا سا چھوٹا کر لینے سے میرے چہرے کے تناسب میں فرق آ جاتا ہے اور میرا شمار حسینوں میں نہیں رہتا اور میں اپنے فرائض اطمینان سے ادا کر سکتی ہوں اور میری زندگی میرے اپنے خیالات اور تصورات اور عقیدے کے مطابق گزر سکتی ہے، حالات میری زندگی پر کچھ زیادہ اثر انداز نہیں ہوتے۔''

بات ختم کرتے ہوئے وہ پھر مسکرائی اور ذرا سی لجائی اور اس کی آنکھوں میں ایک جوت جگمگ جگمگ کرنے لگی اور اس کا چہرہ کھل گیا۔ اس کا چہرہ بہت ہی معصوم اور لہٰذا گہرا تھا جو اس کی گہری اور نیک سیرت کا پرتو تھا۔

اس کی اس گفتگو نے مجھ پر اتنا گہرا اثر کیا کہ میں کھانا ختم کر چکنے کے بہت دیر تک

وہاں بیٹھا رہا، سوچتا رہا، کھویا رہا۔ وہ برتن لے جانے کے بعد صرف بل میں سے پیسے لوٹانے کے لیے آئی۔ اس کے بعد وہ بظاہر میری طرف متوجہ نہ ہوئی مگر اس کی نظریں مجھ پر رہیں لیکن وہ میری طرف نہ آئی۔ آخر میں اٹھ کر چلا آیا۔ اس رات میں دیر تک جاگتا رہا، حسین خواب بنتا رہا، ادھیڑتا رہا، حسین گلیوں، مرغزاروں، پہاڑی راستوں میں آوارہ، بے مقصد، بے منزل، بے نشان گھومتا رہا۔

اس کے اگلے پورے دو ہفتے تک مجھے بالکل فرصت نہ ملی۔ کچھ مریضوں کو دیکھنے اور پھر ان کی دیکھ بھال کے لیے لندن کے مضافات میں جانا پڑا، کچھ شناسا لوگوں کے ساتھ جن کا میں بے حد احترام کرتا تھا، ان کے اصرار پر ان کی اس نیت کے سبب کہ میں یہ خاص اوپیرا دیکھوں جس سے میرے کام کی شدت سے پیدا ہونے والا تناؤ کم ہو جائے گا، اوپیرا دیکھنا اور اس کے بعد ایک اعلیٰ پائے کے ریستوران میں رات کا کھانا کھانا پڑا، اور پھر کئی دن ایک مقدمے میں جیوری کے ایک فرد کے فرائض انجام دینے پڑے۔

آخر جب فرصت ہوئی تو دوپہر کو اس کے ریستوران گیا تو اس کو نہ پایا۔ دوسری ویٹرس سے پوچھا تو اس نے بتایا کہ اس دن اس کو چھٹی تھی۔ چھٹی کے ذکر سے مجھے حیرانی ہوئی تو اس نے بتایا کہ وہ ہفتے میں اس دن چھٹی پر جایا کرتی تھی جس دن کسی دوسری ویٹرس کو چھٹی کی ضرورت نہ ہو۔ اس کرید پر مجھے ندامت ہوئی۔ حسبِ معمول آہستہ آہستہ کھانا کھایا اور نئی ویٹرس کو ذرا زیادہ ٹپ دی تاکہ وہ میری کرید پر زیادہ توجہ نہ دے۔

واپس مطب میں آیا تو کچھ دیر تک مریض دیکھتا رہا مگر کام میں دل نہ لگا تو میرے اسسٹنٹ نے مجھ سے کہا کہ منتظر مریض اہم نہ تھے، ان کے مرض سیدھے سادھے اور معمولی تھے جن کو وہ نپٹا لے گا اور یہ کہ مجھے تفریح کی ضرورت تھی۔ کچھ دیر توقف کے بعد اس نے مجھے بتایا کہ فلاں سینما میں اک مزے کی فلم لگی ہوئی تھی جس نے مہینوں یورپ کے مختلف ملکوں میں دھوم مچائی تھی۔ میں اپنی ناخواستگی کا اظہار کرتے ہوئے اس سے رخصت ہو کر گھر آیا۔ کپڑے اتار بستر پر لیٹ گیا مگر آرام کرنے کو جی نہ چاہا۔ اٹھا، منہ ہاتھ دھو، کپڑے بدلے اور گھر سے نکل آیا۔ خیال آیا کہ شام کے شو میں کافی وقت ہے۔ میٹنی تو

شروع ہوئے کافی وقت گزر چکا ہوگا۔ ایک ریستوران میں داخل ہوا، ایک کونے میں بیٹھ گیا، چائے منگوائی۔ چائے پیتے پیتے نظر جو اٹھائی تو سامنے ایک ادھیڑ عمر شخص کو اپنی طرف دیکھتے پایا۔ ذہن پر زور دیا تو یاد آیا کہ وہ کافی عرصہ ہوا ایک مدت تک کئی بیماریوں کے سلسلے میں میرے زیرِ علاج رہا تھا۔ میں نے اس کو پہچان لیا اور مسکرا دیا۔ وہ اپنی میز سے اٹھ آیا اور میری میز پر بیٹھنے کی اجازت طلب کی، بیٹھ گیا اور اپنی صحت کے متعلق بتانے لگا کہ اب صحت یاب چلا آ رہا ہے۔ میرے علاج پر تشکر کا اظہار کیا۔ اپنے کاروبار کے پھلنے پھولنے کا ذکر کیا اور بتایا کہ اس پھلنے پھولنے میں اس کی صحت یابی کا کس قدر حصہ ہے اور اس کی صحت یابی صرف میرے علاج سے ممکن ہوئی تھی کیونکہ وہ کئی ایک ڈاکٹروں سے ناامید ہو کر میرے پاس آیا تھا۔ پھر اپنی بیوی کی نیک سیرت اور خوبروئی کا ذکر شرما شرما کر کیا، اپنے بچوں کی صحت اور تعلیم و تربیت کا ذکر کیا اور پھر...... اپنے دونوں ہاتھوں کی انگلیوں کو آپس میں پیوست کر کے، کہنیاں میز پر ٹکا اور انگلیوں کے پوروں پر ٹھوڑی رکھ کر مجھ سے سوال کیا:

''ڈاکٹر! آپ نے شادی کیوں نہیں کی۔''

جب میں جواب دینے سے بچنے کے لیے چپ رہا اور شانوں کو جھٹک کر اس موضوع سے اپنی بے تعلقی کا اظہار کیا تو اس نے اپنے دونوں ہاتھ کھول کر میز پر رکھ دیئے، جیسے کہ وہ بہت فیصلہ کن بات کرنے والا ہو، اور مجھے دیکھنے لگا اور پھر کہنے لگا:

''ڈاکٹر! اگر میری بیٹی (ایک ہی ہے اور بچی ہے) جوان ہوتی تو میں اس کو مشورہ دیتا کہ وہ تم سے شادی کر لے۔ کسی عورت کی اس سے بڑھ کر کیا خوش بختی ہو سکتی ہے کہ تم جیسے شریف الطبع، دھیمے مزاج، متین ہمدرد اور انسان دوست اور فارغ البال ڈاکٹر سے اس کی شادی ہو جائے...... کیا واقعی تمہیں سارے لندن اور اس کے مضافات میں ایسی کوئی لڑکی نظر نہیں آئی جو تمہارے من بھائی ہو۔ میں یہ ماننے کے لیے قطعی تیار نہیں ہوں کہ کوئی لڑکی تمہارے من بھائی ہو اور اس کو تمہاری بیوی بننا قبول نہ ہو۔ اگر تمہیں اس میں شک ہو تو کبھی (کل ہی کیوں نہیں؟) میری بیوی سے ملو۔ وہ تمہیں قائل کرنے میں ضرور کامیاب ہو جائے گی کہ تم عورتوں کو، نوجوان لڑکیوں کو ضرور لبھاتے ہو، لبھا سکتے ہو۔ مریضوں سے بھی تمہارا

طرزِ عمل ایک معالج کا نہیں چاہنے والے کا سا ہے۔ جو مرد اور عورت، خصوصاً عورت، چاہے کتنی عمر رسیدہ کیوں نہ ہو، تم سے ایک بار علاج کروا گئے وہ تمہیں ہمیشہ دلی لگاؤ سے یاد کرتے ہیں۔ خدا کی قسم! میں سچ کہتا ہوں کہ اگر میں عورت اور حسین عورت ہوتا تو تمہاری بیوی بننے میں راحت اور فخر محسوس کرتا۔''

فقرہ مکمل کرتے ہی وہ شرمایا اور پھر ایکا ایکی وہ اپنی تقریر پر پریشان ہو کر اٹھ بیٹھا اور خدا حافظ کہہ اپنی میز پر میری طرف پیٹھ کر کے بیٹھ گیا، بل منگوایا، پیسے دیئے اور بقیہ وصول کیے بغیر چلا گیا۔

اس کی تقریر اور اس کے بعد کے ردِ عمل سے مجھے دل ہی دل میں خوشی بھی ہوئی اور اس شریف النفس انسان کے لیے میرے دل سے دعا بھی نکلی۔ میرے دل میں، کہ بیٹھا جا رہا تھا، امید کی ایک بہت بڑی لہر اٹھی اور رگ و پے میں سرایت کر گئی۔

میں نے گھڑی میں وقت دیکھا۔ ابھی شام کے شو میں دیر تھی۔ میں نے بل ادا کیا اور آہستہ آہستہ پیدل ہی سینما کی طرف چل دیا۔ چلتے چلتے خیالوں میں ایسا کھویا کہ سینما کے رستے کو چھوڑ کسی دوسری طرف نکل گیا۔ ایک دم بگ بن کے گھڑیال نے چونکایا۔ اردگرد دیکھا تو ماحول اجنبی تھا۔ چوک کے سپاہی سے رستہ پوچھا تو اس نے بتایا کہ سینما سے اتنی دور نکل آیا تھا کہ اب صرف ٹیکسی میں ہی وقت پر پہنچ سکتا تھا۔ میں نے سپاہی کا شکریہ ادا کیا، ٹیکسی لی اور سنیما پہنچا تو شو شروع ہو چکا تھا۔ سینما ہال کی راہنما (Usherette) نے ٹارچ کی روشنی میں ایک سیٹ پر لے جا بٹھایا۔ میں فلم دیکھنے میں مشغول ہو گیا کیونکہ فلم انتہائی دلچسپ تھی مگر کچھ دیر بعد میں نے محسوس کیا کہ میری پشت کی سیٹ پر کوئی وہ خوشبو لگائے ہوئے تھا جو مجھے ایک زمانے میں بہت ہی محبوب تھی۔ یہ خوشبو اتنی ہلکی تھی کہ اس کو صرف وہی محسوس کر سکتا تھا جو اس کو اکثر لگانے کا عادی ہو۔ میں نے یہ خوشبو برسوں سے نہیں لگائی تھی۔ کچھ ہفتے پہلے میری ایک نوجوان مریضہ صحت یاب ہونے کے بعد مجھے اس خوشبو کی ایک بوتل دے گئی تھی۔ مجھے بار بار یہ خیال آتا تھا کہ اس خوشبو کو لگانے والا ضرور میرا جاننے والا ہے۔ اس رات انٹرول بہت دیر کے بعد ہوا۔ میں اپنی کرسی سے باہر جانے کے لیے ذرا

سامڑا تو کسی نے پیچھے سے مجھے ڈاکٹر کہہ کر پکارا۔ وہ وہی تھی جس کو میں اس دن ملنے کے لیے بے تاب ہو رہا تھا۔ ہم دونوں ایک دوسرے کو اس اجنبی ماحول میں دیکھ کر حیران ہوئے۔ مریم نے مسکراتے ہوئے خیریت پوچھی اور کہنے لگی کہ میں بھی سوچ رہی تھی کہ میری پسندیدہ خوشبو لگائے کون بیٹھا ہے۔ میں نے جب اسے بتایا کہ میں بھی انٹرول تک یہی سوچتا تھا تو اس کے حلق سے مدھم سروں میں بجتی ہوئی گھنٹیوں کی صدا آئی اور اس کی آنکھیں جگمگ جگمگ کرنے لگیں۔ اس کے متوازن سفید سفید دانت روشنی میں چمکنے لگے۔ اس کے چہرے کی سرخی گیت میں ڈھلنے لگی۔ اپنی سرخی کو چھپانے کی خاطر اس نے جیب سے رومال نکال کر ماتھے سے پسینہ پونچھا مگر وہاں تو پسینے کا نشان بھی نہ تھا۔ رومال کو ماتھے تک لے جانے میں اس کے ہاتھ کی پشت کے خم میں ایک لطیف سا ارتعاش پیدا ہوا۔ اس کے ہاتھ کی دوسری انگلی میں پہنی ہوئی سونے کی انگوٹھی میں سے شعاعیں نکل کر اجالے میں گم ہو گئیں۔ اتنے میں لوگ اٹھ اٹھ کر باہر جانے لگے۔ وہاں بیٹھے رہنے کو مناسب نہ سمجھتے ہوئے ہم بھی اٹھ کر باہر چلے آئے۔ ریستوران میں جا کر کافی کا آرڈر دے کر ہم ایک کونے میں بیٹھ گئے۔ میں بار بار اس کے دائیں ہاتھ کی دوسری انگلی کو تکے جا رہا تھا۔ اس نے میری نظر بچا کر باتیں کرتے کرتے اپنا دایاں ہاتھ میز کی اوٹ میں کر لیا۔ میں نے جب اس کی اس حرکت کو دیکھا تو مجھے اپنے بے مطلب تجسس پر بہت ہی افسوس ہوا اور میرا جی چاہا کہ معذرت کروں مگر پھر یہ سوچ کر چپ ہی رہا کہ یہ بھی تو ایک طرح سے تجسس کا اظہار ہوگا اور اس تجسس کے اندر چھپے سوال کا جواب دینا شاید وہ ضروری سمجھے اور جواب دینے سے اسے دکھ ہوگا۔ اس کے بعد مریم نے ادھر ادھر کی باتیں اتنے انہاک اور خوش الحانی سے کرنی شروع کر دیں کہ میں سنتا ہی رہا۔ اتنے میں انٹرول ختم ہونے کی گھنٹی ہوئی اور ہم دونوں اندر چلے آئے اور خاموشی سے کھیل میں دلچسپی لینے لگے۔

شو ختم ہو جانے پر میں نے اس کو گھر تک چھوڑ آنے کی خواہش کا اظہار کیا۔ اس نے پیشکش کو قبول کر لیا اور پیدل ہی چلنے کی خواہش ظاہر کی۔ وہ سارا راستہ مجھ سے میرے بارے میں پوچھتی رہی، کتنے بہن بھائی تھے؟ ماں باپ زندہ تھے؟ لندن میں کب سے تھا؟

دیس کی یاد ستاتی تھی کہ نہیں؟

جب میں نے اس کو بتایا کہ میرا نہ بھائی تھا نہ بہن، ماں کو مرے برسوں ہو گئے، دیس میں اب کوئی نہ تھا جس کے لیے میری زندگی کوئی معنی رکھ سکتی تھی، صرف کچھ یادیں تھیں جن کو بھول جانا ہی بہتر تھا، اور یہ کہ میں پچھلے کئی برسوں سے لندن ہی میں تھا اور وہیں رہنے کا ارادہ تھا۔ اس کو میرے اکیلے پن پر بہت ملال ہوا اور کہنے لگی:

''بچپن میں اور جوانی میں، خصوصاً جوانی میں، بہن کی بہت ہی ضرورت ہوتی ہے: اک بہن جذبات کی تربیت میں بہت بڑی معاون ہوتی ہے۔ بھائی ہر لمحے نت نئی قوت کا احساس دلاتا ہے اور بیک وقت رقیب، دوست اور حلیف کے فرائض انجام دیتا ہے۔ اور ماں......''

ماں کے متعلق وہ کچھ بھی نہ کہہ سکی اور خاموش ہو گئی۔

''میری ماں طب کے آخری امتحان میں میرے پاس ہونے کے کچھ دن بعد ہی مر گئی تھی اور اس نے مرنے سے کچھ دن پہلے ایک خط لکھا تھا جو اس کے مرنے کے بعد میرے ماموں نے مجھے بھجوایا تھا۔ اس خط کے فقرے میرے دل و دماغ پر اس وقت بھی نقش تھے اور آج بھی نقش ہیں۔

میں اب جب اپنی ماں کے متعلق سوچتا ہوں تو میرا دل اور ذہن اس کی یاد میں جھک جاتا ہے کہ شاید ہی کسی کی ایسی اچھی ماں ہوگی۔ اس نے آخری خط میں لکھا تھا ''جس وقت یہ خط تمہیں ملے گا میں تمہارے جنتی باپ کی خدمت میں حاضر ہو چکی ہونگی۔ میں تمہارے پاس ہونے پر ہمیشہ کے معمول کے مطابق تمہیں امتحان میں کامیاب ہونے پر انعام دینا چاہتی ہوں مگر میں اس وقت کا انتظار اب نہیں کر سکتی۔ مجھے یقین ہے کہ تم ہمیشہ کی طرح اب بھی اپنے مرحوم باپ کا نام روشن کرو گے اس وقت میں ایسا کوئی انعام نہیں دے سکتی جو تمہیں صرف میں ہی دے سکتی ہوں سوائے اس کے تم مجھے ہمیشہ چلتی پھرتی دیکھو۔ میرے چہرے پر موت کا سایہ نہ دیکھو۔ میں جانتی ہوں کہ عام حالتوں میں انسان کی یہ بڑی خواہش ہوتی ہے کہ وہ اپنے مرے ہوئے عزیز کا دفن کرنے سے پہلے منہ دیکھے اور اسے اپنے ہاتھوں سے

قبر میں اتارے مگر میں یہ نہیں چاہتی تم بھی وہی کرو جو دنیا کرتی ہے۔تمہارا ماموں میرے لئے وہ تمام فرائض جو مرنے والے کے بیٹے کے ہوتے ہیں، ادا کر دے گا۔ میں چاہتی تھی کہ تم اپنی زندگی کا لائحہ میرے بغیر بناؤ۔ آج مجھے یقین ہو گیا ہے کہ میری یہ خواہش بھی پوری ہو جائے گی۔''

چلتے چلتے اس نے میرے بائیں بازو میں اپنا دایاں ہاتھ ڈال دیا اور یوں میرے ساتھ وہ ننھے ننھے قدم اٹھاتی، دھیرے دھیرے، رواں رہی۔ جب میں نے اپنی ماں کے آخری خط کا ذکر کیا تو اس نے اپنا ہاتھ میرے بازو میں سے نکال کر میرے بائیں کندھے پر رکھ دیا اور آہستہ آہستہ میرے شانے کو تھپکتی رہی۔ اس کی بہت سی عادتیں میری ماں سے ملتی تھیں۔ اس کی آواز میں وہی حلم، وہی موسیقی کا سا زیر و بم تھا۔ جب کوچہ و بازار میں سے گزرتے ہوئے وہ لیمپ کی روشنی میں میری طرف دیکھ کر مسکرا دیتی تو اس کے دانتوں کی سفیدی کی آب مجھے یادوں کی کن کن وادیوں میں سے گزار لاتی۔ وہ اپنے گھر کے قریب والی گلی کی نکڑ تک چپ رہی اور اس کے بعد اس نے مجھ سے رخصت چاہی اس نے مجھے بتایا کہ وہ نہیں چاہتی تھی کہ اُس دن میں اس کے گھر تک اسے چھوڑنے جاؤں۔ اس نے مجھ سے جب ہاتھ ملایا تو اتنے پیار اور شفقت سے میرے ہاتھ کو دبایا کہ میری آنکھیں دھندلا گئیں۔

اس دن کے بعد ہم بغیر وقت مقرر کئے ایک دوسرے کو کہیں نہ کہیں مل جاتے۔ کبھی سینما میں، کبھی تھیٹر میں ایک دو دفعہ اوپرا میں۔ ان تمام ملاقاتوں میں اس نے مجھے کبھی بھی یہ نہ بتایا کہ اس کے ہاتھ میں جو انگوٹھی تھی اس کے کیا معنی تھے اور نہ مجھے ہی جرأت ہوئی کہ اُس سے پوچھوں کہ وہ شادی شدہ تھی، بیوہ تھی یا اس کی صرف منگنی ہوئی تھی۔ ...... ہمارے تعلقات گہرے ہوتے چلے گئے۔ وہ ان تمام عورتوں کا نعم البدل تھی جن سے میں نے یا جنہوں نے مجھ سے پیار کیا تھا اور کسی نہ کسی وجہ سے مجھ سے جدا ہو گئی تھیں۔ میرے لیے وہ ان تمام رشتوں کا مرکز تھی جو ایک انسان کے دوسرے انسان سے ہو سکتے تھے۔ وہ میرے لیے ماں تھی، بہن تھی، دوست تھی، رفیق تھی اور...... ہاں محبوبہ تھی، مگر مجھے کبھی بھی اس سے

اظہارِ عشق کی ضرورت محسوس نہ ہوئی تھی۔ ان تعلقات میں جنس مفقود نہ تھی مگر اس کی نوعیت عام انسانی تعلقات سے ذرا بلکہ خاصی مختلف تھی۔ میرے تئیں اس کے لیے جنسی جذبات کا وجود اس طرح کا تھا جیسے پھول میں اس کا رنگ یا خوشبو۔ اس سے جنسی طور پر لطف اندوز ہونے کی ضرورت مجھے کبھی محسوس تو نہ ہوئی تھی مگر خیال ضرور آتا تھا، خواہش ضرور پیدا ہوتی تھی مگر میں نے ہمیشہ اس خیال اور خواہش کو اپنے تعلقات کی خوشبو ہی جانا۔ اس احساس سے دل میں، دماغ میں، خون میں بڑی خوشگوار سی گرمی ہر دم رواں رہتی تھی۔ میں یہ بھی نہیں کہوں گا کہ اس کو چھونے کی بھی خواہش نہیں ہوتی تھی۔ ہوتی تھی اور بڑی شدت سے ہوتی تھی مگر بالکل اسی طرح جیسے پھولوں کی ریشمی ریشمی سطح پر ہاتھ پھیرنے کی خواہش۔ ان خواہشوں کو پورا کرنے سے میں ہمیشہ باز رہا۔ کیونکہ میں سمجھتا تھا بلکہ مجھے یقینِ واثق تھا کہ ایسا کرنے سے ہمارے تعلقات کی سطحیں اور وسعتیں محدود ہو جائیں گی اور ہم صرف عاشق ومعشوق یا زیادہ سے زیادہ میاں بیوی ہو کر رہ جائیں گے۔ یہ بھی نہیں۔ مجھے تو اکثر خیال آتا تھا کہ وہ جنسی تسکین کے لیے خلق ہی نہ کی گئی تھی۔ وہ انسانوں کی زندگیوں میں طرح طرح کی خوشبوئیں داخل کرنے کے لیے اس جہانِ رنگ و بو میں آئی تھی اور ایک مقررہ مدت کے بعد کسی ایک انسان کی ہوئے بغیر واپس ابد کو لوٹ جائے گی۔

کچھ مہینوں کے بعد، ایک دن خزاں کی ایک دوپہر، وہ سینما میں ایک نوجوان کے ساتھ ملی۔ وہ کافی وجیہہ تھا اور اس کے ساتھ ساتھ چلتا ہوا، اس کے پاس کھڑا ہوا، بھلا لگتا تھا۔ ہر کوئی ان دونوں کو ایک دوسرے کے انتخاب پر داد دیتا ہوا معلوم ہوتا تھا۔ مریم نے تعارف کرایا۔ سنیما کے بعد دونوں نے اصرار کیا کہ میں رات کا کھانا ان کے ساتھ کھاؤں۔ کھانا کھانے کے لیے ریستوران جاتے ہوئے، کھانا کھاتے ہوئے، کھانا کھانے کے بعد ریستوران میں باتیں کرتے ہوئے، مجھے بار بار خیال آتا تھا کہ مریم نے ایسے شخص کو اپنے لئے منتخب کر کے غلطی کی ہے حالانکہ رابرٹ ہنری کی بول چال میں، لباس میں، اعضا کی حرکات میں، ایک سلیقہ تھا، ایک تناسب تھا، ایک توازن تھا۔ میں نے لاکھ دل کو سمجھایا کہ میں خواہ مخواہ اس سے حسد کر رہا ہوں، اس نے میرے کسی تسلیم شدہ حق کو غصب کرنے کی

کوشش نہ کی تھی اور نہ ہی اس کی موجودگی کے سبب مریم کے رویے میں میرے لیے کسی قسم کی تبدیلی آئی تھی۔ اس کی شخصیت کی گرمی پہلے کی طرح مجھ تک پہنچ رہی تھی، اس کی آنکھوں میں پہلے کی طرح میرے لیے جگا جوت تھی اور ان آنکھوں میں انہی جذبات کا عکس دیکھ رہا تھا جو اکثر دیکھتا رہا تھا۔ مگر یہ بیجا وسوسہ میرے دل سے نکل نہ سکا۔ ہم ریستوران سے اٹھے، میں نے مصروفیت کا جائز عذر کر کے ان سے اجازت لی۔ کلینک سے ہوتا ہوا جہاں کچھ مریض میرے منتظر تھے، گھر کی طرف روانہ ہوا۔

اس رات کے بعد میں نے محسوس کیا کہ میں ضرورت سے زیادہ مصروف رہنے لگا ہوں اور جہاں میرا اسسٹنٹ جا سکتا تھا وہاں بھی میں خود جانے لگا ہوں اور جہاں صرف اس کی توجہ کی ضرورت تھی وہاں بھی میں خود توجہ دینے لگا ہوں۔ اور مجھے نہ سینما جانے کا وقت میسر آتا، نہ تھیٹر اور نہ اوپیرا۔ بلکہ اب میں دنوں، ہفتوں دوپہر یا رات کا کھانا کھانے مریم کے ریستوران بھی نہ جاتا تھا، جب کبھی، شاید ایک دو دفعہ، گیا تو اس کی ڈیوٹی نہ ہوئی۔

مجھے اکثر مریم کو دیکھنے کا خیال آتا، اب سوچتا ہوں کہ ان دنوں نہ جانے کیوں...... شاید میں اس سے ملتے ہوئے گھبراتا تھا یا شاید محسوس کرنے لگا تھا کہ میں اس کو کھو دوں گا......، اس سے ملنے کا خیال آتا تھا مگر میں نے اپنی پریکٹس کو اس نہج پر چلا لیا تھا کہ اب فرصت کوسوں، برسوں دور نظر آتی تھی، کام بھی بہت بڑھ گیا تھا یا شاید میں نے کسی لاشعوری کوشش سے بڑھا لیا تھا۔

ایک دن مطب سے نکل کر گھر جانے کو تھا کہ مریم مطب میں داخل ہوئی اور آتے ہی کہنے لگی:

''میں نے تمہارے اسسٹنٹ سے پوچھ لیا ہے کہ تم کئی ہفتوں سے بہت مصروف رہے ہو اور آج اس وقت کے بعد تم بالکل فارغ ہو اور کل جن مریضوں کو تمہیں دیکھنا ہے وہ عام قسم کے مریض ہیں اور وہ خود ان کی دیکھ بھال کر سکتا ہے اور تمہاری موجودگی کی کوئی خاص ضرورت نہیں اور یہ کہ تمہیں آج اور کل کہیں نہیں جانا ہے۔

لہٰذا تمہارا وقت میرا ہے۔ میں جہاں تمہیں کہوں تم میرے ساتھ چلو گے۔ آج شام کو

اور کل بھی میرے ساتھ رہو گے۔ مجھے تم سے کچھ ضروری باتیں کرنا ہیں۔ اس طرح میری اور تمہاری سیر بھی ہو جائے گی۔"

ابھی میں ان اتنی ڈھیر ساری باتوں کی معنویت پر غور بھی نہ کر پایا تھا کہ وہ ایک بار پھر بولنا شروع ہو گئی:

"میں نے تمہیں بتایا تھا کہ میری ایک بہن ہے جو برائٹن میں رہتی ہے۔ وہیں جانا ہے مجھے اور تمہیں بھی۔ ہم دونوں کو میری بہن اور بہنوئی کی طرف سے دعوت ہے۔ اب میں بالکل کچھ نہیں سنوں گی۔ تم میرے ساتھ ابھی گھر جاؤ گے، کچھ دیر آرام کرو گے اور پھر تیار ہو کر میرے ساتھ اسٹیشن چلو گے۔"

فقرے ختم کرتے ہی وہ ہنسنے لگی اور ہنستی ہی چلی گئی۔ مطب کے ماحول میں اس کی ہنسی بہت ہی بھلی لگی اور اس کی خوشبو نے مجھے ڈاکٹر سے ایک انسان بنا دیا۔ مجھے خاموش اور متوجہ دیکھ کر وہ ایک بار پھر بولی:

"میری تقریر ختم ہوئی۔ اس سے مجھے اس سے زیادہ کچھ نہیں کہنا۔ میں نے تمہیں بات کا موقع اس لیے نہیں دیا کہ مجھے ڈر تھا کہ اگر میں رک گئی تو میں پوری بات نہ کہہ سکوں گی اور تم میرے ساتھ نہ جانے کا جواز نکال لو گے۔ اوہ! معاف کرنا میں بھول ہی گئی تھی کہ تم مجھ سے جھوٹ نہیں بولتے۔"

پھر میری بانہہ میں بانہہ ڈال کر مجھے کشاں کشاں مطب سے باہر بازار میں لے آئی، ٹیکسی کو بلایا، خود اس میں بیٹھی اور نظروں سے مجھے اندر کھینچ لیا اور ڈرائیور کو میرے گھر کا پتہ دیا۔ جب میں نے اس کے پتہ بتانے پر حیرانی کا اظہار کیا تو اس نے بتایا کہ وہ آج صبح میرے کلینک میں آنے سے پہلے میرے اسسٹنٹ سے اور باتوں کے علاوہ میرے گھر کا پتہ بھی معلوم کر گئی تھی۔ اس جاسوسی پر اس نے معذرت چاہی اور مسکرا دی۔ اس کی مسکراہٹ ہر تجسس، ہر شکایت اور ہر پریشانی کو ختم کر دینے کے لیے کافی تھی۔ میں اطمینان سے موٹر کی پشت سے کمر لگا کر، آنکھیں بند کر کے، دراز ہو گیا اور مریم کی شخصیت کی حرارت میری طرف بہنے لگی اور مجھے قوت اور طاقت کا احساس ہونے لگا۔

جب ٹیکسی رکی اور میں اس سے نکلنے کے لیے تیار نہ ہوا تو اس نے میرا زانو تھپک کر مجھے بیدار کیا اور میں معذرت کرتے ہوئے ٹیکسی سے نکل آیا اور ٹیکسی والے کو پیسے دے کر رخصت کیا اور مریم کو ساتھ لئے گھر کی سیڑھیاں چڑھنے لگا۔ میری مالکہء مکان نے ہم دونوں کو بڑی حیرت سے دیکھا اور مسرت سے ملی۔ کچھ دیر بعد وہ دروازہ کھٹکھٹا کر کمرے میں چاکلیٹ کا قہوہ لیے داخل ہوئی اور مریم کو مبارک پیش کرتے ہوئے کہنے لگی:

''جو لندن کی لڑکیاں برسوں میں نہ کر سکیں وہ تم نے کس آسانی سے کر لیا ہے۔ ڈاکٹر اتنی جلدی گھر کبھی نہ لوٹا تھا اور پھر یوں لیٹ کر آرام کرتے ہوئے تو میں نے اسے کبھی دیکھا ہی نہیں۔ مجھے تم پر رشک آ رہا ہے۔ اگر میں جوان ہوتی تو رقابت بھی محسوس کرتی۔ اتنا وجیہہ نوجوان، ڈاکٹر ہی سہی، اور صنفِ حسین کی صحبت سے لطف اندوز ہونا نہ جانے، افسوس ہوتا تھا اسے دیکھ کر۔ اگر میں جوان ہوتی تو اس سلسلے میں خود پیش قدمی کرتی۔ ڈاکٹر خوش قسمت ہے کہ تم جیسی لڑکی سے ملا ہے۔ مگر میں یہ کہے بغیر بھی نہیں رہ سکتی کہ تم بھی خوش نصیب ہو کہ ڈاکٹر تمہاری طرف متوجہ ہوا...... خدا تم دونوں پر اپنی رحمتوں کا نزول کرے۔''

مالکہء مکان جاتے جاتے کئی بار مڑ کر دیکھتی رہی اور دروازے پر جا کر بولی ''میں متجسس نہیں ہو رہی۔ نہ ہی کوئی راز پانے کی متلاشی ہوں۔ میں ایک بار پھر اس جوڑے کو دیکھنا چاہتی ہوں جو ایک دوسرے کا اتنا حق دار ہے۔''

میں لیٹا رہا اور مریم ادھر ادھر کی باتیں کرتی رہی جیسی کہ ایک عورت نہایت خوش اسلوبی سے جب چاہے کر سکتی ہے، کر لیتی ہے۔ وہ باتیں کرتی رہی اور میں اپنے آپ میں نہایت ہی آسودہ محسوس کر رہا تھا۔ میں اس آسودگی کے نشے میں شاید سو گیا تھا کہ مریم مجھے شانے سے پکڑ کر ہلا رہی تھی اور کہہ رہی تھی کہ ٹرین کا وقت ہو رہا تھا لہٰذا مجھے تیار ہو جانا چاہیے۔ ہم دونوں جب اسٹیشن پہنچے تو شام ہوئے عرصہ ہو چکا تھا، اسٹیشن پر قمقموں کی روشنی سے نور کی ریل پیل تھی۔ مریم کی بہن کے گھر پہنچے تو اس کی بہن اور بہنوئی کو منتظر پایا۔ دونوں بڑے تپاک سے ملے۔ کچھ دیر ادھر ادھر کی باتوں کے بعد مریم کی بہن نے ہمیں اجازت دے دی کہ ہم اپنے اپنے کمروں میں جا کر دس پندرہ منٹ آرام کرنے کے بعد کھانے کے

لیے تیار ہو کر آ ئیں۔ مریم مجھے لے کر دوسری منزل پر آئی، مجھے میرا کمرا دکھایا اور خود سامنے والے کمرے میں داخل ہو گئی۔ میں پچھلے چند گھنٹوں کے واقعات سے حیران بھی تھا اور خوش بھی۔ لیکن شاید تھکا ہوا کچھ زیادہ ہی تھا کہ ایک بار پھر مجھ پر غنودگی طاری ہو گئی اور میں سو ہی جاتا کہ اگر مریم ایک بار پھر مجھے شانہ ہلا کر جگا نہ دیتی۔ میں جلدی سے اٹھا، منہ ہاتھ دھویا، گردن صاف کی، بالوں میں پانی ڈال کر کنگھی کی اور کپڑے بدل کر تیار ہو گیا۔ جب ڈرائنگ روم میں پہنچا تو مریم، اس کی بہن اور بہنوئی کو ایک ننھی سی ہوشیار لڑکی اور ایک دس گیارہ سال کے شوخ لڑکے سے باتیں کرنے میں مشغول پایا۔ میں بھی بیٹھ گیا اور باتیں سننے لگا۔ کچھ دیر بعد مریم کے بہنوئی نے گھڑی پر نظر ڈالتے ہوئے کہا کہ کھانا کھا ہی لینا چاہیے۔ ہم اٹھ کر کھانے کے کمرے میں چلے گئے۔ میں تو خاموشی سے، لطف اٹھاتے ہوئے، کھانا کھاتا رہا۔ مریم اور اس کی بہن آپس میں باتیں کرتی رہیں۔ اس کا بہنوئی کبھی کبھی بات کر لیتا۔ دونوں بچے خاموشی سے کھانا کھانے میں مگن رہے۔ میں نے محسوس کیا کہ مریم کی بہن بظاہر تو باتوں میں مصروف تھی مگر کن انکھیوں سے مجھے دیکھتی تھی۔ میں نے اس کو پورا موقع مہیا کیا کہ وہ مجھے دیکھ بھال لے، میرا وزن کر لے۔ جب ہم کھانے سے فارغ ہو لیے تو پھر ڈرائنگ روم میں آ گئے اور کچھ دیر بعد مریم وہاں کافی لے آئی۔ جب سب کافی پینے میں مصروف ہوئے تو مریم کی بہن نے کافی کا ایک گھونٹ لیا اور مزہ لیتے ہوئے، نگلتے ہی بولی:

''مریم کے خطوں سے ظاہر ہوتا تھا کہ آپ آرٹسٹ مزاج ہیں یا ولی یا دونوں مگر اب میں دیکھتی ہوں تو آپ تو اچھے خاصے جیتے جاگتے جوان مرد ہیں اور کسی بھی حسین لڑکی کو آپکے ساتھ دیکھے جانے میں فخر ہو سکتا ہے۔ آپ کو میری بات کو بے جا تعریف نہ سمجھنا چاہیے۔ یہ امر واقعہ ہے۔ مگر میں پھر بھی حیران ہوں کہ آپ کو لندن کی حسین لڑکیوں نے کنوارا کیسے رہنے دیا۔ مریم نے اپنے خطوں میں ذکر کیا ہے کہ آپ نے کبھی شادی نہیں کی اور نہ ہی آپ لڑکیوں کے ساتھ دیکھے گئے ہیں۔ کیا آپ کو لڑکیوں اور عورتوں کی صحبت پسند نہیں؟''

''نہیں۔ ایسی تو کوئی بات نہیں۔ میں اب سوچتا ہوں تو ہے عجیب سی بات۔ یہ حقیقت ہے کہ لندن اور یورپ کے مختلف شہروں میں جہاں میں رہا ہوں یا جہاں سفر کے دوران ٹھہرا ہوں وہاں کسی لڑکی یا عورت نے مجھے اتنی توجہ نہیں دی کہ اس کو صحبت کہا جا سکے۔ بس ایک آپ کی بہن ہے کہ عزیز جانتی ہے۔ میں اس کا بہت ممنون ہوں۔'' اس پر مریم بدک گئی۔

''تم ہو ہی اس قابل کہ تمہاری قدر کی جائے۔ کوئی بھی قابل قدر لڑکی ایسا ہی کرتی۔ حادثہ ہے کہ کسی قابلِ قدر لڑکی کی نظر تم پر نہیں پڑی۔ میں تو کہوں گی کہ کسی قابلِ قدر لڑکی کی نظر تم پر کیسے پڑے؟ تم گھسے رہتے ہو دن رات اپنے مطب میں، کہیں آتے جاتے تو ہو نہیں کہ کوئی سمجھ دار لڑکی تمہیں دیکھ لے۔ اصل بات یہ ہے کہ تم زندگی سے بہت مطمئن نظر آتے ہو کہ دیکھنے والوں کو یہی احساس ہوتا کہ وہ تمہارے کسی کام نہیں آ سکتے۔ کوئی خوددار انسان بھی پسند نہیں کرے گا کہ وہ اپنے آپ کو کسی پر عائد کر دے۔ خودغرض انسان تمہاری زندگی میں مخل ہونے کی جرأت نہیں کرے گا کہ تم اس کی حاجتیں اس بے غرضی اور خلوص سے پوری کرو گے کہ اس کو اپنی خودغرضی پر سخت ندامت محسوس ہو گی اور وہ اپنے آپ کو گنہگار محسوس کرنے لگے گا اور احساسِ گناہ کی صلیب اٹھائے پھرنا بہت بڑا عذاب ہو گا ایسے شخص کے لیے......

باقی رہی میری بات۔ تم نے مجھے کافی مواقع فراہم کیے ہیں کہ تم کو جان سکوں، پرکھ سکوں۔ اتنی سوجھ بوجھ تو مجھ میں ہے ہی کہ انسان کی قدر و قیمت جان سکوں۔ اس کے لیے ممنون ہونے کی قطعاً ضرورت نہیں...... میں ناراض ہوں تمہارے آخری فقرے پر۔''

کچھ دیر خاموشی رہی۔ پھر مریم کا بہنوئی بچوں کو لے کر چلا گیا۔ مریم کی بہن ہم دونوں کو گہری دلچسپی سے دیکھتی رہی اور پھر اس نے مشورہ دیا کہ ہم دونوں صلح کر لیں اور برائٹن کی رات سے لطف اندوز ہوں۔ مریم بہن کے مشورے پر شرمائی، مسکرائی اور پھر اٹھ کھڑی ہوئی اور میری طرف دیکھا۔ میں بھی اٹھ کھڑا ہوا اور شب بخیر کہہ ہم گھر سے نکل آئے۔

وہ رات واقعی لطف اندوز ہونے کے قابل تھی۔ ایسی خوبصورت رات میں نے یورپ اور انگلستان میں پھر کبھی نہیں دیکھی۔ ہم سمندر کے ساحل تک گئے۔ ساحل پر خاموشی سے

ٹہلتے رہے۔ خزاں کی رات بہت ہی شفاف تھی، نیلا آسمان دمکتا تھا، تارے خوشی سے جھومتے تھے۔ ہر طرف امن تھا فضا میں۔ ساحل پر کچھ جوڑے اور بھی تھے مگر اپنے اردگرد حصار بنائے ہوئے ٹہلتے تھے۔ ایک دوسرے کی بانہوں میں جھولتے تھے، بے نیاز، بے فکر، بے خوف۔ میرے دل میں دور دور تک امن کی فضا تھی۔ مریم کے دل میں نجانے کیا تھا میں آج بھی نہیں جانتا اگرچہ یہ جاننے کے لیے میں اپنے خون کی ایک پلی دینا بھی پسند کروں گا۔

جب خاموشی ناگوار گزرنے لگی تو مریم نے میرے بازو میں بازو ڈال دیا اور گھر کی طرف منہ کر لیا۔ ساحل کے قریب ہی ایک ریستوران میں بیٹھ گئے۔ کچھ ٹھنڈے مشروب منگوائے۔ مریم نظریں جھکائے بیٹھی رہی، شاید کچھ سوچتی تھی۔ اس کا سوچتا ہوا چہرہ بہت خوبصورت لگ رہا تھا۔ وہ عظیم مصوروں کی مریم لگ رہی تھی۔ جب ویٹر ہماری لیے مشروب لے آیا تو اس نے سر اٹھایا اور ایک گہری اور احاطہ کرتی ہوئی نظر مجھ پر ڈالی۔ اس کی نظروں میں انتہا کا حلم تھا، پیار تھا، احترام تھا اور اعتماد۔ اس نے سکوائش کے گلاس سے ایک بڑا سا گھونٹ بھرا، آہستہ آہستہ حلق میں اتارا، سانس لیا اور کہنے لگی:

''کیا ہی اچھا ہوتا کہ تم وہ سب کچھ میری آنکھوں میں جھانک کر پڑھ لیتے جو میں کہنا چاہتی ہوں۔ چونکہ یہ سب کچھ میرے لیے بہت اہم ہے۔ میں نہیں چاہتی کہ تمہیں اس کا علم نہ ہو۔ اس لیے خاموش رہنا بھی ممکن نہیں۔ آنکھوں سے اتنا کچھ کہنے کا ہنر میں نہیں جانتی۔ یہ انگوٹھی (اس نے اپنا دایاں ہاتھ گود سے اٹھا کر میز پر رکھ دیا) میرے منگیتر نے دی تھی۔ وہ عرصہ ہوا جل مرا۔ وہ ہواباز تھا۔ وہ ہمارے شہر میں سب سے پہلا ہواباز تھا۔ وہ ہمارے شہر کے ایک معزز اور پرانے خاندان سے تھا۔ وہ بہت اچھا تھا۔ خوبصورت اور وجیہہ تھا حسین لڑکیوں کا وہ منظورِ نظر تھا مگر وہ صرف مجھی سے ملنا پسند کرتا تھا۔

ایک شام وہ ہمارے گھر آیا۔ میرے والدین سے کافی دیر باتیں کرتا رہا۔ میں گھر نہ تھی۔ وہ یہ کہہ گیا کہ کل صبح وہ پھر آئے گا۔ اگلے دن وہ صبح ہمارے گھر آیا اور مجھے شادی کا پیغام دیا تو میں کچھ نہ کہہ سکی۔ اس نے مجھ سے پوچھا تو میں نے سر ہلا کر اس کو قبول کرنے کا

اقرار کرلیا۔مہینہ بعد منگنی کی تاریخ مقرر ہوئی کیونکہ اس کو کمرشل لائسنس لینے کے لیے برلن جانا تھا۔

شام کا وقت تھا جب منگنی کی رسم گرجے میں ادا کی گئی۔ بہار کی رات جوبن پر تھی جب اس نے مجھے چوم لیا۔ پھر کافی دیر ہمارے باغ میں چپ چاپ بیٹھا رہا۔ میرا بھی بات کرنے کو دل نہ چاہا۔

کچھ مہینے اس طرح خاموش لطف میں گزر گئے،کبھی ہم پیدل سیر کو دور تک نکل جاتے، کبھی ہم اوپیرا دیکھنے کے لیے برلن چلے جاتے۔زندگی حسین نظر آتی تھی۔اگرچہ میرا ایک چچا میرے والد سے کہا کرتا تھا کہ برے دن آنے والے ہیں اور زندگی مشکل سے گزرے گی۔میں اس کی باتوں پر دل ہی دل میں مسکرادیا کرتی تھی۔

میرا منگیتر ہر شام سورج ڈھلنے سے پہلے جہاز اڑا کر لاتا اور شہر کی عمارتوں کی چھتوں کو چھوتا ہوا، سایہ کرتا ہوا گزرتا۔ایک شام وہ اپنا جہاز ہمارے باغ کے اوپر سے گزار کر لے گیا اور میرے لیے ایک تحفہ باغ میں پھینک گیا۔میں گھر سے نکل میدان کی طرف بھاگی۔اس کا جہاز بلندیوں سے ایک بار پھر نیچے آیا اور فضا میں ڈولنے لگا اور پھر اوپر کو ہولیا اور مغرب کے بن کے درختوں کی اوٹ میں گم ہو گیا۔

رات ہونے سے پہلے میں نے سنا کہ اس کا جہاز مغرب کے بن سے پرے جل کر راکھ ہوا۔میں سن ہو گئی۔میری جنت اجڑ گئی اور دنیا اندھیر ہو گئی۔

چند ہفتوں بعد جرمنی اور یورپ میں جنگ چھڑ گئی۔جنگ کے دوران اپنے دیس میں اپنے منگیتر کے بغیر رہنا دوزخ بن گیا۔جنگ ختم ہو گئی تو ملک کے معاشی حالات ابتر تھے۔ ان اندوہناک حالات میں ملک چھوڑنے کی ہمت نہ ہوتی اگرچہ میری یہی بہن جو لندن میں رہتی تھی، برسوں سے مجھے بلاتی رہی تھی۔مگر کئی سال اس کشمکش میں گزر گئے۔پھر عالمی معاشی بحران نے سب ملکوں میں کہرام مچایا تو میں اپنے دیس سے نکلی اور لندن آ گئی۔پچھلے ایک سال سے میں مطمئن اور قانع تھی۔اب میں خوشی اور امید کی آس لگانے سے نہیں ڈرتی۔

رابرٹ ہنری تمہیں پسند نہیں۔ اس کی شخصیت میں کوئی قابل اعتراض بات نہیں صرف اس کا ذریعۂ معاش اعتراض سے ماورا نہیں۔ اس کے متعلق اس میں اور مجھ میں اختلاف رہتا ہے۔ کچھ ہفتے ہوئے اس نے مجھے شادی کا پیغام دیا ہے۔ میں اس معاملے میں سوچ بچار کے لیے کافی وقت چاہتی ہوں مگر رابرٹ کو اصرار ہے کہ میں فوراً فیصلہ کروں۔ اس لیے وہ میرے ساتھ برائٹن نہیں آیا۔ شاید وہ تم سے تھوڑا سا جلتا بھی ہے۔ کتنا بے وقوف ہے وہ۔ تمہارا مقام ہی اور ہے۔

دنیا میں کچھ نعمتیں ایسی ہوتی ہیں کہ ان کے لیے کئی اور نعمتوں سے ہاتھ اٹھانا پڑتا ہے۔ تم بھی ایسی ہی ایک نعمت ہو۔ اگر رابرٹ نے مجھے انتخاب کرنے پر مجبور کیا تو اسے مجھ سے جدائی اختیار کرنی ہوگی۔ تم ایسی ہی نعمت ہو میرے لیے۔''

میں نے اس کی آنکھوں میں دیکھا تو ان میں وہی حلم، وہی پیار، وہی صبر تھا جو عیسائی ولیوں کی آنکھوں میں مغربی مصوروں کے شاہکاروں میں نظر آتا ہے۔ اس سے پہلے مجھے کبھی خیال نہ آیا تھا کہ عیسائی ولیوں اور اس میں کوئی مماثلت ہے۔ مجھے وہ ہمیشہ انسان اور عورت اور حسین عورت ہی معلوم ہوئی باوجودیکہ وہ ہمیشہ قابل قدر اور قابل احترام ہونے کا احساس دلاتی تھی۔ اس لمحے اس کی آنکھوں کی جگا جوت میں اتنی پاکیزگی اور الوہیت نظر آئی کہ اگر میں رومن کیتھولک عیسائی ہوتا تو اس کو ضرور ولیہ مان لیتا۔

فوراً بعد ہی وہ مسکرا دی اور میرے ہاتھوں کو کہ میز پر ایک دوسرے پر رکھے تھے، تھپک تھپک دیا۔ کچھ دیر بعد ہم دونوں ریستوران سے اٹھے اور گھر کو چل دیئے۔ چلتے چلتے ہم ایک بہت وسیع چوک میں آ گئے جہاں سے دور دور تک بجلی کے کھمبوں کے ساتھ پیوست قوسوں پر قمقمے جلتے تھے جن کی خاموش روشنی ایک خاموش موسیقی کو جنم دے رہی تھی۔ سڑک پر دور دور کوئی نہ تھا۔ ہلکی ہلکی ہوا میں کاغذ کے پرزے بہت ہی بے بسی سے اڑتے پھرتے تھے۔ سڑک اپنی تنہائی کا ماتم کرتے کرتے شاید سو گئی تھی کہ ہمارے قدم اس پر گونجتے نہ تھے۔ بجلی کے قمقمے خاموشی کا گلہ کرتے معلوم ہوتے تھے۔

کچھ دیر تو ہم دونوں ایک دوسرے کی کمر میں بانہیں ڈالے آہستہ آہستہ ننھے ننھے قدم

اٹھاتے چلتے رہے، خاموش، خیالات میں، لطف میں گم۔ مریم وہاں کھمبوں کی روشنی سے بچ کر کناروں پر چلنے لگی۔ چند لمحے قدم اٹھاتی رہی، رکی، میری طرف مڑی، میرے چہرے کی طرف تکتی رہی اور پھر ہچکیاں لے کر رونے لگی، روتے روتے اس نے اپنا سر میرے سینے پر رکھ دیا اور روتی رہی، روتی رہی، نہ جانے کتنی صدیاں بیت گئیں۔ وہ روتی رہی۔ اس کی ہچکیوں سے اس کے تمام بدن میں ایک طوفان تھا بہت ہی مہیب جو سڑک پر، شہر پر، شہر کی بلند عمارتوں کے اوپر سے گزرتا ہوا تمام کائنات پر چھا رہا تھا۔ صرف وہ نقطوں کا مقام جہاں ہم دونوں کے قدم تھے وسیع و عریض سمندر میں ایک جزیرے کے بلند درختوں کی بلند قوس کے سب سے اونچے پتے کی طرح محفوظ تھا۔ اس کی ہچکی میں حرکت تھی، آواز نہ تھی۔ اس کے جسم کا ایک ایک خلیہ، اس کے خون کا ایک ایک قطرہ، اس کی آنکھوں کی روشنی کا ایک ایک نقطہ اس کی بے آواز مگر متحرک ہچکی میں تحلیل ہوتا ہوا معلوم ہو رہا تھا۔ میں نے اس طوفان میں گھبرا کر اس کو سختی سے اپنے بازوؤں میں بھینچ لیا، اس کے سر کے بالوں، اس کے ماتھے کے ایک ایک نقطے کو، اس کی آنکھوں کو، اس کے رخساروں کو بار بار دیوانہ وار چوما مگر اس کی ہچکی تھی کہ رکتی ہی نہ تھی، بڑھتی، پھیلتی چلی جاتی تھی۔ میں نے آخر بے بس ہو کر اس کی ٹھوڑی کو آخری حد تک اوپر کو اٹھایا۔ اس کے کانپتے ہوئے، تھرکتے ہوئے ہونٹوں پر ہونٹ رکھ دیئے۔ رکھے رہا، کائنات پر بیتی ہوئی نہ جانے کتنی صدیاں لوٹ آئیں اور ایک بار پھر بیت گئیں۔ میں نے اپنے اندر اتنی قوت محسوس کی کہ اگر وہ کہتی کہ میں اس کے ساتھ پاتال تک اس کے منگیتر کو واپس لانے کے لیے چلا جاؤں تو چلا جاتا اور کامیاب لوٹ آتا، وہ چاہتی تو اس سے ابدی جدائی کو قبول کر لیتا۔ مگر وہ کچھ نہ بولی، اس نے میرے جذبات سے کچھ تعرض نہ کیا۔ اس کا کانپتا ہوا جسم میری بانہوں میں ساکت ہو گیا، بے بس ہو گیا جیسے میں نے اس کے ہونٹوں سے زندگی کی آخری رمق بھی چوس لی ہو۔

میں نے سانس لینے کے لیے اس کے لبوں سے لب اٹھائے تو سسکیوں کا ایک طوفان تھا کہ اس کے حلق سے پھوٹ نکلا اور وہ ایک جھٹکے میں مجھ سے الگ جا کھڑی ہوئی۔ ہم دونوں مکان و زمان کی تنہائیوں میں بالکل بے یار و مددگار کھڑے تھے اور سسکیوں کا سیلاب

طوفان کی مانند زمان و مکان کی وسعتوں کو بھرپور کر رہا تھا۔ میرے ذہن میں ایک منظر کوند گیا۔ ہر طرف پانی ہی پانی ٹھاٹھیں مار رہا ہے اور ہم دونوں میدانوں کے بلندترین درخت کی بلندترین ٹہنی سے بے یار و مددگار لپٹے ہوئے ہیں اور پانی لمحے بھر میں درخت ہی کو بہا کر لے جائے گا۔

پھر کہیں سے کسی عورت کے ہنسنے کی آواز قریب آتی آتی گم ہوگئی۔ مریم ڈر گئی اور دوڑ کر میرے سینے سے لگ گئی اور رونے لگی۔ میں نے اس کے سر کو بار بار چوما۔ میں نے اس کی ٹھوڑی کو اٹھانا چاہا مگر وہ پوری قوت سے اپنے سر کو میرے سینے پر ٹکانے میں کامیاب رہی۔ چند لمحوں بعد اس نے ہچکیوں کے درمیان سے آواز نکالی اور کہنے لگی:

''میں تمہیں خوشیاں اور مسرتیں دینا چاہتی ہوں مگر مجھے ڈر لگتا ہے، مجھے یقین ہوتا جا رہا ہے کہ میں تم پر غم اور دکھ کے پہاڑ توڑ دوں گی۔ مجھے یوں لگتا ہے کہ میں تمہیں تمہاری راہ سے بھٹکا دوں گی۔ تمہیں میں ولیہ لگتی ہوں مگر مجھے شک ہونے لگا ہے کہ میں تمہارے لیے تباہی کا راستہ ہوں۔ جو کوئی مجھ سے پیار کرتا ہے مر جاتا ہے۔ میرا بھائی مجھے بہت چاہتا تھا، ڈوب مرا۔ ماں ہم دونوں کو بہت چاہتی تھی، وہ بھائی کے فراق میں گھل گھل کے مر گئی۔ میرا منگیتر تھا، لاکھوں میں ایک، جل مرا۔ اب تم ہو! تمہاری تباہی کا سبب بننے سے میرے دل میں ہول اٹھتا ہے۔ میرے لیے دعا کرو اپنے اللہ سے! یسوع مسیح مجھ پر رحم کرو۔ متین کو محفوظ رکھو!''

وہ چپ ہوگئی مگر چپکے چپکے میرے سینے پر سر رکھے روتی رہی۔ دور کہیں سے قدموں کی چاپ سنائی دی۔ چاپ قریب آتی گئی۔ مریم نے میرے سینے سے سر اٹھایا، میری طرف دیکھا، اس کی نظروں میں التجا تھی، معذرت تھی۔ یہ منظر میں نے پہلے کبھی اس کی آنکھوں میں نہ دیکھا تھا۔ میں اس پر جھک گیا، وہ مسکرائی، میں رک گیا۔ اس نے نظریں جھکا لیں اور چل دی۔ میں بھی ساتھ ہولیا۔ اس نے اپنا بازو میری بانہہ میں ڈال دیا اور میرے سہارے دھیرے دھیرے چلنے لگی۔ اس کی چال سے محسوس ہوتا تھا کہ وہ بہت ہی تھک گئی تھی اور کمزوری محسوس کر رہی تھی۔ گھر کے قریب پہنچی تو وہ اپنے سہارے چلنے لگی۔ گھر کی سیڑھیوں

پر چڑھتے ہوئے دروازے کے لیمپ کی روشنی میں اس نے میری طرف دیکھا۔ اس کا چہرہ کھل رہا تھا، اس کی آنکھوں میں وہی جگا جوت روشن تھی جو ہمیشہ اس کی آنکھوں میں مجھے نظر آیا کرتی تھی۔ صرف اس کی پلکیں اس کے رونے کی داستان کہتی تھیں اور اس کے ہونٹوں کے کونوں کے شکن اس کے جذبات کی شدت کی نشان دہی کرتے تھے۔

اس نے جیب سے چابی نکال کر تالا کھولا، میں اندر داخل ہوا۔ اس نے دروازہ بند کر کے تالا لگایا اور دروازے سے کمر لگا کر کھڑی ہوگئی، لمبے لمبے سانس لینے لگی۔ میں چپ چاپ اس کو دیکھتا رہا۔ پھر وہ سیدھی کھڑی ہوگئی اور اپنے دونوں ہاتھ میرے شانوں پر ٹکا کر مجھے نہایت غور اور دلچسپی سے دیکھنے لگی اور پھر بولی:

''میں اپنے جذبات کے لیے قطعی شرمسار نہیں ہوں اور تمہیں میری حالت اور نصیب پر تاسف نہیں کرنا چاہیے۔ خدا نے ہمیں الگ الگ کاموں کے لیے تخلیق کیا ہے اور ہمیں خدا کا حکم بے چون و چرا بجالانا چاہیے۔ میں ولیہ کا رول ادا نہیں کر رہی اور نہ ہی تمہیں تنگ کرنے کے لیے ایسا کیا ہے۔ میں جنسی تعلقات سے ڈرتی نہیں۔ میں جانتی ہوں کہ میں جنس سے لطف اندوز ہونا جانتی ہوں اور جنسی مسرت دینا بھی مجھے آتا ہے۔ لیکن تمہارے ساتھ جنسی تعلقات کا تصور بھی مجھے اس نیکی کا انکار معلوم ہوتا ہے جس کا انسان اپنی امکانی بلندیوں پر پہنچ کر ہی اہل ہوسکتا ہے۔ میں یہ بھی جانتی ہوں کہ میں تمہاری بیوی یا محبوبہ بن کر خوش بھی رہ سکتی ہوں مگر ایسے تعلقات سے ہم دونوں عام انسان بن کر رہ جائیں گے اور ہماری شخصیتیں دنیا کے لیے بالکل بے کار اور بے معنی ہو کر رہ جائیں گی۔ یہ بات اپنی شخصیت کے امکان کو وجود میں لانے سے انکار ہے جو کفرانِ نعمت ہے، لہٰذا گناہِ عظیم۔

میری باتوں کو حرف آخر نہ سمجھو، اس پر غور وخوض کرو۔ میں بھی کروں گی اور اگر تمہارا فیصلہ یہی ہو کہ ہمیں میاں بیوی بن جانا چاہیے یا ہم میں جنسی تعلقات ضروری ہیں تو میں اس فیصلے کو راحت سمجھوں گی اور اس کو مسلسل فرحت بنانے کے لیے کوئی کسر نہ اٹھا رکھوں گی۔''

اس لمحے سے مجھے یقین ہوگیا کہ وہ واقعی عیسائی ولیہ ہے۔ اس کی اخلاقی عظمت کے روبرو دل ہی دل میں سرنگوں ہوگیا۔

اس نے مجھے شانوں سے پکڑ کر ہلایا۔ میں اپنے خیالات کے عالم سے لوٹ آیا۔ وہ کہہ رہی تھی:

''تم اوپر جاؤ۔ مجھے کچھ کام کرنے ہیں...... نہ مجھ پر اور نہ اپنے آپ پر رحم کھانے کا سوچنا۔ ہم اس ضرورت سے یقیناً بہت بلند ہیں۔ ہم حق کو پہچان سکتے ہیں اور اس کی اطاعت کر سکتے ہیں۔

اب جاؤ میری جان۔خدا تمہارے خوابوں کا محافظ ہو!''

اگلے دن ہم دوپہر تک مریم کی بہن، بہنوئی اور بچوں کے ساتھ رہے اور دوپہر کا کھانا کھا کر وہاں سے چل دیئے۔لندن واپس آتے ہوئے ریل گاڑی میں موجود ہر بچے نے مریم سے پیار کرنا فرض جانا۔عورتیں اس کو حیرانی سے اور مرد اس کو احترام سے دیکھتے رہے۔لوگ مجھ پر مہربان ہوتے رہے۔ جب ہم لندن کے اسٹیشن پر اترے تو ہر مسافر نے ہمیں الوداع کہی اور دعا دی۔مریم اسٹیشن سے جدا ہو کر اپنے گھر چلی گئی اور میں اپنے گھر چلا آیا۔

اس ملاقات کے کوئی چار پانچ ماہ بعد ایک شام میں دفتر بند کر کے جانے کی تیاری کر رہا تھا کہ رابرٹ اوورکوٹ میں ملبوس کمرے میں داخل ہوا اور ایک کرسی پر دھم سے گر پڑا۔ میں نے اس کا اوورکوٹ اور کوٹ، اتارا تو اس کے پیٹ میں ایک گہرا زخم تھا۔ میں نے اس زخم کو سی کر پٹی باندھ دی اور اس کو آپریشن کی میز پر لیٹے رہنے دیا۔ جب وہ ہوش میں آیا تو کراہا۔ میں اس کے قریب گیا تو اس نے شکریہ ادا کیا اور کہا۔

''میں جانتا تھا کہ اگرچہ آپ مجھے پسند نہیں کرتے مگر مجھے یوں مرنے نہیں دینگے، پولیس کو رپورٹ نہیں کرینگے۔''

وہ اتنی سی گفتگو میں ہانپ گیا تھا۔ میں نے اسے ضروری ہدایات دیں اور وہ چلا گیا۔

ایک ماہ بعد مجھے جرمنی میں ایک میڈیکل کانگرس میں شامل ہونے کے لیے جانا تھا اور 'بیماری کے معاشی وجوہ' پر ایک مقالہ پڑھنا تھا جس کی تیاری میں کافی وقت صرف ہوتا تھا۔ اس عرصے میں نہ مریم نے میری خبر پوچھی اور نہ میں نے ہی اس کی خیر خبر کی کھوج

لگائی۔ شاید ہم دونوں نے دل ہی دل میں طے کرلیا تھا کہ جب تک کسی فیصلے پر نہ پہنچیں ایک دوسرے سے گریز کریں تاکہ فیصلہ کرنے میں آسانی ہو۔

یورپ جانے سے پہلے میں نے مریم سے ملنے کی کوشش کی مگر اس سے ملاقات نہ ہو سکی اور اس کو بتائے بغیر یورپ چلا گیا۔ کاش اس سے ملنے کی کوشش زیادہ کرتا تو شاید اس سے مل ہی پاتا۔

میڈیکل کانگرس کے بعد ایک جرمن شریک نے مشورہ دیا کہ میری صحت اس قابل نہیں ہے کہ دوبارہ لندن جا کر پریکٹس میں جت جاؤں۔ اگر کچھ ہفتے مکمل آرام نہ کیا تو کسی حادثے کا شکار ہو جاؤں گا۔ لہٰذا اس کے ہمراہ جرمنی کے ایک دور دراز چھوٹے سے شہر میں چلا گیا جہاں سے پہاڑ اور بن قریب تھے۔ ہفتوں دنیا کے ہنگاموں سے دور پہاڑ اور بن کی روزانہ سیر کرتا رہا اور پھلوں اور دودھ، مکھن اور پنیر پر گزارہ کرتا رہا۔

جب لندن واپس لوٹ آیا تو میری مالکہء مکان نے بتایا کہ مریم نے دو تین بار ٹیلیفون کیا تھا اگرچہ کوئی پیغام نہیں دیا تھا۔ جب میں اپنے کلینک پہنچا تو میرے اسسٹنٹ نے بتایا کہ برائٹن سے مریم کی بہن نے فون کیا تھا مگر جب اسے معلوم ہوا کہ میں جرمنی گیا ہوا ہوں تو اس نے بھی کوئی پیام نہ دیا۔ میرا دل بیٹھ بیٹھ گیا۔ بار بار خیال آتا تھا کہ مریم پر کوئی آفت آئی تھی جو اس نے فون کیا تھا۔ مگر فون کے نزدیک جاتے ہوئے ہول اٹھتا تھا، دل وسوسوں کی آماجگاہ بن گیا۔ دوپہر ہوئی تو مریم کے ریستوران گیا تو پتا چلا کہ وہ دو ہفتے پہلے اپنی بہن کے پاس برائٹن چلی گئی تھی۔

دل بے تاب رہا کہ برائٹن جاؤں مگر دل میں خوف سا بیٹھ گیا تھا۔ تمام رات لندن کے ریستورانوں میں جھانکتا پھرا، کہیں دس پندرہ منٹ کے لیے بیٹھ بھی جاتا۔ مگر کچھ کرنے کو، کچھ سوچنے کو دل نہ چاہتا تھا۔ دل سے صرف ایک ہی آواز آتی تھی: برائٹن چلو، برائٹن چلو! کسی نہ کسی طرح یونہی پھرتے پھراتے رات گزار دی۔ صبح سویرے ہی میں اسٹیشن چلا گیا۔ مریم کی بہن کو اپنے آنے کی اطلاع کی اور گاڑی میں بیٹھ گیا۔ گاڑی برائٹن کی طرف بھاگتی جا رہی تھی اور دل بیٹھتا ہی چلا جاتا تھا، یوں لگتا تھا کہ برائٹن پہنچنے سے پہلے ہی دم نکل

جائے گا۔ برائٹن کا اسٹیشن آیا تو ٹرین سے اترنے کو جی نہ چاہا۔ باہر نظر کی تو مریم کی بہن کو اسٹیشن پر کسی کو ڈھونڈتے پھرتے پایا۔ خیال آیا کہ وہ مجھ ہی کو ڈھونڈ رہی تھی۔ ٹرین سے اتر آیا۔ مجھے دیکھتے ہی وہ میری طرف لپکی اور ہاتھ ملانے کے لیے ہاتھ بڑھایا مگر میں تو اس کی آنکھوں میں جھانکنے کی کوشش کرتا رہا کہ شائد اس کی آنکھوں میں پڑھ لوں جو وہ کہنا چاہتی ہے مگر اس کی آنکھوں میں حیرانی اور اندوہ کے سوا کچھ نہ تھا۔ ہم نے وہاں سے ٹیکسی لی اور چل دیئے۔ اس نے گھر کی بجائے ایک ریستوران کا پتا دیا۔ ریستوران پہنچ کر اس نے کھانے کا آرڈر دیا۔ میں نے مریم کی بہن کا دل رکھنے کو تھوڑا سا کھایا۔ مریم کی بہن نے مجھ سے میرے سفر اور میڈیکل کانگرس اور اس گاؤں کا حال پوچھا جہاں میں آخری تین ہفتے گزار کر آیا تھا۔ مجھے تو ٹرین سے اتر کے احساس ہو گیا تھا کہ مریم اس جہاں میں نہیں۔ میں چاہتا تھا کہ اس کی موت کے ذکر میں جتنا بھی توقف ہو اچھا ہے۔ پھر یک لخت وہ اٹھی اور باہر چلی گئی۔ میں نے بل ادا کیا اور اس کے پیچھے ہو لیا۔ وہ تیز تیز قدم اٹھاتے ہوئے ساحل کی طرف چل دی۔ ساحل پر دوپہر کی دھوپ میں نیلا اور سبز سمندر محوِ خواب تھا، آسمان صاف تھا، ایسا صاف کہ انگلستان میں ایسا شاذ و نادر ہی نظر آتا ہے۔ ساحل پر کچھ بچے اور نوجوان لڑکے، لڑکیاں سورج کا غسل کر رہے تھے۔ سمندر کی سطح پر دور ایک آدھ بادبانی کشتی نظر آ رہی تھی۔ وہ کہیں بھی نہ رکی اور اس ننھے سے ہجوم سے دور ساحل کے دوسرے کونے کی طرف بڑھتی رہی۔ کچھ بچوں کا فٹ بال اس کے آگے سے نکل گیا تو بچے اس کے تعاقب میں آئے اور اس کو نہ رکتے ہوئے دیکھ کر رک گئے، میری طرف دیکھا اور پھر فٹ بال کا پیچھا کرنے لگے۔ وہ لوگوں سے بہت دور چلی گئی تھی اور ایک جگہ جا کر وہ رک گئی۔ سمندر کی لہریں اس کے قدموں سے چند قدم دور رک جاتیں اور پھر واپس لوٹ جاتیں۔ جب میں قریب پہنچا تو وہ رونے لگی، پھوٹ پھوٹ کر۔ میں چپ چاپ کھڑا رہا، مجھے کچھ نہ سوجھا کہ میں اس کو تسلی کس طور دوں۔ جب وہ بہت روئی تو میں نے اس کو منہ پونچھنے کے لیے اپنا رومال دیا۔ اس نے آنکھیں پونچھیں۔ دور ایک درخت کے نیچے بچھی ہوئی ایک بنچ پر وہ جا بیٹھی۔ میں بھی اس کے قریب جا کھڑا ہوا۔ اس نے ہاتھ سے اس مقام کی طرف اشارہ کیا جہاں وہ پہلے پہل کھڑی تھی۔

''اس کی لاش وہاں سے ملی تھی۔ وہ یہاں روز اکیلے نہانے آتی تھی۔ جب سے وہ لندن سے آئی تھی بہت خوش تھی۔ وہ بچوں پر پہلے سے زیادہ مہربان تھی۔ وہ پہلے سے بھی زیادہ خوبصورت لگتی تھی۔ یہی جی چاہتا تھا کہ ہر دم اس کو دیکھا کریں۔ مجھے ان دنوں کئی لوگوں نے کہا کہ اس کے چہرے اور جسم کی تمام حرکات، اس کی چال میں اک عجب الوہی قسم کا حسن رچ گیا تھا۔ جب بھی وہ کہیں باہر سے آتی یا اپنے کمرے سے باہر آتے ہوئے سیڑھیوں سے اترتی اور میں پاس ہوتی تو ایسا لگتا کہ کوئی ولیہ ہمارے گھر اتر آئی ہے۔ ان دنوں ہمارے گھر کی فضا میں کسی پرانے اور عظیم گرجے کی فضا رچ گئی تھی۔ ایک دن ایک اجنبی نے ہمارے گھر کا دروازہ کھٹکھٹایا اور پوچھا کہ میرے سوا کوئی اور عورت بھی ہمارے گھر میں رہتی ہے کیونکہ اس نے رات مقدس مریم کو گھر میں داخل ہوتے دیکھا تھا۔ اس رات مریم ایک کلب میں مشہور وائلن نواز سے موتسارت کو سننے گئی تھی۔ میں نے مریم سے اس بات کا ذکر کرنا مناسب نہ جانا۔ ان دنوں وہ آپ کو بہت یاد کرتی تھی۔ کہتی تھی کہ جلد آ جائیں پھر نہ جانے ملاقات ہو یا نہ ہو۔ وہ آپ کو بہت چاہتی تھی۔ ان دنوں اس کو آپ کی بہت ضرورت تھی۔ اس نے دو تین دفعہ آپ کے مطب میں بھی فون کیا، آپ کے گھر میں بھی، مگر آپ ان دنوں یورپ میں گم ہو گئے تھے۔

ان دنوں ایک عجیب بات یہ بھی ہوئی تھی کہ وہ انگوٹھی نہ پہنتی تھی۔ آپ نے اس کو دائیں ہاتھ میں انگوٹھی پہنے اکثر دیکھا ہوگا۔ اس سے پوچھا تو اس نے بتایا کہ اس کے منگیتر نے اس کو اجازت دے دی تھی کہ وہ انگوٹھی نہ پہنے۔ اور مجھے یہ کیسے بھول سکتا ہے کہ وہ عنقریب شادی کرنے والی تھی، اسے صرف دولہا کا انتظار تھا۔ وہ ہر صبح گرجے جاتی تھی۔ پھر کھانا کھانے کے بعد وہ کچھ دیر آرام کرتی تھی اور اس کے بعد نہانے کا لباس لے کر ساحلِ سمندر پر چلی جاتی تھی۔ سمندر میں نہانے کی وہ ہمیشہ سے شوقین تھی۔ وہ بہت اچھی تیراک تھی مگر نہ جانے وہ اس دن واپس کیوں نہ لوٹ سکی۔''

وہ اس سے زیادہ کچھ نہ کہہ سکی۔ میرا دل کٹ کٹ گیا۔ مجھے اپنے آپ پر غصہ آ رہا تھا کہ یورپ کیوں اتنی دیر ٹھہرا، جانے سے پہلے میں اس سے مل کر کیوں نہ گیا۔ میں نے دل

ہی دل میں فیصلہ کرلیا کہ میری بے اعتنائی نے اس کو خودکشی پر مجبور کیا۔ مگر میری سمجھ میں یہ نہ آتا تھا کہ اس جیسی سمجھ دار، دیندار لڑکی خودکشی کیسے کرسکتی تھی۔

مجھے معاً رابرٹ ہنری کا خیال آیا۔ میں نے مریم کی بہن سے پوچھا کہ وہ کبھی رابرٹ ہنری سے ملی تھی۔ اس نے بتایا کہ وہ اس سے ملی تو نہ تھی مگر مریم کے خطوں میں ایک مدت تک اس کا ذکر آتا رہا مگر اس کی واپسی کے کچھ مہینوں پہلے اس کا ذکر مریم کے خطوں میں غائب ہوگیا تھا۔ میرا دل اس جواب سے مطمئن نہ ہوا۔ میرا جی کہتا تھا کہ اس سے ملنا چاہیے ضرور۔ مگر نہ مجھے اور نہ مریم کی بہن کو اس کا پتا معلوم تھا۔ ہم شام تک اس بنچ پر بیٹھے رہے چپ چاپ۔

میں لندن لوٹ آنے اور رابرٹ ہنری کو تلاش کرنے کے لیے بے تاب ہو رہا تھا۔ لہٰذا اٹھنے کی تجویز کی جو مریم کی بہن نے قبول کر لی۔ بیچاری نجانے کن خیالوں میں گم تھی۔ وہ مجھے اسٹیشن پر چھوڑنے آئی۔ ٹرین چلی تو اس نے مجھے الوداع کہی۔ اس کی آنکھوں میں غم اور پیار تھا، میرے لیے۔ جب تک پلیٹ فارم نظر آتا رہا وہ اس مقام پر کھڑی نظر آتی رہی جہاں سے اس نے مجھے الوداع کہی تھی۔

لندن آ کر دل نہ لگا۔ سارا سارا دن گھر پر پڑا رہتا، شام کو لندن کے بازاروں میں، ریستورانوں میں، سینماؤں میں، تھیٹروں میں رابرٹ ہنری کو ڈھونڈتا رہا مگر وہ کہیں نظر نہ آیا۔ آخر تھک ہار کر کئی ہفتوں کے بعد مطب گیا۔ ایک بار پھر کام میں لگ گیا۔ کام میں دل تو لگ گیا اور طبیعت میں پریشانی بھی نہ رہتی تھی جب تک مطب میں رہتا۔ مگر زندگی میں مریضوں کی دیکھ بھال کے سوا کوئی مقصد اور معنی نہ رہے۔

ایک رات ایک مریض کو اس کے گھر دیکھ کر آ رہا تھا کہ رابرٹ ہنری سے سامنا ہوگیا۔ وہ مجھے دیکھ کر ٹھٹکا، پھر منہ پھیر کر چلنے کا ارادہ کرتے کرتے رک گیا۔ کچھ توقف کے بعد وہ میری طرف بڑھا اور مجھے غور سے دیکھتا رہا۔ اس کے لباس میں پہلے کی طرح کا سلیقہ تھا مگر اس کا چہرہ اترا ہوا تھا۔ معلوم ہوتا تھا کہ کوئی دکھ اسے کھا رہا تھا۔

کافی دیر تک وہ مجھے تکتا رہا اور میرا بھی وہاں سے ہلنے کو جی نہ چاہ رہا تھا۔ ایک دم اس

نے سر کو جنبش دی اور ایک قدم پیچھے ہٹا لیا اور کہنے لگا:

''ڈاکٹر! میں دیکھتا ہوں کہ میری طرح تم بھی بہت دکھی ہو۔ ہم دونوں پر ایک ہی پہاڑ ٹوٹا ہے۔ مجھے تو میرے کیے کی سزا ملی اگرچہ بہت کم۔ مگر تم ناحق مارے گئے نجانے کیوں۔

تم نے ایک دفعہ میری جان بچائی تھی۔ میں نے تمہارے احسان کا بدلہ یہ دیا کہ اس نیک ہستی کو تم سے ہمیشہ کیلئے چھین لیا۔ خود مجھے معلوم نہ تھا کہ وہ میرے خون میں کس حد تک رچ گئی تھی۔ اور میں دیکھتا ہوں کہ تمہاری شخصیت میں اس کی شخصیت کا گہرا پرتو ہے۔ تم اس سے بہت پیار کرتے ہو۔

اگر کچھ وقت میرے لیے ضائع کر سکو تو تمہیں مریم سے اپنی آخری ملاقات کا حال بتاؤں۔ اوہ! بہت ہی عظیم انسان تھی وہ۔ وہ یسوع مسیح کی صحیح پیرو تھی۔ وہ تمام انسانیت کے لیے مرا اور وہ میرے لیے مرگئی۔ اس کو مصلوب ہوئے تو سینکڑوں نے دیکھا مگر اس کو مرتے کسی نے نہ دیکھا۔ میں اس وقت موقع پر موجود تھا جب وہ سمندر میں گم ہوگئی۔ اگرچہ مرتے اس کو میں نے بھی نہ دیکھا تھا۔ میں اتنا حقیر انسان ہوں کہ اس کی کہانی کو جاودانی نہیں کر سکتا حالانکہ وہ اس کی حقدار تھی۔ وہ مجھے پیار نہ کرتی تھی اگرچہ مجھے میری ذلت سے بلند اٹھانا چاہتی تھی، مگر میرے لیے مرگئی۔''

میں اس کے ساتھ ہولیا۔ وہ مجھے ایک چھوٹے سے ریستوران میں لے گیا۔ ہم ایک کونے میں بیٹھ گئے۔ اس نے اپنے لیے گوشت اور روٹی منگوائی اور میرے لیے چائے۔ وہ کھانے لگا۔ وہ شاید صبح سے بھوکا تھا۔

جب وہ کھا چکا تو کہنے لگا:

''تم مجھے پسند نہیں کرتے، تم نے مجھے کبھی پسند نہیں کیا۔ تمہاری رائے بالکل درست تھی۔ میں واقعی مریم کے لائق نہ تھا۔ کوئی بھی اس کے لائق نہ تھا۔ معاف کرنا، میں تمہیں بھی شامل کر رہا ہوں۔ میں جانتا ہوں کہ وہ تم سے بہت پیار کرتی تھی۔ اگر وہ کسی شخص سے پیار کرتی تھی تو تمہی سے۔ مجھے تو وہ ازراہِ کرم ملتی تھی۔ اس کا خیال تھا کہ وہ مجھ سے میرا پیشہ

چھڑا لے گی۔ میں پیشہ ور جواری ہوں، کبھی کبھی چوری بھی کر لیتا ہوں اور...... چھوڑو اس قصے کو کہ کیا کیا کرتا ہوں۔ میں شریف انسان نہیں۔ مجھے مریم انسان نہ بنا سکی، باوجود اس کے کہ وہ واقعی ولیہ تھی۔

وہ اکثر مجھے منع کرتی تھی کہ ناجائز ذرائع سے نہ کماؤں۔ میں اگر جائز طریقوں سے روزی کمانے کا عہد کر لیتا تو وہ شاید مجھ سے شادی بھی کر لیتی میری محبت کی وجہ سے نہیں بلکہ بدی چھوڑنے کی وجہ سے۔ مگر مجھے خیرات میں مریم بھی منظور نہ تھی۔ اگر منظور بھی ہوتی تو میں اس سے جھوٹ نہ بول سکتا تھا۔ میں اپنے طور طریقے تو چھوڑ ہی نہیں سکتا، مجھے ان میں بہت ہی مزا ملتا ہے۔ مریم سے کوئی بھی جھوٹ نہیں بول سکتا تھا۔

ایک دن میں نے یونہی آزمانے کو مریم کو شادی کا پیام دے دیا۔ اس نے انکار نہیں کیا مگر جواب دینے کے لیے ایک مدت چاہی۔ اس رات مجھے محسوس ہوا کہ مریم کس طرح میری نس نس میں رچ گئی تھی۔ میں یہ تو نہیں کہوں گا کہ میں اس سے محبت کرتا تھا۔ اس کی مجھ میں اہلیت ہی نہیں تھی، نہ ہے۔

جوں جوں وقت گزرتا گیا مریم مجھے جواب دینے سے گریز کرتی رہی۔ اس گومگو کی کیفیت سے میرے دل میں حسد پیدا ہونے لگا اس آدمی کے لیے جس سے وہ شادی کرنے کا سوچتی تھی۔ مجھے شک تھا کہ وہ آپ سے شادی کرنا چاہتی تھی مگر میرے پاس کوئی ثبوت نہ تھا۔ مجھ سے وہ پہلے کی طرح ملتی رہی۔ وہ میری عزت کرنا چاہتی تھی، مجھ پر فخر کرنا چاہتی تھی، وہ میرے لیے بہت کچھ کرنا چاہتی، وہ سب کچھ جو ایک ماں یا ایک بڑی بہن سوچ سکتی ہے۔ مگر مجھ میں عزت اور فخر کے لائق کیا تھا۔ کچھ نہ تھا۔ بالکل کچھ نہ تھا۔

دن بدن میرے دل میں حسد بڑھتا ہی جاتا تھا اور اس کا مقصد اور مقصود کچھ نہ تھا۔ انتقام کی آگ میں خود ہی جلتا رہا۔ ایک دن میں نے اس کو طعنہ دیا کہ وہ چاہتی تھی کہ تم اس کو شادی کا پیام دو اور وہ تمہیں قبول کر لے۔ اس نے حیرانی کا اظہار کیا اور کہا کہ یہ سچ نہ تھا۔ میں جانتا تھا کہ یہ سچ نہ تھا۔ میری بہتری میں وہ اتنی مگن رہی تھی کہ اس کو اپنے دل کے حال کا بھی پتا نہ تھا۔

چند دن بعد وہ مجھے ملی اور اس نے مجھے قبول کرنے سے انکار کر دیا۔ مجھے بہت غصہ آیا میں نے آپ کو قتل کرنے کے لیے ڈھونڈا مگر آپ ان دنوں یورپ گئے ہوئے تھے۔ میں کئی بار آپ کے مطب پر گیا مگر ہر بار پتا ملتا کہ آپ ابھی یورپ میں ہیں۔

تنگ آ کر میں نے فیصلہ کیا کہ مریم ہی کو ختم کر دیا جائے۔ وہ ان دنوں لندن سے نوکری چھوڑ چھاڑ برائٹن جا چکی تھی۔ میں وہاں پہنچا۔ اس کی حرکات وسکنات کا پتا لگایا۔ وہ ہر روز صبح گرجے میں جاتی تھی اور جب وہاں سے نکلتی تھی تو اس کی طرف دیکھنے کی تاب مجھ میں نہ ہوتی تھی۔ وہ بالکل فرشتہ سی لگتی تھی اور فرشتوں کے قتل کا کس نے سوچا ہے۔ دوپہر کو نہانے کے لیے ساحلِ سمندر پر جاتی تھی۔ نہانے کے لباس میں وہ فرشتہ نہیں عورت لگتی تھی، حسین، بہت ہی حسین۔ ان دنوں اس پر حسن بہت تھا، حسن اس کی نس نس سے پھوٹتا تھا۔ مگر پھر بھی وہ عورت ہی رہتی تھی۔ اس کو قتل کرنا آسان تھا۔

آخر ایک دن ہمت کر کے میں نے اسے نہاتے ہوئے جا لیا۔ مجھے دیکھ کر وہ ذرا بھی پریشان نہ ہوئی، غصے میں نہ آئی بلکہ باقاعدہ خوش سی لگی۔ میرا حال پوچھا۔ میں ساحل پر یونہی بیٹھ گیا۔ وہ نہاتی رہی اور باتیں کرتی رہی۔ اس دن ساحل پر ہمارے قریب کوئی نہ تھا۔ اس کو قتل کرنا آسان تھا کسی کو خبر بھی نہ ہو سکتی تھی۔

مگر میرا ارادہ ہی نہ بن رہا تھا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ اس نے ایک ہی نظر میں میرے دل سے انتقام کے جذبے کو نکال لیا تھا۔ مگر اس کے قتل کے بغیر مجھے اپنی زندگی بے مقصد نظر آتی تھی۔ میں نے اس کو اشتعال دلانے کے لیے طعنہ دیا کہ وہ آپ کے ساتھ جب برائٹن آئی تھی تو آپ کے ساتھ اس کے جنسی تعلقات قائم ہو گئے تھے اس لیے وہ مجھ سے شادی کرنے سے گھبراتی تھی۔

بہت ہی گھٹیا بات تھی۔ میں جانتا ہوں۔ مگر اس وقت مجھے کچھ سوجھا ہی نہیں۔ مریم تیرتے تیرتے رک گئی اور پانی میں کھڑی ہو گئی۔ اس کے چہرے پر پانی کی بوندیں بہت بھلی معلوم دیں۔ اس کا سینہ بہت ہی قابل ستائش تھا اور اس کا رنگ تو قیامت تھا۔ معاف کیجیے! وہ لاکھ ولیہ سہی مگر تھی عورت۔ بہر حال وہ مجھ سے شادی کر سکتی تھی اگر میں نیک رہنے کا

وعدہ کر لیتا۔ تب اس کے سینے ہی کی تعریف کرنے کا حق ادا نہ ہوتا مجھ سے۔

اس نے مجھے بہت غور سے دیکھا۔ اس کی آنکھوں میں غصہ نہ تھا، نفرت نہ تھی، صرف رحم تھا اور افسوس۔ دیر تک وہ مجھے اس طرح دیکھتی رہی اور پھر کہنے لگی:

''میں نہ جانتی تھی کہ ایک عورت کے جسم کی آرزو میں انسان اتنا گر سکتا ہے اور تم نے تو مجھ سے کبھی جھوٹ نہ بولا تھا۔ اگر اس جسم کی تمہیں اتنی ہی خواہش ہے تو تم اس وقت جتنا چاہو اس سے لطف اندوز ہو سکتے ہو۔ ڈاکٹر متین پھر بھی مجھے قبول کر لیں گے۔ میرے لیے ان کے دل میں جو محبت ہے اس میں شمہ بھر فرق نہ آئے گا۔''

اس کے ساتھ ہی اس نے اپنے شانوں سے لباس کے فیتوں کو کھسکانا شروع کیا۔ میں نے دیکھا کہ اس کی آنکھوں میں وہی کیفیت تھی: رحم کی، افسوس کی۔ میں اس منظر کی تاب نہ لا سکا اور میں نے منہ پھیر لیا۔ اس نے لباس اتار کر پھینک دیا اور بولی کہ آ کر اپنی مرضی کر لو میں تیار ہوں۔

میں غصے کے لیے، ناراضگی کے لیے تیار تھا۔ مگر میں خیرات کے لیے بالکل تیار نہ تھا۔ میں جوان ہوں، چور ہوں، جواری ہوں، نہ جانے کیا کیا ہوں مگر بھکاری بالکل نہیں ہوں۔ میں ڈاکا ڈال سکتا ہوں، عورت سے زبردستی بھی کر سکتا ہوں۔ مگر اس دم مجھے احساس ہوا کہ میں اس دنیا کا ذلیل ترین انسان ہوں۔ میں نے اس کا لباس اس کی طرف پھینک دیا اور کہا کہ وہ اس کو پہن لے۔

جب اس نے لباس پہن لیا تو میں اس کی طرف بے خطر دیکھ سکتا تھا۔ لہٰذا اس کی طرف مڑا اور اس کی طرف دیکھا۔ وہ پریشان سی نظر آئی۔ یہ جاننے کے لیے تجسس پیدا ہوا کہ وہ پریشان کیوں ہو گئی تھی۔ میں چپ چاپ اس کی طرف دیکھتا رہا۔ لحہ بہ لحہ اس کی پریشانی بڑھتی ہی جاتی تھی۔ کافی دیر کے بعد اس نے نظر اٹھا کر میری طرف دیکھا۔ اس کی آنکھوں میں اتھاہ کا حزن اور ندامت تھی۔ انہی نظروں سے وہ مجھے دیکھتی رہی اور پھر بھرائی ہوئی آواز میں بولی:

''میں نے ہر حال میں خدا پر تکیہ کیا اور خوش رہی مگر آج میں نے ایسی حرکت کی ہے

جس سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ میں نے خدا کو کچھ لمحوں کے لیے بالکل چھوڑ دیا تھا، یسوع مسیح کو بھول گئی تھی اور ایک چالاک فاحشہ کی طرح میں نے تم سے ہتھکنڈا کیا۔ میں جانتی ہوں، میں اس وقت سے جانتی ہوں جب تم میرے سامنے آئے تھے کہ تم مجھے قتل کرنے آئے تھے۔ میں اس وقت موت سے نہ ڈرتی تھی اور اب بھی نہیں ڈرتی۔ مگر خدا کا رشتہ ہاتھ سے چھوڑ دینا اور اس کو بالکل بھول جانا یہ بہت ہی بڑا گناہ کیا ہے میں نے۔ میں نے ہمیشہ خدا کو اپنے قریب محسوس کیا ہے اور میں اس کو بھول گئی اور ایک چالاک فاحشہ بن گئی۔ اس کا کفارہ عمر بھر کے زہد سے نہ ہو سکے گا۔ میں نہیں سوچ سکتی کہ مجھے کیا کرنا چاہیے۔''

اس کے بعد اس نے میری طرف سے منہ پھیر لیا اور میں وہاں سے چل دیا۔ کچھ دور جا کر میں نے مڑ کر دیکھا تو وہ کہیں نظر نہ آئی۔ میں واپس دوڑا۔ مگر وہ کہیں نہ تھی، دور دور اس کا نشان نہ تھا۔ میں نے سوچا کہ وہ ادھر ادھر چھپی ہوگی۔ میں نے دیکھا کہ ایک درخت کے نیچے اس کے کپڑے تہہ کئے رکھے تھے۔ میں نے اس کو آوازیں دیں۔ کچھ دیر انتظار کیا۔ مگر وہ نہ آئی، نہ نظر آئی۔ وہ شاید سمندر میں ڈوب گئی تھی۔ کیا اس نے خودکشی کر لی تھی؟ میں فیصلہ نہ کر سکا۔

میں وہاں سے چلا آیا۔ شام تک میں نے انتظار کیا۔ شام کے وقت ساحل پر کہرام مچ گیا کہ مریم ڈوب گئی ہے۔ اگلے دن کرونر (coroner) نے فیصلہ دے دیا کہ موت حادثے سے ہوئی ہے۔ مگر مجھے یقین ہے کہ میں نے اسے مارا ہے۔ اگرچہ میں نے اس کے جسم کو ہاتھ تک نہیں لگایا مگر میں نے اس کے دل و دماغ میں ایسی کیفیت پیدا کر دی تھی کہ وہ مرنے کے سوا کچھ نہ کر سکتی تھی۔

اس دن سے آج تک میں نے کوئی کام نہیں کیا، نہ اچھا نہ برا، میں اس تلاش میں ہوں کہ کس طرح مجھے میرے اس گناہ کی سزا ملے۔ مجھے اب جینے کی کوئی خواہش نہیں مگر مجھ میں مرنے کی ہمت بھی نہیں۔ اب میری زندگی کا کوئی مقصد نہیں، میری کوئی منزل نہیں۔ میں کسی کشتی کا ٹوٹا ہوا ٹکڑا ہوں جو سمندر میں تیرتا پھرتا ہے، بے منزل۔'' اس کے بعد وہ ریستوران سے نکل گیا۔

اس ملاقات کے بعد مجھے یقین ہو گیا کہ مریم کی موت کا میں اور صرف میں ذمہ دار ہوں۔ اگر میں رابرٹ ہنری کی اس رات مرہم پٹی نہ کرتا یا اس کو پولیس کے حوالے کر دیتا تو وہ مریم کی زندگی میں ناسور بننے سے پہلے ہی نکل جاتا۔ اگر میں اپنے مرد ہونے کے غرور میں مریم سے برائٹن سے آنے کے بعد ملنے میں بے اعتنائی نہ برتتا تو شاید اس میں وہ جذبات جنم نہ لیتے اور اگر جنم لے چکے تھے تو اتنی جلدی اتنی شدت اختیار نہ کرتے کہ وہ موت کے لیے ہر دم تیار رہتی۔ میں اس سے یورپ جانے سے پہلے ہی مل لیتا تو وہ تنہا محسوس نہ کرتی اور اپنے جذبات کا مقابلہ کرنے میں کوئی امید اس کا سہارا بنتی یا شاید میں یورپ ہی نہ جاتا اور اس کی زندگی کسی دوسری ڈگر پر چل نکلتی۔ میں یورپ گیا تھا تو وہاں نہ رک جاتا اور جلد لوٹ آتا۔ شاید میں چاہتا تھا کہ وہ میری غیر حاضری کو شدت سے محسوس کرے اور اس کے دل میں میری جو محبت پرورش پا رہی تھی وہ اتنی شدت پکڑ لے کہ وہ مجھ سے شادی کرنے پر مجبور ہو جائے۔

اس نے تو میرے ساتھ شادی کرنے کا فیصلہ کر ہی لیا تھا مگر میں نے ہی دیر کر دی۔ میرے غرور نے مریم کی جان لی۔

اس یقین کے بعد لندن میں رہنا میرے لیے محال ہو گیا۔ میں نے اپنی پریکٹس اپنے اسسٹنٹ کو بیچ دی اور یورپ چلا آیا۔ چند مہینے یونہی بے مقصد اور بے منزل یورپ کے ممالک میں گھومتا رہا۔ گناہ کا احساس ہر دم، ہر لمحہ میرے ساتھ صلیب کی طرح رہا۔ آخر میں نے اس احساس کا مقابلہ کرنے کی ٹھان لی اور باسل یونیورسٹی میں فلسفہ کی ڈاکٹریٹ میں داخلہ لے لیا۔ تین سال میں ڈاکٹریٹ کر لی اور اپنے دیس لوٹ آیا۔''

ساتواں باب

متین صاحب کی آواز ابھی تک فردوس کے کانوں میں گونج رہی تھی۔ وہ خاموش ہو چکے تھے، ان کی آنکھیں بند تھیں، ان کا جسم کرسی میں ایسے دراز تھا جیسے اسی کا حصہ ہو۔ ان

کے ہاتھ ایک دوسرے سے ہم آغوش ہو رہے تھے، ان کے چہرے پر نکھار آ گیا جیسے دنوں مینہ برسنے کے بعد آسمان پر۔ کمرے کا تمام سکون ان کی کرسی کے اندر گھر آیا تھا۔ ان کی کرسی کے باہر ایک طوفان تھا جو ابھی گرمِ سفر نہ ہوا تھا۔

فردوس ان کو برابر تکے جا رہی تھی۔ اس نے ان کے چہرے پر کئی کیفیتوں کو ابھرتے، پھیلتے، گم ہوتے دیکھا تھا۔ اس کے ذہن کا ہر خیال، اس کے دل کی دھڑکن، ان کے چہرے کی کیفیتوں کے ساتھ ساتھ چلنے کی اتنی عادی ہو گئی تھی کہ اب جب ان کے چہرے پر کوئی کیفیت نہ تھی تو اس کو سوچتے ہوئے، سانس لیتے ہوئے دکھن کا احساس ہو رہا تھا۔ وہ اپنی کرسی سے اٹھنا چاہتی تھی مگر متین صاحب کے سکون میں خلل انداز ہونے کی جرأت اسے نہ تھی۔ اس کا دم گھٹنے لگا تھا مگر وہ زور سے سانس نہ لیتی تھی کہ کہیں کمرے کی ہوا میں کمی نہ ہو جائے اور باہر میدان کی ہوا خلا کو پر کرنے کے لئے اندر نہ دندناتی چلی آئے۔ وہ آنکھیں بند کر کے پڑے رہنے کا سوچتی، آنکھیں بند کرتی تو فوراً احساس ہوتا کہ اگر سو گئی تو شاید متین صاحب اٹھ کر کہیں ہمیشہ ہمیشہ کے لئے چلے جائیں گے۔ وہ عجیب مصیبت میں تھی۔ اسے اس مصیبت سے نجات کی سوائے موت کے کوئی راہ نہ سوجھ رہی تھی۔ اس پر نزع کی حالت طاری ہونے لگی تھی۔

کہیں قریب ہی سے اجنبی قدموں کی چاپ نے اس کو متوجہ کیا۔ وہ کان لگا کر چاپ کو سننے لگی۔ چاپ قریب آ رہی تھی۔ اس کا سانس ایک بار پھر ٹھیک طرح چلنا شروع ہو گیا تھا۔ اس کے دل اور ذہن پر کوئی بوجھ نہ رہا تھا۔ اس کے دل میں گرم گرم خون چلنے کا احساس پیدا ہونے لگا۔

''عالمہ دیکھو یہ لوگ تو سو رہے ہیں۔ نہ جانے کتنی صدیاں گزر گئی ہیں اور نہ جانے کتنی صدیاں گزر جائیں۔ آؤ ان کی پیشانیوں پر ہاتھ رکھیں تا کہ جاگ جائیں۔''

تقی اور عالمہ دبے پاؤں کمرے میں قدم رکھتے ہوئے داخل ہوئے اور فردوس اور متین صاحب کی طرف بڑھنے لگے، بڑھتے رہے۔ قریب جا کر تقی نے فردوس کے ماتھے پر دونوں ہاتھوں کی انگلیاں رکھ دیں اور عالمہ نے متین صاحب کے سر پر اپنا دایاں ہاتھ رکھ دیا

اور کہا

''ڈاکٹر صاحب! آنکھیں کھولیے۔ دیکھئے کون آیا ہے۔''

فردوس اور متین نے آنکھیں کھول دیں۔ ان کی نظریں ملیں۔ وہ مسکرائے، لجائے۔ نظریں اٹھائیں اور عالمہ اور تقی کو دیکھا۔ ان دونوں کے چہروں پر تحیر سا تھا۔ ایک سوچتی ہوئی مسکراہٹ ان دونوں کے ہونٹوں کے کونوں میں غائب ہو رہی تھی۔

فردوس اور متین صاحب دونوں ایک ساتھ اپنی اپنی کرسیوں سے اٹھ کھڑے ہوئے اور فردوس بولی'' آپ دونوں نے عنایت کی کہ چلے آئے۔ تقی بھئی! اپنی پھوپھی زاد سے تعارف کراؤنا''

''والدین اسے عالمہ کہتے ہیں۔''

''عالمہ؟''

''بس عالمہ''

تم انہیں کیا کہتے ہو؟''

اب تو عالمہ ہی کہتا ہوں'

''پہلے کیا کہتے تھے؟''

''میں بچپن میں اسے ملو کہا کرتا تھا۔''

''کوئی خاص وجہ اس نام کے لیے؟''

''ہاں! یہ ہر ایک سے گھل مل جاتی تھی اور چاہا کرتی تھی کہ میں بھی اسی طرح ہر ایک سے ملا کروں۔''

''اچھا جی! اب تعارف ہولیا۔ آپ تو تمام باتیں آج ہی کر ڈالیں گے۔'' عالمہ پیار سے جھنجھلاتی ہوئی آواز سے بولی۔

''میرا نام فردوس ہے۔ میں تقی سے متواتر چار سال تک ہر روز ناشتہ کی میز پر ملتی رہی۔ کبھی کبھار رات کے کھانے پر بھی ملاقات ہو جاتی تھی۔''

''مجھے بتایا تھا انہوں نے'' عالمہ بولی اور پھر متین صاحب کی طرف مخاطب ہوتے ہوئے بولی ''اور آپ کو تو میں بہت عرصے سے جانتی ہوں''۔

''ابھی کل ہی تو تم سے ملاقات ہوئی۔ بہت عرصہ کیسے ہو گیا۔''

''تقی صاحب آپ کے متعلق برسوں باتیں کرتے رہے ہیں''۔

''آخر یوں کھڑے کھڑے کب تک باتیں ہوں گی۔ آیئے باہر دھوپ میں بیٹھتے ہیں'' فردوس بولی۔

دھوپ میں پیار بھری حرارت تھی۔ دھوپ ان کے کپڑوں میں سے ہو کر ان کی ہڈیوں میں داخل ہونے لگی۔ حرارت کے عمل نے ان میں ہوا میں غباروں کی طرح بلند ہونے کا احساس پیدا کر دیا تھا۔ اس احساس نے ان کی شخصیتوں کے گرد حصار کھینچ دیا اور ہر ایک اپنے احساس میں محصور دوسرے کی حالت سے بے خبر ہوتا جا رہا تھا۔

اتنے میں بابا عمر خان کمرے سے نکل آیا اور ان کو یوں خاموش، بے خبر دیکھ کر ٹھٹکا اور تکتا رہا اور پھر وہ بھی اپنے آپ سے بے خبر ہونے لگا۔ اس کے ذہن میں ایک خیال کوند گیا اور اسے شدید احساس ہونے لگا کہ اگر اس نے ان کو جلد بیدار نہ کیا تو وہ پتھر کے ہو جائیں گے اور پھر جانے صدیوں بعد کسی شہزادے کی آمد پر ہی وہ بیدار ہو سکیں۔ اسے یقین ہو چلا تھا کہ کسی نے ان پر جادو کر دیا ہے ورنہ کبھی یوں بھی پوری محفل کی محفل خاموش، بے خبر ہوتی ہے۔ اس نے ہمت کر کے تجرباً ایک قدم بڑھایا۔ وہ واقعی چل سکتا تھا۔ اس نے ایک قدم اور بڑھایا اور پھر وہ قدم بڑھاتا ہوا بالکل ان کے قریب پہنچ گیا۔ مگر ان میں سے کسی کو بھی اس کے آنے کا احساس نہ ہوا۔ وہ اب بھی خاموش، بے خبر بیٹھے رہے۔ عمر خان نے آہستہ سے فردوس کو پکارا۔ ''بی بی! کھانا تیار ہے۔ بڑے کمرے میں لگاؤں یا کھانے کے کمرے میں؟''

فردوس کے بدن میں جنبش ہوئی اس نے سر اٹھا کر عمر خان کی طرف دیکھا اور پھر کھو گئی۔ شاید اس کے الفاظ کی بکھرتی ہوئی آواز کو اکٹھا کر رہی تھی۔ عمر خان نے اپنی بات دہرائی ''کھانے کے کمرے میں کھانا لگاؤں؟ بڑی میز تو بہت بڑی ہو گی صرف چار آدمی ہی

تو ہیں۔ چھوٹی میز ہی ٹھیک رہے گی؟''

''ہاں!'' فردوس کی آواز کہیں دور سے آتی ہوئی معلوم ہوئی۔ خود اپنی آواز سے فردوس کو ایک دھچکا سا لگا اور اس کی آنکھوں میں تحیر سا تیر گیا۔ اس نے اپنا دایاں ہاتھ اٹھایا۔ ماتھے پر، آنکھوں پر پھیرا۔ شاید سوچنے کی کوشش کر رہی تھی کہ کب سے، کتنے عرصے سے اس بے حسی کے عالم میں تھی۔ اس نے اپنے بدن کو جھرجھری دی اور وہ ایک ہی جھٹکے میں اٹھ کھڑی ہوئی اور بابا سے مخاطب ہوئی۔ ''میں تمہارے ساتھ چل کر دیکھ لیتی ہوں کہ کھانے کا کمرا کیسا ہے۔ آج شاید وہاں نہ جانے کتنے برسوں کے بعد کھانا کھایا جائے گا۔ تمہیں تو یاد ہوگا بابا۔''

''ہاں بی بی۔ اس رات نواب آغا تھے، بڑی بی بی تھیں، چھوٹے آغا تھے۔ نواب آغا بڑی بی بی کو دیکھ دیکھ کر خوش ہو رہے تھے۔ چھوٹے آغا آنکھیں جھکائے کھانا کھانے میں مصروف نظر آنے کی کوشش کر رہے اس کے کچھ ہی گھنٹے بعد......''

بابا عمر خان کچھ سوچتے ہوئے رکا اور ڈر کر اس نے اپنے منہ پر ہاتھ رکھ لیا۔ وہ اپنے آپ میں جھنجھلایا کہ وہ کس ریلے میں بہہ چلا تھا اور وہ بات کہہ دینے کو تھا جس کو اس کے علاوہ اب صرف نواب آغا جانتے تھے یا پھر چھوٹے آغا۔

''بابا تم کیا کہتے کہتے رک گئے۔ کیا بات یاد آئی۔''

''کچھ نہیں بی بی۔ بوڑھا ہو گیا ہوں نا۔ یونہی فضول باتیں کرنے کی عادت سی ہو گئی۔ یہ جگہ بھی تو بہت اکیلی اکیلی ہے نا۔ اپنی عمر کا یہاں کوئی نہیں کبھی کبھی تو بہت جی چاہتا ہے کہ خوب خوب باتیں کروں مگر پرانی باتیں کون سنتا ہے۔ لو! میں پھر باتیں کرنے لگ گیا۔ بھول ہی گیا کہ کس لئے آیا تھا۔ بوڑھا ہو گیا ہوں نا۔''

عمر خان برآمدے سے کمرے میں داخل ہو گیا۔ فردوس بھی اس کے پیچھے کمرے میں داخل ہوئی اور چاروں طرف نظر دوڑانے لگی۔ ایک کافی بڑا کمرا تھا۔ اس کے چاروں طرف یا تو شیشوں والے دروازے تھے یا کھڑکیاں۔ دروازوں پر، کھڑکیوں پر دبیز پردے لٹک رہے تھے۔ برآمدے والے دروازے کے دائیں ہاتھ ایک بہت بڑی میز کے اردگرد بہت

سی کرسیاں تھیں۔ اور کمرے کے بیچوں بیچ ایک چھوٹی میز کے گرد چار کرسیاں پڑی تھیں۔ میز پر ایک سفید اکڑا ہوا، چمکتا ہوا کپڑا پڑا تھا۔ اس میز کے اوپر چھت میں ایک چبوترا تھا۔ جس کے چاروں طرف روشندان تھے۔ ان روشندانوں سے کرنیں چھن چھن کر چبوترے کے خول میں جمع ہو رہی تھیں۔ فردوس کا دل اس میز کی طرف کھنچ گیا اور اس نے چاہا کہ سب اس میز پر نور کے سایے میں بیٹھ کر ہی کھانا کھائیں۔ اس نے اس خواہش کو فیصلے کا درجہ دیتے ہوئے عمر خان کو مناسب ہدایات دیں اور باہر چلی آئی۔ سب لوگ ابھی تک کرسیوں میں خاموش بیٹھے تھے مگر فضا میں ایک ہلچل ضرور تھی۔ شاید وہ اس کے آنے سے پہلے باتیں کر رہے تھے، زبان سے نہیں تو آنکھوں ہی آنکھوں میں۔

فردوس اپنی کرسی پر بیٹھتے ہوئے بولی ''آپ کو کیا ہو گیا ہے کہ آپ خاموش ہیں۔ میزبان کے فرائض میں باتیں کرنا بھی شامل ہے؟ میں چپ ہوں تو آپ ہی بولئے۔''

پھر عالمہ کی طرف مخاطب ہوتے ہوئے ''متین صاحب کہہ رہے تھے کہ آپ کی طبیعت ناساز تھی آج صبح۔ کیا بات تھی۔ کچھ زیادہ تکلیف تھی؟''

''بہت دنوں سے طبیعت میں اضطراب ہے، اضمحلال ہے۔ وجہ ڈاکٹر صاحب ہی جانیں۔ ہم نے تو اپنی صحت ان کے سپرد کر دی ہے، جو کہیں گے، کریں گے''

''متین صاحب سے تو میں پوچھ نہیں سکتی اور نہ ہی ان سے امید ہے کہ وہ پیشہ ورانہ فرائض سے کوتاہی کر کے مجھے بتائیں گے۔ اتنا تو بہر حال پوچھ لینے میں شاید کوئی حرج نہیں کہ آپ کی بیماری میں کوئی فکر کی بات تو نہیں؟''

''نہیں تو۔ شہر پہنچ جاؤں تو ان کا علاج کرنے میں کافی آسانی ہو جائے گی۔''

''کھانا لگا دیا ہے بی بی''

آیئے چلیں۔ سب اٹھ کر اندر چلے آئے اور میز کے چاروں کھونٹ سنبھال لئے۔ ملازم کھانا لاتے رہے اور وہ کھاتے رہے۔

یکا یک ایک کرن روشن دان سے اتر میز پر آئی۔ رکی، تھر کی، پھسلی، سنبھلی اور پھر رقص

کرنے لگی۔ اس کرن کے بعد بہت سی کرنیں یکدم روشندان سے اتر آئیں۔ ان کے بعد تو تانتا بندھ گیا اور تمام میز پر، ان کی کرسیوں کے گرداگرد کرنوں نے جال پھیلا دیا۔ روشنی سے ان کی آنکھیں چندھیانے لگیں۔ میز پر رکھی ہوئی چیزیں روشنی میں تحلیل ہونے لگیں۔ میز پر روشنی کی ایک سڑک بچھ گئی تھی۔ روشن دانوں سے روشنی کے کئی سوتے چبوترے کے خول میں سنگم بناتے ہوئے ایک دریائے نور میں ڈھل کر میز تک آ رہے تھے۔ کچھ عرصے بعد روشنی اتنی تیز ہوگئی کہ ان کو کچھ بھی نظر نہ آتا تھا۔ ان کے ذہنوں پر، ان کے دلوں پر ہیبت چھانے لگی۔ ان کے ہاتھ جہاں تھے وہیں رک گئے۔ ان کے اعضا فرداً فرداً جس جس حرکت میں تھے وہیں ساکت ہوگئے۔ وہ الگ الگ سوچ رہے تھے کہ نور نے جو ان کے گرد حصار کر دیا ہے تو شاید ان سب کی تقدیر ایک دوسرے کے ساتھ وابستہ ہوگئی ہے اور اس تقدیر سے اب کہیں فرار نہ ہو سکے گا۔ الگ الگ ہر ایک کو یہ بھی احساس ہو رہا تھا کہ ہر ایک کو بالکل وہی محسوس ہو رہا تھا۔ ان کے دائیں ہاتھ خود بخود میز کے وسط کی طرف دراز ہوگئے اور میز پر ان کے ہاتھوں کی انگلیوں سے ورے اور چاروں ہاتھوں کے درمیان میز پر ایک دائرہ سا بن رہا تھا اور ان کی کرسیوں کے گرد سے ہٹ کر ان کے جسموں پر سے آہستہ آہستہ گزرتا ہوا میز پر اکٹھا ہونے لگا اور پھر میز کے کونوں سے درمیان میں سمٹنے لگا اور آخر ان کے ہاتھوں کی انگلیوں کے درمیان والے دائرے میں مرکوز ہو گیا اور منجمد ہو گیا۔ نور اس دائرے سے ایک بڑے ستون کی صورت چھت کے چبوترے کی طرف بلند ہو رہا تھا۔ مگر عجیب بات یہ تھی کہ چبوترے کے خلا کے قریب پہنچ کر اس کے تمام نشانات مٹ جاتے تھے۔ روشنی کا یہ ستون میز والے دائرے اور چبوترے کے درمیان والی فضا میں معلق تھا، معلق رہا اور پھر آہستہ آہستہ پگھلنا شروع ہوا۔ پتلا ہونا شروع ہوا، پتلا ہوتا رہا تا آنکہ صرف ایک کرن میز پر رہ گئی۔ اس کرن میں ایک حرکت ہوئی۔ وہ پھسلی، سنبھلی، تھرکی اور پھر رقص کرنے لگی۔ رقص کرتی رہی۔ پھر اس کا رشتہ باہر کی روشنی سے ٹوٹ گیا اور وہ بے جان ہوکر میز پر انگلیوں کے دائرے کے اندر بے حس ہوکر گر پڑی۔ پھر ایک اور کرن روشن دان سے جھانکی۔ اندر پیر بڑھائے اور کود کر میز پر آئی اور فوراً پھر اوپر کو کود گئی اور پھر میز پر قدم رکھے، تھرکی، رکی رہی، پھر جلد جلد دبے پاؤں سے پہلی کرن کی طرف بڑھی اور پھر ایک دم اس کو

اٹھا کر روشن دان کی طرف کو دی اور آنکھ جھپکتے ہی نظروں سے غائب ہوگئی۔ چبوترے کے خلا میں اب نور نہ تھا صرف اس کی چھت سے کچھ روشنی چپکی ہوئی رہ گئی تھی۔

انہوں نے کرنوں کے جاتے ہی ایک دوسرے کی طرف بڑی رازدارانہ نگاہوں سے دیکھا اور ان کی نگاہیں ایک دوسرے کے اندر اتر گئیں۔ ان کو یہ احساس ہو رہا تھا کہ انہوں نے کسی عہد نامے پر دستخط کئے ہیں اور اس عہد نامے سے انحراف کرنے کی صورت میں ان پر کسی بڑی مصیبت کے آنے سے آگاہ کرنے ہی شاید وہ آخری کرن آئی تھی۔ اس ماورائی احساس سے ان کو اپنے آپ پر، اپنے ساتھیوں پر تحیر ہونے لگا اور اس تحیر سے ان کے دلوں پر ہیبت طاری ہونے لگی۔ ان سب کی یک بارگی میز کے وسط میں اپنے اپنے دراز کئے ہوئے ہاتھوں پر نظر پڑی اور ان سب نے ڈر کر اپنے ہاتھ کھینچ لئے اور ہاتھ کھینچتے ہی ان کے دلوں پر ایک چوٹ پڑی اور ان کے چہرے تمتما اٹھے۔

سب ہاتھ پہ ہاتھ دھرے کافی دیر نگاہیں جھکائے، چپ چاپ بیٹھے رہے۔ ان کے جسموں میں کوئی حرکت نہ تھی۔ پھر انہوں نے ڈرتے ڈرتے پلکیں اٹھائیں، ایک دوسرے کو غور سے، حیرانی سے دیکھا۔ ان کی نگاہیں ملیں۔ اطمینان ان کے دلوں میں لوٹ آیا۔ سب کے سب ایک بارگی اٹھے۔ عمر خان کے، جو کھانے کی میز سے دور برتنوں والی میز کے پاس دم بخود کھڑا تھا، جسم میں ایک تھرتھری پیدا ہوئی اور جلدی سے کمرے سے باہر نکل گیا اور فوراً ہی لوٹے میں گرم پانی لے آیا۔ انہوں نے ہاتھ دھوئے، تولیے سے پونچھے اور ایک ایک کر کے کمرے سے نکل کر باہر ٹیرس کی دھوپ میں کرسیوں میں بیٹھ گئے۔ سورج کی گرمی سے ان کے جسموں میں حرارت بھرنے لگی اور آنکھیں میں غنودگی عود کر آئی اور سب کے سب کرسیوں پر آرام، اطمینان سے دراز ہوگئے۔

آٹھواں باب

سورج کی کرنیں اب بھی ان کے جسموں پر تیزی سے پڑ رہی تھیں۔ گرمی سے ان

کے اندر بے ترتیبی سی پیدا ہونے لگی تھی۔ ایک ایک کر کے وہ اپنی کرسیوں میں سنبھل سنبھل کر، آنکھیں کھول کر بیٹھ گئے۔ شاید سوچ رہے تھے کہ کھانے کے کمرے والے تاثر سے کیسے چھٹکارا حاصل کریں۔

''دھوپ کچھ تیز ہے؟ اندر چلیں؟'' فردوس بھرائی ہوئی آواز میں بولی۔ ''نہیں تو، بھلی معلوم ہو رہی ہے۔ یہی تو دن ہیں دھوپ تاپنے کے۔ پھر تو کچھ دنوں میں دھوپ میں بیٹھنا امتحان بن جائے گا۔'' متین صاحب نے رائے دی۔

ایک بار پھر خاموشی چھا گئی۔

''آپ تمام دن کیا کرتی رہتی ہیں۔ جب تک میں یہاں ہوں آپ میرے پاس چلی آیا کیجئے۔ آج کل میں بہت اداس ہوں۔ باتیں کرنے کو کوئی نہیں۔ یہ تو غنیمت ہے کہ تقی اور متین صاحب ابھی داؤ دنگر ہیں۔ لیکن ان کو بھی تو واپس جانا ہی ہوگا۔''

''کچھ بھی تو نہیں کرتی۔ شہر سے تقی بھیا کتابیں بھیج دیتے ہیں کچھ پڑھ لیتی ہوں مگر کتابوں پر تو نہیں جیا جا سکتا۔''

کچھ وقفے کے بعد عالمہ پھر بولی ''ہاں یہاں بیٹھ کر دوپہریں کاٹی جا سکتی ہیں، یہ بلندی، وہ پہاڑ، وہ نیچے بہتی ہوئی ندیاں، یہ خاموشی، یہ تنہائی کافی سکون بخش ہیں۔''

''آپ ولی پور کیوں نہیں چلی آتیں۔ اس دور دراز کے گاؤں میں پڑی پڑی آپ کیا کریں گی۔ شہر میں دلچسپی کے سب سامان ہیں'' فردوس نے پیار بھرے لہجے میں کہا۔

''میں اس گاؤں کو کیسے چھوڑ دوں۔ میری تمام خوشیاں، تمام یادیں، میرا سب کچھ تو یہاں ہے۔ پھر میں آغا جی کو بھی تو نہیں چھوڑ سکتی۔''

''آغا جی کو چھوڑنے کا کیا سوال ہے۔ آپ سب لوگ ولی پور اٹھ آئیے نا۔ کاروبار کے لیے راہیں کھلی ہیں۔ اچھے اچھے ڈاکٹر ہیں۔ آپ وہاں علاج بھی کرا سکتی ہیں۔''

''مگر آغا جی تو شہر نہ جائیں گے۔ وہ اس دھرتی سے، اس آسمان سے دور، اپنے مزارعوں سے، ان کی باتوں سے، ان کے قہقہوں سے، ان کی داستانوں سے دور، کھیتوں

سے،فصلوں سے، گیہوں کی بالیوں پر بیٹھی ہوئی چڑیوں کی چہچہاہٹ سے دور رہ کر تو وہ دنوں میں ختم ہو جائیں گے۔ان کے جسم کا،ان کی روح کا، یہاں کی بو باس سے ایک ایسا رشتہ قائم ہے کہ اب صرف موت ہی اس کو توڑ سکتی ہے۔ میں ان کی لئے موت کا پیغام بننا کبھی بھی گوارانہیں کرسکتی۔

ان کے لئے یہ دھرتی زندہ ہے۔ان سے کلام کرتی ہے اور دھرتی کے بیٹے بیٹیاں انہیں اپنے ہی جسم اور روح کا ایک لازمی حصہ نظر آتے ہیں......اس لیے میں شہر نہیں جاسکتی چاہے وہاں سے راحت اور مسرت کے سفر کی پہلی منزل ہی کیوں نہ شروع ہوتی ہو'۔

عالمہ چپ ہوگئی۔سب چپ تھے۔کسی کو الفاظ کی گونج سے بنے ہوئے طلسم کو توڑنے کی جرأت نہ تھی۔ عالمہ کے الفاظ کی گونج سے ہوا بھی تھرتھرا رہی تھی۔اس کے الفاظ متین صاحب کی پہنائیوں میں اتر گئے تھے۔شور کر رہے تھے۔شور نغمے کی صورت میں ڈھل رہا تھا۔ان کا جی چاہنے لگا تھا کہ وہ سب کے سامنے عالمہ کے سر پر ہاتھ رکھ دیں مگر ان کے ہاتھوں میں جان ہی نہ رہی تھی۔انہوں نے بے بسی کے عالم میں فردوس کی طرف دیکھا۔تقی کی طرف دیکھا۔دونوں نظریں جھکائے کسی سوچ میں کھوئے تھے۔ عالمہ کی طرف دیکھا تو اس کی آنکھیں بند تھیں۔اس کے چہرے پر دمکتی ہوئی سرخی تھی۔اس کا تمام جسم ساکت تھا۔ متین صاحب کی آنکھوں کے سامنے عالمہ کا جسم دھندلانے لگا۔تحلیل ہونے لگا۔ رنگ ہونے لگا۔متین صاحب اس رنگ ہونے کے منظر کی تاب نہ لا سکے۔منہ پھیر لینا چاہا نہ پھیر سکے۔ عالمہ رنگ ہی رنگ تھی۔ رنگ فضا میں گھلنے لگا۔ پھیلنے لگا۔ان کے اپنے سانس کی آواز اس رنگ میں گم ہوگئی۔انہوں نے بڑی کوشش کے بعد اپنا دایاں ہاتھ اٹھا کر دل پر رکھا۔دل کی حرکت بھی گم تھی۔وہ بہت گھبرائے۔اٹھنا چاہا۔نہ اٹھ سکے اور اسی کش مکش میں وہ ہوش وحواس کھو بیٹھے۔

ان کی اس حالت کا کسی کو پتہ نہ چلا۔ان کی آنکھیں بند تھیں۔ان کی سانس برابر چل رہی تھی۔ان کے سینے کا زیر وبم یکساں تھا۔کسی کو تشویش نہ ہوئی۔سورج ڈھلتا رہا۔کرنیں ٹیرس سے پسپا ہونے لگیں۔

فردوس ایک دم اٹھ کھڑی ہوئی۔ سب کی طرف دیکھا۔ عالمہ سو رہی تھی۔ متین صاحب سو رہے تھے۔ تقی کی آنکھیں کھلی تھیں مگر وہ کسی سوچ میں غرق تھا۔ فردوس آہستہ آہستہ قدم اٹھاتی ہوئی تقی کی طرف بڑھی۔ مگر تقی نے جنبش تک نہ کی۔ فردوس بڑھتی ہوئی اس کے عین سامنے، اس کے اور دھوپ کے درمیان جا کھڑی ہوئی۔ سایہ پڑتے ہی تقی سوچ سے جاگا، پلکیں اٹھائیں۔ فردوس کے چہرے کی طرف دیکھا۔ فردوس نے ہونٹوں پر انگلی رکھتے ہوئے آنکھوں سے اٹھنے کا اشارہ کیا۔ تقی اٹھ کر فردوس کے ساتھ ٹیرس سے نکل کر کمرے میں داخل ہو گیا۔ اور پھر وہ کمرے سے نکل کر دوسرے برآمدے میں نکل آئے۔

''دھوپ کافی ڈھل چکی ہے۔ میں ذرا اپنے گھوڑوں کو دیکھ آؤں۔ روز اس وقت دیکھنے جاتی ہوں۔ میرا انتظار کرتے ہونگے......

مجھے گھوڑوں سے بہت فرحت ملتی ہے۔ ان کے چمکتے ہوئے جسم، ان کی اطمینان بھری طاقت یا وفا بھری آنکھیں۔ میرے لئے تو اب زندگی کا یہی سہارا رہ گیا ہے......

چلو تمہارا اپنے گھوڑوں سے تعارف کراؤں۔''

نواں باب

ٹیرس سے دھوپ عرصہ ہوا جا چکی تھی۔ ہلکی ہلکی ہوا چلنے لگ گئی تھی۔ ٹھنڈ بھی ہو چلی تھی۔ عالمہ اور متین صاحب اپنی اپنی کرسیوں پر سو رہے تھے۔ ٹھنڈ ان کی ہڈیوں میں سرایت کرنے لگی تھی۔ ان کے جسموں میں ایک تھرتھری پیدا ہوئی اور دونوں ایک ہی جھٹکے کے ساتھ اٹھ کھڑے ہوئے اور اپنے آپ کو یہیں پا کر بڑے حیران ہوئے اور ایک دوسرے کو تکنے لگے۔

کمرے کی طرف بڑھے۔ وہاں کوئی نہ تھا۔ کمرہ، کمرے کی چیزیں سب کی سب محوِ خواب تھیں۔ دونوں ٹیرس کی طرف لوٹ آئے اور ٹیرس کے جنگلے کے پاس کھڑے ہو کر پہاڑوں کی طرف دیکھنے لگے۔

نیچے وادی میں ابھی دھوپ تھی۔ ندیوں کے درمیان کی زمین پر دھندسی چھائی تھی۔ ندیوں سے جھالا اٹھ رہا تھا۔ جھالے کی بوندیں دھوپ میں چمک رہی تھیں۔ وادی بھی سوئی ہوئی تھی۔ عالمہ نے جنگلے کا سہارا لے کر ٹیرس کی طرف منہ کر کے پوچھا۔''

''کہاں چلے گئے ہیں یہ لوگ؟''

''آتے ہوئے تم نے سڑک کے اس پار گھوڑوں کا فارم تو دیکھا ہی ہوگا؟ وہاں ہونگے۔فردوس صبح، شام وہاں جاتی ہے اور کچھ گھوڑوں کو اپنے ہاتھ سے دانہ کھلاتی ہے۔ دانہ کھلاتے ہوئے اس پر ایک کیف کا عالم ہوتا ہے۔ معلوم ہوتا ہے آج کل اسے اس کیف کی بہت ہی ضرورت ہے۔''

'کیف' کے لفظ کی صدا کے ہوا میں پھیلتے ہی عالمہ کے چہرے پر ایک سایہ سا تیر گیا اور اس کی آنکھوں کے بلوریں دیس میں بھنور اترنے لگے، اس کے جسم پر بے حسی طاری ہونے لگی۔ ہوا اس کے بالوں، اس کے دوپٹے سے کھیل رہی تھی۔ اس کے دوپٹے کے پلو ہوا میں لہرانے لگے۔ اس کے پرسکون جسم پر لہراتے ہوئے پلو خاموش، پرسکون فضا میں حرکت کا پتہ دے رہے تھے مگر عالمہ اس حرکت سے بے خبر نہ جانے کہاں کہاں بھٹک رہی تھی۔

متین صاحب عالمہ کی اس بے حسی، سکون، اداسی سے بے چین ہوکر بولنے لگے۔ ''فردوس کو تقی کی ضرورت ہے اور تقی کو فردوس کی۔ مگر دونوں کو اس بات کا احساس نہیں۔ حیرانی یہی ہے کہ ایسا کیوں ہے۔ دونوں ایک دوسرے سے مدت سے آشنا ہیں عرصہ تک ایک ہی گھر میں رہتے رہے ہیں۔''

عالمہ چونکی۔ اس کے پپوٹے پھڑ پھڑائے، اس کی آنکھوں میں بھنور اترنے کی بجائے ابھرنے لگے۔ اس کے جسم میں شدید کپکپی جاگ اٹھی۔ اس نے ہاتھ اٹھائے اور سینے پر باندھ لئے مگر کپکپی تھی کہ تھمنے کا نام ہی نہ لیتی تھی۔ وہ بولنا چاہتی تھی مگر اس کے ہونٹ تھرتھرا کر بند ہو ہو جاتے تھے۔ اس کی آواز اس کے سینے سے ابھرنے کا نام ہی نہ لیتی تھی۔ وہ پریشان ہوگئی۔ اس کی آنکھوں سے فریاد اٹھنے لگی۔

متین صاحب اس کی طرف بڑھے اور اس کے شانے پر ہاتھ رکھ لیا اور اس کو آہستہ آہستہ چلاتے ہوئے کمرے کی طرف لے چلے۔ عالمہ چپ چاپ، بغیر جھجکے، ان کے ساتھ چلنے لگی۔ کمرے میں پہنچ کر متین صاحب نے اس کے شانے سے ہاتھ اٹھالیا اور بازو پکڑ کر عالمہ کو ایک آرام کرسی کے پاس لے گئے اور اس کے دونوں شانوں پر ہاتھ رکھ کر اسے کرسی پر بٹھادیا اور خود ایک اور کرسی کو کھینچ کر اس کے مقابل بیٹھ گئے مگر عالمہ اب بھی کانپے جارہی تھی۔ متین صاحب بڑی دلچسپی سے اس کو کانپتے ہوئے تکتے رہے، تکتے رہے۔

عالمہ تھرتھراتے ہوئے دوہری ہوئی جارہی تھی۔

متین صاحب کرسی سے فوراً اٹھے۔ ادھر ادھر دیکھا۔ ایک کونے میں ایک کرسی کی کمر پر گرم چادر پڑی تھی۔ اٹھالائے اور اس کو چادر میں لپیٹ دیا اور خود سامنے آکر بیٹھ گئے۔

متین صاحب کے سامنے کی دیوار پر موٹے موٹے ریشمی پردے لٹک رہے تھے۔ وہ سوچنے لگے کہ اس دیوار پر پردے کیوں؟ انہی کے سوال کے جواب میں شاید پردے ایک دم دمکنے لگے۔ پردوں میں دمک بڑھنے لگی اور ساری دیوار کی دیوار دمک اٹھی۔ وہ حیران تھے کہ آخر اس دیوار کے پیچھے کیا ہے۔ ان سے نہ رہا گیا اور اٹھے اور دیوار کی طرف بڑھے۔ قریب جا کر پردہ سرکایا تو دیکھا کہ دیوار میں فرش سے چھت تک شیشے لگے تھے۔ انہوں نے اِدھر اُدھر غور سے دیکھا۔ ایک کونے میں ریشمی رسی لٹک رہی تھی۔ انہوں نے اس کو کھینچا تو دیوار سے پردہ سمٹ گیا اور دھوپ کمرے میں در آئی۔ اس طرح انہوں نے دوسرے کونے سے اسے کھینچ کر دیوار کے دوسرے نصف سے بھی پردے سمٹا دیئے۔ اب کمرے کے نصف تک دھوپ ہی دھوپ تھی۔ عالمہ کے سامنے والی دیوار روشن ہوگئی اور اس نے مڑ کر دیکھا۔ متین صاحب اس کی طرف دیکھ رہے تھے۔

''پہلے پتہ ہوتا تو یہیں دھوپ میں بیٹھتے۔ میں کرسیاں یہاں بچھائے دیتا ہوں۔''

متین صاحب نے کرسیاں دھوپ میں بچھا دیں اور عالمہ چادر لپیٹے دھوپ میں جا بیٹھی۔ دھوپ سے اس کی چادر میں گرمی جاگنے لگی عالمہ کی ریڑھ کی ہڈی میں ایک برفیلی رو سن سے دوڑ گئی۔ اس رو نے اسے عجیب ہی لطف دیا اور اس لطف سے اس کی آنکھوں میں،

اس کے چہرے پر سرخی آ گئی۔ کچھ دیر تو وہ اپنے آپ پر قابو پانے کی کوشش میں مصروف رہی اور اسے گرمی کی شدت کا احساس نہ ہوا مگر کچھ دیر بعد اس کو گرمی لگنے لگی۔ اس کے ماتھے پر پسینہ آ چلا تھا۔ اس نے شانوں کی جنبش سے چادر سرکا دی اور بازو گود سے اٹھا کر کرسی کے بازوؤں پر رکھ دیئے۔

متین صاحب نظریں جھکائے بیٹھے تھے مگر عالمہ کی حالت سے بے خبر نہ تھے۔ وہ کن آنکھیوں سے عالمہ کو تک رہے تھے۔ گرمی سے عالمہ کا سکڑا ہوا جسم کھلنے اور پھیلنے لگا تھا۔ اس کی سانس متوازن ہونے لگی تھی۔ اس کے سینے کے اتار چڑھاؤ میں ایک لے کی کیفیت آ گئی تھی۔ اس کے ہاتھوں کی پشت پر سرخی دوڑ رہی تھی۔ اس نے سمٹی ہوئی ٹانگوں کو دھوپ میں پھیلا دیا اور ایک لمحے بعد اس کے جسم میں ذرا سا اکڑاؤ پیدا ہوا۔ اس نے ہاتھ اٹھا کر دوپٹے سے سر ڈھک لیا۔

''فردوس کو میں نے پہلے بھی ایک بار دیکھا تھا۔ تب وہ اپنے والد کے ساتھ شکار کے لئے آئی تھی۔ اس وقت اس کے چہرے پر خوشی تھی، اطمینان تھا۔ مگر اب؟ میں ابھی تک فیصلہ نہیں کر پائی کہ اس کیفیت کو کیا کہوں جو میں اس کے جسم کے، چہرے کے کنایوں میں چھپی دیکھتی ہوں۔ کوئی دکھ ہے جو اس کو اندر اندر کھائے چلا جا رہا ہے۔ کئی بار میرا دل چاہا کہ اسے لپٹا لوں اور اس کے ماتھے کو چوموں اور پوچھوں کہ تمہیں کیا دکھ ہے مگر رکی کہ اگر اس نے دکھ بتا دیا اور میرے پاس اس کا مداوا نہ ہوا تو۔ کیا واقعی اس کے دکھ، اس کے درد کا کوئی مداوا نہیں؟ اگر ہے تو کس کے پاس؟...... آپ تو طبیب بھی ہیں اور فلسفی بھی۔ تقی کہتے تھے کہ آپ دل کی دھڑکنوں سے دل کا راز جان لیتے ہیں۔ آپ ہی تو کچھ کیجئے نا۔''

متین صاحب مسکرائے۔ ''اس کے درد کا علاج تو تقی کے پاس ہے اور اس وقت تقی اس کے پاس ہے۔ میں تو صرف وہ راہ ہوں جہاں سے ہو کر وہ اس مقام پر پہنچ سکیں گے جہاں وہ ایک دوسرے کو پہچان لیں گے۔ تمہیں فردوس کے متعلق فکر کرنے کی ضرورت نہیں۔ سوچ کی تمام صلاحیتوں کی تمہیں خود اشد ضرورت ہے۔ تمہارے درد کا، تمہارے دکھ کا مداوا تمہارے اپنے سوا کسی کے پاس نہیں...... تمہیں شہر ضرور جانا ہوگا۔ یہ زمین، یہ

آسمان، یہ درخت، یہ وادی، یہ پرندے، یہ چرندے سب چھوڑنے ہونگے۔''

''مگر کیوں؟ ماں باپ کیوں چھوڑوں، میرے آغا جی تو میرے بغیر جی نہ سکیں گے۔ ان کا تو سب کچھ یہی ہے۔ وہ شہر جا کر کیا کریں گے۔ ان کو شہر کا شور پسند ہی نہیں۔ اس شور میں تو وہ گھٹ جائیں گے۔ میں اتنے گناہوں کا بوجھ نہیں اٹھا سکتی۔ مر رہونگی مگر ایسا نہ کرونگی''

''حالات اتنے المناک نہیں ہیں۔ آخر تمہاری شادی بھی تو وہ کرتے ہی اگر تم بیمار نہ ہو جاتیں۔ تم کو ان سے دور جانا ہی ہوتا۔ وہ اکیلے رہ جاتے۔ پھر بھی تو کچھ کرتے۔ کسی طرح تو زندگی گزارتے۔ اپنے آپ کو اس خیال کے ساتھ ہم آہنگ کرنے کی کوشش تو کرو کہ تمہیں ماں باپ سے دور اجنبی شہر جانا ہے، وہاں رہنا ہے، زندگی بنانا ہے، اپنے دکھ کا مداوا کرنا ہے۔ وہاں اسے ڈھونڈنا ہے جو تمہیں ہر سطح پر بھرپور کر سکے۔ میں کہتا ہوں تمہاری زندگی اب شہر میں ہی بیتے گی۔ تمہیں جانا ہی ہوگا۔''

عالمہ کے کانوں نے متین صاحب کی گونجتی ہوئی آواز کو ابھرتے، پھیلتے ہوئے محسوس کیا۔ اس آواز کے معنی نے اس کے ذہن میں بار بار جنم لیا۔ بڑھے، پھلے پھولے۔ اس کے خون نے بھی ان کو قبول کیا۔ معنی کے خون میں حل ہوتے ہی اس کے جسم میں اس زور کی ٹیس اٹھی کہ اس کے کان شل ہو گئے، اس کا سینہ تنگ ہونے لگا۔ اس کی سانس اپنی لے کھونے لگی۔ اس کا دماغ آگ بننے لگا۔ وہ کانپنے لگی۔ اس کے ہونٹ تھرتھرانے لگے۔ اس کے ہاتھ بے چین ہو گئے۔ اس نے ایک ہاتھ میں دوسرے کو دبوچ لیا۔ ٹانگوں کو اکٹھا کر لیا۔

اس کو یوں کانپتے تلملاتے دیکھ کر متین صاحب اٹھے۔ اس کی کرسی کے پیچھے آکر انہوں نے گری ہوئی چادر ایک بار پھر اس کے کندھوں پر ڈال دی۔ مگر عالمہ کانپے چلی جا رہی تھی۔ انہوں نے دونوں ہاتھ اس کے شانوں پر رکھ دیئے۔ ان کے ہاتھ اس کے شانوں پر پڑے رہے۔ وہ یونہی کھڑے رہے۔

کمرے کے باہر قدموں کی چاپ گونجنے لگی۔ ان کی طرف بڑھنے لگی۔ بڑھتی چلی

آئی۔ عالمہ کے کانپتے ہوئے شانوں میں سکون آ گیا۔ اس کا جسم نرم پڑ گیا۔ اس کی گردن مڑی اور اس نے اپنے مہرے کو کرسی کی پٹی سے لگا دیا۔ اس کے پپوٹے اس کی آنکھوں پر جھک گئے۔ متین صاحب نے اس کے شانوں سے ہاتھ ہٹا لیے اور وہاں سے ہٹ کر اپنی کرسی پر دراز ہو گئے۔ قدموں کی چاپ اب بالکل کمرے کے قریب آ کر رک گئی۔

دسواں باب

''لمبے لمبے سانس کیوں لے رہی ہو؟ تمہارا چہرہ بھی تمتما رہا ہے تمہارے تو قدم بھی نہیں اٹھتے۔ بیمار بھی معلوم نہیں ہوتی۔ آخر بات کیا ہے؟ میں پچھلے پندرہ منٹ سے منتظر ہوں کہ تم کچھ کہو گی۔ مگر تم ہو کہ تمہاری آواز گم ہے۔ تمہارا ذہن کہیں ہے، تمہارا دل کہیں، تمہارا ہر عضو دوسرے اعضا سے بے خبر...... فردوس! فردوس! کچھ تو بولو! آواز ہی نکالو!''

''تقی میاں! بے تاب کیوں ہوتے ہو؟ کچھ دیر اور توقف کرو۔ میں حواس جمع کر لوں۔ اپنی حالت کو نام دے لوں۔''

تقی اور فردوس چپ چاپ چلتے رہے۔ تقی اپنے حواس سے باخبر مگر گرد و پیش سے بے خبر۔ فردوس کے نقوش، اس کے اعضا کی حرکات آپس میں ہم آہنگ نہ تھے۔ وہ بس ایک مشین تھی جس میں کوک ختم ہوا چاہتی تھی۔ اس کے قدم ایک مدھم مگر بھاری بھرکم آواز سے، ایک ہی رفتار سے، زمین پر آ رہے تھے اور اٹھ رہے تھے۔ اسے یوں محسوس ہو رہا تھا کہ فرشتہ اس کی روح نکال کر لے گیا ہے مگر اس کے جسم کو قبر تک چل کر خود ہی جانا ہوگا۔ موت کے خیال سے اس کے ذہن کو ایک دھچکا لگا۔ اس کی چال کو جھٹکا لگا۔ اس نے غور سے اپنے پاؤں کو دیکھا، زمین کو دیکھا۔ زمین ہموار تھی۔ اس پر کوئی پتھر نہ تھا۔ اس کے ہونٹوں پر ایک پھیکی، بے سدھ مسکراہٹ نمودار ہوئی۔ اس کے ماتھے پر ذراسی شکنیں پیدا ہوئیں۔ اس کی آنکھوں میں حیرانی اور شعور گھل ملنے لگے۔ اس نے اپنا بایاں بازو اٹھایا، کلائی سے ماتھے کا پسینہ پونچھا اور پھر اس کا بازو اپنے بوجھ سے گر گیا۔ فردوس نے ایک گہرا اور بہت ہی لمبا

سانس لیا۔ اس کا سینہ پھڑ پھڑایا۔ اس کے سینے کے لباس کے خشک حصے گیلے ہو گئے۔ اس کے شانے سکڑے، اس کی گردن سینے کی طرف جھک گئی۔ اس کی ٹانگیں لڑکھڑانے لگیں۔ اس کے قدم الٹے سیدھے پڑنے لگے۔ اس کے ہونٹ کئی بار کھلے مگر آواز نہ نکلی۔ اس کے ہونٹ ایک بار پھر کھلے اور وہ کراہی "تقی ٹھہرو۔ مجھے کندھا دو"

تقی چونکا، مڑا۔ اس نے دیکھا کہ فردوس لڑکھڑا رہی ہے۔ وہ جلد جلد قدم اٹھاتا اس کے پاس پہنچا۔ فردوس نے اپنے دونوں ہاتھ اس کے شانوں پر رکھ دیئے۔ اس کے ہاتھ پھسلنے لگے۔ اس نے دونوں ہاتھ تقی کی گردن کے پیچھے جکڑ لیے۔ اس نے ایک لمبا سانس لیا۔ اس کے بکھرے ہوئے نقوش جمع ہونے لگے۔ اس کی سانس میں ترنم آنے لگا۔ اس کی آنکھوں سے تشکر ڈھلکنے لگا۔ اس کی بانہوں میں طاقت لوٹنے لگی۔ اس کی بانہوں کا بوجھ تقی کے شانوں پر کم ہونے لگا۔

فردوس لمبا سانس لیتے ہوئے بولی "اب میں ٹھیک ہوں۔ مگر تمہارے کاندھے پر ہاتھ رکھ کر چلونگی......آؤ چلیں۔"

کچھ دیر فردوس تقی کے کندھے پر دایاں بازو رکھے چلتی رہی۔ اس کے قدموں میں اعتماد آ چلا تھا۔

"تمہارے متین صاحب کے پاس بیٹھتے ہی دل میں، جسم میں، دماغ میں ایک عجیب سا احساس پیدا ہو جاتا ہے...... جیسے جسم میں بہت سا خون داخل ہو رہا ہو یا...... کوئی نیا عضو پیدا ہو گیا ہو اور اس کا استعمال نہ آتا ہو۔ دل بیٹھتا نہیں، اچھلتا نہیں، بلکہ پھیلتا ہوا محسوس ہوتا ہے۔ سینہ تنگ ہونے لگتا؛ جسم کی ہر شے فالتو لگنے لگتی ہے، جی چاہنے لگتا ہے کہ جسم میں دل کے سوا کچھ نہ ہو۔ پھر دل، پھیلتا ہوا دل، خون بن جاتا ہے اور خون اتنی تیزی سے دوڑنے لگتا ہے جسم کے ذرے پگھلتے ہوئے دکھائی، ہاں دکھائی، دینے لگتے ہیں۔ متین صاحب سے دور بھاگ جانے کو جی چاہتا ہے مگر اکیلے میں ان کے سایہ کے خیال سے جسم میں حظ، دل میں خوشی، دماغ میں حدّت سی جاگنے لگتی ہے؛ نگاہیں ان کو ڈھونڈتی ہیں۔ جب متین صاحب کو دیکھو تو ان کا مطمئن چہرہ، ان کا پرسکون جسم، ان کی روشن پیشانی، ان کی

گہری اور شفاف آنکھوں میں آرزو کا نشان تک نہیں ملتا۔ آخر وہ مجھ سے کیا چاہتے ہیں؟...... یا میں ان سے کیا چاہتی ہوں؟...... میں نے بہت دکھ سہے ہیں، جسم و جاں کئی بار تھک تھک کے چور ہوئے ہیں۔ ذہن ڈر سے، خوف سے کتنی بار مفلوج ہوا ہوگا۔ دل میں تخریب کی خواہش کتنی ہی بار چھائی ہوگی۔ مگر یوں نزع کی سی کیفیت تو کبھی محسوس نہیں ہوئی''

فردوس بولتے بولتے ہانپنے لگی۔ اس کا چہرہ شعلہ سمان ہو گیا تھا۔ وہ چلتے چلتے رک گئی تھی۔ اپنے کہے کے معنی اب اس پر کھل رہے تھے۔ اس کے ذہن کا ایک حصہ بالکل بیدار ہو چکا تھا مگر ایک حصہ حیرانی میں گم ہو گیا تھا۔ وہ چاہ رہی تھی کہ تقی فوراً بولنا شروع کر دے تاکہ وہ اپنے کہے کے معنی سے پوری طرح آشنا ہونے میں کچھ توقف کر سکے۔ مگر تقی چپ تھا، گم تھا۔ وہ کئی بار فردوس کے چہرے کو دیکھنے کے لئے نگاہیں اٹھانے کی کوشش میں ناکام ہو چکا تھا۔ اس کی نگاہیں فردوس کے ساکت ہاتھوں پر جمی تھیں جو رانوں کے ساتھ سمٹے لگے تھے کہ بچے تھے جنہوں نے شرارت کے بعد ماں کے دامن میں پناہ ڈھونڈ لی ہو۔ یکا یک ہاتھوں میں ارتعاش پیدا ہوا۔ فردوس کا دایاں ہاتھ اٹھا تقی کے شانے کو چھوتے ہوئے اس کی گردن تک گیا۔ ہاتھ کچھ دیر گردن میں حمائل رہا پھر فردوس نے تقی کے بالوں سے آہستہ، بالکل آہستہ آہستہ، کھیلنا شروع کر دیا۔ اس ہاتھ کی حرکت سے اس کا ذہن بیدار ہونے لگا، اس کے دل میں جرأت پیدا ہوئی، اس نے نظریں اٹھائیں۔ فردوس کے چہرے کی دمک کی تاب نہ لا سکا اور نظریں جھکا لیں۔ کچھ وقفے کے بعد نظر جو اٹھائی تو فردوس کے ہونٹوں پر اداسی چھائی تھی، اس کی آنکھوں میں روشنیاں مدھم ہو رہی تھیں، اس مدھم ہوتی ہوئی روشنی میں آنکھوں میں جھلکتے ہوئے جذبات بہت ہی بھلے معلوم ہو رہے تھے۔

تقی کا دل چاہا کہ فردوس ننھی سی ہوتی تو وہ اسے کاندھے سے لگائے رات کی تنہائی میں لوریاں دیتے دیتے سلا دیتا۔ اس خیال کی بے بسی کے سبب اسے اپنے آپ پر رحم آنے لگا۔ فردوس کا ہاتھ نہ تھا۔ اس نے مڑ کر دیکھا۔ فردوس اس سے چند قدم پیچھے پر اعتماد قدموں سے چلی آ رہی تھی۔ سڑک سیدھی جاتی ایک دم بائیں مڑ گئی۔ مڑتے ہی سامنے فارم کے جنگلے

کی نوک دار، چوڑی چوڑی، خم دار سلاخیں ابھرنے لگیں۔ گھوڑوں کے دوڑنے کی آواز آنے لگی۔ سڑک اب اوپر چڑھنے لگی جوں جوں وہ چڑھتے جاتے فارم کے حصے پستی سے ابھرنے لگے۔ سڑک کے قریب ترین جنگلے کے پاس کچھ گھوڑے ساکت اور گردنیں جھکائے کھڑے تھے۔ ان کے سفید، سفید بادامی، کالے، بادامی جسم، ان کے جسم پر پسینے کے قطرے، ڈوبتے سورج کی روشنی میں چمک رہے تھے۔ پسینے سے تقی نے قیاس کیا کہ شاید کچھ دیر پہلے تک یہ گھوڑے سبزے پر دوڑ رہے تھے۔ یکا یک گھوڑوں کے کان کھڑے ہوئے، ان کی گردنیں بلند ہوئیں۔ ان کی آنکھوں میں چمک صاف نظر آنے لگی۔ تقی نے کن انکھیوں سے فردوس کو دیکھا تو وہ گردن نیہوڑائے چلی آ رہی تھی، اب وہ بھی گھوڑوں کی حدِ نظر میں تھی۔ گھوڑوں کی اگلی رانوں میں جنبش پیدا ہوئی اور وہ زور سے ہنہنائے۔ تقی باوجود یکہ گھوڑوں پر نظریں جمائے تھا، گھوڑوں کے ایک دم ہنہنانے سے چونکا۔ تقی نے فردوس کی طرف دیکھا۔ اس نے گردن سیدھی کر لی؛ اس کی آنکھوں میں حیرانی تھی، ایک چمک ابھرنے لگی تھی، اس کے جسم میں ارتعاش پیدا ہو گیا تھا۔ وہ ایک لمحے کے لئے رکی، اس کا جسم ساکت ہوا اور اس کے فوراً بعد وہ دوڑنے لگی۔ دوڑتی ہوئی سڑک سے نیچے اتر گئی، فارم کے جنگلے کے ساتھ بائیں مڑی، رکی، ہاتھ جنگلے کی طرف بڑھایا، پھر شاید ارادہ بدلا اور وہ ایک بار پھر دوڑی اور دوڑتی ہوئی جنگلے کے دروازے سے فارم میں داخل ہوئی۔ اتنے میں گھوڑوں نے بھی اپنا رخ جنگلے کی دروازے کی طرف پھیر لیا تھا اور وہ دوڑنے لگے۔ گھوڑے اور فردوس ایک دوسرے کے عین سامنے پہنچ کر ایک دم رکے۔ ایک لمحے کے لئے فردوس گھوڑوں کے درمیان چھپ گئی۔ تقی نے سمجھا کہ وہ گھوڑوں کے نیچے آ گئی ہے۔ اس کے منہ سے ایک چیخ نکلی اور وہ بھی ان کی طرف بھاگنے لگا۔ اس چیخ سے گھوڑوں نے اپنی گردنیں موڑ کر اس کی طرف دیکھا۔ ان کی گردنیں مڑیں تو تقی نے دیکھا کہ فردوس ایک سفید، بھورے رنگ کے گھوڑے کو پیار کر رہی تھی۔ اس نے رکنا چاہا مگر وہ جنگلے کے دروازے تک بھاگتا چلا گیا۔ اسے پریشان دیکھ کر فردوس مسکراتے ہوئے کہنے لگی۔

''گھوڑے ہیں انسان نہیں کہ دوست کو پہچانیں نہیں اور روندتے ہوئے چلے

جائیں۔‘‘

گھوڑوں کی گردنیں جیسے فردوس کی بات کو سمجھتے ہوئے تن گئیں اور وہ تقی کی طرف متعجب نظروں سے دیکھنے لگے۔ تقی کھڑے کا کھڑا ان گھوڑوں کو، کچھ پہلے مضمحل مگر اب بشاش فردوس کو، حیرت سے مسلسل تکے جا رہا تھا۔

’’سکتہ پڑ جائے گا یوں کھڑے کھڑے۔ اپنی جگہ سے ہلو! رکھوالے سے کہو کہ ان کا دانہ لے آئے۔ فردوس نے ہنستے ہوئے، پیار بھری آواز میں کہا۔

تقی مڑا اور جنگلے سے دور ایک یک منزلہ عمارت کی طرف چل دیا۔

فردوس باری باری ہر گھوڑے کے منہ، گردن اور جسم پر ہاتھ پھیرتی رہی، تھپکتی رہی۔ گھوڑوں نے آہستہ آہستہ اس کے گرد حصار بنا دیا اور گردنیں بڑھا بڑھا کر اس کی گردن کو چومنے کی کوشش کرنے لگے۔ فردوس ہنستے ہنستے ان کو منع کرتی، ان کے نتھنے تھپکتی رہی۔

’’بس بس! مان لیا۔ ہم سے غلطی ہوئی۔ دیر سے آنے کی معافی۔ ہوں؟ کل سے دیر نہیں ہوگی۔ وعدہ رہا۔ ہوں؟‘‘

گھوڑے حصار توڑتے ہوئے فردوس کے سامنے ایک لائن میں کھڑے ہو گئے اور انہوں نے گردنیں جھکا لیں۔ شرمسار ہو رہے تھے۔ اس کے ہاتھوں کی طرف دیکھ رہے تھے۔ فردوس نے فیصلہ کرنا پسند نہ کیا۔ مگر ہنستے ہوئے ان سے مخاطب ہوئی۔

’’تقی میاں گئے ہیں۔ مندر خان تمہارا دانہ لاتا ہی ہوگا۔‘‘

گھوڑوں نے احتجاجاً گردنیں بلند کیں۔ ان کی آنکھیں شکایت کر رہی تھیں۔

فردوس نے بھورے سفید گھوڑے کے کانوں سے کھیلتے ہوئے پیچھے مڑ کر دیکھا تو تقی بالٹی اٹھائے چلے آ رہا تھا۔ تم کیوں اٹھا لائے وہ خود لے آتا‘‘۔

’’وہ لاتا تو مخل ہی ہوتا‘‘

فردوس کا ماتھا سکڑا اور وہ کھلکھلا کر ہنسی۔ ’’شکریہ ادا کروں اس عزت افزائی کا؟‘‘

فردوس بالٹی سے دانہ نکال نکال کر ایک ایک کو کھلاتی رہی اور کن انکھیوں سے تقی کو تکے

جاتی تھی کہ شاید کچھ کہے مگر تقی نہ بولا۔ اس کی آنکھیں خود سوال بنی ہوئی تھیں کہ آخر یہ گھوڑے، یہ دانہ، یہ کھلکھلانا، وہ بے بسی؟ آخر کس طرح کا تسلسل ہے؟

''تقی! ان گھوڑوں کی آنکھوں کو غور سے دیکھو۔ ہم انسان جو کچھ ایک پوری کتاب میں بھی نہیں کہہ پاتے یہ اس سے بہت کچھ زیادہ ان آنکھوں سے کہہ جاتے ہیں۔ ایک بار نہیں، اکثر ہی نہیں، بلکہ ہمیشہ۔ یہ آنکھوں کی زبان کتنی پُر اثر ہے۔ کبھی انسان بھی تو اس کا اہل تھا۔ ہم نے زبان ایجاد کر کے اپنے اوپر شاید ظلم ہی کیا ہے۔ یہ جانور کائنات کے دل کی دھڑکنوں کے کتنے قریب ہیں۔ ہمیں کیا کچھ نہیں دیتے اور بغیر کسی مطلب براری کے۔

جب بھی ان کی آنکھوں میں دیکھتی ہوں مجھے اپنی بے صبری پر رحم آنے لگتا ہے۔ کائنات کے مطمئن چلن کا کتنا واضح عکس ان میں ہے، یہ میں ہی جانتی ہوں۔ تم بھی جان جاؤ گے اگر کبھی ان کی آنکھوں میں اتر جانے کی جرأت کرو اور کچھ دیر اپنے آپ کو ان کی گہرائیوں میں گم رکھو۔ کبھی یہ مخلوق آزاد تھی، اب ہماری منت کش ہے۔ اپنا دانہ پانی خود ڈھونڈ لینا ان کو بھول چکا ہے۔ کچھ اس طرح انسان بھی اپنے آپ کو بھول چکا ہے۔ کائنات کے ذروں میں اس کی روح کھوگئی ہے گرچہ اب انسان ان ذروں کا دل بھی ٹٹول سکتا ہے۔ میری ہی طرف دیکھو کچھ دیر پہلے موت کے دیس میں تھی۔ احساس تک نہ تھا کہ موت کے کتنے قریب تھی۔''

''یا زندگی کے کتنی قریب تھی؟''

''کیا مطلب؟''

''ہر انسان کی صلاحیتیں مختلف نوعیت کے نظاموں میں مشہود ہو سکتی ہیں اور ہر نظام ایک مختلف زندگی، ایک مختلف موت کو جنم دیتا ہے۔ اگر انسان جسم کی محرابوں میں سو نہ جائے، دہر کے صحراؤں میں کھو نہ جائے تو وہ اپنی حیاتِ ارضی میں اپنی صلاحیتوں کے اکثر امکانی نظاموں کو درجہ بدرجہ اپنے اندر سموتا چلا جا سکتا ہے۔ جب ایک نظام اگلے درجہ کے نظام میں جذب ہونے لگتا ہے تو نزع کی کیفیت پیدا ہو جانا قیاس سے بعید بات نہیں۔

ہر شخص کسی دوسرے شخص کے لئے اس قسم کی درجہ بدرجہ نئی زندگی اور موت کا سبب بن

سکتا ہے۔ متین صاحب اور تم کچھ اسی قسم کے انسان ہو۔ تمہیں ایک دوسرے سے کیا ملے گا اس کا اندازہ میں نہیں کرنا چاہتا۔ میں کچھ دیر اور انتظار کر سکتا ہوں۔ متین صاحب ہم لوگوں (میں عالمہ کو اپنے ساتھ شامل سمجھتا ہوں) کو نجانے کس عالم کی طرف لے جا رہے ہیں۔ اس عالم میں کون کس کا ساتھی ہوگا اس کا فیصلہ اس وقت تو نہیں ہو سکتا۔ مگر میں اتنا تو محسوس کر رہا ہوں کہ وہ لمحہ بہت ہی جلد آ رہا ہے جب ہم میں سے ہر ایک ایک نئے عالم کی انجانی راہوں پر اپنے اپنے ساتھی، اپنے اپنے زوج کو پہچاننے کی کوشش میں سرگرداں ہوگا۔

اور...... اُس عالم میں میں انجانی راہوں پر بے مراد......''

فردوس نے تقی کے ہونٹوں پر اپنے بایاں ہاتھ رکھ دیا۔ ''دکھوں کو آواز نہیں دیا کرتے؛ آ جائیں تو ان سے معزز مہمانوں کا سا سلوک کیا کرتے ہیں۔''

دن اب لڑکھڑا رہا تھا۔ اس کے خون کی بوندیں دھنش محل کے بڑے بڑے شیشوں کو لالہ زار کر رہی تھیں۔ گھوڑے بھی پریشان ہونے لگے تھے۔ فردوس نے دیکھا تو مندر خان لگامیں اٹھائے قریب آ چکا تھا۔

''میں ان کو لے جاؤں۔ ان کا اصطبل میں جانے کا وقت ہو چکا ہے...... خیر تو ہے بی بی! آج دیر سے آئیں آپ، بہت پریشان تھے یہ سب۔'' مندر خان بولا

''چلو بھئی اب چلیں'' فردوس نے دھنش محل کے شیشوں کو دیکھتے ہوئے کہا۔

''دیکھو ان شیشوں میں خون اتر آیا ہے۔ عالمہ پریشان ہو رہی ہوگی''

''ابھی تو وہ سو رہے ہونگے ٹیرس پر۔ کچھ زیادہ دیر تو نہیں ہوئی''

''دیر نہیں ہوئی! صدیاں بیت چکیں مجھ پر''

''صدیاں بیت چکیں'' تقی نے دوہرایا اور اس کے ہونٹ ہلتے رہے اور اس کی نگاہیں خلا میں نہ جانے کیا ڈھونڈنے لگیں۔

فردوس اس کا بازو پکڑے اسے دھنش محل تک کھینچتی لے گئی۔ ایک ناؤ تھی کہ لہریں اس کو بہائے لئے جاتی تھیں۔ دھنش محل پہنچے تو چھت دار برآمدے میں سے آتی ہوئی ٹھنڈی

ہوا نے تقی کو جگا دیا۔ چھت دار برآمدے میں ڈوبتے سورج کی آخری کرنوں نے ایک جالا سا بن رکھا تھا۔ اس جالے کی روشنی میں دیواریں، چھت تحلیل ہوتی نظر آ رہی تھیں۔ دونوں کے دلوں پر ایک ہیبت طاری ہونے لگی۔ جونہی وہ دائیں مڑے تو بڑے کمرے کا دروازہ کھلا تھا اور دروازے اور اس کے سامنے کی دیوار کے درمیان خون آلود روشنی پھیل رہی تھی۔ ان کو اپنے قدموں کی چاپ سے بھی ڈر آنے لگا اور ان کے قدم ایک دم رک گئے۔ ان میں سے کوئی بھی اس کمرے کے دروازے تک جانے کے لئے تیار نہ تھا۔

گیارہواں باب

کمرے کے باہر کھڑے کھڑے ان کا دم گھٹنے لگا۔ روشنی اور سرخ ہونے لگی۔ کمرے کے اندر سے دھیرے دھیرے سانس کی لے گونجنے لگی۔ فردوس کے لئے کھڑا رہنا عذاب ہو گیا۔ اس نے ہمت کر کے قدم اٹھائے اور کمرے کے اندر جھانکا۔ کمرے کی دیواریں غائب تھیں، چھت غائب تھی، سوائے سرخ روشنی کے کچھ نظر نہ آتا تھا۔ متین اور عالمہ کہاں تھے؟ اس کے کانوں میں سانس لینے کی لے مسلسل چلی آ رہی تھی جس سے اس کو یقین ہوتا چلا گیا کہ دونوں اسی کمرے میں ہیں مگر اس کی نگاہیں اُن کا سراغ نہ پا کر بار بار واپس لوٹ آتی تھیں۔ آخر اس کو اس سرخ سرخ روشنی کے بیچوں بیچ دونوں کے دھندلے سے نقوش جذب ہوتے معلوم ہوئے۔ شاید وہ دونوں کہیں جا چکے تھے۔ اب صرف ان کے سایے پیچھے رہ گئے یا سانس کی لے۔ وہ گھبرائی اور اس نے قدم بڑھائے اور سرخ روشنی اس کے آر پار ہو گئی۔ اس کے بدن نے ایک جھرجھری لی، اس کا دل چلتے چلتے ایک دم رک گیا، اس کا سانس اس کے گلے میں اٹک گیا، اس کا سارا لہو روشنی کے ذروں میں تحلیل ہونے لگا۔ سرخ، گہری سرخ، روشنی سیاہی میں بدلنے لگی۔ زمین و آسمان میں اندھیرا چھا گیا۔ فردوس اندھیرے میں نہ جانے کتنی صدیاں تیرتی رہی۔ اس کو ہوش آیا تو برآمدے سے روشنی پسپا ہو چکی تھی مگر کمرا اب بھی لہو آلود روشنی سے معمور تھا۔ کمرے کی ہر شے روشنی کے ذروں میں

اپنے آپ کو کھو چکی تھی۔

فردوس کا حلق خشک ہو رہا تھا۔ پانی پینے کے لئے وہ عمر خان کو آواز دینا چاہتی تھی مگر اس کی آواز کوشش کے باوجود گلے سے نکل ہی نہ رہی تھی۔ شاید اندھیروں میں گم ہو گئی تھی۔ اس نے تجربتاً قدم بڑھایا۔ وہ چل سکتی تھی۔ جلد جلد قدم اٹھاتی وہ باورچی خانے کی طرف بڑھی۔ آج باورچی خانہ بھی کوسوں دور ہو گیا تھا۔ وہ چل چل کر ہلکان ہو گئی اور باورچی خانہ تھا کہ آنے کا نام ہی نہ لیتا تھا۔ سوچنے لگی اس کمرے کے آگے کھانے کا کمرا ہے، اس کے ساتھ اس کی امی کا کمرہ، پھر برآمدہ دائیں ہاتھ مڑتا ہے، اس کے اپنے کمرے کی دیوار برآمدے کے ساتھ چلتی ہے اور اس کے ختم ہوتے ہی برآمدہ بھی ختم ہو جاتا ہے اور برآمدے کے باہر سامنے ہی باورچی خانہ ہے۔ اس کو طے کرنے میں آج اتنا وقت کیوں لگ رہا ہے۔ اس نے اپنے پاؤں کی طرف دیکھا تو وہ ساکت تھے۔ اس نے اپنے گرد و پیش کو دیکھا اوہ! وہ تو اپنے ہی کمرے کے دروازے کے سامنے کھڑے تھی۔ شاید وہ پہلے دو تین قدم اٹھانے کے بعد رک گئی تھی اس نے پورے ارادے سے دایاں قدم اٹھایا۔ دایاں، بایاں، دایاں، بایاں، دایاں، بایاں۔ وہ گنتی بھول گئی مگر اب برآمدے اور باورچی خانے کے درمیان جو ننھا سا قطعہ تھا وہ وہاں کھڑی تھی۔ اس نے آواز دی۔ پانی مانگا۔ عمر خان نے باورچی خانے کی کھڑکی سے سر نکالا۔ فردوس کو کھڑا دیکھ وہ حیران ہوا۔ پانی گلاس میں ڈال کر فردوس کی طرف بڑھا۔ اس کی آنکھوں میں کئی سوال ابھر رہے تھے۔

''بالکل خاموشی تھی۔ میں نے سوچا کہ تم نہیں ہو'' فردوس نے پانی پیتے ہوئے کہا۔

''میں تو یہیں تھا...... ہاں آج چپ رہنے کو جی چاہ رہا ہے...... جب تم نے آواز دی بیٹی تو نہ جانے کتنی دور سے مجھے لوٹ کر آنا پڑا...... بڈھا ہو گیا ہوں نا، بیتے دن یاد آتے ہیں...... یہی دن تھے۔ تمہاری والدہ زندہ تھیں......اور عجب روشنی تھی اس دن......''

عمر خان باتیں کرتے کرتے کھو گیا۔ ایک دم چونکا۔ اس کے ہونٹوں پر معذرتی سی مسکراہٹ تھی۔ اس نے دیکھا کہ اس کی طرح فردوس بھی کہیں کھوئی ہوئی تھی۔ اس کی پلکوں کے نیچے اندھیرا ہی اندھیرا تھا۔ وہ اس اندھیرے کی تاب نہ لا سکا اور واپس جانے کے لئے

بڑھا۔

''بابا! تم کیا کہہ رہے تھے......روشنی......''

''روشنی؟ ہاں! اس دن بھی عجیب سی روشنی تھی۔''

وہ اپنے الفاظ کی آواز سے ایک دم ٹھٹکا اس نے اپنے منہ پر اپنا دایاں ہاتھ رکھ لیا۔ وہ حیران تھا کہ آخر اس کو کیا ہو گیا ہے کہ جو بات اس کو نہ کہنی چاہیے تھی، جس کو نہ کہنے کی نواب آغا نے ہدایت کی تھی وہ کہے چلا جا رہا تھا۔ وہ چپکا کھڑا دعا مانگنے لگا کہ فردوس کے ذہن میں اس کے الفاظ نہ پہنچے ہوں۔

''روشنی! تم نے ابھی روشنی کی بات کی؟ کہاں دیکھی تھی روشنی؟ کب دیکھی تھی؟ کیسی تھی؟''

''روشنی؟ میں نے تو روشنی کا ذکر تک نہیں کیا۔''

''تم نے ذکر نہیں کیا؟ عجیب بات ہے۔ میرے کانوں میں ابھی تک روشنی کا لفظ گونج رہا ہے۔ آواز تمہاری ہے۔''

عمر خان کو اپنے جھوٹ بولنے کا بہت دکھ ہوا مگر اس کے سوا چارہ ہی کیا تھا۔ اگر وہ سچ کہے تو ساری داستان بیان کرنی پڑے گی۔ اس داستان میں دکھ کے سوا ہے کیا اور فردوس بی بی تو خود اپنی پریشانیوں میں کھوئی ہے۔ لہٰذا وہ چپ چاپ کھڑا فردوس کے چہرے پر سایوں کو آتے جاتے دیکھتا رہا۔

فردوس نے پلکیں اٹھائیں اور نہایت غور سے بابا عمر خان کی طرف دیکھا۔ محسوس ہوا کہ بی بی کو اس کی بات پر یقین نہیں آیا تھا اور اس کے چہرے سے بیزار ہو گئی ہے۔ اس نے کچھ کہنا چاہا، نہ کہہ سکا۔ بی بی نے مکھ موڑ لیا تھا۔ وہ مڑ گئی تھی۔ وہ پلٹی اس کو غور سے دیکھا اور ایک ایک لفظ تولتے ہوئے بولی:

''پیانو والے کمرے میں چائے لے آؤ۔ ساتھ کچھ کھانے کو بھی لیتے آنا۔ مجھے بھوک لگ رہی ہے''......اور......نہیں کچھ نہیں'' فردوس نے ایک بار پھر بابا کو بڑے غور سے

دیکھا۔

بابا کا دل کٹ کٹ گیا مگر وہ کیسے بتا سکتا تھا۔ وہ بتا بھی دیتا تو کیا اس کی بٹیا بات سمجھ لیتی ۔نہیں! اسکی بات وہ کبھی بھی فردوس کو نہیں بتائے گا۔اس کے اپنے دکھ کیا کم ہیں کہ وہ ان دکھوں میں اس کی ماں کے دکھ کا بھی اضافہ کردے۔قدموں کی آواز سے چونکا تو اس نے دیکھا کہ فردوس نہیں ہے وہ برآمدے کی طرف بڑھا۔فردوس اپنے کمرے کی دیوار کے ساتھ ساتھ چلی جارہی تھی۔دور،اس سے ہمیشہ ہمیشہ کے لئے دور۔وہ اب موڑ مڑ چکی تھی۔ اس کے قدموں کی آواز مدھم مدھم ہورہی تھی۔اس نے اپنی بٹیا سے پہلا جھوٹ بولا تھا۔اب وہ اس کے سامنے کس منہ سے جائے گا۔اس نے اپنے خیالات کے بہاؤ کو سختی سے روک دیا اور پورے ارادے سے باورچی خانے کی طرف پلٹا۔جلد جلد قدم اٹھاتے ہوئے وہ باورچی خانے کی طرف بڑھا۔سکینہ! سکینہ! بٹیا کے لئے کچھ بنا دو۔ بھوک لگ رہی ہے اسے۔ جلدی سے،مہمان بھی ہیں۔''

بارہواں باب

''فردوس متین صاحب سے کیا چاہتی ہے؟ میں فردوس سے کیا چاہتا ہوں؟ عالمہ متین صاحب سے کیا چاہتی ہے؟ ہم سب متین صاحب سے کیا چاہتے ہیں؟ زندگی سے کیا چاہتے ہیں؟ ہم سب دھنش محل میں، داؤد نگر میں کیوں اکٹھے کئے گئے؟ کیا ہونے والا ہے؟''

بڑے کمرے کے باہر چھت دار گلی میں کھڑا اتقی خیالوں میں گم تھا۔اس کے ذہن سے مختلف سوالات اٹھتے تھے،خلا میں گم ہوجاتے تھے۔اسے کہیں سے بھی جواب نہ آتا تھا۔وہ چاہتا تھا کہ اس کا دل ان سوالات کا جواب دے،کہیں سے ہی جواب آئے۔لیکن کہیں سے آواز نہ آتی تھی۔وہ بالکل تنہا تھا۔اس کے حواس بھی اس کو چھوڑ گئے تھے۔اس کو کچھ نظر نہ آتا تھا،اس کو کچھ سنائی نہ دیتا تھا۔وہ اپنے اعضا کو ہلانا چاہتا تھا مگر اس کی قوتِ ارادی ہی غائب تھی۔وہ بس ایک

ذہن تھا بلکہ ایک لوح تھا جس پر نامعلوم قلم نئے نئے سوال لکھ دیتے تھے۔ وہ چیخ کر تمام بکھرے ہوئے حواس کو، راہ گم کردہ دل کو، کھوئی ہوئی سوچ کو، متین صاحب کو، فردوس کو اپنے اردگرد اکٹھا کرنا چاہتا تھا تا کہ ان سے پوچھے، رو رو کر، چیخ چیخ کر پوچھے: آخر اس کے حواس، اس کا دل، اس کا ذہن، اس کو چھوڑ کر کیوں اور کہاں چلے گئے تھے۔ متین صاحب نے اس پر کیا جادو کر دیا تھا؟ وہ اس سے کیا کرنا چاہتے تھے؟ فردوس اس کے خوابوں میں، اس کے شعور پر کیوں چھائی رہتی ہے؟ اس کے خون میں کیوں بولتی ہے؟ مگر اس کی آواز بھی خلاؤں میں سرگرداں ہی رہی۔ اس کے ہر طرف، اس کے اندر، اندھیرا ہی اندھیرا تھا۔ ہر شے اندھیرے میں تھی، اندھیرے میں جذب ہو چکی تھی۔ دنیائے آب وگل اندھیرے میں تحلیل ہو چکی تھی۔ اس اندھیرے میں حرکت نام کو نہ تھی۔ تقی بھی اندھیرے میں تحلیل ہو گیا۔

دور، بہت دور سے ایک مبہم سا شور اٹھا، اندھرے میں حرکت پیدا ہوئی۔ آواز قریب آ رہی تھی، اندھیرے پر چھانے لگی۔ اندھیرا پھٹنے لگا، اندھیرے سے روشنی کی ننھی سی کرن باہر آنے لگی، ان کے گرد پھیلنے لگی، پھیلتی، اندھیرے کو دھکیلتی، چلی گئی، ہر طرف روشنی ہی روشنی تھی، آواز ہی آواز۔

آواز کا زور کم ہونے لگا، آواز واضح ہونے لگی، ریشمی کپڑوں کی سرسراہٹ، آواز کبھی کبھی قریب آ جاتی تھی، پھر ایک دم دور، بہت دور، چلی جاتی۔ سرسراہٹ کبھی سرگوشی بن جاتی، کبھی وسیع وعریض وعمیق پانیوں پر ننھے سے چپوؤں کی آواز۔

اس کا ذہن لوٹ آیا؛ اس کا دل لوٹ آیا، دھڑ کنے لگا؛ اس کے حواس لوٹ آئے؛ اس کو سردی لگ رہی تھی۔ اس کی نظر لوٹ آئی تھی۔ دمکتے اندھیرے میں سے ایک روشن، غیر واضح جسم اس کی طرف بڑھ رہا تھا۔ اس کے بالکل قریب آ گیا تھا۔ اس کے جسم میں لاوا دوڑنے لگا۔ اس کو اپنے شانوں پر لوہے کی بہت بھاری، بہت ہی گرم سل سی محسوس ہوئی۔ اس کے کان میں کراہنے کی بہت ہی مدھم آواز آئی۔ شاید اس کی اپنی آواز، جس سے اس کے دماغ میں ایک کھلبلی سی مچ گئی۔ ابھی فیصلہ نہ کر پایا تھا کہ ایک اور آواز اس کے کانوں میں آئی صاف، واضح: ''چلو! اندر چلیں!''

وہ ایک دم جاگ گیا۔ فردوس اس کے سامنے کھڑی تھی۔ اس کے چہرے سے فکر اور تدبّر صاف صاف چھلک رہا تھا۔ اس کا دایاں ہاتھ اس کو نظر ہی نہ آیا۔ وہ گھبرایا۔ اس نے نظر اٹھائی۔ فردوس کا ہاتھ اٹھا ہوا تھا۔ اس نے ہاتھ کے ساتھ اپنی نظر کو چلایا۔ اس نے اطمینان سے ایک لمبا سانس لیا۔ فردوس کا ہاتھ اس کے اپنے شانے پر تھا۔

تقی نے سوچا پھر آواز بھی اسی کی ہوگی مگر فردوس کے ہونٹ تو بند ہیں۔ وہ ایک بار پھر کھو چلا تھا کہ اس کا شانہ بڑے زور سے ہلا، فردوس چلا رہی تھی۔ اس کے لبوں کو جنبش ہوئی، کھلے مگر اس تک آواز نہ پہنچی۔ پھر ایک دم اس نے سنا:

''واپس آ جاؤ، میں فردوس ہوں۔ تمہیں اندر چلنے کو کہہ رہی ہوں۔ نہ جانے کب سے تم تو پتھر بنے ہو۔ آؤ''

فردوس کی آنکھوں میں حزن ملا، مایوس کرتا ہوا پیار تھا۔ آواز اس کے تمام حواس کو پیار سے سہلاتی ہوئی چلی گئی، پھر لوٹ آئی۔ تقی نے محسوس کیا کہ اس کے چہرے پر سرخی دوڑ گئی ہے، اس کی آنکھوں نے فردوس کو کچھ کہا ہے۔ فردوس کا ہاتھ اس کے شانے سے پھسلا اور اس کے بازو پر، کہنی سے ذرا اوپر پیوست ہو گیا۔ وہ اس کو کھینچ رہی تھی۔ اس کے جسم میں حرکت ہوئی، اس کے قدم اٹھے۔ اس کے قدموں نے فرش پر ایک نیم دائرہ بنایا۔ اس کا دایاں پاؤں اٹھا، پھر بایاں اور وہ سرخ سرخ روشنی میں تھا۔ وہ اور فردوس کمرے میں داخل ہو چکے تھے۔ تقی کی آنکھیں روشنی سے چندھیانے لگیں۔ کمرے میں روشنی کے سوا اس کو کچھ نظر نہ آیا۔ آہستہ آہستہ روشنی میں سے جسم ابھرنے لگے۔ دیواریں، چھت، فرش، فرش پر رکھا ہوا پیانو، فرنیچر، کرسیاں۔ روشنی کم ہونے لگی اور عالمہ اور متین کرسیوں پر دراز نظر آنے لگے۔ ان کے جسموں میں جنبش نہ تھی۔ صرف ان کے سینوں کے ہلکے ہلکے زیر و بم سے ان کی زندگی کا اندازہ ہوتا تھا۔ طوفان تھم گیا تھا، سمندر کی لہریں ساحل پر واپس لوٹ چکی تھیں۔ لہریں ساحل پر اپنا سفینہ چھوڑ گئی تھیں۔

عالمہ نے آنکھیں کھولیں۔ ان کو کھڑا دیکھ کر چونکی، جلدی سے کرسی کی پشت سے کمر اٹھائی اور سیدھی ہو کر بیٹھ گئی۔ کرسی سے اس کی اس حرکت سے ایک فریاد بلند ہوئی۔ عالمہ کے چہرے پر جسم کا سارا خون دوڑ گیا۔ متین صاحب نے آنکھیں کھول دیں، شاید کرسی کی فریاد نے ان کو جگا

دیا۔ ان کی آنکھوں میں خواب کے دھندلکوں کا نشان تک نہ تھا۔ وہ شاید جاگتے تھے صرف آنکھیں بند کئے تھے۔انہوں نے تقی کو دیکھا اور مسکرا دیئے۔ پھر فردوس کو دیکھا تو اٹھ کر کھڑے ہو گئے۔ان کی اس حرکت سے سب کے سب اپنی اپنی جگہ ساکت ہو گئے،کھو جانے لگے۔

''یہاں''متین صاحب نے اشارہ کرتے ہوئے کہا''یہاں اس میز پر''۔تقی اور فردوس کی متعجب نگاہوں کو دیکھتے ہوئے بولے''بابا چائے لائے ہیں''۔دونوں نے مڑ کر دیکھا تو بابا چائے کے برتن ایک بڑی ٹرے میں لگائے شیشے والی دیوار کے قریب میز پر رکھ رہے تھے۔دونوں کے سینے پھڑ پھڑائے اور عالمہ سے ایک ساتھ کہنے لگے''آؤ''۔

عالمہ چائے پی چکتے ہی اٹھ کھڑی ہوئی اور فردوس کو خطاب کرتے ہوئے''اب مجھے اجازت دیجئے''،پھر تقی کو مخاطب کیا''تقی بھائی مجھے گھر چھوڑ آیئے''

''کچھ دیر ٹھہر جایئے۔میں بھی آپ کے ساتھ چلتی ہوں۔چچا جان سے ملنا ہے۔صفیہ پھوپھی سے بھی ملے برسوں ہو گئے۔بگھی تیار کرواتی ہوں۔''

ابھی فردوس نے فقرہ ختم نہ کیا تھا کہ بابا آ گیا۔فردوس نے برتن لے جانے سے پہلے بگھی تیار کرانے کو کہا اور بابا کمرے سے باہر چلا گیا۔

''آپ یہاں سے جائیں گے نہیں میرے آنے تک''فردوس نے متین صاحب سے خطاب کرتے ہوئے کہا۔

متین صاحب نے پلکوں کے اشارہ سے درخواست قبول کر لی اور کسی دھیان میں کھو گئے۔سب کرسیوں پر دراز ہو گئے اور بابا کے خبر لانے کا انتظار کرنے لگے۔

حصہ چہارم

پہلا باب

کمرے سے دھوپ بالکل جا چکی تھی۔ شیشے کی دیوار پر کرنیں اپنے آخری رقص میں رقصاں تھیں۔ سورج اب شیشے کی دیوار سے دکھائی نہ دیتا تھا۔ کمرے میں ابھی روشنی باقی تھی۔

وقت ایک نئی کروٹ لے چکا تھا۔ پرندے اپنے اپنے آشیانوں کی طرف محوِ سفر تھے۔ مرغابیاں، طوطے، کوے، کبوتر اور کبھی کبھار کوئی بَرّاق سے پرندوں کا جوڑا، شیشے کی دیوار میں سے گزرتے نظر آنے لگے۔ کبھی کبھی تو تقی کو یوں بھی لگتا تھا کہ دیوار ایک بہت بڑی تصویر ہے جس میں ڈوبتے سورج کا سماں، پرندوں کی اڑان، آسمان کی نیلاہٹ، شفق کی سرخی، سنہری بادل ہمیشہ ہمیشہ کے لئے منجمد کر دیئے گئے ہیں۔ پھر تصویر پگھلتی اور پرندے اپنا سفر جاری کر دیتے، رنگ بدلنے لگتے، سنہرے بادل لال لال ہونے لگتے، نیلے پانیوں میں اندھیرا جذب ہونے لگتا۔

''بٹیا یخنی تیار ہے۔''

''بابا اب برتن لے جاؤ۔'' بابا برتن لے کر چلا گیا اور عالمہ، فردوس اور تقی متین صاحب پر ایک ایک نظر ڈالتے ہوئے بابا کے پیچھے پیچھے باہر نکل گئے۔ متین صاحب اسی طرح گم سم دراز پڑے رہے۔ ان کے گم سم ہونے کا اندازہ صرف ان کے ساکت جسم سے ہوتا تھا۔ ان کے چہرے کے نقوش بولتے تھے، ان کی آنکھیں ان کے غلافی پپوٹوں کے نیچے

دہک رہی تھیں۔ نظر ملاتے ہوئے سارے بدن میں گرمی سی محسوس ہونے لگتی تھی۔

دن نے آخری ہچکی لی اور دم توڑ دیا۔ شیشے کی دیوار اپنی چمک کھو بیٹھی مگر کمرے کی دیواریں اور چھت ابھی دمک رہے تھے۔ دیوار کے سیمنٹ میں ابرق چمک رہا تھا۔ اندھیرے میں جگنو چمک رہے تھے۔ متین صاحب اس طرح جانے کتنی دیر اندھیرے میں پڑے جگنو چمکنے کا تماشہ دیکھتے رہے اتنے میں بابا کمرا بند کرنے کو آ گیا۔ داخل ہوتے ہی ٹھٹکا۔ اس کے کان میں سانس کی آواز آ رہی تھی۔ وہ کچھ دیر تو شک میں غلطاں رہا۔ مگر شک کی گنجائش کہاں تھی۔ بابا نے بتی جلائی۔ کمرا جگمگا اٹھا۔ متین صاحب کرسی کی پٹی کے ساتھ سر لگائے آنکھیں بند کئے پڑے تھے۔ ان کا بایاں بازو کرسی سے لٹک رہا تھا۔ ان کے اس ہاتھ کی انگلیاں فرش کو چھو رہی تھیں۔ بابا چونکا اور ڈرتے ڈرتے بولا جیسے جواب نہ ملے گا۔

''آپ یہاں بیٹھے ہیں۔ سب تو چلے گئے۔ آپ کے لئے گھوڑا تیار کراؤں؟''

یہ کہتے ہی بابا جانے لگا تو متین صاحب نے ہاتھ کے اشارے سے بابا کو روک دیا۔ بابا تذبذب میں تھا کہ گھوڑا تیار کرنے سے روکا گیا یا کہ کمرے سے باہر جانے سے۔ بابا کو فکر ہونے لگی کہ شاید صاحب بیمار ہیں۔ متین صاحب کو دیکھ کر بیماری کا گمان بھی نہ کیا جا سکتا تھا۔ بابا انتظار کرتے کرتے تھک گیا تھا، پہلو بدلنے لگا تھا مگر متین صاحب بولتے ہی نہ تھے۔ بابا مسلسل متین صاحب کو تکے جا رہا تھا۔ شیشے کی دیوار سے ستارے چمکتے دکھائی دینے لگے تھے۔ کہیں دور سے گیت کے بول فضا میں بلند ہو رہے تھے۔ پھر ان بولوں کے ساتھ بانسری بھی فغاں کرنے لگی۔ بابا کچھ لمحوں کے لئے بھول گیا کہ وہ تھک گیا تھا، کمرے میں کیا کرنے آیا تھا، اس کے علاوہ کمرے میں کوئی اور بھی تھا۔

گیت اور بانسری کی فغاں ایک دم نہ جانے کہاں کھو گئے تھے کہ ان کو بلندیوں کی راہ پھر نہ ملی۔ بابا نے ایک لمبا سانس لیا اور اپنے آپ سے بولا ''انسان بوڑھا ہو جاتا ہے مگر بانسری ہمیشہ جوان رہتی ہے۔ جب چھیڑو، مدھر بول پھوٹتے ہیں اس کے شریر سے''

''بانسری کے شریر کے بول تو کبھی سو بھی جاتے ہیں مگر جو بول اس کمرے سے پھوٹ رہے ہیں وہ کب سوئیں گے......''

بابا چونکا۔ متین صاحب کو دیکھا۔ کچھ یاد آیا تو مسکرایا۔ کچھ دیر سوچنے کے بعد ٹھنڈا سانس لیتے ہوئے بولا:

''آپ نے بھی مجھے کہاں چھیڑا ہے، بول کہنے ہی ہونگے۔ آپ سنیں گے؟ بانسری کے بولوں سے زیادہ دکھ ہوگا ان بولوں میں''

متین صاحب نے ہلے بغیر ابروؤں کے اشارے سے رضامندی کا اظہار کیا اور متوجہ نگاہوں سے بابا کی طرف تکنے لگے۔ بابا کی نگاہیں جھک گئیں۔ وہ اپنے اندر کسی شے کو تلاش کرنے لگا۔

''میرے پاس آ کر بیٹھو۔ کھڑے کھڑے سوکھ جاؤ گے۔ تمہاری بی بی تو نہ جانے کب آئے گی۔''

بابا جاگا اور متین صاحب کے پاس جا کر بیٹھ گیا۔ شانے سے پٹکا اتار کر کمر میں ڈالا اور اس کے دونوں پلوؤں کو گھٹنوں پر باندھ دیا۔ بابا نے شیشے کی دیوار کے اس پار نیلے آسمان اور ستاروں پر نظریں جما دیں اور دھیرے دھیرے سرگوشی کے لہجے میں کہنے لگا ''جہاں آپ بیٹھے ہیں۔ وہاں بیٹھی تھیں بڑی بی بی، چپ چاپ۔ نہ جانے کب سے بیٹھی تھیں۔ چاند اس رات بہت بڑا تھا، سرخ تھا۔ ڈوبتا ہوا، چڑھتا چاند ہو یا سورج بڑا دکھائی دیتا ہے...... چاند ابھی ڈوبا نہ تھا۔ چاندنی اُس کرسی تک تھی مگر بی بی کا چہرہ سائے میں تھا۔ بی بی کی دائیں پلک کا کچھ حصہ چاندنی میں تھا۔

اس رات مجھے نیند نہ آئی تھی اور میں اٹھ کر ٹہلتا رہا۔ میرا دل نہ جانے کیوں بیٹھتا، بیٹھتا چلا جارہا تھا۔ رات تھی کہ کٹتی ہی نہ تھی، چاند تھا کہ ڈوبتا ہی نہ تھا۔ کتے بھی سو گئے تھے۔ کہیں سے کوئی آواز نہیں آتی تھی۔ میں گہن میں تھا۔ میرا گلا پیاس کے مارے خشک ہو رہا تھا۔ میں نے آبخورے سے پیالہ بھر کے پانی کا پیا مگر پیاس نہ بجھی۔ میں گھبرا کر گلی میں داخل ہو گیا۔ یہی گلی جو اس کمرے کے سامنے سے گزرتی ہے اور بائیں مڑ جاتی ہے۔ تمام کمرے بند تھے۔ نواب آغا کے کمرے سے کبھی سانس چلنے کی آواز آ جاتی تھی۔ بی بی کے کمرے میں روشنی نہ تھی۔ میں حیران ہوا۔ بی بی روشنی کئے بغیر نہ سوتی تھیں۔ میں اس حیرانی

میں اس کمرے کے دروازے تک چلا آیا۔ دروازہ کھلا تھا۔ اس شیشے والی دیوار سے پردہ ہٹا ہوا تھا۔ اس کرسی پر بی بی چپ چاپ بیٹھی تھیں۔ جیسے آپ ابھی بیٹھے تھے ان کو یوں دیکھ کر میں اپنی نیند، اپنی پیاس سب کچھ بھول گیا۔

بی بی مالکن ہی نہ تھیں میری گود میں کھیلی تھیں۔ ہمارا تین پشت سے ان کے خاندان سے چاکری کا ناتا تھا۔ بچپن میں جب بھی ان کو کوئی تکلیف ہوتی تو میری گود میں چڑھ جاتیں۔ میں سمجھ لیتا کہ ان کو کچھ کہنا ہے۔ میں انتظار کرتا۔ اگر کبھی پوچھ لیتا تو فوراً گود سے اتر جاتیں اور ہفتوں میرے پاس نہ آتیں۔ اس لئے میں ان کو گود میں لٹائے چپ چاپ ان کی آواز کا انتظار کرتا۔

میں چپ چاپ دروازے کے پاس بیٹھ گیا کہ شاید مجھے دیکھ لیں اور کچھ کہیں۔ میں صبح تک یونہی بیٹھا رہا۔ نہ بی بی نے بات کی نہ میں اپنی جگہ سے ہلا۔ مجھے آج بھی وہ رات یاد آتی ہے تو مجھے دکھ ہوتا ہے کہ میں نے کیوں نہ ان کو آواز دی۔ وہ کچھ تو کہتیں۔ ناراض ہی تو ہوتیں۔

مگر میرے منہ سے آواز تک نہ نکلی، دروازہ تک نہ چرچرایا۔ میں نے چاند کو ڈوبتے دیکھا۔ میں نے تاروں کی سبھا کو رخصت کیا۔ میں نے دور سے آتی ہوئی اذان کو سنا۔ میں نے کتوں کو بھونکتے سنا۔ میں نے کھیتوں کو جاتے ہوئے ڈنگروں کے گلے میں پڑی ہوئی گھنٹیوں کی آواز کو سنا۔ میں نے اندھیرے کو چھٹتے، دن کو چڑھتے دیکھا مگر میں بدنصیب پھر بھی چپ ہی رہا۔ روشنی ہر دم بڑھتی ہی چلی گئی۔ بی بی کا چہرہ روشنی میں پیلا پیلا سا لگ رہا تھا۔ ان کا سانس بہت ہی دھیرے دھیرے چل رہا تھا۔ ان کی آنکھیں بند تھیں۔ ان کے ہاتھ کرسی سے لٹک رہے تھے۔ ان کی انگلیاں فرش کے ساتھ بے سدھ پڑی تھیں۔ میں بیوقوف پھر بھی نہ سمجھا۔ میں انتظار کرتا رہا۔ میں سوچنے لگ گیا کہ بی بی کو جگاؤں یا نہ جگاؤں؟ بلاؤں یا نہ بلاؤں؟ میں ابھی سوچ ہی رہا تھا کہ میں نے کسی کے کراہنے کی آواز سنی۔ میں نے بی بی کی طرف دیکھا تو بی بی کی گردن اور اوپر کا دھڑ کرسی سے شیشے والی دیوار کی طرف جھک رہا تھا۔ میں بجلی کی طرح اٹھا اور ان کی کرسی کے پاس گیا۔ ان کا بدن پیلا پڑ

رہا تھا۔ ان کی دائیں پلک پر ایک آنسو چمک رہا تھا۔ میں نے ان کو سیدھا کیا تو آنسو بہہ نکلا۔

میں گھبرا گیا۔ میں نے نواب آغا کو آواز دی۔ ان کی آواز میں حیرانی تھی۔ میں نے کبھی ان سے اونچی آواز میں بات ہی نہ کی تھی۔ بلند کا تو سوال ہی نہ تھا۔ میں نے ان کو بتانا چاہا تھا کہ بی بی کو کچھ ہو گیا ہے مگر میں سوائے 'بی بی' کے کچھ نہ کہہ سکا۔ آغا جی بھاگتے ہوئے آئے۔ پھر شاید ان کے بھاگنے کی آواز سن کر چھوٹے آغا بھی آ گئے۔ پھر نوکر اور ماما بھی آ گئے۔ آغا جی بی بی کو اٹھا کر ان کے کمرے میں لے گئے۔ آپ نے شاید وہ کمرا نہیں دیکھا۔ اس گلی کی نکڑ پر ہے۔ جہاں آپ نے دوپہر کو کھانا کھایا تھا نا؟ اس کمرے کے ساتھ...... اس کھانے کے کمرے میں آج آپ نے دیکھا روشنی کو۔ میں اسی وقت سے پریشان ہوں کہ کیا ہونے والا ہے۔ یہی دن تھے وہ بھی۔ ان دنوں کے بعد اب آباد ہوا ہے یہ گھر۔

ہاں! تو میں کہہ رہا تھا...... ہوں! بی بی کو آغا جی ان کے کمرے میں لے گئے۔ چھوٹے آغا کو ڈاکٹر کے پاس دوڑایا۔ بچارے آغا گھوڑے پر گئے۔ گھوڑا ہلکان ہو گیا۔ ڈاکٹر کو تو وہ لے آئے مگر بیچارہ ڈاکٹر بھی کچھ نہ کر سکا۔ بی بی کو ہوش نہ آیا۔ ڈاکٹر نے ٹیکہ لگایا ہم لوگ، نواب آغا، چھوٹے آغا، ڈاکٹر تمام دن، اگلی رات، اگلا دن اور شام تک اندھیاروں میں رہے۔ چاند نکلا تو بی بی کو ہوش آیا۔ بڑے آغا نے ہم سب کو اشارہ کیا۔ ہم کمرے سے باہر نکل آئے۔

''بی بی نے اس رات نہ اس کے بعد بات کی۔ شاید وہ آواز کھو بیٹھی تھیں۔ اگلی صبح نواب آغا اور چھوٹے آغا کمرے سے باہر نکلے۔ ہمیں حوصلہ دیا اور کسی قسم کا شور نہ کرنے کو کہا۔ دن جوں توں کر کے کٹا۔ رات آئی بی بی نے نواب آغا اور چھوٹے آغا کا اطمینان کرایا کہ وہ اب اچھی ہیں۔ دونوں اپنے اپنے کمروں میں چلے آئے۔ بی بی نے اپنا کمرا بند کر لیا۔

مجھے اس رات بھی نیند نہ آئی۔ میں چاندنی میں ٹہلتا رہا۔ گلی میں نکل آیا تو دیکھا تو بی بی

کے دروازے کی درزوں سے روشنی چھن رہی تھی مگر روشن دانوں کے شیشوں پر روشنی نام کو نہ تھی۔ سوچا کہ شاید بی بی میز کا لیمپ جلائے تھیں۔ مگر کیوں؟ پڑھ رہیں تھیں؟ لکھ رہی تھیں؟ میں نے اپنی زندگی میں پہلی بار بی بی کے دروازے کے ساتھ کان لگایا (آج بھی جب یاد آتی ہے یہ حرکت تو کانپ جاتا ہوں) چرر چرر۔ جلدی جلدی لکھنے کی آواز آرہی تھی۔ میں نے ایک درز میں سے جھانکا تو دیکھا کہ بی بی لکھنے کی میز پر بیٹھی تھیں۔ ان کے بائیں ہاتھ میں رومال تھا جس کو وہ بار بار منہ تک لے جاتی تھیں۔ وہ میز پر جھکی ہوئی تھیں۔ ان کا چہرہ نظر نہ آتا تھا۔ صرف ان کا کان اور کان کے ساتھ چہرے کا کچھ حصہ لیمپ کی روشنی میں نظر آرہا تھا۔ ان کا دایاں بازو میز کے کبھی دائیں آتا تھا کبھی بائیں جاتا تھا۔ جس سے میں نے اندازہ کیا کہ وہ لکھ رہی تھیں۔

مجھے ایک دم خیال آیا کہ میں کتنی کمینی حرکت کر رہا ہوں۔ شرم کے مارے میرا بدن پتھر کا ہو گیا۔ مجھ سے قدم اٹھانا محال ہو گیا۔ ان کے کمرے سے اپنی چارپائی تک جاتے مجھے کتنی صدیاں لگیں!

صبح اٹھا۔ ضروری کام کئے۔ گلی میں جھانکا تو بی بی کا دروازہ بند تھا۔ شاید کسی نے ان کو نہ جگایا تھا۔ ادھر ادھر بے تاب پھرتا رہا۔ میرا سارا دھیان بی بی کے کمرے میں تھا۔ دن چڑھے بڑی دیر ہو چکی تھی۔ آغا جی نے مجھے بلا کر پوچھا کہ بی بی جاگیں کہ نہیں۔ میں نے ایک بار پھر جھانک کے دیکھا تو دروازہ ابھی بھی بند تھا۔ آغا جی خود اٹھے اور ان کے کمرے کی طرف چلے میں بھی ان کے پیچھے پیچھے چلا۔ آغا جی نے دروازے پر دستک دی۔ کوئی جواب نہ آیا پھر دستک دی۔ کوئی جواب نہ ملا۔ انہوں نے دھیرے سے دروازے کو دھکیلا۔ پٹ کھل گئے۔ اندر داخل ہوتے ہی ان کے ہونٹوں سے بہت ہی دردناک آہ نکلی۔ آغا کو کبھی کسی نے آج تک درد سے پریشان ہوتے بھی نہیں دیکھا۔ میں آگے بڑھا۔ نواب آغا بی بی کے پلنگ پر جھکے سسکیاں لے رہے تھے۔ قریب گیا تو بی بی پہلو کے بل لیٹی تھیں۔ ان کا بایاں بازو پلنگ پر بے جان پڑا تھا۔ ان کے ہاتھ سے رومال چپکا ہوا تھا۔ لہو سے لال۔ ان کا چہرہ سفید ہو چکا تھا۔ ان کے ماتھے اور چہرے پر دکھ کے بہت گہرے نشان تھے مگر ان کے ہونٹوں

پر ایک عجیب سی مسکراہٹ کھیل رہی تھی۔ ان کی اس مسکراہٹ سے ان کے سفید چہرے پر نور پھیل رہا تھا۔ میں تاب نہ لا سکا۔ منہ پھیر لیا میں نے۔ کمرے میں نور ہی نور تھا۔ ہر شے اپنی اپنی جگہ بت بنی بی بی کو تکتی تھی میں نے میز کی طرف دیکھا۔ میز پر صرف ایک خط پڑا تھا جو نواب صاحب کے نام تھا۔ وہ خط بہت ہی مختصر تھا۔ رات بھر جس کتاب میں تیزی سے وہ لکھتی رہی تھیں وہ میز پر نہ تھی۔ کمرے میں کہیں نہ تھی۔ جب آغا صاحب نے خط کھولا تو دھیمی دھیمی آواز میں پڑھتے گئے۔ میں نے بھی سنا، بلکہ سب نے سنا۔ بی بی کی آرزو تھی کہ ان کو شکار گاہ والے چشمے کے پاس دفن کیا جائے۔ (یہ چشمہ شمال کی طرف پہاڑوں کے درمیان ایک سبزہ زار ہے وہاں بہتا ہے اور انہی پہاڑوں میں کہیں گم ہو جاتا ہے۔ اس کے متعلق داؤ دنگر کے بوڑھوں سے میں نے سنا ہے کہ جس نے اس میں نہا لیا اس کی تمام آرزوئیں پوری ہوئیں)۔

''اتنے میں فردوس بٹیا کے رونے کی آواز آئی۔ میں نے بٹیا کو پنگوڑے سے اٹھایا، شانے سے لگایا، شانے سے لگائے ٹہلتا رہا۔ میں بٹیا کو کیا بتاتا کہ اس کے ساتھ کیا ظلم ہو گیا تھا۔ بولنا بھی تو ابھی نہ آیا تھا اُسے۔'' ڈاکٹر آیا۔ وہ بھی کیا کرتا بیچارا۔ بعد میں چھوٹے آغا سے پتہ چلا کہ ان کے دماغ کی کوئی نس پھٹ گئی تھی۔ ایسا کیوں ہوا؟ ڈاکٹر کہتا تھا کہ بی بی کو بہت بڑا صدمہ ہوا تھا۔ صدمہ کیسا؟ ان کو کیا کچھ نصیب نہ تھا۔ کچھ رات پہلے ڈر ضرور گئی تھیں۔ کتابوں والے کمرے میں نہ جانے رات ڈھلے کیا کر رہی تھیں۔ شاید پڑھ رہی تھیں۔ ان کی چیخ کو سن کر ہم سب دوڑے گئے۔ قالین پر بے ہوش پڑی تھیں۔ اٹھا کر ان کے کمرے میں لے آئے۔ کچھ دیر میں ہوش میں آ گئیں۔ اگلے دن خوش خوش اٹھیں۔ معمول کی طرح سب کام کئے۔ اس سے اگلے دن بھی اور اس سے اگلے دن بھی۔ اس رات میں اور اس رات میں دس دن کا فاصلہ ہے۔

نواب آغا سے میں آج تک نہیں کہہ سکا کہ اس رات بی بی لکھ رہی تھیں۔ کافی دیر لکھتی رہی تھیں۔ بتا دیتا تو اپنے جرم کی شرم سے ان کو پھر کیسے منہ دکھاتا۔ ان کی وفات سے لے کر آج تک ان کا کمرا بند ہے۔ آغا شاید کبھی آئے ہوں! پچیس برس ہو چکے ہیں۔ یوں لگتا ہے

کہ جیسے یہ سب کچھ ابھی ابھی ہوا ہو"۔ بابا نے گہرا سانس لیا۔ سانس کی آواز بڑی دردناک تھی متین صاحب نے محسوس کیا شاید بابا دم دے دے۔

"یہاں سے شمال کی طرف، پہاڑوں کی اوٹ میں، باغ بنوایا تھا نواب آغا نے بی بی کے لئے۔ ساتھ شکار گاہ بھی تھی۔ وہیں دفن کیا تھا۔ کچھ دن ہوئے میں چوری چوری گیا تھا وہاں۔ باغ اجڑ گیا ہے مگر بہار اب بھی آئی تھی وہاں۔ گھاس بہت اونچی ہوگئی ہے۔ قبر کے اوپر املتاس کا پیڑ ہے۔ سرہانے گلاب کی شاخیں سایہ کرتی ہیں۔ شکار گاہ کے رکھوالے کی کوٹھڑی کے نشان اب بھی باقی ہیں۔

نواب آغا بی بی کو دفن کرنے کے بعد کئی سال وہاں جاتے رہے۔ جب سے فردوس بٹیا نے ہوش سنبھالا ہے آغا صاحب وہاں کبھی نہیں آئے۔ فردوس بی بی کو بھی کبھی نہیں بتایا۔ میں نے کئی بار چاہا کہ بتاؤں کہ اسکی ماں کیسی تھی۔ مگر ہر بار کوئی زبان روک لیتا ہے۔ کیسے بتاؤں کہ وہ کیسی تھیں!

آخر ایسا کیوں؟ بی بی نے تو کبھی کسی کا دل نہ دکھایا تھا گاؤں کے لوگ، ان کے نوکر، جو بھی ان سے ملتا تھا، ان کو دعائیں دیتا تھا۔ پھر ان کے ساتھ یہ سب کچھ کیوں ہوا؟ قدرت اچھوں کو ہی اٹھا لیتی ہے!......اس گاؤں میں ایک بیوہ کا بیٹا تھا۔ عارف نام تھا۔ بہت گھبرو جوان تھا۔ بہت بھولا بھالا تھا۔ ماں کا بہت فرمابردار تھا۔ باپ کے مرنے کے بعد اس نے اپنی تعلیم چھوڑ دی۔ ماں کے پاس چلا آیا۔ کالج میں پڑھتا تھا۔ ہر جماعت میں اس کو وظیفہ ملتا تھا۔ ماں کے پاس رہتا اپنی تھوڑی سی زمین میں ہل چلاتا۔ جو سوکھی پھیکی ملتی تھی اسی کو کھا کر شکر بجالاتا پروردگار کا۔

آغا جی نے اس کو اپنا کتب خانہ استعمال کرنے کی اجازت دے رکھی تھی۔ اس کے آنے کا مجھے کبھی پتہ نہ چلتا۔ آغا جی اس سے بہت خوش تھے۔ کبھی کبھی اس کو شہر کسی اہم کام بھی بھیج دیتے......

جس رات بی بی ڈر گئی تھیں اسی رات وہ غائب ہوا۔ نہ جانے اس کو زمین کھا گئی یا آسمان کھا گیا۔ اس کا آج تک کہیں پتہ نہیں چلا۔ قدرت کے رنگ نیارے ہیں......"

بابا چپ ہو گیا۔ کافی دیر یونہی کھویا رہا پھر اس نے ایک آہ بھری۔ گھٹنوں سے پٹکے کے بند کھولے۔ کھینچ کر شانے پر ڈالا اور اٹھ کھڑا ہوا۔ دیوار کے اس پار تاروں پر حسرت سے اک نگاہ کی۔ ٹھنڈی سانس بھری اور بولا۔

''بٹیا ابھی نہیں آئی۔ آپ کب تک انتظار کریں گے؟''

''جب تک نہ آ جائے حکم جو ہوا''

''بٹیا جو کہہ دے وہ کیسے نہ ہو۔ یہ شاید بٹیا نے کبھی نہیں سوچا۔ اپنی ماں کی طرح۔ بالکل ماں کی تصویر ہے۔ خدا فضل کرے بٹیا پر'' بابا نے بانہہ سے منہ سے پسینہ یا آنسو پونچھتے ہوئے کہا۔

''مجھے آواز دے لیجئے اگر کوئی ضرورت ہو۔ میں اب چلتا ہوں۔ بوڑھا ہو گیا ہوں نا۔ اب بہت دیر بیٹھا نہیں جاتا۔''

بتی گل کر جاؤ۔ چاندنی کافی ہے......اس سے زیادہ کچھ نہ کہہ سکے متین صاحب۔ کوشش کے باوجود متین صاحب کا سکھ چین، ان کا اعتماد، ان کا اطمینان، ان کا توازنِ طبع سب کے سب ان جانی راہوں میں لٹ گئے۔ وہ درد سے بلبلائے۔ کرسی سے اٹھے اور کمرے میں لمبے لمبے قدم لیتے ہوئے ٹہلنے لگے۔

کمرے میں چاندنی ہی چاندنی تھی۔ چاندنی میں ان کا سایہ پھڑ پھڑاتا رہا، پھڑ پھڑاتا رہا۔ پنچھی کا آشیانہ لٹ گیا تھا۔ پنچھی آشیانے پر منڈلاتا رہا۔ فغاں کرتا رہا۔

دوسرا باب

گاؤں کے بڑے بوڑھے بگھی کو آتے دیکھ کر حیرانی سے، ادب سے اپنی اپنی جگہوں سے اٹھ کر کھڑے ہو گئے۔ یوں شام گئے نواب آغا کی بیگم سالہا سال پہلے سیر کو اس بگھی میں نکلا کرتی تھیں۔ بیگم نواب آغا گاؤں کے ہر بچے، ہر عورت، ہر لڑکی سے کتنے پیار سے

ملتی تھیں۔ ہر بوڑھے سے کتنے ادب سے گفتگو کرتی تھیں۔ بیگم آج پھر سیر کو لوٹ آئی تھیں؟ ان کی نظروں کے سامنے سے 30 سال پہلے کا دھنش محل پھر گیا۔

اس روز داؤ دنگر اور اس کے آس پاس کے گاؤں سے ہر خاندان کا بڑا نواب آغا کی بیگم کے لئے تحفہ اٹھائے دھنش محل کی طرف جا رہا تھا۔ دھنش محل میں روشنیاں ہو رہی تھیں۔ سورج ڈوب چکا تھا۔ دور دور تک دھنش محل کی روشنیاں دکھائی دیتی تھیں۔ نیچے وادی میں سینکڑوں لوگ جلوس کی صورت میں بڑھے چلے جا رہے تھے، کوئی گھوڑے پر، تو کوئی بیل گاڑی میں، کوئی پیدل۔ دھنش محل کی طرف جو سڑک چڑھتی تھی اس پر دونوں طرف رنگ رنگ کی کاغذی شمعیں لٹک رہی تھیں۔ ان کی مدھم مدھم روشنیاں چودھویں کے چاند سے روشن ہوتے ہوئے نیلے آسمان کے تلے عجب بہار دکھا رہی تھیں۔

دھنش محل ایک بار پھر آباد ہو رہا تھا اور ان کا آغا اپنی بیاہتا کو داؤ دنگر لایا تھا۔ ایسا واقعہ شاید سو سال کے بعد ہو رہا تھا۔ اس لئے ہر کوئی آغا کی بیگم کیلئے، آغا کے لئے نذرانہ لئے جا رہا تھا۔ انہوں نے آغا کو کبھی نہ دیکھا تھا۔ انہوں نے سن رکھا تھا کہ آغا بہت ہی وجیہہ ہیں اور اس کی بیگم کے حسن کے، اس کی خوش مزاجی کے چرچے ان کی شادی کے فوراً بعد ہی شروع ہو گئے تھے۔ چھوٹے آغا کے ملازمین اور ملازمائیں ان کی شادی کی رسوم کے عینی شاہد تھے۔ شادی کے فوراً بعد آغا اور بیگم یورپ جانے سے پہلے اپنے گاؤں آئے تھے۔ اس لئے لوگ بہت خوش تھے۔

دھنش محل کے صحن اور سڑک کے درمیان شامیانے کے تلے آغا کی جاگیر کے تمام اعیانِ رعیت اور آس پاس کی زمینداریوں کے زمیندار اکٹھے تھے۔ ان کے چہرے تمتما رہے تھے۔ ان کے مونڈھوں کی اگلی قطار سے 6/5 فٹ کا فاصلہ چھوڑ کر ایک بلند چبوترے پر دو سرخ مخمل مڑھی کرسیاں رکھی تھیں۔ ان کے پائے، ان کے بازو، ان کی پشت کے کنارے سونے کے پتروں سے جڑے تھے۔ چبوترے اور مونڈھوں کی اگلی قطار کے درمیان ایک بنات مڑھی لکڑی کی بڑی خوبصورت کرسی رکھی تھی۔ اب چاند وادی کی مسافت طے کر کے دھنش محل کی چھت سے جھانکنے لگا تھا۔ رنگ برنگ کی کاغذی شمعوں کی مدھم

روشنیاں پھیکی پڑنے لگ گئی تھیں۔ مہمانوں کے رنگ برنگے لباس، ان کی سفید، کالی داڑھیاں، ان کے ریشمی رنگدار عمامے چاندنی میں چھٹکنے لگے۔

محل کے اندر سے چھوٹے آغا اوران کے والد بڑے آغا نکل کر صحن کی طرف آرہے تھے۔ تمام مہمان ان کے استقبال کے لئے اٹھ کر کھڑے ہو گئے۔ بڑے آغا نے مہمانوں میں سے بعض سے مصافحہ کیا، ان سے کچھ باتیں کیں۔ چھوٹے آغا بڑے آغا کے جلو میں خاموش کھڑے رہے۔ چھوٹے آغا ان دنوں جوان تھے، شہر میں پڑھتے تھے۔ کچھ ہی دن پہلے گاؤں میں آئے تھے۔

ابھی بڑے آغا مہمانوں سے باتیں کررہے تھے کہ ایک دم خاموشی چھا گئی۔ بڑے آغا بات کو ختم کرتے ہوئے محل کے صحن کی طرف مڑے۔ نواب آغا اور ان کی بیگم صحن سے شامیانے کی طرف بڑھ رہے تھے۔ ان کے نپے تلے قدم، ان کی باوقار چال، نواب آغا کی وجاہت، ان کا بلند قد، ان کی چھوٹی چھوٹی مونچھیں اور ان کے جلو میں بڑھتی ہوئی بیگم کا سادہ، سفید، برّاق سا لباس، ان کے گلے میں دہکتے انگاروں کی مالا اور ان کا دمکتا ہوا مکھڑا۔ سب کی نظریں جھک گئیں، جھکی رہیں۔ نواب آغا اوران کی بیگم کو اپنی کرسیوں پر بیٹھے عرصہ ہو چکا تھا مگر مہمان ابھی تک، نظریں جھکائے کھڑے تھے، اپنے ماحول سے بے خبر۔

بڑے آغا کی گھمبیر آواز نے کھڑے ہوئے، کھوئے ہوئے، مہمانوں کو ان کے خوابوں سے بیدار کر دیا۔ بڑے آغا چبوترے کی طرف منہ کئے کہہ رہے تھے۔

''میں داؤ دنگر کی رعیت کی طرف سے اور معزز مہمانوں کی طرف سے نواب آغا اور ان کی بیگم کو ان کی خانہ آبادی پر مبارک پیش کرتا ہوں اور دعا کرتا ہوں کہ دھنش محل آج کے دن کی طرح ہمیشہ آباد رہے۔''

بڑے آغا کے جواب میں نواب آغا نے اپنی اور بیگم کی طرف سے شکریہ ادا کیا اور وعدہ کیا کہ سال میں کچھ عرصہ دھنش محل میں گزارا کریں گے۔

ان کے بیٹھتے ہی بڑے آغا پھر کھڑے ہوئے اور انہوں نے معزز مہمانوں کو نواب کے حضور پیش کرنا شروع کیا۔ ہر ایک مہمان نے سنہرے، روپہلے تھالوں میں اپنے تحائف

پیش کئے۔ نواب کا ملازم عمر خاں تھال کو نواب کی طرف بڑھاتا اور نواب صاحب ہاتھ لگاتے اور عمر خان تھال کو ایک اور ملازم کے سپرد کر دیتا۔ کافی دیر تک یہ رسم جاری رہی۔ جب آخری مہمان پیش ہو رہا تھا تو چاند دھنش محل کی چھت اور صحن عبور کرتے ہوئے نواب آغا اور ان کی بیگم پر سایہ کرنے لگا تھا۔ مہمان فیصلہ کرنا چاہتے تھے کہ چاند کو دیکھیں یا میزبان اور اس کی بیاہتا کو۔ فیصلہ کرتے تو کیسے! چاند کو تو وہ دیکھنے کے عادی ہو چکے تھے۔ بیگم کے حسن، ان کی سادگی، ان کے وقار اور ان کی چال کے طنطنے کو انہوں نے آج پہلی بار دیکھا تھا۔ بیگم پر نگاہ ڈالنے کی جرأت کسی کو نہ تھی۔ نظریں جھکی ہوئی تھیں۔ نظریں اٹھتیں تو چاند تک پہنچتیں۔

جب آخری مہمان واپس جا کر اپنے مونڈھے پر بیٹھ گیا تو بڑے آغا کسی قدر توقف کے بعد پھر اٹھے اور اعلان کیا کہ نواب صاحب اور ان کی بیگم نے فیصلہ کیا ہے کہ داؤ دنگر میں تین پرائمری سکول اور ایک ہائی سکول کھولے جائیں۔ ان میں ایک سکول صرف لڑکیوں کے لئے مخصوص ہو اور ایک ڈسپنسری کھولی جائے۔ سکولوں میں تعلیم اور ڈسپنسری میں دوائی مفت ملے گی۔ ان کی عمارت کی بنیاد فوراً ہی رکھی جائے۔

مہمان اس اعلان سے حیران ہوئے، پریشان ہوئے۔ لڑکیوں کیلئے سکول؟ ایسا کبھی نہ ہوا تھا۔ ان کی تمام خوشی، ان کا تمام مزا کرکرا ہو گیا۔ مگر چاندنی اور فضا نے ایک بار پھر ان کے ذہنوں پر قبضہ کر لیا اور ان کی یادوں سے اعلان اور اعلان کے معنی محو ہو گئے۔

اس کے بعد مہمانوں کو کھانے کے لئے محل میں بلایا گیا۔ انہوں نے نواب اور اس کی بیگم کے ساتھ فرش پر بیٹھ کر کھانا کھایا۔ وہ خوشی کے مارے کچھ کھا بھی نہ سکے۔

یہ سب کچھ بڑے بوڑھوں کو آج تک یاد تھا۔ اس کی یاد آج پھر ان کے دلوں میں کروٹ لے رہی تھی۔ جوں جوں بگھی قریب آتی جاتی ان کے بوڑھے جسموں میں خون تیز ہونے لگا۔ ان کی جھکی ہوئی کمریں سیدھی ہونے لگیں۔

ان کے قریب پہنچ کر بگھی رک گئی۔ تقی بگھی سے نیچے اتر آیا اور اس نے ہر بوڑھے کا فردوس سے تعارف کرایا۔ بوڑھوں نے جھکی ہوئی آنکھوں کے کونے سے بگھی میں کھڑی

فردوس کو دیکھا۔ بالکل ماں کی تصویر تھی، اس کے بات کرنے کا طریقہ بھی وہی تھا۔ صرف اس کی آنکھوں میں وہ چمک، وہ سج دھج نہ تھی۔ اس کی جگہ وہاں حزن ملا پیار تھا، ہمدردی تھی۔ بوڑھوں نے محسوس کیا کہ ان کے کپکپاتے ہوئے جسموں پر دوشالے ڈال دیئے گئے ہیں۔ فردوس نے ہر ایک سے مؤدبانہ مگر پروقار انداز سے بات کی۔ اس کی آواز میں کتنی نرمی تھی، کتنی زندگی تھی، خشک زمینوں پر برسات کی مسلسل، نرم نرم، حیات آور بارش نہ جانے کتنی دیر ہوتی رہی۔

بگھی کافی دور جا چکی تو بوڑھے جاگے۔ ان کے دلوں سے فردوس کے لئے دعا نکلی۔ وہ مرنے سے پہلے ایک بار پھر دھنش محل میں دولہا اور دلہن کو تحفے دینے کے لئے جانا چاہتے تھے۔

تیسرا باب

تقی کی ماں نے فردوس کو سینے سے لگایا، سرخ مرچیں نچھاور کر کے آگ میں جلائیں؛ اس کے ہاتھ دودھ سے، اس کے پاؤں گلاب کے پانی سے دھلائے۔ فردوس ابھی اس عجیب مگر پیارے سلوک کے متعلق سوچ ہی رہی تھی کہ تقی کی ماں اندر سے ایک خوبصورت چمڑے کا ڈبہ اٹھا لائی۔

''آنکھیں میچ لو بیٹی، ان بوڑھی آنکھوں میں تاب نہیں تمہاری نظروں کی''

فردوس نے آنکھیں میچ لیں۔ اس کا تمتماتا ہوا چہرہ دہکنے لگا، اس کا دل مچلنے لگا، اس کے کان گرمی سے جلنے لگے، اس کی گردن فرطِ جذبات سے جھک گئی۔ سرد سرد انگلیوں نے اس کی گردن کو چھوا۔ اس کے سینے پر، اس کی گردن میں کسی نے برف کی ڈلیاں پرو کر ڈال دیں۔ کسی نے اس کی ٹھوڑی کے نیچے ہاتھ رکھا، ٹھوڑی کو اٹھایا۔ وہ آنکھیں کھولنا چاہتی تھی مگر پلک سے پلک نہ اٹھ سکی۔ اس کے بالوں میں کچھ الجھایا گیا، اس کی مانگ میں ایک سرد سرد لکیر دوڑنے لگی، اس کے ماتھے پر پہنچ ایک دائرے میں بند ہو گئی۔ گرمی اور سردی کے ملاپ

سے اس کی آواز گم ہوگئی۔ اس کا جسم جھکنے لگا، اس کی آنکھوں کے تلے اندھیرا سا چھانے لگا۔ پھر کسی نے ایک دم اس کا سر سینے سے لگا لیا اور اس کی کمر پر پیار سے ہاتھ پھیرنا شروع کیا اور پھر اس کو سہارا دے کر، اسی طرح اس کا سر سینے سے لگائے، چلانا شروع کیا۔ وہ نہ جانے کتنی دیر چلتی رہی۔ کن راہوں سے؟ وہ نہ جاننا چاہتی تھی۔ اس کو پھر بٹھا دیا گیا، اس کے پاؤں سے جوتا اتارا گیا۔ فردوس نے محسوس کیا کہ فضا میں ایک دم دھیما دھیما شور رچ گیا ہے۔ اس کی آنکھیں کھلنے لگیں۔ کسی نے اس کے سر پر ہاتھ پھیرا اور اس نے سنا:

''آنکھیں کھولو بیٹی، دیکھو کون کون آیا ہے۔''

اس نے آنکھیں کھول دیں اور اس نے دیکھا کہ عورتیں، جوان لڑکیاں، بچے اس کی طرف بڑے حیرانی سے، خوشی سے تک رہے تھے۔ تقی کی والدہ نے ہر ایک سے اس کا تعارف کرایا۔ ہر ایک نے رنگ دار رومالوں سے ڈھکی ہوئی چنگیروں میں اس کو تحفے پیش کئے۔ وہ صمٌ بکمٌ اس کھیل کو دیکھتی رہی۔ اس کا دل، اس کا ذہن بالکل خالی تھے۔ اتنے میں عورتوں کے ہجوم کے پیچھے سے آواز بلند ہوئی۔

''بھابھی! کہاں ہیں نواب بٹیا؟''

ایک ادھیڑ عمر کی باوقار، مدھم رنگوں کے کپڑوں میں ملبوس عورت ہجوم کو کاٹتی ہوئی اس کی طرف بڑھی۔ اس کی چال میں، اس کی آواز میں اس کی پھیلی ہوئی بانہوں میں اتنا پیار بھرا تھا کہ فردوس اٹھی اور کھڑی ہوگئی۔ جب وہ عورت اس کے بالکل قریب آ گئی تو اس عورت نے فردوس کو سینے سے لگا لیا۔ فردوس کو اپنا جسم اس کے سپرد کرتے ہوئے ایک عجیب سا لطف ملا اور اس نے محسوس کیا کہ اگر اس کی ماں ہوتی اور اس کو سینے سے لگاتی تو اس کے جسم سے بھی اسی طرح بھینی بھینی، ہوش اڑانے والی خوشبو آتی۔ اس کے جسم سے بھی ایسی ہی گرمی اس کے جسم میں داخل ہوتی، اس کے ہونٹوں سے اس ماتھے میں، ان آنکھوں میں اسی طرح ٹھنڈک پہنچتی۔ اس نے محسوس کیا کہ اس کی آنکھوں میں آنسو آ گئے ہیں۔ اس نے آنکھیں کھولیں تو فضا پر دھند چھائی تھی۔ اس نے پھر آنکھیں میچ لیں، اس نے پپوٹوں کو بھینچا، اس کے رخساروں سے گرم سیال بہتا ہوا اس کے ہونٹوں کے کونوں میں جذب

ہو گیا۔

ہجوم کہ اس منظر کو دیکھ کر گم سم ہو گیا تھا، اب اس میں جان پڑ گئی تھی اور اس طرف سے ایک شور فضا میں گھلنے لگا۔ فردوس نے عورت کے سینے پر سر رکھے رکھے نظریں اٹھائیں اس کی نظریں کسی کو ڈھونڈ رہی تھیں۔ اس کی نظریں رکیں۔ تقی کی والدہ کی آنکھوں کی پلکیں تیز تیز جھپک رہی تھیں۔ اس کے لب کئی بار پھڑ پھڑا کر ساکت ہو گئے۔ پھر اس کے جسم نے پھریری لی اور اس کے لب کھلے اور فردوس نے سنا۔

''بٹیا! تقی کی پھوپھی ہیں۔ جس رات تمہاری جنتی والدہ نے انتقال کیا اس کے بعد کچھ دن رات تم ان کے پاس رہیں۔''

فردوس نے سینے سے سر اٹھایا اور دونوں کی نظریں ملیں۔ اس عورت کی آنکھوں میں اتنا پیار تھا کہ فردوس تاب نہ لا سکی اور اس کی نظریں جھک گئیں۔ عورت نے اپنے دونوں ہاتھ اٹھا کر فردوس کے شانوں پر رکھ دیئے پھر بہت دھیرے دھیرے اس کے جسم کو اپنے جسم سے الگ کیا اور پھر پیار سے اس کے شانوں پر دباؤ ڈالتے ہوئے اس کو پلنگ پر بٹھا دیا۔ فردوس کا دل ایک دم اُچھلا، اس کی آنکھوں تلے اندھیرا چھا گیا اور اس کا جسم ڈھیلا پڑ گیا۔ اس عورت نے اس کے سر کے نیچے ہاتھ دے کر آہستہ سے اس کے سر کو سرہانے پر رکھا اور پھر اس کی ٹانگوں کو اٹھا کر پلنگ پر ڈال دیا۔ اس کے بعد فردوس کو ہوش نہ رہا۔

فردوس کی آنکھ کھلی تو تقی کی والدہ اور تقی کی پھوپھی اس پر جھکی اس کے بالوں کو سہلا رہی تھیں۔ پلنگ کے ایک طرف عالمہ کھڑی تھی، دوسری طرف تقی اور اس کی پائنتی کی طرف دروازے سے چھوٹے آغا داخل ہو رہے تھے۔ ان کو دیکھ کر اس کو اپنی حالت پر بہت شرم آئی اور اس نے اٹھنے کی کوشش کی مگر تقی کی والدہ اور اس کی پھوپھی نے اس کے شانوں پر ہاتھ رکھ دیئے اور ان کے بوجھ سے اس کی کہنیاں بستر پر پھسل گئیں اور اس کے اٹھے ہوئے ہاتھ اس کے پیٹ پر گر گئے۔ اس کے جسم میں اتنی کمزوری ہو سکتی تھی فردوس کے وہم میں کبھی نہ آیا تھا۔ ''عائشہ آخر تمہاری دعائیں فردوس کو کھینچ ہی لائیں۔ چاند دھنش محل سے اتر ہی آیا۔'' چھوٹے آغا نے کہا۔

چھوٹے آغا کی باتوں سے فردوس کے جسم میں گرمی کی ایک بہت بڑی لہر اٹھی اور اس کے سر کی طرف بڑھنے لگی۔ فردوس نے محسوس کیا کہ اس کے ہاتھوں میں، اس کی بانہوں میں، اس کے سارے جسم میں طاقت عود کر آئی ہے اور وہ فوراً اٹھ کر بیٹھ گئی اور تقی کی والدہ اور اس کی پھوپھی کے ہاتھ فضا میں پھڑ پھڑاتے ہی رہے۔

''آغا جی! چچی اور پھوپھی نے مجھے اتنا پیار کیا ہے کہ ہوش کھو دیئے میں نے''

چھوٹے آغا مسکرائے، ان کی آنکھیں چمکیں، انہوں نے تقی کی والدہ اور پھوپھی کی طرف دیکھا، پھر فردوس کی طرف۔ ان کی نظر کبھی فردوس کے چہرے پر رک جاتی اور پھر وہاں سے پھسل پھسل کر تقی کی والدہ اور پھوپھی کی طرف اٹھ جاتی۔ فردوس نہ جانے کتنی دیر اس کھیل کو دیکھنے میں محو رہی اور پھر ایک دم متین صاحب کے خیال سے چونکی اور اس نے اپنی ٹانگیں پلنگ سے لٹکا دیں ایک لمحہ کے لئے کھوئی مگر لوٹ آئی۔ اس نے پاؤں جوتی میں ڈال دیئے اور ایک دم پلنگ سے اٹھ کھڑی ہوئی۔ اس نے یہ سب کچھ اتنی جلدی کیا کہ کوئی بھی اس کی طرف بڑھ نہ سکا، اس کو روک نہ سکا۔ فردوس ایک ہی نظر میں سب کی طرف دیکھتے ہوئے بولی۔

''میں تو بھول ہی گئی تھی کہ میں متین صاحب کو زبردستی غربی کمرے میں بٹھا کر آئی ہوں۔ وہ انتظار کرتے کرتے سوکھ گئے ہونگے اور یہاں رات کتنی ڈھل گئی ہے۔'' تقی کی والدہ اور پھوپھی کی طرف دیکھا۔ اس کی نظریں ان کے چہروں کو ٹٹولتی رہیں۔ پھر تقی اور عالمہ کی خاموشی کا شکریہ آنکھوں ہی آنکھوں میں ادا کیا۔ آخر اس نے ہمت کر کے منہ چھوٹے آغا کی طرف کیا اور ایک لمبا سانس لیتے ہوئے بولی۔

''میں آئی تھی یہ کہنے کہ پرسوں میری سالگرہ ہے۔ میں چاہتی ہوں کہ آپ سب لوگ دھنش محل تشریف لائیں...... آغا جی! سب بندوبست آپ کے سوا کون کر سکتا ہے۔ گاؤں والوں کے لئے بھی تو کچھ کرنا ہوگا۔''

''مجھے یاد تھا بیٹی! میں نے تمہارے کہنے سے پہلے سب بندوبست کر دیا ہے۔''

فردوس کی نگاہیں تشکر سے جھک گئیں اور یونہی جھکے جھکے اس نے سب سے اجازت

چاہی اور چل دی۔ اس کی چال میں اتنا اعتماد اور اس کے قدموں کی چاپ میں اتنی گویائی تھی کہ سب نے سمجھ لیا کہ اس کا اکیلے جانا ہی مناسب ہے۔

بگھی کے گھوڑوں کی ٹراپ ٹراپ سے سب چونکے۔ فردوس جا چکی تھی۔

چوتھا باب

چاندنی اور آواز، چاندنی اور بگھی، بگھی اور گھوڑے، بگھی اور فردوس، فردوس، چاندنی اور آواز سب کے سب ایک دوسرے کے ساتھ ساتھ مگر ایک دوسرے سے بے خبر وقت کی صدراہوں میں محوِ سفر تھے اور وقت؟ فردوس کے سراغ میں نہ جانے کس عالم میں سرگرداں تھا۔

تڑاپ! تڑاپ! گھوڑے چاند کی اُور اڑے جا رہے تھے۔ کھرڑ! کھرڑ! بگھی سسکتی ہوئی کھنچتی چلی جا رہی تھی اور بگھی میں خاموش، ساکت، چاندنی سے، آواز سے، چاندنی میں ناچتے ہوئے کھیتوں، درختوں، ننھے منے پانی کے تھالوں سے بے خبر، سوچ سے، خیال سے، جذبات سے، محسوسات سے، دکھ سے، درد سے، سکھ سے، آنند سے دور، بہت دور، فردوس نہ جانے کن راہوں میں کھوئی، کس کی تلاش میں، کس سے بھاگی چلی جا رہی تھی۔

جب کبھی گھوڑے چاندنی میں اپنے ہی سائے دیکھ کر ڈر کر ہنہناتے تو فردوس لمحہ بھر کے لئے چونک اٹھتی۔ بائیں دیکھتی یا دائیں، اس کے ذہن میں ننھا سا دریچہ کھلتا اور بند ہو جاتا۔ دھیرے چلتی ہوا میں لہراتی ہوئی فصلیں، کھیتوں کے جگمگاتے ہوئے پانیوں میں لرزتی ہوئی چاندنی، کاندھے پر لاٹھی اور لاٹھی سے پوٹلی باندھے، کوئی گھر کو لوٹتا ہوا اکا دکا مسافر، دور سے قریب آتی ہوئی، قریب سے دور جاتی ہوئی دیہاتی گیت کی لے، گھوڑوں

کے سموں اور دھرتی پر سوئے ہوئے پانی کے تصادم کا شور، اس تصادم سے ہوا میں اڑتی ہوئی بوندوں کی چمک، دور افق کے کاندھے پر کسی جھونپڑے کے ننھے سے دریچے میں سو جانے کی کوشش کرتا ہوا ٹمٹماتا ہوا چراغ، یہ سب کچھ اس کے ذہن کے افق پر کوندتا اور پھر ہر طرف گھور اندھیرا چھا جاتا۔ اس اندھیرے میں خیال سوچ سے، سوچ جذبات سے، جذبات محسوسات سے الگ، بے خبر جہاں ہوتے وہیں دبک جاتے، کوندے کا انتظار کرتے۔

کبھی کبھی بگھی کے گھومتے پہیوں کو کوئی چھوٹا سا، پتھر چھیڑ دیتا، پہیے بدکتے فردوس کے جسم کو دھچکا لگتا اور فردوس کے من کے، چت کے دوار کھل جاتے اور ہر بار ان ادھ کھلے پٹوں سے ایک ہی خیال جھانکتا: دھنش محل میں متین صاحب ہونگے؟

فردوس اس خیال کی تاب نہ لاسکتی اور ایک ہی ساتھ من کے، چت کے دوار بند کرنے کی کوشش کرتی۔ چت کے دوار بند کرنے میں کامیاب ہو جاتی تو من کے دوار کھلے رہ جاتے اور من کے دوار بند کرنے میں کامیاب ہو جاتی تو چت کے دوار کھلے رہ جاتے۔ اس دوار سے یا اس دوار سے اب ایک نیا خیال دہلیز پر سینہ تانے کھڑا نظر آتا! متین صاحب ہونگے تو کیوں؟ وہ اپنی کوشش تیز کر دیتی مگر کامیابی نصیب نہ ہوتی کبھی اُس دوار کو تکتی، کبھی اس دوار کو۔ ہر بار ایک نیا خیال پرانے خیالوں کے سنگ ایک بھرپور نظر کا طلبگار ہوتا۔ ''میں کیوں چاہتی ہوں کہ متین صاحب میرے انتظار میں ہوں؟ میں ان سے کیا چاہتی ہوں؟ وہ میرے انتظار میں کیوں ہونگے؟ ان کو مجھ سے کیا چاہئے؟ ہم ایک دوسرے کا سامنا کیسے کرینگے؟ میں ان سے کیا کہوں گی؟ وہ مجھ سے کیا کہیں گے؟ پھر کیا ہوگا؟ وہ وہاں نہ ہوئے تو کیا ہوگا؟''

جب اس کی نظر آخری موہنی صورت سے واپس لوٹنے لگتی تو دونوں دوار نہ جانے کیسے ایک ہی ساتھ بند ہو جاتے۔ اس کے کان سنتے کہ اس نے ایک لمبا سانس لیا ہے۔ اس کا سر ایک بار پھر بگھی کی نرم نرم دیوار سے جا لگتا، اس کی آنکھیں بند ہو جاتیں اور وہ وقت کی اندھیری صدراہوں میں کھو جاتی۔

کھڑ! کھڑ! تڑاپ! تڑاپ! تڑاپ! گھوڑوں کے سموں کی آواز میں، بگھی کے

پہیوں کی آواز میں، ایک کرختگی، ایک رعب آ گیا تھا۔ آواز کانوں کو چیرتی ذہن اور دل پر تھپیڑے مارنے لگ گئی۔ فردوس کے دل سے ایک چیخ اٹھی، سسکی بن کر آواز میں کھو گئی۔ فردوس کا دل پھڑ پھڑانے لگا۔ اس کا ذہن بلبلانے لگا۔ اس نے ایک دم بایاں ہاتھ دل پر تھام لیا، اس کا ہاتھ جلنے لگا، اس نے جلدی سے ہاتھ سینے سے ہٹا لیا۔ تڑاپ! کھرڑ! تڑاپ! کھرڑ! تڑاپ! کھرڑ! اس کے کان پھٹے جارہے تھے۔ اس نے دونوں ہاتھ کانوں پر رکھ لئے، ہاتھوں سے کانوں کو پسینے لگی۔ اس کے کان جلنے لگے، اس نے گھبرا کر دائیں دیکھا: لوہے کی لمبی لمبی، چوڑی چوڑی، چپٹی سلاخوں کی ایک قطار کے سایے ایک وسیع سبزہ زار پر لڑکھڑاتے ہوئے رینگ رہے تھے۔ اس کے ذہن میں کوند گیا "اوہ! گھوڑوں کا فارم! گھوڑے اس سمے کہاں ہونگے؟ اپنے اپنے اسٹالوں پر آنکھیں بند کئے کیا سوچتے ہونگے؟ کیا میری طرح سوچ کے بس میں ہونگے؟ نہیں! کیسے؟ یہ دکھ میرا ہے! اور صرف مجھی کو ہے!...... یا شاید متین صاحب کو"۔

متین صاحب کا دھیان آتے ہی اس نے دائیں سے بائیں مکھ پھیر لیا۔ سڑک بھاگی جارہی تھی۔ سڑک کے ساتھ ساتھ ذرا ذرا اونچی دیوار کے ساتھ گھاٹی سے پرے، کھائی کے ساتھ ساتھ، پتلی سی سڑک سے، پتھریلی اونچی دیوار، دیوار کے اوپر لمبی لمبی، ہوا میں لہلہاتی ہوئی گھاس، سڑک کے ساتھ ساتھ دوڑے چلے جارہی تھی، فردوس ان سب کو تکے چلی گئی۔ ایک دم گھاس پر سایہ لہرایا۔ فردوس کا دل اچھلا۔ سایہ ختم ہوتے ہی ایک ڈالی اور ڈالی پر ایک بڑا سا پھول پاؤں جمانے میں کوشاں، پھول دیکھتے ہی اس کا دل سینے میں سو گیا۔ گھاس لہلہاتی رہی، پتھریلی، پتلی سی، دیوار سڑک کے ساتھ ساتھ مگر دور ہٹتی ہوئی بھاگتی رہی۔ فردوس کی آنکھیں بند ہونے لگیں اور پھر جھٹکے سے کھلیں اور اس کے ذہن میں ایک لمبا، انسانی سایہ کوند گیا۔ اس کے لب کھلے۔ اس کی آنکھوں نے دیوار پر ایک انسانی صورت کی پشت دیکھی۔ اس صورت کے سر سے ذرا اوپر چاند کا ایک کونہ ابھر رہا تھا۔ چاندنی میں اس صورت کے کان، کانوں کے ساتھ کھڑے بال چمک رہے تھے۔ شاید صورت چاند کو تک رہی تھی؟ فردوس کا سارا بدن کانپ گیا۔ اس کے حلق سے ایک چیخ ابھری اور لبوں کے ساتھ

لپٹ کر سو گئی۔ صورت، چاند کا ابھرتا ہوا کونا گم ہو چکے تھے۔ فردوس سکتے میں تھی۔ بگھی اڑی جا رہی تھی۔ سڑک، سڑک کے ساتھ کھائی اور کھائی کے ساتھ دیوار اور دیوار پر اگی ہوئی گھاس سب تیز تیز بھاگے جا رہے تھے۔ فردوس ایک دم بگھی کی سیٹ میں مڑی، اس نے گردن موڑ کر بگھی کی پشت میں لگے ہوئے شیشے میں سے دیکھا سڑک آفاق میں گم ہوتی جا رہی تھی۔ اس نے دائیں نظر گھمائی۔ کھائی اور چاندنی کے بیچوں بیچ، سیاہ، پھیلتی ہوئی، ساکت، غیر مرئی سڑک بگھی کے ساتھ ساتھ چلی آتی تھی۔ اس کھائی کی دائیں دیوار پر گھاس ہی گھاس تھی۔ صورت کا نشان تک نہ تھا۔ اسکی نظر چاندنی میں جذب ہونے لگی، چاندنی اندھیرے میں جذب ہوگئی۔ فردوس کو کچھ نظر نہ آتا تھا۔ وہ گھبرائی، مڑی اور مڑ کر بگھی کی پشت سے پشت لگا کر دراز ہوگئی۔ اس نے کچھ لمحوں کے بعد دھیرے دھیرے آنکھیں کھولنا شروع کیں۔ سامنے کی سیٹ پر چاندنی کھیل رہی تھی۔ ''وہ دیکھ سکتی تھی۔'' اس خیال سے اس کے جسم میں بجلی سی کوند گئی۔

پتھریلی، گھاس والی، دیوار ہر لحظہ اونچی ہوتی جا رہی تھی۔ دیوار آخر ختم ہوگئی، دھنش محل کی چھت کے کونے چاندنی میں چمکے اور بلندیوں میں گم ہو گئے۔ تڑاپ! تڑاپ! تڑاپ! کھرڑ! کھرڑ! سڑک کے دونوں طرف پتھریلی دیواریں اور پھر ایک ساتھ اندھیرا۔ اندھیرے میں گھوڑوں کے سموں کی آواز گونجتی رہی، بگھی کے پہیے سسکتے رہے۔ بگھی اندھیرے سے چاندنی میں لوٹ آئی اور مڑی، سڑک چاندنی کی اور چڑھنے لگی۔

فردوس کا دل گھوڑوں کے سموں کی تڑاپ تڑاپ تڑاپ کے ساتھ دھک دھک کرنے لگا۔ اس کے جسم میں کھلبلی سی مچ گئی اور وہ بگھی سے اترنے کے لئے بے تاب ہوگئی مگر بگھی رکتی ہی نہ تھی۔ اس کی دھک دھک تیز ہوتی گئی اور اس کے دل کے دھڑکنے کے سوا کوئی شور نہ رہا۔

آخر بگھی رکی۔ ایک لمحے کے لئے اس کو بگھی رکنے کا یقین نہ آیا۔ اس نے پوری کوشش سے سننے کی کوشش کی۔ پہیوں کی آواز بند تھی۔ اس نے سیٹ پر کھسکنا شروع کیا اور آخر ہمت کر کے اس نے پائدان پر دایاں پاؤں رکھ ہی دیا اور پھر دوسرا پاؤں۔ پائدان ڈولا

اوراس کے ساتھ اس کا جسم بھی ڈول گیا۔ اس نے اچھل کر دونوں پاؤں زمین پر جما دیئے اور جمی کھڑی رہی اور پھر ایک دم تیز تیز قدم اٹھاتی سڑک سے چاندنی کی طرف چڑھنے لگی۔ سڑک ایک بڑے صحن میں جا کر ختم ہوئی۔ اس نے چاروں طرف دیکھا۔ چاندنی کے سوا کوئی نہ تھا۔ سامنے ڈھلوان کے اوپر بائیں طرف کتب خانے کے دروازے کے شیشوں میں سے چاندنی میں کمرے کی چھت سے لٹکا ہوا ایک فانوس جگمگا رہا تھا۔ تیزی سے کتب خانے کی طرف بڑھی۔ کتب خانے کی دیواریں، دیواروں کے ساتھ لگے ہوئے کتابوں کے شیلف، کمرے میں رکھا ہوا فرنیچر نظر میں کھبتا چلا گیا۔ اس نے کمرے میں جھانکا۔ کوئی نہ تھا۔ کتب خانے کی بیرونی دیوار کے بائیں صحن کی دیوار کے ساتھ نیچے نظر ڈالی۔ نیچے، بہت نیچے تک، اندھیرا ہی اندھیرا تھا۔ اس نے محسوس کیا کہ اس کا سر اس کے شانوں سے لڑھک کر کھائی میں جا گرا ہے۔ وہ سر کے دھم سے نیچے پہنچے کی آواز کا انتظار کرنے لگی۔ اس کی گردن میں، اس کے سینے میں درد ہونے لگا۔ اس نے گردن اٹھائی، کمر سیدھی کی، ایک لمبا سانس لیا اور دروازہ کھول کر کمرے میں داخل ہوگئی۔ وہ آج پہلی بار کتب خانے میں داخل ہوئی تھی۔ دیواروں کے ساتھ فرش سے چھت تک بے در الماریوں میں کتابیں ہی کتابیں تھیں۔ کمرے کے بیچ ایک بڑی میز رکھی تھی۔ اس میز کے سامنے پانچ کرسیاں رکھی تھیں اور میز کی دوسری طرف ایک کرسی۔ میز کے سامنے کی طرف کتابیں لگی تھیں۔ باقی میز پر ایک بڑا شیشہ رکھا تھا۔ فردوس کی نظر کتابوں کی الماریوں، فرنیچر پر پھسلتی ہوئی اس کے بائیں، الماریوں کے بیچ ایک قد آدم کھڑکی پر جا کر رکی۔ کچھ لمحے وہ اس کھڑکی کو تکتی رہی، اور پھر اس کی طرف بڑھ گئی۔ اس نے کھڑکی کے شیشوں میں جھانکا۔ کھڑکی کی چوکھٹ سے شروع ہو کر سامنے دور آفاق تک جاتی ہوئی ایک بہت ہی کم چوڑی دیوار تھی۔ اس پر سبزہ اُگا تھا۔ ''اوہ!'' فردوس بڑبڑائی اور اس نے سوچا یہ وہی دیوار ہے جو آتے ہوئے بگھی سے نظر آئی تھی۔ اس دیوار پر کوئی کیسے چل سکتا ہے؟ گر پڑے گا فوراً کھائی میں۔ اس دیوار پر کھڑے دیکھا تو تھا میں نے، وہم ہوگا؟ نہیں! ایسا نہیں ہوسکتا۔ کون ہوسکتا تھا؟ متین صاحب؟''

متین صاحب کا خیال آتے ہی وہ ایک دم مڑی، کمرے سے باہر نکلی اور کتب خانے

کے دائیں چھت دار گلی میں داخل ہوگئی۔گلی کی بائیں دیوار میں بنے ہوئے روشندانوں سے چاندنی گلی میں داخل ہورہی تھی۔ وہ بھاگنے لگی اور بھاگتے بھاگتے گلی کے موڑ تک چلی گئی۔ مڑی، رکی۔ کمرے کا دروازہ کھلا تھا۔ وہ دروازے کی طرف بڑھی۔ دہلیز پار کی۔ اسے کمرے میں متین صاحب نظر نہ آئے۔ اس نے ان کو پکارا۔ چاندنی میں ایک سایہ لرزا، انسانی صورت اختیار کرنے لگا۔سایے میں خدوخال ابھرے اوراس نے دیکھا کہ ایک کرسی کے سایے میں ایک دھڑ سیدھا ہورہا ہے۔ دھڑ کا سایہ کرسی کی پشت کے سایے میں پیوست ہورہا ہے۔ دھڑ نے سر اٹھایا، چہرے کے خدوخال نمودار ہوئے۔فردوس نے ایک دم نگاہیں اٹھائیں۔متین صاحب ایک کرسی میں بیٹھے اس کی طرف تک رہے تھے۔فردوس کے لب کھلے اوراس نے کھٹ سے اپنا بایاں ہاتھ اٹھا منہ پر رکھ لیا۔

''سوچتا تھا کہ اس کرسی پر بیٹھے بیٹھے نہ جانے کتنی صدیاں بیت جائیں۔ میں نے تمہیں اپنے خیالوں میں بہت ڈھونڈا مگر تم کہیں نہ تھیں۔ دل میں بہت ڈھونڈا تمہارا سراغ نہ ملا۔اب دل، خیال، احساس، وقت سب کے سب تھک کر سو گئے ہیں......''

فردوس کے من میں نہ جانے کتنی دیر مینہ برسا۔ اس کو ٹھنڈ لگنے لگی۔ اس کا جسم کانپنے لگا۔ اس کی روح جسم سے نکلنے لگی۔ اس نے ہونٹ بھینچ لئے۔ اس کے سینے سے ایک لہر اٹھی۔ آواز اس کے حلق سے اس کے ہونٹوں کو چیرتی ہوئی باہر نکلی۔

''متین صاحب!''

اس کے بعد اس کے سینے سے لہر اٹھی اور وہ سسکیاں لے لے رونے لگی۔ اس کی آنکھیں دھندلا گئیں۔ کمرے کی ہر شے دھندلا گئی۔متین صاحب کو اس نے ایک بار پھر کھو دیا۔اس کے سینے سے ایک بہت بڑی لہر اٹھی۔

''م م تی ن صاحب!'' وہ تلملا کر چیخی اور سسکیاں لیتے ہوئے متین صاحب کی طرف بڑھی، ان کے پاس پہنچ کر گھٹنوں کے بل گر پڑی اور ان کے زانوؤں پر سر رکھ کر زار زار رونے لگی اور پھر روتے روتے سو گئی۔

پانچواں باب

ٹخنے سے ٹخنہ ملائے اس کے پاؤں، اس کی پنڈلیاں، اس کے پہلو متین صاحب کی ٹانگوں کے حصہ میں پڑے اطمینان سے سو رہے تھے۔ اس کے دائیں کولہے کے، اس کی ڈھلوان کمر کے خم، اس کی بانہوں کی اوٹ سے جھانکتے ہوئے انگ، اس کی گردن کے خموں میں، اس کے لباس کی سلوٹوں میں، اس کے چمکتے ہوئے بالوں میں، اس کے لباس سے ابھرتے ہوئے انگ میں کتنا امن تھا، کتنی نیند تھی، کتنی جوان تھی وہ نیند۔

فردوس کے سوئے خموں کو، اس کے لباس کی سلوٹوں کو، اس کے لباس سے ابھرتے ہوئے انگوں کو تکتے، اس کے بالوں سے، اس کے لباس سے، اس کے جسم سے اٹھتی ہوئی خوشبوؤں کو سونگھتے متین صاحب کے دل کی اتھاہ گہرائیوں سے ایک موج اٹھی جس میں ماں کا سا پیار، ماں کے دل سے اٹھتی ہوئی رحمت بھری دعا تھی۔ انہوں نے سوچا کہ اگر وہ اس کی ماں ہوتے یا آج اس کی ماں زندہ ہوتی تو فردوس کے دکھ کا مداوا کرتی، پیار کی نظروں سے اس کی ڈھارس بندھاتی، نرم نرم شفقت سے معمور ہاتھوں سے اس کے بالوں کو، اس کی کمر کو سہلاتی اور فردوس اس طرح دنیا سے، اپنے آپ سے مطمئن ہو کر سو جاتی اور جب اٹھتی تو سارے عالم کو اپنی جوان آرزوؤں سے ہم آہنگ پاتی۔

مگر وہ اس کی ماں نہ بن سکتے تھے۔ نہ اس کی ماں زندہ ہوسکتی تھی۔ نہ اس آرزو کی پرورش کا سامان مہیا کر سکتے تھے جو اس کے دل میں جنم لے چکی تھی۔ اس کی آرزو کو تکمیل کے لئے کس کس راہ سے، کس کس منزل سے ہو کر گزرنا ہوگا وہ یہ بھی تو نہ جانتے تھے۔ بس اتنا وہ محسوس کر سکتے تھے کہ وہ فردوس کے لئے ایسا پل تھے جس سے گزر کر ہی وہ اپنے بچپن کی آرزوؤں کی تسکین، اپنی جوانی کے خوابوں کی تعبیر، اپنی حیات کے عروج کی منزلوں کو طے کر سکتی تھی۔ وہ یہ بھی محسوس کر رہے تھے کہ ان کا فرض ہے کہ وہ فردوس کو اس احساس سے آشنا کرائیں اور ان کو پل کی طرح استعمال کرنے پر راضی کریں۔ وہ اس فرض کو ادا کرنے کے لیے بڑی سے بڑی قربانی دینے اور اپنی روح کو بڑے سے بڑے جوکھم میں ڈالنے کے

لئے تیار تھے۔مگر کیسے؟ فردوس کا پناہ ڈھونڈتا ہوا جسم، اطمینان کی متلاشی اس کی روح، اس کے دل کی تمام آرزوئیں تو اس وقت ان کے حضور جھکی ہوئی تھیں۔ وہ اگر اس کو سب کچھ بتا بھی دیں اور وہ اس کو قبول کرنے پر راضی نہ ہو تو اس کی آنکھوں کی پہنائیوں سے ابھرتی ہوئی طنزیہ مگر پیار بھری، اطاعت بھری مسکراہٹ کا مقابلہ کیسے کر سکیں گے؟

اس موج کا زور ختم ہوتے ہی ان کے دل سے ایک اور موج اٹھی اور پہلی موج کو اپنے میں گم کرتی ہوئی متین صاحب کے ذہن اور تخیل پر چھانے لگی۔ وہ فردوس کے ساتھ تمام زندگی بتانے کے سہانے خواب دیکھنے لگے۔ان کے جسم کے ذروں میں ایک شعلہ کروٹیں لینے لگا۔ان کے دماغ کے ذرے رقص کرنے لگے۔شعلہ جواں ہونے لگا، رقص تیز ہونے لگا، خواب حسین سے حسین تر ہونے لگے۔ان کے حسن میں گداز آنے لگا۔ان کے دماغ سے سنسنی کا ایک کارواں مشعلیں لیے ریڑھ کی ہڈی کی راہ سے جسم کے ذرہ ذرہ کو منور کرتا، ان جانے جزیروں کے گیت گاتا، ان کی بانہوں کی طرف، ان کے ہاتھوں کی طرف بڑھنے لگا۔ان کی بانہیں سنسنانے لگیں، ان کے ہاتھ مچلنے لگے۔ان کے گلے کے دروازوں پر ایک آواز دستک دینے لگی مگر انہوں نے اپنے گلے کے دروازوں کے کواڑ سختی سے بند کر لئے۔ دستک تیز، تیز تر ہوتی گئی۔ان کے جبڑے ان کے ہونٹ تھکنے لگے، تھکتے تھکتے ہارنے لگے۔سنسنی سے، دستک کے زور سے متین صاحب بے بس ہوا چاہتے تھے، ان کے مچلتے ہوئے ہاتھ فردوس کو جھنجھوڑ کر جگایا چاہتے تھے۔ان کے گلے کے دروازوں پر دستک دیتی ہوئی آواز کواڑ توڑ کر، ان کے بھنچے ہوئے ہونٹوں کو چیر کر فردوس کے کانوں میں گونجنا چاہتی تھی کہ

''میں زماں ہوں تو مکاں ہے۔آ بانہوں میں بانہیں ڈالے ابدیت کی تمام منزلیں طے کر ڈالیں۔کونین و عالمین سے اس دنیائے آب وگل کا دھندلا سا نقش بھی مٹا دیں۔آ تیرے اور میرے ملاپ سے ایک ایسا عالم جنم لے جو پہلے کبھی نہ تھا۔آ زماں زماں نہ رہے مکاں مکاں نہ رہے۔''

انہوں نے نظریں جھکائیں، سر جھکایا۔انہوں نے اپنے مچلتے ہوئے ہاتھ فردوس کے

بالوں پر رکھ دیئے۔ان کے لب ہلے، پھڑ پھڑائے،فردوس کے نرم نرم، ریشمی بالوں سے ان کے ہاتھ پھسلتے ہوئے، اس کی گردن کے خم کو سہلاتے اس کے سوئے سوئے شانوں پر جا رکے۔ان کی انگلیاں اس کے لباس سے ابھرتے ہوئے، اس کی گردن میں جذب ہوتے ہوئے انگ کو محسوس کرنے لگیں۔ان کے گلے کے دروازوں کے کواڑ کھٹ سے کھل گئے، ان کے لب نیم وا ہوئے مگر آواز کا ریلا ان کے ادھ کھلے ہونٹوں کے کناروں پر آ کر رک گیا۔ وہ حیران تھے کہ ایسا کیوں۔ان کے ہاتھوں کے انگوٹھوں نے محسوس کیا کہ فردوس کی گردن کا خم سیدھا ہو گیا ہے، ان کے زانوؤں پر بوجھ کم ہو گیا ہے۔فردوس کے جسم سے ابھرتے ہوئے گردن میں جذب ہوتے ہوئے رنگ اس کے بالوں کی سیاہی اور چمک میں کھو گئے، اس کے بالوں کی سیاہی اور چمک اس کی دمکتی ہوئی پیشانی کے نور میں، اس کی گہری، بڑی بڑی آنکھوں کی ابلتی ہوئی نیلاہٹوں میں، اس کے چہرے کے شعلوں میں گم ہونے لگی۔

متین صاحب کے ہونٹوں کی پھڑ پھڑاہٹ بند ہوگئی، ان کے ہونٹوں، ان کے ہاتھوں، ان کے جسم پر غنودگی چھا گئی مگر ان کی آنکھیں، ان کے کان ابھی جاگتے تھے۔ان کی نگاہیں فردوس کے چہرے کے کسمساتے ہوئے نقوش کو سہلانے لگیں۔فردوس کی نگاہیں ان کی نگاہوں کی شوخی پر مسکرانے لگیں۔اس کے چہرے کے نقوش نے ایک کروٹ لی، ایک نیا روپ بدلا، اس کے گلابی ہونٹوں پر منور سی مسکراہٹ بل کھا کر اٹھی اور رقص کرنے لگی، رقص کرتی رہی، کرتی رہی۔متین صاحب چہرے کے جیالے روپ کو، مسکراتی نیلاہٹوں کو، رقص کرتی ہوئی مسکراہٹ کو دیکھا کئے۔ دیکھتے ہی رہتے مگر فردوس کے لب ہلے، کھلے، دانت چمکے، ایک مدھم مدھم شور فضا میں رچنے لگا۔شور کی رچنا آواز میں ڈھل گئی۔متین صاحب کے ذہن نے آواز میں معنی کو تلاش کرنا شروع کیا، معنی کا روپ نظر آنے لگا۔فردوس کہہ رہی تھی۔

''میں نے سوتے ہی ایک خواب دیکھا ہے۔ ہر طرف پانی ہی پانی ہے، نیلا، شفاف، گہرا گہرا۔ پانی کے اوپر تاروں بھرا، نیلا نیلا آسمان، آسمان اور پانی کے درمیان سفید سفید

پرندوں کے متحرک سایے۔ کہیں آواز کا نشان نہیں۔ ان پانیوں میں دور آفاق کی سرحد کے قریب ایک کشتی۔ کشتی قریب، قریب تر آنے لگی۔ پانی میں جزیرے ابھرنے لگے، جزیروں میں اونچے اونچے ہرے ہرے درخت، ان درختوں پر سرخ سرخ، پیلے پیلے، نیلے نیلے پھل، ان درختوں کے درمیاں، چپے چپے میں گلستاں اور ان گلستانوں میں گلوں کے سائے میں سوئی ہوئی عجیب صورت خلقت، جن سے دل میں خوشی بھی اور خوف بھی پیدا ہوتا ہے۔ ان گلستانوں سے دور ان جزیروں کے درمیان وہ کشتی ناخدا کے بغیر تھرکتی چلی آ رہی تھی۔ اس کشتی میں کوئی نہ تھا۔ منظر بدلا۔ گلستاں نہ تھے، جزیرے نہ تھے۔ پانی ہی پانی ہے۔ آسماں پر تارے نہیں ہیں۔ بادل ہی بادل، کالے کالے، ڈراؤنے۔ ان بادلوں کے سایے میں پانی پر وہی کشتی۔ کشتی بالکل قریب آ گئی ہے۔ کافی بڑی ہے۔ اس میں ایک کونے میں ایک دھڑکتا ہوا لبادہ۔ لبادے میں جنبش پیدا ہوئی ہے۔ ہاتھ، بانہیں باہر نکلی ہیں۔ عورت کے ہاتھ ہیں۔ عورت انگڑائی لے رہی ہے۔ وہ اٹھ رہی ہے۔ لبادہ اس کے سر سے اس کے سینے سے ڈھلک گیا ہے، اس کے زانوؤں پر آ رہا ہے۔ ہوا چلنے لگی ہے۔ ہوا میں عورت کے بال اڑنے لگے ہیں۔ ہوا تیز تیز چلنے لگی ہے۔ کشتی گھوم رہی ہے۔ اوہ! دور سے دھماکوں کی آواز آنے لگی ہے۔ عورت ڈر گئی ہے۔ دھماکے تیز تیز ہو رہے آفاق پر کوندے لپکنے لگے ہیں۔ اب شعلے بھی صاف دیکھائی دے رہے ہیں۔ اب شعلے کشتی کی اُور لپکنے لگے ہیں۔ کشتی کے چاروں طرف شعلوں کا عکس ناچ رہا ہے مگر کشتی ابھی تک دھندلکے میں ہے۔ عورت کشتی میں ادھر سے ادھر دوڑ رہی ہے۔ اس کو کون بچائے۔ بہت زور سے دھماکہ ہوا ہے۔ شعلے بلند ہو رہے ہیں۔ پانی اور بادلوں کے درمیان شعلے ہی شعلے ہیں۔ ہر طرف شور ہی شور ہے۔ اس شور میں اب لوگوں کی چیخ و پکار، عورتوں کی آہ و بکا، ان کی سسکیوں کی آواز صاف صاف سنائی دے رہی ہے۔ کیا ہو رہا ہے یہ۔ اوہ! یہ گرج۔ بادل گرجا ہے یہ بجلی چمکی ہے۔ بادل سرخ ہو گئے ہیں، پانی سرخ ہو گیا ہے۔ کشتی منور ہو گئی ہے۔ اس سرخی میں اس عورت کا لباس، اس کی پشت جگمگا اٹھی ہے۔ اس نے ریشمی سنہرے کپڑے پہنے ہیں۔ اس کے بالوں میں پھول گندھے ہیں۔ اس نے زیور پہن رکھا ہے۔ اس کے ہاتھوں میں ہائے! مہندی لگی ہے۔ اس کے چہرے کا ایک رخ نظر آیا مگر پہچانا نہیں گیا۔ کون ہے یہ، کس کی دلاری ہے، یہ

کس کی پیاری ہے، کس کے کھوج میں ہے یہ۔ پیا کے؟ کون ہے اس کا پیا؟ کہاں ہوگا اس کا پیا؟ وہ کب تک یونہی نیّا میں پڑی رہے گی؟ نیّا کب تک یونہی چپوؤں کے بغیر پانیوں میں سرگرداں رہے گی؟ بادل گرجا! مینہ برسنے لگا ہے۔ مینہ تیز ہو رہا ہے۔ عورت بھیگ رہی ہے۔ پانی سے لہریں اٹھنے لگیں ہیں۔ بڑی بڑی لہریں۔ نیّا ڈول رہی ہے۔ لہروں کے تھپیڑے اس کو آفاق کی اُور دھکیلنے لگے ہیں۔ لہریں، لہروں پر نیّا، نیّا میں عورت بیہوش پڑی ادھر سے ادھر لڑھک رہی ہے۔ اب کیا ہوگا؟

منظر اب پھر بدلا ہے۔ پانی ہی پانی ہے مگر آفاق کی سرحدوں پر سفید بادلوں کی چمک میں زمین نظر آتی ہے۔ آفاق، چمکتے ہوئے بادل قریب آ رہے ہیں۔ خشکی کے کنارے کنارے کشتی دھیرے چلتی ہوئی ہوا سے ڈول رہی ہے۔ کشتی خالی ہے۔ عورت کہاں گئی؟ ڈوب گئی؟ نہیں! وہ دیکھو وہ سامنے بن کی اور جا رہی ہے۔ بن قریب آ رہا ہے۔ عورت قریب آ رہی ہے۔ عورت اور بن میں ایک دوقدم کا فاصلہ ہے۔ عورت اور بن نیچے جا رہے ہیں۔ اب نیچے عورت ہے، بن ہے، پانی ہے۔ بن کے افقی درختوں کی بلندترین شاخوں پر روشنی پڑ رہی ہے۔ تمام بن منور ہو گیا ہے۔ اس بن میں ایک شہر ہے۔ عورت بن میں داخل ہونا چاہتی ہے۔ عورت مڑی ہے۔ کیوں؟ چاند نکل آیا ہے۔ اس کے بال روشن ہو رہے ہیں۔ اس نے چاند کی اُور منہ پھیرا ہے۔ اس کا ماتھا، اس کی آنکھیں، اس کا چہرہ صاف نظر آ رہا ہے۔ میں پہچان رہی ہوں۔ اوہ! میں...... میں ہوں...... وہ عورت میں ہی ہوں......''

فردوس کی آواز گونجنے لگی اور پھر ایک دم اس کے ہونٹوں پر سو گئی۔ وہ متین صاحب کے زانوؤں پر بازو پر بازو رکھے بیٹھی تھی، اس کا چہرہ متین صاحب کے چہرے کی طرف اٹھا ہوا تھا۔ اس کے سینے سے رنگ کا ایک طوفاں اٹھ رہا تھا۔ اس کے سینے کا لباس تن گیا تھا۔ اس کے ماتھے پر پسینے کی بوندیں چمک رہی تھیں۔ اس کے پسینے میں خوشبو تھی۔ خوشبو سے متین صاحب کا دم گھٹنے لگا۔ انہوں نے فردوس کے شانوں سے ہاتھ کھینچ لئے۔ کرسی کے بازوؤں پر ہاتھ جما کر اٹھنے لگے مگر مسکراتی ہوئی فردوس نے ان کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالتے ہوئے اپنے جسم کا سارا بوجھ بانہوں کے راستے ان کے زانوؤں پر ڈال دیا۔ ان کی

تنی ہوئی بانہیں، تنا ہوا جسم ڈھلک گئے اور وہ بے بسی سے فردوس کے فتح کی خوشی سے رچے ہوئے چہرے کو، اس کے نینوں کی مسکراہٹ کو، اس کے جسم سے، لباس سے نکلتے ہوئے رنگوں کو دیکھنے لگے، ان میں کھونے لگے۔

''وعدہ کیجئے کہ آپ اس گھر سے میری اجازت کے بغیر نہ جائیں گے۔ میں وعدہ کرتی ہوں کہ میں اس گھر سے آپ کی اجازت کے بغیر کہیں نہ جاؤں گی۔ اس گھر میں کیا نہیں۔ موسیقی ہے، علم ہے، اس کے شمال کی طرف پہاڑ ہیں۔ پہاڑوں سے نکلتی ہوئی ندیاں آپ کے چرنوں میں بہیں گی۔ یہ گھر چاند کے، سورج کے قریب ہے۔ یہاں پیار ہے یہاں میں ہوں......''

فردوس کے گلابی ہونٹ تھرتھرا رہے تھے، اس کے نینوں میں آنسو تیر رہے تھے۔ اس کے چہرے کے نقوش میں، اس کے جسم کے خموں میں وجد بیدار ہو رہا تھا۔ متین صاحب کا جی چاہنے لگا کہ وہ کہہ دیں ''میں وعدہ کرتا ہوں'' اور کہتے ہی اس کے جسم کی محرابوں میں ہمیشہ ہمیشہ کے لئے سو جائیں۔ مگر پیشتر اس کے کہ ان کی آرزوئیں زبان پائیں ان کے جسم میں بجلی کوند گئی۔ ان کے دل میں، ان کے سینے میں، ان کے ذہن میں، ان کے تخیل میں نور ہی نور بھر گیا۔ ان کی آرزوئیں نور میں ڈھل گئیں۔

انہوں نے اپنے زانوؤں سے فردوس کے بازو ہٹائے۔ اس کو شانوں سے پکڑ کر فرش سے اٹھا کر کھڑا کر دیا اور خود بھی کھڑے ہو گئے۔ اس کی طرف دیکھا۔ ان کی نظروں میں نور تھا۔ اس نور کے سائے فردوس کی آنکھوں میں تیرنے لگے۔ نور اس کے دل میں اترنے لگا۔ متین صاحب نے اس کے بائیں شانے پر دایاں ہاتھ رکھا اور پھر پورا بازو اس کے دونوں شانوں پر اور پھر بازو کے زور سے اس کو پہلو میں لیا اور شیشے کی دیوار کے قریب لے گئے۔ دیوار میں سے دور تک پھیلتا ہوا سبزہ زار، قریب قریب بہتی ہوئی اور افق کے قریب جا کر مل کر بہتی ہوئی ندیاں چاندنی میں صاف دکھائی دے رہے تھیں۔ دور سامنے کے افق پر ایک قندیل اڑ رہی تھی۔

فردوس نے سوچا یہ چاندنی، یہ ندیوں کا سنگم، یہ اڑتی ہوئی قندیل یہ سب ملاپ کی

دلیل ہیں، ملاپ کی دعوت ہیں۔ اس کا دل پیار سے بھر گیا اور اس نے متین صاحب کی طرف دیکھا۔ وہ کچھ کہنے کا ارادہ کر رہے تھے۔

''یہ اڑتی ہوئی قندیل کسی کے بیاہ کی خبر دے رہی ہے مگر خود اس پر کیا بیتے گی تم نے شاید نہیں سوچا۔ یہ ندیاں افق پر مل کر بہتی ہوئی نظر آتی ہیں مگر بالکل ساتھ ساتھ بہتے ہوئے بھی مختلف کناروں میں بہتی ہیں۔ جب کبھی ان ندیوں میں طغیانی آتی ہے تو یہ دونوں ایک ہو جاتی ہیں مگر طغیانی گزر جانے کے بعد پھر یہ اپنے اپنے کناروں میں واپس لوٹ جاتی ہیں۔ ان کے منبعے الگ، ان کے مرجعے الگ، ان کی راہیں الگ، ان کا سفر الگ، ان سے سیراب ہونے والی، ان سے تاراج ہونے والی زمینیں الگ، اور یہ چاندنی ہمیشہ ملاپ کا سندیسہ نہیں لاتی۔ یہ کبھی کبھی فراق کی خبر بھی دیتی ہے۔ ان کے کہنے میں نہ آؤ۔ کسی دن منہ اندھیرے اٹھ کر صبح کا استقبال کرنا، صبح کے ستارے سے پوچھنا۔ وہ تمہیں تمہاری منزل کا پتہ دے گا، تمہارے پیا کا نشان دے گا۔''

''فردوس کے چہرے پر گھٹا چھا گئی۔ اس کے لب کھلے، رندھی ہوئی آواز میں دھیرے دھیرے کہنے لگی۔

''میرا صبح کا تارا کب نکلے گا میں نہیں جانتی۔ مگر آپ سے اتنی درخواست ہے کہ جب تک آپ کو داوَدنگر کے علاوہ کہیں سے بلاوا نہ آئے آپ یہاں سے نہ جائیں گے۔ اسی گھر میں رہیں گے۔ میں ....ابھی ابھی............سوچتی تھی...... پرسوں میرا جنم دن ہے۔ اس دن سب سے اپنی منزل تک پہنچ جانے کا، اس کی خوشی کا اعلان کرونگی......مگر اب......''

''ہر لمحے کا وقت مقرر ہے۔ کوئی لمحہ اپنے معین وقت سے پہلے، نہ بعد میں آ سکتا ہے۔ ہم آتے لمحوں کو، ہم جاتے لمحوں کو، گزرے ہوئے لمحوں کو ساتھ ساتھ ملا کر، قریب قریب کر کے ان کو دیکھ سکتے ہیں اور ان کی روشنی میں اپنی صلاحیتوں کے مختلف امتزاجات کی امکانی زندگیوں کو دیکھ سکتے ہیں۔ ان میں سے ایک لمحے میں ایک ہی زندگی کی ایک ہی راہ پر چل سکتے ہیں۔ ہم ان سے ہر لمحے ایک راہ کا انتخاب کر سکتے ہیں مگر اگر ہم یہ چاہیں کہ جب چاہا ایک زندگی اور اس کی ایک راہ کا انتخاب کر لیا۔ یہ ممکن ہو تو سکتا ہے مگر اس راہ میں

واقعات، حادثات اپنے آپ کو دہراتے ہی چلے جاتے ہیں۔ کیونکہ بے نظم اور بے نظام زندگی میں معنی نہیں ہو سکتے اور ہر بے معنی زندگی کے لئے لازم ہے کہ اس میں حادثات اور واقعات اپنے آپ کو دہراتے چلے جائیں۔ معنی پیدا کرنے کے لئے لازم ہے کہ ایک فلسفہ حیات تخلیق کیا جائے یا ایسے خلق شدہ فلسفہ حیات کو پورے شعور اور تمام موجود صلاحیتوں کے تعاون سے اپنا لیا جائے، اس کو دل و ذہن میں رچا لیا جائے۔

جب واقعات کی حرکت تکراری ہو تو روح تھک جاتی ہے، تھک کے رک جاتی ہے اور پھر کسی بھی راہ، کسی بھی زندگی کو انتخاب کر لینے کی صلاحیت ہمیشہ کے لئے کھو دیتی ہے۔ یہی حالت جہنم ہے۔

میں جہنم میں جانے کے لئے تمہاری ہرگز مدد نہیں کر سکتا۔ اپنی ممکن زندگیوں کو آپس میں اس طرح ہم آہنگ کرنے کی سوچو کہ ہر زندگی کا رشتہ ایک دوسرے کے ساتھ بیک وقت افقی بھی ہو اور راسی بھی۔ اس طرح کہیں راہ گم کرنے کا امکان پیدا نہ ہوگا اور تمہاری روح درجہ بہ درجہ، طبق بہ طبق، عالم بہ عالم، سفر، ارتقا کرتی رہے گی۔ حتیٰ کہ جنت قریب آ جائے اور تم اس میں داخل ہو جاؤ۔

متین صاحب خاموش ہو گئے۔ ان کے دائیں بازو نے فردوس کے شانوں کو تھرتھراتے ہوئے محسوس کیا۔ انہوں نے اس کے شانوں کو زور سے بھینچ لیا۔ پھر ہاتھ شانے سے اٹھا کے سر پر رکھ دیا۔ اس کے بالوں سے کھیلتے رہے۔ پھر یک دم پیچھے کی طرف مڑے۔ ان کے مڑتے ہی فردوس بھی مڑی۔ دروازے میں بابا کھڑا تھا، بت بنا۔ ان کو مڑتے دیکھ کر ان کی طرف بڑھا پھر رکا اور فردوس سے مخاطب ہوا۔

''کھانا نہیں کھاؤ گی بٹیا؟ جواب نہ پا کر پھر بولا۔

''بہت انتظار دکھایا تم نے۔ میں نے کئی بار اس کمرے میں جھانکا صاحب ہر بار ہاتھوں میں چہرہ چھپائے چپ چاپ بیٹھے تھے۔ مجھے بلانے کی جرأت نہ ہوتی تھی۔ الٹے پاؤں لوٹ جاتا۔ جا کر لیٹ جاتا۔ بگھی کے پہیوں کی آواز کا انتظار کرتا۔ انتظار کرتے کرتے آنکھ لگ گئی۔ تمہارے آنے کا بھی پتہ نہ چلا۔ آنکھ کھلی تو بالکل سناٹا تھا۔ سینے پر بوجھ

تھا۔ اٹھنے کی کوشش کی مگر اٹھ نہ سکا۔ میں گھبرا گیا اور پورا زور لگا کر اٹھا اور ادھر بھاگا۔ اپنے ہی قدموں کی آواز سے ڈر گیا۔ پھر آہستہ آہستہ قدم اٹھاتا یہاں پہنچا۔ دیکھا تو تم دونوں بت بنے چاندنی کی اور منہ کئے کھڑے تھے۔ تمہارے شانے ملے تو میری جان میں جان آئی۔ پھر بھی میری آواز نہ نکلی۔ تمہارے مڑنے سے میں نے جانا کہ تم زندہ ہو۔ ورنہ دروازے میں کھڑے کھڑے میں تو مر گیا ہوتا......

کھانا یہاں لاؤں یا کھانے والے کمرے میں؟''

''کھانے والے کمرے میں اور ہو سکے تو کھانے کے بعد کافی تیار کر دینا'' متین صاحب فردوس کو چپ دیکھتے ہوئے بولے۔

انہوں نے فردوس کو بازو پکڑ کر ہلایا۔ وہ چونکی اور اس نے ان کی طرف دیکھا۔

''آؤ! کھانا کھالیں۔ بابا نے کھانا لگا دیا ہوگا۔ ہم نے بہت انتظار کرایا ہے بابا کو''۔

چھٹا باب

ہاں ہاں! یہی کمرہ۔ اسی کمرے میں متین صاحب کے لئے بستر بچھاؤ۔ میرے کمرے کے سامنے رہیں تا کہ ہلیں بھی تو مجھے خبر ہو''

''بیٹی! اس کمرے میں برسوں سے کوئی نہیں سویا۔''

''متین صاحب کو ڈر نہیں لگے گا'' فردوس نے آنکھیں گھما کر متین صاحب کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

متین صاحب فردوس کے اصرار پر حیران تھے۔ اگر چہ ان کا دل بھی یہی چاہتا تھا۔ وہ فردوس کی والدہ کی موت کا راز معلوم کرنے کے لئے اس کمرے کی ہر شے کو الٹ پلٹ کر دیکھنا چاہتے تھے۔ ان کا دل دھڑ کنے لگا۔ اس کمرے میں کیا ہوگا کوئی خط، کوئی ڈائری، کوئی اور نشان؟

متین صاحب سوچ ہی رہے تھے کہ بابا چابی لے آیا اور اس نے کمرا کھول دیا۔ سامنے پلنگ بچھا تھا۔ اس پر بھورے رنگ کا غلاف چڑھا تھا۔ ایسے ہی غلاف ہر شے پر چڑھے تھے۔

''آیئے ہم لائبریری میں بیٹھتے ہیں۔ بابا کمرا صاف کر دیگا اتنی دیر میں''۔

''لائبریری! وہاں فردوس کی والدہ بیہوش ہوئی تھی۔ اس لائبریری میں اس رات کیا ہوا تھا؟ کیا دیکھا تھا اس رات فردوس کی والدہ نے'' متین صاحب کے ذہن میں سوال ابھرنے لگے۔

فردوس ان کو کشاں کشاں لائبریری میں لے گئی۔ ابھی تک دروازہ کھلا تھا۔ فردوس نے متین صاحب کو اکیلی کرسی پر بٹھا دیا اور خود ان کے سامنے کی کرسیوں میں سے ایک پر بیٹھ گئی۔ متین صاحب سوچ میں کھوئے تھے۔ فردوس ان کو تعجب سے دیکھ رہی تھی۔ متین صاحب کے چہرے پر سے یکا یک ایک بھیانک سایہ گزر گیا۔ ان کے ماتھے پر شکنیں پڑ گئیں اور انہوں نے سر کو پیچھے ہٹایا اور ان کا دایاں بازو اٹھا اور ان کے سر کی ڈھال بن گیا۔ ان کی اس حرکت سے فردوس کو ہنسی آ گئی اور وہ کھلکھلا کر ہنسنے لگی۔ اس کا قہقہہ بلند ہوتا چلا گیا۔ متین صاحب جاگ گئے۔ اس کو ہنستے دیکھ کر حیران ہوئے کہ آخر اس ہنسی کی کیا وجہ ہے۔

فردوس نے ہنستے ہنستے اپنے دونوں ہاتھ کولہوں پر رکھ لیے اور ہاتھوں سے کولہوں کو، پیٹ کو دبانے لگی اور پھر دونوں بازوؤں سے پیٹ کو بھینچ لیا۔ ہنسی بند ہوئی تو اس نے متین صاحب سے پوچھا۔

''آپ پر کون حملہ کر رہا تھا کہ آپ کے چہرے پر ہیبت چھا گئی، آپ نے بازو کی ڈھال بنا لی؟ جاگتے میں ڈراؤنا خواب دیکھا جا سکتا ہے یہ آج مجھے پتہ چلا۔ آپ کے چہرے پر بہت ہی معصومیت تھی، خوف تھا۔ یہ معصومیت، یہ خوف آپ کے چہرے پر مجھے بہت ہی عجیب سے لگے۔ سوائے ہنسنے کے میرے جذبات کو، احساسات کو اظہار کی کوئی اور فوری راہ نہیں ملی۔ آپ نے اس ہنسی کا برا مانا ہو تو معافی چاہتی ہوں۔''

فردوس نے دیکھا کہ وہ اس کی طرف متوجہ نہ تھے بلکہ الماریوں کے درمیان جو قد آدم کھڑکی تھی اس کو دیکھ رہے تھے۔ اس کی بات ختم ہوتے ہی وہ ایک دم اٹھے اور کھڑکی کی طرف بڑھ گئے۔ کھڑکی کی چٹخنی کو کھولا۔ کھڑکی کھولنے کی کوشش کی مگر کھڑکی نہ کھلی۔ اوپر دیکھا تو اوپر ایک اور چٹخنی تھی جو بند تھی۔ انہوں نے ادھر ادھر دیکھا تو ایک کونے میں سٹول نما سیڑھی پڑی تھی۔ اس کی طرف لپکے اور اٹھا لائے۔ کھڑکی کے ساتھ رکھ کر اوپر چڑھ کر چٹخنی کھول ڈالی اور پھر چٹخنی کو پکڑ کر زور سے کھینچا تو کھل گئی۔

سٹول پر بیٹھے وہ کچھ دیر کھڑکی سے باہر دیکھتے رہے! کھڑکی کے ساتھ سے شروع ہو کر دور تک ایک دیوار بڑھتی چلی گئی تھی۔ ''دیوار پر چلا جا سکتا تھا۔ ایک آدمی تو آسانی سے اس دیوار پر چل سکتا تھا۔'' متین صاحب کے ذہن میں خیال پیدا ہوا۔ خیال کے آتے ہی وہ سیڑھی سے اتر آئے۔ کھڑکی میں سے جھک کر ہاتھ سے دیوار کو چھوا۔ کھڑکی سے اتر کر دیوار پر جانا آسان تھا۔ یہ فیصلہ کرتے ہی متین صاحب نے کمر سیدھی کی اور انہوں نے ایک پاؤں کھڑکی سے لٹکایا۔

فردوس ان کی سب حرکتیں حیرانی سے، خاموشی سے، سکتے میں دیکھتی رہی مگر ان کے پاؤں لٹکاتے ہی وہ بجلی کی طرح اٹھی اور اس نے متین صاحب کو پکڑ لیا۔ متین صاحب چونکے، انہوں نے مڑ کر دیکھا۔ ان کے چہرے پر حیرانی اور سرشاری کے جذبات دست و گریبان تھے۔ ان کے لبوں پر ایک پھیکی سی مسکراہٹ آ گئی اور انہوں نے پاؤں کھڑکی سے نکال لیا۔

''نجانے ایک دم میرے دل میں کیا آئی کہ کھڑکی کھول دیوار پر کود جانے کو جی چاہا۔ اگر دیوار پر پہنچ گیا ہوتا تو تمہارے ہاتھ لگتے ہی کھائی میں گر جاتا......''

''کھائی میں گر جاتا! کھائی میں گر گیا! گر گیا؟ کون؟

اس دیوار پر کوئی چل رہا ہوگا اس رات؟ جس کو دیکھ کر شاید فردوس کی والدہ ڈر گئی تھیں؟ ہو سکتا ہے مگر وہ کون تھا؟ وہ کیوں اس دیوار پر چل رہا تھا؟ وہ یہاں سے جا رہا تھا یا ادھر آ رہا تھا؟'' متین صاحب کے ذہن میں خیال چمکنے لگے۔ انہوں نے محسوس کیا کہ

فردوس کی ماں کے راز کو پا لینے کی منزل اب ان سے بہت ہی قریب آ گئی تھی۔ اس احساس سے ان کا دل اُچھلنے لگا۔ انہوں نے دل پر ہاتھ رکھ لیا اور انہوں نے فردوس کی طرف دیکھا جوان کو حیرانی سے تک رہی تھی۔ ان کے ذہن میں فردوس کی ماں کی تصویر بننے لگی۔ وہ بالکل فردوس کی طرح تھیں۔ مگر ان کے چہرے پر معصومیت تھی، جوانی کے شعلے تھے۔ وہ اس اکیلی کرسی پر بیٹھی تھیں۔ سامنے لیمپ جل رہا تھا۔ لیمپ کے پاس ایک کتاب کھلی ہوئی تھی۔ چاند کی کچھ کرنیں ان کے چہرے پر کھیل رہی تھیں۔ ان کی آنکھیں بند تھیں۔ وہ کسی سوچ میں تھیں۔ ان کے بالوں کو ہوا نے چھیڑا۔ انہوں نے آنکھیں کھولیں، ہوا کھڑکی کی طرف سے آ رہی تھی۔ کھڑکی کھلی تھی۔ وہ اٹھ کر کھڑی ہو گئیں۔ کھڑکی کی طرف بڑھنے لگیں۔ کھڑکی کے باہر چاندنی بہت تیز تھی۔ انہوں نے آہ بھری، آہ چیخ بنی۔ انہوں نے اپنے منہ پر ہاتھ رکھ لیا اور وہ لڑکھڑائیں اور فرش پر گر پڑیں۔ کھڑکی کے پار دور دیوار پر سے کوئی گرتا ہوا دکھائی دیا۔ اس کی صورت نہ نظر آئی۔

''لوٹ آیئے! لوٹ آیئے۔ آپ بار بار کہاں؟ کن راہوں میں نکل جاتے ہیں''

''ہوں؟ پتہ نہیں مجھے کیا ہو گیا ہے۔''

متین صاحب نے ایک لمحہ کے لئے فردوس کے شانے پر سر رکھا اور پھر اٹھا لیا۔ فردوس نے ان کے شانوں پر بازو رکھ دیا اور شانوں سے پکڑ کر ان کو ایک کرسی پر بٹھا دیا اور خود بھی پاس ہی بیٹھ گئی۔ وہ ان کے بالوں کو چھیڑتی رہی مگر وہ خیالات میں کھوئے رہے۔ کئی بار اس کا جی چاہا کہ وہ ان کو جھنجھوڑ جھنجھوڑ کر ان کو خواب کے، خیال کے، عالم سے دنیا میں واپس لے آئے مگر اس کے ہاتھ اس کام پر مائل ہی نہ ہوتے اور وہ ان کے بالوں سے کھیلتی رہی۔ متین اس کے بازو کا سہارا لئے خواب میں غلطاں، سرگرداں رہے۔ دونوں اپنے اپنے کھیل میں بہت رات گئے مشغول رہے۔ چاند اب دیوار کی اوٹ میں چلا گیا تھا۔ باہر صحن میں چاندنی آہستہ آہستہ لائبریری کے دروازے سے صحن کی منڈیر کی طرف بڑھ رہی تھی۔

بابا نے آ کر اطلاع کی کہ کمرا تیار ہو گیا ہے۔ بابا کی آواز سے متین صاحب جاگے، مڑ کر بابا کو دیکھا اور اٹھ کر دروازے کی طرف بڑھے۔ بابا مڑا اور متین صاحب اس کے پیچھے

لائبریری سے نکل کر فردوس کی نظروں سے اوجھل ہوگئے۔فردوس کرسی پر بیٹھی، دائیں ہاتھ پر ٹھوڑی جمائے صحن میں چاندنی کے خرام کو دیکھتی رہی۔چاندنی کے خرام کو دیکھتے، وہ اونگھنے لگی۔اس نے گردن موڑی ایک گہرا سانس بھرا اور اٹھ کھڑی ہوئی۔اس نے کمرے پر ایک نظر ڈالی، کھڑکی کے پار دیکھا۔کھڑکی کے باہر دیوار پر اندھیرا چھا چکا تھا۔اس کرسی سے کھڑکی تک کا فاصلہ بڑی مشکل سے طے کیا۔کھڑکی کے باہر ایک نظر دیکھا۔آسمان پر ابھی چاندنی تھی۔اس نے کھڑکی بند کی۔ نچلی چٹخنی زور لگا کر بند کی اور کمرے سے باہر نکل گئی۔ چاندنی اب منڈیر کے بالکل قریب تک پہنچ گئی تھی۔وہ صحن سے گلی میں داخل ہوئی۔گلی میں اندھیرا تھا۔اندھیرے میں ٹٹولتی ٹٹولتی وہ اپنے کمرے تک پہنچی۔اس کے کمرے میں بجلی جل رہی تھی، اس کا بستر اس کو بلانے لگا۔اس نے نظر اٹھا کر سامنے متین صاحب کے کمرے کی طرف دیکھا۔دروازہ بند تھا۔کواڑوں کی درزوں سے روشنی چھن کر گلی میں آ رہی تھی۔

اس نے سوچنے کی کوشش کی کہ متین صاحب روشنی میں کیا کر رہے ہونگے مگر اس کے ذہن پر نیند غلبہ پانے لگی اور وہ اپنے آپ کو کھینچتی کمرے میں داخل ہوئی۔اس نے کواڑ بند کئے۔چٹخنی لگاتے اس کے ذہن میں غنودگی کا ایک جھونکا آیا اور وہ ڈول گئی۔اس نے جوں توں کر کے چٹخنی لگائی اور نیم مدہوشی میں بستر کی طرف بڑھی اور کپڑے بدلے بغیر ہی بستر پر گر گئی۔ تکیے سے سر لگتے ہی وہ سو گئی۔

ساتواں باب

کمرے کے پٹ بند کرتے ہی متین صاحب کو ایک چکر آ گیا اور انہوں نے بند کواڑوں کا سہارا لینے کے لئے کمر دروازے سے لگا دی۔اس نیم بے ہوشی کے عالم میں وہ کافی دیر کھڑے رہے۔ یہ بے ہوشی موت کی سرحدوں تک ان کو لے گئی۔ان کے شعور کے کسی کونے سے ایک خیال ابھرا کہ اگر انہوں نے اپنے آپ کو سنبھالنے کی پوری پوری کوشش نہ کی تو ان کے دل کی حرکت بند ہو جائے گی یا دل خون بن جائے گا اور پھر وہ موت کی

سلطنت میں داخل ہونے پر مجبور ہو جائیں گے۔ موت سے وہ ڈرتے نہ تھے مگر وہ موت کی سرحدوں کے اندر فردوس کی ماں سے شناسا کی حیثیت سے ملنا چاہتے تھے۔ اس لئے ان کے لئے لازمی تھا کہ وہ اس کی موت کا راز معلوم کر کے ہی اپنی جان موت کے سپرد کریں۔ ان کو صرف ایک رات کی بلکہ چند گھنٹوں کی مہلت درکار تھی۔

انہوں نے آنکھیں کھولنے کی کوشش کی۔ آنکھیں کھلیں تو سہی مگر ان کی پلکوں کے نیچے اندھیرا ہی اندھیرا تھا۔ شاید وہ موت کی سرحدوں میں داخل ہو چکے تھے۔ وہاں سے واپسی؟ اس خیال کے آتے ہی وہ دل ہی دل میں اپنے آپ پر مسکرائے۔ اس مسکراہٹ کے احساس سے وہ حیران ہوئے۔ کیا موت کے بعد کوئی اپنے آپ پر مسکرا سکتا ہے؟ نہیں! ایسا ممکن ہی نہیں۔ تو پھر وہ ابھی موت کی سرحدوں سے دور زندگی کی سرحدوں کے اندر ہی تھے۔ اگر ایسا تھا تو پھر یہ اندھیرا کیسا؟ کہاں سے آیا ہے یہ اندھیرا؟ اس اندھیرے میں وہ فردوس کی ماں کی موت کا راز وہ کیسے پا سکیں گے؟

انہوں نے گردن کو جھٹکا دیا۔ ایک زور کا چکر آیا، دل بہت ہی زور سے پھڑکا۔ ان کا جسم ٹھنڈا ہونے لگا؟ ان پر نزع کی کیفیت طاری ہونے لگی۔ اس کیفیت سے ان کو نشہ ہونے لگا۔ ان کا جی چاہا کہ یہ نشہ دیر تک نہ اترے۔ پھر خیال آیا کہ اگر نشہ نہ اترا تو؟ تو موت! ان کے بعد عالمہ کا کیا ہوگا؟ فردوس کا کیا ہوگا؟ تقی کا کیا ہوگا؟

مجھے یہ کیا ہونے لگا ہے؟ میں اس نشے کا مزا کیوں لے رہا ہوں؟ کیا میں زندگی کے مسائل سے بھاگ جانا چاہتا ہوں؟ جب میں اپنے مسائل سے بھاگ آیا تھا تو ایسی کیفیت تو پیدا نہ ہوئی تھی بلکہ میں تو ان مسائل کو ہی بھول گیا تھا۔ اب میں ان مسائل کو حل کرنا چاہتا ہوں اور موت مجھے بلا رہی ہے۔ ان کا ذہن، ان کا تخیل ایک دم خالی ہو گئے۔ ہر طرف گھٹا ٹوپ اندھیرا چھا گیا۔ ان کو اپنے سانس لینے کی آواز بھی سنائی نہ دے رہی تھی۔ کچھ دیر کے بعد اندھیرے ڈھلنے لگے، روشنی ہونے لگی، ان کے تن بدن میں خون دوڑنے لگا، ان کے جسم میں گرمی آنے لگی۔ گرمی سے ان کے ذہن میں، تخیل میں حبس ہونے لگا، ان کا دم گھٹنے لگا۔ انہوں نے پورے زور سے لمبے لمبے، گہرے گہرے سانس لئے۔ ہوا ان کے نتھنوں

میں شور کرتی ہوئی داخل ہوئی اور ان کے کان بجنے لگے۔ان کے دماغ کے خلیوں میں بھی حرارت پہنچنے لگی۔ان کے ذہن میں، ان کے تخیل میں ہوا چلنے لگی۔ ہوا تیز، تیز تر ہوتی چلی گئی۔موت، موت کا خیال ہوا کی شدت کا شکار ہو گئے۔

انہوں نے آنکھیں کھولیں۔کمرے میں سوائے پلنگ کے ان کو کچھ نظر نہ آیا۔ وہ دیر تک پلنگ کو تکتے رہے۔ یہ پلنگ، یہ کمرا نہ جانے کب سے ان کے انتظار میں تھے۔انہوں نے پلنگ کو تکتے ہی محسوس کیا کہ پلنگ کچھ کہہ رہا ہے۔مگر کیا؟ وہ نہ سن سکے۔ کمرے میں سرگوشی کی سی کیفیت آ چکی تھی۔اس سرگوشی کے کیا معنی ہو سکتے تھے، وہ تعین نہ کر سکے۔ پھر آہستہ آہستہ کمرے کی دوسری چیزیں ان کی نظر میں سمانے لگیں۔ بائیں ہاتھ ایک پیاری سی میز تھی۔میز کے ساتھ دیوار میں ایک الماری میں کچھ شیشیاں، کچھ لکھنے کا سامان، کچھ سنگار کا سامان پڑا تھا۔کمرے میں کوئی ایسی چیز نظر نہ آتی تھی جس میں وہ کتاب چھپائی جا سکتی تھی جس میں فردوس کی ماں مرنے سے پہلے لکھتی رہی تھی۔ وہ ناامید ہونے کو تھے کہ ان کی نظر الماری میں پڑی ہوئی ایک ننھی سی شیشی پر پڑی۔اس شیشی میں کیا ہو سکتا تھا؟ یہ جاننے کا خیال ان کے ذہن میں ابھرا اور وہ الماری کی طرف بڑھے۔ الماری کے پٹ کھولے تو خوشبو کا ایک جھونکا آیا۔ان کے ذہن نے رقص کے لئے پہلا قدم اٹھالیا۔

انہوں نے سب شیشیوں کو غور سے دیکھا مگر ان کی ساری توجہ اس ننھی منی شیشی کی طرف تھی۔انہوں نے ہاتھ بڑھایا، شیشی اٹھائی اور اس کو سونگھا۔خوشبو اسی میں سے آ رہی تھی۔انہوں نے ڈھکنا کھولا۔خوشبو سونگھی۔ یہ خوشبو وہی تھی جو وہ جوانی میں لگایا کرتے تھے۔

وہ حیران تھے کہ خوشبو آج تک تو ملاپ کا پیش خیمہ بنتی رہی ہے مگر اب فردوس کی ماں سے ملاپ کی صورت تو ایک ہی ہو سکتی تھی: موت۔مگر وہ عدم کی کارگاہ میں فی الحال جانے کو تیار نہ تھے۔ کیونکہ پچھلے چند دنوں میں جو کچھ ہو چکا تھا وہ اس کے انجام کی ایک جھلک دیکھنا چاہتے تھے۔ان کی سمجھ میں نہ آتا تھا کہ یہ سب کچھ جو محض ان کے وجود سے جنم لے چکا تھا۔ اب ان کی موجودگی کے بغیر کیسے انجام تک پہنچ سکتا تھا۔لیکن، ان کے دل میں خیال آیا، کیا

ضروری ہے کہ ہر واقعہ کا انجام وہی ہو جو میرے شعور کے مطابق ہو۔ یوں بھی تو ہوسکتا ہے کہ میرے مرنے کے بعد ہی واقعات اپنی منزل تک پہنچ سکتے ہوں یا فردوس اور تقی اور عالمہ کی زندگیوں میں میری موت وہی رول ادا کرے جو میری سمجھ کے مطابق میری زندگی کو ادا کرنا ہے۔ میری موت ان کی حیاتِ مطمئنہ کی راہیں ان پر وا کر دے۔ ایسا کیوں؟ میں زندگی میں جو فاش غلطی کر چکا ہوں میں اس کے پیدا ہو چکنے والے نتائج کو بدل دینا چاہتا ہوں۔ یہ احساس مجھے موت کے خیال سے بہت پہلے آچکا تھا۔ لہٰذا مجھے مہلت ملنی چاہیے کہ میں صحیح راہ پر ایک بار پھر گامزن ہوسکوں۔ مجھے توبہ کی مہلت ملنی ہی چاہیے۔

'اے ربِ حیات وموت! موت سے پہلے مجھے توبہ کی مہلت دے۔ لیکن اگر موت اتنی جلد آتی ہے تو توبہ کے خیال کو توبہ سمجھ کر قبول کر لے۔ میں اپنی روح کو موت کے فرشتے کے سپرد کرنے کو تیار ہوں۔'

متین صاحب مرنے کے لئے تیار ہو گئے۔ خیال آیا کہ ایک بار فردوس کو دیکھ لیں۔ اس خیال سے وہ مسکرائے: موت سے یوں مہلت ملا کرتی ہے؟ انہوں نے پلنگ پر سلوٹیں صاف کیں اور لیٹ گئے اور موت کا انتظار کرنے لگے۔ وہ یوں ہی لیٹے رہے مگر موت کے قرب کا احساس تک نہ ہوا۔

وہ حیران تھے کہ موت سے بڑی قیمت کیا ہوسکتی ہے جو ایک انسان کسی بھی آرزو کی تسکین کے لئے دے سکتا ہے۔ وہ اسی اُدھیڑ بن میں تھے کہ پپوٹے بوجھل ہو گئے۔ ان کا بدن ڈھیلا پڑ گیا اور ان پر غنودگی طاری ہوگئی۔ ان کے سینے پر رکھے ہوئے ہاتھ پھسلنے لگے، پھسلتے پھسلتے بستر پر جا گرے اور وہ سو گئے۔ سوتے میں وہ سمندروں میں، پہاڑوں کی بلندیوں میں، وادیوں میں سرگرداں رہے مگر منزل کا کہیں سراغ نہ ملا۔ پھر وہ فضا میں تیرنے لگے، نیلا ہٹیں رنگ بدلنے لگیں۔ زور کی ہوا چلنے لگی، وہ ہوا کی موجوں میں ڈولنے لگے۔ ہوا میں تیزی آنے لگی، آتی ہی گئی، نرم ہوا طوفان میں بدل گئی، وہ طوفان میں تحلیل ہو گئے، طوفان کے سوا کچھ نہ رہا۔ پھر طوفان تھم گیا۔ نیلا ہٹوں میں ایک جسم نمودار ہوا۔ جسم نیلا ہٹوں سے اترنے لگا، آہستہ آہستہ، دھیرے دھیرے قریب آنے لگا۔ ان کے دل میں اس جسم کا

چہرہ دیکھنے کی خواہش پیدا ہوئی مگر جسم تھا کہ قریب آنے میں دیر کر رہا تھا۔ وہ بیتاب ہونے لگے۔ ان کی بے تابی رنگ لانے لگی! جسم تیزی سے اترنے لگا، اترنے کی رفتار تیز، تیز تر ہوتی چلی گئی۔ جسم اب بالکل ان کی نظر کی حدود میں آ چکا تھا مگر چہرہ صاف نظر نہ آتا تھا...... اور انہوں نے دیکھا کہ چہرہ ان کا اپنا تھا۔ وہ حیران ہوئے اور جسم ان کی نظروں سے اوجھل ہونے لگا، بجلی کی رفتار سے زمین کی طرف گرنے لگا، گرتا ہی چلا گیا۔ جسم گرنے کے ساتھ ساتھ ان کا دل بھی اتھاہ گہرائیوں میں گرنے لگا۔

ان کے دل کی حرکت مدھم ہونے لگی۔ ان کے دل کی حرکت بند ہوگئی۔ ایک چیخ ان کے خوابوں کی فضا میں ابھری اور فضا چیخ میں ڈھل گئی۔ آواز اجسام کا روپ دھارنے لگی۔

کمرے کی ہر چیز اپنی اپنی جگہ سو رہی تھی۔ ان کی نظروں کے سامنے، ان کے قریب کوئی شے متحرک تھی۔ انہوں نے آنکھوں کو زور سے بند کر کے آہستہ سے کھولنا شروع کیا۔ ان کے پاؤں کانپ رہے تھے، ان کی ٹانگیں، ان کا سارا بدن کانپ رہا تھا۔ ان کا دایاں ہاتھ دل پر تھا، دل زور زور سے دھڑک رہا تھا۔ ان کے دماغ میں بہت ہی گرم لہر دوڑ رہی تھی۔ ان کے سر کی جلد سنسنا رہی تھی۔ انہوں نے اپنا ہاتھ دل سے ہٹالیا۔ انہوں نے اپنی ٹانگیں اکڑا لیں۔ جب دکھنے لگیں تو ان کو ڈھیلا چھوڑ دیا۔ ان کی ٹانگیں پھر سے کانپنے لگیں۔ ان کے سارے بدن میں کپکپی کی رفتار تیز ہوگئی۔ دل کی دستک ان کے سینے کی دیوار پر تیز ہوتی چلی گئی، بلند ہوتی چلی گئی۔ ان کو محسوس ہونے لگا کہ ان کی جلد ہڈیوں سے الگ ہو جائے گی۔ بدن کی ہڈیاں تڑخنے لگیں گی......

وہ گھبرا کر بستر میں گھومے، انہوں نے ٹانگیں پلنگ سے لٹکا دیں اور فوراً ہی کھڑے ہوگئے۔ ان کی ٹانگیں لڑکھڑائیں اور وہ چکرا کر گر پڑے۔ انہوں نے محسوس کیا کہ ان کا سر کسی سخت چیز سے ٹکرایا ہے۔ خیال آیا کہ پلنگ کے ستون کے پائے سے ٹکرایا ہوگا۔ ان کا سر ٹکراتے ہی پھسلا اور زمین سے جا لگا۔ وہ سناٹے میں چلے گئے۔ جب ہوش آیا تو فرش کی ٹھنڈک ان کی ہڈیوں میں سنسنا رہی تھی۔ انہوں نے اٹھنے کی کوشش کی تو اٹھ نہ سکے اب کے انہوں نے کہنیوں کے بل اٹھنے کی کوشش کی اور اٹھ کر بیٹھ گئے۔ انہوں نے سر پر ہاتھ پھیرا تو

سر خشک تھا۔ اٹھے اور اٹھ کر میز پر پڑے ہوئے لیمپ کا شیڈ ٹیڑھا کیا تا کہ ان کے پلنگ کے پچھلے پائے تک روشنی جائے اور لیمپ کا بٹن دبایا مڑ کر جو پلنگ کی طرف دیکھا تو پچھلے پائے سے ایک تختی زاویہ قائمہ بنائے نکلی ہوئی تھی۔ جلدی سے پائے کی طرف بڑھے اور قریب پہنچ کر دیکھا تو پائے میں ایک خانہ تھا۔ اس خانے میں ایک کتاب پڑی تھی۔ نکالی اور میز کے لیمپ کی روشنی میں لے گئے۔ کتاب پر سرخ رنگ کے چمڑے کی خوبصورت جلد چڑھی تھی۔ وہ کافی دیر جلد کو تکتے رہے اور ہاتھوں سے جلد کو پیار کرتے رہے مگر کتاب کو کھولنے کو ان کا جی نہ چاہا۔ کمرے کی مشرقی کھڑکیوں کے باہر، دور افق پر اندھیرے میں اجالا گھلنے لگا۔

صبح کی آمد کے خیال نے کتاب کو کھولنے کی خواہش کو ارادے کا روپ دے دیا۔ انہوں نے شیڈ کو ٹھیک کیا۔ آخر سے کتاب کھولی اور جہاں سے کتاب کھلی وہاں صفحے خالی تھے۔ انہوں نے جلدی جلدی ورق الٹنے شروع کئے۔ ورق بے نقش تھے۔ وہ ورق الٹتے گئے۔ مگر وہ ورق کہاں الٹ رہے تھے؟ ورق الٹنے کا صرف احساس ان کے ذہن میں تھا۔ انہوں نے اپنے ہاتھوں کی طرف دیکھا، ساکت پڑے تھے، صرف ان کے دائیں ہاتھ کے انگوٹھے اور انگشتِ شہادت میں ورق تھا۔ انہوں نے ورق الٹنے شروع کئے آخر کچھ اوراق کے بعد دائیں ہاتھ کے ایک صفحے پر ایک فقرہ لکھا تھا: ''اب میں اپنی روح موت کے فرشتے کے سپرد کر سکتی ہوں! میرے اعمال کی کتاب اب مکمل ہے۔''

وہ ورق الٹتے رہے۔ لفظ اکیلے لفظ، فقرے، پیراگراف کوندتے رہے۔ گھور اندھیرے میں منظر چمکتے رہے، گم ہوتے رہے۔ ایک طوفان تھا، ہوا کا، بارش کا۔ اس اندھیارے میں منزل کا نشان تھا نہ گمان۔ مسافر تھپیڑے کھاتا، لڑکھڑاتا، گرتا پڑتا، کوندے کی روشنی میں بڑھتا رہا۔ جو راستہ وہ طے کر لیتا وہ پھر اندھیاروں میں گم ہو جاتا، پھر اندھیرے میں سے ایک پگڈنڈی سی روشن ہوتی اور مسافر ٹھٹھرتا ہوا، کانپتا ہوا، ہوا کے زور سے بڑھتا چلا جاتا۔ آخر کوندے ختم ہوئے، طوفان تھم گیا، ہوا سو گئی، مسافر تھک کے چور ہو کر اندھیارے میں گر پڑا، بے سدھ پڑا سورج کی روشنی کا، سورج کی گرمی کا انتظار کرتا رہا۔ مسافر کے کانوں میں اندھیاروں کو چیرتی ہوئی ایک آواز پہنچی۔ اس نے پورے غور

سے سننے کی کوشش کی۔اذان ہو رہی تھی۔ جوں جوں اذان کی یورش فضا پر بڑھتی گئی مسافر کے جسم میں گرمی آتی گئی،خون دوڑنے لگا،اس کی جلد سنسنانے لگی،اس میں جان آنے لگی۔ اس کے ذہن میں خیال انگرائیاں لینے لگے۔مسافر نے آنکھیں کھول دیں۔دھند لکے روشنی میں ڈھلنے لگے۔روشنی میں چیزیں ابھرنے لگیں۔

مشرقی کھڑکیوں کے شیشوں کے باہر روشنی ٹھٹکی ہوئی متین صاحب کو حیرت سے تک رہی تھی کہ کہہ رہی ہو''اب اندر آنے کی اجازت دے دیجئے،پالا لگ رہا ہے،ٹھٹھر جاؤنگی۔''

متین صاحب نے لیمپ بجھا دیا اور روشن کھڑکیوں کی طرف نگاہ کی اور سورج کی کرنیں پھسلتی ہوئی کمرے کی مغربی دیوار کے ساتھ جا کر رکیں۔کمرے کی ہر چیز خواب سے جاگ اٹھی اور متین صاحب کو حیرت سے تکنے لگی۔متین صاحب نے کہ کمرے کی چیزوں کو غور سے تک رہے تھے نظریں جھکا لیں،کتاب بند کی اور پائے کے کھلے طاق میں رکھی اور طاق کے پٹ آہستہ بند کرنے لگے اور پھر ایک دم ان کا ہاتھ رک گیا انہوں نے پٹ کو ذرا سا کھول لیا اور اندر اور باہر اس کی سطح پر ہاتھ پھیر پھیر کر دیکھنے لگے۔کہیں بٹن یا سپرنگ نہ تھا۔وہ کچھ اسی طرح ہاتھ پھیرتے پھیرتے خیال میں کھو گئے اس بے دھیانی میں ان کے ہاتھ سے ٹہوکا لگا اور طاق کھٹ سے بند ہو گیا۔کھٹ کی آواز نے ان کو چونکا دیا۔ پائے میں طاق کا،طاق کے پٹ کا نشان تک نہ تھا۔کیا یہ سب خیال تھا،خواب تھا؟ کیسے ہو سکتا ہے؟نہیں ایسا نہیں۔انہوں نے اپنا دایاں ہاتھ اٹھایا،اس کی انگلیوں کو پھیلایا اور پھیلے ہوئے ہاتھ کو روشنی کے مخالف فضا میں اپنی آنکھوں کے سامنے بلند کیا۔ان کی انگلیاں ان کو بتا رہی تھیں کہ انہوں نے کتاب کی جلد کو واقعی چھوا تھا،کتاب کے اوراق الٹے تھے۔

ان کے لبوں پر مسکراہٹ کا ننھا سا سایہ جھپک گیا۔وہ ایک بار پھر پائے کی طرف متوجہ ہوئے۔وہ اپنے پاؤں پر بیٹھ گئے اور پائے کے اوپر کے حصے کو جگہ جگہ سے دبا دبا کر دیکھنے لگے۔طاق نہ کھلا۔آخر انہوں نے پائے کے مستطیل حصے کے اوپر کے کونے کو پورے زور سے دبایا تو طاق کا پٹ ان کے ہاتھ کو دھکیلتے ہوئے کھل گیا۔انہوں نے طاق پھر بند کیا اور پھر اوپر کے کونے کو زور سے دبایا اور پٹ کھل گیا۔انہوں نے سارے عمل کو کئی بار

دہرایا۔ ان کو اطمینان ہو گیا کہ طاق کھل جاتا ہے تو وہ اٹھے اور اٹھتے ہی انہوں نے محسوس کیا کہ ان کو سخت نیند آ رہی ہے۔ وہ آرام سے بستر پر دراز ہو گئے اور دیوار کی طرف منہ کر کے سو گئے۔

آٹھواں باب

جب سلیمہ نے یہ خوبصورت ڈائری مجھے میری شادی پر نذر کی تو میں نے اس سے کہا تھا: ''مجھے ان سے کچھ بھی چھپانے کی ضرورت نہ ہوگی مگر یہ ڈائری ہے اتنی خوبصورت، دل پذیر و دلربا کہ اس کو قبول کرنے کو ہاتھ بیتاب ہوا چاہتے ہیں۔''

''محبت میں بھی ایسی باتیں ہو سکتی ہیں جو 'ان' سے نہ کہہ سکو گی اور مجھ سے کہنا نہ چاہو گی، بلکہ اپنے آپ سے بھی کہنے سے کتراؤ گی۔ تب تمہیں ڈائری کی ضرورت ہوگی۔ اس ڈائری میں لکھتی ہی جاؤ گی اور کسی سے کہنے کا احساس بھی تم کو نہ ہوگا۔''

آج مجھے ایسی ہی شے کی ضرورت ہے۔ جو دکھ مجھے ہے وہ دکھ ہوتے ہوئے بھی مجھے اتنا عزیز ہے، اتنا انوکھا ہے کہ ان سے کہنے کی جرأت کے باوجود کہہ نہیں سکتی۔ اس دکھ کی جزئیات اور پس منظر بیان کر دینے کے باوجود اس دکھ کا پیارا پن دکھا نہ سکوں گی۔ خود مجھے اس دکھ کے حسن اور میٹھے میٹھے درد کی مختلف رفتاروں اور ان کے باہمی آہنگ کا تجزیہ کرتے ہوئے ڈر لگتا ہے۔ آخر کیوں؟ جمیل سے مجھے محبت نہیں، میری اس سے کبھی بنی نہیں، میرے بچپن میں وہ میرا شریک نہیں رہا۔ مجھے اس کا لاابالی پن، اس کی تخریب پسندی، جس کو وہ انقلابی شعور کا بارعب نام دیا کرتا تھا، کبھی نہ بھایا گیا۔ ہاں! یہ ٹھیک ہے کہ وہ میری سخت سے سخت اور تیز اور چبھتی ہوئی باتوں کو برداشت کرتا رہتا تھا اور اف تک نہ کرتا تھا۔ اس کی یہ عادت مجھے پہلے سے بڑھ کر زیادتی کرنے پر اکساتی رہتی تھی اور میں زیادتیاں کرتی ہی چلی جاتی تھی۔ مگر وہ مجھ سے کبھی بھی الجھتا ہی نہ تھا اگرچہ اس کی آنکھوں کی پتلیوں میں عجیب طرح کی دل لبھا روشنی دور تک ڈوبتی چلی جاتی نظر آنے لگتی اور وہ مجھ سے کبھی بھی منہ نہ پھیر

لیا کرتا، بلکہ میں خود ہی جب اپنے آپ کو اس ڈوبتی روشنی کے سنگ ڈوبتی چلی جاتی محسوس کرتی تو اپنی پوری قوتِ ارادی سے پلہ چھڑا کر بھاگ جایا کرتی۔ اگر کوئی دوسرا اس سے ایسی بات کر بیٹھتا جس سے اس کو اپنی ہیٹی کا ذرا بھی گمان ہوتا تو وہ انتقام لئے بغیر، ہار منوائے بغیر، چین سے نہ بیٹھتا۔

میں نے اس کی اس عادت کے بارے میں کبھی بھی غور نہ کیا۔ آخر کیوں؟ آخر مجھے اس کو ستانے میں، اس کو دُکھانے میں (یہ سب کچھ دکھ دینے کے ہی تو مترادف تھا) کیوں مزا ملتا تھا؟ مزا ملتا تھا! واقعی مزا ملتا تھا؟ نہیں، ایسا تو نہیں تھا! مجھے یاد ہے کہ جب میں اس کو تنگ کرتی تھی، ستاتی تھی اور وہ مجھے جواب نہ دیتا تھا تو اس کے بعد اس کی غیر حاضری میں مجھے ظلم کرنے کا احساس ہوتا تھا۔ مگر اس کو دیکھتے ہی نہ جانے مجھے کیا ہو جاتا تھا کہ میں اس کو زچ کرنے پر تل جاتی تھی اور وہ ماتھے پر بل لائے بغیر مجھے تکتا رہتا اور جب میری زیادتی حد سے بڑھ جاتی تو وہ میرے سامنے سے ہٹ جاتا۔ مگر ایسا بہت کم ہوتا۔ اگر میں کوشش کروں تو شاید ایسے تمام مواقع ایک ہی انگلی کی پوروں پر گن سکوں۔

انّا اماں مجھے ہمیشہ منع کرتیں کہ اس کو تنگ نہ کروں۔ مجھے ان کے منع کرنے پر غصہ آ جاتا کہ بیٹے کو تو برا نہیں لگتا تو ماں کو کیوں برا لگتا ہے۔ انا اماں کہا کرتی ''بٹیا! جمیل تمہارے سامنے کبھی اف نہ کرے گا مگر میں جانتی ہوں کہ اس کو کتنا دکھ ہوتا ہے، کتنا گہرا گھاؤ لگتا ہے اسے۔ وہ تم سے کیوں ڈرتا ہے؟ ہم سب تم سے کیوں ڈرتے ہیں؟ میں نے یہ جاننے کی بہت کوشش کی مگر نہیں جان پائی...... میں نے اس سے کئی بار کہا ہے کہ وہ کہیں چلا جائے۔ کہیں نوکری کر لے۔ مگر وہ میری باتوں کا جواب نہیں دیتا۔ صرف مسکرا دیتا ہے۔ اس کی مسکراہٹ مجھے ہمیشہ لاجواب کر دیتی ہے، اس کی مسکراہٹ سے میں پریشان ہو جاتی ہوں، اس کی مسکراہٹ میں دکھ کا دور دور تک کا نشان نہیں ملتا۔ مگر میں جانتی ہوں کہ اس کے دل میں کتنا گہرا دکھ ہے۔ وہ رات بھر نہیں سوتا، صرف سونے کا ڈھونگ رچانے کے لیے آنکھیں بند کئے، چہرے پر قرار کا رنگ جمائے پڑا رہتا ہے۔ کبھی کبھی وہ اٹھ کر باغ میں چلا جاتا ہے۔ کتنا بھولا ہے! سمجھتا ہوگا کہ میں پڑی سوتی ہوں۔ پگلا ہے! بیٹے کو نیند نہ آئے تو ماں کو کیسے

کل پڑسکتی ہے......

میں نے کئی بار چاہا کہ پوچھوں کہ وہ باغ میں کیوں جاتا ہے۔مگر ہمت ہی نہیں ہوتی۔ ایک رات جب میں اس کشمکش میں اٹھ کر بیٹھ گئی تو مجھے بیقرار دیکھ کر بولا، 'اماں چاند نکلتا ہے۔تو پھلوں میں رس پڑتا، ہے پھولوں سے خوشبو نکلتی ہے۔ مجھے پھولوں کی خوشبو بلاتی ہے، میں جاتا ہوں۔اندھیری راتوں میں مجھے باغ میں جاتے کبھی تم نے دیکھا ہے؟'

میں نے پوچھ ہی لیا''اندھیری راتیں بستر پر پڑے، جاگتے ہی جاگتے گزار دیتا ہے تو۔کیوں؟''

کہنے لگا''اندھیرے میں اتنی ٹھنڈک ہے کہ سونے کو جی نہیں چاہتا اور پھر اماں! قبر میں بھی تو اندھیرا ہی اندھیرا ہوگا۔اس خیال سے بھی مجھے ڈر لگتا ہے ڈر کے مارے میں سو نہیں سکتا۔''

''اب تم ہی کہو کہ یہ باتیں جوانوں کے کرنے کی ہیں۔ مجھے تو ہر دم اس کی فکر لگی رہتی ہے اور...... جب تم اس کو ستاتی ہو تو مجھے ایسا لگتا ہے کہ وہ تم سے بھاگ کر موت سے پناہ مانگ لے گا اور اپنے آپ کو موت کے سپرد کر دے گا۔ میں ہاتھ جوڑتی ہوں، اپنے دودھ کا واسطہ دیتی ہوں کہ اس کو نہ ستایا کرو۔''

اس رات میں بہت دیر تک انّا اماں کی باتیں یاد کر کے روتی رہی، اپنے آپ کو کوستی رہی، دعائیں مانگتی رہی کہ مجھ میں اتنی ہمت پیدا ہو جائے کہ میں جمیل کو نہ ستاؤں۔اگلے دن میں نے نانا ابا سے کہا کہ وہ جمیل کو کسی دوسرے شہر میں ملازم کرا دیں۔انہوں نے وعدہ کر لیا کہ وہ اس کے متعلق سوچیں گے۔

اس کے کچھ عرصہ بعد 'ان' کے والد نے ہماری کوٹھی کے ساتھ کی خالی زمین پر کوٹھی بنا لی۔ جب 'ان' کے لوگ اس کوٹھی میں آباد ہوئے تو انہوں نے ہمسایوں کی دعوت کی۔ ہم سب وہاں گئے۔سلیمہ کو دیکھتے ہی میرا دل بہت زور سے دھڑکا اور وہ بھی مجھے دیکھتے ہی میری طرف بڑھتی ہی چلی آئی۔ہم دونوں ایک دوسرے سے فوراً گھل مل گئے۔

اس دن کے بعد میرا بیشتر وقت سلیمہ کے ساتھ کٹنے لگا۔کبھی میں اس کے یہاں، کبھی

وہ ہمارے یہاں۔ کبھی میں ان کے یہاں سو جاتی، کبھی وہ ہمارے یہاں سو جاتی۔ ہمارے اس پیار پر ایک دن سلیمہ کی والدہ کہنے لگیں ''تم اگر لڑکا ہوتیں تو سلیمہ کو تمہارے ساتھ بیاہ دیتی مگر کیا کروں تم لڑکا نہیں ہو۔ ہاں! ایک اور ترکیب ہے یہ کہتے ہوئے وہ رکیں اور مجھے اپنے پہلو میں کھینچ لیا اور بولیں ''بوجھو کیا ہے؟'' ان کی آنکھوں میں عجیب سی چمک تھی۔ ان کے چہرے پر خوشیاں ناچ رہی تھیں۔ ان کے نینوں میں بجلیاں کوندرہی تھیں۔ میں سمجھی نہیں مگر پھر بھی شرما گئی۔ نہ جانے کیوں؟ میں ان کے گرم گرم آرام دہ پہلو سے لگی کھڑی ہلکا ہلکا، دھیما دھیما حظ اٹھاتی رہی۔ نہ وہ بولیں نہ میں۔ اس کے بعد انہوں نے میرا ماتھا چوم لیا۔ وہ کچھ کہنے ہی والی تھیں کہ سلیمہ کے والد کی آواز آئی۔ چچی جان مجھے چھوڑ دوسرے کمرے میں چلی گئیں اور جب واپس لوٹیں تو سلیمہ سے کہا ''تمہارے بھیا ولایت سے اگلے مہینے کی دس کو پہنچ رہے ہیں۔''

ان کی آواز میں اتنا گہرا پیار تھا کہ میں حیران ہوئی کہ بیٹے سے ماں اتنا پیار کرتی ہے۔ ان کی آواز سے اتنی خوشی بکھر رہی تھی کہ میرے تن بدن میں رچنے لگی۔ کیوں؟ میں نے سوچا کہ آیا اس لیے تھی کہ آواز خوشی سے رچی بسی تھی یا اس لئے کہ سلیمہ کے بھائی آرہے تھے یا اس لئے کہ وہ بھی سلیمہ ہی کی طرح پیارے اور حسین ہوں گے۔ میں نے فیصلہ کرنا پسند نہ کیا۔

آخر 'وہ' آ گئے۔ وہ سلیمہ سے بھی زیادہ سڈول، حسین اور پیارے تھے۔ اب مجھے سلیمہ میں، چچی جان میں ان کی صورت نظر آنے لگی۔ اب مجھے جمیل کو دیکھ کر اس کو ستانے کا خیال نہ آتا تھا۔ اب میں اس سے خاصی دیر تک باتیں کر لیتی۔ مگر میں نے محسوس کیا کہ اب اس کی آنکھوں میں پہلے کی طرح روشن گہرائی، ہر دم گہری ہوتی ہی جاتی ہوئی، پیدا نہ ہوتی تھی۔ اب وہ جلد ہی اٹھ جانے کی کوشش کرنے لگا ہے۔ اس پر نہ جانے اب مجھے ترس کیوں آنے لگا تھا۔ میں نظر اٹھا کر دیکھتی تو وہ جا رہا ہوتا۔ دن یونہی گزرتے رہے۔ ایک دن میں نے محسوس کیا کہ میں نے جمیل کو کئی دنوں سے نہیں دیکھا۔ مگر مجھے ابّا اماں سے پوچھنے کا خیال ہی نہ آیا۔ آخر ایک دن ابّا اماں نے خود ہی بتا دیا کہ جمیل نے کسی دوسرے شہر میں ملازمت کر

لی ہے۔ مجھے دکھ ہوا مگر تھوڑا سا جس کا میں نے اس وقت یہ تجزیہ کیا کہ انا اماں اپنی زندگی میں پہلی بار بیٹے سے دور رہیں گی اور اس سبب وہ دکھی ہیں اور میں نے ان کا دودھ پیا تھا، ان کی گودوں میں کھیل کر جوان ہوئی تھی اور میرے جسم کے بہت سے حصوں میں اس دودھ کی تراوٹ موجود تھی، دودھ نے جوش مارا تھا۔

پھر میں اس دکھ کو بھی بھول گئی۔

دن گزرتے رہے۔ چچی جان کا پیار بڑھتا رہا۔ 'ان' کا گھر سے باہر رہنا کم ہوتا رہا۔ ایک دن سلیمہ اور میں تخت پر بیٹھے تھے، ساتھ ساتھ، چپ چاپ، کھوئے ہوئے نجانے کہاں کہاں۔ پھر چچی جان بھی گھر کے کاموں سے فارغ ہو کر ہمارے پاس آ بیٹھیں۔ ان کے بیٹھتے ہی سلیمہ ان کے زانو پر سر رکھ کے دراز ہو گئی چچی جان نے میری طرف دیکھا میں ان کے دوسرے زانو پر سر رکھ کر دراز ہو گئی۔ چچی جان ہم دونوں کے بالوں سے کھیلنے لگیں۔ مجھ پر غنودگی طاری ہونے لگی۔ میں نے محسوس کیا کہ میرے چہرے پر ان کے دونوں ہاتھ ہیں اور ان کے دونوں ہاتھوں کی انگلیوں سے بڑی میٹھی میٹھی ٹھنڈک میرے چہرے میں، آنکھوں میں، گردن میں سرایت کر رہی تھی۔ میں نے آنکھیں کھول دیں۔ چچی جان میرے چہرے کو بہت گہرے غور سے تک رہی تھیں۔ میرے آنکھیں کھولتے ہی ان کے ہونٹ ہلے مگر آواز نہ نکلی۔ وہ مجھے اسی گہرے غور سے تکا کیں۔ میں بھی نیم وا آنکھوں سے ان کو دیکھتی رہی۔ ان کے ہاتھ میرے بالوں سے کھیلتے رہے۔ کچھ دیر کے بعد ان کے ہاتھ رکے، ان کے لب ہلے، وہ مجھ سے کہہ رہی تھیں:

''تمہارے نانا نے قبول کر لیا ہے کہ تم اب ہمیشہ ہمارے ہی گھر رہا کرو۔ میں بھی بوڑھی ہو چلی ہوں اور سلیمہ کو اب بھی پرائے گھر جانا ہی ہوگا۔ تمہیں منظور ہے نا اس گھر میں ہمیشہ کے لئے رہنا؟''

پہلے تو میں سمجھی ہی نہیں۔ میں نے دونوں آنکھیں کھول کر چچی کے چہرے کو غور سے دیکھا اور دیکھتی ہی چلی گئی۔ ان کی آنکھوں میں پیار تھا مگر روزمرہ سے کہیں گہرا، اتھاہ، ساتھ ساتھ آنکھوں میں ایک شرارت دوڑ رہی تھی۔ سلیمہ اٹھ کر بیٹھ چکی تھی اور میری طرف بڑے

غور سے مسکراتے ہوئے، شرارت سے، پیار سے دیکھ رہی تھی۔ میرے ذہن میں فوراً ایک خیال کوندا ''وہ' اور میں......'' میں شرما گئی اور اٹھنے لگی مگر اٹھ نہ سکی کیونکہ سلیمہ مجھ پر جھک چکی تھی اور میرے کان میں کہہ رہی تھی ''بھ ابھ ی! بھ ابھ ی! بھا...... بھ ی!'' میں نے آنکھیں بند کر لیں۔ کھو گئی۔ جب میں نے آنکھیں کھولیں تو تخت پر کوئی نہ تھا۔ صحن میں، گھر میں خاموشی چھائی تھی۔ گھر والے نجانے کہاں تھے۔ سورج ڈھل رہا تھا۔ میں اٹھی اور گھر آ گئی۔ چھ ماہ بعد ان کے یہاں برات کے ساتھ گئی۔

ہمارے یورپ جانے سے پہلے اناّ اماں نانا ابا کا گھر چھوڑ کر جمیل کے پاس چلی گئیں۔ ہم یورپ چلے گئے۔ مہینوں بعد اناّ اماں کا ایک خط شہر شہر ڈھونڈتا مجھ تک پہنچا۔ وہ جمیل سے خوش تھیں اور جمیل کا سیٹھ اس سے خوش تھا۔ ہم یورپ سے شمالی امریکہ اور وہاں سے جنوبی امریکہ کی سیاحت کو نکل پڑے۔ وقت بے نشاں، بے منزل کٹتا رہا۔ مناظر، موسم، روپ، رنگ، سنگیت، گیت لے بدلتے رہے؛ میں بدلتی رہی، 'وہ' بدلتے رہے؛ ہمارے پیار کی نوعیت بدلتی رہی؛ سمندروں میں طوفان آتے رہے، زمین پر زلزلے آتے رہے۔ یورپ کی قومیں ایک دوسرے کے گریبانوں کی طرف ہاتھ بڑھاتی رہیں۔ تخیل کی وسعتیں پھیلتی رہیں، جذبات میں سکون آتا گیا اور دل دھڑکنے کے آداب سیکھتا چلا گیا؛ ذہن علم کی اقلیموں میں سرگرداں رہنے لگا، اس کی پیاس بڑھتی رہی۔

میں خوش تھی، 'وہ' خوش تھے یورپ کی سرزمیں خوش تھی، لوگ خوش تھے، ہوٹل، سیرگاہیں، محل، ساحلوں پر میلوں تک جھونپڑیاں آباد تھیں۔ نوجوان عشق میں انتظار سے گریزاں نہ تھے، پہاڑوں کی چوٹیوں پر، جھیلوں کی سطحوں پر، قہقہے اور سسکیاں اور ہچکیاں آنکھ مچولی کھیلتی تھیں اور دیس میں امن تھا، خوشحالی تھی۔ ہم نے سوچا کہ کچھ دیر اور یورپ کے صبح وشام دیکھ لیں تو دیس کو لوٹیں گے۔

یکا یک جرمنی سے ایک طوفان اٹھا اور تمام یورپ کو اپنی لپیٹ میں لے لیا۔ آسمان آگ برسانے لگا اور زمین موت سے ہم کنار ہوگئی؛ دیس ہم سے اور ہم دیس سے کٹ گئے، یورپ کی سرزمین خونِ انساں سے لال ہوئی۔ اس لال لال سرزمین پر سیرگاہیں، محل

ہسپتالوں میں تبدیل کر دیے گئے۔ بن اور جنگل فوجی بوٹوں کی چاپوں کے شور سے بھرپور ہوئے، بوئے گل گلستانوں سے باہر قدم نکالتے ہوئے ڈرنے لگی، بہار اور خزاں اجنبی بوٹوں کی چاپوں کے اجنبی شور سے منہ چھپائے ویرانوں میں دبک دبک کے چلنا سیکھنے لگیں، صبا نے پیام رسانی چھوڑ دی، قہقہے سسکیوں میں، سسکیاں ہچکیوں میں بدل گئے اور یہ سب ایک طویل لامتناہی گریہ میں ڈھل گئے، چاند انسان کا دشمن ہو گیا اور اندھیرا انسان کو عزیز ہو گیا۔

ہم یہ سب کچھ دیکھتے رہے اور بے بس اور مجبور رہے۔ 'وہ' ایمبولینس چلاتے رہے اور میں سسکتے، بلبلاتے انسانوں کے پہلو بدلتی رہی۔ لوگ مرتے رہے، بچے یتیم ہوتے رہے، عورتیں بیوہ ہوتی رہیں، محبوب ہمیشہ ہمیشہ کے لئے بچھڑتے رہے، زمین صلیبیں اگلتی رہی، صلیبوں کے سایوں میں شاخوں سے دور پھول مرجھاتے رہے، پھول کھلتے تو تھے مگر صلیبوں کے درمیاں۔ ان اجنبی شوروں، سسکیوں، دم توڑتی ہوئی مسکراہٹوں، شرمیلی روشنیوں کے ہجوم میں کبھی کبھار دیس کا پیام آملتا تو طبیعت بہل جاتی۔ ہڈیوں میں، گوشت پوست میں، ہر دم ایک کسک سی رہنے لگی۔ اجنبی زخمیوں کی آنکھوں میں طلسمی جزیرے جھلکنے، جھلملانے لگے؛ وہ اچھے ہو جانے کے بعد گیت آزاروں میں مبتلا رہنے لگے، مجھے اپنے ہاتھوں سے، اپنے چہرے سے، اپنی آنکھوں سے، اپنے جسم سے ڈر لگنے لگا۔ میں نہ جانے کب، کیسے شکاری بن گئی۔ میں پریشان رہنے لگی، ہر دم، ہر لمحہ، بیداری میں، خواب میں۔

اس اتھاہ پریشانی کے عالم میں ایک دن سنا کہ جمیل کے سیٹھ نے اپنی اکلوتی بیٹی اس سے بیاہ دی ہے۔ میرے دل کے اندھیروں میں ایک لمحے کے لئے آتشبازی چھوٹی۔ اس خبر کے بعد دیس سے کوئی پیام نہ آیا۔ میں سسکتے، بلبلاتے، اجنبی زخمیوں کے پہلو بدلتی رہی۔ وہ اچھے ہوتے رہے، ان کی آنکھوں میں طلسمی جزیرے جھلکتے رہے۔ وہ نظر آنے والے گھاؤ لے کے آتے اور نظر نہ آنے والے گھاؤ لے کے جاتے رہے اور میری پریشانی بڑھتی رہی۔ کوئی نہ تھا جس کو میں اپنا دکھ کہہ سناتی۔ میں تو اپنے آپ سے بھی یہ دکھ چھپاتی رہی۔

آخر زمین نے کروٹ لی۔ صلیبوں کے درمیان نئے پھول کھلے، صلیبوں پر اب

درختوں کے سائے تھے، ہوا میں شور نہ تھے، بوئے گل نئے پھولوں کی تلاش میں نکل پڑی۔ سسکیوں، بلبلاہٹوں پر غنودگی طاری ہونے لگی، پہاڑی سڑکوں پر، جھیلوں کی سطحوں پر پھول، بنوں میں، درختوں کے سایوں میں ایک بار پھر قہقہے انگڑ ائیاں لینے لگے، ہوائیں خاموشی سے بہنے لگیں اور سمندروں کی راہیں ایک بار پھر کھل گئیں۔

ہم دیس لوٹ آئے۔ یہاں بھی ایک عالم بیت چکا تھا۔ دنیا ہی بدلی ہوئی تھی۔ ایک شور جاگ رہا تھا۔ جمیل اب خود سیٹھ تھا۔ انا اماں خوش تھیں کہ بہو میرے جیسی تھی۔ میں سمجھی کہ میرے ایسی طبیعت ہوگی۔ میرے جیسی عادتیں ہونگی۔ مگر انا اماں کا مطلب کچھ اور تھا مجھے یہ بعد میں پتہ چلا کہ ان کی بہو کی صورت بھی مجھ جیسی تھی۔

یورپ سے لوٹنے کے بعد ہم نے ان کی دعوت کی۔ جب وہ ہمارے یہاں پہنچے تو میں ابھی کپڑے بدل رہی تھی۔ تیار ہو کر میں ابھی آئینے میں جھانک رہی تھی کہ آئینے میں میری ایک اور صورت ابھرنے لگی۔ صورت واضح ہوتی چلی گئی، قریب ہوتی چلی گئی۔ میرے ماضی کی تصویر مجھ سے ملنے نجانے کیوں چلی آئی تھی۔ تصویر متحرک تھی۔ ہم دونوں کی آنکھیں ملیں۔ تصویر ٹھٹکی، اس کے لب ہلے، کھلے اور کھلے کے کھلے ہی رہے۔ تصویر کے ماتھے پر پسینے کے قطرے چھلکنے لگے۔ تصویر کا ہاتھ سینے تک اٹھا، قمیص سے رومال نکال کر ماتھا پونچھنے لگا۔ ماتھا چمکنے لگا، آنکھوں میں روشنیاں ابلنے لگیں، سینہ پھڑ پھڑانے لگا۔

میں ڈری اور مڑی۔ تصویر مسکرا رہی تھی۔ تصویر زندہ تھی۔ میں نے ہاتھ بڑھایا تو تصویر نے بھی ہاتھ بڑھایا۔ خیال آیا کہ آئینے میں اپنا ہی عکس نظر آ رہا ہے۔ آئینے کو مڑ کر دیکھا۔ اطمینان ہوا کہ تصویر میرا عکس نہ تھی۔

تصویر بولی ''میں رابعہ جمیل ہوں۔ اماں مجھے آپ تک پہنچا گئی ہیں۔ شاید مجھے یوں نہ آنا چاہیے تھا؟''

مجھ سے بولا نہ گیا۔ چپ چاپ بولتی تصویر کو تکتی رہی۔ تصویر پھر بولی ''آئینہ سامنے ضرور ہے مگر آئینے میں میری صورت اور آپ کی پشت صاف نظر آ رہی ہے۔ میرے عکس میں اور آپ میں شاید ہی کوئی فرق ہو۔ نہیں! فرق ہے یوں لگتا ہے کہ میں آپ کا ہی عکس

ہوں......ایسا کیوں؟......''

میں ساکت کھڑی رہی اور میں نے سنا

''میرا نام صالحہ ہے۔ میں نے انّا اماں-جمیل کی والدہ- کا دودھ پیا ہے۔ ہم دونوں نے اکٹھے پرورش پائی- میں اس کو بہت ستایا کرتی تھی...... برسوں کے بعد دیکھوں گی اسے۔''

یہ میری آواز تھی۔ کتنی اجنبی تھی، کتنی دور سے آرہی تھی۔ میں چونکی اور میں نے اپنے آپ کو سنبھالا اور رابعہ کا ہاتھ اپنے ہاتھوں میں لے لیا اور دیر تک اس کے ہاتھ کو دائیں ہاتھ میں پکڑے بائیں ہاتھ سے تھپکتی رہی- پھر میں نے رابعہ کا ہاتھ چھوڑ دیا اور اپنا بازو اس کی کمر میں ڈال کر اس کو ڈرائنگ روم تک لے گئی۔ اس کے جسم کے تناؤ میں کتنی راحت تھی۔ اس کی حیران آنکھوں میں اطاعت جھلک رہی تھی۔ اس کے کانوں کی لوئیں تمتما رہی تھیں۔ وہ بار بار میرے چہرے کو، میرے جسم کو کن انکھیوں سے تکتی تھی۔ اس کی نگاہیں میرے جسم کو سہلاتی رہیں۔ اس کی کمر میں جہاں جہاں میرا بازو تھا، ہاتھ تھا، وہاں وہاں حدت تیز ہوتی گئی۔

میں نے گھبرا کر اس کو روک لیا۔ وہ رکی، اس کی نگاہیں میرے چہرے کی طرف اٹھیں اور میری نظروں میں سما گئیں۔ مجھے کچھ نہ سوجھا۔ میں نے اس کو سینے سے لگا لیا اور ہونٹ اس کے ماتھے پر رکھ دیئے-شاید ہی کسی انسان نے اپنے آپ سے یوں پیار کیا ہوگا؟

کمرے میں داخل ہوئے تو وہ اور جمیل سامنے صوفے پر بیٹھے تھے۔ دونوں باتیں کرتے کرتے رکے، ان کی آنکھیں اٹھیں اور کھلی کی کھلی رہ گئیں۔ جمیل نظریں ان کے چہرے پر جمائے تھا۔ کچھ دیر ہم دروازے میں کھڑی رہیں۔ ان کی نظریں ہم پر گڑی رہیں۔ جمیل 'ان' کو تکتا رہا اور پھر آہستہ سے اس نے گردن موڑی، نگاہیں اٹھائیں اور کھلکھلا کر ہنس پڑا اور ہنستے ہنستے ان سے مخاطب ہوا!

''قدرت کی ستم ظریفی ملاحظہ کی آپ نے؟ بتایئے تو کون کون ہے۔ لباس بھی تو ایک سا ہے۔ پہچانیے! صالحہ کون سی ہے۔ میں تو تمیز نہیں کر سکتا۔''

'وہ' چونکے، انہوں نے آنکھیں بند کر لیں۔ ان کا سر صوفے کی پشت سے جا لگا۔ وہ

شاید سوچنے کی کوشش کر رہے تھے۔ میرا دل زور سے دھڑکنے لگا- چاہا کہ بول پڑوں مگر آواز ہی نہ نکلی- کبھی ان کو تکتی اور کبھی جمیل کو- جمیل کا مسکراتا ہوا چہرہ تمتمایا اور پھر یک لخت ماند پڑ گیا۔ ان کے ماتھے پر شکن پڑ گئے تھے۔

میں ڈرنے لگی کہ اگر انہوں نے پہچاننے میں غلطی کی تو کیا ہوگا۔ ان کے ماتھے کی شکنیں مٹیں۔ ان کی آنکھیں کھلیں اور وہ مسکرائے اور مسکراتے ہوئے جمیل کو مخاطب ہوئے:

''میں بھی پہچان نہ سکتا اگر مجھے یاد نہ آجاتا کہ صالحہ کبھی بھی کسی کے بائیں ہاتھ نہیں چلتی۔ اب بھی وہ دائیں ہی کھڑی ہے''۔

میری جان میں جان آئی۔ میں نے پہلے اس بات پر کبھی غور نہ کیا تھا۔ میں دائیں کھڑی تھی اور جمیل میرے بالکل سامنے بیٹھا تھا۔

ہم رات گئے تک اکٹھے رہے۔ جوں جوں وقت گزرتا رہا جمیل کی آنکھیں میں جانے پہچانے سایے ابھرنے لگے- اس کی باتوں میں کوشش کا گماں ہونے لگا۔ اُس کا یہ اکھڑا پن میری سمجھ میں آنے لگا مگر اس سمجھ کو قبول کر لینے میں مجھے بڑا تامل تھا- میں نے بہت دعا کی کہ اس کی آنکھوں سے یہ سایے مٹ جائیں، اس کی باتیں اس کی روشنیءِ طبع کا عکس بنیں مگر میری دعا قبول نہ ہوئی۔ خود رابعہ کو بھی بدلے ہوئے حالات کا احساس ہو رہا تھا۔ وہ خود ان حالات سے متاثر ہو چکی تھی اور چپ تھی۔ وہ جب رخصت ہو چکے تو میں 'ان' کو شب بخیر کہے بغیر اپنے کمرے میں چلی آئی اور تمام رات جاگتی رہی۔ صبح ہوئی تو میں نے دیکھا کہ وہ بھی رات بھر نہ سوئے تھے۔

اس پہلی ملاقات کے بعد رابعہ اور جمیل سے سال بھر ملاقات نہ ہوئی۔ ابّا اماں کے خطوں سے دونوں کی خبر کبھی کبھار آجاتی تھی۔ ان کے خطوں سے میں نے اندازہ کیا کہ میاں بیوی کے تعلقات میں پہلی سی گرمی نہ رہی تھی۔ میں پھر بھی مطمئن تھی کہ دونوں اپنی مشکلات پر قابو پالیں گے۔ میں فردوس کی پیدائش اور اس کے بعد اس کی پرورش میں اتنی مگن رہی کہ میرے ذہن سے رابعہ اور جمیل کا خیال تک اتر گیا تھا۔

ایک دن اچانک مجھے اطلاع ملی کہ رابعہ اپنی کسی سہیلی کے یہاں ولی پور آئی ہوئی ہے

اور مجھ سے ملنے کی خواہاں ہے مگر چاہتی ہے کہ ملاقات نہ میرے یہاں ہو نہ اس کے یہاں۔ ہم نے پیامی کے ذریعے وقت اور جگہ طے کر لی۔

مجھے ہمیشہ اپنے متعلق شک رہا تھا کہ میری شخصیت میرا حسن کسی نہ کسی کے لئے دوزخ کا عذاب بن سکتا ہے، یورپ میں اکثر یہ شک یقین کی سرحدوں کو چھو کر لوٹ آیا۔ نجانے کتنے اجنبی مسافروں کو میرے حسن نے، میری شخصیت نے، گمراہ کیا۔ میں ہمیشہ اپنے آپ کو قائل کرتی رہی کہ ان حادثات میں میرا اپنا ارادہ شامل نہیں مگر جمیل کے معاملے میں میں اپنے آپ کو قائل نہیں کر سکی۔ رابعہ کی زندگی میں جو نا قابلِ عبور صحرا پیدا ہو گیا ہے اس کی وجہ اگر میں نہیں ہوں تو کون ہے۔ میں جمیل کو ستاتی رہی، وہ مجھ سے چپکے چپکے پیار کرتا رہا، دکھ سہتا رہا، احساسِ گناہ میں جلتا رہا۔ پھر اپنے لئے نئے راستے تلاش کرتا پھرا، اپنے دل سے میری یاد، میرے حسن کی یاد، میری خواہش سے پیدا ہونے والے احساسِ گناہ کو اپنے دل سے نکالنے کی، بھلانے کی، کوشش کرتا رہا۔ جب وہ اس میں کامیاب ہونے کو تھا تو میں نے پھر اس کی زندگی میں قدم رکھ دیا، مندمل ہوئے زخموں کو پھر ہرا کر دیا، بجھی آگ کو پھر روشن کر دیا، تیز کر دیا، عذاب کو نا قابلِ برداشت کر دیا۔ اگر مجھے جمیل پر کوئی حق تھا بھی تو رابعہ پر کیا حق تھا؟ اس کی زندگی کو جہنم بنانے کا گناہ کس کے سر مڑوں۔

''جب سے اس رات آپ سے ملی مجھے اپنے نقلی ہونے کا، آپ کی نقل ہونے کا، احساس ہونے لگا، احساس شدید ہوتا گیا ہے، عذاب ہو گیا ہے۔ جمیل صاحب کی ہر پیار کی بات پر مجھے یہی احساس ہوتا ہے کہ یہ باتیں میرے لئے نہیں، اصل کے لئے ہیں۔ بلکہ شادی سے اس ملاقات تک کی تمام خوشگوار باتیں مجھے دھوکا اور جھوٹ لگنے لگی ہیں۔ میری شکل وصورت آپ سے کیوں ملتی ہے، اس میں میرا کیا قصور ہے۔ میں ان کو چاہتی ہوں، پیار کرتی ہوں، ان کی پرستش کرتی ہوں۔ اس کا اجر یہ عذاب کیوں! مجھ سے وہ پیار بھی نہیں کر سکتے اور میرے بغیر وہ اپنا ذہنی توازن بھی قائم نہیں رکھ سکتے۔ اگر انہوں نے ذہنی توازن کھو دیا تو تمام کاروبار چوپٹ ہو جائے گا۔ ہزاروں لوگ جو ہمارے کارخانوں میں کام کرتے ہیں بیکار ہو جائیں گے۔ میں اپنے عذاب کو برداشت کر سکتی ہوں مگر مجھ سے ان کا

عذاب نہیں دیکھا جاتا۔

جب بھی ایک جھپکے کے لئے وہ بھول جاتے ہیں کہ میں اصل نہیں ہوں تو ان کی آنکھوں میں روشنیوں کا ایک جہاں آباد ہو جاتا ہے۔ان کے تمام جسم میں، ان کے اعضا کی جنبشوں میں ایک لحن بھر جاتا ہے، ان کی آواز میرے جسم کے ذرے ذرے کو تحلیل کر دیتی ہے، مجھے سب دکھ بھلا دیتی ہے، میری روح سے عذاب کے تمام نشان مٹا دیتی ہے......

مگر......آہ! جب میں ان کی طرف بڑھتی ہوں......اس سے ان کی طرف نہ بڑھنے کا، ان پر پیار نچھاور کرنے کا خیال کس کو نہ آئے گا- آپ کو نہ آئے گا؟ آئے گا!-نہیں ! آپ کو دیکھنے سے تو یہی گماں ہوتا ہے- مجھے یقین ہو چلا ہے کہ آپ میری طرح نہ کریں گی، آپ کی آنکھوں میں کسی اور کی تصویر ہے۔آپ کی نس نس کسی اور ہی کی مالا جپتی ہے، آپ کے کانوں میں تو میری آواز بھی نہیں آ رہی، شاید! کون بسا ہے آپ کی آنکھوں میں؟ کس کی آواز نے آپ کے کانوں میں ڈیرے ڈالے ہیں؟

آخر اس عذاب سے نجات کیسے ہوگی؟ موت ہی کیوں نہیں آ جاتی۔ مجھ میں اب تاب نہیں ہے جینے کی۔''

میں اس کی پکار کا کیا جواب دیتی- وہ سچی تھی-مگر میں بھی تو گنہگار نہ تھی- ہم سب مقدر کے پٹے ہوئے تھے۔اس کے مر جانے سے جمیل کا عذاب کیسے کم ہو سکتا تھا- اگر وہ کچھ کر بیٹھتی تو میرے اس عذاب میں بہت ہی بڑا اضافہ ہو جاتا۔

میں اس کو صرف اتنا ہی کہہ سکی کہ وہ میرے ساتھ گھر چلے۔وہ نہ جانے کیوں انکار نہ کر سکی۔جب ہم گھر پہنچے تو شام ہو چکی تھی، رات چھا جانے کو تھی۔فردوس کے کمرے سے انّا کی لوری کی آواز آ رہی تھی۔میں فردوس کے کمرے کی طرف کھنچی چلی گئی۔فردوس جھولے میں بیٹھی انّا کو مسکرا مسکرا کر دیکھ رہی تھی۔ جب مجھے دیکھا تو ہنسی اور پھر ایک دم اس کی آنکھوں میں حیرانی چھا گئی۔میں نے مڑ کر دیکھا تو رابعہ دہلیز پر کھڑی تھی- میں اس کا ہاتھ پکڑ کر جھولے تک لے گئی۔فردوس حیران تھی، انّا حیران تھی۔رابعہ نے ہاتھ پھیلائے اور فردوس کو پکارا'' آؤ بیٹی''۔فردوس مسکرائی، اس نے اٹھنے کی کوشش کی۔رابعہ نے جھک کر

فردوس کو اٹھالیا، انّا مسکرائی- مجھے ایک لمحے کے لئے احساس ہوا کہ فردوس کی ماں میں نہیں رابعہ ہے، وہ اصل ہے اور میں نقل۔

ہم ڈرائنگ روم میں آ گئے فردوس رابعہ کی گود میں کھیلتی رہی، مسکراتی رہی۔ رابعہ فردوس کی حرکتوں میں، اس کی مسکراہٹوں میں، اس کی کھلکھلاتی ہنسی میں اتنی محو ہوگئی کہ مجھے اپنا وجود فالتو نظر آنے لگا۔ میں ان کو چھوڑ کر اپنے کمرے میں چلی آئی مگر کل نہ پڑی۔ وہاں سے اٹھ آئی۔ ڈرائنگ روم کی طرف بڑھی مگر قدم ہی نہ اٹھے۔ مجبوراً باہر برآمدے میں نکل گئی۔ ہلکی ہلکی ہوا چل رہی تھی۔ دور باغ کے مشرقی درختوں کی شاخوں کی اوٹ سے پورا چاند جھانک رہا تھا۔ ہوا چہرے پر، بدن پر بہت بھلی لگی۔ ڈرائنگ روم سے کبھی کبھار باتوں کی آواز میری طرف اڑ آتی۔ فردوس کی ہنسی ہر چند لمحوں کے بعد فضا میں گونج جاتی اور ایک بار تو ایسا ہوا کہ رابعہ اور فردوس کی ہنسی ایک ساتھ فضا میں گونج گئی، گونجتی رہی اور پھر ایک دم اس ہنسی میں سے کسی کے رونے کی آواز ابھری اور فضا میں پھیل گئی، چھا گئی- رابعہ کے رونے کی آواز تھی- فردوس کی ہنسی کی آواز بند ہوگئی- رونے کی آواز سسکیوں میں ڈھل گئی- میں جہاں کھڑی تھی وہیں کھڑی کی کھڑی رہ گئی- قدم اٹھانے کا خیال تک نہ آیا- جب خیال آیا، ارادہ کیا تو جسم میں جان ہی نہ تھی۔

یکا یک فردوس رونے لگی۔ میں بے تابانہ اس کی آواز پر لپکی، کمرے میں پہنچی تو دیکھا رابعہ کی آنکھوں سے ٹپ ٹپ آنسو برس رہے تھے اور فردوس اس کو دیکھ دیکھ کر رو رہی تھی۔

میں رابعہ کے پاس بیٹھ گئی، جیب سے رومال نکال کر اس کے آنسو پونچھے۔ وہ مسکرائی اس نے اپنی انگلیوں سے فردوس کے چہرے سے آنسو صاف کیے۔ اس کو مسکراتے دیکھ کر فردوس بھی مسکرانے لگی۔ مجھے جرأت نہ ہوئی کہ فردوس کو رابعہ کی گود سے لے لوں۔ رابعہ کچھ دیر تو آنکھیں جھکائے فردوس کو تکتی رہی، اس کے بالوں سے کھیلتی رہی، اس کی ہنسی میں کھوئی رہی۔ فردوس سہلانے سے سوگئی۔ رابعہ اٹھی اور فردوس کو لئے کمرے سے نکل گئی۔ کچھ دیر بعد لوٹ آئی۔ فردوس کو انّا کے سپرد کر آئی تھی۔ وہ بہت خوش تھی۔ آتے ہی میرے پاس بیٹھ گئی اور میرے ہاتھ اپنے ہاتھوں میں لے کر بولی:

''میری باتوں سے، میرے اعمال سے، اگر آپ کو دکھ ہوا ہو تو مجھے معاف کر دیں۔ آپ کی بیٹی نے- کیا نام ہے-فردوس؟ آپ کی بیٹی نے مجھے اتنی خوشی بخش دی ہے کہ اب جینا عذاب نہ رہے گا۔''

ہم دونوں ہاتھوں میں ہاتھ دیئے دیر تک چپ چاپ بیٹھے رہے۔ پھر رابعہ اٹھی۔ میں بھی اٹھی۔ ہم باہر برآمدے میں آ گئے۔ برآمدے سے اتر باغ میں چلے گئے- ٹہلتے رہے۔ چاندنی میں ہمارے سایے بہت سہانے تھے۔ رابعہ کے چہرے کو دیکھتی تو یوں لگتا کہ سب چاندنی اس کی آنکھوں سے، اس کے چہرے سے، اس کے جسم سے نکل رہی تھی۔ چاند کو دیکھا تو وہ رابعہ کا پرتو نظر آیا۔

رات ڈھل گئی تھی۔ رابعہ ٹہلتے ٹہلتے رک گئی تھی اور میری طرف دیکھ رہی تھی۔ میں نے جب اس کی طرف دیکھا تو اس نے باہیں پھیلا دی اور مجھے کھینچ کر سینے سے لگا لیا۔ اس کے جسم سے عجیب سی خوشبو آ رہی تھی۔ میں خوشبو کی راہ سے بھٹک گئی، اپنے آپ کو بھول گئی۔ میرے ماتھے پر کسی کے بوسے نے مجھے چونکایا۔ کوئی پاس نہ تھا۔ ادھر اُدھر دیکھا تو رابعہ دروازے کی طرف بڑھی جا رہی تھی۔ میں ششدر تھی۔ اس کو پکارنا چاہا تو آواز حلق سے نہ نکلی۔ وہ درازے سے نکل چاندنی میں گم ہو گئی۔ میں نے ڈرائیور کو آواز دی کہ موٹر نکال لائے۔ آیا تو میں نے اس کو رابعہ کے پیچھے بھیجا کہ وہ اسے گھر تک چھوڑ آئے۔ وہ چلا گیا تو میں باغ میں انتظار کرتی رہی۔ موٹر دور کہیں جا کر رکی، دروازہ بند کرنے کی آواز آئی اور اس کے بعد موٹر کے چلنے کی آواز۔ میں مطمئن ہو گئی کہ رابعہ بھٹکے بغیر گھر پہنچ جائے گی۔

میں اندر چلی آئی اور کچھ کھائے بغیر ہی بستر پر جا لیٹی۔ جاگتی رہی۔ چاند کو مشرقی بڑی کھڑکی کی چوکھٹ سے نیچے جاتے دیکھا تو پھر آنکھیں مند گئیں، سو گئی، سورج چڑھے تک سوتی رہی۔

ہر سال کی طرح اس سال بھی ہم نومبر میں دھنش محل چلے آئے تھے۔ 'وہ' تمام دن جاگیر کے کارندوں میں مصروف رہتے۔ میں پڑھتی رہتی یا فردوس سے کھیلتی رہتی۔ کبھی کبھار

شام کو بگھی میں چھوٹے آغا کی بیگم یا ان کی بہن کو ملنے داؤ دنگر چلی جاتی۔ جب 'وہ' دوستوں کے ساتھ یا کمشنر یا گورنر کے ساتھ شکار کو چلے جاتے تو میں مغربی کمرے میں چلی جاتی تھی، مغربی موسیقی کے ریکارڈ سنتی رہتی۔ چاند کو چڑھتے، ڈھلتے دیکھتی رہتی یا کہیں دور سے آتی ہوئی بانسری کی دھن پر جھومتی رہتی۔

ایک رات مغربی کمرے میں بیٹھی ریکارڈ سن رہی تھی کہ یونہی اچانک خیال آیا کہ میرے کمرے میں اب ایسی کوئی کتاب نہیں رہی تھی جو میں نے پڑھ نہ لی ہو۔ خیال آتے ہی اٹھی اور لائبریری کی طرف چل دی کہ کچھ کتابیں پڑھنے کے لئے لے آؤں۔

وہاں پہنچی تو دیکھا کہ لائبریری میں روشنی ہے اور دروازہ کھلا ہے۔ اندر جھانکا تو سامنے بڑی میز کے پیچھے سر کرسی کی پشت پر رکھے، کوئی دراز تھا۔ پہلے تو ڈری پھر اندر چلی گئی۔ ایک نوجوان کرسی پر سو رہا تھا۔ چاندنی مغربی کھڑکیوں سے اندر آ چکی تھی مگر ابھی اس کی کرسی تک نہیں پہنچی تھی۔ نوجوان کا چہرہ عجیب سے دھندلکوں میں لپٹا تھا۔ میں بت بنی نوجوان کو دیکھتی رہی۔ چاندنی آہستہ آہستہ میز کی طرف، کرسی کی طرف بڑھتی جا رہی تھی۔ چاندنی میز پر چھا گئی، نوجوان کے جسم کی طرف بڑھنے لگی۔ چاندنی میں اس کی گردن، اس کی ٹھوڑی، اس کے ہونٹ دمکنے لگے۔ چاندنی کچھ لمحوں کے لئے رک گئی یا مجھے لگا کہ رک گئی ہو۔ وہ گردن بہت پیاری پیاری تھی، وہ ٹھوڑی شعلے کی طرح تھرک رہی تھی اور وہ ہونٹ کتنے معصوم تھے۔ چاندنی نے پھر چلنا شروع کر دیا۔ ہونٹوں سے ناک تک، ناک سے آنکھوں تک اور آنکھوں سے ماتھے تک۔ اور اجنبی کا چہرہ چاندنی میں تھا۔ اجنبی چونکا۔ اس نے آنکھیں کھولیں، مجھے حیرانی سے دیکھتا رہا اور پھر ایک دم کرسی کے بازوؤں پر ہاتھ رکھ کے اس نے اپنا دراز جسم اکڑوں کر لیا اور پھر اٹھ کھڑا ہوا اور بت بنا مجھے تکتا رہا۔ ہم ایک دوسرے کو تکتے رہے۔

''میں جا رہا تھا کہ موسیقی کی آواز نے مجھے روک لیا۔ میں دروازے سے لوٹ آیا۔ بیٹھ کر سننے لگا۔ کتنی سہانی، کتنی گہری، کتنی بلند، کتنی ہمہ گیر تھی وہ موسیقی!''

''موسیقی کو بند ہوئے تو دیر ہوئی -- میں کافی دیر سے یہاں کھڑی ہوں......''

''موسیقی اب بھی میرے کانوں میں گونج رہی ہے۔ اصل میں موسیقی کا صحیح لطف تو موسیقی بند ہو جانے کے بعد پیدا ہوتا ہے۔ خامشی موسیقی کو ایک نئے اور عجیب انداز میں دوہراتی ہے......نہیں! دوبارہ تخلیق کرتی ہے۔ میں تو کھو گیا تھا۔ مجھے آپ کے آنے کا بالکل پتہ ہی نہیں چلا۔ چاندنی نے جگا دیا ورنہ میں نہ جانے کب تک خاموشی پر کان لگائے سنتا رہتا......''

''لیکن تم کون ہو؟ یہاں کیا کر رہے ہو؟''

''میں عارف ہوں۔ میں آپ کا کاشتکار ہوں۔ بڑے آغا جی نے مجھے حساب کتاب مرتب کرنے کے لیے مقرر کیا ہے اور مجھے کتب خانے کو استعمال کرنے کی اجازت دے رکھی ہے۔ میں سہ پہر سے شام تک ہر روز یہاں کام کرتا ہوں۔ کتابوں کی فہرست تیار کر رہا ہوں۔ پڑھتا بھی ہوں آج دیر ہوگئی- اماں انتظار کرتی ہوگی- اجازت دیں تو چلا جاؤں- آئندہ کبھی شام کے بعد نہیں ٹھہروں گا۔''

''نہیں، جب آغا نے تمہیں اجازت دے رکھی ہے تو تم کتب خانے کا استعمال جاری رکھو۔''

عارف چلا گیا۔ میں کتابیں لائے بغیر ہی اپنے کمرے میں آ گئی۔ تمام رات جاگتی رہی۔ صبح کی اذان کی آواز سنی تو اٹھ کر وضو کیا، نماز پڑھی اور گڑگڑا کر دعا مانگی کہ مجھے عارف سے اور عارف کو مجھ سے محفوظ رکھا جائے۔ دیر تک دعا مانگتی رہی اور پھر جانماز پر ہی لیٹ گئی اور سو گئی۔ اٹھی تو سورج کی کرنیں میرے تمام جسم کو باندھے ہوئے تھیں۔ دل پر بوجھ سا تھا جیسے میری دعا قبول نہ ہوئی ہو۔

اس رات کے بعد دوسرے تیسرے سرِ شام ہی چائی کوفسکی (Tchaikovsky) کی موسیقی کے ریکارڈ بجا کر سنتی۔ چائی کوفسکی میرے لیے ایک انجانا مگر کہیں کہیں پہچانا ہوا دیس تھا۔ بیچ بیچ میں موتسارت (Mozart) کو بھی سنتی۔ 'ان' کو اکثر کھانے پر میرا انتظار کرنا پڑتا۔

'ان' کو موسیقی پسند تو تھی مگر وہ اکثر مجھ سے کہا کرتے کہ کاموں سے، کھانے سے

فارغ ہو کر موسیقی سنا کرو۔ کھانے سے پہلے مجھے یہ بہت ستاتی ہے۔''

ان کو کیا پتہ تھا کہ میں ریکارڈ کیوں بجایا کرتی تھی۔ اپنے لئے نہیں بجاتی تھی۔ سرِ شام ہی مجھے احساس رہتا کہ عارف چلا جائے گا، اس کو روکوں۔ نہیں! روکنے کا خیال مجھے کبھی نہیں آتا تھا، میں تو اس کی تنہائی کو بہلانا چاہتی تھی۔ کیوں؟ آج سے پہلے مجھے اس سوال کے پوچھنے کا کبھی خیال ہی نہ آیا۔ میں عارف کی تنہائی کے لئے اور کیا کر سکتی تھی۔ وہ شریف تھا، بہت ہی فرمانبردار تھا مگر تھا بہت تنہا۔ وہ گاؤں کے لڑکوں میں منفرد تھا۔ لڑکیوں کو تنگ نہ کرتا تھا۔ گاؤں والے اس کے مداح تھے، وہ بہت ذہین تھا۔ میں جب کبھی کبھی صبح ہی صبح لائبریری میں جاتی تو اس کی میز پر کبھی معمولی درجے کی کتاب نہ دیکھتی۔ ایک صبح جو گئی تو میں نے دیکھا کہ میز کا ایک دراز ذرا سا کھلا ہے۔ کھولا تو دیکھا کہ ایک کاپی میں عارف نے اپنے مطالعے کی کتابوں سے نوٹ لے رکھے تھے۔ اس کا انتخاب اس کے گہرے تجربے اور سوچ کی عادت کا عکس تھا۔

اس کے لئے میرے دل میں عزت بڑھتی گئی۔ میں اس کے آرام، اس کی راحت کا چپکے چپکے انتظام کرتی رہتی۔ مجھے یقین ہو گیا تھا وہ علم کی دنیا میں اپنا نام روشن کرے گا۔ میں چاہتی تھی کہ اس کی راہ سے کانٹے ہٹا دوں۔ میں صرف یہی چاہتی تھی؟...... ہاں! صرف یہی!

میں نے کچھ عرصے کے بعد کتب خانے میں جانا بہت کم کر دیا۔ بہت سی کتابیں اکٹھی لے آتی تھی۔ مگر وہ سب کتابیں میں نے پڑھ لیں۔ آخری کتاب جب میں نے ختم کی تو رات کافی ڈھل چکی تھی مگر نیند کہیں آس پاس نہ تھی۔ میں اٹھی اور کتب خانے میں چلی گئی۔ کمرے میں گھور اندھیرا تھا۔ چاند نیچے وادی میں اتر چکا تھا۔ لیمپ جلایا تو ایسے لگا کہ ابھی ابھی کوئی کمرے سے اٹھ کر گیا ہو۔

میز پر کچھ کتابیں رکھیں تھیں۔ دراز کھولنے کی کوشش کی۔ سب بند تھے۔ میز پر پڑی کتابوں کو الٹ پلٹ کرتی رہی۔ ایک میں پنسل رکھی تھی۔ کتاب کھولی تو دائیں ہاتھ کے صفحے پر ایک فقرے کے نیچے لکیر لگی تھی، ہلکی سی۔ مجھے لکیر لگانے کی عادت نہ تھی، 'ان' کو بھی نہ تھی

اور عارف نے بھی پہلے کبھی کتاب میں لکیر نہ لگائی تھی۔ میں نے فقرہ پڑھا، بار بار پڑھا۔ فاضلانہ مگر سیدھا سا فقرہ تھا! ''انسانی محبت میں بھی ایسا مقام آتا ہے کہ صوفی کے جذب کی طرح محبت کرنے والے کے دل و دماغ میں کبھی تو بالکل گھور اندھیری رات کا سماں طاری ہو جاتا ہے اور رات ازل سے ابد تک محیط دکھائی دیتی ہے یا یوں محسوس ہوتا ہے کہ جسم نور میں ڈھل گیا ہے اور نور زمین کی وسعتوں سے لے کر عرش کی بارگاہوں تک پھیل گیا ہے۔''

میں دیر تک کرسی پر بیٹھی سوچتی رہی کہ عارف کو یہ فقرہ محض پسند آ گیا تھا یا اس کے تجربے کو بھی اس فقرے کو منتخب کرنے میں کوئی دخل حاصل ہے۔ میرا دل کہتا تھا کہ یہ فقرہ اس کے ذاتی تجربے کا اظہار تھا مگر ذہن کہتا تھا کہ اس کی عمر ہی کتنی ہے کہ وہ اس تجربے تک پہنچے۔ میں ابھی یہ سوچ ہی رہی تھی کہ قدموں کی چاپ سنائی دی۔ میں نے لیمپ بجھا دیا اور خود مغربی کھڑکی کے پاس جا کھڑی ہوئی - آواز قریب آتی گئی۔ کوئی کتب خانے کے دروازے کے قریب آ کر رکا، بڑبڑایا اور کمرے میں داخل ہو گیا۔

''کون ہے؟'' وہ پکارا

عارف کی آواز تھی۔ وہ کیوں لوٹ آیا تھا - کیا لینے آیا تھا - میرے دل میں دم بدم سوال پیدا ہو رہے تھے۔ عارف نے لیمپ جلایا اور میز پر پڑی ہوئی کتابوں کو دیکھنے لگا۔ میز سے پنسل اٹھائی۔ میں کتاب میں پنسل رکھنا بھول گئی تھی۔ وہ پنسل کو تکتا رہا اور پھر آہ بھری اور کرسی پر بیٹھ گیا اور اپنے ہاتھوں سے منہ کو ڈھانپ لیا۔ اس کے لبوں سے بار بار آہ نکلتی تھی۔ اس کا سر دائیں سے بائیں کرب میں ہلتا رہا۔ میں اپنے کونے میں دبکی کھڑی رہی۔ عارف بہت کرب میں تھا۔ آخر وہ کرب میں پکار اٹھا ''کون آیا ہوگا؟...... اگر وہ آئیں......'' اس کا گلا رندھ گیا اور آواز حلق میں کھو گئی۔ اس نے چہرے سے ہاتھ ہٹا لئے اور حیران آنکھوں سے چاروں طرف دیکھا۔ مجھے دیکھ کر اس کی نظریں ٹھٹکیں اور وہ کراہتے ہوئے اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ مجھ سے نہ رہا گیا۔ میں اپنے کونے سے نکل آئی، اس کی طرف بڑھی اور اس سے پوچھا:

''کیا ہوا؟ کیا تکلیف ہے؟ یہ کیسا درد ہے؟''

وہ کچھ نہ بولا۔ میں نے اپنے سوالات کو دوہرایا مگر وہ خاموش، نظریں جھکائے کھڑا رہا۔ اس کی نظریں، میں نے دیکھا، کہ کبھی پنسل پر اور کبھی کتاب پر جم جاتی تھیں۔ اس کا پنسل اور کتاب کو مسلسل تکے جانا یوں لگا کہ وہ مجھے سوال کر رہا ہو کہ میں نے اس کتاب کو ہاتھ لگایا تھا؟ نشان کیا ہوا فقرہ پڑھا تھا۔ وہ یونہی ٹکٹکی باندھے تکے جاتا تھا۔ میں چپ نہ رہ سکی۔

''میں نے تمہارا نشان کیا ہوا فقرہ پڑھ لیا ہے...... میں کتابیں لینے آئی تھی۔ لیمپ جلایا تو ایک کتاب میں پنسل رکھی نظر آئی۔ یونہی کھول لی کتاب۔ نشان دیکھ کر فقرہ پڑھ لیا۔''

''اوہ! مجھے گھر جا کر یاد آیا کہ میں نے خلافِ معمول کتاب میں نشان لگا دیا ہے......''

''اس وجہ سے لوٹ آنا تو عقل مندی نہیں۔ صبح کو مٹایا جا سکتا تھا۔''

''ہاں مٹایا جا سکتا تھا مگر...... مجھے پتہ ہے کہ آپ اکثر رات کو کتب خانے میں آتی ہیں اور میز پر پڑی ہوئی کتابوں کو دیکھتی ہیں اور دراز بھی دیکھتی ہیں...... میں نہیں چاہتا تھا کہ یہ فقرہ آپ پڑھتیں......''

وہ باتیں کرتے کرتے ہانپ گیا تھا۔ اس کا سانس مشکل سے آ رہا تھا۔ وہ اپنے آپ پر قابو پانے کی کوشش میں ناکام ہو رہا تھا۔

''کیوں؟''

وہ باتیں کرتے کرتے ہانپ گیا تھا۔ اس کا سانس مشکل سے آ رہا تھا۔ وہ اپنے آپ پر قابو پانے کی کوشش میں ناکام ہو رہا تھا۔

''کیوں؟'' وہ کراہا ''یہ میرے دل کا حال ہے......''

یہ کہتے ہی اس کا دایاں ہاتھ اس کے منہ کی طرف اٹھا اور اس کا منہ بند کر دیا۔ کچھ دیر وہ یونہی سکتے میں کھڑا رہا۔ میں نے بڑھ کر اس کے کندھے پر ہاتھ رکھ دیا اور اس کو بیٹھانے کی کوشش کی۔ وہ بیٹھ گیا اور بیٹھتے ہی میز پر بانہوں پر سر کو رکھے زار زار رونے لگا۔

میں پریشان ہوگئی کہ اس کو کیسے چپ کراؤں، کوئی آ گیا تو ہم دونوں کو دیکھ کر کیا

سوچے گا۔ میں اسی پریشانی میں اس کے بالوں پر ہاتھ پھیرنے لگی۔ اس کے بدن میں ایک تناؤ آ گیا، تناؤ جھرجھری میں بدلا، جھرجھری لرزے میں تبدیل ہوئی اور وہ کپکپاتے ہوئے اٹھا، مجھے دیکھا۔ اس کی آنکھوں میں ایسا گہرا، ہمہ گیر کرب تھا جو میں نے جنگی ہسپتالوں میں زخموں سے نڈھال، دم توڑتے ہوئے نوجوان سپاہیوں اور افسروں کی وحشت زدہ آنکھوں میں بھی نہ دیکھا تھا۔ اس کی آنکھیں امید کی اک کرن کی روشنی کی بھی منت کش نہ تھیں۔ ان آنکھوں میں جھانکتے ہوئے مجھ پر خوف طاری ہو گیا، میرے اندر اندھیرے کا ایک ریلا اس تیزی سے چلا کہ مجھے اپنی شخصیت منتشر ہوتے ہوئے محسوس ہوئی۔ میرے اندر میری اپنی شعوری کوشش کے بغیر تمام صلاحیتوں نے مل کر کچھ ایسا انتظام کیا کہ انتشار محض ایک شدید لرزے میں بدل گیا جس کو میں نے اپنی شخصیت کے شعور پر سے ایک ریلے کی طرح گزر جانے دیا۔ صلاحیتوں کے اجتماع اور ریلے کے تصادم سے ایک ایسی کیفیت پیدا ہوئی جس کو باشعور نشہ کہا جا سکتا ہے۔ میرے پاؤں فرش پر گڑے ہوئے تھے، اس میں پیوست تھے، اس کا لازمی حصہ تھے، صرف شعور ایک محدود سے دائرے میں آزاد تھا، صرف آنکھیں دیکھتی تھیں، باقی حواس معطل تھے۔

وہ کرسی کو آہستہ سے ہٹاتے ہوئے، مجھ سے دامن بچاتے ہوئے مغربی کھڑکی کی طرف بھاگ گیا۔ دایاں ہاتھ مٹھی کی صورت منہ میں دیے کراہنے لگا، بے اختیار۔ اس کا کراہنا بند نہ ہو رہا تھا، اس کی پوری کوشش کے باوجود۔ اس کا سارا بدن کانپ رہا تھا، پھڑک رہا تھا۔ مجھے ڈر لگنے لگا کہ اس کا گوشت، اس کی ہڈیاں، اس کا خون اندرونی دباؤ سے فضا میں منتشر ہونے کو ہے، منتشر ہو جائے گا، کسی بھی لمحے۔

میں نے ایک بار پھر ایک بھرپور کوشش کی اور اپنے آپ کو فرش سے چھڑایا اور اس کی اُور بڑھی۔ اس کے بالکل قریب پہنچ کر رکی اور اس کے روبرو کھڑی اس کو تکا کی۔ اس کا کپکپانا رک گیا، اس کا کراہنا بند ہوا۔ وہ میری طرف مڑا اور کھڑکی کی چوکھٹ کے سہارے سیدھا کھڑا ہو گیا۔ اس کی آنکھیں بڑے غور اور بے خوفی سے مجھے تک رہی تھیں، بے محابا۔ میرے سایے میں اس کی آنکھیں شعلوں کی طرح چمک رہی تھیں۔ ان میں ایک سوال تھا،

ایک للکار تھی۔ مجھے کوئی بات نہ سوجھ رہی تھی۔ میں چپکی کھڑی اس کو دیکھا کی، مسلسل۔اس کی آنکھوں کی گرمی، اس کی آنکھوں کی للکار نا قابلِ برداشت ہوئی جا رہی تھی۔ایک لمحے کے لئے میں نے محسوس کیا کہ اس کے زرد ہونٹوں پر مسکراہٹ کا ایک سایہ سا لرز رہا ہے۔ اس مسکراہٹ میں نہ جانے کیا کیا کچھ تھا! رحم تھا، یہ سمجھانے کی کوشش تھی کہ جس راہ پر چل رہا تھا اس کی منزل کا تعین میرے بس کی بات نہ تھی لہذا مجھے اس سے کچھ نہ کہنا چاہئے۔میرے ذہن کو ہار مان لینے میں کوئی عار نہ تھی مگر پھر بھی میرے منہ سے بے اختیار نکل گیا:

''جس راہ پر تم چل رہے ہو اس پر تم زیادہ دیر نہیں چل سکتے۔ یہ راہ اتنی ہی کٹھن ہے جتنی کھڑکی کے اس پار جانے والی یہ تنگ، لمبی اور بلند کمرِ کوہ۔''

میری آواز میں ایک للکار تھی جس کو میں نے اچنبھے اور حیرانی سے سنا۔

''اگر میں اس راہ سے کمرے تک پہنچ جاؤں تو!''

''تو تم......، تو تم......تو تمہاری......مراد بر آئے گی۔''

بات تو کہہ دی مگر اس کے معنی جب میرے شعور کے افق پر کوندے تو میرا دل اس زور سے دھڑکا کہ خون ہو گیا۔ میں اپنے الفاظ کو واپس لوٹانا چاہتی تھی مگر میرے جسم میں جان ہی نہ تھی۔روح نجانے مستقبل کے کسی اجنبی موڑ پر کس کو ملنے جا چکی تھی۔

عارف کے قدموں میں جنبش ہوئی۔میں گھبرائی کہ وہ شاید میری طرف بڑھنے والا ہے۔ اس کے چہرے کی طرف نگاہیں اٹھ گئیں- وہ مسکرا رہا تھا - اس کی آنکھوں میں روشنیوں کا ایک عجب رقص تھا، مسحور کن۔ لیمپ کی روشنی میں اس کا چہرہ تمتما رہا تھا۔اس نے میری گھبراہٹ کو دیکھا، رکا، مجھ پر ایک سہلاتی ہوئی نگاہ ڈالی اور دروازے کی اُور چل دیا۔ مڑ کر بھی نہ دیکھا۔

جوں جوں وہ مجھ سے دور ہوتا گیا میرے جسم میں جان آتی چلی گئی۔ جب اس کے قدموں کی چاپ خاموشی میں گم ہو گئی تو میرے قدم خود بخود اٹھے اور میں گرتی پڑتی اپنے بستر پر جا گری اور گرتے ہی نیند کے غاروں نے مجھے نگل لیا۔

اگلے دن عارف نہیں آیا۔ کوشش کے باوجود میرا دھیان اسی میں رہا۔ شام ہوئی، رات ہوئی، رات ڈھلی، عارف نہیں آیا۔ میں نے اپنے کمرے کی قدِ آدم کھڑکی کھول دی۔ شمال مشرقی پہاڑوں پر برف چاندنی میں دمکتی تھی، بلاتی تھی۔ چمکیلی چاندنی آنکھوں کی راہ تن بدن میں رچ گئی، سکون بنی اور چھا گئی، عالمِ درونی پر۔ میرے اندر امن تھا، ہر طرف۔ اس رات مجھے برسوں کے بعد اتنی گہری، اتنی پیاری نیند آئی۔ آنکھ کھلی تو کمرے کے روشن دانوں سے دھوپ جا چکی تھی، روشن دان ماند پڑ رہے تھے۔ خیال آیا کہ دوپہر ہو چکی ہے۔ ایکا ایکی اٹھ بیٹھی۔ پائنتی کی اُور ان کو کسی سوچ میں گم کھڑے پایا۔ میں ان کو حیرانی سے دیکھا کی۔ ان کے چہرے پر حیرانی تھی، ایک وجد کی سی کیفیت تھی، جس میں سے ایک اضطراب کی کیفیت اپنے آپ کو آزاد کرنے کی کوشش کر رہی تھی۔ وہ انجانے عالم سے لوٹ آئے تو وہ میری طرف متوجہ ہوئے:

''میں کوئی گھنٹے بھر سے دیکھ رہا ہوں تمہیں۔ تمہارے چہرے پر بہت خوشی تھی، سکون تھا، ایک سرخوشی اور وجد کا سماں تھا جو لبھاتا تھا، ڈراتا تھا، چپ رہنے کی تلقین کرتا تھا۔ تمہارے چہرے پر یہ سماں میں نے پہلے کبھی نہیں دیکھا۔ کئی بار مجھے گماں ہوا کہ تم مسکرائی ہو، دیوانہ وار۔ ایک خوف میرے حواس پر طاری ہوا جس سے میں اپنے آپ کو آزاد کرانے میں مصروف تھا اب تک......''

وہ باتیں کرتے کرتے پھر بے دھیان ہو گئے، کسی صدر راہے میں کھو گئے۔ لوٹے تو بولے۔

''عارف یکا یک بیمار ہو گیا ہے۔ وہ بخار میں پھنک رہا ہے۔ وہ حساب کتاب میں میرا مددگار ہے۔ عارف ہماری جاگیر میں ایک معزز سید کا پسر ہے۔ اس کے والد کا پچھلے سال انتقال ہو گیا۔ اس کو تعلیم چھوڑ کر شہر سے گاؤں آنا پڑا کہ وہی ماں کا سہارا ہے۔ وہ بیوہ ماں کی خدمت میں لگا رہتا ہے۔ میں نے اس کی ذہانت کو دیکھتے ہوئے اس کو کتب خانہ استعمال کرنے کی اجازت دی ہوئی ہے کہ وہ اپنی تعلیم کو مکمل کر سکے۔ مجھے اس سے اُنس سا ہو گیا ہے۔ وہ میرا تیسرا بازو اور دوسرا ذہن بن گیا ہے۔ میں پریشان ہو گیا ہوں۔ شام کو اس کی

عیادت کو جاؤں گا۔‘‘

وہ باتیں کرتے رہے، میرا دل دھڑکا کیا۔ مجھے شدید احساس ہوا کہ میرے چہرے پر کچھ تبدیلی ہویدا ہوگئی ہے۔ میں نے سر جھکا لیا اور آنکھیں ملنے کے بہانے مونہہ ہاتھوں سے ڈھانپ لیا۔ وہ کچھ دیر تو چپ کھڑے رہے اور پھر کچھ کہے بغیر باہر نکل گئے۔

ان کے جانے کے بعد مجھے خیال آیا کہ بیماری کے بعد وہ اپنے آپ پر قابو پا لینے پر قادر ہو جائے گا، اس کے جذبات کا دیوانہ پن سکون میں بدل جائے گا اور جب ہم دس پندرہ روز میں واپس ولی پور چلے جائیں گے تو میری یاد اس لئے عذاب نہ رہے گی۔ اس سلسلے کے خیالات کے اختتام پر میں نے طے کیا کہ میں یورپ چلی جاؤنگی فردوس کو لے کر، اگلے سال۔ اس ارادے سے تسلی ہوئی۔ اٹھ کر ہاتھ منہ دھو کر، ناشتہ کیا اور چھوٹے آغا کے یہاں چلی گئی۔ تمام دن باتوں میں رات کے واقعات شعور سے محو رہے۔ شام ہوئی تو گھر لوٹی۔ کپڑے بدلے ہی تھے کہ انہوں نے یاد کیا۔ کہنے لگے کہ بہت تھک گیا ہوں۔ چاہتا ہوں کہ جلدی کھانا کھا لوں اور سو جاؤں مگر اکیلے کھانا کھانے کو جی نہیں مانتا، تم بھی میرے ساتھ ہی کھانا کھا لو۔ کھانا کھا چکے تو انہوں نے بتایا کہ میرے نام ایک خط آیا تھا جو انہوں نے میرے کمرے کی میز پر رکھوا دیا ہے۔

میرے وہم میں بھی نہ تھا کہ خط جمیل کا ہوگا اس نے مجھے کبھی خط نہ لکھا تھا۔ میں اس کی تحریر سے آشنا نہ تھی۔ خط پر مہر بھی صاف نہ تھی۔ خط مختصر سا تھا مگر پھر بھی بار بار پڑھنے پر مجبور ہوئی، پڑھ چکی تو دل و دماغ پر ایک ہیجان کی کیفیت طاری ہوگئی۔ میں اس خط کو بھلا دینا چاہتی تھی، اس کے وجود سے انکار کر دینا چاہتی تھی مگر انکار کیسے ممکن تھا۔ خط میرے ہاتھ میں تھا، میں اس کی ریشمی ریشمی سطح کو محسوس کر رہی تھی، میرا ہاتھ اس کے قرب سے جل رہا تھا۔ میں نے جھنجھلا کے خط کو آتشدان میں ڈال دیا۔ خط کا اگرچہ وجود نہیں ہے مگر مجھے اس کا ایک ایک فقرہ یاد ہے۔ خط پڑھتے وقت جو جو احساسات جاگے تھے وہ اب تک زندہ ہیں، مجھے ستاتے ہیں۔

''میں نے تمہاری یاد کو کاروبار کی باریکیوں میں تحلیل کرنے کی بہت کوشش کی مگر تمہاری یادنت نئے روپ بدل بدل کر مجھے ڈستی ہے۔ میں نے رابعہ سے لولگائی کہ وہ تم سے بہت ہی مشابہ تھی۔ لیکن تمہاری یاد اس کے اور میرے درمیان حائل رہی ہے۔ تم مجھے ستاتی تھیں، وہ مجھ سے بے پناہ محبت کرتی ہے۔ اس کی آواز، اس کے اعضا کی جنبشیں اور حرکات، اس کی مسکراہٹ، اس کے نینوں کی لو پر تمہارا ہی گماں ہوتا ہے۔ اس میں، اس کی شخصیت میں، بہت کچھ ہے جو تم سے مختلف ہے مگر اس پر بھی وہ مماثلت غالب آجاتی ہے جو اس میں اور تجھ میں ہے۔ اس کی محبت کے باوجود میں کبھی بھی کسی طرح پر بھی اپنے آپ کو قائل نہیں کر سکا کہ وہ تمہارا ہی پرتو نہیں ہے، تمہاری ہی نقل نہیں ہے۔ میں اس سے ہمیشہ ہی اس احساس کو چھپاتا رہا اور شاید اس کو چھپانے میں کامیاب بھی تھا مگر جب رابعہ اور میں تمہارے یہاں سے لوٹے تو اس کے بعد رابعہ پر میرا راز کھل گیا۔ خود اسے اپنے نقل ہونے پر یقین ہونے لگا۔ اس احساس سے اس کو بہت دکھ ہوتا تھا۔ اس کا دکھ مجھ سے دیکھا نہیں جاتا تھا مگر میں کیا کر سکتا تھا۔ میرا طرزِ عمل اس کے اس احساس کو بہت ہی تقویت پہنچاتا تھا۔

جب تک وہ اس دکھ کو سہہ سکتی تھی سہتی رہی مگر برداشت کرتے رہنے کی بھی ایک حد ہوتی ہے۔ وہ حد آخر گزر گئی۔ وہ مجھے چھوڑ کر چلی گئی۔ میں کئی دن پریشان رہا۔ اس کا پتہ نہ چلا۔ آخر وہ ایک دن لوٹ آئی۔ وہ بدل گئی تھی۔ وہ خوش تھی، اس کا رواں رواں خوش تھا۔ اس کی چال مختلف تھی۔ اس کے رنگ روپ میں ایک وجدانی کیفیت تھی۔ مجھے اس سے پوچھنے کی ہمت نہ ہوئی کہ وہ کہاں رہی۔

اس کا حسن، اس کی سیرت، اس کی آواز، اس کے نینوں کی لو، سب نے مل کے میرے تخیل کے تانے بانے کو نئی ہیئت دینی شرع کر دی۔ میرے دل میں تمہاری یاد نے ایک انوکھا روپ دھار لیا جس کو بھلانا ناممکن تھا، جس کی طرف متوجہ نہ ہونا عذاب تھا۔ میری روح تمہاری یادوں میں اور رابعہ کی شخصیت میں جذب ہو جانے کو ہے۔ مجھے اب یوں لگتا ہے کہ وہ دن بہت ہی قریب آ گیا ہے جب میں صرف گوشت پوست کا ایک آلہ بن کر رہ جاؤں گا۔

میری روح نہ رہے گی، میرے تخیل اور حواس میں کوئی رشتہ نہ رہے گا۔ مجھے ذہن کی ضرورت نہ رہے گی۔

اگر ایسا ہوا تو تم ہی بتاؤ کہ اماں جی کا کیا حال ہوگا، رابعہ پر کیا بیتے گی۔ اس سے تو موت ہی بہتر ہوگی مگر موت کا دن معین ہے۔ پھر کیا ہوگا؟............ نہ جانے کتنی صدیاں بیت گئی ہیں جب میں نے 'پھر کیا ہوگا؟' لکھا تھا۔ اس کے بعد میرے جسم کے ذروں میں، میرے خون کی گردش میں، میرے خیالات کی رفتار میں اتنی تیزی آ گئی ہے کہ مجھے شک ہونے لگا کہ میں پاگل ہو جاؤں گا...... مجھے یقین ہے میں پچھلے نہ جانے کتنے طویل لمحے پاگل رہا ہوں۔

اگر مجھے کچھ ہو گیا تو تم اور نواب صاحب رابعہ کا خیال رکھنا۔''

اور اگر مجھے کچھ ہو گیا تو فردوس کا خیال کون رکھے گا، 'ان' پر کیا بیتے گی اور اگر مجھے کچھ نہ ہوا اور عارف کو کچھ ہو گیا تو مجھ پر کیا بیتے گی؟ اس تصور سے میں کانپ جاتی ہوں۔

آج عارف اچھا ہے۔ 'وہ' گئے تھے اس کی عیادت کو۔ کہتے تھے کہ بہت کمزور ہو گیا ہے، اس کی آنکھوں میں عجب سا نور ہے، اک عجیب سی وحشت ہے۔ وہ خوش تھے۔ مگر میرا دل تو بیٹھا جاتا ہے۔ میرا دل کہتا ہے کہ وہ آج کسی وقت رات کو ضرور اس تنگ اور بلند کمر کوہ سے، داؤ دنگر سے، چل کر کتب خانے میں پہنچے گا۔ اگر وہ پہنچ گیا تو...... میں بالکل سوچنا نہیں چاہتی کہ کیا ہوگا۔ میں قطعاً وہاں نہ جاؤں گی۔ میں اپنے آپ کو اپنے کمرے میں بند کر لوں گی۔

کیا بجا ہوگا۔ سورج ابھی مشرقی کھڑکیوں کی اوٹ میں ہے۔ رات آنے تک ابھی بہت وقت ہے۔ دن کیسے کٹے گا؟ رات کب آئے گی؟ رات کب ڈھلے گی؟ سویرا کب ہوگا؟ اس سویرے میں مجھ پر اور...... پر کیا بیتے گی۔

میں اب کیا کروں؟ کچھ کرنے کو جی نہیں چاہتا! لکھوں؟ کیا لکھوں؟ ذہن خیالات سے، دل جذبات سے بالکل خالی ہے۔ لیٹ جاؤں؟ نیند کہاں......

دروازہ کون کھٹکھٹا رہا ہے۔ اوہ! بابا تھا۔ میرے لیے خط ہے۔ کھولوں؟ نہ کھولوں؟

......ایک اور زخم، ایک اور چرکا لگا۔ آخر کتنے زخم کھا سکتا ہے کوئی۔ اناّ اماں لکھتی ہیں کہ ہفتہ بھر سے جمیل بالکل بے سدھ بستر پر پڑا ہے۔ ڈاکٹر کہتے ہیں وہ پاگل ہو گیا ہے کبھی اچھا نہیں ہو سکے گا۔ اس کو کوئی بیماری نہیں ہے۔ اس کا جسم ہر آزار سے آزاد ہے۔......

جمیل پاگل ہو گیا! کیوں؟ میں نے اور میرے پرتو نے اس کی روح کو چھین لیا ہے...... اس گناہ کی کیا سزا ہو گی!!! آخر کیوں؟ میں بے گناہ ہوں...... یہ قدرت کی ستم ظریفی ہے۔ ہے!!! ہے!!! میرا حسن اور میری شخصیت کا حسن کسی کے لئے اگر عذاب بن جائے تو اس میں میرا کیا قصور! مگر...... جمیل کو ستاتا تھا کون؟ میں! میں!! تو گناہگار بھی میں ہی ہوئی، ہوں !!!

اب میں کچھ نہ لکھوں گی۔ میں سوچوں گی بھی نہیں۔ میں سو جاؤں گی۔ ہمیشہ کے لئے! لیکن کیسے! میں نے تو پھر سوچنا شروع کر دیا......

میں نے تو اپنے آپ کو کمرے میں بند کر لیا تھا۔ میں وہاں کیسے اور کب گئی۔ مجھے یہاں کون لایا۔ عارف کا تو آہ! کچھ بھی نہ بچا ہو گا...... گرتے ہی مر گیا ہو گا۔ مجھ سے ابھی اور کتنے گناہ سرزد ہوں گے!

میں لائبریری میں کب گئی تھی؟ میں نے لیمپ کب جلایا تھا؟ کچھ یاد نہیں۔ لیمپ کے روبرو کتنی دیر بیٹھی رہی؟ کچھ یاد نہیں...... جب میں نے مغربی کھڑکی کی طرف دیکھا تو چاند کی کچھ کرنیں تنگ کمرِ کوہ پر ابھی ستا رہی تھیں۔ میں بے دھیانی میں اٹھی اور کھڑکی کی طرف بڑھی۔ کھڑکی بند تھی مگر اس کے شیشوں سے باہر کا منظر صاف نظر آتا تھا۔ باہر کمرِ کوہ پر کوئی نہ تھا، دور تک کوئی نہ تھا۔ میرا دم گھٹنے لگا۔ میں نے کھڑکی کھول دی۔ لمبے لمبے سانس لئے۔ سانس لینے میں اس سے پہلے کبھی اتنا لطف محسوس نہیں کیا تھا۔ میں کھڑکی سے لوٹ آنے کو تھی کہ دور پہاڑی دیوار پر ایک سایہ لرزا۔ سایہ بڑھتا چلا آتا تھا، میری طرف۔ چاند کی کرنوں میں عارف کتنا حسین لگ رہا تھا۔ وہ دھیرے دھیرے تنگ راہ پر نظریں جمائے چل رہا تھا۔ میں ڈری کہ اب گرا کہ اب گرا۔ میں اندھیرے کی اوٹ میں ہو گئی۔ میری نظریں بدستور عارف کے قدموں پر جمی تھیں۔ وہ بڑھا چلا آ رہا تھا۔ وہ کھڑکی کے بالکل قریب آ

گیا۔ اندھیرے کی اوٹ میں میں نے اپنی گردن آگے بڑھائی۔ عارف کا ایک پاؤں تو الٹا پڑ گیا، وہ ڈگمگایا، اس نے اپنے آپ کو سنبھالنے کی کوشش کی، دونوں پاؤں آگے پیچھے جما لینے کے باوجود وہ ڈگمگا رہا تھا۔ اس کا دھڑ خاصا ٹیڑھا ہو رہا تھا، بہت ہی ٹیڑھا ہو گیا۔ میری چیخ نکل گئی۔ عارف نے نظر اٹھائی۔ مجھے دیکھا اور لڑھک گیا، گھور اندھیرے میں، نیچے، بہت نیچے۔ ایک چیخ گہرائیوں سے ابھری اور فضا میں کھو گئی۔

میرا سر چکرایا۔ میں گرتے گرتے سنبھل گئی۔ کھڑکی کی چوکھٹ پر ہاتھ رکھے کھڑی رہی۔ کس انتظار میں؟ ہوش میں آئی تو کمرے سے نکلی۔ اپنے کمرے کی طرف بڑھی۔ داخل ہونے کو جی نہ چاہا۔ مغربی کمرے میں چلی گئی۔ مغربی شیشے کی دیوار پر سے پردے ہٹے ہوئے تھے۔ کمرا چاندنی سے بھرپور تھا۔ شیشے کی دیوار کے پاس آرام کرسی پر بیٹھ گئی۔ میں اپنی حالت کو سمجھنا چاہتی تھی۔ مجھ پر جو بیت گئی تھی اس کے عواقب پر غور کرنا چاہتی تھی۔ مگر دماغ سوچنے سے عاجز تھا، جسم حواس سے عاری تھا۔ اس کرسی پر بیٹھے میں چاندنی کو مشرقی دیوار سے اترتے، فرش سے پھسلتے، چاند کو لحظہ بہ لحظہ مغرب کی اُور اترتے دیکھتی رہی۔ چاند کے ساتھ ساتھ میرا دل بھی ڈوبتا رہا۔ کب تک وہاں پڑی رہی۔ کب یہاں اس کمرے میں آئی۔ کون لایا یہاں مجھے۔

عارف کی جوانی، اس کا حسن، اس کی ماں کا چین، میں نے سب کے سب مٹا دیئے۔ اس ظلم، اس گناہ کے بعد میں کیسے زندہ ہوں۔ موت کا فرشتہ کہاں راہ بھٹک گیا ہے؟ میں اب اور انتظار نہیں کر سکتی۔ موت کے سوا ان گناہوں کا کوئی کفارہ نہیں......

میرے دل کی حرکت بہت ہی تیز ہو رہی ہے، میرا جسم سو رہا ہے، میری آنکھوں میں نیند چھا رہی ہے، میرے ذہن پر اندھیرا چھا رہا ہے، میرے اندر ہر جا اندھیرے بڑھ رہے ہیں، چھا گئے ہیں۔

اب میں اپنی روح موت کے فرشتے کے سپرد کر سکتی ہوں۔ میرے اعمال کی کتاب اب مکمل ہے۔

حصہ پنجم

پہلا باب

ندیوں کی طغیانی اتر گئی تھی۔ ندیوں کے درمیان کی زمین پر چھوٹے بڑے جوہڑوں سے اندازہ ہوتا تھا کہ دونوں ندیاں ایک ہو کر بچھڑی ہیں۔ پانی کی روانی اب بھی تیز تھی مگر اب اس میں کناروں کو توڑنے کی طاقت نہ تھی۔ اب پانی کناروں سے دور دور رہنے پر قانع تھا۔ ندیوں کی طغیانی گھاس پر اثر انداز نہ ہو سکی تھی۔ ندیوں کے درمیان کی زمین پر جوہڑوں کے آس پاس سبز، اودی گھاس پر، گھاس کے سرخ سرخ پھولچوں پر پانی کے قطرے اپنی فتح کا اعلان کرنے پر مُصر نظر آتے تھے۔ ان کو شاید معلوم نہ تھا کہ اب پانی واپس لوٹ کے نہ آئے گا اور سورج کے نکلتے ہی ان کو فضائے بسیط میں نئے ٹھکانے ڈھونڈنے پڑیں گے۔

ندیوں کے پانیوں پر، ان کے درمیان کی زمین پر، دھند لکے ابھی محوِ خواب تھے۔ سورج کی کرنوں کی چاپ نے انہیں جگا دیا۔ انہوں نے انگڑائی لی۔ ان کے چہرے تمتمائے۔ انہوں نے کرنوں کے مقابلے میں قدم جمانے کی بہت کوشش کی مگر فرار کے سوا چارہ نہ تھا۔ کرنوں نے دھندلکوں کو مغرب کی طرف دھکیلنا شروع کیا۔ اس دھکم پیل میں دھندلکوں نے دم توڑ دیا۔ اب مشرق سے مغرب تک، شمال سے جنوب تک، زمین کی سطحوں سے آکاش کی بلندیوں تک روشنی ہی روشنی تھی۔ اس روشنی میں دور کے منظر بھی واضح ہو رہے تھے۔

صبح کی ہوا اب رک گئی تھی، پانی کی سطح پر موجیں سر نہ اٹھاتی تھیں شاید کرنوں کے مقابلے کی تاب نہ تھی، بے حس ہو کر ندیوں کی گہرائیوں میں نئے ہتھیار لینے چلی گئی تھیں۔ پانی نے آئینے کی ردا اوڑھ لی۔ درختوں کے سائے آئینے کے جال میں پھڑ پھڑانے لگے۔ تھک کر مدہوش ہونے لگے، مدہوشی نے ان کی حرکات میں رقص کی کیفیت پیدا کر دی۔ سایے اب ناچنے لگے، کبھی کبھی رقص میں تیزی آ جاتی اور کبھی رقص ایک دھیمی رفتار میں واپس لوٹ آتا، اترتے پرندوں کے سایے طلسمِ آئینہ کے برق رفتار محافظوں کے پھندوں سے نکل نکل جاتے۔ سایے پھندوں کو دیکھ ایک لمحے کے لئے ٹھٹکتے ضرور تھے۔ مگر ان کو قید کر لینا محافظوں کے بس کی بات نہ تھی۔

فضا میں گھنٹیوں کی آواز تھر کنے لگی۔ دور کھیتوں میں، باغوں میں، رکھوالوں کی آوازیں گھنٹیوں کی آوازوں کا ساتھ دینے کیلئے اٹھنے لگیں۔ رنگ برنگ کے گھوڑوں پر، ریڑھوں پر گاؤں کے باسی شہر کو جانے لگے۔

دھنش محل کے سایوں میں جو وادی تھی وہ جاگ پڑی تھی۔ وادی اور آکاش کے درمیان کی فضا جاگ اٹھی تھی، ہوا جاگ پڑی تھی، مندروں کے کلس، مسجدوں کے مینار جاگ اٹھے تھے، ہر سوئی ہوئی راہ جاگ اٹھی تھی، جانوروں کے گلے میں بندھی ہوئی گھنٹیوں کا شور جاگ پڑا تھا۔ ننھے کھلاڑی گھروں سے نکل میدان میں اتر آئے تھے۔

مگر دھنش محل کی دیواروں، گلیوں، ٹیرسوں، کھڑکیوں پر ابھی نیند کے آثار چھائے تھے۔ وہ صبح کے وجود سے انکار کرنے کی کوشش میں سرگرداں تھے۔

ہوا ٹیرسوں، برآمدوں، مسقف راستوں میں پھونک پھونک کر قدم رکھ رہی تھی کہ دھنش محل کے باسی جاگ نہ اٹھیں۔ سورج کی کرنیں مشرقی کمروں میں قدم جما لینے کے بعد ان کمروں کے مغربی دروازوں کی دہلیزوں میں کھڑی سوچ رہی تھیں کہ آگے بڑھیں کہ نہ بڑھیں۔

دور جنوب مشرقی برآمدوں سے پاؤں کی چاپ، چینی کے برتنوں کی جھنکار، ننھے پہیوں کی مدھم مدھم، مدھر آہٹ سرسرانے لگی۔ محل کے درمیانی کمروں کی طرف بڑھنے لگی۔

درمیانی کمروں سے نلکوں کے پھنکارنے کی صدا ابھری اور پھر پانی گرنے کے الحان میں ڈھل گئی۔

اس صدا اور اس الحان کے درمیان گنگنانے کی، دھیمے سروں میں الاپنے کی لے پھڑ پھڑانے لگی اور اس صدا اور اس الحان کو اپنے پروں نیچے چھپانے کی کوشش کرنے لگی۔

پھر یکا یک الاپنے کی لے سو گئی، گرتے پانی کا الحان سو گیا، ننھے ننھے پہیوں کی آہٹ، چینی کے برتنوں کی جھنکار رک گئی۔ کسی نے کہیں دروازہ کھٹکھٹایا۔ فضا میں ایک مترنم آواز گونجی

''کھانے کے کمرے میں برتن لگاؤ، صاحب کو جگاؤ۔''

''میں تو سوچتی تھی کہ شاید صورِ سرافیل پھونکنا پڑے۔

طبیعت اب کیسی ہے؟ نیند کے دھند لکے ابھی تک آپ کی آنکھوں کی پتلیوں سے لپٹے ہوئے ہیں۔''

''تمہارے گیت نے جگایا۔ اس کا شکریہ ادا نہ کرنا کفرانِ نعمت ہوگا۔ یہ کھانوں سے بھری ہوئی میز کو ہم دونوں کو صاف کرنا ہوگا؟''

''ہاں! رات کھانا کس نے کھایا تھا۔''

''اوہ! واقعی؟ تبھی اتنی کمزوری ہو رہی ہے۔''

متین صاحب نے کرسی کھینچی اور فردوس کے سامنے بیٹھ گئے۔ فردوس نے چائے بنا کر پیالی ان کی طرف بڑھا دی۔ دونوں کچھ دیر خاموشی سے چائے پیتے رہے، طشتریاں خالی کرتے رہے۔ پھر دونوں نے چائے کی پیالیوں کو میز پر رکھتے ہوئے ایک ساتھ سر اٹھائے۔ ان کے لب تھر تھرائے، ان کی آنکھیں چمکیں، ان کے چہرے دمک اٹھے۔ ان کے ہونٹوں پر مسکراہٹیں ناچ ناچ گئیں۔ دونوں ایک دوسرے کو دیکھ کر کھلکھلا کر ہنس پڑے۔

''آپ کیا کہنا چاہتے تھے۔''

''تم کیا کہنے لگی تھیں۔''

دونوں ایک ساتھ بول اٹھے۔اس پر دونوں ایک بار پھر ہنسے۔ان کے نینوں نے،ان کے چہروں نے،ایک دوسرے کو بتا دیا کہ وہ ایک دوسرے سے کیا کہنا چاہتے تھے۔

''آج کیا پروگرام ہے؟''

''یہاں سے شمال کی طرف، پہاڑوں کے درمیان ایک سبزہ زار ہے،اس میں شکارگاہ بھی ہے اور ایک گلستان بھی، اس شکار گاہ میں اب جانور نہیں اور اس گلستان میں گل نہیں...... کسی نے مدتوں سے ان کی دیکھ بھال نہیں کی۔اس گلستان کے پاس ایک چشمہ ہے جہاں، سنتے ہیں،جس نے نہا لیا اس کے دکھ دھل گئے۔

جس رات آپ سے پہلی ملاقات ہوئی اور میں مرتے مرتے بچی اس رات میں وہیں جا رہی تھی۔اس رات میں اکیلی جانا چاہتی تھی اور نہ جا سکی۔اس لئے میں چاہتی ہوں کہ آج میرے ساتھ آپ بھی چلیں۔پھر نہ جانے وہاں جانے کا موقع ملے نہ ملے......

چلیں؟''

''ضرور''

دوسرا باب

وہ ندیوں کو، ندیوں کی آواز کو بہت پیچھے چھوڑ آئے تھے۔ان کے چاروں طرف اونچے اونچے پہاڑ تھے،چمکتی، چندھیاتی، چٹانیں تھیں۔پتھریلے، ان جانے، راستوں پر گھوڑوں کے سموں کی صدائیں گونجنے لگی تھیں۔

پتھریلے راستے دم بدم بلندیوں کی طرف اٹھتے جاتے تھے،گھوڑوں کے جسم پسینے میں بھیگ گئے تھے۔وہ مڑ مڑ کر اپنے سواروں کو سوالیہ نظروں سے دیکھ رہے تھے۔سوار اپنے خیالات میں گم،چپ چاپ،ساکت، زینوں پر جمے بیٹھے تھے۔رستہ گھومتا، چکر کاٹتا، برابر بلندیوں کی طرف بڑھ رہا تھا۔رستے پر سایے بڑھنے لگے، ہوا میں خنکی آنے لگی۔گھوڑوں نے،سواروں نے ایک جھرجھری لی۔سواروں نے اپنے مفلر کی گرہیں تنگ کر لیں، بلندیوں

کی طرف ایک بار دیکھا اور پھر خیالات میں کھو گئے۔

یکایک پتھریلے رستے کے دونوں کناروں پر اونچے اونچے درختوں کے سایے لہرانے لگے۔ سواروں نے نگاہیں اٹھائی۔ رستے کے دونوں طرف چیل کے، چنار کے، سفیدے کے درخت دور تک چلے گئے تھے۔ سواروں کے چہروں پر سرخیاں دوڑ گئیں۔ ان کے ماتھوں پر پسینے کے قطرے جھلملانے لگے۔

درختوں کے سایے ختم ہوئے، رستہ ختم ہوا، ایک سبزہ زار شروع ہوا۔ سبزہ زار سے پرے ایک بن نظر آ رہا تھا۔ بن کے کنارے ایک خوبصورت سی جھونپڑی ان کو اپنی طرف بلانے لگی۔ گھوڑے ایک لمحے کے لئے رکے، سواروں نے ایک لمبا سانس لیا، ان کی رانوں میں، ان کی ٹانگوں میں، پیٹ میں ایک تناؤ آ گیا تھا۔ ان کی ایڑیاں گھوڑوں کے شکموں میں گھسنے لگیں، گھوڑوں کی دموں میں ننھی ننھی قوسیں ابھریں، دمیں ٹانگوں کے ساتھ لہرائیں، سواروں نے باگیں ڈھیلی کیں اور گھوڑے سرپٹ دوڑے۔

بن اور بن کنارے کی جھونپڑی ان کی طرف دیوانہ وار بڑھنے لگے۔ بن اور جھونپڑی سواروں کے قریب اور سوار بن کے، جھونپڑی کے قریب ہوتے گئے۔

سواروں کے جسم گھوڑوں کی گردنوں پر لمحے بھر کے لئے جھکے، سواروں نے گھوڑوں کی گردنوں کو تھپکا۔ گھوڑوں کی رفتار کم ہونے لگی اور جھونپڑی کے پاس پہنچ کر گھوڑے رکے۔ سوار اترے، سواروں نے زین سے بندھے ہوئے سامان کو کھولا۔ سامان جھونپڑی میں لے گئے۔ جھونپڑی کے باہر نہ جانے کب کی جلی ہوئی شاخوں کے نشان موجود تھے۔ جھونپڑی میں جگہ جگہ گھاس اُگی تھی اور بے وطن پتے فرش پر بکھرے تھے۔ متین نے جھونپڑی کی گھاس پھونس کے فرش پر دری اور دری پر کمبل بچھایا اور فردوس دھم سے اس پر لیٹ گئی۔ متین صاحب جھونپڑی سے باہر آئے۔ گھوڑوں سے زینیں اتاریں اور گھوڑوں کو سبزہ زار میں کھلا چھوڑ دیا۔ زینیں اٹھا کر اندر لے گئے۔ فردوس کی طرف دیکھا وہ آنکھیں بند کئے پڑی تھی۔ اس کا سینہ اس کے کوٹ سے زور آزمائی کر رہا تھا۔ متین صاحب کو یوں لگا کہ ابھی سینہ زور کرے گا اور کوٹ کے بٹن ٹوٹ جائیں گے اور بٹن ٹوٹنے کی آواز سے بن جلنے لگے گا۔

وہ منہ موڑ کر ایک زین کو سرہانہ بناتے ہوئے دری پر فردوس سے دور ایک اور کمبل بچھا کر لیٹ گئے۔

جب انہوں نے آنکھیں بند کیں تو ان کے کانوں میں اجنبی اجنبی سرسراہٹیں در آنے لگیں ان کے ذہن میں اجنبی صورتیں ابھرنے لگیں۔ ان کے تخیل میں ایک پرسکون روشنی چھانے لگی، ان کا دل پھیلنے لگا۔ دل میں ان کے ماضی کی یادیں، پچھلے کچھ دنوں کے واقعات، فردوس، تقی، دھنش محل، داؤ دنگر، ولی پور، ننھے ننھے، دور ہوتے ہوئے نقطوں میں ڈھلنے لگے۔ روشنی میں نئے منظر ابھرنے لگے۔ ان منظروں سے انوکھے گیتوں کے سر ان کی طرف بڑھنے لگے۔ ان مناظر کے بیچوں بیچ ایک تنگ گندا سا راستہ نظر آنے لگا، اس تنگ گندے راستے پر قدموں کی چاپ گونجنے لگی، پیر نظر آنے لگے، ننگے، تنہا پیر۔ وہ پیروں سے اوپر نظر اٹھانے لگے کہ کسی نے ان کو جھنجھوڑ کر چونکا دیا۔ ان کے کانوں نے سنا ''یہ تنہائی مجھے ڈس رہی ہے۔ بات کیجئے نا؟''

انہوں نے آنکھیں کھول کر دیکھا کہ فردوس ان پر جھکی ہوئی تھی۔ اس کے بال ان کے چہرے کو چھو رہے تھے، اس کے روغنی ہونٹ کانپ رہے تھے، اس کی آنکھوں سے روشنیاں ابل رہی تھیں۔ اس کے گلے میں مفلر نہ تھا، اس کی قمیص کے دو بٹن کھلے تھے۔ اس کی قمیص کے خشک حصے لمحہ بہ لمحہ تر ہوتے جا رہے تھے۔ متین صاحب نے آنکھیں پھر بند کر لیں، پھر کھولیں اور منہ پھیر کر فردوس کے کمبل کی طرف دیکھا۔ فردوس نہ تھی۔ کمبل پر اس کا مفلر، اس کا کوٹ، اس کے سر کا ریشمی رومال، اس کے بوٹ، بوٹ پر جرابیں، ان کو حیرانی سے تک رہے تھے۔

انہوں نے نظریں لوٹائیں اور فردوس کے چہرے پر گاڑ دیں۔ فردوس ان کی نظروں کی تاب نہ لا سکی، اس کی آنکھیں جھپک جھپک گئیں۔ ان کی پلکوں پر تارے جھلملانے لگے۔ متین صاحب کی کمر کے دونوں طرف گرے ہوئے اس کے بازو ڈگمگائے، اس کے سر میں جنبش ہوئی، اس کے سر سے بال سرک سرک کر متین کے چہرے کو چھپانے لگے۔ بالوں کی خوشبو سے ان کا دم گھٹنے لگا۔ انہوں نے ایک دم اپنی کہنیاں فرش میں گاڑ اپنے اوپر

کے دھڑ کو فردوس کے جسم کے پل کے نیچے سے نکال لیا اور زین کے ساتھ کمر لگائے فردوس کے بیٹھ جانے کا انتظار کرنے لگے۔ مگر پل ڈگمگایا اور فردوس دھم سے ان پر گر پڑی۔ اس کا سران کے فراخ سینے پر مچلنے لگا۔ فردوس کے سینے کی ہلچل نے ہچکیوں کو جنم دیا۔ متین صاحب کے کانوں میں اس کی سسکیوں کی آواز آنے لگی۔ اس کے آنسوؤں سے ان کا سینہ تر ہونے لگا۔ ان کی ناک میں اس کے بالوں کی خوشبو، اس کے پسینے کی خوشبو ملی بو اور اس کے تنفس کی خوشبو بھرنے لگی۔ ان کے جسم میں اس کے جسم کی حدت شامل ہونے لگی۔ ان کے خون کی رفتار تیز ہوئی، ان کے خیالات میں انتشار آنے لگا، ان کی جلد سنسنانے لگی۔ ان کے ہاتھ، ہاتھوں کی انگلیاں مچلنے لگیں۔ ان کی ریڑھ کی ہڈی گرم گرم سیال میں تحلیل ہونے لگی۔

بے بسی کا احساس ان کے ذہن پر چھانے لگا، ذہن نے بغاوت کردی اور وہ ایک ہی جھٹکے میں اٹھ کر بیٹھ گئے۔ فردوس کا سران کے شانے پر جا کر رک گیا اور اس کا سینہ ان کے سینے کو سہلانے لگا۔ ان کے ہاتھ اس کے شانوں پر جم گئے، ان کا جسم جھکا، اس کا جسم ان کے بازوؤں میں ڈھلک گیا۔ انہوں نے اس کو آہستہ سے کمبل پر لٹا دیا۔ اس کی قمیص کے خشک حصے بھی اب بھیگ چکے تھے۔ اس کی جبین پر تارے چمک چمک کر ماند پڑنے لگے تھے۔ اس کی پلکوں سے آنسو بہہ نکلے تھے۔ اس کا سانس تیز تیز چل رہا تھا۔ کمر کے فرش سے لگتے ہی اس کا دم ایک لمحے کے لئے رکا، اس کا جسم ساکت ہو گیا، اس کے پاؤں میں تناؤ آ گیا۔

متین صاحب اٹھے اور چیزیں ہٹا کمبل لائے اور کمبل فردوس پر ڈال دیا۔ کمبل کے لپٹتے ہی اس کا سارا بدن کپکپا گیا، اس نے پہلو بدلا اور اوندھے منہ ہو کر وہ دھاڑیں مار مار کر رونے لگی۔ متین صاحب کچھ دیر کھڑے اس کو حیرانی سے تکتے رہے اور پھر جھونپڑی کے دروازے سے ٹیک لگا کر باہر آسمان کی نیلاہٹوں کو، دور دور تک پھیلتے ہوئے پہاڑوں کو، پہاڑوں پر جھومتے ہوئے درختوں کو، درختوں کے سایوں میں گم ہوئے پہاڑی رستے کو، پہاڑوں کے جنوب میں ڈوبتے ہوئے افقوں کو دیکھنے لگے اور دیکھتے دیکھتے دل کی وادیوں میں سرگرداں ہو گئے۔

''متین صاحب! متین صاحب !!!''

متین صاحب چونکے، سورج ان کی آنکھوں میں گھس رہا تھا۔ انہوں نے پہلو بدلا، جھونپڑی میں جھانکا۔ ان کا سایہ جھونپڑی میں پڑا اور ساکت ہوگیا۔ جھونپڑی میں ایک سانس گنگنایا اور گنگناہٹ سے جھونپڑی بھر گئی۔ انہوں نے گردن موڑ کر کمرے میں نگاہ کی۔ دور کونے میں کھانے پینے کی چیزیں گھبرائی نظروں سے ان کو دیکھ رہی تھیں۔ اس سے ادھر دروازے کے قریب فردوس کا کوٹ، اس کا مفلر، اس کے سر کا ریشمی رومال، اس کے بوٹ، بوٹوں پر اس کی جرابیں سب کے سب سوئے ہوئے تھے۔ اور ان سے ادھر مشرقی دیوار کے قریب کمبل پر، کہنیاں کمبل پر ٹیکے، ہتھیلیوں میں چہرے کو اٹھائے، فردوس ان کی طرف لیٹے لیٹے دیکھ رہی تھی۔ وہ دونوں ایک دوسرے کو خاموشی سے دیکھتے رہے۔

''میں جاگی تو میں نے دیکھا کہ آپ نہیں تھے۔ میں ڈری شاید آپ چلے گئے ہیں۔ میں اپنے جذباتی طرزِ عمل کی معافی چاہتی ہوں۔ برسوں کا تشنج، مدتوں کی گھٹن اگر چند جذباتی لمحوں سے مٹ جائیں تو ان لمحوں کو نظر انداز کر دینا چاہیے''۔

اس کی آواز میں ہچکیوں کا، رونے کا نشان تک نہ تھا۔ اس کی آواز جذبات سے معرّا اور سکون کی مظہر تھی۔ مگر یہ آواز پھر بھی متین صاحب کو اپنے مقام سے نہ ہلا سکی اور وہ وہیں کے وہیں ساکت کھڑے فردوس کو دیکھتے رہے۔ فردوس کا چہرہ ہتھیلیوں سے پھسلا، اٹھے ہوئے بازو فرش پر گرے، فردوس نے پہلو بدلا، لمحہ بھر کمر کے بل سیدھا لیٹی رہی اور پھر اٹھی، اٹھ کر کھڑی ہوئی۔ اپنے کمبل کی طرف بڑھی، کمبل سے ورے کھانے کی چیزوں کی طرف بڑھی۔ کینوس کے تھیلے سے برتن نکالے۔ کھانا نکالا، دستر خوان نکالا۔ کمبل پر دستر خوان بچھایا، کھانا لگایا، کھانے کے ساتھ پھل رکھے، تھرماس، شیشے کے گلاس دستر خوان پر رکھے۔

کمبل پر بیٹھنے لگی مگر پھر اٹھی اور دروازے کی طرف لپکی، متین صاحب کو بازو سے پکڑا اور ان کو کشاں کشاں دستر خوان تک لے آئی اور ان کے شانوں پر زور دے کر ان کو بٹھلایا۔

''مجھ سے ناراضگی جائز سہی مگر کھانے سے ناراضگی چہ معنی؟ مجھے بھوک بہت ستا رہی ہے۔ اکیلے کھایا نہ جائے گا''۔

متین صاحب نے تھرماس سے گلاس میں پانی ڈالا، ہاتھ دھوئے اور کھانا شروع کر دیا۔

فردوس ان کو کھاتے دیکھ کر خوش ہو رہی تھی۔ وہ کھانے کی چیزیں ان کے قریب کئے جا رہی تھی اور وہ ہاتھ روکے بغیر کھاتے چلے جا رہے تھے۔ ان کو جلد جلد کھاتے دیکھ کر فردوس مسکرائی، پھر ہنسی اور ہنستے ہنستے بولی:

''ابھی تک آپ نے مجھے معاف نہیں کیا۔ غصہ کھانے پر نکال رہے ہیں؟'' متین صاحب نے اپنے ہاتھوں کی طرف دیکھا، کچھ سوچا، پھر فردوس کی طرف دیکھا اور اس کو دیکھ کر مسکرا دیئے۔

بن خاموش تھا۔ بن اداس تھا؟ راہ تک تک کے سو گیا تھا؟ کس کا انتظار تھا اسے؟ کوئی آواز اس کی طویل خاموشی کو توڑنے کی جرأت نہ کر رہی تھی۔ اس گہری نیند کے بندھن توڑنے کو مدتوں سے شاید کوئی نہ آیا تھا، اور اگر آیا بھی تھا تو وہ وہ نہ تھا جس کے مقدر میں اس خاموشی، اس نیند کے طلسم کو توڑنا تھا۔

سورج کی کرنیں بھی نیند کے اس طلسم میں داخل ہونے سے شاید گھبراتی تھیں کہ گرفتار نہ ہو جائیں۔ مگر اس طلسم کا شاید خزاں پر بس نہ چلتا تھا۔ بہار کو آمد و رفت کی آزادی تھی؛ بن کے فرش پر نہ جانے کتنی خزاؤں کے پتے لمبی لمبی گھاس کی آغوش میں سو رہے تھے، بن کے کنارے کے درختوں کی ٹہنیوں میں سرخ، نیلے، پیلے پھول کھل رہے تھے۔

متین اور فردوس گھوڑوں پر زین کستے کستے کبھی رک جاتے اور بن کی طرف نظر کرتے، ان کے ہاتھ رک جاتے، کچھ سوچتے، چونکتے اور پھر اپنے کام میں مصروف ہو جاتے۔ زین کس لئے گئے۔ سامان زینوں کے ساتھ باندھ لیا گیا۔ گھوڑے اب تیار تھے اور مڑ مڑ کر سواروں کو تکتے تھے۔ متین صاحب نے فردوس کو اس کے گھوڑے پر سوار کرایا۔ اپنے گھوڑے کی باگیں اٹھا کر زین میں پھنسائیں اور فردوس کے گھوڑے کی لگام کو ہاتھ سے پکڑ کر بن کی طرف بڑھنے لگے ان کا اپنا گھوڑا گردن اٹھائے ان کے پیچھے چل دیا۔

جب وہ جھونپڑی سے بن تک کا آدھا رستہ طے کر چکے تو ہوا انگڑائی سے بیدار ہوئی۔

فضا میں ہلچل پیدا ہوئی۔گھوڑوں نے دمیں ہلائیں۔فردوس کے کھلے بالوں نے اڑنے کو پر تولے۔فردوس نے گلے میں بندھے ہوئے ریشمی رومال کے بند کھولے اور بالوں پر ڈال کراس کے بند اپنی ٹھوڑی کے نیچے باندھ لئے۔

متین صاحب نے فردوس کے گھوڑے کی باگیں چھوڑ دیں اور اپنے گھوڑے پر سوار ہو گئے جوں جوں وہ بن کے قریب ہوتے گئے ہوا بھی ان کے ساتھ ساتھ قدم اٹھاتی رہی۔ گھوڑے اپنی رفتار میں تبدیلی پیدا کئے بغیر، آہستہ آہستہ، ناز سے قدم اٹھاتے، دم ہلاتے بن کی اُور بڑھتے رہے۔مگر ہوا بے تاب تھی۔نہ جانے کہاں پہنچنا چاہتی تھی۔اس کی رفتار میں تیزی پیدا ہوئی۔فضا میں شور پیدا ہوا۔بن کے کنارے کے درختوں کی شاخیں جھومنے لگیں۔بن کے فرش پر پڑے پتے خواب میں بڑبڑانے لگے۔ہوا بن کو جگانے لگی مگر بن سوئے رہنے پر مصر تھا۔ہوا اور تیز ہوئی۔گرے پتوں نے اڑنا شروع کیا، درختوں پر استادہ پتوں نے تالیاں بجانی شروع کیں۔ بن میں ایک سرسراہٹ پھیل گئی۔ سرسراہٹ سرگوشیوں میں ڈھل گئی۔سرگوشیاں اعلان بن گئیں۔فردوس کا گھوڑا بن کنارے پہنچ کر رک گیا،اس کے نتھنوں سے پھنکار کی صدا آنے لگی۔متین صاحب کا گھوڑا بن کے قریب پہنچا تو رکے بغیر آگے بڑھ گیا۔اس کے بڑھنے کے بعد فردوس کا گھوڑا بھی بن میں داخل ہو گیا۔

سویا ہوا بن جاگ اٹھا۔سوئے ہوئے پتوں نے احتجاج کیا، شاخوں نے ماتم کیا، گھاس فرش پر غلطاں ہونے لگی۔شاید وہ آ گیا تھا جس کے مقدر میں تھا کہ خاموشی کے، نیند کے طلسم کو توڑے۔گھاس نے، گرے پتوں نے راستوں کے سب نشاں مٹا دیئے تھے۔مگر گھوڑے شمال مشرق کی طرف بڑھتے رہے۔ پتے تالیاں بجا، آہ و بکا کر کر کے، گھاس غلطاں ہو ہو کے ان کو راہ سے گم کرنے کی کوشش کرتے رہے۔جب گھوڑے آہ و بکا سے، تالیوں کے شور سے، گھاس کی سسکیوں سے متاثر ہو کر رک جاتے تو سوار بڑھنے کا اشارہ کر دیتے۔شاخوں کو، شاخوں پر استادہ پتوں کو مصروف دیکھ کر سوچ کی کرنیں کبھی کبھی آنکھ بچا کر گھوڑوں کے پاؤں سے لپٹ لپٹ جاتیں پھر ان کے آگے آگے بھاگتیں۔شاید راہ دکھاتی تھیں؟ جب کبھی ایک لمحے کے لئے درختوں کی شاخیں، شاخوں پر استادہ پتے اپنا کام

چھوڑ کر کرنوں کو گھورتے تو کرنیں واپس فضا میں لوٹ جاتیں۔

سوار طلسم کی سبز پوش فوج کو روندتے بڑھتے ہی چلے گئے۔ بن ختم ہوا پھر ایک سبزہ زار ان کے سامنے تھا۔ اوپر نیلے آسمان کی سنہری فضا کو چیرتے ہوئے پرندوں کے غول بن کی اور اتر رہے تھے۔ طلسم کے اصلی باشندے طلسم فتح ہونے کے بعد دیس کو لوٹ رہے تھے؟۔ سبزہ زار کو دیکھ سوار رک گئے۔ سامنے ان کے دائیں ایک اونچی سی دیوار کھڑی تھی۔ دیوار سے پرے سنہری پھولوں اور درختوں کے سائے میں بہتا پانی جھلک رہا تھا۔ سوار اس دیوار کی طرف بڑھے۔ دیوار ایک چار دیواری کا حصہ تھی۔ چار دیواری میں ایک دروازہ تھا۔ دروازے پر قفل نہ تھا۔ چار دیواری کے گرداگرد اونچے اونچے درخت تھے جو چار دیواری پر سایہ کر رہے تھے۔

سوار گھوڑوں سے اترے، دروازہ کھول چار دیواری میں داخل ہو گئے ایک وسیع سبزہ زار تھا۔ گھاس بہت اونچی ہو چکی تھی۔ اس اونچی اونچی گھاس کے مغرب کی طرف سنگ مرمر کی ایک ننھی سی عمارت کھڑی تھی۔ اس کی چھت پر، اس کی دیواروں پر بیلیں چڑھی تھیں۔ ان بیلوں میں سرخ، نیلے پھول جھولتے تھے۔ دونوں چبوترے کی طرف بڑھے۔

ایک ننھی سی بارہ دری تھی۔ چبوترے پر چڑھ کر پتہ چلتا تھا کہ کبھی اس بارہ دری کے سامنے فواروں کی ایک قطار ہو گی جو مشرقی دیوار تک جاتی تھی۔ مگر اب فوارے ہمیشہ ہمیشہ کے لئے سو چکے تھے۔ ان پر کائی اور گھاس نے اپنے ڈیرے جما لئے تھے۔ پانی بھی اب ان کی راہ چھوڑ گیا تھا۔ بارہ دری حسین تھی مگر اداس۔ یہاں کون کٹیلی دوپہروں کو، چاندنی راتوں کو پھولوں کے سائے میں بیٹھ کر پانی کا ناچ دیکھتا ہوگا۔ وہ آج کہاں ہوگا یا ہونگے؟ ان بیلوں کو کس نے لگایا ہوگا؟ کس کے لئے لگایا ہوگا۔ کب سے یہاں کوئی نہیں آیا؟ فردوس سوچ میں ڈوبی بارہ دری میں گھومنے لگی۔ اس کی مشرقی محرابوں میں جالیوں سے دھوپ چھن چھن کے آرہی تھی۔ بیلوں کے اندھیرے جال میں کبھی کوئی تنہا کرن بھٹک آتی تھی۔ کچھ دیر نہ جانے کس کی قسمت پر چند آنسو بہا لوٹ جاتی۔ بارہ دری کے ادھر اندھیارے کونوں میں ٹھنڈک کنڈلی مارے بیٹھی تھی۔ قریب آنے والے کو ڈس لیتی تھی۔ اس

کے میلے ہوتے ہوئے سفید سفید فرش پر مرجھائے پھول، پتے بے سدھ پڑے تھے۔اس کی چھت میں شہد کی مکھیوں نے چھتہ بنالیا تھا۔

یہ شہد کس کے حلق میں ٹپکے گا؟ ہمارے بعد یہاں کون آئے گا؟ کیا یہ گلستان یونہی اجڑا رہے گا؟ یہ بارہ دری یونہی اداس رہے گی؟ یہ پھول یونہی مرجھاتے رہیں گے؟ یہ پتوں کی لاشیں یونہی گلتی سڑتی رہیں گی؟ یہ فوارے عدم سے کبھی لوٹ نہ سکیں گے؟ فردوس کا سوچتے سوچتے جی بھرآیا اوراس کا جی چاہا کہ اس ویرانی، اس اداسی پر چند آنسو بہالے مگر آنسو بھی اس ویرانے میں گرنے سے گریزاں تھے۔فردوس کو اس اداسی پر، اس ویرانی پر بہت ترس آیا۔مگر اس کو فوراً خیال آیا کہ وہ اس رحم کی زیادہ مستحق تھی۔اس کی اپنی حالت اس اجڑے گلستاں سے کس طرح بہتر تھی؟

وہ نہ جانے کتنی دیر انہی خیالوں میں کھوئی رہتی اگر اسے دوڑنے کی آواز نہ آتی۔وہ پہلے تو بہت ڈری پھر اس نے ہمت کر کے بڑھ کر بارہ دری کی ایک محراب سے جھانکا۔ایک تتلی نہ جانے کہاں سے بھٹک آئی تھی اور اس راہ بھولے مسافر کے پیچھے متین صاحب بھاگتے پھرتے تھے۔تتلی ہوا میں تیرتی، تھرکتی، فرار کی راہ تلاش کرتی تھی۔لیکن پیشتر اس کے کہ راہ ملتی متین صاحب نے اس کو پکڑ لیا۔وہ کچھ دیر تتلی کو ہتھیلی پر رکھے، دوسرے ہاتھ کی انگلیوں سے قابو کئے اس کو دیکھتے رہے۔پھر بارہ دری کی طرف بڑھے۔جب وہ قریب آگئے تو فردوس بھی محراب کے ستون کی اوٹ سے نکل چبوترے پر آگئی۔

متین صاحب نے نظر اٹھا کر اس کو دیکھا۔ان کی آنکھوں میں ایک چمک آگئی۔وہ اس پر نظریں گاڑے چبوترے کی سیڑھیاں چڑھنے لگے۔اس کے قریب آئے۔ان کی ہتھیلی ابھی تک کھلی تھی اوران کے دوسرے ہاتھ کی انگلیاں تتلی کے پھیلے ہوئے پروں کو دبائے تھیں۔اس کے قریب آ کے انہوں نے تتلی کو مٹھی میں بند کرلیا۔ان کی پلکیں پھڑ پھڑائیں اوران کی نظریں اس کے کوٹ کے کالر کے بائیں طرف گڑ گئیں۔نظر وہاں سے پھسلی تو اس کے سر پر جا کر رکی۔انہوں نے اپنے فارغ ہاتھ سے فردوس کے سر سے ریشمی رومال کھول کر اتارا، اس کے بالوں سے ایک پن نکالی اوراس پن سے تتلی کو پر کھول اس کے کوٹ کے کالر پر جکڑ دیا۔

''اس ویراں گلستان میں تتلی کا کیا کام۔ یہ تمہارے کوٹ پر ہی بھلی معلوم ہوتی ہے۔''

اس سارے عرصے میں فردوس دم بخود کھڑی رہی۔ اس کا دل اس عرصے میں کئی بار دھڑکا۔ اس کا ذہن کئی بار بہکا، اس کا تخیل کئی بار بے قابو ہوا۔ مگر ان کی اس ظالمانہ مگر معصوم حرکت پر وہ مسکرائے بغیر نہ رہ سکی۔ متین صاحب اس کی مسکراہٹ کو دیکھ کر سیڑھیوں کی طرف مڑے، کچھ سیڑھیاں اتر گئے اور پھر مڑے، فردوس کو غور سے دیکھا۔ وہ انہی کو تک رہی تھی۔ اس کی نظروں میں سوال بھی تھا اور حکم بھی۔ وہ سوچ میں پڑ گئے۔ جاگے، اس کی طرف ایک بار پھر دیکھا۔ فردوس کی نظریں ان کے چہرے پر نہیں تھیں بلکہ ان کے بائیں شانے پر تھیں۔ انہوں نے گردن گھما کر شانے کو دیکھا۔ فردوس کا ریشمی رومال ان کے شانے پر تھا۔ ان کے چہرے پر سرخی کی لہر سی دوڑ گئی، ان کی نظریں جھک گئیں۔ انہوں نے رومال کو شانے سے اتارا۔ اس کو دوہرا کر کے اس کے مقابل کے کونوں کو ملایا۔ فردوس کے سر پر رکھا، اس کی ٹھوڑی کو اٹھایا اور اس کی گرہیں باندھ دیں۔ فردوس کی آنکھوں میں شرارت آمیز مسکراہٹ ناچ رہی تھی۔ متین صاحب نے اس مسکراہٹ کو نظر انداز کرنے کی کوشش کی۔

''آؤ اب چلیں۔ سورج اب بلندیوں سے اترنا شروع ہو گیا ہے۔''

فردوس جہاں کھڑی تھی وہیں کھڑی آنکھوں سے مسکراتی رہی۔ متین صاحب نے اس کا ہاتھ پکڑ لیا اور اس کو کھینچتے ہوئے سیڑھیاں اتار کر دروازے کی طرف بڑھنے لگے۔

چار دیواری سے نکلتے ہی انہوں نے فردوس کا ہاتھ چھوڑ دیا اور گھوڑوں کی طرف چل دیئے۔ فردوس کچھ دیر تو ان کی طرف دیکھتی رہی پھر بہتے چمکتے پانی کی طرف لپک گئی۔ اس کے دوڑنے کی آواز سن کر وہ مڑے۔ فردوس پانی کے بالکل قریب جا پہنچی تھی۔

''میں چلا! گھوڑے بھی ساتھ لے جا رہا ہوں۔ نرگس بنی بہتے پانی کو تکتی رہنا۔''

فردوس اوندھی لیٹی پانی کو دیکھتی تھی۔ وہ ان کی دھمکی کے باوجود پانی کو دیکھتی رہی۔ وہ گھوڑوں کو لے کر چل دیئے۔ مگر کچھ دیر بعد اکیلے لوٹ آئے جب فردوس کے قریب پہنچ گئے تو فردوس ان کا عکس دیکھ کر پہلو کے بل مڑی، سر کو بازو اور ہاتھ کا سہارا دے کر ان کی

طرف دیکھنے لگی۔ متین صاحب چپ چاپ کھڑے رہے، پانی کو دیکھتے رہے۔

''لوٹ کیوں آئے؟''

''سوچا نرگس کو گاؤں لیتا چلوں۔ شاید کسی کو بھا جائے، لبھا جائے، کسی کے کام آ جائے...... تقی کو بھی نرگس بہت پسند تھی۔''

''آیئے۔ آپ بھی اس پانی میں اپنے عکس کو دیکھئے۔ پھر دیکھیں نرگس کون ہے: میں کہ آپ؟''

متین صاحب نے فردوس کے جسم پر ایک نظر ڈالی اور اس کے پاس اوندھے لیٹ گئے اور بہتے پانی کو دیکھنے لگے۔ بہتے پانی میں ساکت پرچھائیں! کیا انسان کی زندگی کی یہی تمثیل نہیں؟ فردوس نے سوچا۔ وہ ایک لمحے کے لئے بھول گئی کہ اسکی، متین صاحب کی پرچھائیں، ساکت ہیں اور پانی مسلسل بہہ رہا ہے۔ پھر جو خیال لوٹ آیا تو اس شدت سے کہ وہ تڑپ گئی اور اس نے بہتے شفاف پانی میں ہاتھ سے بھنور ڈالنے شروع کر دیئے۔ بھنور پیدا ہوئے مگر اس کی پرچھائیں اور ان کی پرچھائیں میں حسب سابق فاصلہ رہا۔ پرچھائیں ایک دوسرے میں مدغم نہ ہو سکیں۔

اس نے تھک کر ہاتھ پانی سے نکال لیا۔ بھنورا تا ہوا پانی اپنی اصلی حالت کی طرف لوٹنے لگا۔ پرچھائیں تھرکتی رہیں۔ ان کے فاصلے برابر قائم رہے۔ پانی پھر ہموار سطح سے بہنے لگا اور پرچھائیں پھر ساکت ہو گئیں۔ متین صاحب کی پرچھائیں مسکرا رہی تھی۔ ان کی مسکراہٹ سے اس کے گریزاں آنسو ٹپک ٹپک کر بہتے پانی کی ہموار سطح پر ارتعاش پیدا کرنے لگے۔

اس نے سوچا وہ اگر چہ جہاں تھی وہیں ہے، اس کی پرچھائیں اپنے مقام سے نہیں ہلتی۔ اس کے آنسو بہتے پانی کے ساتھ کہاں سے کہاں پہنچ گئے ہونگے۔ وہاں پہنچ گئے ہونگے جہاں وہ نہیں پہنچ سکتی۔ متین صاحب نہیں پہنچ سکتے، کوئی نہیں پہنچ سکتا۔

اس کے آنسو تھم گئے، آخر کب تک بہتے پانی کا ساتھ دیتے۔ اس نے بہتے پانی سے منہ دھویا۔ اس کے چہرے سے پانی کی بوندیں پھسل پھسل گرنے لگیں۔ پانی میں ایک بار پھر

ارتعاش پیدا ہوا۔ لہریں دائرے بناتے ہوئے اس سے دور ہوتی گئیں۔ اس کے چہرے سے آخری بوند بھی ٹپک گئی۔ آخری لہر بھی اس سے دور ہوگئی، پانی کی سطح پھر سے ہموار ہوگئی۔ اب بہتے پانی میں صرف ایک ہی پرچھائیں تھی۔ وہ پہلو کے بل پلٹی۔ متین صاحب پانی کے کنارے سے ہٹ کر آنکھیں بند کئے سیدھے لیٹے تھے۔ ان کے چہرے پر کرب کے گہرے گہرے نشان تھے۔

کیا یہ گہرے گہرے نشان اس کے آنسوؤں نے پیدا کئے ہیں؟ فردوس کو اپنی آنکھوں پر یقین نہ آیا۔ وہ ان کے اور قریب ہوگئی۔ ان کے چہرے کے نشان جلدی جلدی رخصت ہو رہے تھے۔

''اس بہتے پانی میں نہا لیجئے۔ دکھ دھل جائیں گے۔''

''اس پانی میں میرے دکھ اگر حل ہو گئے تو پھر کبھی کسی کے دکھ نہ دھل سکیں گے..... تم نہا لو۔ تمہاری آرزوئیں پوری ہو جائیں گی۔''

''میری آرزوئیں؟''

''تمہاری آرزوئیں جن سے تم ابھی ناواقف ہو۔''

''واقعی؟''

''ہاں''

''تو پھر آپ یہیں ایسے ہی لیٹے رہیے۔ میں دکھّن کی اُور پیلے پھولوں والے درختوں کی اوٹ میں نہا آؤں۔ میرا انتظار کیجئے گا۔''

فردوس نے کوٹ اتار کر ان کے سینے پر ڈال دیا اور خود دکھّن کی اور پیلے پھولوں والے درختون کی طرف چل دی۔ قریب پہنچی تو درختوں کے درمیان ہری ہری جھاڑیاں اگی تھیں جن کے پیچھے آدمی چھپ سکتا تھا۔

مدت ہوئی اس نے اس طرح شہر سے دور، درختوں اور پھولوں کے سایے میں، اپنا جسم پانی کے سپرد کیا تھا۔ مگر آج اس کے جسم سے نشہ آور دھوئیں کی بجائے اس کے روئیں

روئیں کی زبان سے خاموش دعائیں نکل رہی تھیں۔ آج اس کا جسم، اس کا ذہن، اس کا تخیل، اس کے جذبات کا احاطہ کرنے سے قاصر تھا اور اس صورتِ حال پر قانع۔ آج پانی کی ٹھنڈک، ہوا کی، سایے کی خنکی اس کے اعتماد کو ٹھکرانے میں اس کے جسم کے تعاون سے محروم تھی، آج اس کے نینوں میں اپنے دمکتے ہوئے روغنی جسم کو دیکھنے کی تاب نہ جانے کہاں سے آگئی تھی حالانکہ آج پانی میں اس کے جسم کے خطوط کا عکس کسی نارائنی سنگیت کی تصویر معلوم ہو رہا تھا۔

وہ اپنے عکس کو دیکھتی دیکھتی لطف و سرور کے ایک اجنبی اجنبی سورگ میں جا سوئی۔ وہ سوتی ہی رہتی مگر اس کے کنج میں سورج کی کرنوں کا گزرنا گزیر ہوگیا۔ کرنوں نے اس روغنی جسم کے گرد ایک سنہری جال بننا شروع کر دیا۔ اس کے خون میں اجنبی حدتوں نے انوکھے گیت جگانے شروع کر دیئے۔ گیت جاگے، خون جاگا، جسم کے مسام جاگے، جسم کی محرابوں میں سوئے ہوئے ذرے جاگے۔ ذروں نے رقص کرنا شروع کیا، جذبات ساکت کھڑے رقص میں گم ہونے لگے۔ تخئیل نے رقص کا ساتھ دینے کے لیے جانے پہچانے راگ نئے الاپ میں گانا شروع کر دیئے۔ ذہن نے وجد میں آ کر ایسا نعرہ لگایا کہ رقص تھم گیا، راگ سازوں میں دب گیا۔

اشنان کرتی ہوئی دیوی گیان سے جاگی۔ اس نے گرد و پیش پر نظر کی! سورج پیلے پھولوں سے لٹکا اس کو گھور رہا تھا۔ اس کے جسم کے بال کرنوں کے مقابلے کیلئے تیار کھڑے تھے۔ ان کو سلانے کو ہوا اپنا جادو جگا رہی تھی۔

دیوی نے جل میں اپنا سریر چھپالیا۔ مگر سورج کو شرم نہ آئی، وہ اپنے مقام سے نہ ہٹا۔ دیوی تنگ آ کے جل سے نکل سورج کے سامنے تن گئی۔ کرنیں آتی تھیں اس کے سریر سے ٹکرا ٹکرا کر موت کی نیند سو جاتی تھیں۔ اس کے سریر سے لپٹی ہوئی پانی کی بوندیں ہوا کے کاندھوں پر سوار ہو اس کے سریر سے ودا ہونے لگیں۔ دیوی کا سریر دہکنے لگا۔ اس سے بھبوکے اٹھ اٹھ سورج کی طرف لپکنے لگے۔ سورج سریر کی جوالا کی تاب نہ لا سکا اور سامنے سے ہٹ گیا۔

فردوس نے ریشمی رومال سے جسم کو صاف کیا اور مڑ کر ہری ہری جھاڑیوں کی اوٹ سے متین صاحب کی طرف دیکھا۔ وہ پانی کنارے بیٹھے منہ پر چھینٹے مار رہے تھے۔ وہ مڑی اور اس نے مڑ کر پانی کو دیکھا۔ اس پانی میں ان کے جسم ہاتھوں سے ٹپکا ہوا پانی کب اس تک پہنچا ہوگا؟ پہنچا بھی ہوگا؟ وہ کب سے منہ ہاتھ دھونے میں مصروف تھے؟ وہ اس سے آگے نہ سوچ سکی اور شرما گئی۔ وہ جلدی جلدی کپڑے پہن، تیار ہو، متین صاحب کی طرف چل دی۔ اس کے قدموں کی چاپ سن کر متین صاحب نے پانی سے ہاتھ کھینچ لئے اور اٹھ کر کھڑے ہو گئے۔ جیب سے رومال نکال انہوں نے ہاتھ صاف کئے، منہ پونچھا۔

''میں نے سوچا نہ جانے اشنان کب تک ہوتا رہے۔ لاؤ ہم بھی بہتی گنگا میں ہاتھ دھولیں۔......آؤ اب چلیں۔''

''ادھر سے چلئے۔ جس راہ سے آئے ہیں اس راہ سے جانا ضروری ہے کیا؟''

''نہیں تو۔ مگر سورج تیزی سے ڈھل رہا ہے۔ خنکی بڑھ رہی ہے۔''

''درختوں کے سایوں سے نکل لئے تو خنکی نہ رہے گی۔ باقی سورج اگر ڈھل گیا تو چاند چڑھ آئے گا۔ چاند نکل آنے کے بعد تو طوفانی دریا بھی پار ہو جاتے ہیں''۔

''یہیں ٹھہرو۔ میں گھوڑے لے آؤں''

وہ بہتے پانی کے ساتھ ساتھ جھاڑیوں سے بچتے دکھن کی طرف روانہ ہو گئے۔ بہتا پانی درختوں میں، جھاڑیوں میں چھپتا، اوجھل ہوتا، ان کے ساتھ سایوں میں چلتا رہا۔ گھوڑوں کی آہستہ خرامی سے ان کے خیالات بھی آہستہ خرامی سے نئے راستوں پر نکل پڑے۔ سایے اجالوں میں بدلنے لگے اور پھر ایک ساتھ روشنی نے، گرمی نے، ان کو گھیر لیا اور ان کو ایک کھلے سبزہ زار میں لا کھڑا کیا۔ بہتا پانی اب کھلے بندوں بہنے پر مجبور تھا اور کچھ دور جا کر ندی کے روپ میں بہہ رہا تھا۔ وہ ندی کے، سبزہ زار کے ساتھ چلتے رہے۔ سبزہ زار ڈھلوان ہو گیا۔ ندی کے پانی کی رفتار تیز ہو گئی اور اس میں شور کی کیفیت پیدا ہو چلی تھی۔

ڈھلوان سے اترتے ہی ایک اور سبزہ زار نے ان کے قدم لئے۔ ندی اب اس سبزہ زار کے بیچوں بیچ بہتی تھی۔ اس کے دونوں طرف درخت تھے، پستہ قد مگر خوبصورت۔ کچھ

دور جا کر ندی سے ایک مرمریں چبوترہ ابھر آیا۔اس مرمریں چبوترے پر پستہ قد درختوں کی شاخیں ایک دوسرے سے ملی سایہ کر رہی تھیں۔ان درختوں میں سفید سفید پھول لگے تھے۔ قریب گئے تو مرمریں چبوترے میں گھری ایک کچی قبر تھی اور اس قبر کے سرہانے گلاب کا ایک پودا تھا۔اس کی شاخوں پر سرخ سرخ کلیاں جھوم رہی تھیں۔اس کی ایک ڈالی پر ایک پھول کھل چکا تھا۔

''اس حسین ماحول میں یہ کس کی قبر ہے؟ قبر پر کتبہ بھی تو کوئی نہیں......جی چاہتا ہے کہ یہ گلاب توڑ لوں......کیا اس خواہش کو پورا کر لینا چاہیے؟''

اس نے ابھی بات ختم نہ کی تھی کہ اوپر درخت سے ایک سفید پھول گرا اور اس کے بالوں،گردن کو چھوتا ہوا اس کے کھلے گریباں میں جا گرا۔

''تمہیں تمہارے سوال کا جواب مل گیا ہے۔''

فردوس نے ہاتھ بڑھا کر گلاب کا پھول توڑ لیا اور سونگھے بغیر متین صاحب کے کالر میں لگا دیا۔ پھول کی خوشبو ان کے نتھنوں تک پہنچ رہی تھی۔ وہی خوشبو تھی جو وہ لگانے کے شائق تھے۔ وہ خوشبو میں کھو گئے۔''مجھے معلوم نہ تھا کہ تم سے اس پھول کے روپ میں ملاقات ہوگی اور ایسے ماحول میں۔اور فردوس کے ساتھ، جب اس کو ساتھ ہوتے ہوئے ہماری ملاقات کا پتہ نہ چلے۔''

''کیا دکھ ہونگے جو مرنے کے بعد بھی اس ندی میں دفن ہونے کی خواہش کی مرنے والے نے''

''ہاں! بہت دکھ تھے مرنے والے کو''

''آپ کو کیسے پتہ ہے؟''

''ہوں! کیا کہا تم نے؟''

''آپ کو کیسے پتہ ہے کہ مرنے والے کو واقعی بہت ہی دکھ تھے؟''

''میں نے کچھ کہا اس کے بارے میں؟

''ہاں''

''نہ جانے کیوں میں نے یہ بات کہہ دی یونہی بے دھیانی میں بات منہ سے نکل گئی۔''

''جانے کو جی نہیں چاہتا یہاں سے...... کچھ ارپن کرنے کو بھی جی چاہتا ہے...... اس وقت میرے پاس کیا ہے جو ارپن کروں؟''

فردوس نے سر سے رومال کھولا اور قبر پر ڈال دیا اور کوٹ کے کالر سے تتلی اتار کر رومال پر ڈال دی۔

متین صاحب نے زین سے تھرموس اتارا، اس کا ڈھکن اتارا اس میں ندی سے پانی لیا، کالر سے پھول کو اتار کر ڈھکنے میں ڈالا اور پھر اس کو نکال پانی کو قبر پر ڈال دیا۔ اور پھول فردوس کے بالوں میں لگا دیا۔

''اس پھول پر میرا جتنا حق ہو سکتا تھا وہ مجھ تک پہنچ چکا اب اس پر تمہارا ہی حق ہے...... اس کو میری طرف سے اپنی سالگرہ کا تحفہ سمجھو۔''

''آپ بھی جذباتی ہو سکتے ہیں؟''

''تم جانتیں کہ اس کی خوشبو میں کتنے عالم بسے ہوئے ہیں تو تم مجھ پر جذباتیت کا الزام نہ لگا تیں''

''میری بات کو بھول جائیے...... اب چلیں۔''

ندی کے ساتھ ساتھ خاموش چلتے چلتے وہ درختوں کے سائے سے، سبزے سے، دور نکل آئے۔ ندی شور کرتی چٹانوں کے درمیاں ایک کھڈ میں گر گئی، کھو گئی۔ ندی کھو گئی اور ان کے شعور کو دھچکا لگا، اوہ! وہ چونکے۔ گرد و پیش پر نگاہ کی تو ہر طرف سنگ زار کے سوا کچھ نہ تھا۔ صرف ندی کے گرنے کا شور تھا، سورج کی گرمی تھی اور دور افق پر بادل کے ننھے ننھے آوارہ گالے۔ متین نے فردوس کی طرف دیکھا، ان کی آنکھوں میں سوال تھا کہ اب؟ فردوس کی آنکھوں نے جواب دیا''بڑھے چلو، جو ہو سو ہو'' متین کی آنکھوں میں مبہم سی مسکراہٹ

چھلاوے کی طرح پیدا ہوئی اور گم ہوگئی۔ وہ بڑھتے چلے گئے۔ ان کے گھوڑوں کے سموں سے سنگ زار تڑخنے لگا۔ اس آواز نے ان کو بیدار رکھنے کا بندوبست کر دیا۔ دونوں ایک دوسرے کی طرف دیکھے بغیر افق پر نظریں جمائے، گرمی میں جھلستے سورج کی پتھروں سے منعکس ہوتی ہوئی روشنی سے جھنجھلاتے افق کی طرف بڑھتے گئے۔ راستہ ہر قدم کے ساتھ ساتھ لمبا ہوتا چلا گیا مگر دونوں ایک دوسرے کو رستہ بدلنے کے لئے کہنے کی خواہش کو دباتے ہوئے بڑھتے ہی گئے۔ ندی کے شور نے بھی ان کا ساتھ چھوڑ دیا: اب وہ بالکل تنہا تھے۔ آسماں دور تھا، بہت دور؛ زمین سخت تھی، بہت سخت؛ سورج سوا نیزے پر اتر آیا تھا اور دھنش محل دور تھا، نہ جانے کتنی دور۔ روشنی اور سنگ زار کے دیس میں ان کا کوئی ہادی نہ تھا، کوئی شافع نہ تھا۔ ان کے گھوڑے اس گرمی سے بلبلانے لگے تھے اور قدم قدم پر مڑ کے اپنے سواروں کو شکایت آمیز نگاہوں سے دیکھتے تھے۔ گھوڑوں کی نظروں سے گھبرا کر دونوں نے زین میں مڑ کر پیچھے کی طرف دیکھا۔ روشنی اور چمکتے ہوئے پتھروں، چٹانوں اور دہکتے ہوئے آسمان کے سوا کچھ نظر نہ آیا۔ ہر طرف ایک سا سماں تھا۔ گرمی سے ان کے حلق خشک ہونے لگے۔ گھوڑوں کے جسم پسینے سے شرابور ہوگئے۔ متین صاحب نے جلدی سے تھرموس کھولا۔ اس میں پانی نہ تھا۔ جلدی سے دوسرا کھولا۔ گھبراہٹ میں ڈھکنا کھلتے ہی ان کے ہاتھ سے پھسلا، پتھریلے فرش پر گرا۔ اک صدا فضا میں گونجی۔ اس کی ہیبت سے ان کے ہاتھوں سے تھرموس چھوٹ کر پتھروں پر جا رہا۔ اس کا کارک اس کے منہ سے نکل کر لڑھک گیا، پانی بہنے لگا۔ متین صاحب تصویر بنے بے بسی سے بہتے پانی کو دیکھتے رہے۔ سنگ زار کی چمک میں ایک اور چمک کا اضافہ ہوگیا۔ ان کی نظریں چندھیا گئیں۔ اس بے بسی سے ان کے آنسو نکل آئے۔ انہوں نے دھندلائی ہوئی نظروں سے فردوس کو دیکھا۔ فردوس ان کے چہرے کی بے بسی اور اس پر اظہارِ معذرت کے واضح نشانات دیکھ کر تڑپ گئی اور اس کے لبوں سے ایک آہ پھوٹ نکلی۔ اس ہو کے عالم میں اس آہ نے زلزلے کا کام کیا۔ متین صاحب کی نظروں کے سامنے سنگ زار کا فرش، روشنی کا سمندر لرزنے لگے۔ انہوں نے گھبرا کر آسمان کی طرف دیکھا تو آسمان بھی کانپ رہا تھا۔ روشنی کی بڑی بڑی لہریں ہر طرف سے ان کی طرف لپک رہی تھیں۔ سنگ زار کے افقی کونے بلندیوں اور پستیوں کے درمیان تیزی سے ڈول رہے تھے۔

وہ اس طوفان سے ڈر کر کانپنے لگے۔ ان کے گھٹنے گھوڑے کے پیٹ کی دیواروں سے ٹکرانے لگے، ان کے ہاتھوں کی انگلیاں گھوڑے کی باگوں پر کس گئیں، ان کا سر چکرانے لگا اور وہ پیچھے کی طرف گرنے لگے۔ ان کی کمر پیچھے کی طرف جھکنے سے باگوں میں جنبش ہوئی۔ گھوڑے کا بدن تھرتھرایا اور وہ سرپٹ بھاگا۔ متین صاحب کو ایک سخت جھٹکا لگا ان کی بے بسی کو جھٹکا لگا، ان کے شعور کو جھٹکا لگا، ان کی مردانگی کو جھٹکا لگا اور وہ زین پر چوکس ہو کر بیٹھ گئے۔ ان کے جی میں کوندا کہ وہ گھوڑے کو روک لیں مگر فوراً ہی کوندا کہ روک لینے سے منزل قریب تو نہ آ سکے گی۔ لہٰذا انہوں نے اپنی قوتِ ارادی کو، اپنے مقدر کو، اپنی حیات وموت کو گھوڑے کی رفتار کے سپرد کر دیا۔ اس فیصلے سے ان کے دل و دماغ اطمینان سے لبریز ہو گئے۔ انہوں نے کان لگا کر سننا شروع کیا۔ ان کے گھوڑے کی ٹاپوں کے ساتھ، اس سے ہم آہنگ، ایک اور گھوڑے کی ٹاپ صاف سنائی دے رہی تھی۔ انہوں نے مڑ کر دیکھا تو فردوس کا روشنی کو چیرتا ہوا بُرّاق سا گھوڑا، فردوس کا زین میں اٹھتا بیٹھتا، فضا کی روشنی میں ارتعاش پیدا کرتا ہوا جسم، اس کا دہکتا ہوا چہرہ، اس کے فضا میں اڑتے ہوئے، چمکتے ہوئے، سیاہ بال ایک دم دار ستارے کی طرح آسماں کی بلندیوں کی طرف پرواز کرتے ہوئے دکھائی دے رہے تھے۔ انہوں نے محسوس کیا اس ستارے کی روشنی کے سامنے فضا کی روشنی، سورج کی روشنی ماند پڑ جائے گی۔ ہر طرف اندھیرا ہی اندھیرا چھا جائے گا۔ زمین کے لوگ اس ستارے کی روشنی سے ڈر کر بنوں میں، غاروں میں جا چھپیں گے۔ بلندیوں اور پستیوں کے درمیاں سوائے اس ستارے کی روشنی کے کچھ نہ رہے گا اور جب یہ ستارہ زمین کے بہت ہی قریب پہنچے گا تو زمین اپنے محور سے ہل جائے گی، زمین اندھیری ہو جائے گی اور اس کے بعد...... وہ اپنے خیال کو منزل پر نہ پہنچا سکے تھے کہ دنیا ان کی نظروں میں واقعی اندھیری ہو گئی۔ وہ کافی دیر اس اندھیرے میں ہاتھ پاؤں مارتے رہے۔ ذہن کے اندھیاروں کے آفاق سے روشنی پھوٹنے لگی، فضا پر تیزی سے چھانے لگی تو انہوں نے ادھر ادھر دیکھا۔ ان کے دائیں بائیں اندھیرا تھا، ان کے آگے پیچھے اجالا تھا اور ان کے اوپر اندھیرا تھا۔ وہ کچھ نہ سمجھ سکے۔ انہوں نے آنکھیں بند کیں اور دائیں ہاتھ کے انگوٹھے اور اس کے ساتھ والی انگلی سے پپوٹوں کو، ڈھیلوں کو سہلایا اور پھر آہستہ آہستہ آنکھیں کھولیں۔ گرد و پیش کی چیزیں ان

پر واضح ہونے لگیں وہ ایک کھوہ میں تھے۔ کھوہ وسیع وعریض تھی۔ وہ روشنی کا بہتا ہوا سنگ زار کھوہ کے دہانے سے باہر تھا۔ ان کے سامنے دور ایک اور دہانہ تھا۔ اس دہانے میں سے نیلا آسماں اور......سبز سبز گھاس......اور درخت کا تنا صاف دکھائی دے رہے تھے۔ ان کے کانوں میں ایک لخت پانی کے ٹپکنے کی آواز آئی اور آتی ہی چلی گئی۔ اب وہ بالکل بیدار ہو چکے تھے۔

ان کو فردوس کا خیال آیا! وہ کہاں تھی؟ انہوں نے چاروں طرف بغور دیکھا۔ ان کے دائیں کچھ فاصلے فردوس کا گھوڑا ان کی طرف پشت کئے، گردن جھکائے کھڑا تھا۔ گھوڑے نے گردن اٹھا کر، مڑ کر ان کی طرف دیکھا۔ اس کے منہ سے پانی کے قطرے ٹپک رہے تھے۔ پانی کے ٹپکتے ہوئے قطروں سے ان کو خیال آیا کے کھوہ کے اس کونے میں پانی بہہ رہا ہوگا۔ ان کے دل میں پانی پینے کی خواہش پیدا ہوئی۔ ان کا جی چاہا کہ وہ گھوڑے سے کود یں اور پانی سے پیاس بجھائیں مگر فردوس کے خیال نے ان کی خواہش کو پس منظر میں ڈال دیا۔ انہوں نے غور سے پانی والے کونے کی طرف دیکھا مگر فردوس نظر نہ پڑی۔ ''کہیں باہر سنگ زار پر گری تڑپ رہی ہوگی'' اس خیال کے آتے ہی ان کے حواس بلبلاتی ہوئی آہ میں ڈھل گئے۔ انہوں نے گھوڑے کی باگیں موڑیں مگر گھوڑا مڑا نہیں۔ انہوں نے جھنجھلا کر گھوڑے کے پیٹ میں ایڑیاں گاڑ دیں مگر گھوڑا ہلا نہیں، صرف پھنکارا۔ وہ گھوڑے سے کودے اور پاگلوں کی طرح سنگ زار والے دہانے کی طرف چڑھنے لگے۔

''کہاں چلے!...... میں یہاں ہوں...... اپنے گھوڑے کے دائیں۔ ذرا فاصلے پر دیوار کی اوٹ میں پانی میں منہ ڈالے پڑی تھی۔ گھوڑے کی پھنکارنے، آپ کے کودنے کی آواز نے جگا دیا۔ آیئے! میرے پاس آیئے، پانی کے پاس آیئے۔ دوزخ کی طرف نہ جایئے!''

متین صاحب دہانے کے سرے پر پہنچ کر ٹھٹکے۔ روشنی سے ان کی نظریں چندھیانے لگیں، گرم ہوا کے ایک جھونکے نے ان کے سارے جسم میں آگ بھر دی۔ وہ گھبرا کر پلٹے اور اپنے گھوڑے کے پاس جا کر رکے۔ وہ منہ موڑے ان کو حیرانی سے تک رہا تھا۔ انہوں

نے اس کی گردن پر اس کے منہ پر پیار سے ہاتھ پھیرا اور سوچنے لگے۔

''رک کیوں گئے؟ میں ہوں۔ میری آواز دھوکا نہیں۔ پانی ٹپکنے کی آواز قریب نہیں۔ گھوڑے کو تو پانی پلائیے۔''

متین صاحب مسکرائے، گھوڑے کی طرف دیکھا، انہوں نے محسوس کیا کہ گھوڑے کی آنکھوں میں بھی مسکراہٹ ہے۔ شاید ان کے پاگل پن؟ یا بھولپن؟ پر مسکرا رہا تھا۔ انہوں نے اس کی گردن کو، اس کے نتھنوں کو تھپکا اور اس کو لگام سے پکڑ کر فردوس کے گھوڑے کی طرف لے گئے۔ دیوار کے ساتھ ایک عریض چبوترا تھا اور اس چبوترے میں ایک حوض تھا۔ گھوڑے نے پانی کو دیکھتے ہی پانی میں منہ ڈال دیا کچھ پانی پیا مگر فوراً ہی منہ نکال کر ان کی طرف دیکھا انہوں نے اس کی گردن پر ہاتھ پھیرا اور بائیں کونے کی طرف چل دیئے۔

چبوترے کے ختم ہوتے ہی ایک دیوار تھی جس سے کھوہ دو حصوں میں بٹ گئی تھی۔ اس دیوار میں ایک بڑا سا دروازہ تھا جس سے کھوہ کا دوسرا دہانہ دور نظر آتا تھا جس کے پار سبزہ تھا، درخت تھے۔ دروازے کے دائیں ایک بڑا سا تالاب تھا جس میں دیواروں کے سنگم سے، ایک چھجے پر سے ہوتا ہوا، پانی ایک حوض میں ٹپک رہا تھا اور حوض سے ایک ننھے سے سوراخ سے ہو کر پانی تلاب میں جا رہا تھا۔ وہ حیران تھے کہ اس ٹپکتے ہوئے پانی سے یہ اتنا بڑا تالاب کیسے بھر سکتا ہے۔

''کیا سوچ رہے ہیں؟''

''سوچتا ہوں کہ ان ٹپکتے ہوئے ذروں سے اتنا بڑا تالاب بلکہ ننھی منی جھیل، کیسے بھری گئی۔''

''کچھ دیر پہلے اُس دہانے سے سورج کی کرنیں اس جھیل کے درمیان تک پہنچ رہی تھیں اور اس روشنی میں میں نے دیکھا کہ جھیل کے درمیان ایک چشمہ ابل رہا ہے۔ جھیل کا پانی بالکل شفاف ہے۔ اس کی تہ میں پڑے پتھر صاف دکھائی دیتے تھے...... آپ آخر جھیل کنارے کب تک پیاسے کھڑے رہے گے...... اس حوض سے پیاس بجھایئے اور اس جھیل میں منہ ہاتھ دھو ڈالئے...... پھر ستالیں تو آگے بڑھیں؟''

متین صاحب نے حوض سے تھرموس کے ڈھکنے میں پانی لے پیا، پھر پیا، بار بار پیا مگر ان کی پیاس بجھنے میں نہ آتی تھی۔ ''یوں پیاس نہ بجھے گی۔ یہاں آیئے جھیل کنارے پیٹ کے بل لیٹ جائیں اور سر اور چہرے کو پانی میں ڈال دیجئے۔ دماغ ٹھنڈا ہوگا تو پیاس بھی بجھ جائے گی''

متین صاحب فردوس کی ہدایات پر عمل کرتے ہوئے لیٹ گئے ان کا منہ پانی میں تھا اور فردوس ان کی طرف چپ چاپ تکے جا رہی تھی۔ اس کی آنکھوں میں ویسا ہی پیار تھا جیسا متین صاحب کی آنکھوں میں اپنے گھوڑے کو پانی پیتے دیکھ کر آ گیا تھا۔ اس کا بھی جی چاہا کہ وہ ان کی گردن پر پیار سے ہاتھ پھیرے، ان کی کمر کو تھپکے، وہ پانی میں پھنکاریں اور ان کی پھنکار سے اٹھتی ہوئی لہروں کے سہارے وہ جھیل کی سطح پر جھومتی رہے۔

وہ اپنے اس اجنبی خیال پر مسکرائی کہ وہ ان کی گردن پر ہاتھ پھیر سکتی تھی، ان کی کمر کو تھپک سکتی تھی مگر وہ پھنکارتے تو کبھی بھی نہ۔ اس کے دل نے کہا کہ فیصلہ سے پہلے آزمائش شرط ہے۔ اس نے ہمت کر کے ان کی گردن پر پیار سے ہاتھ پھیرا۔ ان کی کمر کو تھپکا اور وہ پھنکارے، ننھی ننھی لہریں اٹھیں اور دوجے کنارے کی طرف روانہ ہو گئیں۔ متین صاحب نے پہلو بدلا اور فردوس کی طرف منہ کر کے اس کو مسکراتی ہوئی طنز سے دیکھنے لگے۔

''کیا سوجھی آپ کو کہ پھنکارے؟ اگرچہ میں یہی چاہتی تھی کہ آپ پھنکاریں۔''

''کیوں؟''

''کہ آپ کی پھنکار سے اٹھتی ہوئی لہروں پر تیرتی رہوں، جھومتی رہوں''

''پانی میں منہ ڈالے مجھے خیال آیا کہ اگر فردوس میری گردن پر ہاتھ پھیرے، کمر کو تھپکیاں دے تو میں پھنکار دوں یا نہ پھنکاروں؟

لہریں تو الگ اٹھ کر پانی میں واپس لوٹ گئیں اور میں اب پھنکارنے سے رہا۔ تم اب کیسے پانی پر ڈولو گی؟''

''اگر آپ بھی نہائیں تو میں بھی دوجے کنارے اندھیرے کی اوٹ میں نہا لوں، تیر

لوں، لہروں پر جھولا جھول لوں۔''

''تم اسی کنارے پر ہی نہالو میں اتنی دیر میں اس سامنے کے دہانے کے پار جھانک آتا ہوں۔''

''آپ نہانے سے گھبراتے کیوں ہیں۔ تیرنا نہیں آتا یا آپ افیون کھاتے ہیں؟ پنڈے سے فالتو گرمی نکل جائے تو سفر خوشگوار ہو جائے گا۔''

''نہیں ایسی تو کوئی بات نہیں۔ اگر تم اسی سے خوش ہوتی ہو تو نہالیتا ہوں۔''

فردوس ان کے بالمقابل اندھیرے میں چلی گئی۔ کچھ دیر کے بعد پانی میں کود پڑی اور پھر کانپتی ہوئی آواز میں بولی:

اس کونے میں پانی بہت ٹھنڈا ہے مگر مزا آ گیا ہے......آپ کھڑے کیا کر رہے ہیں۔ اگر آپ یونہی سوچتے رہے تو گھر پہنچ لئے۔''

''تم اندھیرے میں چلی جاؤ اور دوسری طرف منہ کر کے کھڑی رہو جب تک میں نہ کہوں''

فردوس مسکرائی، ہنستی ہنستی گنگنائی، اندھیرے کی اور تیرتی ہوئی چلی گئی اور پھر کھلکھلا کر ہنسنے لگی۔ متین صاحب کپڑے اتار پانی میں اتر گئے اور تیرنے لگے۔ فردوس بھی اندھیرے سے روشنی میں لوٹ آئی۔ دونوں اپنے درمیان کافی فاصلہ رکھے دیر تک تیرتے رہے۔ جب کرنیں پانی سے کنارے پر چلی گئیں تو دونوں اپنے اپنے کناروں کی طرف لوٹ گئے۔ فردوس کو کپڑے پہنتے ہوئے شاید سردی لگ رہی تھی کہ وہ تھرتھراتی ہوئی آواز میں گنگنا رہی تھی۔

متین صاحب کپڑے پہن کر دونوں گھوڑوں کو لگاموں سے پکڑے جھیل کنارے لے آئے۔ اتنے میں فردوس بھی اپنے کنارے سے لوٹ آئی۔ دونوں روشنی کی طرف بڑھنے لگے۔ کھوہ کے باہر ایک سبزہ زار تھا، درخت تھے، درختوں میں پرندے چہچہاتے تھے، نیچے وادی سے کہیں بانسری کی پکار ان کی طرف بڑھ رہی تھی۔

کوئی گاؤں آس پاس ہے کہ کوئی بانسری بجا رہا ہے۔

سبزہ زار میں ایک رستے کے واضح نشان تھے۔ وہ اسی راستے پر چل نکلے۔ راستہ درختوں کے بیچوں بیچ، اونچی اونچی چٹانوں پر اُگے ہوئے درختوں کے بیچوں بیچ چکر کھاتا ہوا نیچے اترتا گیا۔ کبھی کبھی کوئی چھوٹا سا پتھر گھوڑوں کے سموں سے ٹکرا کر لڑھک پڑتا اور فغاں کرتا ہوا نیچے دور کہیں جا کر گم ہو جاتا۔

راستہ ایک ننھے سے پہاڑی گاؤں کے سرے پر جا کر رک گیا۔ گاؤں کے باہر ایک چھوٹے سے کھیت کی پتھریلی منڈیر پر ایک نوجوان بانسری بجا رہا تھا اور اس کے پاس بھیڑوں کا ایک غول اس کی طرف منہ اٹھائے اس کو غور سے دیکھ رہا تھا۔

ان کے گھوڑوں کے سموں کی آواز سے، لڑھکتے ہوئے پتھروں کے شور سے بھیڑیں پریشان ہو گئیں۔ نوجوان نے ہونٹوں سے بانسری ہٹالی اور مڑ کر ان کی طرف دیکھا اور دیکھتے ہی نظریں جھکائے اٹھ کھڑا ہوا۔

''اس گاؤں کا مالک کون ہے؟ مکھیا کون ہے؟''

''اس گاؤں میں سبھی کاشتکار ہیں۔ یہ گاؤں، یہ پہاڑ، یہ بن، وہ نیچے نظر آتی ہوئی وادی سب کے سب نواب آغا کی ملکیت ہیں۔ اس گاؤں کا مکھیا آج داؤ دنگر گیا ہے کل واپس لوٹے گا۔ داؤ دنگر میں کل مالک کی بیٹی کا جنم دن منایا جا رہا ہے۔ سب مکھیا نذریں پیش کریں گے...... سنتے ہیں دھنش محل کی شہزادی بہت ہی سندر ہے۔ اک عمر بدیس رہی۔ اب دیس کو لوٹ آئی ہے اور اس محل میں اکیلی رہتی ہے جہاں کبھی کوئی سکھی نہ رہ سکا۔ ان کی ماں بھی، بڑے بوڑھے بتاتے ہیں سکھی نہ رہ سکی اور بیچ جوانی کے دنیا سے بدا ہو گئی...... دھنش محل کی شہزادی کو دیکھنے کو بہت جی چاہتا ہے مگر یہ بھاگ صرف بڑے بوڑھوں کے۔ جب ہم دیکھ سکیں گے تو شہزادی بھی ہمری تو ر بوڑھی ہو چکی ہونگی''

فردوس نے گلے سے مفلر اتار کر اس نوجوان کی طرف پھینکا اور بولی ''یہ کل داؤ دنگر چھوٹے آغا کے پاس لے آنا وہ تمہیں دھنش محل ساتھ لے آئیں گے۔ وہاں شہزادی کے درشن کر سکو گے۔''

مفلر جب اس کے کندھوں پر گرا تو اس نے نظریں اٹھا کر دیکھا اور کندھے سے مفلر

اتار، ہاتھوں میں لے اس کی طرف کچھ دور جا کر رک گیا۔

''مالکن دیوی نے یہیں درشن دے دیئے تو مندر کیوں جاؤں۔''

وہ نظریں جھکائے، مفلر کو دونوں ہاتھوں سے اس کی طرف بڑھائے کھڑا رہا، ساکت، چپ چاپ، سوچ میں ڈوبے ہوئے۔ ''یہ اب تمہارا ہے۔ اس کے بدلے تم آخری دم تک دوپہروں کو یہیں بیٹھ کر یونہی بانسری بجاتے رہا کرو گے''

فردوس نے گھوڑے کو ایڑ لگائی اور گاؤں میں داخل ہوگئی۔ کونے پر ایک بوڑھے سے متین صاحب نے داؤدنگر کا راستہ پوچھا اور بتائے ہوئے راستے پر سرپٹ گھوڑے دوڑاتے ہوئے داؤدنگر کی طرف لپکے۔ سورج کافی ڈھل چکا تھا اور دھنش محل کی وادی اب ان کے بالکل سامنے تھی۔ دور مغرب کی طرف ندیوں کا پانی چمک رہا تھا اور دور ان کے سامنے دھنش محل جگمگا رہا تھا۔ وہ میدان کو پار کرتے ہوئے دھنش محل کی طرف بڑھے۔ گھوڑوں نے جانے پہچانے منظر کو دیکھ کر اپنی رفتار اور تیز کر دی۔ چند ہی لمحوں میں ان کے سموں کی آواز دھنش محل کی بلندیوں تک پہنچنے لگی۔ لائبریری کے سامنے والے صحن میں پہنچ کر دونوں گھوڑوں سے کودے اور انہوں نے باگیں اٹھا کر زین میں پھنسائیں۔ اتنے میں سائیس آگیا اور گھوڑوں کو لے گیا۔

مغربی کمرے میں پہنچے تو تقی اور عالمہ اور چھوٹے آغا چائے پی رہے تھے۔ ان دونوں کو دیکھتے سب ایک ساتھ بولے۔ ''عین وقت پر پہنچے آپ لوگ۔ بابا کہہ رہا تھا کہ بی بی چائے کے وقت پہنچ جاتی ہے۔ کبھی دیر نہیں ہوئی۔ اسے یقین تھا کہ تم وقت پر پہنچ جاؤ گی۔ لہذا وہ چائے لے آیا مگر تم نہ تھیں۔ وہ پریشان ہو کر چلا گیا ہے۔''

''لو وہ آگیا بابا'' عالمہ بولی۔

''میں تو جانتا تھا کہ تم چائے کے وقت پہنچ جاؤ گی۔''

''میں نے کھوجیوں کو بلایا ہے۔ صبح ہی سے کہاں چل دی تھیں۔ متین صاحب کو ساتھ لے گئی تھیں۔ یہ دونوں بہت پریشان تھے۔''

''سامنے کے پہاڑوں میں جو شکارگاہ ہے نا؟ وہاں گئے تھے۔ وہاں ندی کے بیچوں

بیچ ایک قبر ہے۔ کس کی ہے۔ آپ جانتے ہیں۔''

''تمہاری والدہ کی'' چھوٹے آغا نے آہ بھرتے ہوئے کہا

''میری والدہ کی؟'' یہ کہتے ہی اس نے متین صاحب کی طرف دیکھا۔

ان کے پپوٹے ان کی آنکھوں پر جھک آئے تھے اور ان کی آنکھوں میں جھانکنا مشکل تھا۔

دونوں چائے کی میز پر بیٹھ گئے۔ عالمہ نے چائے بنائی۔ سب نظریں جھکائے چپ چاپ چائے پیتے رہے، صرف عالمہ کبھی کبھی کن انکھیوں سے کبھی فردوس کے چہرے کو، کبھی متین صاحب کے چہرے کو دیکھ لیتی تھی۔ چائے ختم ہوئی، برتن اٹھائے گئے۔ سب خاموش، سوچ میں سرگرداں تھے۔

شیشے کی دیوار سرخ ہوئی اور پھر دن رخصت ہوا، شام آئی، ستارے نکلے، کمرے کے لیمپ جلائے گئے۔

''اچھا میں اب چلتا ہوں۔''

''کیوں آغا جی؟''

''نوجوانوں کی محفل میں بوڑھوں کا کیا کام اور پھر دیا جلنے سے پہلے ہی میں گھر پہنچ جایا کرتا ہوں۔ آج خیال ہی نہیں آیا۔''

تیسرا باب

چاند نکل آیا تھا۔ اس کی روشنی نیلے آسمان کی فضا میں گھل رہی تھی اگرچہ اس کے ابھی شیشے کی دیوار کے سامنے آنے میں بہت دیر تھی۔ کمرے کے باہر ٹیرس پر چاندنی کھل رہی تھی اور وہاں بیٹھے بیٹھے دروازے سے چاندنی کا خرام دیکھا جا سکتا تھا۔

سب کی نظریں باہر تاروں بھرے آسمان پر لگی تھی جیسے آسماں ہی نے ان کی قوت گویائی چھین لی تھی۔ خاموشی سب پر بار ہو رہی تھی مگر سب کرسی میں بے تاب ہونے کے

باوجود چپ تھے۔ان کی بے تابی،ان کی خاموشی،اب کمرے کی فضا پر اثر انداز ہونے لگ گئی تھی: فضا سنسنانے لگی تھی۔

دروازے کی چرچراہٹ نے سب کو اپنی طرف متوجہ کرلیا۔ دروازے پر دروازے کے کواڑوں کا سہارا لیے بابا کھڑا تھا۔

''میں آیا تھا یہ پوچھنے کیلئے کہ آغا جی اور بٹیا کھانا کھائیں گے نا،مگر یہاں پہنچتے ہی آپ سب لوگوں کو خاموش دیکھ کر نجانے کیوں میرا دل بیٹھ سا گیا۔پچھلے تین چار دن سے دل کو نجانے کیا ہو گیا ہے۔کیا ہونے والا ہے۔آج چاندنی بھی پھیکی پھیکی نظر......''

بابا فقرہ مکمل نہ کر پایا تھا کہ ٹیرس والے دروازے کے شیشوں سے بہت تیز پیلی پیلی روشنی بڑی تیزی سے کمرے میں داخل ہوئی اور چلی گئی پھر شیشے کی دیوار سے جنوب مغربی دیوار پر نمودار ہوئی، پھر ایک دم دار ستارہ آسمان پر نمودار ہوا اوراس کی روشنی میں سب تارے، کمرے کی روشنی، ماند پڑ گئے، ان کے چہروں پر پیلاہٹ دمکنے لگی۔ کچھ دیر ستارہ ان کے سامنے رہا پھر مغرب کی پستیوں میں گم ہو گیا مگر آسمان پر پیلی روشنی کا عکس دیر تک رہا۔

''یااللہ فضل!'' بابا کی آواز فضا میں جلدی سے جذب ہو گئی۔

''بہت بڑی مصیبت آنے والی ہے ہمارے دیس پر۔کشت وخون ہوگا، بادشاہی بدلے گی شاید......میں جوان تھا تب ایسا ہی ستارہ نکلا تھا۔تمام شہر اس کی روشنی سے جگمگا اٹھا تھا۔ پہلے لام لگی، پھر کال پڑا۔رب ہمیں مصیبت سے بچائے رکھے......مجھے تو بہت ڈر لگنے لگا ہے۔ میں بھی حیران تھا کہ دل کیوں بیٹھا جاتا ہے۔سوچتا تھا کہ بوڑھا ہو گیا ہوں مگر اب معلوم ہوا کہ ایسا نہیں ہے......

آغا جی، بٹیا تم دونوں آج گھر نہ جاؤ، نہ جانے راستہ میں کیا حادثہ پیش آئے۔''

بابا چلا گیا۔ کمرے پر پھر سے خاموشی طاری ہو گئی۔ ہر ایک سوچ کے اجنبی دیسوں میں کھویا ہوا تھا۔

''متین صاحب!'' فردوس بولی

''جی''

''انسان آسماں سے کیوں ڈرتا ہے؟ ہر گھڑی آسماں کو کیوں تکتا ہے؟ ہر آسمانی حادثہ ہم کو کیوں متاثر کرتا ہے؟ آسماں سے ہم ڈرتے بھی ہیں اور اپنی ہر امید آسماں سے وابستہ بھی رکھتے ہیں......

یہ دم دار ستارہ جو ابھی ابھی ڈوبا ہے کیا واقعی انسانوں کی زندگیوں پر اس طرح اثر انداز ہوگا جیسے بابا کہہ رہا تھا۔ مجھے تو ڈر کے ساتھ ساتھ حُسن کا بہت ہی شدید احساس ہوا۔ آخر ایسا کیوں؟''

''یہ حقیقت ہے کہ انسان پر آسمانوں سے ہی رحمت اور عذاب نازل ہوتے ہیں۔ انسان کا، ہر جاندار کا وجود اس زمین پر محض اس لیے ہے کہ سورج ہے، چاند ہے، کائنات کا پورا نظام ہے۔ جب سورج سے کٹ کر چاند اور ہماری زمین بنی تو فضا کے سرد ہونے سے بخارات پانی بنے، زمین پر بارش ہوئی، پھر ایک وقت آیا ہوگا کہ زمین پر پانی ہی پانی ہوگا۔ سورج کی گرمی سے پانی سے بخارات بنے ہوں گے، پانی کی ہیئت بدلی ہوگی، چاند سے سمندر میں جوار بھاٹا اٹھا ہوگا، اس سے جھاگ بنی ہوگی، جھاگ میں سورج کی گرمی سے پانی میں حیات پیدا ہوئی ہوگی۔ حیات ارتقا کی منزلیں طے کرتی زمین پر منتقل ہوئی ہوگی۔ بلندیوں سے جب پانی اترا ہوگا تو زمین میں حیات بیدار ہوئی ہوگی، نباتات پیدا ہوئی ہوگی، درختوں میں پھل اور پودوں میں پھول آئے ہوں گے۔ چاند نہ ہوتا تو کلیاں نہ چٹکتیں، پھلوں میں رس نہ آتا، پھولوں میں خوشبو نہ آتی۔

دھیان میں لاؤ کہ اگر کل سے چاند نہ ہو، سورج نہ ہو تو انسان کی زندگی اجیرن ہو جائے، زمین سے زندگی کے آثار ہمیشہ ہمیشہ کیلئے ختم ہو جائیں۔

انسان کا وجود بھی سورج، پانی اور چاند کا مرہونِ منت ہے۔ ہم اس سورج کا ایک حصہ ہیں۔ ہمارے جسم کے ذرے ذرے میں سورج چھپا ہے، سمندر ہم میں ہر وقت موجود رہتا ہے۔ اس کا ثبوت یہ ہے کہ جب بھی چاند نکل آتا ہے تو انسان کے اندر سمندر کی موجوں سے مماثل حرکت پیدا ہوتی ہے اس کے خیالات میں، اس کے جذبات میں ہیجان

پیدا ہوتا ہے، لہریں اٹھتی ہیں......

سورج زندگی کا منبع ہے تو چاند حسن کا منبع ہے۔ زندگی کا تعلق ہمارے شعور سے ہے اور چاند کا ہماری ہر غیر شعوری صلاحیت سے۔

زندگی اور شعور، عقل اور تخیل، تخیل اور تخلیق، تخلیق اور تہذیب وتمدن ان سب کا سورج اور چاند سے لازمی اور لابدی، ازلی اور ابدی رشتہ ہے۔

اسی لیے جب تک انسان کی نظریں فرشِ ارض پر ہی لگی رہتی ہیں تب تک زندگی اور تخلیق، تہذیب وتمدن کا ارتقا ممکن نہیں ہوتا۔ انسان پستیوں میں رہ کر جب تک بلندیوں سے اپنا رشتہ نہ جوڑے اور اس رشتے کو قائم نہ رکھے وہ انسان نہیں رہ سکتا، خالق نہیں بن سکتا، صرف ایک جسم رہے گا اور اس لحاظ سے حیوان کے درجے پر مگر حیوان کبھی نہیں بن سکتا کیونکہ وہ حیوانوں کی طرح صرف حواس کے عالم میں ہی نہیں رہ سکتا۔ انسان محض انسان ہونے کی وجہ سے اس کا شعور رکھتا ہے اور اس لیے خود اپنی حالت کا بھی شعور رکھے گا۔ لہٰذا حواس کی دنیا میں حیوان کی طرح جینا اس پر عذاب ہو جائے گا۔

اس لیے انسان آج تک مادے کو اپنا حریف سمجھتا رہا ہے، اس کے شکنجے سے اپنا دامن بچاتا رہا ہے، اس کے مقابلے میں ہمیشہ روشنی کی تلاش میں سرگرداں رہا ہے، حالانکہ اسی مادے کے اندر روشنی بند ہے۔ انسان بھی چونکہ ایک سطح پر مادے کی ایک شکل ہے اس لیے اسے بھی اپنے جسم کے اندر روشنی کے منبعوں پر سے مہریں توڑنی ہوں گی، روشنی کو آزاد کرنا ہوگا اور اس روشنی کی مدد سے آسمانی روشنیوں کو مسخر کرنا ہوگا۔

یہی وجہ ہے کہ ہر آسمانی حادثہ انسان کو اتنا متاثر کرتا ہے۔ ہر آسمانی حادثہ انسان کو یاد دلاتا ہے کہ اس کی ابتدا کہاں سے ہوئی تھی، اس کی انتہا کیا ہے اور وہ ابھی تک زمین کے اندھیاروں میں سرگرداں ہے۔

آج جب انسان زمین اور آسمان کے باہمی رشتوں کی تفصیل سے آشنا ہو رہا ہے تو ممکن ہو سکے گا کہ زندگی اور حسن میں جو بُعد اور تضاد دکھائی دیتا ہے وہ نہ رہے۔

اور سب سے بڑی بات تو یہ کہ ہر واقعہ، ہر حادثہ، جو زمین پر یا آسمان پر ہوتا ہے وہ کسی

نہ کسی طرح انسانی زندگی کی تمثیل نظر آتا ہے، اس زندگی کے سفر اور اس کی حرکی منزلوں کا اسم بن جاتا ہے۔ اس لیے ہر واقعہ اور حادثہ جو وجود میں آتا ہے وہ اپنے اندر معنی کے کئی عالم لئے ہوتا ہے اور انسان کو کئی سطحوں پر اپنی طرف متوجہ کرتا ہے۔ ان اسموں کی ماہیت کو سمجھ کر ہی وہ اپنے اندر کی سربلند روشنیوں کو آزاد کر سکتا ہے۔

اس دم دار ستارے کی روشنی کو، اس کے سفر کو نہ صرف ہمارے حواس نے محسوس کیا ہے بلکہ جوں جوں وقت گزرتا چلا جائے گا اس کی روشنی، اس کا سفر ہمارے اندر چھپے ہوئے عالمین میں جنم لیتے جائیں گے اور ہر عالم میں اس روشنی اور سفر کے اندر چھپے ہوئے معنی کے عالم ہم پر وا ہوتے چلے جائیں گے۔ بالکل اسی طرح انسانوں میں ایسے انسان ہوتے ہیں جو انسان کے معاشرے میں، اس کے شعور میں یوں وجود میں آتے ہیں اور عدم کی سرحدوں میں گم ہو جاتے ہیں اور کچھ ایسے بھی ہوتے ہیں جو آسمان کے چھوٹے بڑے روشنی کے مظاہر کی طرح کبھی نظر آتے ہیں اور کبھی نظروں سے اوجھل ہو جاتے ہیں اور ان کے وجود کا احساس اس ستارے کی طرح انسانی شعور سے، اس کی تہذیب و تمدن سے ہمیشہ کیلئے گم نہیں ہو جاتا ہے۔

ایسے لوگ انسان کے اسمائی عالمین کے سورج، چاند، ستارے کہلاتے ہیں اور ان کے بغیر انسان کے ان عالمین میں ہمیشہ اندھیرا رہے۔ اور اگر ایسا ہو تو انسان کے لیے حسن کا وجود ہی نہ رہے اور انسان پر ارتقا کی بلندیاں بند ہو جائیں اور انسان مادے میں اسی طرح قید رہے جیسے آج تک مادے میں طاقت اور روشنی قید رہی۔''

''لیکن اکثر دیکھا گیا ہے کہ حسن کا احساس انسان پر بلندیوں کی راہ کھولنے کے بجائے موت کی راہیں کھول دیتا ہے، جذبات کی موت، عقل کی موت اور انسان ایک بھنور میں پھنس کر رہ جاتا ہے شاید ہی کبھی ایسا ہوا ہو کہ وہ اس بھنور سے نکل آئے۔ ایسا کیوں؟''

فردوس کا بولتے ہوئے چہرہ سرخ ہوتا گیا، آنکھیں چمکتی ہی چلی گئیں۔ جب اس نے جذبات کی موت کا ٹکڑا ادا کیا تو اس کا چہرہ، اس کے خد و خال رنگ ہی رنگ ہو گئے اور جب وہ کیوں تک پہنچی تو رنگ آتشبازی سمان متین صاحب کی نظروں کو خیرہ کرتے ہوئے فضا میں

جذب ہو گیا۔

''انسان اگر چہ ایک سطح پر بظاہر مادے ہی کی ایک شکل ہے اور نظر آتا ہے۔ مگر اس کے اندر کئی عالمین مضمر ہیں۔۔ انسان اپنی زندگی میں ایک وقت میں، حواس کے عالم کے ماسوا، ایک ہی عالم میں جیتا ہے اور اسی عالم کا شعور رکھتا ہے۔ وہ عالم ہے اسما کا عالم۔ اسما کے عالم میں جو واقعات اور حادثات وجود میں آتے ہیں وہ اسی عالم میں محدود نہیں رہتے وہ اس عالم کی حدود سے ماورا اور اس عالم سے بلند دوسرے عالمین میں سفر کرتے ہیں یا یوں بھی کہا جاسکتا ہے کہ ان کے اندر کئی عالمین چھپے ہوتے ہیں اور ان کی جھلک اسما کے عالم میں بھی دیکھی جاسکتی ہے اور جھلک دیکھ لینے کے بعد ان عالمین میں سفر کرنے کیلئے انسان کو اپنے اندر ان عالمین سے ممثل عالمین خلق کرنے پڑتے ہیں۔ ہر انسان ایسا نہیں کرسکتا کیونکہ اکثر انسان یہ جانتے ہی نہیں کہ حواس کے عالم سے ماورا اور بھی عالم ہیں اور ان میں جو باہمی رشتے ہیں اور ایک سے دوسرے عالمین کو جو راستے جاتے ہیں وہ ایک دوسرے سے بیک وقت راسی اور افقی رشتوں میں منسلک ہیں۔

جس انسان کو ایسے عالمین میں سے ایک عالم کی جھلک دکھائی دے جاتی ہے اور وہ نہیں جانتا کہ اس کے اندر بہت سے عالمین کا وجود ممکن ہے۔ وہ اس جھلک سے اسی طرح متاثر ہوتا ہے جس طرح انسان اس دم دار ستارے کو دیکھ کر متاثر ہوتے ہیں۔ جس طرح بابا متاثر ہوا تھا۔

مگر اس صدی کا مہذب انسان اگر چہ اسما کے عالم سے پوری طرح آشنا نہیں مگر پھر بھی وہ اس عالم سے ماورا کئی عالمین میں کبھی کبھی نکل جانے کا اہل ہو گیا ہے، باوجود اس کے کہ ان عالمین کو بھی حواس کے عالم کا ایک حصہ سمجھتا ہے۔ جب کبھی کوئی انسان عالم حواس کے ساتھ ساتھ اور بیک وقت کسی اور عالم کو بھی دیکھ سکے تو وہ اس کا اہل ہو جاتا کہ وہ اتنی دیر کیلئے حسن کے عالم کی جھلک دیکھ سکے جتنی دیر وہ حواس کے عالم کے ساتھ کبھی کسی اور عالم کو بھی دیکھ سکے۔ حسن کے عالم کی سرحدیں عالم حواس سے ماورا ہر دوسرے عالم کے ساتھ اس طرح ملی ہوئی ہیں کہ جب تک اس عالم کی اس سرحد پر کھڑے نہ ہو جہاں وہ حسن کے عالم

سے ملی ہوئی ہے،ہم حسن کو محسوس کر ہی نہیں سکتے۔

اکثر ایسا ہوتا ہے کہ جو کوئی بھی کسی ایسے عالم میں نکل گیا جس کی کوئی سرحد حسن کے عالم کی کسی سرحد سے ملتی ہے تو وہ یہی سمجھتا ہے کہ وہ حواس کے عالم کی سرحدوں کے اندر ہے اور وہاں سے لوٹ آنے کا بندوبست نہیں کرتا اور اس کا رشتہ حواس کے عالم سے کٹ جاتا ہے اور وہ پوری طرح سے کسی بھی عالم میں جی نہیں سکتا، وہ عالمین کے صدراہوں میں بھٹکتا پھرتا ہے اور یوں زندگی اس کے لیے مشکل ہو جاتی ہے، عذاب بن جاتی ہے۔

عام انسان اسی قسم کے انسان ہوتے ہیں۔اسی لیے تو ان کو حسن کا شعور ہی نہیں ہوتا۔ کیونکہ انسان عالمِ حواس کے علاوہ عالمِ اسما میں بھی بیک وقت جیتا ہے لہٰذا اس کو دوسرے عالمین کی خبریں عالمِ اسما میں پہنچتی رہتی ہیں۔اسی لیے وہ دوسرے عالمین کے موجودات کے شعور کا دعویٰ کرنے پر اصرار کرتا ہے۔یوں وہ عالم حواس کی کسی شے کو حسین کہہ دینے پر مصر رہتے ہیں۔ان عالمین کے متعلق ایک اور قابل ذکر بات یہ ہے کہ ہر عالم کے لیے انسان کی ایک خاص صلاحیت یا کچھ صلاحیتوں کا ایک خاص امتزاج ہی مشعل راہ بن سکتا ہے یا یوں کہہ لو کہ اس خاص امتزاج کے سبب وہاں تک پہنچا سکتا ہے۔ جیسے ہم نے عالمِ حواس میں سفر کے نئے نئے طریقے ایجاد کر لیے ہیں اسی طرح کچھ انسانوں کے لیے ممکن ہے ان طریقوں سے ملتے جلتے طریقے ان دوسرے عالمین کے سفر کے لیے ایجاد کر لیں۔

ایسے ہی لوگ ہیں جو جب بھی حسن کے عالم میں چلے جاتے ہیں تو لوٹ بھی آتے ہیں اور انہی میں سے چند ایسے بھی ہوتے ہیں جو بیک وقت کئی عالمین میں نہ صرف زندہ رہتے ہیں بلکہ ان میں بیک وقت سفر کرتے رہتے ہیں۔

انسان نے اپنے متعلق بہت ہی غلط اندازے لگا رکھے ہیں، اپنی حدود کو بہت ہی تنگ کر رکھا ہے اور جہاں ایسا نہیں ہے وہاں انسان نے سفر کے مناسب طریقے ایجاد کئے ہیں۔''

''یہ تو سمجھ میں آتا ہے یا گمان ہے کہ آتا ہے یا آ جائے گا۔مگر انسان کے لیے کیسے ممکن ہو کہ وہ ایک ہی وقت میں نہ صرف کئی عالمین کا شعور رکھے بلکہ ان میں جئے، ان کے

اندر سفر کر سکے۔ ایک وقت میں ایک ہی مقام پر جیا جا سکتا ہے اور ایک وقت میں ایک ہی مقام سے ایک سے زیادہ مقاموں کی طرف سفر نہیں کیا جا سکتا۔ میں یہ بات پورے وثوق سے تو نہیں کہہ رہی مگر کیا حقیقت میں ایسا نہیں ہے اور جو کچھ آپ نے کہا اس کا احساس ایک فریب نہیں؟''

عالمہ کے چہرے پر تذبذب اور کرب کے نشان ابھر آئے تھے جب اس نے متین صاحب سے سوال کیا۔ اس کی نظروں میں، اس کی آواز میں بیک وقت چیلنج بھی تھا اور اعتماد بھی کہ متین صاحب اس کے سوالوں کا جواب دے سکیں گے۔

''تمہاری بات انسان کے جسم کے متعلق تو صحیح ہے مگر جیسا کہ میں نے ابھی ابھی بتایا کہ انسان محض جسم نہیں۔ اگر تم اپنے گرد و پیش پر نظر ڈالو تو تمہیں غور کرنے کے بعد پتہ چل جائے گا کہ مادے کی مختلف شکلیں حواس کے عالم کے اندر بند ہیں اور ان کو اس بات کا شعور تک نہیں کہ ایسا ہے۔ صرف انسان کو ہی اس بات کا شعور ہے۔ اسی لیے انسان تخلیق کا اہل بھی ہے اور ہر انسان کی تخلیق دوسرے انسانوں کی تخلیقات سے مشابہ ہوتے ہوئے بھی الگ ہوتی ہے۔ حالانکہ غیر انسانوں میں جو جاندار بھی کچھ بناتا ہے تو اس کی نوع کے تمام افراد ویسی ہی اشیا بناتے ہیں، ان میں فرق بالکل نہیں ہوتا۔ یہ اس لیے کہ غیر انسانوں کے اعمال کی حدود معین ہیں بلکہ ان حدود کے اندر مختلف اعمال کی صورتیں بھی معین ہیں۔ ہر نوع کا ہر فرد کسی ایک عمل کو ایک ہی صورت دے سکتا ہے۔ اس کے برعکس تم دیکھتی ہو کہ انسان ایک عمل کو کئی کئی صورتیں بخش سکتا ہے۔ اس کے لیے امکانات کا ایک پورا ملک ہے جس میں سے وہ انتخاب کرتا ہے۔

انسان ہی اس کا اہل ہے کہ اپنے ماضی اور حال کا امتزاج کر سکے، حال کی بجائے ماضی میں جیے یا مستقبل میں یا صرف حال میں اور سب سے بڑی بات کہ ماضی کا شعور رکھ سکے اور مستقبل میں جھانک سکے اور ان دونوں سے حاصل کئے ہوئے مواد پر اپنے حال میں اعمال کی بنیاد رکھ سکے۔

جب امکان کو مشہود کر لینے پر انسان قادر ہو اور غیر انسانوں کی طرح مجبور نہ ہو کہ کچھ

امکانات کو ضرور مشہود کر دے اور کچھ کو نہ کر سکے تو یہ سمجھ آ سکنے میں کوئی دقت نہیں ہونی چاہیے کہ انسان ایک ہی مقام سے ایک ہی وقت میں کئی مقاموں کی طرف سفر کر سکتا ہے۔ اس کے بعد یہ کہ ایک ہی وقت میں انسان کئی مقاموں سے کئی مقاموں کی طرف سفر کر لینے پر قادر ہے۔

تم اپنے متعلق اگر غور کرو تو تمہیں معلوم ہو جائے گا کہ شعور اور لاشعور ایک ہی مقام سے ایک ہی وقت میں کئی مقاموں کی طرف سفر کرتے ہیں اور یہ دونوں صلاحیتیں انسان کی ساخت کا حصہ ہیں۔ انسان بیک وقت نہ صرف ان دو صلاحیتوں کا استعمال کرتا ہے بلکہ کئی اور صلاحیتوں کا استعمال کرتا ہے اور ان سب سے الگ کئی اور صلاحیتوں کا استعمال اس کے لیے ممکن ہے، اور ان سب کے استعمال کرنے سے شعور اور لاشعور، عقل و وجدان اور تخیل اور عدم اور خلق کے باہمی امتزاج سے ایک ایسی قوت کو وجود میں لایا جا سکتا ہے جو ان سب پر حاوی ہو اور ان سب کی حدود کے اندر مشہود اور نامشہود کی ہر شکل کو دیکھ سکے، محسوس کر سکے۔ اس طاقت کو وہی مشہود کر سکتا ہے جو حواس کے عالم سے ماورائی اور عالمین کا شعور رکھتا ہو اور ان میں سفر کر چکا ہو اور بار بار سفر کر سکتا ہو۔

ایسی راہ پہاڑ کے رستوں کی طرح کٹھن ہے مگر اس راہ میں پہاڑی رستوں کی طرح کسی ایک سطح سے نیچے کی سطحوں کو بیک وقت دیکھا جا سکتا ہے۔ کسی ایک سطح سے اوپر کی سطح یا سطحوں کو دیکھا جا سکتا ہے۔

ماضی، حال اور مستقبل مناظر ہیں عالمِ حادثات کے۔ انسان اس عالم میں ہر دم سفر کرتا رہتا ہے اور اس کے لیے ممکن ہے کہ وہ اس عالم کو اپنی کسی خاص صلاحیت کی وجہ سے کسی ایسے عالم سے دیکھ سکے جو اس سے بلند سطح پر ہو۔ چونکہ ہم ہر دم اس عالم بلند کی سطح پر نہیں رہ سکتے اس لیے ہم صرف کچھ حصوں کو ہی دیکھ پاتے ہیں۔ صرف ایک ہی ہستی ایسا کر لینے پر قادر ہے اور وہ ان عالمین کے رب کی ہے۔ انسان اس کے بنائے ہوئے رستوں پر ہی چلتا ہے اور جن رستوں پر وہ خود چلتا ہے ان ہی رستوں پر چل کر انسان کچھ لمحوں کے لیے اس کی کسی ایک صفت کو تھوڑا بہت جذب کر سکتا ہے اور اس رب کی طرح خالق بن سکتا

ہے، باری اور مصور بن سکتا ہے۔

ہم میں سے ہر ایک کے لیے یہی مسئلہ ہے کہ ہماری صلاحیتیں کیا کیا ہیں، ان کے کون کون سے امتزاجات اس زمانے میں ممکن ہیں، کن کن کو اپنے معاشرے کے اندر مشہود کیا جا سکتا ہے اور کن کن کے ذریعے معاشرے میں ایسی تبدیلی پیدا کی جا سکتی ہے کہ جن کے بعد اس زمانے کے ہر انسان کے لیے عالمین کا سفر ممکن ہو سکے، آسان ہو سکے۔ جس معاشرے میں ہر انسان کے لیے یہ سفر ممکن نہیں وہاں ہر انسان کے لیے حواس کے عالم کا سفر بھی سخت کٹھن ہو جاتا ہے اور جو لوگ اس عالم کے علاوہ دوسرے عالمین میں سفر کرنے کے اہل ہیں اور سفر کا عزم رکھتے ہیں، ان کو اس عالم سے فرار اختیار کرنا پڑتا ہے۔ چونکہ ایسا ممکن نہیں لہٰذا عذاب میں گرفتار ہو جاتے ہیں۔ کچھ ایسا ہی ان انسانوں پر بیتتا ہے جو حواس کے عالم سے باہر سفر کرنے کو فریب سمجھتے اور تہذیب اور معاشرے کے عوامل کو اس عالم کی حدود کے اندر رکھنا چاہتے ہیں۔

اگر یہ سب کچھ یا اس میں سے بہت کچھ صحیح ہے تو انسان کو کائنات کا حصہ تسلیم کرتے ہوئے بھی کائنات کا سا ایک نظام ماننا پڑے گا اس فرق کے ساتھ کہ کائنات قانون سے انحراف نہیں کر سکتی اور انسان کر سکتا ہے۔ لہٰذا ہر انسانی عمل کو اس کے مطابق ڈھالنا پڑے گا۔''

''آپ ابھی تک فلسفی ہیں۔ طب کو کب عمل میں لائیں گے۔'' فردوس بولی

''نہیں۔ ایسا تو نہیں۔ ساری گفتگو میں ان کی شخصیت کے ان دو پہلوؤں کا واضح اظہار ملتا ہے۔ کیوں تقی بھائی آپ کا کیا خیال ہے؟''

''مجھے تم سے اتفاق ہے۔ فردوس تو اس انسانی آفاق تک پھیلتے ہوئے منظر حیات کا احاطہ کر لینے کے لیے فوراً وقت نکالنے کو خواہ مخواہ ایک ایسی بحث کا آغاز کرنا چاہتی ہے جس میں اس کو حصہ نہ لینا پڑے بلکہ جس کا سننا بھی اس کے لیے ضروری نہ ہو۔''

''تقی میاں! تم مجھ پر دوسری بار الزام لگا رہے ہو۔''

''دوسری بار! پہلی بار کب تھی؟''

''ٹرکش باتھ والا الزام بھول گئے؟''

''تمہیں ابھی تک یاد ہے؟''

''ہاں! مجھے بہت کچھ بلکہ سبھی کچھ یاد ہے۔''

''واقعی؟ میں سمجھتا تھا مجھے ہی سب کچھ یاد ہے۔ میں اس خیال اور نئے الزام کے لیے معذرت چاہتا ہوں اگر چہ میں یہ ضرور چاہتا ہوں کہ تم جواز پیش کرو کہ جو تم نے متین صاحب کے متعلق کہا ہے اس کی وجہ اس وجہ سے مختلف ہے جو کچھ وجہ میں نے بیان کی ہے۔''

فردوس تقی کی چمکتی ہوئی، مسکراتی آنکھوں اور تمتماتے ہوئے چہرے کو دیکھ کر مسکرائی اور پھر ہنس دی۔

''میں صرف اس احساس سے کچھ لمحوں کے لیے فرار چاہتی تھی کہ میں نے اپنی زندگی ان راہوں میں گزار دی جو میری منزل کی طرف نہ جاتی تھیں اور مجھے زندگی کا سفر کسی اور مقام سے نئے سرے سے شروع کرنا ہوگا اور وہ سفر نہ جانے اس سفر سے کتنا کٹھن ہوگا...... اس فرار کے بعد میں اپنے آپ کو اس بات پر تیار کرنا چاہتی تھی کہ اپنے نقصان کو قبول کر لیا جائے۔''

''مجھے تو سخت بھوک لگ رہی ہے۔ بابا آ جائے تو کھانا لگانے کو کہا جائے۔ اتنی طویل گفتگو کے بعد بہت ہی کمزوری محسوس ہو رہی ہے۔ یوں لگتا ہے کہ سیروں خون نکل گیا ہے۔''

''میں حاضر ہوں میرے آغا۔ کھانا لگا دیا ہے۔ چلئے۔''

''چلو بھئی اٹھو۔ فردوس، عالمہ، تقی، آ ؤ رات ابھی باقی ہے اور یہاں کی فضا سوچنے کے لیے بہت سازگار ہے۔ سونے کا بندوبست بھی یہاں ہو سکتا ہے کیوں فردوس۔؟''

''ہاں! ہاں کیوں نہیں۔''

چوتھا باب

''اگر آپ کچھ عرصے کے لیے اپنے آرام کو ملتوی کر سکیں تو میں آپ سے کچھ پوچھوں۔'' فردوس نے کھانے کی میز سے اٹھ کر ہاتھ دھوتے ہوئے متین صاحب سے کہا۔

''میں بھی آپ سے یہی کہنے والی تھی۔ آپ کی گفتگو کے بعد اب کون آج کی رات سو سکے گا۔''

''میں فردوس اور عالمہ کے سوالات اور ان کے جوابات آپ سے سننے کے لیے ضرور جاگنا پسند کروں گا۔''

''تو آئیے لائبریری میں بیٹھیں۔ میں نے آج ہی وہاں صوفے رکھوائے ہیں۔ چاند اب وہاں سے نظر آئے گا اور باہر صحن میں صبح تک چاندنی رہے گی۔ آج کی گفتگو کے لیے چاندنی کا قُرب ضروری ہے۔''

لائبریری کی مغربی کھڑکیوں سے چاندنی کمرے میں داخل ہو چکی تھی اور کرسیوں، صوفوں سے لپٹی سو رہی تھی۔ متین صاحب نے قدِ آدم کھڑکی کو کھول کر باہر کی ہوا میں سانس لیا۔ ہوا زیادہ ٹھنڈی نہ تھی، خوش گوار تھی۔ چہرے پر ہوا کے لگتے ہی ان کے دماغ نے انگڑائی لی اور بیدار ہو گیا، ان کی آنکھوں کو ٹھنڈک سے بہت آرام ملا۔ انہوں نے ایک اور لمبا سانس لیا اور نیچے وادی پر نظر ڈالی اور پٹ بند کر دیئے اور کمرے کی طرف منہ کر کے سب سے مخاطب ہوئے۔

''ہوا خاصی خوشگوار ہے اگر چاہیں تو کھول دوں؟''

''ضرور! ضرور''

متین صاحب نے کھڑکی کے پٹ کھول دیئے اور خود کاؤچ کے سامنے ایک خالی آرام کرسی پر دراز ہو گئے۔

''آپ کے نزدیک حسن اور زندگی میں کوئی حقیقی تضاد نہیں مگر انسانی تاریخ شاہد ہے

کہ حسن نے ہمیشہ زندگی سے بہت بڑی بھینٹ چاہی ہے اور انسان نے ہمیشہ یہ بھینٹ دی ہے۔ کیا حسن ہی وہ راہ نہیں جس راہ سے انسان کی زندگی میں سب دکھ داخل ہوتے ہیں؟ جو حسن کو پہچان سکتا ہے اور جس شے میں بھی حسن ہے خود اس پر بربادی نازل ہوتی ہے بلکہ کبھی کبھی تو مجھے شدید احساس ہوتا ہے کہ حسن عذاب ہے، جہنم ہے۔ جس پر حسن نازل ہوا یا جس کو اس کی پہچان ہے اس پر ارتقا کی راہیں مسدود ہو گئیں۔ ایسا کیوں؟''

فردوس کی آواز فضا میں ارتعاش پیدا کرتے کرتے سو گئی مگر متین صاحب کے لبوں میں جنبش تک نہ ہوئی۔ سب ان کو دیکھ رہے تھے۔ ان کی آنکھیں بند تھیں۔ ان کے چہرے پر سکون اور طمانیت اس طرح گھلی ملی تھی کہ ان کے خدوخال کا لازمی حصہ ہو مگر ان کے سینے اور پیٹ کے ٹھہراؤ سے اندازہ ہوتا تھا کہ وہ اپنے اندر کی کسی کشمکش پر، سانس روکے، قابو پانے کی کوشش کر رہے تھے۔ ایک دم کسی اجنبی آواز نے ان سب کو چونکا دیا۔ انہوں نے لائبریری کے دروازے کی طرف دیکھا مگر وہاں کوئی نہ تھا۔ جب متین صاحب کو دیکھا تو ان کے لب متحرک تھے اور وہی بول رہے تھے۔ ان کی آواز بہت بدل چکی تھی۔ ان کی آواز میں چولہے کی آگ کی سی گرمی اور سکون تھا۔

''جب انسان کا وجود نہ تھا اس وقت بھی حُسن موجود تھا اور انسان نہ رہے گا تب بھی حُسن موجود ہوگا۔ وجود حسن کے بغیر انسان کی تخلیق ہی ممکن نہ تھی۔ حُسن انسان ہی کی طرح آزاد بھی ہے مقدور بھی مگر مجبور نہیں۔ انسان اپنی آزادی کو سلب بھی کر سکتا ہے، کھو بھی سکتا ہے، مگر حسن اگر آزاد نہ ہو تو اس کا وجود ختم ہو جائے۔ حُسن مکان و زمان کی حدود سے ماورا ہے۔

انسان اپنی تقویم میں مقدر مگر لامحدود امکانات کا ایک بیک وقت ارتقا پذیر اور انحطاط پذیر مشہود نظام ہے۔ امکانات نوعیت کے اعتبار سے رشتوں کے مختلف نظاموں میں جکڑے ہوئے ہیں۔ ان نظاموں میں امکانات کے رشتے بیک وقت افقی اور راسی ہیں۔ فطرتاً ہر امکان مشہود ہونے کے لیے بے قرار ہے مگر چونکہ انسان زمان و مکان کی حدود میں رہنے کے لیے مجبور ہے لہٰذا امکانات ایک خاص ترتیب سے ہی وجود میں آ سکتے ہیں۔ چونکہ

انسان کی تخلیق میں حسن بھی شامل ہے اس لیے وہ زماں و مکاں سے ماورا کو محسوس کر لینے کا بھی اہل ہے۔ چونکہ وہ زمان و مکان کی حدود کے اندر رہنے پر مجبور ہے لہٰذا وہ زمان و مکان سے ماورا کو مشہود صورت میں دیکھنے کا خواہاں ہے۔ اس لیے وہ مادے کو ایسی صورتوں میں ڈھالتا رہتا ہے جو اس ماورا کے مشابہ ہوں۔ چونکہ وہ آزاد بھی ہے اس لیے اسے جینے کے لئے ہر لمحہ اعمال کا انتخاب کرنا پڑتا ہے اور چونکہ وہ مجبور بھی ہے اس لیے ان تمام حادثات کا علم نہیں رکھتا جن سے اس کو اعمال کے انتخاب کی وجہ سے ملنا پڑتا ہے۔

ہر انسان چونکہ زمان و مکان کے تغیر پذیر رشتوں کے مختلف نظاموں کے درمیان جنم لیتا ہے لہٰذا وہ اپنی انفرادی حیثیت سے دوسرے انسانوں سے مختلف امکانات کا نظام لیے ہوتا ہے۔ اس نظام کو مشہود رکھنے کے لیے ضروری ہے ایسے اعمال کا انتخاب کیا جائے کہ ان کی وجہ سے جن حادثات سے ملنا پڑے وہ ایسے ہوں کہ اس مشہود نظام کے ارتقا میں ممد ثابت ہوں تا کہ انسان کم سے کم مجبور رہے اور زمان و مکان سے ماورا کے زیادہ سے زیادہ قریب ہوتا چلا جائے۔ لیکن چونکہ اس کا علم مکمل نہیں لہٰذا وہ ایسے اعمال کا انتخاب کر سکتا ہے کہ وہ زیادہ سے زیادہ مجبور ہوتا چلا جائے اور جب جب بھی اس کو اس مجبوری کا اور زمان و مکان سے ماورا سے دوری کا احساس ہوتا ہے تو اس کو دکھ ہوتا ہے اور اس کو اس ماورا سے قربت حاصل کرنے کیلئے بہت ہی زیادہ محنت کرنی پڑتی ہے۔ اس سلسلے میں اس کو اپنے مشہود حصوں میں ایسی تبدیلیاں کرنی پڑتی ہیں کہ یہ حصے اس کے غیر مشہود حصوں کو زمان و مکان کی حدود سے باہر جانے سے نہ روک سکیں۔

یہ کام کچھ آسان نہیں کیونکہ وہ اپنے مشہود حصوں کو مشہود رکھنے کے لیے اور ان کی زکا کے لیے وہ دوسرے انسانوں کے تعاون کا محتاج ہے۔ اس حاجت سے وہ کسی صورت میں آزاد نہیں ہو سکتا ہے۔ وہ صرف یہ کر سکتا ہے کہ اس تعاون کو ایسی شکل دے لے کہ اس کے مشہود کے حوائج اس طرح خود بخود پورے ہوتے رہیں جیسے کہ اس کی سانس لینے کی حاجت۔

ایسا کر لینے کے لیے ضروری ہوگا کہ اس کو معلوم ہو کہ انسان کے بحیثیت انسان کیا کیا

امکانات ہیں اور ان امکانات کے آپس میں کس نوعیت کے رشتے ہوتے ہیں تا کہ وہ ان امکانات کو صحیح ترتیب سے مشہود کرتا چلا جائے۔

امکانات اپنی نوعیت کے لحاظ سے نظاموں میں منسلک ہوتے ہیں اور مختلف النوع نظام ایک خاص ترتیب سے آپس میں جکڑے ہوتے ہیں۔ کسی بھی ایسے نظام میں امکانات کے رشتوں کی نوعیت دو طرح کی ہوتی ہے: افقی، راسی۔ اور نظاموں کے درمیان رشتوں کی نوعیت تین طرح کی ہوتی ہے: افقی، راسی اور قوسی۔

ایسے کسی واحد نظام کو عالم کہیں گے۔ اس عالم کے اندر جن امکانات کا رشتہ ہوگا ان سب کو افقی ترتیب کے لحاظ سے درجہ کہیں گے اور جب ان میں رشتہ راسی ہوگا تو طبق۔

مختلف عالم بھی ایک خاص ترتیب میں ایک دوسرے سے منسلک ہیں اور اس ترتیب میں بھی رشتوں کی نوعیت وہی ہے جو کہ ایک عالم میں امکانات کی ہے۔ عالمین کے اس نظام کو کون کہیں گے۔

اپنے وجود کے اعتبار سے یہ عالمین نہ مکان سے نہ زمان سے بلکہ قدامت سے متعلق ہیں۔ جوں جوں انسان ان نظاموں پر عبور حاصل کرتا چلا جائے گا وہ حسن کے قریب ہوتا چلا جائے گا، تمام عالمین اس کی سلطنت شعور میں شامل ہوتے چلے جائیں گے اور جب ایسا ہو جائے گا تو اس کے ارتقا کی رفتار بہت تیز ہو جائے گی۔ اتنی تیز جتنی کہ روشنی کی رفتار ہے۔ اور وہ زمان و مکان کے جبر سے آزاد ہو جائے گا۔ بقا سے ہمکنار ہو جائے گا۔

انسان کا ایسا کر لینا ممکن تو ہے مگر ضروری نہیں کیونکہ اسے ہر لحہ امکانات کا انتخاب کرنا پڑتا ہے اور اسے امکانات کی نوعیت اور ان کے نتائج حادثات کا پورا پورا علم نہیں ہوتا۔ لہٰذا وہ ایسی راہوں پر نکل سکتا ہے جہاں اس پر ترقی کی، زکا کی راہیں بند ہو جائیں۔

ایسی صوت میں وہ صرف انہی حادثات سے مل سکتا ہے جن سے وہ پہلے مل چکا ہے۔ ان حادثات کے دائرے میں قید ہو جائے گا۔ جب بھی ایسا ہوا انسان کا انسان رہنا ناممکن ہو جاتا ہے۔ ایسی حالت میں دو ہی صورتیں ممکن ہیں جہاں سے وہ غلط راہ پر چلا تھا وہاں لوٹ آئے اور وہاں سے پھر صحیح راہ کا انتخاب کرے یا وہ عذاب کے بھنور میں گرفتار

ہو جائے۔ جو ایسے بھنور میں پھنس گیا اس کو سوائے عالمین کے رب کے کون نکال سکتا ہے یا پھر وہ جس کے پاس رب کی دی ہوئی رسی ہو جسے وہ ڈوبنے والے کی طرف پھینک دے کہ وہ اس کو پکڑے اور بھنور سے سلامتی کی طرف نکل آئے۔

اب اس پس منظر میں کچھ نشانوں کو ابھارنے سے آپ کے سوالات کے جواب دے سکنے کی راہیں نکل آئیں گی۔

یہ تو آپ نے سمجھ لیا ہوگا کہ انسان انسانی گنتی کے طریقوں کے لحاظ سے لامحدود امکانات کا نقطہء وصال ہے۔ ان امکانات کے مشہود ہونے کا صرف یہی طریقہ تھا کہ انسان کی کوئی مشہود صورت ہوتی یعنی اس کا جسم ہوتا۔ جب اس کا کوئی جسم ہوگا تو وہ مادی قوانین کے تابع ہوگا۔ انسان کے جسم کے معاملے میں ایسا ہی ہے۔ مادہ کی ایک صورت کے امکانات محدود ہوتے ہیں اور جب تک وہ صورت قائم رہتی ہے امکانات وہی رہتے ہیں۔ صورت بدل جانے سے اس کے امکانات کی حدود میں وسعت آ سکتی، تنگی آ سکتی ہے۔ مگر ان پر لامحدودیت کا اطلاق نہ ہو سکے گا۔

انسان چونکہ مادے کی دوسری صورتوں کے مقابلے میں لامحدود امکانات رکھتا ہے۔ لہٰذا اس کی خاصیتیں بھی لامحدود ہوں گی لہٰذا انسانوں کا دنیائے محسوسات سے ماورا خاصیتوں کا حامل ہونا بھی ناگزیر ہے۔

یہ استخراج اب سائنسی علوم کی تحقیقات اور تفتیشات سے بھی ثابت ہے۔

لہٰذا جب بھی محسوسات کی دنیا میں کوئی بہت ہی اچنبھے کا واقعہ ہوگا جس کا رشتہ ہمارے زمین و آسمان کے قوانین سے یا انسانی تجربے سے نہ ہوگا تو انسان مجبور ہوگا کہ وہ اس کی توجیہہ دنیائے محسوسات سے ماورا کسی اور قانون سے کرے اور تجربے سے ثابت ہے کہ انسان ایسا ہی کرتا ہے۔ جیسا کہ بابا نے کیا۔ چونکہ انسان ایسا کر سکتا ہے لہٰذا اس دنیائے محسوسات سے ماورا بھی کچھ ہے جس کا مبہم سا شعور انسان کو ہے۔ انسانی تجربہ ہے کہ جو بھی مبہم ہے اس کو واضح کیا جا سکتا ہے اور اس کا علم حاصل کیا جا سکتا ہے۔

اس مبہم ماورا کے متعلق انسانوں نے بہت سا مواد اکٹھا کیا ہے جس سے اندازہ ہوتا

ہے کہ انسان کی ایسی ہی ماورائی خاصیتیں کئی نظاموں میں منسلک ہیں۔ ان نظاموں کی جھلک انسان کو کبھی کبھار نظر آ جاتی ہے۔ چونکہ ایسی جھلک ماورا سے متعلق ہے اس لیے اس کا شعور اور علم انہی لوگوں کو ہوسکتا ہے جو اس ماورا اور اس ماورا کے نظاموں کے وجود پر، اپنی ذات کی کسی سطح پر، یقین رکھتے ہیں۔

انسانوں کی بہت بڑی اکثریت کو ان ماورائی نظاموں کا یقین تو ایک طرف ان کا گمان تک بھی نہیں ہے۔ اس لیے جب ان کو ایسی جھلک نظر آتی ہے تو اس کو پہلے فریب سمجھتے ہیں مگر وہ جھلک اتنی بیّن ہوتی ہے کہ وہ اس کو فریب نہ سمجھنے کی کوشش کرتے ہیں۔ اس لیے اس جھلک کے دوہرائے جانے کی خواہش کے لیے مجبور ہوجاتے ہیں۔ مگر اس جھلک کا بار بار دیکھ لینا، ان کے لیے اسی صورت میں ممکن ہوتا ہے جب اس کے ظاہر ہونے کے قوانین کا علم ہو اور ان قوانین پر ان کا زور ہو۔ چونکہ انسانوں کی اکثریت کیلئے ان کی اپنی افتادِ علم کے سبب یہ ممکن نہیں لہٰذا ان کو ناکامی کا منہ دیکھنا ہی پڑتا ہے۔ ناکامی سے ہر جاندار متاثر ہوتا ہے۔

حسن کا تعلق بھی انہی ماورائی نظاموں سے ہے۔ انسانوں کی اکثریت حسن کے مظاہر کو پیہم دیکھنے کی خواہش کرتی ہے۔ کیونکہ ان مظاہر کے نقش ان کی یادداشت محفوظ کر لیتی ہے اور یہ نقش ان کے ماضی سے ان کے حال میں دخل انداز ہوتے رہتے ہیں۔ اس ماورائی مشاہدے کے نتائج وہی ہوں گے جو اس قسم کے مشاہدات کے بیان کئے گئے ہیں۔

یہ تو ان مشاہدات کے اصول کا بیان ہوا۔ جب ایسے مشاہدات انسانوں کے باہمی تعلقات کے سبب پیش آتے ہیں تو ان کی نوعیت ان مشاہدات سے مختلف ہوتی ہے جو کسی بھی انسان کو مادے کے غیر انسانی مظاہر کے مشاہدے سے پیش آتے ہوں۔ کیونکہ ہماری ارض پر حسن کے مظاہر کی ترکیب اور ساخت لامحدود امکانات کے سبب پیدا ہوتی ہے اور ان مظاہر سے پیدا ہونے والے نتائج سے حسن کا شاہد اور حسین دونوں متاثر ہوتے ہیں، اگرچہ ان تاثرات کی نوعیت الگ الگ ہوتی ہے، اس لیے انسانوں میں صحیح تعلق کلام کا ہے مگر اس کے لیے ضروری ہے کہ مکالمہ ایک ہی سطح پر ہو۔ اگر دو انسان دو مختلف سطحوں سے ایک

دوسرے کو مخاطب کریں گے تو ان کا رشتہ مکالمہ کا نہ ہوگا بلکہ تنہا گوئی کا ہوگا جو کلام کے مقصد سے مختلف نتائج کا حامل ہوگا، لہٰذا مکالمے کی کوشش ناکام ثابت ہوگی۔

تم نے حسن اور زندگی کے مابین تضاد کا ذکر کیا ہے۔ حالانکہ تضاد کا وجود ہی نہیں۔ ہر شے جو وجود رکھتی ہے اس کا زوج ہے۔ جب زوجین کا ملاپ ہو جائے تو اس تعلق میں حسن جنم لے لیتا ہے اور جب تک ملاپ قائم رہتا ہے اس کا ناتا حسن سے رہتا ہے۔ لیکن ایسا ہوسکتا ہے کہ زوجین کا ملاپ ہی نہ ہو یا نہ ہو سکے۔ ایسی صورت میں زندگی کا تعلق حسن سے وابستہ نہیں ہو پاتا۔

زندگی اور حسن میں تضاد کا سوال پیدا ہی نہیں ہونا چاہیے کیونکہ نہ صرف حسن زندگی کی تخلیق میں شامل ہے بلکہ زندگی حسن کے خاصے کی طرف مائل ہے اور اس کے درجے کو پہنچنا چاہتی ہے، زندگی لم یزل ہونا چاہتی ہے۔

انسانی زندگی اور حسن میں بُعد اس لیے نظر آتا ہے کہ انسان حسن کے شہود کی نوعیت سے واقف نہیں ہوتے اور شہودِ حسن سے پیدا ہونے والے تاثرات کا دوام چاہتے ہیں۔

ہر حسین کو اس قسم کے حادثات سے دوچار ہونا پڑتا ہے لیکن وہ ہر اس انسان کا زوج نہیں بن سکتا جو اس کے حسن سے متاثر ہو اور اس متاثر کرنے والے تعلق کا دوام چاہے۔ ایسا چاہنے والے کے لیے لازم ہے کہ وہ جاننے کی کوشش کرے کہ نظارہ حسن اس سے کیا چاہتا ہے اور وہ اپنے امکانات کی کس شکل کے اعتبار سے حسین سے تعلق کلام تخلیق کرسکتا ہے جو حسین کے امکانات کی کسی شکل سے لازمی و لابدی تعلق رکھتا ہو یا اگر ایسا ممکن نہ ہو تو کیا وہ اس تاثر حسن کی قلب ہیئت کر کے اس کے مشابہ کی تخلیق کا اہل ہے۔ اگر دونوں میں کوئی بھی صورت ممکن ہے تو حسین اور شاہدِ حسن میں رشتہ قائم ہونا لازم ہے، جس کی نوعیت تخلیقی ہوگی اور شاہدِ حسن کی شخصیت کا تقاضا نہ ہوگا کہ یہ رشتہ ازدواجیت کا ہو اگرچہ ایک سطح پر، تخلیقی سطح پر، یہ رشتہ زوجیت ہی کا ہوگا۔ لہٰذا اس رشتہ کے سبب شاہدِ حسن میں اور حسین میں انبساط اور نشاط پھوٹیں گے اور نشو ونما پاتے چلے جائیں گے۔ دونوں کی شخصیتوں کے امکانات میں ارتفاع پیدا ہوتا چلا جائے گا۔ اس لیے اس کا قانونِ جزا یہ ہے اعمال کے انتخاب کے

مطابق صلہ ملتا ہے اور جو انسان حسن کے روبرو آتا ہے اور ملاقات کے تاثر کو قبول کر لیتا اور اس تاثر سے کسی قسم کا تقاضا نہیں کرتا وہ اس کی فضائے یاد میں ایک خوش گوار صورت میں موجود رہتا اور اس کو انبساط اور نشاط مہیا کرتا ہے۔ میں اس امکان سے بے خبر نہیں ہوں کہ حسین اور شاہدِ حسن کے درمیان ایسا جذبہ وجود میں آ سکتا ہے کہ شاہدِ حسن کے لیے عذاب کا سبب بن جائے۔ یہ اس صورت میں ہوگا جب شاہدِ حسن نہ تو حسین سے کلام کا اہل ہو اور نہ تاثرِ حسن کا مشابہ خلق کر لینے پر قادر ہو۔ مگر چاہتا ہو کہ حسین اس کے قبضے اور تصرف میں آ جائے۔ ایسی صورت میں عذاب ہی ایسے جذبے کا صحیح صلہ اور جزا ہے۔

لیکن دونوں صورتیں ممکن نہ ہوں تو یقین جانو کہ ایسے انسان کے لیے نظارہ حسن سے جو تاثرات پیدا ہوں گے وہ کبھی بھی عذاب یا دکھ کی صورت اختیار نہ کریں گے کیونکہ انسان، حسن اور مشہوداتِ حسن کا جو خالق ہے وہ رب بھی ہے اور رحیم و رحمٰن بھی۔''

بولتے بولتے نہ جانے کب متین صاحب کی آنکھیں بند ہو گئی تھیں۔ ان کا جسم ساکت تھا اور اطمینان اور طمانیت کا مظہر تھا۔ ان کے چہرے کو دیکھ کر احساس ہوتا تھا کہ وہ کسی الہامی صحیفے سے پڑھ کر سنا رہے تھے اور اس پر یقین نہ کرنا اپنے اوپر ظلم کرنے کے مترادف ہوگا۔

سنتے سنتے فردوس اپنی کرسی پر اس طرح نین موندے دراز ہو گئی تھی جیسے وہ بچہ جو کہانی سنتے سنتے ماں کے پہلو سے لگ نہ سونے کی بے دلی سے کوشش کر رہا ہو اور کبھی کبھی غنودگی کی حالت میں خواب دیکھتے دیکھتے منہ بناتا ہو۔ کہانی ختم ہو چکی تھی۔ خواب ختم ہو چکا تھا اور فردوس غنودگی میں تھی۔

تقی منہ کھولے ان کو تک رہا تھا۔ وہ کبھی کا آنکھیں جھپکنا بھول چکا تھا۔ وہ شاید کچھ پوچھنا چاہتا تھا اور نہیں پوچھ رہا تھا؛ اس کو احساس تھا کہ ذرا سا سوچنے سے اس کو اپنے سوال کا جواب مل جائے گا۔

عالمہ کے مطمئن چہرے پر تذبذب کی ننھی سی ایک بدلی منڈلا رہی تھی۔ وہ جو سوال کرنا چاہتی تھی اس کا جواب اس کے پاس تھا مگر وہی جواب وہ متین صاحب سے سننا چاہتی تھی۔

متین صاحب نے دھیرے سے آنکھیں کھولیں اور عالمہ کی طرف دیکھا۔ عالمہ کو نہ جانے کیوں محسوس ہوا کہ وہ اس کو دیکھ کر پیار سے مسکرا رہے ہیں حالانکہ اس کی آنکھوں نے اس کے اس احساس پر صاد نہ کیا تھا اس کے چہرے پر اطمینان اب پھوٹ رہا تھا۔ اس نے متین صاحب کی طرف منہ کر کے مگر نظریں جھکا کر سوال کر ہی ڈالا۔

''جب ایک شخص کو پوری سوچ سمجھ کے بعد یہ پتہ چل گیا ہو کہ فلاں اس کا سچا زوج ہے اور اس کو یہ نظر آئے کہ اس فلاں کو احساس نہیں کہ وہ اس کا زوج ہے حالانکہ وہ فلاں خود شناس بھی ہو اور خود اس کی شخصیت کے نہاں خانوں سے بھی واقف ہو تو ایسے شخص کو کیا کرنا چاہیے؟ انتظار؟ کس اصول کے برتے پر؟''

''ہر وہ دو انسان جن میں رشتۂ زوجین ہونا لابدی ہو تو ضروری ہے کہ وہ عالمین کے سفر میں ایک ہی مقام پر ہوں یا ایک ہی عالم میں تاکہ وہ ایک دوسرے کو زوجین کی حیثیت سے پہچان سکیں۔ جب ان میں سے ایک دوسرے کو نہ پہچانتا ہو تو دوسرے کے لیے لازم ہے کہ دونوں کے درمیان سفر کی منزلوں کا جو بُعد ہے اس کو جلد از جلد طے کر لے۔ اس کی دو صورتیں ہوں گی اگر وہ خود سفر میں آگے ہے تو اس بات کا بندوبست کرے کہ اس کا صحیح زوج اس کے قریب پہنچ سکے اور اگر پیچھے ہو تو خود ان منازل کو طے کر لے اور پھر پکارے۔''

تقی نے متین صاحب کی بات کو جو درحقیقت پوری ہو چکی تھی، کاٹتے ہوئے ان سے پوچھا:

''آپ یہاں سے کب اور کہاں جائیں گے۔''

''جب بلاوا آئے گا تب اور جہاں سے بلاوا آئے گا۔''

چاندنی مغربی کھڑکیوں سے کبھی کی واپس جا چکی تھی مگر لائبریری کے دروازے سے باہر صحن میں چاندنی کا سماں صاف نظر آتا تھا۔ چاندنی صحن کی جنوبی دیوار کی طرف رینگ رہی تھی۔ جب رینگتے رینگتے چاندنی دیوار پر چڑھ نیچے کود گئی تو صحن میں اندھیرا ہو گیا۔ اندھیرے سے سب چونکے اور کمرے سے باہر نکل کر ایک دوسرے کو الوداع کہہ اپنی اپنی خواب گاہوں کو روانہ ہوئے۔

پانچواں باب

اندھیرے اور خاموشی کی یلغار لحظہ بہ لحظہ بڑھتی ہی جا رہی تھی۔ اس کے دل میں جلتے ہوئے دیئے کی لو تھرتھرانے لگی۔ اس لو کو اس یلغار سے بچانے کی کوئی صورت نظر نہ آتی تھی۔ اس کے پپوٹے اندھیرے کے بوجھ سے بند ہونے لگے تھے، اس کے دماغ سے اندھیرے کے ریلے سے سب خیال بہہ گئے تھے-- اب وہاں کچھ نہ تھا، ہر طرف اندھیرے کا سمندر ٹھاٹھیں مارتا تھا۔ اس کا دم گھٹنے لگا۔ سانس لینا اس کے لیے تکلیف دہ ہونے لگا، عذاب بننے لگا۔ یہ عذاب اس کی برداشت کی حدود کو توڑنے لگا۔ اس کی سب کوششیں ناکام ہوا چاہتی تھیں کہ اس نے ایک آخری کوشش کرتے ہوئے اپنی منتشر ہوتی ہوئی قوت کو اکٹھا کیا اور اندھیرے کے بڑھتے طوفان کو، عذاب کی پھیلتی ہوئی آگ کو روکنے کے لیے ایک آخری حملہ کیا۔ طوفان کا ریلا، پھیلتی ہوئی آگ ایک لمحہ رکے مگر اس کی قوت پسپا ہونے لگی، منتشر ہونے لگی، بالآخر وہ اندھیرے کے ریلے اور آگ کے درمیان پس کے رہ گئی۔

اندھیرے اور آگ کے تصادم سے اس کے آفاق روشن ہونے لگے۔ روشنی ہر طرف سے اک مرکز کی طرف بڑھنے لگی۔ جوں جوں روشنی قریب آتی گئی آفاق پر تاریکی چھاتی گئی۔

یکا یک آگ بلندیوں کی طرف لپک گئی اور پستیوں پر اندھیرا ہی اندھیرا رہ گیا۔ آگ بلندیوں میں ایک نقطہ بن گئی۔ نقطہ پھیلنے لگا، قریب آنے لگا، قریب آتا ہی چلا گیا۔ پھر-- سورج بن گیا۔ سورج نیچے اترنے لگا اور اندھیرا کٹنے لگا۔ سورج اب بہت ہی قریب آ گیا، اندھیرا مٹ گیا، پستی کی سطح پر سبزہ اگنے لگا، سبزے میں پھول کھلے، پھولوں سے گلزار بنا، گلزار میں روشیں بنیں، روشیں گلزار سے نکل میدان میں چل نکلیں، میدان میں راہوں کا جال بن گیا، ان راہوں پر راہی چلنے پھرنے لگے اور ان راہوں پر آبادیاں، شہر آباد ہو گئے۔ سورج سے شہروں کی ہر شے روشن تھی۔ سورج نصف النہار پر تھا۔

عالمہ نے آنکھیں کھولیں۔ اس کے سینے پر بوجھ نہ تھا، اس کو سانس عذاب نہ تھا۔ اس کے کمرے میں بالکل اندھیرا، ہر طرف خاموشی ہی خاموشی تھی۔ اس کے دل کے دھڑکنے کی آواز اس کے کانوں تک پہنچ رہی تھی۔ آواز کا لحن اس کے کانوں کو بھلا لگنے لگا۔ وہ لحن میں کھو گئی، اب لحن کے سوا کچھ نہ تھا۔ لحن کی وادیوں میں وہ تنہا تھی۔ ان وادیوں میں کسی نے اس کو پکارا۔ اس نے کوشش کی کہ آواز کی سمت متعین کر سکے مگر آواز ہر سمت سے آتی معلوم ہوتی تھی۔ وہ کبھی اس اُور کبھی اُس اُور بھاگنے لگی۔ آواز واضح ہو رہی تھی، قریب ہو رہی تھی۔ اس آواز میں پیار چھپا تھا۔ وہ بھاگتے بھاگتے تھک گئی۔ وہ تھک کر، ہار کر، بیٹھ گئی۔

آواز اب بالکل اس کے قریب تھی، اس کے کانوں کے بالکل ہی قریب۔ اس نے کان لگا کر سنا...... اس کے اپنے ہی سینے سے آواز آ رہی تھی -- اس کے دل کی آواز تھی۔

''عالمہ تو تنہا ہے، بالکل تنہا۔ فردوس متین صاحب کو چاہتی ہے اور تقی فردوس کو چاہتا ہے۔ تو کس کو چاہتی ہے؟ متین صاحب کو؟ وہ تم کو چاہتے ہیں؟ وہ تو ہر دم فردوس کے ساتھ رہتے ہیں۔ کیوں؟ وہ تو کہتے تھے کہ فردوس کو تقی کی ضرورت ہے اور تقی کو فردوس کی۔ وہ دونوں ایک دوسرے کو کیوں نہیں پہچانتے کہ وہ ایک دوسرے کے ہیں؟ کیا متین صاحب صرف ایک پل ہیں؟ کیا وہ تمہارے لیے بھی پل ہی ہیں؟ نہیں! بالکل نہیں! تو پھر وہ تم کو کیوں نہیں پکارتے؟ وہ تمہاری پکار کیوں نہیں سنتے؟ کیا واقعی تو نے ان کو کبھی پکارا؟ نہیں! کیوں نہیں؟......''

عالمہ کو کیوں کا جواب نہ ملا۔ وہ سوچنے لگی کہ آخر اس نے کیوں نہیں ان کو پکارا۔ اس نے چاہا کہ وہ اندھیرے میں ان کو پکارے مگر اس کی پکارنے کی صلاحیت اس کے اندر کہیں چھپی سو رہی تھی۔ وہ اس کو ڈھونڈتی رہی مگر اس کو پا نہ سکی۔

وہ گھبرا گئی، گھبرا کر اٹھ بیٹھی۔ اس نے ہاتھ بڑھا کر پلنگ کے ساتھ رکھی ہوئی میز پر رکھے ہوئے ٹیبل لیمپ کو جلایا۔ لیمپ کی روشنی اس کے پاؤں، اس کی ٹانگوں اور اس کے گود میں رکھے ہوئے ہاتھوں پر پڑ رہی تھی۔ اس نے اپنے ہاتھوں کی طرف دیکھا: وہ سو رہے تھے۔ اس نے اپنے پاؤں کی طرف دیکھا تو وہ اس کی طرف سوالیہ انداز میں تک رہے تھے۔

وہ ان کی نظر کی تاب نہ لاسکی اور ان کو جوتی میں ڈال دیا۔اب جوتی کے سنہری نقش اس کو گھورنے لگے۔ وہ گھبرا کر اٹھ کھڑی ہوئی۔اس کے کندھوں میں سردی سرایت کرنے لگی۔ اس نے میز کے پاس رکھی ہوئی کرسی سے گرم چادر اٹھائی اور کندھوں کو اس میں چھپالیا۔مگر سردی برابر اس کے کندھوں سے سرایت کرتی رہی۔ وہ ٹہلنے لگی۔ وہ ٹہلتے ٹہلتے کمرے کے دروازے کے سامنے جا کر رک گئی۔اس کا ہاتھ دروازے کی چٹخنی پر جم گیا۔چٹخنی کھلنے کی آواز نے اس کو چونکا دیا۔

وہ اتنی رات گئے کہاں جانا چاہتی تھی، کس کو جگانا چاہتی تھی؟ فردوس کو؟ تقی کو؟ متین صاحب کو؟

''متین صاحب کو''اس کے دل نے جواب دیا۔

اس کے ہاتھوں نے دروازہ کھول دیا۔اس کے قدم دہلیز سے پار ہوئے۔گلی میں قدم رکھتے ہی اس کے جسم پر سرد سرد ہوا جھپٹی۔ وہ سردی سے کپکپا اٹھی۔اس نے سسکی بھری۔ وہ اپنے کمرے کو لوٹ جانے کو مڑنے لگی مگر اس کے قدم متین صاحب کے کمرے کی طرف بڑھتے گئے۔ ان کے کمرے کے سامنے پہنچ کر اس کے قدم رکے۔ اس کے ہاتھوں نے دروازے کو دھکیلا، پٹ کھل گئے۔اندر کمرے میں دھند لکے کا سماں تھا۔اس دھند لکے سے آواز آئی:

''اندر آجاؤ اور پٹ لگا دو۔''

آواز نے اس کو چونکا دیا اور وہ قدم اٹھاتے اٹھاتے رک گئی۔اس کے دماغ سے ایک گرم گرم لہر اٹھی اور اس کے سا تھ جسم میں گھوم گئی۔اس نے محسوس کیا کہ اس کے چہرے سے، اس کے جسم سے آگ نکلنے لگی ہے، وہ اپنے آپ پر قابو پانے کی کوشش کرنے لگی۔ دھند لکے سے پھر آواز آئی:

''پٹ بند کر دو، کمرے میں سرد سرد ہوا داخل ہو رہی ہے۔ مجھے سردی لگ رہی ہے۔''

''میں آگ بن گئی ہوں۔ متین صاحب کو سردی لگ رہی ہے۔ ان کو آگ کی ضرورت ہے۔''

عالمہ کے قدموں نے دہلیز پار کی اور اس کے ہاتھوں نے پٹ بند کر دیئے۔ چٹخنی لگنے کی آواز سے وہ ایک بار پھر چونکی اور چونکتے ہی وہ مڑی، اس کے قدم ڈگمگائے۔ اس نے سہارے کے لیے دروازے سے ٹیک لگا دی۔

''اس کرسی پر بیٹھ جاؤ۔''

عالمہ نے کمرے کے چاروں طرف دیکھا۔ ایک کونے میں ایک میز پر لیمپ جل رہا تھا۔ لیمپ کے سامنے ایک کرسی پر متین صاحب کرسی کی پشت پر سر رکھے دراز تھے۔ لیمپ کی روشنی ان کے چہرے پر پڑ رہی تھی۔ جہاں عالمہ کھڑی تھی وہاں سے صرف ان کی دمکتی ہوئی پیشانی، ان کی ناک اور ان کی آنکھ نظر آتی تھی۔ ان کی آنکھ بند تھی۔

اس کے قدم ان کی میز کے پاس پڑی خالی کرسی کے قریب جا کر رک گئے۔

''بیٹھ جاؤ۔''

وہ بیٹھ گئی۔ لیمپ کی روشنی سے اس کے جسم میں گرمی جاگنے لگی۔ اس نے متین صاحب کو دیکھا۔ ان کی منور پیشانی کے سایوں میں ان کی آنکھیں کھل رہی تھیں۔ ان کی آنکھیں بالکل کھل چکی تھیں۔ ان کی آنکھیں روشن تھیں۔ ان کی آنکھوں سے روشنی ابل رہی تھی۔ اس نے لیمپ کی طرف دیکھا اور پھر ان کے چہرے کی طرف۔ اس کو لگا کہ لیمپ میں روشنی ان کی آنکھوں کی روشنی سے تھی۔ روشنی سے اس کو گرمی لگنے لگی۔ اس نے شانوں سے چادر کے پلو اتار دیئے اور چادر کو آگے سے کھول دیا مگر گرمی کی شدت میں کمی نہ ہوئی۔ اس نے شانوں سے چادر گرا دی مگر اس کے ماتھے پر، اس کی گردن پر پسینہ آ گیا تھا۔

متین صاحب کی آنکھیں اگرچہ کھلی تھیں مگر ان کی نظر کہیں بہت دور کسی کو ڈھونڈ رہی تھی۔ ان کی پتلیوں سے ابلتی روشنی تیز ہوتی جا رہی تھی اور اس سے لیمپ کی روشنی میں گرمی کی شدت بڑھتی جا رہی تھی۔ اس کا چہرہ دہکنے لگا تھا، اس کی گردن سے انگارے اس کی ریڑھ کی ہڈی کے ساتھ ساتھ لڑھکنے لگے، اس کا بدن جلنے لگا، اس کے پپوٹے آنکھوں سے نکلتی ہوئی گرمی سے جلنے لگے، اس کا لباس تپتی ہوئی زرہ بن گیا۔

متین صاحب نے لیمپ بجھا دیا۔ کمرے میں تاریکی چھا گئی۔ تاریکی سے خنکی نے جنم

لیا۔ عالمہ نے چادر سے اپنے آپ کو لپیٹ لیا۔

''میں سونے کے لیے لیٹا تو مجھے یوں لگا کہ کوئی مجھے کہیں دور سے پکار رہا ہے۔ میں اٹھنے لگا تو نیند نے غلبہ کیا اور میری آنکھیں بند ہوگئیں۔ مگر سو نہیں سکا۔ پکارنے کی آواز مسلسل آتی چلی گئی۔ قریب ہوتی گئی۔ اتنی قریب ہوگئی کہ جیسے کوئی کان کے ساتھ منہ لگائے دھیرے سے میرا نام لے رہا ہو۔ میں جاگا۔ آواز آتی رہی میں اٹھا تو بھی آواز آتی رہی۔ میں پلنگ سے اٹھ کھڑا ہوا۔ آواز مجھ سے لپٹنے لگی۔ میں آواز کی سمت چلنے لگا۔ آواز اس میز کے پاس آ کر رک گئی۔ میں نے لیمپ جلایا۔ کوئی نہ تھا۔ آواز خاموش ہوگئی۔ میں نے سننے کی بہت کوشش کی مگر آواز سوگئی تھی یا چلی گئی تھی۔ میں بالکل جاگ اٹھا تھا، نیند کوسوں دور چلی گئی تھی۔ میں یہاں بیٹھا نیند کو چمکارتا رہا مگر نیند مجھ سے دور بھاگتی گئی۔ میں تھک کر اس میز پر بانہوں پر سر رکھے سونے کی کوشش کرنے لگا۔

یکا یک کہیں قریب سے سسکی کی آواز آئی اور پھر وہی آواز میری طرف بڑھنے لگی۔ اس آواز میں اب پکار کی کیفیت نہ تھی بلکہ کسی کے آہستہ آہستہ چلنے کی چاپ تھی۔ چاپ قریب آتی گئی۔ میرے دروازے پر آ کر رکی۔ ایک دم ٹھنڈی ہوا نے مجھے چاروں طرف سے گھیر لیا۔ چاپ ایک بار پھر میری طرف بڑھنے لگی۔ ٹھنڈی ہوا کا گھیرا تنگ ہونے لگا۔ مجھے سردی لگنے لگی۔ میں پیچھے مڑ کر دیکھنا چاہتا تھا مگر بدن میں سکت ہی نہ تھی۔ میں نے پکارنا چاہا کہ کون، مگر آواز حلق میں ہی گم ہوگئی۔ پھر تم اس کرسی پر بیٹھ گئیں۔ میں اس سارے واقعے سے بالکل حیران تھا۔ میں نے سمجھا کہ لیمپ کی تیز روشنی نے میرے واہمہ کو جسم دے دیا ہے۔ میں نے اسی لیے لیمپ بجھا دیا مگر مجھے تمہارا سانس صاف سنائی دیتا ہے۔ مجھے یقین ہے کہ اگر میں ہاتھ بڑھاؤں تو تم کو چھو سکتا ہوں۔''

ہاتھ لگتے ہی اس کا سارا بدن درد سے جھنجھنا اٹھا۔ اس کے سارے بدن میں شدید درد تھا وہ اس احساس سے کراہی۔

''تم واقعی ہو۔ وہ آواز واہمہ نہ تھی، تمہاری صورت واہمہ نہ تھی۔''

عالمہ کے بدن میں درد بڑھتا رہا اور ناقابلِ برداشت ہوگیا۔ اس پر قابو پانے کی ہر

کوشش ناکام ہوگئی۔اس کا جی چاہنے لگا کہ وہ دھاڑیں مار مار کر روئے کہ اس کا درد کم ہو۔ اس کے پیٹ سے ایک مروڑ اٹھا اور اس کے حلق کو چیرتا ہوا اس کے لبوں پر آ کر رکا۔اس کے لب کھلے اور اس نے سنا: ''آپ کے آنے سے پہلے میں سکھی تو نہ تھی مگر میں اپنے دکھ سے مطمئن تھی۔گاؤں کی ہر شے میرا دکھ بٹاتی تھی۔تقی بھیا آتے تھے تو میں سب دکھ بھول جاتی تھی۔ان کی نگاہیں فضا میں سفر کرتے ہوئے بھی میرے آس پاس رہتی تھیں مگر اب یہ نظریں مجھ سے بہت دور ہوگئیں ہیں۔گاؤں کی ہر شے مجھ سے بیگانہ ہوگئی ہے۔یہاں کی ہوا، یہاں کے چاند ستارے، یہاں کے پھول، یہاں کے گیت، یہاں کے پرندوں کی چہچہاہٹ، یہاں کے دن رات، سب کے سب اب آپ کے قدموں کی چاپ میں گم ہوگئے ہیں۔جہاں آپ کی چاپ سنائی دیتی ہے وہاں سب کچھ فردوس کے رنگ روپ میں حل ہوتا نظر آتا ہے۔حتیٰ کہ تقی بھیا کی آنکھوں میں بھی اسی کا رنگ روپ ہر دم چھایا رہتا ہے۔وہ ہر دم اداس رہتے ہیں۔میں نے ان کو کبھی اداس نہ دیکھا تھا۔ان کی چال میں پہلے ایک پر یقین لہک تھی؛اب اس چال میں لہک تو ہے مگر یقین نہیں۔

مجھے اس سب نے بالکل پریشان کر دیا ہے۔آپ یہاں کیوں آئے؟ میرا سب کچھ آپ نے کیوں چھین لیا؟ اب آپ چلے بھی جائیں تو ہر شے پر آپ کی ملاقات کے نشانات موجود رہیں گے۔سورج آپ ہی کو ایک افق سے دوسرے افق تک ڈھونڈتا پھرے گا، یہ چاند، یہ چاندنی، صرف آپ کے لیے ہی رقصاں ہوگی، پرندوں کی چہچہاہٹ آپ کو ہی رجھانے کو ہوگی، یہ ہوا اب آپ ہی کو پکارتی پھرے گی۔

آپ اس سب کو لے کر کیا کریں گے۔کس کے لیے یہ سب کچھ اکٹھا کر رہے ہیں۔ آخر وہ کون ہے؟ کس کے رجھانے کو آپ سب کچھ لوٹ رہے ہیں؟ بولیے! جواب دیجئے!''

''میں نے کچھ نہیں لوٹا۔میں نے کسی سے کچھ نہیں چھینا۔بلکہ میرے پاس جو کچھ تھا وہ یہاں لٹ گیا ہے۔میرے پاس کچھ نہیں۔''

''آپ کے پاس کچھ نہیں۔میرا سب کچھ لٹ گیا۔تقی بھیا سے سب کچھ چھن گیا۔

آخر کس نے یہ سب کچھ لوٹ لیا۔ فردوس نے؟ نہیں وہ بھی بیچاری لٹی لٹائی پھرتی ہے۔

آخر یہ لوٹ کیوں۔

ہم سب یوں لگتا ہے کہ ایک چوٹی پر کھڑے ہیں اور وہاں سے ہر طرف ہزاروں رستے پھوٹتے ہیں اور دور افق سے سورج نکل رہا ہے۔ اس کی گرمی سے چوٹی پر حبس ہو رہا ہے اور وہاں سے چل پڑنا لازمی ہے۔ مگر کون کس رستے پر نکلے اور اگر نکل پڑے تو کہاں پہنچے اور کب؟ ان طویل راہوں پر زادِراہ کے بغیر تو دم نکل جائے گا۔

آپ ہی بتائیے کہ زادِراہ کہاں سے لائیں۔

میں زادراہ کہاں سے لاؤں۔ میں اس زمین و آسماں کے درمیان، اس ساری کائنات میں، بالکل بے گھر ہو گئی ہوں۔ میں تنہا ہوں۔ دور دور تک کوئی نہیں۔ کہاں جاؤں؟''

''ہمارے دور میں کون ہے جو کائنات میں بے گھر نہیں، تنہا نہیں، اجنبی راہوں میں، اجنبی دیسوں کی طرف مہاجر نہیں۔ کوئی نہیں جانتا کہ پناہ کہاں ملے گی۔

تمہیں اگر یہ احساس ہو گیا تو کوئی ظلم نہیں ہوا اور اس کا ذمے دار اگر میں ہی ہوں تو مجھے یہ ذمے داری قبول کرنے سے انکار نہیں۔ مگر تمہیں کبھی نہ بھولنا چاہیے کہ انسان اسی وقت سے اس کائنات میں بے گھر ہے جب سے وہ جنت سے نکلا۔ سانپ آج بھی اس کے ساتھ ساتھ لگا ہے۔ انسان کی راہ میں سانپ پھن پھیلائے کھڑا ہے۔ اس کے منہ سے تیز اور تند ہوائیں فضا میں گردباد بنا رہی ہیں۔ جو بھی اس گردباد میں پھنس گیا وہ راہ سے بھٹک گیا۔

تمہیں، مجھے، تقی، فردوس اور ہر انسان کو اس سانپ کا سامنا کرنا ہی ہوگا۔ اس کے ساتھ یُدھ کرنا ہی ہوگا۔ اس کے جبڑوں کو چیر پھاڑ نا ہوگا۔ اس کے زہر سے جسم جلے گا، جسم میں درد رچ جائے گا۔ جو بھی اس زہر کو نکالنے کے لیے رکا وہ پھر نہ چلا۔

تمہیں بھی اس درد کی پروا نہ کرتے ہوئے اجنبی راہوں پر اجنبی دیسوں کی اُور چلتے ہی جانا چاہیے۔ چلتے رہنے سے زہر خود بخود جسم سے خارج ہو جائے گا۔

انہی راہوں پر تمہیں کوئی راہی ایسا ملے گا جو تمہارے سفر میں تمہارا مدام کا ساتھی ہوگا۔ اس ساتھی کو دیکھتے ہی پہچان نہ سکو گی۔ اس سے تمہیں مل مل کر جدا ہونا ہوگا۔ جدا ہو ہو کر ملنا ہوگا۔

ان راہوں پر چلتے چلتے ایک مقام ایسا بھی آئے گا جہاں سورج، چاند اور ستارے سب کے سب بیک وقت نظر آئیں گے۔ ایسے میں جس سے بھی ملو گی وہی تمہارا زوج ہوگا۔''

متین صاحب چپ ہوگئے مگر عالمہ کے کانوں میں ان کی آواز دیر تک گونجتی رہی۔ اس نے دیکھا کہ جس اجنبی راستے پر وہ چل رہی تھی وہاں دونوں طرف سایہ دار درخت اگ آئے ہیں اور ہر صدراہے پر پہنچتے ہی سب رستے اندھیرے میں گم ہو جاتے ہیں اور صرف ایک رستہ روشن رہ جاتا ہے وہ ان روشن روشن رستوں پر سے چلتے چلتے ایک ایسے رستے پر پہنچ گئی جو فضا میں بلندیوں کی طرف جاتا تھا۔ وہ اس رستہ پر چڑھنے لگی۔ رستہ بل کھاتا رہا اور اس کے ساتھ ساتھ بلند ہوتی گئی۔ وہ تھک جاتی تو رکتی مگر رکتے ہی اس کے پاؤں پھسلنے لگتے اور وہ رستہ کے دونوں طرف کے اندھیرے کی طرف لڑھک جاتی۔ وہ اپنے آپ کو مشکل سے سنبھالتی، چڑھتی رہی۔

چڑھتے چڑھتے ایک موڑ مڑتے ہی اس کی آنکھیں روشنی سے چندھیا گئیں۔ روشنی کی عادی ہونے کے بعد اس نے دیکھا کہ ایک شہر ہے جس میں ہر شے سورج کی کرنوں سے بنی ہے۔ اس کی جگمگاہٹ پر نظر نہ ٹھہرتی تھی۔ وہ دم بخود اس کو دیکھنے لگی۔ وہ شہر اس سے دور ہوتا جارہا تھا۔ اس نے پاؤں کی طرف دیکھا تو وہ پھسلی جارہی تھی۔ اس نے بہت کوشش کی مگر اس کے پاؤں نہ جم سکے۔ وہ گرتی رہی، روشن رستے اس سے دور ہوتے گئے......''

عالمہ کی کرسی کے پیچھے سے روشن کرنیں اس کے سر کے گرد سنہری جال بنتے ہوئے چھت کے اندھیرے کو سنہری دھندلکے میں بدل رہی تھیں۔ اس نے مڑ کر دیکھا تو اس کے پیچھے کھڑکیوں کے شیشوں سے صبح کی پہلی کرنیں داخل ہو رہی تھیں مگر ابھی سورج ان کھڑکیوں سے نظر نہ آتا تھا۔

اس نے متین صاحب کی طرف دیکھا وہ میز پر بانہیں رکھے سو رہے تھے۔ ان کے سر کے بالوں میں ایک آدھ کرن کھیل رہی تھی۔ اس نے ان کو پکارا مگر کوئی جواب نہ ملا۔ وہ دبے پاؤں کرسی سے اٹھ کر دروازے کی طرف بڑھی اور چٹخنی کھول کر باہر گلی میں نکل گئی۔

گلی میں ابھی اندھیرا تھا۔ ہوا میں خنکی تھی۔ اس نے فردوس کے کمرے کی طرف دیکھا تو پٹ بند تھے۔ اس نے تقی کے کمرے کی طرف نگاہ کی تو پٹ کھلے تھے۔ اس نے ایک لمحے کے لیے چاہا کہ وہ اندر جھانک کر دیکھے۔ لیکن اس نے ارادہ بدل لیا اور اپنے کمرے کی طرف بڑھی۔ اس کے کمرے کے پٹ کھلے تھے۔ دہلیز کے قریب پہنچ کر اس نے دیکھا کہ دروازے کے اندر کے پردوں میں چمک تھی۔ اس کا لیمپ جل رہا تھا۔ کون تھا اس کے کمرے میں؟ یہ سوال ذہن میں آتے ہی وہ مسکرائی۔ وہ خود ہی تو لیمپ کو جلتے چھوڑ گئی تھی۔

وہ کمرے میں داخل ہوئی۔ وہ پردہ اٹھا اپنے پلنگ کی طرف بڑھی۔ کمرے کے درمیان کوئی کھڑا تھا، مبہوت وہ ایک لمحہ کے لیے ٹھٹکی اور پھر اس نے تقی کو پہچان لیا۔

تقی اس کی طرف مڑا۔ اس کے چہرے پر زردیاں چھائی تھیں۔ اس نے اس کے پاؤں سے سر تک نہایت آہستہ سے نظریں اٹھائیں۔ ان کی آنکھیں چار ہوئیں۔ تقی کے چہرے پر سرخیاں دوڑ گئیں اور اس کا چہرہ اندھیرے میں دمکنے لگا اور وہ دوڑ کر عالمہ کے قدموں میں جھک گیا۔

''میں نے تم پر شک کیا اور جہنم کی آگ میں جلتا رہا۔ مجھے معاف کر دو۔''

عالمہ نے جھک کر تقی کے سر پر دھیرے سے ہاتھ پھیرا اور دونوں ہاتھ اس کے شانوں پر رکھ دیئے۔ تقی ہاتھ لگتے ہی عالمہ کے گھٹنوں میں سر دے کر زار زار رونے لگا۔

''آؤ اب گھر چلیں۔ رات بہت لمبی تھی۔

تقی اٹھا۔ عالمہ نے قمیص کے کف کے چاک سے رومال نکال کر اس کے آنسو پونچھے اور پھر اس کے دائیں کندھے پر دایاں ہاتھ رکھ اس کو آہستہ سے جھٹکا دیا۔ وہ بھی عالمہ کے ساتھ قدم اٹھانے لگا۔ دونوں کمرے سے نکل گلی میں آئے۔ گلی کی چھت کے روشن دان کے شیشے چمکنے لگے تھے۔

دونوں نے متین صاحب کے کمرے کی طرف دیکھا۔

دروازے کے پھڑ پھڑاتے ہوئے پردوں پر تھرکتی ہوئی کرنوں کے درمیان سر کا عکس ناچ رہا تھا۔ اس سر کو دیکھ کر دونوں نے ایک دوسرے کی طرف دیکھا، مسکرا دیئے اور تیز تیز قدم اٹھاتے گلی سے باہر نکل گئے۔

چھٹا باب

فردوس آنکھ کھلتے ہی ایک دم اٹھ کر بیٹھ گئی۔ وہ حیران تھی کہ رات کی گفتگو کے بعد اس کو کس طرح نیند آ گئی۔ اس کے ذہن میں کوندا کہ وہ ایک شہزادہ ہے جس کو اس کے ساتھی چھوڑ جہاز لے کر دیس کو روانہ ہو گئے ہیں۔ یہ خیال آتے ہی اس کے ذہن میں منظر ابھرنے لگے:

ایک جزیرہ ہے۔ اس میں اونچے اونچے درختوں کے درمیان گلزار کھلے ہیں۔ ان گلزاروں سے دور پہاڑ کی چوٹی پر ایک محل ہے سنگ مرمر کا جو ڈوبتے سورج کی کرنوں سے دمک رہا ہے۔ اس محل کے اندر ہر کمرے میں آرائش کا سامان سلیقے سے لگا ہے۔ کسی کمرے میں کوئی نہیں۔ محل کے آخری کمرے میں ایک پلنگ پر ایک شہزادہ سو رہا ہے۔ پلنگ کے سامنے کی جالی دار دیوار میں سے سورج کی کرنیں داخل ہو رہی ہیں۔ ایک شوخ کرن دوڑ کر پلنگ پر چڑھ گئی اور شہزادے کی پلکوں میں گدگدی کرنے لگی۔ سونے والے نے پہلو بدلا اور آنکھیں کھول دیں۔ کچھ دیر یونہی بیٹھا رہا جیسے کہ کسی آواز پر کان دھرے ہو۔ پھر جیسے کوئی آواز نہ سن کر گھبرا کر اٹھا۔ اس نے دیوار کی جالی سے جھانکا، سبز پانیوں پر دور ایک بادبان دکھائی دیا اور پھر نظر سے اوجھل ہو گیا۔ شہزادہ مڑا اور کمرے سے بھاگا۔ ہر کمرے میں کسی کو پکارتا محل سے باہر ایک گلزار میں نکل آیا۔ اس کے خوبصورت پھولوں کو دیکھ کر وہ سب کچھ بھول گیا اور ان پھولوں کو دیکھتا دیکھتا ایک کنج میں جا نکلا۔ اس کنج میں ایک چشمہ ابل رہا تھا۔ چشمے کا پانی پھولوں سے لدے پھندے پودوں کے درمیان نہر کی صورت میں بہہ رہا

تھا۔ اس نہر کے ایک موڑ پر پھولوں کے سایہ میں کوئی سو رہا تھا۔ وہ اس سونے والے کی طرف بڑھا مگر سورج ڈوب گیا اور ہر طرف اندھیرا چھا گیا۔ وہ اندھیرے میں سونے والے کی سمت بڑھتا رہا، دھیرے دھیرے، دبے دبے۔

رستہ ہر قدم کے ساتھ لمبا ہوتا رہا۔ وہ تھک کر رک گیا۔ یکا یک اس کے سامنے سے پورا چاند نکل آیا۔ اس کی روشنی میں اس نے دور تک نگاہ کی مگر وہاں نہ وہ پودا تھا نہ کوئی سونے والا۔ وہ حیران کھڑا چاند کو دیکھتا رہا۔

ایک دم اس کے پیچھے سے گھٹی ہوئی چیخ فضا میں پھڑ پھڑائی۔ وہ مڑا۔ اس کے پیچھے اس کے سایہ میں پھولوں کے درمیان ایک خوف زدہ عورت منہ پر ہاتھ رکھی بیٹھی تھی۔ اس کے مڑتے ہی اس عورت نے سسکی بھری۔ وہ چاندنی کی راہ سے ہٹ گیا۔ اب چاندنی اس عورت کے بدن پر تھی، شہزادے کے منہ پر تھی۔ وہ عورت کی طرف بڑھا اور اس نے پکارا۔ عورت آواز سن کر سر اٹھاتے ہوئے بولی۔

''تم آ گئے۔ تم نہ آتے تو نہ جانے کتنی صدیاں سوتی رہتی......''

فردوس چونکی۔ یہ آواز خود اس کی تھی۔ وہ سوچنے لگی کہ وہ شہزادہ کون تھا۔ 'شہزادہ' کے لفظ کے ذہن میں آتے ہی وہ دل ہی دل میں مسکرائی کہ اس کے خیالات بچوں کی طرح اب بھی رومانٹک تھے۔

اس نے انگڑائی لی۔ چھت کے روشن دان کے شیشے سرخ ہو رہے تھے۔ ''دن چڑھ آیا ہے۔'' اس نے سوچا۔ اس نے لحاف اتار دیا اور کرسی سے گرم گاؤن اٹھایا اور سلیپر پہن کر اٹھ کھڑی ہوئی۔ اس نے گاؤن پہن کر اس کی ریشمی ڈوری کو پیٹ پر گرہ دی اور غسلخانے میں چلی گئی۔ دانت کے برش پر پیسٹ لگایا اور دانتوں کو برش کرنے لگی۔ برش کرتے کرتے وہ رکی۔ اس نے سننے کے لیے کان لگائے۔ ہر طرف خاموشی تھی۔ آج دن چڑھے تک سب کیوں سو رہے ہیں۔ شاید رات دیر سے سوئے تھے؟ مگر خاموشی بہت ہی گہری تھی۔ سب کے سب اٹھ کر کہیں چلے گئے ہیں؟ شاید رات کو ہی چلے گئے ہوں؟ مگر کیوں؟

فردوس نے اپنے آپ کو تسلی دی کہ ایسا کیسے ہو سکتا ہے۔ وہ مطمئن ہو گئی۔ اس نے

دوبارہ برش کرنا شروع کیا۔ نلکا کھولا اس کے شور سے وہ ڈری۔ اس نے ہاتھ میں پانی لے کر کلی کی، غرارہ کیا، پھر پانی لے کر منہ صاف کیا۔ منہ پر صابن لگایا۔ منہ دھویا۔ نلکا بند کیا۔ شور خاموشی میں گم ہوگیا۔ خاموشی اس کو بری لگنے لگی، وہ خاموشی سے گھبرانے لگی۔ اس کا جی چاہا کہ سب کو جھنجھوڑ جھنجھوڑ کر اٹھا دے۔

اس ارادے سے باہر نکلی۔ تقی کے کمرے کے پٹ کھلے تھے۔ وہاں اندھیرا تھا۔ اس نے اس کو پکارا۔ اس کی آواز گونجی اور لوٹ آئی۔ اس نے پھر پکارا مگر کوئی جواب نہ ملا۔ وہ کمرے میں داخل ہوئی، لیمپ جلایا۔ بستر کو دیکھا۔ الجھے ہوئے بستر پر کوئی نہ تھا۔ وہ وہاں سے نکل کر عالمہ کے کمرے کی طرف بڑھی۔ دروازہ کھلا تھا، دروزے کے پردوں کے ساتھ کان لگا کر کھڑی ہوگئی۔ کمرے میں کامل سکوت تھا۔ اس نے پردہ ذرا سا ہٹا کر جھانکا۔ کمرے میں کوئی نہ تھا مگر میز پر لیمپ جل رہا تھا۔ بستر پر لحاف اس طرح الجھا ہوا تھا ایسے کوئی ابھی ابھی اٹھ کر گیا ہو۔

اس کا شک یقین میں بدلنے لگا کہ سب کے سب چلے گئے ہیں۔ وہ کمرے سے نکلی اور متین صاحب کے کمرے کی طرف بڑھی۔ ان کا دروازہ بھی کھلا تھا۔ اسے اب یقین ہوگیا کہ وہ بھی ان دونوں کے ساتھ چلے گئے ہیں۔ وہ لوٹنے لگی تو اس کی نظر دروازے کے پردوں پر تھرکتے ہوئے انسانی سر کے عکس پر پڑی۔ وہ ٹھٹکی اور پھر ایک دم کمرے میں داخل ہوگئی۔ پردہ اٹھا کر اس نے اندر جھانکا۔ پلنگ پر متین صاحب نہ تھے۔ ان کے بستر پر لحاف پائنتی پر تہہ کئے رکھا تھا۔ پلنگ کے مشرقی پایوں تک دھوپ آ چکی تھی۔ اس نے مشرقی کھڑکیوں کی طرف دیکھا تو کھڑکیوں کے سامنے والی میز کے سامنے والی کرسی پر کوئی بانہوں پر سر رکھے بیٹھا تھا۔ وہ دبے دبے کرسی کی طرف گئی۔ متین صاحب تھے۔ اس نے ان کو پکارا مگر متین صاحب کے جسم میں جنبش تک نہ ہوئی۔ وہ ان کو ہاتھ سے چھونا چاہتی تھی۔ مگر ان کے جسم کے سکون کو دیکھ کر اس کا دل نہ چاہا کہ ان کو اٹھا دے۔ وہ ان کے پاس پڑی ہوئی کرسی پر بیٹھ گئی اور ان کی طرف ٹکٹکی باندھے دیکھنے لگی۔ ان کے جسم میں کوئی جنبش نہ ہوئی۔ اس نے غور سے دیکھا تو ان کے شانے ابھرتے ڈھلکتے تھے۔ اس کو اطمینان ہوا کہ وہ سو رہے

تھے۔ یوں بیٹھے بیٹھے اس کو اونگھ آ گئی۔ اس نے کرسی کی پٹی سے سر لگا کر آنکھیں بند کر لیں۔ وہ نہ جانے کب تک سوتی رہی۔ سوتے سوتے اس کو گرمی لگی اور اس کی آنکھیں کھل گئیں۔ اس کے چہرے پر سورج کی کرنیں پڑ رہی تھیں۔ ان کرنوں میں کافی گرمی تھی۔ اس کو آنکھوں کے سامنے کرنوں کے سوا کچھ نظر نہ آیا۔ اس نے کرسی کی پٹی سے سر اٹھایا اور اکڑوں بیٹھ گئی۔ متین صاحب والی کرسی میں متین صاحب نہ تھے۔ وہ گھبرا کر ایک دم اٹھ کھڑی ہوئی۔ اس کے اٹھنے سے کرسی اپنی جگہ سے سرکی اور اس کے سرکنے سے ایک آواز پیدا ہوئی۔

وہ ان کی کرسی کی طرف بڑھی۔ روشنی سے اس کی نیم بیدار آنکھیں ابھی پوری طرح سے آشنا نہ ہوئی تھیں۔ اس کو ٹھوکر لگی۔ اس نے سنبھلنے کے لیے متین صاحب کی کرسی کی طرف ہاتھ بڑھایا۔ کرسی کی پشت پر اس کا ہاتھ زور سے پڑا اور کرسی گر گئی۔ اس کے گرنے سے ایک دھماکہ ہوا اور اس کے دل کو دھچکا سا لگا۔ ڈر کے مارے اس کا سارا جسم ٹھنڈا ہو گیا۔

''کیا ہوا؟''

متین صاحب کی آواز سن کر اس کے جسم میں ایک حرارت پیدا ہوئی۔ اس نے جواب دینا چاہا مگر اس کی آواز نہ نکلی۔ اس کی آنکھیں اب روشنی سے آشنا ہو رہی تھیں۔ اس نے دیکھا کہ کمرے میں کوئی نہ تھا۔ اس نے گھبرا کر ادھر ادھر نظر دوڑائی۔

''کیا ہوا؟ تم گھبرائی ہوئی کیوں ہو؟ میں یہاں ہوں۔ غسل خانے کے دروازے میں۔''

فردوس نے آواز کی سمت دیکھا اور پکار اٹھی۔

''تقی اور عالمہ نہ جانے کہاں چلے گئے ہیں۔''

''گھر گئے ہوں گے۔ اس میں پریشانی کی کیا بات ہے اب وہ شاید سب کے ساتھ ہی آئیں گے...... تم کب سے اس کمرے میں ہو؟''

''دن چڑھے آئی تھی۔ آپ سو رہے تھے۔ میں اس کرسی پر بیٹھ گئی اور بیٹھتے ہی اونگھنے لگی اور پھر سو گئی......''

''ہوں''

ان کی 'ہوں' میں تعجب کی کیفیت تھی۔ وہ حیران ہوئی کہ آخر اس کی باتوں پر تعجب کیوں۔اس نے ان سے سوال کر ہی ڈالا۔

''آپ کو میرے کہے کا یقین نہیں؟ ایسا......''

متین صاحب نے اس کی بات کاٹ دی۔

''نہیں! ایسا نہیں۔ مجھے جاگنے سے پہلے یقین تھا کہ اس کرسی پر کوئی اور بیٹھا تھا۔ میں نے اس سے بہت سی باتیں کیں۔ جب میں جاگا تو تمہیں کرسی پر سوتا دیکھ کر مجھے خیال آیا کہ میں نے رات باتیں کس سے کی تھیں۔تم تو نہ تھیں۔مگر اس کرسی پر تم اس طرح سو رہی تھیں جیسے تمہیں سوئے ہوئے دیر ہوگئی تھی۔ میں اٹھنے سے اب تک اس الجھن میں تھا کہ میں نے باتیں کس سے کی تھیں۔اب مجھے یہ بھی شک ہونے لگا ہے کہ میں نے باتیں کی بھی تھیں یا خواب دیکھا تھا۔؟''

''آپ کی بات سے مجھے یاد آتا ہے کہ جیسے میں نے نیند میں کسی کو کراہتے سنا اور اس کے کچھ دیر بعد کسی نے کہا:

......ہاں یاد آیا......'تمہاری صورت نہ تھی' نہیں! یوں نہ تھا۔'تمہاری صوت، واہمہ نہ تھی' ہاں! یہی! بالکل یہی۔''

''واقعی''

''جی ہاں......وہ آواز میرے کانوں میں اب بھی آرہی ہے...... ہیں؟ یہ تو آپ کی آواز ہے؟ کیا آپ نے یہ فقرہ بولا تھا؟''

''تو یہ سب خواب نہ تھا؟ واہمہ نہ تھا؟'' متین صاحب بڑبڑائے۔

''کیا کہا آپ نے''

''کچھ نہیں۔''

فردوس کو یقین تھا کہ متین صاحب نے کچھ کہا ہے جس کو وہ چھپا رہے تھے۔ وہ سوچنے

لگی کہ آخر ان کے کمرے میں کون آ سکتا تھا؟ تقی؟ عالمہ؟ لیکن کیوں؟ اگر تقی تھا تو اس کی آمد کو چھپانے کی کیا ضرورت ہو سکتی ہے؟ عالمہ اگر آئی تھی تو ان کو یہ کہنے کی کیا ضرورت ہو سکتی تھی کہ 'تمہاری صورت واہمہ نہ تھی' جو بھی ان کے کمرے میں آیا تھا وہ کراہا کیوں؟

وہ اس راز کو نہ پا سکی۔ اس نے شکایت آمیز نظروں سے متین صاحب کی طرف دیکھا۔ وہ کسی دھیان میں کھوئے تھے۔ اس نے مڑ کر کرسی کی طرف دیکھا جیسے کرسی ہی اس کو بتا دے گی کہ اس سے پہلے اس پر کون بیٹھا تھا۔ اس کا جی چاہا کہ وہ متین صاحب سے پوچھ ہی لے کہ عالمہ ان کے کمرے میں آئی تھی۔ مگر اس نے سوچا کہ اگر متین صاحب نے اثبات میں جواب دیا تو اس کا اپنا ردعمل کیا ہوگا۔ اس خیال سے دل پر چوٹ لگی۔ اس کو اب بالکل یقین ہو گیا کہ عالمہ ہی ان کے کمرے میں آئی تھی۔ اس لیے تو وہ اس سے چھپا رہے تھے۔ شاید وہ جانتے تھے کہ یہ جان کر مجھے دکھ ہوگا......

ان کو کیسے یہ احساس ہے کہ مجھے عالمہ کے ان کے کمرے میں آنے سے دکھ ہو سکتا ہے؟ کیا عالمہ بھی ان کو چاہتی ہے؟ کیا متین صاحب بھی اس کو چاہتے ہیں؟ اگر ایسا ہے تو وہ اس سے ملتے کیوں نہیں۔ ان کا اکثر وقت تو میرے ساتھ کٹتا رہا۔ اگر وہ عالمہ کو نہیں چاہتے تو کس کو چاہتے ہیں؟ مجھے تو وہ بتا ہی چکے ہیں کہ وہ مجھے نہیں چاہتے۔

اگر وہ عالمہ کو نہیں چاہتے تو بیچاری میری ہی طرح بدنصیب ہے۔

عالمہ کی بدنصیبی کا خیال آتے ہی اس کا جی بھر آیا اور اس نے چاہا کہ وہ دوڑتی ہوئی عالمہ کے پاس جائے اور اس سے معافی مانگے۔

برتنوں کی کھڑکھڑاہٹ سے اس کے خیالات کا تسلسل ٹوٹ گیا۔ کھڑکھڑاہٹ قریب آ چکی تھی۔ اس آواز سے ایک دم اس کو احساس ہوا کہ اس کو سخت بھوک لگ رہی ہے۔

یہ خیال آتے ہی وہ کمرے سے نکل گئی۔

ساتواں باب

''بابا! بی بی کہاں ہیں؟''

''اپنے کمرے میں گئی ہیں......ناشتہ کر گئی ہیں۔''

جواب دیتے ہوئے بابا کی نظریں متین صاحب کی نظروں کو ڈھونڈتی تھیں مگر متین صاحب نظریں جھکائے چائے انڈیلنے میں مصروف رہے۔ بابا میز کی دوسری طرف کھڑا ان کو ٹکٹکی باندھے دیکھتا رہا۔ وہ جاننا چاہتا تھا کہ آخر آج بی بی کپڑے بدلے بغیر ناشتہ کرنے کیوں آئی؟ اور پھر متین صاحب کا انتظار کیے بغیر ناشتہ کیوں کیا؟ اور اپنے کمرے میں اپنے آپ کو بند کیوں کرلیا ہے؟ وہ آخر کس سے پوچھتا؟ بی بی کے تیور ہی ایسے تھے کہ سوال کرنے کی اس کو جرأت ہی نہ ہوسکتی تھی اور متین صاحب اس کو موقع ہی نہ دے رہے تھے۔ وہ جس سکون سے ناشتہ کرنے میں مشغول تھے اس کے پیش نظر اس کی ساری سوچ، اس کی فکر بے معنی نظر آتی تھی۔ ان کے چہرے پر کسی قسم کے تعجب یا پریشانی کے کوئی آثار نظر نہ آتے تھے۔

متین صاحب ناشتہ ختم کر کے جاچکے تھے مگر تقی میاں اور عالمہ بی بی اپنے کمروں سے نہ نکلے تھے؟ آخر وہ کیا کر رہے تھے؟ آج سب کو کیا ہوگیا تھا؟ ہر کوئی یوں آتا ہے، ناشتہ کرتا ہے اور چلا جاتا ہے کہ جیسے گھر میں اس کے سوا کوئی اور نہیں۔ بابا تقی اور عالمہ کے انتظار میں کافی دیر کھانے کے کمرے میں کھڑا رہا۔ آخر انتظار اور پریشانی سے نڈھال ہوکر وہ کمرے سے نکلا۔ پہلے عالمہ کے کھلے دروازے پر دستک دی۔ کوئی جواب نہ پاکر اس نے پھر دستک دی۔ ایک بار پھر دستک دی مگر جواب نہ ملا۔ بابا تنگ آ کر کمرے میں داخل ہو ہی گیا۔ کمرے میں ابھی تک لیمپ جل رہا تھا مگر کمرے میں کوئی نہ تھا۔ بابا نے لیمپ بجھایا، بستر درست کیا، انتظار کیا کہ شاید بی بی غسل خانے میں ہو۔ اس نے کان لگا کر سنا مگر غسل خانے سے تو کسی قسم کی بھی آواز نہ آتی تھی۔ اس نے غسل خانے کے بند دروازے پر دستک دی، بار بار دستک دی۔ دستک کی تکرار سے اس کے دماغ میں کچھ تڑخنے لگا۔ جرأت کر کے اس نے دروازہ کھول ہی لیا، ڈرتے ڈرتے اندر جھانکا۔ کوئی نہ تھا۔ بابا پریشان ہوگیا۔ وہ جلدی سے کمرے سے نکلا۔ تقی کے کمرے تک گیا، رکا، دستک دی، بار بار دستک دی اور پھر ایک دم دروازہ کھول کر کمرے

میں داخل ہو گیا۔ کمرے میں روشندان کے شیشوں سے منعکس ہوتی ہوئی کرنوں کے سوا کچھ نہ تھا۔ بابا کو یقین ہو گیا کہ تقی میاں اور عالمہ بی بی دھنش محل سے چلے گئے ہیں مگر پھر بھی اس نے غسل خانے کے دروازے پر دستک دی، کچھ دیر انتظار کیا اور پھر دروازہ کھول دیا۔ دروازے کا پٹ پورے کا پورا کھل گیا اور دیوار کے ساتھ ٹکرایا۔ ٹکرانے کی آواز سے بابا کے دل سے نہ جانے کیا ٹکرا گیا کہ اس کے پاؤں ڈگمگائے، اس نے سہارے کیلئے ہوا میں ہاتھ چلائے، وہ لڑکھڑا کر گرنے کو تھا کہ اس کا ہاتھ دروازے کی چوکھٹ پر پڑ گیا۔ اس نے چوکھٹ کو دونوں ہاتھ سے پکڑ لیا اور دھم سے کمر کھلے ہوئے پٹ کے ساتھ لگا دی۔ اس کا دل اب تک دھک دھک کر رہا تھا۔ اس کو کچھ دیر تک پتہ ہی نہ چلا کہ اس کو کیا ہو رہا ہے۔ اس کا سارا بدن پسینے میں بھیگ گیا تھا۔ اس نے شانے سے کپڑا اتار کر منہ پونچھا اور ایک لمبا سانس لیا۔ اس نے محسوس کیا شاید اس نے گھنٹوں سانس نہیں لیا اور اس کے جسم میں ایک بہت بڑا خلا پیدا ہو گیا ہے جس کو بھرنے کیلئے اس میں اتنا لمبا سانس لینے کی طاقت ہی نہ تھی۔ اس نے دم روک کر ایک بار پھر لمبا سانس لیا مگر اس کا خلا پر نہ ہوا۔ آخر اس نے ہمت کر کے فرش پر پاؤں جمائے، دروازہ بند کیا، سوئی ہوئی کرنوں کو حسرت سے دیکھا اور پھر دبے پاؤں کمرے سے نکل گلی میں آ گیا۔ گلی کے دونوں طرف سے ٹھنڈی ٹھنڈی ہوا آ کر اس کو لپٹ گئی۔ وہ اس سرد حملہ آور کی تاب نہ لایا اور اس کے بدن میں کپکپی سی پیدا ہو گئی۔ اس کپکپی میں وہ ایک لمحے کیلئے بھول ہی گیا کہ اس پر پچھلے آدھ گھنٹے میں کیا بیت چکی ہے۔

جب کپکپاتے کپکپاتے بابا ہانپ گیا تو اس نے ملتجی نگاہوں سے متین صاحب کے دروازے کی طرف دیکھا۔ کھلے کواڑوں کے اس پار پھڑ پھڑاتے پردوں پر رقص کرتی ہوئی دھوپ سینے سے لگا لینے کا اشارہ کر رہی تھی۔ بابا تیز تیز قدم اٹھاتا ہوا پردے ہٹا کر کھڑکیوں سے چھنتی ہوئی دھوپ میں جا کھڑا ہوا۔ دھوپ بدن گرمانے لگی تو اس کے ذہن میں خیال ابھرنے لگا۔ اس نے مڑ کر کمرے کے کونے کونے کی اُور نظر کو قدم قدم چلاتے چلاتے مشرقی کھڑکیوں کی اُور لوٹا لیا۔ دھوپ کے سہلانے سے اسے بہت ہی سکون مل رہا تھا اور اس کے دل میں بار بار ایک ہی خیال ابھرتا تھا اور وہ اس پر کان نہ دھرتے ہوئے کھڑکیوں میں سے

فضا میں پھسلتا پھسلتا شمال سے مشرق کی اُور پھیلتے ہوئے پہاڑوں کی دمکتی ہوئی چوٹیوں پر جا کر رک جاتا، وہاں سے پھسلتا، تیزی سے پھلستا ہوا درمیانی کھڑکی کی چوکھٹ پر آ کر رک جاتا اور اس کے دل میں اٹھتی ہوئی آواز اس کانوں کے کواڑوں پر دستک دینے لگتی اور وہ ایک بار پھر چوٹیوں کی اور تیزی سے پھسلنے لگتا۔ چوکھٹ سے چوٹیوں تک اور وہاں سے چوکھٹ تک پھسلتے پھسلتے وہ تھک گیا، اس کے جسم میں الاؤ سے جلنے لگے، ان الاؤں کے شعلوں نے شور کرنا شروع کیا، شور طوفان بنا، طوفان سرگوشیوں میں ڈھل گیا، سرگوشیاں واضح ہونے لگیں، کوئی اس سے مخاطب تھا۔ پہلے تو وہ سمجھ ہی نہ سکا کہ اس سے کیا کہا جا رہا ہے۔ اس کو آواز شناسا سی محسوس ہوئی۔ اس نے آواز کو پہچاننے کی کوشش کی۔ وہ آواز کے لحن میں ایسا گم ہوا کہ اس کو بھول ہی گیا کہ اس نے کس مطلب کیلئے آواز پر کان لگایا تھا۔

’’فردوس متین صاحب کو چاہتی ہے اور وہ اس سے بے اعتنائی نہ برتتے ہوئے بھی اس سے دور رہتے ہیں۔ آخر کیوں؟ ان کو کس سے پیار ہے؟ فردوس کے پاس کیا کچھ نہیں۔ حسن؟ ذہانت؟ دل؟ متین صاحب کو آخر کیا چاہیے؟ وہ شادی پر راضی کیوں نہیں ہو جاتے؟ کیا ان کی شادی ہو چکی ہے؟ آخر ان کی بیوی میں کیا کیا کچھ ہو؟ جو میرا حشر ہوا وہ حشر فردوس کا بھی ہونیوالا ہے؟ ایسا نہیں ہونا چاہیے! بابا! اس کا یہاں تمہارے سوا کون ہے؟ تم ہی نے مجھے پالا، تم ہی میرے دکھ سے واقف ہو، تمہاری گود میں مچل مچل کر فردوس جوان ہوئی ہے۔ تمہیں یاد نہیں؟ انہی دنوں کی تو بات ہے کہ مجھ پر دکھ کے پہاڑ ٹوٹ پڑے تھے جن کے بوجھ سے میں جاں بر نہ ہو سکی۔ یہ کمرا میرا ہے، یہاں اب متین صاحب سانس لیتے ہیں، میرے ہی پلنگ پر سوتے ہیں، انہی کھڑکیوں سے دھوپ سینکتے ہیں جن سے میں دھوپ سینکتی تھی، اسی میز پر بیٹھ کر وہ پڑھتے لکھتے ہیں جس میز پر، تمہیں تو یاد ہے، میں اس رات لکھتی رہی تھی۔ میں نے اس پلنگ پر وہ رات کس طرح گزاری تھی تم اس کا اندازہ نہیں کر سکتے۔ جب اس کمرے سے، یہاں سے متین صاحب چلیں جائیں گے، تو اس پلنگ پر پڑے پڑے فردوس پر کیا بیتے گی؟ جانتے ہو؟ وہ ان کھڑکیوں کے پار کس کی راہ دیکھے گی، اس دروازے سے باہر گلی میں کس کی چاپ پر کان لگائے گھنٹوں بیٹھی رہے گی؟ جانتے ہو؟

میرے دکھوں کو دھیان میں لاؤ۔ وہی کچھ یا اس سے بھی زیادہ فردوس پر بیت سکتا ہے۔اور اگر بیت گیا تو......''

بابا سننے کی تاب نہ لا سکا۔اس کا دماغ، اس کی جلد، اس کا رواں رواں سنسنا اٹھا۔اس کے کانوں نے، اس نے آواز پہچان لی تھی۔''صالحہ بیٹی!'' وہ بڑبڑا اٹھا اور اس نے ادھر ادھر دیکھا۔کمرے کی چیزوں سے پھسلتی ہوئی نگاہ ناکام لوٹ آئی۔

''کیسے ہوسکتا ہے؟ میں آج پچیس سال کے بعد اس کمرے میں صبح کے وقت آیا ہوں۔اس دن بھی صبح کا وقت تھا۔دھوپ اسی طرح پلنگ کے اس پائے تک تھی، ایسا ہی دھندلکا سا چھت پر چھایا تھا۔یونہی کمرے کی ہر شے ساکت تھی، خاموش تھی اور میں وہاں پردوں سے ذرا آگے کھڑا تھا۔اس دن تو میں کچھ نہ کر سکا تھا مگر آج، آج، آج......آج بھی میں آخر کیا کر سکتا ہوں؟ کیا کر سکتا ہوں؟......میں متین صاحب سے پوچھ تو سکتا ہوں کہ وہ آخر بٹیا سے کیا چاہتے ہیں؟ وہ مہمان بن کے آئے تھے اور اس گھر کو ویران کر کے چلے جائیں گے۔آخر کیوں؟''

وہ ایک دم دروازے کی طرف بڑھا، دہلیز پار کرتے ہی رکا اور اس نے کواڑوں کو بند کیا، گلی میں تیز تیز قدم اٹھاتے ہوئے شیشے کی دیوار والے کمرے کے دروازے پر جا کر رکا، ایک لمبا سانس لے وہ کمرے میں داخل ہوگیا۔کمرے میں کوئی نہ تھا۔کمرے کی ہر شے اس کو تحیر کی آنکھ سے تک رہی تھی۔'وہ' کرسی ابھی تک وہیں پڑی تھی جہاں اس رات پڑی تھی؛ جہاں اس رات صالحہ بیٹی بے سدھ پڑی تھی اور پرسوں رات متین صاحب صالحہ بیٹی کی طرح بے سدھ پڑے تھے۔اس کی آنکھوں میں آنسو بھر آئے اور اس کا جی چاہا کہ وہ دھاڑیں مار مار رو دے۔اس نے ضبط کیا مگر پھر اس کی پلکیں بھیگ ہی گئیں، اس کی نظر دھندلا گئی۔اس نے بائیں بازو کی آستین سے آنسو پونچھے اور ایک بار وہ پھر گلی میں بے یار و مددگار تھا۔

وہ سینے میں خون ہوتے ہوئے دل کے ساتھ، بھاری بھاری پیروں کو پوری قوتِ ارادی سے اٹھاتا ہوا صحن کی طرف بڑھا۔اس نے چلتے چلتے طے کر لیا تھا کہ داؤد نگر میں

جہاں بھی متین صاحب ہوں گے وہ ان کا دامن پکڑ کر فریاد کرے گا کہ وہ اس کے بڑھاپے پر رحم کریں، دھنش محل لوٹ آئیں اور فردوس بٹیا کے متعلق کسی قسم کے فیصلے کو کچھ مہینوں کیلئے، کچھ ہفتوں کیلئے، کچھ دنوں کیلئے، کچھ گھنٹوں کیلئے، اس کی سالگرہ کی دعوت ہو چکنے تک ملتوی کر دیں۔ وہ اپنی ہمت بندھاتے بندھاتے آدھا صحن پار کر چکا تھا۔ اس کو خیال آیا کہ وہ اپنی پگڑی کو تو بھولے ہی جا رہا تھا، اس کو یوں تو نہ جانا چاہیے بلکہ اس کو کوٹ، پگڑی اور اپنی چھڑی لے کر جانا چاہیے۔ آخر وہ محض نوکر تو نہیں ہے۔ وہ ضلع کے سب سے بڑے جاگیردار کے گھر کا ایک اہم رکن ہے۔ وہ اپنے کوارٹر کی طرف جانے کے لیے مڑا تو اس کی نظر لائبریری کے کھلے کواڑوں کو پھلانگتی ہوئی بڑی میز کے پیچھے سر جھکائے بیٹھے ہوئے متین صاحب پر پڑی۔ اس پر سکتے کی سی کیفیت طاری ہوگئی۔ اس کو جب ہوش آیا تھا تو اس کو ایک لمحے کے لیے یہ محسوس ہوا کہ اس کا جسم بالکل پانی بن گیا ہے اور وہ بہہ جائے گا، مٹ جائے گا۔ وہ صالحہ بٹی کی خواہش پوری کئے بغیر مرنا نہ چاہتا تھا۔ اس کے قدم زمین نے پکڑ لیے تھے۔ وہ بت بنا متین صاحب کو تکے جا رہا تھا۔

متین صاحب نے سر اونچا کیا۔ ان کی نظر اس کے جسم سے ٹکرائی اور وہ لرز گیا۔

''کہاں جا رہے تھے؟''

''آپ کو ڈھونڈنے؟''

''کیوں؟''

وہ جلدی جلدی صحن کو طے کرتا ہوا متین صاحب کے سامنے جا کھڑا ہوا۔ متین صاحب کچھ نہ بولے۔ ان کی آنکھوں میں کوئی سوال نہ تھا، ان کی آنکھیں کچھ نہ کہہ رہی تھیں، ان آنکھوں میں بڑا ہی گہرا، بے پایاں، دکھ بھرا پیار جھلک رہا تھا۔ ان کے کنگھی کئے ہوئے بالوں کی ایک لٹ ان کے ماتھے پر سو رہی تھی۔ ان کے چہرے پر ایک حزیں معصومیت تھی۔ ان کے ہاتھ کھلی کتاب کے صفحوں پر آرام کر رہے، ان کے جسم میں تناؤ نہ تھا مگر پھر بھی نہ جانے کیوں اطمینان کا مظہر نہ تھا۔

بابا کو ان کی حالت پر رحم سا آنے لگا اور اس نے چاہا کہ وہ ان کے سر پر ہاتھ رکھ دے،

ان کو پیار کرے، ان کو تسلی دے، ان سے پوچھے کہ وہ ان کے حزن کو کم کرنے کیلئے کیا کرسکتا ہے، وہ ان کے لیے سب کچھ کرنے کو تیار ہے۔ مگر اس کی آرزو اس کے پاؤں میں حرکت پیدا نہ کرسکی، اس کی زبان کو کھول نہ سکی پھر بھی اس نے محسوس کیا کہ اس کے دل کی باتوں کو متین صاحب نے اس کی آنکھوں میں پڑھ لیا ہے۔ متین صاحب اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالے، مگر گونگی، معصوم نظروں سے اس کو تک رہے تھے۔

ان کے دل میں کیا تھا وہ نہ پڑھ سکا۔ اس نے چاہا کہ متین صاحب کے لب ہلیں، ان میں ارتعاش پیدا ہو، پھڑ پھڑائیں تاکہ اس کے دل کی آرزو اس کے جسم میں حرکت پیدا کرے اور وہ ان سے پوچھے کہ وہ ان کے لیے کیا کرے۔ مگر ان کی آنکھوں کی روشنی میں، ان کے چہرے کی رنگت میں، ان کے چہرے کے نقوش کے آہنگ میں، ان کی بانہوں کے زاویوں میں، ان کے آرام کرتے ہوئے ہاتھوں میں کسی قسم کی حرکت کا شائبہ تک نہ تھا۔ بابا کے دل کی بے بسی بڑھنے لگی، اس کا جسم اس کے پاؤں پر بوجھ بننے لگا۔ کمرے کا فرش نرم نرم دلدل بننے لگا، اور اس کا جسم دھیرے دھیرے اس میں دھنسنے لگا۔ اس کی آنکھیں متکلم ہوئیں۔ اس کی آنکھیں، اس نے محسوس کیا، کہہ رہی ہیں کہ وہ چند ہی لمحوں میں ہمیشہ ہمیشہ کیلئے نظروں سے اوجھل ہونے کو ہے اس لیے متین صاحب اس سے کچھ بات تو کریں۔ دلدل سے نکل آنے کی ہر خواہش اس کے دل سے مٹ گئی، وہ نظروں سے اوجھل ہونے پر قانع ہو گیا اور اس کے دھنسنے کی رفتار تیز ہو گئی۔ اس نے محسوس کیا کہ وہ گردن تک دھنس گیا ہے مگر متین صاحب کی آواز نے اس کو دھنستے چلے جانے سے، دلدل میں غائب ہو جانے سے بچا لیا اور وہ دلدل سے ابھرنے لگا۔

''میں ابھی ابھی اس کتاب میں پڑھ رہا تھا کہ پریت میں ایسا وقت بھی آتا ہے جب دل میں گھور اندھیری رات چھا جاتی ہے۔ رات کے سوا کچھ نہیں رہتا، رات ازل سے ابد تک پھیل جاتی ہے۔ کبھی کبھی یوں بھی ہوتا ہے کہ محبوب کا روپ چاندنی میں ڈھل جاتا ہے۔ اور چاندنی ہی چاندنی رہ جاتی ہے۔ چاندنی جسم میں داخل ہو جاتی ہے، جسم نور ہی نور ہی بن جاتا ہے، نور زمین سے لے کر عرش تک پھیل جاتا ہے۔''

متین صاحب کے چہرے کی رنگت بدلی، چہرے کے نقوش کا آہنگ بدلا، ان کی آنکھوں کی روشنی، نہیں روشنیوں، میں حرکت پیدا ہوئی، ان کے سوئے ہونٹوں نے انگڑائی لی، ان کی ٹھوڑی کا گوشت پھڑ پھڑایا، ان کے کھلی کتاب پر سوئے ہوئے ہاتھ کانپے، ان کا سارا جسم کوندے کی مانند لرز گیا۔ بابا کے دل سے رحم کی، پیار کی ایک بہت بڑی موج اٹھی اور آواز بن گئی۔

''مجھے معلوم نہ تھا کہ آپ پر کیا بیت رہی ہے۔ مجھ کو آپ پر غصہ آ رہا تھا۔ میں آپ کو الزام دے رہا تھا کہ آپ نے بٹیا کو حیران کر دیا ہے، ویران کر دیا ہے، مگر اب میں سوچتا ہوں کہ شاید اس سے زیادہ تو آپ پر بیت گئی ہے۔ آپ کو کیا ہو گیا ہے۔ کس نے آپ پر ستم ڈھائے ہیں؟

میں نہ جانتا تھا کہ یہ کچھ پریت میں ہو سکتا ہے۔ آپ کو دیکھ کر مجھے صالحہ بٹی...... بٹیا کی والدہ...... کی حالت یاد آ گئی۔ مرنے سے کچھ دن پہلے ان کے چہرے پر بھی کبھی کبھی وہی کچھ نظر آتا تھا جو ابھی ابھی میں نے آپ کے چہرے پر دیکھا ہے۔ آپ کے معاملے میں تو سمجھ میں آتا ہے کہ ایسا کیوں ہوا مگر بیگم صاحب پر یوں کیوں بیتی۔ ان کو، ان کو، ان کو، کس سے،...... کس سے پیار...... پیار تھا...... ایسا کون تھا؟''

بابا نے متین صاحب کی طرف دیکھا تو وہ مسکرا رہے تھے۔

''تمہیں میرے متعلق غلط فہمی ہوئی۔ مجھ پر کسی نے ستم نہیں ڈھائے۔ تم اگر پڑھ سکتے تو میں تمہیں دکھاتا کہ جو کچھ میں نے کہا وہ اس کتاب میں لکھا ہے......''

''لکھا تو ہو گا مگر اس لکھے سے آپ پر جو بیت گیا وہ میں نے اپنی آنکھوں سے دیکھا ہے اور میرا دل کہتا ہے کہ جو کچھ آپ نے کہا وہ آپ پر بیت رہا ہے۔ نظر فریب کھا سکتی ہے مگر میرا بوڑھا دل دھوکا نہیں کھا سکتا۔'' بابا نے بات کاٹتے ہوئے کہا۔

متین صاحب کچھ کہنا چاہتے تھے مگر رک گئے۔ فضا میں ایک نغمہ جھنجھنا اٹھا اور فضا میں جذب ہو گیا اور پھر دھیرے دھیرے نغمہ دبے دبے فضا میں لوٹ آیا۔ بابا نے بھی نغمہ سنا۔ اس نے متین صاحب کی طرف دیکھا۔ ان کے چہرے کے نقوش، آواز کی طرف محوِ سفر تھے۔

کوئی وائلن بجا رہا تھا۔ نغمہ پھڑ پھڑاتا تھا، رک جاتا تھا، لڑکھڑاتا تھا، لڑکھڑاتے ہوئے چل نکلتا تھا، لے فضا میں اڑنے لگتی، اس کے پروں کی آواز صاف سنائی دیتی تھی۔ پھر لے فضا میں پر کھولے تیرنے لگتی، پر بند کئے پستیوں کی طرف جھپٹتی، معلق ہوتی، پھر پھڑاتی، پر مارتی، کچھ دیر اڑتی، پھر پر بند کئے پستیوں کی طرف جھپٹی، ایک سطح پر آ کر رکتی، لڑکھڑاتی اور ایک دم دوڑنے لگتی، دوڑتی ہی چلی جاتی، دوڑتے دوڑتے اس کی رفتار تیز ہوجاتی، رکتی، لمبا سانس لیتی، سانس روک لیتی، فضا میں کودتی، کودتی ہی چلی جاتی، کودتے کودتے فضا میں معلق ہوجاتی، اس کے پر کھل جاتے، وہ فضا میں تیرنے لگتی، تیرتے تیرتے زور زور سے پر مارتے مارتے فضا میں بلند ہونے لگتی۔

سنتے سنتے بابا نے دیکھا کہ فضا میں اونچے اونچے پہاڑ ابھر آئے ہیں۔ ان پہاڑوں پر اندھیرا رینگ رہا ہے، اندھیرے میں بجلی کوندنے لگی، بجلی کے کوندنے میں ان پہاڑوں کی چوٹیوں پر سفید سفید بادل سرخ سرخ ہوجانے کو ہیں۔ پھر بادلوں سے برف گرنے لگی، گرتی رہی، بادلوں کی اوٹ سے کہیں دور چاند نکل آیا، چاند کی چاندنی پہاڑوں کی چوٹیوں پر، کھائیوں میں پھیل گئی، برف گرتی رہی، چاندنی پھیلتی رہی، برف نے سیاہ چوٹیوں کو سفیدی کی آغوش میں سلا دیا اور پھر سفیدی خود بھی سو گئی۔

منظر بدلا، دن نکلا، شفق کی سرخیوں سے برف میں آگ لگ گئی، برف پگھلنے لگی، ڈھلوانوں پر برف کے تودے لڑھکنے لگے، تودے پانی بنے، پانی نشیبوں کی طرف شور کرتا ہوا بہنے لگا، ہر سو ندیاں شور مچاتی بلندیوں سے اترنے لگیں، سب ندیاں مل کر دریا بنیں، دریا میدانوں میں اتر آیا، دریا کے کناروں پر شہر آباد ہونے لگے، دریا شہروں میں سے ہوتا ہوا، ویرانوں میں نکل گیا، ویرانوں سے چٹانیں ابھرا بھر کر دریا کا رستہ روکنے لگیں، دریا کی روانی تیز ہونے لگی، تیز ہوتی چلی گئی، دریا کی روانی سے شور پیدا ہوا، شور بڑھنے لگا، ہر طرف شور ہی شور تھا، پستیوں اور بلندیوں میں شور بھر گیا، پستیاں اور بلندیاں شور سے خالی ہونے لگیں، دریا کی روانی میں سستی آ گئی، دریا سمندر میں جا گرا۔

لے رک گئی۔ نغمہ فضا میں، آغوش میں سو گیا۔

بابا نے نظر اٹھا متین صاحب کی طرف دیکھا۔ متین صاحب کرسی میں نہ تھے۔ اس نے ادھر ادھر دیکھا۔ متین صاحب کتابوں کی الماریوں کے درمیان کی قد آدم کھڑکی میں کھڑے باہر دیکھ رہے تھے۔ کھڑکی سے باہر افق میں گم ہوتی ہوئی دیوار پر سبزہ چمک رہا تھا۔ متین صاحب کا سر دائیں شانے کی طرف جھکا ہوا تھا جیسے شانے پر سو جانا چاہتا ہو۔ ان کے ساکت شانوں میں جنبش ہوئی، لرزے، پھڑ پھڑائے اور فضا میں معلق ہو گئے۔

متین صاحب ایک دم مڑے، لڑکھڑائے اور کھڑکی کی چوکھٹ پر بیٹھ گئے۔ ان کے بیٹھتے ہی ان کے زانوؤں پر ان کی کہنیاں جم گئیں، ان کی بانہیں فضا میں معلق ہوئیں، ان کا سر جھکا اور ان کا چہرہ ان کے کھلے ہوئے ہاتھوں میں چھپ گیا۔

کافی دیر کے بعد انہوں نے ہاتھوں سے سر اٹھایا اور بابا سے مخاطب ہوئے۔

''بابا آج کی رات آپ میرے لیے دعا کیجئے۔ میں اندھیرے میں ہوں، منزل کا پتہ نہیں، مشعلِ راہ ساتھ نہیں...... آپ کی دعا شاید میرے لیے اندھیاری میں روشنی کا سامان پیدا کر دے......

آپ میرے لیے دعا کریں گے نا؟ دعا کی ضرورت مجھے ہے، فردوس کو نہیں۔''

''دعا؟ اوہ! دعا! میں، میں آپ کے لیے دعا ضرور کروں گا۔ مگر کیوں؟ آپ نے تو بتایا ہی نہیں کہ آپ پر کیا ٹوٹ پڑی ہے۔''

''ابھی تو میں خود بھی کچھ نہیں جانتا......''

وہ شاید ابھی کچھ اور کہنے کو تھے مگر ان کے ہونٹوں نے انگڑائی لی اور سو گئے۔

وہ ایک دم کھڑکی کی چوکھٹ سے اٹھے، میز کی طرف بڑھے، میز کے قریب جا کر کرسی کی پشت پر ہاتھ رکھے کچھ سوچنے لگے۔ سوچتے سوچتے ان کی انگلیوں نے کرسی کی پشت پر ایک دھیمی سی لے چھیڑ دی۔ وہ چونکے، انہوں نے آخری ٹھیکہ لگایا، کرسی کی پشت پر ہاتھ کے بل اپنا سارا بوجھ ڈال دیا اور پھر آہستہ آہستہ قدم اٹھاتے کمرے سے صحن اور صحن سے گلی میں چلے گئے۔ بابا بھی ان کے پیچھے کمرے سے نکل آیا۔ گلی کا موڑ مڑنے کو تھا کہ اس نے

دروازہ کھٹ کھٹانے کی آواز سنی۔ وہ جہاں تھا وہیں رک گیا۔ دروازہ کھلنے کی آواز آئی تو اس نے منہ موڑ کر دوسری طرف جھانک کر دیکھا۔ گلی میں کوئی نہ تھا۔ بابا الٹے قدم لوٹا اور اپنے کوارٹر میں چلا گیا۔

آٹھواں باب

متین صاحب جب کمرے میں داخل ہوئے تو خوشبو میں لپٹی ہوئی، ریشمی پردوں میں سوئی ہوئی دھوپ چونک اٹھی۔ ہر طرف دھوپ پُرخمار آنکھیں نیم وا کئے انہیں حیرانی سے تک رہی تھی۔ کمرے کی سبز دیواروں پر، سرخ قالین پر، چھت کے روشن دان کے قوسِ قزحی شیشوں سے منعکس ہوتی ہوئی دھوپ دیر تک سونے پر مُصر تھی۔

جونہی متین صاحب قوس قزح کے رنگوں میں لپٹی ہوئی فردوس کی طرف بڑھے تو دھوپ ان کے قدموں سے لپٹ لپٹ ان کو فردوس کے پاس جانے سے روکنے لگی مگر ان کے پاؤں قالین پر پھسلتے پھسلتے ان کو فردوس کے قریب لئے لئے گئے۔ دھوپ جھنجھلا کر ان کے سینے پر چڑھ گئی تو وہ ٹھٹکے، وائلن پر جھکی ہوئی، سمادھی میں ڈوبی ہوئی، فردوس چونکی، اس کے دائیں ہاتھ کا سہارا لئے، وائلن کے تاروں سے کمر لگائے سویا ہوا گز چونک گیا، تھرک گیا اور درد سے وائلن کراہ اٹھا، اس کے کراہتے ہوئے ہونٹوں سے نغمہ پھوٹ کر بہہ نکلا اور رنگین فضا میں کھو گیا۔

فردوس حیران آنکھوں سے کبھی متین صاحب کو کبھی وائلن کو دیکھتی تھی۔ اس کا دایاں ہاتھ اور اس کے ہاتھ میں پکڑا ہوا گز، وائلن کے ہینڈل کی پشت کو سہارا دیئے ہوئے اس کا بایاں ہاتھ، اس کی نیم بیدار انگلیاں وائلن کے تاروں میں سفر کی منتظر تھیں۔ چھت کے قوس قزحی شیشوں سے منعکس ہوتی ہوئی رنگین دھوپ اور اس رنگین دھوپ میں لپٹے ہوئے متین صاحب حکم سفر کے منتظر تھے۔

فردوس نے اپنے کانوں اور اپنی آنکھوں پر شک کرتے ہوئے اپنے دائیں ہاتھ میں

پکڑے ہوئے گز کو وائلن کے تاروں پر تھرتھرایا، بائیں ہاتھ کی انگلیوں سے تاروں کو جھنجھنایا۔ ایک نغمہ فضا میں کوند گیا۔ رنگین شعاعوں میں لپٹے ہوئے، مبہوت کھڑے، متین صاحب کے جسم میں ارتعاش پیدا ہوا اور اس ارتعاش سے رنگین شعاعیں لرز اٹھیں۔ ان کے لرزنے سے فردوس ڈر گئی اور اس کے دائیں ہاتھ میں پکڑا ہوا گز وائلن کے تاروں پر چلنے لگا، اس کے بائیں ہاتھ کی انگلیاں تاروں کو گدگدانے لگیں۔ آواز کی لہروں سے رنگین روشنی کی لہروں میں مدوجزر پیدا ہوا اور متین صاحب کا دل ڈولنے لگا، ڈوبنے لگا۔ انہوں نے گھبرا کر روشنی کی لہروں سے ہاتھ نکالا، ان کا ہاتھ فضا میں پھڑ پھڑا کر گر گیا۔ ان کا دل ڈوبتا چلا گیا۔ انہوں نے لہروں پر قابو پانے کی کوشش کی مگر ہر کوشش ان کے دل کو گہرائیوں میں دور تک لے جاتی اور پھر سطح پر لے آتی۔ انہوں نے خوف زدہ آواز میں پکارا:

''تھم جاؤ! رک جاؤ! میرا دل ڈوب چلا!''

فردوس کے ہاتھ رک گئے، نغمہ رک گیا، فضا کی لہریں اس کو بہا دور، بہت دور، لے گئیں۔ متن صاحب کی کشتیء دل محفوظ ہوگئی۔ فردوس کو اپنے کانوں کا، اپنی آنکھوں کا اعتبار آ گیا۔ اس نے وائلن سے ٹھوڑی اٹھا، وائلن کو شانے سے اتار لیا۔ وائلن، وائلن کا گز، فردوس کے پہلو سے پہلو ملا کر سو گئے۔

دونوں کی آنکھوں میں تشکر اور اطمینان کے روشن روشن دھندلکے تیر تیر گئے مگر ان کے جسموں میں جنبش نہ ہوئی، ان کے لبوں میں حرکت نہ ہوئی۔ وہ دونوں ایک دوسرے کو دھندلائی نظروں سے تکتے رہے۔

متین صاحب نے ہونٹوں پہ زبان پھیری، دونوں ٹانگوں کی بجائے اپنے جسم کا بوجھ بائیں ٹانگ پر ڈال دیا اور فردوس کی نظروں میں نظریں ڈالے بولے:

''کب تک یونہی کھڑے رکھو گی؟ بیٹھ جاؤ تو میں بھی بیٹھوں۔ آؤ اس صوفے پر بیٹھ جائیں۔''

''اوہ!'' فردوس اس سے زیادہ کچھ نہ کہہ سکی اور صوفے پر جا کر دھم سے بیٹھ گئی۔

متین صاحب اس کے سامنے صوفے کی کرسی پر ٹانگیں پھیلا، صوفے کے بازوؤں پر

کہنیاں جما، دائیں ہاتھ کی انگلیوں کو بائیں ہاتھ کی انگلیوں میں پھنسا، دونوں ہاتھ سینے پر رکھ، دراز ہو گئے۔فردوس کے چہرے کے نقوش سے اس کے دل و دماغ کی حالت کا اندازہ لگانے میں مصروف ہو گئے۔

ان کی نظروں کی گرمی سے فردوس کا چہرہ تمتما اٹھا اور اس کی نظریں جھک گئیں۔اس کی جھکی ہوئی نظریں اس کے ہونٹوں کو سہلانے لگیں۔اس کے ہونٹ جاگے، انگڑائی لیتے لیتے لرزے اور پھر فوراً رقص میں محو ہو گئے۔

''آپ مجھے یوں دیکھ رہے ہیں جیسے میں نے کوئی گناہ کیا ہو، آپ سے کوئی زیادتی کی ہو حالانکہ آپ مجھ سے جو سلوک کر رہے ہیں وہ کوئی بھی عورت برداشت نہ کرتی اور انتقام پر اتر آتی......

میں نے اگر آپ سے اپنے جذبات کا اظہار کیا تو میں نے آپ سے زیادتی نہیں کی، آپ کی توہین نہیں کی۔کیا آپ کو میرا اظہار اس لیے ناگوار گزرا کہ میں عورت ہوں اور آپ میرے لیے منتہائے نظر؟ عورت کا اظہار محبت حیا کے منافی ہے؟ آخر کیوں؟ کیا صرف حیا ہی میرا کل سرمایہ تھا جو میں نے آپ کے نقطہ نظر سے لٹا دیا اور اب میں آپ کے قابل نہیں رہی؟ اگر آپ نے میرے متعلق یہی سوچا ہے تو مجھے بہت ہی دکھ ہوگا۔اس لیے نہیں کہ اس میں میری شخصیت کی تذلیل کا پہلو نکلتا ہے بلکہ اس لیے کہ میں آپ کو ایسے تصورات سے ماورا اور بہت ہی بلند سمجھتی ہوں۔

مجھے قبول کرنے کے لیے سوچ کی کافی مدت چاہتے ہیں تو میں انتظار کر سکتی ہوں۔ میں دل کو سمجھا لوں گی کہ منزل کی جھلک نظر آنے کے باوجود منزل ابھی دور ہے۔

اگر آپ کے قلب ونظر نے کسی اور کو منتخب کر لیا ہے تو میں اپنے رب سے دعا کروں گی کہ وہ میری آرزو بدل ڈالے۔

بولیے نا! میری بات کا جواب دینے میں بھی شاید آپ کی تذلیل کا پہلو نکلتا ہے؟''

''طعنے نہ دو! میں نہ صرف تمہارے جذبات کی قدر کرتا ہوں، عزت کرتا ہوں، بلکہ میرے دل میں تمہاری جو جگہ ہے اس کے آس پاس بھی مرتے دم تک کوئی نہ آ سکے گا۔اگر

مجھے یہ یقین نہ ہوتا کہ میں تمہارے سفر کا صحیح ساتھی نہیں ہوں تو میں تمہیں نعمت عظمیٰ سمجھ کر قبول کر لیتا۔ تم نہیں جانتی کہ میں نے اس یقین کو اپنے دل و دماغ سے محو کرنے کی کتنی کوشش کی ہے اور اس کوشش میں کتنے چرکے کھائے ہیں۔

میں تمہارے لیے چراغِ راہ سے زیادہ کچھ نہیں ہوں۔ جہاں میری روشنی کی حد ختم ہوتی ہے۔ وہیں تمہاری منزل کی حدود شروع ہوتی ہیں۔ میرا دل کہتا ہے کہ تمہاری منزل اب بہت ہی قریب ہے اور میری منزل میں ابھی بہت دور کی مسافت ہے۔

میرے قلب ونظر کو تم سے دور رہنا منظور نہیں مگر میری تقدیر تم سے دور کہیں میری منتظر ہے۔ اگر میری تقدیر تم ہی ہو تو میری منزل پر جا کر مجھے پکارو۔ مگر میرے قلب ونظر، میری تقدیر سے زیادہ قوی وہ طاقت ہے جو میری، تمہاری، تقدیر کی خالق ہے۔ اس کی مرضی کو جانتے بوجھتے مجھ میں انحراف کی جرأت نہیں۔ میں تمہیں منزل سمجھ کر رک بھی جاؤں مگر میں جانتا ہوں کہ جب تمہاری صحیح منزل تمہارے سامنے آ جائے گی تو مجھے تمہیں کھو دینا ہوگا۔ وہ دکھ اس دکھ سے بہت ہی بڑا دکھ ہوگا جو تمہیں اب منزل نہ سمجھ لینے سے مجھے ہو رہا ہے اور اس وقت تک ہوتا رہے گا جب تک میرا رب اپنے کرم سے اس کو راحت میں، آنند میں نہ بدل دے۔

اگر کان لگا کر اپنے دل کی گہرائیوں سے ابھرتی ہوئی آواز کو سنو تو تمہیں میری باتوں کا یقین آ جائے۔ تمہاری آرزو تمہارے ذہن، تمہارے تخیل اور...... مجھے معاف کرنا، تمہارے جسم کے ذروں کے رقص سے وجود میں آئی ہے۔ یہ آواز تمہاری پوری شخصیت کی تخلیق نہیں۔ اگر میری منزل تم سے ماورا نہ ہوتی تو میری حالت بھی ان انسانوں کی طرح ہوتی جو تمہارے حسن کی یادوں کے بھنور میں پھنسے موت کے منتظر ہیں۔

میری جنت بھی تو نہیں، میرا جہنم بھی تو نہیں۔ تو وہ آتش فشاں پہاڑ ہے جس کے لاوے سے میری حیاتِ نو کی مٹی زرخیز بنے گی اگرچہ اب میری یادوں کا شہر تمہاری شخصیت کی آتش فشانی سے جل رہا ہے، اس کی راکھ تمہارے لاوے میں حل ہو رہی ہے۔“

”آپ میری شخصیت کو بہت ہی ڈراؤنا روپ دے رہے ہیں۔ مجھے گناہ کا شدید احساس ہونے لگا ہے۔ مجھے ڈر ہے وہ نفرت جو برسوں سے میرے خون میں خود میرے

اپنے خلاف حل ہو رہی ہے اب میرے لیے زہر نہ بن جائے۔

مجھے بہت عرصے سے یہ احساس اور شعور ہے کہ میری شخصیت، میرا حسن، ہر اس انسان کے لیے جہنم ہے جسے میری نظروں کا قرب حاصل ہو گیا......

آہ! آپ نے مجھے کہاں چھیڑا ہے۔ وہ سب کچھ جاگ گیا ہے جس کو میں نے برسوں تھپک تھپک کر سلایا تھا۔ اب میں برسوں کی سعی سے تھک گئی ہوں۔ اب مجھ میں اس سب کو سلانے کی تاب نہیں۔ کتنے جواں شہر تھے، کتنے پرانے شہر تھے، جو محض میرے وجود سے تباہ ہوئے۔ اوہ! اف! آہ!......''

''جس نے جلتی آگ پر بسیرا کرنا چاہا وہ راکھ ہوا۔ تمہارا اس میں کیا قصور۔ ان سب کو تم نے نہیں ان کی اپنی آرزوؤں نے تباہ کیا۔ میں آخری شہر ہوں جو تمہاری آگ میں جل کر راکھ ہوگا۔ مگر میں وہ شہر ہوں جو جل کر پھر آباد ہوگا اور نئی شان وسطوت سے۔ اس کی رونق تمہاری ہی آگ کی مرہونِ منت ہوگی۔''

''کیا آپ کا طرزِ عمل فرار کا، بزدلی کا، مظہر نہیں؟ آپ مجھے ڈرا کر، بہلا کر اپنی بزدلی کو چھپانا نہیں چاہتے؟ کیا آپ کو واقعی یہ خوف نہیں کہ آپ میرے حسن کی آگ میں بار بار جل کر بار بار جینے پر قادر نہ ہو سکیں گے؟''

''کاش حقیقت یوں ہی ہوتی۔ ہم دونوں ایک دوسرے کیلیئے وہ آبِ حیات ہیں جس کے خون میں حل ہوتے ہی ہم دونوں پتھر کے ایسے مجسمے بن جائیں گے جن کا حسن ابدی تو ہوگا مگر وہ خود زندگی سے، نشو ونما سے، قدرتِ سفر سے محروم۔ مجھے تمہارے لئے نہ اپنے لئے ایسی ابدیت قابلِ قبول ہے۔

مجھے اپنی موت کے تصور سے نہ تمہاری موت کے تصور سے ڈر لگتا ہے۔ جس موت سے ارتقا کے سفر میں سامنا ہو وہ موت اس سفر کی سدِ راہ نہیں بن سکتی۔ موت ارتقا کے سفر میں ایک موڑ ہے جس سے پرے جنت بھی ہے جہنم بھی۔

میں نے جتنے قریب سے تمہاری آتشِ حُسن کو محسوس کیا اتنے قریب سے شاید ہی کسی انسان نے کیا ہو۔ میں اس میں جلا نہیں مگر اس سے میری سب کثافتیں الگ ہو گئی ہیں اور

مجھ میں نکھار آ گیا ہے۔ اس آ گ میں مجھے نہیں میری کثافتوں کو ہی جلنا تھا۔ میرے نہ جلنے کو فرار نہ سمجھو، بزدلی نہ جانو۔

یہ یقین جانو میں تمہاری راہ کو اس مقام تک اور اس لمحے تک روشن کیئے رہوں گا جب تک تمہیں منزل نظر نہ آ جائے۔''

''مجھے اب بھی یقین نہیں آ تا کہ میری آرزو میری ساری شخصیت کی تخلیق نہیں۔ کیا یہ ممکن نہیں کہ آپ نے اپنے دل کی آواز کو سمجھنے میں غلطی کھائی ہو؟''

''نہیں! نہیں!''

''میں خود اپنے کانوں سے آپ کے دل کی دھڑکنوں میں چھپی ہوئی آواز کو سننا چاہتی ہوں، بار بار سننا چاہتی ہوں تاکہ خود میرے دل سے اس کا جواب آئے۔

آپ تیار ہیں اس کٹھن امتحان کیلیۓ؟''

فردوس کی آنکھوں میں نہ جانے کتنے طلسم آباد ہو گئے جو متین صاحب کو طلسم کشائی کا چیلنج دے رہے تھے۔

''میں تیار ہوں۔'' ان کی آواز میں اسمِ اعظم کے ورد کا سا اثر تھا۔

فردوس کے نقوش اور خدوخال رنگ و رقص کا ایک سورگ بن گئے۔ متین صاحب نے اس سورگ پر ایک نظر ڈالی اور اپنی کرسی سے اٹھ کر فردوس کے پاس کاؤچ پر جا بیٹھے۔ فردوس نے اپنی گود سے اپنے ہاتھ اٹھا متین صاحب کے شانوں پر رکھ دیئے اور دھیرے دھیرے گردن جھکا کر سر کو ان کے سینے سے لگا دیا۔ اس کی گردن کی گولائی سے ان کے سینے کی وادی بھرپور ہو گئی، اس کے چہرے نے ان کے دل کو ڈھانپ دیا، اس کا کان ان کے دل کی گہرائیوں میں اتر گیا۔ اس کا منہ ان کی بغل میں تھا۔ اس کے سانس سے ان کے بازو میں، ان کے پہلو میں ٹھنڈ سرایت کرنے لگی، ان کا بدن ٹھنڈا ہونے لگا۔ ان کا سارا جسم ٹھنڈا ہو گیا، ان کے پاؤں، ان کی ٹانگیں، ان کی رانیں، ان کے کولہے، ان کا پیٹ، ان کے دل کے گرداگرد کا سینہ سن ہونے لگا۔ اس کے جسم کے بوجھ سے ان کا جسم کاؤچ کی کمر سے سرک

سرک کر کاؤچ کے بازو پر آ ٹکا تھا۔ ان کے جسم کی ٹھنڈک ان کے چہرے کو اور فردوس کے لباس سے اٹھتی ہوئی خوشبو ان کے دماغ کو شل کرنے لگی۔ فردوس کے جسم کی حدّت ان کے جسم کی ٹھنڈ پر قابو نہ پا سکی اور ان کے جسم و دماغ کی ٹھنڈاب ان کے دل کے قریب پہنچ رہی تھی۔ انہوں نے سوچ لیا کہ جب تک خود فردوس امتحان کے ختم ہونے کا اعلان نہ کرے گی وہ ملنے جلنے کی کوشش تک نہ کریں گے چاہے ان کا دل بھی شل ہو جائے۔ لحظہ بہ لحظہ فردوس کے جسم کا بوجھ ان کے جسم پر زیادہ ہو رہا تھا۔ اس کے جسم کی حدت کا احساس ان کے ذہن میں مبہم ہو رہا تھا۔ صرف ان کی ٹھوڑی کے ایک ننھے سے نقطے میں اس کے سر سے نکلتی ہوئی گرمی کی آنچ محسوس ہو رہی تھی۔ انہوں نے ٹھوڑی کو اس کے سر سے لگا دیا۔ اس کے سر سے گرمی کی لہریں اٹھ اٹھ کر ان کے جسم کی ٹھنڈ سے نبرد آزما ہونے لگیں۔ اس کشمکش میں ٹھنڈ کی ایک بہت بڑی لہر نے ان کے دل کو لپیٹ لیا۔ ان کے دل کی دھڑکن ایک لمحے کے لیے رکی۔ انہوں نے گھبرا کر اپنے سرد سرد ہونٹ فردوس کی گرم گرم گردن اور بالوں کے مقامِ اتصال پر پیوست کر دیئے۔ ان کے ہونٹوں کی سردی سے فردوس لرز اٹھی اور اس کے چہرے کی لرزش سے ان کا دل بہت زور سے دھڑکا۔ فردوس ہونٹوں کی سردی سے اور دل کے دھڑکنے سے ڈر گئی اور ایک دم جھٹکے سے سیدھی ہو کر بیٹھ گئی۔

اس کا دل زور زور سے دھڑک رہا تھا، اس کا سانس تیز تیز چلنے لگا۔ اس کی گردن کے ایک ننھے سے حصہ میں ابھی تک ٹھنڈ کنڈلی مارے بیٹھی تھی اور اردگرد کے حصوں سے بڑھتی ہوئی گرمی کو ڈس رہی تھی۔ وہ چند لمحوں میں موت کی سرحدوں تک ہو کر لوٹ آئی تھی۔ اس کو یقین ہی نہیں آ رہا تھا کہ متین صاحب کے ہونٹوں سے ہی ٹھنڈ اس کی گردن میں منتقل ہوئی تھی۔ وہ حیران ہو رہی تھی کہ کس طرح اس کے حسن کی آگ، اس کے خون کی گرمی، اس کے جوان جسم کی حدت، اس کے پیار کی تپش سے ان کے ہونٹوں کی برفیلی ٹھنڈ وجود میں آئی، اس کا پیار موت کی سرد ہواؤں میں ملبوس ہو گیا۔ بار بار اس کے ذہن میں سوال پیدا ہو رہا تھا کہ کیا اس کی رگوں میں جوان خون سرد ہو گیا تھا؟ اور کیوں؟ اور کیسے؟ اس کے دل میں شکست کا احساس جنم لے کر بڑی تیزی سے جوان ہو رہا تھا۔ اس کو اپنے حسن کے وجود پر ہی

شک ہونے لگا۔ وہ اٹھ کر جلدی سے آئینے میں اپنے آپ کو دیکھنا چاہتی تھی۔ خواہش پیدا ہوتے ہی وہ اٹھ کر کھڑی ہوگئی اور بھاگتی ہوئی اپنے ڈریسنگ روم میں جا کر آئینے کے سامنے کھڑی ہوگئی۔ چھت کے روشندان کے شفاف شیشوں سے چھن چھن کر آتی ہوئی دھوپ سے آئینے کے گرداگرد سنہری ہالہ بنا ہوا تھا۔ اس کا عکس آئینے میں جگمگا اٹھا اس کو شک سا گزرا کہ اس کا عکس محض سنہری ہالے کی وجہ سے جگمگا رہا ہے۔ یہ خیال آتے ہی اس نے ایک جھنجھلاتے ہوئے لمحے کے لیے دیکھا کہ اس کا حسن دھندلا گیا ہے۔ اس احساس سے آنکھیں دھندلا گئیں۔ دھندلائی ہوئی نظروں سے اس کا حسن اور بھی دھندلایا ہوا نظر آنے لگا۔ اس کے دل پر ایک کاری ضرب لگی اور اس کے آنسو نکل آئے۔ اس کو اپنے آپ سے حیا آنے لگی۔ وہ دل ہی دل میں، خیال ہی خیال میں اپنے حسن کے اچانک رخصت ہو جانے کا ماتم کرنے لگی۔ وہ دیر تک یونہی آئینے کے سامنے کھڑی ماتم کرتی رہی۔ اس نے دل کو تسلی دینے کی بہت کوشش کی کہ اگر اس کا حسن دھندلا گیا تو کیا ہوا کہ اس کی جوانی، اس کے جسم کی آب تاب تو باقی ہے۔ مگر اس کے ذہن کے کسی دور افتادہ افق پر ایک سوال کوند گیا۔

''تمہیں کیسے یقین ہے؟ حسن و جوانی ساتھ آتے ہیں اور ساتھ جاتے ہیں؟''

اس خیال نے اس کو بالکل پریشان کر دیا۔ اور اس نے پاگلوں کی طرح کپڑے اتارنے شروع کر دیئے۔ جب اتارنے کو کچھ نہ رہا تو اس نے ڈرتے ڈرتے نظریں اٹھائیں۔ آئینے کے گرد سنہری ہالہ نہ تھا۔ دھوپ میز کی پشت والی دیوار سے جا چکی تھی۔ اس نے کن انکھیوں سے آئینے میں دیکھا۔ اس کا دمکتا ہوا جسم جوان تھا، حسین تھا، اس نے گردن اٹھا، تن کر آئینے میں اپنے عکس کو بغور دیکھا۔ اس کو اپنی آنکھوں پر یقین نہ آیا۔ اس نے آنکھیں بند کر لیں۔ ہتھیلیوں سے پپوٹوں کی مالش کی۔ یکا یک اس کو جسم میں گرم گرم رو چلنے کا احساس ہوا۔ اس نے آنکھیں کھول دیں۔ بلندیوں سے دھوپ کا دھارا اتر کے اس کے جسم کو ڈھانپنے کی کوشش کر رہا تھا۔ آئینے میں اس کا عکس اس کی یادوں سے بھی زیادہ جوان اور حسین نظر آ رہا تھا، وہ دھوپ کے دھارے کے درمیان سے ہٹ کر آئینے کے قریب ہوگئی۔ عکس کے انگ انگ سے رنگ کی بڑی بڑی لہریں اٹھ رہی تھیں۔ اس کا ذہن، اس

کا تخیل ڈوبنے لگا۔ اس نے آنکھیں بند کرلیں اور اپنے اعصاب پر قابو پانے کے لیے اس نے اپنے حواس کو اکٹھا کرنا شروع کیا۔ اس کوشش کے دوران میں اس کو یاد آیا کہ اس نے ڈریسنگ روم کا دروازہ بند نہیں کیا تھا۔ یہ خیال آتے ہی اس نے محسوس کیا کہ متین صاحب دروازے میں کھڑے ہیں۔ وہ ایک دم مڑی۔ اس مڑنے میں وہ ایک شعلہ بن کر لرز اٹھی۔ ریشمی ڈوریوں سے بندھے ہوئے پردوں کی محراب سے لے کر ڈرائنگ روم کے دروازے پر پھڑ پھڑاتے ہوئے پردوں تک نظر جا کر لوٹ آئی۔ راستے میں خلا کے سوا کچھ نہ تھا۔ متین صاحب کہاں تھے؟ ابھی تک کاؤچ پر بیٹھے تھے یا اپنے کمرے میں چلے گئے تھے؟ ان سوالوں کا جواب جاننے کے لیے وہ بے تاب ہوگئی مگر کپڑے پہنے بغیر وہ اپنے سوالوں کا جواب کیسے جان سکتی تھی؟ وہ آئینے کی طرف مڑی۔ اس نے اپنے جسم کو، قدموں پر بکھرے ہوئے کپڑوں کے عکس کو دیکھا۔ اس کے جسم کا روغن دہک رہا تھا۔ اس نے جلدی جلدی کپڑے پہنے اور ڈریسنگ روم کے دروازے کے پاس جا کر رک گئی۔ اس نے پردوں کو ریشمی ڈوریوں سے آزاد کیا۔ اس کے اور پھڑ پھڑاتے ہوئے پردوں کے درمیان ایک اور پردہ حائل ہوگیا۔ اس کو اطمینان سا ہوا۔ وہ آہستہ سے پردہ اٹھا ڈرائنگ روم میں جا داخل ہوئی۔ متین صاحب کو کاؤچ پر نہ دیکھ کر وہ شرم سے لال بھبھوکا ہوگئی۔ اس نے ادھر ادھر نظر دوڑائی تو دیکھا کہ متین صاحب اس کے وائلن کو بڑے پیار اور حسرت سے دیکھ رہے تھے۔ اس کے قدموں کی چاپ سن کر اس کی طرف متوجہ ہوئے۔

''تمہارے وائلن نے جو احسان آج مجھ پر کیا ہے اس کو میں کبھی نہیں بھولوں گا۔ آج چاند نکلنے سے پہلے پہلے میں اس کو ایک بار پھر سننا چاہتا ہوں۔ نہیں! اب میرا دل نہیں ڈوبے گا۔''

ان کی انگلیاں وائلن کے تاروں کو سہلاتی رہیں۔ ان کی نظریں اس کے چہرے پر جمے ہوئے ہونے کے باوجود اس سے بہت دور تھیں۔ فردوس ان نظروں کے تعاقب میں آفاق سے بھی پرے جانے کو تیار تھی۔ وہ اس کے متعلق سوچ ہی رہی تھی کہ خاموشی نغمہ بن کر فضا میں شعلہ سمان بلند ہوئی۔

ان کی ٹھوڑی اور شانے کے درمیان وائلن کا پیٹ جکڑا ہوا تھا، وائلن کے ہینڈل کو سہارا دیئے ہوئے ہاتھ کی انگلیاں وائلن کے تاروں کو چھیڑ رہی تھیں۔ ان کے دائیں ہاتھ میں وائلن کا گز حکمِ سفر کا منتظر، ہوا میں ٹھٹکا، وائلن کی طرف جھکا، کھڑا تھا۔ فردوس کے دیکھتے دیکھتے گز وائلن کے تاروں پر چلنے لگا، ان کے بائیں ہاتھ کی انگلیاں تاروں میں شانہ کرنے لگیں۔

فردوس حیران ہوئی۔ متوجہ ہوئی اور پھر مبہوت ہوئی۔ نغمہ کے ساتھ ساتھ تصور ہی تصور میں رقص کرنے لگی۔ رقص کرتے کرتے وہ سب کچھ بھول گئی۔ اس کے ذہن کے آفاق تک اندھیرا چھا گیا۔ اس اندھیرے میں کہیں دور اونچے پہاڑوں کی اوٹ سے چاند نکل آیا۔ اس کی چاندنی آسمان پر پھیل گئی۔ چاند نظر نہ آتا تھا مگر اس کی چاندنی لحظہ بہ لحظہ آسمان سے فرش کی اُور بڑھ رہی تھی۔ چاند اپنی گپھا سے نکل آیا، اس کی چاندنی چارسو پھیل گئی۔ اس چاندنی میں ایک گلزار کھلا تھا۔ اس گلزار کے حدود کا کہیں پتہ نہ تھا۔ گلزار میں چاندی کی نہروں کا ایک جال بچھا تھا۔ نہروں کے جگہ جگہ سنگم تھے، ان سنگموں کے درمیان ننھے ننھے درختوں کے سائے میں، بیلوں کی اوٹ میں، پھولوں کے تختوں میں گھری سنگ مرمر کی دمکتی ہوئی بنچیں بچھی تھیں۔ ان بنچوں پر کہیں کسی شہزادے کے زانوؤں پر سر رکھے کوئی اپسرا سو رہی تھی اور کہیں اپسرا کے زانوؤں پر سر رکھے کوئی شہزادہ سو رہا تھا۔ ہر طرف خاموش چاندنی اور نہروں کی مترنم روانی کے سوا کچھ نہ تھا۔

یکا یک کہیں سے بانسری بجی، بانسری کی لے کے ساتھ ساتھ، طبل بجنے لگے، ناقوس بجنے لگے۔ ہر کنج میں شور مچا، ہر طرف ہاہا کار مچی۔ نرناری ہاتھوں میں ہاتھ دیئے نہروں کو پھلانگتے ایک طرف کو بھاگنے لگے۔ سب راستے ایک وسیع وعریض سبزہ زار میں جذب ہوگئے۔ نرناریاں بھاگتے بھاگتے وہاں پہنچ کر رک گئے۔ بانسری چپ ہوگئی۔ طبل وناقوس سو گئے۔ سب جوڑے ہاتھوں میں ہاتھ دیئے آسمان کی، چاند کی اور دیکھنے لگے۔ ان کے دیکھتے آسمان پر بادل چھا گئے، چاند چھپ گیا، چاندنی چھپ گئی، ہر طرف اندھیرا چھا گیا۔ بجلی چمکی، بادل گرجا، پریتمائیں پریتموں کے سینوں پر سر رکھے سسکیاں لینے لگیں۔ سبزہ

زار سسکیوں سے بھرپور ہو گیا۔

یکا یک بڑے زور سے بجلی چمکی۔ زمین و آسمان سرخ ہو گئے۔ بادل کڑکا۔ ناریوں نے ڈر کے مارے سسکیاں لیتے ہوے منہ پریتموں کی بغلوں میں چھپا لئے۔ بجلی بار بار چمکتی تھی اور زمین و آسمان میں ہر بار نیا رنگ بھر جاتا۔

پھر یکا یک اندھیرا دور ہوا، چاند نکل آیا، ہر سو چاندنی پھیل گئی۔ نرناریوں نے ایک دوسرے کی طرف جھجکتے ہوئے دیکھا۔ ان کے کپڑے اندھیرے میں بدل گئے تھے، ان کے کپڑوں میں دھنک کے رنگ ابھر آئے تھے۔ ناریوں کی چوٹیوں میں رنگ رنگ کے پھول گندھے تھے۔ وہ ابھی ایک دوسرے کو جی بھر کر دیکھنے بھی نہ پائے تھے کہ بانسری بجی۔ اس کی لے سے سبزہ زار بھر گیا۔ اس لے کے ساتھ طبل و ناقوس بھی دھیرے دھیرے بجنے لگے۔ بانسری کی لے اور طبل کی تھاپ اور ناقوس کی آواز تیز ہونے لگی۔

نرناریوں نے ایک دوسرے کے گرد ناچنا شروع کیا، لے، تھاپ، آواز تیز ہوتی گئی اور اس کے ساتھ ساتھ ناچ بھی تیز ہوتا گیا۔

آسمان سے گلال اور سنہرا سفوف برسنے لگا۔ چاند کی کرنیں آپس میں ایک دوسری کے گرد ناچنے لگیں۔ آسمان سے سنہری زنجیروں کا ایک گھومتا ہوا جال اترنے لگا۔

بانسری بجتی رہی، طبل و ناقوس بجتے رہے، نرناریاں ناچتے رہے، آسمان سے گلال اور سنہرہ سفوف برستا رہا، سنہری زنجیروں کا جال سبزہ زار پر محیط ہوتا رہا۔

پھر کہیں سے یکا یک کسی ناری کے گانے کی آواز آنے لگی۔ گانے کی لے میں بانسری کی لے، طبل کی تھاپ، ناقوس کی صدا، نرناریوں کے ناچتے ہوئے قدموں کی دھمک، سب کے سب گم ہوتے گئے۔ گانے کی لے قریب آتی رہی، فضا پر محیط ہوتی رہی۔ آخر زمین و آسمان میں جو کچھ تھا وہ اس گانے کی لے میں جذب ہو گیا۔

ناچتے جوڑے ناچتے ناچتے رک گئے، قطار اندر قطار کھڑے ہو گئے، گاتی ہوئی آواز ان قطاروں میں گھومتی قریب آتی جا رہی تھی۔ آواز کی رفتار رک گئی اور اب آواز نہ دور تھی نہ قریب تھی۔

قطاریں ایک دوسرے میں جذب ہو کر دائروں میں بٹ بٹ کر ایک وسیع دائرے میں ڈھل گئیں۔ ہر دائرے میں ایک جوڑا ناچ رہا تھا اور باقی لوگ دائرے کو کبھی اس جوڑے پر تنگ کر دیتے تھے اور کبھی کھلا۔ان دائروں کے بیچوں بیچ ایک ناری اکیلی ناچ رہی تھی۔اس کے جسم کے ابھینایوں سے اندازہ ہوتا تھا کہ وہ کسی کی متلاشی ہے۔غور سے دیکھنے سے پتہ چلتا تھا کہ گانے والی بھی وہی تھی۔

وہ ناچتی رہی، گاتی رہی، مگر اس کو کوئی ساتھی نہ ملا۔ چاندنی کی سنہری زنجیریں اس کے گرد لپٹنے لگیں۔ زنجیریں بھی اس کے ناچتے ہوئے جسم کے ساتھ ساتھ گھومنے لگیں۔ زنجیریں اور ناری دیر تک اکٹھے ناچتے رہے۔ ناری نے رقص تیز کر دیا۔ زنجیروں کے رقص میں بھی تیزی آ گئی۔ ناچتے ناچتے زنجیریں اس کے جسم کے ساتھ لپٹ گئیں اور پھر ایک دم اس کے گھومتے ہوئے جسم سے الگ ہو کر فضا میں گھومنے لگیں اور گھومتے گھومتے زنجیریں ایک جوان کی صورت اختیار کر گئیں۔ نوجوان اور ناری ناچتے ناچتے ایک دوسرے کے مدمقابل آ گئے۔ دونوں ٹھٹکے۔انہوں نے ایک دوسرے کو پہچان لیا اور ہاتھ میں ہاتھ دیئے، گھومتے دائروں کے درمیان سے باہر کی طرف بھاگے۔ وہ بڑے دائرے سے نکل دور اونچے پہاڑوں کی طرف بھاگنے لگے۔ راہ میں ندیاں، نالے، ان کا رستہ روکتے تھے مگر وہ سب کو پار کرتے گئے۔ آخر وہ ایک دریا کے کنارے پہنچے جس کا پاٹ بہت وسیع تھا۔ دریا میں طغیانی تھی دوسرا کنارہ نظر نہ آتا تھا۔

ناری نے گھبرا کر ادھر ادھر دیکھا مگر کشتی کا نام ونشان نہ تھا۔اس نے مڑ کر دیکھا تو اس کا ساتھی غائب تھا۔ وہ دریا کے کنارے تنہا رہ گئی تھی۔ دریا کے شور اور اس کی موجوں سے اس کو ڈر لگنے لگا۔

یکا یک چاند بھی آسمان سے غائب ہو گیا۔ ناری پریشان ہو گئی اور ڈر کے مارے رونے لگی۔ وہ رو رو کر بے حال ہو رہی تھی کہ کسی نے اس کے شانے پر ہاتھ رکھ دیا۔ وہ چونکی اور شکایت آمیز نظریں آنے والے کی طرف پھیر دیں۔ آنے والا اس کا ساتھی نہ تھا۔ وہ تو چاند تھا جو آسمان سے اتر آیا تھا۔ چاند کو وہ روز دیکھتی مگر اس کو کبھی خیال نہ آتا تھا کہ وہی اس

کا ساتھی ہوگا۔

اس کا نیا ساتھی کہیں سے کشتی کھینچ لایا۔اس نے کشتی دریا میں ڈال دی، ناری کو اس میں بٹھایا اور اس کے بعد اس کو دھکا دے خود بھی اس میں سوار ہوگیا۔موجیں کشتی کو بار بار اپنی لپیٹ میں لے لیتیں مگر ہر بار کشتی ان کی آغوش سے نکل جاتی۔ایک بار وہ موجوں کی لپیٹ سے نکلے ہی تھے کہ ایک بہت بڑی موج ان کی طرف بڑھی اور ان کی کشتی، اس کے اندر گم ہوگئی۔

فردوس چونکی۔نغمہ سوگیا تھا۔اس کی آنکھ نے ایک آخری منظر اور دیکھا اور وہ بیدار ہوگئی۔اس نے دیکھا کہ کشتی کنارے پر اوندھی پڑی ہے اور دور مشرق کی اور چڑھتے سورج کی طرف ناری اور اس کا ساتھی بڑھے چلے جارہے ہیں۔

فردوس نے متین صاحب کی طرف دیکھا تو وہ وائلن اور وائلن کے گز کو بکس میں رکھ رہے تھے۔بکس بند کر کے وہ اس کی طرف مڑے اور اس کی طرف بڑھے۔انہوں نے فردوس کو دائیں بغل میں لے لیا اور اس کی ٹھوڑی کے نیچے انگلی رکھ کر اس کے چہرے کو اوپر اٹھاتے وہ بولے:

’’جاگتے میں بھی خواب دیکھتی ہو۔کب تک یونہی خواب دیکھتی رہو گی۔جاگو! سنو! قدموں کی چاپ! آغا جی اور سب لوگ آرہے ہیں شاید۔آؤ۔‘‘

حصہ ششم

پہلا باب

''بٹیا کوئی تم سے ملنے آئے ہیں۔ میں نے ان کو بڑے کمرے میں بٹھا دیا ہے۔''

''کون ہیں؟''

''میں نہیں جانتا۔ میں نے ان کو پہلے کبھی نہیں دیکھا۔ اک ادھیڑ عمر کے صاحب ہیں اور ان کے ساتھ ایک عورت ہے جس کی شکل تمہاری والدہ سے بہت ملتی ہے۔ کافی معزز معلوم ہوتے ہیں۔ آدمی کے چہرے سے وقار اور رعب جھلکتا ہے۔ میں ان سے پوچھ ہی نہیں سکا کہ ان کا نام کیا ہے؟ اور وہ کہاں سے آئے ہیں؟''

''متین صاحب! آیئے چلیں۔''

جب فردوس نے مخاطب کرتے ہوئے ان کے چہرے کی طرف دیکھا تو ان کے چہرے پر تعجب اور مسکراہٹ کی ایک بہت ہی ڈرامائی کیفیت دیکھ کر اس کو حیرانی ہوئی مگر یہ سوچ کر کہ متین صاحب کی ہر حرکت بامعنی ہوتی ہے اس نے سوال کرنا مناسب نہ سمجھا اور اس امید پر کہ اس کیفیت کے معنی اس پر جلد ہی کھل جائیں گے وہ خاموش رہی اور ان کے ہاتھ میں ہاتھ دیئے وہ کمرے سے نکل گلی میں داخل ہوگئی۔ گلی میں داخل ہوتے ہی اس نے محسوس کیا کہ متین صاحب کی رفتار میں تیزی ہے جیسے کہ وہ آنیوالوں سے ملنے کیلئے بہت مشتاق ہیں۔

کمرے میں داخل ہوتے ہی پردوں کے پیچھے متین صاحب نے فردوس کو روک لیا اور

پردوں کے پیچھے سے مہمانوں کو دیکھا۔ مرد کی عمر کوئی ساٹھ کے لگ بھگ تھی اس کے پروقار اور وجیہہ چہرے پر سادھی کی کیفیت تھی۔ اس کے سارے جسم پر سکون کی ایک اتھاہ حالت طاری تھی۔ اس کا لباس امارت، خوش مذاقی کا مظہر تھا۔ اس کو دیکھ کر فردوس کو ایک کوندے کے لیے گمان ہوا کہ اس کے دل میں ہوک اٹھی ہے اور اس ہوک نے پیار کا، رحم کا، روپ دھار لیا ہے۔ اس کا جی چاہا کہ وہ دوڑ کر اس کے پاس جائے اور اس کے قدموں میں بیٹھ جائے۔ اس خیال سے اسے تعجب ہوا، سرور ملا اور اس کی خودداری کو ٹھیس سی لگی۔ وہ حیران تھی کہ آخر ایسا کیوں؟ وہ اجنبی مرد کون تھا؟ اس نے ان احساسات اور خیالات سے دامن بچانے کی خاطر اپنی نظروں کو مرد سے ہٹا کر عورت پر مرکوز کر دیا۔ اس کے دل و دماغ اس خیال سے بھرپور ہوئے کہ میرا ہی روپ ہے۔ یہ خیال آتے ہی اس کے قدموں میں حرکت ہوئی اور وہ متین صاحب سے ہاتھ چھڑا کر جلدی سے پردے ہٹا عورت کی طرف والہانہ انداز میں بڑھی۔ قدموں کی چاپ سے عورت اپنے خیالوں کی دنیا سے جاگی، فردوس کو اپنی طرف بڑھتے ہوئے دیکھا ایک دم اٹھی، بانہیں پھیلا کر فردوس کی طرف لپکی اور فردوس کو سینے سے لپٹا لیا۔

متین صاحب نے یہ منظر جو دیکھا تو پردوں کو چھوڑ، مڑے اور کمرے سے نکل، گلی میں جا کھڑے ہوئے۔

قدموں کی چاپ نے مرد کو بھی جگا دیا اور اس نے پردوں کے پیچھے لوٹتے ہوئے قدموں کو دیکھا۔ گردن موڑ کر اپنے دائیں دیکھا، اس کی بھویں سکڑیں، اس نے متذبذب ہو کر ادھر ادھر دیکھنے کو نظریں اٹھائیں۔ دو عورتوں کو ایک دوسرے سے لپٹے ہوئے دیکھ کر متعجب ہوا، اپنی بیوی کے شانے پر نیم خواب چہرے کو دیکھ ششدر رہوا، اس کے لبوں سے ایک چیخ نکلی اور وہ اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔

چیخ سن کر دونوں عورتیں ایک دوسرے سے علیحدہ ہوئیں اور ایک ساتھ مڑ کر مرد کو حیرانی سے دیکھنے لگیں۔ اس کے سامنے ایک ہی روپ کی دو مورتیں کھڑی تھیں۔ وہ بت بنا کبھی ایک کو کبھی دوسری کو دیکھتا تھا۔ دیکھتے دیکھتے وہ کپکپانے لگا، اس کا چہرہ رنگ بدلنے

لگا۔

ہرلمحہ اس کے جسم میں کپکپاہٹ تیز ہوتی گئی، اس کے چہرے پر، اس کی آنکھوں میں مختلف کیفیات کوندرہی تھیں، دونوں کو یوں لگ رہا تھا کہ اس کا سارا جسم مختلف کیفیات کی تصویروں میں تحلیل ہوجائے گا اوران تصویروں کے سوا اس کے جسم کا نام ونشان نہ رہے گا۔

فردوس اس کو دیکھتی جاتی تھی اور اس کے دل میں جذبات کا، اس کے جسم میں سنسنیوں کا، اس کے ذہن میں خیالات کے کوندوں کا ایک طوفان جاگ رہا تھا، اس کو لگ رہا تھا کہ اگر اگلے چند لمحوں میں اس کے ماحول میں کوئی حرکت پیدا نہ ہوئی، تو وہ کوئی ایسی حرکت کر بیٹھے گی جس سے اس کی، اس عورت کی اور مرد کی زندگیاں بدل جائیں گی اور خود اس کو بہت ہی زیادہ دکھ ہوگا۔ اس کشمکش میں اس کی حالت غیر ہورہی تھی۔

فردوس کے جسم سے علیحدہ ہوکر وہ عورت بڑے غور سے مرد کی آنکھوں میں بدلتے ہوئے مناظر کو دیکھنے لگی۔ مرد کی آنکھوں میں، اس کے چہرے کے نقوش کی بدلتی ہوئی شکلوں میں ایک ایسا والہانہ پن تھا جس کا احاطہ کرنا، اس کے بس میں نہ تھا۔ وہ ان بدلتے ہوئے مناظر کی تاب نہ لاسکی، اس کی نظریں جھک گئیں، اس نے آنکھیں بند کرلیں اور پھر ایک دم اس نے گردن موڑ، آنکھیں کھول فردوس کے چہرے کو بغور دیکھنا شروع کیا۔ چہرے پر اور آنکھوں میں جذبات کے منظر اتنی تیزی سے بدل رہے تھے، اوران مناظر میں روشنی اور آگ کی کیفیات اتنی تیزی سے تیز، تیز تر ہورہی تھیں کہ اس کو ڈر لگنے لگا۔ وہ مرد اور فردوس کی حالتوں سے سخت پریشان ہونے لگی۔ وہ آنیوالے طوفان کو روک دینا چاہتی تھی مگر اس کو اپنی بے بسی کا احساس نہایت شدت سے ہورہا تھا۔ اس نے ہمت کرکے لب کھولے:

"فردوس! یہ ہیں جمیل صاحب! ان کی والدہ نے تمہاری مرحومہ نانی کی بے وقت موت کے بعد تمہاری مرحومہ والدہ کو دودھ پلایا، پالا، پرورش کیا۔ تمہاری والدہ اور یہ دونوں دودھ شریک تھے۔ اس لئے یہ تمہارے ماموں ہوئے۔ تمہاری طرح تمہاری والدہ بھی بچپن میں ماں سے محروم ہوگئی تھیں۔

میرا نام رابعہ ہے۔ میں تمہاری ممانی ہوں۔ جب میں نے تمہیں پہلی بار دیکھا تو جھولے میں پڑی تھیں۔ تمہاری آیا تمہیں لوریاں دے رہی تھی۔ تمہاری والدہ تمہارے جھولے پر جھکی ہوئی تھی۔ تم اپنی ماں کو دیکھ کر اٹھ بیٹھیں اور مجھے دیکھ کر بہت حیران ہوئیں، تمہاری والدہ نے میری طرف دیکھا اور مجھے کھینچ کر تمہارے جھولے تک لے گئیں۔ میں نے تمہیں پکارا تو تم میرے پاس آ گئیں۔ ہم تمہیں ڈرائنگ روم میں لے آئے۔ تم مجھ سے کھیلتی رہیں۔ میں تم سے باتیں کرتی تھی، تمہیں گدگداتی تھی، تم ہنستی تھیں۔ نہ جانے کب تک تم اور میں باتیں کرتے رہے، ہنستے رہے۔ پھر نہ جانے یکا یک مجھے کیا ہوا کہ میں رونے لگی اور تم مجھے روتے دیکھ کر ہنستے ہنستے رونے لگیں۔ تمہاری والدہ باہر سے دوڑی آئی۔ میرے آنسو پونچھے، تمہارے آنسو پونچھے۔ میں نے تمہیں دیکھا تو تم میری طرف بڑے غور سے دیکھ رہی تھیں۔ میں تمہارے بالوں سے کھیلنے لگی اور کھیلتی رہی، تمہیں دیکھتی رہی۔ تم مسکراتے مسکراتے میری گود میں سو گئیں۔

اس دن مجھے زندگی میں جتنی خوشی ہوئی وہ آج تک میرے لیے زندگی کا سہارا ہے۔ جب بھی وہ دن مجھے یاد آتا ہے تو میرے غموں کا، دکھوں کا، بوجھ میرے دل سے اتر جاتا ہے۔

تمہارے ماموں تمہاری والدہ کی موت سے کچھ دن پہلے، اپنے ذہن کا توازن کھو بیٹھے تو مجھ پر غموں کے پہاڑ ٹوٹ پڑے۔ تمہاری صورت، تمہاری مسکراہٹ، مجھے یاد آ جاتی اور میری ہمت بندھ جاتی۔ کچھ برسوں سے ان کا ذہنی توازن کچھ لمحوں کے لیے لوٹ آنے لگا ہے، پچھلے چند مہینوں سے میرا خیال ہے کہ ان کا ذہنی توازن کم و بیش برقرار ہے۔

''کوئی مہینہ ہونے کو آیا ہے کہ میں نے سنا کہ تم یورپ سے چھ سال کے بعد لوٹ آئی ہو۔ تبھی سے تمہیں ملنے کو میں بے قرار تھی۔ مگر ہچکچاتی تھی، سوچتی تھی کہ تم جنگ کے صدموں سے نڈھال ہو کر آئی ہو، نہ جانے کس حال میں ہو گی، اس حال میں تم سے ملنا مناسب بھی ہو گا یا نہیں؟

''آخر ہمت کر کے ولی پور تمہیں ملنے گئی تو تمہارے والد سے پتہ چلا کہ تم یورپ سے

سیدھی یہاں چلی آئی ہو، ان سے بھی نہیں ملی۔ یہ جان کر میری رہی سہی ہمت ٹوٹ گئی۔

''پچھلے چند دنوں سے تمہارے ماموں بار بار پوچھتے رہے صالحہ کی ایک بیٹی تھی۔ کہاں ہے آج کل؟ کتنی بڑی ہوگئی ہوگی؟''

''جب میں نے انہیں بتایا کہ تم یہاں ہو تو انہوں نے تمہیں دیکھنے، ملنے کے لیے بہت اصرار کیا۔ میں نے ایک بار پھر ہمت باندھی اور یہاں چلی آئی۔''

رابعہ نظریں جھکائے، رکے بغیر بولتی رہی۔ نظر اٹھا کر اس کو دونوں میں سے کسی کو دیکھنے کی ہمت نہ ہو رہی تھی۔ لحظہ بہ لحظہ اس کے پاس کہنے کے لیے مواد کی کمی ہوتی گئی، اس کے ڈر میں اضافہ ہوتا رہا کہ اس کی باتوں کے درمیان نہیں تو اس کی باتوں کے ختم ہونے کے فوراً بعد طوفان جو فردوس اور جمیل کے دل و دماغ میں جاگ رہے ہیں وہ ہر آنے والے لمحے کو بہا کر لے جائیں گے۔

اس کی باتیں ختم ہوگئیں۔ اس کا ڈر اپنی انتہا کو پہنچ گیا مگر آنیوالا طوفان نہ آ چکتا تھا۔ کمرے میں کسی قسم کی حرکت کا، آواز کا، احساس تک نہ تھا۔ اس کے اپنے سانس کے تیز تیز چلنے کی آواز کے سوا کچھ نہ تھا۔ اس کے ذہن میں کوندا، ان کے تنفس کی آواز نہیں آ رہی۔ ''شاید فردوس اور جمیل دونوں پتھر بن گئے ہیں۔'' اس کے ذہن میں دیوانگی کی لہر اٹھی اور طوفان بنا چاہتی تھی کہ اس نے نظریں اٹھائیں جمیل صاحب کی آنکھوں میں ایک پر تعجب مسکراہٹ کھل رہی تھی، ان کے چہرے کے نقوش میں مترنم سکون تھا۔ اس نے ڈرتے ڈرتے فردوس کی طرف دیکھا۔ وہ اس کو حیرانی سے تک رہی تھی۔ مگر اس حیرانی میں وحشت کے، جنوں کے آثار بالکل نہ تھے۔ اس حیرانی میں پیار اور انگڑائی لیتی ہوئی راحت اور مسرت کے جذبات ابھر رہے تھے۔

''بیٹی! رابعہ! آؤ بیٹھیں۔ تم بیٹی! یہاں! میرے سامنے اس کرسی پر اور رابعہ تم فردوس کے پاس اس کرسی پر بیٹھو۔ میں تم دونوں کو جی بھر کے دیکھنا چاہتا ہوں......''

دونوں بتائی ہوئی کرسیوں پر بیٹھ کر جمیل کو دیکھنے لگیں۔ جمیل صاحب کی آنکھیں، ان کے نقوش، متکلم تھے مگر اس تکلم کو سمجھنے میں دونوں کو دقت ہو رہی تھی۔

رابعہ کو یاد نہ آ رہا تھا کہ اس نے ان کی آنکھوں میں اس سے پہلے کب اتنا تکلم دیکھا تھا۔ شاید شادی کے پہلے چند ہفتوں کی کوئی صبح تھی۔ اس کو یاد آ رہا تھا۔ اس کے تخیل میں وہ منظر جنم لے رہا تھا، اس کے دل میں وہ جذبات، اس کے جسم میں وہ گدگدی اور میٹھا میٹھا درد جاگ رہا تھا جو اس صبح ان کی چمکتی ہوئی آنکھوں میں جھلکتے ہوئے کیف، ان کے روغنی ہونٹوں کی ملگجی مسکراہٹ کو دیکھ کر اس کے دل میں پیدا ہوئے تھے اور اس کے جسم میں جاگے تھے۔ اس دم وہ پلنگ کے کٹہرے پر ہاتھ رکھے، پلنگ کے اس پار کھڑکی میں سے شفق آلود افق پر ابھرتے سورج کو دیکھتے تھے اور کبھی اس کے چہرے پر کھیلتی ہوئی کرنوں کو دیکھتے تھے۔ اس کی خواب آلودہ، کرنوں کی روشنی سے چندھیاتی ہوئی آنکھوں اور ان کے جھکے ہوئے چہرے کے درمیان صبح کی نرم نرم ہوا سے ٹھٹھرتے ہوئے سنہری دھندلکے حائل تھے۔ ان دھندلکوں نے ان کے حسین نقوش کی وضاحت کو دھندلا کر اور بھی حسین بنا دیا تھا۔ اس نے اپنے جذبات کی بیبا کی سے شرما کر آنکھیں بند کر لیں تو اس کے خون کی گردش اس کے کانوں میں سنسنانے لگی تھی...... مگر آج اس کو اپنے جذبات سے، اپنے جسم کی سنسناہٹ سے، شرم محسوس نہ ہو رہی تھی۔ اس نے تجزیہ کرنے کی کوشش کی کہ آج اس کے جذبات اور اس کے جسم کی سنسناہٹ سے اس کے ذہن میں وہ تاثر کیوں مرتب نہ ہو رہا تھا جو اس صبح ہوا تھا۔ اس کے ذہن نے کہا کہ تب وہ جوان تھی، ان کی آنکھوں کی چمک میں جھلکتے ہوئے جذبات جوان تھے، اس کا دل ناتجربہ کار تھا اور سب سے اہم یہ کہ اب اس کا دل، اس کا ذہن، اس بات کی خوشی سے بھرپور ہو رہا تھا کہ ان کا ذہنی توازن پوری طرح برقرار ہو گیا ہے اور ان کے دل سے صالحہ کی آرزو محو ہو گئی اور فردوس کے لیے، خود اس کے لیے، جینے کی آرزو ان کے دل میں جنم لے چکی ہے۔ اس تجزیے سے اس کا دل مطمئن ہو گیا اور اس نے پر اعتماد نظروں سے ان کی طرف دیکھا۔ ان کے چہرے کے نقوش ہم آہنگ تھے۔ ان کی نظروں میں تذبذب نہ تھا، وحشت نہ تھی، سمادھی کی کیفیت نہ تھی۔ ان کی آنکھوں کی چمک آنکھوں کو بھلی لگ رہی تھی، ان کے جسم میں کھچاؤ کی بجائے آرام سے لطف اندوز ہونے کی کیفیت تھی، ان کے ہونٹوں کا رنگ پھیکا نہ تھا۔ ان کی حالت سے اس کا ذہن بھی مطمئن ہو گیا۔

وہ اپنے خیالات کی رو میں فردوس کے وجود کو بھول چکی تھی۔ جمیل صاحب کی حالت سے مطمئن ہوتے ہوئے جب اس کو فردوس کا خیال آیا تو اسے گناہ کا اتنا شدید احساس ہوا کہ وہ بوکھلا گئی، اس کا بدن جلنے لگا، اس کی آنکھوں کے سامنے سرخ سرخ شعلے آ گئے۔ اس نے مڑ کر فردوس کو دیکھنا چاہا مگر اس کی گردن سخت ہو گئی تھی، اس نے گھبرا کر اس کو پکارنا چاہا مگر اپنی آواز پر قابو نہ پا سکی۔ اس کو خیال آیا کہ شاید اس کے خودغرض اطمینان کی سزا میں اس سے اس کا نطق چھن گیا ہے۔ وہ ان احساسات، ان جذبات، ان خیالات کے اس دمبدم تلون سے ہوش و حواس کھو بیٹھی۔ اس حیرانی اور بے بسی کی حالت میں اس کے ذہن میں کوندا کہ اس کا ذہنی توازن بگڑ گیا ہے اور بگڑا رہے گا۔ اس خیال سے اسے اتنا دھچکا لگا کہ وہ ذہنی توازن کھو بیٹھی۔

فردوس نے کہ اپنے جذبات، خیالات، احساسات کا تجزیہ کرنے میں محو تھی جو نظر اٹھائی تو رابعہ کے چہرے پر جا ٹھہری۔ رابعہ کی حالت نے اس کو چونکایا اور اس نے محسوس کیا کہ اگر اس نے رابعہ کو پکارا نہیں تو رابعہ پاگل ہو جائے گی۔ اس نے گھبرا کر اس کو پکارا:

''امی! امی! تمہیں کیا ہو گیا ہے۔ میری طرف دیکھو، جمیل صاحب کی طرف دیکھو! جہاں بھی ہو وہاں سے لوٹ آؤ۔ میرے پاس، جمیل صاحب کے پاس۔''

فردوس کی آنکھوں نے دیکھا کہ رابعہ کے کان کھنچ گئے ہیں، اس کے بالوں نے ایک ننھی سی انگڑائی لی ہے، اس کے نتھنے پھولے ہیں، پھڑ پھڑائے ہیں، اس کے نیم وا ہونٹوں میں تشنج پیدا ہوا ہے، اس کی آنکھوں میں سایوں کا گردباد دوڑتے دوڑتے ایک دم رکا اور سو گیا ہے، اس کے شانے پھڑ پھڑائے ہیں، اس کے ہاتھ پھڑ پھڑائے ہیں، پھڑ پھڑاتے ہوئے فضا میں اٹھے ہیں اور اٹھتے ہی اس کے چہرے پر سایہ کرتے ہوئے لوٹنے لگے ہیں۔

اس کے چہرے سے اٹھتے ہوئے شعلے اس کے رنگ میں جذب ہو گئے، اس کا رنگ گلابی ہوا۔ اس کے ماتھے پر، چہرے پر پسینے کے قطرے نمودار ہوئے، اس نے لبوں پر زبان پھیری، اس کے لعاب کی تری سے اس کے خشک ہونٹوں پر روغن کی سی جلد آ گئی، اس کے ماتھے سے شبنم ڈھلک کر اس کی آنکھوں میں ٹپکی، اس کی پلکیں کپکپائیں، اس کی آنکھوں

سے آنسو بہہ نکلے، اس کے لب پھڑ پھڑائے اس کا سارا جسم تھرایا، اس کے پاؤں میں حرکت ہوئی اور وہ فردوس کی طرف پکارتی ہوئی دوڑی اور اس کی کھلی بانہوں نے اس کو سینے سے لپٹا لیا۔ اس کی آواز، اس کی پکار تھمتی ہی نہ تھی۔

''بیٹی! بیٹی! میں لوٹ آئی ہوں، میں لوٹ آئی ہوں! اب مجھے اپنے سے دور نہ جانے دینا! مجھے......''

رابعہ کے آنسوؤں سے فردوس کا بایاں شانہ، اس کے شانے اور سینے کے درمیان کا حصہ تر ہو گیا۔ اس نے رابعہ کی کمر میں جکڑے ہوئے ہاتھوں کو کمر سے اٹھایا، ہاتھوں سے رابعہ کے سر کو اپنے شانے سے اٹھایا، اس کی آنکھوں میں جھانکا جھیل میں تلاطم نہ تھا، موجیں نہ تھیں، مکمل سکون تھا، فردوس نے رابعہ کا ماتھا چوما، اس کی آنکھوں کے پپوٹوں کو چوما، اس کے آنسوؤں سے تر رخساروں کو چوما، اس کے پھڑ پھڑاتے ہوئے ہونٹوں کو چوما، فردوس کے ہونٹ اس کے ہونٹوں سے آگے نہ چل سکے۔ رابعہ کا جسم فردوس کی بانہوں میں ڈھیلا پڑ گیا اور ڈھلک کر اس کی بانہوں سے پھسلنے لگا۔ فردوس نے اس کے پھسلتے ہوئے جسم کو تھام لیا اور نظریں اٹھا کر جمیل صاحب کی طرف دیکھا۔ جمیل صاحب نے بڑھ کر رابعہ کے پھسلتے ہوئے جسم کو اٹھایا اور اٹھا کر کاؤچ پر ڈال دیا۔ رابعہ کا سانس متوازن رفتار سے چل رہا تھا، وہ بے ہوش ہو گئی تھی یا شاید سو گئی تھی۔ جمیل صاحب نے فردوس کی طرف دیکھ کر کہا:

''یہاں کوئی ڈاکٹر......''

بیشتر اس کے کہ وہ فقرہ مکمل کرتے فردوس دروازے کی طرف بھاگی، دروازے تک پہنچ کر اس نے گردن موڑ کر کہا:

''ابھی لائی۔''

اس کے دوڑتے ہوئے قدموں کی آواز گلی میں گونجنے لگی۔ جمیل صاحب کے کان اس آواز پر لگے تھے۔ قدموں کی آواز رکی اور ایک اور آواز بلند ہوئی!

''متین صاحب! آیئے! جلدی''

متین صاحب اپنے کمرے میں پلنگ اور دروازے کے درمیان کھڑکی کی طرف منہ کئے چپ چاپ کھڑے تھے۔ فردوس کی آواز نے ان کو چونکا دیا۔ وہ مڑے ان کی نظروں میں سوال تھا کہ کیا ہوا۔

''جلدی چلئے! امی کو کچھ ہو گیا ہے!''

''امی؟'' متین صاحب نے دہرایا اور مڑ کر پلنگ کی طرف دیکھا۔ ان کے سوال کا جواب نہ ملا۔ وہ مڑے۔ انہوں نے فردوس کی طرف غور سے دیکھا۔ فردوس کے ماتھے کی شکنوں سے پتہ چلتا تھا کہ وہ کچھ سوچ رہی تھی۔ اس کے چہرے پر تذبذب کی کیفیت ابھر آئی اور اس کا چہرہ اور بھی حسین ہو گیا۔ اس نے پلکیں اٹھائیں، پلکوں کے اٹھتے ہی اس کے چہرے کے رنگ نے کروٹ لی۔ اس کے چہرے سے تذبذب کی کیفیت غائب ہوئی مگر اس کے حسن کی کیفیت برقرار رہی۔

''آؤ۔'' متین صاحب کی آواز میں تذبذب نہ تھا، سوال نہ تھا، سوال کی خواہش بھی نہ تھی، ان کی آواز میں اعتماد تھا، حکم تھا۔

فردوس اس پُر اعتماد آواز کا سہارا لیے، اس آواز کے حکم کو بجا لائے بغیر نہ رہ سکی اور دونوں رابعہ اور جمیل کی طرف لپکے۔

کمرے میں داخل ہوتے ہی متین صاحب نے جمیل صاحب کے، جو قدموں کی تیز چاپ سن کر دروازے کی طرف منہ کئے مڑ چکے تھے، چہرے پر ایک سرسری سی نگاہ ڈالی اور صوفے پر پڑی ہوئی رابعہ کی طرف متوجہ ہو گئے۔ صوفے کے قریب جا کر وہ کھڑے رابعہ کے بے سدھ جسم کو، پرسکون چہرے کو، دھیرے دھیرے ابھرتے ڈھلکتے سینے کو دیکھنے لگے، اس کے تنفس کی مدھم لے کو سننے لگے، انہوں نے اپنی نظروں کو جسم سے اٹھتے ہوئے موج در موج رنگ سے چھڑایا، مدھم لے سے اپنے کانوں کو بچایا، ادھر ادھر دیکھا، پیانو کے پاس پڑے سٹول کو اٹھا لائے اور سٹول کو صوفے کے قریب رکھ، رابعہ کے دائیں ہاتھ کو اٹھا، نبض پر ہاتھ رکھ، نبض کی پھڑ پھڑاہٹوں کو گننے لگے۔ نبض ٹھیک چل رہی تھی۔ انہوں نے اطمینان کی خاطر دوسرے ہاتھ کو اٹھا نبض کی پھڑ پھڑاہٹوں کو گننا شروع کیا۔

گنتے گنتے ان کی نظریں رابعہ کے چہرے کی طرف کھنچی چلی گئیں۔اس کے چہرے کو دیکھ کر ان کو یاد آیا کہ صالحہ کی شکل بھی وہی تھی جو رابعہ کی ہے۔وہ اصل تھی اور یہ اس کا عکس۔ وہ عکس کے قریب تھے، وہ عکس کو بچا سکتے تھے مگر اصل ان سے دور، زندگی کے نشیمن سے آگے،ان کی دسترس سے ماورا تھی۔وہ اس وقت کہاں تھے جب صالحہ یونہی بے سدھ پڑی، اپنے پلنگ پر موت کا انتظار کر رہی تھی۔شاید اس گھڑی اخبار فروش گلیوں میں میٹرک کے امتحان کے نتیجے کا اعلان کر رہے تھے۔

نبض زور سے پھڑ پھڑائی اور متین صاحب ایک جھٹکے سے واپس لوٹ آئے۔انہوں نے مریض کو دیکھا۔مریض کے چہرے پر رنگوں کا سفر منزل پر پہنچ چکا تھا۔چہرے پر گلابی رنگ لوٹ آیا تھا۔متین صاحب اسٹول سے اٹھ کھڑے ہوئے۔انہوں نے ایک بار پھر مریض کے جسم پر نظر ڈالی۔مریض سو رہا تھا۔اس کے چہرے سے عیاں ہو رہا تھا کہ اس کا شعور بیدار ہوا چاہتا ہے۔متین صاحب نے سٹول اٹھایا اور پیانو کے پاس رکھ آئے۔واپس پلٹ کر انہوں نے جمیل اور فردوس کے متفکر چہروں کی طرف دیکھا۔انہوں نے دونوں کو مطمئن نظروں سے دیکھا اور ان کی نظر نے ان کے چہروں سے فکر کو دھوڈالا۔

''فکر کی کوئی بات نہیں۔ان کے ذہن کو جو دھچکا لگا ہے اس کا اثر اب زائل ہو رہا ہے۔ ان کے شعور نے ان کے جذبات پر قابو پا لیا ہے۔انہیں ابھی سونے دیجئے۔ان پر گرم چادر ڈال دیجئے۔تاکہ پسینہ آنے سے ان کے بدن کا تناؤ نرم پڑ جائے۔

معلوم ہوتا ہے کہ ان کی قوتِ ارادی کافی زبردست ہے۔صحت بھی ماشاء اللہ قابلِ رشک ہے۔اتنے بڑے دھچکے کو شاید ہی کوئی اور اتنی جلدی جذب کر سکتا۔''

''فردوس! بھئی تم نے ڈاکٹر صاحب سے تعارف نہیں کرایا؟''

''مجھے متین کہتے ہیں۔مدت ہوئی میں طب کو چھوڑ کر فلسفہ پڑھاتا ہوں لیکن اب پھر اپنے پہلے پیشے کو اختیار کر رہا ہوں۔''

''مجھے جمیل کہتے ہیں۔فردوس کی والدہ نے میری ماں کا دودھ پیا تھا۔اس رشتے سے میں فردوس کا ماموں ہوتا ہوں اگر چہ فردوس سے آج میری پہلی ملاقات ہے۔''

''جمیل صاحب! متین صاحب میرے بہت ہی عزیز دوست ہیں چند دنوں سے داوَدنگر میں ہیں۔ میں ان کی ممنون ہوں کہ انہوں نے میرا مہمان بننا قبول کیا۔ میں نے اپنی زندگی میں بہت ہی سفر کیا ہے مگر ان کے ساتھ میں نے پچھلے چند دنوں میں جتنا سفر کیا ہے وہ شاید میری تمام عمر کا حاصل ہے۔''

''میں مطمئن تھا، منزل سے دور تھا۔ جب سے فردوس سے ملاقات ہوئی ہے مطمئن نہیں ہوں مگر میری منزل میرے قریب آ گئی ہے۔''

جمیل صاحب متین صاحب کو بڑے غور اور دلچسپی سے دیکھ رہے تھے۔ ان دونوں کے مکالمے سے ان کی آنکھوں میں تجسس کے ساتھ اب پیار بھی گھل ملنے لگا۔ ان کا جی چاہا کہ وہ دونوں کو ایک ساتھ سینے سے لپٹا لیں مگر متین صاحب کے چہرے کے تدبّر اور متانت نے ان کی اس خواہش کو عمل کی صورت دینے سے روک لیا مگر ان کی یہ خواہش دب نہ سکی اور انہوں نے اپنی خواہش اور حالات کا سمجھوتہ کراتے ہوئے دونوں کے کندھوں پر ہاتھ رکھ، دونوں کو صوفے پر پاس پاس بٹھا، خود سامنے بیٹھ اطمینان کو اپنے قریب کر لیا۔

دونوں ساتھ ساتھ بیٹھے ان کو اتنے، پیارے اور خوبصورت لگ رہے تھے کہ ان کے دل سے دعا نکلی کہ وہ دونوں یونہی پہلو بہ پہلو بیٹھے رہیں، ساتھ ساتھ چلتے رہیں، ایک اگر دور ہو تو دوسرا خوش آمدید کہنے کے لیے ہر لمحہ منتظر رہے مگر ان کے اندر کسی گوشے سے ننھی سی آواز آئی۔ ''افسوس! تمہاری یہ دعا قبول نہیں ہو سکتی۔'' انہوں نے اس آوز پر کان دھرنا نہ چاہا مگر آواز ان کا تعاقب کرنے پر مُصر تھی۔ اس اصرار کی وجہ ان کی سمجھ میں نہ آتی تھی۔ وہ اس آواز کو سنتے تھے اور نیم وا آنکھوں سے ان دونوں کو دھیمے دھیمے سانس لیتے دیکھتے تھے۔ آواز اور منظر میں اتنا بُعد تھا کہ ان کا تخیل بھی اس کو بھرپور نہ کر سکا۔ مگر آواز اور منظر ان کے دل میں اترنے لگ گئے تھے، ان کے دل میں رواں دواں خون کے قطروں میں گھلنے ملنے لگے تھے۔ ان کے خیال سے، ان کے حواس سے، ان کی یادداشت سے سب کچھ مٹ گیا، اب آواز تھی کہ گیت بن رہی تھی، منظر تھا کہ خیال، حواس، جذبات کو جذب کر کے نئے نئے رنگ ایجاد کر رہا تھا، گیت بنتے رہے، رنگ نئے رنگوں میں ڈھلتے رہے، وہ وقت بھی آ کر

بیت گیا کہ گیت گیت نہ رہا اور رنگ رنگ نہ رہا، یہ دونوں ایک انوکھی وحدت میں ڈھل گئے، خیال اور حواس اور جذبات دھندلا سا خواب ہوئے اور خواب اندھیرے میں تحلیل ہوا اور چاروں اور اندھیر تھا۔

دور خیال اور تخیل کے آفاق پر بجلی کوندی: ''میں پھر پاگل ہو گیا ہوں۔'' کوندے کی روشنی بہت تیز تھی، اندھیرا جل کر راکھ ہوا، ان کے کان سنسنانے لگے، ان کی پلکوں کے نیچے دھند لکے دمکنے لگے، ان کے جسم میں کھلبلی سی مچنے لگی۔ انہوں نے سانس روکا، روکے رکھا، ان کے گال تمتمانے لگے۔ ان کا سینہ تنگ ہونے لگا، ان کے ہونٹ مچلنے لگے۔ انہوں نے گھبرا کر ہونٹ کھول دیئے، پیاسے حواس سیراب ہوئے، دھند لکے دور ہوئے، نور ہوئے، سنسناہٹ ترنم میں بدلی۔

متین صاحب بہت سکون سے مگر غور سے ان کی طرف نیم وا آنکھوں سے دیکھ رہے تھے۔ ان کے چہرے سے مٹتے ہوئے بل جمیل صاحب کی نظر نے روک لیے مگر بل پہلو بچا کر رخصت ہو ہی لیے۔ فردوس کی آنکھیں کھلی تو تھیں مگر اس کی نظر پلکوں کے سایوں میں گم سم نہ جانے کس کے انتظار میں بیٹھی تھی: اس کے چہرے کے نقوش میں ایک انوکھا، اجنبی، جاذب آہنگ تھا جس کے ہمیشہ قائم رہنے کی دعا کرنے کو جمیل صاحب کا دل مچلنے لگا مگر جمیل صاحب کا تخیل اس دعا کو عرش کی طرف رخصتِ پرواز دینے سے پہلے اس آہنگ کے تمام امکانی پہلوؤں کو اچھی طرح دیکھ لینے پر مُصر تھا۔ اس آہنگ کو وہ فردوس کے انگ انگ کے ساتھ ملا ملا کر اس ملاپ کے حسن و قبح کا فیصلہ کرنے لگے۔ وہ تو نہ جانے کب تک عدالت لگائے یونہی بیٹھے رہتے مگر فضا میں ایک قہقہہ بلند ہوا اور عدالت برخاست ہوئی۔ جمیل صاحب نے ایک بار پھر اپنے حواس و خیالات کو متوجہ کیا تو دیکھا تو فردوس کے سفید سفید، چمکتے ہوئے دانت مسکرا رہے ہیں، اس کی دہکتی ہوئی آنکھیں مسکرا رہی ہیں، اس کے چہرے کی تمتماہٹ مسکرا رہی ہے اور اس کے روغنی ہونٹ رقصاں ہیں، اس کی پلکیں رقصاں ہیں، اس کی بھویں رقصاں ہیں، اس کے جسم کا انگ انگ رقصاں ہے، اس کے حلق سے تھرک کر نکلتی ہوئی آواز رقصاں ہے۔

وہ پریشان سے ہوئے کہ اس ماحول کے سیاق وسباق میں قہقہے کی گنجائش کیسے تھی۔ مگر ان کی پریشانی فردوس کے مسلسل قہقہے کے رقص کو روک نہ سکی۔ انہیں جھنجھلاہٹ سی ہونے لگی۔ وہ فردوس سے سوال کرنا چاہ رہے تھے مگر آواز الفاظ میں ڈھلتی ہی نہ تھی، آواز نرخرے سے ٹکرا ٹکرا کر دم توڑنے لگی، ان کا نرخرہ بجنے لگا۔ نرخرے کے شور سے فردوس کی نظریں متوجہ تو ہوئیں مگر اس کا قہقہہ تھم نہ سکا۔ فردوس کی نظروں میں سوال بھی تھا کہ فرمائیے اور التجا بھی تھی کہ دیکھو میں بے بس ہوں۔ جمیل صاحب فردوس کی سوال بھری، التجا بھری نظر سے گھبرا گئے اور آواز الفاظ میں ڈھل گئی۔

''تم! تم! ہنس! ہنس! کیوں رہی ہو۔ میری صورت میں مضحکہ خیزی کی طاقت کہاں؟ اس کمرے میں جو سمے گزرے ہیں ان کے سیاق وسباق میں گدگدی چھپی تھی کیا؟ آخر تمہاری ہنسی تھمے گی کہ نہیں! تمہاری مسلسل ہنسی مجھے دیوانہ بنا دیگی، میں پاگل ہو جاؤں گا۔''

فردوس ہنستے ہنستے دوہری ہوئی جا رہی تھی، بے بس ہو چکی تھی۔ ہنسی رکی، مسکراہٹ بنی اور مسکراہٹ پھیکی پڑنے لگی۔ اس کے گھٹنوں پر جمے ہوئے ہاتھ پھسلے اور ایک دم اس کے چہرے کی طرف لپکے اور چہرے کو چھپا لیا۔ ہاتھوں کی انگلیوں کے جھرنوں سے رونے کی آواز پھوٹنے لگی۔ جمیل صاحب اور پریشان ہو گئے۔ انہوں نے اپنے کانوں پر اعتبار نہ کرتے ہوئے فردوس کی طرف غور سے دیکھا: فردوس کی جھکی ہوئی کمر کپکپا رہی تھی۔ جمیل صاحب نے سوچا کہ وہ اٹھ کر اس کی تھراتی ہوئی کمر پر ہاتھ رکھ کر اس کو دلاسا دیں مگر وہ ابھی سوچ ہی رہے تھے کہ فردوس اٹھی، ان کی طرف لپکی اور ان کے قدموں میں گر گئی اور گرتے ہی ان کے زانوؤں پر بانہیں دوہری کر کے دھاڑیں مار مار کر رونے لگی۔

جمیل صاحب نے اس کے سر پر دونوں ہاتھ رکھ دیئے، انگوٹھوں سے اس کے کانوں کو سہلاتے ہوئے، انگلیوں کی پوروں سے اس کی کنپٹیوں کے بالوں کو چھوتے ہوئے، اس کے چہرے کو، اپنے جھکے ہوئے چہرے کی طرف اٹھایا۔ اس کی دھندلائی ہوئی آنکھوں میں آنسو جھلملا رہے تھے، چہرہ اٹھاتے ہی اس نے آنکھیں میچ لیں، آنسو بہہ نکلے۔ انہوں نے انگوٹھوں کے پوروں سے اس کی آنکھوں کے کونوں کو گدگدایا اور اس نے آنکھیں کھول

دیں۔ اس کی ڈھلی ہوئی آنکھوں میں التجا تھی، گہرائیاں تھیں، جذب تھا۔ اس کے بہتے ہوئے آنسو اس کے ہونٹوں کے کونوں میں جذب ہو گئے، اس کے ہونٹ نیم وا ہوئے، اس کے دانت چمکے، اس کے دانتوں کا در کھلا، اس کی گلابی زبان نے باہر جھانکا، اس کے روغنی ہونٹوں کے روغن میں جلا پیدا کی، اس کی زبان لوٹ آئی، اس کے ہونٹ پھڑ پھڑائے:

''مجھے معاف کر دیجئے۔ مجھ سے نہ پوچھیے کہ کیوں ہنس رہی تھی۔ نہیں! میں بتائے دیتی ہوں۔ مجھے بتا ہی دینا چاہیے عجیب سی بات...... آپ کو کھوئے ہوئے دیکھ کر خیال آیا کہ کمرے میں امی ہیں...... میں امی ہوں...... میں نے محسوس کیا کہ میں ہی امی ہوں۔ میرا جی چاہا، نہیں، امی کا جی چاہا، کہ آپ کو تنگ کیا جائے، آپ کو خیالوں کے تعاقب سے واپس بلایا جائے۔ میں نے آپ کو بلانے کے لیے آپ کی طرف دیکھا تو آپ کے چہرے پر بچوں کا سا بھولپن تھا۔ نگاہ آپ کے چہرے سے پھسل کر آپ کی سفید براق سی مونچھوں میں الجھ گئی۔ نگاہ کو نکالنے کی کوشش کی تو یوں محسوس ہوا کہ آپ کی مونچھوں نے گدگدایا ہے اور پھر نظر جب لوٹی تو آپ کے چہرے کے بھولپن اور آپ کی سفید مونچھوں کے ملاپ نے نگاہ کو گدگدایا اور پھر نہ جانے ایک دم میں کیوں ہنسنے لگی۔

جمیل صاحب ''امی'' کا لفظ سن کر سن ہو گئے اور پھر ایک دم کانپنے لگے۔ کپکپاہٹ ان کی بانہوں کے رستے ان کے ہاتھوں میں منتقل ہو گئی۔ ان کے ہاتھ کانپنے لگے۔ فردوس کے گالوں نے ان کے ہاتھوں کی کپکپی کو محسوس کیا اور اس نے بانہوں کو ایک دم کھولا اور ہاتھ اٹھا کر جمیل صاحب کے کانپتے ہوئے ہاتھوں کو تھام لیا۔

متین صاحب نہایت خاموشی سے، اطمینان سے، ان سارے مناظر کو تکتے رہے۔ وہ اگرچہ ان مناظر کو بغور دیکھنے میں مصروف تھے مگر ان کے کانوں نے صوفے کی طرف سے اٹھتی ہوئی آہ کو سن لیا۔ وہ ادھر متوجہ ہوئے۔ رابعہ صوفے میں اٹھنے کی کوشش کر رہی تھی۔ متین صاحب اپنی جگہ سے اٹھے اور اس کو سہارا دے کر صوفے میں بٹھا دیا۔ رابعہ ان کی طرف حیرانی سے دیکھنے لگی۔

''میرا نام متین ہے۔ میں فردوس کے ہاں مہمان ہوں۔ میں ڈاکٹر بھی ہوں...... ابھی

آپ صوفے میں ہی آرام کیجئے۔فکر کی کوئی بات نہیں۔فردوس اور جمیل صاحب بخیر ہیں۔''

رابعہ نے جمیل صاحب کی طرف بڑے گداز اور پیار کی نظر سے دیکھا۔ وہ پر اطمینان غور سے دیکھ رہے تھے۔ ان کے چہرے اور ہونٹوں کی سرخی کے درمیان ان کی براق سی مونچھیں اس کو لگا کہ گلاب زار کے درمیان ایک سفید مور ہو جو رقص کے لیے پر کھولنے کی سوچ رہا ہو۔اس منظر کے حسن میں وہ کھویا چاہتی تھی کہ اس کو فردوس کا خیال آیا۔اس نے اپنی عنانِ نظر فردوس کی طرف موڑ دی۔فردوس جمیل صاحب کے زانوؤں سے ذرا دور زانوؤں کے سہارے،صوفے کے بازو پر دائیں بانہہ رکھے سر نہوڑائے، پریشان بال، نہ جانے کس خیال میں گم بیٹھی تھی۔اس کے چہرے پر آنسو بہنے کے واضح نشان تھے اور پلکیں بھیگی بھیگی تھیں،اس کے چہرے پر سرخی اور پیلاہٹ کا ایک عجیب سا امتزاج جھلملا رہا تھا۔ اس کا بایاں شانہ اس کے سینے کے زیرو بم کے ساتھ ہم آہنگ ہوا کانپ رہا تھا۔رابعہ فردوس کی یہ حالت دیکھ کر حیران سی ہوئی اور سوچ میں پڑ گئی کہ فردوس پر کیا افتاد پڑی کہ روتے روتے اداس ہو گئی تھی۔ یوں سوچتے سوچتے اس کو یاد آیا کہ اس نے جاگنے سے پہلے خواب میں صالحہ کو دیکھا تھا کہ ایک گلاب زار میں چاندی کی نہر کے کنارے کسی رعنا کفن کے اوپر جھکی زار زار رو رہی تھی۔روتے روتے وہ مڑی اور رابعہ کو دیکھ کر اٹھ کھڑی ہوئی اور فریاد کے لہجے میں بائیں ہاتھ کے اشارے سے کفن پوش کی طرف اس کو متوجہ کیا۔اس نے جب ہاتھ کے رخ نظر کی تو کفن پوش اٹھ بیٹھا تھا۔ وہ ڈری اور اس کے منہ سے چیخ سی نکل گئی۔اس کی چیخ سے صالحہ ایک دم مڑی اور کفن پوش کی طرف لپکی۔وہ زانوؤں کے بل گری اور گرتے ہی کفن کے بند کھولنے لگی۔کفن سے کسی کے نرخرے کے بجنے کی آواز صاف سنائی دے رہی تھی۔صالحہ نے گردن کے بند کھول، کپڑا منہ سے ہٹا دیا اور اس کی طرف منہ پھیر کر دعوتِ نظارہ دی۔ وہ دیکھنا چاہتی تھی مگر اس کی نظریں دھندلا گئیں۔اس نے آنکھیں بھینچ لیں۔ اس کی آنکھوں سے آنسو بہہ نکلے۔اس نے ہاتھ کی پشت سے آنسو پونچھے اور آنکھیں کھولا ہی چاہتی تھی کہ ایک دم کسی کے ہنسنے کی آواز نے اس کو چونکا دیا۔اس کو کچھ نظر نہ آیا صرف اس کے کانوں میں ہنسی کا ترنم گونج رہا تھا۔صالحہ ہنس رہی تھی۔اس کی ہنسی میں خوشی تھی،

پاگل پن تھا۔ وہ ڈری کہ کہیں صالحہ کو شادی مرگ نہ ہو جائے، یا وہ پاگل ہی نہ ہو جائے۔ وہ اس کی طرف بڑھی مگر اس کو ٹھوکر لگی۔ اس نے اٹھنے کی کوشش کی تو اس نے دیکھا کہ اس کی آنکھ کھل گئی ہے اور ایک اجنبی اس کو سہارا دے کر بٹھانے کی کوشش کر رہا ہے۔

وہ ایک بار چونکی۔ اس نے محسوس کیا کہ خواب اور اس کے سامنے کی حقیقت میں کوئی رشتہ ہے۔ کیا تھا؟ اس کی سمجھ میں نہ آیا۔ اس نے پریشان ہو کر ایک جھرجھری لی اور اٹھ کھڑی ہوئی، فردوس کے قریب جا کھڑی ہوئی، جمیل صاحب کو ہاتھ کے اشارے سے باہر چلے جانے کو کہا۔ جمیل صاحب اٹھ کھڑے ہوئے اور باہر نکل گئے۔ ان کے قدموں کی چاپ دور ہوئی تو ایک دوسری چاپ ان کی چاپ کے تعاقب میں قریب سے دور ہوتی چلی گئی، اس نے سمجھ لیا کہ متین صاحب بھی باہر چلے گئے ہیں۔

اس نے ایک لمبا سانس لیا، فردوس پر جھکی، اس کے سر پر پیار سے ہاتھ پھیرا اور اس کی بغلوں میں ہاتھ دے کر اس کو اٹھایا، اٹھا کر صوفے پر بٹھایا اور خود بھی ساتھ بیٹھ گئی۔ اس کے بیٹھتے ہی فردوس مڑی اور اس نے اس کی گردن میں بانہیں ڈال اس کے سینے میں منہ چھپا لیا۔ رابعہ کا سینہ تر ہونے لگا، اس کے سینے سے سسکیوں کی آواز آنے لگی۔ اس نے اپنی بانہیں فردوس کی کمر میں ڈال دیں اور اس کی کمر کو، اس کی گردن کو، اس کے بالوں کو پیار سے دھیرے دھیرے سہلانے لگی۔ پیار کی گرمی نے فردوس کی سسکیوں کو زبان بخشی اور اس نے پکارا:

''امی! میں کیا کروں؟''

رابعہ نے فردوس کو زور سے بھینچ لیا، اس کا سر سینے سے اٹھایا، بے تابانہ اس کا ماتھا، اس کی آنکھیں، اس کے گال، اس کا منہ، اس کی ٹھوڑی چوم چوم ڈالی۔ جب جذبات سے نڈھال ہو گئی تو بولی:

''تو نہ رو! تیرے حصے کا میں نے، صالحہ نے رو لیا ہے۔ میں ہوں تمہاری امی۔ میں ہوں تمہارے پاس۔ اب تمہارے دکھ دھلا چاہتے ہیں۔ میں نے ابھی ابھی خواب میں تمہاری امی کو ہنستے دیکھا ہے۔ آج مدتوں کے بعد تمہاری امی کو ہنستے دیکھا ہے۔''

فردوس نے آنکھیں کھولیں۔ اس کی دھندلائی ہوئی آنکھوں سے شعاعیں نکل رہی تھیں۔ اس کے بالوں کی ایک لٹ اس کی بائیں آنکھ کے گرد ہالہ کئے تھی۔ وہ یونہی دھندلائی ہوئی نظروں سے رابعہ کو تکتی رہی، تکتی رہی۔

رابعہ ان دھندلکوں میں چھپی شعاعوں کی تاب نہ لا سکی تو اس نے نظریں جھکا لیں اور پوچھنے لگی:

''یہ متین صاحب تمہارے کون ہوتے ہیں۔ ان سے ڈر بھی لگتا ہے اور ان پر پیار بھی آتا ہے۔ ان کے چہرے مہرے سے نجابت اور اتھاہ ذہانت ٹپکتی ہے۔ تم کب سے ان کو جانتی ہو؟ یورپ میں ان سے ملی تھی؟ یا ان سے پہلے سے ملاقات ہے؟''

کچھ دیر اس کے الفاظ فضا میں بے مقصد و بے منزل پھرتے رہے اور پھر نہ جانے کہاں کھو گئے۔ فضا ان کے تعاقب میں بھاگنے لگی۔ اس دوڑ دھوپ سے ایک دھیما سا شور سنسنانے لگا۔

''وہ میرے کون ہیں؟ میں چند گھنٹے تک تو جانتی تھی مگر اب مجھے نہیں معلوم۔ میں ان کو کب سے جانتی ہوں؟ شاید جب سے جنم لیا ہے! ان سے ملاقات کب ہوئی؟ چند دن ہوئے! مگر کتنے طویل دن، کتنے سہانے، کتنے دلدوز، کتنے وجد آفریں تھے یہ دن۔ اور...... اب آنے والے دن کتنے ویران، ویران اور سپاٹ ہوں گے۔ یہ دن کیسے کہاں بیتیں گے؟ آہ!''

''کیا ان کے دل میں تمہارے لیے کوئی جا نہیں؟ تو پھر تمہارے پاس کیوں ہیں؟''

''ہے! ہے! ان کے دل میں ہوں! ان کے خیالوں میں ہوں! ان کے خون میں ہوں! مگر ان کی روح پھر بھی مجھ سے گریزاں ہے! کیوں؟ میں نہیں جانتی! وہ بھی نہیں جانتے؟ تو کون جانتا ہے؟ مجھے بتاؤ ماں! مجھے یہ کون بتائے گا؟ دل مل کے بھی بھرپور کیوں نہیں؟ یہ جدائی جدائی بھی تو نہیں! بتاؤ نا! بولو نا!''

''میں سمجھتی تھی کہ میرا دکھ بہت ہی اچرچ ہے۔ مجھ پر جو بیتا ہے وہ ظلم ہے مگر مجھ کو اس کی وجہ تو سمجھ میں آتی تھی۔ لیکن تمہارا دکھ میرے دکھ سے بھی عجیب ہے......

یہ پیار، یہ محبت، یہ عشق، یہ وجد ہم جیسے لوگوں سے کیا چاہتا ہے؟ کیوں ہمارے ہی در پر بھکاری بن کر آتا ہے اور سکھ چین بھینٹ لے کر ٹلتا ہے۔ اس محبت میں کئی بار ہوا ہے کہ جمیل صاحب مسکرائے ہیں، ان کی آنکھوں کی چمک تیز ہوئی ہے تو سارا جہاں نور ہی نور ہو گیا ہے۔ اور وہ سارا نور میرے دل میں بھر گیا ہے، ان کے چہرے پر گھٹائیں چھا گئی ہیں تو آنکھوں تلے اندھیرا آ گیا ہے، زمین پر، زمین و آسمان کے درمیان اندھیرا ہی اندھیرا ہے، کئی کئی دن، کئی کئی راتیں یوں ہی گزر گئی ہیں......

پیار میں ایسا کیوں؟ یہ میں نہیں جانتی؟......''

اس کی فریاد سے سارا کمرا بھر گیا، فضا بھرپور ہوگئی۔ کہیں سے جواب نہ آیا۔ اس کے کان تھک کر سو گئے، اس کا دل اچھل اچھل کے دم توڑ بیٹھا، اس کا دل اب کہیں نہ تھا، شاید خون ہو گیا تھا، اس کے خیالوں میں اندھیرا ہی اندھیرا تھا۔

فردوس نے جو رابعہ کی طرف دیکھا تو اس کے چہرے کے نقوش تلملا رہے، بلبلا رہے تھے، اس کی نظریں کھوئی ہوئی تھیں، اس کے ہونٹ کانپ رہے تھے، اس کے نتھنے پھول گئے تھے اور اصلی حالت میں لوٹ جانے کی راہ بھول بیٹھے تھے، اس کے سینے کا زیر و بم رک گیا تھا۔

فردوس اپنا سب دکھ درد بھول گئی اور اس نے رابعہ کو جھنجھوڑا، اس کو پکارا۔ رابعہ لوٹ آئی۔ فردوس نے جھک کر اس کا منہ چوم لیا اور اس کے سینے پر سر رکھ کر اس کے دل کی دھڑکنیں سننے لگی۔ اس کے دل و ذہن میں دھڑکنیں رچنے لگیں، اس کے خون کے قطرے دھڑکنوں کی لے کے ساتھ ساتھ ناچنے لگے۔ فردوس قطروں کے ناچ میں کھو گئی، سو گئی۔

دوسرا باب

دھوپ کی گرمی نے متین صاحب کو چونکایا۔ انہوں نے ادھر ادھر دیکھا۔ وہ لائبریری کے سامنے صحن میں کھڑے تھے۔ صحن دھوپ میں سو رہا تھا۔ صحن کا فرش، صحن کی منڈیر، دھوپ

کی چمک میں ابھر ڈھلک رہے تھے۔ کرنوں کا جال فضا میں نہایت آہستہ آہستہ جھول رہا تھا۔ متین صاحب نے مڑ کر دھند لکے میں لپٹی ہوئی گلی کو دیکھا۔ گلی سوئی ہوئی تھی۔ انہوں نے دیواروں پر نگاہ کی۔ دیواریں سوئی ہوئی تھیں۔ ہر طرف ہر شے سوئی ہوئی تھی۔ انہوں نے کان لگائے مگر ہر طرف خاموشی تھی۔ انہوں نے آسمان کی طرف دیکھا۔ فضا شفاف تھی، نیلاہٹیں دمک رہی تھیں، آسمان سے ہن برس رہا تھا اور لوٹنے والا کوئی نہ تھا۔

متین صاحب مغربی منڈیر کی طرف بڑھے، منڈیر کے اس پار دیکھا، نیچے دیکھا، دور تک دھوپ کے سنہرے جال کے سوا کچھ نہ تھا، نیچے سڑک سو رہی تھی، لائبریری کی کھڑکی کی طرف آتی ہوئی پہاڑ کی کمر پر سبز سبز گھاس سے ابھرتی ہوئی سبز ڈنٹھل پر ایک گلاب ان کی طرف گھور رہا تھا۔ دھوپ میں گلاب کی چمکتی ہوئی گلابی آنکھ کی تاب نہ لا سکے اور ان کی نظر جھک گئی اور منڈیر پر رینگنے لگی اور پھر رینگتے رینگتے بھاگنے لگی۔ نظر کے ساتھ ان کا جسم بھی مڑا اور وہ صحن سے گزر نیچے سڑک کی طرف روانہ ہوئے۔

ان کے قدموں کے بوجھ سے سڑک جاگ اٹھی اور ان کے آگے آگے بھاگنے لگی۔ وہ اس کے تعاقب میں پورب کی اور پورب سے اتّر، اتّر سے پورب، پورب سے اتّر چکر کاٹتے ہوئے نیچے وادی میں اترتے چلے گئے۔ سڑک ایک پتھریلے، دور تک پھیلتے ہوئے میدان میں گم ہوگئی اور متین صاحب سڑک کے گم ہوتے ہی رک گئے۔ میدان کی پتھریلی سطح دھوپ سے چمک رہی تھی۔ اس چمک سے ان کی پتلیاں جل گئیں اور ان کے دل میں ٹھنڈک کی خواہش پیدا ہوئی۔ انہیں یاد آیا کہ قریب ہی ندیاں ہیں۔ ان کے کانوں میں ندیوں کے بہتے پانی کی آواز آنے لگی۔ انہوں نے نظر اٹھا کر ندیوں کی طرف دیکھا۔ سفید سفید چمکتی پٹیوں سے نظریں خیرہ ہونے لگیں۔ ندیوں سے دور سبزہ تھا، درخت تھے، چھاؤں تھی۔

وہ سبزے کی، درختوں کی، چھاؤں کی اور لپکے۔

ان کے تیز رفتار قدموں کی زد سے زمین چونکی، زمین پر بکھری ہوئی کنکریاں بول اٹھیں، فضا کا سکوت ٹوٹا مگر متین صاحب اپنے دھیان میں مگن لپکے چلے گئے۔

دھوپ ان کے سر کی جلد کو، ان کی گردن کو سہلانے لگی، ان کے رگ و ریشہ میں رچنے

لگی، رچتی چلی گئی، ان کے دماغ میں سرسراہٹیں جاگیں، حظ بنیں، حظ نے عمل کی سب طنابیں کھینچ لیں، متین صاحب چلتے چلتے رک گے، بولتی کنکریوں کی آواز لڑکھڑائی اور بند ہوگئی۔انہوں نے اپنے پاؤں کی طرف دیکھا۔نظر پاؤں سے پھسلی، پتھریلے فرش پر رینگنے لگی، ان کا تناظر بدلنے لگا، وسیع ہوتا چلا گیا،نظر افق تک پہنچی، پہنچ کر لوٹی۔ درختوں کی چوٹیوں سے پھسلی،سبزے میں لوٹی، پھر تیزی سے نینوں کی اور بڑھنے لگی، بڑھتی چلی آئی، ایک ندی پار کی، دوسری کو عبور کیا اور......ایک دم ٹھٹکی: ندی کنارے ایک مدور، چوڑے چکلے پتھر پر کوئی بیٹھا تھا۔' کون ہے؟ کیا کرتا ہے؟ ندی سے اڑتے ہوئے جھالے کا نظارہ کرتا ہے؟ یا بہتے ہوئے پانی کو دیکھتا ہے؟' یکے بعد دیگرے کئی سوال متین صاحب کے ذہن میں ابھرے مگر کہیں سے جواب نہ ملا۔ پھر ان کا ذہن خیالات سے بالکل خالی ہوگیا اور پھر ان کے ذہن میں بیٹھی ہوئی شکل کی کمرا بھرنے لگی اور ساتھ ہی ان کے کانوں میں آواز آئی:

''رک کیوں گئے؟ آیئے۔ یہاں آیئے۔ میرے پاس۔اس سامنے کے پتھر پر بیٹھا جاسکتا ہے۔ مجھے انتظار تھا۔شاید آپ کا ہی تھا......آپ کا ہی تھا۔آپ ڈاکٹر ہیں نا۔فلسفی بھی......آیئے نا!''

متین صاحب کی آنکھوں نے اٹھے ہوئے ہاتھ کو دیکھا۔ ہاتھ چمک رہا تھا،ننگی کلائی کے بھورے بھورے بال چمک رہے تھے۔ ہاتھ حسن کی دعوت بھی تھا اور حکم بھی۔ان کے قدم خود بخود اٹھنے لگے اور وہ ہاتھ کی سمت بڑھتے چلے گئے اور بیٹھی ہوئی صورت کے قریب پہنچ کر انہوں نے صورت کے چہرے کو دیکھا اور پھر بڑھ کر ندی کے پانی کے بالکل قریب پتھر پر بیٹھ گئے۔

آواز اور چہرے کے ملاپ نے ایک جانی پہچانی صورت کو جنم دیا۔جمیل صاحب تھے۔متین صاحب کا دل دھک دھک کرنے لگا اور ان کا بدن بے حس ہونے لگا، ہوتا چلا گیا۔ وہ صرف کان تھے، آنکھ تھے، ندی کے پانی کی آواز کا زیر و بم اپنے تمام تنوع سے سنائی دے رہا تھا۔ اڑتے ہوئے جھالے کی شفاف، چمکیلی، سات رنگوں والی بوندیں علیحدہ علیحدہ دکھائی دے رہی تھیں، ہر ایک بوند میں ایک جہان وا تھا۔

''متین صاحب! گناہ!...... یہ...... یہ آخر گناہ...... گناہ آخر انسانی زندگی کے ساتھ کیوں وابستہ کر دیا گیا ہے؟ دنیا میں اور دکھ کیا کم تھے کہ اس کی تخلیق بھی ضروری تھی؟ انسان کی زندگی کا کوئی لمحہ ایسا نہیں جب گناہ اس کا راستہ نہ کاٹتا ہو۔ راستہ کاٹتا ہے، بھلا لگتا ہے، رجھاتا ہے، ساتھ لگا لیتا ہے اور...... پھر ڈس لیتا ہے...... اور اس کا زہر رگ و ریشے میں رچنے لگتا، اس رچاؤ کے احساس سے دل اور دماغ جلنے لگتے، نیند اور موت دور دور بھاگتے، زندگی اجیرن ہو جاتی ہے...... اجیرن ہو جاتی ہے، عذاب ہو جاتی ہے...... خراب ہو جاتی ہے۔ آخر کیوں؟ جب انسان کے سوا گناہ کسی اور کا ساتھی ہو ہی نہیں سکتا تو پھر اس کی سنگت کا اتنا دکھ کیوں؟ اس کے ڈنک میں ایسا اور اتنا زہر کیوں؟......''

متین صاحب کے جسم سے حرکت سلب ہو چکی تھی، وہ جس پتھر پر بیٹھے تھے، اس کا حصہ معلوم ہو رہے، صرف ان کی آنکھوں کی متحرک گہرائی اور گہرائی سے ابھرتی ہوئی چمک سے اندازہ ہوتا تھا کہ ان میں زندگی تھی...... ٹھٹھری ہوئی، ٹھٹکی ہوئی۔ ان کے ابروؤں کے تناؤ سے اندازہ کیا جا سکتا تھا کہ وہ جمیل صاحب کا ایک ایک لفظ بہت ہی غور سے سن رہے تھے۔

''آپ مجھے ہی دیکھئے۔ میں جوان تھا جب مجھ سے میری زندگی کے سوا سب کچھ چھین لیا گیا-- میری عقل، میرا ہوش۔ میں پچیس سال اس جہاں میں چلتے پھرتے بھی اس جہاں میں نہ تھا۔ آج سے پچیس سال پہلے میں جوان تھا، دنیا حسین تھی، صالحہ......'' جمیل صاحب نے ایک دلدوز آہ بھری۔

''صالحہ زندہ تھی اگر چہ مجھ سے دور تھی، بہت دور۔ آپ اندازہ نہیں کر سکتے وہ مجھ سے کتنی دور تھی۔ رابعہ نہ ہوتی تو میں آج یہاں نہ بیٹھا ہوتا۔ اس ندی کے کنارے، جس کی ہر لہر مجھے اپنی زندگی کی تمثیل نظر آتی ہے۔ ان کناروں کے درمیاں یہ ندی، جو نہ جانے کہاں سے آئی ہے، نہ جانے کب سے بہہ رہی ہے، بہے چلی جا رہی ہے، نہ جانے کب تک بہتی رہے گی۔ آپ کہہ سکتے ہیں کہ یہ ندی فلاں پہاڑ کی فلاں چوٹی سے اتری ہے اور فلاں مقام پر سمندر میں شامل ہو جائے گی۔ مگر میں کہوں گا کہ پہاڑوں پر پڑی ہوئی برف کہاں سے

آئی؟ بادلوں سے؟ بادلوں میں پانی کہاں سے آیا؟ سمندر سے؟ سمندر میں پانی کہاں سے آیا؟ کوئی نہیں جانتا۔ اس طرح میں بھی نہیں جانتا انسان میں زندگی کہاں سے آتی ہے اور کہاں جاتی چلی جاتی ہے۔ جب انسان اس جہاں میں چلنے پھرنے کے باوجود اس جہاں میں نہ ہوتو زندگی کے کیا معنی ہوئے؟ میں پچیس برس کہاں رہا۔ کوئی تو جانتا ہی ہوگا۔

متین صاحب! صالحہ ننھی سی تھی جب میں نے اسے پہلی بار دیکھا، کسی عورت کی گود میں تھی اور رو رہی تھی۔

صالحہ کو روتے دیکھ کر میں بے تاب ہو گیا اور میں نے اماں سے کہا کہ وہ اس کو اپنی گود میں لے لیں، پیار کریں، لوریاں دیں کہ وہ چپ ہو جائے۔ اماں کی آواز بہت ہی بھلی تھی۔ ان کی لوریاں اب تک میرے کانوں میں گونجتی ہیں۔

اماں نے صالحہ کو گود میں لے لیا، سینے سے لگایا، بازوؤں میں جھولایا، صالحہ چپ ہوگئی اور پھر اماں کے سینے سے لگی سو گئی۔ اس دن کے بعد میں نے کبھی اس کو روتے نہیں دیکھا۔ مسکراہٹ اس کے ہونٹوں میں ایسی رچی کہ کبھی علیحدہ نہ ہوئی۔

جب ہم اس کے گھر گئے تو میں پانچ چھ سال کا تھا۔ یقیناً چھ سال کے لگ بھگ کیونکہ میں باقاعدہ سکول جاتا تھا۔ وہ لمحہ یقیناً بہت ہی خوبصورت تھا جس لمحے میں نے صالحہ کو اماں کی گود میں دیکھا۔ وہ اس سے ایسی بھلی لگی کہ اس کے بعد کوئی اور بھلا نہ لگا۔ میں صبح سکول جانے سے پہلے اسے ضد کر کے گود میں لیتا، بانہوں میں دھیرے دھیرے جھولاتا۔ چھوڑنے کو جی نہ چاہتا مگر چھوڑ کر چلا جاتا۔ سکول میں تمام دن اس کا بھولا بھالا چہرہ آنکھوں کے سامنے پھرتا رہتا۔ کبھی کبھی جب کھیل کود میں اس کا چہرہ نظروں سے دور ہو جاتا تو میں کھیلتے کھیلتے رک جاتا اور گھر لوٹ آنے کو بے تاب ہو جاتا مگر استادوں کے ڈر سے، امّاں کی ناراضی کے ڈر سے، میں کبھی وقت سے پہلے گھر نہ آتا۔ میں گھنٹوں، دنوں، مہینوں، برسوں اسے بانہوں میں اٹھائے اٹھائے پھرا۔ بچپن میں اس کے سوا کسی سے کھیلنا نہ بھاتا تھا مگر وہ میرے کھیلوں میں شریک نہ ہوسکتی تھی کیونکہ وہ ان دنوں اکثر بیمار رہتی تھی۔ مگر آہستہ آہستہ اس کی بیماری اس سے دور دور رہنے لگی اور جب وہ سکول میں داخل ہوئی تو بیماری اس سے

ہمیشہ ہمیشہ کے لیے رخصت ہو چکی تھی۔ اس کے بعد وہ کبھی بیمار نہ ہوئی۔

جب وہ پہلی بار سکول سے اپنے ساتھ ایک لڑکی کو گھر لائی اور شام تک اس سے کھیلتی رہی تو مجھے بہت دکھ ہوا۔ مگر جب بھی وہ مسکرا کر مجھے بلا لیتی تو مجھے اپنے سب دکھ بھول جاتے۔ جوں جوں وہ بڑی ہوتی گئی وہ مجھ سے قریب ہوتی گئی۔ وہ کبھی سکول سے کسی سہیلی کو ساتھ نہ لاتی تھی۔ ان دنوں میں بہت خوش رہا۔ یہ خوشی چند سال کی تھی۔ مجھے سکول، سکول کی کتابیں بھی، اچھی لگنے لگی تھیں۔ میں اس کا ساتھی تھا، میں اس کا بھائی تھا، میں اس کا دوست تھا۔ میں اس کا استاد تھا، میں اس کی مسرتوں کا امین تھا۔ وہ مجھ سے کچھ نہ چھپاتی تھی۔ میں سکول سے نکل کالج جا پہنچا۔ اک نیا جہان تھا مگر اس جہان سے کمتر، بہت ہی کمتر، جو صالحہ کی چمکیلی آنکھوں میں بستا تھا، جو اس کی مسکراہٹ سے میرے اردگرد آباد ہو جاتا تھا۔

پھر ایک دن میں کالج سے لوٹا تو میں نے دیکھا کہ صالحہ لڑکپن کو الوداع کہہ چکی تھی۔ اس لمحے وہ عجیب طرح سے خون میں رچنے لگی، گنگنانے لگی، اس کی چمکیلی آنکھوں میں گہرائی کا گمان سا ہوا۔ اس کی مسکراہٹ سے سانس گلے میں اٹکنے لگا۔ مجھے یکا یک محسوس ہوا کہ میرے ہونٹ خشک ہو گئے ہیں۔ میں نے گلاس میں پانی انڈیلا، ہونٹ تر کیے اور پھر ایکا یکی میں پانی پیتا چلا گیا۔ ایک گلاس، دو گلاس اور صالحہ کے قہقہے نے مجھے چونکا دیا۔ وہ ہنس رہی تھی اور کہہ رہی تھی۔ ''بھائی جان! آپ کو سردی میں بھی پیاس لگتی ہے۔ گرمیوں میں تو آپ مٹکے ہی پئیں گے۔''

ان قہقہوں کی آواز برف کی لہر بن کے کانوں میں داخل ہوئی۔ میرا تمام جسم سرد ہو گیا۔ میں نے محسوس کیا کہ میرے ماتھے پر سرد سرد بوندیں ابھر آئی ہیں۔ میں پریشان ہو گیا میرے لیے وہاں ٹھہرنا دوبھر ہو گیا۔ وہاں سے کھسکنے کی سوچنے لگا۔ مگر مجھے وہاں سے ہلنے کی ہمت ہی نہ ہو رہی تھی۔ اتنے میں امّاں نے صالحہ کو آواز دے دی۔ وہ چلی گئی تو میں اپنے کمرے میں چلا گیا۔ دیر تک کمرے میں کھڑے کھڑے نہ جانے کیا سوچتا رہا۔ تھک گیا تو بستر پر بیٹھ گیا۔ بیٹھا رہا، بیٹھا رہا، غنودگی سی طاری ہونے لگی۔ سو گیا۔ جاگا تو بدن پھنک رہا

تھا۔ امّاں ماتھے پر ہاتھ پھیر رہی تھی اور مجھے پکارتی تھیں، جہاں وہ بیٹھی تھیں وہاں سے کچھ دور صالحہ بیٹھی تھی۔ کھوئی کھوئی سی۔

میں پورے دس دن بخار میں جلتا رہا۔ خواب اور بیداری کے دیس میں سرگرداں رہا۔ صحت یاب ہوا تو میری خوشیوں کا دور بیت چکا تھا۔ صالحہ مجھ سے دور دور رہنے لگی تھی۔ قریب آتی تھی تو مجھے اس سے نظریں ملاتے ہوئے ڈر لگتا تھا۔ میرے کان اس کی آواز سننے کی لیے بے تاب رہتے تھے۔ میرے کان اس کے قدموں کی چاپ پر لگے رہتے تھے۔ وہ بھی کھوئی کھوئی سے رہنے لگی۔

دن یونہی گزرتے رہے ہر دن پہاڑ سا گزرتا، رات جاگ کر گزرتی، میں دنوں لمحوں کے ساتھ تنہا رہا۔ ان لمحوں نے کیا کیا منظر دکھائے۔ میری سمجھ میں نہ آتا تھا کہ مجھے کیا ہوگیا ہے۔

امتحان کے دن آئے پڑھائی میں دل نہ لگا۔ فیل ہوگیا۔ دل کو دھچکا سا لگا۔ جی کڑا کر کے میں پڑھائی میں جت گیا۔ سال گزرتے دیر نہ لگی۔ اتنا چھوٹا سال پھر کبھی نہ آیا۔ جب کبھی نظر کتاب سے اٹھی، صالحہ کو ڈھونڈتی پھری۔ مگر ان دنوں صالحہ کہاں گم رہتی تھی۔ اس کے قدموں کی چاپ گھر کی خاموشی میں بھی سنائی نہ دیتی۔

کبھی کبھار کھانے کی میز پر سامنا ہوجاتا تو نظر اس کی آنکھوں کی گہرائیوں میں ڈوبتی ہی چلی جاتی۔

وہ جوان ہورہی تھی۔ وہ بہت ہی حسین ہورہی تھی۔ اس کے اعضاء کی ہر جنبش ذہن پر نقش ہوجاتی اور تخیل میں ایک نئے نگار خانے کا افتتاح ہوجاتا۔

مگر اس کا حسن، اس کی جوانی میرے لیے نہ تھی۔ اس نے میری ماں کا دودھ پیا تھا۔ وہ مجھ پر حرام تھی۔ مگر میں دل کے ہاتھوں مجبور تھا۔ ہر لحظہ، ہر لمحہ، اس کی جوانی نکھرتی جاتی تھی، اس کا حسن کھلتا جاتا تھا، اس کی مسکراہٹ صد جہان کو جنم دیتی تھی۔ ان جہانوں میں اپنا داخلہ چوری چھپے کا تھا۔ جب بھی پہچانا جاتا نکالا جاتا۔

ایک دن کالج جانے کے لیے گھر سے نکلا تو ساتھ کی خالی زمین پر مزدور اینٹوں کے

ڈھیر لگا رہے تھے۔ پوچھا تو پتہ چلا کہ کوئی صاحب اپنا بنگلہ تعمیر کرا رہے تھے۔ مہینوں بنگلہ بنتا رہا۔ اپنا دل بیٹھ بیٹھ جاتا۔ بنگلہ بن کر تیار ہوا۔ بنگلے والے آ کر آباد ہوئے۔ ان کی عورتوں نے ہمارے یہاں آنا جانا شروع کیا۔ بنگلے والوں کی ایک بیٹی تھی جو صالحہ کی سہیلی بن گئی۔ پھر کیا تھا یا وہ ہمارے یہاں ہے یا صالحہ وہاں ہے۔

صالحہ کی شخصیت میں ایک اور روپ ظاہر ہوا، اس کو اپنی شخصیت کی قوت اور اپنے حسن کا احساس ہونا شروع ہوا اور مجھ کو اکثر یوں لگا کہ جب بھی وہ مجھ سے بات کرتی تو اس میں عنایت کا، رحم کا، خیرات کا، جذبہ کارفرما نظر آتا۔ جس سے مجھے بہت ہی کوفت ہوتی، اتھاہ دکھ ہوتا، مگر آج سوچتا ہوں تو مجھے بالکل یاد نہیں آتا کہ کبھی اس نے اپنی عنایت کے لیے، رحم کے لیے، خیرات کے لیے میرے سوا کسی کو مستحق گردانا ہو یا میرے ساتھ کسی کو شامل کرنے کا خیال بھی کیا ہو۔ ان دنوں اکثر یہ ہوتا کہ وہ خوش خوش باتیں کر رہی ہے مجھے دیکھا ہے یا میرے قدموں کی چاپ سنی ہے تو اس کے اعضا کی ہر جنبش کے باہمی امتزاج اور رشتے کی نوعیت بدل گئی ہے، اس کا جسم تن گیا ہے، جس سے بھی گفتگو کر رہی ہے اس سے جلدی جلدی فارغ ہوئی ہے، اور میری طرف پوری طرح متوجہ ہوئی ہے اور اگر میں اس کے حضور سے ادھر ادھر ہو گیا ہوں تو مجھے ڈھونڈ نکالا ہے اور...... اس کے بعد...... اس کی باتوں میں، اس کے لہجے میں، اس کے چہرے کے نقوش میں، اس کے رنگ روپ میں، اس کے اعضا کی ہر جنبش میں ایک گرم اور تند ہوا کا طوفان بیدار ہو جاتا، اس کی ہر بات مجھ پر طنز ہوتی، اس کے لب و لہجے سے میرا خون کھول اٹھتا، اس کی ناک کی دھیرے دھیرے پھڑ پھڑاتی ہوئی قوسیں، اس کی ناک سے کبھی دھیرے کبھی تیز سانس کی سرسراہٹ، اس کی آنکھوں میں ڈوبتی ہوئی، کبھی ابھرتی ہوئی، روشنی اور آگ، اس کے سینے کے زیر و بم سے پھڑ پھڑاتے ہوئے گریبان کی ہوا سے میرا تن بدن جھلس جاتا، میرا ذہن بھسم ہو ہو کر زندہ ہوتا، میرے تخیل میں غصے اور بغاوت اور انتقام کی آگ سے کئی جہاں جل جاتے مگر میں کچھ نہ کہتا کیونکہ مجھے ہر دم یہی دھڑکا لگا رہتا کہ اگر میں نے لب کھولے تو میری محبت کا راز افشا ہو جائے گا۔ راز افشا ہونے سے جو دو، صرف دو ہی (نہ جانے دو ہی کیوں)، ردِ عمل

ممکن تھے ان کے تصور سے میری روح کانپ اٹھتی تھی۔ اگر اس نے محبت کو گناہ کی دعوت سمجھا (میرا جی چاہتا تھا کہ وہ یونہی سمجھے) تو اس احساس کے پیدا ہونے سے جو آگ اس کے تن بدن میں، اس کی آنکھوں میں، اس کے چہرے کے رنگ روپ میں بیدار ہو گی اس کی گرمی کی، اس کی چمک کی تاب کون لا سکے گا۔ اس میں اگر ایک بار جل کے زندگی کا دوبارہ ملنا ممکن بھی ہوتا تو مجھے یہ منظور نہ ہوتا کیونکہ بار بار جل کر راکھ ہونا پڑتا اور بار بار زندہ ہونا پڑتا۔ اس معجزے کی مجھے زمین و آسمان کے خالق سے بھی امید نہ تھی۔ اور اگر وہ میری محبت کو قبول کر لیتی اور سب کچھ تیاگ دینے پر راضی ہو جاتی تو اس جسم کے ہر گوشہ میں جو جنت آباد ہو جاتی اس کے نظارے کی تاب لانے کے تصور سے میں اب بھی کانپ جاتا ہوں۔ اتنی بڑی قربانی اور جرأت کے سامنے ابلیس بھی ہوتا تو ٹل جاتا۔ میں نے تو مہینوں ان تصورات کا، صالحہ کے طرزِ عمل کا سامنا کیا اور زندہ رہا۔

صالحہ کی ہر بات، ہر جنبش، اس کی پتلیوں کا خرام، اس کے ابروؤں کی ہر پھڑ پھڑاہٹ، اس کی بھنوؤں کا ہر تناؤ، مجھے دل کا راز کہنے پر اکساتا تھا۔ وہ اپنی آنکھوں کی روشنی کو میری آنکھ میں منعکس کر کے میری آنکھوں میں میرے دل کا حال دیکھ لینا چاہتی تھی۔ مجھے اپنی تمام قوتوں کو استعمال میں لا کر اپنی آنکھوں میں اندھیرے، تہہ در تہہ اندھیرے، چھائے رکھنے پڑتے۔ ان اندھیروں کے اندر اترنے کے لیے، ان اندھیروں کو پاٹنے کے لیے وہ اپنی آواز کے زیر و بم میں عجیب وسعتیں پیدا کرتی اور اس کی آواز روشنی کا ایک متحرک ستون بن جاتی۔ بڑے زور کا معرکہ ہوتا۔ جب بھی پسپا ہونے لگتا، پسپائی ہمیشہ میری ہی ہوتی، اماں میری مدد کو آ پہنچتی اور صالحہ سے کہتیں:

''بیٹی میری دو ہی تو آنکھیں ہیں: ایک تم اور ایک جمیل۔ اگر ان میں سے کسی ایک کو کچھ ہو گیا تو میرا دل کٹ جائے گا۔ جمیل تو تمہارے سامنے بولتا ہی نہیں تو کیوں اسے تنگ کرتی ہے۔ تم سے بڑا ہے وہ۔ تمہیں گود میں اٹھائے وہ گھنٹوں پھرا کرتا تھا۔ اسے تم سے بہت ہی محبت ہے۔ اس سے یوں سختی سے پیش نہ آیا کرو۔'' اور صالحہ ہمیشہ ایک ہی جواب دیتی:

''جب جمیل بھائی میری باتوں کا جواب نہیں دیتے تو مجھے ان پر غصہ آ جاتا ہے۔ مجھے دیکھتے ہی بدل جاتے ہیں۔ آخر کیوں؟ ان سے پوچھو اماں ایسا کیوں کرتے ہیں۔ میں ان کا ادب کرنا چاہتی ہوں، کرتی ہوں۔ مجھے ان کا سکھ اور ان کی خوشی بہت ہی عزیز ہے۔ اپنی خوشی سے بھی زیادہ مگر یہ میری باتوں کا جواب دینا کسرِ شان سمجھتے ہیں۔ عمر میں بڑے سہی، ذہین سہی، وجیہہ سہی مگر مجھ سے کس طرح اتنے بہتر ہیں کہ مجھ سے بات کرنا بھی ان کو ناگوار ہو۔''

آپ ہی کہیے متین صاحب! اس کا میں کیا جواب دیتا۔ دن گزرتے گئے۔ صالحہ روز بروز اپنا اکثر وقت بنگلے والوں کے ہاں گزارتی مگر جب بھی کبھی ہفتے عشرے میں میرا اس کا سامنا ہوتا تو اماں کی جان پر بن جاتی۔ آخر ایک دن انہوں نے مجھ سے کہا ''تم کہیں چلے کیوں نہیں جاتے، میں سمجھ لوں گی کہ میری ایک بیٹی ہی تھی۔ مجھ سے تمہارا جلنا نہیں دیکھا جاتا۔ کسی دن صالحہ پاگل ہو جائے گی یا تم راکھ ہو جاؤ گے۔ ایسا کیوں ہو۔''

میں سکتے میں آ گیا۔ مجھے یقین ہو گیا کہ امّاں کو میری محبت کا پتہ تھا۔ مجھے خیال آیا کہ اگر ان کو پتہ تھا تو میرے گناہ میں وہ بھی برابر کی شریک تھیں کیونکہ انہوں نے مجھ سے کبھی نفرت کا اظہار نہیں کیا تھا۔ نہ اشارتاً نہ کنایتاً۔ اس خیال سے میں کانپ کانپ گیا اور تمام رات سو نہ سکا اور صبح ہونے سے پہلے ہی میں گھر سے نکل گیا۔ مہینوں نہ جانے کہاں کہاں کی خاک چھانتا پھرا، اب صرف چند منظر، چند گیت، کوئل کی پکار اور گاؤں کی ناریوں کے بھولے بھالے چہرے یاد ہیں۔

مہینوں کے بعد ہوش آیا تو میں ساون پور کی ایک بہت مصروف سڑک پر چلا جا رہا تھا۔ ہر طرف لوگ تھے۔ شور تھا اور پھر مجھے ایک دم دھکا لگا اور میں گر گیا، بے ہوش ہو گیا۔ ہوش آیا تو اک دھندلکے سے ایک چہرے کو اپنے اوپر جھکا پایا اور پھر ایکا ایکی میری کمر میں شدید درد جاگ پڑا۔ میں درد میں چلایا۔ میری چیخ نے مجھے مکمل طور پر بیدار کر دیا۔ میں نے آنکھ کھولی تو دیکھا کہ نرسیں، ڈاکٹر میرے بستر کے اردگرد کھڑے ہیں اور ایک معزز سا، ادھیڑ عمر کا، آدمی کرسی پر بیٹھا مجھے پیار بھری آنکھوں سے دیکھتا ہے۔ میں نے اٹھنا چاہا تو

ایک نرس نے دونوں ہاتھ میرے شانوں پر رکھ کے مجھے اٹھنے سے باز رکھا۔ میں لیٹ گیا اور ان پیار بھری نظروں سے پھوٹتی ہوئی نرم نرم گرمی سے مجھ پر غنودگی طاری ہونے لگی اور میں سو گیا۔ جب بھی میری آنکھ کھلتی تو وہ دو پیار بھری آنکھیں مجھے دیکھتی ہوتیں۔ اس چہرے کے لب کبھی متحرک نہ ہوتے۔ اس طرح نہ جانے کتنے دن گزرے۔

ایک دن میری آنکھ کھلی تو میرے پلنگ کے مقابل کی کھڑکی کے اوپر کے حصے کے شیشے سورج کی روشنی سے جگمگا رہے تھے۔ مجھے یہ فیصلہ کرنے میں کچھ دیر لگی کہ صبح ہو رہی تھی کیونکہ ہر طرف ابھی خاموشی کا راج تھا۔

میں ابھی کھڑکی کے شیشوں کی جگمگاہٹ دیکھنے میں مصروف تھا کہ نرس آ گئی۔ اس نے میرے ماتھے پر ہاتھ رکھا اس کی یہ حرکت بھلی سی لگی۔ اس نے ایک لمبا سانس لیا اور پھر بولی:

''آج آپ کو تیز بخار نہیں ہے۔ نبض دکھایئے۔ ہوں! پلس نارمل ہے۔''

میں مسلسل نرس کے چہرے کو تکے جا رہا تھا۔ نرس خوبصورت تو نہ تھی مگر کبھی کبھی اس کے خوبصورت لگنے کا گمان ضرور ہوتا تھا۔ میری ٹکٹکی سے وہ گھبرا سی گئی اس نے میری نبض سے ہاتھ اٹھالیا اور پھر اپنے ہاتھ سے میرے اٹھے ہوئے بازو کو آرام سے میرے سینے پر ڈال دیا۔ کچھ دیر وہ چپ چاپ کھڑی رہی۔ اس کے چہرے کے نقوش مختلف رشتوں میں مربوط ہوتے رہے اور پھر وہ ایک دم میرے بستر کی پٹی پر بیٹھ گئی اور دائیں ہاتھ سے میرے بالوں سے کھیلنے لگی، کھیلتی رہی۔ اس کی یہ حرکت مجھے بہت ہی بھائی اور جی چاہا کہ وہ یونہی میرے بالوں سے کھیلتی رہے اور میرے پاس بیٹھی رہے۔ اس کا جسم میرے پہلو سے لگا ہوا تھا۔ اس جسم کی حدّت سے میرے دل میں بہت مدت کے بعد جینے کی خواہش پیدا ہوئی۔ میں اس خواہش کے انجام پر غور کرنے لگا۔ کچھ سوچنے کو جی نہ چاہا۔ جی گھبرا گیا۔ کہیں دور سے قریب آتے ہوئے قدموں کی چاپ کانوں میں آئی، سینے پر بوجھ سا محسوس ہوا، آنکھوں کے سامنے اندھیرا سا آ گیا۔ میرے ہونٹوں پر نرم نرم ہونٹ تھے۔ ان ہونٹوں میں اتنی گرمی تھی، اتنی طاقت تھی کہ اس نے میرے اندر ایک ایسی قوت کو جنم دیا کہ میں نے محسوس کیا کہ زندگی میں ہر حادثے کا کامیابی سے مقابلہ کر سکتا ہوں۔ میرے ہاتھوں نے جنبش کی

اور اس جھکے ہوئے جسم کو جکڑ لیا۔ میرے پہلو میں، میرے سینے میں، میرے چہرے میں، میرے دماغ میں گرمی کی ایک رو بہت ہی تیزی سے گردش کرنے لگی، میرا بدن جلنے لگا، اس گرمی سے جسم کو آسودگی سی ملنے لگی مگر ذہن بغاوت پر آمادہ تھا۔ میں ابھی یہ فیصلہ نہ کر پایا تھا کہ جسم کی آسودگی کو اپناؤں یا ذہن کی بغاوت کا ساتھ دوں کہ میرے سینے پر پڑے ہوئے جسم میں حرکت ہوئی اور ایک ہی جھٹکے میں میرے بازوؤں کی گرفت سے جسم نکل گیا اور پھر ایک بہت ہی مختصر وقفے کے بعد میرے پہلو میں سردی محسوس ہونے لگی۔ میں نے آنکھ کھول کر دیکھا تو نرس کھڑی کانپ رہی تھی۔ اس کی آنکھوں میں آنسو جھلملا رہے تھے۔ وہ خوبصورت لگ رہی تھی۔ میں اس کو دیکھتا رہا۔ وہ مجھے دیکھتی رہی۔ قدموں کی چاپ قریب آتی ہی چلی گئی۔ رک گئی۔ دروازہ کھولنے کی آواز آئی۔ نرس کا جسم ایک دم تن گیا۔ اس نے ہاتھ اٹھا کر ہاتھ کی پشت سے آنسو پونچھ ڈالے۔

دروازہ کھلا اور داؤد سیٹھ کمرے میں داخل ہوئے اور نرس سے پشت کی طرف ہی سے مخاطب ہوئے۔

''نرس ہمارے مریض کا حال کیسا ہے؟''

وہ بولنا چاہتی تھی مگر بول نہ سکی۔ اس کے لب پھڑ پھڑا کر رہ گئے۔ اس کی نظریں مجھ پر گڑی تھیں۔ ان نظروں میں بیک وقت چیلنج تھا کہ ''نہ بولو، اور التجا تھی کہ تم ہی اپنا حال کہہ دو'' میں کچھ فیصلہ نہ کر سکا۔ کان میں ایک آواز آئی اور چونک گیا۔

''میں اب بالکل اچھا ہوں۔ میرا خیال ہے کہ اب میں چل پھر سکوں گا۔''

یہ میری آواز تھی۔ میری آواز نے مجھ میں خواہش پیدا کی کہ میں اٹھ کر بیٹھ جاؤں اور میں نے اٹھنے کی کوشش کی: کہنیوں کو بستر پر گاڑا اور جسم کو اوپر اٹھانے لگا۔

داؤد سیٹھ نرس کی پشت سے بجلی کی طرح میری طرف بڑھے اور دونوں ہاتھ میرے سینے پر رکھ مجھے لٹا دیا۔

میری نظریں نرس کے چہرے پر لگی تھیں۔ سر کے سرہانے سے لگتے ہی اس کے جسم میں حرکت پیدا ہوئی۔ اس نے ایک جھرجھری لی اور میرے بستر کی طرف بڑھی۔

''سیٹھ صاحب! معاف کیجئے میں اپنے فرض کو بھول گئی۔ آپ تشریف رکھیں۔ فکر کی کوئی بات نہیں۔ ان کو اب بخار نہیں۔ پلس نارمل ہے۔ ایک دو دن میں پلاسٹر اتار دیا جائے گا''

نرس نے بستر کے شکن ٹھیک کیے۔ میرے ماتھے کو اپنے دائیں ہاتھ سے سہلایا اور آہستہ سے میرے چہرے پر ہاتھ سے مالش کی اور پھر شہادت کی انگلی میرے ہونٹوں پر رکھ دی اور پھر ایک دم سیدھی کھڑی ہوگئی اور سیٹھ کی طرف متوجہ ہوئی۔

''میری ڈیوٹی ختم ہوئی۔ میں جا رہی ہوں۔ صبح کی نرس آتی ہی ہوگی۔''

اس دن کے بعد میں نے اس نرس کو نہ دیکھا۔ دو دن بعد میرے سینے کو، میرے پیٹ کو، پلاسٹر کے شکنجے سے آزاد کر دیا گیا اور ایک ہفتے بعد میں داؤد سیٹھ کے ساتھ ان کی کوٹھی منتقل ہو گیا۔

عجیب بات ہے۔ مجھے جب بھی خیال آیا کہ داؤد سیٹھ نے میری بیماری کے تمام عرصے میں مجھ سے کبھی بات نہیں کی تو مجھے سخت حیرانی ہوئی۔ مجھے کبھی کسی نے نہیں بتایا کہ مجھے ہسپتال کون لایا اور کیوں؟ سیٹھ داؤد نے میری صحت میں اتنی دلچسپی کیوں لی؟ میرا خیال ہے، میں نے اکثر سوچا ہے اور میں اس نتیجے پر پہنچا ہوں کہ سیٹھ کی کار نے ہی مجھے دھکا دیا تھا اور میں اس کے نیچے آ گیا تھا۔

داؤد سیٹھ مجھے اپنے گھر لے گئے۔ کوٹھی کے ایک الگ حصے میں میری رہائش کا بندوبست کر دیا۔ کچھ دنوں کے بعد وہ مجھے اپنے دفتر لے گئے۔ اپنے کارندوں سے ملوایا اور مجھے اپنے دفتر میں ایک پورے شعبے کا ناظم مقرر کیا۔ میں اپنا کام پوری تندہی سے کرتا رہا۔ میری کوئی اور دلچسپی نہ تھی، زندگی میں کوئی آرزو نہ تھی، ماضی کو بھلانے کا کوئی اور طریقہ نہ تھا۔ میں کچھ سال یونہی کام کرتا رہا۔ دن کو کام کرتا۔ شام کو کلاسیکی موسیقی کے ریکارڈ سنتا۔ دل کو، ذہن کو، ایک آسودگی سی محسوس ہوتی۔ اس آسودگی کے حظ میں رات ہو جاتی۔ کھانا کھاتا، اگلے دن کے کام کا پروگرام مرتب کرتا اور پھر سو جاتا۔

وہ دن اور وہ راتیں عجیب سکون کی تھیں۔ سکون کی نہیں، بے ہوشی کی، لاشعوری کی،

خواہش اور آرزو سے معرّا۔ دنیا اور مجھ میں میرے کام کی دیوار حائل تھی۔ کبھی کبھی داؤد سیٹھ کا کوئی دوست ضد کر کے مجھے اپنے ساتھ سینما لے جاتا یا کبھی چھٹی کے دن سیٹھ کے ساتھ پکنک پر چلا جاتا۔ مگر ان دنوں کی، ان راتوں کی کوئی بات مجھے یاد نہیں۔ یوں لگتا ہے کہ میری آنکھوں نے، میرے کانوں، میرے جسم نے دنیا سے وہ تمام رشتے قطع کر لیتے تھے جن کا محض زندہ رہنے سے کچھ زیادہ تعلق نہ تھا۔ کوئی منظر، کوئی آواز، کوئی چہرہ یاد نہیں۔

ایک دن دفتر میں سیٹھ میرے کمرے میں آئے۔ وہ پہلے میرے کمرے میں کبھی نہ آئے تھے۔ وہ بہت خوش تھے۔ کہنے لگے۔

''سب کام چھوڑ دو۔ میرے ساتھ چلو۔ مجھے بہت ضروری باتیں کرنی ہیں۔'' میں ان کے ساتھ ہولیا۔ کار میں بیٹھے۔ سیٹھ صاحب نے ڈرائیور کو رخصت کر دیا۔ میں حیران ہوا۔ کار ہمیشہ ڈرائیور ہی چلاتا تھا، میں نے انہیں کار چلاتے ہوئے کبھی نہ دیکھا تھا۔ خود آگے بیٹھے۔ مجھے پیچھے بٹھا دیا۔ اس دن پہلی بار میں نے ساون پور کے بازاروں کو، بازاروں میں چلتی پھرتی مخلوق کو، عورتوں کو، ان کے کپڑوں کو، سجی ہوئی دکانوں کو، نیلے آسمان کو، نیلے آسمان پر تیرتے ہوئے ننھے ننھے، سفید سفید، بادل کے ٹکڑوں کو دیکھا۔ کار کے چلنے کی آواز، راہیوں کا شور، بھکاریوں کے گیت کانوں کو بہت ہی بھلے لگے۔

کار ان رستوں پر نہ جا رہی تھی جو گھر کی طرف جاتے تھے۔ کار شہر سے باہر، ساحل کی طرف جانے والی سڑک پر، تیزی سے جا رہی تھی۔ کار سے باہر ہر شے بڑی تیزی سے ماضی کی طرف جا رہی تھی۔ اس سے مجھے یوں لگ رہا تھا جیسے میری قسمت کا فیصلہ ہوا چاہتا ہے۔ مگر مجھے اندازہ نہ تھا کہ اس فیصلے کی نوعیت کیا ہوگی۔ میں اس کے متعلق سوچ ہی رہا تھا کہ کار رک گئی۔ کھڑکی میں سے سمندر کی طرف سے آتی ہوئی ٹھنڈی ہوا نے مجھے جگایا۔ دیکھا تو سیٹھ صاحب کار میں نہ تھے۔ کار سے نکلا۔ ادھر ادھر دیکھا تو وہ سمندر کے کنارے کھڑے سمندر کے پار افق کو دیکھتے تھے۔ میں ان کی طرف بڑھا۔ شام ہو رہی تھی۔ سورج سمندر کی سطح سے کچھ ہی اونچا تھا۔ سمندر کی نیلاہٹوں اور سبزی میں گلال مل رہا تھا۔ سورج کی روشنی میں سیٹھ صاحب کا چہرہ عجب رنگ بدلتا تھا۔ میں ان کے پاس جا کر چپ چاپ کھڑا ہو گیا۔

وہ چپ چاپ کھڑے رہے صرف ان کے چہرے کے نقوش بولتے تھے۔ مگر میں ان کی زبان سے آشنا نہ تھا۔ میں ان کے چہرے کے نقوش کو بنتے بگڑتے دیکھتا رہا، دیکھتا رہا۔

پھر اندھیرا ہوگیا۔ ہر طرف خاموشی تھی۔ سمندر کی لہروں کا دھیما دھیما شور بھی اس خاموشی کا ایک حصہ معلوم ہوتا تھا۔ ہم دونوں اس اندھیرے میں، اس خاموشی میں چپ چاپ کھڑے ایک دوسرے کے تنفس کی آواز کو سنتے رہے، سنتے رہے۔

پھر سمندر کی سطح پر ہلکی ہلکی، مدھم مدھم، روشنی لرزنے لگی۔ میں نے مڑ کر پیچھے دیکھا تو ایک کٹا ہوا چاند افق سے بلندیوں کی طرف بڑھ رہا تھا۔ کٹا ہوا چاند، سمندر کی لہروں کا دھیما دھیما شور، خاموشی، تنہائی، ان سب سے مجھے ڈر لگنے لگا۔ شاید میرا ڈرنا سیٹھ صاحب تک پہنچ گیا تھا کہ وہ بولے:

''بیٹھ جاؤ۔''

اور خود بھی ریت پر بیٹھ گئے۔ تھوڑے سے توقف کے بعد کہنے لگے: ''میں چند گھنٹے پہلے بہت مطمئن تھا اگرچہ خوش نہ تھا۔ خوشی سے مدت ہوئی کنارا کش ہو چکا تھا۔ یکا یک کاغذ کے چند ورقوں نے مجھے بہت ہی خوش کیا، اتنا خوش کیا کہ میں ہر ایک کو بتانا چاہتا تھا کہ میری بھی ایک بیٹی ہے۔ اس نے مجھے خط لکھا ہے۔ وہ مجھ سے ملنے آ رہی ہے۔ وہ کل یہاں پہنچے گی۔ میں نے اسے پہلے کبھی نہیں دیکھا۔ مگر میں نے جب رابعہ (میری بیٹی) کی آمد سے پیدا ہونے والے نتائج پر غور کیا تو میری خوشی ڈر میں بدل گئی ہے۔ اب میں ڈرتا ہوں۔ یہاں کھڑے کھڑے مجھے کئی بار خیال آیا کہ میں اپنے آپ کو سمندر کی لہروں کے سپرد کر دوں کیونکہ رابعہ کا سامنا کرنا اس کی ماں کا بھی سامنا کرنا ہے اگرچہ اس کی ماں اب زندہ نہیں ہے۔

رابعہ کی ماں بہت ہی حسین تھی، بہت ہی دولتمند تھی۔ اس کا باپ اس شہر میں سب سے بڑا تاجر تھا۔ جب میں نے پہلی بار اسے دیکھا تو وہ بچی تھی۔ پانچ چھ سال کی ہوگی۔ ان دنوں میں جوان تھا مگر غریب تھا۔ ہاں! واقعی غریب تھا۔ اس دن جو کپڑے میں نے پہن رکھے تھے وہ میرے کپڑوں کا آخری جوڑا تھا۔ دوسرا جوڑا اس دن سے ایک دن پہلے دھوتے

دھوتے بالکل پھٹ گیا، بالکل پہننے کے قابل نہ رہا تھا۔ میں نے اس دن طے کیا تھا کہ اگر اس جوڑے کے میلے ہونے سے پہلے کسی نے میری دستگیری نہ کی تو میں سمندر میں ڈوب مروں گا۔ رابعہ کی ماں نے اس دن میری دستگیری کی۔ میں نے اس کے سامنے نہ اس کی غیر حاضری میں کبھی اس کا نام لیا۔ مجھے کبھی بھی یقین نہ آیا، اب بھی نہیں ہے، کہ اس کا کوئی نام ہوسکتا تھا۔ بچپن میں، جوانی میں، شادی کے بعد صبح سے شام تک، رات سے صبح تک، میں نے جب بھی اسے دیکھا تو یوں لگا کہ وہ اجنبی ہے اور میں اسے زندگی میں پہلی بار دیکھ رہا ہوں۔ اس کے ہزاروں ہی روپ تھے: اداس اداس، چمکیلے چمکیلے، انوٹھے انوٹھے، موہن موہن، سندر سندر، شیتل شیتل، سُورگ سُورگ؛ اس کی اداس، کبھی شوخ، کبھی چمکیلی، کبھی آگ سی روشن، کبھی سیاہ گہری، اتھاہ گہری، آنکھوں میں میں نے ہمیشہ آنند ہی پایا-- ایسا آنند جو موت کے بہت قریب ہو مگر موت کے اختیار سے ماورا۔

ہاں! تو اس دن گھر سے میں صبح ہی صبح نکل آیا تھا۔ میرے پاس اس دن صرف ایک پائی تھی۔ ان دنوں ایک پائی بھی بڑی نعمت تھی۔ اس سے اتنے چنے خریدے جاسکتے تھے کہ پیٹ تمام دن تنگ نہ کرے۔ میں نے چنے خریدے، جیبیں بھر لیں اور شہر سے نکل آیا۔ شہر میں کوئی کسی کی دستگیری نہیں کرتا اور اگر کرتا بھی ہے تو چند لمحوں کے لیے۔ آج نہیں ہمیشہ سے یہی طور رہا ہے۔ میں نے سمندر کنارے پہنچ کر سمندر کے سامنے ڈیرے ڈال دیے۔ سوچا کہ اگر کسی نے سمندر کو مجھ سے کھینچ لیا تو دستگیری ہوگی ورنہ سورج کے ساتھ میں بھی سمندر میں بہہ جاؤں گا۔ میں تمام دن سمندر کو گھورتا رہا، سمندر مجھے ڈراتا رہا۔ مجھے دیکھ دیکھ دھاڑتا تھا، میری طرف لپکتا تھا اور پھر مسکرا کر لوٹ جاتا اور پھر کھلکھلا کر ہنس دیتا جیسے کہ مجھ سے کوئی کھیل کھیل رہا ہو۔ اس کھیل میں سورج ڈھلنے لگا۔

ان دنوں ساحل پر لوگ یوں سیر کو نہ آتے تھے۔ شہر سے ساحل تک کا رستہ بالکل اجاڑ تھا، صرف ساحل کے آس پاس مچھیروں کا ایک گاؤں تھا۔ میں بھی اس دن سے پہلے کبھی ادھر نہ آیا تھا۔ اس دن کے بعد میں اکثر یہاں آتا جاتا رہا۔

ہاں! تو اس دن سورج ڈھل گیا مگر ساحل پر کوئی نہ آیا، کوئی آواز تک بھی کانوں میں

نہ آئی۔ ہر طرف سمندر کی لہروں کا شور تھا اور بس۔ دور دور تک کہیں کشتی نام کو نہ تھی۔ افق سرخ تھا۔ سبز سمندر سرخ ہو رہا تھا اور میرا دل بیٹھ رہا تھا، میرے شانوں سے ایک سرد لہر اٹھ رہی تھی جو پوری کمر پر ہلہ بول رہی تھی، میرا تمام جسم سرد ہونے لگا تھا۔ سرد لہریں اٹھ اٹھ کر میرے دماغ کو سرد کرنے پر تلی ہوئی تھیں۔ میری آنکھوں کے سامنے اندھیرے کا ایک سمندر ابھر رہا تھا۔ اس سردی سے، اس اندھیرے سے میں اپنے آپ کو بچانا چاہتا تھا مگر میرے جسم میں طاقت ہی نہ رہی تھی، میرے ذہن میں خیال ابھرتا ہی نہ تھا۔ مجھے موت کا قرب محسوس ہو رہا تھا۔

پھر یکایک دور سے ایک آواز میری طرف لپکی، لپکتی ہی چلی آئی۔ لہروں کا شور تھا۔ میں چونکا۔ سر اور گردن کے سنگم سے ایک گرم گرم لہر ابھری اور خون میں، رگوں میں دوڑتی ہوئی دماغ کو منور کر گئی۔ اندھیرے دور ہوئے۔ ڈوبتے سورج کی روشنی میں میں نے سمندر کو مسکراتے ہوئے پایا۔ میں نے محسوس کیا کہ میرے جسم میں کہیں، شاید دل میں ایک گلزار کھلا ہے۔ اس خیال سے میری ناک میں خوشبو کا ایک ایسا جھونکا آیا کہ میں مدہوش ہونے لگا۔ اتنے میں میں نے محسوس کیا کہ کوئی میرے ہاتھ کو پکڑ کر ہلا رہا تھا اور پوچھ رہا تھا۔

''تم سورج کو لینے آئے ہو۔ کہاں لے جاؤ گے بھلا؟ کچھ دیر اور اسے یہیں سمندر پر تیرنے دو۔ تم کہاں سے آئے ہو؟ تم سمندر پر چل سکتے ہو؟ تم سورج کو کیسے پکڑو گے؟ بھاگ گیا تو؟''

میں نے دیکھا کہ ایک بہت ہی خوبصورت، بھولا مگر ذہین چہرہ مجھے غور سے دیکھ رہا تھا۔ اس چہرے میں آنکھیں -- وہ معصوم معصوم، چمکیلی چمکیلی، شفاف شفاف، گہری گہری، سیاہ آنکھیں، سفید سفید، براق سی پتلیاں -- مجھے کبھی بھی نہیں بھولیں۔ ان آنکھوں نے اس دن مجھے موت کے پنجے سے چھین لیا۔

میں جواب سوچتا ہی تھا۔ نہیں مجھے جواب دینے کا خیال نہیں آیا کہ ایک نسوانی آواز تیرتی ہوئی کانوں میں آئی:

''کیسی باتیں کرتی ہے۔ بیچارے کو پریشان کر دیا۔ نہ جانے کون ہے۔ صورت سے تو

شریف لگتا ہے۔ کپڑے بھی اجلے ہیں۔ اس شہر میں نیا نیا ہے شاید۔ کیوں آپ کا کیا خیال ہے۔ ایک عورت مجھے نہایت گہری دلچسپی سے دور کھڑی دیکھتی تھی۔

میں آواز کی طرف متوجہ ہوا۔ ایک عورت جو حسین تو نہ تھی مگر بہت ہی وجیہہ تھی، وہ مغربی لباس میں بہت ہی پروقار لگ رہی تھی، اس کے چہرے کو دیکھنے سے ٹھنڈی ہوا اور خوشگوار سی گرمی کا احساس ہوتا تھا (اس لمحے بھی ہوا اور اس کے بعد بھی ہمیشہ ہی ہوا) اس چہرے کو دیکھتے دیکھتے مجھے احساس ہوا کہ ایکا ایکی سمندر شانت ہوگیا ہے، اس کی لہریں گہرائیوں میں اتر کر سو گئی ہیں اور نیلا اور سبز سمندر تہہ در تہہ شفاف ہوتا چلا جا رہا ہے اور اس کی سب مخلوق اور اس کے سب خزانے مجھ پر، میرے لیے، عیاں ہوگئے ہیں۔ اس کے چہرے پر کھلے، وسیع، سرسبز، میدانوں کی سی فراخی اور خلوص تھا۔ اس کے کھڑے ہونے کے انداز سے مجھے اس دن اور اس کے بعد ہمیشہ یوں لگا کہ یوکلپٹس کے درخت تیز ہوا میں جھولتے جھولتے ہوا کے ایکا ایکی ساکن ہوجانے سے متین ہوگئے ہیں۔ اس کی نیلی نیلی آنکھوں میں ایسی جگمگاہٹ تھی کہ مجھے مدتوں نہ سوجھا کہ کائنات میں ایسی بھی کوئی جگمگاہٹ ہوسکتی ہے تا آنکہ ایک صبح میں نے یورپ جاتے ہوئے بحیرہ روم کی نیلی نیلی پرسکون سطح پر سورج کی کرنوں میں سوئی ہوئی نیلاہٹ میں ایسی جگمگاہٹ دیکھی اور برسوں کے سفر کے بعد ایک آرزو کا سفر ختم ہوا۔

میں اس وجیہہ پروقار اور پراسرار عورت کو صدیوں، قرنوں، یونہی دیکھتا رہتا اگر وہ میری طرف بڑھ نہ آتی اور رابعہ کی ماں کا ننھا ننھا، پیارا پیارا، ہاتھ پکڑ کر واپس گاڑی کی طرف نہ لوٹ جاتی۔ وہ گاڑی میں جا بیٹھی۔ میری نظریں اس کے قدموں کا تعاقب کرتی گاڑی کے پائدان تک گئیں اور ٹھٹکیں اور پھر اس مقام پر لوٹ آئیں جہاں وہ پراسرار عورت کھڑی تھی۔ وہاں اب ایک ادھیڑ عمر کا پروقار، اداس سا مرد کھڑا تھا جس کی کنپٹیوں پر بال سفید ہو رہے تھے۔ اس کے کھڑے ہونے کے انداز میں اداس سا تحکم تھا اور ہر شے سے اطاعت کا طالب تھا اور ہر شے کی اطاعت سے اُداس تھا۔ میں نے دیکھا کہ اس کی نظریں میرے قدموں پر گڑی تھیں اور اوپر نہ اٹھنے، مجھے نہ دیکھنے پر بضد تھیں۔ میں ان نظروں کی

ضد سے پریشان سا ہوا اور میں نے سمندر کے اس پار افق پر سے بڑھتے ہوئے سایوں کے لشکر کو دیکھا اور پھر جب میری نظریں لوٹیں تو اس مرد کی نظریں مجھے، میرے سارے جسم کو اپنے جال میں گرفتار کئے واپس لوٹ رہی تھیں۔ جب میری نظریں اس مرد کے چہرے پر پہنچیں تو اس کے جسم میں حرکت پیدا ہوئی اور وہ مڑا، گاڑی میں بیٹھی ہوئی عورت اور بے تاب لڑکی کو گاڑی میں کھڑے دیکھا، اس کی گردن میں ذرا خم آیا جیسے وہ مجھے ایک بار پھر دیکھنا چاہتا ہو مگر وہ مجھے دوبارہ دیکھے بغیر گاڑی کی طرف بڑھتا چلا گیا۔ گاڑی میں بیٹھ گیا اور گاڑی چل دی۔

میرے دل میں جو جینے کی خواہش اور آس پیدا ہوئی تھی، سو گئی۔

گاڑی شہر کی طرف بھاگی چلی گئی۔ گاڑی اور میرے درمیان اندھیروں کا سمندر ٹھاٹھیں مارنے لگا۔ میں نے افق کی طرف دیکھا، سمندر کی سطح پر نظر ڈالی۔ ہر شے اندھیرے میں گم ہو رہی تھی، اندھیرا بن رہی تھی۔ میں خود اندھیرے کا ہی ایک ننھا سا قطرہ معلوم ہو رہا تھا۔ میں نہ جانے کتنی دیر یوں اندھیرے کی لہروں پر ڈولتا رہا۔ یکا یک بادل گرجنے کی آواز نے مجھے چونکا دیا۔ میں نے آسمان کی طرف دیکھا۔ بادل یورش کرتے ہوئے افق کی طرف سے بڑھ رہے تھے۔ ان کی اس خاموش یورش سے دل دہلنے لگا، بجلی کی چمک کی خواہش کرنے لگا۔ بجلی چمکی، آفاق روشن ہوئے، سمندر کی سطح روشن ہوئی، زمین روشن ہوئی، فضا روشن ہوئی، اس روشنی میں میں نے دیکھا کہ بادل تہہ در تہہ ابل رہے تھے، کبھی کبھی بجلی کی چمک ان تہہ در تہہ ابلتے ہوئے بادلوں کے متحرک دائروں میں قید ہو جاتی اور فضا میں چھا نہ سکتی۔ یہ ہولناک مگر حسین منظر کبھی اندھیرے میں گم ہو جاتا اور کبھی منور ہو جاتا۔ پھر ایک بار اس زور سے بادل گرجا کہ زمین دہل گئی، کانپ گئی اور بارش ہونے لگی۔ بارش بہت زور کی تھی، بارش کے قطرے بہت بوجھل تھے۔ جب کبھی بجلی چمک جاتی تو ہر طرف زمین سے آسمان تک تار ہی تار نظر آتے اور ان عمودی تاروں کے درمیان میرا ننھا سا جسم محصور و مسدود نظر آتا تھا۔ تاروں کی ان لہراتی ہوئی، ہر طرف پھیلتی ہوئی، دیواروں میں میں قید تھا۔

تاروں کے اس قید خانے، اس طلسم سے نکلنا ممکن نظر نہ آتا تھا۔ سمندر کی طرف سے

بہت تیز ہوا آ رہی تھی۔ جس سے تاروں کے طلسم میں تھرتھری سی پھیل رہی تھی۔ فطرت کی طاقتوں کے اس سیلاب میں میرے حواس بہہ نکلے، ہوش و عقل نے نہ جانے کہاں پناہ ڈھونڈی۔ میں اس سیلاب میں بے یار و مددگار تھا۔ سمندر قریب ہونے کے باوجود مجھے قبول کرنے کے لیے تیار نہ تھا، اس کے اور میرے ملاپ میں تند ہوا اور مجھ میں ارادے اور سوچ کا فقدان حائل تھے۔ شہر اور مجھ میں اندھیروں اور بارش کی تاروں کا جنگل حائل تھا۔ بچاؤ کی صرف دو ہی صورتیں ہو سکتی تھیں، سمندر کی لہریں بڑھ کر مجھے ساتھ بہا لے جائیں یا شہر سے کوئی پکارنے اور ساتھ لے جانے کے لیے آ جائے۔ میری تمام امیدیں سمندر کی لہروں سے وابستہ ہونے لگی تھیں۔ سمندر کی لہروں کا شور قریب آ رہا تھا۔ سمندر کی لہروں کا شور تند ہوا اور بارش کے قطروں کے شور پر بھی چھانے لگا تھا۔ میں نے چاہا کہ اپنے آپ کو اس شور کے سپرد کر دوں مگر اپنے اندر گہرائیوں میں سے ایک للکار سنائی دی ''ٹھہرو، رک جاؤ۔'' میرا تن بدن تن گیا۔ میرا تنا ہوا بدن ایک ساز بن گیا جس سے تند ہوا کے لمس سے امید و رجا کے نغمے سے پھوٹنے لگے۔ میں ان نغموں پر کان دھرنے کو تھا کہ دور سے ایک ننھا سا شور بلند ہوا جس کی سمت متعین کرنے میں مجھے کچھ دیر لگی۔ یہ ننھا سا شور شہر کی طرف سے بڑھ رہا تھا۔ شور للکار کی مانند قریب آتا جا رہا تھا۔ میں اس نئے شور کی طرف متوجہ ہو گیا۔ یہ نیا شور للکار سے امید کی آواز بنا، رجا کا مینار بنا، ہر طرف اندھیرے کے باوجود روشنی کا احساس ہونے لگا۔ پھر یکا یک بارش کے قطروں کا بوجھ بدن پر کم ہونے لگا مگر ہوا کی تندی کا احساس بڑھنے لگا۔ میرا سارا جسم ہوا میں لہرانے لگا۔ میں ایک درخت تھا کہ ہوا کی تندی سے گرا چاہتا تھا، اپنے مقام سے اکھڑا چاہتا تھا۔

للکار یکا یک نعرے میں بدلی اور تند ہوا پر سے یلغار کرتی ہوئی گھوڑوں کے ہنہنانے کی آواز میرے کانوں میں آئی۔ پھر اس آواز کے تعاقب میں گاڑی کے پہیوں کی آواز لپکتی ہوئی آئی۔ میرا سارا جسم کان بن گیا اور میری آنکھیں گاڑی اور گھوڑوں کی متلاشی ہوئیں۔ اندھیرے میں کچھ نظر نہ آتا تھا۔ میری بے تابی بڑھنے لگی، ڈر میں تبدیل ہونے لگی۔ اندھیرا، بارش، ہوا مجھے ڈرانے میں مصروف نظر آنے لگے۔ کبھی کبھی بادل کی گرج بھی ان

کے ساتھ مجھے ڈرانے میں شامل ہو جاتی۔ مگر امید کا نعرہ اور روشنی کا مینار قریب آتے چلے گئے۔ ایک لمحہ ایسا بھی آیا کہ وہ خوش آئند آواز رک گئی، روشنی کا مینار اندھیرے میں گم ہو گیا۔ میں گھبرا گیا، بے تاب ہو گیا، پریشان ہو گیا، ویران ہو گیا۔ میری ویرانی میں سے ایک چشمہ پھوٹا اور فلک تک اس کی دھار گئی۔ اک چیخ فضا میں گونج گئی: ''کون آیا ہے۔'' اس چیخ کے جواب میں بجلی چمک گئی اور میں نے دیکھا کہ مجھ سے کچھ دور چار سفید گھوڑوں کے پیچھے ایک بند سیاہ گاڑی کھڑی تھی۔ پھر بجلی کی چمک اندھیرے میں کھو گئی اور میری چیخ اندھیرے کے آغوش میں سو گئی۔

''چپ کیوں کھڑے ہو۔ گاڑی کی طرف بڑھو۔ میں تمہیں لینے آئی ہوں۔'' گاڑی کی سمت سے ایک نسوانی آواز بڑے وقار اور اعتماد سے میری طرف بڑھی اور مجھے جھنجھوڑا۔ میں جاگا اور آواز کی طرف بڑھا، بڑھتا ہی چلا گیا۔ میں نے دیکھا کہ گاڑی کے اندر سے ایک لالٹین نکلی اور گاڑی اور گھوڑوں کی پشت کے درمیان معلق ہو گئی اور پھر ایک اور لالٹین گاڑی میں سے نکلی اور گاڑی کی پشت کی طرف چلی، غائب ہوئی اور دوسری طرف گھوڑوں کی پشت کے پاس بلند ہوئی اور اوجھل ہو گئی میں لالٹین کی طرف بڑھتا چلا گیا۔ میں گاڑی کے قریب پہنچا تو گاڑی کا دروازہ کھلا، ایک ہاتھ نکلا جس نے میرا ہاتھ پکڑ کر مجھے گاڑی کے اندر کھینچ لیا اور پھر کھٹ سے گاڑی کا دروازہ بند ہوا اور گاڑی چل دی۔

ہوا میں گھوڑوں کی ٹاپوں کی آواز بلند ہوئی اور گاڑی ہوا میں لہرانے لگی۔ ہوا کی شائیں شائیں اور بارش کے قطروں کے گرنے کا شور گاڑی کا تعاقب کرنے لگے۔

میں اندھیرے میں پڑا حواس و ہوش کو اکٹھا کرنے میں مصروف تھا مگر حواس تھے کہ جمع ہو ہو کر بکھر رہے تھے۔ میں آخر تھک کر کونے میں گر گیا اور شاید سو گیا۔ پھر ایک جھٹکا سا لگا اور میں ڈر کر اٹھ بیٹھا۔ گاڑی رک گئی تھی، گاڑی کے چاروں طرف آوازوں کا دھیما دھیما مگر واضح ہوتا ہوا شور اٹھ رہا تھا۔ گاڑی کا دروازہ کھلا اور روشنی دندناتی ہوئی گاڑی میں داخل ہوئی۔ سامنے کی سیٹ پر بیٹھے ہوئے ایک نسوانی جسم کے مغربی لباس کے نچلے کناروں، پنڈلیوں اور پاؤں کو ڈھانپتی ہوئی گرگابی کو منور کرنے لگی۔ اس سامنے کی سیٹ سے ایک

ہاتھ اور بازو روشنی کی طرف بڑھے۔ میری طرف بڑھے اور مجھے شانے سے پکڑ کر ہلایا۔ میری آنکھیں کہ روشنی سے کچھ دیر کے لیے چندھیا گئی تھیں اب صاف صاف دیکھنے لگی تھیں۔ اس ہاتھ اور بازو کے پیچھے ایک چہرے کا بھی کچھ حصہ نظر آ رہا تھا۔ چہرہ شناسا سا محسوس ہوا۔ میں پہچاننے کی کوشش کرنے لگا۔

''آؤ......گھر آ گیا ہے۔''

آواز میرے ذہن میں گونج گئی۔ یہ تو وہی نیلی جگمگاتی ہوئی آنکھوں والی پراسرار عورت تھی۔

میں نے کونے میں سے سر اٹھایا اور بیٹھ گیا۔ عورت دروازے میں سے نکل گاڑی کے باہر جا کھڑی ہوئی۔ اس نے مڑ کر گاڑی کے اندر دیکھا اور چل دی۔ اس کے سیڑھیاں چڑھنے کی آواز کچھ دیر میرے کانوں میں آتی رہی اور پھر غائب ہوگئی۔ کچھ دیر روشنی، آوازیں، گاڑی اپنی اپنی جگہ الگ الگ، اپنے وجود کا اعلان کرتی رہیں اور پھر کسی کے جلدی جلدی سیڑھیوں پر سے اترنے کی آواز آئی اور پھر وہ آواز دوڑنے لگی اور ایک ننھا جسم گاڑی کے پائیدان پر چڑھ آیا اور مجھے پکارنے لگا:

''اجنبی! جاگو! میں آ گئی ہوں۔ تمہیں لینے کے لیے۔ میں بہت دیر سے تمہارا انتظار کر رہی تھی۔''

پھر وہ ننھا سا جسم گاڑی میں داخل ہوا اور میرا ہاتھ ٹٹول کر پکڑ لیا اور مجھے کھینچنے لگا۔ میں اٹھا اور گاڑی سے نکل آیا۔ آوازوں کا دھیما دھیما شور ٹھٹک گیا۔ میں نے چاہا کہ اپنے گردوپیش پر نظر ڈالوں مگر ننھی صوفیہ......اس کا نام صوفیہ تھا، کتنا سچا نام تھا،...... نے مجھے موقع نہ دیا اور مجھے کھینچتے ہوئے سیڑھیوں تک لے گئی اور پھر میں اس کے ساتھ ساتھ سیڑھیاں چڑھنے لگا۔ صوفیہ--آج اس کی بیٹی آ رہی ہے۔ اس خوشی میں اگر اس کا نام لے لیا تو شاید کچھ ہرج نہیں- بار بار مجھے اپنی چمکتی ہوئی، مسکراتی ہوئی، آنکھوں سے دیکھتی تھی۔ اس کے سارے چہرے سے خوشی پھوٹ پھوٹ کر بہہ رہی تھی۔ میرا دل خوشی سے بھر گیا اور میں تیزی سے سیڑھیاں چڑھنے لگا اور جب سب سیڑھیاں چڑھ گیا تو میری پشت سے ایک

ننھا سا قہقہہ بلند ہوا۔ میں نے مڑ کر دیکھا تو ننھی صوفیہ مسکرا رہی تھی۔

''اجنبی تمہیں کیا معلوم کہ تمہیں اب کہاں جانا ہوگا، صرف میں جانتی ہوں۔'' پھر وہ جلدی سے سیڑھیاں چڑھتی ہوئی میرے پاس آئی۔ وہ ہانپ رہی تھی، اس کا چہرہ تمتما رہا تھا۔ وہ بہت ہی خوبصورت اور پیاری لگ رہی تھی۔ اس نے میرا ہاتھ تھام لیا اور سامنے کے برآمدے کی طرف بڑھی۔ برآمدے میں سے ایک اور برآمدہ اندر کی طرف بہہ نکلا۔ ہم اس برآمدے میں داخل ہوئے۔ پہلے ہی کمرے کے دروازے کے شیشوں سے روشنی باہر آ رہی تھی۔ صوفیہ نے دروازے کو کھٹکھٹایا اور دونوں ہاتھوں سے دروازے میں لگے ہوئے پیتل کے سر کو گھمایا۔ دروازہ کھل گیا۔ صوفیہ کمرے میں داخل ہوئی اور دروازے کے سامنے لٹکے ہوئے پردوں کو کھول کر کمرے کی روشنی میں گم ہوگئی اور پھر اپنے والد کا ہاتھ پکڑے ہوئے ان کو باہر لے آئی۔ میں کمرے کے باہر کھڑا نہ سوچنے کی کوشش میں مصروف تھا۔ صوفیہ کے والد کو دیکھتے ہی میں نے ان کا شکریہ ادا کیا تو وہ مسکرا کر بولے کہ:

''نوجوان! میں نے تو تمہارے متعلق کچھ بھی نہ سوچا تھا مگر صوفیہ کو اصرار تھا کہ تمہیں ساحل سے لایا جائے اور اس کی خالہ نے ہمت کی اور گاڑی لے کر چلی گئیں۔ اس لیے تمہیں صوفیہ اور اس کی خالہ کا شکریہ ادا کرنا چاہیے۔ بہرحال آج سے تم اپنے آپ کو اس گھر کا ایک فرد جانو۔''

پھر میرے گیلے کپڑوں پر نظر ڈالی اور واپس کمرے میں لوٹ گئے۔ کہیں ایک گھنٹی بجنے کی آواز گونجی اور پھر برآمدے میں کسی کے قدموں کی آواز قریب آنے لگی۔ صوفیہ کے والد پھر کمرے سے نکل آئے۔ اتنے میں ملازم بھی آ گیا۔ نوشیرواں سیٹھ نے ملازم کو حکم دیا کہ مجھے میرے کمرے میں لے جائے۔ نوشیرواں سیٹھ نے شب بخیر کہی اور صوفیہ کو گود میں اٹھا کر برآمدے کے اندر کی طرف چل دیئے۔ صوفیہ نے نوشیرواں سیٹھ کے کندھے سے ہاتھ ہلا کر شب بخیر کہا۔

ملازم مجھے لے کر باہر کے برآمدے میں آیا اور پھر اس برآمدے کے شمالی کونے کی طرف چل دیا۔ برآمدے میں ٹھنڈی ٹھنڈی ہوا چل رہی تھی جس سے مجھے سردی سی لگنے

لگی۔ ملازم نے کمرے تک پہنچ کر کمرے کے دروازے کھول دیئے۔ دروازے کے اس پار کمرا نہ تھا ایک اور برآمدہ تھا۔ اس کے آخر میں ایک اور دروازہ تھا۔ اس کو کھولا تو غسل خانہ تھا۔ ملازم نے بتایا میرے لیے گرم پانی رکھا تھا، رات کو پہننے کے کپڑے رکھے تھے اور غسل خانے کے دوسری طرف ڈریسنگ روم تھا اور اس کے ساتھ سونے کا کمرا اور اس کی بغل میں ڈرائنگ روم۔ یہ سب کچھ بتا کر ملازم چلا گیا۔ میں نہایا، کپڑے بدلے اور سونے کے کمرے میں داخل ہوا۔ بستر کی شکل دیکھ کر برسوں کی تھکن جاگ اٹھی اور میری آنکھیں نیند سے بوجھل ہو گئیں۔ میں بستر پر پڑتے ہی سو گیا۔ جب آنکھ کھلی تو بھوک سے پیٹ میں بل پڑ رہے تھے۔ جی میں آیا کہ کسی کو بلاؤں مگر خیال آیا کہ کیسے۔ میں نے بہت سوچ بچار کے بعد فیصلہ کیا کہ پہلے نہایا جائے۔ شاید کوئی پانی کی آواز سے میری طرف متوجہ ہو۔ میں نہانے لگا تو کہیں قریب ہی سے دروازہ کھلنے کی آواز آئی۔ پھر میں نے محسوس کیا کہ کوئی میرے سونے کے کمرے کا دروازہ کھٹکھٹا رہا ہے اور پھر دروازہ کھول کر داخل ہو گیا ہے۔ دروازہ پھر بند ہوا اور لوٹتے ہوئے قدموں کی آواز دور ہونے لگی۔ میں نہا کر نکلا تو ڈریسنگ روم کی کرسی پر باہر پہننے کا ایک نیا سا جوڑا رکھا تھا۔ میں کپڑے بدلنے لگا تو ڈرائنگ روم میں برتن رکھنے کا شور سا ہوا۔ میں کپڑے بدل ڈرائنگ روم میں داخل ہوا تو ننھی صوفیہ نوکر کو ہدایات دے رہی تھی کہ اور کیا کیا لائے۔

مجھے دیکھتے ہی صوفیہ نے خوش آمدید کہا اور بولی:

''اجنبی! تم تو بہت سوتے ہو۔ میں نے صبح تمہارا انتظار کیا تو تم سوتے تھے، دوپہر تمہارا انتظار کیا تو تم سوتے تھے، اب سہ پہر ہوئی تو میں نے سوچا کہ تمہیں خود ہی آ کر اٹھا دوں۔ اچھا ہوا کہ تم خود ہی اٹھ بیٹھے۔''

''میرا نام داؤد ہے۔ میں اب اجنبی نہیں ہوں۔ تمہارا مہمان ہوں۔''

''تمہیں کیسے معلوم ہوا کہ تم میرے مہمان ہو؟ خالہ اور ابا جان بھی یہی کہتے ہیں کہ تم میرے اور صرف میرے مہمان ہو اور مجھے ہی تمہاری دیکھ بھال کرنی ہے۔''

پھر کچھ وقفے کے بعد صوفیہ نے سنجیدہ صورت بنا کر کہا:

''تمہارا نام داؤد ہی سہی مگر میں تو تمہیں اجنبی ہی کہہ کر پکارا کروں گی۔ مجھے تو ایسا لگتا ہے کہ تمہارا نام ہی اجنبی ہے۔ داؤد تو لوگوں کا سا نام ہے۔ تم تو سورج کو گرفتار کرنے آئے تھے نا......''

صوفیہ نے فقرہ مکمل نہ کیا اور مسکرانے لگی اور پھر ہنسنے لگی اور ہنستے کہنے لگی۔

''کیا تم واقعی یہ سمجھتے ہو کہ میں اور بچوں کی طرح پریوں کی کہانیوں کو سچ مانتی ہوں؟ تمہیں ساحل پر کھڑے سورج کو گھورتے ہوئے مجھے یونہی خیال سا آیا کہ تم سورج کو گرفتار کرنے آئے ہو۔ گھر آ کر مجھے اپنی اس بات کا بہت مزا آیا۔ پھر جب بارش ہونے لگی تو مجھے تمہارا خیال آیا......تم کھاتے کیوں نہیں۔ میں تو باتیں سننے کے ساتھ ساتھ کئی کام کر لیتی ہوں۔ کھاؤ نا......

''مجھے خیال آیا کہ تم اس زور کی بارش میں کہاں جاؤ گے۔ میں نے خالہ سے کہا، ابا سے کہا کہ وہ کسی کو بھیج کر تمہیں یہاں لے آئیں۔ خالہ نے اصرار کیا کہ وہ خود جا کر تمہیں لے آئیں گی۔ میں کچھ دیر تو تمہارا انتظار کرتی رہی پھر میں صوفے پر بیٹھی بیٹھی سو گئی۔ خالہ نے آ کر مجھے جگایا اور بتایا کہ وہ تمہیں لے آئی ہیں۔ وہ تو اپنے کمرے میں چلی گئیں...... آج وہ بھی تمہاری طرح ابھی تک سو رہی ہیں......''

صوفیہ اس کے بعد نہ جانے کیا کیا باتیں کرتی رہی۔ میں نے کچھ نہ سنا۔ میرے ہاتھ لقمے اٹھاتے رہے اور میرا ذہن یہی سوچتا رہا کہ صوفیہ کی خالہ آج کیوں اس وقت تک سو رہی تھیں۔ اگر جاگ رہی تھیں تو اپنے کمرے سے کیوں نہیں نکلیں۔ وہ کیا سوچ رہی تھیں۔ جب سوچتے سوچتے میرے ہاتھ لقمے اٹھانے سے رک جاتے تو صوفیہ کی آواز مجھے چونکا دیتی اور میں پھر لقمے اٹھانے لگتا۔ ایک بار تو یوں ہوا کہ میرے ہاتھ رک گئے مگر صوفیہ نے کچھ نہ کہا۔ میں چونک گیا۔ دیکھا تو صوفیہ بڑے غور سے مجھے دیکھ رہی تھی۔ اس کے چہرے پر سنجیدگی اور گہری سوچ کے آثار نمایاں تھے۔ مجھے متوجہ دیکھ کر وہ مسکرائی اور مجھے آج بھی محسوس ہوتا ہے کہ وہ ذرا سی شرمائی بھی تھی۔

میں نے میز کے برتنوں کو دیکھا تو سب خالی ہو چکے تھے۔ کچھ دن تو یونہی آرام

کرنے، کھانے پینے اور ننھی صوفیہ کی باتوں میں گزر گئے۔ کبھی کبھی ہم دونوں شام کو سیر کے لیے بھی چلے جاتے تھے۔ میں اس بے مقصد زندگی سے گھبرانے لگا تو ایک دن نوشیرواں سیٹھ نے مجھے بلا بھیجا اور مجھ سے پوچھا کہ میں کتنا پڑھا ہوا ہوں۔ میرے بتانے پر انہوں نے کہا کہ اس سے اگلے دن سے میں باقاعدہ تعلیم حاصل کروں اور انٹرنس کا امتحان پاس کرنے کے بعد وہ میرے مستقبل کے بارے میں ایک بار پھر سوچیں گے۔ پورا ایک سال پڑھائی میں گزر گیا، امتحان دیا، پاس ہوا تو ایک بار پھر نوشیرواں سیٹھ کے حضور پیش ہوا۔ انہوں نے فیصلہ کیا کہ مزید تعلیم کے لیے انگلستان چلا جاؤں اور تین چار سال میں بیرسٹری پاس کر کے واپس لوٹ کر ان کے کاروبار میں قانونی مشیر کا کام سنبھالوں۔

تیاری میں کچھ مہینے لگ گئے۔ اس عرصے میں پہلی بار صوفیہ کی خالہ نے مجھ سے بات چیت کرنا شروع کی۔ صوفیہ، صوفیہ کی خالہ اور میں ہر روز صبح کی چائے، دوپہر کے کھانے، سہ پہر کی چائے اور رات کے کھانے کے وقت تو ضرور ہی اکٹھے ہوتے تھے۔ نوشیرواں سیٹھ ان دنوں بہت ہی مصروف رہتے تھے، شاید ہمیشہ ہی یوں مصروف رہتے تھے۔ کبھی کبھار ہمارے پہنچنے سے پہلے ناشتے کی میز پر سے اٹھتے نظر آتے یا کبھی کبھار جب ہم لوگ رات کا کھانا کھا، بہت سی باتیں کر لیے ہوتے اور اٹھنے کی سوچ رہے ہوتے تو وہ کھانے کی میز پر آتے تھے، ہمیں اٹھنے کی تیاری کرتے دیکھ کر وہ شب بخیر کہہ کر ہمیں رخصت کر دیتے۔ ان چند مہینوں میں فرانچسکہ ماریا سپاغتی --صوفیہ کی خالہ اٹلی کی تھی، نوشیرواں سیٹھ نے اطالوی عورت سے شادی کی تھی جو سنتے ہیں کہ صوفیہ کی پیدائش کے کچھ دنوں بعد مر گئی تھی-- مجھ سے بہت گھل مل گئی اور ہم اکثر ایک دوسرے سے باتیں کرتے کرتے بھول جاتے کہ صوفیہ بھی پاس بیٹھی ہے۔ اس استغراق میں صوفیہ کا بھی حصہ تھا: وہ کبھی بھی اپنے وجود کا احساس دلانے کی کوشش نہ کرتی تھی۔ جب کبھی ہم استغراق سے ابھرتے تو وہ ہمیں دیکھ کر مسکرا دیتی، اس کی مسکراہٹ میں بے اطمینانی کا شائبہ تک نہ ہوتا، اس کی مسکراہٹ میں رفاقت اور ہم سفری کا احساس بہت ہی نمایاں ہوتا تھا۔ اس کی اس مسکراہٹ نے ہمیں ہمیشہ بہت ہی فرحت اور راحت بخشی۔ فرانچسکہ اکثر وینس کی صبح و شام کا ذکر کرتی اور اپنی اس آرزو کا

اظہار کرتی کہ وہ مرنے سے پہلے وینس کو ایک بار پھر ضرور دیکھنا چاہتی ہے۔کبھی وہ اپنے آباؤ اجداد کے محل کا ذکر کرتی جو اب ان کے قبضے سے نکل چکا تھا کیونکہ ان کی دادی نے ایک موسیقار کے ساتھ شادی کر لی تھی۔کبھی وہ اپنے والدین کی غربت کا ذکر کرتی جس میں تکلیف تو تھی مگر دکھ نہ تھا کیونکہ اس کے والدین میں بہت پیار تھا۔کبھی کبھی وہ ان سفید پھولوں کا ذکر کرتی جو ان کا والد اس کی ماں کے لیے اس کے جنم دن کی شام کو لایا کرتا تھا۔ کبھی کبھی وہ آہ بھری آواز میں خواہش اور افسوس کا اظہار کرتی کہ اس کا کوئی بھائی نہ تھا جو اس کی جوان آرزوؤں کو پھلتے پھولتے دیکھ دیکھ کر خوش ہوتا۔

اس کی باتوں کے معنی واضح ہوتے ہوئے بھی یہ احساس ہوتا کہ اس کے لفظوں کے پیچھے ایک ایسا جہاں چھپا ہے جس کو وہ خود بھی دیکھنا نہ چاہتی تھی۔اس کی باتوں میں موسیقی کا سا لوچ اور اس کے الفاظ کی ترتیب میں عجیب زیروبم ہوتا تھا۔ایسا زیروبم اور ایسی موسیقی کا لوچ مدتوں بعد میں نے روم کے ایک فلاکت زدہ علاقے کے گرجے میں شام کی سروس کی منڈلی (choir) کے الحان میں پایا۔اس چہرے پر تو کبھی اداسی کے آثار میں نے نہیں دیکھے مگر کبھی کبھی جب وہ صوفیہ اور مجھے پیانو پر وینس کے مختلف طبقوں کی لڑکیوں کے محبت کے گیت سناتی تو کسی ایک مصرعے کو ادا کرتے ہوئے اس کی آنکھوں سے ایک بہت ہی چھوٹے سے لمحے کے لیے اس کی جگمگاہٹ غائب ہو جاتی اور اندھیروں کا سیلاب اس کی آنکھوں میں ابھر آتا۔میرا اکثر جی چاہا کہ اس سے پوچھوں کہ یہ اندھیرے اس کی آنکھوں میں کیوں اور کہاں سے آتے تھے؟ اسے کیا دکھ تھا؟ اس دکھ کا مداوا کیا تھا؟ میں اس کے لیے کیا کر سکتا تھا؟ مگر جب بھی میں یہ ارادہ کرتا تو وہ اتنی خوش نظر آنے لگتی اور ایسی دلنواز گفتگو کرتی کہ مجھے اس سے ایسے سوالات کرنے کی کبھی ہمت نہ ہوتی۔میں اب سوچتا ہوں تو مجھے یاد نہیں آتا کہ ان دنوں ہم کبھی اکیلے بھی ملے ہوں۔شاید وہ اس کا بندوبست کر لیتی تھی کہ ہم کبھی بھی تنہائی میں نہ ملیں۔

کبھی کبھی صوفیہ فرانچسکہ کی گود میں جا چڑھتی اور وہ اس پر جھک جاتی تو اس کی گردن اور کمر میں ایسا خم آ جاتا کہ جس کو اپنے آپ کے لیے بیان کرنے میں بھی مجھے کبھی کامیابی

نہیں ہوئی۔صرف یہی یاد آتا ہے کہ اس خم کو دیکھ کر دل میں حلم کا ہمہ گیر سا جذبہ بیدار ہو جاتا اور میرا ذہن اور میرے تمام جذبات رب کائنات کے حضور سرنگوں ہو جاتے اور جی میں آتا کہ دنیا کی ہر حقیر شے کو سینے سے لگا لوں۔اس خم کو دکھایا نہیں جاسکتا، محسوس کرایا جاسکتا ہے۔ بیتھوون (Beethovan) اور واگنر (Wagner) کی سمفنیوں میں نغمے کے عروج کے بعد جب وقفے آتے ہیں اور ان وقفوں کو ملا لیا جائے تو جو تاثر ہو اس سے اس تاثر کا اندازہ ہوسکتا ہے جو فرانچسکہ کے اس خم سے ہوتا تھا جب وہ صوفیہ پر جھک جایا کرتی تھی۔

کبھی کبھی وہ صوفیہ کی کہانیوں پر ہنس دیتی تو صوفیہ جھوٹ موٹ کے غصے کا اظہار کرتی۔اس بناوٹی غصے بھرے چہرے پر کچھ عجب مضحکہ خیزسی معصومیت چھا جاتی جس سے فرانچسکہ بےساختہ قہقہے لگانے لگتی۔قہقہے لگاتے ہوئے وہ بہت ہی حسین لگتی۔اس کا چہرہ سرِ شام کی ہلکی ہلکی ہوا میں لہراتے ہوئے گلاب زار کی طرح کھل اٹھتا، اس کی آنکھوں کی جگمگاہٹ تیز ہو جاتی، اس کی پروقار ناک کے پردے پھڑ پھڑانے لگتے، اس کے براق سے دانتوں کی چمک فضا میں کوندنے لگتی، اس کے شانوں اور سینے کا زیروبم ہوش وحواس گم کرنے لگتا اور اس کے ہاتھ فضا میں زخمی پرندے کی طرح پھڑ پھڑانے لگتے اور اس کے ہونٹوں اور ان کی سرخی کا حال میں نہیں کہوں گا۔ان کی سرخی آج بھی میرے خون میں رچی ہے اور جب بھی ان کی سرخی، ان کے گداز اور ان کی Glaze کا خیال آتا ہے تو دل ڈوبنے لگتا ہے......''

داؤد سیٹھ باتیں کرتے کرتے رک گئے۔ان کا سانس تیز تیز چلنے لگا تھا۔ادھر کٹے چاند کی زرد زرد روشنی میں ان کے شانے تھرتھرانے لگے تھے۔کچھ دیر بعد ان کا سارا جسم ایک لمحے کے لیے کانپ گیا اور پھر ان کا جسم بالکل ساکت ہو گیا، بت بن گیا۔جب انہوں نے کچھ وقفے کے بعد مجھے بلایا تو ان کی آواز سے عیاں ہوتا تھا کہ انہوں نے ایک بہت بڑے طوفان پر قابو پایا ہے اور یہ طوفان شاید کچھ دیر بعد ان کے قابو سے نکل جائے گا۔

''رات بہت گزر گئی ہے، شاید صبح قریب ہے۔یہ قصہ بہت ہی طویل ہے۔کئی راتیں اور کئی طویل تنہائیاں چاہئیں اس قصے کو سنانے کے لیے۔میں اپنے ماضی کو کسی کے سپرد

کر کے اپنی بیٹی سے ملنا چاہتا ہوں تاکہ اس کے اور میرے مستقبل میں ماضی کی کوئی یاد حائل نہ ہو۔ میں جانتا ہوں یہ بہت بڑا بوجھ ہے جو میں تمہارے کندھوں پر ڈال دینا چاہتا ہوں۔ میں سوچتا ہوں، میں دل کو تسلی دیتا ہوں، کہ میرے قصے سے شاید تمہارے وہ مسائل حل ہو جائیں جو تمہیں تمہارے فطری ساتھیوں سے جدا رکھے ہوئے ہیں، جو تمہیں اپنی تنہائیوں میں بند رہنے پر مجبور کیئے ہوئے ہیں۔ خدا کرے کہ ایسا ہی ہو۔ تمہاے سوا کون ہے جس کے کندھوں پر میں یہ بوجھ اتار سکتا ہوں۔ اپنے سینے پر اس بوجھ کو زیادہ دیر رکھنے کی مجھ میں اب تاب نہیں۔''

پھر ایک دم اٹھے اور گاڑی کی طرف چل دیئے۔ میں کچھ دیر تو سکتے میں رہا، مگر موٹر کے ہارن نے مجھے اپنے ماحول میں واپس بلا لیا۔ میں اٹھا اور گاڑی میں جا کر بیٹھ گیا۔ گھر پہنچا تو کپڑے اتارے بغیر ہی بستر پر لیٹ گیا اور لیٹتے ہی سو گیا۔

صبح کی کرنوں نے مجھے جگایا۔ داؤد سیٹھ کی کوٹھی میں مجھے ہمیشہ ہی کرنوں نے ہی اٹھایا کیونکہ میرا سونے کا کمرے کوٹھی کے مشرقی کونے میں تھا۔ میں نے ہمیشہ وہاں سورج کو چڑھتے ہی دیکھا۔ سورج کب، کہاں غروب ہوتا تھا میں نے کبھی نہ دیکھا۔

صبح اٹھا تو پتہ چلا کہ داؤد سیٹھ مجھ سے پہلے ہی اٹھ گئے تھے اور تیار ہو کر بیٹی کو لینے گئے تھے۔ میں تیار ہو کر دفتر چلا گیا۔ تمام دن دفتری کام مشین کی طرح کرتا رہا۔ ذہن اور دل کسی خیال اور جذبے کو اپنے اندر جگہ دینے کے لیے تیار نظر نہ آتے تھے۔ شام ہوئی تو پہلی بار مجھے گھر جاتے ہوئے ڈر سا لگا اور میں نے اس دن پہلی بار ہوٹل میں کھانا کھایا اور اکیلا سینما دیکھنے چلا گیا۔ سینما سے نکلا تو پھر بھی گھر جاتے ہوئے ہول سا آیا تو شہر کی سڑکوں پر بے منزل پھرتا رہا جب تھک ہار چکا تو ہمت باندھ گھر کو لوٹا۔ گھر میں ہر طرف خاموشی ہی خاموشی تھی۔ صرف داؤد سیٹھ کے کمرے میں روشنی تھی۔ کچھ دیر میں اس روشنی کو دیکھتا رہا مگر روشنی اندھیرے میں بدلنے کا نام ہی نہ لیتی تھی۔ تھکاوٹ سے رواں رواں چور چور ہو رہا تھا۔ بڑی مشکل سے کھڑکی سے ہٹ کر میں بستر تک آیا اور کپڑوں سمیت ہی سو گیا۔ اگلے دن صبح کو کرنیں مجھے جگا نہ سکیں اس دن میں دو پہر تک سوتا رہا۔ دو پہر کو اٹھا تو دفتر کا میر منشی

میرا انتظار کر رہا تھا۔ میں نے اس سے اپنا حال کہا اور دفتر کا حال پوچھا اور اسے ڈاکٹر کو بلانے کے لیے کہا اور پھر بستر پر آ لیٹا۔ شام تک میں بخار میں پھنکنے لگا۔ پورا ایک ہفتہ میں بے ہوش رہا۔ کبھی کبھی آدھی رات کے وقت ایک آدھ لمحے کے لیے ہوش آتا تو یوں لگتا کہ کوئی کمرے میں تھا اور باہر نکل گیا مگر نرس کے علاوہ کوئی دکھائی نہ دیتا جو میرے پلنگ کے پاس کرسی پر بیٹھی نظر آتی تھی۔ ہفتے بعد بخار تو اتر گیا مگر کمزوری کا یہ حال تھا کہ چلتا تھا تو بید کی طرح کانپتا تھا۔ داؤد سیٹھ صبح و شام عیادت کو آتے۔

جب صحت یاب ہوا تو سیٹھ نے بیٹی کی آمد اور میری صحت یابی کی خوشی میں ایک بہت بڑی دعوت دی۔ اس دن پہلی بار میں نے رابعہ کو دیکھا۔ دیکھتے ہی سکتے میں آ گیا۔ اس کی شکل وصورت بالکل صالحہ کی سی تھی۔ فرق صرف اتنا تھا کہ اس کے انداز میں وہ اعتماد نہ تھا جو صالحہ کا خاص امتیاز تھا۔ سیٹھ نے تعارف کرایا تو رابعہ نے میری طرف اس انداز سے دیکھا کہ صالحہ اور اپنے تعلقات کی سب یادیں، سب دکھ تازہ ہو گئے۔ میں کچھ گھبرا سا گیا تو رابعہ کا انداز فوراً بدل گیا اور اس کی آنکھوں اور اس کے چہرے کے نقوش میں کچھ ایسا گداز سا آ گیا کہ میں ایک لمحے کے لیے اپنا سارا دکھ بھول گیا۔

اس دن کے بعد میں ایک بار پھر دفتری کاموں میں مشغول ہو گیا مگر اس فرق کے ساتھ کہ میں نے کچھ لوگوں سے ملنا جلنا شروع کر دیا، کبھی کبھار سمندر کنارے سیر کو چلا جاتا یا کبھی کلب یا کبھی سینما چلا جاتا۔ مگر اس نئی طرز زندگی میں پہلی طرز زندگی کا سا بے ضرر پن نہ تھا، ہر رستے پر بے تعلقی اور غیر آرزومندی کا عالم نہ تھا۔ زندگی سے بہت سی امیدیں، آرزوئیں وابستہ ہونے لگیں تھیں جن کو واضح تصور، خیال یا جذبے کی شکل دینے کو جی نہ چاہتا تھا یا شاید اہلیت ہی نہ تھی۔ کمرے میں آتا تھا تو یوں لگتا تھا کہ ابھی ابھی کوئی کمرے میں سے ہو کر گیا ہے حالانکہ کمرے کی ہر شے اپنے مقررہ مقام پر رکھی ہوتی تھی۔ مگر اس کی فضا میں ایک ارتعاش کی کیفیت محسوس ہوتی تھی۔ کبھی کبھی تو یہ احساس ہوتا کہ نہایت ہی لطیف خوشبو کمرے سے فرار ہونے کی کوشش کر رہی ہے اور اپنے مقصد میں کامیاب ہو گئی ہے۔ کبھی کبھی رات کو سوتے سوتے احساس ہوتا کہ کوئی کھڑکی سے جھانکتا ہے یا میرے

چہرے پر جھکا ہوا ہے۔ جی میں آتا کہ آنکھ کھول کر دیکھوں کہ کون ہے مگر دل میں ایک آرزو زور پکڑ جاتی کہ نہیں یونہی آنکھیں بند کئے پڑے رہو، اس میں بہت لطف ہے، یہ مزا پھر نہ جانے ملے نہ ملے۔ کبھی کبھی علی الصبح آنکھ کھلنے سے پہلے احساس ہوتا کہ کوئی وائلن پر مشق کرتا ہے مگر آنکھ کھلنے پر، بیدار ہونے پر، یہ احساس ہوتا کہ وہم تھا مگر کان اصرار کرتے کہ ابھی ابھی نغمہ ہوا میں تیرتا تھا۔ ایک بار رات کو آنکھ کھلی تو دیکھا کہ ایک سایہ کھڑکی میں سے اتر کر گیا ہے۔ فوراً اٹھا، کھڑکی میں سے کودا، ایک سایہ باغ کے پھولوں پر لہرایا اور گم ہو گیا۔ اس احساس سے میں پریشان تو رہا ہی مگر اس سے دل و دماغ میں ایک گہرے اور لطیف رچاؤ کا احساس ہونے لگا جس سے زندگی کشٹ اور تپسیا کی بجائے ایک انعام سا محسوس ہونے لگی۔ پھولوں پر پیار آنے لگا، ہوا چھیڑتی تھی، تن بدن میں، دل میں گدگدی سی ہوتی تھی، فضا میں معلق ہونے کو، تیرنے کو جی چاہنے لگا، آسمان بدن پر لپٹتی، پھسلتی ریشمی چادر محسوس ہوتا تھا۔ جب رات کو کپڑے اتارتا تو بدن میں میٹھا میٹھا سا درد ہوتا، صبح اٹھ کر نہاتا تو محسوس ہوتا کہ میرا بدن ایک ساز ہے جس پر پانی کی دھار ایک مشاق ہاتھ کی طرح پھر جاتی اور سارا بدن جھنجھنا اٹھتا۔ میں نے زندگی میں اس طرح کا درد اور لطف اور کیف کبھی محسوس نہ کیا تھا۔ دل امید سے پر ہو ہو کر بہک جاتا۔ کبھی کبھی نہیں صرف ایک دو بار، یہ خیال بھی آیا کہ اگر پرانے زخم اس چھیڑ چھاڑ میں ہرے ہو گئے تو کیا ہو گا۔

ان دنوں خون کی گردش نے بھی عجب رنگ دکھلائے: کبھی تیز ہو جاتی، کبھی رک ہی جاتی، دماغ سے خون کا جزر شروع ہوتا، دماغ ماؤف ہو جاتا، گردن اکڑ جاتی، سینہ تنگ ہو جاتا، دل سکڑ جاتا اور پھر ایک دم پھیلتا اور پھیلتا ہی چلا جاتا۔

اس گردش کو ایک رفتار پر قائم رکھنے کے لیے خیال آیا کہ مغربی موسیقی کے ریکارڈ سنا کروں۔ لہٰذا گھر آنے کے بعد ریکارڈ بجایا کرتا۔ آہستہ نہایت مدھم آواز میں تاکہ کوئی اور سن نہ سکے اور اس کی تنہائی میں خلل نہ آئے۔ شام سے رات تک یہی شغل رہنے لگا۔ موسیقی میں محو ہو جاتا، محویت اور بیداری کے درمیانی وقفے میں کبھی کبھی محسوس کرتا کہ کوئی کسی ساز پر نغمے کا ساتھ دے رہا ہے۔ ریکارڈ بند کرتا تو ساز بھی خاموش ہو جاتا۔ کسی سے پوچھ کچھ بھی نہ

کرتا تھا تا کہ کسی کو میرے دل کے حال کا پتہ نہ چلے۔ کبھی کبھی تو اپنی دیوانگی کا یقین ہو جاتا۔ مہینوں یونہی دن رات گزرتے رہے۔ ہر دم یہی احساس ساتھ رہتا کہ کوئی آس پاس پھرتا ہے۔

ایک دن شام کے وقت سیٹھ صاحب نے بلایا اور بتایا کہ وہ کچھ عرصے سے بیمار رہنے لگے ہیں، دل کے دورے پڑنے لگے تھے۔ میں نے کچھ پوچھنا چاہا تو مسکرا دیئے۔ کہنے لگے ایک مدت تک ایک گہرے گھاؤ کو چھپانے کی کوشش میں ساری شخصیت کو جمع کیے رہا، اب بیٹی آ گئی ہے تو گھاؤ چھپانے کی ضرورت ہی نہیں رہی، گھاؤ بھر گیا ہے۔ مگر اپنی ساری طاقت منتشر ہو گئی ہے، یوں لگتا ہے کہ زندگی کے دن پورے ہوا چاہتے ہیں۔ چاہتا ہوں کہ بیٹی کا ہاتھ ایسے ہاتھ میں دے دوں کہ اس کو ماں کی طرح دکھ نہ ہو اور نہ باپ کی طرح تمام عمر پچھتاتی رہے۔ تم نہ صرف ایک مدت سے میرا سہارا ہو، میری آنکھیں ہو، میرا ذہن ہو، میرے راز داں ہو بلکہ رابعہ کے آنے سے پہلے تم ہی میرے لیے سب کچھ تھے۔ میں چاہتا ہوں کہ تم اسے قبول کر لو۔''

میں نے کچھ کہنا چاہا تو کہنے لگے:

''وہ تمہیں پسند کرتی ہے۔ اس نے تمہیں بیماری اور صحت کی حالت میں، لوگوں میں اور تنہائی میں، سورج کی روشنی میں اور رات کی تاریکی میں، خوشی میں اور پریشانی میں، غرض کہ ہر حال میں تمہیں دیکھا ہے۔ تم میں اور اس میں بہت سی باتیں، بہت سے مشاغل مشترک ہیں۔''

میں کچھ نہ کہہ سکا اور داؤ دسیٹھ کمرے سے اٹھ کر چلے گئے۔ میں وہیں بیٹھا رہا اور کئی گھنٹے یونہی گزر گئے۔ آخر جی کڑا کر کے اٹھا اور کمرے کی طرف لوٹتے ہوئے مجھے محسوس ہوا کہ قدرت نے صالحہ کے بدلے رابعہ بخش دی ہے۔ اس عظیم انعام کے شکرانے میں دل آنسوؤں سے بھر گیا اور میں رات بھر روتا رہا اور روتے روتے سو گیا۔

کچھ دن بعد منگنی کی رسم ادا ہوئی۔ اس دن باپ کی فرمائش پر رابعہ نے اپنے وائلن پر کچھ نغمے چھیڑے اور مجھے دیکھ دیکھ مسکراتی رہی۔ اس کی مسکراہٹ میں مسرت اور تفاخر کے

جذبات کے ساتھ ساتھ تشکر کا جذبہ بھی جھلملاتا تھا۔ مہمان رخصت ہو لیے تو صرف ہم ہی کمرے میں تنہا رہ گئے تو رابعہ نے ایک بار پھر وائلن اٹھایا اور وہ تمام نغمے چھیڑ دیئے جو مجھ کو عزیز تھے۔ اس کی ٹھوڑی وائلن کے پیٹ پر ٹکی تھی۔ اس کا بایاں ہاتھ وائلن کے تاروں میں محوِ سفر تھا اور دایاں ہاتھ گز کو تاروں پر رقص کرانے میں مصروف تھا۔ اس کی نظریں کبھی کبھی وائلن سے اٹھ کر میرے چہرے پر گڑ جاتیں اور اس کے لبوں پر ایک پراسرار مسکراہٹ رقص کرنے لگتی۔ اس مسکراہٹ سے یہ راز کھلا کہ وہی تھی جو آس پاس پھرتی تھی، وہی تھی جو میری بیماری میں مجھے راتوں کو دیکھنے آتی تھی، وہی تھی جو کبھی کھڑکی سے، کبھی باغ کی دیوار سے، مجھے جھانکتی تھی، وہی تھی جو وائلن پر میرے ریکارڈوں میں بھرے ہوئے نغموں کا ساتھ دیتی تھی۔

اس کی آنکھوں میں روشنیاں ڈوبتی، ابھرتی تھیں۔ اس کی پلکوں کے نیچے کبھی بہتے پانی کا، کبھی ٹھہرے ہوئے یا گہرے شفاف پانی کا، کبھی بلور دیس میں چڑھتے سورج کا، کبھی شفق پھولنے کا احساس ہوتا۔ آپ نے فردوس کی آنکھیں تو دیکھی ہیں بالکل ایسی ہی تھیں اس کی آنکھیں......اور رابعہ کی آنکھیں۔ ان آنکھوں میں کتنے جہاں آباد تھے، انسان پر کتنے جہاں وا ہوتے تھے ان آنکھوں میں، اور وہ آنکھیں اس جہان کو اتنا تنگ کر دیتی تھیں کہ ان آنکھوں کے سوا کچھ نظر نہ آتا تھا اس کائنات میں۔

میں ان نغموں کے گلزاروں میں قرن ہا قرن گھومتا رہا۔ ہوش آیا تو کمرے میں کوئی نہ تھا اور رات گہری ہو چکی تھی۔ باہر نکلا تو چاند مشرق سے ابھر رہا تھا۔ اتنا سرخ چاند میں نے پھر کبھی نہ دیکھا۔ دل دہل گیا۔

کچھ مہینوں کے بعد ہماری شادی ہو گئی اور داؤد سیٹھ سارا کاروبار میرے سپرد کر کے یورپ علاج کرانے چلے گئے۔

شادی کے بعد رابعہ میں ایک عجیب سی تبدیلی آ گئی۔ اس کی چال ڈھال، اس کی گفتگو کے انداز میں، اس کے عضو عضو کی جنبش میں، اس کے ہونٹوں کے کونوں میں چھپے دائروں میں، اس کی مسکراہٹ میں، اس کے دانتوں کی سفیدی کی آب میں، اس کے سینے کے

زیر و بم، سینے کے زیر و بم سے اس کے گریبان کی پھڑ پھڑاہٹ کی ہوا کے ترنم میں، اس کے سانس کی لے میں صالحہ بولتی تھی۔ رابعہ اور صالحہ میں کوئی فرق نہ رہا۔ کبھی صالحہ واہمہ و خیال محسوس ہوتی تو کبھی رابعہ اس کا پرتو۔

رابعہ سے پیار کی باتیں کرتے کرتے محسوس ہوتا کہ میں تو رابعہ کو صالحہ سمجھ کر پیار جتا رہا تھا۔ اس احساس سے فوراً غصہ آ جاتا اور میں پیار کی لے کو بے اعتنائی میں بدل دیتا۔ جب کبھی رابعہ کے رنگ و روغن کو لب و دندان سے خراج ادا کرتا اور وہ جنسی تعلقات پر مائل ہوتی تو فوراً خیال آتا کہ وہ صالحہ ہے اور صالحہ سے ایسے تعلقات حرام ہیں تو میں چونک چونک اٹھتا اور میرا سارا بدن سرد پڑ جاتا۔ اس ردعمل سے رابعہ از حد پریشان ہو جاتی اور نفرت اور بغاوت کے جذبات اس کی آنکھوں سے ابلنے لگتے۔ پھر فوراً ہی خیال آتا کہ وہ صالحہ نہیں رابعہ ہے تو آرزوؤں اور خواہشات کا طوفان امنڈ امنڈ آتا اور رابعہ اس طوفان میں بہہ جاتی، ہاتھ پاؤں مارتی اور تھک کر بے حال ہو جاتی۔ جب ایسا ہوتا تو مجھے سخت ندامت ہوتی اور جب رابعہ اس ندامت کی کیفیت کو میرے چہرے پر پڑھتی تو اس کے چہرے اور آنکھوں کی حیرانی اور کرب ملی مسرت پریشانی اور غصے میں بدل جاتی اور میں اس کو اسی حال میں چھوڑ، منہ چھپا کر اس سے دور بھاگ جاتا۔ ان حادثوں کے بعد کئی دن میں اس کے سامنے نہ جاتا اور شہر کے کوچہ و بازار میں، سمندر کے ساحل پر، دور افتادہ آبادیوں میں مارا مارا پھرا کرتا۔

زندگی بیک وقت وجد اور کرب و اندوہ کی ناقابلِ برداشت کیفیت بن کے رہ جاتی۔ جب ہفتوں بعد قرار آتا، دل کو سمجھا بجھا لیتا تو رابعہ کے سامنے جاتا تو وہ مجھے دیکھ حیران ہوتی، پھر خوش ہوتی اور اس کی آنکھوں سے بیم و رجا کے جذبات طرح طرح کے روپ بدل بدل کر جھانکتے۔ ایسے لمحوں میں میرا دل کٹ کٹ جاتا اور میں اپنے آپ کو لعن طعن کرتا۔ پھر باتیں ہوتیں۔ رابعہ کبھی بھی مجھ سے میرے رویے کی وجہ نہ پوچھتی۔ شاید کبھی پوچھ لیتی تو میرا دل ہلکا ہو جاتا اگرچہ دل سے صالحہ کی یاد کا کانٹا نہ نکلتا۔ سرسری باتیں پیار کی باتوں اور گھاتوں میں بدلتیں، ڈرتے ڈرتے پیار کی سب منزلیں طے ہو جاتیں اور رابعہ کو اور مجھے

اپنے آپ پر حیرانی ہوتی اور رابعہ مارے خوشی کے پھولی نہ سماتی۔ ہم دونوں کار لئے دور دور کی آبادیوں میں سیر کرتے، خاموش فضاؤں کو رابعہ وائلن کے نغموں سے بھرپور کر دیتی، چرند پرند ہمیں حیرانی سے دیکھتے، راہگیر ہمیں پیار میں مگن دیکھ کر کبھی شرما جاتے اور کبھی مسکرا کر چل دیتے۔ کچھ ہفتے اسی طرح خوشی اور انبساط کی قلمرو میں گزرتے اور......

پھر پرانے واہمے لوٹ آتے، سانپ بن ہمیں ڈستے۔ رابعہ بدکتی، بلکتی، کراہتی مگر اس کا کچھ بس نہ چلتا۔ گناہ کا احساس تھا کہ میرا پیچھا ہی نہ چھوڑتا تھا۔ حقیقت اور نیرنگِ نظر میں فرق نظر ہی نہ آتا۔ ہر خوشی حرام کاری نظر آتی۔ ہر مزا، ہر لطف دوزخ کی آگ کی طرح جلاتا تھا۔ کبھی جی میں آتا کہ صالحہ کو کہیں سے پکڑ کے لے آؤں اور اس کے جسم و جاں پر گناہ کے نشتر سے وہ وہ کچوکے دوں کہ اس کا رواں رواں دوزخ کی آگ میں ہر دم جلتا رہے۔ کبھی کبھی یہ بھی خیال آتا کہ اس بیچاری کا اس میں کیا قصور۔ اس خیال سے دل اس کے لیے رحم اور پیار کے جذبات سے بھرپور ہو کر بہک جاتا اور جی میں آتا کہ اس کے پاس جاؤں اور اس کے قدموں میں گر کر اس سے اپنے گناہوں کی معافی مانگوں۔ جب ان جذبات سے دل پر ہوتا اور رابعہ سامنے آ جاتی تو میں اس کو اس انداز سے دیکھتا جیسے کہ وہ حقیقت نہیں ہے، کسی کا سایہ ہے، عکس ہے اور میری نظریں اصل کو ڈھونڈتی ہیں۔ ایسے لمحوں میں رابعہ پر جو کچھ بیت جاتا اس کا اندازہ اس کی آنکھوں میں حزن کے سمندر جاگ اٹھنے سے ہوتا تھا۔ ایسے سمے دل میں غم اور افسوس کی بجائے خوشی اور مسرت پھوٹ پھوٹ پڑتی جیسے کہ میرے دکھوں کا باعث وہی تھی۔ صالحہ کے خلاف انتقام کی آگ بڑھکانے والی وہی تھی، جیسے کہ اس نے جان بوجھ کر صالحہ کی جگہ لینے کی کوشش کی تھی اور اس کی سزا اس کو ملنی ہی چاہیے تھی۔ اس خوشی اور مسرت کے عالم میں جب میں رابعہ کی طرف ہاتھ بڑھاتا تو وہ چیخ کر بھاگ جاتی۔

پھر موسم بدلتا تو خوشی اور انبساط کے لمحے لوٹ آتے۔ رابعہ کے انگ انگ میں سورگ آباد ہو جاتا اور میں اس سورگ میں رچ بس جاتا۔ رابعہ کو لمحہ بھر کی جدائی شاق گزرتی اور یہی کچھ حال اپنا ہوتا چلا گیا۔ میں نے کاروبار میں اس کو بھی برابر کا شریک کر لیا۔ کاروبارِ دنیا میں اور کاروبارِ عشق میں کوئی فاصلہ، کوئی فرق نہ رہا۔ ہر کام عشق کی ایک مہم تھا اور بس۔ اب

بس ایک آرزو تھی، ایک میری اور ایک رابعہ کی۔ ہم ایک بیٹے اور ایک بیٹی کی دعائیں مانگتے تھے۔ پورے دو سال اس سفرِ عشق میں ہنستے کھیلتے گزر گئے۔ کاروبار میں فروغ ہوتا رہا، رابعہ کی کاروباری صلاحیتوں سے ہر کوئی حیران ہوتا تھا، وہ اپنے کارکنوں اور مزدوروں کی منظورِ نظر تھی، اس کی صحت اور حسن نہ صرف قابلِ رشک تھے بلکہ قابلِ حسد تھے مگر رشک کرنے والا اور حسد کرنے والا کوئی نہ تھا، اگر کوئی تھا تو اس کو اظہار کی جرأت نہ تھی۔

میرا جی چاہنے لگا کہ یورپ کی سیر کی جائے۔ جن مناظر کا حال یورپی ادب کے شاہکاروں میں پڑھتے تھے ان کو اپنی نظر سے دیکھنا چاہیے، جن مصوروں کی تصویروں کے صرف عکس دیکھتے تھے ان کو بالمقابل ہو کر دیکھنا چاہیے، جن نغموں اور سمفنیوں کو اپنے اجنبی ماحول میں سنتے تھے ان کو ان کے مخصوص ماحول میں سننا چاہیے۔

کاروبار پر اپنی غیر حاضری کو اثر انداز نہ ہونے دینے کے تمام انتظامات مکمل کر لئے تو پہلی جنگِ عظیم چھڑ گئی اور یورپ جانا ملتوی کرنا پڑا اور اپنی سب توجہ کاروبار پر لگا دی۔ کاروبار میں فروغ ہوتا چلا گیا۔ رابعہ اس کاروبار کو اپنے قابو میں رکھنے میں ہر دم مصروف رہنے لگی۔ اس کو نت نئی سوجھتی تھی جس سے کاروبار میں ایک نئی اپج پیدا ہوتی اور حکومت اور کارکنوں اور مزدوروں سے اس کو خراجِ تحسین ملتا۔ مجھ پر کاروبار کا بوجھ کم ہوتا چلا گیا اور میں ان دنوں کچھ تنہائی پسند ہو گیا۔ اس کی کچھ تو وجہ رابعہ کی مصروفیت تھی اور کچھ دل میں کسی نئے منظر کی تلاش کا جذبہ بیدار ہونے لگا تھا۔ جب کبھی رابعہ سے تنہائی میں روبرو ملاقات ہوتی تو تنہائی اور یکسوئی کی آرزو اس کے ہونٹوں کی سرخی اور روغن اور آنکھ کی جگا جوت نفیر ہو جاتی اور پھر ہفتوں جسم و جان کا ذرہ ذرہ اس کے گیت گاتا اور گائے جانے پر مطمئن محسوس ہوتا۔

ایک دن نہ جانے کیوں دل مُصر ہوا اور ڈوکس پر جا پہنچے تو مسافر جہاز سے اتر رہے تھے۔ ڈوبتے سورج کی کرنوں میں مضمحل اور شاداں چہروں کا ایک جلوس تھا، نہیں ایک دریا تھا، جو ساون پور کے ساحل پر بہنے لگا تھا۔ سب مسافروں کے اتر جانے کے کچھ وقفے کے بعد جہاز کی سیڑھی کے آخری اوپر کے کونے پر ایک گلابی چھتری کی چاندی کی نوک چمکی اور پھر گلابی ساڑی میں ایک صورت نمودار ہوئی۔ عجیب صورت تھی کہ دل پر بن گئی۔ برسوں کے

بعد صالحہ نظر پڑی تھی۔ وہ پہلے کبھی اتنی حسین نہ تھی، اس کے حسن میں پہلے وقار اور جلال کی کیفیت تھی مگر اب اس میں حلم اور ہمہ گیر ہمدردی کا گداز بھی تھا۔ حسن، وقار، جلال اور حلم اور ہمہ گیر ہمدردی کا ایسا امتزاج انسانی آنکھ نے کہاں دیکھا ہوگا۔ اس کی نظریں کسی کو نہ ڈھونڈتی تھیں۔ اس کی نظریں جھکی ہوئی تھیں اور اس کے کان محسوس ہوا کہ پیچھے آنے والے مرد کے قدموں کی چاپ پر لگے تھے۔ اس کی چال میں حسن کا تفاخر اور بے اعتنائی نہ تھی۔ اس میں نرمی تھی، معذرت کا اظہار تھا اور کاش ایسا نہ ہوتا، اعتماد تھا۔ وہ سیڑھیوں سے اترتی اترتی میرے دل میں اتر گئی، جس طرح اس کی چھتری اور لباس کا گلابی پن فضا پر چھا گیا تھا اسی طرح اس کا رنگ روپ اور اس سے وابستہ ماضی دل و دماغ کو روندتا ہوا گزرتا چلا گیا۔ دایاں ہاتھ اٹھا اور دل پر جم گیا اور پاؤں میں جنبش ہوئی جیسے اس کے استقبال کو بڑھنا چاہتے تھے۔ رابعہ کا دایاں ہاتھ میرے بائیں بازو پر مضبوطی سے جم گیا۔ میں نے اس کی طرف بغور دیکھا۔ اس کی آنکھوں میں خلا تھا، اتھاہ خلا، جس میں ایسا کھویا کہ ہفتوں خاموش رہا۔

یورپ سے لوٹنے کے چند ہفتے بعد صالحہ اور اس کے شوہر نے ہماری دعوت کی۔ جب رابعہ اور میں ان کے ہاں سے واپس لوٹے تو رابعہ پر میرا راز یکسر کھل چکا تھا۔ اسے اپنے نقل ہونے کا احساس ہونے لگا۔ اس احساس سے اس کو بہت دکھ ہوتا تھا۔ اس کا دکھ مجھ سے دیکھا نہیں جاتا تھا مگر میں کیا کرسکتا تھا۔ میرا طرزِ عمل اس کے اس احساس کو بہت ہی تقویت پہنچاتا تھا۔

اس پریشانی میں ایک دن وہ گھر سے غائب ہوگئی۔ میں پہلے تو بہت پریشان ہوا مگر اس پریشانی میں لپٹا ہوا یہ احساس بھی تھا کہ اب صالحہ کی یاد دلانے والا کوئی نہیں۔ اس خیال سے پریشانی خوشی اور اطمینان میں بدل گئی۔ اس تبدیلی پر مجھے حیرت تو ہوئی ہی مگر اس کے ساتھ گناہ کا اتنا شدید احساس ہوا کہ جیسے میں نے رابعہ کو، داؤ دسیٹھ کو، فرانچسکہ کو، ننھی صوفیہ کو زہر دے کر ہلاک کر دیا ہو۔ اس احساس نے مجھے پاگل ہی تو کر ڈالا اور مجھے کچھ نہ سوجھی اور صالحہ کے شہر کی طرف روانہ ہوگیا۔ اس کی کوٹھی کے قریب پہنچا تو اندر داخل ہونے کی جرأت نہ ہوئی۔ کوٹھی کے سامنے کے درختوں کے ایک جھنڈ کی آڑ میں چھپ کر ہر آتے جاتے کو

دیکھتا۔ آخر کچھ گھنٹوں کے بعد رابعہ کوٹھی سے بڑی تیزی سے باہر نکلی اور ایک طرف چل دی۔ اس کے چہرے پر، اس کی رفتار میں، فتح کے احساس سے پیدا ہونے والا وجد تھا، طاقت کا احساس تھا۔ پھر کوٹھی سے ایک کار نکلی جس میں ڈرائیور کے سوا کوئی نہ تھا۔ کار نے رابعہ کا پیچھا کیا اور اس کو جالیا اور اس کو بٹھا کر کہیں لے گئی۔ میں درختوں کے پیچھے سے نکلا، کوٹھی میں داخل ہونے کا ارادہ کیا مگر ہمت نہ ہوئی۔

اسی دن میں ساون پور لوٹ آیا۔ میرے پہنچنے کے کچھ دیر پہلے رابعہ گھر پہنچ چکی تھی۔ اس رات رابعہ نے مجھ سے بہت بہت پیار کیا، اتنا پیار کہ میں نے سوچا کہ گناہ کی آلائش کا آخری ذرہ بھی میرے ذہن اور دل اور بدن سے دھل گیا ہوگا۔

اس رات کے بعد صبح وشام، چاند اور تارے، پھول اور سمندر اور آسمان اور فضا دوستی اور ہمدردی سے بھرپور محسوس ہوتے۔ صبح کی کرنیں سوئی ہوئی رابعہ کے بالوں سے، اس کی پلکوں سے، اس کے چہرے کے ٹھہرے ہوئے نقوش سے چھیڑ کرتیں تو میرا دل تشکر اور طمانیت سے بھر جاتا اور میں جھک کر اس کا منہ چوم لیتا تو وہ آنکھ کھول دیتی اور وہ پہلو بدل دیتی اور چت لیٹ جاتی اور پیار بھری نظروں سے مجھے دیکھتی تو اس کی شرارت بھری نظریں مجھے گدگداتیں، اس کے چہرے اور گردن کی، لباس میں گم ہوتی ہوئی، سرخی مجھے لبھاتی تو میں ہاتھوں سے اس سرخی کا تعاقب کرتا تو وہ ایک دم پھرتی سے پلنگ سے کود کر مجھے پلکوں کے ارتعاش سے شرمسار کرتی ہوئی مسکراتی اور پھر کھلکھلا کر ہنس دیتی۔ جب میں تھک تھکا کر دفتر سے آتا تو اس کی چال کا رقص اور اس رقص کی نیم خوابیدہ لے میری تھکن کو دور کر دیتی۔ ان دنوں مجھے اکثر احساس ہوا کہ رابعہ کبھی بھی اتنی حسین اور طرح دار نہ تھی اور شاید نہ ہوسکتی تھی۔ گناہ کا احساس ماضی کا پارینہ قصہ ہو کر رہ گیا۔ کبھی کبھی جب ماضی کے دکھ بھرے منظر نظروں کے سامنے آتے تو پہچانتے ہوئے ذرا بھی ہچکچاہٹ نہ ہوتی اور میں انہیں تھپک کر رخصت کر دیتا اور وہ حسرت سے دیکھتے ہوئے جدا ہو جاتے۔

مگر رابعہ کے حسن، اس کی سیرت، اس کی آواز، اس کے نینوں کی لو، سب نے مل کر میرے تخیل کے تانے بانے کو نئی ہیئت دینی شرع کر دی۔ میرے دل میں صالحہ کی یاد نے

ایک انوکھا روپ دھار لیا جس کو بھلانا ناممکن تھا، جس کی طرف متوجہ نہ ہونا عذاب تھا۔ میری روح صالحہ کی یادوں میں اور رابعہ کی شخصیت میں جذب ہو جانے کو تھی۔ سورگ اور نرک کے اس انوکھے امتزاج سے میرے ذہن کی بنیادوں میں رخنے پڑنے لگے۔ مجھے یوں لگتا تھا کہ میں صرف گوشت پوست کا ایک آلہ بن کر رہ جاؤں گا۔ میری روح نہ رہے گی، میرے تخیل اور حواس میں کوئی رشتہ نہ رہے گا۔ مجھے ذہن کی ضرورت نہ رہے گی۔ تنہائی پسند ہو گیا تھا، کبھی ایک آدھ فقرہ بول لیتا، ہفتوں خاموش رہتا۔ اور ایک دن جب رابعہ مجھے صبح صبح اٹھانے آئی تو میری حالت غیر تھی، ڈاکٹروں کو بلایا تو انہوں نے کئی دنوں بعد فیصلہ دیا کہ میں دیوانگی کے عالم میں ہوں۔ اس کے بعد کیا ہوا میں نہیں جانتا۔

متین صاحب! پچیس سال اسی طرح گزر گئے۔ اس عرصہ میں رابعہ پر کیا بیتی ہوگی وہ تو وہی جانتی ہے۔ مجھ پر جو بیتی وہ خدا ہی جانے، صالحہ پر جو بیتی اس کے صلے میں خدا اس کو جنت میں جگہ دے۔ اس کی موت کا حال سن کر دل بہت رویا۔ نہ جانے بیچاری کس عذاب میں پکڑی گئی تھی۔

مہینے سے کچھ دن اوپر ہو گئے ہوں گے، رابعہ نے بتایا ہے کہ حسب معمول مجھے سیر کو لیجاتے ہوئے نہ جانے کیوں اس نے موٹر کو ڈوکس کی طرف موڑ دیا۔ وہاں پہنچے تو رابعہ حیران ہوئی اور سکتے کے عالم میں ڈوبتے سورج کی کرنوں کو جہاز کے شیشوں کو خون آلود کرتے ہوئے دیکھنے لگی۔ جہاز کی سیڑھیوں سے مسافر اتر رہے تھے۔ سب سے آخر میں ایک جوان عورت سیاہ لباس میں ملبوس اور گلابی چھتری کا سایہ کئے اترنے لگی۔ اس کی صورت صالحہ سے اتنی ملتی تھی کہ گمان ہوتا تھا کہ صالحہ ہی تھی حالانکہ وہ پچیس سال پہلے مر چکی تھی۔ اس کی چال میں بھی وہی تمکنت تھی، حلم تھا، معذرت تھی اور اعتماد تھا۔ میں رابعہ سے بازو چھڑا کر سیڑھی کی طرف بڑھا مگر قریب جا کر رک گیا۔ اور عورت کو کہ صالحہ کی ہم صورت تھی دیکھنے لگا۔ عورت نے آنکھ اٹھا کر نہ دیکھا اور اتر کر ہجوم میں کھو گئی۔ میں اپنی جگہ کھڑا رہا۔ رابعہ کہتی ہے کہ جب اس نے مجھے بازو سے پکڑ کر کار کی طرف لانا چاہا تو میں اس کی طرف دیکھ کر مسکرایا اور ساتھ ہو لیا۔ میری آنکھوں میں پاگل پن کے آثار نہ تھے۔ میری

آنکھوں میں ایک وضاحت اور یکسوئی تھی جو باہوش انسانوں میں ہوسکتی ہے اور جو کبھی میری آنکھوں میں تھی۔ اس دن سے میں روبصحت ہوں، کبھی کبھار باتیں بھی کر لیتا ہوں (مسکراتے ہوئے) آج کی گفتگو ایک بہت بڑی مہم ہے جس پر میں خود بھی حیران ہوں۔

باہوش ہونے کے کچھ دنوں بعد میں نے صالحہ کا حال پوچھا پتہ چلا کہ وہ میرے پاگل ہونے کے کچھ دن بعد اللہ کو پیاری ہوگئی تھی۔ پھر میں خاموش ہوگیا، ہفتوں خاموش رہا، مگر باہوش رہا، اپنے ماحول میں دلچسپی لیتا رہا۔ پھر چند دن پہلے میں نے صالحہ کی لڑکی سے ملنے کی خواہش کی۔ رابعہ نے پتہ کیا اور مجھے بتایا کہ چالیس دن پہلے وہ یورپ سے لوٹی تھی۔ اسی دن جس دن میرا پاگل پن باہوشی میں بدلا تھا۔ اس دن ہم نے اسی کو سیاہ لباس میں گلابی چھتری لیے ہوئے جہاز سے اترتے دیکھا تھا۔ اسی کے نور سے اپنی تاریک دنیا روشن ہوئی تھی۔ وہ عالمی جنگ کا سارا زمانہ وہیں رہی تھی اور اب اپنے آبائی گاؤں کے آبائی محل میں مقیم تھی اور آج صبح ہی ہم گاؤں پہنچے تھے۔ اس کے بعد جو کچھ ہوا وہ آپ کے علم میں ہے۔''

متین صاحب پتھر پر بت بنے بیٹھے تھے، صرف ان کے سینے کے زیر و بم سے ان کی زندگی کا اور ان کی آنکھوں کی جوت سے ان کے باہوش ہونے کا پتہ ملتا تھا۔ وہ کافی دیر خاموش رہے۔ ان کی آنکھیں کبھی بہتے پانی کو کبھی جمیل صاحب کو دیکھتی تھیں۔ پھر یکایک پتھر سے اٹھ بیٹھے اور ندی کنارے ٹہلنے لگے، ٹہلتے ٹہلتے وہ جمیل صاحب سے کافی دور نکل گئے، رکے اور ندی کنارے بیٹھ کر منہ دھونے لگے، ہاتھوں، بانہوں پر پانی ڈالا، گردن پر دونوں ہاتھ اس طرح پھیرے کہ جیسے وضو کرتے ہوں، مگر پیروں سے بوٹ نہیں اتارے جس سے اندازہ ہوا کہ وضو نہ کرتے تھے۔ اٹھے اور جمیل صاحب کی طرف لوٹ آئے اور ان کو بغور دیکھ، پتھر پر بیٹھ گئے۔ کچھ دیر یونہی خاموش بیٹھے رہے اور پھر بہت ہی مدھم آواز میں بولنے لگے۔ پہلے پہل تو ان کے الفاظ سمجھنے میں جمیل صاحب کو کوشش کرنی پڑی مگر کچھ دیر بعد ان کی گفتگو میں بہتے پانی کا سا تسلسل اور روانی پیدا ہوگئی۔

''اس موضوع پر میں نے برسوں سوچا ہے، اس لیے نہیں کہ میں فلسفہ پڑھاتا ہوں بلکہ اس لیے کہ میری زندگی میں ایک موقع ایسا بھی آیا تھا جب میں نے ایک ایسے آدمی کی

جان بچائی جو بعد میں اُس لڑکی کی موت کا سبب بنا جو مجھے اپنی زندگی میں ماں کے بعد سب سے زیادہ عزیز تھی۔ آپ کہہ سکتے ہیں کہ جان بچانے کے وقت مجھے علم نہ تھا کہ وہ شخص بعد میں ایسا فعل کرے گا۔ مگر میں یہی کہوں گا کہ دل کے کسی کونے میں یہ علم چھپا تھا کہ وہ میری عزیز ترین نعمت کو مٹی میں ملانے والا تھا۔ مجھے اتنا تو اس وقت بھی علم تھا کہ میں اس شخص سے نفرت کرتا تھا اور اس شخص کو بھی اس بات کا علم تھا کہ میں اس سے نفرت کرتا تھا اور وہ میرے کردار سے بہت اچھی طرح واقف تھا کہ میں اس کو اپنے رستے سے ہٹا کر کبھی اپنی نعمت تک رسائی حاصل کرنا نہ چاہوں گا۔''

متین صاحب نے کچھ دیر توقف کیا اور ایک لمبا دکھ بھرا سانس کھینچ کر انہوں نے اپنی بات کو جاری رکھا۔

''اس عرصے میں میں نے بہت غور کیا ہے کہ گناہ کیا ہے اور اس کا انسان کی زندگی میں کیا کام ہے اور گناہ انسان کی زندگی سے کیوں لگا رہتا ہے۔ اس کی تخلیق کی ضرورت ہی کیا تھی۔

آدمی اگر آزاد نہیں تو انسان نہیں۔ آزاد وہ اسی صورت ہے کہ وہ ارادہ کرے اور اس کو پورا کرنے کی کوشش کرے۔ صرف انسان ہی عمل پر حاوی ہے باقی تمام مخلوق صرف ردِعمل کا اظہار کرتی ہے۔

انسان کو عمل کے لیے ارادہ کرنا پڑتا ہے اور ایک راہ منتخب کرنی ہوتی ہے۔ انسان کا علم محدود ہے، اگرچہ نسل بہ نسل بڑھتا رہتا ہے۔ مگر علم کے بڑھنے کے ساتھ عمل کی راہوں میں اضافہ بھی ہوتا رہتا ہے۔ ایک انسان کے لیے ایک وقت میں کئی اعمال ممکن ہوتے ہیں مگر وہ ان میں صرف ایک ہی کا انتخاب کر سکتا ہے، ایک ہی پر کاربند ہو سکتا ہے۔

اس انتخاب میں وہ غلطی بھی کر سکتا ہے کیونکہ اس کو ہر عمل کے ہر نتیجے کا علم نہیں ہوتا اور نہ ہو ہی سکتا ہے۔ ایک عمل کو منتخب کر لینے کے بعد اس کو اپنے عمل کے نتائج کو قبول کرنا ہی پڑتا ہے۔

اگر معاملہ یہیں تک ہوتا تو وہ پھر بھی حل ہو سکتا شاید۔ مگر آدمی حیوان بھی ہے، لہٰذا اس

کی حیوانی ضروریات ہیں مگر حیوانوں کی طرح اس کی کوئی مقررہ اور متعین فطرت نہیں ہے۔ وہ اپنی ضروریات کا انتخاب کرسکتا ہے۔ اس قوت انتخاب کی بھی کوئی حدود نہیں۔ وہ کسی بھی شے کی آرزو کرسکتا ہے۔ ممکن اور ناممکن آرزوؤں کو جنم دے سکتا ہے اور ان آرزوؤں میں سے ناممکن آرزوؤں کو اپنے لئے پسند کرسکتا ہے۔ مگر ہر آرزو کے پورا ہونے کے لیے صرف اس کی اپنی کوشش ہی کارآمد نہیں۔ وہ خلا میں رہ کر، یا دوسرے انسانوں کے تعاون کے بغیر اپنی آرزوؤں کو پورا نہیں کرسکتا اور ہر انسان ایک دوسرے انسان سے مختلف آرزوئیں رکھ سکتا ہے اور ان کی آرزوئیں ایک دوسرے کے راستے میں حائل ہوسکتی ہیں، ایک دوسرے کی آرزوؤں کا رد کرسکتی ہیں۔

اگر یہ بھی مان لیا جائے کہ ایک وقت میں ہر انسان کی ایک ہی آرزو ہو اور وہ آرزو مشترک ہو تو بھی اس کے پورا ہونے میں مادی وسائل کا فقدان یا مناسب وسائل تلاش کرنا آرزو کی تکمیل میں حائل ہوسکتا ہے۔ انسان اپنی معاشرتی اور معاشی ضرورتوں میں دوسرے انسانوں کا، مادی قوتوں کا، مادی قوتوں کو استعمال میں لانے کے وسائل کا، ان وسائل کو تلاش کرنے کے علم کا، اور اس علم کے آسانی سے میسر آنے کا محتاج ہے۔

لہٰذا بعض زمانوں میں بعض معاشی اور معاشرتی آرزوؤں کا پورا ہونا ناممکن ہے۔ فرض کیجئے کہ مادی وسائل دوسو فیصد کی رفتار سے بڑھتے اور انسان کی آرزوئیں دوسو فیصد سے زیادہ کی رفتار سے بڑھتی ہوں تو بعض آرزوؤں کا پورا ہونا بالکل ممکن نہ ہوگا۔

اس طرح انسانوں نے آرزوؤں کے انتخاب کے سلسلے میں کچھ قوانین صدیوں کے تجربات کی روشنی میں مرتب کئے ہیں جن کو توڑنے کی سخت سزائیں مقرر ہیں۔ اس میں کوئی انسان اپنی مرضی سے ردوبدل نہیں کرسکتا۔ اگر کرتا ہے تو اس کی مقررہ سزا پاتا ہے۔

اسی طرح بعض آرزوئیں ہیں جن کا تعلق انسان کے اپنے ذاتی تصورات اور تخیلات سے ہے۔ اس میں وہ معاشرے کے قید و بند سے آزاد ہے مگر چونکہ ہر حال میں انسان ہے اور حیوانوں کی طرح محدود نہ ہوتے ہوئے بھی اپنے اعمال میں اپنے تصورات کے مقابلے میں محدود ہے۔ یہ اس لیے ہے کہ انسان محض شعور و ارادہ نہیں ہے۔ اس میں حیوان ہونے

کی حیثیت سے تمام حیوانی ضرورتیں اور عوامل کارفرما ہیں اور انسان ہونے کی حیثیت سے اس کے لیے ضروری تھا کہ اس میں یہ صلاحیت بھی ہوتی کہ وہ اپنے اور اپنے آباؤ اجداد کے تجربات کو بھی اپنے اندر محفوظ رکھ سکتا۔ لہٰذا اسے یادداشت کی صلاحیت ملی ہے۔ اس یادداشت میں بھی کچھ حصہ شعور کی روشنی میں رہتا ہے اور کچھ حصہ لاشعور کے اندھیروں میں رہتا ہے۔ جو کچھ اس کے شعور میں ہوتا ہے اس کا اس کو علم ہوتا ہے اور جس کا اس کو علم ہو اس کو وہ اپنے قابو اور اختیار میں رکھ سکتا ہے۔

جو کچھ اس کے شعور میں، لہٰذا اس کے اختیار میں، ہے اس کو تبدیل کر سکتا ہے، اس میں وہ ترمیم کر سکتا ہے۔ مگر جو کچھ اس کے لاشعور میں ہے اس میں نہ تو وہ تبدیلی کر سکتا ہے اور نہ ترمیم جب تک کہ وہ اس کو شعور کی روشنی میں نہ لے آئے۔ اس لاشعور میں وہ سب تجربے محفوظ سمجھنے چاہئیں جو نسلِ آدم کو حیوان سے آدمی بننے میں ہوئے کیونکہ آج بھی، آدمی کی جسمانی ساخت میں ایسے بے شمار اعضا ہیں جو حیوانوں جیسے ہیں اور اس کے اندر ایسے بھی اعضا ہیں جو بے جان مادہ کی طرح مردہ ہیں۔ لہٰذا اس کے کسی عمل کے لیے اور اعمال کے ایک سلسلے کے لیے ایسا نظام خیال بنانا پڑتا ہے جو مردہ مادے سے لے کر حیات اور شعور تک کی تمام قوتوں کے مناسب اور صحیح مقام کا تعین کر سکے۔ اس کام میں تمام انسانی علوم کی ضرورت ہے اور انسان کو بہت لمبی زندگی کی ضرورت ہے۔ انسان اپنی کوشش سے اپنے شعور کی اور اپنی زندگی کی حدود میں وسعت پیدا کر رہا ہے مگر اس نے اپنی ضرورتوں اور آرزوؤں کی کوئی حدود مقرر نہیں کیں جس سے اس کے شعور اور زندگی کی حدود اور آرزوؤں کی حدود میں تطابق پیدا نہیں ہوتا۔ جس کی وجہ سے انسانی زندگی میں خیالات اور تصورات کا عذاب داخل ہو جاتا ہے۔

اب اگر اس پس منظر میں حسن اور حسن کے اثر سے پیدا ہونے والے انسانی جذبات اور آرزوؤں کو سمجھنے کی کوشش کریں تو گناہ کی ماہیت کو سمجھنے کی ایک اور منزل طے ہو جائے گی۔

انسانوں کو انسانوں کے علاوہ کائنات میں بھی حسن نظر آتا ہے اس لیے کہ کائنات

میں بھی حسن ہے۔انسان خود بھی تو کائنات ہی کا ایک حصہ ہے اگرچہ اس کی ایک ارتقا شدہ صورت ہی سہی۔ کائنات چونکہ قدیم ہے اس لیے حسن کو بھی قدیم ماننا پڑے گا۔حسن بہرحال انسان سے بہت ہی قدیم ہے۔

لہٰذا جب بھی جس شے میں بھی انسان حسن دیکھتا ہے اس کو اس کی قدامت کا احساس ہوتا ہے جب انسان کوئی شے نہ تھا۔اس لمحے میں وہ بہ یک وقت عدم اور ابد میں سانس لیتا ہے۔اور اس عدم اور ابد کی زندگی میں انسان کو اپنی حدود ہی نظر نہیں آتیں۔وہ لامحدود محسوس کرتا ہے اور لامحدود رہنا چاہتا ہے۔مگر وہ کائنات کی حدود کے اندر جنم لیتا ہے۔اور انہیں حدود میں وہ مرجاتا ہے۔لہٰذا اس کائنات کی حدود سے ماورا میں زندہ رہنا اس کے لیے ممکن ہی نہیں۔

حسن اگرچہ کائنات میں بطور جزو شامل ہے مگر کائنات کی تخلیق نہیں ہے اس لیے اس پر کائنات کی سی اور اس سے بڑھ کر انسانی شعور کی حدود عائد کرنا ایک ناممکن آرزو ہے۔

لہٰذا جب آپ نے صالحہ کے حسن کو دیکھا،اس کی جوانی کو دیکھا تو آپ بہ یک وقت عدم اور ابد میں اور حیات و مادہ کی حدود میں سانس لینے پر مجبور ہوگئے۔آپ ان تمام عالمین میں بیک وقت زندہ نہیں رہ سکتے تھے۔آپ حسن کی آرزو کر سکتے تھے یا جوانی کی۔مگر آپ نے نہ تو اپنی آرزوؤں کی ہی تربیت کر رکھی تھی اور نہ ہی آپ نے اپنے لاشعور اور شعور میں پرورش پانے والے انسانی تجربات میں سے اپنے لئے بعض کا انتخاب کر رکھا تھا۔آپ نے ان تمام اخلاقی قدروں کو بھی جو آپ کے معاشرے میں رائج ہیں لاشعوری اور شعوری طور پر قبول کر رکھا تھا اور ان کو ایسی حدود مان رکھا تھا جن کو توڑ کر انسان مرجاتا ہے۔حالانکہ کوئی ایسی اخلاقی قدر نہیں جس کو انسان توڑ کر زندہ نہ رہ سکتا ہو اور میں تو یہ بھی کہوں گا کہ وہ کسی ایک قدر کو توڑ کر نہ صرف زندہ بلکہ خوش بھی رہ سکتا ہے۔لیکن یہ بہرحال ضروری ہے کہ اس کی کچھ اخلاقی قدریں ضرور ہوں ورنہ اس کی آرزوؤں اور امکانی اعمال کی حدود میں اتنی وسعت آجائے گی کہ اس کے پاس کوئی آرزو اور اس کے مطابق عمل منتخب کرنے کا کوئی معیار ہی نہیں رہے گا۔اور وہ کچھ بھی نہ کر سکے گا۔صرف ردعمل کی حدود میں قید ہوجائے گا۔

لہٰذا حیوان بن جائے گا۔ مگر اس کا شعور تو رہے گا ہی۔ لہٰذا وہ اس قید کی حدود کو بڑی شدت سے محسوس کرے گا، ان کو توڑنا چاہے گا اور نہ توڑ سکے گا۔

آپ ان اخلاقی قدروں کو توڑنا پسند کرتے اور اپنے آپ کو حق جانتے تو آپ خوش رہ سکتے تھے مگر آپ نے ان قدروں کو توڑنا پسند نہ کیا۔ شاید اس لیے کہ آپ کے پاس اتنا علم نہ تھا کہ آپ جواز ڈھونڈ سکتے۔ نہ ہی آپ نے اپنی آرزو کو بدلا۔ شاید آپ اس کو ممکن ہی نہ جانتے تھے۔ پھر آپ کے حالات سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ آپ نے صالحہ کے علاوہ کسی اور انسان سے تعلقات استوار کرنے کی کوشش ہی نہ کی تھی۔ لہٰذا آپ کی تمام آرزوؤں کا مرکز وہی رہی۔ اس لیے آپ نے اپنی تمام زندگی کا داؤ اس کو حاصل کرنے کی آرزو میں لگا دیا اور اس کو حاصل کرنے کی کوشش ہی نہ کی۔ ایسی صورت میں آپ کے لیے دو ہی عمل ممکن تھے۔ یا اس کو حاصل کرنے کی کوشش اور معاشرہ اس کی جو بھی سزا دیتا اس کو قبول کرتے یا اپنی آرزو کو بدلنے کی کوشش کرتے۔

پہلی صورت آپ نے رد کر دی مگر دوسری صورت کو قبول کرتے ہوئے پوری کوشش ہی نہ کی۔ اس کے بعد بھی آپ نے ایک اور عورت سے تعلقات قائم کئے جو صالحہ ہی کا روپ تھی۔

میں مانتا ہوں کہ اس میں کچھ ہاتھ قدرت کا بھی ہے۔ اسی سے تو گناہ وجود میں آتا ہے۔ آپ گناہ سے ڈرتے ہیں۔ تمام عمر ڈرتے رہے۔ مگر یہ کبھی نہ سوچا کہ انسان کے علاوہ کون گناہ کر سکتا ہے۔ فرشتے؟ حیوان؟ مادہ؟ ان میں سے کوئی گناہ کر ہی نہیں سکتا۔ صرف انسان ہی گناہ کر سکتا ہے۔ وجہ ظاہر ہے، انسان ہی شعور و ارادہ رکھتا ہے لہٰذا عمل پر قادر ہے۔

اس کا مطلب یہ بالکل نہیں کہ قدرت نے ہمیں ایک ہاتھ سے شعور اور ارادہ بخشا اور اس کے ثمروں کو گناہ کا نام دے کر ہمیں عمل سے باز رکھا۔ یہ تو اسی صورت میں ہوتا اگر ہمیں ہر گناہ کی ہمارے دوسرے اعمال سے الگ کر کے سزا ملتی۔ مگر آپ دیکھتے ہیں ایسا نہیں۔ لوگ گناہ کرتے اور سزا نہیں پاتے۔ میں یہاں گناہ اور قانون شکنی کو ایک ہی قرار نہیں دے رہا۔ ایک ٹھیک ٹھاک معاشرے میں قانون شکنی کی سزا ضرور ملتی ہے۔ مگر گناہ چونکہ قدرت

کے اصولوں کے خلاف عمل کرنے کا نام ہے تو اس کی سزا قدرت ہی سے ملنی چاہیے مگر ہم دیکھتے ہیں، ہمارے علم میں ہے، تاریخ نے ایسے بے شمار لوگوں کے اعمال کو ہمارے لیے محفوظ کر رکھا ہے کہ جنہوں نے ایسے ایسے گناہ کئے کہ جس سے انسانی تصور کانپتا ہے مگر ان کو قدرت نے کوئی سزا نہیں دی۔ مگر اس کے ساتھ ہی آپ یہ بھی دیکھتے ہیں کہ لوگ چھوٹا سا گناہ کرتے ہیں تو ان کو اس کی سزا فوراً مل جاتی ہے۔

ان ساری باتوں کو ایک ہی اصول کے مطابق آپس میں منسلک کیا جا سکتا ہے اور اس اصول کو اگر مان لیا جائے تو جو کچھ میں نے کہا ہے اس کو ایسے نظام میں جکڑا جا سکتا ہے جس سے ہر بات کا اپنا مقام متعین ہو جائے اور ہر بات کے باہمی رشتوں کا تعین ہو جائے۔

یہ اصول وہی ہے جس کی مختلف شکلوں کو لوگ شماریاتی قوانین کہتے ہیں۔ شماریاتی قوانین نہ صرف کاروبار میں کارفرما ہیں بلکہ مردہ مادہ سے لے کر حیات تک انہی قوانین کی پابند ہے۔ مادہ وحیات کو انہی قوانین کی روشنی میں سمجھا جا سکتا ہے۔ مردہ اور کسی ذی حیات میں جو قوتیں کارفرما ہیں وہ اپنے نتائج فرداً فرداً مرتب نہیں کرتیں بلکہ ان کے نتائج بحیثیت مجموعی مرتب ہوتے ہیں۔ سائنسدان مادے کی کسی شکل اور کسی ذی حیات پر اس کے اندر یا اس پر جو قوتیں کارفرما ہیں یا اثر انداز ہیں ان کے مجموعی تاثر کو تو ٹھیک ٹھیک، بے کم وکاست، متعین کر سکتے ہیں مگر یہ تعین نہیں کر سکتے کہ ایک خاص قوت باقی تمام قوتوں کے کارفرما ہوتے ہوئے کیا اثر مرتب کرے گی۔ سوائے اس کے کہ اتنی قوت تمام قوتوں میں داخل کی جائے تو مادہ کی ایک خاص شکل یا ایک ذی حیات کا سارا نظام درہم برہم ہو جائے گا۔

اسی طرح انسان کے پاس علم ہو اور وہ اس کے مطابق اپنے لاشعور اور شعور اور ان میں جنم لینے والی آرزوؤں کی تربیت کرنا جانتا ہو تو وہ اپنے گناہوں کا بھی خود ہی انتخاب کر سکتا ہے اور ان کے اثرات کو محدود کرنے پر قادر ہو سکتا ہے۔ اور اپنی نیکیوں اور گناہوں میں یہ توازن رکھ سکتا ہے کہ اس کی نیکیوں کی قدر و قیمت اس کے گناہوں سے ہر لمحہ زیادہ ہو۔

صرف ایک ہی گناہ ایسا ہے جس سے انسان کی انسانیت کا نظام درہم برہم ہو جاتا ہے اور وہ یہ ہے کہ عمل کی قوت ضائع کر بیٹھے۔ اگر ایسا ہو تو اس سے انسان انسان نہیں رہتا

اس کی زندگی ایک مقام پر رک جاتی ہے۔ایسی ہی زندگی جہنم کی زندگی ہے۔

جو کچھ آپ پر بیتا ہے اس سے کم تو رابعہ پر نہیں بیتا ہوگا مگر اس کی گرفت زندگی پر برقرار رہی۔اس کی کیا وجہ ہے؟ آپ نے سوچا؟ اس نے اپنی ہر آرزو کی منزل آپ کو قرار نہیں دیا تھا۔اس نے اور انسانوں سے بھی اپنی آرزوئیں وابستہ کر رکھی تھیں اور ان کو پورا کرنے میں ان کے تعاون کو حاصل کرنا جانتی تھی۔جن آرزوؤں کو اس نے ناممکن جانا ہوگا ان کو یا تو بدل دیا ہوگا یا ان میں ترمیم کرلی ہوگی۔''

جمیل صاحب ہمہ تن گوش بنے سنتے رہے۔کبھی کبھی ان کو محسوس ہوتا کہ ان کے ذہن کے آفاق سے روشنی یلغار کرتی ہوئی ان کے ذہن کے فوکس میں محدود ہو کر رک گئی ہے، آگ بن رہی ہے۔اور آگ کی حدت سے ان کے حواس میں ایک گرم گرم رو تیزی سے رواں ہونے لگی ہے، کمر میں، ریڑھ کی ہڈی میں، جذب ہونے لگی ہے جس سے ان کے سارے بدن میں گرمی کا ناقابل برداشت احساس بیدار ہو جاتا اور پھر کبھی یہ گرم گرم رو نہ جانے کہاں غائب ہو جاتی، ذہن کی آنکھ کے فوکس سے روشنی ہٹتے ہٹتے آفاق سے دور چلی جاتی، گم ہو جاتی اور ان کے ذہن پر اندھیروں کی کالک برسنے لگتی جس سے ان کے جسم و جان میں خنکی کا احساس رہنے لگتا جس سے ان کو آرام ملتا۔مگر اس آرام کے لطف میں ان کو اپنا دل ڈوبتا ہوا محسوس ہوتا اور وہ اپنی تمام قوت ارادی کو حرکت میں لاتے اور متین صاحب کے الفاظ میں معنی کو شعوری طور پر سمجھنے کے کٹھن سفر پر نکل پڑتے۔

شعور کی ہزیمت اور یلغار میں ایک نظام کا گمان گزرتا تھا۔اس نظام کی طرف جمیل صاحب کی بھولی ہوئی، سختی سے بھلائی ہوئی یادیں اور تجربات فراموشی کے جہاں سے ابھر ابھر کر پرواز کرنے لگے، بالکل اسی طرح جیسے موسم بدلنے کے ساتھ پرندوں کے لشکر ایک منطقے سے دوسرے منطقے کی طرف ہجرت کرتے ہیں۔جمیل صاحب کے شعور کے ارض وسما ان یادوں اور تجربوں کے شور سے بھرپور ہو گئے، ان میں تنگی کا احساس ہونے لگا۔اس تنگی کے احساس سے جمیل صاحب کا دل سینے میں گھٹنے لگا۔اس گھٹن سے ان کا رواں رواں تن گیا، بوٹی بوٹی پھڑکنے لگی، ان کا ذہن اس یلغار سے مقابلہ کرنے کے لیے بیدار ہو گیا اور

تخیل کی مملکت سے اپنے تحفظ کے لیے اسلحہ طلب کرنے لگا۔

کتنے ہی سہانے منظر تھے جن کا حسن، ذہن اور تخیل کو اپنے آپ میں جذب کرنے میں مصر تھا، کتنے ہی مناظر تھے جن سے لطف اندوز ہونے کی خواہش سے دل پر ہول طاری ہوتا تھا، گناہ کا احساس بیدار ہوتا تھا۔ کتنی ہی یادیں تھیں تلخ تلخ، درد آفریں، جن کے لمس سے جسم بغاوت کرتا تھا، تخیل کبھی لطف میں جھولتا تھا، ذہن کبھی کراہت میں چکراتا تھا۔ کتنی ہی یادیں تھیں جن کا روپ تہہ در تہہ تھا، جس کے ایک نظارے سے کئی اور منظر ابھرتے تھے، کبھی سہانے، کبھی ڈراؤنے، کبھی دلربا، کبھی روح فرسا۔ کتنی آوازیں تھیں، نرم نرم، خشمگیں خشمگیں، حواس کو سہلاتی ہوئی، حواس پر قمچی مارتی ہوئی، فردوس آفریں مگر جہنم صفت۔ کتنی ہی خوشبوئیں تھیں جن میں کتنی ہی گلیاں، کتنے ہی شہر آباد تھے۔ کتنے ہی لمس تھے جن سے جسم میں گرم گرم پانیوں کے چشمے ابلتے تھے، کبھی کبھی، شاید ایک دوبار، خنک خنک نرم رو پانیوں کی نہریں پھوٹتی تھیں۔ ایک آدھ یاد ایسی بھی تھی جس سے قلب و ذہن اور تخیل سے رحم اور حلم کا دریا بہہ نکلتا تھا اور جسم کے روئیں روئیں کو سیرابی کا احساس دلاتا تھا۔

تیسرا باب

رابعہ نے جب جمیل صاحب کو ہاتھ کے اشارے سے باہر چلے جانے کو کہا تو جمیل صاحب کے ذہن کے ایک افق پر روشنی کی ایک تیز سی لکیر ابھری اور انہیں محسوس ہوا کہ وہ لکیر ان کے قریب آ کر پھر ایک دوسرے افق کی طرف چل دی ہے۔ انہوں نے محسوس کیا کہ اگر انہوں نے اس لکیر کا تعاقب نہ کیا تو ان کے ذہن کے جہاں پر وہ اندھیرا پھر سے یلغار کر کے قابض ہو جائے گا جو برسوں ان کے جہاں پر مسلط رہا تھا۔ اسی تعاقب میں وہ دریا کنارے پہنچ گئے اور ایک بڑے پتھر پر، جو شاید بیٹھنے کی خاطر ہی وہاں جمایا گیا تھا، بیٹھ گئے۔

اس روشنی کی لکیر کے سفر کے دوران میں ان کو اپنے جہان میں کئی، بے شمار، صورتیں،

دھندلی دھندلی سی نظر آئیں مگر وہ اس لکیر کے تعاقب میں تیزی سے کھنچے چلے جا رہے تھے کہ وہ رکنا بھی چاہتے تو ان کے قدم اٹھتے ہی چلے جاتے۔ ان دھندلی دھندلی صورتوں پر ان کو جان پہچان کا گمان تو گزرا مگر تعاقب کی تیزی میں یہ صورتیں محض ہوا پر سے مٹتے ہوئے نشانات سے ہو کے رہ گئیں۔ وہ ابھی اسی تعاقب میں تھے کہ ان کے جہاں میں ایک شور سا اٹھا جس نے ان کے اٹھتے ہوئے قدموں کو رکنے پر مجبور کر دیا اور شور ان کے قریب آتا چلا گیا، مدھم ہوتا چلا گیا، رک گیا، ان کی آنکھوں نے اندر کے جہاں سے منہ موڑ لیا، باہر کی طرف ہچکچاتے ہوئے دیکھا۔ روشنی کے ایک مینار پر ان کی نظریں جا ٹکیں۔ نظریں مینار کے گرد پھریں۔ مینار کی روشنی پس منظر میں دور تک تحلیل ہونے لگی اور روشنی کے درمیان ایک انسانی سایہ...... اور پھر ایک انسانی صورت۔ نظروں نے ذہن سے رشتہ جوڑنے کی کوشش کی اور ذہن نے حواس کو زندہ کیا اور جمیل صاحب نے دیکھا، اپنے سارے بدن کی قوتوں سے دیکھا، محسوس کیا کہ متین روشنی کی وسعتوں میں کھوئے کھوئے کھڑے ہیں۔ ان کی آنکھیں کھلی تھیں مگر معلوم ہوتا کہ وہ کچھ نہیں دیکھ رہے، ان کے حواس سو رہے ہیں۔ اس منظر نے جمیل صاحب کے سارے تن بدن میں حلم کا ایک سمندر سا جگا دیا۔ ان کا جی چاہا کہ وہ اٹھیں اور متین صاحب کو سینے سے بھینچ بھینچ کر لگا ئیں۔ مگر کوئی قوت تھی جس نے ان کی حرکت کی قوت سلب کر لی تھی اور بیٹھے بیٹھے ان کو دیکھنے پر مجبور تھے۔ پھر متین صاحب کی پلکیں پھڑ پھڑائیں، ان کی پتلیوں میں روشنیاں جھلملائیں، جیسے ان کی نظریں اپنے آپ کو فوکس کر رہی ہوں۔ جب جمیل صاحب کو یقین ہو گیا کہ متین صاحب کی نظروں نے اپنے آپ کو منظر اور تناظر سے ہم آہنگ کر لیا ہے تو انہوں نے چاہا کہ وہ متین صاحب کو بلائیں مگر ان کی قوت گویائی حرکت میں نہ آئی۔ وہ گھبرائے کہ شاید قوت گویائی کھو بیٹھے ہیں۔ اس گھبراہٹ میں ان کے کانوں میں ایک آواز سی گونجی۔ انہوں نے اپنی پوری توجہ سے اس آواز کو سننے کی کوشش کی۔ ان کے ذہن میں کوندا کہ یہ آواز ان کی اپنی ہی آواز تھی۔ وہ متین صاحب کو متوجہ کر رہے تھے اور ان کو اپنے سامنے والے پتھر پر بیٹھنے کی دعوت دے رہے تھے۔

ان کی اپنی ہی آواز نے ان کے سارے حواس کو اتنی تیزی اور سختی سے جھنجھوڑا کہ ان کے پیٹ کی گہرائیوں میں ایک مروڑ سا اٹھا اور برسنے والے سیاہ بادلوں کی طرح ان کے سارے جسم میں چھا گیا اور انہوں نے محسوس کیا کہ ان کا رواں رواں کٹ رہا ہے۔ اورا لگ الگ ہو رہا ہے اور اگر انہوں نے اپنی پوری کوشش نہ کی تو ان کے جسم کے ذرات ہوا میں، فضا میں منتشر ہو جائیں گے۔ اس بات کے شعور نے ان کے ذہن میں ایک سوال کو جنم دیا کہ ایسا کیوں ہوگا۔ انہوں نے کیا کیا ہے۔ سوال کے جواب میں ایک لفظ ان کے ذہن کے جہاں میں گونجا ''گناہ''۔ اس لفظ کی آواز نے ان کے جسم میں ایک ارتعاش سا پیدا کیا جس نے اس مروڑ سے پیدا ہونے والے تشنج کی رو کو روک دیا، اس پر تصرف حاصل کیا اور پھر سارے جسم میں حلول کر گیا۔ اور پھر اس ارتعاش کی لہریں جیسے ذہن کی طرف لوٹ لوٹ کر آنے لگیں اور ذہن نے ان لہروں کو آواز کی شکل میں ڈھالا اور وہ بولنے لگے اور بولتے ہی چلے گئے۔

ان کو اپنی آواز یوں لگی جیسے اندھیری رات میں موسلا دھار بارش ہو رہی ہو۔ اور کوئی اس رات کی تاریکی میں اس لگا تار ہوتی ہوئی بارش میں کسی انجانی منزل کی طرف بڑھتا چلا جا رہا ہو اور اس لگا تار ہوتی ہوئی بارش کے تار اس کے گرد اگرد سلاخوں کی صورت میں گڑ رہے ہوں، اس کو ان سلاخوں کے درمیان مسدود کر رہے ہوں۔ اور وہ ان سلاخوں کو چیرتا ہوا بڑھتا ہی چلا جاتا ہو، پستی سے بلندی کی طرف۔

پھر یکا یک بارش تھم گئی، رات اور اندھیری ہوگئی۔ پھر بادل گرجا، گرجتا چلا گیا۔ ایک بار بہت زور سے گرجا اور بجلی کڑکی اور اندھیرے میں روشنی پھوٹی اور ایک لمحے بھر کے لیے منظر روشن ہوا، اشیا اور کائنات روشن ہوئے اور پھر اندھیرے میں روشنی تحلیل ہوگئی۔

جمیل صاحب نے محسوس کیا کہ ان کی آواز کی جگہ متین صاحب کی آواز نے لے لی ہے اور وہ بول رہے ہیں۔ اپنے متعلق باتیں کر رہے ہیں۔ ان کی باتیں اگر چہ ان کے اپنے ہی متعلق تھیں مگر جمیل صاحب کی یادوں کے جہاں میں ان کی روشنی داخل ہو رہی تھی اور اس جہان کے مناظر کو روشن کرتی ہوئی چلی جا رہی تھی۔ منظر اتنی تیزی سے روشن ہو کر اندھیرے

میں جذب ہو رہے تھے کہ جمیل صاحب کو ان مناظر کو پہچاننے میں دقت ہو رہی تھی۔ جیسے اندھیری رات میں کوئی جہاز زمین سے ذرا ہی اونچا اڑ رہا ہو اور اس کے چراغ فضا میں اپنے راستے کو منور کرنے کو روشنی پھینک رہے ہوں اور اس روشنی سے ان کے سفر کی راہ منور ہونے کے ساتھ ساتھ زمین کی چیزیں بھی دھندلی دھندلی سی نظر آنے لگیں۔

جمیل صاحب کے جسم و جاں میں ان دھندلے تصورات، صورتوں، محسوسات کے متعلق ایسے الگ اور متنوع تاثرات پیدا ہو رہے تھے، جیسے ان کے اندر ایک شخصیت کی بجائے کئی مختلف شخصیتیں ہوں، اور ہر ایک پر الگ الگ، کبھی کبھی متضاد، اثرات مرتب ہونے ناگزیر ہوں۔ کبھی کبھی ان کے تخیل کے جہاں میں آسمان کی طرف بلند ہوتے ہوئے آتشبازی کے چکروں کی طرح یہ خیال روشنی کے جال پھیلاتا کہ ان کی تمام شخصیتیں آنکھ نہیں رکھتیں بلکہ ایسا جسم رکھتی ہیں جن کا رواں رواں چیزوں سے پیدا ہونیوالی حرکت کی لہروں کے مسلسل سیلاب سے جھنجھنا رہا ہے اور جھنجھناہٹ سے پیدا ہونے والی لہروں سے ان کے جسم میں کبھی کبھی سخت سرد رو دوڑنے لگتی اور کبھی کبھی ان کی ریڑھ کی ہڈی میں آتشی سا سیال کمر سے سر کی طرف دوڑنے لگتا اور پھر دماغ میں پہنچ کر آگ کا روپ دھار لیتا اور ان کے دماغ میں ایک الاؤ سا روشن ہو جاتا اور ان کو یادوں کے جہاں کے مناظر اور اشیاء اور صورتیں لمحے بھر کے لیے دمکتی ہوئی، لبھاتی ہوئی، رجھاتی ہوئی، ستم ڈھاتی ہوئی، رقص کرتی ہوئی، مست بناتی ہوئی، بے بس کرتی ہوئی، نظر آتیں اور پھر شعور سمندر میں جوار بھاٹے کی لہروں کی طرح کبھی توجہ کے مرکز کی طرف بڑھتا اور کبھی پیچھے ہٹتا اور ہٹتا ہی چلا جاتا، اس حد تک کہ شعور کے وجود کا احساس ہی نہ رہتا۔

شعور کے اس جوار بھاٹے کی لہروں کا شور کبھی کبھی پرندوں کی چیخ و پکار میں بدل جاتا اور جمیل صاحب کے تخیل کے جہاں میں آفاق سے سیاہ و سفید پرندوں کے جھرمٹ کے جھرمٹ آندھی کی طرح ابھرتے اور توجہ کے مرکز کی طرف چلے آتے جیسے موسم بدلنے کے ساتھ ساتھ ایک منطقے سے دوسرے منطقے کی طرف پرندوں کے لشکر شور و غل کرتے ہوئے اور کبھی بالکل خاموشی سے ہجرت کرتے ہیں۔ یہ ہجرت کرتے ہوئے پرندے جب توجہ کے

مرکز پر پہنچتے تو ان کے پروں کی حرکت سے ان کے چمکدار پروں اور چونچوں سے روشنی کی لکیریں، بلکہ پٹیاں پھوٹ بہتیں اور ان پٹیوں میں ان مناظر کی تصویریں ابھر آتی جہاں سے وہ ہجرت کر کے آئے تھے۔ اور جمیل صاحب کے تخیل کی آنکھ میں یادوں، تلخ اور سہانی یادوں، کے مناظر جمنے لگتے۔ ان کے حظ میں کبھی تو دل ڈوب ڈوب جاتا، کبھی ان سے اذیت کا اتنا گہرا احساس جاگتا کہ جسم کے ذرے ذرے میں جہنم جنم پاتا۔ جسم و جاں میں نہ اس حظ کی جنتوں نہ اذیت کے ان جہنموں کو برداشت کرنے کی تاب تھی۔ تخیل کو محفوظ کرنے والی قوتیں ان مناظر کو دھندلا دیتیں، صورتوں کو آواز اور اندھیرے کے ایک مسلسل بہاؤ میں تحلیل کر دیتیں۔ آواز اور اندھیرے کا جادو جسم و جاں میں رچے ہوئے حظ اور اذیت کو جذب کر کے نکال باہر پھینکتا اور شعور کا احساس تک مٹ جاتا اور سکون کی ایک بارش سی حواس پر ہونے لگتی۔

شعور کے جوار بھاٹے، روشنی کی آتش بازی، روشنی کے جال، اندھیروں کے پرشور سمندر، سرد اور آتشی سیال کے بہاؤ، اس سے جنم پانے والے آگ کے الاؤ، اس کی روشنی، اس روشنی میں نظر آنے والی دھندلی اور واضح صورتوں، مناظر، مسلسل موسلا دھار بارش کے تاروں سے وجود میں آنے والے قید خانوں، گرجتے بادلوں، کڑکتی بجلیوں، ان کے کوندوں، اور ہجرت کرتے ہوئے پرندوں کے لشکروں، ان پرندوں کے چمکدار پروں اور ان کی روشنی فشاں چونچوں سے پھوٹنے والی روشنی کی پٹیوں میں ابھرنے والے سہانے اور دلفگار مناظر کے تواتر میں ایک آہنگ، ایک نظام پیدا ہونے لگا۔ اس نظام کے احساس نے جمیل صاحب کے اندر اپنے ماضی کی ایک ایک دلفریب اور دل سوز یاد کو دونوں آنکھوں سے، بھرپور انداز میں، دیکھنے کی جرأت پیدا کر دی اور انہوں نے چاہنا شروع کیا کہ ماضی کی ایک ایک یاد اور ایک ایک تجربے کو حال کی بزم میں حاضر کریں، ان کی داستان سنیں۔ کبھی کبھی ان کا جی چاہتا کہ وہ ایک سپہ سالار کی طرح یادوں کو ایک لشکر کی صورت اپنی توجہ کے میدان میں حاضر کریں، ان کا معائنہ کریں۔ ان کو اقسام کے لحاظ سے مختلف حصوں میں تقسیم کریں اور اس تقسیم کے بعد ان میں ضبط و نظم پیدا کر کے اپنے مستقبل کی طرف یلغار

کریں۔ اور زندگی کے بلند ترین قلعوں پر اپنا پرچم لہرائیں۔ تخیل کی آنکھ سے وہ پرچم کو لہراتے دیکھتے، تخیل کی آنکھ سے اس پرچم کی پھڑ پھڑاہٹ کو سنتے اور سنتے ہی چلے جاتے اور پھر دل ہی دل میں اس کامیابی کے تصور سے پیدا ہونے والے فخر وغرور کے جذبے سے خوف کھانے لگتے، اس پر نادم ہونے لگتے اور پھر ایک دم اس تصور کو مٹا ڈالتے اور ایک ایک یاد کو حال کی بزم میں حاضر کر کے ان کی داستان سننے پر قناعت کرنے کی سوچتے۔

یادوں کی محفل آرائی سے پہلے جمیل صاحب نے ایک بار کوشش کر کے حواس کو باہر کے گردوپیش کی طرف متوجہ کیا۔ دریا بہنے میں محو تھا، دریا کی روانی میں جو بڑے بڑے پتھر حائل تھے اس سے ٹکرا ٹکرا کر پانی کے جھالے مختلف جگہوں پر بوندیوں کے سات رنگے جال فضا پر پھینک رہے تھے، دور شمال اور مغرب کے آفاق سے پہاڑوں کی نیلی چوٹیوں پر سرخی مائل سنہری برف کے تودے ایک الاؤ روشن کئے ہوئے تھے، پہاڑوں کی چوٹیوں اور دریا کے درمیانی میدانوں میں درخت خاموش کھڑے اونگھتے تھے، سبزہ دھوپ میں ستا رہا تھا، ہر طرف خاموشی اور سکون کی عملداری تھی، صرف کبھی کبھی اکا دکا پرندہ فضا میں اڑتا دکھائی دے جاتا تھا۔ اونگھتی فضا نے جمیل کی نظروں پر ایک نشہ سا طاری کر دیا اور نظریں آہستہ آہستہ اپنے منبع کی طرف کھسکنے لگیں، منبع پر پہنچ کر نظروں نے آخری بار باہر کی طرف دیکھا، متین صاحب کی ساکت، محو، مستغرق صورت پر ایک لمحے کے لیے رکیں؛ متین صاحب کی آنکھیں نیم وا تھیں، ان کی پتلیوں میں روشنی تو تھی مگر بہت ہی مدھم اور ساکت اور بہت گہرائی میں۔ متین صاحب کی محویت سے جمیل صاحب کو اطمینان ہوا کہ محفلِ یاد بغیر خوف و خطر آراستہ کی جاسکتی ہے۔ مطمئن ہو کر انہوں نے اپنی نظروں کی باگ باہر سے اندر کی طرف موڑ دی۔

اب نظریں تھیں کہ اندر کے عالم میں مینار نور کی روشنی کی طرح، ایک طرف سے ہر سمت رواں تھیں؛ جیسے اعلان کرتی ہوں کہ جو کہیں چھپا ہے سامنے آجائے۔

ماضی کی یادیں ایک دم ایک طغیانی کی صورت امڈ آئیں، کسی کے خدوخال اس افراتفری میں نظر نہ آتے تھے، طغیانی کچھ دیر بعد اتر گئی، دور تک دھندلی دھندلی صورتیں،

نظر آنے لگیں۔

جمیل صاحب نے نظروں کو مجبور کیا کہ وہ ان تمام مناظر اور صورتوں کا احاطہ کرنے کی بجائے ایک ایک منظر، ایک ایک صورت کو الگ الگ کر کے دیکھیں تا کہ ان کے خیالات اور جذبات میں ہیجان پیدا نہ ہو۔

پھر انہوں نے شعور کی شمع روشن کی۔ شمع کے روشن ہوتے ہی تمام منظر اور صورتیں معدوم ہو گئیں، جیسے سورج کے طلوع ہونے پر رات کے جانور چھپ جائیں۔ مگر شمع سورج تو نہ تھی، ایک مسدود و مستور لو تھی جس کی روشنی کے گرداگرد اندھیرے کی فصیلیں پھیلتی چلی گئی تھیں۔ پھر پروانہ وار، مگر ایک ایک کر کے، منظر اور صورتیں شمع کی لو کی طرف بڑھنے لگیں۔

ایک بڑے سے میدان میں ایک کونے میں ایک لالٹین لٹک رہی ہے، اس کی روشنی میں کچھ صورتیں نظر آتی ہیں، کچھ ادھیڑ عمر کی عورتیں ایک بڑھیا کے گرد جمع ہیں۔ بڑھیا کے چہرے پر وقار فکر مندی کی جھریوں سے اُمڈ رہا ہے۔ وہ شاید کچھ کہتے کہتے خاموش ہو گئی ہے۔ لالٹین کی روشنی میں میدان نے ایک صحن کی صورت اختیار کر لی ہے۔ صحن کے چاروں طرف بلند دیواریں، دیواروں میں دروازوں اور کھڑکیوں کے پٹ کھلے ہیں۔ صرف ایک دیوار کی تین کھڑکیوں سے نہایت ہی مدھم روشنی اندھیرے کو چیرنے کی کوشش کر رہی ہے۔ صحن کے ساتھ تین طرف دالان تھے، سامان سے اٹے ہوئے۔ ایک دالان میں چارپائی پر ایک بچہ سو رہا ہے، چوتھی طرف کچے سے فرش پر ایک ننھا سا چمن ہے جو تاریکی میں لپٹا ہے، صرف فرش سے ایک آدھ فٹ تک پودوں کے جسم نظر آتے ہیں، صرف لالٹین کے پاس کے چند پودوں پر پوری روشنی پڑ رہی ہے، پھول شاخوں کے سروں پر پڑے سوتے ہیں۔ لالٹین ایک درخت کے تنے کے ساتھ ایک کیل سے لٹک رہی ہے۔ صحن میں ہُو کا عالم ہے، ہر شے طلسمی معلوم دیتی ہے۔

یکا یک کسی کے کراہنے کی آواز سے خاموشی کا طلسم ٹوٹتا ہے۔ روشن کھڑکیوں کے پٹ کسی نے اٹھ کر بند کر دیئے، ہر طرف اندھیرا سنسنانے لگا ہے۔ عورتوں کے جھرمٹ میں

حرکت پیدا ہوئی ہے۔ ایک عورت اٹھ کر اوپر کی طرف چلی گئی ہے۔ دالان میں سویا بچہ ہڑ بڑا کر اٹھ بیٹھا ہے گردوپیش کے اندھیرے اور کراہنے کی آواز سے ڈر کر رونے لگا ہے، ماں کو پکارنے لگا ہے۔ بوڑھی عورت اٹھتی ہے، روشنی سے اندھیرے میں تحلیل ہوتی ہوئی دالان کی طرف آتی ہے اور بچے کو گود میں اٹھانے کی کوشش کرتی ہے مگر بچہ بھاری ہے۔ لہٰذا بچے کے پاس ہی بیٹھ جاتی ہے، اسے پیار کرتی ہے، پچکارتی ہے۔ بچہ آواز کو پہچان لیتا ہے شاید اور اب رونے کی بجائے بسورنے لگا ہے اور پھر بوڑھی عورت کے سینے سے لگ کر اس سے پوچھتا ہے کہ اس کی امی کہاں ہے۔ عورت بتاتی ہے کہ اس کی ماں اوپر کے کمرے میں ہے اور اس کی طبیعت کچھ اچھی نہیں مگر صبح تک اللہ کے فضل سے اچھی ہو جائے گی۔ بچہ سینے سے لگا لگا سو جاتا ہے، عورت اسے پھر سے لٹا دیتی ہے۔ اور منظر پر بالکل اندھیرا چھا جاتا ہے، منظر گم ہو جاتا ہے۔

اندھیرے میں سے پھر ایک اور منظر ابھرتا ہے۔ ایک بڑے سے کمرے میں سورج کی کرنوں کو چیرتے ہوئے ایک بچہ اور وہی بوڑھی پروقار عورت داخل ہوتے ہیں۔ در و دیوار کے ساتھ دیوار کی طرف سرکئے ایک بڑے سے چھپر کھٹ پر ایک عورت لیٹی ہے۔ چھپر کھٹ کے پاس ایک موڑھے پر ایک جوان سا آدمی بیٹھا ہے۔ وہ عورت کی طرف جھک جھک کر دیکھتا ہے۔ بچہ اور عورت پلنگ کی طرف بڑھتے ہیں۔ پائنتی کے قریب پہنچتے ہیں تو مرد اٹھ کر کھڑا ہو جاتا ہے۔ عورت بچے کو چھوڑ کر موڑھے پر جا بیٹھی ہے۔ لڑکا پائنتی کی طرف کھڑا پلنگ پر لیٹی ہوئی عورت کے پاس ایک گٹھڑی سی میں لپٹی ہوئی گڑیا کی طرف دیکھتا ہی چلا جاتا ہے۔ مرد بچے کی طرف بڑھتا ہے اور پیار سے اس کے شانے پر ہاتھ رکھ آہستہ سے اپنی طرف کھینچتا ہے۔ بچہ حیرانی سے مرد کی طرف دیکھتا ہے۔ مرد کے دمکتے چہرے پر شرمیلی سی مسکراہٹ ہے۔ بچہ مرد کے چہرے کی طرف دیکھتا ہے تو کبھی پلنگ پر لیٹی ہوئی عورت کو دیکھتا ہے جو شرمیلی شرمیلی، مضمحل مضمحل مگر خوش خوش، نظروں سے اس کو ٹکٹکی باندھے دیکھ رہی ہے۔ پھر ہاتھ کے اشارے سے اسے اپنی طرف بلاتی ہے۔ مرد کی آواز گلے میں کھنکھناتی ہے اور پھر خاموش ہو جاتی ہے۔ بچہ کبھی پلنگ پر لیٹی ہوئی عوت کی طرف دیکھتا ہے، کبھی مرد

کے چہرے کی طرف اور پھر موڑھے پر بیٹھی ہوئی عورت کی طرف دیکھتا ہے۔ بوڑھی عورت اس کی طرف دیکھ کر مسکراتی ہے اور پھر ہنسنے لگتی ہے اور ہنستے ہنستے اس کو کہنے لگتی ہے۔ ''جمیل بیٹے! ادھر آؤ دیکھو تمہارے ابا تمہارے لیے گڑیا لائے ہیں جو نہ صرف آنکھیں ہی جھپکتی ہے بلکہ روتی بھی ہے...... آؤ۔''

بچہ کچھ دیر تو کھڑا رہتا ہے جیسے کچھ سمجھنے کی کوشش کر رہا ہو۔ وہ پلنگ کی پٹی پر ہاتھ رکھے آہستہ آہستہ پلنگ پر لیٹی ہوئی، مسکراتی ہوئی عورت پر نظریں جمائے بوڑھی عورت کے موڑھے کی طرف بڑھتا ہے اور موڑھے سے لگ کھڑا ہو جاتا ہے۔ بوڑھی عورت جھک کر پلنگ پر پڑی ہوئی گٹھڑی کا منہ کھول دیتی ہے۔ بیچ میں سے ایک ننھا سا سرخ سا گڑیا سا چہرہ نکل آتا ہے۔ گڑیا کی آنکھیں ہیں۔ اس کے چہرے پر جھریاں دیکھ کر بچہ حیران رہ جاتا ہے۔ پھر لیٹی ہوئی عورت پلنگ پر سے اٹھا کر اپنا ہاتھ اس سر پر رکھ دیتی ہے، ہاتھ اس کے بالوں کو سہلاتا ہوا، اس کی گالوں کو گدگداتا ہوا اس کی ٹھوڑی پر آ کر رک جاتا ہے۔ بچے کی نظریں جھک جاتی ہیں اور وہ عورت کی بجائے گڑیا کو دیکھنے لگتا ہے۔ یکا یک گڑیا آنکھیں کھول دیتی ہے۔ وہ ڈر سا جاتا ہے۔ عورت مسکراتی ہے۔ مرد ہنستا ہے۔ بوڑھی عورت اسے کہتی ہے:

''گڑیا جاگ گئی ہے؟ یہ گڑیا نہیں ہے۔ تیری ننھی ننھی سی بہن ہے۔''

ابھی بہن کا لفظ فضا میں گونج ہی رہا تھا کہ دروازے میں سے ایک ادھیڑ عمر کی عورت ہاتھ میں ایک پیالہ اٹھائے ہوئے داخل ہوتی ہے۔ اور بچے کو دیکھ کر کہتی ہے:

''گڑیا کا بھائی گڑیا کو دیکھنے آیا ہے؟ گڑیا کو پیار کرو، بیٹے! دیکھو کتنی پیاری ہے تمہاری گڑیا۔''

پیالہ اٹھائے عورت اب بالکل پلنگ کے قریب آ گئی ہے۔ بچہ اسے دیکھ کر جیسے ہوشیار سا ہو گیا ہے۔ اس کی نظریں پیالے پر ہیں۔ عورت پیالے کو پلنگ کے ساتھ رکھی ہوئی میز پر رکھ دیتی ہے اور پلنگ پر لیٹی ہوئی عورت کو سہارا دے کر اٹھاتی ہے اور موڑھے پر بیٹھی ہوئی عورت پاس ہی پڑی ہوئی چارپائی سے گاؤ تکیہ اٹھا کر پلنگ کے کٹہرے کے ساتھ

لگا دیتی اور عورت اٹھ کر تکیہ کے ساتھ ٹیک لگا کر بیٹھ جاتی ہے۔ بچے کی طرف دیکھتی ہے۔ بچہ اب موڑھے پر بیٹھی ہوئی عورت کی گود میں بیٹھنے کی کوشش کر رہا ہے۔ بیٹھ جانے کے بعد وہ تکیے سے ٹیک لگائے ہوئے عورت کی طرف دیکھتا ہے۔ عورت میز سے پیالہ اٹھا کر منہ سے لگاتی ہے اور اس کے گلے میں اس کا نرخرا اوپر نیچے ہوتا ہے۔ پھر وہ پیالہ منہ سے ہٹا کر بچے کی طرف متوجہ ہو کر پوچھتی ہے:

''تم بھی پیو گے؟''

''پیالے میں کیا ہے۔ ماں''

''یخنی ہے بیٹے۔ لو۔ بڑی مزے دار ہے۔''

بچہ ماں کے ہاتھ سے پیالہ لے کر منہ سے لگاتا ہے۔ گھونٹ بھرتا ہے اور پھر ماں کو دیکھتا ہے۔ ماں گڑیا کو دیکھ رہی ہے۔ ماں گڑیا کی طرف ہاتھ بڑھاتی ہے اور پھر آہستہ آہستہ اس کو تھپکتی ہے۔

بچہ پھر پیالے کو منہ لگاتا ہے اور ایک ہی سانس میں ساری یخنی پی جاتا ہے اور پیالہ ماں کی طرف بڑھا دیتا ہے۔ ماں، تھپکتے ہوئے، ہاتھ سے پیالہ پکڑتی ہے اور پاس کھڑی ہوئی عورت کو دے دیتی ہے۔ اور پھر بچے کی طرف متوجہ ہو کر کہتی ہے۔

''دائی اماں کو سلام کرو بیٹے۔''

بچہ حیرانی سے دیکھتا ہے اور پھر جلدی سے دائی اماں کو سلام کرتا ہے۔

دائی اماں کھلکھلا کر ہنستی ہے اور کہتی ہے:

''میں لے جاؤں تمہاری گڑیا کو؟''

اس کی ماں اس کی طرف دیکھ کر مسکراتی ہے۔ بچہ ایک دم دونوں ہاتھ گڑیا پر رکھ دیتا ہے۔ گڑیا میں سے رونے کی آواز آتی ہے۔ وہ ڈر جاتا ہے اور جلدی اپنے ہاتھ ہٹا لیتا ہے۔ اس کے چہرے پر حیرانی طاری ہے وہ کبھی ماں کو، کبھی موڑھے پر بیٹھی ہوئی عورت کو دیکھتا ہے۔

پھر جیسے بڑی کوشش سے وہ موڑھے والی عورت سے کہتا ہے۔

''دادی اماں! کیا دائی اماں گڑیا کو لے جائیں گی؟ انہیں کہیے نہ لے جائیں ہماری گڑیا کو۔ بڑی پیاری ہے۔ہم بہت ہی اچھی طرح اسے پیار کریں گے، اچھے اچھے کپڑے پہنائیں گے......اور......دادی اماں ہم گڑیا کو نہلائیں گے بھی نا؟''

دادی اماں سر ہلاتے ہوئے مسکراتی ہیں۔

مرد بچے کے شانے پر ہاتھ رکھ کر اس کو اپنی طرف متوجہ کرتا ہے''آؤ بیٹے ہم بازار چلیں۔ پوری حلوا لائیں گے۔''

مرد اور بچہ دروازے کی طرف مڑتے ہیں۔اور منظر پر اندھیرا چھا جاتا ہے۔

اندھیرے میں سے روشنی پھوٹتی ہے، جیسے ڈوبتے سورج کی آخری کرنیں اندھیرے سے نبرد آزما ہوں۔ اس مدھم مدھم روشنی میں مناظر کی گہرائی میں ایک کمرے کا اندرونی حصہ نظر آرہا ہے۔ کمرے میں ایک مرد اور ایک بوڑھی عورت آمنے سامنے بیٹھے ایک دوسرے کو محویت کے عالم میں دیکھتے ہیں۔کمرے پر بھی محویت کا عالم طاری ہے جیسے ہر شے ان دونوں کو تک رہی ہو۔اس سکوت میں کسی گہرے طوفان کے بہت ہی مدھم شور کا احساس ہوتا ہے۔ کمرے کی آخری دیوار میں سے بند کواڑوں کی درزوں سے روشنی کی پتلی پتلی پٹیاں کمرے میں ایک دمکتے سے دھند لکے کا سماں پیدا کر رہی ہیں۔ایکا ایکی کواڑ کھلتے ہیں۔ روشنی کمرے میں امڈ آتی ہے۔ایک خوبصورت نوجوان عورت نئے نئے پشمینے کے کپڑوں میں ملبوس، زیورات سے آراستہ ایک ہاتھ میں فانوس نما پیتل کے دمکتے ہوئے چراغ کو اٹھائے ہوئے اور دوسرے ہاتھ کی انگلی سے ایک بچے کو لگائے کمرے میں داخل ہوتی ہے۔ کمرے میں ایک ہلچل سی پیدا ہونے کا احساس ہوتا ہے۔ چراغ کی روشنی فرش کے ایک بڑے سے حصے اور چھت کے ایک ننھے حصے میں تیرنے لگتی ہے۔مرد اور عورت کے جسموں میں ایک ننھے سے لمحے کے لیے تھرتھری سی پیدا ہوتی ہے اور ان کے جسموں میں ایک تناؤ سا پیدا ہوتا ہے جیسے کہ کمانیں تن رہی ہوں اور تیر نشانے کی طرف اڑا چاہتے ہوں۔عورت چراغ اور بچے کو لئے دونوں کی طرف آہستہ آہستہ بڑھتی چلی آتی ہے۔ چراغ کی روشنی میں

عورت کا حسین چہرہ، جھومر، کانوں کے جھولتے بندے، گلابی گردن میں سونے کا گلوبند اور گلوبند میں جڑے ہوئے موتیوں کی چھوٹوں کے درمیاں عورت کے متین وحلیم چہرے کے گلابی دھندلکے میں سے جھانکتی ہوئی کالی کالی، بڑی بڑی منور آنکھیں خاموش خطابت سے مرد اور عورت کو دیکھے جا رہی ہیں۔ بچہ کبھی چراغ کو اور کبھی چراغ کی روشنی سے بھی زیادہ روشن عورت کے چہرے کو تحیر سے تکے جا رہا ہے۔ کمرے کے وسط میں پڑے ہوئے چھپر کھٹ کے قریب پہنچ عورت رکتی ہے۔ چھپر کھٹ پر ایک چادر میں لپٹی ہوئی ننھی سی جان کو دیکھتی ہے۔ چراغ کی روشنی میں سوئی ہوئی بچی کا چہرہ دمک اٹھتا ہے۔ بچی کے گلابی سے ماتھے اور رخساروں کے درمیان سائے میں بند بڑی بڑی آنکھیں آہستہ سے کھلتی ہیں۔ ننھی ننھی سی آنکھوں کی روشنی اور چراغ کی روشنی ایک دوسرے سے مقابلے میں صف آرا ہو جاتی ہیں اور پھر چراغ کی روشنی ننھی ننھی آنکھوں کی روشنی کے سامنے ماند پڑ جاتی ہے۔ عورت چھپر کھٹ پر جھک جاتی ہے، اس کے متین وحلیم چہرے پر ایک مسکراہٹ کی سی کیفیت اُمڈ آتی ہے۔ اس کی آنکھوں کی پتلیوں کے گرد پانی کے قطرے سے جھلملا اٹھتے ہیں۔ وہ مسکرانے لگتی ہے۔ بچی پہلے تو تحیر سے عورت کو تکے چلی جاتی ہے اور پھر مسکراتی ہے اور پھر اس کے چہرے پر مسکراہٹ پھیل جاتی ہے اور وہ ہنسنے لگتی ہے اور ہلنے کی کوشش کرتی ہے جیسے وہ اٹھنا چاہتی ہو۔ عورت کی انگلی سے لگا بچہ بھاگ کر چھپر کھٹ کی دوسری طرف بچی کے پاس چلا جاتا ہے۔ بچی ہنسے چلی جاتی ہے۔ بچہ اس پر جھک جاتا ہے اور اس کو چوم لیتا ہے۔ بچی عورت کی طرف سے توجہ ہٹا کر بچے کی طرف متوجہ ہو جاتی ہے اور بچہ اس کی گردن اور ٹانگوں کے نیچے ہاتھ دے کر اس کو آہستہ سے اٹھا لیتا ہے۔ عورت کمر کو سیدھا کرتی ہے اور ایک بار پھر چلنے لگتی ہے اور چراغ اٹھائے چھپر کھٹ کے ساتھ چلتی ہوئی چھپر کھٹ کے دوسری طرف پڑی ہوئی ایک گول میز پر چراغ کو رکھ دیتی ہے۔ عین میز کے اوپر چھت سے ایک جھاڑ لٹک رہا ہے جو چراغ کی روشنی سے جگمگا اٹھتا ہے۔ عورت میز کے پاس کھڑی کچھ سوچنے لگتی ہے۔ بچی کو اٹھائے ہوئے بچہ بھی کسی خیال میں گم نظر آتا ہے۔ چراغ کی روشنی اب کچھ اس طرح سے پڑ رہی ہے کہ عورت کے چہرے کا ایک حصہ سائے میں ہے اور روشنی سے صرف اس کی گلابی گردن میں پڑا ہوا گلوبند اور اس کے سینے کا ابھار منور ہو رہا ہے۔ اس

سائے اور روشنی کے درمیان اس کی سیاہ آنکھوں سے پھوٹتی ہوئی مدھم مدھم روشنی کا بھی احساس ہوتا ہے۔اس کی آنکھیں موڑھے نما کرسیوں پر بیٹھی ہوئی عورت اور مرد پر مرکوز معلوم ہوتی ہیں۔دونوں چپ چاپ، ساکت بیٹھے چراغ کی روشنی میں دھندلکے میں لپٹی ہوئی عورت اور روشنی سے منور بچے اور بچی کو تکے جا رہے ہیں۔یکا یک بچی رونے لگتی ہے۔ شاید خاموشی سے گھبرا گئی ہے۔ایک دم عورت اور مرد اپنے موڑھے نما کرسیوں سے اٹھتے ہیں۔مرد کے جسم میں یکا یک ایک تشنج سا آ جاتا ہے اور وہ اپنے جسم کو ساکت کر لیتا ہے مگر عورت بچی کو اٹھائے ہوئے بچے کی طرف لپکتی ہے۔اس کو لپکتے دیکھ کر نوجوان عورت کی گردن میں ذرا سا ارتعاش پیدا ہوتا ہے مگر وہ بھی اپنے جسم کو ساکت کر لیتی ہے۔بچہ گھبرا سا جاتا ہے۔حیرانی سے کبھی نوجوان، کبھی اپنی طرف بڑھتی ہوئی عورت کو دیکھتا ہے۔بوڑھی عورت بچے کی گود سے بچی کو لے لیتی ہے، اسے چمکارتی ہے، گود میں جھولاتی ہے، اس کو چپ کرانے کی کوشش کرتی ہے۔بچی عورت کے سینے سے لگی بسورنے لگتی ہے اور پھر چپ ہو جاتی ہے۔پھر ہر کوئی اپنے اپنے مقام پر کھڑا اپنے خیالات میں گم ہو جاتا ہے۔کچھ دیر بعد دور نیچے سے ایک آواز اوپر کو آتی ہوئی سنائی دیتی ہے:

''ماما! گاڑی تیار ہے۔''

آواز کے خاموشی میں ڈوبتے ہی قریب آتے ہوئے قدموں کی چاپ سنائی دیتی ہے۔چاپ قریب آتی چلی جاتی ہے اور پھر رک جاتی ہے۔مرد کے پیچھے کی دیوار میں کھلتے ہوئے دروازے میں سے ایک ادھیڑ عمر کی موٹی سی عورت داخل ہوتی ہے۔اس کے ماتھے پر پسینے کی بوندیں جھلملا رہی ہیں۔اور اس کا سانس پھولا ہوا ہے اور اس کے مدبر سے چہرے پر ایک غم اور اداسی کی کیفیت کا گہرا سا رنگ جھلک رہا ہے۔

''مالک! سامان گاڑی میں رکھا جا چکا۔''

اس کی آواز بھرائی ہوئی ہے۔شاید امڈتے ہوئے جذبات پر بند باندھنے کی کوشش بہت دیر سے کر رہی ہے۔

مرد کے جسم میں حرکت پیدا ہوتی ہے اور وہ چھپرکھٹ کی طرف بڑھتا ہے اور ایک

آواز فضا میں تھراتی ہے:

''اماں! آئیں چلیں۔''

بوڑھی عورت ننھی بچی کو گود میں اٹھائے مرد کی طرف بڑھتی ہے۔اس کے پاس پہنچ کر آگے بڑھ جاتی ہے، دیوار میں کھلتے ہوئے دروازے کی طرف۔مرد بچے اور نوجوان عورت کی طرف بڑھتا ہے، بچے کے سر پر ہاتھ رکھ رکھ کر عورت کی طرف گردن جھکا کر کہتا ہے:

''آؤ چلیں۔''

بچہ مرد کی انگلی پکڑ لیتا ہے۔دونوں دروازے کی طرف چل دیتے ہیں۔بچہ مڑ کر عورت کی طرف دیکھتا ہے۔عورت اپنی جگہ پر صمٌ بکمٌ کھڑی ہے۔بچہ مرد کی انگلی چھوڑ کر عورت کی طرف بھاگتا ہے اور اس کی انگلی پکڑ کر اس کو دروازے کی طرف کھینچتا ہے۔مگر اس کا ننھا سا جسم عورت کے جسم کو کھینچ نہیں پاتا۔بچہ منہ اٹھا کر عورت کو بلاتا ہے۔

''امی! امی! ابا اور دادی اماں چلے گئے۔آؤ چلیں۔''

دونوں آہستہ آہستہ، لڑکا اشتیاق سے اور عورت بددلی سے، دروازے کی طرف بڑھتے ہیں، دروازے کو پار کرتے ہیں۔ایک لمبی سی گلی کو طے کر کے سیڑھیاں اترتے ہوئے، لڑکا آگے آگے، جلدی جلدی، اور عورت اس کے پیچھے آہستہ آہستہ، ایک بڑے سے صحن میں، جو کہ میدان سا نظر آتا ہے، داخل ہوتے ہیں۔صحن میں ابھی ڈوبتے سورج کی آسمان پر پھیلتی ہوئی سرخی کا عکس مدھم سی روشنی کئے ہوئے ہے۔ایک ملازمہ دیوار کے ساتھ لگی ہوئی شیشوں میں بند ایک بڑی سی قندیل کو روشن کر رہی ہے۔اس کی روشنی میں صحن کے ایک کونے میں بیری کی پھیلی ہوئی شاخوں کا عکس زمین پر پڑنے لگا ہے۔بچہ شاخوں کے عکس کو حیرت سے دیکھتے دیکھتے رک جاتا ہے عورت اس کے قریب آکر اس کی گردن میں ہاتھ ڈال کر اس کو چلنے پر مجبور کرتی ہے۔دونوں صحن کو عبور کر کے ایک بڑی سی لمبی سی ڈیوڑھی میں داخل ہوتے ہیں۔ڈیوڑھی کی دیوار کے ساتھ ایک بڑی سی قندیل روشن ہے۔اس کے دوسری طرف پھاٹک کے پاس اندر کی طرف ایک بند گاڑی کھڑی ہے۔گاڑی کے دونوں طرف لیمپ روشن ہیں اور ان کی روشنی فرش پر پٹیوں کی صورت پڑ رہی ہے اور گاڑی

کے آگے دو سیاہ گھوڑے ساکت کھڑے ہیں اور اس کے دروازے کے پاس مرد اور بوڑھی عورت کھڑے ہیں۔ ان کو ڈیوڑھی میں داخل ہوتے دیکھ کر مرد گاڑی کا دروازہ کھول دیتا ہے۔ ان کے پاس پہنچ کر عورت بوڑھی عورت سے بچی کو لے لیتی ہے اور بوڑھی عورت گاڑی میں داخل ہو جاتی ہے اس کے بعد نوجوان عورت بھی بچی کو اٹھائے گاڑی میں داخل ہو جاتی ہے۔ مرد بچے کو دونوں ہاتھوں سے کمر سے پکڑ کر اٹھاتا ہے اور اس کو گاڑی میں داخل کر دیتا ہے اور پھر خود بھی گاڑی میں داخل ہو جاتا ہے گاڑی کا دروازہ بند کر لیتا ہے گاڑی کی دوسری طرف کی کھڑکی سے بچہ گردن باہر نکال کر دیکھنے لگتا ہے۔

پھاٹک کے کواڑ کھل جاتے ہیں اور سائیس گاڑی کے آگے اپنی مچان پر بیٹھ جاتا ہے اور گاڑی ڈیوڑھی سے باہر نکل جاتی ہے۔ بچہ گاڑی کے اندر جھانکتا ہے۔ اس کے پاس مرد بیٹھا ہے اور اس کے سامنے کی نشست پر اس کی ماں اور دادی اماں بیٹھے ہیں اور اس کی ماں کی گود میں اس کی ننھی سی بہن سو رہی ہے۔ گاڑی کی چھت سے ایک ننھی سی لالٹین جھول رہی ہے۔ بچہ کبھی دادی اماں کی صورت کو دیکھتا ہے، کبھی ماں کو، ماں کی گود میں سوئی ہوئی بہن کو اور کبھی والد کے بلند چہرے کو۔ سب خاموش ہیں۔ بچے پر خاموشی بار ہونے لگتی ہے اور وہ اپنی نشست پر بے اطمینان ہونے لگتا ہے، بے تاب ہونے لگتا ہے۔ دادی اماں کی طرف دیکھتا ہے۔ دادی اماں کی آنکھوں میں پانی کی بوندیں جھلملا رہی ہیں۔ وہ حیرانی سے جھلملاتے آنسوؤں کو دیکھنے لگتا ہے۔ اور پھر یکا یک بول اٹھتا ہے۔ ''ہم کہاں جا رہے ہیں؟ دادی اماں!''

اس کی آواز سے دادی اماں کے جسم میں ایک لرزہ سا پیدا ہوتا ہے اور اس کی آنکھوں سے آنسو بہہ نکلتے ہیں۔ بچہ ششدر ہو جاتا ہے۔ اس نے کسی بھی بڑے کو آج تک روتے نہ دیکھا تھا اور دادی اماں کے رعب دار چہرے پر آنسو کا تصور تو وہ کر ہی نہ سکتا تھا۔ ان کے قدموں کی چاپ سے ہنستے ہوئے چہرے اور بولتے ہوئے منہ سنجیدہ ہو جاتے تھے۔

اسی حیرانی کے عالم میں اس نے جو اپنی ماں کی طرف نگاہ کی تو وہ بالکل بت بنی بیٹھی تھی اور ان کی آنکھوں میں چھت سے لٹکتی ہوئی روشنی نیچے گہرائی میں اترتی ہوئی معلوم ہوتی

تھی، جیسے اس کی آنکھیں ایک لمبی سی ڈیوڑھی ہوں اور اس ڈیوڑھی کے اندھیرے میں کوئی ننھی سی شمع اٹھائے چلا جا رہا ہو۔ وہ پریشان سا ہو جاتا اور وہ اپنی نشست سے گاڑی کے فرش پر کھسک جاتا ہے اور دادی اماں کے زانوؤں کی طرف سرک جاتا ہے اور ان زانوؤں پر دونوں ہاتھ رکھ کر ان کی طرف منہ اٹھا کر دیکھتا ہے۔ ان کی آنکھوں سے ٹپ ٹپ آنسو گر رہے تھے۔ ایک آنسو تو اس کے چہرے پر بھی گرتا ہے۔ اس کے جسم میں جھرجھری سی آتی ہے۔ اس کا دم گھٹنے لگتا ہے۔ اور وہ مڑ کر ماں کو دیکھتا ہے اور اس کو حیرانی سے بتاتا ہے:

''امی! دادی اماں رو رہی ہیں۔'' اور اس کی آواز میں جوش سا آجاتا ہے اور وہ پوچھتا ہے ''رو کیوں رہی ہیں؟ دادی اماں رو کیوں رہی ہیں؟ امی!'' مگر اس کی امی کی طرف سے کوئی جواب نہیں آتا، وہ گم سم بیٹھی ہے، صرف اس آواز سے اس کے سینے میں ذرا سا ارتعاش پیدا ہوا ہے۔ اس کو محسوس ہوتا ہے کہ اس کے کانوں میں سسکی کی بہت ہی مدھم آواز آئی ہے۔ وہ دادی اماں کی طرف دیکھتا ہے۔ اس کو ان کے اداس چہرے پر آنسوؤں کی لکیروں کے سوا کچھ نظر نہیں آتا۔ وہ ماں کی طرف دیکھتا ہے۔ اس کے چہرے کے خدّ و خال میں ایک کھنچاؤ اور اس کے ہونٹوں میں تشنج کی کیفیت نظر آتی ہے، جیسے بہت ضبط کی کوشش ہو رہی ہو اور ناکام ہوا چاہتی ہو۔

بچہ یک لخت دادی اماں کے زانوؤں کے سہارے مڑتا ہے اور اپنی نظریں اپنے باپ کے چہرے پر گاڑ دیتا ہے جیسے کہ وہ کہہ رہا ہو:

''آپ نے دادی اماں اور امی کو کیا کر دیا ہے۔ میں نے دادی اماں کو روتے ہوئے کبھی نہیں دیکھا، امی کو اس طرح خاموش اور پریشان کبھی نہیں دیکھا۔ یہ رونا اور پریشانی کیوں۔''

باپ بچے کی نگاہوں میں چھپے ہوئے سوال کی زیادہ دیر تاب نہیں لا پاتا اور منہ موڑ کر کھڑکی سے باہر دیکھنے لگتا ہے۔ باہر دور تک پھیلتے ہوئے میدانوں میں چاندنی بچھی ہوئی ہے۔ اور ہرے بھرے ساکت کھیتوں کے درمیان کہیں کہیں ایک آدھ مکان، مکانوں کے ننھے ننھے جھنڈ تیزی سے پیچھے کی طرف بھاگتے نظر آتے ہیں۔ مناظر کی حسن آرائی اس کا

دل لبھانے لگتی ہے اور گاڑی کے اندر کے منظر کو بھول جاتا ہے۔ مگر بچے کی آواز اس کو اپنی طرف متوجہ کرتی ہے۔ بچہ اس کو زانو سے پکڑ کر ہلا رہا ہے اور بار بار کہے جا رہا ہے۔

''ابا جان! دادی اماں رو رہی ہیں۔ ابا جان! دادی اماں رو رہی ہیں۔ ایسا کیوں؟ ان کو کس نے مارا ہے؟ بتائیں نا۔''

مرد جھک کر بچے کو اٹھا کر گود میں بٹھا لیتا ہے۔ اور اس کے بالوں سے کھیلنے لگتا ہے۔ پھر بچے کی ٹھوڑی کو انگشت شہادت سے اوپر اٹھا کر کہتا ہے۔

''ہم دور بہت دور، سمندر پار جا رہے ہیں......''

''کہاں؟''

''ملکہ معظّمہ کے دیس میں۔''

''آخر کیوں؟''

''ملکہ معظّمہ کا ایسا ہی حکم ہے۔ ہم جلد ہی لوٹ آئیں گے۔ یہی دو تین سال میں ہم لوٹ آئیں گے۔ اتنی دیر تم اپنی امی کا خیال رکھنا۔ رکھو گے نا؟''

باپ بیٹا یونہی باتیں کرتے چلے جاتے اگر سسکیوں کی آواز ان کو متوجہ نہ کرتی۔ دونوں دادی اماں کی طرف دیکھتے ہیں۔ دادی اماں دونوں ہاتھوں سے چہرے کو ڈھانپے سسکیاں بھر رہی تھیں اور بچے کی امی چپ چاپ اس کی دادی کو تکے جا رہی تھی۔ اس کی امی کی آنکھوں میں حیرانی کے ساتھ پیار تھا۔

''اماں! آپ کو تو خدیجہ کو حوصلہ اور سہارا دینا چاہیے تھا آپ خود ہی نڈھال ہوئی جا رہی ہیں۔ میں تو اپنا سب کچھ آپ ہی کے سہارے چھوڑے جا رہا ہوں۔ میں نے تو سب جرأت اور تحمل آپ ہی سے سیکھا ہے۔ والد کی موت کے بعد آپ ہی کی ہمت سے میں آج اس قابل ہوا ہوں کہ سرکارِ انگلشیہ کی نظرِ انتخاب نے مجھے اس اعزاز کے قابل سمجھا ہے۔''

''مگر اتنی دور اور اتنے عرصے کے لیے۔ آخر کیا ضروری تھا۔ مجھے تمہاری قابلیت، تمہاری لیاقت نہیں چاہیے، تمہارا قرب، تمہاری زندگی ہی میرے لیے بہت بڑی نعمت

ہے۔ اور پھر اس منحوس فرنگی کی خدمت میں کمر بستہ ہونا کہاں کی جواں مردی ہے۔ ان فرنگیوں کی حکومت کے ہاتھوں سے ابھی تک ہمارے بادشاہ کا خون ٹپک رہا ہے۔ اور ہماری دھرتی کے سینے پر لوہے کی میخیں گاڑ کر لوہے کی پٹڑیاں بچھا کر ان پر لوہے کی گاڑیاں چلا کر ہماری دھرتی کو قید کر دیا ہے، بے بس کر دیا ہے۔ اور اب ہمارے جوانوں کو عہدوں کا لالچ دے کر ان کو ان کے دین اور ان کے آباؤ اجداد سے چھین لینے کا اہتمام کر رہے ہیں یہ منحوس فرنگی۔ خدا کا عذاب ہو ان پر۔''

''اماں! مجھے آپ کے جذبات کا احترام ہے؛ ان کا احترام مجھ پر فرض ہے۔ مگر اماں سوچیے تو۔ مغلوں کی حکومت ختم ہوئے عرصہ ہوا۔ مرہٹوں اور سکھوں کی پھیلائی ہوئی بدامنی ختم ہو چکی۔ انگریز کے راج نے یہاں قدم جما لئے ہیں۔ اب ملک میں عرصے کے بعد بالکل امن ہے، غریب کو کھانے کو روٹی میسر ہے۔ ہمارے لوگوں میں ہمت اور سوجھ بوجھ ہوتی تو آج غیر کی حکومت یہاں نہ ہوتی۔ مگر اب غیر کی حکومت ہے۔ حکومت ظالم نہیں۔ ان کی حکومت ہمارے تعاون کے بغیر بھی چل سکتی ہے۔

اگر ہم ان سے تعاون کر کے ان سے ان کی حکومت کا راز جان سکیں تو عین ممکن ہے کہ ایک دن، بہت دور سہی وہ دن، مگر پھر بھی ایک دن ہم ان سے اپنا راج واپس لے سکیں گے۔ اس کی صرف یہی ایک ہی صورت ہے۔ جہاد کر کے ہم نے دیکھ لیا، کشت وخون کر کے دیکھ لیا۔ انگریز کے اقبال کا ستارہ طلوع ہو چکا ہے۔

میرے جیسے لوگوں کو اپنے ملک میں بھیج کر، ان کو اپنے علم وبصیرت سے آشنا کرا کے، ان کو اپنی حکومت کے ستون بنا کے وہ ہمیں زیادہ عرصے تک حکومت کی باگوں سے دور نہ رکھ سکیں گے۔ میری سوجھ بوجھ یہی کہتی ہے کہ ہم میں سے جتنے لوگ اس قابل ہو سکتے ہیں کہ وہ انگریز کی حکومت کے کارکن بن سکیں، بن جائیں۔''

''مگر فرنگی بندروں میں رہ کر تم بھی تو فرنگی بن جاؤ گے۔ اپنے دین سے منحرف ہو جاؤ گے۔ اپنے آباؤ اجداد کے نام پر دھبہ لگاؤ گے۔ میرا تو اس دن دل بیٹھ گیا تھا جب تمہارے والد نے تمہیں انگریزی مدرسے میں داخل کرایا تھا۔ مگر میں نہ جانتی تھی کہ وہ تمہارے ذہن

کے ساتھ تمہارے جسم کو بھی چھین لیں گے۔ افسوس میرے اختیار میں کچھ بھی نہ تھا۔''

''اماں! ایسا خطرہ بعید از قیاس نہیں۔ مگر اس خطرے کو مول لئے بغیر نہ تو اس ملک میں اب عزت کی روٹی میسر آ سکتی ہے اور نہ اس ملک کی خدمت کے مواقع میسر آ سکتے ہیں۔ ہمیں یہ بھی نہ بھولنا چاہیے کہ ہم مسلمانوں نے کچھ صدیاں ہسپانیہ، صقلیہ اور افرنگ کے دوسرے علاقوں پر حکومت کی تھی اور وہاں کے لوگوں نے ہمیں سے ہمارا علم اور بصیرت حاصل کر کے ہم سے راج چھین لیا تھا۔ بالکل یہی کچھ ہمیں کرنا ہے۔ اگر تمام کی تمام قوم مولویوں کی طرح انگریز کے علم کے خلاف جہاد کرتی رہی تو ہم بالکل بے بس اور برباد ہو جائیں گے۔ جس طرح ایک زمانے میں ہمارا علم جہاں میں ترقی کی واحد راہ تھا اسی طرح آج افرنگی کا علم ترقی کی واحد راہ ہے۔ اس لیے آپ سے درخواست کرتا ہوں کہ آپ اپنے دل پر قابو رکھیں اور اسے سمجھائیں کہ یہ چند برسوں کا فراق ہماری آپ کی، ہماری قوم کی بہتری کے لیے ضروری ہے۔''

''مگر میں بوڑھی ہوگئی ہوں۔ مجھے جوان سہارے کی ضرورت ہے۔ تمہاری غیر حاضری میں، میں زندہ نہیں رہ سکوں گی۔ یقین جانو میں مر جاؤں گی۔ واپسی پر میری صورت نہ دیکھ سکو گے۔''

''آپ کے پاس تو جمیل ہے، فاطمہ ہے، خدیجہ ہے۔ میں تو صرف آپ کی، ان کی یادوں کو ذہن اور دل میں محفوظ کر کے لئے جا رہا ہوں۔ ان کے سر پر ہاتھ رکھیے، ان کے لیے سایہ بن جائیے، میری امانت کی حفاظت کیجئے، اور وعدہ کرتا ہوں کہ میں دین وایمان، جو مجھے آباؤ اجداد سے ورثے میں ملے ہیں، میں ان کی پوری بیداری اور جی داری سے حفاظت کروں گا۔

میں جانتا ہوں اس فراق سے آپ کے دل پر کیا بیت رہی ہے، بیتے گی، بیت سکتی ہے۔ مگر یہ سفر، مجھے یقین واثق ہے، مقدر میں لکھا ہے اور ٹل نہیں سکتا۔ اور اس سفر میں ظفر ہے۔ اس سے زیادہ میں کچھ نہیں کہہ سکتا۔''

گاڑی کے اندر ایک بار پھر خاموشی طاری ہوگئی ہے اور فضا میں گھوڑوں کی ٹاپوں اور

پہیوں کی گھڑ گھڑاہٹ اور دور سے آتی ہوئی ڈھولک کی آواز کے امتزاج سے ایک دل لبھا قسم کا نغمہ بُنا جا رہا ہے۔

جمیل باپ کی گود میں بیٹھا کھڑکی میں باہر کی طرف دیکھنے لگا۔ دور تک کھلا میدان ہے۔ آسماں پر آدھا چاند زمین پر پیلی پیلی روشنی بہا رہا ہے۔ سڑک کے کنارے اکا دکا مسافر اپنے اپنے خیال میں مگن چلے جا رہے ہیں۔ دور کہیں کسان ہل کندھے پر اٹھائے بیلوں کو ہانکتے ہوئے کھیتوں سے پرے مٹی کے گھروں کی طرف جاتے نظر آ رہے ہیں۔ منظر بڑی تیزی سے گاڑی کے پیچھے کی طرف بھاگے جا رہے ہیں۔

جمیل کھڑکی کی طرف سے توجہ ہٹا کر اندر کی طرف دیکھتا ہے۔ دادی اماں کے آنسو کبھی کے تھم چکے ہیں اور امی کی آنکھوں میں روشنی لمبی سی ڈیوڑھی کے اندر دور جاتی ہوئی دکھائی دینے کی بجائے باہر آتی ہوئی دکھائی دے رہی ہے۔ اس کے خدوخال میں ایک ہم آہنگی سی آ چکی ہے اور وہ بڑے غور سے ابا کو دیکھ رہی ہے۔ دادی اماں بھی ابا کو دیکھ رہی ہیں۔ جمیل منہ اوپر اٹھا کر ابا کی طرف دیکھنے کی کوشش کرتا ہے مگر چہرے کو اچھی طرح سے دیکھ نہیں سکتا۔ اسی لیے شاید وہ باپ کی گود سے اتر کر دادی اماں کی گود میں جا چڑھتا ہے۔ دادی اماں جھک کر اس کو چوم لیتی ہیں اور ایک لمبا سانس بھرتی ہیں اور پھر سر اٹھا کر ابا کے چہرے پر نظریں گاڑ دیتی ہیں۔ جمیل باپ کے چہرے کو غور سے دیکھتا ہے۔ ان کے چہرے پر دادی اماں اور امی کی سی کیفیت نہیں ہے۔ ان کے چہرے پر ایک بےخودی کا عالم طاری ہے۔ ان کی آنکھوں کی روشنی کسی اندرونی عالم میں سرگرداں معلوم ہوتی ہے۔ ان کے چہرے پر بےخودی کے ساتھ اشتیاق کی بھی واضح کیفیت نظر آ رہی ہے۔ یوں لگ رہا ہے کہ منزل پر پہنچنے سے پہلے ہی تخیل ہی تخیل میں منزل پر پہنچ چکے ہیں اور منزل کے مناظر کی سیر کر رہے ہیں۔ جمیل کے والد یکا یک بےخودی کے عالم سے گاڑی کے تنگ سے جہان میں لوٹ آتے ہیں اور حیرانی سے اور پھر ایک دم مسکراتے ہوئے دادی اماں کو، اس کو، امی کو اور پھر امی کی گود میں سوئی ہوئی فاطمہ کو دیکھتے ہیں اور پھر فاطمہ کے سر پر ہاتھ پھیرتے ہیں اور پھر امی کی طرف بڑی گہری نظر سے دیکھتے ہیں اور کچھ کہنے کو ان کے ہونٹ ہلتے ہیں مگر کچھ

نہیں کہتے یا شاید آنکھوں ہی آنکھوں میں سب کچھ کہہ دیتے ہیں۔گاڑی میں ایک سکون اور اطمینان کی کیفیت چھا جاتی ہے اور جمیل مطمئن ہوکر باہر کی طرف دیکھتا ہے۔دور سے منظر دوڑتے ہوئے گاڑی کی طرف آ رہے ہیں اور پاس آ کر جلدی سے گاڑی کے پیچھے کی طرف چلے جاتے ہیں۔دور ایک بڑی سی عمارت نظر آتی ہے جس کے اندر روشنی کے مقید الاؤ کا احساس سا ہوتا ہے۔عمارت بڑی تیزی سے گاڑی کی طرف بڑھتی چلی آتی ہے۔ جمیل پہلے تو حیران ہوکر اس عمارت کو دیکھتا ہے، دیکھتا چلا جاتا ہے۔اور عمارت جو پہلے تیزی سے بڑھتی چلی آتی تھی اب آہستہ آہستہ ان کی طرف بڑھ رہی ہے۔بالکل قریب آ کر رک جاتی ہے۔گاڑی بھی رک جاتی ہے۔جمیل حیران ہوکر والد سے پوچھتا ہے کہ گاڑی رک کیوں گئی۔جواب میں اس کے ابا بتاتے ہیں کہ اسٹیشن آ گیا ہے اور وہ وہاں سے لوہے کی گاڑی میں سوار ہوکر دور سمندر پار کی منزل پر روانہ ہو جائیں گے۔

قلی اسباب اٹھاتے ہیں۔ابا گاڑی سے اتر کر ہدایات دیتے ہیں۔دادی اماں اور امی سفید براق برقعوں میں ملبوس ابا کے پاس کھڑی ہوجاتی ہیں۔صحن کی وسیع ڈیوڑھی میں سوائے کالی وردیوں والے لوگوں کے، انگریز سپاہیوں اور انگریزی لباس میں ملبوس چند گورے لوگوں اور میموں کے کوئی دیسی آدمی نظر نہیں آتا۔قلی اسباب اٹھائے آگے آگے چل دیتے اور ابا جمیل کو انگلی سے پکڑ لیتے اور دادی اماں اور فاطمہ کو اٹھائے ہوئے امی ان کے ساتھ ساتھ آہستہ آہستہ چل دیتے ہیں۔ڈیوڑھی سے پرے ایک لوہے کے جنگلے کے درمیاں دروازے پر ایک نیلی وردی میں ملبوس گورے صاحب کو ٹکٹ دکھا کر وہ اندر چلے جاتے ہیں۔ٹکٹ دیکھنے والے صاحب کے چہرے پر تعجب کے آثار ابھرتے ہیں اور وہ ان کو کچھ دیر پلیٹ فارم پر جاتے ہوئے دیکھتا ہے۔پلیٹ فارم سے پرے اس سے بہت نیچے دور تک لوہے کی پٹڑیاں بچھی ہوئی ہیں جو عجیب عجیب زاویوں سے ایک دوسری کو کاٹ کر دور افق تک چلی گئی ہیں۔ان پٹڑیوں کے بیچ کہیں کہیں کھمبوں پر رنگدار اور ہلکی پیلی روشنی دیتے ہوئے چراغ نصب ہیں جن کی روشنی گھروں میں استعمال ہونیوالے چراغ کی روشنی سے مختلف ہے، ان میں لویں تو ہیں ہی نہیں اور گھر کی قندیلوں کے شیشے کے ڈبوں سے تو

ان کے دڑبے بہت ہی چھوٹے ہیں۔ ان میں نہ تو موم بتی ہے نہ تیل کا دیا۔ جمیل ان چراغوں کو غور سے دیکھنے لگتا ہے۔ عجب قسم کے چراغ ہیں۔ اس کا ذہن ان کو سمجھنے سے قاصر ہے اور وہ ابا کی انگلی کو کھینچ کر اپنی طرف متوجہ کرتا ہے اور پوچھ ہی لیتا ہے کہ آخر یہ چراغ کیسے روشن ہیں جب ان میں نہ تو موم بتی ہے اور نہ دیا۔ باپ ہنستا ہے اور اس کو گود میں اٹھا کر ایک ایسے کھمبے کے نیچے لے جاتا ہے جس پر اسی طرح کا چراغ نصب تھا اور اس کو بتاتا ہے کہ ان چراغوں میں بھی اسی طرح کی بجلی بند ہے جس طرح کی بجلی بارش کے دنوں میں آسمان پر چمکتی ہے۔

''تو ابا وہ بجلی انہوں نے کیسے پکڑ کر بند کر رکھی ہے ان چراغوں میں۔ پکڑنے والوں کے ہاتھ نہیں جلے۔ وہ تو آسمان پر بڑی لمبی نظر آتی ہے۔ مگر یہ تو بالکل ننھی سی ہے اس کے مقابلے میں۔''

''یہ بجلی آسمان سے نہیں پکڑی بیٹے۔ یہ فرنگی نے خود بنائی ہے۔ یہ ہر وقت نہیں جلتی۔ صرف رات کو جلتی ہے۔''

''یہ فرنگی تو بڑا جادوگر ہے ابا جان۔ دادی اماں کہتی تھیں کہ فرنگی کے پاس کالا علم ہے۔ اس کا جادو ہر چیز پر چل جاتا ہے۔ اس نے اس علم کے زور پر ہمارے ملک پر قبضہ کر رکھا ہے۔''

''فرنگی جادوگر نہیں بیٹا۔ نہ اس کے پاس کالا علم ہے۔ اس کا علم تم بھی سیکھ سکو گے جب تم سکول میں داخل ہو گے۔ فرنگی اپنے علم کو چھپاتا نہیں۔ اس کا علم ہر کوئی سیکھ سکتا ہے چاہے وہ چمار کا بیٹا ہی کیوں نہ ہو۔ تم بھی کوشش کر کے اس علم کو سیکھنا۔ پھر جب یہ علم سیکھ لو گے تو یہی بجلی ہمارے لوگ بھی اپنے استعمال میں لا سکیں گے۔''

''ابا جان۔ یہ بجلی دادی اماں اور امی جاں کو بھی بلا کر دکھائیے۔''

''چلو چلیں ان کے پاس اور پوچھیں ان سے کہ وہ ابھی اس بجلی کو دیکھیں گی۔'' باپ بیٹا دونوں عورتوں کی طرف روانہ ہوتے ہیں۔ جمیل مڑ مڑ کر بجلی کے قمقمے کو حیرانی سے دیکھے چلا جاتا ہے۔ ماں اور دادی اماں کے پاس پہنچ کر وہ دادی اماں سے کہتا ہے:

''دادی اماں آپ نے بجلی کا چراغ دیکھا ہے؟ اس میں بھی وہی بجلی بند ہے جو بارش کے دنوں میں آسمان پر چمکتی ہے۔''

''دیکھ رہی ہوں بیٹے۔ یہ فرنگی نہ جانے کس کس شے کو قید کر لے گا۔ دیکھ رہی ہوں کس طرح اس نے ہماری دھرتی کے سینے میں لوہے کی میخیں گاڑ رکھی ہیں اور ان میخوں سے اس نے یہ لوہے کی پٹڑیاں مضبوطی سے دھرتی کے سینے پر بچھا دی ہیں۔ بے بس ہے ہماری بدنصیب دھرتی۔ اللہ بھی اس دھرتی کی آہ و پکار کو نہیں سنتا۔ تمہارے ابا بھی تو نہیں سنتے اس دھرتی کی آہ و پکار کو۔ فرنگی کے دوست ہیں تمہارے ابا۔ تم تو سن رہے ہو نہ اس کی پکار۔''

جمیل کان لگا کر سننے کی کوشش کرتا ہے۔ سر ہلاتا ہے۔ اور کہتا ہے ''نہیں دادی اماں۔ کچھ سنائی نہیں دیتا۔ شاید سو رہی ہے ہماری دھرتی۔ ہے نا امی جان۔''

''نہیں بیٹے...... دھرتی کے منہ میں زبان نہیں ہے۔ اس کے پاس تو صرف دل ہے جو ہر دم دھڑکتا رہتا ہے کیونکہ فرنگی نے دھرتی کی طنابیں کھینچ لی ہیں اور وہ بے بس ہے۔''

جمیل باپ کی انگلی چھوڑ دیتا ہے اور فرش پر گھٹنوں کے بل بیٹھ کر کان فرش کے ساتھ لگا دیتا ہے۔ کافی دیر تک لگائے رکھتا ہے۔ باپ اس کی اس معصوم حرکت پر مسکرا رہا ہے۔ ماں اور دادی اماں کی آنکھیں اس کو حیرت اور حُزن کی نظر سے دیکھ رہی ہیں۔ دونوں ساتھ ساتھ کندھے سے کندھا جوڑے کھڑی کبھی پٹڑیاں بچھے میدان کو، کبھی وسیع وعریض اور خالی پلیٹ فارم کو دیکھتی ہیں جہاں چند قلی سامان کے پاس بیٹھے ہیں اور ایک آدھ سیاہ وردی والا فرنگی چلتا نظر آتا ہے۔

''امی! امی! دھرتی کا دل دھڑک رہا ہے مگر آہستہ آہستہ اب ذرا ذرا تیز ہو رہا ہے۔''

دونوں حیران ہو جاتی ہیں اور حیرانی سے وہ دونوں ایک دوسری کو تکتی ہیں پھر دونوں مرد کو دیکھتی ہیں۔ باپ کہتا ہے:

''شاید گاڑی آ رہی ہے...... ہاں۔ گاڑی ہی تو آ رہی ہے۔ سگنل گر گیا ہے۔ اب ذرا سنبھل جائیں۔ بہت شور ہوگا۔ بہتر ہوگا اگر ہم یہاں سے ہٹ کر'' ادھر ادھر دیکھتا ہے اور دیوار کے ساتھ پڑی ہوئی ایک خالی بنچ کو دیکھ کر اس کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہتا ہے

''اس بنچ پر بیٹھ جائیں۔''

باپ جھک کر جمیل کو اٹھاتا ہے۔ جمیل کے چہرے پر ابھی تک گہری حیرانی کے آثار ہیں اور وہ کھویا کھویا ہے۔ وہ اٹھتا ہے اور اس کھوئے کھوئے انداز میں باپ کے ساتھ چل دیتا ہے۔ وہ سب اس بنچ پر بیٹھ جاتے ہیں۔ ایک دم میدان میں روشنی پھیل جاتی ہے جیسے پانی کا ایک ریلا سا ہو۔ جمیل پہلے تو حیران ہوتا ہے۔ بنچ سے کھسک آتا ہے۔ حیرانی سے پھیلتے ہوئے روشنی کے ریلے کو دیکھتا ہے پھر ذرا سا آگے بڑھتا ہے۔ روشنی کا منبع نظر نہیں آتا۔ پاؤں کے بل اونچا ہو ہو دیکھتا ہے پھر جھجکتے جھجکتے آگے بڑھتا ہے۔ آہستہ آہستہ، ذرا تیزی سے قدم اٹھاتے ہوئے پلیٹ فارم کی طرف بڑھتا ہے۔ اس کا باپ بھی بنچ سے اٹھ کر اس کے پیچھے چل دیتا ہے۔ جمیل مبہوت اور مسحور بڑھتا چلا جاتا ہے۔ روشنی میدان میں دور تک پھیل چکی ہے۔ اب پلیٹ فارم کے کنارے کے قریب اور بالکل قریب آ گئی ہے اور پھر جمیل دیکھتا ہے دور پٹڑیوں پر ایک بہت بڑا اژدھا جس کی دو بڑی بڑی آنکھیں ہیں، ایک سرخ اور ایک پیلی سی جو چمک رہی ہیں اور ایک بڑی آنکھ عین اس کے ماتھے میں ہے جس سے روشنی پھوٹ پھوٹ کر دور دور تک پھیل رہی ہے۔ وہ ڈر جاتا ہے اور کانپنے لگتا ہے۔ باپ جھک کر اس کو گود میں اٹھالیتا ہے۔ وہ مارے ڈر کے منہ موڑ لیتا ہے اور اپنی ماں اور دادی کی طرف دیکھنے لگتا ہے۔ وہ دونوں کھڑی ہیں۔ حیران اور ساکت ایک دم شور اٹھتا ہے۔ ہر دم شور قریب آتا چلا جاتا ہے۔ وہ منہ موڑ کر باپ کے چہرے کی طرف دیکھتا ہے۔ باپ مسکرا رہا ہے۔ اور وہ دیکھتا ہے کہ باپ نے بایاں ہاتھ اس اژدھے کی طرف اٹھایا ہوا ہے۔ باپ کو جب اطمینان ہو جاتا ہے کہ اس کا ڈر کم ہو گیا ہے تو وہ کہتا ہے۔ ''وہ دیکھو گاڑی آ رہی ہے۔ اس کے آگے انجن ہے۔ اس کی آنکھوں میں بجلی بند ہے۔ اس گاڑی میں بیٹھ ہم جائیں گے سمندر پار۔''

جمیل باپ کے سر کے ساتھ سر لگائے انجن کی روشن آنکھ کو تکے جاتا ہے۔ گاڑی کی روشنی پلیٹ فارم پر پھیل جاتی ہے اور پھر پلیٹ فارم سے چلتے چلتے بالکل غائب ہو جاتی ہے اور انجن اب بالکل قریب آ گیا ہے۔ بہت ہی اونچا ہے یہ انجن۔ بالکل ہاتھی لگتا ہے۔ اس

کے پیچھے دور تک مکان سے ہیں جن میں چراغ روشن ہیں۔ پھر انجن زن سے ان کے سامنے سے گزر جاتا ہے۔ اس کے دروازے میں سے ایک فرنگی کالے کپڑوں میں ملبوس اور کالا سا ٹوپ اوڑھے جھانک رہا ہے اور اس کو دیکھ کر ہنستا ہے اور ہاتھ ہلاتا ہے۔ گڑڑ گڑڑ روشن مکان ایک ایک کر کے گزرنے لگتے ہیں۔ ان میں گورے مرد اور میمیں بیٹھی ہیں۔ کچھ لوگ اپنے دیس کے بھی نظر آتے ہیں۔ مگر برقعے والی کوئی عورت نظر نہیں پڑتی۔ روشن مکان رک جاتے ہیں۔ ایک دم پلیٹ فارم جو پہلے خالی تھا اب لوگوں سے بھر جاتا ہے۔ لوگ مکانوں کے دروازے کھول کھول کر اترتے چلے جاتے ہیں۔ عین ان کے سامنے جو مکان ہے۔ اس میں گورے گورے فرنگی اور میمیں ہیں۔ ان میں ایک اس کی ہم عمر بچی بھی ہے۔ وہ گورے نیچے اترتے ہیں۔ قلی سامان اتارنے کے لیے مکان میں داخل ہو جاتے ہیں۔ ایک فرنگی آگے بڑھ اس کے باپ سے گٹ مٹ گٹ مٹ کرتا ہے۔ پھر حیران ہو جاتا ہے اور اس کے باپ کی طرف ہاتھ بڑھاتا ہے، ہاتھ ملاتا ہے۔ پھر اس کی طرف دیکھتا ہے اور اس کے باپ سے صاف اردو میں پوچھتا ہے۔

''یہ آپ کا فرزند ہے۔ بہت وجیہہ ہے۔ سکول میں پڑھتا ہے؟''

''جی نہیں! ابھی سکول میں داخل ہونے کی عمر نہیں ہوئی اس کی۔ ابھی تو صرف ساڑھے پانچ سال کی ہے۔ پھر ماں کا ایک ایک لڑکا ہے۔ اس لیے بھی۔ پانچ چھ ماہ تک داخل ہو جائے گا۔ ریورینڈ رابرٹ نے وعدہ کر لیا ہے۔''

پھر فرنگی اس کی طرف ہاتھ بڑھاتا ہے اور جمیل بے ساختہ اس کی طرف ہاتھ بڑھا دیتا ہے۔ فرنگی ہاتھ ملاتا ہے اور مزاج پوچھتا ہے۔ جمیل اتنا حیران ہے کہ اس کے منہ سے کچھ نہیں نکلتا۔ اتنے میں دوسرے فرنگی اور میمیں آ جاتی ہیں اور وہ بچی بھی۔ بچی بہت ہی خوبصورت ہے۔ جمیل کا دل چاہا کہ وہ جلدی سے ادھر جائے اور اس کو بلائے۔ اس کے چہرے پر اشتیاق کے جذبات نمایاں ہوتے ہی آہستہ آہستہ مٹنے لگتے ہیں شاید اس نے سوچا ہے کہ وہ تو فرنگیوں کی زبان نہیں جانتا۔

جس فرنگی نے اس سے ہاتھ ملایا تھا وہ دوسرے فرنگیوں سے کچھ گٹ مٹ کرتا ہے اور

وہ سب اس کے باپ سے ہاتھ ملاتے ہیں۔ پھر میموں سے ایک ایک کر کے باتیں کرتا ہے اور اس کا باپ سر اور کمر کو جھکا ان میموں سے ان کی گٹ مٹ میں جواب دیتا ہے۔ میمیں مسکراتی ہیں۔ ننھی بچی کو اس کی طرف متوجہ کرتی ہیں۔ اس کا باپ اس کو گود سے اتار دیتا ہے۔ ننھی بچی اس کی طرف ہاتھ بڑھا دیتی ہے اور وہ اپنے باپ کی طرح سر اور کمر کو جھکا تا ہے۔ وہ سب ہنستے ہیں۔ وہ حیرانی سے باپ کی طرف دیکھتا ہے جیسے کہہ رہا ہو کہ یہی کچھ آپ نے کیا تھا۔ اس کے باپ سے کچھ کہتے ہیں۔ اس کے والد کے چہرے پر لمحے بھر کے لیے نرمی دوڑ جاتی ہے اور وہ ہنستے ہنستے سنجیدہ ہو جاتے ہیں اور کہتے ہیں، ''ہاتھ ملاؤ بیٹا۔'' وہ جھجکتے ہوئے ہاتھ ملاتا ہے تو وہ لڑکی مسکراتی ہے اور پھر کھلکھلا کر ہنس دیتی ہے۔ اور اس کے شانے پر ہاتھ رکھ دیتی ہے اور اس سے کچھ کہتی ہے۔ اس کی سمجھ میں نہیں آتی یہ گٹ مٹ۔ وہ حیران ہو جاتا ہے۔ اس کا باپ اس سے کہتا ہے کہ نام پوچھتی ہے تمہارا۔ وہ بتاتا ہے کہ اس کا نام جمیل ہے۔ اس کا باپ بھی گٹ مٹ میں اس کا نام لڑکی کو بتاتا ہے۔ لڑکی نام دہراتی ہے جیسے کسی مزیدار سی چیز کو زبان پر کھلا رہی ہو۔ اس کے سنہرے بال، نیلی شفاف مگر گہری آنکھیں، گلابی گلابی سا رنگ اور اس کے فرنگی کپڑے جمیل کے دل میں اتر جاتے ہیں وہ بڑی سی لگتی ہے۔

اتنے میں ایک میم نے بچی کو گڑیا دے کر اس سے کچھ کہا۔ بچی نے گڑیا کو اس کی طرف بڑھا دیا۔ وہ حیران ہو گیا کہ کرے تو کیا کرے۔ جس فرنگی نے اس سے ہاتھ ملایا تھا اس نے اس سے اردو میں کہا ''بچی گڑیا تحفہ دے رہی ہے آپ کو۔ آپ لے لیں۔'' اس نے ہاتھ بڑھا کر گڑیا لے لی اور گردن اور کمر جھکائی اور اس کے منہ سے آپ ہی آپ ''شکریہ'' کا لفظ نکل گیا۔ سب لوگ ہنسنے لگے پھر اس کے باپ نے اس سے کہا کہ بچی کو دادی اماں اور امی جان سے ملا لاؤ۔'' وہ بچی کا ہاتھ پکڑ کر دادی اماں اور امی کے پاس لے گیا۔ وہ دونوں بچی کو دیکھ پہلے تو سکتے میں آ جاتی ہیں پھر اپنے آپ کو سنبھالتی ہیں اور بنچ پر بیٹھ جاتی ہیں۔ بچی اس کی ماں کی طرف ہاتھ بڑھاتی ہے اور اس کی ماں بھی ہاتھ بڑھا کر اس کو آہستہ سے اپنی طرف کھینچ لیتی ہے اور اس کے ہاتھ کو آہستہ سے چومتی ہے۔ بچی بھی ان کی گود کی طرف

بڑھ آتی ہے۔ اوران کی گود میں جاگتی ہوئی بچی کو غور سے دیکھتی ہے اور فرنگی زبان میں کچھ کہتی ہے۔ اس کی ننھی بہن کو پیار کرتی ہے اور اس کی ماں کی طرف منہ اٹھا کر کچھ کہتی ہے۔ اس کی ماں سر سے ہاں کہتی ہیں اور وہ جھک کر اس کی بہن کا منہ چوم لیتی ہے۔ پھر جو دادی اماں کی طرف متوجہ ہوتی ہے۔ ان کے چہرے پر غصے کے آثار ہیں۔ بچی ان کی طرف جھک کر فراک پھیلا کر آداب بجالاتی ہے تو دادی اماں کا چہرہ کھل جاتا ہے اور وہ مسکراتی ہیں اور اس کے سر پر ہاتھ کر دعا دیتی ہیں۔ جمیل مسکراتا ہے۔ پھر اس کی ماں سے کہتی ہیں کہ بچی کو کچھ دینا چاہیے۔ اس کی ماں اس کی بہن کے گلے سے اتار کر سونے کی زنجیر بچی کے گلے میں پہنا دیتی ہے۔ وہ بچی بہت خوش ہوتی ہے اور آداب بجالاتی ہے اور کچھ گٹ مٹ کرتی ہے اور اٹک اٹک کر اور تتلا کر ''شکریہ'' کا لفظ ادا کرتی ہے۔ اس پر دادی اماں اور اس کی ماں دونوں ہنستے ہیں۔ اس کی دادی اماں بچی کو اٹھا کر گود میں بٹھا لیتی ہیں اور اس کا ماتھا چومتی ہیں۔ پھر وہ بچی ان کی گود سے آپ ہی آپ آہستہ سے اتر آتی ہے، آداب بجالاتی اور جمیل کا ہاتھ پکڑ کر واپس چلی آتی ہے۔ فرنگی مرد اور عورتیں ان دونوں کو آتے ہوئے دیکھتے ہیں اور ہنستے ہیں۔ ایک میم بچی کے گلے میں سونے کی زنجیر دیکھ کر کچھ کہتی ہے اور اس کا باپ اس سے کچھ گٹ مٹ کرتا ہے۔ پھر وہ میم اور دوسری میمیں اس کے والد کے ساتھ اس کی ماں اور دادی اماں کے پاس جاتے ہیں۔ وہ ان کا تعارف کراتے ہیں اور ان کی ماں اور اس کی دادی اماں ماتھے پر ہاتھ رکھ کر ان کو سلام کرتی ہیں۔ میمیں ان کی طرف ہاتھ بڑھاتی ہیں اور وہ ہاتھ ملاتی ہیں۔ پھر سب میمیں باری باری اس کی بہن کو دیکھتی ہیں۔ اتنے میں گھنٹا بجنے کی آواز آتی ہے اور وہ سب واپس لوٹ آتے ہیں۔ اس کا باپ اس کو گود میں اٹھا لیتا ہے اور وہ فرنگیوں سے ہاتھ ملاتے ہیں اور وہ رخصت ہو جاتے ہیں۔ پھر وہ اس روشن مکان میں چڑھتے ہیں۔ اس کی دادی اس مکان کی دیواروں کو ہاتھ لگا کر دیکھتی ہیں اور اس کی ماں سے کہتی ہیں ''لکڑی اور لوہے سے بنائی گئی ہیں یہ گاڑیاں۔ فرنگی کیا کیا کرشمے دکھاتا ہے۔ یہ فرنگنیں تو واقعی خوبصورت تھیں۔ بچی بھی بہت پیاری تھی۔ مگر ہمارے جمیل سے خوبصورت نہ تھی۔''

جمیل ایک دم بول اٹھتا ہے ''نہیں، دادی اماں یہ تو بہت ہی خوبصورت تھی۔ بالکل امی کی طرح تھی۔'' اس کا باپ اس کی ماں کی طرف دیکھتا ہے اور مسکراتا ہے۔ اس کی ماں شرما جاتی ہے اور نظریں جھکا لیتی ہیں۔ اس کی دادی چہرے پر ناراضی طاری کر کے جمیل کو کان سے پکڑ لیتی ہیں اور کہتی ہیں۔ ''ابھی سے فرنگیوں کی طرف داری۔ فرنگن بچی نے موہ لیا میرے بیٹے کا دل۔'' پھر ہنستی ہیں اور اس کے باپ سے مخاطب ہو کر کہتی ہیں ''مجھے تو اب اور ہی وسوسہ ہو چلا ہے۔ اگر سب ہی فرنگی ایسے ہی چالاک ہوتے ہیں تو تمہیں بھی موہ نہ لیں۔ اور کوئی فرنگن تمہارا ابھی تمہارے بیٹے کی طرح دل نہ موہ لے۔''

''نہیں اماں ایسا کیسے ہوسکتا ہے۔ فرنگنیں لاکھ حسین سہی اور بقول آپ کے لاکھ چالاک سہی مگر ہماری خدیجہ کی گرد کو بھی نہیں پہنچ سکتیں۔'' اس کی ماں شرما جاتی ہے اور برقعے کے پلو میں منہ چھپا لیتی ہے۔ اتنے میں ایک بار پھر گھنٹا بجنے کی آواز سنائی دیتی ہے۔ اس کا باپ ان سے کہتا ہے کہ گاڑی اب چلنے والی ہے اس لیے اب انہیں گاڑی سے اتر جانا چاہیے۔ اس کی دادی اماں اس کے باپ سے بغل گیر ہوتی ہیں اور اس کا باپ دادی اماں کی کمر سے ہاتھ اٹھا کر اس کی ماں کے کندھے کو پکڑ کر تھپکتا ہے۔ اس کی ماں اس کے باپ کو حسرت سے دیکھتی ہے اور اس کی آنکھوں میں آنسو جھلملانے لگتے ہیں اور دونوں ہونٹوں کو جلدی سے سختی سے بھینچ لیتی ہے۔ اس کی دادی اماں اس کے باپ کی کمر سے دونوں بانہوں کو نکال لیتی ہیں۔ اور پھر اس کو شانوں سے پکڑ کر ان کے چہرے کو بڑی حسرت سے دیکھتی ہیں۔ دونوں ہاتھ اٹھا لیتی ہیں۔ برقعے کے اندر ہاتھ ڈال کر سبز رنگ کے لمبے سے ٹکڑے کو نکالتی ہیں اس میں کچھ سیّا ہوا ہے۔ اس کا باپ اپنا لمبا کوٹ اتار دیتا ہے اس کی دادی اماں اس کے باپ کے دائیں بازو کی قمیص کا کف کھول کر بازو اوپر چڑھا دیتی ہیں اور پھر وہ سبز ٹکڑا اس کے باپ کے بازو پر باندھ دیتی ہیں اور قمیص کا بازو کھول کر سبز ٹکڑے کو چھپا دیتی ہیں۔ اس کا باپ کوٹ پہن لیتا ہے اور ایک دم سنجیدہ ہو جاتا ہے۔ پھر دادی اماں اور اس کی ماں سے کہتا ہے ''میں نے اپنے احباب کو اسٹیشن پر آنے سے منع کر دیا تھا اور رشتہ داروں سے کل ہی مل آیا تھا تاکہ ہم آپ آخری وقت تک ساتھ رہیں...... چھ ماہ بعد جمیل کو بھائی

شمس الدین کے ساتھ پادری رابرٹ کے سکول بھیج دیں۔ انہوں نے مجھ سے وعدہ کرلیا ہے وہ جمیل کو سکول میں داخل کرلیں گے میں یہی چاہتا ہوں کہ جن استادوں سے میں نے تعلیم پائی ان سے یہ بھی پڑھے۔ انگلستان پہنچ کر میں اپنے حالات اور پتے سے آگاہ کروں گا۔ یہاں کے حالات سے آگاہ رکھیں۔''

پھر بچی کو گود میں لے کر پیار کیا۔ اس کا منہ چوما اور پھر اس کو واپس ماں کی گود میں دے دیا۔ پھر جمیل کو گود میں اٹھا کر پیار کیا اس کا منہ چوما اور اس سے کہا ''دادی اماں اور ماں کا ہمیشہ حکم بجالانا۔ سکول جانے میں کوتاہی نہ کرنا۔ اب گھر میں تم ہی مرد ہو۔ بہن کا، ماں کا اور دادی اماں کا خیال رکھنا۔ ان کو کسی قسم کی تکلیف نہ ہو۔ واپس آ کر سب حساب لوں گا۔ سمجھ لیا۔'' جمیل سر ہلاتا ہے۔ باپ اس کو گود سے اتار دیتا ہے۔ پھر اس کا باپ گاڑی سے اتر جاتا ہے۔ دادی اماں کو ہاتھ پکڑ کر گاڑی سے اتارتا ہے، اس کی ماں کی گود سے بچی کو لے کر دادی اماں کے سپرد کرتا ہے، پھر اس کی ماں کا ہاتھ پکڑ کر اس کو گاڑی سے اتارتا ہے۔ آخر جمیل کو گود میں لے کر فرش پر کھڑا کر دیتا ہے۔

''اماں جان...... وہ سامنے جو دائیں کو پہلا موڑ ہے اس کے مڑتے ہی سامنے اپنی گاڑی نظر آئے گی۔ اب آپ تشریف لے جائیں۔ جب آپ موڑ مڑ جائیں گی میں تب گاڑی میں چڑھوں گا۔ تیسری گھنٹی ہونے ہی والی ہے۔''

وہ سب روانہ ہوجاتے ہیں۔ جمیل بار بار مڑ مڑ کر دیکھتا جاتا ہے۔ وہ سب واپس ڈیوڑھی میں پہنچ کر گاڑی میں سوار ہوجاتے ہیں اور گاڑی گھر کو روانہ ہوجاتی ہے۔ جمیل کھڑکی کے پاس بیٹھ جاتا ہے اور بار بار کھڑکی سے باہر دیکھتا ہے۔ ہر شے اداس اداس ہے۔ گاڑی کی دیوار کے ساتھ لگے ہوئے چراغ کی روشنی، دور تک پھیلے ہوئے کھیتوں میں بچھی ہوئی چاندنی، کھیتوں میں مٹی کے گھروں کے جھنڈ، ان میں جلتے ہوئے چراغوں کی روشنی، ٹھٹکے ہوئے راہیوں کے آہستہ آہستہ اٹھتے ہوئے قدموں سے جنم پانے والی چال، آدھے روشن اور آدھے ماند چاند کی صورت سے اداسی ہی اداسی ٹپک رہی ہے۔ گاڑی کے رنگ میں، گاڑی کے اندر جھولتی ہوئی لالٹین کی بجھی بجھی سی، ننھی سی روشنی میں اس کی دادی

اماں اور اس کی ماں کے تھکے ہوئے، نڈھال جسموں میں، آہستہ رواں گھوڑوں کی ٹاپوں کے مسلسل نغمے میں اتھاہ اداسی رچی ہوئی ہے۔ گھر آ ہی نہیں چکتا۔ جمیل گھبرا جاتا ہے اور کھڑکی سے منہ نکال کر کوچوان کو آواز دیتا ہے۔ ''شمبو! آج گھر آ کیوں نہیں چکتا'' اس کو اپنی آواز کی رندھی ہوئی کیفیت حیران کرتی ہے۔

''ننھے مالک! آج گھر بہت دور ہو گیا۔ گھوڑے بھی آج آہستہ دوڑ رہے ہیں۔ ان کے جسم میں بھی ہماری طرح آج جان نہیں ہے۔''

اس کی آواز میں آج پہلی بار اتنی گہرائی، اتنے جذبات تھے مگر وہ ان کے اظہار پر بند مارتے مارتے شاید تھک گیا تھا۔ منظروں کی اڑان میں بھی ایک واضح اداسی ہے۔ نہایت آہستہ چل رہے ہیں، آگے جاتے ہوئے ایک لمحے کیلئے رکتے ہیں، حسرت کی نگاہ سے دیکھتے ہیں، جیسے کہہ رہے ہوں کہ ہم چلے، پھر نہ جانے کب ملیں گے۔ دور آفاق سے کالک برس رہی ہے۔ پھر آبادی کے مکان آہستہ آہستہ نظر آنے لگتے ہیں۔ ان گھروں کی روشنیاں اداس نہیں ہیں۔ وہ بس روشنیاں ہیں۔ دور کہیں سے ڈھولک اور اس کے ساتھ گانے کی آواز آ رہی ہے۔ اس گانے میں اداسی نام کو نہیں۔ خوشی کی ایک لے کہ بس آسمان کی طرف بلند ہو رہی ہے۔ جمیل بہت دیر تک اس لے کا تعاقب کرتا رہا، لے برابر آسمان میں بلند ہوتی جا رہی تھی۔ لے کے سروں میں سب کچھ گم ہو گیا ہے۔

اب صرف لے تھی، سر تھے، سر کی چھایا تھی۔ اس چھایا کے روپ میں جمیل صاحب کا سارا ماضی غلطاں تھا، عدم سے وجود میں آنے کو تڑپ رہا تھا۔ وہ لے ایک اور ہی لے میں، بہت ہی گھمبیر، بارعب، مگر نہیں دل میں اتر جانے والی لے میں گم ہو گئی۔ دور سے آتی ہوئی بارات کے باجے تھے۔ اس سنگیت کے ساتھ ساتھ کبھی کبھی پٹاخوں کی آوازیں آتی تھیں اور پھر آسمان میں آتش بازی چھوٹنے لگی اور اس کے رنگین جال فضا میں تن گئے۔ گاڑی آہستہ آہستہ چل رہی تھی اور نغمہ آہستہ آہستہ ان کی طرف بڑھ رہا تھا۔ اس نغمے کی یاد نے جمیل صاحب کے بدن میں انگڑائی لی اور جوان ہو گیا۔ صدیاں ہی بیت گئی ہوں گی اس نغمے کو سنے، نہیں ایسا کیسے ہو سکتا ہے۔ وہ بچے تھے تب پانچ چھ سال کے۔ زندگی کے اتنے کٹھن سفر

میں کبھی بھی یہ نغمہ ان کا دستگیر نہ ہوا تھا۔ اگر دستگیر ہوا ہوتا تو شاید ان کی مصیبتیں ان پر اس طرح نہ ٹوٹ پڑتیں کہ وہ ہوش و حواس ہی کھو بیٹھتے۔ بہت ہی عجیب تھا وہ بارات کا منظر۔ سڑک ویران تھی۔ سڑک پر کافی کافی فاصلے پر شیشے کے دڑبوں میں تیل کے دیئے جل تو رہے تھے مگر ان کی روشنی چند قدموں کے بعد اندھیرے میں راستہ بھول جاتی تھی۔ دور سے کچھ لوگوں کے سروں پر گیس جگمگا رہے تھے اور ان کی روشنی میں عجیب عجیب قطع کے پیتل کے پیلے پیلے ساز چمک رہے تھے۔ اور ان کے پیچھے اندھیرے میں دھندلی دھندلی صورتیں اور ان کے پیچھے گھوڑے پر دولہا۔ گیس اٹھائے ہوئے مزدور ان کی گاڑی کے سامنے آئے تو گاڑی رک گئی۔ باجے والے بڑی آہستہ آہستہ چل رہے تھے۔ ان کے منہ ان سازوں میں جھکے ہوئے تھے جو ان کی گردنوں میں حمائل تھے۔ ان کے آگے آگے ایک آدمی اپنے منہ میں ایک لمبی سی نالی جو بانسری سی لگتی تھی، لگائے آسمان کی طرح منہ اٹھائے جا رہا تھا۔ اس کی بانسری میں سے ایک عجیب دلدوز نغمہ آسمان کی طرف بلند ہو رہا تھا مگر وہ نغمہ آسمان کی طرف جانے سے انکاری معلوم ہوتا تھا۔ اور وہ نغمہ وہیں زمین پر لوٹنے پر مُصر تھا، کہہ رہا تھا وہ دلہن کو لیے جا رہے ہیں، دور، بہت دور، ماں باپ سے دور، بہن بھائیوں سے دور، سکھی سہیلیوں سے دور۔ مجھے روکو، میرے پاؤں میں زنجیر پڑے ہیں، منہ پر تالا لگا ہے۔ میری آنکھوں سے آنسو بہہ رہے ہیں۔ میں رکنا بھی چاہوں تو رک نہیں سکتی۔ میں ہوں مجبور۔ میرا دل رو رہا ہے۔ میرا ذہن اور تخیل اڑے جا رہے ہیں۔ دور بہت دور، اجنبی دولہا کے گھر، اس کی گلیوں میں، اس کے گھر کی سیڑھیوں میں، اس کے گھر کے کمروں میں جھانکتے ہیں، کچھ ڈھونڈتے ہیں۔ کیا ڈھونڈتے ہیں؟ پھولوں سے لدی سیج کو ڈھونڈتے ہیں۔ میرا دل رو رہا ہے۔ میری نہیں مانتے یہ ذہن، یہ تخیل، کتنے بے درد ہیں، کتنے ظالم، کتنے بے شرم ہیں، یہ غدار ذہن، یہ غدار تخیل۔ کوئی ان سے کہے کہ یہ میرے دل کے آس پاس رہیں، اس کو سہارا دیں۔ مگر یہ ظالم رکتے ہی نہیں، اڑے ہی جاتے ہیں۔ پھولوں سے لدی سیج کے گیت سناتے ہیں، مجھے رجھاتے ہیں، لبھاتے ہیں، ستاتے ہیں، مجھے روکو، میں ہوں مجبور، سکھیوں سے دور، میرا انگ انگ ہے چور، دکھ درد سے یا آنے والی خوشیوں کے خیال سے۔ میں کچھ فیصلہ نہیں کر پا رہی مجھے بتاؤ کوئی۔ میں کس کی سنوں؟ روتے دل کی؟ یا ہنستے

ذہن کی؟ یا گیت گاتے تخیل کی؟ میری ایک جان اور اس کے اتنے مشیر جو مجھے ماضی کی یادوں کو بھلانے پر اکساتے ہیں اور مستقبل کی سیج پر ستانے کی سجھاتے ہیں۔ان غداروں نے میرے انگ انگ کو باغی کر دیا ہے۔اب میرا کوئی نہیں۔سب بیری بالم کے ہو رہے ہیں۔ہائے میں کیا کروں۔ہائے کوئی تو مجھے روکے۔مجھے لے چلے لوگ غیر کے گھر، جہاں ہر کوئی مجھے گھورے گا۔ جہاں رنگ رنگ کی، ڈھنگ ڈھنگ کی، ہر عمر کی عورت مجھے تولے گی، جیسے قصائی ذبح کے لیے جانوروں کو نظروں سے تولتا ہے۔ وہ میرے نین نقشے میں نقص ڈھونڈیں گی۔ میری ساس اور میری نندیں مجھے اپنے نرغے لیے لوگوں سے منہ دکھاوے کے روپے وصول کریں گی۔اور پھر جب دولہا کو میرے سامنے لا بٹھائیں گے اور میرے اور اس کے درمیان آئینہ رکھ دیں گے تو میں کیسے اس آئینے میں دیکھ سکوں گی۔ہائے پھر کیا ہوگا۔بچپن اور کنوارپن خواب ہو جائے گا۔نہ اپنی نیند ہوگی اور نہ اپنی سیج۔ہر شے میں کوئی اور، کوئی غیر شریک ہوگا۔نہ جانے کیسا ہوگا۔کہتے سنا ہے میں نے سہیلیوں سے کہ سجیلا ہے میرا دولہا۔مگر میں تو مر جاؤں گی دولہا کے لمس سے، اس کے گرم سانس کی حدت سے۔ اس کے بعد نیا جنم ملے نہ ملے۔ہائے! ہائے۔کوئی روکو رے مجھے۔

سیاہ پتلی سی نلی کُوکتی رہی اور بارات آہستہ آہستہ نظروں سے اوجھل ہوگئی مگر نلی کی کوک جسم و جاں میں رچ گئی۔سب یادیں نلی کی کوک میں ڈھل گئیں، اداسی مٹ گئی اور اس کی جگہ ایک اتھاہ احساس نے لے لی کہ ہر حسین شے کے لیے چند لمحے کی زندگی ہے جو نغمے کی کوک ہے اور بس۔ نغمے کے بہاؤ میں سب یادیں، سب صورتیں بہہ گئیں۔گاڑی ایک بار پھر چل دی۔گھوڑوں کی ٹاپوں نے نغمے کا سینہ چیر دیا اور نغمہ کراہنے لگا، سسکنے لگا، نغمے نے آخر دم توڑ دیا۔ٹاپوں کی آواز، پہیوں کی گھڑ گھڑ تھی اور آشنا مکانوں، سڑکوں، گلیوں کی صورتیں نظروں کے سامنے سے گزرنے لگیں۔جمیل نے منہ گاڑی کے اندر کر لیا۔اس کی دادی اماں اور امی کے چہروں پر عجیب والہانہ کیفیت تھی۔ وہ نہ جانے کن مرغزاروں، گلزاروں میں سیر کناں ہوگئی تھیں۔ان کے چہروں پر، جمیل صاحب کو واضح طور پر، محسوس طور پر، یاد آ رہا تھا کہ ایسا حسن، ایسا اطمینان شاید ہی پھر کبھی نظر آیا ہو۔ وہ اپنا عزیز ترین

سرمایہ فرنگی اجنبیوں کے سپرد کر کے بھی مطمئن تھیں مگر ان کے ننھے سے دل میں اس ننھی سی فرنگن کی تصویر سی اتر گئی تھی جس کی روشنی میں زندگی کی ہر شے کبھی اچھی اور کبھی کریہہ نظر آتی تھی۔ زندگی کے اس لمحے تک اس کی روشنی گئی جب انہوں نے پہلی بار صالحہ کو اس احساس سے دیکھا کہ وہ اب بچی نہیں جوان لڑکی ہے جس کے جسم کی جنت آفریں قوسوں میں جہنم کی آگ روشن ہے۔ پھر اس روشنی کے گرداگرد اندھیرا ہی اندھیرا تھا اور ان کا ماضی اور مستقبل اس اندھیرے میں سرگرداں ہو گئے۔

اس ننھی فرنگن کے حسین چہرے، شفاف نیلی، گہری، بہت گہری آنکھوں والے چہرے اور آسمان کی طرف بلند کئے جاتے مگر زمین پر لوٹنے پر مصر نغمے اور حسین صالحہ کے جسم کے الاؤ اور اس کی نرم نرم، کبھی تمسخر آمیز، کبھی جرأت آزما، کبھی استہزا انگیز، ہنسی کی درمیانی وسعتوں میں کیا تھا۔ ان کو باوجود کوشش کے بھی یاد نہ آ رہا تھا یا شاید ان کی یادداشت فضائے یاد میں اپنے چھپے ہوئے خزانوں کو ابھی وا کرنے کے لیے تیار نہ تھی۔ اور شاید وہ خود بھی اس سفر دروں سے تھک گئے تھے۔ انہوں نے اتنا طویل سفرِ دروں شاید ہی کبھی کیا تھا۔ جب وہ جوان تھے تب ان کے اندر کا جہاں اتنا آباد نہ تھا، اتنا وسیع نہ تھا۔ اس جہاں میں سورج تھی تو صالحہ، چاند تھی تو صالحہ، دھوپ تھی تو صالحہ، چاندنی تھی تو صالحہ، رات کی وسیع و عریض مملکت میں ہر ستارے، ہر کہکشاں سے صورت نظر آتی تھی تو صالحہ کی، رات کے اتھاہ اندھیروں کی سائیں سائیں میں کسی کے تنفس کی لے سنائی دیتی تو صالحہ کی، چاندنی راتوں کے پچھلے پہروں میں ہوا کی سرسراہٹیں گیت میں ڈھلتیں تو ان گیتوں کے زیر و بم کی تمام وسعتوں، پہنائیوں، گہرائیوں میں صالحہ ہی کی آواز کا رچاؤ ہوتا، گرمیوں کی خاموش، اداس دوپہروں کی سنسناہٹوں میں صالحہ کی سرگوشی کرتی ہوئی آواز کے سوا کچھ سنائی نہ دیتا تھا، اگر کبھی سنائی دیتا تو یہی کہ صالحہ کہیں دور سے آ رہی ہے اور اس کے خرام سے پیدا ہونیوالی لے ہر دوسری آواز پر چھا گئی ہے اور وہ ہر دم قریب آتی ہوئی خرام ناز کی آواز بالکل ہی قریب نہیں آ چکتی اور آ چکنے کے بعد نہیں رکتی، بس قریب اور قریب تر آتی ہوئی ہی معلوم ہوتی، نس نس میں رچنے لگتی، رچ جاتی اور جمیل صاحب کو اپنا جسم اس آواز میں گھلتا ہوا محسوس

ہوتا، یا کبھی کبھی اس خرام ناز کی آواز لپکتی آگ کی طرح محسوس ہوتی اور اس آگ میں ان کو اپنا جسم ایندھن کی طرح جلتا ہوا محسوس ہوتا اور اس آگ میں نہ جانے کتنی ہی بار وہ بھسم ہو کر جی جی اٹھتے تھے۔

آج وہ بار بار تخیل کو حکم دیتے تھے، پیار سے کہتے تھے، منت سماجت سے کہتے تھے کہ وہ صورتوں کے طلسم کی سیاحی کو ایک بار پھر سے لے چلے مگر تخیل ان کی بات کو خاطر میں ہی نہ لاتا تھا۔ شاید اس کو اپنی زندگی خطرے میں نظر آتی تھی یا شاید تخیل ان کے حواس کی خستگی کو آزمانے کے لیے تیار نہ تھا۔

اس ادھیڑ بن میں جمیل صاحب کے جسم میں ایک شدید کپکپی کی کیفیت طاری ہونے لگی۔ ان کے حواس ایک دم سردی کے احساس سے بیدار ہو گئے، سردی کے مقابلے کے لیے تن گئے۔ ان کے ذہن نے خارجی جہان کی طرف نظر پھیر لی۔ ان کے سامنے دور تک پھیلی پھیلی دھوپ بلندیوں کی طرف چڑھ رہی تھی۔ محل کی بلوریں دیواریں گلنار بنی تھیں۔ اس گلنار رنگ نے انہیں یاد دلایا کہ وہ کہاں تھے اور کیوں تھے۔ انہوں نے اردگرد نظر دوڑائی۔ سامنے کا بڑا سا پتھر ان کو حیرانی سے تک رہا تھا۔ معاً ان کے اندر خیال کوندا گیا کہ متین صاحب کہاں چلے گئے؟ مشرق اور شمال کی وسعتوں نے لاعلمی کا اظہار کیا۔ وہ اپنی نشست میں مڑے۔ جنوب کی طرف ان کی نشست سے چالیس پچاس گز کے فاصلے پر ایک صورت کمر پر ہاتھ باندھے جنوب مغرب کی طرف منہ کئے ساکت کھڑی نظر آئی۔ اس صورت کے کھڑے ہونے کے انداز سے انہماک کے علاوہ ایک اتھاہ اعتماد کا احساس ہوتا۔ ان کے دل میں تجسس پیدا ہوا کہ یہ اجنبی صورت کون ہے اور ڈوبتے سورج کی روشنی میں کیا دیکھ رہی ہے۔ وہ اٹھے اور صورت کی طرف چل دیئے۔ ان کے قدموں سے ایک صدا اٹھی، وہ رکے، قدموں کی طرف نظر کی۔ دور تک بجری کے ننھے ننھے پتھر اپنی انفرادیت کا اعلان کرتے نظر آتے تھے۔ انہوں نے اپنی رفتار آہستہ کر لی اور پھونک پھونک کر قدم رکھتے ہوئے وہ صورت کی طرف بڑھتے چلے گئے۔ قریب پہنچ کر ان کو وہ صورت آشنا سی معلوم ہوئی۔ معاً انہیں یاد آیا کہ وہ تو متین صاحب تھے۔ اس خیال کے آتے ہی وہ رک گئے اور

انہوں نے ساکت صورت کی نظر کے رخ کی طرف نظر اٹھائی۔ ان کی نظر کے بالکل سامنے شمال اور مغرب سے آنے والے دریا آپس میں مل رہے اور ان کے ملاپ میں ایک گرمجوشی تھی۔ اس سنگم کو دیکھ کر انہوں نے سوچا یہ دریا نہ جانے کن منابع سے پیدا ہوئے، کن راہوں سے ہوتے، کن مرحلوں کو طے کرتے ہوئے، اس مقام پر ایک دوسرے سے ملنے پر مجبور ہیں، ان پر مقدر تھا کہ مشکل ترین منزلیں تنہا تنہا طے کرتے اور پھر جب انسانی آبادی کے قریب آئیں تو اجنبی پانیوں کو اپنا ساتھی، اپنی جان بنا کر آگے بڑھیں۔ انسان کا بھی یہی مقدر ہے۔ جہاں جنم پائیں اس مقام کو، اگر جسمانی طور نہ سہی روحانی طور، چھوڑیں، ماں باپ، بہن بھائی، خون کے سب رشتوں کو چھوڑ کر اجنبی لوگوں سے رابطہ بڑھائیں اور پھر ان کے تعاون، ان کے تقابل یا تخالف سے زندگی کی وسیع منزلوں کو طے کریں۔ خود ہر ایک انسان کی زندگی ان دو دریاؤں کی طرح ہے: جو تھا اور جو ہوگا، وہ دونوں منزلیں طے کرتے حال کی طرف بڑھتے ہیں، حال میں ان کا ملاپ ہوتا ہے اور اس ملاپ سے نئے نئے دکھ اور سکھ جنم لیتے ہیں اور یہ دکھ سکھ، یہ ماضی، مستقبل اور حال ایک عدم میں جا مدغم ہوتے ہیں، جو ان کا آغاز بھی ہے اور انجام بھی۔ بالکل اسی طرح جس طرح دونوں دریا سمندر میں جا گریں گے۔

وہ کبھی ساکت صورت کو دیکھتے، کبھی شمال سے آنے والے دریا کے شفاف پانیوں کو، کبھی مغرب سے آنیوالے دریا کے گدلے گدلے سے پانیوں کو، پھر ان دونوں پانیوں کے ملاپ سے پیدا ہونیوالے بھورے بھورے پانیوں کو جن کی سفید بلوریں جھاگ میں ڈوبتے سورج کی کرنیں قوس قزح کے رنگ نکھار رہی تھیں۔

قوس قزح کے رنگوں سے پیدا ہونے والے تاثرات کو وہ ابھی لفظوں میں ڈھالنے کی کوشش کر ہی رہے تھے کہ متین بڑے اطمینان سے مڑے اور ان کی طرف متوجہ ہو کر کہنے لگے:

''ان دو دریاؤں کو دیکھئے! دونوں کے بہنے کی رفتار الگ الگ، دونوں کے پانیوں کے رنگ الگ ہیں، دونوں کے ذائقے الگ ہیں (میں نے دونوں دریاؤں کا پانی پیا ہے)

مگر اس مقام پر دونوں مل کر بہنے پر مجبور ہیں اور ان کے ملاپ سے ایک تیسرے رنگ، تیسرے ذائقے، تیسری رفتار نے جنم لیا ہے اور ان دونوں نے ایک نئی ہی سمت بہنا شروع کیا ہے۔ میری اور آپ کی طرح۔ مگر ہم انسان ہیں، دریا نہیں ہیں۔ ہم اجنبی تھے، اب ملے ہیں، کون جانے پھر ملیں نہ ملیں، مل کے مستقبل کی زندگی گزاریں، نہ گزاریں۔ مگر ہمارا ملنا، مل کر کچھ عرصہ ساتھ چلنا ہم دونوں کی زندگیوں پر ایک ایسا گہرا اثر چھوڑے گا کہ ہماری زندگیوں کی رفتار، سمت، ان کا رنگ، بالکل وہ نہ ہوگا جو کہ اس صورت ہوتا جب میری آپ کی ملاقات ہی نہ ہوتی۔ اب اس ملاقات سے اور ان حالات کے پس منظر میں جس میں آپ کا، آپ کی بیوی کا ماضی، فردوس کی ماں کی زندگی، ایک ہی تناظر میں بندھے نظر آتے ہیں اور جس میں آپ کا، آپ کی بیوی کا، فردوس کا، تقی کا، اور میرا حال ایک دوسرے تناظر میں بندھے نظر آتے ہیں اور یہ قیاس کرنا عین ممکن ہے کہ ہم سب کا ماضی اور حال ہم سب کے مستقبل کے دھاروں کو اس طرح سمت بدلنے پر مجبور کرے گا جس کا ہم کبھی تصور بھی نہ کر سکتے تھے، جس کے تصور کرنے کا خیال بھی ہمیں نہ آ سکتا تھا۔ اس آنے والے مستقبل کی روشنی میں ہمارے ماضی کی ایک ایک یاد، ایک ایک تصویر، ایک ایک رشتہ نئے نئے رشتوں میں منسلک ہوگا، ان رشتوں سے ترکیب پانے والی مختلف النوع صورتوں کی ہیئت بدلے گی اور ان صورتوں سے جنم پائے ہوئے احساسات و جذبات کی کیفیات نئے روپ اختیار کریں گی، دکھ سکھ میں اور سکھ دکھ میں، فخر شرم میں اور شرم فخر میں بدلے گی۔

اور اگر ہم نے اپنے ماضی اور مستقبل کو الگ الگ دائروں میں بند رکھنے کی کوشش کی اور ان کو کسی سنگم پر ملنے اور مل کر ساتھ بہنے سے باز رکھنے کی کوشش کی تو ایسا جہاں ہمارے اندر جنم لے گا یا ہم ایک ایسے جہاں میں جذب ہو جائیں گے جو روشنی سے، احساس سے، جذبہ و خیال سے، یاد اور ارادے سے یکسر محروم ہوگا، بالکل اس جہاں کی طرح جس میں آپ برسوں رہے ہیں۔ ایک تاریک اور گنگ اور ساکت جہاں۔

خیال کی گرمی بھی فضا کی ہر دم بڑھتی ٹھنڈک کے احساس کو مٹانے یا محو کرنے میں ناکام ہو رہی تھی۔ دونوں نے افق کی گہرائیوں میں ڈوبتے ہوئے زخمی اور مضمحل اور خون

آلودسورج کو،لہو کی طرح سرخ مغرب کو اور اس سرخی کی روشنی میں رنگ بدلتے ہوئے بلند درختوں، کھڑی فصلوں، گھروں کو جاتے ہوئے جانوروں، لوگوں، بہتے دریاؤں کے رنگین پانیوں پر ایک آخری نظر ڈالی اور دھنش محل کی بلندیوں کی طرف چل دیئے۔

دھنش محل کی بلوریں مغربی دیوار ابھی تک گلنار تھی۔ مگر لمحہ بہ لمحہ اس کا گلنار رنگ نئے نئے رنگوں میں تحلیل ہو رہا تھا۔ اور اس سے پرے اندھیرا امڈا چلا آ رہا تھا۔ شمال اور مشرق اور جنوب کی طرف سے اندھیرے دھنش محل کی طرف بڑھ رہے تھے۔ پھر ایک دم دھنش محل کی بلوریں مغربی دیوار سیاہ ہوگئی۔ پھر اس سیاہی سے ایک شعلہ سا لپک گیا اور بلوریں دیوار روشن ہوگئی، یہ روشنی پیلی پیلی سی تھی مگر اس کی پیلاہٹ میں ایک صحت مند زندگی کا احساس ہوتا تھا۔ دھنش محل کی بلندیوں سے نیچے ہر طرف اندھیرا تھا۔ دور شمال مشرقی پہاڑوں کی چوٹیاں منور ہو رہی تھیں۔ شاید ان کے پیچھے چاند نکل آیا تھا۔

دونوں خاموشی سے تیز تیز قدم اٹھاتے ہوئے اس پہاڑی پیچانی رستے کی طرف بڑھ رہے تھے جو دھنش محل کی بلندیوں طرف لے جاتا تھا۔

چوتھا باب

رابعہ کے سینے پر سر رکھے فردوس سوگئی تھی۔ شاید بہت ہی تھک گئی تھی۔ اس کے چہرے پر گزرے ہوئے طوفان کے نشانات اگرچہ مٹ رہے تھے مگر تھے بہت واضح۔ سینے پر فردوس کا پرگداز بوجھ رابعہ کو عجیب سا حظ دے رہا تھا۔ اس حظ میں ڈوب جانے کے باوجود وہ ڈوب نہ سکی۔ اسے یاد نہ آ رہا تھا کہ اس نے پہلے بھی کبھی اس قسم کا حظ محسوس کیا تھا۔ اس کے شعور نہاں میں شاید اس حظ کا تجربہ ہو چکا تھا کیونکہ اسے بار بار محسوس ہو رہا تھا کہ وہ اس حظ کی نوعیت جان لینے پر بہت جلد قادر ہو جائے گی۔ اس کو خیال آیا شاید ایسا ہی کچھ حظ ہوگا جو جمیل صاحب نے کبھی محسوس کیا ہوگا جب وہ، ان کی بغل میں منہ دیئے، ان کے چہرے کی عیاں شہوت سے شرمسار ہونے کو محسوس کرنے کی کوشش کر رہی ہوگی۔ اس لمحے فردوس کا

پروقار، پراعتماد حسن مضبوط بانہوں کی پناہ چاہتا نظر آتا تھا۔ کاش وہ ان مضبوط مردانہ بانہوں کی مالک ہوتی، اس انہونے خیال پر رابعہ کے چہرے پر ایک ہلکی سی مسکراہٹ محسوس ہوئی۔ مگر اس خیال میں اور اس حظ کی نوعیت میں تطبیق کا احساس پیدا نہ ہوا۔ رابعہ پھر سوچنے لگی کہ آخر اس حظ کی نوعیت کیا تھی۔ کیا وہ یہ چاہ رہی تھی کہ جمیل صاحب یوں ہی اس کے سینے پر سر رکھے اس کے جسم کے گداز کی حدت سے محظوظ ہوں؟ اس خیال نے اسے ایک دم اداس کر دیا۔ اس کی جوانی کے تمام سال گزر چکے تھے۔ وہ اب بڑھاپے کی منزلوں کے قریب پہنچ چکی تھی اگر چہ اس کے جسم میں نو جوانوں ایسی کساوٹ اور لچک اب تک تھی مگر پچھلے پچیس سال کی زندگی میں وہ جوانی کی سب آرزوؤں، لذتوں، حدتوں، سرسراہٹوں، سنسنیوں کو فراموش کر چکی تھی، ان کو رخصت کر چکی تھی، وہ سب اب اس کے بلائے بھی نہ لوٹ سکیں گے۔ اگر وہ سب لوٹ بھی سکیں تو اس کی کوکھ تو ہری نہ ہو سکتی تھی۔ بڑھاپے میں اس کے لیے، جمیل کے لیے کسی بیٹے، بیٹی کا سہارا ممکن نہ تھا۔ کیا اسے واقعی کسی سہارے کی ضرورت تھی؟ اس نے کیا زندگی کے کٹھن سال بغیر سہارے کے نہیں گزارے تھے جبکہ جمیل صاحب کی زندگی بھی اندھیرے کی زندگی تھی اور ان کے ہر دم بڑھتے کاروبار کا بوجھ اس کے نازک کندھوں پر تھا۔ تھا تو۔ مگر اس کی ہمت اور الوالعزمی اور وفاداری کی وجہ سے اسے اپنے مزدوروں، ان کے لیڈروں، اپنے ماتحتوں کا نہ صرف تعاون ہی حاصل تھا بلکہ ان کے دل و جان سے ابھرتی ہوئی محبت میسر تھی۔ اس کے کاروباری رقیب بھی اس کو گزند پہنچانے کو گناہ سمجھتے تھے۔ اس کے مزدور اسے بہت ہی عزیز تھے، اولاد کی طرح ان کی آنکھوں میں، ان کے بدن کی ہر حرکت میں اسے اپنے لئے پیار کی گرمی کا احساس ہوتا مگر یہ گرمی سردیوں کی راتوں میں آتشدان کی آگ کی طرح تھی، ساتھ سوئے محبوب یا بچے کے جسم کی حدت کی طرح نہ تھی، ایسی حدت جو اسے اب فردوس کے جسم سے اپنے رگ وریشے میں داخل ہوتی ہوئی محسوس ہوتی تھی۔

فردوس کے جواں اور بھرپور جسم کی حدت نہ صرف اس کے رگ وریشے میں داخل ہو رہی تھی بلکہ یہ حدت اس کے رحم کی پہنائیوں اور گہرائیوں میں اتر رہی تھی۔ اس کی رانوں

میں، اس کے پیڑو میں، اس کے پیٹ میں ایک الاؤ سا روشن ہو رہا تھا۔ اس الاؤ کی گرمی اس کو بے تاب کر رہی تھی۔ یہ گرمی اپنی شدت کے باوجود قابل برداشت ہی نہ تھی، لطف انگیز بھی تھی، ایسا لطف جو اس نے پہلی بار جمیل صاحب کی آغوش میں اپنی بے باک سپردگی کے بعد محسوس کیا تھا۔ اس لطف سے جسم و جاں میں کمزوری کا احساس پیدا ہونے کی بجائے ایک طاقت کا، تفخر کا احساس جاگ رہا تھا۔ اس کا جی چاہ رہا تھا کہ وہ فردوس کے جسم کو اپنی بانہوں میں جکڑ کر بھینچ لے، اس زور سے بھینچ لے کہ فردوس کا جسم اس کے جسم کا حصہ بن جائے، وہ اس کے جسم کے اندر اس کے دل کی طرح دھڑکنے لگے۔ اس کے رحم میں روشن الاؤ کی گرمی اس کی نس نس سے باہر کی طرف نکلتی ہوئی محسوس ہو رہی تھی۔ اس کے ہاتھوں میں ایک ہلکے سے ارتعاش کی لہریں اٹھ رہی تھیں، اس کے ہاتھ کچھ کرنے کے لیے بے تاب ہو رہے تھے۔ اس الاؤ کے شعلے اس کے سینے کے اندرونی حصوں کو چھونے لگے، ان کے شعلوں کی لپک اس کے ہونٹوں، اس کی آنکھوں، اس کے دماغ تک پہنچنے لگی تھی۔

اس بے تابی کے عالم میں رابعہ نے پوری کوشش سے آنکھیں کھول کر فردوس کے چہرے پر نظر کی۔ وہ اس کے چہرے کو اچھی طرح نہ دیکھ سکی۔ اس نے کمر کو جھکایا، فردوس کے جسم کو اپنی بانہوں اور فردوس کے سر کے نیچے اس نے اپنے دونوں ہاتھوں سے سہارا دیا۔ رابعہ نے غور سے فردوس کے چہرے کو دیکھا۔ اس کے چہرے پر طوفان کے نشانات مٹ چکے تھے، اس کے چہرے پر سکون تھا، اتھاہ سکون، جیسے ایک خوبصورت سے سوئے ہوئے بچے کے چہرے پر۔ اس کے چہرے سے نظر فردوس کی شفق میں نہائی مرمریں گردن پر سے پھسلتی ہوئی اس کے ابھرتے ڈھلکتے سینے پر جا رُکی اور رکی رہی۔ یہ چہرہ، یہ شفق میں نہائی ہوئی مرمریں گردن، یہ ریشم میں نہاں گلابی سینہ کتنے نوجوان دلوں کے لیے جنت کا خواب اور جہنم کا عذاب ثابت ہوا ہوگا، رابعہ نے سوچا۔ اس پر سکون چہرے کے پردے کے پیچھے کیا یادیں چھپی تھیں۔ اس ابھرتے ڈھلکتے گلابی سینے کے راز سے کون آشنا ہو سکے گا، کس کو اتنی جرأت ہوگی کہ اس کو ریشمی پردوں سے آزاد کر دے۔ اس سینے میں دھڑکتے دل نے جس کو انتخاب کیا تھا وہ اس جسم میں خون کی طرح رواں ہونے کے لیے کیوں تیار نہیں؟ کیا جوان،

پر گداز، گلابی گلابی جسم اپنے حقیقی ساتھی کا انتظار کرتے کرتے تھک کر سو جانے، ہمیشہ کے لیے سو جانے پر ہی مجبور رہے گا؟ ایسا کیوں؟ ان خیالات سے رابعہ کو وحشت سی ہونے لگی، اس کا ذہن بغاوت پر آمادہ ہو گیا، اس کا تن بدن اس گلابی گلابی سے جسم کی حفاظت کے لیے تن گیا۔ اس نے چاہا کہ وہ فردوس کو اٹھا کر اپنے رحم میں رکھ لے اور جب اس کی قسمت کا ستارہ طلوع ہو تو پھر اسے جنم دے۔ اس طرح اس کی کوکھ سے جو بے انصافی ہوئی تھی اس کی بھی تلافی ہو جائے گی۔ مگر ایسا ہونا حد امکان سے باہر تھا۔ وہ جس کی کوکھ سے پیدا ہوئی تھی اسی کی تھی، اس کی نہ ہو سکتی تھی اگر چہ فردوس کے منہ سے لاکھ بار اس کے لیے 'ماں' کا لفظ کیوں نہ نکلے۔ رابعہ نے ذہن کے اس فیصلے کو قبول کرنے سے انکار کر دیا اور اس نے فردوس کے جسم کو سینے سے لگا لیا اور اپنے ہونٹوں کو اس کی گردن میں پیوست کر دیا۔ وہ فردوس کی رگ رگ میں رچ جانا چاہتی تھی، وہ کچھ بھی سوچنا نہیں چاہتی تھی۔ اس کے ہونٹوں نے فردوس کی گردن کی رگوں کی پھڑ پھڑاہٹ کو محسوس کیا، ان رگوں میں دوڑتے ہوئے خون کی گرمی کو محسوس کیا۔ اس کے خون میں کتنی گرمی تھی۔ اتنی گرمی سے اس کی بوڑھی رگوں، اس کے بوڑھے پٹھوں میں ایک بار جوانی کی ترنگ جاگ اٹھی۔ یہ ترنگ روشنی بن کے اس کے ذہن کے نہاں خانوں کو منور کرنے لگی۔ اس روشنی میں اس کے ذہن کے اندھیروں سے یہ خیال ابھرا کہ فردوس کا گرم گرم خون اس کے حلق میں اترنے لگا ہے۔ اس خیال کے لمس سے اس کے جسم کا ذرہ ذرہ جھنجھنا اٹھا۔ اس نے گھبرا کر اپنے ہونٹ فردوس کی گردن سے زبردستی علیحدہ کر لیے۔ اس کے تن بدن میں اپنے لئے ایک نفرت کا جذبہ جاگ اٹھا۔ کیا وہ ایک ڈائن تھی کہ فردوس کا خون چوس لینا چاہتی تھی؟ نہیں وہ ڈائن نہ تھی۔ فردوس کی ماں کی ہمزاد تھی۔ اس کی ماں کی، اس کی ہم شکل تھی، اس کی ماں کے دیوانے کی دیوانی تھی۔ وہ صرف اتنا چاہتی تھی کہ فردوس کو ماں کا پیار دے سکے جس پیار سے وہ بچپن میں ہی محروم ہو گئی تھی۔ مگر وہ ان تمام رشتوں کے باوجود بلکہ انہی کے باعث اس کی ماں نہ بن سکتی تھی۔

وہ کسی کی بھی ماں نہ بن سکتی تھی۔ اسے ماں بننے کے لیے بے وفا بننا قبول نہ تھا۔ اسی لئے اس نے خورشید منظر کی محبت کی حقیقت کو ہمیشہ قبول کرنے سے انکار کیا تھا۔ اس کے جسم

کا ذرہ ذرہ اس کی محبت کو قبول کرنے کے لیے برسوں بے تاب رہا، اس کا رحم خورشید منظر کے پریم رس کو اپنی تاریکیوں میں پرورش کرنے کے لیے بغاوت کیے رہا مگر اس کا دل، اس کا ذہن دامن وفا کو ہاتھ سے چھوڑنے کے لیے کبھی رضامند نہ ہو سکا۔

خورشید منظر کا خیال آتے ہی رابعہ کے جسم میں رعشہ سا پیدا ہونے لگا۔ اس کو ڈر سا لگنے لگا کہ کہیں فردوس کا جسم اس کی بانہوں میں سے پھسل نہ پڑے اس نے فردوس کا سر ایک بار پھر اپنے سینے پر رکھ لیا اور خود کاؤچ پر اس طرح کھسکنے لگی کہ فردوس کا سر اس کے زانو پر آ رہا۔ پھر اس نے دونوں ہاتھوں سے اس کا سر کاؤچ پر رکھ دیا اور فردوس کی ٹانگیں اٹھا کر کاؤچ پر رکھ دیں۔ وہ کچھ دیر تو فردوس کے سرہانے بیٹھی اس کے سینے کے زیر و بم کو دیکھتی رہی، اس کے تنفس کی لے کو سنتی رہی۔

فردوس کے سینے کے زیر و بم میں سے خورشید منظر کا چہرہ اس کی طرف گھورنے لگا۔ اس نے آنکھیں بند کر لیں اور ایک لمبا سانس لیا۔ پھر اس نے آہستہ سے آنکھیں کھولیں۔ فردوس کی طرف دیکھا۔ خورشید منظر کا چہرہ ابھی تک فردوس کے سینے سے ابھرا ابھر کر اس کو گھور رہا تھا۔ اس نے جھک کر چہرے کو دیکھا۔ اس چہرے پر کتنا پیار تھا، اس کی آنکھوں میں کتنی روشنی تھی۔ اس کی آنکھوں میں ہمیشہ ہی روشنی تیرتی رہتی تھی، جیسے جھیل کے شفاف پانی میں سورج کی پہلی کرنوں کی روشنی تیرتی ہے۔ ان آنکھوں میں جھیل کی سی گہرائی تھی۔ اس کی آنکھوں کی گہرائی اس کے دل کی گہرائیوں کا پتا دیتی تھی، اس کی آنکھوں کی گہرائیاں ہمیشہ اسے بلاتی تھیں، اندر اتر آنے کی دعوت دیتی تھیں۔ اسے ہر بار اپنے آپ کو ان کی دعوت کو قبول کر لینے سے بڑی کوشش سے باز رکھنا پڑتا۔

جب اس نے پہلی بار خورشید منظر کو دیکھا تو اس کے دفتر کے وسیع و عریض کمرے کی مشرقی اور شمالی کھڑکیوں اور دروازوں کو سورج کی کرنیں الوداع کہہ چکیں تھیں مگر ابھی مغربی کھڑکیوں سے دور سے نظر آنے والے درختوں کی شاخوں اور ان شاخوں پر لہلہاتے ہوئے پھولوں کے اور کھڑکیوں کے پاس بنے لکڑی کے چھجوں سے لپٹی، ان پر چڑھتی ہوئی بیلوں، ان بیلوں سے پھوٹتے ہوئے پھولوں کے درمیانی سایے سورج کی ترچھی کرنوں سے جگمگا

رہے تھے۔اس کے کمرے کے مشرق اور مغرب درختوں کے جھرمٹ تھے اور درختوں اور کمرے کی عمارت کے درمیاں لکڑی کے چھجوں پر بیلیں چڑھی تھیں جن پر بہار میں رنگ رنگ کے پھول آتے تھے۔ان پھولوں کی بھینی بھینی خوشبو کمرے کی فضا کو معطر کر رہی تھی۔ اس دن وہ کام کرتے کرتے معمول سے زیادہ تھک گئی تھی۔خوشبو کی لطافت سے جہاں اس کے دماغ میں روشنی کی کیفیت پیدا ہو رہی تھی وہاں اس کے جسم میں ایک سر درو دوڑنے لگی تھی۔خوشبو کی روشنی اور جسم میں دوڑتی ہوئی رو نے اس کی توجہ کو منتشر کرنا شروع کر دیا۔اس نے چاہا کہ اٹھ کر باہر باغ میں دھوپ میں چلی جائے مگر وہ اپنی تھکن پر قابو نہ پاسکی اور اپنی کرسی پر جمی رہی۔اور اگر وہ اٹھ کر باغ میں چلی جاتی تو اس کو اپنے چپڑاسی کو کہنا پڑتا کہ جب خورشید منظر نئے ڈیزائنوں کے نقوش لے کر آئے تو اسے باغ میں بھیج دے یا اس کو باغ سے بلا لے۔پہلی صورت اسے اس لیے پسند نہ تھی کہ دفتری کام باغ کی آزاد فضا میں کرنا ایسی فضا سے بے انصافی تھی اور دوسری صورت اس لیے کہ اس کے ملازم پر یہ ظاہر ہوتا کہ وہ آخر ایک عورت تھی اگر چہ ایک بہت ہی بڑے کاروبار کی مالک اور سربراہ تھی۔ایسے خیالات اس کے ذہن میں کیوں آ رہے تھے وہ جان نہ سکی۔

خورشید منظر اس کے کپڑے کے کارخانوں کا ٹیکسٹائل ڈیزائنر تھا۔اس نے اس کو پہلے کبھی نہ دیکھا تھا کیونکہ جب اس کا تقرر ہوا تھا تو وہ اس وقت جمیل صاحب کو لے کر یورپ گئی تھی۔ان دنوں یورپ میں نئے نفسیاتی علاج کا بہت شہرہ تھا۔مگر نیا علاج بھی جمیل صاحب کے لیے شعور کے بند دروازوں کو وا نہ کر سکا۔اور وہ وہاں سے لوٹ کر بہت پریشان رہنے لگی تھی۔اس کا جی چاہتا تھا کہ سب کاروبار کو اپنے با اعتماد اہلکاروں کے سپرد کر کے یورپ کے ان ویرانوں میں پناہ ڈھونڈے جو پہلی جنگ عظیم نے پیدا کر دیئے تھے۔مگر ان ویرانوں میں اس کو اپنی ویرانی کا حل یا ان کو بھلا سکنا ناممکن نظر آیا اور اسے اپنے وسیع کاروبار کی جزئیات کو نئے نئے نظاموں میں ڈھالنے میں ہی فلاح کی واحد صورت نظر آتی تھی کیونکہ وہ اس دنیا میں جمیل صاحب کے ساتھ ساتھ، ان کے ہر دم پھیلتے کاروبار کی دیکھ بھال میں مصروف رہنا چاہتی تھی۔اس کے شعور کے کسی افق پر یہ خیال پرورش پا رہا تھا کہ

ان کے دکھ کا مداوا اسی رنگ و بو کے جہان میں ہے، اگر ہے۔

اس کے جسم میں دوڑتی ہوئی سردسی رو اس کے دماغ کی روشنی پر بار بار یلغار کررہی تھی اور وہ اس روشنی کی حفاظت کرنے کیلئے اپنی تمام قوتوں کو جمع کرنے کا سوچ رہی تھی کہ مغربی دیوار کے روشندانوں سے سورج کی کرنیں داخل ہوئیں اور کمرے کا مغربی حصہ جگمگا اٹھا اور پھر ان کرنوں کی جگمگاہٹ کمرے میں پھیلنے لگی۔ اس جگمگاہٹ کو وہ اپنی بائیں آنکھ کے مغربی کونے سے دیکھ رہی تھی کیونکہ ابھی تک اس کی توجہ دماغ کی روشنی پر ہی مرکوز تھی۔ پھر یکا یک سورج کی کرنیں اس کی میز پر چڑھ آئیں اور اس کی ساری میز پر پھیل گئیں اور اس کے سینے اور اس کی گود میں سوئے ہوئے ہاتھوں کو گدگدانے لگیں۔ اس گدگدی سے وہ چونکی۔ اس کی نظریں ایک دم سامنے کی دیوار میں کھلے دروازے کی چوکھٹ پر جم گئیں۔ اس چوکھٹ میں سے ایک نوجوان داخل ہو رہا تھا اور اس کی اٹھی ہوئی نظروں کو دیکھ کر ٹھٹکا اور وہیں چوکھٹ کے درمیان تصویر بن گیا۔ نوجوان کی پشت پر سورج کی ترچھی کرنیں لکڑی کے چھجے کے جال سے نیچے اتر رہی تھیں۔ اس روشن جال اور اس کے کمرے کی دہلیز کے اندر کچھ فاصلے تک کے درمیانی خلا میں سایہ تھا جو اندھیرے کی کیفیت پیدا کر رہا تھا۔ نوجوان اس درمیانی اندھیرے میں تصویر بنا کھڑا تھا۔ چند لمحوں میں اس کو محسوس ہوا کہ چوکھٹے میں تصویر کانپنے لگی ہے۔ اس نے اس کو واہمہ سمجھا اور اپنی توجہ کو شعوری کوشش سے چوکھٹ پر مرکوز کیا اور اس کی نظروں نے محسوس کیا کہ تصویر کے شانے پھڑ پھڑائے ہیں۔ اور تصویر کے دائیں ہاتھ میں پکڑے ہوئے گتے لرزے ہیں اور ہاتھ سے گرا چاہتے ہیں۔ اس کے ذہن میں خیال کوندگیا کہ اگر اس نے نظروں کو واپس نہ بلا لیا اور تصویر کو آواز نہ دی تو تصویر بت بن جائے گی۔ اس نے نظریں جھکا لیں، گود میں سوئے ہوئے ہاتھوں کو کرسی کے بازوؤں پر رکھ لیا اور تصویر کو اندر آنے کے لیے متوجہ کیا۔ تصویر میں جنبش پیدا ہوئی اور نوجوان کے جسم نے جھرجھری لی، نوجوان نے شانے جھٹکے اور میز کی طرف بڑھ آیا۔ اس نے بتایا کہ وہ خورشید منظر ہے اور اس کے حکم کی تعمیل میں اس کے کارخانوں میں تیار ہونے والے کپڑوں کے نئے نئے ڈیزائنوں کے نقوش اس کے ملاحظے کے لیے لایا ہے۔ اس نے اس کو بیٹھنے

کے لیے کہا۔ نوجوان بیٹھ گیا اور اس نے بیٹھ کر گتے کے بستے کے تسمے کھولنے شروع کیے اور پھر ایک ایک نقش اٹھا اٹھا کر اس کے سامنے رکھتا گیا اور ان کی خوبیوں کی وضاحت کرتا چلا گیا۔ اس کی آواز میں تازگی تھی، اعتماد کا نشہ تھا، لحن تھا اور اس لحن میں طاقت کے اظہار کی بجائے حلم کا اظہار تھا جس سے اس کے دل کی طنابوں میں ایک جھٹکے کی سی کیفیت پیدا ہونے لگی تھی۔ اس کیفیت سے اس کے جسم میں ایک گرم گرم لہر اٹھی اور اس کے رگ وریشہ میں سرایت کرنے لگی۔ اس گرمی کے رچاؤ سے اس کی قوت سامعہ متاثر ہونے لگی۔ وہ گھبرائی کیونکہ وہ اپنے کاروباری فرض سے عہدہ برا ہونا چاہتی تھی اور جو شے بھی اس میں حائل ہونے کی کوشش کرتی وہ اس کو اپنے ہوش وحواس کا، صبر وقرار کا حریف جانتی تھی۔ اس نے پوری کوشش سے قوت سامعہ کو مضبوط کیا اور خورشید منظر کی باتوں کو غور سے سننے لگی۔ اس کی باتیں اس کے مدلل ذہن اور اس کے فنی شعور کا واضح پرتو تھیں۔

جب اس نے ایک آدھ نقش میں ترمیم کی تجویز کی تو نوجوان کے چہرے پر سرخی کی لہریں ابھر آئیں جیسے کہ وہ حیران ہوا ہو کہ ایسی ترمیم اس کو خود کیوں نہ سوجھی اور ممنون ہوا کہ اس کی مالکہ نہ صرف اس کے نقوش کی اچھی پارکھ تھی بلکہ ان کو بہتر بنانے کی سوجھ بوجھ بھی رکھتی تھی۔ جب وہ آخری نقش پر منظوری کی مہر ثبت کر چکی اور وہ نقوش کو گتے کے بستے میں رکھ کر بستے کے تسمے باندھنے میں مصروف ہو گیا تو اس نے اس کے چہرے کو بغور دیکھا۔ اس کے تیکھے نقوش میں نزاکت کے ساتھ قوت کا احساس ہوتا تھا۔ اس کے چہرے کی مخملی جلد کے نیچے ہڈیوں کی ساخت میں بناؤ اور تناسب کی عجیب وحدت تھی جس کا وہ جلدی میں تجزیہ نہ کر سکی کیونکہ خورشید منظر کی بڑی بڑی آنکھوں کے غلافی پپوٹوں میں حرکت پیدا ہوئی اور اس کی نظریں اٹھیں اور اس نے اس سے پوچھا کہ وہ کچھ ہدایات تو نہ دینا چاہتی تھی اور کیا وہ ترمیم کے بعد نقوش کو ایک بار پھر دیکھنا چاہے گی تو وہ جواب میں صرف اتنا ہی کہہ سکی کہ وہ اس کے ذوق پر اعتماد کر سکتی تھی۔ وہ کرسی سے اٹھا۔ نقوش کے بستے کو اٹھانے کے لیے ذرا سا میز کی طرف جھکا، بستے کو اٹھا کر دائیں پہلو سے لگا لیا اور پھر واپس دروازے کی طرف چل دیا۔ اس نے محسوس کیا کہ وہ دہلیز پر لمحہ بھر کے لیے رکا تھا مگر اس کے فیصلہ

کرنے سے پہلے ہی وہ دروازہ پار کر کے جا چکا تھا۔

اس دن خورشید منظر کی کرسی دھوپ میں تھی، اس کے سارے بدن پر کرنوں کے سنہری جال نے ایک جگمگاہٹ کی کیفیت پیدا کر رکھی تھی۔ جب کرنیں اس کی آنکھوں کے قریب سے گزرتیں تو اس کی گہری مگر شفاف آنکھوں میں گہرا بادامی رنگ جھلملانے لگا اور جب باتیں کرتے کرتے اس کی آنکھیں کرنوں کی راہ سے ہٹ جاتیں تو اس کی آنکھوں کا رنگ چمکدار سیاہ نظر آتا۔ یہی کیفیت ہمیشہ اس کی آنکھوں میں نظر آئی تھی۔ اس کیفیت کے پیدا کرنے میں اس کی ناک کا بھی حصہ تھا۔ اس کی ناک کے متعلق وہ کبھی فیصلہ نہ کر سکی تھی کہ وہ اس کے چہرے کے تناسب سے چھوٹی تھی کہ ذرا سی بڑی یا بالکل مناسب تھی۔ قریب سے جب وہ اس کے سامنے بیٹھا ہوتا تو اس کی ناک اس چہرے میں بالکل تناسب میں بیٹھی معلوم ہوتی تھی مگر جب وہ دور سے آتا دکھائی دیتا تو اس کی ناک اس کے ماتھے کی فراخی اور اس کی بڑی بڑی آنکھوں کے پس منظر میں چھوٹی معلوم ہوتی اور جب وہ باتیں کرتے کرتے گردن میں خم ڈالتا تو اس کی ناک کی دیواریں اس کی آنکھوں کے درمیان تیکھی ستواں دیواروں کی طرح بلند ہوتی دکھائی دیتیں جیسے دو گہری اور شفاف جھیلوں کے درمیاں ایک تیکھی چٹان ایک پتلی ستواں سی دیوار کی طرح اٹھ رہی ہو اور بلند ہوتی ہی چلی جا رہی ہو۔ ایسی صورت میں اس کی ناک اس کے چہرے پر تناسب سے بڑی دکھائی دیتی تھی۔ اور جب اس کی نظر اس کی ناک کی بلند دیوار سے پھسلتی تو اس کے اوپر کے ہونٹ کی مخملی سلوٹیں اس کی آنکھوں کو گدگداتیں اور اس کے نچلے ہونٹ کے گلابی پن اور اس کی کمان کی سی قوس اور اس کے ہونٹوں کے سنگم کی قوسوں پر وہ کبھی بھی پوری توجہ سے نظریں جمانے پر قادر نہ ہو سکی تھی۔ اور اس کی ٹھوڑی کی قوس کبھی بالکل گول دکھائی دیتی۔ اور کبھی کبھی جب اس کے چہرے پر سوچ اور افسردگی کے سائے چھا جاتے تو اس کی ٹھوڑی بالکل تکونی دکھائی دینے لگتی۔ اور اس کی گلابی گردن کبھی کبھی تو گلاب کے پھول کی ٹہنی کی طرح نازک معلوم ہوتی اور کبھی کبھی چمکدار فولادی ستون نظر آتی جس پر اس کا وجیہہ اور پروقار اور پرحلم چہرہ کبھی تو ڈگمگاتا اور کبھی مضبوطی سے جما دکھائی دیتا۔ اور اس کی گردن کے نیچے اس کا چوڑا اپھڑ پھڑاتا

ہوا سینہ جیسے بلند و بالا پہاڑوں کے درمیان وسیع و عریض وادی ہو جو آبادی کی دعوت دیتی ہو۔ اور چلتے ہوئے، پشت سے اس کے کولہے، اس کی رانوں اور کولہوں کی گلائیوں کی باہم حرکت ایک متحرک یونانی مجسمے کا گماں پیدا کرتی تھی۔ اس دن واپس جاتے اس کی چال میں ایک عجیب ترنم سا تھا جیسے ایک نغمہ اپنے عروج سے اتر کر آہستہ آہستہ اپنے اختتام کی طرف بڑھ رہا ہو۔ اس دن وہ دفتر میں بڑی دیر تک بیٹھی رہی۔ اس کے کمرے سے دھوپ آہستہ آہستہ مغربی کھڑکیوں کی طرف پسپا ہوتے ہوئے نہ جانے کب درختوں کی چوٹیوں پر گئی تھی اور پھر دور تک سبزہ زار میں اندھیرا چھا گیا۔ اس کی میز کے عین سامنے والے بند دروازے کے نیچے سے روشنی جھانکنے لگی مگر اس کے تن بدن میں اتنی سکت نہ تھی کہ وہ اپنی میز پر پڑے لیمپ کے بٹن کو دبا کر روشن کر سکے۔ وہ نہ جانے کب تک اسی حالت میں ساکت و جامد بیٹھی رہتی اگر اس کی پشت والے کمروں میں سے کسی ایک میں ایک کرسی کے گھسٹنے کی کریہہ آواز ایک دم سے اس کی طبیعت کو جھنجھلا نہ دیتی۔ اس جھنجھلاہٹ سے وہ تخیل کی وادیوں کی سرگردانی سے لوٹ آئی۔ اندھیرے میں رچی ہوئی رات کی رانی کی خوشبو اس کو بہت ہی بھلی محسوس ہوئی۔ اس اندھیرے میں کتنا سکون تھا۔ اندھیرے میں نرم نرم ہاتھوں کی تھپکی کی کیفیت تھی۔ اندھیرے کی تھپکی سے اسے وہ تھپکیاں یاد آ گئیں جب رات گہری ہونے کے بعد اس کی ماں اس کو سلانے کے لیے لوری دیتی تھی اور ماں کی لوری کی لے کے ساتھ دور وینس کے کشتی بانوں کے گیت ہمیشہ گھلتے ملتے سنائی دیتے تھے۔ اور پھر جب اس پر غنودگی غلبہ پانے لگتی تو لوری کی لے اور ان میں گھلتی ملتی کشتی بانوں کی دور ہوتی ہوئی لے اور بھی دور ہوتی ہوئی، ڈوبتی ہوئی، سنائی دیتی اور پھر کبھی اس کے کمرے کے نیچے کشتی کی چپ چپ اور گلیوں کی دیواروں سے ٹکراتی ہوئی لہروں اور ہوا کے تھپیڑوں کی آوازیں اس کو نیند کی ندی پر بہالے جاتیں۔ اس دن اس کو تھپکنے والے ہاتھ محسوس نہ ہوئے، لوری کی لے سنائی نہ دی، صرف اندھیرے کی سرسراہٹ تھی اور رات کی رانی کی خوشبو اس کے نتھنوں کو گدگدا رہی تھی۔ اس گدگداہٹ سے اس کو چھینک آ گئی اور وہ بالکل جاگ گئی۔ اس نے بٹن دبا کر لیمپ روشن کیا انگڑائی لی اور دونوں ہاتھ کرسی کے بازوؤں پر جما کر اٹھ کھڑی ہوئی۔ لیمپ کی روشنی میں جھک کر کلائی کی گھڑی میں وقت دیکھا۔ سات بج رہے تھے۔ اس کو ایک خیال آیا

کہ وہ تو روز شام کی تاریکیاں چھا جانے سے پہلے ہی گھر پہنچ جایا کرتی ہے اور جب کبھی اس کو دیر ہو جاتی تھی تو اس کو گھر پہنچ کر جمیل صاحب کی نرس سے معلوم ہوتا تھا کہ سرِ شام سے جمیل مضطرب تھے اور ان کی آنکھوں کی تاریکیاں گہری نظر آنے لگی تھیں۔ وہ ایک دم کمرے سے نکل آئی اور چپڑاسی کی طرف دیکھے بغیر اپنی کار کی طرف بڑھ گئی۔ اس کو گھر جا کر بالکل یاد نہ آیا کہ وہ کب کار میں سوار ہوئی، کن راستوں سے، کب گھر پہنچی۔ آج بھی اس کو یاد نہ آ رہا تھا کہ اس کے چپڑاسی کے چہرے پر کیا کیفیت تھی، گھر پہنچ کر نرس سے کیا باتیں ہوئیں، جمیل صاحب کو اس نے کیا کہا۔ جب اس کو ہوش آیا تو وہ اپنے بستر پر گھٹنوں کے گرد بانہیں حمائل کیئے اکڑوں بیٹھی تھی اور چاند کی کرنیں کمرے میں داخل ہونے کے لیے اجازت طلب کر رہی تھیں۔ رات بہت گہری ہو چکی تھی، مہینے کے آخری دنوں کا ہلالی چاند اس کے اور جمیل صاحب کے کمرے کی جنوبی کھڑکی کے شیشے سے نظر آ رہا تھا۔ چاند کے آسمانی مقام سے اس نے اندازہ کیا کہ رات اپنے عروج پر پہنچ کر صبح کی طرف عرصہ ہوا روانہ ہو چکی تھی۔ اس نے اپنے گردوپیش کی طرف دیکھا۔ جمیل صاحب اپنے پلنگ پر سو رہے تھے۔ ان کا سانس یکسانی سے چل رہا تھا۔ دور بہت دور سے مچھیروں کے گیتوں کی آواز آ رہی تھی۔ شاید وہ شکار سے واپس ساحل کو لوٹ رہے تھے۔ اسے پلنگ پر یوں اکڑوں بیٹھے ہوئے ہونے پر تعجب ہوا۔ پھر اس کو محسوس ہوا کہ جیسے سامنے کی دیوار میں ایک دروازہ کھلا ہے اور خورشید منظر داخل ہوا ہے۔ اس کے بدن میں گرم گرم لاوا دوڑنے لگا، اس کے چہرے پر گرم گرم چشمے سے ابل پڑے، اس نے محسوس کیا کہ اس کے چہرے پر حیا کی سرخی دوڑ گئی ہے اور اس کی آنکھیں ڈبڈبا گئی ہیں۔ وہ ڈر گئی، اس نے شانوں کے گرد چادر کو مضبوطی سے لپیٹ لیا اور ایک لحاف اوڑھ کر بستر میں لیٹ گئی۔ اس نے محسوس کیا کہ وہ کانپ رہی ہے، اس کا دل زور زور سے دھڑک رہا ہے اور اس کا جسم پھنک رہا ہے۔ اس نے لحاف کے کناروں کو دونوں طرف سے دبا کر اپنے پہلوؤں کے نیچے لے لیا اور آنکھیں بند کر لیں۔ سہ پہر کا ایک ایک منظر، خورشید منظر کے اعضاء کی ایک ایک جنبش، اس کی آواز کی مترنم یکسانی کا ایک ایک موڑ اس کو یاد آنے لگا۔ اس کے ماتھے کی فراخی میں وہ کھو کھو گئی، اس کی آنکھوں کی گہرائیوں میں وہ ڈوب ڈوب گئی، اس کی ناک کی تیز تیز دھار پر پھسل

پھسل کر زخم کھاتی رہی، اس کے نچلے ہونٹ کی کمان سے اس پر تیر برسائے، اس کے ہونٹوں کے سنگموں کے دائروں میں بند بند ہو کر وہ آزاد ہو ہو گئی۔ اس کا رواں رواں تھک گیا۔ وہ پسینے میں شرابور ہو گئی۔ اس کے ماتھے پر بکھرے ہوئے بال تر ہو گئے۔ آخر بڑی کوشش سے وہ کمر کے بل سے پہلو کے بل ہوئی، بائیں ران کی پنڈلی دائیں ران پر ٹکا کر اس نے اپنا بایاں گھٹنا پلنگ کی پٹی کے ساتھ لگایا۔ اس طرح کمر میں ایک سکوں کی کیفیت آئی اور وہ سو گئی۔

جب اس کی آنکھ کھلی سورج کی کرنوں سے سارا کمرا بھرپور ہو رہا تھا اور مسز کروز، جمیل صاحب کی نرس، اس کے ماتھے پر ہاتھ رکھے اس پر جھکی مسکرا رہی تھی۔ اس نے جمیل صاحب کے پلنگ کی طرف دیکھا۔ جمیل صاحب پلنگ پر نہ تھے، پلنگ پر بستر پوش پڑا تھا اور کسی پاس کے کمرے میں موتسارت کی موسیقی کا کوئی ریکارڈ بج رہا تھا۔ وہ کوشش کے باوجود نغمے کو پہچان نہ پائی۔ ذہن کی اس پریشانی پر بہت ہی حیران ہوئی۔ ایسا تو کبھی نہ ہوا تھا۔ بچپن ہی سے وہ موتسارت کی موسیقی سے آشنا تھی۔ اس کی ماں اور اس کی ماں کی خالہ پیانو پر اٹلی کے بڑے موسیقاروں اور موتسارت کی موسیقی کو زندہ کر سکتی تھیں۔ وہ ہمیشہ سے موتسارت کی موسیقی کی رسیا رہی تھی کیونکہ اس کی موسیقی میں ایک وضاحت تھی جس سے اس کے ذہن و قلب کی عمیق ترین گہرائیوں تک میں نکھار آ جاتا تھا، ان میں سے ابھرنے والے ہر خیال اور ہر جذبے کے باہمی رشتے اور رشتوں کے امتزاج میں ایک وضاحت آ جاتی تھی اور موتسارت کی موسیقی اس سے کسی ماورائیت کا مطالبہ نہ کرتی تھی اور نہ ہی اطالوی موسیقی کی طرح اس کے دل کو مسوستی تھی اور نہ پیسیجتی تھی اور نہ ہی بیتھوون کی موسیقی کی طرح اس سے دیوتا بن جانے کا مطالبہ کرتی اور نہ ہی اس میں ننھے منے انسان ہونے کا احساس جگاتی تھی۔

موتسارت کی موسیقی اسے ہمیشہ ہی یہ احساس دلاتی تھی کہ وہ ایک انسان ہے اور انسان ہونا ایک بہت بڑی نعمت ہے، راحت ہے، لطفِ جمیل ہے۔

اس نے اٹھنے کی کوشش کی مگر نرس نے مسکرا کر اس کو اٹھنے سے باز رکھا۔ ایک مدت کے بعد اس نے محسوس کیا کہ وہ ایک عورت ہے بے سہارا اور اس کو ایک مضبوط سہارے کی

ضرورت ہے۔ اس کے انگ انگ میں ایک نیا درد تھا جس سے وہ پہلے کبھی آشنا نہ تھی۔ اس درد میں بھی ایک مزے کا چٹخارہ تھا۔ اس احساس سے اس کو حیا آنے لگی مگر درد میں مزے کا احساس تیز ہوتا گیا۔ اس احساس سے اس کی طبیعت میں ایک الجھاؤ پیدا ہو گیا۔ ایک عرصے سے اس کو یہ یقین ہو چکا تھا کہ وہ اپنے بدن کی ہر کیفیت پر قابو پا چکی ہے اور وہ اب ایسی نرم و نازک عورت نہ تھی جس کو جذبات کے، آرزوؤں کے جھونکے کبھی ڈگمگا سکیں گے۔ مگر آج تو ایک ہی جھونکے سے لرز اٹھی تھی۔ ایسا کیوں؟ کیا وہ اب بھی بس ایک کمزور عورت ہی تھی؟ نہیں! اس کے قلب و ذہن سے آواز آئی۔ بلکہ جھونکا کہاں تھا، ایک طوفان تھا جذبات کا، آرزوؤں کا، وجاہت کا اور جوانی کا۔ اس کے قلب و تخیل کی گہرائیوں نے اس طوفان کو جنم نہ دیا تھا بلکہ خورشید منظر ایک طوفانِ باد کی طرح اس پر چھا گیا تھا، اس نے اس کی گہرائیوں تک پر اپنا اثر چھوڑا تھا۔ اس کو خیال آیا کہ وہ یونانی دیوتا اپالو (Apollo) کی طرح اس کے کمرے میں داخل ہوا تھا مگر یونانی دیوتا دیونی سیوس (Dionysus) کی طرح اس کے اندر ایک ہیجانِ بے کراں کو چھوڑ گیا ہے۔ اپالو اور دیونی سیوس کا ایسا امتزاج اس نے یونانی اصنامی کہانیوں میں کہیں نہ دیکھا تھا۔ کل سے پہلے اسے اکثر خیال آیا تھا کہ وہ یونانی دیوی اثینا (Athena) کی طرح ہے جس کے جذبات اور ذہن پر کوئی اثر نہیں ڈال سکتا اور جس کا مقدر ہے کہ وہ نئے شہر بسائے، نئی صنعتیں ایجاد کرے۔ مگر آج اسے محسوس ہوا کہ وہ دیوی نہ تھی انسان تھی، ایسا انسان جسے ایک ہیرو کی طرح مہمیں سر کرنا تھیں، جس کی منزلیں کٹھن تھیں، جس پر مقدر ہو چکا تھا کہ وہ کائناتی طاقتوں کے تعاون کے بغیر بھی اپنی منزل مقصود کی طرف بڑھتا ہی چلا جائے۔ اس خیال کے آتے ہی وہ کانپ گئی، ڈر گئی۔ یونانی المیہ ڈرامے کی ایک ایک ہیروئن کا انجام اس کے تخیل کی آنکھ کے سامنے ابھر آیا۔ ان ہیروئنوں کے انجام کے تصور سے اس کا دل بیٹھ گیا، ڈوب گیا۔ اور پھر اس کے دل سے ایک لہر اٹھی اور اس کے تخیل کی بلند ترین چوٹیوں کی طرف اچھلنے لگی۔ اس کے انگ انگ میں ایک کھلبلی سی مچ گئی اور وہ ایک دم اٹھ کر بستر پر بیٹھ گئی، اس کے ہاتھ کچھ کرنے کے لیے بے تاب ہو ہو گئے۔ اس نے نرس کو کہا کہ وہ نادرہ، اس کی ملازمۂ خاص، کو بلا دے۔ نادرہ آئی اور اس نے اس کو نہانے کے لیے سخت گرم پانی تیار کرنے کے لیے کہا۔ اس نے پلنگ کے کٹہرے سے اپنا

ڈریسنگ گاؤن اٹھایا، پہن لیا، ٹانگیں پلنگ سے نیچے اتار دیں۔ فَر دار سلیپر پہن لیے اور گاؤن کے کمر بند کو کمر پر کس دیا اور گرم چادر سے سر اور گردن اور شانوں کو لپیٹ لیا اور کمرے میں ٹہلنے لگی۔ ٹہلتے ٹہلتے اس نے محسوس کیا کہ اس کی چال میں بے پناہ قوت ہے، شدت ہے جیسے وہ اولمپک کی کھیلوں میں دس ہزار میٹر کی ریس میں شریک ہونے کی تیاری کے لیے ٹانگوں کے کس بل کھول رہی ہے۔

اس کو محسوس ہو رہا تھا کہ اس کے اندر اتنی قوتیں بیدار ہو رہی ہیں کہ اگر وہ دوڑتے دوڑتے سامنے کی دیوار پر ہاتھ رکھ دے تو دیوار پانی کی طرح اس کو رستہ دے دے گی۔ اس بے پناہ قوت کے احساس سے اس کے ذہن میں خیالات کی، اس کے دل میں جذبات کی اتنی ریل پیل ہو رہی تھی، بلکہ کہرام مچ رہا تھا کہ اس کا تخیل بالکل مفلوج سا ہو رہا تھا: ایک تماشائی کی طرح اپنے مقام پر کھڑا ہجوم کے ایک ایک فرد کو تکے جاتا تھا۔ اس کو اپنے آپ پر، جمیل صاحب پر، اپنے ماضی کے ہر فیصلے پر غصہ آ رہا تھا، اس کا کوئی ایسا کام کرنے کو جی چاہ رہا تھا جس پر اس کا ہر جاننے والا دنگ ہو کر رہ جائے، ہر جاننے والے کا ذہن، اس کی اخلاقی حس، اس کے اس عمل کے اثر سے پیدا ہونے والے زخم کے درد سے بلبلا اٹھے۔ کبھی اس کے جی سے اٹھتی کہ وہ خورشید منظر کو پیٹ پیٹ ڈالے، اس کی بوٹی بوٹی نوچ نوچ لے، اس کے اوپر کے ہونٹ کی مخملی سلوٹوں کو مسل ڈالے، اس کی گلاب کی ٹہنی کی طرح نازک اور فولادی ستون کی طرح مضبوط گردن کو مروڑ دے، اس کا سینہ چیر کے اس کا دل نکال کر ہتھیلی پر رکھ لے اور دل کے تڑپنے، دھڑکنے کو صدیوں، ابدوں دیکھتی رہے، اس سے کہے یوں یوں تڑپی تھی میں، یوں یوں دھڑکا تھا دل میرا، یوں یوں چلے تھے تیر میرے سینے پر، اور جب اس کا دل تڑپ تڑپ کر ساکت ہو جائے تو کہے کہ میرا دل بھی یونہی رک رک گیا تھا کئی کئی بار۔ پھر اس کے دل سے رحم کی ایک لہر اٹھتی اور اس کو خیال آتا کہ وہ دوڑ کے خورشید منظر کے پاس جائے اور اس سے اپنے ان ناگفتہ گناہوں کے لیے رو رو معافی چاہے اور جب اس کی نگاہوں سے معافی اور حلم نہ ٹپکے تو اس کو جھنجھوڑے، روئے، اس کے فراخ سینے پر سر رکھ کر زار زار روئے، روتی چلی جائے تا آنکہ اس کا دل پسیج جائے اور وہ اس کو سینے سے

لگا لے، بھینچ بھینچ لے، اس کی روتی آنکھوں پر، اس کے ماتھے پر، اس کی گردن، اس کے ہونٹوں پر معافی کی مہریں ثبت کرتا چلا جائے اور اس کے دل میں اس کے لیے محبت کا ایک دریا، ایک سمندر موج زن ہو جائے اور اس کے ہونٹ ایک پیاسے کی طرح اس کے بدن کے گوشے گوشے سے، قوس قوس سے، بلندیوں اور پستیوں میں، پانی کی آرزو میں اس کے پسینے کے قطرے پئیں۔ تخیل کی اس افتاد پر اس کو حیرانی ہوئی، شرمساری ہوئی اور اس کے تیزی سے اٹھتے ہوئے قدم رک گئے، اس کا دایاں ہاتھ ہوا میں تڑپا، اس کے رخساروں کی طرف لپک گیا، اس کے رخسار انگارے کی طرح دہک رہے تھے۔ اس کا ہاتھ اس کی گردن کی طرف پھسل گیا، اس کی گردن بھی تپ رہی تھی۔ وہ پریشان ہوگئی اور وہ ایک دم اپنے کپڑے بدلنے کے کمرے کی طرف لپکی، اس نے دروازہ کھول، اندر داخل ہوکر، دروازے کی چٹخنی لگالی اور اپنی سنگار میز پر جا بیٹھی۔ اس کے سامنے، اس کے پیچھے، اس کے دائیں، اس کے بائیں ایک حسین عورت کا دہکتا ہوا، نیم خوابیدہ چہرہ، اس چہرے میں سرخ ڈوروں میں گھری سیاہ پتلیاں نجانے کس کی تلاش میں سرگرداں تھیں۔ وہ دیر تک اس چہرے کو، ان سرگرداں آنکھوں کو حیرانی سے دیکھتی رہی۔ جب اس کو خیال آیا کہ وہ چہرہ، وہ آنکھیں خود اس کی تھیں تو وہ ہمہ تن توجہ بن کر اس چہرے پر سے اور ان آنکھوں میں نظر آتے ہوئے سایوں سے اپنے جذبات کا اندازہ لگانے کی کوشش کرنے لگی۔ ان آنکھوں میں اسے ایسی زخمی ہرنی کی آنکھیں دکھائی دیں جو بھاگتے بھاگتے گر پڑی ہو اور جس کو شکاری ہر دم قریب آتا ہوا دکھائی دے رہا ہو۔ اپنی ایسی حالت دیکھ کر اس کا دل بھر آیا، اس کا سینہ اس کے آنسوؤں کے سیل کے سامنے تنگ محسوس ہونے لگا اور اس سے برداشت نہ ہو سکا اور وہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی، روتی رہی۔ اتنا روئی کہ اس کا گریبان، اس کے ہاتھ، اس کی بانہیں، اس کی کہنیاں، اس کے لباس کا وہ حصہ جہاں اس کہنیاں ٹکی تھیں، سب تر ہو گئے، مگر اس کے آنسو تھے کہ تھمتے ہی نہ تھے۔ روتے روتے اس کی ہچکی بندھ گئی اور اس کے بدن کا رواں رواں اس کی ہچکی کے جھٹکوں سے تھک گیا۔ وہ جب بالکل تھک گئی تو اس نے اپنے ہاتھوں سے چہرے کو اوپر اٹھا، آئینے میں دیکھا اور حیران رہ گئی، اس نے اپنے آپ کو اس قدر حسین کبھی نہ دیکھا تھا۔ اس کی نہائی ہوئی آنکھوں میں اتھاہ روشنی تھی، اس کی آنکھوں

میں شفاف پن تھا، اس کی لمبی لمبی بھیگی پلکیں اس کی آنکھوں پر درختوں کی ثمر سے لدی ہوئی ٹہنیوں کی طرح سایہ کئے تھیں۔ اس کے بہے ہوئے آنسوؤں سے جو لکیریں بنی تھیں وہ اس کی ناک کی، اس کے اوپر کے ہونٹ کی گلاب کی پتی کی سی ننھی ننھی قوسوں، اس کے نچلے گلابی ہونٹ کی پپڑی سے پیدا ہونے والی لکیروں کے ساتھ مل کر ایک ایسے آہنگ کا سماں پیدا کر رہی تھیں جیسا بوتی چیلی (Botticelli) کی تصویروں میں عورت کے جسم کی قوسوں اور قوسوں میں غلطاں ان کے لباس کی قوسوں کی لکیروں سے پیدا ہوتا ہے۔ اس حسن کے احساس سے اس کے بے نہایت جی میں، اس کے ابلتے ذہن میں، اس کے پرّاں اور پریشاں تخیل میں ایک قرار آتا چلا گیا۔ اس سکون کی کیفیت سے یہ آرزو ابھری کہ کیا وہ اپنی گردن سے نیچے بھی اتنی ہی حسین تھی۔ اس آرزو کے اثر کے تحت اس نے ہاتھ اپنے گریباں کی طرف اٹھائے۔ ڈریسنگ گاؤن کے بند کھول دیئے انگڑائی لی اور گاؤن کو بدن سے گرا دیا، پھر آہستہ آہستہ، جیسے مصمم ارادے سے، شب خوابی کے سیاہ زمین پر پیلی دھاریوں والے کرتے کے بٹن کھولتی چلی گئی، اس کا کرتا آگے سے کھل گیا اس نے کندھے جھٹک کر کرتا فرش پر گرا دیا، اس کی گردن سے اس کی ناف تک ایک گلاب کھل گیا مگر اس کے سینے پر ابھی سیاہ انگیا کا بھنورہ بیٹھا تھا، اس نے سانس روک کر انگیا کے بند پیچھے سے کھول دیئے۔ انگیا اس کے سینے کے پسینے کی وجہ اس کی چھاتیوں سے چپکی ہوئی تھی، اس نے دائیں ہاتھ سے انگیا کو چھلکے کی طرح سینے سے اتار دیا۔ شفقی افق پر دو گلابی قمر طلوع ہوئے۔ اس کا گلابی بدن، اس کے گلابی پستان، ان پستانوں پر بادامی بٹنیاں، اور ان سب پر پسینے کے چمکتے قطرے، دو قمروں کا حلقہ کئے ہوئے تاروں کے جھرمٹ۔ اس کا جی چاہا کہ جھک کر آئینے میں اپنے بدن کے انگ انگ کو چوم چوم لے۔ وہ اس خیال سے جھکی ہی تھی کہ آئینے میں سے ایک کرن لپکی اور وہ ڈر گئی۔ آئینے کے مشرقی حصے کی طرف سے کرنیں بڑھ رہی تھیں۔ اس کمرے کے مشرقی روشندان میں سورج کی کرنیں داخل ہو رہی تھیں۔ وہ اس دخل در معقولات پر حیران سی ہوئی۔ اس کو خیال آیا کہ ایسا کبھی پہلے تو نہ ہوا تھا۔ اس کو یاد آیا کہ برسوں پہلے جب وہ اس مکان میں پہلے پہل آئے تھے تو ان دنوں اس کے جمیل صاحب باہوش تھے، اس سے بے پناہ پیار کرتے تھے۔ جب کبھی وہ اس سے بے اعتنائی

برتتے تو بے حد شرمسار ہو جاتے اور پھر اس بے اعتنائی کی بے انصافی کے احساس کو مٹانے کے لیے وہ رات رات بھر اس کے جسم پر عنایات کی بارش کرتے تو وہ تھک کر صبح کے قریب سوتی اور پھر صبح کو دیر سے اٹھ کر نہانے کے بعد سنگار میز پر آتی تب اس کو کرنیں سہلاتیں، لبھاتیں۔ وہ کرنوں کی یلغار کو دیکھنے لگی۔ کرنیں اس کے دائیں کے آئینے پر چھا گئیں اور اس کا جسم اس آئینے میں پیلے نور کی طرح دمک اٹھا۔ کرنیں اس کے قدموں کی طرف بڑھنے لگیں اور پھر قدموں میں لوٹنے لگیں اور پھر اس کے ٹخنوں، پنڈلیوں، رانوں سے لپٹنے لگیں۔ کچھ دیر بعد اس کے سارے جسم پر کرنوں کا جال تن گیا۔ کرنوں کی حدت اس کے انگ انگ میں رچنے لگی۔ اس نے انگڑائی لی۔ اس کے سینے میں کرنوں کی حدت سے گدگدی سی پیدا ہوئی، کرنوں نے اس کے سینے کو، پستانوں کو سہلایا۔ پھر آہستہ آہستہ وہ اپنے پہلوؤں کو، کولہوں کو، اور پھر کمر بند کھول کر رانوں کو سہلانے لگی، سہلاتی رہی اس پر ایک نشہ سا طاری ہونے لگا۔ آہستہ آہستہ اس کے خون کی گرمی میں ایک اعتدال سا آ گیا۔ ایک لمحہ آیا کہ اس نے محسوس کیا کہ اب اس کو نہالینا چاہیے۔ وہ اٹھی، اس کا پاجامہ فرش پر پھسل گیا۔ اس نے بے اعتنائی سے آئینے میں جھانکا اور منہ موڑ کر غسل خانے کی طرف چل دی۔ غسل خانے کے دروازے پر کسی کو دیکھ کر وہ ٹھٹکی۔ نادرہ دروازے میں کھڑی حیرت کی تصویر بنی تھی۔ اس نے غور سے اس کو دیکھا۔ اس نے محسوس کیا کہ نادرہ ایک پتھر کا تودہ ہے جس میں وہ اگر چاہے تو جان ڈال سکتی ہے، ایک جاندار بنا سکتی ہے جو عورت بھی ہو اور ایک مجسمہ بھی۔ ایک جوان عورت جس کا چہرہ اگرچہ حسین نہ ہو مگر جذبات نے اس پر ایسا روغن چڑھا دیا ہو کہ اولمپس کے دیوتا بھی اس کو دیکھنے کے لیے ایک بار آسمانوں سے اتر آئیں۔ اس نے اپنے آپ کو دیوی اتھینا محسوس کیا اور نادرہ کو اپنی ایک اجنبی پجارن، ایسی پجارن جس نے دیوی کو بے ستر دیکھا ہو اور اپنے فعل کی جرأت سے لرزاں ہو۔

اس کے سینے میں ایک خلا سا پیدا ہوا اور اس کو خیال آیا کہ شاید نادرہ کو بھی ایک محبوب کی، ایک جسم کے مالک کی ضرورت تھی اور اس کی اس ضرورت کی تسکین میں اس کی ملازمت، اس ملازمت کی آسائشیں حائل تھیں، وہ خود حائل تھی۔ اس خیال سے اس کا دل

حلم سے بھرپور ہوا اور اس نے نادرہ کی طرف بڑھ اس کے کندھوں پر دونوں ہاتھ رکھ دیئے اور اس نے اپنی آواز میں بناوٹی غصے کا لہجہ پیدا کرتے ہوئے پوچھا: ''تم کو کس نے اجازت دی کہ ہم کو بے ستری کی حالت میں دیکھو؟ ہیں؟''

نادرہ کے بدن میں جھرجھری پیدا ہوئی اور اس کے چہرے پر ڈر کی، حیا کی، شرمساری کی سرخی دوڑ گئی اس کی حیرت زدہ آنکھیں جھک گئیں اور اس کا سارا بدن خوف سے کانپنے لگا اور وہ اس کے قدموں میں جھک گئی۔

اس نے اس کی بغلوں میں ہاتھ دے کر اس کو اٹھا لیا، دائیں ہاتھ سے اس کے چہرے کو اوپر کو اٹھایا۔ نادرہ کی آنکھوں میں خوف ابھر رہا تھا، حیرت گم ہو رہی تھی اور ان میں ایک نشہ کی کیفیت تھی۔ اس نے ایک بار پھر اس کے شانوں پر ہاتھ رکھ دیئے، اس کے شانوں کو مضبوطی سے گرفت میں کر لیا اور اس کے چہرے، اس کے جسم پر ایک غور کی نظر کی۔ اس کا جواں جسم بھرپور تھا، اس کے جسم کی قطع خوبصورت تھی، اس کے چہرے کے نقوش ہم آہنگ تھے، ان میں حسن تھا، اس کی آنکھیں سیاہ تھیں مگر پلکیں چھوٹی چھوٹی تھیں جس سے اس کے چہرے پر حسن کا تاثر پیدا نہ ہوتا تھا اور پھر اس کی آنکھیں چھوٹی چھوٹی تھیں مگر تھیں اس کے چہرے کے متناسب۔ اس نے محسوس کیا کہ گہرے جذبات سے نادرہ کے چہرے پر، اس کے بھرپور جسم میں ایک غضب کی کشش پیدا ہو گئی تھی۔ اگر وہ مرد ہوتی تو اس کشش سے مسحور اور اس کشش میں محصور ہو جاتی۔ اس خیال سے اس کے دل کو ایک جھٹکا سا لگا اور اس کے ہاتھوں کی گرفت نادرہ کے کندھوں پر سخت ہو گئی۔ اس نے محسوس کیا کہ وہ تمام قوتیں پھر سے اس کے جسم میں بیدار ہو گئی ہیں جو پہلی بار اس میں سونے کے کمرے میں بیدار ہوئی تھیں۔ اس نے محسوس کیا کہ وہ ایک عظیم صورت گر ہے اور نادرہ کا ساکت جسم ایک نئی قسم کا پتھر ہے جو اس کو للکار رہا ہے کہ اس کو ایک مجسمے کی صورت عطا کرے۔ اس کے ہاتھ پتھر کو گوندھنے کے لیے، صورت عطا کرنے کے لیے بے تاب ہو گئے۔ اس کے ہاتھوں نے پتھر سے ایک پیشانی، ایک ناک، دو آنکھیں، رخسار، لب، ٹھوڑی گوندھ ڈالی۔ صورت گر کامیابی پر پھولا نہ سمایا۔ اس نے شانے، پستان، ناف، کولہے، چوتڑ، رانیں پتھر سے گوندھ نکالیں۔ وہ

خالق تھی، اس نے ایک زندہ صورت پتھر سے گوندھ لی تھی۔ وہ اس صورت کو ایک بار محسوس کرنا چاہتی تھی، وہ اطمینان کرنا چاہتی تھی کہ اس کی بنائی ہوئی صورت زندہ تھی، حقیقت تھی۔ اس کے ہاتھ ایک بار پھر اس کی پیشانی، اس کی ناک، اس کے رخساروں، اس کے ہونٹوں، اس کی ٹھوڑی کو محسوس کرنے لگے۔ اس کے ہاتھوں نے اسکی نازک دھڑکتی ہوئی گردن کو چھوا۔ اور اس کے رخساروں پر جم گئے اور وہ اس کے چہرے پر جھک گئی، کچھ دیر جھکی رہی، نادرہ کی آنکھیں خوف اور حیرت سے اس کو تک رہی تھیں۔ وہ صورت میں روح پھونکنا چاہتی تھی۔ اس نے نادرہ کا ماتھا، اس کی آنکھیں چوم لیں اور پھر اس کے ہونٹ اس کے رخساروں پر رینگتے ہوئے اس کے ہونٹوں پر جم گئے اور اس کے ہاتھ اس کی گردن سے اس کے شانوں اور اس کے شانوں سے اس کی کمر پر پھیل گئے اور اس نے نادرہ کو اپنی گرفت میں جکڑ لیا۔ وہ اپنے ہاتھوں کی حدت سے، مورت میں حیات کی گرمی دوڑانا چاہتی تھی۔ اس نے ہاتھوں سے اس کی کمر، اس کے کولہوں، اس کے چوتڑوں، اس کی رانوں کو سہلانا، بلکہ مسلنا شروع کر دیا۔ اس سہلانے اور مسلنے کے اثر سے نادرہ کے بدن میں ایک اضطراب پیدا ہوا اور اس نے اس کی گرفت سے آزاد ہونے کی کوشش کرنا شروع کی اور اس کے ہونٹ اس کے ہونٹوں کے نیچے مچلنے لگے، جیسے اس کا سانس گھٹ رہا ہو۔ اس نے اس کے ہونٹوں کو ایک بھرپور اور طویل بوسہ دیا اور پھر اپنے ہونٹ اس کے ہونٹوں سے جدا کر لئے۔ نادرہ ہانپ رہی تھی، اس کے ماتھے پر، اس کے رخساروں پر، اس کی گردن پر پسینے کے قطرے نمودار ہو گئے تھے۔ صورت زندہ تھی۔ زندگی اس میں دھڑک رہی تھی۔ وہ صورت گر ہی نہ تھی، خالق تھی۔ اس کا یہ احساس اس کو تکبر محسوس ہوا۔ ایسا تکبر جس کے اگر انسان مرتکب ہوں تو ان کو سزا میں دنیا میں ذلت، رذالت ملتی ہے۔ وہ عجز کے جذبے سے بھرپور ہو گئی۔ اس نے محسوس کیا کہ وہ دیوی نہ تھی، خالق نہ تھی، ایک عورت تھی جس کو سہارے کی، ہمدردی کی، گرمی کی ضرورت تھی۔ وہ اپنے فعل پر نادم تھی مگر نادرہ کے جسم سے جو مزہ اس کو ملا تھا اس کے لیے خوش تھی اور اس کی ممنون بھی تھی۔ وہ چاہتی تو تھی کہ وہ اس کو اپنی گرفت سے آزاد کر دے مگر اس کا جسم، اس کے ہاتھ نادرہ کے جسم سے علیحدہ ہونا نہ چاہتے تھے۔ اس کے ہاتھوں نے نادرہ کے کولہوں کو، اس کے پہلوؤں کو، اس کی بغلوں کو، اس کی گردن، اس کے

سینے، اس کے ایک ایک پستان کو سہلایا۔ اگر چہ اس کا جی تو چاہتا تھا کہ وہ اس کے پستانوں میں اپنے دانت گاڑ دے مگر اس خیال سے کہ شاید نادرہ اس کے جذبات کی تندی کو برداشت نہ کر سکے اس نے اپنی گرفت کو اس حد تک ڈھیلا کر دیا کہ نادرہ نے ایک ہی جھٹکے سے اپنے آپ کو اس کی گرفت سے آزاد کر لیا اور کپڑے بدلنے کے کمرے کے دروازے کی طرف بھاگی۔

اس کے ذہن میں یہ خیال کوند گیا کہ نادرہ کو کمرے سے باہر نہ جانے دینا چاہیے۔ لہٰذا اس نے پکارا:

''نادرہ! رک جاؤ...... میرا انتظار کرو میں نہالوں۔ مجھے تمہاری ضرورت ہے۔ مجھے تم سے بہت سی باتیں کرنی ہیں...... جانا نہیں!''

نادرہ ملازمہ تھی، خدمت گزار- رک گئی- وہ ہانپ رہی تھی۔ اس نے دروازے کے ساتھ پشت لگا لی اور کھڑی رہی، پھر پھسلنے لگی اور پھسلتے پھسلتے دروازے کے ساتھ لگ کر بیٹھ گئی، کھوئی ہوئی سی۔

وہ غسل خانے میں داخل ہوئی۔ نہانے کے برتن نما مرمریں حوض میں پانی کی حدت کو ہاتھ ڈال کر جانچا۔ پانی اس کی منشا کے مطابق تھا۔ نادرہ اس کی منشا سے اچھی طرح واقف تھی۔ وہ ایک اچھی ملازمہ تھی۔ اس نے محسوس کیا کہ وہ خود نادرہ کے لیے بڑی بہن تھی، مالکہ نہ تھی۔ اس نے ارادہ کیا کہ وہ واقعی اس کی بڑی بہن بن جائے گی۔ آج نادرہ نے اس کو دیوانگی سے بچا لیا تھا اگر چہ اس کو اس کی بہت بڑی قیمت ادا کرنا پڑی۔ وہ نادرہ کی اس خدمت کے لیے ممنون تھی۔ اس نے اپنے آپ سے طے کر دیا کہ وہ جلد ہی نادرہ کے لیے اچھا سا بر تلاش کرے گی اور اس کو ایک چھوٹی بہن کی طرح سسرال رخصت کر دے گی۔ اس ارادے پر اس کے ذہن نے اس سے کہا کہ وہ نادرہ کو اپنی راہ سے ہٹانا چاہتی تھی کہ وہ ایک بار پھر اس کے جسم کی مرہونِ منت نہ ہو۔ مگر اس نے ذہن کے اس اشارے پر نظر نہ کی اور نہانے کے حوض میں بیٹھ گئی۔ بدن کو اسپنج سے صاف کرتے ہوئے اس نے محسوس کیا کہ اس کا بدن ایک ساز بن گیا ہے جس سے عجب نغمے پھوٹ رہے ہیں ایسے نغمے پھوٹ رہے ہیں

جن سے اس کے کان، اس کا حافظہ آشنا نہ تھا۔ وہ ان نغموں سے بہت خوش ہوئی اور خوشی میں وینس کے کشتی بانوں کا صبح کا نغمہ گنگنانے لگی۔ اس کے ذہن نے کہا کہ وہ اس نغمے سے نادرہ کو مسحور کرنا چاہتی تھی تاکہ وہ دروازے سے لگی بیٹھی رہے اور باہر نہ جائے تاکہ اس کا راز اس کے چہرے، اس کی چال سے افشا نہ ہو جائے۔ ذہن کی اس راز افشائی پر وہ مسکرائی۔ بدن کو صابن سے صاف کر چکی تھی تو وہ حوض سے نکل آئی اور نہانے کے فوارہ نما نلکے کے نیچے جا کھڑی ہوئی اور اپنے انگ انگ کو ملنے مسلنے لگی۔ اس میں اس کو بے حد مزا ملا، گرم پانی کی دھاروں میں اس کا سب نشہ، سب مزا بہہ گیا اور اس نے محسوس کیا کہ وہ دن کے کاموں کے لیے تیار تھی۔ اس نے بدن کو تولیے سے خشک کیا اور تولیہ لپیٹے سنگار کی میز پر جا بیٹھی۔ کنگھی کرنے کے لیے کنگھی اٹھائی تو کچھ سوچ کر رک گئی اور نادرہ کو بلایا۔ آئینے میں دیکھا کہ اس کی آواز سے نادرہ ٹھٹکی ہے اور اس نے اپنے جسم کو اس طرح جنبش دی ہے کہ جیسے وہ بہت ہی زخمی ہو۔ اس نے محسوس کیا کہ جیسے اس کے کانوں میں نادرہ کی آہ کی آواز آئی ہو۔ آئینے میں نادرہ دروازے کے سہارے آہستہ سے اٹھی، اس نے ایک لمبا سانس لیا اور جسم کو جھٹکا اور پھر تیز تیز قدم اٹھاتی ہوئی اس کے قریب آ کر رک گئی۔

اس نے کنگھی نادرہ کی طرف بڑھا دی اور وہ اس کے بالوں میں کنگھی کرنے لگی اور پھر اس کی چوٹی کے بالوں کو گوندھ کر ان کو جوڑے کی صورت باندھ دیا۔ اس نے بدن سے تولیہ اتار کر نادرہ کو دے دیا۔ نادرہ نے تولیہ اسٹینڈ پر لٹکا دیا اور پھر اس کے پاس آ کھڑی ہوئی۔ اس نے کرتا اٹھا کر اس کو دیا اور کھڑی ہو گئی۔ نادرہ نے اس کو کرتا پہنا دیا۔ پھر اس نے پاجامہ پہن لیا اور پھر وہ نادرہ کی طرف منہ کر کے بیٹھ گئی اور نادرہ کے ہاتھ دونوں ہاتھوں سے پکڑ کر اس کو فرش پر پاس بٹھا لیا۔ وہ کچھ دیر تو اس کو غور سے دیکھتی رہی اور نادرہ بھی اس کو غور اور انتظار کی حالت میں تکتی رہی۔

نادرہ!...... میں نے آج جو کچھ تم سے کیا میں اس پر شرمندہ ہونے کی خواہش رکھتے ہوئے بھی شرمسار نہیں ہوں کیونکہ (ہنستے ہوئے) اس کے لیے خود تم بھی ذمہ دار تھیں اور ہو۔ تم اگر کمرے میں نہ ہوتیں اور تمہارا بھرپور اور جوان جسم اتنا پرکشش نہ ہوتا تو شاید میرا

عمل وجود میں نہ آتا۔ مگر میں تمہاری ممنون ہوں کہ تمہارے جسم میں کشش تھی، ہے؛ تم خوبصورت نہ ہوتے ہوئے بھی اتنی بھلی معلوم ہوتی ہو کہ میں اگر مرد ہوتی تو (ہنستے ہوئے......اس ہنسی میں کتنی خوشی تھی......) میں تمہیں ضرور خوبصورت بنا دیتی۔ مگر میں مرد نہیں ہوں...... نادرہ! میں اپنے کاروبار میں اتنی مصروف رہتی ہوں اور جمیل صاحب کی صحت مجھے اتنا پریشان رکھتی ہے کہ میں تمہاری جذباتی آسائشوں، ضرورتوں کی طرف توجہ نہ دے سکی۔ شاید میں محسوس کرتی تھی کہ تم میرے لیے ایک چھوٹی بہن کی طرح ہو، اگر تمہیں کوئی ضرورت محسوس ہوئی تو مجھے بتا دو گی...... نادرہ! کیا کوئی ایسا آدمی ہے جس سے تم شادی کرنا چاہتی ہو؟ یا کوئی ایسا آدمی ہے جو تم سے شادی کرنا چاہتا ہو اور تمہیں بھی اس سے شادی کرنا بھلا معلوم ہوتا ہو۔''

''ملا نہیں بی بی!...... جب سے میں یہاں آئی ہوں میں آپ کے دکھوں میں اتنی الجھی ہوں کہ میں نے کبھی محسوس ہی نہیں کیا کہ میں کسی مرد کی آرزو کا حاصل ہو سکتی ہوں۔ پھر مجھے آپ کو دیکھ دیکھ کر محبت کے تصور سے بھی ڈر لگنے لگا اور سب سے بڑھ کر یہ کہ میں آپ سے اتنا دور ہونے کا تصور بھی نہیں کرنا چاہتی تھی اور نہ کرنا چاہتی ہوں کہ جہاں آپ کی آواز میرے کانوں میں نہ آئے، میری آنکھیں آپ کو نہ دیکھیں۔ میری ہمیشہ سے آرزو تھی کہ مجھے آپ اپنی ننھی سی بہن سمجھیں، میں نے ہمیشہ آپ کو خوابوں میں بہن ہی کے نام سے پکارا ہے۔

آپ نے ٹھیک ہی کہا کہ آپ کے آج کے عمل کے لیے میں بھی ذمہ دار ہوں۔ میں نے ہمیشہ ہی آرزو کی کہ آپ کو سینے سے لگا کر اس زور سے بھینچوں، چوموں کہ آپ چند لمحوں کے لیے (اس سے زیادہ مدت کا میں تصور کرنا ناممکن سمجھتی تھی، سمجھتی ہوں) آپ کے دل و ذہن سے اپنے دکھوں کا احساس مٹ جائے۔

اور ویسے بی بی (مسکراتے ہوئے......اس کی مسکراہٹ میں ایک پیلاہٹ تھی، ایک حزن کی کیفیت تھی) آپ اتنی حسین ہیں کہ مجھے ہمیشہ ہی حیرت ہوئی کہ حسن اور دکھ کا ایسا رشتہ کیوں جو مجھے آپ کی زندگی میں نظر آتا ہے۔ میں یہاں آنے سے پہلے اکثر سوچا کرتی

تھی کہ اگر میں حسین ہوتی تو دنیا کی آسائشیں مجھے میسر آ سکتی تھیں۔ میں نے اکثر سوچا تھا کہ حسن سے دکھ خائف ہوتے ہیں اور حسن کے قریب آنے کی جرأت نہیں کرتے۔ آپ کو دیکھ کر میں نے اکثر سوچا ہے کہ شاید حسن و الم میں ایک لابدی رشتہ ہے کیونکہ حسن لازوال ہے اور جب لازوال کو فانی روپ اختیار کرنا پڑتا ہے تو اس کے لیے دکھ لازمی ہو جاتے ہیں۔ حسن کے لیے فرحت کی ایک ہی صورت ہے کہ وہ فنا کے عالم میں نمودار نہ ہو...... اگرچہ آپ کی پسند کی موسیقی برسوں سننے کے بعد مجھے بارہا یہ احساس ہوا ہے کہ انسانی دکھ درد حسین ہیں، فنا کو ابدیت کی راہیں دکھاتے ہیں اور مسلسل فرحت ایک بھنور ہے جس سے نکلنے کے لیے انسان کا دل جلد ہی بے تاب ہو جاتا ہے۔

......جمیل صاحب کو جب بھی مشرقی کھڑکیوں کے سامنے آرام کرسی پر لیٹے دیکھتی ہوں تو ان کے حسین چہرے کے گونگے نقوش مجھے مہم جوئی کی دعوت دیتے ہوئے محسوس ہوتے ہیں۔ مگر یہ سوچ کر دل مسوس کر رہ جاتی ہوں کہ جب آپ کی عقل، آپ کا آفاقی حسن ان کے گونگے نقوش کو نطق نہیں دے سکا تو میں حقیر اور مجبور عورت ان کے لیے کیا کر سکتی ہوں۔''

''مجھے بہت خوشی ہوئی کہ تمہارے سینے میں اتنا زندہ اور روشن دل ہے اور تمہاری نظر اتنی دوررس ہے اگرچہ اب مجھے افسوس ہو رہا ہے کہ میں اتنی دیر تمہارے دل کی روشنی سے اور تمہاری نظر کی دوری سے بے خبر کیوں رہی......

اور ہاں! تم نے اس طرح گفتگو کرنا کہاں سے سیکھا؟ تمہارے ذہن میں یہ جلا کیسے پیدا ہوئی؟ جب تم ملازمت کے لیے آئی تھیں تو تم میں یہ صلاحیتیں تو نہ تھیں...... ہاں، بالکل نہیں تھیں۔''

''آپ بالکل صحیح کہتی ہیں۔ جب میں آپ کی ملازمت میں آئی تو واقعی میں معمولی سمجھ بوجھ کی انجان لڑکی تھی۔ فارسی اگرچہ میری مادری زبان تھی مگر میں اسے بھی عام بول چال کی زبان ہی جانتی تھی اور اردو میں نے سکول میں پڑھی تھی اور انگریزی کی شدبد تو سکول میں ہو گئی تھی اور اس میں جلا مسز ڈی سوزا نے پیدا کی......''

''مسز ڈی سوزا کون؟''

''مسز کروز، جمیل صاحب کی نرس، کی بہن۔ وہ سینٹ جوزف سکول میں ہیڈ مسٹریس ہیں۔ وہ پہلے کبھی کبھی بہن کو ملنے آتی تھیں تو مجھے آپ کی لائبریری میں دیکھ کر انہوں نے انگریزی کی باقاعدہ تعلیم دینی شروع کر دی۔ اور برسوں ہی ہو گئے ہیں، شاید سات آٹھ سال، وہ سہ پہر کو یہاں ضرور آتی ہیں، بہن سے ملنے کم مجھے پڑھانے کی خاطر زیادہ۔ اور میں اس علم کو آپ کے کتب خانے کی کتابوں سے فروغ دیتی رہی ہوں۔''

''اس کے باوجود تم ایک ملازمہ ہونے اور رہنے پر قانع ہو، کیوں؟

تمہیں معاشرے میں اس علم کے بل بوتے پر ایک اچھا مقام مل سکتا تھا، کسی اچھے آدمی سے تمہاری شادی ہو سکتی تھی۔''

''ایسا ہو سکنا بعید از قیاس نہیں ہے اور نہ میرے لیے تھا۔ مگر میں اس گھر سے باہر شاید مشکل سے ہی سانس لے سکتی۔ یہاں میں اپنے آپ کو زندہ محسوس کرتی ہوں، مجھے اس گھر کی دیواریں بھی معاشرے کے عام لوگوں کے مقابلے میں زندہ محسوس ہوتی ہیں، ہوئی ہیں۔ اور سب سے بڑی وجہ تو یہ ہے کہ میں نے ہمیشہ محسوس کیا کہ مجھے زندگی کی سب نعمتیں آپ کی ہی بدولت ملیں گی، مجھے لازوال یقین ہے کہ اس گھر میں ایک معجزہ ہوگا۔ میں چاہتی ہوں، میں نے ہمیشہ ہی چاہا ہے کہ جب وہ معجزہ ہو تو میں یہاں موجود ہوں۔''

نادرہ کی گفتگو نے اس کو سوچ میں ڈال دیا۔ اور ایک لمبی سوچ کے بعد اس نے سر اٹھایا اور نادرہ سے باہر جانے کے لیے کپڑے بدل کر تیار ہو جانے کے لیے کہا۔ نادرہ کمرے سے نکل گئی اور وہ خود کپڑے بدلنے لگی۔

اس دن سے نادرہ اس کے دفتر جانے لگی۔ اس نے اس کو اپنی سیکریٹری بنا لیا اور یوں اس نے اپنے اور خورشید منظر کے درمیان اس کو حائل کر لیا۔ زندگی میں اس کے نئے رول نے نادرہ کو ایک نیا قالب عطا کر دیا۔ اس کی جوانی کھل اٹھی، اس کا مضمر حسن عیاں ہو گیا؛ اس کی چھوٹی چھوٹی پلکیں اس کے چہرے کے نقوش پر اثر انداز ہونے سے قاصر رہنے لگیں۔

اس واقعہ کے بعد اکثر اس کے دل میں یہ سوال پیدا ہوتا کہ اس نے نادرہ کو اپنا معتمد بنا کر اپنے آپ کو محفوظ کیا تھا؟ یا خورشید منظر کو شکار کرنے کو ایک انوکھا جال بچھایا تھا؟

اگلے چند برسوں میں خورشید منظر اس کے حضور نادرہ کی ہی وساطت سے پہنچتا۔ خورشید منظر نے اپنے آپ کو کپڑے کے نقوش کے ڈیزائنوں تک ہی محدود نہ رکھا۔ اس نے فنِ تعمیر میں سوجھ بوجھ پیدا کر لی اور اس فن کی باقاعدہ تعلیم حاصل کر کے سند لے لی اور ساتھ ساتھ اس کے کاروبار کی باریکیوں سے اپنے آپ کو آگاہ کرتا رہا۔

اور جب اس نے اپنے نئے چمڑہ سازی اور جوتے بنانے کے کارخانے کے لیے نقشے کے انعامی مقابلے کا اعلان کیا تو اس مقابلے میں ججوں نے خورشید منظر کے نقشے کو منتخب کیا۔ اس طرح وہ اس کے حضور پہنچنے کے لیے نئی نئی راہیں ڈھونڈ نکالتا۔ اور جب اس کے کارخانوں کا منتظمِ اعلیٰ اپنے عہدے سے صحت کی خرابی کی وجہ سے سبکدوش ہوا تو اس کے کاروبار کے سب شعبوں کے ناظموں نے خورشید منظر کی نظامت میں کام کرنے پر ہی رضامندی کا اظہار کیا اور اس کو ان کے مشورے کو رد کرنے کا کوئی جواز نظر نہ آیا اور اس مشورے کو قبول کرنے میں ہی اسے اپنے کاروبار میں مددگاروں کی فلاح نظر آئی۔

اس کے بعد ہر روز خورشید منظر کسی نہ کسی کام کے سلسلے میں اس کے دفتر کے کمرے میں آ جاتا: مشورے کے لیے، کسی حکم کی تعمیل کی اطلاع کے لیے، کسی نئی سکیم کی منظوری کے لیے۔ جب اسے کوئی کام نہ ہوتا تو مختلف ناظموں کی ماہانہ کانفرنس میں اس سے ملاقات، اس کے دیدار کی صورت نکل آتی۔ اس کے کمرے میں خورشید منظر کی حضوری میں وہ نادرہ کو ہدایات کی یادداشت لکھوانے کے بہانے حائل کر لیتی تھی مگر کانفرنس کے کمرے میں سب ناظموں کی حاضری میں ان کی عام آنکھوں سے نہاں مضمر شعوری ملاقات جاری رہتی، کانفرنس میں ان کی کاروباری صلاحیتیں ہی بروئے کار آتیں اور ان کے اصلی اور شخصی شعور آپس میں محوِ التفات رہتے۔

پھر کچھ مدت کے بعد اس کے پاس بڑے بڑے لوگوں کی فرمائشیں آنے لگیں کہ وہ خورشید منظر کو اجازت دے کہ وہ ان کے لیے کوٹھیوں، کارخانوں، بنگلوں، فلک بوس ہوٹلوں

کے نقشے تیار کر دے کیونکہ ان کی نظر میں فنِ تعمیر میں وہ فنکار تھا۔ یوں شہر کے مختلف کونوں میں خورشید منظر کی فنکاری کے نمونے اس کے وجود کا، اس کی صلاحیتوں کا، اس کی حسن کاری کا اعلان کرتے دکھائی دینے لگے۔ کبھی کبھی تو اسے ان عمارتوں کو دیکھ کر با قاعدہ احساس ہوتا کہ وہ اس سے کہہ رہی ہیں کہ خورشید منظر اس کی زندگی کو حسن کا ایک نمونہ بنا سکتا ہے اور اسے اس حسن کاری کا موقعہ نہ دینا ناروا ظلم ہے۔ جب ان عمارتوں کی باتوں پر اس نے دھیان نہ دیا تو ان پارٹیوں میں جن میں اس کا شریک نہ ہونا ایک قسم کی بغاوت یا نفرت کا اعلان ہوتا اس سے حکومت کے بڑے افسر، شہر کے رؤسا کہتے کہ وہ اپنے لیے خورشید منظر سے نیا محل کیوں نہیں بنواتی۔ آخر وہ اپنی دولت کو کب تک کاروبار ہی کی وسعت اور خیرات کے کاموں میں لگاتی رہے گی۔ اور جب وہ جانتی ہے کہ دولت ان تمام کاموں میں استعمال ہونے کے بعد فلک بوس ڈھیروں کی صورت بچ جاتی ہے تو اس کے لیے ضروری ہے، اس کا شہری فرض ہے کہ وہ شہر میں ایسا محل بنائے جو اس شہر کی روح کے شایانِ شان ہو اور خورشید منظر کی صلاحیتوں کا بہترین استعمال بھی ایسا ہی محل ہو سکتا ہے۔ چونکہ اس محل پر جو لاگت آئے گی اس کو مہیا کرنے کی صرف اسی میں صلاحیت تھی تو ایسا محل ضرور ہی اسے بنوا لینا چاہیے۔ وہ اس فعل کو فضول خرچی، دولت نمائی یا تکبر کا اظہار بتا کر اپنے ارادے پر قائم رہنے کی کوشش کرتی رہی۔ اصل بات یہ تھی کہ وہ جانتی تھی کہ اگر اس نے خورشید منظر سے اپنا محل تعمیر کروایا تو وہ ہر دم اس کے وجود، اس کی محبت کے حصار میں محصور ہو کر رہ جائے گی۔ اس بات سے اس کے کان پک گئے اور اس کو اس کے سوا چارہ نظر نہ آیا کیونکہ ایسا نہ کرنے سے اس کے جذبات کی گہرائی کا لوگوں کو پتہ چل سکتا تھا، خورشید منظر سے اس کی لگن کا ان کو اندازہ ہو سکتا تھا۔ وہ جذبات کی اس بے ستری کے لیے کسی حالت میں تیار نہ تھی۔

آخرِ کار اس نے ایک دن خورشید منظر کو شہر کے ایک ویران اور غیر آباد کونے میں محل کی تعمیر کے نقشے تیار کرنے کو کہہ ہی دیا۔ اس دن اس کی آنکھوں میں ممنونیت، مسرت، تفاخر کے جذبات چھپانے کی کوشش کے باوجود اس نے دیکھ لیے اور وہ لرز گئی۔ اس نے نہ ڈرنے کی، اس چیلنج کو قبول کرنے کی، اس کے دل و جان پر چھانے کی، ان میں رچ جانے کی اس

آخری کوشش میں اس خورشید منظر کا ڈٹ کر، میدان میں اتر، سامنے آ کر مقابلہ کرنے کی ٹھان لی، اگر چہ اس کے تخیل نے اس کو متنبہ کیا کہ وہ شاید اس مقابلے میں زیر ہو جائے۔

محل کے لیے زمین صاف ہوئی، بنیادیں کھدیں، بنیادیں چنی گئیں، دیواریں استوار ہوتی چلی گئیں، دیواروں پر چھتیں ڈالی جاتی رہیں۔ وہ ہر روز صبح کو محل کو تعمیر ہوتے دیکھنے جاتی۔ وہ کوشش کرتی کہ وہ اتنی صبح پہنچے کہ خورشید منظر وہاں نہ ہو مگر وہ اسے ہمیشہ وہاں کام میں مصروف پاتی۔ وہ کوشش کرتی کہ وہ اس کو کاروبار کے کاموں میں سست رفتار، بے خبر پائے مگر ہر جا اس کو خورشید منظر کی سوجھ بوجھ کی مہریں نظر آتیں، اس کا ذوق ہر کام میں کارفرما نظر آتا، اسے اس کے کسی کام میں بھی کوتاہی نظر نہ آتی؛ بلکہ اس کے ہر کام میں پہلے سے زیادہ تندہی، رچاؤ اور نظم نظر آتا۔ اسے کبھی کبھی تو یقین ہونے لگتا کہ وہ اپالو کے روپ میں دیونی سیوس ہے جو اپنی وجد آفرین فنکاری، سوجھ بوجھ کی پرکاری سے اس کے قلب و ذہن اور اس کے جسم کے روئیں روئیں کو بیک وقت دیوی اور پجارن بننے پر رضامند کرنے میں کامیاب ہو چلا ہے۔ مگر پھر نجانے وہ کون سی قوت تھی جو اس کو خورشید منظر کے لیے مہربان دیوی اور خورشید منظر کی پجارن بننے سے بچا بچا لیتی۔ اس کو کبھی کبھی احساس ہوتا کہ جمیل صاحب اپنے پاگل پن کے باوجود خدائے خدایاں زیوس (Zeus) کا مظہر ہیں اور وہ ان کی پجارن ہے اور وہ اپالو اور دیونی سیوس کی صلاحیتوں کے امتزاج سے ترکیب پانے والی ہر تدبیر کو ناکام بنا دیتے ہیں۔ اس نے کئی بار چھپ چھپ کر، بغیر اطلاع گھر پہنچ کر جمیل صاحب کو بغور دیکھا مگر ہر بار وہ اس کو مجبور اور بے بس نظر انسان ہی نظر آتے۔

محل کی تعمیر کے آغاز کے لمحے سے وہ نادرہ کے وجود سے بے خبر ہونا شروع ہو چلی تھی۔ اس کو آج یاد نہ آ رہا تھا کہ ان دنوں نادرہ دفتر کے کاموں کے بعد گھر میں کیا کرتی تھی، کہاں جاتی تھی۔ ایک آدھ دفعہ جب وہ صبح دیر سے اٹھی تو اس کو احساس ہوا کہ جمیل صاحب کو لئے نادرہ کہیں سے آئی ہے۔ مگر وہ جب ان کے کمرے میں داخل ہوئی تو اس کو محسوس ہوا کہ جمیل صاحب اپنے کمرے میں مشرقی کھڑکیوں کے سامنے آرام کرسی پر تکیے پر سر رکھے سو رہے ہیں، ان کے بستر پر نظر کرتی تو اس کو معلوم ہوتا کہ وہ بستر پر رات بھر سوئے تھے۔ وہ

ان کی آنکھوں کے پپوٹوں کو بغور دیکھتی تو گمان گزرتا کہ ان کے پپوٹوں پر ذرا سا بوجھ ہے جیسے سونے کا ڈھونگ رچائے ہوں۔ان کے پپوٹوں پر وہ سکون نہ ہوتا جو برسوں سے ان کا سونے کی حالت کا نشان تھا۔اوران کے چہرے کے نقوش پر اس قسم کا تکلم نظر آتا جو اس بچے کے نقوش میں ہوتا ہے جس نے ماں باپ کی باتوں کو نیا نیا سمجھنا شروع کیا ہو۔نقوش کے اس موہوم تکلم سے اس کو خوشی بھی ہوتی مگر اس خیال سے اس کو افسوس ہوتا کہ شاید، بلکہ یقیناً، یہ تکلم اس کے تخیل کی، اس کی شدتِ آرزو کا پرتو تھا، اس کی نظر کا فریب تھا۔

کبھی کبھی رات کی گہرائیوں میں اس کے شعور میں یہ احساس جاگتا کہ کوئی جمیل صاحب کے کمرے میں آہستہ آہستہ گنگنا رہا ہے، لوری دے رہا ہے مگر یہ احساس ہمیشہ خواب میں تحلیل ہو جاتا اور اس کی ماہیت کا سراغ لگانے سے اس کا ذہن ہمیشہ کتراتا۔اس کے دل میں یہ خیال آہستہ آہستہ جڑ پکڑنے لگا کہ جمیل صاحب کے کمرے میں رات کو، صبح سے کچھ دیر پہلے، اس کے سوتے ہوئے خواب کے دیس میں سرگرداں ہوتے ہوئے، نادرہ اپنی روح کو جمیل صاحب کے سوئے ہوئے شعور کو بیدار کرنے کے لیے نے کی طرح استعمال کرتی ہے۔آخر کیوں؟ اس کے دل میں اکثر یہ سوال پیدا ہوا مگر اس کا دل، اس کا ذہن، اس کا تخیل، اس کے جسم کی قوتیں اتنے بکھیڑوں میں الجھی ہوئی تھیں کہ اس کو اس سوال کا حل تلاش کرنے کی فرصت ہی نہ ملتی اور جب ملتی تو وہ اتنی تھکی ہوتی کہ وہ کئی بار رات کا کھانا کھائے بغیر ہی سو جاتی۔

محل فلک کی طرف بلند ہوتا ہی چلا گیا۔سورج ڈوب جانے کے بعد اس کی تعمیر کا کام رات کو گیسوں کی روشنی ہوتا رہا۔خورشید منظر پر ایک محویت کا عالم ہر دم طاری رہتا۔اس کو کاروبار کی ہر باریکی کا، ہر تفصیل کا شعور ہوتے ہوئے بھی کسی شے کا بھی شعور نہ تھا، جیسے اس کی شخصیت کا ایک حصہ کاروبار کی باریکیوں، تفصیلوں پر نظر رکھ رہا ہو اور دوسرا محل کی تعمیر کی ایک ایک تفصیل پر کڑی نظر رکھ رہا ہو اور دونوں ایک دوسرے سے آگاہ نہ ہوں۔

اس کے دل میں ڈر گھر کرنے لگا کہ شاید شخصیت کے اس انشقاق سے خورشید منظر کسی حادثے کا شکار نہ ہو جائے۔اس ڈر کے زیرِ اثر اس نے نادرہ کو خورشید منظر کا معتمدِ خاص

مقرر کر دیا تا کہ وہ کاروبار میں اس کے کام کے بوجھ کو ہلکا کرنے میں مددگار ثابت ہو اور اس طرح وہ اس کی حرکات وسکنات سے آگاہ بھی رہے۔

نادرہ نے اس کی معتمد بن جانے کے بعد اس کے کہنے کے باوجود اپنے لئے کوئی علیحدہ مکان نہ لیا اور جب وہ اپنے کہنے میں اصرار کرتی تو وہ عاجزی سے التجا کرتی کہ وہ اس کو اپنے سے، جمیل صاحب سے، دور چلے جانے کے لیے نہ کہے۔ اس کی التجا میں اس کو اس قدر خلوص جھلکتا نظر آتا کہ اس کو اس کے سوا کچھ بن نہ آتا کہ وہ اس کے گھر میں گھر کے ایک اہم فرد کی طرح رہے۔ جب اس کی خدمات خورشید منظر کو منتقل کر دیں تب بھی وہ اسی طرح اس کے گھر کے انتظام میں دلچسپی لیتی رہی بلکہ پہلے سے بھی زیادہ انہماک سے اس انتظام میں کارفرما رہنے لگی۔

جب محل کی تعمیر مکمل ہوگئی تو اس کے کمروں میں تعمیری آرائش کا سامان ہونے لگا۔ اس کے ہر کمرے میں کمرے کی نوعیت کے مطابق عمارتی گارے میں، سنگ مرمر میں، پیتل میں، رنگدار شیشے میں مختلف قسم کے نقش ونگار، صورتیں، تجریدی نگارشیں ابھاری جانے لگیں، ان پر رنگ کئے جانے لگے، ان کو صیقل کیا جانے لگا۔ شہر کے رئیس، افسر اور فن کار خورشید منظر کی، اس کے چنے ہوئے کاریگروں، پچی کاروں، مصوروں، صورت گروں، آئینہ سازوں کی حسن کاری کو دیکھنے کے لیے صبح وشام کی ہر گھڑی آتے رہتے اور اس کو، جب وہ وہاں موجود ہوتا، کام میں محو دیکھ کر نہ تو اس کو داد ہی دیتے نہ اس سے سوال ہی کرنے کی جرأت کرتے۔ اس خاموشی میں داد کا اتھاہ سمندر موجزن رہتا۔

ایک آدھ دفعہ ڈوبتے سورج کی روشنی میں نادرہ اور جمیل صاحب ان منقوش کمروں میں اس کو گھومتے ہوئے ملے۔ وہ ان نقوش میں اتنے محو تھے کہ وہ ان کے پاس سے گزری تو ان کو اس کا احساس تک نہ ہوا۔ اس نے چھپ کر ان کو دیکھا۔ نادرہ ان کے بائیں بازو کو تھامے کبھی اس میں ہاتھ ڈالے ان کو ایک کمرے میں، دوسرے کمرے میں لے جاتی۔ جمیل صاحب کے چہرے کو دیکھ کر کوئی اجنبی یہ اندازہ نہ کر سکتا کہ وہ پاگل تھے، ہوش سے عاری تھے؛ وہ ان کے چہرے کے سکون اور بے تکلمی کو جمال میں استغراق پر محمول کرتا۔ کئی بار اس

کو شک گزرا کہ ان کی آنکھوں کی روشنی میں ایک سمت ہے مگر وہ ان آنکھوں سے اتنی دور ہوتی کہ وہ گمان کی تصدیق نہ کر پاتی۔ نادرہ کے چہرے پر ایک والہانہ استغراق کی کیفیت رقصاں تھی۔ اس استغراق کا باعث جمیل صاحب کی معیت تھی یا خورشید منظر کے فن کی حسن کاری وہ طے نہ کر پائی۔ وہ اس دن گھنٹوں ان کا ایک کمرے سے دوسرے کمرے میں، ایک منزل سے دوسری منزل پر تعاقب کرتی چلی گئی۔ اس تعاقب میں، توجہ کی اس مسلسل خبر داری میں، اس کی روح تھک گئی۔ آخر محل کی آخری چھت پر پہنچ گئے۔ شام گہری ہوگئی تھی مگر ابھی مغرب کے آخری افق پر شفق کے آثار نمایاں تھے۔ ہلکی ہلکی ہوا چلنے لگی تھی۔ چھت پر پانی کو جمع رکھنے کے لیے سنگ مرمر کے بڑے بڑے بند حوض تھے۔ یا سوراخ دار اوندھے ہاون تھے جو نچلی چھت میں روشنی کو ایک نظم سے داخل کرنے کے لیے تھے۔ یہ ایک ہی لکیر میں نصب نہ تھے، ان کو قوسوں کے ایک متحرک نیم مدور آہنگ میں ترتیب دیا گیا تھا جس کے باعث نظر ایک ہی مقام سے ایک ہی وقت ساری چھت کا احاطہ نہ کر سکتی۔ انہیں بلند مرمریں اوندھے ہاونوں، بند حوضوں کی اوٹ میں جمیل صاحب اور نادرہ کہیں کھو گئے تھے۔ اس نے ان کی اوٹ میں چھپتے چھپاتے ان کو ڈھونڈ ہی لیا۔ ان حوضوں کے درمیانی فاصلوں میں جا بجا مرمریں کرسیاں اور شہ نشینیں بنی ہوئی تھیں۔ وہ دونوں ایک شہ نشین پر بیٹھے مشرق سے ابھرتے ہوئے چاند کو ایک محویت کے عالم میں دیکھ رہے تھے۔ چاند کی کرنیں چھت کی فصیلوں کے کنگروں کو چھو رہی تھیں۔ آہستہ آہستہ چاند کی کرنوں نے چھت کے فرش پر سایوں اور روشنی کا ایک طلسم نقش کر دیا۔ اور پھر چاند کی روشنی نے ان کے چہروں کو منور کر دیا۔ جمیل صاحب نادرہ کے شانے پر سر رکھے یکسانی سے سانس لے رہے تھے۔ ان کی دائیں آنکھ سے آنسو جھلک رہا تھا۔ اس ایک آنسو کی چمک نے اس کے لیے چاند اور تاروں کو ماند کر دیا۔ اس ایک آنسو نے اس کی تاریک شخصی زندگی میں روشنی کی اک کرن داخل کر دی۔ اس کرن کی روشنی میں اس نے اپنی نہاں زندگی کے جہان پر ایک سرسری نظر ڈالی۔ اس کو عجیب منظر نظر آئے، وہ گھبرا گئی اور اس نے ایک بار پھر ان کی طرف دیکھا۔ اس نے محسوس کیا کہ نادرہ کے ہونٹوں پر ایک خفیف سی مسکراہٹ نمودار ہوئی ہے۔ مسکراہٹ نے اس چہرے کے استغراق پر شعور کا روغن سا چڑھا دیا۔ اس کے سر نے جنبش کی، اس نے

گردن موڑ کر جمیل صاحب کو دیکھا۔ ان کے آنسو کی چمک سے اس کی آنکھوں میں ایک چمک سی کوند گئی اور اس چمکتے ہوئے آنسو کو وہ مسلسل دیکھتی رہی اور پھر اس نے ایکا ایکی رونا شروع کر دیا۔ اس کے رونے کی آواز میں دکھ نہ تھا، اس میں ایک استراحت کی کیفیت تھی، جیسے سیاہ گھٹائیں کھل کر برس جائیں اور پھر آسمان پر روشنی ہو جائے۔ وہ اس کو اوجھلے سے دیکھتی رہی۔ وہ روتے روتے شہ نشین سے اٹھ کر ان کے قدموں میں بیٹھ گئی اور ان کی گود میں منہ ڈال کر روتی رہی۔ اس کے رونے سے جمیل صاحب کے بدن میں کوئی جنبش نہ ہوئی جیسے وہ اس کے رونے سے بے خبر ہوں۔ کچھ دیر وہ یونہی ساکت بیٹھے رہے اور نادرہ ان کی گود میں منہ ڈالے روتی رہی۔ پھر اس نے دیکھا کہ جمیل صاحب نے سر اٹھا کر چاند کی طرف دیکھا ہے۔ چاند پر نظریں جمائے وہ چاند کے سفر کو دیکھتے رہے۔ اور پھر ان کی بائیں آنکھ میں ایک آنسو چمکنے لگا۔ اس کا جی چاہا کہ وہ دوڑ کر ان کے پاس جائے اور آنچل پھیلا کر ان کے آنسوؤں کو اس میں محفوظ کر لے مگر وہ ہل نہ سکی۔ پھر نہ جانے کتنی صدیوں بعد اس نے محسوس کیا کہ اس کی آنکھوں نے دیکھا ہے کہ ان کے ہاتھ نادرہ کے شانوں کی طرف بڑھے ہیں۔ ان کے ہاتھ اس کے شانوں سے اس کی گردن پر اس طرح جم گئے جیسے وہ اس کا گلا گھونٹ دینے والے ہوں۔ اس کا دم سینے میں رک گیا۔ اس نے چاہا کہ وہ چلائے اور چلا کر ان کو اس فعل سے باز رکھے مگر اس کی آواز اس کے گلے میں کھو گئی۔ اس نے چاہا کہ وہ بھاگ کر جائے اور ان کے ہاتھوں سے نادرہ کی گردن کو چھڑا لے مگر اس میں سکت ہی نہ رہی تھی، وہ صرف دیکھ ہی سکتی تھی، اس کا رول محض ایک تماشائی کا سا تھا۔ ان کے ہاتھ اس گردن کی سلوٹوں کو سہلانے لگے، سہلاتے سہلاتے رخساروں کی طرف بلند ہو گئے ان کی اس حرکت میں ارادہ اور شعور کا گمان ہوتا تھا مگر ان کے ہاتھ اس طرح اس کے رخساروں پر رواں تھے جیسے کہ نادرہ کے رخسار عورت کے رخسار نہ ہوں، پتھر کا ٹکڑا ہوں، کرسی کا بازو ہو یا سیڑھیوں کا کٹہرا ہو۔ نادرہ نے چہرہ اٹھا کر جمیل صاحب کی طرف دیکھا۔ اس کے چہرے پر حیرت نقش تھی، اس کی آنکھوں میں آنسو تیر رہے تھے، اس کے رخساروں پر آنسو کی لکیروں کے آثار تھے۔ ان کے ہاتھ اس کے رخساروں سے اس کے سر کی طرف بڑھے اور اس کے سر پر جا کر رک گئے جیسے اپنے ہاتھوں سے اس کے سر پر سایہ کر رہے ہوں۔ پھر ان کے ہاتھ

اس کے بالوں سے کھیلنے لگے، کھیلتے رہے اور پھر ایک دم رک گئے، رکے رہے۔ ان کا سارا جسم ساکت تھا، صرف ان کے سینے کے زیر و بم سے پتا چلتا تھا کہ وہ زندہ تھے، سانس لے رہے تھے۔ نادرہ ان کو صدیوں یونہی تکا کی۔ پھر اس نے ایک بہت ہی لمبا سانس لیا اور اپنے دونوں ہاتھ اٹھا کر جمیل صاحب کے ہاتھوں کو اپنے ہاتھوں میں لے لیا، ان کو چوما، ان کو اپنے رخساروں سے لگایا اور پھر ان کے ہاتھوں کو ان کی گود میں ڈال دیا۔ وہ دیر تک ان کی گود میں پڑے ہوئے ہاتھوں کو دیکھتی رہی۔ پھر اس نے ایک اور لمبا سانس لیا، اٹھ کھڑی ہوئی اور ٹہلنے لگی۔ وہ بار بار اس مرمریں بند حوض کی طرف بڑھتی جہاں وہ چھپی بیٹھی تھی مگر ایک بار بھی اتنی قریب نہ آئی کہ وہ اس کو وہاں چھپا دیکھ سکتی۔

چاند اب چھت کی بلند فصیلوں کے کنگروں سے بلند ہو چکا تھا، خنکی بڑھ رہی تھی۔ اس کو سردی لگنے لگی اگرچہ اس نے سویٹر اور کوٹ بھی پہن رکھا تھا۔ وہ بے تاب ہونے لگی کہ نادرہ وہاں سے چلی جائے تا کہ وہ بھی وہاں سے جا سکے۔ ہر لحظہ اس کی بے تابی بڑھتی ہی جاتی تھی۔ مگر نادرہ ٹہلے ہی چلی جاتی تھی۔ وہ کیا سوچ رہی تھی، اس کے سینے میں جو جذبات مچل رہے تھے وہ اس کو جاننے کے لیے جمیل صاحب کو بھی نادرہ کو بخش دینے کے لیے دل ہی دل میں راضی ہو گئی تھی۔ وہ سردی اور اپنی بے تابی کو قابو کرنے کے چکر میں لگ گئی، اپنے آپ میں کھو گئی۔ ''بولیئے، ہوش میں آیئے، میرا گلا ہی گھونٹیئے، آپ بولتے کیوں نہیں۔ کیوں بے حس بیٹھے ہیں۔''

وہ چونکی نادرہ کے بازوؤں کی گرفت میں جمیل صاحب تھے۔ نادرہ کے چہرے پر ایک عجیب کرب تھا، ایک نور سا تھا۔ وہ جمیل صاحب کو جھنجھوڑ رہی تھی۔ اس کی آواز بسیط خاموشی میں کھو گئی۔ اور پھر نادرہ جمیل صاحب کو چومنے لگی ان کے ماتھے کو، ان کی آنکھوں کو، ان کے رخساروں کو، ان کی گردن کو۔ وہ بار بار ان کو چومے جا رہی تھی مگر اس کے ہونٹ ان کے ہونٹوں سے احتراز کر رہے تھے، کرتے رہے۔ جب نادرہ بے سدھ ہو گئی، تھک گئی تو اس نے اپنے ہونٹ جمیل صاحب کے ہونٹوں سے پیوست کر دیئے۔

وہ حیران ہو گئی۔ کیا نادرہ دیوانی تھی کہ ایک دیوانے کو دیوانہ وار چومتی چلی جا رہی

تھی۔اس کا بوسہ اتنا طویل ہو گیا کہ اس کو شک ہونے لگا کہ شاید دونوں کی روح قفس عنصری سے پرواز کر گئی ہے اور وہ دونوں اب گرے کہ گرے مگر وہ دونوں بت بنے تھے،ان کے جسم ایک دوسرے میں پیوست تھے۔شاید دونوں میں ایک ہی روح سانس لے رہی تھی۔یا شاید نادرہ جمیل صاحب کے ہونٹوں سے سانس کھینچ رہی تھی۔ وہ ڈائن تھی کیا۔نہیں اس کے چہرے پر تو ایک آفاقی حلم کی کیفیت تھی۔شاید وہ ان کے ہونٹوں کے راستے ان میں اپنا نطق پھونک دینا چاہتی تھی۔

ایک بت میں حرکت ہوئی اور جمیل صاحب کے بازوؤں نے نادرہ کو شانوں سے پکڑ کر اپنے آپ سے جدا کر دیا۔ وہ زور زور سے سانس لے رہے تھے۔ان کے چہرے پر سرخی ابل رہی تھی،ان کی آنکھوں میں غضب کی چمک تھی۔ان کے ہاتھ ابھی تک نادرہ کے شانوں پر جمے تھے۔نادرہ ہانپ رہی تھی۔اس کے چہرے پر اتنی پیلاہٹ تھی کہ گمان گزرتا تھا کہ شاید ابھی ابھی قبر سے نکالی گئی ہو۔وہ دیر تک ہانپتی رہی۔جمیل صاحب کے ہاتھ اس کے شانوں سے گر گئے۔ وہ بار بار ادھر ادھر دیکھ رہے تھے۔ان کی حرکت میں شعور اپنے وجود کا اعلان کرتا محسوس ہوتا تھا۔نادرہ نے ایک لمبا سانس لیا اور دایاں ہاتھ اٹھا کر جمیل صاحب کے چہرے کو تھپکا اور پھر ان کی کمر میں ہاتھ ڈال کر ان کو سیڑھیوں کی طرف لے گئی۔

وہ سکتے میں تھی کہ آخر یہ کیا ماجرا ہے۔نادرہ اور جمیل صاحب میں جو تعلق قائم ہو گیا ہے اس کی نوعیت کیا تھی۔اس تعلق کے متعلق اس کا طرز عمل کیا ہونا چاہیے۔ایک بات کا اس کو یقین سا تھا کہ اس تعلق کی نوعیت نہ تو شہوت تھی اور نہ ہی محبت،تعلق کا باعث کوئی انوکھا جذبہ تھا۔کیا وہ رحم تھا،حلم تھا۔کیا وہ اس مہم میں کامیاب ہونے کی آرزومند تھی جس مہم میں یورپ کے بڑے بڑے ڈاکٹر اور ماہر نفسیات ناکام ہو گئے تھے۔اس کے دل سے نادرہ کے لیے دعا نکلی۔ نادرہ کا محرک جذبہ کچھ بھی ہو اس کے اس جذبے کے لیے اس کے دل میں ایک بے پناہ احترام اور ممنونیت کے جذبات انگڑائیاں لینے لگے۔

وہ اپنی کمیں گاہ سے نکل آئی اور مغربی فصیل میں بنی ہوئی ایک شہ نشین سے نیچے

دیکھنے لگی۔ دور بہت دور نیچے نادرہ جمیل صاحب کے بازو میں ہاتھ ڈالے میدان میں بڑے دروازے کی طرف بڑھ رہی تھی۔ وہ دونوں جب دروازے سے نکل کر اس کی نظروں سے اوجھل ہو گئے تو وہ شہ نشین سے اٹھی۔ اس نے محسوس کیا کہ وہ بھوک سے بے تاب ہو رہی تھی۔ وہ سیڑھیوں کی طرف بڑھی تو اس نے کسی کے اوپر چڑھتے آنے کی چاپ سنی۔ وہ رکی۔ اس نے سوچا شاید کوئی چوکیدار ہو گا۔ وہ انتظار کرنے لگی۔ چڑھنے والے نے سیڑھیوں کے دروازے سے سر نکالا۔ وہ خورشید منظر تھا۔ وہ اس کو دیکھ حیران رہ گیا۔

''آپ؟ اتنی رات گئے۔ مجھے معلوم نہ تھا ورنہ میں آپ کی تنہائی میں مخل نہ ہوتا...... یا شاید ہوتا! میں برسوں سے اس تنہائی کا منتظر تھا شاید۔ آپ نے کبھی مجھے موقع ہی نہیں دیا کہ میں آپ سے وہ سب کچھ کہہ دوں جو میرے دل میں ہے، میرے ذہن میں ہے، میرے تخیل نے مجھے بار بار، رنگ رنگ سے، سجھایا ہے...... آج اس لمحے میں اپنی زندگی کی، اپنے فن کی معراج پر پہنچ چکا ہوں۔ اب اگر مر بھی جاؤں تو مجھے دکھ نہ ہو گا۔ اس لمحے کے بعد قدرت کی ہر نوازش احسان عظیم ہو گی۔

میں نے جب سے آپ کو جمیل صاحب کے ساتھ ایک شام برسوں گزرے دیکھا اس لمحے سے میں آج تک ایک لمحے کے لیے بھی آپ کو اپنے خون کے ہر قطرے کی گرمی سے الگ نہیں کر سکا۔ اس شام میں ایک لڑکا تھا چھ سات برس کا اور آپ پر بھرپور جوانی تھی۔ جمیل صاحب باہوش تھے، حسین تھے، طاقتور تھے، آپ کے ہر طرح سے اہل تھے۔ میرے لیے آپ کا وجود سورج کی طرح رہا ہے۔ میں ایک پھول تھا جو سورج کی روشنی میں ہی زندہ رہ سکتا تھا۔ میں کئی بار مرجھا گیا مگر ہر بار آپ کے دیدار سے زندہ ہو گیا۔ پہلی ہی نظر کے بعد میں نے مصمم ارادہ کر لیا کہ جو ہو سو ہو میں ایک دن آپ کا قرب حاصل کر کے رہوں گا۔ اس قرب کی خاطر میں نے وہ سب کچھ سیکھا جس کے باعث میں اس مقام پر ہوں کہ میں اور آپ زمین سے دور، آسمان سے دور، دنیا کے ہر رشتے سے الگ، زمین و آسمان کے درمیان ایک دوسرے کے اتنے قریب کھڑے ہیں کہ ہمارے سانس کی لے سے ایک نغمہ وجود میں آ رہا ہے۔ میں ایک عرصہ سے جانتا ہوں کہ آپ میرے راز سے برسوں سے آشنا

ہیں، میں یہ بھی جانتا ہوں کہ اس راز سے آشنائی نے آپ کے طرزِ عمل کو، آپ کے قلب و ذہن کو، تخیل کے تہہ در تہہ عالموں کو، آپ کے تن بدن کے روئیں روئیں کو، آپ کے خون کی گرمی اور اس کی رفتار کو متاثر کیا ہے۔ لیکن پھر بھی آپ مجھ سے دور دور، بہت دور پھرتی ہیں۔ آخر کیوں؟ جمیل صاحب حائل ہیں؟ میں نے پہلی نظر سے آج تک یہ آرزو نہیں کی کہ آپ جمیل صاحب کو اپنی زندگی سے الگ کر دیں۔ میں نے صرف یہی چاہا ہے کہ مجھے بھی اپنی زندگی میں شریک کریں۔ میں اور آپ زندگی کی کتنی سطحوں پر لازمی رفیق ہو سکتے ہیں، ہماری ہر طرح کی نشو ونما اسی طرح ممکن ہے کہ جسم کے رستے ذہن اور تخیل اور روح کی سطح پر ایک دوسرے میں اس طرح جذب ہوں کہ ہم اپنی شخصیت کو ایک دوسرے سے الگ بھی رکھیں اور ان کو ایک دوسرے میں رچا بھی لیں، جیسے نین میں نیند۔ اور آپ کو کیسے یقین ہے کہ جمیل صاحب سے آپ کا اس طرح طبق در طبق رشتہ قائم ہے، قائم رہ سکتا ہے۔ میں دل کی تمام گہرائیوں سے، تخیل کی تمام وسعتوں کے ذرے ذرے کی زبان سے کہہ سکتا ہوں کہ میں ان کا ممنون ہوں کہ انہوں نے آپ کو وہ سب کچھ بننے میں مدد کی جو مجھ کو عزیز ہے۔ میں یہ بھی جانتا ہوں کہ ان کا پاگل پن بھی آپ کی شخصیت کی پرورش میں آج بھی، اس لمحے تک کارفرما ہے اور شاید ہمیشہ کارفرما رہے گا۔ مجھے بھی وہ مقام حاصل کر لینے دیں جو جمیل صاحب کو حاصل تھا جب وہ باہوش تھے، آپ کو جسمانی، جذباتی، ذہنی، تخلیقی، روحانی ضرورتوں، آسائشوں کو مہیا کرنے پر قادر تھے۔ میں کسی صورت قبول کرنے کے لیے تیار نہیں ہوں کہ آپ کو ماں بننے کی آرزو نہیں ہے۔ نادرہ کے ساتھ پچھلے چند برسوں میں جو سلوک آپ نے کیا وہ اس بات کا ثبوت ہے کہ ماں بننے کی آرزو، ضرورت، آپ کے لیے کتنی گہری ہے۔ وہ اگر آپ کی صلبی اولاد نہیں تو معنوی اولاد ضرور ہے۔ وہ آپ کے کتنے ہی رویوں کا پرتو ہے۔ اس کی چال میں، اس کے چہرے کے استغراق میں، اس کے جسم کی ہر جنبش کے اچھینایوں میں وہی دھیان جھلکتا ہے کہ جو آپ کے تن بدن کی ہر ادنیٰ سے اعلیٰ جنبش کے اچھینایوں میں ہے۔ آپ کو کیسے خیال گزر سکتا ہے کہ جمیل صاحب اب آپ کو ماں بنانے پر قادر ہو سکتے ہیں، آپ کیسے کہہ سکتی ہیں کہ آپ کو ایسا شریک حیات نہیں چاہیے جو نہ صرف آپ کی تنہائیوں کا محافظ ہو بلکہ جب آپ چاہیں اس میں شریک ہو سکے، جس کی

تنہائیوں کی آپ امین ہوں، جس کی تنہائیوں میں آپ سما سکیں، رچ سکیں۔

میں قبول کرنے کے لیے تیار ہوں کہ میں نے آپ کا قرب حاصل کرنے کی آرزو میں آپ کے گرد اپنی سوجھ بوجھ، ذوق نظر کے سہاروں کا، ایسے فن پاروں کا جال بن دیا ہے جو آپ کے ذوق کو لبھائیں، آپ کے تخیل میں رچ جائیں۔ اس کوشش، میں کہوں گا کہ کامیاب کوشش، سے آپ کو نظر بندی کا احساس ہوتا ہو اور آپ اپنی آزادی کو برقرار رکھنے کو حق جانتی ہیں۔ میں نے جو کچھ بھی کیا ہے اس سے یہی ہوا ہے کہ آپ کے گرد ایک ایسی فضا بن گئی ہے جس میں میرے سانس کی لے، خون کی حدت رچی ہے کیا یہ اس بات کا ثبوت نہیں کہ میں اور آپ ایک دوسرے کے لیے ہی بنائے گئے تھے۔ یہ محل تو میں نے تعمیر کیا ہے اس کا تصور بھی میرے وہم و گمان میں نہ تھا، میں سوچ ہی نہ سکتا تھا کہ آپ مجھ سے کبھی اس بات کی فرمائش کر سکتی ہیں کہ میں آپ کے لیے ایسی عمارت تعمیر کروں جس کے اندر نہ صرف آپ سانس ہی لیں بلکہ جو آپ کی تنہائیوں کی امین ہو، جس کی دیواریں نہ صرف آپ کی آواز کو سنیں بلکہ آپ کے ستر کو دیکھیں، جس کے نقش و نگار آپ کے ذوق کی تسکین کا باعث ہوں جب آپ نے خود اس کی فرمائش کی تو میں ڈرا، لرز گیا کہ اگر میں آپ کے شایانِ شان عمارت تعمیر نہ کر سکا تو میرے لیے زندہ رہنا کیسے ممکن ہو سکے گا۔ آپ کا ہر روز آنا، ہر تفصیل کو گہری اور کڑی نظر سے دیکھنا اور ان پر ذوق کی تصدیقی مہر ثبت کرنا میری نظروں سے اوجھل نہیں رہا۔

اور آپ کی واضح نوازشات کے پنہاں معنی بھی میری سوجھ بوجھ سے نہاں نہیں رہے۔ نادرہ کو میرا معتمد مقرر کرنا جتنی بڑی نوازش تھی اس کے لیے میں ممنون تو ہوں ہی مگر میں یہ بھی جاننا چاہوں گا کہ اس کا قرب مجھ کو بخش کر کیا آپ نے مجھے اپنے قریب نہیں کیا؟ اس کے تنفس کی لے میں کیا آپ کے تنفس کی لے محسوس نہیں ہوتی؟ وہ بھی آپ ہی کی طرح ہر دم میرے قریب رہتے ہوئے بھی مجھ سے دور بہت دور رہتی ہے۔ اس کو بھی آپ کی ہی طرح جمیل صاحب کی بے تکلفی، بے ہوشی، بے حواسی عزیز ہے۔ وہ ان کو لے کر یہاں اکثر ہی آتی رہی ہے۔ آج بھی یہاں آئی تھی اگرچہ میں نے اسے جاتے ہوئے نہیں دیکھا۔

آخر کیوں؟ وہ جمیل صاحب کو میرے اور آپ کے درمیان حائل کرنا چاہتی ہے۔ میں ان کو اپنے راستے سے ہٹانے کی نہیں سوچتا اور نہ ہی میں نے کبھی سوچا ہے۔ میں ان کو بھی عزیز رکھتا ہوں، میں ان کو بھی اپنی زندگی کا شریک رکھنا چاہتا ہوں۔

اور یہ نادرہ دن بدن، لحظہ بہ لحظہ آپ کے روپ میں کیوں ڈھلتی چلی جاتی ہے؟ کیا وہ سمجھتی ہے یا اس کو سمجھایا جاتا ہے کہ وہ آپ کا دوسرا قالب بن سکتی ہے اور اگر بن بھی جائے تو آپ کو تمیز کرنے میں حائل ہوسکتی ہے۔ وہ میری نظر کو فریب دے سکتی ہے، میرے حواس کو دھوکا دے سکتی ہے، میرے تخیل کو بھٹکا سکتی ہے مگر میری روح ہمیشہ ہی لاکھوں ہم شکلوں، ہم صورتوں، ہم قالبوں میں آپ کو پہچان لے گی، آپ کا تعاقب کرے گی، ابد تک، موت کے اس پار تک......

میں چوری سے آپ کی زندگی کا شریک بننے کے لیے نہ تو راضی ہوسکتا ہوں نہ اس کی آرزو ہی رکھتا ہوں۔ میں آپ کے اپنے اصولوں کے تحت، معاشرے کے قانون کے تحت، ان دونوں کو اپنے اپنے مقام پر قائم رکھتے ہوئے جہاں آپ کی زندگی، آپ کی عیاں اور نہاں زندگی کا، آپ کی خاموش اور متکلم تنہائیوں کا شریک بننے کی آرزو رکھتا ہوں وہاں آپ کو بھی اپنا عیاں اور نہاں شریک بنانا چاہتا ہوں۔''

خورشید منظر کی باتوں سے اس کے کان آج ہی آشنا ہوئے تھے مگر اس کا تخیل، اس کی روح برسوں سے آشنا تھی۔ وہ لاکھوں ہی بار اس کی ان باتوں کا جواب دل ہی دل میں دے چکی تھی۔ مگر وہ اس انجام سے اپنے آپ کو واقف نہ کرا سکی جو ان باتوں کا جواب سن کر خورشید منظر کا ہوتا۔ وہ اس پر ہر طور سے عیاں ہوتے ہوئے بھی اپنی اصل میں اس کے لیے ایک راز تھا۔ آج بھی اسے جواب میں وہی کچھ کہنا تھا جو وہ لاکھوں بار دل ہی دل میں کہہ چکی تھی۔

وہ بڑے غور سے خورشید منظر کو دیکھ رہی تھی۔ اس کے چہرے کے خدوخال کے اتار چڑھاؤ سے اس کا دل پسیج پسیج گیا مگر اس کی روح، اس کی روح سے ہم کلام ہونے پر راضی نہ تھی اور وہ یہ بات کہتے ہوئے ڈرتی تھی۔ مگر جب خورشید منظر سب کچھ کہہ کر خاموش ہوگیا

تو رات کی خاموشی میں ان کے تنفسوں کی لے سے ترکیب پانے والا نغمہ اس کے کانوں کو، اس کے حواس کو ویران کرنے لگا تو اس نے کہا!

''مجھے جو کچھ کہنا ہے اس سے تمہاری شخصیت کا ذرہ ذرہ آشنا ہے۔ تمہاری روح اس کو قبول کر چکی ہے۔ پھر مجھ سے کیسا مطالبہ؟ کانوں سے سننا چاہتے ہو؟ کیوں؟ میری اپنی آواز میری روح کی آواز کو گم نہیں کر سکتی، مجھے تمہاری آرزو کی طرف ایک قدم بھی بڑھنے پر مجبور نہیں کر سکتی۔

جب میں جوان تھی تو تم اپنی ماں کی گود میں دودھ کے لیے بلبلاتے ہو گے، جب میری نظریں رفیق کی متلاشی تھیں تو تم کہاں تھے؟ تم کو میری تلاش تھی؟ ہرگز نہیں! جمیل صاحب میرے لیے رحمت بن کر نازل ہوئے۔ میری نس نس میں رچ گئے، میرے تخیل میں بس گئے، میرے جسم نے ان کو لبیک کہا، میری روح نے ان کو رفیق کہا۔ حیات و موت کے خالق نے میرے لیے ان کو مقدر کیا تھا۔ میں اگر چاہتی بھی تو ان کے سوا کسی کو انتخاب نہیں کر سکتی تھی۔ میرے تن بدن کے ذرے ذرے پر ان کی مہریں ہیں، ان کو مٹانا بھی چاہوں تو مٹا نہیں سکتی۔ تمہیں اپنی زندگی میں شریک کر بھی لوں تو تم شریک نہیں بن سکو گے کیونکہ میرے ہر ابھینائے میں، میری ہر بات میں، میرے تنفس کی لے، میرے انگ انگ کی ہر قوس میں تمہیں جمیل صاحب کی شکل نظر آئے گی۔ میری زندگی کی ہر راہ پر تم کو جمیل صاحب کے قدموں کے نشان ملیں گے۔ تم آخر انسان ہو، فن کار ہو، نئی راہیں تلاش کرنے کی آرزو رکھو گے اور میری زندگی میں ہر راہ پر تمہیں جمیل صاحب میرے ساتھ چلتے نظر آئیں گے۔

میں یہ مانتی ہوں کہ میں ماں بننے کی آرزو رکھتی ہوں اور یہ بھی جانتی ہوں کہ جمیل صاحب جس حالت میں ہیں وہ اس آرزو کی تکمیل میں میری مدد کرنے سے قاصر ہیں۔ مگر تمہیں کیسے یقین ہے جو میری اور جمیل صاحب کی آرزوؤں اور کوششوں سے نہ ہو سکا وہ تمہاری مدد سے ہو سکے گا۔

تمہیں یہ بتانے میں بھی مجھے کچھ جھجک نہیں کہ اگر جوانی میں تمہیں جمیل صاحب سے

پہلے دیکھ پاتی، تم سے مل جاتی تو شاید تم ہی میرے رفیق ہوتے۔ مگر ایسا نہیں ہوا۔ انسانی زندگی ایسے ہی حادثوں کا نام ہے۔ میں اپنے ماضی کو نہیں بدل سکتی، میرا جسم، میرا ذہن، میرا تخیل، میری روح جمیل صاحب کو بھلا نہیں سکتی، ان کی مہروں کو توڑ نہیں سکتی، شاید کوئی بھی نہیں توڑ سکتا۔ انہونی کو ہونی بنانا ہم انسانوں کے بس میں نہیں۔

مجھے یہ قبولنے میں بھی باک نہیں کہ تمہارے جسم کی ہر ادا نے، تمہارے ذہن کی ہر اپج نے، تمہارے ذوق کی لطافتوں نے، تمہارے فن پاروں میں عیاں تخیل کے ہر عالم نے برسوں مجھے للچایا ہے، تم سے وصل کے خیال نے لاکھوں بار بے تاب کیا ہے۔ مگر یہ للچانا، یہ بے تابی، کبھی بھی میرے جسمانی، ذہنی، تخیلی عوامل کو اس حد تک متاثر نہیں کر سکا کہ میری روح ان کو ایسے عمل کی شکل اختیار کرنے کی اجازت دے دیتی جو اس وصل کے تصور کو واقعہ میں بدل دیتی۔ میں یہ بھی ماننے کے لیے تیار ہوں کہ اس للچانے اور بے تابی کے لیے میں آج اس لمحے شرمسار نہیں ہوں، مجھے اس للچانے اور بے تابی کی ہر یاد حسین نظر آتی ہے، میں ان کو کسی بھی حالت میں بھلانا نہ چاہوں گی، اس للچانے اور بے تابی نے مجھ پر اتنے نئے عالم وا کئے ہیں کہ میں ان عالموں میں ہر دم داخل ہو سکنے کے حق سے کسی صورت دستبردار نہ ہوں گی۔ میں بزدل بھی نہیں کہ چاہوں کہ تمہارے قرب سے دور ہو جاؤں تا کہ تم مجھے للچا نہ سکو۔ میں یہ بھی جانتی ہوں میں اس قرب میں تمہیں ہمیشہ ہی للچاتی رہوں گی اور ایسی صورت کا تصور مجھے گنہگار ہونے کا احساس نہیں دلاتا کیونکہ مجھے یقین ہے کہ یہ للچانا تمہاری صلاحیتوں کو کسی طرح نقصان نہیں پہنچائے گا بلکہ ان کی نشو ونما اور ان کی ربوبیت کا ضامن ہے، تم پر ایسے عالموں کی راہیں کھولے گا جو تم کو بحیثیت انسان، بحیثیت فنکار، عزیز ہوں گی اور ان راہوں کے سفر سے جو تخلیقات تم سے ممکن ہوں گی وہ صاحب دل اور باذوق اور صاحب فکر لوگوں کے لیے انسان کے روحانی ارتقا کی نشانیاں اور ان کا ثبوت ہوں گی۔

اگر تم اپنی روح کی گہرائیوں میں میری باتوں کی حقیقت کو قبول نہیں کرتے یا تم کو یہ سب ایک فریب معلوم ہو اور تم مجھ سے وصل کے بغیر اپنی شخصیت، اپنی انسانیت، اپنی خلقیت کے ناممکن ہو جانے یا بے معنی ہونے کو عین ممکن سمجھو تو میرا جسم، میرا ذہن، میرا تخیل

اس وصل کے تجربے کے لیے رضا مند ہے۔ یہ بھی یقین رکھو کہ میرا جسم، میرا ذہن، میرا تخیل اس تجربے کی لطافتوں کو، کثافتوں کو، شادمانیوں کو، ویرانیوں کو رحمت نہیں تو عذاب بھی نہ سمجھے گا۔ مجھ میں یہ جرأت ہمیشہ سے ہے کہ اگر زندگی کی مردودترین راہ میں بھی مجھے اپنے مقدر کی اطاعت کا گمان بھی ہو تو اس کو اختیار کرنے سے نہ ڈروں گی، نہ جھجکوں گی۔ مقدر کی اطاعت کو میں زندگی کی معراج سمجھتی ہوں۔ میرا اگر ایمان ہے تو یہی، دین ہے تو یہی۔ میں تم سے بھی یہی توقع رکھتی ہوں کہ تم بھی مقدر کی اطاعت سے نہ گھبراؤ گے، چاہے اس اطاعت میں معاشرے کے قوانین پر کتنی ہی بڑی زد پڑتی ہو۔ میں معاشرے کے قوانین سے اس اصول کے تحت انحراف سے نتیجتاً وجود میں آنے والی تمام تعزیروں اور عذابوں کو قبول کرنے کا جگر رکھتی ہوں اور تم سے بھی اس کی طلبگار رہوں۔ اگر تم ان مقامات پر تصرف کر لینے کا مقدور نہیں رکھتے تو تم میں مجھ میں کسی قسم کے رشتہ کا امکان ناممکن ہے، مجھے نامنظور ہے......

اس وقت میری پکار کو سن کر کوئی بھی تمہاری آرزو کی تکمیل میں حائل نہیں ہوسکتا، ہم سے جہاں والے بہت دور ہیں، موت و حیات کا مالک میری مدد کے لیے اپنی طاقتوں کو بروئے کار لانے کی نہیں سوچے گا۔ اگر تم میرے وصل کے لیے طاقت کے استعمال کرنے کی جرأت رکھتے ہو تو میں تمہاری جرأت کو آزمانے کے لیے، للچانے کے لیے حاضر ہوں۔ جو چاہو کر گزرو میں اس کو تمہیں للچانے کی سزا سمجھ لوں گی......''

چاند چھت کی مغربی فصیل کے کنگروں پر قدم جمائے نہ جانے کس انتظار میں رک گیا تھا۔ کرنوں نے چھت پر روشنی اور سایے کے امتزاج سے عجب عجب نقش فرش پر، مشرقی فصیل کی دیوار پر ابھار دیئے تھے۔ ہوا بھی دم بخود ہوگئی تھی۔ میلوں خاموشی دم سادھے موت کا روپ بھرے پڑی تھی۔ نیلے چمکتے ہوئے آسمان پر تاروں کے کارواں دم لینے کو رک گئے تھے۔ دور ساحل سے پرے سمندر کی سطح سے بحری جہازوں پر نصب بجلی کے دور بینی چراغوں کی روشنیاں پٹیوں کی صورت میں فضا میں نہ جانے کیا ڈھونڈ رہی تھیں کیونکہ کسی طیارے کی آواز فضا میں نہ تھی۔

چاندنی خورشید منظر کے چہرے کے دائیں حصے کو منور کیے ہوئے تھی۔ اس کی دائیں آنکھ میں عجب مدھم سی مگر بہت واضح روشنی ابھر ڈوب رہی تھی۔ اس کی نظریں اس کے جسم کی ادنیٰ سی جنبش کا تعاقب کرنے کے لیے ہوشیار تھیں۔ مگر وہ تو وہاں سے ٹل جانے کے لیے نہ سوچ رہی تھی۔ وہ اس للچانے اور بے تابی کا انجام دیکھ لینے پر تل گئی تھی۔ خورشید منظر کا جسم بت بنا تھا۔ اس کا سارا بدن اندھیرے میں تھا اور خود اس کا چہرہ اور گردن اور شانے اندھیرے سے اوپر تھے۔ اس کے سانس کی لے بہت ہی مدھم تھی، کبھی کبھی تو اس کو گمان ہوتا کہ لے رک گئی ہے، اندھیرے میں کہیں ڈوب گئی ہے۔ گزرتے وقت کی چاپ وہ باقاعدہ اور مسلسل سن رہی تھی۔ وقت کی چاپ نہ تو ان سے دور ہی جارہی تھی اور نہ قریب ہی ہو رہی تھی، شاید وقت بھی انتظار میں بے تابی سے ان کے آس پاس ٹہل رہا تھا۔

پھر یکایک اس کا چہرہ اندھیرے میں ڈوب گیا مگر اس کے کانوں میں اس کے گھبرانے کی آواز نہ آئی، اس نے چاند کی طرف دیکھا۔ اس کا نچلا کونا نظروں سے اوجھل تھا۔ چاندنی ابھی اس کی پیشانی پر اور اس کی آنکھوں میں تھی۔

اندھیرے میں کسی کے قدموں کی چاپ لرزی۔ خورشید منظر چاندنی میں ہو گیا تھا۔ اس کے چہرے پر عجیب استغراقی وجد کی سی کیفیت تھی۔ اس کیفیت میں حرکت نہ تھی، اس پر تبدیلی کا گمان نہ ہوتا۔ کیفیت اس کے چہرے کا رنگ بن چکی تھی۔ اس کی آنکھوں میں ایک شعلہ منجمد ہوا دکھائی دیتا تھا۔ اس کی ناک کے بائیں طرف ایک ننھا سا سایہ سو رہا تھا۔ اس کے سینہ پر زیر و بم کا موہوم سا گمان ہوتا تھا۔ وہ اس کے جسم سے کسی واضح جنبش کی منتظر تھی شاید۔ اس کے روشن ہونٹوں کے درمیان اندھیرے کا گمان ہوا اور فضا میں ایک انوکھی، انجانی آواز سرگوشیاں کرنے لگی۔

''میں نے برسوں اس ملاقات کے لیے انتظار کیا ہے۔ میں ابھی برسوں انتظار کرنے کی طاقت رکھتا ہوں۔ میں برسوں انتظار کروں گا۔ شاید تمہاری روح میری روح سے ہم کلام ہونے کو پسند کر لے۔ اس مبارک گھڑی تک میں چاہوں گا کہ آپ اس قرب کی نوعیت میں کسی تبدیلی کو روا نہ رکھیں جو اس لمحے مجھ میں آپ میں ہو گیا ہے۔ مجھے اگر

شراکت کا شرف نہ دیں تو رفاقت کا شرف ضرور عطا کریں۔ مجھے اجازت دیں کہ اس گھر میں جس میں میری روح رواں ہے میں ایک دوست کی طرح آ جا سکوں۔"

"مجھے تمہاری دوستی قبول ہی نہیں عزیز ہے۔ جس جنت نظیر کو تم نے خلق کیا ہے میں تمہیں اس جنت سے کیسے محروم کر سکتی ہوں۔ میں ایسے ظلم کی کبھی بھی مرتکب نہیں ہوں گی۔"

خاموشی مترنم ہو چکی تھی۔ چاند اپنی فصیل سے نیچے کود چکا تھا، تاروں کے کارواں سستا کر ایک بار پھر سفر پر روانہ ہو چکے تھے۔ چھت پر اندھیرا چھا چکا تھا۔ خورشید منظر نے اس سے کہا کہ اسے اب گھر چلا جانا چاہیے۔ نادرہ اور دوسرے لوگ نہ جانے اس کو کہاں کہاں تلاش کرتے پھرتے ہوں گے۔ وہ ٹارچ کی روشنی میں پیچانی سیڑھیوں سے اتر نچلی منزل پر آئے اس کے کمروں میں غیر شفاف شیشے کے ٹکڑوں میں گھرے، شفاف نیلے، پیلے، لال، گلابی اور سنہرے اور سادہ شیشوں میں سے چھن چھن کر آتی ہوئی چاندنی نے تاریک ٹکڑیوں سے مل کر عجب طلسم باندھ رکھا تھا مگر انہوں نے اس طلسم پر نظر نہ کی اور منزل بہ منزل اترتے ہی چلے گئے۔ جب نیچے میدان میں پہنچ گئے تو صحن کے بند دروازے میں سے دور دوڑتی آتی ہوئی کاروں کی روشنیاں ہر دم قریب ہوتی نظر آ رہی تھیں۔ جب وہ دروازے کے قریب پہنچے تو خورشید منظر نے یہ کہتے ہوئے رخصت چاہی کہ وہ محل کی چھت پر صبح کا انتظار کرے گا۔

پانچواں باب

جب رابعہ اپنے استغراق سے بیدار ہوئی تو اس نے دیکھا کہ فردوس صوفے پر نہیں ہے۔ وہ لمحہ بھر کے لیے حیران سی ہو گئی۔ اس نے ارد گرد دیکھا تو فردوس کو پیانو کھولے، پیانو کے سٹول پر بیٹھے موسیقی کے اشارتی کتابچوں کے ورق الٹتے ہوئے پایا۔ اس کو بیدار ہوتے دیکھ کر فردوس نے پوچھا کہ اگر اس کو ناگوار نہ ہو تو وہ پیانو پر کوئی نغمہ چھیڑے۔ رابعہ نے سر ہلا کر اثبات میں جواب دیا۔

فردوس نے موتسارت کا ایک نغمہ چھیڑ دیا۔ رابعہ نے محسوس کیا کہ فردوس کو جیسے معلوم ہو کہ وہ کہاں کہاں سرگرداں رہی تھی اور وہ اب ماضی کے نہاں خانوں کی سیر کے بعد کس حالت میں ہے۔

فردوس کی انگلیاں طربوں کو سہلاتی رہیں، گدگداتی رہیں اور نغمہ لحہ بہ لحہ جسم اختیار کرتا ہوا جوانی کی منزلیں طے کرتا عروج پکڑتا چلا گیا۔ رابعہ حیران تھی۔ اس نے موتسارت کا یہ نغمہ پہلے تو کبھی اس طرح نہ سنا تھا۔ نغمہ کی تجسیم اس کے لیے بالکل نئی چیز تھی۔ اس نے محسوس کیا کہ وہ خود آواز تھی، لے تھی، جو آہستہ آہستہ جسم اختیار کرتی جا رہی تھی۔ کبھی کبھی اس کو شدت سے احساس ہوتا کہ اس کے ماضی کا ایک ایک منظر جو ابھی ابھی اس کے تخیل کی بزم میں حاضر تھا اور ابھی تک اس کی آنکھوں میں رم رہا تھا، آواز بن کر، لے بن کر، پیانو کی طربوں سے پھوٹ رہا ہے، مستقبل کے ایوانوں کی طرف اڑا جا رہا ہے۔

نغمہ اپنی معراج پر پہنچ کر ایک خفیف سے وقفے کے لیے ٹھٹکا اور یہ وقفہ رابعہ پر بھاری ہو گیا۔ اس نے محسوس کیا کہ جیسے خاموش ویرانی صدیوں تک پھیل گئی، اس کے ماضی کی ایک ایک یاد اس سے رخصت ہو چکی ہے، اس کے دل پر، اس کے سینے پر، اس کے ذہن پر، اس کے جسم پر کسی قسم کا بوجھ نہیں ہے؛ وہ بالکل آزاد ہے، ماضی سے، حال سے، مستقبل سے، وہ اتھاہ، تاریک، ساکت، افق تک پھیلے ہوئے پانیوں پر روشنی کا ایک نقطہ ہے۔ اس کی روح نغمے کے کوچ کے لیے بے تاب ہو گئی۔ اس نے گھبرا کر پیانو کی طرف دیکھا۔ فردوس کے ہاتھ طربوں پر، ان کو نہ چھوتے ہوئے، معلق تھے۔ اس کے دل سے دعا نکلی کہ ہاتھ طربوں کو چھوئیں، ان کو گدگدائیں اور نغمے کو، کہ سو چلا تھا، پھر سے حکم سفر دے دیں۔ اس کی دعا قبول ہوئی، فردوس کی انگلیاں طربوں پر تھرکنے لگیں۔ ٹھٹکا ہوا نغمہ اتنی آہستہ سے اپنی منزل کی طرف سرکنے، رینگنے لگا، کہ اس کو سننے کے لیے اپنی تمام قوتوں کو، صلاحیتوں کو قوت سامعہ میں مرکوز کرنا پڑا۔ نغمہ اس کی نس نس میں رچ گیا۔ اس کے کان آنکھ بن گئے تھے، وہ نغمے کے جسم کو دیکھ سکتی تھی، ایک اتھاہ پہنائی تھی جس کے اوپر چمک دار نیلے سبز سنہری پروں والا ایک عقاب دو روشن افقوں کے درمیان مائلِ پرواز تھا۔ اڑتے اڑتے تھک جاتا تو وہ پر

کھول کر فضا میں تیرنے لگتا، تیرتا رہتا، پھر بازو ہلا ہلا کر اڑنے لگتا، اڑتے اڑتے، تیرتے تیرتے تھک جاتا، تھک کر نڈھال ہو جاتا تو پہنائی میں ڈوبنے لگتا، ڈوبتا چلا جاتا، اس کے چمکتے نیلے سبز سنہری پروں سے پھوٹنے والی روشنی سیاہی میں گم ہونے لگتی تو وہ ایک بار پھر بازو ہلا ہلا کر سیاہی میں سے ابھر آتا اور روشن افق کی طرف اڑنے لگتا۔ نیلے سبز سنہری چمکتے پروں والا عقاب روشن افق کی طرف بڑھتا ہی چلا گیا، روشن افق میں جذب ہو گیا۔ نغمہ ختم ہو گیا۔ پوری فضا نغمے کا جسم تھی۔ نغمے کا جسم کمرے میں معلق تھا۔ رابعہ نے محسوس کیا کہ وہ نغمے کے جسم کو انگلی سے چھو سکتی تھی۔ اس کے ہونٹوں نے نغمے کے جسم کو محسوس کیا۔ اس کے ہونٹ خشک ہو گئے۔ اس نے ہونٹوں پر زبان پھیری۔ اس کے ہونٹ ابھی نغمے کے جسم کی حدت کو محسوس کرنے کے چکر میں ہی تھے کہ فردوس پیانو کے پٹ بند کر کے اس کے پاس آ بیٹھی۔ اس نے رابعہ کی گود میں سوئے ہوئے ہاتھ گود سے اٹھا کر اپنے ہاتھوں میں لے کر تھپکنے شروع کیے، جیسے ان کو تسلی دے رہی ہو، اس کے درد میں خاموشی سے شریک ہو رہی ہو۔

شمالی دروازے سے نظر آنے والے صحن کے فرش سے، اس کے مرمریں جالی دار جنگلے پر سے، کرنیں بلند ہو چکی تھیں اگرچہ جنگلے کے اوپر کی فضا میں کرنوں کے سنہرے جال لہرا رہے تھے۔ دور شمالی افق پر نیلے چمکدار آسمان کے پس منظر میں ابھرتے ہوئے نیلے پہاڑوں کی برفیلی چوٹیوں پر ہن برس رہا تھا۔ نیلے چمکدار آسمان، نیلے پہاڑوں کی برفیلی چوٹیوں، مرمریں جالی دار جنگلے کے اوپر کی فضا میں لہراتے ہوئے سنہرے جال، صحن میں پڑی ہوئی میزوں پر پڑے ہوئے سرخ، پیلے میز پوشوں کی پھڑ پھڑاہٹیں، کرسیوں میں سوئی ہوئی سبز مخملی گدیوں کی استراحت، دروازے کے ساتھ مشرق کی طرف کھلی ہوئی کھڑکی میں پڑے ہوئے دبیز گہرے سرخ پردے کی لہراہٹ، آسمان و زمین کے درمیان پھیلے ہوئے، فضاؤں میں، ہر شے میں رچے امن کا اعلان کر رہے تھے۔

یہ امن رابعہ اور فردوس کے جسموں کو چھونے کے باوجود ان کے ذہن اور قلب کی گہرائیوں، پہنائیوں، وسعتوں اور سطحوں کو متاثر نہ کر سکا۔ اگر متاثر کر بھی سکتا تو شاید وہ

دونوں اس امن کے لمس سے اپنے قلب و ذہن کے دامن بچا لیتیں کیونکہ جو ہیجان ان کے رگ و پے میں رچ گیا وہ ان کے لیے زندگی کا، مقدر کا، نشان بن چکا تھا جس سے بچنے کی، جس سے آنکھ چرانے کی آرزو اپنی روح کی ابدی تمنا سے انحراف کے مترادف ہوتی۔ مگر فضا میں رچے ہوئے امن کے رنگ ان کی آنکھوں کو گدگدانے، لبھانے لگے تھے، نظارے کی دعوت دے رہے تھے۔ ان کی آنکھیں سرگوشیاں کرنے لگیں۔ آخر امن کے رنگ دیکھنے میں، ان سے نظروں کو سہلانے میں کیا حرج ہے۔

رابعہ کے ہاتھوں کو تھپکتے ہوئے فردوس کے ہاتھوں نے چمکتی برفیلی نیلا ہٹوں، سنہرے دھندلکوں، میز پوشوں، گدیوں، پردے کے رنگوں کے رقص، میز پوشوں اور پردے کی پھڑ پھڑاہٹ کے الحان کو محسوس کیا؟ اور تھپکتے ہوئے ہاتھوں کے لمس سے رابعہ کے شعور میں رقص والحان کے اس احساس کو داخل کیا۔ اس احساس کو اس نے حسین پایا۔ اس نے چاہا کہ وہ اس احساس میں جمیل صاحب کو بھی شامل کرے۔ مگر جمیل صاحب کہاں تھے؟ اس کو خیال آیا۔ اور فردوس کا مہمان؟ کیا وہ دونوں اکیلے اکیلے تھے؟ اس خیال سے اس کو لمحے بھر کے لیے گناہ کا احساس ہوا جیسے اس نے اپنے ماضی کی یادوں کے حظ میں دونوں کو بھلا دیا ہو اور اس بھلا دینے پر خوش ہو۔ ہوسکتا ہے کہ وہ دنوں اکٹھے ہوں؛ ایک دوسرے سے ہم کلام ہوں، اس نے سوچا۔ اس خیال کو اس نے محض طفل تسلی سمجھا اور یہ جاننے کے لیے وہ بے تاب سی ہونے لگی کہ جمیل صاحب اور وہ ڈاکٹر صاحب، کیا تھا ان کا نام،...... متین صاحب، ہاں! متین صاحب کہاں تھے۔ وہ واقعی متین تھے۔ ابھی وہ اسی ادھیڑ بن میں تھی کہ ایک بوڑھی مگر واضح اور پراعتماد آواز نے اس کو چونکا دیا۔

''بی بی! چائے کا وقت ہولیا۔ چائے کہاں لگواؤں، کھانے کے کمرے میں؟ یا باہر صحن میں، دھوپ میں؟ یا آپ اپنے مہمانوں کا انتظار کرنا پسند کریں گی؟''

''مہمان کہاں ہیں؟''

''گھر میں تو کہیں نہیں ہیں۔ شاید نیچے میدان میں ہوں۔ آپ کی دوربین لے آؤں؟''

''ہاں! ہاں! باہر صحن سے میدان میں دیکھوں گی۔''

پھر رابعہ کو مخاطب کرتے ہوئے ''آیئے صحن میں چلیں۔ جمیل صاحب اور متین صاحب شاید دریا کا نظارہ کرتے ہوں گے۔'' دونوں صحن میں چلی گئیں۔ بوڑھا نوکر جو لباس سے نوکر کم گھر کا فرد زیادہ دکھائی دیتا تھا، دوربین لے آیا۔ فردوس نے دوربین لگا مرمریں جنگلے پر کہنیاں ٹکا نیچے میدان میں نظر دوڑائی۔ شمال، شمال مغرب، مغرب میں وہ کہیں نہ تھے۔ آخر اس کی نظروں نے جنوب مغرب میں ان دونوں کو پتھروں پر بیٹھے محوِ کلام پالیا۔ جمیل صاحب بول رہے تھے۔ استغراق کی کیفیت ان کے چہرے پر رقصاں تھی۔ متین صاحب خاموشی سے، گہرے انہماک سے ان کی باتوں کو سن رہے تھے۔ اس نے دوربین رابعہ کی طرف بڑھا دی۔ رابعہ نے بھی ان کو پالیا۔

''کتنے استغراق سے جمیل صاحب باتیں کر رہے ہیں۔ کیا کہہ رہے ہوں گے؟ دل کی بات؟'' رابعہ نے محویت میں کہا۔

''ہاں! متین صاحب سے ہر کوئی دل کی بات کہے بغیر رہ نہیں سکتا۔''

''مجھے بہت خوشی ہوئی ہے کہ آخر آج وہ اتنی طول طویل خاموشی کے بعد کسی سے تو دل کی بات کہنے کے قابل ہوئے۔ خدا ان متین صاحب پر اپنی رحمت برسائے۔''

رابعہ دیر تک جمیل صاحب کو باتیں کرتے دیکھتی رہی۔ پھر ٹھنڈی آہ بھری اور دوربین آنکھوں سے ہٹا فردوس کی طرف متوجہ ہوئی۔

''جمیل صاحب اپنی کہہ چکے ہیں۔ اب متین صاحب بول رہے ہیں۔ جمیل صاحب کے چہرے سے اب اندھیرے چھٹ گئے ہیں جو برسوں ان کے چہرے کی فضا کا لازمی حصہ رہے، ان کے چہرے پر روشنی ہے، ایک مسلسل روشنی۔ ایسی روشنی میں نے پہلے کبھی ان کے چہرے پر نہیں دیکھی......''

''ایسی روشنی اپنے آپ کو سمجھ لینے کے بعد پیدا ہوتی ہے!''

''کاش ایسا ہی ہو۔''

''یہی ہوسکتا ہے۔ متین صاحب کی معیت میں یہی محسوس کیا ہے کہ میں اپنے آپ کو سمجھ رہی ہوں، ماضی کو روشن آنکھوں سے دیکھ رہی ہوں، مستقبل کو مضبوط دل سے دیکھ سکتی ہوں۔ ان کے آس پاس کی فضا سے بھی اعتماد پیدا ہوتا ہے۔''

رابعہ نے ایک بار پھر دوربین لگائی، نیچے جنوب مغرب کی طرف دیکھا۔ متین صاحب ابھی بول رہے تھے۔ جمیل صاحب کا استغراق پہلے کی طرح نورفشاں تھا۔ جیسے متین صاحب کی باتوں سے ان کے مسئلے حل ہوتے چلے جا رہے ہوں۔ اس کے دل میں اطمینان نے انگڑائی لی اور بیدار ہوگیا۔ اس نے دوربین آنکھوں سے ہٹائی اور فردوس کی بانہہ میں بانہہ ڈال کر کہا:

''آؤ! دھوپ میں بیٹھیں۔ جمیل صاحب کی طرف سے مطمئن ہوں۔ مجھے یقین ہے۔ وہ جب بھی لوٹیں گے تو سوجھ بوجھ کے ایک نئے انوکھے عالم کو ساتھ لئے ہوئے آئیں گے۔ یہ تمہارے متین صاحب کے چہرے پر اتنا اعتماد، اتنا اطمینان کیوں جھلکتا ہے؟...... جواب دینے کی ضرورت نہیں۔ یونہی فضول سا خیال تھا۔ شاید مجھے ان پر رشک آ گیا تھا۔ رشک ہونا ہی چاہیے۔ اطمینان اور اعتماد بہت بڑی نعمت ہیں...... چائے کے لیے کہو۔ وہ شاید بہت دیر میں لوٹیں۔''

چائے کے برتن لگ گئے۔ چائے کے برتنوں پر دودھ سی سفید زمین پر گلابی رنگ اس خوبی سے چڑھا تھا کہ ان پر زندگی کا گمان ہوتا تھا۔ چائے آ گئی۔ فردوس نے چائے بنائی۔ چائے کا رنگ، پیالیوں کے اندر کی سفیدی، ان کے باہر کا گلابی رنگ، مرمریں جالی دار جنگلے پر سوئی ہوئی دھوپ کا سنہرا رنگ، دور افق تک پھیلی ہوئی ٹھنڈی ٹھنڈی نیلاہٹیں، جنگلے کی جالی کے سوراخوں میں سے نظر آتے ہوئے درختوں کا لہراتا ہوا سبز رنگ ایک عجب نغمہ چھیڑ رہے تھے۔ رابعہ پر ایک نشے کی کیفیت طاری ہونے لگی۔ اس نے اس نشے پر قابو پانے کی کوشش میں چائے کا ایک گھونٹ پیا۔ گرم گرم چائے نے اس کی زبان کو، اس کے ذائقے کو گدگدایا۔ اس نے فردوس کی طرف غور سے دیکھا۔ فردوس کرسی کے بازو پر کہنیاں جمائے، دائیں ہاتھ کے انگوٹھے اور انگشت شہادت میں گلابی پیالی کو پکڑے، بائیں ہاتھ کی انگلیوں کے

پوروں سے پیالی کو سہارا دیئے، پیالی کے کنارے سے ذرا دور ہونٹوں کو نہ جانے کیا کر رہی تھی؟ یہ کیا سوچ رہی تھی؟ گلابی انگلیوں میں پکڑی ہوئی گلابی پیالی کا سفید سفید کنارہ، اس کنارے سے ذرا دور گلابی ہونٹ اور ان گلابی ہونٹوں پر ستواں ناک کے آہستہ آہستہ پھڑپھڑاتے ہوئے ہلکے گلابی پردے، اس ناک کے اوپر جھکی ہوئی لمبی لمبی سیاہ پلکوں کے سائے میں نیم باز آنکھیں، ان نیم باز آنکھوں پر روشن، شکن آلود پیشانی کا حاشیہ، اس پیشانی پر ہلکی ہلکی ہوا میں جھولتی ہوئی سیاہ بالوں کی ایک لٹ، ان سب نے مل کر رابعہ کے تخیل میں ایک طلسم باندھ دیا۔ فردوس اپنی ماں کی طرح حسین نہ تھی۔ اس کی ماں کا حسن آگ کا گلزار تھا جس میں تخیل کے بھی پر جلتے تھے۔ فردوس کا حسن ایک محل تھا جس میں اذن کے بعد راحت تھی، آرام تھا، سکون تھا اور دل کا گداز تھا۔ فردوس کی ماں کا حسن ملکوتی تھا، غیر انسانی تھا، جو انسانوں سے عجز اور پرستش کا طالب تھا۔ فردوس کا حسن رحمت کی بارش تھی۔ فردوس کی ماں کا حسن اس کے لیے ایک زبردست محافظ تھا جس کے رعب سے طاقت اور عقل بے بس ہو جاتے تھے اور آرزوؤں کا خون ہو جاتا تھا۔ فردوس کے حسن میں ہر دیکھنے والے کو شرکت کا احساس ہوتا تھا، اس سے اپنا حصہ پا لینے کا احساس جاگتا تھا۔ فردوس کی ماں کا حسن ایک حاکم تھا جس کی اطاعت ہی ہو سکتی تھی۔ فردوس کا حسن ایک دوست تھا جو زندگی کی تاریکیوں میں امید کی شمع روشن رکھتا تھا۔

رابعہ نے سوچا کہ فردوس کی ماں اپنے جہاں سوز حسن کے باوجود یا شاید اس کے باوصف زندگی سے مطمئن تھی مگر فردوس اپنے جہاں دوست حسن کے باوجود زندگی سے وہ کچھ نہیں پا سکی جو اس کا حق ہے۔ کیا یہ اسی لیے ہے کہ اس کا حسن ہر ناظر کو یہ احساس دلاتا ہے کہ زندگی اچھی ہے، پرامید ہے؟ اگر ایسا ہی ہے تو کیوں؟ ایسا سوال فردوس سے تو کیا ہی نہ جا سکتا تھا۔ اگر کیا جا سکتا تو فردوس نے اس کا جواب تلاش کر ہی لیا ہوتا کیونکہ اس کو نظر آ رہا تھا کہ اس سوال ہی میں فردوس کی زندگی عبارت تھی۔ وہ جاننا چاہتی تھی کہ اس جہاں دوست حسن کا دوست کون ہوگا؟ کون اس حسن کے جسم کا، اس کے دل اور ذہن اور تخیل کا شریک ہوگا، کون اس حسن کی تنہائی کا محافظ اور امین ہوگا۔ آخر یہ متین صاحب کیوں فردوس

کے دوست ہوتے ہوئے، اس کے دل و جان سے ہوتے ہوئے بھی صرف اسی کے کیوں نہیں ہیں۔ مقدر! آخر اس مقدر سے رستگاری ممکن نہیں ہے کیا؟

وہ ایک بار پھر اپنے خیالات کے بہاؤ کے ساتھ بہہ چلی تھی۔ اس نے ایک ہی جھٹکے میں اپنے آپ کو خیالات کے بہاؤ سے آزاد کر لیا۔ اس نے چاہا کہ فردوس اس سے اپنے دل کی داستان کہے اور وہ اسی طرح سنتی رہے جس طرح متین صاحب جمیل صاحب کی سن رہے تھے۔ مگر وہ متین صاحب نہ تھی جس سے ہر کوئی اپنے دل کی کہے بغیر نہ رہ سکے۔ اس نے بڑی کوشش سے اپنے حواس کو فردوس کی طرف متوجہ کیا۔ فردوس بڑے غور سے اس کو دیکھ رہی تھی۔ اس نے محسوس کیا کہ جیسے اس کا چہرہ ایک کتاب ہو جس سے فردوس نے اس کی داستان دل پڑھ لی ہو۔ اس کی نظروں سے گمان گزرا کہ شاید وہ ان چراغوں کی روشنی کی مدد سے اس کے ماضی کے اندھیروں میں اتر جانے کا سوچ رہی ہو۔ وہ فردوس کی نظروں میں عیاں ہمدردی کے لیے ممنون ہوئی۔ اس کی اس ممنونیت کو شاید اس کی آنکھوں میں دیکھ کر فردوس بولی:

''چند لمحوں کے لیے اپنے آپ کو، اپنے ماضی کو، اپنے حال کو، اپنے مستقبل کو بھول جایئے۔ اس آرام کرتی ہوئی دھوپ کو، اس جھومتی ہوئی ہوا کو، افق تک پھیلتی ہوئی ان روشن نیلاہٹوں کو، دور نیلے نیلے پہاڑوں کی برفیلی چوٹیوں پر ان سنہرے دھندلکوں کو دیکھیے، ان میں رچے ہوئے امن و سکون کو محسوس کیجیے، (کھڑے ہوتے ہوئے) نیچے میدانوں میں جھومتے ہوئے درختوں کے روشن سبز پتوں کو، چمکتے سنہری سفید، دریا کے بہتے پانی کو، اس پانی کی سطح پر اڑتے ہوئے جھالے کو، فضا میں اڑتے ہوئے سفید پروں والے پرندوں کو دیکھیے۔ کون جانے کب فرصت کے ایسے لمحے میسر آئیں۔ انسان کے مسائل اگر حل ہی ہو جائیں تو زندگی بے رنگ سی نہ ہو جائے گی؟ ان نیلے نیلے پہاڑوں میں نظر آدم سے نہاں، تنہائی کی آغوش میں سوئے مناظر آپ کا انتظار کرتے ہیں۔ کل چلیں گے ان کے نظارے کے لیے۔ انہی پہاڑوں میں ایک ندی کے بیچوں بیچ امی کی قبر ہے۔ چند روز ہوئے میں پہلی بار امی کی قبر پر گئی تھی۔ اس قبر سے امن و سکون پھوٹتا ہے۔ شاید آپ کو، جمیل

صاحب کو بھی یہ امن راس آئے۔

میں نے یورپ میں کہیں بھی یہ امن محسوس نہیں کیا۔ فطرت یہیں حسین ہے۔ یورپ میں فطرت میں جہاں حسن ہے وہاں امن کا احساس نہیں ہوتا۔ یہاں فطرت کا حسن حواس کو تھپکتا ہے، سہلاتا ہے۔ وہاں فطرت کا حسن تخلیقِ حسن پر ابھارتا ہے، جو کھم کی راہیں کھولتا ہے۔ وہاں اگر انسان حسن کی تخلیق پر قادر نہ ہو سکے تو فطرت کے حسن کی ہیبت اس کو جنگ اور تباہ کاریوں کی طرف ابھارتی ہے۔ وہاں جب تک انسان فطرت کے مظاہر سے جسمانی اور روحانی طور پر برتر اور بہتر نہ ہو تو فطرت کا تابع ہو کر اپنے میں مجبور ہو جاتا ہے اور وہاں فطرت کے ناخن اور دانت انسان کی آرزوؤں کے خون سے سرخ ہیں، وہاں فطرت کی اطاعت انسانی آرزوؤں کے خون کے مترادف ہے۔

وہاں امن وسکون انسان کے خلق کیئے فنی شاہکاروں کے علاوہ کہیں نظر نہیں آتا۔ یہاں فطرت کی محرابوں میں اطمینان سے زندگی بسر کی جا سکتی ہے۔ یہاں بے اطمینانی یورپی حملہ آور لائے ہیں۔ ان حملہ آوروں کے آلات جنگ ہی سے بے اطمینانی پیدا نہیں ہوتی بلکہ ان عظیم ترین خیالوں، تصوروں، جذبوں، احساسوں سے بھی بے اطمینانی ہی پیدا ہوتی ہے۔ اس دیس کی فطرت میں بھی اب ان کی فطرت کی روح حلول کر رہی ہے۔

ہم، ہمارے لوگ، ہماری پرسکون، امن فشاں فطرت، اب یورپی فضا میں سانس لینے پر مجبور ہیں۔ اب ہمیں امن اور سکون اور اطمینان کے لیے انسانی تخلیق کی ان بلندیوں پر پہنچنا ہوگا جہاں انسان پہلے کبھی نہیں پہنچ سکا۔ ان بلندیوں کے تصور سے ہی جی میں ہول اٹھتا ہے۔

اس گوشے سے ابھی یورپ کی روح کا سایہ نہیں گزرا۔ اس فضا میں ہم ہی یورپ کی فضا کے نشان ہیں۔ ہم ان نشانوں کو مٹا نہیں سکتے۔ یہ خودکشی ہوگی۔ ہمیں اب اس فطرت کی روح کا یورپ کے فنی شاہکاروں میں رواں روح کے ساتھ نکاح کرنا ہوگا۔ اس نکاح سے جو روح پیدا ہوگی وہی ہماری، آپ کی، ہمارے لوگوں کی، ہماری فطرت کے اطمینان اور امن کی امین ہوگی۔

آیئے اس فضا میں ہر طرف پھیلے ہوئے امن کے حضور یہ پیمان باندھیں کہ ہم اس نئی روح کے جنم کے لیے کوشاں ہوں گے، اس روح کی آنکھ سے اپنے مسائل کو دیکھیں گے اور اس کی آنکھ میں جلنے والی جوت کی روشنی میں اپنے ماضی پر، اپنے حال اور مستقبل پر نظر ڈالیں گے اور اپنے ماضی اور حال اور مستقبل کو اس روح کی ہدایت کے مطابق ایک ارتقا پذیر ارتقاعی وحدت کی شکل دینے کی کوشش کریں گے۔''

''کیا ایسی منزل کے سراغ کی آرزو ایک فریب نہیں؟ کیا یہ آرزو پندار انسانی کی متکبر ترین خواہش نہیں؟ ہمارے ماضی نے ہمارے حال کو جو شکل عطا کی ہے اس کی قلب ہیئت کیسے ممکن ہو سکتی ہے؟ میری تو رگوں میں یورپ کا خون رواں ہے۔ میرے بچپن کے بعد کے سال، جوانی تک یورپ کی فضاؤں میں سانس لیتے گزرے ہیں۔ یورپ کے مناظر آج بھی میری آنکھوں میں رم رہے ہیں، اس کے شاہکاروں کی یاد میرے خون کی حدت میں رچی ہے، اس کے موسیقاروں کی موسیقی میرے کانوں میں بسی ہے، میں نے بچپن میں جو کہانیاں سنی تھی وہ یورپ کی داستانوں سے ماخوذ تھیں۔ میرے ذہن کی ہر سوچ یورپی سانچوں میں ڈھل کے نکلتی ہے۔ یورپ میری روح ہے، صرف میرا جسم اس دیس کی مٹی کا ہے۔ میرا جسم اس دیس کی فضا سے متاثر ہوتا ہے۔ میرا جسم اس دیس میں پھیلی ہوئی فطرت کی محرابوں میں سو جانے کے لیے ہزار بار اصرار کرتا ہے، اس فطرت میں رواں قوت میں ڈوب جانے، اس قوت کے بہاؤ میں بہہ جانے کے لیے بے تاب ہوا ہے مگر میری روح میرے جسم سے الگ ہو کر کھڑی ہو جاتی رہی ہے۔

میرے جسم کا محبوب اور ہے، مگر میری روح کا محبوب اور۔ جمیل صاحب کو دیکھتے ہی میری روح پکار اٹھی کہ منزل آ چکی، رک جاؤ۔ میں منزل سے ہم کنار ہو گئی، برسوں ہم کنار رہی۔ اور پھر...... پھر منزل میری نظروں کے سامنے رہتے ہوئے بھی گم ہو گئی، کھو گئی۔ تم تو جانتی ہی ہو...... میں اس پیمان میں تمہارا ساتھ کیسے دے سکتی ہوں؟''

''میرے لیے، ہمارے لوگوں کے لیے جو مسئلہ عملی اور ذہنی طور پر درپیش ہے وہ آپ کے لیے ذاتی مسئلہ ہے۔ اس لیے اس کے حل کے سراغ میں آپ کی شخصیت کی بقا کا راز

بھی پنہاں ہے۔ہم اگر اس مسئلے کو حل کرنے کی کوشش نہ کریں تو جی سکتے ہیں یا مر سکتے ہیں، حتیٰ کہ ایک سطح پر، روحانی طور پر، اطمینان بھی حاصل کر سکتے ہیں۔مگر آپ اس مسئلے کو حل کیے بغیر نہ جی سکتی ہیں، نہ مر ہی سکتی ہیں، ایک مسلسل، نہ ختم ہونے والی سرگردانی آپ کے لیے مقدر ہو جاتی ہے۔حتیٰ کہ آپ جمیل صاحب کی طرح پاگل بھی تو نہیں ہو سکتیں۔ان کے پاگل ہو جانے کا سبب ان کی روح کی ترکیب میں، ان کی روح اور جسم کے باہمی تعلق میں مضمر نہ تھا، ان پر حالات نے صورت ایسی مسلط کر دی کہ ان پر صرف دو ہی راستے کھلے تھے، جن میں سے ایک کا انتخاب ان کے صرف ہوش وحواس کا یا ہوش وحواس اور راحت کا تعین ہو سکتا تھا مگر انہوں نے ان میں سے ایک کا بھی انتخاب کرنے کی جرأت نہ کی۔ایسی صورت میں پاگل پن ہی مقدر ہو سکتا تھا۔میں نہیں جانتی کہ وہ دو راستے کیا تھے، وہ حالات کیا تھے مگر اتنا میرا علم مجھے بتاتا ہے کہ پاگل پن دو اور صرف دو صورتوں میں سے کسی ایک کو بھی منتخب نہ کرنے سے لازم آتا ہے۔''

''شاید تم ٹھیک ہی کہتی ہو۔مگر اس سفر پر ایسے ساتھیوں کی معیت لازمی ہے جن کو ہم نے اپنی زندگی کا شریک بنایا ہو۔میں نہیں جانتی جمیل صاحب اس سفر میں میرے شریک، میرے رفیق، ہو سکیں گے کہ نہیں۔میں ان کے ذہن سے، ان کے دل سے، ان کے تخیل سے، ان کی روح سے ایک مدت سے آشنا نہیں ہوں اگرچہ ان سے الگ زندگی کا تصور کرتے ہوئے میری روح کانپ کانپ گئی ہے، ایسے تصور سے میری روح نے بار بار انکار ہی کیا ہے۔

میں انتظار کر سکتی ہوں، بہرحال انتظار کروں گی۔اگر جمیل صاحب اس سفر میں ساتھی بن سکے تو میں اس سفر کے لیے اپنے آپ کو تیار کروں گی۔اس وقت تک تم اس سفر کے لیے اور ساتھیوں کی تلاش کرو۔یہ سفر بہت ہی کٹھن ہوگا۔اس سفر میں ہم نامعلوم موت بھی مر سکتے ہیں۔اس سفر کی، اس سفر کی منزل کے سراغ کی اطلاع ہمارے لوگوں کو بھی ہونی چاہیے۔صرف اپنے اطمینان کے لیے، صرف اپنی فلاح کے لیے یہ سفر کرنا مجھے گناہ کا احساس دلائے گا، مجھے ہر دم خود غرضی کا احساس دلاتا رہے گا۔میری یورپی روح ایسے سفر پر

نکلنے سے انکاری ہو گی جس پر میرے بعد اور لوگ، ساری انسانیت، گامزن نہ ہو سکے۔''

''آپ کی روح کا مطالبہ صحیح ہے اور مجھے بھی قبول ہے۔ میں ایسے ساتھیوں کی متلاشی رہی ہوں، ہوں، رہوں گی۔ میں اس امن و امان کے گوشے میں فرار کر کے پناہ لینے نہیں آئی ہوں۔ میں یہاں سستانے کے لیے، ایک بار پھر سفر کے لیے تیار ہونے کے لیے، اپنے ماضی و حال کا سکون سے تجزیہ کرنے اور اس تجزیے سے حاصل ہونے والے علم کی روشنی میں نیا لائحہ عمل تیار کر سکنے کے لیے آئی تھی۔

یہاں متین صاحب سے ایسے حالات میں ملاقات ہوئی جس میں مقدر کا ہاتھ نظر آتا ہے اور اب آپ سے اور جمیل صاحب سے بھی ملاقات ایسی ہی نوعیت کی نظر آتی ہے۔''

''متین صاحب اس گوشے میں کیسے آ نکلے؟ ہم تو تمہاری تلاش میں آئے ہیں۔''

''میرے ایک عزیز ہوتے ہیں تقی نام ہے۔ ان کے والد علاقے میں زمیندار ہیں اور ہماری زمینوں کا بندوبست وہی کرتے ہیں۔ ان کے بزرگوں اور ہمارے بزرگوں میں کئی صدیوں سے تعلقات چلے آتے ہیں اگر چہ، عجیب بات، رشتہ داری کبھی نہیں ہوئی۔ تقی سے میرے یورپ جانے سے پہلے دوستانہ تعلقات تھے۔ وہ تعلیم کے سلسلے میں کئی سال ہمارے ہی گھر میں گھر کے ایک فرد کی طرح رہا۔ ان دنوں اگر کسی سے تھوڑے بہت قرب کا احساس ہوا تو اسی سے۔ وہ وجیہہ ہونے کے باوجود بہت ہی سلیم اور حلیم تھا۔ اس کی طبیعت میں الجھاؤ نام کو نہ تھا۔ اس کی زندگی میں ایک راستی تھی جس پر مجھے اکثر تنگی کا، تنگ نظری کا، گمان ہوتا اگر چہ تنگ نظر قطعاً نہ تھی۔ وہ ہمیشہ میری بات، اوروں کی باتیں، بڑی دل جمعی سے سنتا، اگر اس سے مشورہ لیا جاتا تو بڑی سوجھ بوجھ سے مشورہ دیتا۔

تقی ان دنوں متین صاحب سے فلسفہ پڑھتا تھا۔ میں ان دنوں موسیقی سے محبت کے ساتھ ساتھ معاشیات اور سیاسیات کی شیدائی تھی۔ ان میں استاد شاگرد کے علاوہ دوستی کے بھی تعلقات تھے۔ میں ان کی شہرت سے آشنا ضرور تھی مگر ان کے علم کو بے سود، بے فیض سمجھتی تھی۔ لہٰذا ان کے متعلق کبھی ذہن و دل میں خیال نہ آتا تھا۔

پھر میں اعلیٰ تعلیم کے لیے یورپ چلی گئی۔ وہاں معاشیات و سیاسیات سے شغف تو رہا

مگر زندگی کا مقصد موسیقی کے علاوہ کچھ اور نہ بن سکا کیونکہ میں نے یورپ میں معاشیات اور سیاسیات کو زندگی کے مسائل کے حل کرنے میں ناکام پایا۔ جب زندہ رہ سکنے کے وسائل مہیا ہو چکتے ہیں اور زندہ رہ سکنے کے لیے جو معاشی اور سیاسی نظام ضروری ہیں ان کی ترکیب ہو چکتی ہے تو ایسے مسائل انسانوں میں جنم لیتے ہیں جن کے لیے ضروری ہو جاتا ہے کہ وہ اپنے اندر اور اپنے سے باہر کے جہان میں تفاوت اور تصادم کی بجائے ان میں تعاون کا ربط قائم کریں۔ ان کے لیے اس بات کا نہ صرف تجربی احساس ناگزیر ہے بلکہ یہ یقین اور ایمان لابدی ہے کہ انسان کے اندر اور فطرت کے جہان میں ایک ازلی اور ابدی آہنگ ہے جو انسان کے جہل سے گم تو ہو سکتا ہے مگر معدوم نہیں ہوتا۔ پھر اس ایمان اور یقین سے یہ خیال جنم لیتا ہے کہ انسان اور فطرت ایک ہی نظام کا حصہ ہیں، ایک ہی وحدت کے زوج ہیں۔ اور جب یہ خیال احساس بن جائے، ایمان میں ڈھل جائے تو پھر اس خیال سے دامن کشی ناممکن ہو جاتی ہے کہ آزاد انسان اور پابند فطرت کا آہنگ اور آہنگ مسلسل ایک حادثہ نہیں ہو سکتا، اس میں معنی ہیں۔ معنی دلیل ہیں ایسے ارادے کے جو علم پر مبنی ہو۔ چونکہ انسان اور فطرت میں ایک دوسرے کے عمل سے ایک دوسرے میں جو وصفی تبدیلیاں آتی چلی جاتی ہیں ان میں ایک مسلسل آہنگ کا واضح ثبوت ملتا ہے اس لیے معنی کو جنم دینے والے ارادے میں ایک ہمہ گیر علم کا ہونا نہ صرف عینِ قیاس ہے بلکہ ایسا عینِ عقل و تخیل ہے جو قلبِ انسانی کو بھی مطمئن کرتا ہے۔ لہٰذا ایسے ہمہ گیر علم والے ارادے کو انسان اور فطرت کا خالق ماننا انسانی بصیرت کا محکم مطالبہ بن جاتا ہے۔ خیال اور تخیل کی اڑان یہاں ہی ختم نہیں ہو جاتی۔ ہمہ گیر علم والے ارادے کو انسان اور فطرت کا، انسان اور فطرت کے آہنگ کا، خالق مان لینا اس بات کا بھی مطالبہ کرے گا کہ اس خالق کے متعلق یہ بھی فرض کر لیا جائے، یہ بھی ایمان ہو جائے کہ وہ انسان کے مقدر سے دلچسپی لیتا ہے۔ اور اس دلچسپی کو ایمان بنانے سے لازم آتا ہے کہ وہ انسان کو ہدایت کی راہ بھی دکھائے اور دکھاتا رہے تا آنکہ وہ اس منزل پر پہنچ جائے جو اس کی متعین اور غیر متعین صلاحیتوں کے امتزاج سے عمل میں آنے والے اعمال کے سبب اس پر مقدر ہے۔

یہی وہ یقین ہے جس نے یورپ کے جنگی کارزاروں میں میرے ہوش وحواس کو برقرار رکھا اور اپنے دیس کے جہالت زاروں میں اس امید پر لوٹ آنے کی جرأت بخشی کہ اس دیس میں علم کے ساتھ ساتھ امن اور سلامتی کو جنم دینے والا نظام رائج کیا جا سکتا ہے جو ہمارے لوگوں کو یورپ کے علمی جہنم سے محفوظ رکھے۔

اس یقین میں متین صاحب کی صحبت سے استحکام پیدا ہوا ہے۔ اگرچہ میں ابھی یہ نہیں جان سکی کہ استحکام پیدا کیسے ہوا۔''

''میرا سوال اتنے طویل جواب کا طلبگار نہ تھا اور نہ یہ سب کچھ میرے سوال کا جواب ہی ہے۔''

''بظاہر ایسا ہی ہے۔ مگر آپ غور کریں کہ اگر تقی سے میرے وہ تعلقات نہ ہوتے جو کہ تھے، جو اس کے خاندان سے ہیں، اور تقی کے متین صاحب سے جو تعلقات تھے، ہیں، نہ ہوتے تو آج متین یہاں نہ ہوتے اور اگر وہ یہاں نہ آتے تو میرے یقین میں استحکام نہ آتا۔ لہٰذا جن جن اسباب کا متین صاحب کو یہاں لانے کا تعلق مجھ پر کھل چکا ہے اس کا ذکر نہ کرتی تو آپ سے دیانت نہ برت سکتی اور آپ سے دیانت ہی کا برتاؤ کیا جانا ضروری ہے۔ ایک لحاظ سے آپ کا اعتراض درست ہے۔ میں صحیح طور پر نہیں جانتی کہ متین صاحب یہاں کیوں آئے ہیں۔ اس کا جواب تو تقی ہی دے سکتا ہے۔ اور تقی آج کل اپنی پھوپھی زاد بہن کی بیماری کی وجہ سے مصروف ہے۔ عالمہ، اس کی پھوپھی زاد کا یہی نام ہے، اس کی بچپن کی ساتھی ہے، اس کی شاگرد ہے اور شاید اس کی ہونے والی شریک حیات ہے۔ شاید وہ آج کل میں یہاں آئے۔ متین صاحب اس کو بہت ہی عزیز ہیں۔ ان کی صحبت کی آرزو اس کو اس طرف لے ہی آئے گی۔ شاید ان کی صحبت کی آرزو ہی کے اثر کے تحت تقی ان کو یہاں لایا تھا۔ مگر ایسے حالات نے، جن پر تقی کا قابو نہ تھا، متین صاحب کو میری راہ میں ایسی حالت میں لا کھڑا کیا کہ اگر وہ نہ ہوتے تو ایک قاتل ناگ میرے گھوڑے کو، مجھے ڈس کر ہلاک کر دیتا۔ اس کے بعد قرب کا، ایک دوسرے کو سمجھنے کا ایک مسلسل سفر درپیش ہوا۔ اس سفر کی ایک منزل آپ کی آمد سے وجود میں آئی۔ اور اس سے اگلی منزل شاید آپ کی معیت

میں ہی ممکن ہو......اگر آپ کو واپس جانے کی جلدی بھی ہو تو میرے لیے کچھ دن کے لیے رک جائیے۔ میرا دل کہتا ہے کہ اگلی منزل صرف چند دن دور ہے۔''

دھوپ کا لمس رابعہ کے پاؤں، ٹخنوں، پنڈلیوں کے زیریں حصوں، کولہوں، کمر، شانوں سے ہٹ چکا تھا، صرف گردن اور سر پر دھوپ کا لمس محسوس ہوتا تھا۔ میز پر بھی دھوپ نہ تھی، صرف فردوس کی کرسی پر دھوپ ابھی موجود تھی۔ فردوس کے تن بدن میں سکون جلوہ گر نظر آتا تھا۔ اس کی روشن، گہری آنکھوں میں دور تک دھوپ اترتی ہوئی نظر آتی تھی۔ اس کی لمبی لمبی سیاہ پلکوں پر کرنیں سو رہی تھیں۔ شاید وہ اندرونی کیفیت میں مست تھی۔ یہ سکون اس کو کب میسر آئے گا، رابعہ نے سوچا۔ اس خیال نے اس کی گردن کی جڑ میں ایک ٹھنڈی رو کو جنم دیا جو زن سے اس کے سارے بدن میں دوڑ گئی۔ اس کا ذہن ہشیار ہو گیا۔ وہ جمیل صاحب کو دیکھنے کے لیے بے تاب ہو گئی۔ وہ اس خیال میں گم اپنی کرسی سے اٹھی اور مرمریں جنگلے کی طرف بڑھی، پاس پہنچ کر نیچے جھانکا، وادی اور دریا اور دور افق تک پھیلے ہوئے درختوں اور کھیتوں کے سوا کچھ نہ دیکھ سکی، حیران ہوئی، دائیں ہاتھ کی پشت سے پیشانی کی، آنکھوں کے پپوٹوں کی مالش کی۔ دفعتاً اس کو خیال آیا کہ دوربین کے بغیر جمیل صاحب کو کیسے اس کی نظریں ڈھونڈ سکیں گی۔ وہ اپنی گم گشتگی پر مسکرائی، اس کا دل ایک لمحے کے لیے اس کے سینے میں اچھلا، اس نے کمزوری محسوس کی۔ اس نے دونوں ہاتھ مرمریں جنگلے پر ٹکا دیئے۔ جنگلے کی مرمریں رگوں میں ٹھنڈک کے باوجود دھوپ کی حدت کے نشاں ابھی باقی تھے۔ وہ کہنیوں کے سہارے صحن کی طرف مڑی اور کمر جنگلے کے ساتھ لگا کر اس نے صحن کے دوسرے کونے میں بیٹھی ہوئی فردوس کی طرف دیکھا۔ وہ اپنی کرسی کے بازوؤں پر ہاتھ جمائے اٹھنے کی سوچ رہی تھی۔ رابعہ کو اپنی طرف متوجہ دیکھ کر ایک دم سے سیدھی کھڑی ہو گئی۔ وہ اندر کے حظ میں ابھی تک گم سی تھی۔ اس نے اپنی کرسی کی کمر سے دوربین کی پیٹی کو اتارا اور دوربین لے کر رابعہ کی طرف بڑھ گئی۔ قریب پہنچ کر اس نے دوربین رابعہ کی طرف بڑھا دی۔ رابعہ کی آنکھوں میں، اس کے جسم میں کمزوری کے آثار دیکھ کر اس نے دوربین اپنی آنکھوں سے لگائی اور دور نیچے وادی میں نظر دوڑائی۔ متین صاحب اور جمیل صاحب

خاموش بیٹھے تھے، جیسے اپنی اپنی کہہ چکے ہوں اور ستا رہے ہوں، شاید یادوں کا سفر بہت لمبا تھا۔ جمیل صاحب کے چہرے پر سکون تو نہ تھا مگر ان کے چہرے کی کیفیت سے گمان ہوتا تھا کہ جیسے انہوں نے بہت طاقتور حریف سے بڑی تگ و دو کے بعد کشتی جیت لی ہو اور اس جیت پر حیران بھی ہوں اور ممنون بھی۔ فردوس کا دل ہمدردی سے بھرپور ہو گیا۔ اس نے چاہا کہ وہ دوڑ کر ان کے پاس پہنچ جائے اور ان کو سینے سے لگا کر ان کی پیٹھ آہستہ آہستہ تھپکے، تھپکتی رہے، اس وقت تک تھپکتی رہے جب تک وہ سو نہ جائیں۔

اس نے دوربین نظروں سے ہٹالی اور ایک بار پھر رابعہ کی طرف غور سے دیکھا۔ رابعہ کو دوربین کے لیے منتظر پایا۔ اس نے دوربین اس کی طرف بڑھا دی۔ اس نے دوربین آنکھوں سے لگائی، اس کے ہاتھ کانپنے لگے، اس نے جلدی سے کہنیاں مرمریں جنگلے پر ٹکا دیں اور دوربین کی پٹی گردن میں ڈال لی۔ نیچے وادی میں ہن برس رہا تھا۔ شفاف اور گدلے دریا اپنے اپنے کناروں میں اطمینان سے بہہ رہے تھے۔ کھیتوں میں کہیں کہیں شفاف پھیلے ہوئے پانی میں کسی فصل کے ننھے ننھے پودے پانی سے سر نکالے حیرانی سے گردوپیش کو دیکھتے تھے اور ایسے کھیتوں میں شمال، مغرب اور جنوب کی طرف دور تک کھڑی فصلیں اپنے آپ میں گم ہو رہی تھیں اور پھر، آہستہ آہستہ، کھڑی فصلیں سر ہلانے لگیں، شاید ہوا چلنے لگی تھی۔ اس نے نظروں کو ان پتھروں کی طرف موڑا جہاں اس نے پہلے جمیل صاحب اور متین صاحب کو بیٹھے دیکھا تھا۔ دونوں اپنی اپنی جگہ پر بیٹھے تھے۔ جمیل صاحب کے چہرے کے نقوش ایک دوسرے سے بے خبر نہ جانے کس سفر پر نکلے ہوئے تھے۔ رابعہ کا دل ڈوب ڈوب گیا کہ اگر ان کے نقوش سفر میں واپسی کا راستہ بھول بیٹھے تو کیا ہوگا؟ کیا وہ ایک بار پھر ہوش وحواس سے محروم ہو جائیں گے؟ ایسا نہیں ہوسکتا! اس کا دل پکارا۔ کیوں نہیں ہوسکتا؟ اس کی عقل نے سوال کیا۔ کیونکہ اب ایسا ہونا بالکل ہی بے معنی ہوگا اور قدرت میں بے معنویت کے لیے کوئی جا نہیں۔ پہلی بار ہوش وحواس کی گم گشتگی کے اگر آج معنی ہیں تو برسوں بعد دوسری بار کی گم گشتگی کے بھی معنی نظر آ سکتے ہیں۔ رابعہ نے سننے سے انکار کر دیا اور اپنی تمام قوت سے جمیل صاحب اور...... متین صاحب پر نظریں مرکوز کرنے کو

دوبارہ دوربین میں جھانکا۔جمیل صاحب اپنی جگہ پر موجود تھے مگر متین صاحب اپنی جگہ پر نہ تھے۔وہ پریشان ہوگئی۔اس کی نظروں نے بے تابانہ متین صاحب کو ڈھونڈنا شروع کیا جیسے ان کی غیر موجودگی میں وہ سب کچھ وجود میں آ سکتا تھا جو ابھی ابھی اس کی عقل اس کو بتا رہی تھی۔اگر اس کے بس میں ہوتا تو وہ نظروں سے متین صاحب کو باندھ کر اس پتھر پر بٹھا دیتی جس پتھر پر وہ بیٹھے تھے۔آخر اس کی بے تاب نظروں نے ان کو ڈھونڈ ہی لیا۔وہ تو کسی طرف چلے جا رہے تھے۔ان کی چال میں تذبذب تھا، بے توجہی تھی، شاید وہ خود بھی نہ جانتے تھے کہ وہ کہاں جا رہے ہیں۔پھر...... پھر ان کے قدم ایک دم رک گئے، جیسے اس کی نظروں نے ان کے پاؤں میں زنجیر ڈال دی ہو۔وہ ٹھٹک سی گئی، اس کا سانس رک گیا، اس کا دل سینے میں تنگی محسوس کرنے لگا۔اب کیا ہوگا؟ وہ بے تابانہ انتظار کرنے لگی۔مگر متین صاحب کا جسم ساکت تھا۔ان کے جسم کے اردگرد ڈوبتے سورج نے ایک سنہرا جال سا بن دیا۔وہ روشنی ہی کی تجسیم معلوم ہو رہے تھے۔ہر شے روشنی کی تجسیم معلوم ہو رہی تھی، نور کی صورتیں دور افق تک ساکت کھڑی تھیں۔اس نے نور کا یہ روپ پہلے کبھی نہ دیکھا تھا۔یورپ میں نور کا یہ روپ تو تصور میں بھی نہ لایا جا سکتا تھا۔تاثریتی مصوروں کی تصویروں میں نور اشیا کا وصف تھا اور بس۔مگر یہاں تو مغرب سے مشرق تک، فرش سے عرش تک نور ہی نور تھا، اس کی الگ حیثیت تھی، وہ اشیا کا وصف نہ تھا، اشیا اس کے اثر سے نور کا بہاؤ بنی ہوئی تھیں۔شاید ایسا ہی نور ہوتا ہوگا جو وصل کے کیف کی حالت میں عاشقوں کے دلوں میں اترتا، جو صوفیا کے ذہن و قلب کو معمور کرتا ہوگا اگرچہ وہ صوفی نہ تھی، عاشق ضرور تھی مگر ایسی عاشق جو مدتوں سے قرب کے باوجود وصل حبیب سے محروم تھی۔اس کے نصیب میں ایسا نور کہاں۔کاش یہ نور اس کے اندر حلول کر سکتا۔اور اگر دنیا تاریک ہوگئی تو؟ ایک ننھی سی، مدھم سی آواز اس کے کانوں میں آئی۔وہ کانپ گئی، دنیا کو تاریک کر کے اس کو نور نہیں چاہیے تھا۔وہ اندر اور باہر ہر جا نُور چاہتی تھی۔

اس کے اندر ہوا کی کمی ہوگئی، اس نے ایک لمبا سانس لیا اور نور کے بہاؤ میں متین صاحب کو تلاش کیا۔وہ اب بھی نور کی تصویر بنے ساکت کھڑے تھے۔ان کے چہرے پر

جذبات کا کوئی نشان نہ تھا مگر ان کا چہرہ بے آباد ہونے کا تاثر پیدا نہ کر رہا تھا۔ وہ تصور ہی نہ کر سکی کہ اطمینان کے سوا ان کے چہرے پر کسی اور تاثر کا گمان بھی ہوسکتا تھا۔ پھر اس نے کوشش سے نظروں کو جمیل صاحب کی طرف موڑا۔ وہ اپنے پتھر پر بیٹھے حیرانی سے گردن کو ادھر ادھر گھما رہے تھے۔ متین صاحب کو تلاش کر رہے تھے، اس کو خیال آیا۔ ہاں وہ انہی کو ڈھونڈتے تھے کیونکہ ان کی نظریں اب ان کی طرف تھیں۔ وہ اٹھے اور متین صاحب کی نور سمان صورت کی طرف چل دیئے۔ وہ مطمئن ہوگئی کہ اب ان کو کوئی خطرہ نہیں۔ اس نے آنکھوں سے دوربین ہٹائی اور دونوں ہاتھوں سے اس کو اس طرح بلند کیا کہ اس کی پٹی اس کی گردن سے نکل آئی اور اس نے مڑے بغیر دوربین دائیں ہاتھ سے بائیں شانے کی طرف بڑھا دی مگر کسی نے اس سے دوربین نہ لی۔ وہ نور کے جہاں کی سیر سے لوٹ آنا نہ چاہتی تھی مگر فردوس کی دوری کے احساس نے اس کو صحن کی طرف مڑنے کے لیے مجبور کیا۔ فردوس اپنی کرسی پر بیٹھی تھی اور بوڑھے ملازم سے منہ اوپر کو اٹھائے، کچھ کہہ رہی تھی۔ اپنی تمام قوت کو قوت سامعہ بنانے کے باوجود وہ نہ سن سکی کہ فردوس کیا کہہ رہی تھی۔ بوڑھا ملازم رخصت ہوا تو فردوس اس کی طرف متوجہ ہوئی اور مسکرائی اور مسکراتے ہوئے اس سے پوچھا۔

''کیا کر رہے ہیں اب؟ ان کا خاموش سفر ابھی جاری ہے؟''

اس نے جواب نہ دیا اور دوربین لگا کر ایک بار پھر نور کی وادی میں جھانکا دونوں پاس پاس کھڑے، شاید ایک دوسرے سے بے خبر، بہتے دریاؤں کو دیکھ رہے تھے۔ اس نے بہتے دریاؤں کو دیکھا۔ سفید اور گدلے پانی کا ملاپ ڈوبتے سورج کی روشنی میں کتنے ہی جہانوں کی طرف راہنمائی کر رہا تھا۔ وہ کسی بھی سفر کے لیے تیار نہ تھی لہٰذا اس نے دوربین کو آنکھوں سے ہٹا لیا اور فردوس کی طرف چل دی۔ پاس پہنچ کر دوربین میز پر رکھ کر اپنی کرسی میں گر گئی۔ وہ تھک گئی تھی۔ اس نے آنکھیں بند کر لیں۔ لمحہ بھر میں وہ تازہ دم ہوگئی اور اس نے آنکھیں کھول دیں اور بڑے گہرے غور سے فردوس کو دیکھتے ہوئے بولی:

''دونوں پاس پاس کھڑے دریاؤں کے سنگم پر نظریں جمائے نہ جانے کیا سوچ رہے

ہیں...... یہ دریا کن منبعوں سے پھوٹے ہوں گے، الگ الگ رستوں سے ہوتے ہوئے اس وادی میں ایک دوسرے کے ہوگئے ہیں۔ یہاں سے پھر نہ جانے اکیلے ہی یا کسی اور دریا کے ملاپ سے اپنی آخری منزل کی طرف روانہ ہوتے ہوں گے...... یہ دریا کچھ کہتے ہیں مگر قلب و ذہن ان کی سننے کے لیے تیار نہیں...... کچھ بھی تو سننے کے لیے تیار نہیں۔ جی چاہتا ہے کہ فطرت کے جہان سے، انسان کے جہان سے کہیں دور چلیں، جہاں جانوروں کے سوا کوئی نہ ہو۔ نہ وہ ہم سے کچھ کہیں اور نہ ہم ان سے کچھ کہیں۔ ان میں اور انسانوں میں اور فطرت کی مختلف شکلوں میں اتنا گہرا ربط ہے کہ انسان کے اندر اور باہر میں ایک دوسرے کا پرتو ہونے کا گمان ہوتا ہے، کبھی اندرونی کیفیتوں کے ہمزاد باہر نظر آتے ہیں اور کبھی باہر کی شکلوں، عواملوں کے پرتو اندر کے جہان میں نظر آتے ہیں۔ شاید جانوروں میں رہ کر اس بات کا احساس نہ ہو...... کیوں کیا خیال ہے؟''

''آیئے چلیں۔ پاس ہی ہمارا گھوڑوں کا فارم ہے۔ سینکڑوں گھوڑے میدان میں اس وقت کھلے پھرتے ہوں گے۔ صرف چند گھوڑے سواری کے کام آتے ہیں۔''

رابعہ ہچکچائی، وہ ڈر رہی تھی کہ جانے ان کی غیر حاضری میں کیا ہو جائے۔ فردوس نے اس ہچکچاہٹ کو اور اس ہچکچاہٹ کے محرک جذبے کو محسوس کیا۔ وہ اس ہچکچاہٹ کو عمل میں بدل دینا چاہتی تھی۔ اس نے سوچا کہ ہونے کو تو کچھ بھی ہوسکتا ہے: میں مرسکتی ہوں، جمیل صاحب، متین صاحب کی جان پر بن سکتی ہے۔ مگر اس ہونے کے خوف سے عمل کو ملتوی کرنا بزدلی کے مترادف ہے، اس نے فیصلہ کیا۔

''ہم جلد ہی لوٹ آئیں گے۔ شاید ہم ان کی واپسی سے پہلے ہی لوٹ آئیں۔ اگر وہ اب چل دیئے تو آدھ گھنٹے میں ادھر پہنچیں گے۔ اتنی دیر میں ہم لوٹ سکتے ہیں۔'' رابعہ شاید اس تسلی ہی کی منتظر تھی، چل دی۔

بیٹھنے کے کمرے کا شیشہ ڈوبتے سورج کی پیلی پیلی کرنوں سے دمک رہا تھا اور کمرے میں ایک سنہرا سا دھندلکا ہو رہا تھا۔ کچھ ایسا ہی دھندلکا اس گلی میں ہو رہا تھا جو باہر جانے کا راستہ تھی۔ روشنی اور اندھیرے کا یہ عجیب ملاپ رابعہ کی ذہنی اور قلبی کیفیت کی تصویر بن گیا۔

اس تصویر میں وہ اتنی محو ہوئی کہ جب کھلے میدان میں گھوڑوں کے دوڑنے کا شور اس کے کانوں میں پہنچا تو وہ ششدر سی رہ گئی۔ پھر گھوڑوں کو دیکھ وہ اپنے آپ میں شرمندہ سی ہوئی کہ آخر ماحول سے ایسی بھی بے خبری کیوں؟ اس کیوں کا جواب دینے کی سکت اس میں نہ تھی۔ اس کی ایک ہی آرزو تھی کہ آسمانوں سے اندھیرے اتریں اور اس کو بہا کر لے جائیں۔ وہ پاگل ہوئے بغیر ماضی، حال اور مستقبل کے شعور سے آزاد ہو جانا چاہتی تھی، ہمیشہ کے لیے نہیں، چند لمحوں کے لیے، نہیں چند گھنٹوں کے لیے، شاید چند دنوں کے لیے۔ اندھیرے کی لہروں پر جھولتے ہوئے کتنا آنند ملتا ہے، جسم کو کتنی تازگی کا احساس ملتا ہے۔ رات کی آمد میں ابھی بہت دیر تھی اگرچہ سورج مغرب کی پہنائیوں میں اتر جانے کو تھا۔ رات تو تب ہوگی جب وہ اپنے بستر پر کمر لگا سکے گی، جب اس کا سر سرہانے سے لگا ہوگا۔ وہ لمحہ واقعی ابھی بہت دور تھا، صدیوں دور تھا۔ سڑک کے بائیں ایک وسیع سبزہ زار میں، لوہے کے جنگلے میں بیسیوں بلکہ سینکڑوں سفید، بھورے، بھورے سفید، سفید بھورے، کالے گھوڑے اور گھوڑیاں ایک غیر منظم نظام سے دوڑ رہے تھے۔ دوڑتے دوڑتے جن کا رخ جنگلے کی طرف ہوا تو وہ ایک خفیف سے وقفے کے لیے رکے اور پھر دوڑنے لگے، چکر لگانے لگے۔ فردوس نے رابعہ کی طرف مڑ کر دیکھا جیسے کہہ رہی ہو ''یہ رہے آپ کے جانور!'' فردوس تو جنگلے کے ساتھ ساتھ ہو کر بائیں طرف اتر گئی اور جنگلے میں ایک دروازے کو کھول کر سبزہ زار میں داخل ہوگئی۔ رابعہ دروازے کے باہر ہی رک گئی۔ گھوڑے دوڑتے رہے، جب اس کے رخ آئے بھی تو بھی نہ رکے۔ فردوس ان کے جھرمٹ میں گھس گئی تو وہ رک گئے، انہوں نے اس کے گرد ایک دائرہ بنا لیا اور چکر کاٹنے لگے۔ جب وہ پسینے میں شرابور ہو گئے تو اس سے چہل کرنے لگے۔ وہ اس کی گردن کو، اس کے چہرے کو چومنے کی کوشش کر رہے تھے۔ وہ ہنس ہنس کر، قہقہے لگا لگا کر ان کو باز رکھنے کی کوشش کر رہی تھی مگر گھوڑے تھے کہ مانتے ہی نہ تھے۔

''ارے نالائقو! کیوں ضد کرتے ہو۔ دیکھتے نہیں کون آیا ہے میرے ساتھ؟ میری ماں! سچ! یقین نہیں آتا؟......امی! امی! کہاں ہیں آپ؟ اندر چلی آئیے نا۔ کچھ نہیں کہیں

گے یہ آپ کو۔ان کو یقین ہی نہیں آتا ہے کہ آپ میری امی ہیں۔''

''انسان تھوڑے ہیں کہ دھوکا کھا جائیں۔تمہاری امی کو تو انہوں نے دیکھا ہی ہوگا......''

''نہیں تو......اتنا بوڑھا تو کوئی بھی نہیں......''

رابعہ کو دیکھ کر گھوڑے رک گئے۔ڈوبتے سورج کی روشنی میں ان پر پسینے کی بوندوں میں کتنے ہی رنگ نظر آرہے تھے گھوڑے منہ اٹھائے اس کو دیکھ رہے تھے۔ان کی چمکتی ہوئی پُراطمینان آنکھوں میں عجیب سی آبادی کا گمان ہوتا تھا۔ان کی آنکھوں میں اندھیرے کی لہریں ابھرابھر کراس کو تیرنے کی دعوت دے رہی تھیں۔ان لہروں کے نیچے ایک جہاں آباد تھا،انوکھا اور غیر انسانی۔ان غیر انسانی آنکھوں میں کتنا تکلم تھا،مگر یہ تکلم اس سے کسی عمل کا متمنی نہ تھا۔کاش انسانوں کی آنکھوں میں ایسا ہی تکلم ہوتا۔

رابعہ ان غیر انسانی آنکھوں کے اندھیروں میں اتر گئی۔اندھیروں کا عکس اس کے حواس پر نشتر کی طرح لگا،اس کے حواس سے خون بہہ نکلا،اس کے جسم سے ذہانت،تہذیب وتمدن کے جراثیم اس خون کے ساتھ بہہ نکلے،اس میں شعور کی گرمی اور روشنی باقی رہی،اس شعور کی روشنی جو زندگی اور جسم کا لازمی حصہ ہے،جسم کی بلند ترین ٹہنیوں کا پھل ہے، جو جسم میں خون کی طرح حرکت کرتا ہے، جو جسم میں خون کی طرح کسی خاص مقام کا وصف نہیں، وہ شعور کائنات کے جسم میں خون کی طرح ازل سے رواں ہے اور ابد تک رواں رہے گا،اس نے محسوس کیا۔اس کا شعور کائنات کے دل کی دھڑکنوں کے ساتھ ہم آہنگ تھا، وہ زمین کے تنفس کو محسوس کرسکتی تھی، وہ ڈوبتے سورج کی کرنوں میں پنہاں شعور کو اپنی جلد کے مساموں میں محسوس کرنے لگی،اس کو خیال آیا وہ رات کے آسمان میں چمکتے ہوئے ستاروں کی کرنوں کے لمس سے ان کے اندر نہاں شعور سے تعلق پیدا کرسکے گی۔اندھیرے کی لہریں اس کے اس خیال کو بھی بہا کر دور بہت ہی دور لے گئیں،اس کا شعور کائنات کے شعور میں جذب ہوگیا؛اس کی 'میں' اس کی یادوں،اس کی آرزوؤں،اس کے رنج والم،اس کے اندوہ وانبساط کو خون کے بخار کی طرح اندھیروں کے ٹھنڈے لمس نے چوس لیا،اس کا خون اس

انسانی بخار سے پاک ہوگیا۔ اس نے محسوس کیا وہ زمین، چاند، ستاروں، سورج، پودوں، پتھروں، بہتے پانیوں، کھڑی فصلوں، سہ پہر کی ہلکی ہلکی ہوا میں لمبی لمبی ٹہنیوں پر لہرانے والے پھولوں، نیلے پرشکوہ پہاڑوں، ان پر پڑی ہوئی برف کی طرح کائنات کی بیٹی تھی، کائنات کے شعور کا ایک جسم تھی، جو اور جسموں سے اپنے اوصاف میں مختلف ہوتے ہوئے بھی ان سے ہم آہنگ تھا۔ اندھیرا اس کے خون میں رچ بس گیا، اس کے خون کے ساتھ اس کے جسم میں دوڑنے لگا۔ اس کے جسم میں دوڑتا ہوا خون اور اندھیرا اس کی جلد کے ساحلوں سے ٹکرانے لگے اور اس کا جسم ساحل کی زمین کی طرح اس کے خون کی لہروں میں حل ہونے لگا، حل ہوتا چلا گیا، حل ہو گیا۔ خون کے اس اندھیرے ساگر پر اس کا شعور ایک دیے کی طرح ڈولتا رہا، ابھرتا، ڈوبتا رہا، جب ڈوب ڈوب جاتا تو اندھیرے ساگر کے سینے میں نور کی لہریں گہرائی میں اترتی ہی چلی جاتیں۔ دیے کی لو کا نور اندھیرے ساگر کا ہی حصہ، اسی کا وصف بن گیا۔ یہ اندھیرا جو اسے برسوں موت کا مترادف نظر آتا رہا تھا، جو اس کے قلب و ذہن میں ہول پیدا کرتا تھا، اب اس کو زندگی کا رس محسوس ہوا۔ اس کے لیے زندگی اور موت کا امتیاز مٹ گیا، اس کو زندگی اور موت شعور کے سمندر کی مختلف لہریں نظر آنے لگیں، جو الگ الگ بھی تھیں اور ایک دوسری میں پیوست بھی تھیں۔

اندھیرے ساگر کے سینے میں اترتا چلا جاتا ہوا دیا اترتا چلا گیا، اترتا ہی چلا گیا، ساگر کی تھاہ نہ تھی شاید۔ دیے کی لو سے نور کی لہریں اندھیرے ساگر کی لہروں میں رچتی چلی گئیں، نور کی لہریں اندھیرے ساگر کی وسعتوں میں رچ گئیں، اندھیرا نور ہوا، ہر طرف نور ہی نور تھا، نور میں ایک ٹھنڈی طراوت تھی جو بہت ہی بھلی تھی، جس میں اندھیرا ٹھاٹھیں مارتا ہوا محسوس ہوتا تھا۔ یہ کیسا نور تھا؟ یہ کیسا اندھیرا تھا؟ جو ایک دوسرے میں جاری و ساری تھا۔

رابعہ کا جی ایک اتھاہ خوشی سے بھر گیا۔ اس نے چاہا کہ وہ جمیل صاحب کے پاس، فردوس کے پاس، متین کے پاس لوٹ جائے اور انہیں اس اندھیرے نور اور منور اندھیرے کی خوش خبری دے، ان کو اس اندھیرے نور اور منور اندھیرے کا تحفہ پیش کرے۔ وہ گھوڑوں کی غیر انسانی آنکھوں سے باہر نکل آئی۔ اس کی گردن اور چہرے پر عجیب طرح کا ٹھنڈا

ٹھنڈا، گرم گرم لمس تیر رہا تھا۔ اس نے دیکھا میدان میں اندھیرے اتر رہے تھے، ان اندھیروں میں گھوڑوں کے دمکتے ہوئے جسم اندھیرے ہی کی تجسیم معلوم ہو رہے تھے، اس کے چاروں طرف گھوڑے دائرہ بنائے اس کو دیکھ رہے ہیں، ان کے منہ اس کے چہرے اور گردن کے قریب تھے۔ اس نے ان کے تنفس کو اپنے چہرے اور گردن پر محسوس کیا۔ اس نے محسوس کیا وہ ان کی ہم جنس تھی، ان کی بہن تھی جو قرنوں ہوئے ان سے بچھڑ گئی تھی۔ اس کا دل حلم سے بھر گیا، وہ سراپا حلم بن گئی۔ اس نے گھوڑوں کو تھپکا، ان کی گردنیں احسان سے جھک گئیں، اس نے ایک ایک کی تھوتھنی پکڑ کر ان کی پیشانیوں کو چوما، ان کے جسم سے اٹھتی ہوئی باس اس کے نتھنوں کو بھلی محسوس ہوئی۔ ان کے جسموں میں مسدود قوت اس کے لمس سے مسخر ہو گئی، اس تسخیر نے اس کو ایک ایسا سرور بخشا جو شعور کا نقیض نہ تھا، شعور سے الگ نہ تھا، جو شعور کا نیا رنگ تھا، شعور کا نیا وصف تھا، جو شعور کے باقی اوصاف سے ہم آہنگ تھا۔ اس سرور نے اس کے قدموں میں حرکت پیدا کی اور گھوڑوں نے دائرے کو کھول دیا، دائرے سے باہر فردوس حیرت اور خوشی کے ملے جلے جذبات سے اس کو دیکھ رہی تھی۔ اس کی خوشی اور حیرت اس کی آنکھوں کی روشنی کا ہی وصف معلوم ہو رہی تھی۔

میدان اندھیرے سے معمور ہو گیا، گھوڑے ان کو ایک دوسرے کے مقابل چھوڑ کر اپنے استھان کی طرف چل دیئے۔ وہ ایک دوسرے کے سامنے نہ جانے کتنی دیر خاموش، ساکت کھڑی رہیں۔ اس سکوت کو توڑنے کی ان کی خواہش ہی نہ تھی۔ پھر وہ دونوں ایک دوسرے کو کچھ کہے بغیر گھر کی طرف چل دیں، فردوس آگے آگے اور رابعہ پیچھے پیچھے۔ فردوس کے قدم آہستہ آہستہ اٹھ رہے تھے اور رابعہ کے لمبے لمبے۔ کچھ ہی دیر میں وہ ایک ساتھ چل رہی تھیں۔ رابعہ نے فردوس کی کمر میں ہاتھ ڈال دیا اور فردوس نے سر اس کے شانے پر رکھ دیا اور یونہی چلتے چلتے گھر کے صحن میں پہنچ گئیں۔ صحن کی منڈیر پر جمیل اور متین صاحب بیٹھے ہانپ رہے تھے، شاید ابھی ابھی لوٹے تھے۔ ان کے ہانپنے کی لے نے ان کو جگا دیا۔ صحن میں اندھیرا تھا اسی لیے وہ ان کے چہروں کو واضح طور پر نہ دیکھ سکیں۔ فردوس نے رابعہ کے شانے سے سر اٹھا لیا اور اس دیوار کی طرف بڑھ گئی جہاں صحن کے برقی قمقمے کا بٹن

تھا۔مگراس کے پہنچنے سے پہلے ہی صحن میں روشنی ہوگئی۔بابا نے بٹن دبا دیا تھا۔

''آیئے اندر چلیں، باہر خنکی ہورہی ہے۔'' فردوس کی آواز جمیل صاحب اور متین صاحب کواور رابعہ کواجنبی محسوس ہوئی۔فردوس کے پیچھے وہ سب بیٹھنے کے کمرے میں داخل ہوگئے۔فردوس کچھ دیر آرام کرنا چاہتی تھی۔اس نے دوسروں کوغور سے دیکھا سب کے چہروں پرتھکن کے واضح نشان تھے،ان کوآرام کی ضرورت تھی۔فردوس نے کلائی کی گھڑی دیکھتے ہوئے ان سے کہاوہ کھانے سے پہلے دواڑھائی گھنٹے آرام کرلیں اور چاہیں تو نہا دھو لیں۔ان کے کمروں میں گرم اور ٹھنڈے پانی کا انتظام تھا۔جمیل صاحب اور رابعہ کووہ ان کے کمرے میں لے گئی۔ان کا کمرااس کمرے سے متصل جنوب کی طرف تھاجہاں ایک دن پہلے متین صاحب سوئے تھے۔

جب وہ بیٹھنے کے کمرے میں واپس آئی تو متین صاحب ایک صوفے کی کمر پرسر رکھے، آنکھیں بند کیے، کچھ سوچ رہے تھے (کیونکہ ان کی بھوؤں کے درمیان شکنیں تھیں۔)فردوس ان کے سامنے ایک صوفے پر بیٹھ گئی اوران کوبغور دیکھنے لگی۔

''تم آرام نہیں کروں گی کیا؟ تم تھکی ہوئی ہو۔تمہارا چہرہ کہتا ہے کہ تم نے برسوں آرام نہیں کیا۔''

''آرام؟ ہم بے منزل لوگوں کے لیے آرام کہاں۔آرام ان لوگوں کے لیے ہے جو منزل پرپہنچ گئے ہیں، یا جوسفر پر نکلے ہی نہیں۔اس دور میں آرام کہاں، ہردم سفر ہے،کبھی باہر کے جہاں میں تو کبھی اندر کے جہاں میں،ہم لوگ مسافر ہیں جن کا کوئی دیس نہیں،جن کے سفر کی کوئی منزل نہیں،ہم یہ بھی تونہیں جانتے کہ سفر ہی کیوں،کس مقصد کے لیے۔اتنی طویل فرصت جہاں والوں کوکسی اور دور میں نصیب نہ ہوئی ہوگی۔یہ فرصت تنہائی کا ایک بے پایاں جہاں ہےجس کا آفاق ہےہی نہیں۔تنہائی کا احساس ناقابل برداشت ہے۔ہم اپنے آپ کوبھلانے کے لیےہجوم کی تلاش میں نکلتے ہیں مگرہجوم میں ہم اور بھی تنہا ہو جاتے ہیں۔ایک اتھاہ جذبہ دل میں گھر کرتا ہے کہ ہرانسان اپنے آپ میں تنہا ہے۔اس جذبے سے یہ احساس جنم لیتا ہے کہ ہم ایک ہیں مگر یہ احساس زیادہ دیر قائم نہیں رہ سکتا کیونکہ

انسانوں میں صلاحیتوں کا اتنا بعد ہے کہ تنہائی کا احساس بھی ان کے درمیان پائیدار جذباتی، ذہنی اور روحانی رشتے قائم نہیں کرتا۔ شاید اس کی وجہ یہی ہے کہ اس رشتے کے لیے جسمانی رشتے، انس، الفت کی بنیاد لازمی ہے۔ جسمانی جذبیت اور جاذبیت کے بغیر دو انسانوں میں حلاوت ممکن نہیں اور حلاوت کے بغیر تنہائی محدودیت اور مسدودیت کا احساس اتنی شدت سے کراتی ہے کہ جی چاہتا ہے شور میں، ہجوم میں، جلوسوں میں کھو جائیں۔ مگر خودکشی کے بغیر کھو جانا بھی تو ممکن نہیں۔ چاہے خودکشی جسمانی نہ بھی ہو مگر کسی نہ کسی سطح پر خودکشی کے بغیر خود فراموشی ممکن نہیں۔

مگر شاید خودکشی سے بھی مسئلہ حل نہ ہو کیونکہ خودکشی مسئلہ کا حل نہیں، حل سے فرار ہے۔ تنہائی کے احساس کو محدودیت اور مسدودیت کے احساس میں بدل جانے سے محفوظ رکھنے کے لیے ضروری ہے کہ اس کو جذبیت اور جاذبیت میں بدل دیا جائے۔ ایسا ہونا ان ہی دو انسانوں کے درمیان ممکن ہو سکتا ہے جن میں صلاحیتوں کا توازن ہو اور جن کی صلاحیتوں میں بھی باہمی توازن کا امکان ہو اور ان دونوں کے درمیان جذبیت اور جاذبیت تمام صلاحیتوں کا احاطہ کر سکے، جن میں دوستی کا رشتہ قائم ہو سکے، جن کی دوستی میں ان کا جسم بھی شریک ہو......''

''کیا جنسی تعلق کے بغیر دوستی نامکمل ہے؟''

''جسم اور جنس مترادف نہیں ہیں، دونوں ایک دوسرے کا احاطہ نہیں کر سکتے۔ دو انسان ایک ہی جنس کے ہیں اور دوست ہیں تو ان میں جنسی تعلق ایک ہی صورت میں لازمی ہوگا کہ وہ دونوں دوستی کو زوجیت کے بڑے رشتے میں منسلک کرنا اپنی صلاحیتوں کے توازن کے لیے ضروری سمجھیں۔ مگر اس سے کسی طرح بھی لازم نہیں آتا کہ ان دونوں کی تمام صلاحیتوں کی تسکین، نشو و نما اور ارتقا کے لیے زوجیت کا رشتہ ہی کافی ہو۔ ہر انسان اتنی مختلف نوعیت کی صلاحیتوں کا مالک ہوتا ہے کہ زوجیت کے رشتے کے لزوم کے باوجود ان کو دوستی کے رشتے کی بھی اشد ضرورت ہے اور اس رشتے کے لیے ضروری نہیں وہ اپنی ہی جنس کے انسان سے ہو یا دوسری جنس کے انسان سے ہو۔ اس دوستی کے رشتے کے لیے یہ بھی

ضروری نہیں کہ دوستوں میں ہر دم قرب کی، مکانی اور جسمانی قرب کی ضرورت ہو۔ زوجیت میں جسمانی اور مکانی قرب لازمی ہے۔اس لیے تو زوجین سے خاندان کی تشکیل ہوتی ہےاور خاندانوں کے بغیر شاید معاشرے کا تصور بھی ناممکن ہو۔

دوستی میں وصل شرط نہیں،فراق دوستی کا نقیض نہیں۔دوستی مکانی بعد پر بھی حاوی ہے۔ میں تو یہ بھی یقین رکھتی ہوں کہ دوستی کی پرورش کے لیے فراق اور کبھی کبھی طویل فراق اشد ضروری ہے کیونکہ اگر تنہائی کا احساس معدوم ہوجائے تو انسان کا انسان رہنا ناممکن ہوجائے،انسان بے شعور ہوجائے، جمادات،نباتات اور حیوانات کی طرح انسان فطرت کا مجہول عضو بن کے رہ جائے۔انسان شعور اور ارادے کے بغیر تصور ہی نہیں کیا جاسکتا۔ اسی لیے تو زوجین اور دوست تنہائی کے شریک ہوتے ہوئے بھی ایک دوسرے کی تنہائی کے محافظ اور امین ہوتے ہیں۔تنہائی کا احساس انسان کی انسانیت کا امین ہے، اس کا محافظ ہے۔''

''کیا زوجین میں ایک وحدت نہیں ہوتی؟ وہ ایک نہیں ہوجاتے؟ ان میں دوئی کا احساس نہیں مٹ جاتا۔''

''استعارے کی زبان میں یہ سب کچھ کہا جاسکتا ہے مگر حقیقت اس سے مختلف ہے۔ ایسا ہونا ایک ہی صورت میں ممکن ہے اور ہوتا ہے: زوجین یا عاشق ومحبوب جب جنسی وصل کی حالت میں ہوں۔مگر کیا آپ تصور کرسکتے ہیں کہ یہ جنسی وصل کی حالت مسلسل ہوسکتی ہے۔ یقیناً نہیں ہوسکتی۔ وحدت اور دوئی کے احساسات، زوجیت اور دوستی کا لازمہ ہیں۔ ان کے باہمی توازن سے ایک اعلیٰ وحدت ممکن ہوجاتی ہے اور اس کو آپ فلسفہ کی زبان میں کثرت میں وحدت یا وحدت میں کثرت کہہ سکتے ہیں۔

اصل میں تنہائی کو دو انسانوں میں، انسانوں کے درمیان، کسی قسم کے رشتے کا نقیض اور حریف سمجھا جاتا ہے حالانکہ یہ درست نہیں، حقیقت میں تنہائی اور رشتہ بھی ایک دوسرے کے زوج ہیں اور انسان اگر ان کو آپس میں حلول نہ کرنے دیں، گھل مل جانے نہ دیں تو پریشانی اور مصیبت لازمی ہے، انسان کا اعصاب زدہ، نفس زدہ ہوجانا عین حقیقت ہے۔

میرا سفر دوستوں کی تلاش ہے اور زوج کی بھی۔ دنیا والے دوستی اور زوجیت کی حقیقت سے آشنا نہیں اسی لیے میرا سفر ابھی جاری ہے، بے منزل ہے۔ اسی لیے آرام ممکن نہیں۔

آپ کے متعلق میرا احساس تھا، ہے، بلکہ کبھی کبھی تو یقین سا ہونے لگتا ہے کہ آپ دوست بھی ہیں زوج بھی۔ مگر آپ کا احساس مجھ سے مختلف ہے بلکہ الٹ ہے۔ آپ مجھے زوج کی حیثیت سے قبول کرتے ہوئے ہچکچاتے ہیں، بدکتے ہیں......''

''نہیں ایسا نہیں۔ اپنے آپ کو تمہارا زوج سمجھنا اتنا عجیب اور اجنبی لگتا ہے کہ مجھے اس کو قبول کرنا لالچ محسوس ہوتا ہے۔ کبھی کبھی تو مجھے اس شدت سے یہ احساس ہوتا ہے کہ اگر میں نے تمہیں زوج بنالیا تو تم سے ایک فریب ہوگا، تم پر ایک ظلم ہوگا۔ اور تمہارے ہونے والے اور اصلی زوج سے بے انصافی ہوگی۔

میں تمہیں اپنا دوست سمجھتا ہوں، میں تمہارا دوست ہوں۔ اس لمحے سے تمہارا دوست ہوں جب سے میں تمہیں گھوڑے پر ساتھ بٹھا کر اس گھر تک لایا تھا۔ میں اس بات سے انکار نہیں کروں گا، کیونکہ یہ جھوٹ ہوگا اور تم سے جھوٹ بولنا میں اپنے آپ پر ظلم عظیم سمجھتا ہوں، کہ تمہارے طرز عمل نے، تمہارے اظہار اعتماد نے مجھے لاکھ بار للچایا ہے کہ تمہارے جسمانی قرب کو جنسی وصل میں بھی بدل لوں مگر ہر بار میری روح کی گہرائیوں سے آواز آئی، روح کے آفاق سے پیغام بر پہنچے کہ ایسا کرنا بے صبری ہوگی، گناہ ہوگا......

گناہ ہوگا؟ گناہ عوام کے معنی میں نہیں۔ میرے نزدیک ہر وہ عمل گناہ ہے جو ہماری صلاحیتوں کے ارتقاء کی لازمی منزل نہیں جو ہمارا مقدر نہیں اور مقدر کی اطاعت ضروری ہے۔''

''کیوں؟ کیا یہ تصور انسان کی انسانیت کا انکار نہیں۔ انسان آزاد بھی تو ہے، محدود و مسدود نہیں اگر چہ ہر فعل میں آزاد نہیں، ہر فعل پر قادر نہیں۔ یہ اقتدار تو قادر مطلق ہی کے لیے ممکن ہے''

''قادر مطلق کے نقطہء نظر سے انسان حدود میں مسدود ہے مگر جمادات اور نباتات اور

حیوانات کے نقطۂ نظر سے، اگر ان کا نقطۂ نظر ہونا فرض کر لیا جائے، انسان آزاد ہے، ہر عمل پر قادر ہے، مگر اس کے اپنے مقام سے اس کی زندگی پر نظر کی جائے تو بہت ہی وسیع آفاق میں وہ آزاد ہے مگر پھر بھی اس پر حدود مسلط ہیں، مقدر ہیں۔ وہ نہ اپنی مرضی سے پیدا ہو سکتا ہے اور نہ اپنی مرضی سے مر سکتا ہے۔ حیات و موت کے لیے وہ حیات و موت کے ازلی و ابدی مالک کا محتاج ہے۔ ہر عہد میں اس عہد کا سب سے اعلیٰ صلاحیتوں والا یا والے انسان اپنے عہد کے علم کی امکانی منزلوں سے آگے نہیں نکل سکتے۔ یہ بھی ان کی آزادی کی ایک حد ہے۔ لہٰذا ان حدود کو توڑنے کی آرزو گناہ کی آرزو ہے اور جو حدود توڑی جا سکتی ہیں ان کا توڑنا گناہ ہے اور ان کی سزا ایک عذاب ہے۔''

''حدود کا توڑنا کیسے ممکن ہو سکتا ہے اگر وہ حدود ہیں تو؟''

''حدود میں بھی قسمیں ہیں۔ بعض حدود کا توڑنا ناممکن ہے جیسے اپنی مرضی سے پیدا ہونا، جہاں چاہے، جس گھر میں، جس ملک میں، جس عہد میں، پیدا ہونا۔ انسان کے باہمی تعلقات، انسان اور فطرت کے تعلقات اور جو کچھ اس میں ہے اس سے انسان کے تعلقات کی جو حدود ہیں، ان کو انسان توڑنے میں آزاد ہے مگر اس کے لیے اس کو بھاری قیمت دینی پڑتی ہے اور اس قیمت کی نوعیت کبھی تو ناخوشی، بدحالی، نکبت اور کبھی عذاب اور مسلسل عذاب ہے۔

اس لیے مقدر بلکہ بہتر الفاظ میں تقدیر کی اطاعت راحت کی راہ ہے، فلاح کا راز ہے۔ لہٰذا اس کو آزادی کا انکار یا آزادی سے انحراف یا فرار نہیں کہا جا سکتا۔''

''تو میرے لیے ابھی سفر مقدر ہے؟ آرام محال ہے؟''

''نہیں تو...... منزل پر پہنچ جانے کے لیے ضروری ہے کہ راہ میں پڑاؤ ڈال کر ستا لیا جائے، تازہ دم ہو لیا جائے۔ اس سے سفر کی صعوبتوں کا مقابلہ آسان نہیں تو ممکن ضرور ہو جاتا ہے۔''

''تو پھر آرام کر لوں؟...... مگر میں آپ کے قرب سے دور ہونا نہیں چاہتی۔ اس لمحے تو میں نیند میں بھی آپ کا قرب چاہوں گی۔''

''تو آؤ اس صوفے پر میرے زانو پر سر رکھ کر کچھ دیر آرام کرلو، سولو۔''

''اور اگر چاہوں کہ آپ کے سینے پر سر رکھ کر سوجاؤں تو کیا یہ ناممکن ہوگا، آپ کو ناگوار ہوگا؟''

مسکراتے ہوئے ''نہیں تو۔عین راحت ہوگی۔''

فردوس اپنے صوفے سے اٹھ آئی اور متین صاحب صوفے کی کمر اور بازو کے ساتھ ٹیک لگا کر صوفے پر نیم دراز ہوگئے ان کا آدھا دھڑ صوفے پر تھا اور ان کی ٹانگیں صوفے سے نیچے تھیں اور ان کے پاؤں فرش پر تھے۔فردوس ان کے سینے پر سر رکھ کر صوفے پر دراز ہوگئی اور لیٹنے کے کچھ دیر بعد اس نے متین صاحب کے دونوں ہاتھ اٹھا کر اپنے پیٹ پر رکھ لیے اور پہلو کو ذرا سا موڑ کر کمر کو صوفے کی طرف کر کے سوگئی۔

چھٹا باب

ہر طرف ریت ہی ریت تھی جو ڈھلتی دھوپ میں چمک رہی تھی۔دور دور تک درخت کا نشان نہ تھا۔اس ریت کے سمندر کے بیچوں بیچ سفید لبادے میں لپٹی ایک صورت پسینے میں شرابور، بھورے گھوڑے کی عنان پکڑے سورج کی اور چلی جارہی تھی، جیسے سورج کے تعاقب میں ہو اور سورج بھاگتا، ہانپتا، چھپتا پھرتا ہو۔

صورت اپنی چال اور قد وقامت سے عورت معلوم ہوتی تھی۔اس کی چال میں بے پناہ تھکن تھی۔وہ بار بار گردن موڑ موڑ کر ادھر ادھر دیکھتی تھی۔شاید ستانے کی جا ڈھونڈتی تھی مگر سایہ ناپید تھا۔ایک بار تو صورت لڑکھڑا گئی اور عنان کے سہارے دوہری ہوگئی۔گھوڑا رک گیا۔صورت ہانپ رہی تھی۔دیر تک گھوڑا اور صورت ریت کے سمندر میں کھڑے رہے، جیسے طوفان کے بعد سمندر کا پانی دلدلے ساحل پر ایک اوندھی کشتی اور نیم جاں مسافر کو چھوڑ گیا ہو۔

سورج کی کرنوں میں پہلی سی روشنی نہ تھی، ریت کی چمک ماند پڑ گئی تھی، عنان تھامے صورت ابھی دہری ہی تھی مگر اس کا ہانپنا بند ہو چکا تھا۔ شاید صورت کی روح اس حالت میں قبض ہو چکی تھی۔ ایسا نہیں تھا۔ صورت میں ایک لرزا سا پیدا ہوا اور اس کی کمر سیدھی ہو گئی اور اس نے ایک لمبا سانس لیا، اتنا لمبا کہ شاید صحرا کی ساری ہوا اس کے سینے میں کھنچ آئی اور اس کھنچاؤ سے سورج مغربی افق پر کانپ گیا۔

صورت نے گھوڑے کی گردن کو تھپکا اور اس کو اپنے گرد اگرد گھمایا اور پھر زین کی گردن پر دونوں ہاتھ جما کر، رکاب میں لرزتا ہوا پاؤں جمایا اور کانپتی ہوئی ٹانگ کے سہارے گھوڑے پر سوار ہو گئی۔ یہ کوشش بڑی مشکل سے کامیاب ہوئی تھی اور صورت گھوڑے کی گردن پر دہری ہوئی ہانپ رہی تھی مگر صورت نے جلد ہی اپنے آپ پر قابو پا لیا اور سیدھی ہو کر زین میں جم کر بیٹھ گئی، گھوڑے کی گردن کو تھپکا، عنان کو کھینچا اور دونوں رکابوں میں جمے ہوئے پاؤں کی ایڑیوں کو گھوڑے کے پیٹ میں گاڑ دیا۔ گھوڑا تھرایا اور اس کی لمبی دم کی جڑ میں تشنج پیدا ہوا اور گھوڑا ایک خفیف سے وقفے کے لیے فضا کے سینے پر نقش ہو گیا۔ اور پھر گھوڑا ہوا ہو گیا۔ صحرا کی طنابیں کھنچ گئیں اور ڈوبتا سورج ایک بار پھر مغرب سے ابھرنے لگا۔ سورج کا چہرہ خون آشام تھا جیسے سوار کے مقابلے کے لیے، جم کر لڑنے مرنے پر، تل گیا ہو۔ گھوڑا اڑتا چلا گیا، سورج افق سے ابھرتا چلا گیا۔ صحرا کی ریت اب آہستہ آہستہ مٹی میں بدل رہی تھی، کہیں کہیں گھاس کا واضح نشان ملنے لگا تھا۔ مٹی ایک مرتفع سطح کا نشان بننے لگی۔ صورت نے زین میں بلند ہو کر پیچھے کی طرف مڑ کر دیکھا۔ سورج کے خون کی بوندوں کا عکس سوار کے عرق آلود چہرے پر دمک رہا تھا۔ دور مشرق کی طرف سے اندھیرے کوچ کرتے ہوئے چلے آ رہے تھے۔ نیچے گہرائی میں ایک سمندر میں لہریں اٹھ رہی تھیں۔ کہیں کہیں سے ہلکا ہلکا غبار بھی اٹھ رہا تھا۔ شاید شام کی ہوا ریت اڑا اڑا کر اپنی آمد کا اعلان کر رہی تھی۔

صورت زین میں بیٹھ گئی اور اس نے ایک بار پھر ابھرتے ڈوبتے سورج کی طرف منہ پھیر لیا۔ گھوڑا مرتفع سطح پر بلندی کی طرف چڑھتا رہا۔ راستہ پیچانی تھا۔ ابھرتا ہوا سورج ایک بار پھر ڈوبنے لگا۔ پیچانی راستہ ایک سبزہ زار وادی کا پتا دینے لگا۔ آخر راستہ ختم ہوا اور دور

تک سبزہ زار پھیلا نظر آنے لگا اس سبزہ زار کے بیچ ایک مرمریں عمارت کی بلند فصیلوں پر سرخ ڈوبتے سورج کی آخری کرنیں لال رنگ چڑھا رہی تھیں۔ عمارت کے مشرقی عقب میں دور تک نیم تاریکی میں پانی کا گماں ہوتا تھا۔

یکا یک سورج ڈوب گیا۔ مشرق سے اندھیرے کا ریلا بڑھنے لگا مگر ابھی آسمان پر روشنی ٹمٹما رہی تھی۔ پھر آسمان پر بھی اندھیرا چھا گیا۔ صورت اور گھوڑا ابھی تک ساکت تھے۔ ان میں حرکت پیدا ہوئی اور اندھیرے میں گھوڑا مرمریں عمارت کی طرف رواں ہو گیا، اندھیرے میں تحلیل ہو گیا۔

ہر طرف اندھیرا چھا گیا۔ اندھیرے میں سب کچھ مٹ گیا۔ پھر آہستہ آہستہ افق کے آسمان پر مدھم مدھم سی روشنی ہونے لگی۔ مغرب سے چاند نکل آیا۔ اس کی چاندنی کا ریلا آسمانوں سے زمین کی طرف اترنے لگا۔ سبزہ منور ہوا، اونچے اونچے درختوں کی پھننگیں منور ہوئیں، دور تک پھیلتے ہوئے درختوں کے جھنڈ چاندنی سے بھر گئے۔ آہستہ آہستہ درخت چاند کی اور بڑھنے لگے اور ان کے درمیاں ان کے سایے میں سفید، گلابی، پیلے، اودے کھلتے ہوئے، مسکراتے ہوئے پھول نظر آنے لگے۔ چاندنی پھولوں سے، ان پر سایہ کرتے ہوئے درختوں سے بلند ہونے لگی۔ مرمریں عمارت کی دمکتی فصیلیں نیچے دوڑنے لگیں اور دور تک ٹھاٹھیں مارتے ہوئے سمندر کا منظر کھل گیا۔ منظر کھلتے ہی ٹھٹک گیا، افق پر نقش ہو گیا، جم گیا۔ چاندنی لہروں میں طبق اندر طبق گھل ملنے لگی۔ لہریں افق سے ابھرتیں تو لہروں اور افق کے درمیانی فاصلوں میں اندھیرا سا چھا جاتا۔ چاندنی میں لہروں اور لہروں کے درمیان اندھیرے کا باہمی سینہ بہ سینہ رقص ایک عجیب منظر پیش کر رہا تھا۔

آہستہ آہستہ لہروں کے درمیانی فاصلوں سے اندھیرے غائب ہونے لگے۔ چاند نیلی دمکتی سیڑھیاں چڑھتا ہی چلا گیا۔ ہر شے چاندنی بن گئی۔ مگر نیلے سبز افق پر ایک سیاہ سا دھبہ ابھر آیا تھا۔ دھبہ آہستہ آہستہ شکل اختیار کرنے لگا، ایک کشتی بن گیا۔ لہریں کشتی کو چاند کی اور دھکیلے لئے آ رہی تھیں۔ کشتی لہروں پر ابھرتی، ڈولتی، ساحل کی طرف چلی آ رہی تھی۔ ایک بار ایک بڑی سی لہر نے کشتی کو چاند کی طرف اچھال دیا اور پھر ساحل کی طرف لڑھکا دیا۔

کشتی لڑھکی اور اس میں سے ایک صورت پانی پر لڑھک آئی۔ ایک اور لہر چاند کی طرف لپکی اور اس کے زور سے صورت ساحل پر آ رہی۔

لہریں ساحل کی طرف آتیں مگر ساحل کو چھو کر، کبھی کبھار ساحل پر پڑی ہوئی صورت کو بھی اٹھا کر ساحل پر اور دور تک لے جا کر گرا دیتیں اور واپس لوٹ آتیں پھر واپس مرکز کی طرف لوٹ جاتیں۔ بھاٹا جوار میں بدل رہا تھا۔

لہریں ابھرتی، ڈولتی رہیں۔ چاند نیلی دمکتی سیڑھیاں چڑھتے چڑھتے تھک گیا اور مشرق کی طرف اترنے لگا۔ آخر اترتے اترتے تھک گیا، پیلا پڑ گیا اور پھر تھک کر چور ہو گیا اور اس کے چہرے کی پیلاہٹ سفیدی میں بدلنے لگی۔ لہروں کے درمیانی فاصلوں پر ایک بار پھر اندھیرا چھانے لگا۔ سمندر کی لہروں اور ساحل پر پڑی ہوئی صورت میں فاصلہ بڑھنے لگا، بڑھتا ہی چلا گیا، صورت بے سدھ پڑی تھی۔ چاند کی سفید، صورت بے نور ہو گئی۔ گھپ اندھیرا ہو گیا۔

مشرق سے کرنیں پھوٹ بہنے لگیں۔ شانت، سوئے، خراٹے لیتے ہوئے، سمندر پر کرنیں پھونک پھونک کر قدم دھرنے لگیں، دبے پاؤں چلنے لگیں۔ لہروں پر تیرتی ہوئی جھاگ، سمندر کی سبزی مائل نیلاہٹیں دمک اٹھیں۔ سمندر کے سینے پر ننھی منھی لہریں اٹھ اٹھ کر سورج کو خوش آمدید کہہ رہی تھیں۔

ساحل پر پڑی ہوئی صورت بے سدھ پڑی تھی۔ سورج نیلے دمکتے آسمان پر تیرتا تیرتا وسط میں پہنچ لیا تو صورت میں جنبش ہوئی اور اس نے سورج کی طرف سے پہلو بدل لیا اور اوندھی ہو گئی۔ سورج کی گرمی سے اس کا لباس خشک ہونے لگا۔ صورت نے ریت میں پاؤں کے پنجے گاڑ دیئے اور بانہوں کے زور اٹھنے کی کوشش کرنے لگی۔ بانہوں اور اٹھی ہوئی کمر کے سایے میں سینے کی قوسیں نمایاں ہو گئیں۔ پھر آہستہ آہستہ زمیں پر ٹکی ہوئی بانہوں اور گھٹنوں میں فاصلہ کم ہوتا چلا گیا۔ کچھ دیر ریت پر اوندھی سکڑتی ہوئی صورت کانپتی رہی اور پھر گھٹنوں کے بل اٹھ کر بیٹھ گئی۔ اس نے ادھر ادھر دیکھا۔ اس سے کچھ دور ساحل پر کشتی اوندھی پڑی تھی۔ اس نے کشتی سے منہ موڑ کر مغرب کی طرف دیکھا۔ مرمریں فصیلوں والی

عمارت کو دیکھا، عمارت سے پرے بلند درختوں کو دیکھا۔ درختوں کے پتے ہل رہے تھے۔ ہوا چل رہی تھی۔ درختوں کی پتلی نازک ٹہنیوں پر ڈولتے ہوئے سفید سفید، گلابی گلابی، پیلے پیلے، اودے اودے پھولوں کو دیکھ کر اس کا نڈھال پیلا پیلا سا چہرہ دمک اٹھا۔ وہ دیر تک مبہوت پھولوں کو ڈولتے، جھولتے دیکھتی چلی گئی۔ اور پھر ایک دم وہ زمین پر ہاتھ جما کر اٹھ کھڑی ہوئی اور عمارت کی طرف چل دی۔

چلتے چلتے اس کی رفتار آہستہ ہوگئی۔ وہ چلتے چلتے رک گئی۔ کچھ سوچنے لگی پھر شانے جھٹک کر، سر ہلاتے ہوئے، وہ ایک بار پھر عمارت کی طرف چل دی۔ عمارت کے قریب پہنچ کر اس نے دیکھا کہ کھڑکیوں میں پڑے ہوئے اجلے اجلے پیلے پیلے پردے ہوا سے پھڑ پھڑا رہے ہیں، جیسے اس کو اندر آنے کی دعوت دے رہے ہوں۔ عمارت کے گرد گھومنے لگی۔ رنگ برنگ کے گلزار کے سامنے عمارت کا برآمدہ تھا۔ اس کے سامنے پہنچ کر وہ رک گئی اور اس نے پکارا۔

''کوئی ہے اندر......کوئی ہے اندر......'' آواز ہوا کے سہارے دور تک چلی گئی مگر کہیں سے بھی جواب نہ آیا۔ اس کے شانے کانپے، شاید وہ ڈر رہی تھی۔ اس کے جبڑے تن گئے اور وہ سیڑھیاں چڑھ کر برآمدے میں داخل ہوگئی۔ سیاہ اور سفید مرمریں فرش پر کہیں گرد کا نشان نہ تھا۔ وہ برآمدے کے ایک سرے سے دوسرے تک گئی اور پھر ایک دم مڑ گئی۔ اس کے چہرے پر خوف کے ہلکے سے نشانات تھے۔ اس نے ایک بند دروازے پر دستک دی۔ کوئی جواب نہ ملا۔ اس نے دروازے کو دھکیلا، دروازہ کھل گیا۔ وہ ڈرتے ڈرتے گلابی پردوں کو ہٹاتے ہوئے اندر داخل ہوئی۔ فرش پر سرخ نیلے رنگ کا قالین بچھا تھا جس میں اس کے پاؤں چھپ گئے۔ اس نے پاؤں کو دیکھا، قالین کو دیکھا اس کے پاؤں مٹی کے باوجود اس کو حسین قالین پر چلنے کے حق دار معلوم ہوئے۔ یہ بیٹھنے کا کمرا تھا۔ کمرے میں صوفوں پر گلابی رنگ کا ریشمی کپڑا چڑھا تھا۔ کمرے کی ہر شے پر گلابی رنگ کے کپڑے پڑے تھے۔ دیوار پر نصب شمعدان گلابی تھے، دیوار پر گلابی رنگ چڑھا تھا۔ گلابی چھت میں نصب سنہری زنجیر سے لٹکتے ہوئے شمعدان گلابی تھے۔ کھڑکیوں میں، دروازوں کے آگے

گلابی دبیز پردے پڑے تھے۔

وہ اس کمرے سے دوسرے کمرے میں داخل ہوئی تو وہاں ہر شے پر پیلے کپڑے پڑے تھے، دیواریں پیلی تھی، شمعدان پیلے تھے۔ ہر کمرے کا رنگ مختلف تھا اور اسی رنگ کے کپڑے چیزوں پر پڑے تھے، اسی رنگ کے پردے کھڑکیوں میں لہراتے تھے، اسی رنگ کے بھاری اور ملائم ریشمی پردے دروازوں کے آگے پڑے تھے۔

وہ کمرے دیکھتے دیکھتے تھک گئی۔ اس کو بھوک ستانے لگی۔ اس نے نتھنے پھڑ پھڑائے۔ وہ نیلے کمرے میں سے نیلے پردوں کو ہٹا کر بائیں طرف کے کمرے میں داخل ہوگئی۔ یہ کھانے کا کمرا تھا۔ یہاں نیلی دیواروں پر سنہری، منقش شمعدان نصب تھے۔ شمعدانوں کے درمیانی فاصلوں میں چھوٹے چھوٹے منقش دبیز پردے لٹک رہے تھے جن پر مختلف مناظر بنے ہوئے تھے۔ ایک دیوار پر سمندری مناظر کی روغنی تصویریں آویزاں تھیں۔ مگر کمرے کا حسن اسے زیادہ دیر اپنی طرف متوجہ نہ رکھ سکا۔ وہ کھانے کی میز کی طرف بڑھی۔ لمبی میز پر کمخواب کے دستر خوان پر رنگ رنگ کے کھانے چنے تھے۔ اتنے کھانے تو ایک سو مہمانوں کے لیے بھی کافی تھے۔ اس نے کھانوں کی خوشبو کو سونگھنے کے لیے ایک لمبا سانس لیا اور ایک کرسی کو کھینچ کر اس میں گر گئی۔ وہ بھوک سے نڈھال ہو رہی تھی۔ اس نے ایک رکابی میں پلاؤ ڈالا اور کھانے لگی اور کھاتی ہی چلی گئی۔ ختم ہونے پر اس نے نظر اٹھا کر میز کو دیکھا تو اس نے محسوس کیا کہ سالنوں سے بھری ہوئی کشتیاں اس کو حیرانی سے دیکھ رہی تھیں۔ اس نے اس بار بریانی کی قاب سے چاول اپنی رکابی میں ڈالے اور مختلف سالنوں کی طرف دیکھا اور اتنے بہت سے سالن دیکھ کر وہ فیصلہ نہ کر سکی کہ کیا لے۔ پھر ایک قریب کے سالن کی کشتی سے سالن لیا اور کھانے لگی۔ وہ مختلف قسم کے چاولوں کی کشتیوں سے چاول اور سالنوں کی کشتیوں سے مختلف قسم کا سالن لے کر کھاتی ہی چلی گئی۔ نمکین چیزوں سے دل بھر گیا تو میٹھی چیزوں کی طرف ہاتھ بڑھائے اور پھر مشروبات کی طرف ہاتھ بڑھائے جب سیر ہو کر اٹھی تو اٹھا نہ گیا۔ اس نے حیرانی اور ندامت سے ادھر ادھر دیکھا کوئی نہ تھا۔ اس نے ایک بار میز پر نگاہ کی تو اس پر سے کھانے کی چیزیں غائب تھیں، صرف ایک گلابی بلور کے

گلاس میں سفید سا شربت تھا جس کو دیکھ کر آنکھوں میں طراوت کا احساس ہوا۔ اس نے بغیر سوچے اس کی طرف ہاتھ بڑھا دیا، اٹھا کر منہ سے لگا لیا۔ اتنا لذیذ شیریں مگر ترش شربت اس نے کبھی نہ پیا تھا۔ اس کے پیتے ہی اس کے پیٹ کی گرانی غائب ہوئی اور اس پر غنودگی سی طاری ہونے لگی۔ وہ کھانے کے کمرے سے سونے کے کمرے کی تلاش میں نکل پڑی۔ ایک کمرے میں سے خوشبوؤں نے اس کو اپنی طرف متوجہ کیا۔ وہ دائیں مڑ گئی۔ ایک وسیع کمرے میں گہرے اودے رنگ کے لبادوں میں ڈھکی ہوئی اشیا دم سادھے اس کا انتظار کھینچتی تھیں۔ قالین بھی گہرے اودے رنگ کا تھا۔ پلنگ پر پڑے ہوئے پلنگ پوش بھی اودے تھے مگر سنہری تاروں سے منقش تھے۔ وہ منقش پلنگ پوش کو اٹھا کر مخملیں بستر پر بیٹھ گئی اور بیٹھتے ہی اس کی گردن سرہانے کی طرف جھک گئی۔ اس نے ٹانگیں فرش سے اٹھا کر پلنگ پر رکھ لیں۔ اس کی آنکھوں پر پردے گر گئے اور وہ سو گئی۔

وہ سو کر اٹھی تو چاند مشرقی افق میں کھڑا اس کو دیکھتا تھا۔ اس کے دیکھتے دیکھتے چاند ماند ہوا اور اندھیرا ہو گیا۔ اس نے آواز کے لیے کانوں کو خبردار کیا مگر کھڑکیوں میں پڑے ہوئے ہلکے ہلکے پردوں کی پھڑ پھڑاہٹ کے سوا کوئی آواز اس کے قریب نہ تھی۔ دور سے سمندر کے خراٹوں کا شور آہستہ آہستہ اس کے کانوں کی طرف بڑھ رہا تھا، جیسے کوئی آہستہ آہستہ دروازے پر دستک دے رہا ہو۔ اور پھر صبح ہو گئی۔

تیس شب و روز اسی طرح گزر گئے۔ وہ کھاتی پیتی، صبح و شام باغ کی سیر کرتی اور دوپہر کو وہ بلند مرمریں فصیلوں والی چھت پر چڑھ جاتی اور آفاق میں کسی کشتی، کسی جہاز اور خشکی کی طرف کسی سوار یا آدمی کی تلاش میں نظریں دوڑاتی۔ مگر کہیں بھی اس کو اپنے سوا کسی آدم زاد کا نشان نظر نہ آتا۔

اس کے بدن میں جوانی، آرزوئیں، ساتھی کو پکارنے لگیں۔ مگر ساتھی کی امید اس کو پوری ہوتی نظر نہ آتی تھی۔ اس کا جی چاہا کہ وہ اپنے آپ کو آئینے میں دیکھے مگر آئینہ کہیں نہ تھا۔ اس نے کئی بار کوشش کی کہ کھانے کی میز سے کسی برتن میں پانی ڈال کر باہر روشنی میں لے آئے اور اس میں اپنے عکس کو دیکھے مگر ہر بار برتن سے پانی باہر آتے آتے غائب

ہو جاتا۔ وہ اس بے آئینہ جہاں پر آخر قانع ہو گئی۔ اس نے دن گننے بھلا دیئے۔

اس کو ایک دن خیال آیا کہ آخر گلزار کے پھولوں کو بھی تو پانی کہیں سے ملتا ہی ہوگا۔ اس نے اس پانی کی تلاش شروع کی مگر گلزار کو سیراب کرنے والا پانی اس کو کہیں نظر نہ آیا۔ وہ اپنے آپ کو نہ دیکھ سکنے پر بھی قانع ہو گئی۔

جوانی اور آرزوؤں نے اس کے تخیل کے جہان میں ایک نئے سورج کو جنم دیا۔ اس کا سورج اس کے بے آئینہ جہاں کے سورج سے مختلف تھا اور اس سے کہیں زیادہ حسین۔ اس میں گرمی تو تھی مگر اتنی نہ تھی کہ نظریں چندھیا جائیں اور آنکھوں تلے اندھیرا آ جائے۔ نہ ایسا تھا کہ چاند کی طرح اس کی طرف ٹکٹکی باندھے دیکھتے رہو اور آنکھوں کو، خون کو، جسم کو کچھ نہ ہو۔ اس میں صرف ایک وصف ویسا ہی تھا جیسا کہ بے آئینہ جہاں کے سورج میں تھا، وہ بہت دور تھا، اس کا تعاقب کرتے کرتے اس کی آنکھیں تھک جاتی تھیں۔ وہ بے آئینہ جہاں کی اداسیوں کو بھول گئی اگرچہ اس کے گلزار میں مسکراتے ہوئے رنگ رنگ کے پھولوں کی گود میں جھولتی ہوئی شبنم کی بوندوں کی یاد اس کو اکثر ستاتی تھی۔

ایک دن وہ بڑے ہی دنوں کے بعد دوپہر کے وقت چھت کی فصیل پر ٹھوڑی ٹکائے سمندر کے اس پار دیکھتی تھی کہ اس پر غنودگی طاری ہونے لگی۔ اس کے جی میں آئی کہ اگر چھت پر پلنگ اور بستر ہو تو وہ وہیں سو رہتی۔ غنودگی نے بہت زور کیا۔ وہ نیچے اترنے کی نیت سے مڑی تو چھت پر ایک سنہرے پلنگ پر سنہری بستر کو منتظر پا کر حیران ہوئی۔ اس پر غنودگی کا غلبہ بڑھتا ہی چلا گیا۔ وہ پلنگ پر لیٹ گئی۔ اس کی آنکھیں بند ہو گئیں اور اس کے تخیل کے جہاں کا منظر اس پر کھل گیا۔ اس کا ہمدرد سورج آج بھی حسین تھا، اس کے حسن میں جلال کی شدت نہ تھی۔ اس کی کرنیں اس کو گدگدانے لگیں، اس کے خون میں مدھ کی لہریں اٹھنے لگیں۔ وہ نظروں سے سورج کا تعاقب کرنے لگی۔

یکا یک سورج بلندیوں سے ٹوٹ کر گرا اور گرتا ہی چلا گیا۔ فضا میں گرمی کی شدت پیدا ہوئی اور بڑھتی چلی گئی۔ وہ گھبرا کر اٹھ بیٹھی اور سورج ایک ننھے سے وقفے کے لیے ٹھٹکا اور پھر آہستہ آہستہ اس کی طرف اترنے لگا۔ مرمریں فصیل کے کنگروں پر سے ہوتا ہوا اس کے

پلنگ کی طرف بڑھ آیا اور اس کے دائیں پاؤں کے انگوٹھے پر کھڑا ہو گیا۔ گرمی کی شدت سے اس کا پتہ پانی ہونے لگا وہ گھبرا گئی اور گھبرا کر اس نے پاؤں کو اپنی طرف کھینچ لیا۔ سورج اس کی رانوں کی طرف لڑھک آیا اور اس کے دیکھتے دیکھتے گم ہو گیا۔ وہ ششدر رہ گئی۔ اس نے یکا یک محسوس کیا کہ جیسے سورج اس کے پیٹ میں ہو، اس کے پیٹ میں آگ سی لگی تھی۔ اس کے تن بدن میں آگ تھی۔ اس نے محسوس کیا کہ اس کے چہرے سے شعلے اٹھ رہے تھے۔

فضا میں تاریکی تھی۔ تاریکی کی ٹھنڈک اس کی آگ کو ٹھنڈک میں نہ بدل سکی۔ اس نے اٹھنا چاہا مگر اپنے آپ کو پلنگ سے پیوست پایا۔ اس نے اس آگ سے نجات کے لیے دعا کرنا چاہی تو اس کے دل نے سوال کیا کہ کیا وہ واقعی اس آگ سے نجات چاہتی تھی؟ اس نے محسوس کیا کہ اس کے تن بدن نے جواب دیا ''نہیں! ہرگز نہیں'' اس کی نظریں آسمان پر لگی تھیں مگر آسمان سے کچھ بھی نہ اتر رہا تھا۔ اس نے اپنے آپ پر نظر کی۔ اس نے محسوس کیا کہ اس کی ٹانگوں میں، اس کی رانوں میں درد ہے، بے پناہ درد ہے، اس نے سوچا کہ شاید جنائی کا درد ہو۔ وہ اس درد کی اذیت اور لذت میں کھو گئی۔ اس کے زانوؤں سے درد اس کے پاؤں کی طرف چل نکلا اور پھر بڑی شدت کے بعد اس کے دائیں انگوٹھے میں داخل ہو گیا۔ اس نے انگوٹھے کی طرف دیکھا تو اس میں سے ایک ننھا سا آئینہ ابھر رہا تھا۔ وہ حیرانی سے اٹھ بیٹھی وہ خوش ہوئی کہ وہ اٹھ بیٹھی ہے۔ وہ آئینہ اس کے انگوٹھے سے الگ ہو کر پھیلنے لگا اور پھیل کر قد آدم ہو گیا۔ اس کے دل میں ایک لہر اٹھی کہ وہ اب اپنے آپ کو دیکھ سکے گی۔ مگر ہر طرف اندھیرا ہی اندھیرا تھا۔ اس نے روشنی کے لیے دعا کی۔ اس کے سینے سے شعلہ نکلا اور فضا میں روشنی کا گمان پیدا ہوا۔ اس نے آئینے میں دیکھا۔ وہ بہت ہی حسین تھی۔ اتنی حسین کہ جتنی......جتنی......اس نے سوچا۔ مگر اس کی سوچ نے جواب دے دیا۔ اس نے ایک بار پھر آئینے میں دیکھا۔ آئینے میں فردوس تھی۔ وہ حیران ہوئی اور وہ پلنگ سے اتر آئی۔ اس نے ایک بار پھر غور سے آئینے کو دیکھا۔ فردوس کے دمکتے چہرے کے نیچے پیٹ میں سے سورج جھانک رہا تھا۔ وہ ڈر گئی اور اس کے منہ سے چیخ نکل گئی اور اس نے دونوں

ہاتھوں سے پیٹ میں سے جھانکتے ہوئے ہوئے سورج کو ڈھانپ لیا......

فردوس خواب سے چونک کر بیدار ہوئی۔ اس نے اٹھنے کی کوشش کی تو اٹھ نہ سکی۔ اس نے آنکھیں کھول کر دیکھا تو اس کی کمر متین صاحب کی بانہوں میں جکڑی تھی، ان کے دونوں ہاتھ اس کے پیٹ پر تھے اور اس کے اپنے دونوں ہاتھ ان کے ہاتھوں پر تھے۔

اس کے جسم کی حرکت سے متین صاحب بھی خوابوں کے جہاں سے لوٹ آئے اور انہوں نے صوفے کے بازو سے سر اٹھایا اور فردوس کے بوجھ سمیت صوفے میں اٹھ کر بیٹھ گئے۔ ان کی آنکھوں میں ابھی خواب کے نشان باقی تھے اور ان کے چہرے پر لذت اور حیرانی کے جذبات ایک دوسرے سے بغلگیر ہو رہے تھے۔ دونوں نے کمرے کو غور سے دیکھا۔ شمالی دروازے کی چوکھٹ میں چاند کی کرنیں قدم جمانے کی کوشش کر رہی تھیں۔ انہوں نے کان لگا کر سنا۔ خاموشی کے سوا کچھ نہ تھا۔

متین صاحب نے فردوس کی کمر سے بانہیں ہٹالیں اور صوفے پر سیدھے ہو کر بیٹھ گئے۔ فردوس صوفے سے اٹھ کھڑی ہوگئی اور کمرے میں ٹہلنے لگی۔ ٹہلتے ٹہلتے وہ باہر صحن میں نکل گئی۔ چاند مشرقی پہاڑیوں کی چوٹیوں سے بلند ہو چکا تھا۔ صحن میں چاندنی اور اندھیرا ایک دوسرے کی آغوش میں مدہوش، ایک دوسرے کو سہلا رہے تھے۔ فردوس نے مرمریں کٹہرے سے نیچے جھانکا، مشرق سے مغرب تک چاندنی بہہ رہی تھی۔ ہوا سو رہی تھی، درختوں پر پتے سو رہے تھے، مغرب کے کھیتوں میں کھڑی فصلیں سو رہی تھیں، شمال اور مغرب سے بہنے والے دریا بہتے بہتے تھک کر جنوب کے قلب میں سو گئے تھے، رک گئے، ان کا وصال ناممکن نظر آ رہا تھا۔ بالکل اسی طرح جس طرح متین صاحب اور خود اس کی زندگی کا وصال، شاید چاندنی کا لمس ان کو خواب سے بیدار کرے اور ان کا وصال، ان کا باہمی سفر پھر سے شروع ہو۔ ان کا اپنا چاند کب نکلے گا؟ اس نے سوچا۔ اس نے آفاق پر متعین پہاڑوں پر نظر کی۔ وہ اپنے اپنے مقام پر قائم اس وادی کی زندگی کی حفاظت کر رہے تھے، اگرچہ وہ ایک دوسرے سے آفاق کے بُعد کی وجہ سے الگ الگ تھے مگر وادی کے اشتراک اور اتصال کی وجہ سے ایک دوسرے میں پیوست تھے۔ اگر دریاؤں کی طرح مل

کے بہنا ان دونوں کے لیے ممکن نہ تھا تو ان پہاڑوں کی طرح ایک ہی فرض کی انجام دہی کے باعث، زندگی کے ایک ہی حصے کی حفاظت میں، مقام کے بُعد اور اختلاف کے باوجود، کیا وہ ایک دوسرے سے اشتراک اور اتصال کی زندگی بسر نہیں کر سکتے؟ کیا ضرور ہے کہ دو انسانوں میں ان دریاؤں کا سا ہی رشتہ ہو۔ اس پھیلی ہوئی کائنات میں ہر مظہر الگ اور منفرد بھی ہے اور ایک دوسرے میں جاری وساری بھی، ان کے اوصاف الگ الگ بھی ہیں اور ایک دوسرے کے وصف کے استقرار میں مددگار بھی۔ مقام کے بُعد اور اختلاف کے باوجود ایک ہی عالم کا حصہ ہونے کا احساس دونوں انسانوں کو قرابت اور حلاوت کے رشتوں میں پیوست رکھ سکتا ہے۔ ان خیالات اور احساسات کے سلسلے سے اس کے اندر ایک حرکی سکون نے، ایک پھیلے ہوئے گردوپیش کا احاطہ کرتے ہوئے حلم نے جنم لیا۔ اس سکون اور اس حلم کے جذبات کے ساتھ ساتھ اس کے ذہن اور تخیل میں ممنونیت کا احساس جاگا کہ مظاہر کے خالق نے ہر مظہر کو ایک نشان راہ بنایا ہے جس کی راہنمائی سے ہمارے سفرِ درون کی ہر منزل ہمارے معاشرتی اعمال کی منزل بنتی چلی جاتی ہے اور ہمارے ہر معاشرتی عمل کی منزل ہمارے سفرِ درون کی منزل بنتی چلی جاتی ہے، جن کی روشنی میں اندر اور باہر ایک ہی گزرگاہ کی منزلیں معلوم ہوتے ہیں۔

اس نے اپنے اور متین صاحب کے سفر کی آخری منزل کو، اور اس منزل سے پھوٹنے والی نئی، اگرچہ الگ الگ، منزلوں کو قبول کر لیا۔ اس لمحے، اس نے سوچا، ستانے اور انتظار اور صبر کے سوا کچھ ممکن نہیں، یہی تقدیر کے خالق کی اطاعت ہے۔

ساتواں باب

''کھانے میں ابھی دو گھنٹے کی دیر ہے۔ کیا آپ نہانا پسند کریں گے؟ اور شاید کچھ دیر کی تنہائی بھی؟''

''ہاں! نہا کر تازہ دم ہو ہی لیں تو اچھا ہے۔ نہ جانے کتنا لمبا سفر درپیش ہو۔''

دونوں، فردوس اور متین، کمرے سے نکل آئے اور اپنے اپنے کمروں میں چلے گئے۔

فردوس نے غسل خانے میں جا کر مرمریں ٹب کے اوپر لگے ہوئے گرم پانی کے نلکے کی ٹونٹی کھول دی۔ ٹب میں پانی گرنے کی آواز میں پہاڑی ندی کا شور تھا اور موتسارت کے اوائلِ عمر کے نغموں کا ناچتا ہوا، غیر مسدود، کھلا پن جس میں معنی کی وضاحت تھی، ہنرمندی اور بے ساختگی کی حیرت انگیز گھلاوٹ تھی۔

اس کا جسم پانی کی آواز، پانی کے دھوئیں میں لپٹ جانے کے لیے بے تاب ہونے لگا۔ وہ غسل خانے سے نکل آئی، سنگھار کی میز کے سامنے جا بیٹھی۔ وہ اپنے آپ کو پہچان نہ سکی اس کے چہرے کے نقوش نئے رشتوں میں منظّم ہو گئے تھے۔ ان میں آگ اور آہن سے ترکیب پائی ہوئی تلوار کی دھار کی سی چمک تھی اور ویسی ہی نزاکت اور کاٹ۔ اور اس کی آنکھوں میں روشن چراغ جیسے اندھیرے پانیوں میں نہاں سورج۔ آئینے کی سطح پر تیرتے ہوئے جلال افشاں جمال کے مظہر کو تحیر اور مدھم مدھم خوف کے جذبات میں لپٹے کھلتے لباس میں ملبوس دیکھتی رہی۔ اس کے ہاتھ آئینے میں تیرتی صورت کو اچک لینے کے لیے بے تاب ہو گئے، اس کے ہاتھ آئینے کی طرف لپکے، آئینے کی سطح پر تھرتھرائے، اس کا دایاں ہاتھ آئینے کی سطح پر دائیں سے بائیں اتنی تیزی سے جھپٹا کہ اس کے سینے میں ہوک سی لپک گئی اور آئینے کی آنکھیں تاریک ہو گئیں اور اس نے دونوں ہاتھ اپنے سینے میں گاڑ دیئے۔ اس کے سینے کے اوندھے کنول لرز رہے تھے۔ کنولوں کا لرزنا جھیل کے بطن میں اٹھتی ہوئی طغیانی کا اعلان کر رہا تھا۔ مگر فردوس اس لمحے طغیانی نہیں چاہتی تھی وہ جھیل کی سطح ساکن چاہتی تھی تاکہ جھیل کی تھاہ کا نظارہ کر سکے۔ اس نے کنولوں کو ہاتھوں سے سہارا دیا اور جھیل کے بطن میں طغیانی سسکیاں لینے لگی۔

طغیانی سسکیاں لیتے لیتے سو گئی، کنول سو گئے۔ فردوس اٹھ کھڑی ہوئی، اس نے ایک ہی جھٹکے میں سرخ سویٹر اتار کر آئینے کی پیشانی پر ڈال دیا، اس نے اودی قمیص کے گردن کے، پہلوؤں کے بٹن کھول دیئے اور قمیص کو نچلے کناروں سے پکڑ کینچلی کی طرح اتار آئینے کے بدن پر ڈال دیا۔ مگر آئینے کی آنکھیں اس نقاب کی زد میں نہ آ سکیں اس نے

سفید جھالر دار شمیز بھی اتار دی اور آئینے کی بے نقاب آنکھیں نظارے کی توقع میں ہمہ تن انتظار بن گئیں۔ اس نے سانس روک کر سرخ ریشمی انگیا کے بند کھول دیئے اور ایک انگڑائی لیتے ہوئے انگیا کو دائیں ہاتھ کی شہادت کی انگلی اور انگوٹھے سے پکڑ کر سینے سے اتار آئینے کی آنکھوں پر ڈالنے کے لیے آئینے کی طرف ہاتھ بڑھانا چاہا تو آئینے کی آنکھوں میں اک عجیب حیرت دیکھ ہاتھ فضا میں رک گیا۔ آئینے کی آنکھیں ایک ستارہ شناس کی آنکھیں تھیں جس کے افق نظر پر اجنبی ستارے طلوع ہو گئے ہوں۔ اس نے اجنبی ستاروں کو اپنے ہاتھوں سے چھپا لیا۔ مگر ان کا نور اس کے ہاتھوں کی انگلیوں سے چھن چھن کر آئینے کی آنکھوں کو متحیر کرنے لگا۔ اجنبی ستارے اس کے سینے، اس کے شانوں کو گدگدانے لگے۔ اس نے ستاروں کو بے نقاب کر دیا اور شانوں کی طرف ہاتھ بڑھائے۔ اس نے دونوں ہاتھوں سے شانوں کی، دائیں سے بائیں کو اور بائیں سے دائیں کو، بغلوں کی، مغرور پستانوں کی سر بلند، زیریں گولائیوں کی مالش کی اور آہستہ آہستہ پہلوؤں کی، پیٹ کی، ناف کی مالش کرتے ہوئے پیڑو پر آ کر رک گئی، ستائی اور پھر اودی شلوار کے کمر بند کی گرہ کھول دی، شلوار اس کی پاؤں میں گر گئی، اس نے گری ہوئی شلوار سے پاؤں نکال لئے پھر چوکی سے اٹھ کھڑی ہوئی اس نے سفید ریشمی کروشیے سے کاڑھے ہوئے جانگیے کو کہ اس کے کولہوں، رانوں، سرین اور ناف کی سرخی سے گلابی سا ہو رہا تھا سرین اور پیڑو سے نیچے کھسکا دیا اور سنگار میز کی گدی دار چوکی پر بیٹھ گئی، پھر دونوں ہاتھوں سے کولہوں، سرین، رانوں اور پنڈلیوں کی مالش کرتی ہوئی اپنے پاؤں کی طرف جھک گئی۔ اس نے دونوں ہاتھوں کی انگلیوں کے پوروں سے پاؤں کے انگوٹھوں کے اگلے حصوں کو چھوا، زمین کو چھوا اور پھر اس نے ہتھیلیاں، گھٹنوں کو جھکائے بغیر، زمین پر ٹکا دیں، اس سے اس کے بدن میں خوشی کی لہر دوڑ گئی۔ اس کے جسم میں ابھی تک جوانی کی لچک باقی تھی، زندہ تھی۔

اس نے لمبا سانس لیا اور ایک دم تیر کی طرح سیدھی کھڑی ہو گئی اور آئینے کے چہرے سے اپنے اترے ہوئے کپڑوں کو اتار کر سنگھار میز کی کرسی پر ڈال دیا۔ آئینے کا تن بدن روشن ہو گیا اور اس کی سطح پر فردوس کا بے لباس بدن دمکنے لگا۔ اس نے غور سے اپنے آپ کو

دیکھا۔اس کے ماتھے،اس کے مغرور، سربلند پستانوں کی چوٹیوں پر،اس کے پیٹ پر پسینے کے ننھے ننھے قطرے جھلملا رہے تھے۔اس نے بدن پرآہستہ آہستہ ہاتھ پھیرا۔اس کی جلد اب بھی ریشم سی ملائم تھی، اس کی جلد میں ابھی بجلیاں بھری تھیں۔اس نے آنکھوں ہی آنکھوں میں اپنے عکس کوالوداع کہااور غسل خانے کے شور کی طرف چل دی۔

مرمریں ٹب میں پانی چھلکنے لگا تھا۔اس نے پانی کو انگلی سے چھوا۔پانی کی حدت اس کو قابل برداشت معلوم ہوئی۔اس نے احتیاطاً ٹھنڈے پانی کے نلکے کی ٹوٹنی کو کھول دیا۔ ٹب سے پانی چھلک کر بہنے لگا اور بہتا ہی چلا گیا۔اس نے پانی میں نہانے کے صابن کا سفوف ڈالا اوراسے پانی میں حل کرنے کے لیے پانی کو ہاتھوں سے تہ وبالا کیا۔پانی کے اوپر جھاگ تیرنے لگی۔اس نے دایاں پاؤں پانی میں ڈالا، پانی کی حدت اب اس کی منشا کے مطابق تھی۔وہ دائیں پاؤں کو مرمریں ٹب کے فرش پر جما کر، بائیں ٹانگ اٹھا کر ٹب میں کھڑی ہوگئی اور پھر آہستہ آہستہ سرین کو جھکاتے ہوئے،سرین سے پانی کو چھوتے ہوئے، پانی کی حدت کو قابلِ برداشت پاتے ہوئے،اس میں بیٹھ گئی۔پانی اس کی بغلوں کو چھو رہا تھا۔پانی کی گرمی اور دھواں اس کے بدن میں مدھ کی طرح رچنے لگا اوراس پرایک کیف آور سی غنودگی چھانے لگی،اس کی آنکھوں کے سامنے دھوئیں کا غیر شفاف پردہ آ گیا،اس کی آنکھوں کے پپوٹے بوجھل ہو گئے، اس کی آنکھیں بند ہوگئیں۔اس نے آنکھیں بند کئے نہانے کا اسپنج پکڑ لیا۔اس نے اسپنج کو پانی اور جھاگ میں بھگویا اورآہستہ آہستہ بدن پر پھیرا۔صابن کی جھاگ کی بھینی بھینی خوشبو سے اس کے نتھنوں میں عجیب سی گدگدی ہوئی اور اس کے ذہن سے غنودگی کا غبار اترنا شروع ہو گیا۔وہ آہستہ آہستہ اسپنج سے بدن کو سہلاتی رہی۔سہلانے سے اس کے تن بدن میں طاقت اور تازگی آتی چلی گئی۔اس کے تن بدن کی ساری طاقت اس کے مغرور سربلند پستانوں میں مچلنے لگی۔اس نے چاہا کہ ہاتھوں سے ان کو تھپکے مگر وہ ڈری کہ ہاتھوں کا لمس ان کی طاقت کو سلانے کی بجائے یلغار پر نہ اکسائے۔اس نے دونوں ہاتھ سرین کے نیچے دبا لئے،اور گھٹنوں کو سینے سے لگا کر اکڑوں ہو بیٹھی مگر طاقت کا لہرانا نہ تھم سکا۔مچلی ہوئی طاقت ایک عالم کے تاب نظارگی کو آزمانے پر تلی تھی۔اس کی

اتھاہ گہرائیوں میں یقین کا ایک ساگر جھوم رہا تھا کہ عالم میں کسی کو اس نظارے کی تاب نہ تھی، اگر تھی تو صرف متین صاحب میں۔ مگر وہ ان کی جرأت نظارگی کو آزماتے ہوئے ڈرتی تھی کہ اگر وہ اس نظارے کی تاب نہ لاسکے تو اس کی تمام توقعات کا خون ہو جائے گا جو اس نے مستقبل سے، متین صاحب سے (کہ اس کا مستقبل تھے) وابستہ کر رکھی تھیں، اور اگر یہ نظارہ ان کی شخصیت کو متاثر نہ کر سکا تو اس کی سندرتا کا مان ٹوٹ جائے گا، اس کا مستقبل سے توقعات وابستہ کرنے کا ادھیکار چھن جائے گا۔ وہ اپنی سندرتا کا مان برقرار رکھنا چاہتی تھی، مستقبل سے، متین صاحب سے، توقعات وابستہ رکھنے کا ادھیکار کھونا نہ چاہتی تھی۔ پھر بھی وہ اس نظارے کے صحیح ناظر کی طلبگار ضرور تھی۔ صحیح اس لیے کہ اس نظارے کا ایک ناظر ضرور تھا......

سیگفر یڈ اس نظارے کا واحد ناظر تھا مگر وہ تو بالکل ہی بچہ سا لگتا تھا اگرچہ اس کا سن سولہ سترہ کے لگ بھگ تھا۔ اس کی آنکھوں میں، اس کی چال میں، اس کے سارے بدن کی ایک ایک حرکت میں بھولپن تھا۔ اس کی شخصیت میں جوانی کا تجسس نہ تھا، اس کی جوانی خراج کی طلبگار نہ تھی، نسوانی جوانی کی آرزومند نہ تھی۔ وہ ہردم اپنے ہی خیالوں میں مست رہتا تھا۔ اس کا سکول، استادوں کے جنگ کی نذر ہو جانے کے باعث بند ہو چکا تھا۔ لہٰذا وہ ان دنوں سارا سارا دن قریب کے بن میں گھومتا رہتا۔ اس کے گمان میں بھی نہ تھا کہ اس کی قوم کے قائد کو اس کی خدمات کی ضرورت ہو سکتی تھی۔ وہ بےفکر موسموں، صبح وشام کے رنگوں کے سفر کا نظارہ کرتا، بن سے پھول اور پھل اکٹھے کر کے لاتا، جب گھر میں جلانے کی لکڑی ختم ہونے لگتی تو بن سے لکڑیاں چن لاتا۔

فردوس جنگ کے ہنگاموں سے تنگ آ کر اس ننھے سے بوتیری گاؤں میں چلی آئی تھی، کیونکہ اسے یہی گاؤں امان کی جا نظر آیا تھا۔ وہ چند برس پہلے جرمنی کی سیر کے سلسلے میں ایک دفعہ اس گاؤں سے گزری تھی اور سیگفر یڈ کی بہن اس کو رات بسر کرنے کے لیے اپنے گھر لے گئی تھی۔ اس کی بہن اینا کتنی حسین تھی مگر اس کے سینے میں حسن کا غرور نہ تھا۔ اس کو نہ صرف جانوروں بلکہ درختوں سے بھی ہمدردی تھی۔ کسی جانے پہچانے درخت کا کٹ جانا

کسی عزیز کی موت کے برابر تھا اس کے لیے۔ اس کا دل کٹ جاتا تھا۔ جنگ کے سفاک ہاتھوں نے اس کو بھی اپنوں سے جدا کر دیا تھا۔ وہ نرس بن کر بیماروں کی خدمت کے لیے جنگ میں شریک ہوئے بغیر نہ رہ سکی۔ چند مہینوں سے وہ لاپتا تھی، نہ جانے وہ کس مصیبت میں پھنسی تھی۔

ایک دن اس کے ملک کے قائد نے سیگفر یڈ اور اس جیسے ہزاروں بھولے نوجوان بچوں کو جنگ کی گاڑی میں جوتنے کے لیے طلب کر لیا۔ حکم نامے کے پہنچنے پر وہ حیران و ششدر رہ گیا تھا۔ اس کی آنکھوں میں بھولپن کی جگہ حیرانی اور خوف نے لے لی۔ وہ اس دن صبح سے ہی بن کی طرف نکل گیا تھا۔ وہ دوپہر تک نہ لوٹا تھا۔ اس کی ماں دوپہر کی دعا کے لیے جلدی، اپنے دکھ کے زیر اثر گرجے چلی گئی تھی۔ اس کا دل اکیلے میں گھبرانے لگا۔ وہ گرجے نہ جا سکتی تھی۔ وہ ایک بار گئی تھی مگر اس نے اپنے آپ کو گرجے کی فضا میں اتنا اجنبی پایا کہ اس کے بعد اس میں گرجے جانے کی ہمت ہی پیدا نہ ہوئی۔ مطالعے میں بھی اس کا جی نہ لگا۔ اس کو ہر لحظہ یہی خیال کھائے چلا جاتا تھا کہ اگر سیگفر یڈ کو کچھ ہو گیا تو اس کی بوڑھی ماں تو مر ہی جائے گی۔ سیگفر یڈ کا اس جنگ سے واپس لوٹ آنا اس کو ناممکن نظر آتا تھا۔ اس کے سب جاننے والوں کو جنگ کا عفریت نگل گیا تھا۔ وہ جس شہر میں پناہ ڈھونڈتی تو وہاں سے اس کے جاننے والوں کو جنگ کا بلاوا آ جاتا اور وہ ایک بار پھر یکا و تنہا رہ جاتی۔ اب سیگفر یڈ کی ماں کے سوا جرمنی میں اس کا جاننے والا کوئی نہ تھا، کوئی تو مارا گیا تھا، کوئی جنگی قیدی تھا، تو کوئی لاپتا تھا۔ اینا اس کی آخری ہمدرد تھی اگرچہ وہ اس کی ہمراز نہ تھی۔ جب وہ اپنوں سے، اس سے رخصت ہوئی تو فردوس کو اپنے بھائی، اپنی ماں کی حفاظت اور نگہداشت سپرد کر گئی۔ ایک سال اور چند ماہ سے وہ ان کے یہاں مقیم تھی۔ وہ دن بھر گاؤں کے ڈاک خانے میں پوسٹ ماسٹر کا کام کرتی، سہ پہر کو گھر آ کر سیگفر یڈ کی ماں کا ہاتھ بٹاتی یا جنگی قیدیوں کے لیے اونی دستانے، مفلر یا سویٹر بنتی رہتی جو وہ صلیب احمر کے دفتر میں پہنچا آتی۔ اس کو اون بھی اس دفتر سے کبھی کبھی مل جایا کرتی تھی۔

اس دن جب اس کا دل کسی کام میں نہ لگ سکا تو اس نے سوچا کہ وہ نہا ہی لے۔ اس

کو نہائے ہوئے ہفتوں ہی گذر گئے تھے۔اس نے سیگفر یڈ کی لائی ہوئی لکڑیوں پر نہانے کے لیے پانی گرم کیا اور اپنے خیالوں اور دل کی دھڑکنوں میں محو غسل خانے کا دروازہ مقفل کئے بغیر ہی نہانے لگی۔نہاتے،نہاتے،بدن پر پانی گرانے اور اس کے گر کر بہے جانے کے ایک درمیانی وقفے میں اس کو گمان گزرا کہ قدموں کی چاپ اس کے قریب آ کر رک گئی ہے۔اس نے ایک دم نظر اٹھا کر دیکھا تو سیگفر یڈ غسل خانے کے دروازے پر کھڑا اس کو اجنبی آنکھوں سے دیکھ رہا تھا۔اس کی آنکھوں میں بھولپن بالکل نہ تھا،اس کی آنکھوں میں خوف تھا،غصہ تھا،جھنجھلاہٹ تھی،تشدد کی آرزو تھی۔جب سیگفر یڈ کی نظریں اس کی نظروں سے ملیں تو سیگفر یڈ کی نظریں آپ ہی آپ جھک گئیں۔اس سے سیگفر یڈ کے چہرے پر غصے کی ایک شدید لہر دوڑ گئی اور اس نے ایک جھٹکے سے سر کو بلند کیا اور نظریں گاڑے اس کو غور سے دیکھنے لگا۔فردوس نے محسوس کیا کہ سیگفر یڈ کی آنکھوں میں کمزوری کے واضح نشانات ہیں۔اس کو خیال آیا کہ اگر وہ مسکرائی تو وہ اس کی تاب نہ لا سکے گا۔وہ مسکرادی اور اس نے ہنستے ہوئے سیگفر یڈ کو بیٹھنے کے کمرے میں اس کا انتظار کرنے کو کہا۔وہ گھبرا گیا اور اس کے قدم غسل خانے کے دروازے سے بیٹھنے کے کمرے کی طرف اٹھتے ہی چلے گئے۔اس نے اٹھ کر جلدی سے دروازہ نہایت آہستگی سے بند کرلیا۔اس نے جلدی جلدی پہلے کپڑے پہنے اور غسل خانے سے نکل کر اپنے سونے کے کمرے میں چلی گئی۔وہ آج تک تجزیہ کرنے میں کامیاب نہ ہوسکی تھی کہ اپنے سونے کے کمرے میں پہنچ کر وہ گنگنانے کیوں لگ گئی۔کیا وہ ڈر رہی تھی؟ کیا وہ سیگفر یڈ کے دل میں شرافت کے جذبات ابھارنا چاہتی تھی؟ کیا وہ اپنے لحن سے سیگفر یڈ کے شہوانی جذبات کو مسحور کر کے سلا دینا چاہتی تھی؟ یا شاید اس کو لبھانا چاہتی تھی تا کہ اس کی شہوانیت سے حیوانیت اور تشدد کی آرزو خارج ہو جائے؟ کیا وہ حقیقت میں سیگفر یڈ کی جوانی کے لمس کو اپنے جسم پر محسوس کرنا چاہتی تھی؟

سنگھار کی دیہاتی سی میز کے سامنے بیٹھے کپڑے بدلتے ہوئے اس نے محسوس کیا کہ اس کے نقوش کے رشتوں میں ایک عجیب تغیر آ گیا ہے۔اس کا حیران حسن یکلخت پر اعتماد اور مغرور حسن بن گیا ہے جو اطاعت کا نہ صرف طلب گار ہے بلکہ اطاعت کو نافذ کرنے پر

کمر بستہ ہے۔

جب وہ کپڑے بدل بیٹھنے کے کمرے کی طرف بڑھی تو اس نے محسوس کیا کہ اس کے قدموں کی چاپ میں بے پناہ تمکنت تھی، دبدبہ تھا۔ جب وہ کمرے میں داخل ہوئی تو سیگفریڈ ٹہلتے ٹہلتے ٹھٹک گیا۔ اس کے چہرے پر حیرانی چھائی تھی۔ اس نے پوری کوشش سے اپنی حیرانی کو اپنے چہرے اور بدن سے الگ کیا۔ حیرانی دور ہوئی تو اس کے چہرے پر وحشت سی چھانے لگی، اس میں خشونت کی بھی ملاوٹ تھی۔ وہ ایک کرسی پر بیٹھ گئی اور بیٹھتے ہی اشارے سے اس کو بھی بیٹھنے کے لیے کہا۔ اس کے جسم نے اس کی مرضی کے خلاف اس کے اشارے کی اطاعت کی۔ اس پر وہ بہت جھنجھلایا۔ اس نے اس جھنجھلاہٹ میں اپنے ہاتھ کرسی کے بازوؤں پر جمالئے جیسے وہ ایک چیتے کی طرح شکار پر جھپٹا ہی چاہتا تھا۔ فردوس اس پر نظر گاڑے اس کو دیکھتی چلی گئی۔ اس نے محسوس کیا کہ اس کے چہرے پر، اس کی آنکھوں میں ایک بہت بڑا الاؤ روشن تھا، اگر اس نے جھپٹنے کی کوشش کی تو اس کے الاؤ کی حدت کی شدت کی تاب نہ لا کر پسپا ہو جائے گا۔

وہ ایک دوسرے کے سامنے ڈٹے رہے، نہ اس میں جھپٹنے کی جرأت تھی اور نہ اس میں اپنی کرسی کی پناہ کو چھوڑنے کی، دونوں ایک دوسرے میں کمزوری کا مقام تلاش کرتے رہے۔ سیگفریڈ آخر بچہ ہی تو تھا، زیادہ دیر ڈٹ نہ سکا اور کچھ فردوس کے حسن میں اتنا دبدبہ تھا کہ اس کو پسپا ہوتے ہی بنی۔ مگر پسپائی سے پہلے وہ ایک بار جھپٹا ضرور۔ وہ ایک دم اپنی کرسی سے بجلی کی طرح اٹھا اور فردوس کی کرسی پر ٹوٹ پڑا۔ اس نے فردوس کو شانوں سے پکڑ کر کرسی سے اٹھالیا۔ فردوس باوجود تیار ہونے کے لحظہ بھر کے لیے حیران سی ہو گئی مگر حملے نے اس کی تمام قوتوں کو بیدار کر دیا۔ لیکن وہ طاقت کا جواب جسمانی طاقت سے نہ دینا چاہتی تھی کیونکہ اس میں اس کے حسن کی توہین کا امکان ضرور تھا۔ وہ اس کے لباس کو پھاڑ ضرور ہی سکتا تھا اور پھر جسمانی قوت کا استعمال سیگفریڈ کو جان کی بازی لگا دینے پر اکسا سکتا تھا جو اس میں اتنی قوت پیدا کر دیتا کہ وہ فردوس کو ایسا چرکا لگا دیتا کہ عمر بھر اس کا داغ اس کے جسم اور روح پر رہتا۔ اس کے لیے وہ کسی بھی صورت تیار نہ ہوتی، ہاں اگر اس کی عصمت، بالکل ہی

خطرے میں آ جاتی جس کا سیگفر یڈ سے اس کو احتمال نہ تھا۔

فردوس نے نظریں اس کی نظروں میں ڈالتے ہوئے اور شاید آنکھوں کے کونوں سے مسکراتے ہوئے اس سے کہا:

''سیگ فری ایڈ! اگر تم نے اس لمحے اپنے آپ کو وقتی جذبے کے سپرد کر دیا تو تمہارا ذہنی اور جذباتی اور جسمانی توازن بگڑ جائے گا اور...... اس توازن...... کے بغیر تم جنگ کی آگ سے اپنے آپ کو بچا کر نہیں لا سکو گے۔ جنگ سے لوٹ کر آنا تمہارے لیے اشد ضروری ہے۔ تمہاری ماں کا، تمہاری گمشدہ بہن کا، اب تمہارے سوا کون ہے؟ تمہاری غیر حاضری میں تمہاری ماں کا سہارا بنوں گی، تمہارے لیے اس کو مایوس ہونے سے محفوظ رکھوں گی۔ اگر تم نے مجھے دکھ پہنچایا تو میں یہاں کس منہ سے رہ سکوں گی؟

میں تمہاری طاقت سے ڈرتی نہیں...... میں صحت مند ہوں، جوان ہوں، میری طاقت تمہاری طاقت کی طرح کچی نہیں۔ لیکن میں تمہیں طاقت سے زیر کرنا پسند نہیں کروں گی کیونکہ میں تمہاری جوانی اور مردمی کی توہین نہیں کرنا چاہتی......''

اس کے شانوں پر اس کے ہاتھوں کی گرفت اگرچہ مضبوط تھی مگر تھی کچی اور اناڑی پن کی۔ اس کی گرفت میں پکا پن کہاں سے آتا۔ شاید اس نے زندگی میں پہلی بار کسی کو یوں شانوں سے پکڑا ہو، اور پھر عورت سے تو یقیناً اس کا پہلا مقابلہ تھا۔ فردوس ایک دم بیٹھ گئی اور پھر ایک دم کود کر اس کی گرفت سے دور چلی گئی۔

وہ حیران سا رہ گیا۔ اس کی آنکھوں میں پانی سا ابھر آیا۔ اس کے چہرے کے نقوش سے بھولپن سے پیدا ہونے والی وحدت گم ہو چکی تھی اور یہ گم گشتگی اس کے متضاد اور متناقض جذبات کی چغلی کھا رہی تھی۔ اسکی اس حالت پر فردوس کے دل کو ٹھیس لگی، اس کا دل رحم سے بھر گیا۔ شاید اس کی آنکھوں سے بھی ترحم پھوٹنے لگا تھا کہ سیگفر یڈ نے بھرائی ہوئی آواز میں، جس میں جھنجھلاہٹ کے ساتھ ساتھ عجز و التجا بھی تھی، اس سے کہا:

''کل صبح مجھے گاؤں کے نوجوانوں کے ساتھ فوجی کیمپ میں حاضری کے لیے روانہ ہونا ہے۔ کون جانے زندہ بچ کر لوٹ سکوں کہ نہیں۔ میں عورت کے حظ سے اب تک محروم

ہوں۔ میں نے کبھی کسی لڑکی کے ہاتھ کو بھی تو نہیں چوما۔ میں سوچتا تھا کہ دل نے جس کو پسند کیا تو اس کی آرزو کرنا ہی اصل زندگی ہے۔ دل نے آج تک کسی کو پسند ہی نہیں کیا بلکہ کسی کو پسند کرنے کا خیال ہی دل میں نہیں آیا۔ میں صبح وشام کے رنگوں کا تعاقب کرنے میں، بن کے پرندوں کی چہچہاہٹ سننے، ندی کے شفاف پانی میں ٹانگیں ڈال کر اس کے پانی کے لمس کو محسوس کرنے اور بن میں گرے ہوئے پتوں پر سر رکھے گھنٹوں خواب دیکھنے میں اتنا مصروف رہا کہ کسی لڑکی کو دونوں آنکھوں سے جی بھر کے دیکھنے کا خیال ہی نہیں آیا۔

آج میں نے تمہیں دونوں آنکھوں سے دیکھا ہے مگر تم میرے ساتھ تعاون کرنے کے لیے تیار ہی نہیں۔ میں کچھ بری شکل کا بھی نہیں۔ میں جوان ہوں، تمہارے حسن کو جوانی کا خراج میں دے سکتا ہوں۔ آج تمہاری آغوش کا طالب ہوں، کل نہ جانے موت کی آغوش نصیب ہو۔

میں جانتا ہوں کہ تمہیں کسی مرد سے محبت نہیں، تم نے کسی مرد سے محبت نہیں کی، کوئی کہیں تمہارا منتظر نہیں۔ تو پھر ہمارے تمہارے ملاپ میں ہرج ہی کیا ہے؟ کسی کو کانوں کان خبر ہی نہیں ہوسکتی۔ اماں کے لوٹنے میں ابھی کافی دیر ہے، آج دعا بہت لمبی ہو جائے گی۔ میرا لوٹ کر آنا محال ہے بلکہ ناممکن۔ لاکھوں ہی جرمن اس جنگ میں مارے جا چکے ہیں جب تجربہ کار سپاہی نہیں بچ سکے تو میرے جیسے ناتجربہ کار کے لیے بچ آنا خیال است و جنوں......

مجھ سے اگر تم تعاون نہیں کرو گی تو مجھے تشدد پر اترنا ہی پڑے گا۔ میں عورت سے حظ اٹھائے بغیر مرنا نہیں چاہتا۔ سب لوگ بلکہ سب عورتیں، اس وقت گرجے میں ہیں اور نوجوان اپنی محبوباؤں کے ساتھ آخری بار بن کی سیر کرتے ہوں گے۔ تمہیں آخر کون بچانے آئے گا؟ تمہارا عدم تعاون میرے مزے کو کم کرسکتا ہے مگر مجھے میرے مزے سے محروم نہیں کرسکتا۔ آؤ، میرے پاس آؤ۔ یہ خاموش تنہائی ہمارے تمہارے راز کو محفوظ رکھے گی۔ میں پیار میں نرمی برتوں گا......

مجھے احساس ہے کہ تم جیسی ذہین اور مدبر اور ثقہ عورت کے لیے پیار کے مراحل کے

بغیر جنسی تعاون گھٹیا اور پوچ ہے مگر میں نے کبھی تمہیں اس نظر سے دیکھا ہی نہیں۔ دیکھتا تو ضرور ان مراحل کو تمہاری مرضی کے مطابق طے کرتا۔ تمہارا حسن اور جوانی میں نہ جانتا تھا کہ اتنا للچائیں گے۔ اس للچانے میں خود تمہارا بھی ہاتھ ہے۔ اگر تم نے غسل خانے کا دروازہ بند رکھا ہوتا تو شاید میرا دل یوں نہ للچاتا، شاید للچاتا ہی نہ، تم نے شاید اسی مقصد کے لیے دروازہ کھلا رکھا تھا۔

جب میں نے تمہیں بے ستر دیکھ ہی لیا ہے بلکہ جب تم نے مجھے اپنے آپ کو بے ستر دکھا ہی دیا ہے، میرے جسم میں آگ لگا دی ہے تو اس کو ٹھنڈا بھی تم ہی کرو۔ جب نظر کے لمس پر تمہیں اعتراض نہ تھا تو دست و دہن کے لمس پر اعتراض کیوں؟ جنسی وصل پر اگر تم راضی نہیں تو دست و دہن کے وصل میں کیا ہرج ہے؟ شاید میرے دست و دہن پیار کے وہ سب مراحل طے کرا دیں جو تم جیسی عورت کو جنسی وصل پر راضی کرنے کے لیے ضروری ہیں۔ کیا تمہیں یہ بھی قبول نہیں؟ نہیں؟ تو پھر اپنی حفاظت کرو۔ میں آیا۔''

سیگفریڈ اس کی طرف لپکا۔ فردوس نے پورے زور سے دائیں ٹانگ چلائی اس کا پیر اس کے پیٹ میں اس زور سے لگا کہ اس کے حواس باختہ ہو گئے اور وہ چکرا کر فرش پر اوندھا گر پڑا۔

فرش پر اس کا بے سکت، بے حس پڑا جسم اس سے رحم کا طالب تھا۔ اس نے جھک کر اس کو سیدھا کیا۔ اس کے چہرے سے خشونت اور وحشت اور حیوانیت کے سب نشانات مٹ چکے تھے۔ اس کے چہرے پر بھولپن لوٹ آیا تھا اس کا نازک سا، سڈول مگر کچا کچا سا جسم، اس کی لمبی صراحی دار گردن، اس کی بند بڑی بڑی آنکھیں، لمبی لمبی بل کھاتی سی پلکیں، اس کی شمشیر سی بھوئیں، اس کے پنکھڑیوں ایسے ہونٹ، اس کا دل پسیج گیا۔ وہ اس کے پاس بیٹھ گئی۔ اس نے اس کی نبض دیکھی۔ چل رہی تھی۔ اس نے اس کی پتلون سے اس کی قمیص نکالی، اس کے پیٹ اور اس کے سینے کی آہستہ آہستہ مالش شروع کر دی۔ اس کے پیٹ پر گوشت تنا ہوا تھا۔ اس کے سینے پر گوشت بہت ہی ملائم تھا۔ وہ تو بچہ نہ ہوتے ہوئے بھی بچہ ہی سا تھا۔ اس کے سینے پر بہت کم بال تھے۔ اس نے اس کے چہرے کو سہلایا۔ اس کا ابھی

خط بھی نہ آیا تھا۔ مسیں بھی نہ بھیگی تھیں۔ اس کا فراخ ماتھا کتنا معصوم تھا اور اس کے سنہرے بال کتنے ریشمی سے تھے۔ کاش وہ اس کی ہم عمر ہوتی اور وہ اس سے پیار کرسکتی۔ مگر وہ اس کی نہ ہوسکتی تھی، وہ کسی کی متلاشی تھی، اس کی روح اپنے ساتھی کی آرزو کو، اس کی آنکھوں کی روشنی کو، اس کے قدموں کی چاپ کو پہچانتی تھی۔

اس بچے سے نوجوان میں جو اس کا ساتھی نہ تھا۔ وہ اس پر رحم کھا سکتی تھی، وہ اس کے سر کو تھپک سکتی تھی، اس کے بالوں میں کنگھی کر سکتی تھی۔ مگر اپنے جسم پر اس کے لمس کا تصور بھی نہ کرنا چاہتی تھی۔

اس نے اس بچے سے نوجوان کے جسم کو بازوؤں میں اٹھالیا اور اس کو اس کے کمرے میں لے گئی اور اس کو پلنگ پر لٹا دیا اور خود اس کے پاس بیٹھ کر اس کے پیٹ کی مالش کرنے لگی۔ اس کے پیٹ پر چوٹ کا سرخ سا دھبا تھا۔ اسے اپنے آپ پر غصہ سا آ گیا کہ اتنے نازک سے بدن کے لیے اس طاقت کی ضرب۔ وہ اپنے آپ کو سزا دینا چاہتی تھی۔ اس نے اس کے ماتھے کو چوما، اس کی بند آنکھوں کو چوما، اس کے پیٹ پر ضرب کے سرخ نشان کو چوما، اس کو زبان کی نوک سے سہلایا، لعاب دہن کو بطور مرہم اس سرخ نشان پر لگایا۔

مگر اس کو کسی طور ہوش نہ آ رہا تھا، رخساروں کا تھپکنا، بدن کی مالش، چہرے پر پانی کے چھینٹے، سب بے کار ثابت ہو رہے تھے۔ وہ پریشان ہو چلی تھی کہ اس کو یاد آیا کہ اس کے کپڑوں والے صندوق کے ایک کونے میں عطر کی شیشی تھی جو دو اڑھائی سال پہلے اس کی ایک یہودن دوست، روتھ ہانمان، نے کنسنیٹریشن کیمپ جانے سے چند روز پہلے بطور تحفہ اور یادگار دی تھی اور اس نے اس کو اپنے ذہن سے بڑی کوشش کے بعد اتار دیا تھا۔ وہ بھاگ کر اپنے سونے کے کمرے میں گئی اور تلاش کر کے عطر کی شیشی لے آئی۔ اس نے اس کا کارک ہٹا کر اس کو سونگھا تو یادوں کا ایک سمندر اس کے اندر لہرانے لگا، اس نے جلدی سے شیشی کو ناک سے ہٹا لیا اور اس کے منہ کو انگوٹھے کے دباؤ سے بند کر دیا واپس اس کے کمرے میں آ کر اس نے شیشی کا منہ سیگفریڈ کے نتھنوں کے نیچے لگا دیا۔ جو کام اس کے لب اور لعاب دہن سے نہ ہو سکا وہ خوشبو نے کر دیا۔ سیگفریڈ کے چہرے کے نقوش میں ایک تشنج

سا پیدا ہوا، جیسے اس کا دم گھٹ رہا ہو۔ اس نے شیشی کا منہ اس کے نتھنوں سے نہ ہٹایا۔ کچھ دیر بعد اس نے کروٹ لی اور وہ درد میں کراہا۔ اس نے اپنے آپ کو گنہگار محسوس کیا اور وہ اس گناہ کا کفارہ دینے کے لیے اپنے آپ کو تیار کرنے لگی۔ وہ آنکھیں کھولے بغیر کراہتا چلا گیا۔ اس کا دل اس کراہنے سے کٹ کٹ گیا۔ اس نے سوچا کہ گھر میں کہیں نہ کہیں چوٹ ووٹ کے لیے مرہم قسم کی کوئی چیز ضرور ہی ہوگی۔ اس نے خوشبو کی شیشی کو بند کرلیا اور اٹھ کر سیگفر یڈ کی ماں کے سونے کے کمرے کی تلاشی لی۔ ایک الماری میں برانڈی کی آدھی بوتل مل گئی وہ اس کو لئے واپس سیگفر یڈ کے پلنگ کی طرف بڑھ آئی۔ اس نے برانڈی روئی میں بھگو کر اس کے پیٹ کے سرخ دھبے پر لگائی اور آہستہ آہستہ اس کے پیٹ کی مالش کرتی رہی اور اس کے ذہن میں اس کے جرمن دوستوں کی شکلیں ابھرنے لگیں کتنے اچھے، ذہین، طباع لوگ تھے۔ کچھ کا جرم یہ تھا کہ یہودی تھے، کچھ یہ کہ وہ جرمن قائد کے طرز حکومت کے مخالف تھے، کچھ جنگ میں کام آ گئے، کچھ بندی خانوں میں، کنسینٹریشن کیمپوں میں سڑ رہے تھے، ایک آدھ اتحادیوں کا قیدی تھا اور کارل جو اتنا اچھا وائلن بجاتا تھا، روپوش تھا۔ اس کے گمان میں بھی نہ تھا کہ اتنا دھیما، متین اور نرم دل شخص اشتراکی پارٹی کا سرگرم رکن ہوسکتا ہے۔ اور پھر آہستہ آہستہ اس کے ذہن میں ان جلوسوں میں نظر آنے والی صورتیں ابھر آئیں جن کے چہروں پر اپنے قائد کی تقریر سن کر یا اس کو سلامی لیتے دیکھ کر ایک عجیب وجدی کیفیت طاری ہوجاتی تھی۔ اسی وجدانی کیفیت لیے ہوئے چہروں پر ہویدا جذبات کے سہارے تو ان کا قائد سارے عالم سے جنگ مول لینے پر تل گیا تھا۔

وہ خیالات میں غلطاں، سیگفر یڈ کے پیٹ اور سینے کی مالش کرتی، سہلاتی، نہ جانے کب تک چلی جاتی اگر اس کو اپنے ہاتھ پر ہاتھوں کا بوجھ محسوس نہ ہوتا۔ وہ اپنے سفر سے لوٹ آئی اور اس نے کھوئی کھوئی آنکھوں سے سیگفر یڈ کے سینے کی طرف نگاہ کی۔ اس کے ہاتھ پر اس کے دونوں ہاتھ جمے ہوئے تھے اور وہ اس کو عجب حیرت اور بھولپن سے دیکھ رہا تھا۔ اس نے اس کی آنکھوں میں جھانکا تو اس کی آنکھیں حظ میں بند ہوگئیں۔ اس کا رنگ پیلا پڑنے لگا۔ وہ گھبرا گئی۔ اس نے جھک کر اس کے سینے پر کان لگایا۔ اس کا دل دھک

دھک کرر ہا تھا۔اس نے محسوس کیا کہ جیسے اس سے شکایت کرر ہا ہو،فریاد کرر ہا ہو۔ مارے ندامت کے اس کا چہرہ گرم ہو گیا۔شاید اس کے چہرے کی گرمی سے اس کا فریاد کرتا ہوا دل آہستہ خرام ہو گیا، جیسے اس کو قرار آ گیا ہو۔اس کا دل پسیج گیا اور اس کی آنکھوں سے آنسو بہنے لگے اور سیگفر یڈ کے سینے کے قلیل بھورے بال اس کے آنسوؤں سے تر ہو گئے۔ سیگفر یڈ نے اپنے دونوں ہاتھ اس کے سر پر رکھ دیئے اور ہاتھوں سے اس کے سر کو تھپکنے لگا۔ وہ روتی رہی اور وہ اس کے سر کو تھپکتا رہا۔ جب اس کا جی ہلکا ہوا تو اس نے اس کے سینے سے سر اٹھایا تو اس نے دیکھا کہ وہ اس کو بڑے پیار اور ہمدردانہ نظروں سے دیکھ رہا ہے۔اس کے سر اٹھانے سے اس کے بال، جو اس کے تھپکنے سے کھل گئے تھے، اس کے چہرے کو سہلانے لگے۔ان کے سہلانے نے اس کے ہونٹوں پر ایک معصومانہ سی مسکراہٹ پیدا کی جس میں فردوس نے فتح کے احساس کو بھی محسوس کیا۔اس نے ہاتھوں سے اپنے بالوں کو اس کے چہرے سے ہٹا لیا اور وہ پلنگ پر سیدھی ہو کر بیٹھ گئی۔ وہ اس سے کچھ کہنا چاہتی تھی مگر فیصلہ نہ کر پا رہی تھی کہ معذرت کرے یا اس کا حال پوچھے۔آخر اس کے کانوں نے سنا کہ وہ اس کا حال پوچھ رہی ہے۔ وہ کچھ دیر تو کچھ نہ بولا مگر مسکراتا رہا۔ پھر اس نے کہنیوں کے بل اٹھنے کی کوشش کی مگر کمزوری کی باعث اٹھ نہ سکا۔فردوس نے جلدی سے اس کی کمر میں دونوں ہاتھ دے کر اس کو اٹھا کر پلنگ کے کٹہرے کے سہارے تکیہ لگا کر بٹھا دیا۔ اس کو اٹھاتے ہوئے اس کا سینہ اس کے سینے سے چند لمحے کے لیے پیوست ہو گیا۔ جب وہ کٹہرے سے لگ کر بیٹھ گیا تو اس کے ہونٹوں پر ایک پھیکی ہلکی سی مسکراہٹ پھیلتی ہی چلی گئی مگر وہ ساتھ ساتھ اپنے آپ پر قابو پانے کے لیے کوشش کرتا رہا۔

فردوس کو خیال آیا کہ اس کو برانڈی پلانا چاہیے۔ وہ باورچی خانے سے جا کر گلاس لے آئی اور اس میں برانڈی انڈیل گلاس اس کے منہ کے ساتھ لگا دیا۔ وہ نظریں اس پر جمائے غٹ غٹ پی گیا۔اس سے اس کے چہرے کی رنگت لوٹ آئی اور فردوس نے محسوس کیا کہ اس کے تن بدن میں بھی طاقت لوٹ آنے لگی ہے۔

کچھ دیر میں اس کی جان سی پھر گئی اور اس نے اس کو پکارا۔ جب وہ اس کی طرف متوجہ

ہوئی تو اس نے کہا:

''مجھے معاف کر دو۔ میں سوچ رہا تھا کہ اگر میں وہ نامناسب حرکت نہ کرتا تو شاید یہ رشتہ جواب مجھ میں اور تم میں ہے نہ پیدا ہوتا۔ میں اپنے آپ کو تمہارے اتنے قریب پاتا ہوں کہ شاید تم کو بھی اس پر حیرانی ہی ہو رہی ہو۔ یہ قرب، اس قرب کی یاد، میدان جنگ میں میری حفاظت کے امین ہوں گے۔ میں اس قرب کے لیے تمہارا ممنون ہوں اگرچہ (مسکراتے ہوئے) اس کی قیمت میں سخت درد مول لینا پڑا ہے۔ میرے نتھنوں میں، میرے ذہن میں تمہاری سنگھائی ہوئی خوشبو بسی ہے اور اس کے ساتھ ساتھ تمہارے جسم کی خوشبو تو میرے خون میں بھی رچ گئی ہے۔ میں محسوس کرتا ہوں کہ تمہارا طرز عمل حق پر تھا مگر میں اپنے عمل کے لیے بھی مقدر کا ممنون ہوں کہ اس کے صدقے میرے سینے کو تمہارے آنسو، تمہارے سینے کا لمس میرے نتھنوں کو تمہارے بدن کی خوشبو، میرے چہرے کو تمہاری زلفوں کا لمس نصیب ہوا۔ تمہارے رخساروں کی گرمی تو میرے تن بدن، میرے خون کا جزو بن گئی ہے۔ اس کے لیے میں تمہارا بھی ممنون ہوں۔ اس کے لئے میں اس منحوس جنگ کا، اپنے پاگل قائد کا بھی ممنون ہوں۔

اب صرف ایک آرزو ہے...... اگر تم کرم کرو تو پوری ہو سکتی ہے...... میرے ساتھ، مجھے سہارا دیتے ہوئے، بن کی سیر کو چلی چلو...... اب میں بالکل مختلف انسان ہوں...... کیا مجھے یہ عزت بخشو گی؟'' وہ صرف سر کے اشارے سے ہی اس کی بات کو قبول کر سکی۔

سورج کی ایک کرن جنوب مغربی روشن دان سے کمرے میں داخل ہوئی اور سیدھی سیگفر یڈ کے پیٹ کے سرخ نشان کو سہلانے لگی۔ اس اکیلی کرن نے فردوس کے بدن میں ہیجان سا پیدا کر دیا جیسے کرن بھی کہہ رہی ہو کہ ''یوں مارتے ہیں نازک بدنوں کو؟ کتنی بدذوق ہو تم! تیری آنکھوں کو کیا ہوا تھا؟ تیری شمشیر ابرو کو کیا ہوا کہ تیری حفاظت نہ کر سکی؟ کیا تمہاری مسکراہٹ بھی اس نازک اندام کو پابہ زنجیر نہ کر سکی؟ حیف! صد حیف!

وہ سوچنے لگی کہ آخر سیگفر یڈ اور اس کی عمر میں اتنا بعد بھی کیا تھا کہ اس کو اتنی اہمیت دی جاتی۔ کیا وہ واقعی ابھی تک پابند رسوم تھی کہ معصوم آرزو کو بھی گناہ تصور کرتی تھی؟ نہیں تو۔

گناہ سے ڈرتی نہ تھی۔ گناہ اس کے لیے ایک بھکاری تھا جو سردی کی رات میں گرمی کی تلاش میں اجنبی دروازوں پر دستک دیتا ہو۔ اس نے ہمیشہ یہی سوچا تھا کہ اگر گناہ نے اس کا دروازہ کھٹکھٹایا تو وہ دروازہ کھول دے گی اور اسے آتشدان کے سامنے لا بٹھائے گی اور بیچارہ گرمی کے نشے میں وہیں پڑ کر سو رہے گا۔ مگر آج بھکاری نے دستک دی تو وہ گھبرا کیوں گئی تھی؟ بھکاری بھی نازک بدن، بھولا اور نوجوان بچہ سا۔ اگر وہ اس کو گود میں لے کر تھپک دیتی تو وہ سو جاتا۔

ایک لحاظ سے بھکاری بھکاری بھی نہ تھا، وہ ایک خوفزدہ بچہ تھا جو طبل جنگ کی آواز سے دہل گیا تھا اور پناہ کا متلاشی تھا، تسلی کا آرزومند تھا۔ اگر وہ اس کی کمر میں بانہیں ڈال کر اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر اس کو دیکھتی تو وہ موم ہو جاتا؟ اس کی بانہوں سے نین کے نیر کی طرح بہہ جاتا۔

کیا وہ واقعی اس سے ڈر گئی تھی، نہیں! شاید وہ اپنے آپ سے ڈر گئی تھی، اپنی پنہاں آرزوؤں کے زور سے ڈر گئی تھی۔ اگر اس کی آرزوؤں کا زور چل جاتا تو اس کو بہت ندامت ہوتی، وہ اپنے آپ کو بہت ہی چھوٹا محسوس کرتی، اپنے آپ کو ذلیل بلکہ رذیل محسوس کرتی، جیسے کہ وہ آدمی جس کے گھر میں ہزار نعمت دستر خوان پر چنی ہو مگر وہ گھر کے راستے پر گامزن مگر گھر سے دور کسی غریب بچے کے ہاتھ سے چنے چھین لے۔

بالکل یونہی۔ اگر وہ اپنے آپ کو سیگفریڈ کے سپرد کر دیتی تو وہ اس سے ہمیشہ ہمیشہ کے لیے جوانی کی حیرت، جوانی کا عزم، جوکھم کی آرزو، طلسم کشائی کی مسرتیں چھین لیتی اور زندگی کے سفر میں ایک بے مسافر جہاز کی طرح اجنبی سمندروں کے تھپیڑوں کے لیے وقف ہو جاتا۔

کیسے؟ کیوں؟

اگرچہ ان دونوں کی عمروں میں سات آٹھ سال کا فرق تھا مگر وہ اپنے خاندانی مرتبے، خاندانی دولت، اپنی ذہانت، اپنی آزادیٔ فکر اور اپنے اس تجربے کے باعث، جو اس کو علم کی روشنی میں اپنے جذبات، عقل، تخیل اور وجدان اور حواس کی اڑان کو ایک بے نظم

نظام میں ڈھالنے کی کوشش سے حاصل ہوا تھا، شخصیت کے عالم میں ایسے مقام پر تھی جہاں اس کے جنسی لمس سے ایک ناتجربہ کار، بھولے، رومانی، نوجوان بچے کے حواس، جذبات اور عقل اور وجدان جل جاتے، مر جاتے۔ اس کی شخصیت کے جنسی عمل سے سیگفریڈ کی نامکمل شخصیت اسی طرح پاش پاش ہو جاتی جس طرح سنگتراش کے اوزاروں سے ہاتھی دانت میں صورت گری کی کوشش سے ہاتھی دانت۔ اگر وہ سیگفریڈ کے ہونٹوں پر ہونٹ رکھ دیتی تو اس کا دم نہ صرف گھٹ ہی جاتا بلکہ اس کی روح اس کے تنفس کے خروج کے ساتھ اس سے رخصت ہو جاتی۔ اور اگر سیگفریڈ اس کے بے لباس جسم کو اپنے بے لباس جسم سے چھو لیتا تو اس کی کچی کچی ہڈیاں پانی ہو جاتیں۔ اور اگر جنسی وصل کی سکت اس میں رہ جاتی تو وہ اس کے حظ میں ڈوب کر ابھر ہی نہ سکتا۔

ہوں! حسینہ کا خواب! ہر حسینہ جوانی کے لمحوں کو گزرتے دیکھ کر یونہی دل کو بہلاتی ہے! محض جذبات کو بہلانے کے لیے طفل تسلیاں!

کیا واقعی یہ خواب تھا؟

یہ سوال اس کو اپنی توہین محسوس ہوا۔ وہ لرز اٹھی جیسے کسی نے چابک اس کے چہرے پر مارا ہو۔ آتش غضب میں اس کا تن بدن پھنکنے لگا۔ وہ اپنے حواسی ماحول میں لوٹ آئی۔ ٹب کا پانی بہت گرم ہو گیا تھا۔ اس نے منہ پھیر کر گرم پانی کے نلکے کی طرف دیکھا، نلکا چل رہا تھا اس نے ٹب کی طرف دیکھا تو ٹب کا پانی چھلک چھلک کر بہہ رہا تھا۔

اس نے ایک بار جلدی جلدی جسم پر ہاتھوں سے مالش کی، جھاگ ہٹا کر منہ پر گرم پانی کے چھینٹے مارے اور ٹب سے اٹھ کر باہر نکل آئی۔ اس نے تولیے سے بدن پونچھا اور تولیے کو بدن پر لپیٹ کر وہ سنگھار کمرے میں داخل ہو گئی۔ کپڑوں کی الماری کھول کر دبیز ریشم کا ایک جبہ نکال، بازو پر ڈال سنگھار میز کی طرف چل دی، گدے دار چوکی کے قریب پہنچ کر، تولیے کو بدن سے اتار، لکڑی کے الگنی پر ڈال اور جبہ پہن چوکی پر بیٹھ گئی۔ بالوں کو برش کیا، جوڑا باندھا اور پھر کپڑوں کی ایک دوسری الماری کی طرف چل دی۔ اس میں سے زربفت کا غرارہ اور کرتا نکالا۔ کپڑے کی زمین کا رنگ نیلا تھا، ایسا نیلا جیسے خزاں کے دنوں میں دوپہر

کے بے بادل آسمان پر ہوتا ہے، اس نے کپڑوں کو گیرے دار تخت پر ڈال دیا اور ایک بار پھر الماری کی طرف متوجہ ہوئی۔ اس دفعہ اس نے گرم پوراز یر جامہ نکال، تخت پر بیٹھ، اس کو پہن لیا۔ پوراز یر جامہ اس کے جسم پر نئی جلد کی طرح چڑھ گیا۔ اس پر اس نے نیلا زربفتی جوڑا پہن لیا اور سنگار میز کے آئینے کے سامنے جا بیٹھی۔ سنگار میز کے ایک خانے میں سے زیور کا ڈبہ نکال کر اس میں بندے جن میں نیلے روغن کے صدف میں ہیرے جڑے تھے، نکال کر کانوں میں پہنے، گلے کے لیے اس نے شبنمی سے موتیوں کا ہار انتخاب کیا اور ہاتھوں میں ہاتھی دانت کی منقش چوڑیاں پہن لیں۔ اور آئینے میں اپنا سراپا دیکھنے لگی۔ اس کے حسن میں عجب سج دھج تھی کہ وہ اپنے آپ میں لجا لجا گئی مگر اس کا ماتھا کہتا تھا کہ وہ اپنے آپ پر نازاں تھی۔ جذبات کے اس تانے بانے میں اتنی محو ہوئی کہ اس کو یاد ہی نہ آیا کہ کب اس کا ہاتھ سنگھار بکس میں مسی کی انگشت کی طرف بڑھ گیا۔ مسی کی انگشت کو نکال کر وہ ہونٹوں تک لے گئی۔ ایک دم اس کی نظر آئینے پر جا پڑی تو ہاتھ میں مسی کی انگشت دیکھ کر وہ حیران سی ہوئی۔ اس نے جانچنے کی کوشش کہ مسی لگانے سے اس کے حسن پر کیا اثر پڑے گا۔ اس نے بہت سوچ کے بعد فیصلہ کیا کہ مسی لگانے سے ہتھیار بند ہونے کی کیفیت پیدا ہوگی۔ اس نے مسی کی انگشت کو واپس سنگھار بکس میں رکھ دیا اور آئینے کے سامنے سے اٹھ کھڑی ہوئی اور تخت پر جا بیٹھی اور اس کے ڈھلواں کٹہرے کے ساتھ ٹیک لگا کر باہر کی آوازوں پر کان لگایا۔ ہر طرف خاموشی سر سرا رہی تھی۔ وہ حیران ہوئی کہ آخر کھانے میں آج اتنی دیر کیوں؟ کیا وقت نہ ہو چکا تھا؟ اس نے چاہا کہ گھڑی میں وقت دیکھے مگر گھڑی سنگھار کی میز پر رکھی تھی اور اٹھنے کو اس کا جی نہ چاہ رہا تھا اگرچہ وہ لیٹے رہنا بھی نہ چاہتی، وہ بیٹھنے کے کمرے میں بھی نہ جانا چاہتی تھی۔ وہ تو یہ چاہتی تھی کہ متین صاحب اس کے دروازے پر دستک دیں اور وہ ان کو بلا کر پاس تخت پر بٹھا لے اور ان کو دیکھتی رہے، ان کے تنفس کی لے کو سنتی رہے۔ اس کے اپنے تنفس کی لے متین صاحب کے تنفس کی لے کے ساتھ مل کر اس کے لیے اک عجیب، زندہ اور حسین موسیقی کو خلق کرتی۔ یہ موسیقی اس کو اتنی ہی مطمئن کرتی جتنی یورپ کے عظیم فنکاروں کی موسیقی، خصوصاً موتسارت کی موسیقی۔

لیٹے لیٹے، اپنے تنفس کی لے سنتے سنتے، ایک بار اس کی نظر آئینے پر جا پڑی۔ اپنا سنگھار دیکھ کر اس کے دل نے کہا "دلہن بنی کس دولہا کی راہ دیکھتی ہے ری؟ تیری برات کہاں ہے ری؟ باجوں کی صدا دور دور تک نہیں۔ جس کو دولہا بنانے کا سوچتی ہے وہ نہ جانے کس دلہن کے لیے سرگرداں ہے؟ تو اس کے حواس، جذبات، ذہن، تخیل کی رانی ہوتے ہوئے بھی اس کی دلہن نہیں۔ اس کی روح تمھیں دلہن ماننے سے انکاری ہے۔ تیرا کیا بنے گا؟ دولہا کی تلاش میں تم نے کتنا لمبا سفر کیا ہے، کتنے جوکھم اٹھائے ہیں، ایک جنگ کی آگ کو اپنے تخیل، جذبات، ذہن اور حواس پر محسوس کیا ہے۔ مگر سفر ختم ہوتا نظر ہی نہیں آتا۔ وہ لمحے بھر کے لیے اپنے دل پر جھلائی کیونکہ وہ متین صاحب اور اپنے تعلقات کے مستقبل سے آگاہ تھی، ایک سطح پر اس کو مکمل طور پر قبول کر چکی تھی، وہ صرف ستانے کے لیے یہ چاہتی تھی کہ جتنی دیر وہ متین صاحب کے قرب میں سانس لے سکے لے لے۔ وہ تو یہ بھی قبول کرنے کو تیار تھی کہ متین صاحب اس کے لیے وہ گزرگاہ تھے جس کو طے کرنے کے بعد اس کے دولہا کے دیس کی سرحد شروع ہوتی تھی مگر اس قبولیت کے ساتھ ساتھ اس کا ذہن اس سے طلبگار تھا کہ وہ متین صاحب کے لیے بھی ایسی ہی گزرگاہ بن سکے، بن جائے۔

خیالات کا سلسلہ لامتناہی ہوتا چلا گیا، وہ گھبرانے لگی۔ کچھ کرنے کے لیے تڑپنے لگی۔ وہ ایک دم تخت سے اٹھ کھڑی ہوئی اور ننگے پاؤں متین صاحب کے کمرے کی طرف چل دی۔ اس نے دستک دیئے بغیر دروازہ کھولا اور داخل ہوگئی۔ کمرے کے بیٹھنے والے حصے میں وہ نہ تھے، اس نے دوسرے میں جھانکا، وہ بستر پر بھی نہ تھے، صرف ان کے کپڑے ایک بستر پر پڑے تھے۔ شاید وہ غسل خانے میں تھے۔ اس نے غسل خانے کے دروازے کی طرف دیکھا، دروازہ کھلا تھا۔ اس نے کان لگا کر سنا مگر پانی گرنے کی آواز نہ تھی، نہاتے ہوئے اعضا اور پانی کے ملاپ سے پیدا ہونے والی آواز نہ تھی۔ شاید وہ گرم پانی میں چپ چاپ بیٹھے خیالوں میں گم تھے۔ دروازے میں داخل ہونے کے لیے اس کا دل بہت للچایا۔ اس نے دل کو سمجھایا مگر اس کے قدم دروازے کی طرف بڑھ رہے تھے۔ وہ اپنے آپ سے ڈر گئی اور الٹے پاؤں واپس بیٹھنے کے کمرے میں چلی آئی۔ بیٹھنے کو دل نہ مانا، وہ دروازہ

کھول کر گلی میں نکل آئی، گلی کی چھت کی طرف دیکھا۔ چھت کے شیشے کے روشندانوں کی سطح روشن سی ہو رہی تھی۔ چاندنی روشندانوں تک پہنچ چکی تھی۔ اس نے کان لگا کر سنا۔ دور باورچی خانے سے باتوں کی گنگناہٹ سی آ رہی تھی۔ کون باتیں کر رہا ہوگا؟ ایک باورچی اور ایک بابا؟ مگر گنگناہٹ تو محض دو آدمیوں کی آوازوں کی نہ تھی شاید کوئی تیسرا بھی تھا۔ کون ہوسکتا ہے؟ کیا کرنے آیا ہے؟

اپنے تجسس پر وہ مسکرا دی۔ آخر وہ بھی لوگوں کی طرح گوشت پوست کی انسان تھی، صلاحیتوں کے فرق اور بعد کے باوجود وہ انسان ہی تھی۔ وہ گلی میں زیادہ دیر رک نہ سکی اور اپنے کمرے میں داخل ہوگئی۔ ایک الماری کھول کر اس میں سے نیلی زربفتی جوتی نکال کر پہن لی۔ چلنے سے بے دھیان، خیالات میں گم، آئینے کی طرف بڑھی سنگھار میز سے کلائی کی گھڑی اٹھا کر بائیں کلائی پر باندھ لی اور اپنے سراپے کو دیکھ ٹھٹکی، پاؤں کی طرف دیکھا۔ جوتی ہموار تلے کے باعث چلنے میں خاموش تھی۔ آئینے میں اک دلہن کو سجے دیکھ کر وہ خیالات میں کھوگئی اور بغیر سوچے آئینے سے منہ موڑ وہ دروازے کی طرف بڑھی اور کمرے سے نکل متین صاحب کے کمرے میں ایک بار پھر داخل ہوگئی۔ وہ کہیں بھی نہ تھے۔ غسل خانے کا دروازہ اس کو بار بار للچاتا رہا مگر اس نے کوشش کی کہ اس کے قدم نہ اٹھیں مگر وہ زیادہ دیر اپنے پاؤں پر قابو نہ رکھ سکی۔ وہ سانس روکے غسل خانے کے دروازے میں داخل ہو ہی گئی۔ وہ وہاں بھی نہ تھے۔ وہ بھونچکی سی رہ گئی۔ اس کو کچھ نہ سوجھا کہ وہ کیا کرے۔ ایک دم اس کو خیال آیا کہ متین صاحب اس کو چھوڑ کر چلے گئے ہیں۔ وہ پریشان ہوگئی اور جلدی سے گلی سے ہو کر بیٹھنے کے بڑے کمرے میں داخل ہوگئی۔ وہ وہاں بھی نہ تھے۔ اس نے جلدی سے کمرے کو عبور کیا اور باہر صحن میں پہنچ گئی۔ صحن میں چاندنی کھلی تھی مگر وہ وہاں بھی نہ تھے۔ وہ بے تاب ہوگئی، اس کے دل کی طرف ایک سرد سا ہاتھ بڑھنے لگا۔ اس نے صحن کو عبور کیا اور کھانے کے کمرے میں جھانکا وہاں بھی کوئی نہ تھا۔ ابھی وہاں کھانے کے برتن تک نہ لگائے گئے تھے۔ کمرے میں چھت کے کرسی دار روشندانوں کے شیشے چاندنی سے جگمگا رہے تھے۔

وہ وہاں بھی رک نہ سکی اور کمرے کو عبور کر کے ایک بار پھر گلی میں آ گئی۔ وہ گلی سے کتب خانے کی طرف بڑھی۔ کتب خانے میں روشنی دیکھ کر اس کی جان میں جان آئی۔ وہ گلی سے صحن میں داخل ہوئی اور پھر صحن سے کتب خانے میں داخل ہوئی۔ میز پر ایک کتاب کھلی رکھی تھی اور اس پر بلور کا ایک گول ٹکڑا بطور وزن رکھا تھا۔ کتاب نے اس کو ایک دم اپنی طرف متوجہ کر لیا۔ وہ میز کی طرف بڑھی اور کرسی پر بیٹھ کر اس نے کھلی کتاب کو پڑھنا شروع کیا۔ قلمی کتاب تھی۔ کتاب میں عشق الٰہی کے مراحل کا بیان تھا۔ اس نے ورق الٹنے شروع کیے، سرسری نظر سے اوراق کو دیکھتی چلی گئی۔ ایک صفحے پر فنا کا ذکر تھا اور اس کے حاشیے پر کسی نے پنسل سے کچھ لکھ رکھا تھا جس کو ٹھیک طرح سے پڑھ نہ سکی۔ اس نے میز کے ایک خانے سے محدب عدسہ نکالا اور پنسل کے حروف کو پڑھنے کی کوشش کرنے لگی۔ اس نے پڑھا ''عشق میں بھی ایسی منزل آتی ہے جب شخصیت بالکل فنا ہو جاتی ہے اور انسان موت سے ہم کنار ہو جاتا ہے۔ موت حسین معلوم ہوتی ہے، بے حد حسین معلوم ہوتی ہے۔ موت زندگی سے بھی زیادہ جاندار معلوم ہوتی ہے۔ موت کے ہاتھ میں ہاتھ دیئے ایک طویل سفر کے بعد پھر سے زندگی ملتی ہے مگر محبوب کی شخصیت کے پرتو کی حیثیت سے۔ عاشق محبوب کا روپ بن جاتا ہے، وہ سب کچھ محسوس کرتا ہے جو محبوب محسوس کرتا ہے، محبوب کا دل اس کا دل بن جاتا ہے، محبوب کے جذبات اس کے جذبات بن جاتے ہیں، وہ محبوب کے ذہن سے سوچتا ہے۔ وہ محبوب کی شخصیت میں جذب ہو جاتا ہے۔'' پنسل کا لکھا بہت پرانا معلوم ہوتا تھا۔ فردوس نے سوچا کس کی تحریر ہو سکتی تھی۔ اس کے والد کی؟ نہیں ان کی تحریر میں ہمیشہ سے ایک پختگی تھی اور اس تحریر کا خط کچا کچا سا تھا۔ کسی نوجوان کی تحریر معلوم ہوتی تھی۔ مگر اس کے خاندان میں کوئی ایسا نوجوان نہ تھا جس کی یہ تحریر ہو سکتی تھی۔ وہ اسی ادھیڑ بن میں تھی کہ کسی نے روشنی گل کر دی۔ وہ ہڑبڑائی ''کون ہے؟''

روشنی ہو گئی۔ اس نے دیکھا کہ متین صاحب روشنی کے بٹن کے پاس کھڑے تھے۔

''آپ یہاں کب سے ہیں؟ میں ابھی ابھی اٹھ کر یہاں سے گیا تھا۔''

''یہ کتاب آپ پڑھ رہے تھے؟''

''ہاں!''

''اس کے ایک صفحے کے حاشیے میں کسی کی تحریر ہے۔عجب تحریر ہے۔آپ نے دیکھی ہے؟''

''ہاں!''

''کس کی تحریر ہو سکتی ہے؟ کسی نو جوان کی تحریر معلوم ہوتی ہے۔''

''ہاں، لکھنے والا نو جوان ہی تھا۔یہی کوئی بیس اکیس برس کا ہوگا اس وقت۔''

''اچھا؟ آپ کو کیسے معلوم ہے؟''

''اس کتب خانے کا محافظ ایک نو جوان تھا۔اس کے ہاتھ کی تیار کی ہوئی ایک فہرست میز کے سب سے نچلے خانے میں ہے۔دونوں میں ایک ہی خط کی تحریر ہے۔''

''اس کو کسی سے عشق تھا......''

''ہاں تھا''

''آپ کو کیسے معلوم ہے؟''

''اس کتاب کے جس حاشیے کی طرف تم نے ابھی اشارہ کیا اس سے یہی ظاہر ہے۔''

''اس کو گاؤں کی کسی لڑکی سے عشق ہوگا۔کیوں کیا خیال ہے۔''

''نہیں۔گاؤں کی کوئی لڑکی اس میں ایسی کیفیات پیدا نہیں کر سکتی تھی۔اس کے لیے نہ صرف محبوب کا حسین ہونا ہی ضروری ہے بلکہ اس کی ذہانت بھی بلند درجہ ہونی چاہیے اور سب سے ضروری بات تو یہ ہے کہ اس عشق کا ناکام عشق ہونا ضروری ہے۔شاید اس کو اپنے سے بہت بلند مرتبہ عورت سے عشق تھا جس تک اس کی رسائی تو تھی مگر اس سے وصل ناممکن تھا۔''

''بے چارے کا مجھ جیسا نصیبہ ہوگا۔''

''تمہیں ایسی بات زیب نہیں دیتی۔ہمارا تمہارا رشتہ بالکل مختلف نوعیت کا ہے۔''

''اگر آپ اتنا کچھ جانتے ہیں تو بتا دیں وہ کون تھا جس سے اس کا وصل ناممکن تھا۔''

''فردوس! مت پوچھو کہ وہ کون تھا۔ یہ راز ہے جو مجھ پر بھی حادثاتاً کھل گیا ہے۔''

''میرا دل بہت مضبوط ہے۔ مجھ میں سننے کی تاب بھی ہے۔''

''اس کتب خانے کا محافظ ایک بیوہ کا اکلوتا لڑکا تھا۔ وہ حسین تھا، ذہین تھا، وفادار تھا۔ مگر اس کو اپنی مالکن سے بے پناہ عشق تھا۔''

''امی سے!''

''ہاں! تمہاری ماں سے۔ تمہاری ماں تم سے بھی زیادہ حسین تھی۔ اس کا حسن انسانوں سے صرف اطاعت ہی قبول کر سکتا تھا۔ اطاعت ہی اس کا خراج تھا اور تمہاری ماں اس اطاعت، اس خراج سے تنگ تھی۔ اس کا حسن جہاں افروز تو تھا مگر جہاں سوز بھی تھا۔ جس نے دونوں آنکھوں سے اس کو دیکھ لیا اس کا ہی ہو رہا، جہان کے لیے وہ مر گیا۔''

''کتنی المناک بات ہے۔''

''ہاں۔''

''آپ کو یہ سب کچھ کیسے معلوم ہے۔''

''جمیل صاحب نے، ان کی بیوی نے تمہاری ماں کو دیکھا ہے۔ جمیل صاحب کو بھی تمہاری ماں سے عشق تھا مگر تمہاری ماں کے ہمشیر ہونے کے باعث تمہاری ماں ان کی نہ ہو سکتی تھی۔ ان کی زندگی کی روشنی اور تاریکی تمہاری ہی ماں سے تھی۔''

''یہ میں جانتی ہوں۔ مگر کتب خانے کے محافظ کا قصہ آپ کیسے جانتے ہیں؟''

''جلد ہی تم پر یہ بات بھی کھل جائے گی۔ اس لمحے نہ پوچھو۔ ابھی ہمارے سفر کی منزل بہت دور ہے۔ منزل پر پہنچ کر ہی اس موضوع پر بات ہو سکے گی......

یہ تو بتاؤ کیا کچھ وقت ہے کہ میں نہا لوں؟''

فردوس نے بائیں کلائی کو موڑ کر گھڑی دیکھی اور کہا:

''ابھی بیس منٹ ہیں......''

''کافی ہیں۔''

متین صاحب کمرے سے نکل گئے۔فردوس نے ان کو جاتے ہوئے غور سے دیکھا۔ ان کے جوتوں کے تلووں کے کناروں سے دھول سی جمی تھی۔ دھول پتھریلی زمین پر کیسے؟اس نے سوچا۔وہ کہاں گئے تھے؟اس کو خیال آیا کہ جب وہ کمرے میں داخل ہوئے تھے تو ان کے چہرے پر پسینہ تھا، جیسے وہ کوئی سخت کوش کام کرکے آئے ہوں،اور ان کے نقوش میں ایک تشنج کی کیفیت تھی جیسے ایسا کام کرکے آئے ہوں جس میں جسم اور ذہن نے آپس میں گتھ کر کام کیا ہو،جس میں شدید حاضر دماغی اور کڑے شعور کی ضرورت ہو۔

اس کی سوچ اس کو کچھ نہ بتا سکی۔وہ ہار کر کتاب کی طرف متوجہ ہوگئی۔وہ ورق الٹتی ہی گئی۔کہیں کوئی فقرہ اس کی توجہ کا دامن کھینچ لیتا اور وہ رک جاتی،فقرے کے معنی پر غور کرتی اور آگے چل دیتی۔مگر کوئی فقرہ اس کی توجہ کو جذب نہ کرسکا۔اس کا ذہن،اس کی توجہ صرف اس بات پر لگی تھی کہ متین صاحب کے جوتوں کے تلووں کے کناروں پر دھول کیسے آئی،وہ کیا کرکے آئے تھے۔

ورق الٹتے الٹتے وہ اس باب پر جا پہنچی جہاں اس بات کا بیان تھا جب قرب الٰہی ممکن محسوس ہونے لگتا ہے اور روح وصال کے لیے بے تاب ہونے لگتی ہے۔اس میں ایک فقرے نے اس کی ساری توجہ کو جذب کرلیا اور اس کے تخیل کا جہاں لمحے بھر کے لیے بالکل روشن ہوگیا۔''قرب اور وصال کے درمیان ایک منزل ایسی بھی آتی ہے جب روح وصال کے حظ اور اس حظ کے خوف سے تھرانے لگتی ہے۔روح کو محسوس ہوتا ہے کہ وہ ایسی سرزمین پر قدم رکھنا چاہتی ہے جہاں اس کو حق نہیں جہاں اتھاہ تنہائی،اتھاہ غیریت کا ایک بے آفاق سمندر ٹھاٹھیں مارتا ہے اور جو روح اور اللہ کے درمیان حائل ہے۔جس کو پاٹنے کی آرزو انتہائی تکبر،انتہائی دیدہ دلیری،گناہ عظیم محسوس ہوتی ہے۔جلال الٰہی کی ہیبت دل پر طاری ہوجاتی ہے۔اللہ بالکل غیر معلوم دیتا ہے۔روح کے قدم رک جاتے ہیں۔روح کے لیے اس سے خطرناک منزل کوئی نہیں۔اس مقام پر روح کی تمام قوتوں اور جرأتوں کا وجدانی استعمال ناگزیر ہوجاتا ہے۔اگر روح یہاں مارے خوف کے شل ہوجائے تو اس کی ابدی

موت ناگزیر ہو جاتی ہے......''

اس کے حاشیے پر پنسل میں تحریر تھی: ''انسانی عشق میں بھی ایسا ہی ہوتا ہے۔ محبوب کے قرب کے احساس، محبوب کی جوابی توجہ کے باوجود احساس ہوتا ہے کہ محبوب کی غیریت کی حدود میں داخل ہونا، اس کی آرزو، محبوب کے ساتھ ظلم ہے، ایک گناہ ہے۔ محبوب کو ہمیشہ غیر ہی رہنا چاہیے۔ یہی عشق کا آئین ہے۔ مگر وصل کی آرزو غیریت کو جذب کامل میں بدل دینا چاہتی ہے اور اس منزل کی طرف کشاں کشاں لے جاتی ہے۔ حالانکہ اس منزل کا سفر تلوار کی دھار کا سفر ہے، بس ایک پل صراط ہے۔''

فردوس کے روئیں روئیں پر ایک وجد آور ہیبت کی کیفیت چھا گئی۔ اس کے ذہن میں نور ہی نور بھر گیا۔ اس نے محسوس کیا کہ وہ کتب خانے کے محافظ کی روح کو بے نقاب دیکھ رہی ہے، اس کی محبت، العشق، کی آتش سے وہ اپنے حواس کو جلتے ہوئے محسوس کرنے لگی۔ اس نے محسوس کیا کہ وہ اس کی شکل صورت کو بھی دیکھ رہی ہے۔ وہ کتب خانے کی مغربی کھڑکی کے اس پار دیوار پر چلا آ رہا ہے۔ وہ کرسی میں بیٹھے بیٹھے کھڑکی کی طرف مڑ گئی۔ کھڑکی کھلی تھی اور دور سے ایک سر آتا دکھائی دے رہا تھا، شاید کوئی کھڑکی کے نیچے والی پہاڑ کی کمر پر چل رہا تھا۔ صورت قریب آتی چلی گئی۔ ایک نوجوان سا چہرہ تھا جس پر ایک الوہی والہانہ پن تھا جس نے چہرے کو انتہائی حسین بنا دیا تھا۔

فردوس حیرت میں کرسی چھوڑ، کھڑکی کی طرف منہ کیے، کھڑی ہو گئی۔ وہ کمر کوہ کو دیکھ سکتی تھی۔ صورت بڑھی چلی آ رہی تھی، آہستہ آہستہ جیسے کوئی نیند میں چل رہا ہو، اس نے محسوس کیا کہ کوئی تلوار کی دھار پر چل رہا ہے اور اس کی طرف بڑھا چلا آ رہا ہے۔ اس سے قرب کی، وصل کی آرزو لیے۔ اس کے ذہن میں خیال ابھرا کہ شاید اس نے اس نوجوان کا امتحان لینے کے لیے اس کو اس تلوار کی دھار پر چلنے کے لیے کہا ہے اور اگر وہ طے کر کے کھڑکی کو عبور کر کے اس کے قریب آ گیا تو اس کو وصل کا وعدہ پورا کرنا ہی ہوگا۔ وصل کے خیال سے اس کے سارے بدن میں ایک جھرجھری سی آ گئی اور وہ کانپنے لگی۔ اس نے خوف میں کھڑکی کی طرف نظر کی تو نوجوان کھڑکی کی چوکھٹ کو چھوا ہی چاہتا تھا۔ اس پر خوف غلبہ

کرنے لگا اور اس کے منہ سے ایک دلدوز چیخ نکل گئی۔ نوجوان نے حیرت سے اس کی طرف دیکھا، وہ لرزا، اس کا توازن قائم نہ رہا اور چکرا کر تلوار کی دھار پر سے گر گیا۔ فردوس کے جسم میں ایک دم حرکت پیدا ہوئی اور وہ کھڑکی کی طرف بھاگی۔ اس نے چوکھٹ پر دونوں ہاتھ رکھ کر نیچے دیکھا۔ نیچے اندھیرا ہی اندھیرا تھا۔ صرف کھڑکی سے چند گز دور تک پتلی سی دیوار کی سطح کمرے کے بلب سے روشن تھی۔ اس روشنی میں اس نے دیکھا کہ دیوار کی سطح پر جوتوں کے نشاں ہیں۔ وہ حیران ہوئی اور پھر ایک دم اس نے مارے ڈر کے اپنا دایاں ہاتھ منہ پر رکھ لیا۔ اس کے ذہن نے کہا کہ متین صاحب اس دیوار پر سے چل کر گئے تھے جب وہ کتب خانے میں داخل ہوئے تھے۔

وہ ابھی اس خیال سے حیران ہی ہو رہی تھی کہ کسی کے قدموں کی چاپ نے اس کو چونکایا۔ وہ ایک دم چوکھٹ پر ہاتھ رکھے مڑی اور کمر کے سہارے کھڑکی کے ساتھ لگ کر کھڑی ہو، کتب خانے کے دروازے کی طرف دیکھنے لگی۔ متین صاحب کمرے میں داخل ہوئے۔ انہوں نے گہرے نیلے رنگ کا سوٹ پہن رکھا تھا، ان کے کوٹ کی اوپر کی جیب سے ایک سرخ ریشمی رومال کا کونا اس کو غور سے دیکھ رہا تھا۔ ان کی واسکٹ کے گلے سے ایک سفید ریشمی قمیص اور سنہری دھاری والی شبنمی ٹائی ان کے روشن چہرے کو اور بھی منور کر رہی تھی۔ ان کے چہرے پر اطمینان اور تیقن کا ایک حسین مگر پر ہیبت روپ جھلک رہا تھا۔ وہ دروازے میں لمحہ بھر کے لیے رکے، شاید یہ دیکھنے کے لیے کہ فردوس کہاں تھی۔ اس کو کھڑکی کے پاس کھڑے دیکھ کر وہ اس کی طرف تیزی سے بڑھے۔ قریب پہنچ کر سرگوشی کے انداز میں اس سے پوچھا۔

”چیخ تمہاری تھی؟ کیا ہوا تھا؟“

فردوس نے سر کی جنبش سے کمرکوہ کی طرف اشارہ کیا۔

”میرا بھی یہی خیال تھا۔ بالکل یہی کچھ تمہاری ماں نے آج سے پچیس سال پہلے دیکھا تھا۔“

”وہ نوجوان اس دیوار پر کیا کر رہا تھا؟“

''وصل محبوب کے لیے امتحان پر پورا اترنے میں کوشاں تھا۔تمہاری ماں کی چیخ تیر کی طرح اس کے دل کے پار ہوئی اور وہ چکرا کر گر گیا اور نیچے بہتے پانیوں میں گر کر نہ جانے کہاں چلا گیا۔''

''نیچے بہتا پانی ہے؟''

''ہاں اس کمرکوہ کے نیچے، بہت دور نیچے، اک نہاں ندی ہے جو دریاؤں کے سنگم سے ذرا نیچے جا کر دریاؤں میں مل جاتی ہے۔میں نے اس ندی کے شور کو سنا ہے۔''

''ندی زیرزمین کیسے ہے۔''

''یہ ندی قدرتی نہیں، کبھی بنائی گئی ہوگی......تمہیں شاید معلوم نہیں اس مقام پر کبھی شاہی محل تھا جہاں پرانے بادشاہ شمالی پہاڑوں کے اس پار جنت نظیر جاتے ہوئے یہاں قیام کیا کرتے تھے سکندر بھی یہاں چندروز ٹھہرا''

''واقعی؟ آپ کو یہ سب کیسے معلوم ہوا۔''

''تمہارے اس کتب خانے میں ایک قلمی نسخہ ہے جو اس علاقے کی تاریخ ہے۔''

''اوہ۔آپ کی نظر کہاں کہاں پڑ جاتی ہے۔آپ سے کچھ بھی تو مخفی نہیں۔''

''نہیں، ایسا تو نہیں۔میں خود، میرا مستقبل، مجھ سے مخفی ہے۔اور میں خوش ہوں کہ مخفی ہے۔''

صحن میں قدموں کی چاپ سن کر وہ دونوں خاموش ہو گئے۔انہوں نے ایک ساتھ دروازے کی طرف دیکھا۔تقی اور عالمہ دروازے میں سے داخل ہو رہے تھے۔دونوں بہت ہی پیارے لگ رہے تھے۔عالمہ نے سفید رنگ کی چینی ریشم کی شلوار اور قمیص پہن رکھی تھی اور اس پر سفید کامدار چادر اوڑھ رکھی تھی۔اس کا گلابی، پھول سا چہرہ، تدبر کے باوجود بہت بھولا لگ رہا تھا۔اس بھولپن میں اس کے کانوں میں جھولتے ہوئے آویزوں کے جگمگاتے ہوئے لعل ایک ہٹیلی، کٹیلی سی شوخی کا گمان پیدا کر رہے تھے۔اس کے پاؤں میں سفید کامدار ہموار تلے والی جوتی تھی۔تقی نے گائے کے مکھن جیسے رنگ کی ریشمی قمیص پر سیاہ رنگ کی

واسکٹ کوٹ اور پتلون پہن رکھی تھی۔ اس کے کوٹ کے کالر کے پھول لگانیوالے سوراخ میں بسنتی پھول لگا تھا، پھول کے پاس اس کی جیب سے سفید رومال جھانک رہا تھا اور اس کی بسنتی رنگ کی ٹائی پر سرخ بوندیاں تھیں۔ اس کے چھریرے مگر متناسب اور گٹھے ہوئے بدن پر کپڑے عجب بہار دے رہے تھے۔ فردوس اور متین صاحب کچھ نہ بولے، دیکھتے ہی چلے گئے، جیسے ان پر جادو ہوگیا ہو۔ جب دونوں ان کے قریب پہنچ گئے تو تقی اور عالمہ نے سلام کے بعد پوچھا ''ہم میں کیا بات ہے کہ آپ دیکھے ہی چلے جاتے ہیں۔''

''تمہاری جوڑی بہت ہی خوبصورت ہے۔ اس لمحے تم دونوں بہت ہی حسین دکھائی دے رہے ہو۔ خدا نظر بد سے بچائے......تم دونوں شادی کرلو۔ اپنے دیس کی برات دیکھے مدتیں گزر چکی ہیں۔ باجے بجیں، ہاتھوں میں مہندی لگے، رات بھر ڈھولک بولے، مہمانوں کی ریل پیل، نوجوان لڑکیوں کے قہقہے، نوجوان لڑکوں کا بار بار کسی نہ کسی بہانے زنانے میں آنا، ماں بہن سے باتیں کرتے کرتے کن انکھیوں سے لڑکیوں کو دیکھنا، اک خواب ہوگئے ہیں۔ پھر رخصتی کے دل ہلانے والے گیت، سنوا دونا آج کل میں۔'' فردوس نے کہا

''ہم اسی لئے آئے ہیں۔''

''واقعی؟ مبارک ہو۔''

''آپ غلط سمجھیں۔ شادی کا بلاوا ضرور دینے آئے ہیں مگر عالمہ کی پھوپھی زاد کی شادی ہے۔ آپ، آپ کے مہمانوں، سب کو بلاوا ہے۔ بڑی دھوم کی شادی ہوگی۔ آپ نے تو گاؤں کی شادی نہیں دیکھی ہوگی پہلے۔ برات کا بینڈ تو اس علاقے کی خاص چیز ہے......ایک دعوت کا بلاوا اور بھی ہے ٹھاکر شِو آنند نے آپ سب کو کل صبح سے کچھ دنوں کے قیام کی دعوت دی ہے۔''

''یہ ٹھاکر شِو آنند کون ہیں؟'' فردوس نے پوچھا۔

ہمارے یہاں کے سب سے بڑے ہندو زمیندار ہیں۔ بہت پرانی زمینداری ہے ان کی۔ مسلمان بادشاہوں سے پہلے سے ان کے آباؤ اجداد یہاں آباد تھے۔ ان کی زمینداری کی سرحد شمالی پہاڑوں کی بلندیوں سے شروع ہوکر عالمہ کے پھوپھا کی زمینداری کی سرحد

سے جاملتی ہے۔ ان کی ایک بھانجی تمہارے ساتھ پڑھتی تھی۔تمہیں یاد تو ہوگی سوشیلا پنڈت؟''

''وہ طرحدار اور ذہین لڑکی!''

''ہاں، ہاں، وہی۔تمہاری رقیب۔''

''میری رقیب؟''

''بھول گئیں۔کالج میں تم دونوں مخالف جماعتوں کی لیڈر تھیں۔اگرچہ وہ ہر معاملے میں تم سے مختلف رائے رکھتی تھی مگر اپنے بلند مقام سے اتر کر کبھی چوٹ نہ کرتی تھی......تم دونوں کو دوست ہونا چاہیے تھا۔مگر تم دونوں کی سیاست میں اتنا اصولی بعد تھا۔''

''یاد آیا۔وہ تمہاری بھی تو بہت دوست ہوتی تھی، بلکہ اک تمہاری ہی تو وہ دوست تھی، باقی لوگ تو اس کی امت میں سے تھے۔

ان دنوں تم مجھ سے الگ الگ رہا کرتے تھے......کہاں ہے وہ آج کل۔تمہیں تو خبر ہی ہوگی۔''

''ہاں مجھے خبر ہے۔وہ آج کل ماموں کے ہاں آئی ہوئی ہے۔آج کل وہ ہندو نشاۃ ثانیہ کو ایک زندہ حقیقت بنانے کی فکر میں ہے۔بہت بڑی عالمہ ہوگئی ہے وہ۔کئی تو زبانیں ہی جانتی ہے۔سنسکرت تو ان کے گھر کی لونڈی تھی ہی۔رقیب کے گھر جانے میں اک مزہ تو ہے۔کیوں کیا خیال ہے؟''

''چلیں گے، ضرور چلیں گے۔'' متین صاحب نے فیصلہ کن انداز میں کہا،''وہاں شکار تو ہوگا ہی؟''

''ہاں...... اپنے بن میں انہوں نے ہزاروں ہرن پال رکھے ہیں۔خاص خاص مہمانوں کو سال میں ایک آدھ بار دعوت دیتے ہیں ٹھاکر صاحب۔''

''اور......''

''کوئی اور بھی دعوت ہے؟''

''دعوت تو نہیں، میلہ ہے۔ سید قطب الدین کا عرس ہے۔ اس کے ساتھ بہت بڑا میلہ لگتا ہے۔ تین چار دن تک بڑی دھوم دھام رہتی ہے۔ اگر آپ میری مانیں تو صبح ٹھاکر کے یہاں چلے چلیں، وہاں سے پرسوں دوپہر کے بعد عالمہ کے پھوپھا کے یہاں چلے چلیں۔ پچھلی رات کو رخصتی ہوگی۔ اس سے اگلے دن ہم لوگ واپس ٹھاکر کے یہاں چلے آئیں گے۔ (ٹھاکر صاحب بھی تو وہاں بمع خاندان مہمان ہوں گے) اور پھر اس سے اگلے دن عرس اور میلہ دیکھیں۔ پیر صاحب نے آپ دونوں کو، مہمانوں سمیت، بلایا ہے۔ ہفتہ بھر اچھا کٹ جائے گا۔'' ''بہت لمبا پروگرام ہے۔ مگر ضرور چلیں گے۔'' متین صاحب نے کہا۔

دور کہیں سے گھنٹے نے صدا دی۔ فردوس نے کہا کہ کھانے کے لیے بلاوا دیا جا رہا ہے۔ وہ چاروں کھانے کے کمرے کی طرف چل دیئے ان کی سج دھج سے گمان ہوتا تھا کہ کسی کی برات جا رہی ہے۔

حصہ ہفتم

پہلا باب

فردوس کے کمرے سے چلے جانے کے بعد جمیل صاحب نے کمرے کو غور سے دیکھا۔ کمرے میں دو کھڑکیاں تھیں جو مشرقی شمال کی طرف کھلتی تھیں، جن کے پٹوں کے شیشے ماند چاندنی سے روشن ہو رہے تھے۔ کھڑکیوں میں ہلکے بسنتی پھول دار پردے لہرا رہے تھے۔ کمرے میں ایک دروازہ تھا جو سونے کے کمرے میں کھلتا تھا۔ اس پر بھی بسنتی مگر دبیز ریشمی پردہ پڑا تھا۔ جمیل صاحب نے پردہ اٹھا کر جھانکا۔ کمرے میں ایک بڑا سا پلنگ تھا جس پر گہرا پلنگ پوش پڑا تھا جس کے نیچے گدہ، دری، چادر اور لحاف نظر آتے تھے۔ اس کی شمال مشرقی دیوار میں ایک دروازہ تھا اور دروازے کے بائیں طرف دیوار کے ساتھ سنگار میز تھی جس کا قد آدم آئینہ اداس تھا۔ میز کے سامنے گدی دار چوکی تھی۔ سنگار میز پر آرائش کا سامان سجا تھا۔ جمیل صاحب مسکرائے کہ آئینے کا تصور آرائشِ خمِ کاکل کے سامان کے بغیر کیسے ہو سکتا تھا۔ اس کمرے میں داخل ہو کر انہوں نے پلنگ کو بغور دیکھا۔ بہت بڑا پلنگ تھا، اس پر تو پنگ پونگ بھی کھیلی جا سکتی تھی۔ انہوں نے اس پر لیٹ کر دیکھا بہت آرام دہ معلوم دیا۔ وہاں سے اٹھ کر وہ شمال مشرقی دروازے میں داخل ہو گئے۔ غسل خانہ تھا۔ مرمریں ٹب کے اوپر دو نلکے تھے۔ انہوں نے ایک ایک کی ٹونٹی کھول کر دیکھی۔ ایک میں کافی گرم پانی آتا تھا اور دوسرے میں ٹھنڈا پانی۔ دیوار کے ساتھ لگے ہوئے ایک چھجے پر نہانے کے سب لوازمات رکھے تھے جو ایک حسین اور امیر اور طرحدار عورت پسند کر سکتی تھی۔ ان کے دل میں خواہش پیدا ہوئی کہ وہ کپڑے اتار کر ٹب میں بیٹھ جائیں اور نلکے کھول دیں مگر وہ کچھ دیر

کے لیے آرام کرنا چاہتے تھے، ان کی آنکھوں کے پپوٹے غنودگی سے بھاری ہو رہے تھے۔ وہ غسل خانے سے نکل آئے اور سنگار اور سونے کے کمرے سے ہوتے ہوئے واپس بیٹھنے کے کمرے میں چلے آئے۔ رابعہ ایک صوفے پر نیم دراز آنکھیں بند کیے پڑی تھی۔ اس کے چہرے پر تھکن کے آثار کے ساتھ ساتھ اتھاہ اطمینان اور انتہائی حظ کے آثار ایک انوکھے رقص میں محو تھے۔ اس کا سینہ ابھرتے ڈھلکتے ان کو قرب کی دعوت دے رہا تھا، بلکہ تابِ نظارہ کے لیے للکار رہا تھا۔ اس کی شلوار میں سے اس کی ٹانگوں کا سڈول پن للچانے پر تلا نظر آتا تھا۔

انہوں نے رابعہ کے قریب جا کر اس کے چہرے کو غور سے دیکھا۔ اس کے چہرے پر جوانی کا بھولپن نہ تھا، اس پر کنوارپنے کی تاب نہ تھی، اس کے جسم میں کنوارپنے کی باس نہ تھی مگر اس کے چہرے پر سورج کی کرنوں سے دمکتے ہوئے پرانی ارغوانی شراب کے بلوریں جام کا سا رنگ تھا اور انہوں نے سوچا کہ ویسا ہی حظ اور مزا۔ اس کے ارغوانی ہونٹوں پر ایک والہانہ پن سو رہا تھا اور اس کی متناسب گلابی سی گردن اور اس کے نیچے ہڈیوں کا حصار اور اس کی قمیص کے سینے کی بلندی سے پیدا ہونے والے درمیانی فاصلے کا خلا دل کو ڈوب جانے کی دعوت دے رہا تھا۔ اس کے آہستہ خرام تنفس کی لے میں تنہا باغ میں بہار کے پھولوں کو جھولاتی ہوئی سہ پہر کی سرسراتی ہوا کی سی دھیمی دھیمی موسیقی جواں ہو رہی تھی۔ ان کا سینہ جذبات کی شدت سے تنگ ہونے لگا، ان کا سانس گھٹنے لگا اور ان کے سارے جسم میں خون کی رفتار دھیمی، بہت دھیمی ہوگئی، دھیمی ہی ہوتی چلی گئی۔ ان کے ذہن سے ایک سرد ہوا اٹھی اور ان کا سارا جسم اس کی لپیٹ میں آتا چلا گیا۔ ان کو سردی لگنے لگی۔ انہوں نے جلدی سے کھڑکیاں بند کر دیں مگر سرد ہوا کھڑکیوں سے تو نہ آ رہی تھی۔ ان کو گرد و پیش میں صرف رابعہ کا جسم ہی گرمی کا منبع نظر آیا۔ انہوں نے جھک کر رابعہ کی گردن اور کمر میں ایک بازو اور دوسرا اس کی رانوں کے نیچے دے کر اس کو گود میں اٹھا لیا۔ رابعہ کے جسم میں ذرا سی جنبش ہوئی اور اس نے ایک آہ کے ساتھ ان کی گردن میں بانہیں ڈال ان کے شانے پر سر رکھ دیا۔ وہ اس کو گود میں اٹھائے سونے اور سنگار کے کمرے میں لے گئے اور کمرے کے درمیان پہنچ کر سوچ

میں کھو گئے۔ رابعہ کا جسم ان کی گود میں ہلکا ہو گیا اور رابعہ ان کی گود سے نیچے اترنے کی کوشش کرنے لگی۔ انہوں نے اس کو سنگار میز کی گدی دار چوکی پر جا بٹھایا۔ رابعہ نے ان کو آئینے میں دیکھا کہ سوچ میں کھوئے ہوئے ہیں۔ اس نے ان سے کہا: ''دیکھئے ہمارا ساماں کمرے میں ہے؟ اس میں میرا گہرے بھورے رنگ کا شب خوابی کا جوڑا تو نکال لائیں؟''

وہ چونکے، انہوں نے ادھر ادھر دیکھا۔ پلنگ کی پائنتی جو تین الماریاں تھیں اس کے دائیں ان کے چمڑے کے صندوق رکھے تھے۔ وہ صندوقوں کے پاس گئے، ان کو کھولا تو خالی پایا۔ پھر انہوں نے الماریوں کو دیکھا تو ان میں ان کے کپڑے سلیقے سے یا تو لٹک رہے تھے یا الماریوں میں لگے ہوئے تختوں پر رکھے تھے۔ رابعہ کے شب خوابی کے جوڑوں میں سے گہرے بھورے رنگ کا ریشمی جوڑا نکال لیا اور اس کے پاس لے گئے۔ اس نے بیٹھے بیٹھے ایک مستی کے عالم میں ان سے جوڑا لے لیا اور کپڑے بدلنے لگی۔ اس کو دیکھتے دیکھتے ان کا دل ڈوبنے لگا اور وہ غسل خانے میں چلے گئے۔ سرد پانی کا نل کھول کر منہ پر چھپکے مارے، منہ پر صابن لگا کر منہ صاف کیا، کلی کی، مگر دل کا ڈوبنا نہ رکا۔ وہ واپس کمرے میں لوٹ آئے۔ رابعہ آئینے کے سامنے چوکی پر بے لباس بیٹھی اپنے عکس کے نظارے میں یا اپنے آپ میں، وہ فیصلہ نہ کر سکے، کھوئی بیٹھی تھی۔ اس کا جسم اندھیری رات میں ایک ویران میدان میں ایک الاؤ کی صورت دہک رہا تھا۔ ان کا دل ان کے سینے میں بلیوں اچھل گیا اور پھر ایک دم ڈوبتا چلا گیا اور وہ لڑکھڑاتے ہوئے پلنگ کی طرف بڑھے۔ رابعہ نے ان کو لڑکھڑاتے ہوئے دیکھا تو وہ جلدی سے اٹھ کر ان کی طرف لپکی۔ وہ پلنگ پر اوندھے گر پڑے، ان کی ٹانگیں پلنگ سے نیچے لٹک رہی تھیں، ان کے پاؤں فرش پر تھے۔ اس نے ان کی ٹانگوں کو اٹھا پلنگ پر رکھا، ان کو پلنگ پر سیدھا لٹا دیا، ان کی بغلوں میں ہاتھ ڈال کر ان کو کمر سے اٹھا کر ان کا سر تکیے پر رکھا۔ اس نے ان کو کمر کے نیچے بازو دے کر اٹھایا، ان کا کوٹ، واسکٹ، ان کی قمیص اور ان کی بنیان اتار ڈالی۔ پتلون کے بٹن کھولے، پتلون کھینچ کر اتار دی۔ پھر اس نے جلدی سے پائنتی سے پلنگ پوش اٹھا کر لحاف نکالا، پلنگ پوش کو پھر پائنتی پر ٹھیک کر کے ڈال دیا، پائنتی پر لحاف کو کھول کر ڈالا اور ان کی طرف دیکھا۔ وہ بے

سدھ پڑے تھے جیسے کہ ابھی ابھی ان کو صلیب سے اتارا گیا ہو۔اس کا دل آنسو بن کر اس کے گلے میں اٹک گیا اور اس نے لحاف کو اوپر کے کونے سے کھینچ کر ان کے بے بس بدن پر ڈال دیا۔لحاف ان پر ڈال کر وہ پلنگ کی پٹی پر پاؤں کے بل بیٹھ گئی اور ان کے بدن کی ہاتھوں سے مالش کرنے لگی۔انہوں نے آہ بھری،اس کی طرف دیکھا،ان کی آنکھوں میں آنسو تھے۔اس کی آنکھوں میں آنسو تیرنے لگے۔وہ مالش کرتی رہی۔ان کے بدن نے ایک جھرجھری لی اور کانپنے لگے۔انہوں نے اس سے کہا:

''مجھے سردی لگ رہی ہے،نا قابل برداشت سردی،ایک اور لحاف یا کمبل ہو تو مجھ پر ڈال دو۔''

اس نے ادھر ادھر نظر دوڑائی۔کہیں فالتو لحاف یا کمبل نظر نہ آیا۔اس نے لحاف اٹھایا اور اس میں داخل ہوگئی۔کچھ دیر وہ ان کے ساتھ چپ چاپ پڑی رہی۔مگر اس کے جسم کا قرب بھی ان کا کانپنا بند نہ کرسکا۔اور وہ کانپتے ہوئے بولے:

''سردی بہت لگ رہی ہے......''

رابعہ پہلو کے بل مڑی،اپنا بوجھ ان کے سینے پر ڈال ان کے ہونٹوں کو اپنے ہونٹوں سے چھپا لیا اور اپنے جسم کی ساری طاقت سے ایک طویل بوسہ لیا۔اس طویل بوسے سے ان کے جسم میں سوئی گرمی اور پنہاں طاقت ان کے سینے کی طرف بڑی تیزی سے،بڑی شدت سے بڑھنے لگی۔ان کے سینے میں ایک بھٹی سی روشن ہوگئی۔سینے کی گرمی سے ان کے حواس جلنے لگے،ان کا دم گھٹنے لگا اور ان کے جسم میں اس طرح کی حرکت پیدا ہونے لگی جیسے وہ اپنے آپ کو اس کے ہونٹوں سے علیحدہ کر لینا چاہتے ہیں۔اس نے ان کے ہونٹوں سے ہونٹ ہٹا لیے اور ان کے رخساروں،ان کی گردن،ان کے شانوں،ان کے سینے کو چومتی ان کے پیٹ کی طرف بڑھنے لگی۔ان کے سینے کی گرمی اس کے جسم میں رچنے لگی۔ان کی طاقت جو بیدار ہوگئی تھی اب ان کے اعضا میں مچلنے لگی۔ان کے بازوؤں میں،ان کے ہاتھوں میں بیتاب ہونے لگی۔ان کے ہاتھ اس کو محسوس کرنے کے لیے بے تاب ہو گئے۔انہوں نے دونوں ہاتھوں سے اس کے سر،اس کے ریشمی بالوں،اس کے رخساروں،اس

کے شانوں، اس کی بانہوں، اس کی کمر کو سہلانا شروع کیا۔ اس سے اس کے جسم میں ایک تشنج سا آ گیا اور اس کے ہونٹ ان کے پیٹ سے رینگتے ہوئے ان کے ہونٹوں پر واپس آ کر جم گئے۔ ان کے ہاتھ اس کی کمر، اس کے پہلوؤں، اس کے سرین کو جانگیے پر سے سہلاتے ہوئے اس کے پیٹ پر جا پہنچے اور اس کے پیٹ کی ریشمی جلد کو سہلاتے ہوئے وہ اس کے سینے کی طرف بڑھنے لگے۔ انہوں نے بائیں پہلو کے بل ہو کر اس کو اپنے جسم سے آہستہ سے پھسلا دیا اور وہ پلنگ پر آ رہی اور دائیں ہاتھ سے اس کے پستانوں کو سہلانے لگے۔ ان کی سر بلندی اور ان کا غرور اور ان کی لچک اور ان کی سختی اور ان کی ملائمت ابھی برقرار تھی، ان میں برق اب بھی دوڑ رہی تھی۔ ان کے ہونٹ اس کے ہونٹوں سے ہجرت کرتے ہوئے اس کی گردن کو سہلاتے ہوئے، اس کے پستانوں کو سہلانے لگے۔ ان کی ملائم، لچک دار مگر سخت سطح پر ان کے ہونٹ بے تاب ہو ہو گئے، مچل مچل گئے۔ اس کے بدن سے اٹھتی ہوئی باس ان کے نتھنوں میں بس گئی، اس کے پستانوں کا نمکین سا، مچلتا ہوا، ذائقہ ان کے ہونٹوں، ان کی زبان کے رستے ان کے خون میں رچ گیا، اس کے جسم میں دوڑتی ہوئی برقی لہریں، ان کے ہاتھوں، ان کے بائیں پہلو، ان کی رانوں کی راہ سے ان کے تن بدن میں دوڑنے لگیں۔ ان کے شور کی گرمی ان کے لیے ناقابلِ برداشت ہونے لگی، رابعہ کے جسم کی تحریک سے ان کے دل اور ذہن پر ایک ہیبت چھانے لگی مگر یہ ہیبت رابعہ کے جسم سے ملنے والے کیف اور مستی اور حظ کے نشے کو کم نہ کر سکی، ان پر نہ چھا سکی اور نہ ہی ان میں گھل مل سکی، بلکہ ان میں ایک کشمکش پیدا ہوئی جو تصادم کی شکل اختیار کرتی چلی گئی۔ وہ اپنے آپ کو اس میں مدغم کر دینا چاہتے تھے، اپنے آپ کو بھلا دینا چاہتے تھے، وہ اس میں ڈوب جانا چاہتے تھے تاکہ دوئی اور غیریت کا احساس مٹ جائے وہ اپنے جسم کے حواس کے احساس کی شدت، اس کے جسم کی تمام تر غیریت کے احساس کو ایک ایسی وحدت میں ڈھال دینا چاہتے تھے جس میں کشمکش نہ ہو، جس میں تصادم نہ ہو، جس میں زندگی اور موت کا امتیاز نہ ہو، جس میں بیخودی کا ایک بے آفاق اور بے منزل سمندر وجد میں رقصاں ہو۔

ان کے ہاتھ اس کے جانگیے کو اس کے سرین پر سے ڈھلکانے کے لیے کوشاں

ہو گئے، بے تاب ہو گئے، انہوں نے لحاف میں بیٹھ کر اس کا جانگیہ اس کی رانوں، اس کی پنڈلیوں، اس کے پاؤں سے علیحدہ کر دیا اور اس کے تلوؤں، اس کی پنڈلیوں، اس کی رانوں کی بیرونی اور اندرونی جلد، اس کے پیڑو، اس کے پیٹ اور اس کے پستانوں کو ہاتھوں سے سہلاتے ہوئے، منہ میں ڈالتے ہوئے، انہوں نے اپنے دونوں ہاتھ اس کی بغلوں کے نیچے سے اس کی کمر میں ڈال اس کی پیشانی، اس کی آنکھوں، اس کی ناک، اس کے رخساروں، اس کی گردن کو اس کے شانوں، اس کے پستانوں کو ہونٹوں سے مسلتے ہوئے، اپنی دائیں ٹانگ اس کی ٹانگوں میں ڈالتے ہوئے وہ اس کو پلنگ پر کمر کے بل لٹانے میں کوشاں ہو گئے۔ مگر رابعہ درد بھری آواز میں پکار اٹھی! ''آپ کا لمس، آپ کی آرزو، آپ کی حدت، آپ کا بدن، مجھے اجنبی معلوم ہوتے ہیں۔ مجھ سے اجنبی نہ رہیے، مجھے اپنے آپ سے، اپنے جسم سے اچھی طرح آشنا ہو جانے دیجئے، اپنے لمس کو میرے خون کی حدت بن جانے دیجئے، اپنی آرزوؤں کو میری آرزو بن جانے دیجئے، تب اور صرف تب ہی یہ غیریت وحدت میں ڈھل سکے گی۔''

''مگر میں برسوں، صدیوں، قرنوں کے بعد ایک بار پھر اپنے آپ کو جوان محسوس کر رہا ہوں، میں نے اپنے ماضی کے ایک ایک لمحے پر تمہاری مہریں لگا دی ہیں۔ میرے لیے اب تم کسی کا عکس نہیں، کسی کا روپ نہیں، تم میرے لیے صرف ''تم'' ہو اور میں اپنی ''میں'' اور تمہاری ''تم'' میں کوئی فرق نہیں رکھنا چاہتا۔ آؤ میں ''میں'' نہ رہوں اور تو ''تو'' نہ رہے، ایک ہو جائیں، جیتے جی مر جائیں اور امر ہو جائیں۔''

''اس کے لیے ایک طویل فرصت چاہیے اور جسم، حواس، جذبات، ذہن اور تخیل میں ایک گہری آشنائی اور ہمہ گیر دوستی جو ابھی اس لمحے ہم میں نہیں۔ آیئے ایک دوسرے میں سو جائیں، اپنے جسموں، ذہنوں، جذبوں، تخیلوں کو موقع دیں کہ وہ اس عرصے میں دوستی کی تمام منزلیں طے کر لیں۔''

یہ کہہ کر رابعہ ان کی گردن میں بانہیں ڈال، ان کی بغل میں منہ دے کر آنکھیں موند سو گئی۔ ان کی ''میں'' میں جو کشمکش تھی وہ اس کے تنفس کی لے میں تحلیل ہو گئی اور ان کا جسم

اس کے جسم سے ہم آہنگ ہو گیا۔ اس کی کمر میں دونوں ہاتھ دے کر اس کو سینے سے لگا اس کی کمر، اس کے پہلو اور اس کے سرین کو سہلاتے سہلاتے وہ حظ میں ڈوبتے چلے گئے، ڈوب گئے۔

وہ دونوں گہری، بے خواب، نیند سو گئے۔ سارا کمرا ان کے تنفس کی لے سے پیدا ہونے والی موسیقی سے بھر گیا۔ موسیقی کی لہروں نے چھت میں کرسی دار روشندانوں سے چھن چھن کر اترتی ہوئی کرنوں کو اپنے سینے پر جھولانا شروع کیا۔ چاندنی آہستہ آہستہ کمرے میں اترتی چلی گئی۔ کمرے کا جنوبی حصہ آہستہ آہستہ روشن ہوتا چلا گیا۔ چاندنی پلنگ کی پٹی پر چڑھ گئی اور ان کے چہروں کے آس پاس رک گئی، شاید سانس روکے فیصلہ کر رہی تھی کہ وہ سوئے ہوئے محبوبوں کے چہروں پر سوئے وجد اور مستی کی تاب لا سکے گی کہ نہیں۔ چاندنی نے جرأت کی اور ان کے چہروں پر جھک گئی۔ ان کے چہروں پر کیف و مستی کو بے لباس ہوتے دیکھ کر چاندنی شرما گئی اور ان کی طرف سے منہ موڑ آہستہ آہستہ پلنگ کی پٹی کی طرف رینگنے لگی مگر مارے شرم کے اس میں رینگنے کی بھی سکت نہ تھی، چاندنی رینگتی چلی گئی۔ پٹی پر پہنچ کر ستائی اور پھر پٹی سے بے سدھ ہو کر فرش پر گر گئی۔

رابعہ شاید چاندنی کے پلنگ کی پٹی سے گرنے کی آواز سے چونک گئی۔ اس نے آنکھیں کھول دیں۔ ان کو دیکھا اپنے جسم کو ان کے جسم میں غلطاں دیکھا اور وہ لمحے بھر کے لیے اپنے اور ان کے جسم میں تمیز نہ کر سکی، اس کا لمس ان کے اور اپنے جسم کی حدود کا اندازہ نہ کر سکا۔ اس نے کن انکھیوں سے چاندنی کو پسپا ہوتے دیکھا۔ اس چاندنی کی پسپائی سے اس کو ایک اور چاندنی کی پسپائی کی ایک رات یاد آ گئی۔

جب وہ پہلی بار اپنے محل میں اپنے کمرے میں سوئی تھی تو اس رات چودھویں کا چاند تھا۔ اس رات محل میں محل کو آباد کرنے کی خوشی میں دعوت تھی۔ محل کے وسیع و عریض صحن میں رقص و سرود کی محفل دیر تک رہی۔ آدھی رات کے بعد جب ایک ایک کر کے اس نے مہمانوں کو رخصت کر دیا تو وہ، نادرہ اور خورشید منظر محل کے صحن کے بلند دروازے پر اکیلے رہ گئے۔ ان سے دور مغربی شمالی حصے میں وسیع و عریض خیموں میں سامان اٹھاتے ہوئے

نوکر چاکر اپنے اپنے کاموں میں مصروف تھے۔ صحن کے مغربی حصے میں جو گلزار تھا اس میں پھول آنکھیں کھول کھول کر، انگڑائیاں لیتے ہوئے، بیدار ہو رہے تھے، ان کے تنفس سے پیدا ہونے والی خوشبو صحن میں پھیل رہی تھی۔ چاندنی میں پھولوں کے سائے لہرا رہے تھے، پچھلے پہر کی ہوا چلنے لگی تھی۔

اس نے محسوس کیا کہ اس کی طرح پھول بھی ہم جنسوں کی محفل میں تنہا تھے۔ پھولوں کی تنہائی کے تصور نے اس کی اپنی تنہائی کے احساس میں ایک عجیب طرح کی وسعت، بے کرانی پیدا کر دی، جس کا اس کے ساتھیوں کو بھی احساس ہوا۔ شاید اسی لیے وہ اس سے رخصت چاہے بغیر دروازے سے نکل اس کی نظروں سے اوجھل ہو گئے۔ کار چلنے کی آواز بھی اس کی تنہائی کے سکوت کو توڑ نہ سکی۔ نادرہ اور خورشید منظر کو کار میں ہاتھ ہلا ہلا کر الوداع کیا۔ اس کی آنکھوں نے دیکھا کہ محل کی ساخت، اس کی آرائش، اس کے کمروں میں چاندنی اور سایوں، روشنی اور سایوں سے پیدا ہونے والے امتزاج میں خورشید منظر نے جو طلسم باندھا ہے اس کی فضا میں رچے ہوئے جادو سے اپنے آپ کو کیسے محفوظ رکھ سکے گی؟ کیا اپنے آپ کو محفوظ رکھنا ضروری بھی ہے؟ وہ فیصلہ نہ کر سکی۔ وہ بلند دروازے سے ہٹ کر صحن کی طرف مڑی تو مغربی دیوار کے ساتھ پھیلے ہوئے گلزار میں پھولوں کی انجمن کو دیکھ کر حیران رہ گئی۔ اس نے محسوس کیا کہ جیسے وہ ساری انجمن اس کو غور سے دیکھ رہی ہے، اس کے چہرے پر ہویدا کیفیات کی راہ سے اس کے دل میں جھانکنے کی کوشش کر رہی ہے۔ ان کی خوشبو نے اس کو گھیر لیا، اس کے گرد ایک حصار باندھ دیا اور اس کو کشاں کشاں اپنی محفل میں لے گئی۔ اس کو اپنی محفل میں دیکھ کر پھول خوشی میں جھوم جھوم کر گانے لگے مگر وہ ان کی بولی کو نہ سمجھ سکی۔ مگر ان کی خوش آمدید سے اس کا دل احسان کی گرمی سے پسیج گیا اور اس نے ایک ایک پھول کے رخساروں کو تھپکا۔ وہ ایک ایک پھول کو تھپکتے ہوئے ایک ایسے پھول کے پاس جا نکلی جو فوارے کے حوض میں حوض کی دیوار کے ساتھ لگ کر اکیلا کھڑا گردن اٹھائے اس کو اپنی طرف بلا رہا تھا۔ اس نے جھک کر اس کا براق سا منہ چوم لیا۔ اس نے اس پھول کے منہ سے جو منہ اٹھایا تو اس نے دیکھا کہ سب پھول اداس کھڑے اس کو اس طرح دیکھتے

ہیں، جیسے شکایت کر رہے ہوں کہ اس پھول پر اتنا پیار کیوں؟ اس نے لاکھ کہا کہ وہ بھی میری طرح تنہا ہے مگر ان کے چہروں سے اداسی نہ گئی۔ اس نے ان کو غور سے دیکھا تو اس نے محسوس کیا کہ وہ کہہ رہے ہیں کہ ہر پھول اپنے آپ میں تنہا ہے، تنہائی میں اگتا ہے، تنہائی میں جوان ہوتا ہے، کھلتا ہے، خوشبو کو ہجرت کے سفر پر روانہ کرتا ہے اور تنہائی میں مرجھا جاتا ہے، بکھر جاتا ہے۔ اس نے پھول پھول کو سینے سے لگایا، ان کا منہ چوم چوم لیا۔ جب آخری پھول کو چوم کر سیدھی کھڑی ہوئی تو اس نے دیکھا کہ مغربی دیوار کے زیریں حصے پر اندھیرا چڑھ رہا ہے۔ اس نے کمر کو سیدھا کیا، ایک انگڑائی لی اور اس کے پپوٹوں پر نیند کا بوجھ بڑھنے لگا۔ اس نے محل کی عمارت کا رخ کیا تو اس نے دیکھا کہ نادرہ بلند دروازے میں کھڑی اس کو دیکھ رہی ہے۔ اس کو محل کی عمارت کی طرف بڑھتے دیکھ وہ دروازے سے بھاگ کر اس کی طرف لپکی۔ اس کے قریب پہنچ کر وہ اس کے قدموں میں بیٹھ گئی اور اس کی پنڈلیوں سے بغلگیر ہو کر، اس کی رانوں میں منہ دے کر سسکنے لگی۔ وہ حیران ہو گئی کہ آخر ماجرا کیا ہے۔

''مجھے معاف کر دیجئے! معاف کر دیجئے!''

''کس لئے؟ تم نے کیا کیا ہے؟''

''میں آپ کو تنہا چھوڑ کر خورشید منظر کو گھر تک چھوڑنے چلی گئی تھی۔''

''مجھ سے زیادہ ساتھی کی اس کو ضرورت تھی۔ اس کا تو سب کچھ یہاں ہے۔ وہ سب کچھ چھوڑ کر جا رہا تھا۔ اس کو ہمدرد دوست کے قرب کی سخت ضرورت تھی۔ میرے پاس یہ پھول تھے، ان کی خوشبو تھی، چاندنی کا حسن تھا، گیت بنتی ہوئی ہوا کا لمس تھا۔''

''نہیں! نہیں! مجھے یہاں سے نہ جانا چاہیے تھا۔ میں نے غداری کی ہے۔ مجھے سزا ملنی چاہیے، کڑی سزا......''

''ہاں، تمہیں سزا ملنی چاہیے۔ ضرور ملے گی تمہیں سزا۔ ابھی، اسی لمحے......اٹھو! تمہیں سزا دوں۔''

نادرہ اپنے دونوں کولہوں پر ہاتھ جما کر اس کے سامنے مجرم کی طرح سر نیہوڑائے کھڑی ہو گئی۔ اس نے اس کے شانوں پر ہاتھ سختی سے جما دیئے جیسے وہ اس کو پکڑ کر پھول کی

طرح مسل ڈالے گی۔ اس کے ہاتھ اس کے شانوں سے اس کی گردن کی طرف بڑھے اور اس کی ٹھوڑی کو دائیں ہاتھ کی شہادت کی انگلی سے اوپر اٹھا کر اس کی آنسو بھری آنکھوں میں جھانکا۔ وہ ہمہ تن احساس گناہ بنی تھی۔ وہ اس کو دیکھ مسکرائی۔ نادرہ کے چہرے پر حیرانی نے انگڑائی لی۔ اس نے اس کی کمر میں بانہیں ڈال کر اس کو سینے سے لگا لیا، اس کا منہ چوما، اس کے رخسار، اس کی گردن چومی اور دونوں ہاتھوں سے اس کے سرین، اس کی کمر، اس کے کولہوں، اس کے شانوں، اس کے پستانوں کو اس طرح سے سہلایا کہ جیسے وہ کمہار کے گھومتے ہوئے پہیے پر چڑھی گیلی مٹی ہو اور وہ اس مٹی کو مورت عطا کر رہی ہو۔ نادرہ کانپنے لگی۔ اس نے ہاتھوں کو اس کے جسم سے ہٹا لیا اور اس کے شانے پر سر رکھ کر بولی:

''اب تم مجھے میرے سونے کے کمرے میں لے چلو۔ یہی تمہاری سزا ہے۔'' نادرہ اس کو اپنے جسم کا سہارا دیئے محل کی خودحرکی لفٹ میں چڑھی، چوتھی منزل پر اتار کر اس کو ایک لمبی روشن غار نما گلی کے آخری حصے میں جو عین مغرب میں تھا، لے گئی۔ اس حصے میں اس کے بیٹھنے، سونے، سنگار، مطالعے اور موسیقی کے کمرے تھے۔ ان کمروں کے ساتھ، بلکہ ان کے پیچھے ایک ننھا سا ماڈرن باورچی خانہ، غسل خانہ اور پاخانہ تھا۔ یہ حصہ عمارت کے اکثر حصوں کی طرح رہائش کے لیے خودکفیل تھا۔

نادرہ نے کمرے کے باہر ہی اس کو الوداع کہنا چاہا مگر اس نے اسے جانے نہ دیا۔ اس کا دل چاہتا تھا کہ اس رات کوئی اس کے ساتھ رہے تاکہ وہ اپنے کمروں سے مکانی، جمالیاتی اور روحانی طور پر نہ صرف آشنا ہی ہو جائے بلکہ ان کو تسخیر بھی کرے۔ اس لیے اس نے نادرہ کو رخصت نہ ہونے دیا۔ دونوں کمرے میں داخل ہو گئیں۔ اس نے کمرے میں کچھ گھٹن سی محسوس کی۔ اگرچہ اس کو شعور تھا کہ گھٹن کمرے کی فضا میں نہیں، اس کی اندرونی فضا میں ہے۔ اس نے نادرہ کو کہا کہ وہ اس کے کمرے کی جنوب مغربی اور شمال مشرقی کھڑکیاں کھول دے۔ کمرے میں تازہ ہوا کی آمدورفت سے اس کی طلسمی کیفیت میں حقیقت کا داخلہ ہو گیا اور وہ فراخی کے احساس میں مطمئن ہو کر سانس لینے لگی۔ کمرے میں سیب کے سے رنگوں کے روغن دیوار پر چڑھے تھے۔ اسی طرح کے پردے دروازوں اور

کھڑکیوں پر پڑے تھے۔ کمرے کی چھت کے شیشے بھی ویسے ہی رنگوں کے تھے۔ چھت اور چھت کے شیشوں کے درمیان سبز اور نیلی اور دھیمی سفید روشنی دینے والے قمقمے لگے تھے جس سے آدھے چاند کی روشنی میں نظر آنے والے سمندر کا منظر نظر آتا تھا۔ کمرے میں سیب کے سے رنگوں کے ریشمی کپڑے چڑھے صوفے رکھے تھے، پست قد میزوں پر ان رنگوں کے پھول گلدانوں میں سجے تھے۔ دیواروں پر دوفی (Dufy) کی آبی رنگوں کی دو اصلی تصویریں اور تین چار کارڈ بورڈ کی تجریدی صورتیں نصب تھیں جن پر سیب کے رنگوں ایسے روغن چڑھے تھے۔ صوفے پر نیم دراز ہوتے ہی اس نے نادرہ سے نہایت پیار کے لہجے میں کہا کہ وہ رسوئی میں سے اپنے لئے اور اس کے لیے کوئی نیم سرد سا شربت یا مشروب لے آئے۔ اس کے کمرے سے نکل جانے کے بعد وہ آنکھیں موند کر صوفے پر آرام سے لیٹ گئی۔ کچھ دیر میں ایک ہلکے سے ارتعاش کی آواز نے اس کو غنودگی سے بیدار کر دیا اور وہ اٹھ کر صوفے میں نیم دراز بیٹھ گئی اور نادرہ کا انتظار کرنے لگی۔ نادرہ ایک پہیوں والی کشتی میں ایک بلوریں موتی کے رنگ میں گردن تک بھری صراحی اور اس کے ساتھ اسی رنگ کے، اسی قطع کے، پیالہ نما سے گلاس لے آئی۔ اس نے دو گلاسوں میں رس انڈیلا، ایک اس کو دیا اور دوسرا کشتی میں رہنے دیا۔ اس نے اس رس کو آہستہ آہستہ گلے میں اتارنا شروع کیا۔ انناس کے رس نے اس کے گلے سے اترتے ہی اس کے اندر کی فضا کو بدل دیا۔ بھیگی برسات کے بعد شرد کا موسم آ گیا۔ آسمان بلور کی طرح دمکنے لگا، فضا میں دور دور تک شفاف پن، ایک امن، ایک سکون آ گیا، تخیل کے ثمروں میں رس آنے لگا، خوشبو پڑنے لگی، وہ خورشید منظر کے جمالیاتی جہاں میں بے خطر سانس لینے، اس میں رہنے کے لیے تیار ہو گئی۔ اس نے پاس بیٹھی ہوئی نادرہ کو دیکھا۔ وہ شرد کے آسمان میں نہائی ہوئی، دمکتی ہوئی زہرہ معلوم ہو رہی تھی۔ اپنی طرف اس کو دیکھتے ہوئے دیکھ کر وہ مسکرا دی۔ شرد میں بہار کا ایک پھول کھل گیا۔ اس نے حیرت سے اس کے چہرے پر مسکراہٹ کے نور کو پھیلتے دیکھا۔ نادرہ کے جسم کے رنگ و روغن میں، اس کی شخصیت میں ایک نیا وجد تھا، اس کے روشن ماتھے اور دمکتی آنکھوں میں ایک گیان کی کیفیت آ گئی تھی۔ نادرہ شرد کی مورت بنی تھی۔ اس کے روپ میں، اس کے سروپ میں، اس کے انگ انگ میں، اس کے ابھینایوں، اس کے نینوں میں

روغن کی طرح دمکتے نیر میں انتہائی شستگی کا، وضاحت کا، ایک شفاف گہرائی کا نکھار جس سے وہ بہت ہی متاثر ہوئی اور اس کے اپنے جذبات اور خیالات کے فساد میں نکھار آ گیا اور اس کو اپنے جذبات اور خیالات اپنی شخصیت کا انوکھا سنگار معلوم دیئے۔

نادرہ اس کو زرتشت کے پیشرو عہد کی ایک دیوی معلوم ہو رہی تھی۔ اس کو یاد آیا کہ نادرہ کے اجداد زرتشت کی جائے پیدائش سے ہجرت کرتے ہوئے اس کے شہر میں آ کر آباد ہوئے تھے۔ اس نے سوچا شاید نادرہ کو کوئی زرتشتی گیت یاد ہو اور اس کی زرتشتی گت بھی۔ اس کا ذہن ہچکچایا کہ اس سے اس قسم کے علمی و جمالیاتی تبحر کی توقع کرنا ایک قسم کی زیادتی تھی، توہین کرنے کی آرزو تھی، چھوٹا محسوس کرانے کا حیلہ تھی۔ اس کو اپنی نیت پر شک کا گمان ہونے پر تعجب ہوا۔ اس کا دل کہتا تھا کہ اس کی آرزو پوری ہو سکتی ہے اور اس کی فرمائش کو پورا کرتے ہوئے نادرہ کو بھی بہت راحت اور خوشی ہوگی اور اس کی شخصیت کو استقامت ملے گی۔ اس نے آخر فیصلہ کر ہی لیا کہ وہ نادرہ سے فرمائش کرے۔

''نادرہ! تم کوئی زرتشتی گیت اصل زبان اور اصل گت میں جانتی ہو؟ نہ جانے کیوں میرا دل کہتا ہے کہ تم سے ایسی توقع کی جا سکتی ہے۔ تمہی نے تو شاید ایک بار مجھے بتایا تھا کہ تمہارے اجداد اس گاؤں کے تھے جہاں زرتشت نے جنم پایا تھا اور تمہارے اجداد صدیوں تک زرتشتی موبد رہے۔''

''جی ہاں! یہ گیت میرے اجداد کا مقدس ترین ورثہ ہیں۔ ہم نسل بہ نسل اس کو اپنی اولاد کو صحیح و سالم منتقل کرتے رہتے ہیں۔ میرے اجداد نے طلوعِ اسلام کو جب قبول کیا تو اس میں اپنے ورثہ کی اصل کو جاگزیں پایا۔ ان کے لیے نیا دین پرانے دین کی تجدید تھا، نئے زمانے بلکہ نئے عہد کی روحانی، معاشرتی، کائناتی اور جمالیاتی ضرورتوں کے مطابق پرانے دین کی روح کی قلبِ ہیئت تھی۔ وہ نئے دین کو قبول کرنے کے باوجود اپنے جدی ورثے کو کھونے، بھلانے کے لیے کبھی بھی تیار نہیں ہوئے۔

معاف کیجئے میں کیا داستان لے بیٹھی۔ اگر آپ نے واقعی گیت سننے ہیں تو آپ نہالیں، کپڑے بدل لیں اور میں بھی نہا کر، کپڑے بدل کر آتی ہوں...... میں دیر نہیں

لگاؤں گی۔''

نادرہ اٹھ کر چلی گئی۔ وہ بھی اپنے سنگار کمرے میں گئی اور کپڑے بدل کر نہانے کی تیاری کرنے لگی۔ اس کمرے کی شمال مغربی کھڑکیاں ایک گلی میں کھلتی تھیں اور وہ گلی دور تک چلی گئی تھی۔ کئی گلیاں اس گلی میں کھلتی تھیں اور اس کی دیواروں میں جا بجا دبیز مگر شفاف شیشے لگے تھے تا کہ روشنی اور چاندنی اس گلی میں کھلنے والی کھڑکیوں اور دروازوں میں داخل ہو سکیں۔

وہ آئینے کے سامنے بیٹھی تھی کہ آئینے میں سے اس نے دیکھا کہ چاندنی مغربی کھڑکیوں میں سے داخل ہوئی ہے۔ چاندنی کمرے میں پھیلنے لگی۔ کھڑکیوں کے شیشوں پر سے بھی چاندنی منعکس ہو ہو کر ان حصوں میں پھیل رہی تھی جہاں چاندنی کا براہ راست گزر نہ تھا۔ وہ آئینے کے سامنے سے اٹھی اور غسل خانے میں داخل ہو گئی۔ غسل خانے کی چھت آدھے حصے میں دبیز شیشے کی تھی جس سے روشنی اور چاندنی تو چھن کر آ سکتی ہے مگر گرمی کا دخل نہ ہو سکتا تھا۔ چھت کے ایک ننھے سے حصے میں ایک سوراخ تھا جو روشندان بھی تھا اور آسمان کو دیکھنے کی ایک کھڑکی بھی۔ اس روشندان نما کھڑکی کے عین نیچے ایک مستطیل پستہ قد روغنی مٹی کی سلوں سے بنے ہوئے گملے میں بیل نما پھول لگے تھے۔ غسل خانے کا فرش اور دیواریں قرمزی، نیلی اور گہری سبز اینٹوں سے چنی تھیں جس سے سنگلاخ فضا میں زندگی کا ایک جہان آباد ہو گیا تھا۔ فنکار نے غسل خانے کو گلزار اور نگار خانے کا حسین نامیہ بنا دیا تھا۔ اس کے دل میں احسان مندی کے گہرے جذبات ابھر آئے اور اس نے خورشید منظر کو دعا دی۔ اس نے جلدی جلدی بدن پر پانی گرایا، صابن لگایا، جسم کو صاف کیا۔ بالوں میں شیمپو کیا اور ان کو دھو ڈالا۔ وہ نہ چاہتی تھی کہ کسی قسم کی کثافت اس کے جسم پر رہے۔ نہا دھو کر اس نے ایک بسنتی زربفتی ساڑھی اور چولی اور اسی رنگ کا زیر جامہ نکال کر زیب تن کیا۔ کپڑوں پر عطر لگایا۔ کمرے میں پڑی ہوئی بوٹے قد کی میز پر پڑے ہوئے گلدان میں سے ایک سفید پھول توڑ کر بالوں میں لگایا۔ اس نے بالوں کے نیچے ایک بسنتی ریشمی رومال کندھوں پر ڈال لیا تا کہ اس کے کپڑے تر نہ ہو جائیں۔ اس کے بعد وہ وہاں سے اٹھ کر موسیقی کے کمرے

میں آ کر نادرہ کی راہ دیکھنے لگی۔ کمرے کی بند شمال مغربی کھڑکیوں اوران کے ساتھ کے دروازے کے شیشے چاندنی سے دمک رہے تھے۔اس نے اٹھ کر کھڑکیاں کھول دیں، دروازہ وا کر دیا۔ باہر گلی میں بہار کی ہلکی ہلکی ہوا چل رہی تھی۔ دروازے اور کھڑکیوں کے ہلکے آبی سبز رنگ کے پردے ہوا سے لہرانے لگے۔اس کی آنکھیں اس دروازے پر لگیں تھیں جس سے وہ خود سنگار کی ساتھ والی گلی سے داخل ہوئی تھی۔مگر نادرہ اس دروازے سے داخل ہوئی جو شمال مغربی گلی میں کھلتا تھا۔ وہ اتنی آہستہ سے جرابیں پہنے، بغیر جوتے کے آئی کہ اس کو معلوم ہی نہ ہوا کہ وہ کب کمرے میں داخل ہوئی؟ کب اس کی کرسی کے پیچھے آ کر کھڑی ہوئی؟ اور کب وہاں سے ہٹ کر فرش پر بچھے ہوئے صوفہ نما پلنگ پر آسن جما کر بیٹھ گئی۔ وہ اس کو وہاں بیٹھے دیکھ کر لمحے بھر کے لیے چونک گئی،اس کے دل پر ہیبت سی طاری ہوگئی۔اس کی حالت کو دیکھ نادرہ مسکرائی اوراس نے دھیرے،نہایت دھیرے سے الحان شروع کیا یہ سرگوشی کرتا ہوا الحان پہلے لفظ سے اس کے تن بدن میں رچنے لگا۔ نادرہ سفید ریشمی تہبند نما لبادے میں اپنی ٹانگوں کو لپیٹے اورایک انوکھے انداز کی چولی میں سینے کو چھپائے ہوئے تھی۔ اس کے سر پرسفید ریشمی چادر تھی جس میں اس کا سر،اس کی گردن اور شانے چھپے تھے،صرف چہرہ اور پائنچے کھلے تھے۔

اس کا اجنبی اجنبی، عجیب عجیب، الحان آہستہ آہستہ بلند ہوتا چلا گیا مگر احساس یہی ہوتا تھا کہ وہ اب بھی سرگوشی ہی ہے۔ ایک گیت ختم ہونے کے بعد نادرہ نے دو گیت اور گائے، بلکہ یوں کہنا بہتر ہے کہ ان کا ورد کیا۔ اس کا الحان کمرے، باہر دور تک چلی جاتی ہوئی گلی میں،محل کی رگ رگ میں پھیل گیا، رچ گیا،محل کی شریانوں میں سے اتر کر اس کی بنیادوں میں سو گیا۔

نادرہ کے الحان نے اس پرایک عجب محویت کا عالم طاری کر دیا۔اس کو یاد ہی نہ رہا کہ وہ کب اس سے رخصت ہوئی۔ اس نے جب کمرے کو دیکھا تو چاندنی کمرے سے پسپا ہو چکی تھی۔ دروازے اور کھڑکیوں کے شیشوں کی آنکھوں کی چمک سے اندازہ ہوتا تھا کہ چاندنی ابھی یہاں تھی۔ وہ جلدی سے اٹھ اور دروازے سے نکل شمال مغربی گلی میں آئی۔ بل

کھاتی ہوئی گلی کی مغربی دیوار میں لگے ہوئے شفاف، دبیز، شیشے کے روشندانوں میں سے چاندنی چھن چھن کر گلی میں نیم اندھیرے کے سینے پر عجیب نقش ونگار بنا رہی تھی۔ وہ دیر تک چاندنی کی آنکھ مچولی کو دیکھتی رہی۔ آخر دور گلی کے مشرقی حصے کے آخر میں چاندنی کا ایک ریلا آیا، آہستہ آہستہ مشرقی دیوار روشن ہوئی اور پھر دھیرے دھیرے مشرقی دیوار اندھیری ہوتی چلی گئی، اندھیری ہوگئی۔ لمحے بھر کے لیے چھت کا ایک کونہ روشن ہوا اور پھر گلی میں اندھیرا ہوگیا۔ اندھیرے میں سے چھت اور چھت کے شیشے کے درمیان نصب مدھم روشنی کے قمقموں سے اندھیرا اجلا ہونے لگا۔

وہ گلی سے اپنے سونے کے کمرے میں آ گئی۔ سونے کے کمرے میں ہر شے قرمزی اور گہرے بادامی رنگ کے ایک لہریے دار امتزاج کا مظہر تھی۔ صوفوں پر انہی رنگوں کے کپڑے چڑھے تھے، دیواروں پر روغن انہی رنگوں کا تھا، چھت کے شفاف دبیز شیشوں کے پیچھے چھت پر یہی روغن چڑھا تھا اور جب چھت کے قمقمے روشن ہوتے تھے وہ روشنی بھی انہی رنگوں میں رنگ جاتی تھی۔ کمرے میں بیٹھنے اور سونے کا سب سامان پستہ قد تھا مگر اس کے باوجود، یا اس کے باوصف، وہ آج تک اس کا فیصلہ نہ کر پائی تھی، نہایت نظر فریب اور حسین معلوم ہوتا تھا۔

اس کے کمرے کی مغربی شمالی دیوار میں گلی میں باہر نکلے ہوئے ٹیڑھے سے روشندان ان روشندانوں کے بالمقابل تھے جو گلی کی مغربی دیوار میں نکالے گئے تھے۔ ان میں چاندنی کی آخری کرنیں کمرے کی مشرقی جنوبی دیواروں کے اوپر کے حصے کو منور کر رہی تھیں۔ اس کمرے کی دیواروں میں اوپر کے حصے میں پستہ قد طاقچے بنے تھے جن میں سفید مرمر کی جالیوں کے درمیانی خلاؤں کے منور شیشوں میں کانسی اور لکڑی اور پتھر کی مختلف ابھنیایوں میں رقصاں مورتیں نصب تھیں۔ لکڑی کی مورتوں پر گلابی، بسنتی، قرمزی اور گہرے سبز، جامنی رنگوں کے عجیب حسین روغن انوکھے اور انوٹھے امتزاجوں میں چڑھے تھے۔ مگر مورتیں اس ترتیب اور تناسب سے نصب تھیں کہ کمرے میں ہجوم کا احساس نہ ہوتا تھا۔ اس کے پلنگ کے سرہانے کے عین سامنے دیوار پر قرمزی اور بادامی روغنی سطح پر ایک ہلکی سی سبز

کشتی میں ایک سفید دودھ سے چمکدار رنگ کی عورت بیٹھی اور اس کا ایک پاؤں کشتی کی منڈیر سے نیچے لٹک رہا تھا اس کے پاؤں کا تلوہ سرخ تھا۔

یہ روشن اور تاریک دیواری تصویر اس کو گھنٹوں ہی لبھانے میں ہمیشہ کامیاب رہی۔ اس وقت اس دیواری تصویر پر چاندنی نہ تھی مگر پھر بھی اس کی تاریک روشنی یا اس کی روشن تاریکی اس دیوار اور اس کی مورتوں پر بھاری تھی جس پر چاندنی محوِ خرام تھی۔ چاندنی اس دیواری تصویر کو حیرانی سے تکتے تکتے دھیرے دھیرے دیوار پر سے رخصت ہو رہی تھی، پسپا ہو رہی تھی۔ اس کی آنکھوں پر غنودگی کا غلبہ بڑھنے لگا، اس کے اعضا میں ایک ڈھیلا پن آتا چلا گیا، جوں جوں کمرے میں اندھیرا بڑھتا چلا گیا اس کو محسوس ہوا کہ دیواروں کا لمس اس کے قریب ہوتا جا رہا ہے۔ مگر اس لمس سے اس کا دم نہ گھٹا بلکہ اس کو کسی حسین جسم کی حدت کا احساس ہوتا چلا گیا، اس نے محسوس کیا کہ وہ ماحول اس کا دوست، اس کا ہمدم، اس کی تنہائی کا محافظ، اس کی تنہائی کا شریک ہے۔ اس جاں فزا قرب کے احساس کی لذت میں اس کی آنکھیں مند گئیں اور وہ نیند کے ساگر کے تخت پر جھولنے لگی۔ اس کو برسوں میں پہلی بار اس رات بے خواب، گہری، فرحت بخش نیند نصیب ہوئی تھی۔

بالکل ایسی ہی جو اس کو آج جمیل صاحب کے قرب میں، ان کے جسم سے اتصال مسلسل میں، نصیب ہوئی تھی۔ اس نے سوچا کہ اب اس کو اٹھ جانا چاہیے تا کہ وہ نہا کر کھانے کے وقت سے پہلے پہلے کپڑے بدل کر تیار ہو جائے۔ اس نے اپنی رانوں کو ان کی رانوں سے جدا کیا، اپنی کمر کو ان کی بانہوں کی گرفت سے الگ کیا اور اٹھنے لگی تو جمیل صاحب نے اس کے سینے پر ہاتھ رکھ کر اس کو اٹھنے نہ دیا۔

"کچھ دیر اور لیٹی رہو میرے پاس۔ کھانے میں ابھی دیر ہے۔"

"ابھی آپ کی تسلی نہیں ہوئی؟"

"ہوتی کیسے؟ سردی ابھی بھی میری ریڑھ کی ہڈی کے کسی حصے میں کنڈلی مارے بیٹھی ہے۔ میں نے خواب میں دیکھا کہ زمین فضا میں گھوم رہی ہے۔ زمین پر برف ہی برف ہے، ہر طرف اندھیرا ہے اور اس اندھیرے میں ایک صورت اس برف کے جہاں میں اکیلی

پڑی سسک رہی ہے۔ وہ صورت جانتی ہو کون تھی۔''

''خواب آپ نے دیکھا ہے میں کیسے بتا سکتی ہوں۔نہیں! بتا سکتی ہوں۔ وہ صورت آپ ہی تھے۔ ہے نا؟''

''ہاں!''

''اس طنز کے لیے شکریہ۔ ابھی کچھ دن اور اسی برف کے جہان میں پڑے رہیے۔ انتظار کیجیے کہ آفتاب نکلے، برف پگھلے، دریا بہہ نکلیں اور آپ اس کے پانیوں میں غلطاں ہو جائیں اور ان میں سے بچ نکلنے کی کوشش میں کامیاب ہو جائیں اور ساحل پر پہنچ کر ریت میں لیٹے آفتابی غسل کرتے رہیں۔''

''اس وعدے کا شکریہ۔ میں انتظار کروں گا۔''

''اٹھیئے، اب باتیں نہ بنائیے۔ میزبان ہماری راہ تکتا ہوگا۔''

''تم اٹھو تو اٹھوں، ویسے اٹھوں کیسے؟''

''پلنگ کے دوسری طرف سے۔''

''بائیں طرف سے''

''جوانی کی عادت نہیں بھولی آپ کو؟ ادھر ہی سے اتر جائیے نا۔ اس وہم کو کب تک پرورش کرتے رہیں گے؟''

جمیل بائیں طرف سے پلنگ پر سے اتر گئے۔ انہوں نے الماری سے غسل کا تولیے کا بنا ہوا چوغہ نکال کر پہنا اور گنگناتے ہوئے غسل خانے میں داخل ہو گئے۔ رابعہ کچھ دیر لحاف میں لیٹی رہی مگر جب اس کو لحاف میں زیادہ گرمی سی لگنے لگی تو وہ لحاف کو سینے سے لگائے پلنگ میں اٹھ بیٹھی۔ پلنگ پر سے اپنا جانگیہ ڈھونڈ کر اس کو لحاف میں بیٹھے بیٹھے پہنا اور پھر آہستہ سے دونوں پیر لحاف سے نکال دئے۔ پاؤں کو خوشگوار سی ٹھنڈک نے چھوا۔ اس نے دونوں پاؤں فرش پر ٹکا دیئے اور دھیرے سے لحاف جسم سے اتار دیا، انگڑائی لی، اٹھ کھڑی ہوئی، دونوں بازوؤں کو دونوں ہاتھوں کو پھرتی سے سر سے اوپر لے گئی، اسی پھرتی سے بازو کندھوں

کے برابر کھڑے کیے اور پھر ان کو کولہوں پر رکھ لیا، دائیں ٹانگ کو کولہے کے برابر سیدھا اٹھایا، لوٹایا، دوسری ٹانگ کو اسی طرح فضا میں بلند کیا اور واپس اپنی جگہ لے آئی۔ اس ورزش کو پانچ دفعہ دہرایا۔ پھر اس نے ایک لمبا سانس لیا اور کمر کو جھکا کر، ٹانگوں میں خم لائے بغیر، پاؤں کے انگوٹھوں کو چھوا اور پھر پاؤں کو کھول کر دونوں ہاتھوں کو، بازوؤں کو رانوں کے اندر دور تک لے گئی اور پھر فرش پر دونوں ہاتھوں رکھ کر ان پر سارے بدن کا بوجھ ڈال کر دونوں ٹانگوں کو ہاتھوں سے دور لے گئی اور پھر دونوں ہاتھوں کو فرش پر جماتے ہوئے اپنے ہاتھوں کے گرداگرد اپنے جسم کو ایک چکر لگوایا اور پھر ہاتھوں کے سہارے اپنے جسم کو سکیڑ لیا اور دونوں پاؤں کو ہاتھوں کے قریب لا کر بیٹھ گئی اور پھر چند دقیقے سستا کر وہ ایک دم اٹھ کھڑی ہو گئی اس کا دل دھک دھک کر رہا تھا۔ برسوں کے بعد آج اس کا جی چاہا تھا کہ وہ اس ورزش کو کرے۔ وہ جوانی میں، شادی کے کئی سال بعد تک، یہ ورزش ہر روز سونے کے بعد اٹھتے ہی کیا کرتی تھی۔ خورشید منظر سے ملاقات کے بعد اس نے برسوں یہ ورزش نہ کی تھی۔ اس کا سینہ ابھر ڈھلک رہا تھا، اس کے پستان لرز رہے تھے۔ اس نے پستانوں کو تھپکا مگر وہ لرزتے ہی رہے۔ اس نے دونوں ہاتھ پستانوں پر رکھ دیئے۔ لرزنا کچھ دیر میں رک گیا۔ اس نے دونوں ہاتھوں سے اپنے پستانوں کی مالش کی اور پھر ان کو ہاتھوں سے مسل کر چھوڑ دیا۔ ان سے میل اتر کر اس کے ہاتھوں پر سے فرش پر گر گیا۔ اس کو یاد آیا کہ وہ کوئی ایک ہفتے سے سفر میں تھی اور بدن کو صاف کرنے کا اس کو موقع ہی نہ ملا تھا۔

اس نے آئینے کے سامنے جا کر گدی دار چوکی کے قدموں سے اپنا چاکلیٹ رنگ کا شب خوابی کا لباس اٹھا لیا اور چوکی پر بیٹھ کر پاجامہ پہن لیا اور اس کا لچکیلا کمر بند کمر پر درست کیا اور اس کے بعد اس نے کرتا بھی پہن لیا اور اس کے بٹن بند کر دیئے۔ اس نے اٹھ کر پلنگ پر سے لحاف اٹھا کر پلنگ کے کٹہرے پر رکھ کر بسنتی پلنگ پوش کی سلوٹیں ٹھیک کیں، لحاف کو تہہ کیا اور پائنتی سے پلنگ پوش اٹھا کر پائنتی پر لحاف کو رکھ کر اس کو پلنگ پوش سے ڈھک دیا۔

ادھر سے فارغ ہو کر اس نے جمیل صاحب کا سوٹ اور ان کے دوسرے کپڑے

اٹھائے سوٹ کو سلیقہ سے تہہ کیا اور دوسرے کپڑے دھلانے کے لیے علیحدہ فرش پر گرا دیئے۔ پھر الماری سے ان کے لیے سیاہ سوٹ نکالا اور اس کے ساتھ ان کی پسندیدہ قرمزی رنگ کی اطالوی ریشم کی ٹائی نکالی جس پر چاکلیٹ رنگ کی چوڑی چوڑی چار دھاریاں تھیں۔ ان کپڑوں کو اس نے مشرقی دیوار سے لگے ہوئے ایک صوفے نما پلنگ پر سلیقے سے کھول کر رکھ دیا اور اس کے ساتھ نہایت ہی ہلکے بسنتی رنگ کی اطالوی ریشم کی قمیص نکال کر اس کے پہنچوں کے سوراخوں میں سونے کے بٹن لگائے۔ ان کے ساتھ فرش پر ان کا کالا جوتا اور قرمزی ریشمی جرابیں، جیب کے رومال۔ پھر دوسری الماری سے اس نے قرمزی رنگ کے دبیز ریشم کا سایہ نما غرارہ اور چولی نما کرتا نکالا۔ دونوں ساخت اور کٹائی میں مغربی معلوم ہوتے تھے مگر اس سے ان کے مشرقی انداز میں ایک نکھار آ گیا تھا۔ اس کے ساتھ اس نے سفید براق سی جالی دار انگیا، پورے بدن کا اونی اور سوتی دھاگوں سے بنا ہوا زیر جامہ نکالا۔ ان کپڑوں کو اس نے اس پلنگ پر سجا دیا جس پر ابھی ابھی وہ سوئی ہوئی تھی۔ ان کپڑوں کے ساتھ پہننے کو اس نے قرمزی رنگ کی اطلسی ہموار تلے کی جوتی نکالی۔

وہ سب کاموں سے فارغ ہولی مگر جمیل صاحب ابھی تک نہا رہے تھے اور گنگنا رہے تھے۔ وہ اپنے آپ میں مسکرائی۔ ان پر جوانی واقعی لوٹ آئی تھی۔ اس کے لبوں میں ایک خوشی کی لہر اٹھی اور اس کے سارے بدن میں سے برقی شعاعیں نکلنے لگیں۔ اس کے کان میں کسی نے سرگوشی کی کہ اسکی چھپی ہوئی، دفن کی ہوئی، بھلائی ہوئی آرزو پوری ہو کر رہے گی۔ وہ حیران سی ہوئی اس نے دل کو سمجھایا کہ وہ اس سرگوشی پر کان نہ دھرے کیونکہ اس کی اب عمر کہاں تھی کہ وہ بچہ جنے مگر دل نے کہا کہ حساب کرو۔ اس نے جلدی جلدی حساب کیا وہ مشکل سے چوالیس کی بنتی تھی۔ اس کی تسلی نہ ہوئی۔ اس نے بار بار حساب کیا۔ ہر بار نتیجہ چوالیس ہی نکلا۔ اس کے بدن نے نعرہ لگایا، اس کا دل ناچ اٹھا، اس کا ذہن مسکرایا، اس کے تخیل نے پھریری لی۔ وہ جھوم گئی۔ اس نے محسوس کیا کہ اس پر کنوار پنے کی آب لوٹ آئی ہے، کنوار پنے کی باس اس میں بس گئی ہے۔ اس نے ڈرتے ڈرتے آئینے میں دیکھا تو واقعی اس کے چہرے پر کنوار پنا تخت نشین تھا۔ وہ دیر تک اس معجزے کو دیکھتی رہی۔

''فکر مند نہ ہو۔ ہم تم ایک بار پھر جواں ہوں گے، ہم پر کنوار پنے کا روغن، اس کی آب، اس کی باس لوٹ آئے گی۔ اوہ ہو! لوٹ ہی تو آئی ہے...... رابعہ! رابعہ! رابعہ! آ آ آ آ میری طرف دیکھو۔'

اس نے ان کی طرف دیکھا۔ ان کا دمکتا ہوا بدن، اس کی جوانی کی یادوں کو بھی مات کر رہا تھا۔ انہوں نے دونوں بانہیں پھیلا دیں۔ وہ شرما گئی۔ انہوں نے اس کو پکارا، وہ ان کی طرف دوڑی مگر ان سے بغل گیر ہونے کی بجائے وہ بدن چرا کر غسل خانے میں جا گھسی اور جلدی سے دروازہ بند کر لیا اور پھر کھلکھلا کر ہنس دی۔ اس کی ہنسی میں خوشی تھی، ممنونیت، فتح مندی اور عجز مندی تھی۔ پھر غسل خانے پر خاموشی چھا گئی۔ جمیل صاحب لمحے بھر کے لیے فکر مند ہو گئے۔ انہوں نے دروازے کو دھکیلا تو ان کے کانوں میں پانی سے کھیلنے کا ہلکا ہلکا، میٹھا میٹھا شور پہنچا تو وہ مطمئن ہو کر کپڑے پہننے لگ گئے۔

کپڑے پہن کر وہ آئینے کے سامنے بیٹھ کر ٹائی باندھنے لگے تو سیاہ سوٹ اور ٹائی اور اپنے گلابی سے چہرے اور سفید مونچھوں میں ایک ایسی باہم دگری نظر آئی جس میں ان کی اندرونی کیف و مستی کی کیفیت ایک ایسے نامیہ کا وصف نظر آنے لگی جس میں کوئی وصف بھی دوسرے اوصاف پر چھایا ہوا نہ تھا، جس میں سب اوصاف ایک دوسرے کی روشنی کو کم کرنے کی بجائے ایک دوسرے کو سیراب اور نصیب کر رہے تھے۔ لباس اور بدن اور شخصیت کا یہ نیا رشتہ ان کو بہت ہی بھلا اور صحیح معلوم ہوا۔ انہوں نے ٹائی کی گرہ کو کالر کے دونوں کناروں کے ہم کنار کر دیا، واسکٹ کے بٹن بند کیے، اس پر کوٹ پہنا، کوٹ کے بٹن لگائے، کوٹ کے دل کی اوپر والی جیب میں ریشمی سرخ نمائشی رومال لگایا۔ چوکی سے اٹھ کھڑے ہوئے، آئینے سے دور ہٹ کر آئینے میں اپنے آپ کو دیکھا۔ ان کی نظر نے ان کے لباس اور ان کی ظاہری شباہت کو قبولیت کا شرف بخشا۔

وہ کچھ دیر تو یونہی کھڑے اپنے آپ کو آئینے میں دیکھتے رہے، پھر گنگناتے ہوئے، مسکراتے ہوئے، کمرے سے نکل، بیٹھنے کے کمرے میں چلے آئے، پڑھنے کی میز سے ایک کتاب کو منتخب کر کے اس کی تصویروں کو دیکھنے لگے۔ کتاب جرمن رنگین چھپائی اور کتاب

سازی کا ایک اعلیٰ نمونہ تھی۔ یورپی مصوری کا بڑا اچھا انتخاب تھا جس میں اکثر تصویریں اصل رنگوں میں تھیں اور کئی تصویریں اصلی حجم کے مطابق تھیں اگرچہ ان کو دو، دو، چار چار تہوں میں تہہ کیا گیا تھا۔ وہ یورپی مصوری کے تاریخی سفر میں اتنے محو ہوئے کہ جب رابعہ کمرے میں داخل ہوئی تو ان کو معلوم ہی نہ ہوا۔ رابعہ ان کے استغراق پر حیران تو ہوئی مگر جب اس نے آہستہ آہستہ ان کے صوفے کے پیچھے جا کر کتاب کے متن اور اس کی تصویروں کو دیکھا تو اس کو ان کے استغراق پر خوشی ہوئی وہ ان کے پیچھے سے ہٹ کر پھر کمرے کے اس دروازے کے پردے کے پیچھے جا کھڑی ہوئی جس سے وہ داخل ہوئی تھیں اور دروازے کے پٹ پر دستک دی۔ جمیل صاحب چونکے، انہوں نے کچھ سوچنے کی کوشش کی اور پھر پردے کے نیچے رابعہ کے پاؤں کو دیکھ کر مسکرا دیئے، کتاب کو بند کر کے صوفے پر رکھ دیا اور کہا!

''آیئے۔ اندر چلی آیئے۔''

رابعہ کمرے میں دائیں ہاتھ پر گہرے براؤن رنگ کی گرم چادر ڈالے داخل ہوگئی تو وہ صوفے سے اٹھ کھڑے ہوئے۔ انہوں نے محسوس کیا کہ رابعہ جوانی میں بھی کبھی اتنی خوبصورت نہ تھی۔ گہرا بسنتی لباس اس کے بدن پر اتنا بھلا معلوم ہو رہا تھا کہ ان کو سوچنا پڑا کہ وہ کسی اور لباس میں رابعہ کیسے لگ سکتی ہے۔ وہ اور لباس ایک دوسرے کے لیے خلق کیے گئے معلوم ہوتے تھے۔ لباس کسی فنکار کے فن کا بہت ہی اچھا نمونہ تھا۔ زندگی میں پہلی بار انہوں نے محسوس کیا اور ساتھ ہی قبول بھی کیا کہ لباس سازی بھی ایک فن ہوسکتا ہے جو بدن کے ملاپ سے زندگی حاصل کرتا ہے۔

بسنتی لباس کی سج دھج اتنی بھلی کسی اور کی بھی تھی، ان کی یاد کے کسی کونے سے یہ خیال ابھرا۔ انہوں نے یادداشت پر زور دیا۔ ان کے ذہن میں دھندلے سے نقوش ابھرنے لگے، جیسے کسی بہت ہی قدیم تصویر کے رنگ اور لکیریں مرورِ زمانہ سے ماند پڑ گئی ہوں۔ وہ یادداشت کے جہاں میں کھو گئے۔

ایک کمرا تھا جس کی دیواروں پر لال اور بسنتی رنگ چڑھے تھے، چھت گہرے سبز رنگ

کے شیشے سے چنی تھی جس سے روشنی چھن رہی تھی فرش پر چاندنی محوخرام تھی۔ چاندنی اور سایے کے ملاپ سے فرش پر نقش بن اور مٹ رہے تھے۔ان کے ہاتھ ایک حسین جوان کی گردن پر تھے، وہ اس کا ٹینٹوا دبا رہے تھے، جوان کی انکھیں ابلی پڑتی تھیں۔ایک دم کمرے میں ایک چیخ لرز گئی انہوں نے چیخ کی سمت دیکھا، ایک صوفے پر ایک عورت ایک انوکھے انداز کے بسنتی رنگ کے لباس میں ملبوس، بال کھلے، ایک صوفے پر نڈھال پڑی تھی، اس کا ایک بازو صوفے سے لٹک رہا تھا، کتنا خوبصورت تھا بسنتی آب رواں میں سے جھانکتا ہوا وہ گلابی سا بازو۔اس کا ایک ہاتھ فرش پر کھلا پڑا تھا۔ ننھے منّے ہاتھ کی کلائی میں سنہری کانچ کی چوڑیاں تھیں، اس کا دوسرا ہاتھ اس کے پیٹ پر پڑا تھا۔اس ہاتھ کی کلائی میں ایک ننھی سی سونے کی گھڑی، کالے فیتے سے بندھی تھی، گھڑی کے شیشے سے چھت کی سبز روشنی کی چھوٹیں منعکس ہو رہی تھیں۔اس عورت کے چہرے پر خوف اور خوشی ایک نا قابلِ بیان رشتے میں جکڑے رقص کر رہے تھے۔اس کا منہ کھلا تھا۔اس کے گلابی ہونٹوں کے درمیان اس کے سفید دانتوں کی لڑیوں اور ان کے اندر اس کی گلابی سی زبان سے، اس کے چہرے کے رقص کرتے ہوئے نقوش سے خوف اور ہیبت کی کیفیت فضا میں ضیا بار ہو رہی تھی۔

ان کی نظریں اس حسین عورت پر (وہ عورت خوشی اور خوف کے جذبات میں گرفتار ہونے کے باوجود حسین تھی!) جمی تھیں مگر ان کے ہاتھوں کی گرفت جوان کے ٹینٹوے پر مضبوط ہوتی چلی گئی۔ جوان کے گلے سے عجیب طرح کی آواز نکلنے لگی تو اس عورت کے منہ سے بہت ہی دردناک آواز نکلی اور گولی کی طرح فضا میں سنسنانے لگی۔

''اس کا گلا چھوڑ دیں، مر جائے گا۔اس نے آپ کو ہوش بخشا ہے، یہ آپ کا محسن ہے۔''

مگر جب انہوں نے اس کے گلے پر اپنی گرفت ڈھیلی نہ کی تو وہ عورت بجلی کی طرح صوفے سے لپکی اور ان کے سینے پر ہاتھ رکھ کر ان کو پرے دھکیلنے لگی۔اس کے ننھے ننھے حسین ہاتھوں میں بے پناہ قوت تھی، اس کی آنکھوں میں سے شعلے نکل رہے تھے۔اس کا چہرہ ایک ہر دم قریب آتے ہوئے ٹوٹے ہوئے تارے کی طرح روشن تھا۔اس کی آنکھوں

میں آنسو بھی جھلملا رہے تھے۔ان کے ہاتھوں کی گرفت جوان کی گردن پر ڈھیلی ہوگئی۔اس عورت نے ہاتھ ان کے سینے سے ہٹا لئے اوران کی بانہوں کو جوان کی گردن سے اس زور سے کھینچ لیا کہ وہ لمحے بھر کے لیے سکتے میں آ گئے۔اس پر اس عورت کے چہرے پر خوف اور خوشی کے جذبات اداسی میں بدل گئے۔اور وہ ان کے سینے پر سر رکھ کر زار زار رونے لگی اور روتے روتے واویلا کرنے لگی۔

''یہ میں نے کیا کیا۔ وہ ہوش میں آئے تھے اور اب وہ پھر ہوش وحواس کھو بیٹھے ہیں۔'' وہ دیر تک حیران کھڑے رہے اور وہ ان کے سینے سے لگی روتی رہی، روتی رہی۔ان کی قمیص تر بتر ہوگئی، ان کے سارے بدن میں ایک برق سی دوڑنے لگی۔ان کا جی چاہا کہ عورت کو گلے سے لگالیں اور اس کو کہیں کہ نہ رو، میں ہوش میں ہوں۔'' مگر دیر تک ان کے منہ سے آواز نہ نکل سکی۔ پھر ان کے کانوں نے تیز تیز سانس لینے کی آواز سنی۔انہوں نے دونوں کی طرف دیکھا تو جوان، بدحال، لمبے لمبے سانس لے رہا تھا۔ وہ حیران ہوکر سوچنے لگے کہ وہ جوان کون تھا؟ عورت جوان کے سینے سے لگی رو رہی تھی وہ کون تھی؟ وہ دونوں آپس میں کیا تھے؟ وہ خود اس جوان کا گلا کیوں گھونٹ رہے تھے؟

ان کی سوچ ان کے سوالوں کا جواب نہ دے سکی تو وہ پریشان ہو گئے۔ان کو خیال آیا کہ اس عورت سے ہی پوچھیں کہ وہ کون تھی؟ اور وہ جوان کون تھا؟ اور وہ خود کہاں تھے؟ اور کیوں؟ انہوں نے عورت کو شانوں سے پکڑ کر اپنے سینے سے الگ کر دیا اور پھر بایاں ہاتھ اس کی ٹھوڑی کے نیچے رکھ کر اس کا سر اوپر اٹھا دیا۔انہوں نے اس کی آنسو بھری آنکھوں میں جھانکا۔اس کی آنکھوں میں بہت گہرا حزن تھا، حیرانی تھی، توقع تھی۔

''میں کہاں ہوں؟ تم کون ہو؟ یہ جوان کون ہے؟ میں اس کا گلا کیوں دبا رہا تھا؟......''

عورت کے چہرے پر خوشی کی کرنیں پھوٹنے لگیں، اس کی آنسو بھری آنکھیں جگمگا اٹھیں، اس کے گلابی سے ہونٹ تھرتھرانے لگے مگر اس کے منہ سے آواز نہ نکل رہی تھی۔ وہ جذبات کی شدت میں اپنے اعضا کا استعمال نہ کر پا رہی تھی۔ پھر وہ یکا یک رونے لگی اور

روتے روتے اس نے ان کے ہاتھوں کو چوم لیا اور کہنے لگی:

''آخر آج خدا نے میری سن لی۔ میری برسوں کی محنت کامیاب ہوئی۔ (اور پھر خورشید منظر کی طرف متوجہ ہوکر) میں تم سے معافی کی خواستگار ہوں کہ میں نے اس داؤ میں تم کو رازدار نہ بنایا۔ بنا بھی کیسے سکتی تھی؟ اس صورت یہ محل پیدا ہی نہ ہوتا۔ میں مانتی ہوں کہ اس داؤ میں تمہاری جان کا خطرہ تھا مگر مجھے اپنی محبت اور تمہاری محبت کی طاقت پر اعتماد تھا اور میں سوچ بھی نہ سکتی تھی کہ ان کے جسم میں اتنی طاقت آ سکتی ہے کہ تمہاری جوان طاقت پر حاوی ہو جائے۔''

وہ عورت خاموش ہوگئی، جیسے تھک گئی ہو، نڈھال ہوگئی ہو۔ وہ ان کے چہرے کو بڑے پیار سے، حلم سے، ملائم نظروں سے تکتے چلی گئی۔ اس کی نظروں میں ایک خوشگوار حدت تھی جوان کو بہت ہی بھلی معلوم ہوئی۔

''آپ اپنے نئے گھر میں ہیں۔ میں نادرہ ہوں، آپ کی بیوی کی معتمد خاص اور یہ خورشید منظر ہیں۔ یہ آپ کے کپڑوں کے کارخانوں کے نقاش اعلیٰ ہیں اور اس محل کا نقشہ، اس کی تعمیر، اس کی آرائش سب ان کے فن کے مرہون منت ہیں۔ (انہوں نے کمرے کے سازوسامان، اس کی دیواروں کے روغن، ان کے نقش و نگار، اس کے گہرے بادامی پردوں، میز پوشوں کو غور سے دیکھا۔ ہر شے سے نور کی چھوٹیں پھوٹ رہی تھیں۔ پست قد دیوار کے روشن دانوں میں سے چاندنی کی پٹیاں بلند قامت دیوار کو چھونے میں کوشاں تھیں اگرچہ ابھی منزل سے ہم کنار نہ تھیں۔ رات کو ایک عجیب اجلا پن میسر تھا۔ انہوں نے چاہا کہ قمقمے کی روشنی بجھ جائے، رنگ اور چاندنی کا اجالا ہی رہے۔ اس خواہش کے تصور نے ان کے ذہن اور کمرے کے امتیاز کو، اندر اور باہر کے امتیاز کو مٹا دیا اور ایک ہی منظر میں جذب ہو گئے۔ اس نور منظر کے نظارے سے ان کو بے پایاں فرحت ہوئی۔) میرا اور ان کا رشتہ بہت ہی عجیب نوعیت کا ہے۔ اس نوعیت کے بیان کے لیے ایک عمر اور فرصت طویل چاہیے۔ اس لیے داستان کو کسی اور وقت کے لیے اٹھا رکھیے۔ یہ جو آپ ان کا گلا گھونٹ رہے تھے۔ اس کا جذباتی پس منظر بھی بیان کے لیے یاد کا ایک بہت لمبا جوکھم چاہتا ہے جو اس لمحے میرے بس

میں نہیں۔ میں بہت تھک گئی ہوں۔ میں کئی راتوں سے نہیں سوئی۔ میں نے مہینوں اس تصادم کے لمحے کے لیے ڈھنگ ڈھنگ کے طریقے سوچے، ان کو کارفرما کیا۔ عقل و ہوش کی تمام قوتوں کو استعمال کیا اور اس استعمال میں جس ضبط و نظم کی ضرورت ہوئی وہ بہت ہی صبر آزما تھا۔ کئی بار تو میں ڈری کہ حالات میرے قابو سے نکل چلے ہیں مگر قدرت نے ساتھ دیا۔ میں نے برسوں آپ کو اپنے ساتھ مانوس کرنے کی کوشش کی اور جب اس میں کامیابی ہوئی تو میں نے آپ کے شعورِ نہاں کو اپنا محافظ بنانے کے لیے کتنے جتن کیے یہ میرا دل ہی جانتا ہے۔ کتنا بڑا پاگل پن تھا یہ، مجھے آج خیال آتا ہے۔ لیکن میں بلکہ میرا شعورِ نہاں جانتا تھا کہ آپ کو ہوش کے جہاں میں لانا میری سب سے بڑی تخلیق ہوگی۔ میں نے ہمیشہ ہی اپنے آپ کو انسانوں کا صورت گر سمجھا ہے۔ نہ جانے کیوں۔ میں نے دل کو، ذہن کو، لاکھ سمجھایا کہ میں صورت گر نہیں مگر میرے شعورِ نہاں کی قوتیں نہیں مانیں......''

اس نے ایک لمبا سانس لیا اور ان کو ہاتھ سے پکڑ کر ایک صوفے پر جا بٹھایا اور پھر خورشید کا ہاتھ پکڑ کر اس کو ان کے سامنے دوسرے صوفے پر بٹھا دیا۔ وہ حیران اور اداس تھا۔ اس کے چہرے پر غصے کا شائبہ تک نہ تھا۔ وہ خود بھی اس کے پاس بیٹھ گئی اور اس کے ہاتھوں کو اپنے ہاتھوں میں لے کر تھپکنے لگی۔ تھپکتے تھپکتے ایک بار اس نے دائیں ہاتھ کو اٹھا کر اس کی گردن کو سہلایا۔ خورشید منظر نے اس کی طرف متوجہ ہو کر اس سے کہا!

''میں نے اکثر سوچا کہ تمہاری محبت میں وہ گرمی کیوں نہیں جو ایک محبت کرنے والے سے محبوب تک پہنچتی ہے۔ میں اب سمجھا کہ وہ محبت ایک ذریعہ تھا اس مقصد کے لیے۔ میں کئی کئی راتوں کو رات رات بھر تمہارے ایک ایک فعل کا تجزیہ کرتا رہا ہوں مگر مجھے کبھی نہ سوجھا کہ تمہاری محبت ایک کھیل ہے، ایک داؤ ہے۔ تمہارے اعمال اور تمہارے جسم کی ایک ایک جنبش، تمہارے اعضا کی ایک حرکت، آغاز سے انجام تک، تمہاری گفتگو کا ایک ایک لفظ، ہر لفظ کا لہجہ میں نے یاد کی بزم میں حاضر کیا اور اس کو ہر پہلو سے دیکھا اور اب میں تم سے، یا اب یوں کہنا چاہیے کہ تمہارے ظاہر سے، اس حد تک آشنا ہوں کہ مجھے ڈر ہے کہ شاید اپنے آپ سے، کسی اور سے بھی اس حد تک آشنا ہو سکوں گا کہ نہیں۔ تم میرے خون کی

حدت بن گئی ہو، اس کی رفتار بن گئی ہو، تمہاری آواز، تمہارا لہجہ میرے لیے ہر آواز، ہر لہجے کا معیار بن گیا ہے، تمہارا بے دھیانی میں کن انکھیوں سے دیکھنا میری آنکھوں کی پتلیوں پر نقش ہو چکا ہے؛ تمہارے ہاتھوں کے لمس نے مجھے ہر لمس سے بیگانہ بنا دیا ہے؛ اب صرف میری روح پر تمہارا نقش نہیں......آخر تم نے ایسا کیوں کیا؟''

''اس لیے کہ مجھے ہر اس شے سے پیار ہے جو اس کو عزیز ہے جس کو تم چاہتے ہو۔ میں جانتی ہوں کہ تمہاری آرزوؤں کا مرکز کون ہے۔ میں خود ان کو اس حد تک پیار کرتی ہوں کہ ان کا پرتو بن گئی ہوں، میں نے انہیں اپنے اندر اتار لیا ہے۔ میں وہ سب کچھ محسوس کر سکتی ہوں جو وہ محسوس کرتی ہیں۔ میں یہ بھی جانتی ہوں کہ تم ان کو کتنے عزیز ہو۔ ان سے پیار کا مطلب یہ بھی ہے کہ تم سے پیار کروں اور ان کی عزیز ترین متاع کو چاہوں۔ تمہیں اگر معلوم نہیں تو جان لو کہ ان کی عزیز ترین متاع ہمیشہ سے (ان کی طرف اشارہ کرتے ہوئے) یہ ہیں اور رہیں گے کیونکہ ان کا اور ان کی روحوں کا، ان کے شعور نہاں اور شعور عیاں اور شعور مضمر کا نکاح ہوا ہے۔ اس نکاح پر کوئی اور محبت چھا نہیں سکتی، اس پر فتح یاب نہیں ہو سکتی۔

پھر شاید میں یہ بھی چاہتی تھی اور چاہتی ہوں کہ ان کی متاع عزیز ان کو صحیح و سالم ہو کر ایک بار پھر ملے اور ان کی محبت ماضی کے نہاں خانوں سے نکل کر مستقبل کے ایوانوں میں جلوہ نشیں ہو اور پھر تمہاری محبت اور ان کی محبت مدِّ مقابل آئے اور ان محبتوں کے مقابلے اور کشمکش سے جو نئی محبت پیدا ہو اس کو میں اپنے اندر اتاروں، اس کی صورت گری کروں۔ میں صورت گر ہوں۔ میں نے اپنی صورت گری کی ہے، میں نے، تم مانو یا نہ مانو، ایک حد تک تمہاری بھی صورت گری کی ہے اور میں خوش ہوں، مجھے مان ہے، میں اپنے خالق کی ممنون ہوں کہ میں نے ان کی بھی کسی حد تک صورت گری کی ہے جن کو ہم سب چاہتے ہیں، جو ہم سب کی آرزوؤں کا مرکز ہیں۔ محبت کرنے والے محبت میں نہ صرف اپنی بلکہ محبوب کی بھی صورت گری کرتے ہیں۔ یہ ان کی محبت کی نوعیت پر منحصر ہے کہ ان کی صورت گری فن کا، فن پارے کا درجہ رکھتی ہے کہ نہیں۔ ہم محبت میں اپنے آپ کو، محبوب کو کریہہ بھی بنا سکتے ہیں۔ عموماً ایسا ہی ہوتا ہے کیونکہ عام محبت میں محبت کرنے والے کا ایک وصف، ایک آرزو،

اس کے باقی اوصاف پر، اس کی باقی آرزوؤں پر حاوی ہو جاتا ہے، ان کو اپنے مقصد کے لیے استعمال کرتا ہے۔ اس کا نتیجہ کریہہ ہی ہوسکتا ہے، جیسے ہماری آنکھیں ہمارے باقی سب اعضا کو اپنے مقصد کے لیے استعمال کریں تو ان میں اور باقی اعضا میں تناسب اور توازن اور آہنگ بالکل بگڑ جائے گا۔ ان کے رشتوں میں جو ہم آہنگی ہے وہ تلف ہو جائے گی اور توازن، تناسب اور آہنگ کا بگڑ جانا کراہت کو جنم دیتا ہے۔

مگر میری محبت ساری شخصیت کی محبت ہے اور ان کی ساری شخصیت سے محبت کرتی ہے، ہر اس شے سے محبت کرتی ہے جس کو وہ چاہتی ہیں۔ اس لیے میری محبت میرے تمام اوصاف اور میری تمام آرزوؤں کو ہم آہنگ کرتے ہوئے ان کی نشو ونما اور ان میں ایک ارتقاء پذیر ارتفاع کرتی ہے۔ اسی لیے مجھے تم سے، اِن سے، اُن سے محبت کرنے میں کوئی تضاد نظر نہیں آیا۔ میں آپ سب سے ایک سا قرب، ایک سا فاصلہ محسوس کرتی ہوں۔

ان کی صورت گری مجھ سے جس طرح کی محبت چاہتی تھی میں نے ویسی ہی محبت ان تک پہنچائی اور اگر اس صورت گری میں میں نے تمہاری شخصیت سے تمہارے علم کے بغیر مدد لے لی ہے تو محبت کے خلاف کوئی گناہ نہیں کیا، محبت سے غداری نہیں کی۔ میری محبت ایک ایسا نامیہ ہے جس کے اعضا وہ سب محبتیں ہیں جو مجھ کو تم سے، اِن سے، اُن سے، علم سے، حکمت سے، موسیقی سے، مصوری سے، تعمیری فنون سے، زرتشت کے گیتوں سے، اپنے خالق سے ہے۔ لہٰذا اس نامیہ کو حق ہے کہ اپنی زندگی کے لیے، اپنے ارتقا کے لیے جس عضو کا جب چاہے، جن حالات میں چاہے، استعمال کرے......

وہ اور خورشید منظر اتنی محویت سے اس کی باتوں کو سن رہے تھی کہ جب وہ ستانے کے لیے خاموش ہوتی تو ان کو بالکل احساس نہ ہوتا، یا کم از کم، خود انہیں اس بات کا احساس نہ ہوا۔ اس نے لمبا سانس لیا اور پھر بولنے لگی تو ان کو احساس ہوا کہ پہلے خاموشی تھی۔

''آج جو کچھ ہوا ہے۔ اس سے تم ایک معاملے میں آزاد ہو گئے ہو۔ اب تمہیں یہ احساس نہ ستائے گا کہ تم نے اپنے رقیب کو بے ہوشی کے عالم میں ہرا دیا۔ اب تم بے خطر اپنی محبت کی زندگی کے لیے وہ سب کچھ کرنے میں آزاد ہو جو پہلے نہ کر سکتے تھے......

(جمیل صاحب کی طرف متوجہ ہوتے ہوئے) جمیل صاحب! میری گفتگو کا موضوع آپ سمجھے کہ کون ہے؟

''میں سمجھ گیا۔ رابعہ؟ میں نہ جانتا تھا کہ اس کی شخصیت ایک حسین اور ذہین لڑکی سے ترقی کرتے کرتے اس مقام پر آ پہنچی ہے کہ وہ اب ایک فن کار اور ایک بہت ہی حسین اور ذہین اور حکیم عورت کو اس حد تک موہ لے کہ وہ اپنی محبت میں ہر اس شے کو شریک کر لے جو اس کو عزیز ہو۔ یہ کمال مجھے ایک ایسا سبق پڑھانا چاہتا ہے کہ اگر میں عہدِ جوانی میں اس سے آشنا ہو جاتا تو اتنا دکھ نہ اٹھاتا۔ مگر خالق ابدی کو ایسا منظور نہ تھا۔

میں اپنی صحت یابی کے لیے تم دونوں کا ممنون ہوں اور آپ دیکھیں گے کہ میں اس احسانِ کریم کو کبھی نہ بھلاؤں گا۔ میں رابعہ سے اپنی محبت میں آپ دونوں کو شریک کرتے ہوئے ایک فخر اور مسرت محسوس کرتا ہوں......

مگر...... رابعہ ہے کہاں؟ میں کیسے اتنی دیر اس کو بھولے رہا؟ آپ کی گفتگو کے بعد اس کے درشن تو دیوی کے درشن ہوں گے۔''

''وہ یہاں ہوتیں تو شاید یہ کھیل اس خطرناک حد تک کھیلا ہی نہ جا سکتا اور اس کے بغیر آپ کی صحت یابی محال تھی۔ وہ کاروبار کے سلسلے میں یورپ گئی ہوئی ہیں۔ آج کل ہی میں آیا چاہتی ہیں۔''

اس عرصہ میں رابعہ پردے کے پیچھے سے نکل کر ان کی طرف بڑھی۔ وہ سب حیرانی کے عالم میں اپنی اپنی جگہ سے اٹھ کھڑے ہوئے۔ اس نے نادرہ کو گلے لگایا اور اس کو گلے لگاتے ہوئے اس نے اپنا دایاں ہاتھ خورشید منظر کی طرف بڑھا دیا۔ خورشید منظر نے وہ ہاتھ اپنے دونوں ہاتھوں میں لے لیا اور اس کو تھپکنے لگا اور پھر آہستہ سے چھوڑ دیا۔ رابعہ نے نادرہ کو شانوں سے پکڑ کر اپنے سے جدا کر دیا اور اس کو غور سے دیکھنے لگی۔ اس کی نظروں میں بے پناہ داد جھلک رہی تھی اور خوشی اور احسان مندی بھی۔ اس نے پھر جمیل صاحب کی طرف دیکھا اور نادرہ کی کمر میں ہاتھ ڈال کر اس کو جمیل صاحب کے سامنے لے گئی اور ان سے پوچھا!

''پہچانیے کہ اس لمحے نادرہ کس کی یاد دلاتی ہے۔''

''دھندلی سی یاد آئی تو ہے مگر میں اس یاد کو اپنے قابو میں نہیں لاسکتا۔''

''اس لمحے یہ بالکل صالحہ کا روپ ہے۔ کیوں؟''

''جمیل صاحب حیران سے ہو گئے اور پھر اداس ہو گئے۔

''ہاں! بالکل! حیرت ہے! بچاری صالحہ! شاید اس نے نیا جنم لیا ہے۔''

''نہیں، ایسا ناممکن ہے۔ کیوں نادرہ تمہاری عمر کیا ہو گی اس وقت؟''

''مجھے ستائیسواں سال لگا ہے۔''

''بالکل۔ ایسا کیسے ہوسکتا تھا۔ یہ تو اس کا اپنا معجزہ ہے۔ یہ بہت بڑی صورت گر ہے، پتھروں کی نہیں، انسانوں کی۔ شاید اس نے میری شخصیت میں صالحہ کی صورت ڈھونڈ نکالی ہے۔ میں نے ایک بار اس سے اپنی داستان کہی تھی۔ مگر اس کے وجدان کا کمال ہے کہ جو تصویر میرے دل پر نقش ہے اس نے کس طرح اس کو اپنے دل پر اتار لیا اور پھر اس صورت کو اپنی شخصیت میں جلوہ گر کر لیا ہے۔ آیئے اس رحمت کی خوشی میں کوئی تقریب کریں۔''

رابعہ ان کو حیرانی سے دیکھ رہی تھی۔ جب وہ یادوں کے سفر سے لوٹ آئے تو اس نے گرم چادر سے شانے لپیٹتے ہوئے پوچھا: ''یہ آپ کہاں کھو گئے تھے؟ میرا تو دل اب تک دھک دھک کر رہا ہے۔''

''تمہارے بسنتی کپڑوں سے یاد آ گیا کہ جس رات میں نے ہوش پایا اس رات نادرہ بسنتی کپڑے پہنے ہوئے تھی اور وہ کتنی حسین تھی۔ اگر اسکی بھوئیں بھی خوبصورت ہوتیں تو اس کا حسن الوہی معلوم ہوتا۔ کتنا عجیب لباس تھا اس کا اس رات۔''

''زرتشتی عہد میں ایرانی امرا کی عورتیں ایسا ہی لباس پہنا کرتی تھیں۔ نادرہ بھی تو ایرانی ہے اور اس کے اجداد زرتشت کے دین کے موبد تھے۔''

قریب ہی سے گھنٹے نے صدا دی۔

''کھانے کے لیے بلایا جا رہا ہے شاید۔ آؤ چلیں۔''

دوسرا باب

جب جمیل صاحب اور رابعہ کھانے کے کمرے میں داخل ہوئے تو باقی لوگ کھانے کی میز پر بیٹھے ہوئے شاید ان کا انتظار کرتے تھے۔ میز پر ہلکی نیلی چھت سے ہزار چشم بلوریں جھاڑ میں سات موم بتیاں روشن تھیں جس سے جھاڑ کی ہر آنکھ چمک رہی تھی۔ ان کی روشنی میں میز پر بیٹھنے والوں کے چہرے دمک رہے تھے، فردوس اور عالمہ کے کانوں میں پڑے آویزوں کے ہیروں اور لعل کی چھوٹیں مختلف سمتوں میں سفر کناں تھیں، میز پر سجے ہوئے چینی کے برتنوں، چھریوں، کانٹوں، چمچوں سے موم بتیوں کی روشنی منعکس ہو رہی تھی میز کے گرد صدر نشست اور اس کے بائیں ایک اور نشست خالی تھی۔

سفید، نیلے، سنہری، سرخ رنگوں کا کھیل ایسا سحر آفریں تھا کہ وہ دروازے میں ٹھٹک گئے۔ ان کو یوں مبہوت کھڑے دیکھ کر فردوس اپنی نشست سے اٹھ کھڑی ہوئی اور ان کی طرف بڑھی۔ اس کو اپنی طرف بڑھتے دیکھ کر وہ دونوں شرمسار سے ہوئے مگر ابھی چلنے کا فیصلہ نہ کر پائے تھے کہ وہ ان کے پاس جا پہنچی۔ اس نے رابعہ کا ہاتھ پکڑ لیا اور جمیل صاحب کی طرف دیکھ کر مسکراتے ہوئے دیکھتے ہوئے بولی: ''یہاں کوئی اجنبی نہیں۔ تقی اور عالمہ سے اگرچہ آپ کا روبرو تعارف نہیں مگر میں ان کا ذکر آپ سے کر چکی ہوں۔ وہ آپ سے ملنے کے لیے مشتاق ہیں۔ دونوں میرے عزیز ہیں اور تقی متین صاحب کا دوست، شاگرد اور نہ جانے کیا کیا ہے۔''

فردوس دونوں کو لیے میز کی طرف بڑھی، جب وہ میز کے قریب پہنچے تو متین، عالمہ، تقی سب کھڑے ہوئے۔ فردوس نے جمیل صاحب کو صدر نشست پر بٹھا دیا اور ان کے بائیں خالی نشست پر رابعہ کو۔ رابعہ کے بائیں متین صاحب بیٹھے تھے، ان کے بائیں جمیل صاحب کے بالمقابل فردوس بیٹھ گئی اور اس کے بائیں تقی اور تقی اور جمیل صاحب کے درمیان عالمہ تھی۔ فردوس نے عالمہ اور تقی کا جمیل صاحب اور رابعہ سے تعارف کروایا اور چاروں میں کچھ رسمی سی باتیں ہوئیں اور پھر یکایک فضا میں خاموشی چھا گئی۔ کمرے کی

کھڑکیوں کے اوپر کے کھلے حصوں میں سے ہلکی ہلکی ہوا آ رہی تھی۔ جس سے کبھی کبھی موم بتیوں کے شعلے لرزنے لگ جاتے۔ شعلوں کی لرزتی روشنی میں وہ ایک دوسرے کو خاموش تحیر ملی دادِ حسن دیتے رہے۔ خاموشی اور ان کے سانس لینے کی سرسراہٹوں نے مل کر ایک ایسی موسیقی کو جگا دیا کہ ان کے تکلم کی آرزو ایک بھولی ہوئی یاد بن گئی۔ تکلم کی آرزو تھی تو رنگوں میں، ہیرے، لعل اور موتی جڑے آویزاں کی چھوٹوں میں، ابھرتے ڈھلکتے لباسوں میں، لرزتے ہوئے شعلوں میں۔ رنگوں کے تکلم نے، خاموشی اور سانس کی سرسراہٹوں سے جاگنے والی موسیقی نے ان سب میں اس احساس کو جنم دیا کہ ان کے مقدر ایک دوسرے سے ابدی رشتوں میں منسلک ہو رہے ہیں، وہ ایک ہی سفر پر روانہ ہو رہے ہیں۔ اس احساس سے ان کے شعور کی تمام عیاں اور پنہاں قوتیں انگڑائی لے کر بیدار ہوگئیں۔ یہ کیفیت ان کی زندگی میں پہلے کبھی طاری نہ ہوئی تھی۔ وہ نہیں جانتے تھے کہ اس کیفیت کا کیا اثر ہوگا، اس کا اظہار کیسا ہوگا۔ لہٰذا وہ سب دم بخود بیٹھے کسی بیرونی حادثے، واقعے، ارتعاش کا انتظار کرنے لگے۔ مگر کھڑکیوں کے پردوں کی ہلکی ہلکی پھڑ پھڑاہٹ کے سوا کچھ سنائی نہ دے رہا تھا اور یہ پھڑ پھڑاہٹ ان کو اپنے دل کی دھڑکن سے جدا نہ معلوم ہوتی تھی۔ پردے پھڑ پھڑاتے رہے، دل دھڑکتے رہے، سانس کی لے موسیقی میں ڈھلتی رہی، موم بتیوں کے شعلے چہروں کو دمکاتے رہے، ان کی روشنی میں ہیروں، لعلوں، موتیوں کی چھوٹیں فضا میں انجانی سمتوں میں سفر کرتی رہیں، سرخ، نیلے، سنہرے، بسنتی اور سیاہ رنگ تکلم کے نئے انداز ایجاد کرتے رہے مگر خاموشی کا طلسم وسعتوں اور پہنائیوں میں پھیلتا ہی چلا گیا۔

خاموشی اتنی فرحت افزا، اتنی حسین، اتنی وحدت خلق تھی کہ کسی پر گراں نہ تھی یا شاید خاموشی کے پردے میں ان سب کے پنہاں شعور مل کر ایک نئے اور عظیم شعور کی تخلیق کر رہے تھے جن کی کوششوں کو بار آور ہوتے دیکھ کر ان کے عیاں شعور ایک ہی مقام، بلکہ نقطے پر مرکوز ہو کر پنہاں شعوروں کو اپنی روحانی قوت پہنچا رہے تھے۔ ان کے لیے تخلیق کا یہ روپ، یہ امکان، عجیب سرور کا حامل تھا۔ اس سرور نے ان کے اندر ایک ایسی روشنی کو جنم دیا جس سے ان کے اندر کے جہانوں کے چھپے کونے تک روشن ہو گئے اور انہوں نے دیکھا کہ

وہ الگ الگ رنگوں کے پانیوں کی صورت مختلف بطنوں میں، مگر ساتھ ساتھ بہہ رہے ہیں اوران کے بطنوں کے درمیان نور کی پتلی پتلی لکیریں ان کی شخصیتوں کی حدود بنی ہیں۔ پھر ایکا ایکی نور کی لکیریں غائب ہوگئیں اورسب پانی ایک ہوئے، سب رنگ مل کر نیا رنگ بن گئے اور روشنی کی لکیریں نور کا ایک عظیم دھارا بن گئیں اور پانی اور نور کا دھارا ساتھ ساتھ، نیچے اوپر، آفاق تک پھیلتے چلے گئے؛ پانی کے نم سے سوکھی، ویران، زمینیں سیراب ہوئیں، خصیب ہوئیں، ان سے رنگ رنگ، قسم قسم کی فصلیں، پھل اور پھول اُگے، نور سے تاریک جہاں روشن ہوئے، فصلوں، پھلوں، پھولوں، میں نئی، انوکھی، خوشبوؤں نے انگڑائیاں لیں اور آنکھیں کھول دیں۔

ابھی یہ منظر پوری طرح اپنا آپ دکھا نہ پائے تھے کہ دور آفاق سے اندھیری آندھی اٹھی اور سیراب، خصیب، زمینوں کی طرف جھپٹنے لگی۔ پانیوں میں طوفان جاگ اٹھے، میدانوں میں ہوائیں انگڑائی لے کر جھکڑ بنیں، فصلوں کے خوشے فضا میں بکھرنے لگے، پھلوں کے درخت جڑوں سے اکھڑ اکھڑ کر گرنے لگے، پھولوں کی پتیاں پریشان ہوگئیں۔ ہواؤں اوراندھیروں کے عفریت چنگھاڑنے لگے۔

وہ سب ڈر گئے اور جاگ اٹھے۔ انہوں نے گردوپیش کو دیکھا، ہر طرف سکون تھا، کھڑکیوں کے پردے بھی پھڑ پھڑا نہ رہے تھے، شعلوں کی لوئیں بھی سیدھی، ستواں تھیں۔ ان دمکتے چہروں پر نقوش بڑی تیزی سے اپنے اپنے مقاموں پر لوٹ رہے تھے، جیسے طوفانوں کی خبر پاتے ہی پرندے اپنے اپنے گھونسلوں کی طرف تیزی سے اڑتے ہوئے لوٹ رہے ہوں۔ وہ ایک دوسرے کو دیکھ کر مسکرا دیئے جیسے کہہ رہے ہوں کہ کتنے سہانے مناظر تھے اور کتنے بھیانک اندھیرے اور طوفان تھے۔

انہوں نے کان لگا کر سنا تو دور سے نزدیک آتے ہوئے برتنوں کی کھنک نے ان کی قوتِ شامہ کو سمت عطا کی۔ شاید نوکر پہیوں والی میزوں پر کھانے اور برتن رکھے ان کی طرف آ رہے تھے۔ یکا یک شور بالکل قریب آ گیا اور ٹھٹک گیا۔ سب نے ایک ساتھ دروازے کی طرف نگاہ کی تو بابا دروازے میں کھڑا دکھائی دیا۔ پھر آہستہ آہستہ پہیوں والی

میزوں کو دہلیز پار کرائی گئی۔ بابا کے علاوہ فردوس کے لیے سب نوکر اجنبی تھے اور وہ حیران ہوئی کہ اتنے سارے نوکر کہاں سے آ گئے تھے۔ اس کی نظر اچانک تقی کے چہرے پر جا پڑی تو وہ مسکرا دیا جیسے کہہ رہا ہو کہ حیرانی کی کیا بات ہے؟ ہمارے ہوتے ہوئے نوکوں کی کمی کیسے ہو سکتی ہے؟ جن کھانوں کی ضرورت نہ تھی ان کی میزوں کو ایک کونے میں کھڑا کر دیا گیا اور نوکروں نے میزوں پر سے کھانے اٹھا اٹھا کر ترتیب اور باری سے ان کے سامنے پیش کرنے شروع کر دیئے۔ وہ چینی کی تھالیاں بدل بدل کر مختلف کھانے، سالن لیتے چلے گئے۔

کھانے تو جانے پہچانے تھے مگر ان کی خوشبوئیں نئی تھیں، ان کے ذائقے انوکھے، مگر خوشگوار تھے، ان کے نئے اور انوکھے پن نے ان کی اشتہاؤں کو تیز کر دیا اور انہوں نے سیر ہو کر کھایا۔ برسوں کے بعد انہوں نے محسوس کیا کہ کھانا بھی ایک نعمت ہے جس کے لیے خیر الرازقین کا شکر بجالانا واقعی ایک لازمی اور خوشگوار فریضہ ہے۔ ان کو کھانا کھانے کے بعد یاد آیا کہ کھانے کے دوران میں انہوں نے آپس میں بالکل بات نہ کی تھی۔ اس یاد پر ان کو بہت حیرانی ہوئی۔ انہوں نے سوچا شاید اسی لئے آج کھانا ایک نعمت معلوم ہوا۔ ان کی تمام صلاحیتیں ذائقے اور ہاضمے کی صلاحیتوں کی مددگار کی حیثیت سے کام کرتی رہی تھیں۔

صلاحیتوں کے اس نئے طریق کار، اس انوکھے آہنگ نے ان کے اندر سوجھ بوجھ، ذوق اور شوقِ عمل کے انوکھے، انوٹھے پھول کھلائے جن کی خوشبوئیں حواس کو سہلانے، سلانے کی بجائے بیدار کرتی تھیں۔ ان میں قوت کی نئی برق دوڑنے لگی تھی۔ اس نئی قوت کی گردش نے ان کو لمحے بھر کے لیے اپنے ماحول سے بیگانہ کر دیا اور وہ اپنے آپ کو اس قوت سے آشنا کرانے کے فرائض میں گم ہو گئے۔ اس گم گشتگی سے لوٹتے ہی ان کو خیال آیا کہ اس نئے ذائقے کے خالق کا شکریہ ادا کرنے کے فرض سے تو وہ عہدہ برآ ہوئے ہی نہیں۔

اس خیال سے وہ چونک گئے۔ انہوں نے دیکھا کہ کمرے سے کھانے کے برتن، پہیہ دار میزیں جا چکی تھیں۔ کمرے میں صرف بابا تھا جو خاموش کھڑا منتظر تھا۔ شاید فردوس کے حکم کا انتظار کر رہا تھا۔ فردوس نے اس کی طرف دیکھا۔ اس کے ساکت جسم میں حرکت ہوئی مگر

پیشتر اس کے کہ اس کے ہونٹ ہلیں فردوس نے کہا۔

''بابا! آج کا کھانا تو ایک نعمت تھا۔ میں ممنون ہوں کہ میرے مہمانوں کو ایسا کھانا ملا اور ان کے طفیل مجھے بھی۔''

''بی بی! اس کے لیے آپ کو زروان کا شکر گزار ہونا چاہیے۔ یہ سب اس کا اعجاز ہے۔''

زروان کے نام سے فردوس کے اندر ایک دھندلی سی صورت ہویدا ہوئی اور اس کو یاد کرنے کے لیے اس نے محسوس کیا کہ کچھ زیادہ ہی کوشش کرنی پڑے گی اور اس میں وقت لگے گا لہٰذا اس نے اس صورت کو غور سے دیکھنے سے انکار کرتے ہوئے پوچھا!

''زروان؟ کون زروان؟''

بابا کو اس سوال کی جیسے توقع ہی نہ تھی۔ وہ حیران سا ہو گیا مگر سنبھلا اور بولا۔

''جی بی بی، زر...... وان...... آغا صاحب نے اس کو آپ کی خدمت کے لیے بھیجا ہے۔ وہ وہاں ان کا خاص باورچی اور خاصہ بردار تھا۔ آپ کو یاد نہیں؟ وہ تو کہتا ہے کہ آپ نے اس کو کئی بار کھانے کی میز پر دیکھا ہے اور اس کے کھانے کی تعریف کی ہے۔ حیرت ہے! آپ کو یاد نہیں!''

''دھندلی سی یاد تو آتی ہے مگر صورت یاد نہیں...... زر...... وان، زروان، زروان۔ عجیب نام ہے۔ کبھی سنا نہیں۔''

''زرتشتی دین میں زروان وقت، بلکہ فلسفے کی زبان میں زمان، کا روپ ہے۔'' متین صاحب نے کہا۔

اس پر جمیل صاحب، رابعہ اور عالمہ کی آنکھیں جگمگائیں اور ان کے لبوں پر ایک طلسمی سی مسکراہٹ رقص کے لیے پر کھولنے لگی۔ متین صاحب کی آنکھوں کی پتلیوں کی گہرائیاں اور بھی گہری ہو گئیں اور ان گہرائیوں سے روشنیاں ابھرنے لگیں جیسے اندھیرے سمندر پر مینارِ نور سے روشنی کا دھارا پھوٹ کر کسی کے سراغ میں سرگرداں ہونے لگے۔

تقی طلسمی مسکراہٹ، روشنی کے دھارے کی سرگردانی، اور فردوس کے چہرے پر حیرت

کے عیاں اور پنہاں ہونے کا ایک عجیب رقص دیکھنے میں مصروف ہو گیا، محو ہو گیا۔ مگر وہ زیادہ دیر محو نہ رہ سکا۔ زروان کو دیکھنے کی آرزو نے اس کو بیرونی ماحول میں لا کر چھوڑ دیا۔ بابا ان کی حیرت، مسکراہٹ اور نینوں کی جگمگاہٹ کو دیکھ کر ہمہ تن توجہ بن گیا۔ مگر وہ زیادہ دیر خاموش نہ رہ سکا کیونکہ اس کو زروان کو بتانا تھا کہ وہ کافی کھانے کے کمرے میں پئیں گے یا بیٹھنے کے کمرے میں۔

''بی بی!......بی بی......'' وہ اس سے زیادہ کچھ نہ کہہ سکا کیونکہ اس کو اس سے زیادہ کہنا بے سود نظر آنے لگا کیونکہ فردوس اس کی طرف متوجہ نہ ہو رہی تھی اور اپنے آپ میں گم تھی۔

''جی بابا!'' وہ چونکی۔

''جی'' پر بابا مسکرا دیا۔ بچپن میں فردوس بابا کو اس کے بلانے پر ہمیشہ ''جی بابا'' کہہ کر ہی سوال کیا کرتی تھی۔ بچپن میں وہ کتنی بھولی تھی، بابا نے سوچا۔ اور اتنی ہی اپنے آپ میں گم۔ یہ اپنے آپ میں کھو جانے کی عادت اس میں پرانی تھی۔ وہ کتنی بدل گئی تھی مگر اس کی یہ عادت نہ بدلی تھی۔ وہ خوش تھا کیونکہ وہ اس عادت سے اپنی بٹیا کو پہچان سکتا تھا کیونکہ یہی عادت اس کی ماں میں بھی تھی اگرچہ اس کی آنکھوں میں اپنی ماں سا جلال نہ تھا جو اس کی ماں کے بھولپن میں بھی ہمیشہ عیاں رہتا تھا۔ اس کی ماں کو کبھی بھی اس نے غصے اور ناراضگی کی حالت میں نہ دیکھا تھا۔ جلال اس کی نظر کا وصف تھا اور بس۔

''جی بابا'' فردوس نے دہرایا۔

بابا چونکا، مسکرا دیا کہ وہ خود بھی بٹیا کی طرح اپنے آپ میں کھو گیا تھا۔

''زروان پوچھتا ہے کہ کافی آپ یہاں پئیں گے یا بیٹھنے کے کمرے میں۔''

''بیٹھنے کے کمرے میں اور زروان کو کہیے کہ کافی کے ساتھ وہ خود بھی چلا آئے۔'' متین صاحب نے کہا۔

فردوس نے متین صاحب کی طرف دیکھا۔ وہ خود یہی کچھ کہنے والی تھی۔ اس نے متین صاحب کی آنکھوں میں جھانکا۔ ان کی نظروں میں جان پہچان کے باوجود ایک استغنا کی

کیفیت تھی۔ ان کی پتلیوں کی گہرائیوں سے ابھرتا ہوا نور اس کو گہرائیوں میں اتر آنے کی دعوت دے رہا تھا۔ وہ ابھی اترنے یا نہ اترنے کا فیصلہ نہ کر پائی تھی کہ کرسی کے پیچھے ہٹنے کی صدا نے اس کو چونکا دیا۔ جمیل صاحب اپنی نشست سے کھڑے ہو چکے تھے۔ وہ سب ان کی پیروی میں اٹھ کھڑے ہوئے اور بیٹھنے کے کمرے کی طرف چل دیئے۔

رابعہ نے عالمہ کے کندھے پر ہاتھ رکھا تو اس نے گردن موڑ کر اس کی طرف دیکھا اور اس کو مسکراتے دیکھ کر خود بھی مسکرا دی۔ وہ دونوں ایک دوسرے سے یکا یک قریب ہو گئیں، جیسے برسوں کی دوست اور اب ایک ہی منزل کی طرف ہمسفر ہوں۔ عالمہ نے اس کی کمر میں ہاتھ ڈال دیا اور یوں وہ دونوں سب سے آخر کمرے میں داخل ہوئیں۔ جمیل صاحب، فردوس اور متین صاحب ساتھ ساتھ دو صوفوں پر بیٹھے تھے، ایک بڑے صوفے پر فردوس اور جمیل صاحب اور ان کے ساتھ صوفے کی کرسی پر متین صاحب، اکیلے۔ تقی ان سے ذرا دور ایک صوفے کی کرسی پر اکیلا بیٹھا تھا اور مطمئن انتظار کی کیفیت اس کے لباس کی طرح اس کے جسم سے الگ اور پھر بھی اس کے جسم کا حصہ بنی نظر آتی تھی۔

رابعہ عالمہ کو لئے تقی کے پاس پڑے ہوئے صوفے پر جا بیٹھی۔ صوفے پر ایک پوری نشست کی جگہ خالی تھی۔ رابعہ نے تقی کو مخاطب ہو کر اس کو اپنے پاس بیٹھنے کی دعوت دی۔ تقی اٹھ کر اس کے پاس جا بیٹھا۔ سفیدی اور نیلاہٹ کے درمیان بسنتی رنگ کھل اٹھا جیسے نیلے آسمان پر سفید براق سا بادل کا ٹکڑا اور ان کے سایے میں زمین پر وسیع سبزہ زار میں ایک بسنتی پھول اور نیلے افق پر شفق کی سرخی۔

نوجوانوں میں بیٹھی رابعہ، جمیل صاحب کو جوان دکھائی دی اگرچہ اس کی جوانی میں رس بھرے پھل کی کیفیت تھی اور تقی اور عالمہ میں نئے نئے کھلے ہوئے پھولوں کی سی تازگی۔ ان تازہ پھولوں کے درمیان رس بھرے پھل نے ان کا دل موہ لیا اور وہ پھل کو چکھنے کے لیے اس کے ذائقے کے بے تاب ہوتے گئے، ان کے ہونٹ، ان کی زبان کی نوک مچلنے لگے، ان کی انگلیوں میں ایک سنسنی سی دوڑنے لگی، ان کی آنکھوں میں آرزو کی آگ آہستہ آہستہ دہکنے لگی۔

اس آگ کی حدت رابعہ کو بھی چھونے لگی اور وہ مارے شرم کے سرخ ہونے لگی اور اس نے جمیل صاحب کی طرف دیکھا۔ انہوں نے محسوس کیا کہ جیسے ان سے کوئی شرمناک حرکت سرزد ہوگئی ہو اور انہوں نے جلدی سے نینوں کی آگ کو پپوٹوں سے ڈھک لیا۔

رابعہ کے احساسِ شرم کی حدّت کو عالمہ نے بھی محسوس کیا اور اس نے اس کے چہرے پر سرخی کو آہستہ آہستہ چڑھتے ہوئے دیکھا اور پھر اس کی نظروں نے جمیل صاحب کی بند آنکھوں کو، فردوس کی کھوئی ہوئی مگر روشن آنکھوں، دمکتے ہوئے چہرے کو اور پھر متین صاحب کی پرنور خاموشی کی سطوت کو دیکھا۔ ان کی سطوت میں استغنا کا نور تھا۔ ان کی سطوت سے دل میں رعب کی بجائے دوستی کے جذبات جاگتے تھے کیونکہ استغنا کے باوجود ان کی سطوت میں انسانی خون کی زندگی تھی۔ ان کی سطوت میں آسمانی نیلاہٹوں کی سی وسعت تھی مگر اس وسعت کو زمینی پھولوں کی سی سفیدی، اس پر صبح کی کرنوں کے سنہرے پن اور شبنم کی چمک نے انسانی حدود کے سمان کر رکھا تھا۔ عالمہ نے محسوس کیا کہ اس انسانی سطوت کے لیے حلم سے رچے گھر سے بہتر تحفہ شاید ہی ممکن ہوگا۔ حلم سے رچا گھر، اس نے سوچا، کہاں ہوگا؟ پھر اس کو ایکا ایکی خیال آیا کہ وہ خود حلم سے رچا گھر ہے، اس خیال کے آتے ہی وہ شرما سی گئی اگرچہ اس شرم میں شرمساری نہ تھی، حیا تھی، خوشی تھی، فخر تھا۔ اس کی آنکھوں میں جو حیا تھی، خوشی تھی، جو فخر تھا، وہ اس کی رگ رگ میں رچنے لگا، اس کے جسم کا ذرہ ذرہ آنکھ بن گیا۔ ان آنکھوں نے دیکھا کہ تقی کی نظریں ان کا تعاقب کر رہی ہیں۔ آنکھوں نے اس کی نظروں سے نظریں چرا لیں، بند ہوگئیں۔ حیا، خوشی اور فخر کی رچنا اس کے بدن کی فضا پر چھا گئی۔

تقی جو اس کے پاس خاموش بیٹھا، توجہ اور شوق کو لگام دیئے، پتلیوں کو پھرائے بغیر رنگوں اور جذبوں کے الگ الگ رقصوں کو اپنے اپنے دائروں میں مسدود مصروف وجد دیکھتا رہا: کبھی دائرے کھل جاتے اور رنگوں اور جذبوں کے رقص ایک ہی رقص کا حصہ معلوم ہونے لگتے اور کبھی رقص پھر اپنے اپنے دائروں میں مسدود ہو جاتے۔ اس خاموش رقص سے اس کا جی گھبرانے لگا، اس کا جی چاہنے لگا کہ اس گونگے رقص کے گلے سے سر پھوٹے۔ وہ جی کے

اسی ادھیڑ بن میں تھا کہ اس کے پہلو سے سر پھوٹ رہے۔ اس نے حیرت سے عالمہ کی طرف دیکھا۔ اس کے نقوش محوِ تکلم تھے، اس کی آنکھوں سے ابھرتے، ڈوبتے جذبے اور آرزوئیں سر بن رہی تھیں۔ ان سروں کے آہنگ نے ایک گیت کو جنم دیا جو استغنا کی سطوت کی حمد کر رہا تھا۔ اس حمد کے الحان نے، سروں نے، ان رشتوں کی نوعیت کو بدلنا شروع کیا جو اس کے اور عالمہ کے درمیان ان کے والدین نے متعین کئے تھے۔ تقی نے محسوس کیا کہ عالمہ اور اس کے مستقبل مختلف راہوں پر گامزن ہیں اگرچہ ان راہوں میں وہی آہنگ اور وہی رشتہ ہے جو ایک منظر میں نظر آنے والے پہاڑوں، میدانوں، میدانوں کی فصلوں، پھلوں، پھولوں، دریاؤں میں ہے۔ ایک کے بغیر دوسروں کا تصور، ان کی زندگی کا تصور ناممکن ہے۔ اس اختلاف، اس دوری پر اس کو حیرت بھی ہوئی اور اس کے ساتھ ساتھ نئے رشتے کے احساس سے خوشی بھی۔ اس حیرت اور خوشی کے نکاح سے اس میں تجسس پیدا ہوا کہ عالمہ کے مستقبل کی نئی راہ پر اس کے ساتھ کون ہم سفر ہوگا؟ عالمہ کی نظروں کی سمت کو دیکھ کر اس کے دل میں خیال آیا کہ شاید متین صاحب۔ مگر متین صاحب کے استغنا کی سطوت کو دیکھ کر اس کی سوجھ بوجھ نے اس امکان کو قبول کرنے سے انکار کر دیا۔ اور اگر متین صاحب اس کے ہم سفر نہ ہوں گے، وہ خود اس کا ہم سفر نہ ہوگا، تو اس کو مستقبل کی راہ پر تنہا سفر کرنا ہوگا۔ اس کی تنہائی کے تصور سے اس کا دل کانپ گیا، اس کا گلا رندھ گیا، اس کی آنکھوں میں شبنم سی تیرنے لگی۔ اس نے آنکھیں میچ لیں۔ اس کو محسوس ہونے لگا کہ وہ عالمہ سے غداری کر رہا ہے۔ اس تصور سے اس کے جسم میں نفرت کا ایک جذبہ انگڑائی لینے لگا اور اس کے جسم میں خفیف سا ارتعاش لرزنے لگا۔ اس نے اس پر قابو پانا چاہا اور ناکام رہا۔ اس ناکامی پر وہ رویا ہی چاہتا تھا کہ عالمہ نے اس کے ران پر پڑے ہوئے دائیں ہاتھ کو تھپکنا شروع کیا۔ یہ تھپکنا اس کی نجات بن گیا۔ اس کے دل نے، اس کے ذہن نے، اس کے تخیل اور اس کی روح نے سمجھ لیا کہ یہ تھپکنا کہہ رہا ہے کہ عالمہ نے راہوں کے اس اختلاف کو قبول کر لیا ہے، وہ سفر کی تنہائی سے ہراساں نہیں، وہ اس تنہائی کو رفیق بنا لے گی، اپنا محافظ بنا لے گی، اس تنہائی کو مینارِ نور بنا لے گی جس کی روشنی میں وہ اپنے ساتھی، اپنے ہم سفر کی تلاش کرے گی۔

اس نے دھندلائی آنکھوں کے دائیں کونے سے دیکھا کہ عالمہ کا ہاتھ اس کے ہاتھ پر اس طرح ساکت پڑا ہے، جس طرح پھول پر شبنم۔ پھر اس نے ایک نظر سب پر ڈالی۔ اس کی دھندلائی نظروں نے محسوس کیا کہ وہ سب ان کو دیکھ رہے تھے مگر ان کی نظروں میں تجسس نہ تھا، تکلّم نہ تھا، تفکّر نہ تھا، تدبّر نہ تھا، ان نظروں میں دوستی کا حلم تھا، موقع کی، موقع کے پس منظر اور پیش منظر کی اور ان کے امتزاج سے پیدا ہونے ولے امکانی نتائج کی سمجھ تھی، ان کی قبولیت تھی اور ہر طرح کے تعاون کی پیش کش تھی۔ نظروں کے اس پیغام سے اس میں انگڑائی لیتی نفرت پھر سے سوگئی، اس کے جسم میں لرزتا ہوا ارتعاش رک گیا، اس کے ہاتھوں میں جنبش ہوئی، اس نے دائیں جیب سے رومال نکال کر منہ پونچھا، آنکھوں کا پانی خشک کیا، اس کا دل مطمئن ہوگیا، آنکھیں روشن ہوگئیں۔ اس کے ذہن پر کھانے کے سرور سے غنودگی سی طاری ہونے لگی۔ اس نے سوچا کہ کافی آجاتی تو غنودگی کا توڑ ہوسکتا۔ اس کے دل نے زروان کو پکارا۔ زروان دروازے پر حاضر تھا۔ اس کو تعجب ہوا کہ اس نے پہیوں والی میز کی آمد کا شور تو سنا ہی نہیں۔ اس کی یاد میں میز پر پڑے ہوئے برتنوں کا ہلکا ہلکا سا شور دور جاتا ہوا گم ہوتا ہوا سنائی دیا۔ وہ اپنے آپ میں مسکرا دیا اور مطمئن ہوگیا۔ وہ اپنے خیالات میں اتنا مگن تھا کہ جو شور اس کے کانوں میں پہنچا وہ اس کے ذہن تک نہ پہنچ سکا اور پہنچنے کا انتظار کئے بغیر اپنی منزل عدم کو روانہ ہوگیا تھا۔ آواز اور رنگ کا یہی چلن ہے، یہی قانون ہے، اس نے سوچا۔

زروان ایک چھریرے بدن کا جوان تھا اگرچہ اس کی جوانی میں تدبّر اور گہرے غم کا رس رچا تھا جس نے اس کے مہرے اور سیدھی کمر اور ہم آہنگ سراپے میں متانت پیدا کر رکھی تھی۔ جوانی، تدبّر، گہرے غم اور متانت نے اس کو تجربہ کار، سالخوردہ مرد کا روپ دے دیا تھا۔

زروان میز کو دھکیلتے ہوئے کمرے میں داخل ہوگیا۔ جب وہ ان کے صوفوں کے قریب پہنچا تو آداب بجالایا۔ اس پر فردوس چونک کر بولی!

''اوہ! تم ہو زروان؟''

''جی...... مجھے آج سے پہلے بھی آپ کی خدمت کا شرف حاصل ہوا ہے۔ شاید آپ کو یاد نہیں۔ ان دنوں آپ بہت مضمحل اور پریشان اور کھوئی کھوئی سی رہتی تھیں۔ آپ تو اپنے ماحول سے بھی بے خبر رہتی تھیں۔ میرے وجود کا احساس آپ کو کیسے ہوتا!......''

وہ بات کہتے رک گیا جیسے اس کو احساس ہو گیا ہو کہ وہ اپنے مقام کو بھول گیا تھا اور اس مقام سے تجاوز کر گیا تھا۔ اس کے چہرے پر ندامت کی سرخی چھا گئی اور اس نے فردوس سے معذرت چاہتے ہوئے کہا:

''مجھے معاف فرمائیں۔ نہ جانے مجھے کیا ہو گیا تھا کہ الفاظ میرے قابو میں نہ آ سکے اور میں نہ جانے کیا کہتا چلا گیا۔''

''معذرت کی ضرورت نہیں، میاں۔ تم نے اچھا کیا۔ جو کچھ تم نے کہا اس میں کوئی برائی نہ تھی۔ اس خاموش ماحول میں اگر تم نہ بول اٹھتے تو تعجب ہوتا۔ ہم گھنٹے بھر سے خاموش تھے اور منتظر تھے کہ کوئی آئے اور خاموشی کو تکلم میں بدل دے۔ اس خدمت کے لیے ہم سب تمہارے ممنون ہیں......''

''تمہارے کھانے کی داد نہ دینا ظلم ہو گا مگر تم جس داد کے مستحق ہو اس کی شاید ہم میں سے کسی میں استعداد ہی نہ ہو۔ میاں، تم گفتگو اور چال ڈھال سے بڑے نستعلیق آدمی معلوم ہوتے ہو۔ اس لیے تم کو داد دیتے ہوئے بھی تمہاری فنکاری کی توہین کا احساس ہوتا ہے۔

تم فنکار ہو۔ تمہارے فن سے ایسا حظ ملا کہ یورپ اور مشرق کے عظیم نغموں، تصویروں، عمارتوں میں عیاں استغراق آفریں حظ ہی اس کا مثل ہو سکتا ہے۔''

اس تعریف پر وہ پریشان سا ہو گیا اگرچہ اس کے ہاتھوں کی پھرتی اور اس کی حرکات سے عیاں سلیقے میں کوئی فرق نہ آیا۔ وہ ہر ایک کی مرضی کے مطابق کافی بنا کر ان کے پاس پڑی ہوئی تپائیوں پر رکھ کر، الگ ہو کر، دروازے کے پاس دست بستہ کھڑا ہو گیا۔

فردوس نے کافی کا ایک گھونٹ لیا۔ حلق سے اتارتے ہوئے اس سے پوچھا

''آغا جی تو بخیریت ہیں؟''

''جی''

''باقی سب لوگ اچھے ہیں؟''

''جی۔ وہ سب آپ کے لیے دعا گو ہیں اور آپ کی واپسی کے منتظر۔''

''آغا جی نے میرے لیے کوئی پیغام تو نہیں دیا؟''

''دیا ہے.....مگران کا ارشاد یہی تھا کہ کل صبح آپ کی خدمت میں پیش کیا جائے...... فکر کی کوئی بات نہیں......ایک خط ہے اور انہوں نے کہا تھا کہ جب تک جی چاہے یہاں رہیے۔''

وہ ایک ایک پیالی پی چکے تو انہوں نے دوسری پیالی کی فرمائش کی۔ اس نے دوسری پیالی بنا کر ان کی تپائیوں پر رکھ دی اور خود پھر دروازے کے پاس جا کھڑا ہوا۔ انہوں نے جب دوسری دوسری پیالی بھی لی تو فردوس نے اس کو اشارہ کیا کہ وہ برتن لے جائے۔ وہ برتن تپائیوں سے اٹھا کر، میز پر رکھ، میز کو دھکیلنے لگا تھا کہ متین صاحب اس سے مخاطب ہوئے۔

''میاں! برتن رکھ کر، چاکری کا لباس اتار کر، فرصت کا لباس پہن کر یہاں چلے آؤ۔ آج ہمیں تمہارے تکلم کی ضرورت ہے۔''

وہ حیران تو ہوا مگر چاکری اس کا وصف تھا لہٰذا اس نے سرِ تسلیم خم کیا اور میز کو دھکیلتے ہوئے کمرے سے باہر نکل گیا۔

جب میز کا شور دور ہو گیا تو فردوس تعجب سے متین صاحب سے مخاطب ہوئی۔

''آپ نے اس کو پریشان کر دیا ہے! کیا پوچھیں گے آپ اس سے؟''

''اس کا نام زروان ہے اور زروان زرتشتی دین میں، جیسا کہ میں نے پہلے بھی بتایا ہے، زمان کا روپ ہے۔ ایسا نام ہمارے ملک میں کسی ماں باپ کو سوجھ نہیں سکتا۔ لہٰذا اس کا یہ نام اس کے ماں باپ نے نہیں رکھا، کسی اور نے رکھا ہے اور شاید کسی خاص وجہ اور وصف کے باعث۔

اور اس کے سراپے کی متانت، اس کی کمر کا ستواں پن، اس کے چہرے کے نیچے اس کی ہڈیوں کا تانا بانا، اس کے آنکھوں میں چھپا ہوا گہرا غم، اس کی آنکھوں کے کونوں کی سلوٹوں میں نہاں تدبّر میں میں اس کی جنم بھومی کے مناظر کو دیکھ رہا ہوں۔ وسیع سرسبز میدانوں میں ایک ہی انداز میں جھکے ہوئے، مڑے ہوئے، درخت؛ سرسراتی ہوئی تیز ہوا اور ان کے درمیان ننھی ننھی، تنگ نہروں کا بچھا ہوا جال۔ اس کی جنم بھومی پر کوئی مصیبت آئی تھی جس کے نشانات ابھی تک اس کے جسم پر نقش ہیں۔ اس دھرتی کا نصیب پن، اس کی سر بلندی، اس کے تن بدن میں رچی دیکھتا ہوں۔ اپنی دھرتی کا شاید وہ واحد داستان گو ہے اگر چہ اس کو ابھی تک اس کا احساس نہیں اور نہ ہی داستان گو بننے کی اس میں جرأت ہے۔ وہ ہمارے ملک کے ماضی و حال اور مستقبل کی بہت ہی جامع تصویر ہے جو اپنی تفسیر بھی خود ہی کرتی ہے۔

ہم اور ہماری دھرتی میں وہ ایک ایسا رشتہ ہے جس سے کٹ کر ہم کٹی ہوئی پتنگ کی طرح فضاؤں میں ہمیشہ ہمیشہ اڑتے رہیں گے، بے محور، بے منزل، بے سمت۔ اور اس رشتے کے بغیر ہماری دھرتی ہمارے طبائع کی روشنی سے ہمیشہ ہمیشہ کے لیے محروم رہے گی۔ اس روشنی کے بغیر ہماری دھرتی میں جنم پانے والے پھل، پھول رس اور خوشبو سے محروم رہیں گے۔''

''آپ کی باتوں سے مجھے ڈر لگنے لگا ہے اگر چہ ان باتوں سے محروم رہنا کبھی بھی مجھے گوارا نہ ہوگا۔'' فردوس نے کہا۔

''میں سمجھتی ہوں کہ اگر واقعی زروان ایسا رشتہ ہے تو ہمیں حالات کے خالق اور رب کا شکر گزار ہونا چاہیے۔ ہمیں واقعی ایک محور، ایک سمت، ایک منزل کی ضرورت ہے جو اس دھرتی سے جنم پائے۔ ہم لوگ ایسی روشنی ہیں جو خلاؤں میں سرگرداں ہے، گم ہے، جس سے کوئی جہاں روشن نہیں، جو کسی جہاں کا راہ نما ستارہ نہیں۔'' عالمہ بولی۔

تقی اور جمیل اور رابعہ نے سر کے اشارے سے اس پر صاد کیا۔

''زروان وہ قوت، وہ کشش ہے جو سرگرداں روشنی کو ستارہ و قمر و شمس بناتی ہے۔ یہی

اس کا کام ہے، یہی اس کی حیات کا مقصد ہے۔''

متین صاحب کی بات ختم ہوتے ہی ایک بار پھر فضا پر گہری خاموشی چھا گئی، مگر اس خاموشی میں پہلا سا اطمینان نہ تھا، اس خاموشی میں ایک بے تابی مچل رہی تھی۔ متین صاحب کے سوا وہ سب زروان کی آمد کے منتظر تھے۔ فردوس کے دل میں انتظار کی بے تابی کے ساتھ ساتھ خوف تھا کہ شاید متین صاحب کس کٹھن سفر پر لے نکلیں۔ اس کو زروان کے قرب کے تصور ہی سے الجھن ہو رہی تھی۔ اس کو زروان، زمان، کی ضرورت اور آرزو نہ تھی، اس کو تو مکان کے ایوانوں اور محرابوں کی آرزو تھی جن کی گود میں وہ سکون اور اطمینان پا سکتی۔

زروان کمرے میں داخل ہوا۔ وہ شلوار، قمیص، سویٹر اور گرم کوٹ پہنے تھا اور اس نے سر پر کلاہ پر لنگی باندھ رکھی تھی جس سے اس کے متین سراپے میں ایک وقار کی سی کیفیت پیدا ہو گئی تھی۔ وہ ٹھٹکا۔ متین صاحب نے اس کو اشارے سے ایک صوفے کی کرسی پر بیٹھنے کو کہا مگر وہ پاؤں سے چپل اتار کر قالین پر ہی بیٹھتے ہوئے بولا: ''ہم لوگوں کے لیے فرش ہی کرسی ہے۔ میں اپنے مقام کو پہچانتا ہوں۔ اپنے مقام سے تجاوز نہ کرنے میں ہی راحت سکون اور اطمینان ہے۔ بلند مقام کے تصور ہی سے میرا تو سر چکرانے لگتا ہے۔ اگرچہ بچپن میں بلند مقام کی آرزو بہت ستاتی تھی......''

وہ بات کہتے کہتے رک گیا جیسے اپنی چرب زبانی پر حیران ہو رہا ہو۔ وہ خاموش ہو گیا۔ وہ اپنے آپ پر، باتیں کرتے چلے جانے کی خواہش پر قابو پانے کی کوشش کر رہا تھا۔ متین صاحب نے دیکھا کہ وہ ناکام ہو چلا ہے۔ وہ اس کی مدد کو لپکے اور اس سے مخاطب ہوئے:

''میاں، کیا نام ہے تمہارا؟''

''زروان!'' وہ حیرانی سے پکار اٹھا۔

''میرا مطلب تھا کہ ماں باپ، بہن بھائی تمہیں کس نام سے پکارتے تھے۔''

''ماں باپ تو غلام محمد کہتے تھے اور بڑی بہن ''تارے'' کہہ کر پکارتی تھی۔''

''تارے کیوں؟''

''وہ کہا کرتی تھی کہ میں ان کے اندھیرے گھر کا تارا تھا۔ وہ مجھ سے دس سال بڑی تھی۔''

''تمہاری طرح تمہاری بہن بھی خوبصورت ہوگی۔''

''جی! نہ ہوتی تو اچھا ہی ہوتا۔ مگر وہ تھی ہمارے گھر کی چاندنی، اندھیری راتوں میں اس کی کہانیاں ستاروں کی طرح روشن جہاں دکھاتی تھیں...... وہ خوبصورت نہ ہوتی تو اچھا ہی ہوتا۔''

''تم وسیع میدانوں کے رہنے والے ہو۔''

''جی ہاں، ہمارا گاؤں نیلے، روشن آسمان تلے، سرسبز میدانوں میں ایک نگینہ تھا۔ افسوس اجڑ گیا۔''

''کیسے؟''

''ہمارا گاؤں ہی نہیں، دور دور کے گاؤں تک سرسبز تھے، آباد تھے، فصلیں اچھی ہوتی تھیں، سال میں وقت پر بارش ہوجاتی تھی، ڈھور ڈنگروں کے لیے چارہ کافی ہوجاتا تھا۔ ڈنگر صحت مند تھے، منوں دودھ دیتے تھے۔ مرد، عورتیں، جوان اور بچے بے فکر سبزہ زاروں میں محنت کرتے، ہل چلاتے، گیت گاتے، شادی بیاہ رچاتے، زمین وآسمان کے مالک کے گن گاتے۔

ایکا ایکی ایک دن گاؤں گاؤں خبر پھیل گئی کہ ہمارے دیس میں نہر کھدے گی جو نور پور کے ریگستانوں کو سیراب کرے گی اور ہماری زمینوں کو بھی پانی دے گی۔ سب لوگ خوش تھے کہ فرصت کے دنوں میں کمائی والا کام مل جایا کرے گا اور سارا سال پانی ہونے سے نئی نئی فصلیں کاشت ہوسکیں گی۔ پورے دیس میں خوشی کی لہر دوڑ گئی، نئے گیت بنائے گئے۔

میری ماں سنایا کرتی تھی کہ نہر برسوں کھدتی رہی۔ ہمارے دیس کے لوگ دور دور تک اس نہر کو کھودنے کے لیے گئے۔ انہوں نے زندگی میں پہلی بار اتنی دور کا سفر کیا تھا۔ انہوں نے پہلی بار ایسی دھرتی دیکھی جہاں سبزہ نہ تھا، درخت نہ تھے، ہر طرف ریت ہی ریت تھی۔

پھر ایک دن خبر پھیل گئی کہ اگلے دن نہر میں پانی آئے گا۔اس خوشی میں سارے گاؤں میں کسی نے کام نہ کیا اور نہر کے دونوں کناروں پر بچے، جوان، مرد اور عورتوں کے ٹھٹ کے ٹھٹ لگ گئے۔ دور سے پانی دوڑتا ہوا آیا اور ہمارے گاؤں سے آگے نکل گیا۔اس دن سے پہلے دوڑتا ہوا پانی کسی نے نہیں دیکھا تھا دریا بھی تو ہمارے دیس سے میلوں دور تھا، اتنا دور تھا کہ کسی اور دیس کی بات معلوم ہوتی تھی۔

ہفتوں تک بچے اور نوجوان صبح سے شام تک نہر کے کنارے کھیلا کرتے، جو نوجوان گاؤں کے جوہڑ میں تیرنا سیکھ چکے تھے وہ اس نہر میں نہانے کی بھی جرأت کر لیتے۔

یہ باتیں میری پیدائش سے برسوں پہلے کی ہیں۔نوراں، میری بہن، کی پیدائش سے بھی پہلے کی بات ہے یہ تو۔ان دنوں، میری ماں کہا کرتی تھی کہ ''میں جوان تھی اور تمہارا باپو ان دنوں اپنے کھیت میں اکیلا ہل چلایا کرتا تھا۔ جب میں وہاں سے گزرتی تو وہ لمحہ بھر کے لیے ہل کو روک لیتا اور جب میں گزر جاتی تو پھر ہل چلانے میں مصروف ہو جاتا۔''

نہر بننے کے بعد پہلے پہل تو بڑی اچھی اچھی فصلیں ہوئیں، بہت خوشحالی پھیلی، مگر آہستہ آہستہ سال بسال فصلیں کم ہونے لگیں۔زمینوں میں سیم، کلر پیدا ہونے لگا۔اس نئی مصیبت کا کوئی حل نہ ہو سکا۔نہر کے ساتھ ساتھ کے کھیت اور باغ ویران ہوتے چلے گئے اور پھر ان کے بعد ان کے ساتھ ساتھ کے کھیت۔خوشحالی خواب بنتی چلی گئی۔

نوراں کہتی تھی کہ جب وہ پاؤں چلنے لگی تو ابھی ہمارا باغ پانی کی مار سے محفوظ تھا مگر جوں جوں وہ بڑی ہوتی گئی باغ پانی کی مار سے اجڑتا چلا گیا، درخت جڑوں کے گل جانے سے گرتے چلے گئے اور ایک دن باغ باغ نہ رہا، ویران ہو گیا، آخری درخت بھی گر گیا۔اس دن وہ، ہماری ماں بہت روئے۔

جب میں پیدا ہوا تو ہمارے کھیت ویران ہو چکے تھے۔ دور دور تک ویرانی پھیل چکی تھی۔میرا باپ میلوں دور ایک دوسرے گاؤں میں کسی زمیندار کے کھیتوں میں ہل چلایا کرتا تھا۔ دور دور تک بے کاری عام تھی جس کی وجہ سے زمیندار اپنے کاشتکاروں کی محنت کو سستے داموں خرید لیتے تھے۔آہستہ آہستہ برسوں کا جمع کیا ہوا اندوختہ ختم ہونے لگا۔پرائی کاشت

سے مشکل سے پیٹ کی بھوک مٹتی تھی۔

بدحالی اور ویرانی کے یہ دن رات میری ماں برداشت نہ کرسکی اور چل بسی۔ اب نوراں ہی میری ماں تھی، بڑی بہن تھی۔ وہ دن بھر کسی زمیندار کے گھر جا کر دانے اور گندم پیستی، باپ منہ اندھیرے کام پر نکل جاتا اور رات گئے لوٹتا۔

نوراں میرے دیکھتے دیکھتے جوان ہوئی اور پھر آہستہ آہستہ غریبی کے ستم سہتے اس کے چہرے کی رنگت پیلی پڑنے لگی، اس کے جسم سے گوشت اترنے لگا۔ مگر پھر وہ رہی ہمارے گاؤں کا نور ہی۔

میرا باپ محنت کرتے کرتے بوڑھا ہوگیا، تھک گیا۔ کام پر بھی دیر دیر سے جانے لگا۔ غریبی کے غم اور نوراں کے بر کی تلاش میں وہ دن بدن ڈھلتا ہی چلا گیا۔

ان دنوں اکثر سننے میں آتا کہ آج فلاں نے اور کل فلاں نے غریبی سے تنگ آ کر اپنی لڑکی کسی شہری یا دور کے کسی زمیندار یا نہر کے کسی بابو کے ہاتھ بیچ دی ہے۔ یہ سن سن کر میرا باپ رات رات بھر بستر پر کروٹیں لیا کرتا۔

آخر ایک دن میرے باپ کو اس کے زمیندار نے جواب دے دیا کیونکہ اس کو جواں محنت کار عام اور سستے داموں ملتے تھے۔ کچھ دن تو میرا باپ گاؤں میں سارا سارا دن پاگلوں کی طرح گھومتا رہا اور پھر ایک دن وہ صبح سویرے ہی مجھے ایک ہمسایے کے گھر چھوڑ نوراں کو لے کر گاؤں سے نکل گیا۔ جب شام کو نوراں کے بغیر لوٹا تو مجھے دیکھ کر زار زار رونے لگا۔ میں بچہ ہوتے ہوئے بھی بچہ نہ تھا۔ عمر میری آٹھ نو برس تھی مگر سمجھ جوانوں سے کم نہ تھی۔ سمجھ گیا کہ باپ نوراں کو بیچ آیا ہے۔

اس رات اور اس کے بعد ہفتوں رات کو میں سو نہ سکا۔ گاؤں کی فضا میں میرا دم گھٹنے لگا۔ ایک دن ابھی میرا باپ سو رہا تھا کہ میں اٹھا اور نہر کی طرف چل دیا۔ نہر پر پہنچ کر میں نے نہر میں نے کودنا چاہا مگر ہمت نہ ہوئی۔ نہر کے ساتھ ساتھ چل دیا۔ دوپہر تک چلتا رہا، تھک جاتا تو کسی درخت کے سائے میں بیٹھ جاتا مگر جب اپنی مصیبت کے خیال سے دم گھٹنے لگتا تو ایک بار پھر چلنے لگتا۔ سہ پہر کے قریب ایک ریسٹ ہاؤس سے ذرا دور میں بھوک

اور تھکن سے نڈھال ہو کر گر پڑا۔

ہوش آیا تو لالٹین کی روشنی میں، میں نے دیکھا کہ نوراں میری چارپائی پر جھکی، دونوں ہاتھوں سے میرے چہرے کو سہلا رہی تھی۔ میں حیران ہوا تو اس نے ہونٹوں پر انگلی رکھ کر مجھے خاموش رہنے کو کہا۔ میں خاموش رہا۔اس نے مجھے گرم گرم دودھ لا کر دیا۔ میں نے پیا اور مجھ پر غنودگی طاری ہوگئی اور میں سو گیا۔ جب میں سو کر اٹھا تو دن چڑھ چکا تھا، سارے کمرے میں روشنی تھی۔نوراں نے مجھے کھانا لا کر دیا۔ میں نے برسوں میں پہلی بار سیر ہو کر کھایا۔ میں نے آخری لقمے کے بعد پانی پی کر نوراں کو غور سے دیکھا۔اس کا چہرہ بھر گیا تھا، اس کے چہرے پر سرخی تھی، اس کی ہڈیوں پر گوشت چڑھ آیا تھا۔ وہ میرے بچپن کی نوراں بن گئی تھی۔ مجھے غور سے اپنی طرف دیکھتے ہوئے دیکھ کر اس نے مجھ سے نظریں چرالیں۔میرے دل کا زخم دکھنے لگا۔

دوپہر کو اس کا مالک گھر آیا میں نے اس کو غور سے دیکھا وہ نوجوان تھا۔ ہوگا کوئی پچیس کے لگ بھگ۔اس کے چہرے سے شرافت ٹپکتی تھی مگر اس کی آنکھوں میں عجب حزن تھا۔ میں نے سوچا کہ اس بابو کو نہ جانے کیا گھن لگا ہے۔ مجھے نوراں کے پاس بیٹھا دیکھ کر وہ شرما سا گیا مجھ سے دور فرش پر بچھی ہوئی دری پر بیٹھ گیا۔نوراں نے اس کے آگے کھانا لا کر رکھ دیا اور خود اس کو پنکھا کرنے لگی۔

اس کے پنکھا کرنے میں چاکری کا رنگ کم تھا اور محبت کا رنگ زیادہ تھا۔ مجھے چارپائی پر لیٹے لیٹے غصہ سا آ گیا کہ اپنے خریدار سے پیار کی کیا ضرورت تھی اور وہ بھی میرے سامنے۔

جب وہ کھانا کھا کر چلا گیا تو میں نے نوراں سے پوچھنا چاہا کہ اس کی اور اس کے خریدار میں تعلقات کی نوعیت کیا تھی، مگر مجھے جرأت نہ ہوئی۔ میں ہفتوں اسی کوشش میں رہا مگر یا تو مجھے جرأت نہ ہوئی اور جب مجھے جرأت ہوتی تو نوراں کے سراپے پر ایسا عجز چھا جاتا کہ میرا دل بیٹھ جاتا اور میں اپنے سوال کو دل کی گہرائیوں میں ڈبو دیتا۔

اس سارے عرصے میں شفقت علی، نوراں کے خریدار کا یہی نام تھا، کا طرزِ عمل عجیب

سا تھا۔ مجھے یوں لگتا تھا جیسے وہ مجھ سے معافی کا طلب گار ہو، اپنے کئے پر نادم ہو۔

ایک دن سورج ڈھل رہا تھا، شفق کے عکس سے نہر سرخ ہو رہی تھی، نوراں کھانا پکانے میں مصروف تھی کہ شفقت علی نے مجھے اشارے سے بلایا اور گھر سے باہر نکل گیا۔ میں بھی اس کے پیچھے باہر نکل آیا۔ ہم دونوں آگے پیچھے نہر کے کنارے کنارے گھر سے دور ایک درختوں کے جھرمٹ میں جا نکلے۔ شفقت علی نے مجھے بیٹھ جانے کو کہا۔ میں بیٹھ گیا کچھ دیر وہ سبزے پر ٹہلتا رہا اور پھر زمین پر بیٹھ گیا۔ اس کا سانس بڑی تیزی سے چل رہا تھا، جیسے اس کے سینے پر بہت بڑا بوجھ ہو۔

''تمہاری بہن بہت اچھی ہے۔ بالکل میری بہنوں کی طرح۔ مجھے اپنی بہنوں سے بہت پیار ہے۔ میری تین بہنیں ہیں۔ مجھ سے سب چھوٹی ہیں۔ سب سے بڑی تمہاری بہن کی عمر کی ہو گی۔ جب میں نوکر ہوا تو مجھے سب سے زیادہ غم ان سے دور ہو جانے کا تھا۔ اس نوکری سے پہلے میں کبھی بھی اپنے گھر سے، گھر والوں سے دور نہ ہوا تھا۔ ہمارا گھر شہر کے بیچوں بیچ ہے۔ اس میں بڑا سا صحن ہے، اس کے ایک حصے میں ننھا سا باغ ہے اور باغ کے ایک کونے میں ایک نیم کا پیڑ، یہ پیڑ بچپن سے اپنا دوست، اپنا بھائی، اپنا ہمجولی رہا ہے۔ اس کی ہریالی کو دیکھ کر اپنا دل ہمیشہ ہرا ہو جاتا۔ برسات میں ہم بہن بھائی نیم کے پیڑ کی شاخوں میں جھولا ڈال لیتے اور میں بہنوں کو جھولا جھولایا کرتا۔

بچپن بیت گیا اور میں سکول جانے لگا تو ہر روز نیم کے پیڑ کی یاد ستاتی، ننھی بہنوں کی توتلی باتیں یاد آتیں۔ پڑھنے میں دل نہ لگتا۔ مگر آہستہ علم نے نئے دیسوں کے منظر دکھائے اور دل پڑھائی میں لگ گیا۔ جونہی سکول سے چھٹی ہوتی میں سیدھا گھر کو چلا آتا۔

جوان ہوا تو شادی بیاہ کے موقعوں پر رشتہ دار لڑکیوں سے ملاقات ہوتی تو ان کی خوبصورتی، ان کے بھولپن، ان کی جوانی سے ہمدردی پیدا ہوتی۔ ان کو ہنسا کر بہت خوشی ہوتی۔ کبھی خیال نہ آتا کہ بیاہ کے ہنگاموں، ڈھولک کے شور، بڑی بوڑھیوں کی باتوں میں مصروفیت سے فائدہ اٹھاتے ہوئے جوان لڑکیوں کو تنگ کیا جائے، ان کو اندھیرے میں پکڑ کر چوم لیا جائے۔ دوسرے رشتہ دار لڑکے مجھ سے اکثر ناراض رہتے کہ میں ان کی راہ میں

حائل رہتا تھا۔

پڑھائی کے دن ختم ہوئے تو نوکری کی تلاش ہوئی۔امتحان دیا، پاس ہوا تو نہر کے محکمے میں اورسیری مل گئی، پچھلے چار سال سے گاؤں گاؤں پھرتا، کام کرتا اور تھک کر جب گھر آتا تو گھر کی تنہائی ستاتی، بہنوں کی، ماں باپ کی یاد ستاتی، نیم کا پیڑ یاد آتا۔ دل ویران ہو جاتا۔ اس ویرانی کا دوسرے لوگوں نے حل ڈھونڈ رکھا تھا۔ وہ گاؤں کی کسی عورت کو، لڑکی کو، رات بھر کے لیے پیسے دے کر اپنے پاس رکھ لیتے۔ مگر مجھے اس حل سے ہمیشہ ہی الجھن سی ہوئی، کراہت ہوتی، اس کے خیال ہی سے دل میں ہول اٹھتا اور آنکھوں کے سامنے اپنی بہنوں کے بھولے بھولے چہرے آ جاتے اور دل میں اک دکھن سی گھر کر لیتی۔

کام کے ساتھی میری حالت کا مذاق اڑاتے، مجھے طرح طرح کے طعنے دیتے، مجھ سے طرح طرح کی شرارتیں کرتے، کبھی میرے سونے کے کمرے میں کسی جوان لڑکی کو دھکیل کر کمرا بند کر دیتے۔ان کی شرارتوں سے الجھن تو ہوتی مگر دل کبھی نہ دکھتا کیونکہ وہ مجھ سے ہر بات میں الگ تھے، انہیں اپنے گھر والوں سے، اپنے گھر سے پیار نہ تھا، ان کو کبھی گھر یاد آتا تو محض ان آسائشوں کے باعث جو ہر گھر کا وصف ہیں۔

دل بہت دکھتا جب گاؤں کے جوان، جن کی اپنی بہنیں جوان ہوتیں، مجھے دیکھ کر اشاروں سے مجھ پر ہنسا کرتے۔ کبھی کبھار گاؤں کا کوئی گبھرو مجھے شام کو نہر کے ساتھ ساتھ درختوں کے سایے میں تنہا سیر کرتے دیکھ کر فقرہ کس دیتا۔

میرے ماتحت اور گاؤں والوں نے میری اس حالت سے فائدہ اٹھانا شروع کر دیا اور میرے سرکاری کاموں میں دخل دینا شروع کر دیا اور اپنے فائدے کے لیے ناجائز حرکتیں کرنی شروع کر دیں جس سے میری شہرت کو نقصان پہنچنے کا خطرہ پیدا ہو گیا۔ میں نے اپنے کام میں سخت گیری اختیار کر لی مگر ان کی آنکھوں میں ہمیشہ مجھے یہی نظر آیا کہ کہہ رہی ہوں کہ ''تم لاکھ سخت گیر بنو مگر ہو تو نامرد ہی'' ان طنز بھری نگاہوں کی میں زیادہ دیر تاب نہ لا سکا اور ایک دن میں نے اپنے ایک ماتحت سے کہہ ہی دیا کہ مجھے ایک عورت خرید دے کیونکہ رات بھر کے سودے سے مجھے کراہت ہوتی تھی۔ اس نے بڑی کوشش سے ایک

کنواری کا سراغ لگایا جو آوارہ نہ تھی مگر جس کا باپ اس کو بیچنے کے لیے تیار تھا۔

میں نے اس لڑکی کے باپ کو قیمت ادا کر دی اور لڑکی کو یہاں لے آیا۔ میں اپنے خیالوں میں اتنا گم تھا کہ قیمت ادا کرتے ہوئے نہ تو میں نے لڑکی کو دیکھا اور نہ لڑکی کے باپ کو۔ لڑکی یہاں آ گئی مگر میں اس کی طرف دیکھتے ہوئے، اس سے بات کرتے ہوئے گھبراتا تھا، ہر دم اس کے سایے سے بچتا رہتا، اس خرید کے باوجود میرا مسئلہ حل نہ ہوا۔ میرے ماتحتوں نے میری غیر حاضری میں گاؤں کی عورتوں کے ذریعے پتہ لگا لیا کہ میں نے لڑکی کو ہاتھ نہیں لگایا۔ اس خبر سے ان کے، گاؤں والے کے طرزِ عمل میں پہلے سے زیادہ بے باکی، بلکہ گستاخی آ گئی۔

آخر ایک رات میں نے تنگ آ کر لڑکی پر ہلہ بول دیا۔ وہ رات بھر روتی رہی۔ اس کا رونا میری مردانگی کا اعلان ثابت ہوا، میری نجات کا ذریعہ بنا۔ جب اگلے دن میں دوپہر کے وقت گھر آیا تو میں نے اس کو پہلی بار گھونگھٹ کے بغیر دیکھا۔ وہ میرے انتظار میں تھی۔ مجھے دیکھ وہ کھانا لے آئی اور میرے پاس بیٹھ گئی میں کھانا کھاتا رہا اور وہ پنکھا کرتی رہی۔ برسوں میں پہلی بار میں نے گھر کا سکھ آرام پایا۔ میری سب الجھنیں صاف ہو گئیں، میرے سینے سے بوجھ اتر گیا۔ میں نے محسوس کیا کہ میں پھر اپنی بہنوں کا بھائی بن گیا ہوں۔

اس دن کے بعد لوگوں کی نظروں میں طنز نہ تھی، ان کی نظریں مجھے دیکھ کر جھک جاتیں ہیں، ان کے قدم تیز تیز اٹھنے لگ جاتے ہیں، میرے ماتحت بھی اپنے کام میں چوکس رہنے لگے ہیں۔

اب مجھے صرف ایک دکھ ہے میں نوراں سے شادی نہیں کر سکتا۔ میرے گھر میں ایک کہرام مچ جائے گا، میرے خاندان کی ناک کٹ جائے گی۔ کبھی کبھی مجھے خیال آتا ہے کہ میں چوری چھپے اس سے شادی کر لوں اور اسے اس گاؤں میں کہیں مکان لے دوں اور اس کی آمدن کے لیے تھوڑی سی سرکاری زمین کرائے پر لے دوں۔ میں ابھی تک فیصلہ نہیں کر پایا۔ اس معاملے میں فیصلہ کرنے میں کچھ مدت درکار ہوگی۔ اس میں میری مدد کرو۔ مجھ سے نفرت نہ کرو۔ میں اس نفرت کا سزاوار نہیں۔ میں حالات کے ہاتھوں مجبور تھا، مجبور

ہوں ۔نوراں کا مستقبل مجھے عزیز ہے ۔ میں اس کے مستقبل کا بندوبست کر کے رہوں گا ۔‘‘

میں کچھ مہینے اس کے پاس رہا۔ ایک دن وہ کسی سرکاری کام سے شہر جارہا تھا جہاں اس کو چار پانچ دن تک رہنا تھا۔ میں نے اصرار کیا کہ وہ مجھے بھی ساتھ لے جائے۔ پہلے تو وہ مانا نہیں مگر بعد میں نوراں کے کہنے سے وہ راضی ہو گیا۔ میں شہر چلا آیا۔ میں تین چار دن شہر کو دیکھتا رہا اور جب لوٹنے کا دن آیا تو میں شفقت کے پاس سے بھاگ آیا۔ دنوں شہر میں چھپا رہا۔ ایک دن ریل گاڑی میں سوار ہو گیا۔ کئی جگہ گاڑی سے اتارا گیا، پھر آنکھ بچا کر کسی دوسری گاڑی میں سوار ہو جاتا۔ پندرہ دن میں سانجری پہنچ گیا۔ دن بھر بھیک مانگتا رات کو کہیں زمین پر پڑ کر سو رہتا۔

لوگ اچھے تھے۔ بہت بھیک دیتے۔ پیٹ بھر کر کھاتا جسم میں جان آتی چلی گئی۔ ایک دن جی گھبرا گیا اس بھیک کی زندگی سے۔ نوکری کی تلاش ہوئی۔ ایک دن ایک بوڑھے میاں کو بازار سے ترکاری اور دوسرا سودا سلف لیتے دیکھا، اسکی صورت میں غم اور دکھ کے نشان دیکھ کر طبیعت اس کی طرف متوجہ ہوئی۔ میں نے اس کا پیچھا کیا۔ وہ سامان سے لد گیا تھا۔ میں نے اس کے پاس جا کر اس سے کہا کہ میں اس کا بوجھ اٹھانے میں مدد کرسکتا ہوں۔ اس نے میری طرف غور سے دیکھا اور چیزیں میرے سپرد کر دیں اور ہم باتیں کرتے ہوئے اس کے مالک کے بنگلے کی طرف چل دیئے۔ بنگلے پر پہنچ کر اس نے مجھے مزدوری دینی چاہی مگر میں نے انکار کیا، اس نے مجھے کھانا کھلانا چاہا میں نے انکار کیا اور چلا آیا۔ اس کے بعد میں کئی دن تک اس کا بوجھ اٹھا کر اس کے مالک کے بنگلے تک چھوڑ آتا، مزدوری نہ لیتا، کھانا قبول نہ کرتا اور چلا آتا اور اگلے دن پھر اس کی راہ دیکھتا۔

چند ہفتے یونہی گزر گئے۔ ایک دن اس نے مجھے واپس نہ آنے دیا اور مجھ سے کہا کہ میں اس کا بیٹا بن کر اس کے پاس رہوں۔ میں اس کے پاس رہنے لگا۔ وہ باورچی تھا۔ میں آہستہ آہستہ اس کے کام میں دلچسپی لینے لگا اور چند مہینوں میں اس کا ہاتھ بٹانے کے قابل ہو گیا۔ بازار سے سودا سلف لانا اس نے میرے سپرد کر دیا اور میں اس کی ہدایت کے مطابق سودا خرید کر لے آتا۔ پھر اس نے اپنا فن مجھے سکھانا شروع کیا۔ میں اچھا شاگرد تھا اور مجھے

ساوَل شاہ سے انس بھی ہو چلا تھا اس لیے میں اس کی ہر ہدایت کو سینے پر نقش کرتا چلا جاتا، میرے ہاتھ اس کی ہدایات کو عملی جامہ پہنانے میں طاق ہوتے گئے۔

ایک دن اس کی مالکن نے مجھے بازار سے سودا سلف لاتے دیکھ لیا مگر کہا کچھ نہیں مگر گھر میں آتے جاتے میرا خیال رکھنے لگی۔ کچھ دن کے بعد اس کی مالکن نے مجھے باقاعدہ اپنے ملازموں میں شامل کر لیا، میری تنخواہ پندرہ روپے ماہوار مقرر کر دی، پہننے کو وردی دے دی۔

جب کبھی ساوَل شاہ بیمار پڑ جاتا اس کا کام میں ہی کرتا۔ میرے کام سے مالکن بہت خوش ہوئی اور اس کی نوازشات مجھ پر زیادہ ہوتی چلی گئیں۔ ساوَل شاہ اکثر بیمار رہنے لگا تھا۔ ایک دن اس نے مجھ سے کہا:

''تمہارے آنے سے پہلے میں کام کرنے کی مشین تھا اور بس۔ تمہاری محبت نے مجھے انسان بنا دیا ہے اور اس کے ساتھ ساتھ انسانوں کے آزار بھی دے دیئے ہیں۔ میں خوش ہوں کہ میں انسان مروں گا، میرے بعد مجھے یاد کرنے والا کوئی تو ہوگا۔'' آخر ایک دن ساوَل شاہ چل بسا۔ میں اس کا جانشین ہوا۔

بنگلے میں مالکن نے ملازموں کے بچوں کے لیے ایک چھوٹا سا سکول کھول رکھا تھا جس میں ملازموں کے بچوں کو مفت کتابیں اور پڑھائی دیگر سامان اور ناشتہ اور دوپہر کا کھانا ملتا تھا۔ میں نے بھی اس سکول میں داخلہ لے لیا مگر دن کے وقت میں سکول نہ جا سکتا تھا۔ استاد نے میرے شوق کو دیکھ کر مجھے میری فرصت کے وقت میں تعلیم دینی شروع کی۔ استاد بھی بنگلے میں ہی ایک الگ سے گھر میں رہتا تھا۔ بنگلہ کیا تھا محل تھا۔ کئی منزلوں میں تھا۔ بیسیوں تو اس کے کمرے تھے۔ نوکروں کے لیے چھوٹے چھوٹے گھر تھے۔ ہم سب ملازم مالکن سے اور اس کے حوالے سے مالک سے خوش تھے۔ ہم مالک کو بہت کم دیکھتے تھے۔ ان کا رہائش کا حصہ ہمارے گھروں سے دور، دوسری طرف تھا۔

میرے شوق کو دیکھ استاد نے بھی اپنی سی پوری کوشش کی۔ میں چند برسوں میں دو تین زبانوں میں پڑھنے لکھنے کے قابل ہو گیا۔ مجھے نئے کھانے ایجاد کرنے کا بہت شوق تھا۔ اس موضوع پر جب کبھی کوئی کتاب ہاتھ لگ جاتی حفظ کر ڈالتا۔ اس کے ساتھ میں مختلف کھانوں

میں استعمال ہونے والے اجزا کی صحت وری کے متعلق بھی معلومات بہم پہنچانے لگا۔ ساوَل شاہ کی موت کے بعد چند ہی برسوں میں اپنے فن میں طاق ہو گیا۔ بقول اپنے مالک کے یکتا ہو گیا۔

میرا مالک مجھ پر مہربان ہو گیا۔ میرے لیے مددگار ملازم رکھے گئے۔ میں نے انہیں بھی اس فن میں طاق کر دیا۔ جب میرے مددگار میرے بغیر کام پر حاوی ہو گئے تو میرا مالک مجھے اپنے کاروباری سفروں میں ساتھ ساتھ رکھنے لگا۔ میں نہ صرف اس کا باورچی، خاصہ بردار، بلکہ اس کا خاص ملازم بن گیا۔ وہ مجھ سے مشورہ لینا بھی اپنی شان کے خلاف نہ سمجھتا تھا۔ میرے مشورے خدا کی مہربانی سے اس کے کاروبار کے لیے بہت سودمند ثابت ہوئے۔ اس کے وسیع کاروبار میں دن دونی رات چوگنی ترقی ہونے لگی، اس کے دشمن بھی اس کی دوستی کو فخر سمجھنے لگے۔ ایک دن میرے مالک نے مجھے علی الصبح بلایا اور کہا:

''غلام محمد آج سے تمہارا نام زروان ہے۔ زروان ہمارے دین میں ہر شے کو بدل دینے کی قوت ہے۔ ایک لحاظ سے بڑھنے، پھولنے کی محافظ ہے۔ تم بھی میرے لیے، میرے گھرانے کے لیے ایسی ہی قوت بن گئے ہو۔ جب سے تم نے اس گھر میں قدم رکھا ہے ہر شے بدل گئی ہے، پھل پھول رہی ہے۔ حالات میرے خاندان کے حق میں بدل گئے ہیں۔ میرے دشمن میری دوستی کا دم بھرنے کو فخر جاننے لگے ہیں۔ اس کے لیے میں تمہارا ممنون ہوں۔''

اس دن کے بعد سے میں زروان ہوں۔

زروان خاموش ہو گیا۔ اس کا سانس بڑی آہستگی سے چل رہا تھا جیسے اس کے سینے سے بہت بڑا بوجھ اتر گیا ہو۔ اس کی نظریں جھکی تھیں۔ اس کی آنکھیں آدھی بند تھیں۔ اس کے ماتھے پر ایک نور سا چمک رہا تھا۔

''ایسے مہربان مالک اور مالکن کو تم چھوڑ کر کیوں چلے آئے۔'' عالمہ نے معصومیت اور بے ساختگی سے پوچھا۔

اس کے بدن میں ایک تشنج پیدا ہوا، اس کے شانے اکڑ گئے، اس کا سر اٹھ گیا، اس نے

عالمہ کی طرف حیرت سے دیکھا جیسے کہہ رہا ہو کہ اس چرکے کی آپ سے توقع نہ تھی۔'' اس کے چہرے کی رنگت ماند ہونے لگی، اس کے ماتھے کا نور دھندلا گیا، اس کی آواز اس کے گلے میں اٹک گئی۔ اس کا نرخرا کئی بار اوپر نیچے ہوا جیسے وہ کچھ نگل رہا ہو۔ عالمہ اس کی حالت سے پریشان ہوگئی اور معذرت کرتے ہوئے بولی: ''میری بات سے تمہیں دکھ ہوا۔ میں اس کی معافی چاہتی ہوں۔ میرے وہم و گمان میں بھی نہ تھا کہ اس سوال سے تمہیں روحانی اذیت ہوسکتی ہے...... مے رے...... میرے سوال کو بھول جاؤ۔''

''بھول کیسے جائے بیچارا۔ بہت گہرا گھاؤ تھا کہیں اس کے دل میں جس کو تم نے ہرا کر دیا۔ اب مرہم سے کام نہ چلے گا۔ اب تو نشتر ہی سے سکھ مل سکے گا۔ میاں! اس گھر میں کوئی لڑکی بھی تھی، تمہارے مالک کی بیٹیوں کے علاوہ؟'' متین صاحب نے پوچھا۔

اس کی اٹھی ہوئی گردن میں ایک جھٹکا سا پیدا ہوا جیسے کسی نے اس کے پہلو میں یا پشت میں چھرا گھونپ دیا ہو۔ اس کا سارا بدن تن گیا جیسے دشمن کا مقابلہ کرنے کے لیے تیار ہو رہا ہو۔

''اس نے تم سے اظہارِ عشق کیا تھا؟ اس کو تم سے بے پناہ عشق تھا؟ وہ عشق کا جواب عشق میں چاہتی تھی؟ تمہارے دل میں اس کے لیے عشق کی آگ روشن ہوئی، جنگل کی آگ بنی؟ کیوں؟'' متین صاحب نے نشتر چلائے۔

''متین صاحب کتنے بے درد ہیں آپ! کن کن مقاموں پر آپ کی نظر جا پڑتی ہے! بچارے کو دم تو لینے دیں، سنبھلنے تو دیں! ایک ہی سانس میں اتنے وار! بے درد، بے درد!''

''جراحی بے دردی کے سوا ممکن بھی نہیں بی بی! اب اس کے سوا چارہ ہی کیا ہے۔ میں نے برسوں زخم کو چھپایا مگر یہ رستا ہی رہا۔ اچھا ہی ہوا آج اس پر نشتر چل گیا۔ خون بہنے سے شاید اس پر انگور آجائے اور یہ مندمل ہو جائے۔'' زروان کراہا۔

''عجیب آدمی ہو! اپنے ستمگر کی حمایت کرتے ہو'' فردوس بلبلائی۔

باقی سب لوگ حیرت سے کبھی متین صاحب کو، کبھی زروان کو تکتے تھے۔ زروان بڑی مشکل سے سانس لے رہا تھا۔ اس کے چہرے پر آہستہ آہستہ پیلاہٹ روشن ہونے لگی،

اس کے ماتھے کا نور اپنی تاب کی طرف لوٹ آیا۔ اس نے ہونٹوں پر زبان پھیری، دہن کا لعاب نگلا اور ایک لمبا سانس لیا اور پھر کہنے لگا۔

''صاحب! میں آپ کی نظر پر حیران ہوں، میں آپ کی سوجھ بوجھ کا ممنون ہوں، میں آپ کے نشتر سے دکھ میں ہوں مگر پھر بھی احسان مند ہوں کہ جس دکھ کا سامنا کرنے کا مجھ میں یارا برسوں نہ ہوا تھا آج میں اس دکھ کا سامنا کر سکوں گا اور آپ کی مدد سے اس پر قابو پا سکوں گا۔ آپ بڑے زیرک جراح معلوم ہوتے ہیں مگر محض جراحی سے کام نہ چلے گا، مرشد کی سی راہنمائی اور ہدایت کی بھی ضرورت ہوگی۔ کاش آپ راہنمائی بھی کریں، منزل کی صورت بھی دکھلائیں۔''

متین صاحب اس کے چہرے پر نظریں جمائے خاموش بیٹھے رہے۔ ان کے جسم میں نام کو بھی جنبش نہ تھی، ان کا سانس بھی نہ چل رہا تھا، صرف ان کی آنکھوں میں بے پناہ روشنی سے ان کی زندگی کا نشان ملتا تھا، ان کی زندگی کا اعتبار آتا تھا۔ ان کی آنکھوں کی روشنی اندھیرے سمندر پر مینارِ نور کے دھارے کی طرح تھی یا شاید جراح کے برقی چراغ کی طرح جو زخم کے عین اوپر روشنی کر رہا ہو۔

زروان کی نظریں متین صاحب کی نظروں سے بچ نہ سکیں اور دونوں آپس میں پیوست ہوگئیں اور متین صاحب کی آنکھوں کی روشنی زروان کی آنکھوں میں اترنے لگی اور اس کا چہرہ روشن ہوا، اس کا ماتھا نور ہوا، اس کے سارے بدن میں ایک وجد کی کیفیت رچ گئی۔ اس کے چہرے کے نور میں ایک مراقبے کی کیفیت آتی چلی گئی اور وہ آہستہ آہستہ بولنے لگا، اس کی آواز بدل گئی، اس میں یقین تھا، اعتماد تھا۔ اس کے اندازِ بیان میں ایسی کیفیت تھی جیسے کوئی کسی وسیع و عریض گلزار کے مناظر کا حال بلندی پر کھڑے ہو کر سنا رہا ہو۔ وہ کہنے لگا:

''اپنے مالک کا منظورِ نظر ہوئے اور زروان کا لقب پائے مجھے ایک سال سے اوپر کچھ عرصہ ہوا تھا کہ مالک کی بہن اور بہنوئی کار کے حادثے میں ہلاک ہوگئے اور ان کی اکلوتی بیٹی، انتی، ہمارے یہاں رہنے کے لیے آ گئی۔ چند مہینے تو وہ بہت غمگین سی رہی مگر پھر آہستہ آہستہ وہ اپنے ماحول میں دلچسپی لینے لگی۔ مالک کے ساتھ آتے جاتے وہ مجھے بہت غور سے

دیکھتی۔ اس کا دل بہلانے کے لیے مالک کی لڑکیاں اور لڑکے اس کو پکنک منانے کے لیے لے جاتے۔ مجھے ہمیشہ ان کے ساتھ جانا پڑتا۔ ان کے خورونوش کا سب بندوبست میرے سپرد ہوتا۔ مجھے اس سے ہمدردی تھی۔ اس سے حادثہ بھی تو بہت دردناک پیش آیا تھا۔ میں اس کو اس کے غم سے بہلانے کے لیے نئے نئے کھانے، نئے نئے مشروب ایجاد کرتا۔ ان دنوں مجھ پر ایجادیں الہام ہوتی تھیں۔ کھانوں کے علاوہ پھولوں کی ترتیب و آرائش میں بھی میں نے مہارت پیدا کر لی تھی۔ میرا مالک پھولوں کا عاشق تھا۔ ہمارے باغ میں رنگ رنگ، قسم قسم کے پھول تھے۔ میرے مالک کو کاروبار کے علاوہ اگر کوئی لگن تھی تو نئے نئے پھول تلاش کرنے کی، ان کو اپنے باغ میں اگانے کی۔ لیکن اس کا یہ مطلب نہیں کہ وہ حسن کے دوسرے مظاہر سے بیگانہ یا بے خبر تھا۔ اس کو موسیقی اور پینٹنگ سے بھی شغف تھا۔ ہمارے گھر میں بیسیوں ہی اعلیٰ درجہ کی تصویریں آویزاں تھیں، ان کے لیے ایک گیلری خاص طور پر بنوائی گئی تھی۔

مالک کے ہر شوق کی تسکین کے لیے میں نے اس شوق کی سوجھ بوجھ پیدا کرنا اپنا فرض سمجھ لیا تھا۔

اور یہ سب سوجھ بوجھ میں نے انتی کو غم سے بے گانہ بنانے کے لیے استعمال کی۔ جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ آٹھ دس پکنکوں میں انتی کھانوں، پھولوں، موسیقی میں دلچسپی لینے لگی۔ مالک کا ایک بیٹا وائلن بہت ہی اچھا بجاتا تھا۔ میں اپنی محنت کو بارآور ہوتے دیکھ بہت خوش ہوا اور میں نے اپنے دل ہی دل میں انتی اور مانک کا رشتہ طے کر لیا تھا۔ مگر مجھے معلوم تھا کہ مانک تو محض ٹٹی کی آڑ تھی اور بس۔ چھ سات مہینوں میں آہستہ آہستہ مجھ پر کھلنے لگا کہ مانک نہیں بلکہ میں انتی کی نظروں کا مرجع تھا۔ اس کی نگاہیں ہر دم میرا تعاقب کرتیں۔ وہ ہر دم کوشش کرنے لگی کہ اس کی آواز میرے کانوں میں پڑتی رہے۔ کبھی کبھی وہ میرے مالک کی خاص اجازت سے مجھے اپنے دوستوں کے ساتھ پکنک منانے کے لیے لے جاتی۔ جب ہم پکنک سے لوٹتے تو وہ ایک آدھ گھنٹہ مجھے اپنی کار میں لئے اکیلی سمندر کے ساحل پر گھومتی رہتی۔ کچھ نہ کہتی اور سب کہہ بھی دیتی۔ اس کو ابھیناؤں سے، اشاروں سے تکلم کرنے میں

بے پناہ مہارت تھی۔ بظاہر اس کے طرزِ عمل میں بے اعتنائی کا رنگ ہوتا مگر اس کے سر کی جنبش، اس کی بھنوؤں کا کھنچاؤ، اس کی پلکوں کی پھڑ پھڑاہٹ، اس کی بھوری، گہری اور شفاف آنکھوں کی پتلیوں سے ابھرتی ہوئی، ڈوبتی ہوئی روشنی، اس کے شانوں کی جنبش، اس کی کمر کے خم، اس کے سینے کا زیر و بم، منہ کے کلام سے بالکل الگ اور اس کے سایہ میں، کبھی اس کی خاموشی کی آڑ میں ایک انوکھی مگر واضح زبان میں وہ ہر دم مجھ سے محوِ کلام رہتی۔ اس نے میرے جسم کو بھی اس زبان کا ایسا آشنا بنا دیا تھا کہ وہ میری مرضی کے برخلاف اس سے محوِ گفتگو رہتا جس سے مجھے اکثر الجھن ہوتی، ہول اٹھتا میرے دل میں، مالک کے ساتھ خیانت کا احساس جاگتا مگر میں کر ہی کیا سکتا تھا۔ انتی نے مہینوں یہ طرزِ کلام اختیار کیے رکھا۔ جب اس کے اس گپتی کلام کی سب باتیں میرے خون میں رچ گئیں تو وہ کئی ہفتے مجھ سے اوجھل رہی، اس کی آواز تک میرے کانوں میں نہ آتی مگر مجھے اچھی طرح سے معلوم ہوتا کہ وہ ہے میرے آس پاس ہی۔ اس کی بے اعتنائی مجھ پر بہت شاق گزری۔ میری شخصیت دو حصوں میں بٹ گئی، ایک حصہ مالک کی خدمت میں حاضر رہتا اور ان کی ہر فرمائش کو پورا کرنے میں مستعد رہتا اور دوسرا حصہ انتی کی آواز، اس کی چال کی چاپ، اس کے لباس کی سرسراہٹ کا متلاشی رہتا۔ ان دنوں میرے حواس بہت ہی زود اثر اور تیز ہو گئے۔ مگر اس کی خبر کہیں سے نہ آتی۔ راتوں کو سوتے ہوئے بھی میرا ایک حصہ سوتا تھا اور ایک حصہ اس کی خبر کے لیے سرگرداں رہتا تھا۔

پھر یکا یک انتی میری طرف متوجہ ہو گئی۔ اپنے دوستوں کے ساتھ اس نے ہندوستان کی سیر کا پروگرام بنایا اور ماموں کو ضد کر کے مجھے اپنے ساتھ لے جانے پر راضی کر لیا۔ میرا دل اس خبر کو سن کر بس بیٹھ ہی گیا۔ میں نے مالک سے بہت کہا کہ ان کی دیکھ بھال میری غیر حاضری میں کون کرے گا مگر انہوں نے انتی کی خوشی کے لیے اپنے آرام کا کوئی خیال نہ کیا کیونکہ ان کا کہنا تھا محض نوکر کی ہی ضرورت نہ تھی، اس کے محافظ، اس کے لیے ایک ساتھی کی بھی ضرورت تھی جو اس کو گھر کی آسائش اور گھر کا ماحول دے سکے اور یہ کام صرف میں ہی کر سکتا تھا۔

ہم سفر پر نکل پڑے۔ اس کے دوست اور سہیلیاں دن بھر اس کے ساتھ سیر کر کے تھک جاتے مگر وہ کبھی نہ تھکتی۔ وہ رات کو سیر کو نکل جاتی اور مجھے اس کے ساتھ جانا پڑتا کیونکہ میں اس کو اکیلے کیسے جانے دے سکتا تھا اور نہ ہی اس کو انکار کر سکتا تھا۔ جب ہمارا آدھا سفر ختم ہو لیا تو ایک رات ہم جے پور میں تھے۔ آدھی رات جا چکی تھی۔ رات چاندنی تھی۔ محل میں ہر آدمی سو چکا تھا کیونکہ سارا دن ہم گھومتے رہے تھے۔ انتی نے مجھے کافی بنانے کو کہا۔ میں کافی بنا کر لے گیا تو وہ باہر جانے کے کپڑے پہنے بیٹھی تھی۔ وہ یکے بعد دیگرے کافی کی تین پیالیاں پی کر اٹھ کھڑی ہوئی اور مجھے بھی ساتھ چلنے کو کہا اور کہا کہ باہر جانے کے کپڑے پہن لوں۔ میرا دل دھڑکا مگر کیا کر سکتا تھا۔ دل ڈرتا بھی تھا اور چاہتا بھی تھا۔

ہم دونوں اس کی کار میں شہر سے باہر چاندنی میں گھومتے رہے، اس کا جسم گپتی زبان میں دادِ حسن طلب کرتا رہا، عشق کے اظہار کی دعوت دیتا رہا۔ وہ حسین تو نہ تھی مگر اس کے جسم میں بے پناہ کشش تھی، اس کے جسم کے تناسب کا تصور کرنے کے لیے یونانی صورت گروں کا اور اس کی کشش کے جادو کے لیے اجنتا کے غاروں کے مندروں کے صورت گروں کا تخیل چاہیے۔ اس کا چہرہ بالکل سادہ تھا، مگر اس کی آنکھیں جو کبھی تو بالکل پایاب نظر آتیں اور کبھی ان میں اتھاہ گہرائیاں نظر آنے لگتیں جن میں ڈوب جانے کی دعوت اس کے ہونٹوں کی جنبش دیا کرتی۔ اس رات اس کا جادو سر پر چڑھ کر بول رہا تھا۔ ہم بہت دور نکل گئے۔ تیز ہوا چل رہی تھی۔ ہوا میں اس کے بال اڑ رہے تھے، کبھی اس کے بال میری آنکھوں کے پاس سے ہو کر گزر جاتے۔ میں آنکھوں کو بچانے کو جب سر پرے ہٹا لیتا تو وہ ہنستی۔ اوہ! اس کی ہنسی میں کتنی دعوت، کتنا اعتماد تھا، کتنا جادو تھا۔ اس کی آنکھوں میں ہزار ستاروں کی روشنیاں رقصاں تھیں۔ کار بڑی تیزی سے چلتی رہی۔ ہوا میں اس کے بال تیرتے رہے، فضا میں اس کی جادو بھری ہنسی رچتی رہی، اس کے جسم کی گپتی زبان میرے جسم سے اس زبان میں جواب لیتی رہی۔ میں بے بس تھا، بے سدھ تھا، اس کے بس میں تھا، میں نے آنکھیں بند کر لیں۔

یکا یک کار آہستہ ہوتی ہوئی رک گئی۔ وہ کار کا دروازہ کھول کر باہر نکل گئی، چٹیل سخت

زمین پر کہیں کہیں ننھی ننھی گھاس تھی۔ دور دور تک ویرانی تھی، ہوا تھی، چاندنی تھی، تنہائی تھی۔ اس نے مجھ سے کہا کہ میں کار کی سپرنگ دار گدی نکال لاؤں۔ میں نے نشست کی گدی نکال کر زمین پر رکھ دی۔ اس نے مجھے اس پر بیٹھنے کا اشارہ کیا۔ میں بیٹھ گیا۔ وہ چٹیل، سخت زمین پر رقص کرنے لگی۔ وہ رقص کے ساتھ آہستہ آہستہ گلے میں ہنستی جاتی۔ تیز ہوا میں، کھلے صحرا میں، اس کا رقص اور ہنسی کی موسیقی نے ایک عجب سماں باندھ دیا، اس نے میرا سب صبر و قرار، نیک و بد کا شعور لوٹ لیا، وفا اور چاکری کی تمیز مٹا دی، وہ ناچتے ناچتے میری گود میں گر گئی۔ میرے ذہن و ہوش پر ایک بجلی سی گر گئی۔ میں سکتے میں آ گیا مگر میرا جسم اس حادثے کے لیے تیار تھا۔ صبح تک سب حجاب اٹھ گئے، سب دروازے ہم پر کھل گئے تھے اور انتی میرے لیے ایک ایسا طلسم بن گئی جس کی لوح تھی ہی نہیں۔ جب صبح کی پہلی کرن نے ہمیں گدگدایا اور میں نے آنکھ کھولی تو وہ ننھی ننھی گھاس پر چمکتی ہوئی شبنم سے منہ دھو رہی تھی، جسم کو صاف کر رہی تھی۔ سورج کی کرنوں میں اور اس کے جسم کے سنہرے پن میں امتیاز کرنے میں مجھے دیر لگی۔

ہم باقی لوگوں کے جاگنے سے پہلے ہی واپس لوٹ آئے۔ کچھ دن بعد ہم جے پور سے رخصت ہوئے اور اپنے سفر پر نکل پڑے مگر انتی کے دوست اور سہیلیاں اتنے لمبے سفر کی طوالت سے گھبرا گئے اور بضد ہوئے کہ واپس چلیں۔ انتی نے بھی کچھ خاص مزاحمت نہ کی۔ انہوں نے اس کا دل رکھنے کے لیے دو ہفتے اور اس کے طے شدہ سفر میں اس کا ساتھ دیا۔ یہ دو ہفتے میرے لیے جنت کی راتیں تھیں اور دوزخ کے دن۔ انتی میرے ساتھ شادی کے تصور کو بھی اپنے پاس پھٹکنے نہ دینا چاہتی تھی۔ وہ تعلقات کی نوعیت کو کسی طرح بدلنے کے لیے راضی نہ تھی اور سب سے مشکل تو یہ بات تھی کہ وہ گھر لوٹ کر بھی ان تعلقات کو جاری رکھنے پر بضد تھی۔ مجھے پورا یقین تھا کہ اگر وہ راضی ہو جاتی تو میرا مالک بھی اس شادی پر بالآخر راضی ہو جاتا۔ وہ مجھ پر اتنا مہربان تھا مگر انتی شاید مجھ سے شادی کے تصور ہی کو اپنی توہین سمجھتی تھی۔ وہ کہتی تھی کہ شادی ایک معاشرتی فعل ہے جس میں معاشرے کی باعزت رضامندی بہت ہی ضروری ہے اور معاشرہ کبھی بھی اس کو اس شادی پر معاف نہ کرتا اور اگر کر

بھی دیتا تو وہ معاشرے کے اس احسان کے تلے اتنا دب جاتی کہ زندگی کو حرام سمجھتی۔ مجھ میں اور اس میں جو تعلقات تھے وہ صرف دو انسانوں کا معاملہ تھا جس میں معاشرے کی رضامندی کی ضرورت ہی نہ تھی۔ جب میں اس کو ضمیر کی آواز کے متعلق بتاتا تو وہ ہمیشہ یہی کہتی کہ میں نے معاشرے کو اپنے اندر حلول ہو جانے کی اجازت ہی کیوں دی۔ جب میں اس کو نیک و بد کے اصولوں کی طرف بلاتا تو وہ ہنس دیتی اور کہتی کہ زروان! آہورامزدا کی مرضی یوں ہی ہے کہ ہم تم میں بیاہ کی یہی صورت ہو۔ تم معاشرے کو اس میں کیوں لے آتے ہو۔ ہمارا تمہارا رشتہ کس لحاظ سے بیاہ کے رشتے سے کم ہے۔ فرق یہی ہے کہ نا کہ میں اس رشتے کا اعلان نہیں چاہتی۔'' مگر میں کبھی بھی اس سے مطمئن نہ ہو سکا۔ میرا چین آرام لٹ گیا اور میں مالک کی خدمت سے کبھی کبھی بے خبر ہو جاتا جس سے مجھے بہت دکھ ہوتا۔ آخر ایک دن میں نے تہیہ کر لیا کہ مالک سے اپنے دکھ کی داستان کہہ سناؤں گا۔ سارا دن میں ان کے ساتھ رہا مگر مجھے جرأت ہی نہ ہوئی۔ جب رات گئے میں اس سے رخصت ہوا تو اس نے مجھے واپس بلایا اور کہا:

''تم سارا دن اور آدھی رات کچھ کہنے کی سوچتے رہے مگر کچھ کہا نہیں...... میں جانتا ہوں تمہارا آزار کیا ہے۔ ہم تم اس سلسلے میں بے بس ہیں۔ جو بھی تم نجات کی راہ سمجھو وہ مجھے قبول ہو گی۔ اگر جدائی کے بغیر نجات ممکن نہیں، تو مجھے یہ بھی قبول ہے۔ مگر جدائی کب ہو گی اس کا فیصلہ تم مجھ پر چھوڑ دو۔ میں فی الحال اس کے لیے تیار نہیں۔ میں اب بوڑھا ہو گیا ہوں کمر باندھنے میں کچھ دیر تو لگے گی ہی۔

کاش میں وقت سے پہلے اس لمحے کا تصور کر لیتا تو آج ہم تم اس مقام پر کھڑے نہ ہوتے...... تم واقعی زروان ہو۔ یہی تمہاری حیات کا قانون ہے......

اچھا اب آزار کو اس وقت تک بھلائے رکھو جب میں جدائی کے لیے کمر نہ باندھ لوں۔ تمہارا خدا تمہاری حفاظت کرے۔''

میرے دل میں جو تیر اٹکا تھا وہ نکل گیا مگر اس کا زخم کبھی مندمل نہ ہوا، اس کا درد کبھی کم نہ ہوا۔

انتی نے جو حق مجھ پر حاصل کر لیا تھا اس سے دستبردار ہونے کے لیے کبھی بھی، لمحہ بھر کے لیے بھی تیار نہ ہوتی تھی۔ مجھے اس کے حقوق پورے کرنے ہی ہوتے۔

اس کو اپنے آپ پر، حالات اور حادثات پر، اتنا قابو تھا کہ کسی کے وہم میں بھی نہ آ سکا کہ مجھ میں اور اس میں کیا رشتہ تھا۔ نہ جانے میرے مالک کو اس کا کیسے شعور ہو گیا تھا، خبر ہونے کا تو سوال ہی نہیں۔ خود انتی بھی اسے اس معاملے کی خبر نہ کر سکتی تھی۔ ہم مختلف طریقوں سے راتوں کو ملتے رہے۔ کاش وہ میری بیوی بن سکتی۔ ایسی اچھی بیوی کا تصور بھی نہ ہوتا مگر وہ جہان سے بالکل الگ ایک نئے اخلاق کی بنیاد رکھنا چاہتی تھی۔ جس میں معاشرہ کسی طرح بھی شریک نہ ہو۔ جس معاملے میں معاشرے کی شرکت وہ ضروری سمجھتی تھی وہ اس کی اصل زندگی سے اتنا غیر متعلق ہوتا کہ اس میں معاشرے کو شریک کرتے ہوئے اس پر دھوکا اور فریب اور زمانہ سازی کا گمان تک ہونا عجیب لگتا تھا۔ وہ کسی ایسے آدمی سے شادی بھی کر سکتی تھی جس سے اُسے کسی بھی سطح پر دلچسپی نہ ہو، رغبت نہ ہو۔ وہ معاشرے کو آسمان اور زمین اور ہوا کی طرح ماحول کا ایک حصہ سمجھتی تھی جس میں زندگی کے حسین لمحے گزارنے، ان کو اپنی گرفت میں کرنے کے مواقع مہیا ہو سکتے تھے اور بس۔ اس کے نزدیک ایسی زندگی سے ماورا اگر کوئی زندگی تھی تو اس کی سمجھ سے ہنوز بالاتر تھی۔ وہ کہا کرتی تھی کہ جب اس ماورا کا حال اس پر کھل گیا تو وہ ضرور اس کے مطابق اپنی زندگی کی روش کو بدل لے گی مگر اس وقت تک وہ اپنی سمجھ اور اپنی شخصیت کی ساخت اور حیات کے اصولوں سے انحراف کرنا ایک جرمِ عظیم سمجھتی رہے گی۔

مجھے کبھی بھی اس کی منطق میں، اصول میں سقم نظر نہ آیا۔ وہ اپنے افعال میں حق بجانب تھی۔ اس کے افعال اس کے خلوص کے آئینہ دار تھے۔ اس کے افعال کو بدلنے سے پہلے ضروری تھا کہ اس کی شخصیت کی ساری ساخت اور اس کی حیات کے اصولوں کو بدل دیا جاتا۔ یہ میرے بس کی بات نہ تھی۔ میں مفکر نہ تھا، فلسفی نہ تھا، ہادی اور رہبر نہ تھا، اسے تو کسی مرشد کی ضرورت تھی جو اس کی اپنی شخصیت سے ایسے حیات آور اصولوں کو عیاں کر سکتا جو اس کی شخصیت کو مردہ کیے بغیر بدل دیتے، ان میں نیا رس، نئے پھول، نئے پھل لاتے......

چند ماہ بعد میرا مالک مجھے یورپ کے سفر کے بہانے ساتھ لایا اور سانجری میں نواب آغا کے سپرد کر کے یورپ چلا گیا۔ اس کے بعد مجھے کسی طرح سے اس کی، انتی کی خبر نہیں ملی۔ بس بیس ہزار روپے ان کی طرف سے پہنچے۔''

''اپنے گاؤں سے چلے آنے کے بعد تم پھر اپنے گاؤں نہیں گئے؟'' عالمہ نے سوال کیا۔

''گیا تھا۔ بی بی کی یورپ سے واپسی سے کوئی ایک ماہ پہلے گیا تھا۔ ایک زمانہ بدل گیا ہے۔ ہمیں جاننے والا کوئی نہیں تھا۔ نہر ابھی بھی چل رہی ہے۔ دور دور تک ویرانی کے سوا کچھ نہیں۔ جو زمینیں سیم اور تھور کی مار سے بچی ہیں ان کی زرخیزی میں بھی فرق آ گیا ہے۔ جب میں گیا تھا تو ان دنوں سرد ہوائیں چلتی تھیں۔ درخت ہوا کے رخ پر جھکے ہوئے تھے۔ ہر درخت کی کمر دہری تھی جیسے اس دیس کے بڑے بوڑھوں کی کمریں۔ مگر اس خمیدگی میں بھی ایک آہنگ تھا۔ ہر درخت ایک خاص زاویہ پر جھکا تھا، ایک ہی طرف جھکا تھا، جیسے ہوا کی تندی سے بچنے کی ایک ہی راہ تھی کہ درخت ایک خاص زاویے پر جھک جائیں۔

کہیں ایسی زمینیں بھی تھیں جن پر اس ویرانی کا اثر نہ تھا۔ جیسے کہ ویرانی کے ساگر میں چند جزیرے ہوں، سرسبز اور شاداب جس سے ویرانی اور بھی بھیانک ہوگئی تھی مگر اس ویرانی کے ڈراؤنے پن میں بھی ایک سطوت تھی جس سے دل میں ہول کے ساتھ ایک انوکھے حسن کا احساس جاگتا تھا۔ میں کئی دن اس ویران سطوت کے درمیان آوارہ پھرتا رہا۔ سرسراتی، سرد اور تیز ہوا کی موسیقی سنتا رہا۔ کبھی تو لگتا کہ فضا ویرانی کی نوحہ کناں ہے اور کبھی لگتا کہ ویرانی سرور اور حظ میں ایک وجد آور رقص میں محو ہے اور کبھی کبھی محسوس ہوتا کہ ہوا اور درخت ماضی کی ویرانی کا ماتم کرتے ہیں اور مستقبل کی آبادی اور شادابی کے گیت گاتے ہیں اور آبادیوں کو دعوت دیتے ہیں اور ان جانے آبادکار، ان کی للکار پر لپکے چلے آ رہے ہیں۔ لوگوں سے پوچھا کہ سرسبز و شاداب جزیروں کے بکنے کے کوئی آثار ہیں۔ معلوم ہوا کہ کچھ زمیندار ویرانی سے گھبرا کر ان جزیروں سے سبکدوش ہونا چاہتے تھے۔ مگر کوئی خریدار ہی نہ تھا۔ میں ان مالکوں سے ملا وہ میری حماقت پر حیران بھی ہوئے اور اپنی خوش قسمتی پر خوش

بھی۔ میں نے کئی جزیرے جو کئی مربعوں میں پھیلے تھے بیس ہزار روپے میں خرید لئے اور پھر انہی زمینداروں کو کرایہ پر دے دیئے۔ اگلے سال سے مناسب سی آمدن ہوجایا کرے گی۔''

''اس ویرانی میں تم جا کر کیا کرو گے؟'' کبھی وہاں رہ سکو گے؟''

''شہری زندگی اپنی تمام آسائشوں کے باوجود مجھے کسی کا ہونے کا احساس نہیں دلا سکی۔ میں نے ہمیشہ ہی چاہا کہ کسی کا ہو رہوں۔مگر کوئی میرے لئے مرکز نہیں بن سکا۔ ہر دم، ہر لمحہ میرے دل کے کسی کونے میں اپنے دیس کا ویران کونہ روشنی کا مینار بنا موجود رہا اگرچہ اپنی روزمرہ کی زندگی اس کی روشنی سے دور، بہت ہی دور، رہی۔ انتی سے جدائی کے بعد اس ویران کونے کی روشنی مجھے بڑی شدت سے اپنی طرف متوجہ کرنے لگی اور میں اس کی روشنی سے بغلگیر ہونے کے لیے بے تاب ہونے لگا۔اور جب اس ویرانی کے درمیان پہنچ گیا تو احساس ہوا کہ گھر پہنچ گیا ہوں، اپنے مرکز، اپنے محور پر آ گیا ہوں۔اس ویران جہاں میں اپنا کوئی نہ تھا پھر بھی یہی احساس ہوا کہ میں اس کا ہوں اور وہ میرا ہے۔اس ویرانی کے ساگر میں شاداب و سرسبز جزیرے مستقبل کی زندگی کا نشان معلوم ہوئے۔مگر میں نے چاہا کہ ان جزیروں میں کسی ساتھی، کسی دل پسند بیوی کے سوا زندگی ممکن نہ ہو سکے گی۔اس کی تلاش کی آرزو میں وہاں سے لوٹ آیا۔اب ہر دم نظریں ساتھی کی تلاش میں سرگرداں رہتی ہیں۔''

''کبھی نوراں کی اطلاع ملی؟''

''کاش نہ ملتی! انہیں سرسبز وشاداب جزیروں میں ایک بوڑھی عورت نے بتایا کہ چند سال پہلے ایک ادھیڑ عمر عورت جس کے چہرے پر جوانی اپنا سایہ کئے ہوئے تھی ان جزیروں میں آئی تھی۔ وہ ان جزیروں کی خریدار تھی مگر اس کا خاوند اس ویرانی پر رضامند نہ تھا۔ وہ عورت کسی مجھ جیسے نوجوان کے متعلق بھی پوچھتی رہی مگر کسی سے اس کو پتا نہ ملا تو اپنے خاوند کی مرضی پر رضامند ہوگئی اور چلی گئی۔ میں نے بہت پوچھ گچھ کی وہ لوگ کہاں سے آئے تھے؟ کہاں گئے؟ مگر کچھ پتہ نہ مل سکا۔ایک زخم جو مدت ہوئی بھر چکا تھا پھر سے رسنے لگا۔ اس رسنے سے امید کی ایک کرن پھوٹی کہ شاید ہم بہن بھائی ایک بار پھر اس سرزمین پر آباد

ہوسکیں، اس سرزمین کی آبادی کا باعث بن سکیں۔ کاش ایسا ہو سکے......''

''اگر ہوا تو تم اس ویرانی کے ساگر کا کیا بندوبست کرو گے؟ کیا اس ساگر کی لہریں تمہارے شاداب جزیروں کو اپنی لپیٹ میں نہ لے لیں گی؟ رابعہ نے سوال کیا۔

''میں زروان ہوں، میں غلام محمد بھی تو ہوں۔ میں اس ساگر کو خشک کرلوں گا۔ اہلِ مغرب نے سمندر کی زد سے لاکھوں ایکڑ زمین چھین لی ہے اور اس چھین لینے کو ایک فن، ایک سائنس بنا لیا ہے۔ میں جب سے اپنے دیس سے لوٹ کر آیا ہوں اس فن اور اس سائنس کی سوجھ بوجھ پیدا کرنے میں کوشاں ہوں۔ مردہ زمیں کو زندگی بخشنا انسان کے لئے ممکن ہے۔ مغرب کا ایک ملک ایسی ہی مردہ زمین کو زندگی بخش کر آباد ہوا ہے۔ اس کی زمین آبی موت سے بچالی گئی ہے۔ جو کچھ وہاں ممکن ہے وہ یہاں بھی ممکن ہے۔ ایمان بہرحال شرط ہے۔ چاہے یہ ایمان انسان کی اپنی صلاحیتوں پر ہو یا یہ ایمان مردہ زمین، مردہ انسان کے ازلی اور ابدی احسن الخالقین پر ہو۔''

''کیا ایٹم بم کے دور میں، نازی، فاشی اور روسی بربریت کے دور میں ایمان ممکن ہے، اس کے کچھ معنی ہو سکتے ہیں!'' رابعہ سسکی۔

''اگر سیم اور تھور کے ویران ساگر میں شاداب اور سرسبز جزیرے ممکن ہیں تو ایمان بھی ممکن ہے۔ اگر ان سرسبز وشاداب جزیروں کے کوئی معنی ہیں تو ایمان کے بھی معنی ہیں۔ کیا مردہ زمینوں کے درمیان زندہ اور بارآور زمین اس بات اعلان نہیں کہ اگر زمین کا ذرہ ذرہ آپس میں پیوست ہو اس طرح کہ اس میں وحدت کارفرما ہو تو وہ سیم اور تھور کا مقابلہ کرسکتی ہے، زندہ اور بارآور رہ سکتی ہے؟......

اسی طرح انسان بھی اپنی صلاحیتوں کو پریشان ہونے سے بچائے رکھے اور ان میں ایک وحدت پیدا کرے تو وہ بربریت کے جہاں میں، باایمان، زندہ اور بارآور رہ سکتا ہے۔''

''کیا ویرانی کی تیز اور تند ہوائیں اس کی بارآوری کو ختم نہ کردیں گی؟'' عالمہ بولی۔

''ویرانی کی تیز اور تند ہوائیں ایک ایسی موسیقی کو جنم دیتی ہیں جس سے ایمان کی

طاقتوں کو للکار ہوتی ہے اور وہ بیدار ہو کر کارفرما ہو جاتی ہیں۔ بالکل اسی طرح جیسے میرے مردہ دل میں ایمان کی قوتوں کو دیس کی ویرانی کی تیز اور تند سرد ہواؤں سے پیدا ہونے والی موسیقی نے آبادی پر اکسایا، للکارا۔''

''ہر بربریت کا عہد ایک ایسے جہان کو جنم دیتا ہے جو ایمان کی مردہ طاقتوں کو ایک بار پھر سے زندہ کر دیتا ہے۔ تاریخِ عالم کے اوراق اس بات کی صداقت کے شاہد ہیں۔'' متین صاحب کی پُرسکون، بے جذبات، آواز آئی۔

''کیا یہ لازمی ہے کہ ایمان کی طاقت کو کارفرما کرنے کے لیے بربریت اپنی انتہائی پستی پر پہنچ لے؟'' عالمہ نے متین صاحب سے حیرانی سے سوال کیا۔

''تاریخ کے دھارے کا چلن ایسا ہی رہا ہے مگر اس سے یہ لازم نہیں آتا کہ آئندہ بھی ایسا ہی ہوتا رہے۔ اگر انسانوں کے منظّم گروہ، اگرچہ وہ اقلیت ہی میں کیوں نہ ہوں، ایمان کو قائم اور تازہ رکھنے کے سامان مہیا کرتے رہیں اور وحی کی طاقت سے اس کی زندگی کی نشوونما کرتے رہیں تو عین ممکن ہے کہ تاریخِ عالم کا چلن بدل جائے اور وہ عملاً انسان کا حلیف بن جائے۔''

''ایسا ہونا بظاہر ناممکن نظر آتا ہے کیونکہ اتنے کٹھن عمل پر فطرتِ انساں حاوی نہیں ہے اور لاکھوں سال کی عادت کو بدل لینا بعید از قیاس ہے۔'' رابعہ بول اٹھی۔

''ایسا ہونا بعید از قیاس تو نہیں مگر معجزہ ضرور ہے اور تاریخ عالم کے اوراق ایسے معجزوں کے ذکر سے خالی نہیں۔ انبیاء کی زندگی ایسے ہی معجزات کی داستان ہے اور ایسی داستان پر شک کرنا اس لیے ممکن نہیں کہ انسان کی داستان کی تاریکیوں کے درمیان جو درخشندگی کی چھوٹیں واضح طور پر نظر آتی ہیں ان کی توجیہہ ایسے ہی معجزات کے وجود سے ممکن ہوسکتی ہے۔ انسان کو محض پستیوں کی تصویر سمجھنا حقیقت سے روگردانی ہے۔ انسان کی بلندیوں کے تصور سے ذہن چکرانے لگتا ہے۔

اس جنگ میں، جس آگ کی حدت آج بھی شدت سے محسوس ہو رہی ہے، بے شمار عام مرد اور عورتوں نے انتہائی کٹھن اور صبر آزما حالات میں پوری سوجھ بوجھ اور انتہائی ہوش

اور سکون کی حالت میں بے آسرا، بے یقین اغیار کی مدد کی ہے اور اس مدد میں اپنی جان کو بار بار خطرے میں ڈالا ہے اور یہ جانتے ہوئے خطرے میں ڈالا ہے کہ جان کی امان بعید از قیاس ہے اور انتہائی جاں گسل موت یقینی ہے......

ایسے ہی لوگوں کا وجود مجھے حوصلہ دلاتا ہے کہ انسان کی زندگی ارتقاع پذیر ارتقا ہے۔ ایک دیوانے کا خواب نہیں، عذابِ مسلسل نہیں، ایک مسخرے جابر کا تمسخر بھرا کھیل نہیں بلکہ ارضی جنت کا امکان ہے اگر اس ارضی جنت کے لیے انسان اپنی تمام عیاں اور نہاں اور امکانی صلاحیتوں کا منظّم اور خلاقانہ استعمال کرے۔ میں یہ ماننے میں بالکل نہیں شرماتی کہ اس کام کے لیے بڑے مستحکم ایمان اور ایک مسلسل صبر کی ضرورت ہے جس کی انسانی فطرت روزمرہ کی زندگی میں عادی نہیں۔ لیکن میں نے اس حالیہ جنگ میں عام، کمزور، بے حوصلہ، بے یقین انسانوں کو انتہائی صبر آزما حالات میں، ہر دم، ہر طرف سے موت کے درمیاں گھرے ہوئے، عمل میں مستحکم پایا ہے، اس سے ایک ہی نتیجہ نکل سکتا ہے کہ انسان کی فطرت میں یہ وصف موجود ہے کہ وہ مسلسل صبر آزما حالات میں اپنی معینہ منزل کی طرف بڑھتا ہی چلا جائے، چاہے اس میں اس کی جان پر بار بار عذابِ مسلسل کی بارش ہی کیوں نہ ہوتی رہے۔

میں یہ بھی مانتی ہوں کہ منزل کا تعین ہی سب سے بڑا جوکھم ہے۔ جو انسانوں سے شاید و باید ہی سر ہو سکتا ہے۔ مگر اس بات میں میں ذرا سی ترمیم چاہوں گی کیونکہ انسان پر ایک منزل تو ہر حالت میں مقدر ہے اگر وہ سہل انگار ہے، بے یقین ہے: بربریت کی منزل......اس منزل تک کا سفر بھی کافی صبر آزما ہے۔ مگر عام انسان عام حالات میں اس منزل کو چھو لینے میں کامیاب ہو ہی جاتے ہیں۔ لہٰذا اگر انسان کی منزل کا تعین بربریت کی مخالف سمت میں ہو جائے تو انسان کی فطری ضد جرأت اور خلاّقی کا مظہر بن جائے اور میں تو کہوں گی کہ بن جاتی ہے۔'' فردوس نے گرم جوشی سے کہا۔

''بربریت کی طرف یا اس کی مخالف سمت میں ثابت قدمی انسانوں کی اقلیتوں کے عمل کی تعریف تو ہو سکتی ہے مگر انسانوں کی اکثریت کے لیے کسی راہ پر ثابت قدمی ان کی

زندگی کا معمول نہیں، وہ صرف اس اقلیت کی تقلید کرتے ہیں جو کسی ایک عہد یا معاشرے میں سیاسی یا معاشی طاقت کے سرچشموں پر تصرف رکھتی ہو۔'' رابعہ نے اعتراض کرنے کی مدھم سی کوشش کی۔''

''انبیا کے اولین پیروؤں کا تصرف نہ تو سیاسی اور نہ معاشی طاقت کے سرچشموں پر تھا مگر پھر ان کو کامیابی ہوئی'' عالمہ نے کہا۔'' ارض وسما کے خالق اور مالک اور رب کی حمایت کا یقین ان سب طاقتوں پر بھاری ہے۔ لہٰذا ایسی حالت کی ناکامی پر تو حیرت ہوسکتی ہے مگر کامیابی پر تو ذرہ بھر بھی حیرت نہ ہونی چاہیے۔ جمیل صاحب نے دھیرے سے کہا۔

ان کی اس بات پر سب نے ان کی طرف حیرت سے نگاہ کی، صرف متین صاحب کی آنکھوں میں ایک مدھم سی مگر واضح روشنی شرارت سے رقصاں تھی۔ اس توجہ پر جمیل صاحب جھینپ سے گئے۔

''مگر کیا یہ ممکن نہیں کہ ایک غلط بات، ایک غلط نظریے، جھوٹے وعدے، جھوٹے خداؤں پر انسان ایمان لے آئے اور اس ایمان پر استقامت سے قائم رہے؟ ایسے بے شمار معاشروں کی اطلاع ہم تک تاریخی شواہد کے ذریعے پہنچتی ہے۔ ایسے امکان کے پیشِ نظر جھوٹ اور سچ کی پہچان کیسے ممکن ہو؟'' زروان نے استعجاب سے پوچھا۔

متین صاحب پر زروان کی نظروں کو جمے دیکھ کر سب نے ان کی طرف دیکھا۔ وہ دور کسی ان دیکھے افق پر نظریں جمائے تھے۔ ان کی آنکھوں میں بڑی تیز اور بھرپور روشنی تھی جیسے کسی وادی میں گرمیوں کے سورج کی روشنی......ان کے چہرے کے نقوش میں کسی قسم کی حرکت نہ تھی، ان کے ماتھے پر شکن کا گمان تک نہ تھا، صرف ان کے ہونٹوں کے کونوں پر ایک موہوم سی حرکت پر تول رہی تھی۔ یہ موہوم حرکت ان سب کے لیے اتنی جاذبِ توجہ ثابت ہوئی کہ وہ سب دم روکے ان کی آواز کے لیے ہمہ تن گوش بن گئے۔

''جھوٹے نظریوں کی تخلیق جھوٹے خداؤں پر ایمان لے آنے سے ممکن ہوتی ہے اور جھوٹے خداؤں کی تخلیق کسی بھی معاشرے میں اس اقلیت کا کمال ہوتا ہے جو کسی وجہ سے معاشرتی قوتِ عمل کے سرچشموں پر تصرف رکھتی ہے۔ عام انسانوں کو ہر دم محض جسمانی

طاقت کے زور پر یا جسمانی اذیت کے خوف سے جھوٹے نظریوں پر استوار کئے ہوئے معاشرے کی اطاعت پر مجبور نہیں کیا جا سکتا۔ کیونکہ عمل کے لیے کسی نہ کسی نوعیت کے ایمان کی حرارت کی ضرورت ہے اور یہ ایمان کائنات کے خالق کے کسی تصور، چاہے وہ جھوٹا ہی کیوں نہ ہو، پر ہی لایا جا سکتا ہے۔ ہمارے عہد میں بھی مادہ پرست مادے کو ایسا خالق تصور کرتے ہیں جس سے اس جہاں کی تخلیق ہوئی اگرچہ مادے کو بذاتہٖ باشعور تصور نہیں کرتے، لیکن شعور کو مادے ہی کی ایک ترقی یافتہ شکل مانتے ہیں، جو مادے سے وجود اور شکل اخذ کرتی ہے۔ اگرچہ اب تک مادے کے اس تصور پر کسی مذہب یا نظامِ حیات کی رسوم کا تانا بانا نہیں بنایا گیا مگر غور سے دیکھا جائے تو نازی ازم، اور کمیونزم کے مادی نظامِ حیات میں خدا کا تفاعل ضرورت یا مقدر کا تصور ادا کرتا ہے۔ مگر اس میں ایک بات حیرت افزا ہے کہ اصل کائنات و شعور اور حیات کا اصول ایک وحدت پر مبنی ہے۔

یہ تصورِ حیات مظاہر پرست معاشروں کے اصل الاصول کی ایک ترقی یافتہ صورت ہے۔ اس کا ثبوت یہ ہے کہ ان نئے مادہ پرست معاشروں میں قائد کو وہی مقام حاصل ہے جو قدیم مظاہر پرست معاشروں میں ایک اوتار یا خدائے اعلیٰ کے فرزند کو حاصل تھا۔

ایسے معاشروں میں انسان کی حیاتیاتی نشوونما اور انسانی شخصیت کی بقا اور زکا کے لیے رزق کی تقسیم اس طرح ہوتی ہے کہ طاقتور اقلیت رزق کے سرچشموں پر قابض ہوتی ہے اور اپنی مددگار اکثریت کو اس رزق میں سے صرف اتنا حصہ دیتی ہے کہ وہ اپنی حیاتیاتی زندگی اور شخصیاتی بقا اور زکا کے لیے ان کی ہر دم مرہونِ منت رہے۔ ان کی زندگی، ان کی شخصیاتی بقا اور زکا ان کے اقتدار کی رقیب بننے کی صلاحیت کو حاصل نہ کر سکے۔

اور جو گروہ ایسے معاشروں کے خداؤں، قائدوں اور نظامِ حیات کو قبول نہیں کرتے ان پر رزق کے چشموں سے فیضیاب ہونا ناممکن نہیں تو نہایت مشکل ضرور بنا دیا جاتا ہے۔ ناممکن اس لیے نہیں بنایا جاتا کیونکہ محنت کاروں کی بہرحال ہر معاشرے کو ضرورت ہوتی ہے اور جن لوگوں پر رزق تنگ ہو جاتا ہے ان کے لیے بہت ہی سستے داموں پر محنت کار بن جانا ناگزیر ہو جاتا ہے۔

اس کے برعکس سچے نظریات پر مبنی معاشروں میں سچا خدا ایک ہی ہوتا ہے اور تمام انسان اسی ایک خدا کی مخلوق سمجھے جاتے ہیں اور ان سب پر رزق کے دروازے کھلے رکھے جاتے ہیں اور اس حد تک کھلے رکھے جاتے ہیں کہ اس نظام کو قبول نہ کرنے والے کی حیاتیاتی اور شخصیاتی بقا اور رزق کا پر کسی قسم کی حد مقرر نہیں کی جاتی اور ان کو اجازت ہوتی ہے کہ وہ اپنی پسند کے نظامِ حیات کا پرچار کر سکیں یا کم از کم اس نظامِ حیات کی ترقی اور استحکام میں اپنی مدد کو شامل نہ کریں جس کو وہ پسند نہیں کرتے۔

طرزِ عمل کی ان دو صورتوں سے جھوٹے اور سچے کی پہچان ہو سکتی ہے۔'' متین صاحب نے سمجھایا۔

''مگر موجودہ دور کی رفاہی طرزِ حکومت بھی تو رزق کے سرچشموں کو اپنے مخالفوں پر تنگ یا بند نہیں کرتی اگرچہ یہ نظام کسی ایسی بنیاد پر قائم نہیں کیا گیا جو ان لوگوں کی اکثریت نے رکھی ہو جو شعوری طور پر ایسے نظامِ حیات کو مانتے ہوں جس میں ایک واحد خدا کا جو تمام کائنات کا خالق اور مالک اور رب ہو، تصور رہا ہو۔

کیا ایسا ہونا محض انسان دوستی کے تصور کی وجہ سے نہیں ہے؟'' رابعہ نے کہا۔

''نہیں! ایسا تو نہیں ہے۔ ان معاشروں میں ابھی تک ان لوگوں کی اکثریت ہے جو عیسیٰ کو ربِ اعلیٰ کا اکلوتا فرزند اور اس کی ربوبیت کا مظہر مانتے ہیں، جو گمراہ انسانوں سے اس حد تک پیار کرتا ہے کہ ان کے لیے مصلوب ہو جاتا ہے اور جو ہر دم انسان کی تلاش میں رہتا ہے اور اسے اپنی توفیق سے نوازتا رہتا ہے۔

انسانوں کے لیے متلاشی اور ان کے لیے مصلوب خدا کا تصور جب ان میں نہ رہے گا تو رفاہی معاشرہ بھی قائم نہ رہے گا اور اگر رہا تو محض اس لیے کہ انسان دوستی جو مصلوب خدا کا وصف ہے ان کی فطرتِ ثانیہ بن گیا ہوگا۔'' فردوس پکاری۔

''شاید تم نے ایسے مصلوب خدا کو مصروفِ کار دیکھا ہے؟'' عالمہ نے بے یقینی کا اظہار کرتے ہوئے کہا۔

''یقیناً۔ اس کا ثبوت یہ ہے کہ روسی کمیونزم کے قائد نے جنگ کے دوران میں ایسے

خدا کے ماننے والوں پر سے اکثر تنگ کرنے والی پابندیاں ہٹالیں اوراسی طرح ایک لم یلد ولم یولد خدا کے ماننے والوں پر سے بھی۔ اور خدائے یکتا نے لادین روس کو لادین نازیوں کے ظلم وستم کے بوجھ سے دم توڑ دینے سے محفوظ کرلیا۔" فردوس کرب سے شاہد بنی۔

"ایسے رفاہی معاشروں کے وجود کے لیے ایک اور بات قابلِ توجہ ہے۔ کسی رحیم خدائے یکتا کے تصور کے بغیر اگر ایسا رفاہی معاشرہ محض انسان دوستی کے تصور کے سہارے، قائم ہو بھی جائے تو اس معاشرے میں جینے والے لوگوں میں روزمرہ کی خوشحال زندگی کی یکسانی اور بے رنگی اور بے وجدی کے باعث لوگوں میں ایک کبیدگی اور اداسی کا جہاں جنم لے لے گا، جس سے بے یقینی اور بے معنویت اور بے مقصدیت کے تصورات وجود میں آجائیں گے، جیسا کہ مغربی رفاہی معاشروں کے نوجوانوں اور ادھیڑ عمر کے لادین لوگوں میں نظر آنے لگے ہیں۔

یہ معاشرتی بے یقینی، بے معنویت اور بے مقصدیت اس حد تک گہری ہو چکی ہے کہ مغرب میں ایسے فلسفی پیدا ہو گئے ہیں جن کا فلسفہ انہی تصورات سے اخذ ہے اور ان کے بنیادی اصول کا تانا بانا انہی تصورات کے گرد بنا گیا ہے۔ مگر ستم تو یہ ہے کہ ایسے فلسفے کو کسی رفاہی معاشرے کی بنیاد کے طور پر استعمال کرنا محال ہے کیونکہ بے یقینی اور معاشرے کا قیام ایک دوسرے کے نقیض ہیں۔ معاشرے کا قیام اور وہ بھی رفاہی معاشرے کا قیام یقین، مقصد اور معنویت کے راسخ اصول کو قبول کئے بغیر ممکن ہی نہیں اگرچہ ان اصولوں کو غیر شعوری طور پر ہی قبول کیا جائے یا کیا گیا ہو۔

اس کا ایک ثبوت وہ فلسفی ہیں جو موجودہ دور کے انسان کی بے یقینی، بے مقصدیت اور بے معنویت اور انسان کی روزمرہ کی زندگی کی یکسانی، بے رنگی اور بے وجدی کو معاشرتی حقائق مان کر ایک بایقین، بامقصد، بامعنی نظامِ حیات کی تخلیق کے لیے کوشاں نظر آتے ہیں اور ان کے یہ تصوری نظامِ حیات ایک ایسی روزمرہ کی زندگی کا وعدہ کرتے ہیں جو رنگوں کا آہنگ لئے، وجد وسرور لئے، تنوع لئے ہو اور ان کے لیے یہ اس لیے ممکن ہے کہ ان کا نظامِ حیات ایک رحیم خدائے یکتا کے تصور سے اخذ ہے جو ہر ماننے والے کو توفیق عطا کرتا ہے کہ

وہ خدا دوست ہوتے ہوئے بھی، بلکہ اسی لیے، انسان دوست، جہاں دوست، بلکہ کائنات دوست بن سکے۔ ایسے فلسفیوں کے لیے یہ تصورِ حیات اس لیے ممکن ہوگا کہ وہ انسان کے اندر پنہاں جہنم اور جنت سے نظریں نہیں چراتے اور جہنمی قوتوں کو آبِ ایمان کا بپتسمہ دے کر ان کو جنت کی قوتوں میں بدل لیتے ہیں۔ یہ کوئی محیر العقول بات نہیں۔ قلبِ ہیئت کا اصول تمام کائنات میں جاری وساری ہے۔ ورنہ خاردار ٹہنیوں پر نرم ونازک پھول نہ کھلا کرتے، سنگلاخ زمینوں میں سے آبِ شیریں کے چشمے نہ پھوٹا کرتے، یہودی سال میں سے عیسائی سینٹ پال جلوہ گر نہ ہوتا، عمر بن خطاب عمر فاروق اعظم کے روپ میں ظاہر نہ ہوتا اور توانائی سے سب کائنات ظہور میں نہ آتی۔'' متین صاحب نے بیان کیا۔

''مگر جہنم کی طاقتوں کو جنت کی طاقتوں میں کیسے تبدیل کرلیا جائے، آگ سے جنم پائی ہوئی ہوا کو نسیمِ سحری اور شمیمِ چمن میں کیسے بدلا جائے۔'' زروان کراہا۔

''توانائی کی قلبِ ہیئت سے جو مخلوق وجود میں آئی وہ سب زوجین کی صورت میں تقسیم ہے۔ ہر شے اپنے زوج کی تلاش میں سرگرداں ہے۔ یہی تلاش کائنات میں حرکت کا اصول ہے۔ جو مخلوق شعور وارادہ سے عاری ہے اس میں اس تلاش کی منزل ہر حال میں زوج سے وصال ہے۔ مگر جس مخلوق میں شعور اور ارادہ ہے اس کی تلاش کی منزل ہر حال میں زوج سے وصال نہیں، اس کے لیے عین ممکن ہے کہ اس کا وصال ایسی منزل سے ہو جو اس کا زوج نہ ہو۔ تو ایسی حالت میں اس کی تلاش اس راہی کی سی ہوجاتی ہے جو دوپہر کے وقت صحرا میں سایہ راہ گم کر بیٹھے، اسے پانی میسر بھی ہو تو اس کی پیاس نہ بجھے۔

یہ اس صورت میں ہوتا ہے جب ایسی مخلوق کا فرد یعنی انسان اپنی ذات میں وحدت کا مظہر نہ ہو اور اس کی شخصیت متضاد قوتوں کی آماجگاہ بنی ہو۔ اور انسانوں کی اکثریت کے سلسلے میں ایسا ہی ہوتا ہے اور پھر ایسے انسان کو ایک اور حادثہ بھی درپیش آتا ہے کہ انسان اپنی ذات میں وحدت کا مظہر ہوتے ہوئے ایک ایسے انسان سے ہم کنار ہو جو اپنی ذات میں وحدت کا مظہر تو ہو مگر اس کی وحدت جامد ہو یا بیرونی تحریک کے بغیر زکا نہ کرتی ہو۔ پہلی صورت میں ہر منزل عذابِ مسلسل کی ایک منزل ہے مگر دوسری صورت میں سفرِ حیات ایک

جو کٹھن تو ہوتا ہے مگر اس میں جنت نشاں زندگی کا امکان بڑی حد تک ہوتا ہے۔

صحیح زوج کی تلاش اور حصول کے لیے شخصیت کی طاقتوں اور صلاحیتوں کا ایسا آہنگ اور وحدت ضروری ہے جو یقینِ محکم پر مبنی ہو جو ایمان اور تخلیق کی قوتوں کو تقویت اور استحکام بخشتا ہو۔ یہ اسی صورت ممکن ہے جب عالم الغیب، رحیم و رحمٰن، رب العٰلمین، انسان کو وہ راہ دکھائے اور اس راہ پر چلنے کی توفیق عطا کرے جس راہ پر وہ خود گامزن ہے۔ عالم الغیب اس امکان کو اس طرح ممکن بناتا ہے کہ وہ انسانوں پر اپنے پیغام بر بھیجتا ہے جو انسان کے لیے روشن قانونِ حیات اور ہدایت کا نور لے کر آتا ہے اور اس کے مطابق ایک معاشرے کی تشکیل اور ترویج کرتا ہے۔

جب انسان یا انسانوں کے گروہ عالم الغیب کے پیغام کو اپنے لئے مشعلِ راہ بنا لیتے ہیں تو ان کو ان کے اپنے نفسوں میں اور اپنے سے باہر کے آفاق میں آیات نظر آنے لگتی ہیں جن کی روشنی میں وہ انفس و آفاق میں ایک ہمہ وقت آہنگ پیدا کر لینے میں کامیاب ہو جاتے ہیں۔ اس سے انسان اپنے اپنے زوج کو تلاش کر کے ان سے نکاح کی مودت کا لطف حاصل کرتے ہوئے ارض و سما کو مسخر کر لیتا ہے۔

ہر عمل کی طرح انسان کا یہ اعلیٰ ترین نصب العین اور یہ سفر بہت کٹھن ہے مگر اس کٹھن سفر ہی کے لیے تو اس کو وہ تمام صلاحیتیں عطا ہوئی ہیں جن کو انسانی صلاحیتیں کہا جاتا ہے، ورنہ وہ بھی حیوانوں میں سے ایک حیوان ہوتا جو ردِ عمل کے دائروں میں محدود و مسدود ہوتا اور نظامِ کائنات کے لیے ایک خطرہ نہ ہوتا۔"

"مگر ایسے شخص کا کیا علاج جو اندر سے کچھ اور ظاہر اس کے خلاف کرے جو خدع کے مرض میں مبتلا ہو یا اپنی شخصیت کی وحدت کو سب سے بڑا قانون مانتا ہو اور جانتا ہو؟" زروان نے صدا کی۔

"یہ دو مختلف سوال ہیں کیونکہ دو بالکل مختلف قسم کی انسانی شخصیتوں کے متعلق سوال ہیں۔

مگر دونوں کی صورت میں علاج کی پہلی منزل مشترک ہے۔ انسان کی صلاحیتوں،

اس کے امکانات کا بطور انسان صحیح صحیح اندازہ بلکہ علم ہو، جس کا مطلب یہ ہے کہ اس کی انتہائی بلندیوں اور انتہائی پستیوں کا علم ہو۔ اس پس منظر میں اس فرد کی صلاحیتوں کا علم بہم پہنچایا جائے جس کا علاج مطلوب ہو۔ پھر اس فرد کی شخصیت میں اس صلاحیت، اس قوت کا سراغ لگایا جائے جو اس شخصیت میں عمل کی تشکیل اور تجدید اور اس کی معاشرتی ہیئت کا تعین کرتی ہو کیونکہ اس شخصیت میں آہنگ صلاحیتوں کے تعاون سے نہیں بلکہ ایک صلاحیت کے تغلب سے وجود میں آتا ہے اور صلاحیتوں کے تعاون سے آہنگ اسی صورت میں ممکن ہوتا ہے جب ہر صلاحیت کے وصف اور اس کی حرکی حدود کا تعین ہو جائے۔ یہ اسی صورت ہوگا کہ انسانی زندگی اور اس کے گرد و پیش کی کائنات کا ہمہ گیر تصور کسی انسان کے قلب پر کھل گیا ہو۔ مگر یہ وحی کی روشنی کے بغیر ممکن نہیں اور نہ ہی آج تک تاریخِ انسان میں ایسا ممکن ہوا ہے......

اب اگر اس پس منظر میں انتی کی زندگی کا جائزہ لیا جائے تو اس کی شخصیت کا سرّ ہم پر کھل سکتا ہے۔

وہ خوشحال والدین کی اکلوتی بیٹی تھی، اس کی ہر آرزو کی تکمیل کا، تسکین کا، سامان اس کو میّسر تھا۔ وہ معاشرے میں جننے، جینے اور مرنے کی صعوبتوں سے ناآشنا تھی۔ جینے اور مزے اڑانے کی مقصدیت اور معنویت اس کے لیے زندگی کا حرفِ آخر تھا۔ روزمرہ کی زندگی میں رنگینی اور تنوع پیدا کرنا اس کے ماحول میں، اس کی نوجوانی کی عمر میں، کچھ زیادہ مشکل نہ تھا۔ اس کے لیے ہر روز روزِ عید تھا اور ہر شب شبِ برات تھی۔

پھر یکایک اس کے ماحول میں موت نے خروج کیا اور آن کی آن میں اس کی نظروں سے اوجھل اس کے والدین کو ختم کر دیا۔ ان کی موت میں اس کو کوئی مقصد، کوئی معنویت نظر نہ آ سکی اور نہ آ ہی سکتی تھی۔ اس کی زندگی چلی ہی اس نہج سے تھی کہ اس میں حیات اور موت کا علم آ ہی نہیں سکتا تھا اور اگر آ بھی سکتا تو اس کی عمر ہی ایسی نہ تھی کہ وہ فکر و تدبر کی اہل ہوتی اور پھر وہ اجنبیوں کے درمیان رہنے پر مجبور تھی کیونکہ تنہائی کا جہاں اس کے لیے بالکل ہی اجنبی تھا جو اس کو موت کے جہاں کی یاد دلاتا تھا جو اس کے والدین پر

یکا یک مسلط ہو گیا تھا۔

اس اجنبی مگر اپنوں کے گھر میں ایک دوسرا ہی ماحول تھا، وہاں وہ والدین کے المناک حادثے کے باعث ایک امتیازی توجہ کی حقدار ضرور تھی مگر اپنے والدین کے گھر کی طرح اس ماحول کا مرکز اور محور نہ تھی اور نہ بن ہی سکتی تھی۔

اس کی شخصیت کی ترویج جس انداز سے ہوئی تھی اس سے اس میں خود مرکزیت اور خود محوریت کا احساس اس کی جذباتی زندگی کا اہم ترین احساس بن گیا۔ مگر اس کے ذہن میں ابھی ان کا تصرف اور تغلب نہ ہوا تھا کیونکہ اس غلبے کی احساس کو ضرورت ہی نہ تھی اور اس کے ماحول میں اس کے احساسات کو نہ تو حیرت اور نہ بری نظر سے دیکھا جاتا تھا۔

مگر نئے ماحول میں اس جیسے کئی تھے اور کوئی بھی ان احساسات کو عزیز نہ رکھتا تھا۔ لہٰذا اس احساس کو ایک چتونی ملی اور اس لئے اس کا اس احساس کی حفاظت کے لیے کمر بستہ ہو جانا عین زندگی تھا۔ اس کے لیے اس احساس کی تحدید اور تہذیب کا جواز کوئی نہ تھا۔ ہوتا بھی کیسے؟ اگر انسان کا جنم اور اس کی موت، اس کی ایک خاص معاشرے اور ایک خاص ماحول میں زندگی، حادثات نہ تھے تو کیا تھے، اس نے سوچا ہوگا۔ اگر محض حادثے تھے تو بے مقصد تھے، بے معنی تھے۔ اگر ایسا تھا تو انسان کی زندگی کا کوئی معنی نہ تھا کوئی مقصد نہ تھا۔ اگر ایسا ہی تھا تو وہ اپنے احساسات کے مطابق کیوں عمل پیرا نہ ہو؟ اس لیے کہ دوسرے لوگ اس احساس کو برا سمجھتے تھے؟ اور اس سے اس کو اس وجہ سے نقصان پہنچ سکتا تھا؟ تو اس کا حل یہ تھا کہ وہ ان سے سروکار ہی نہ رکھے اور اگر رکھے بغیر چارہ نہ ہو تو اس احساس کو ان پر وانہ ہونے دے۔ ایسا کر لینا اس کو ناممکن نہ نظر آیا ہوگا۔

اگر انسانی زندگی کا کوئی معنی تھا، کوئی مقصد تھا تو ہر واقعہ حادثہ نہ تھا ایک مقررہ منزل تھی جس سے ہر انسان کو گزرنا تھا۔ مگر اس یکا یکی کی موت کو وہ ایک مقررہ منزل سمجھ لینے کے لیے کسی صورت تیار نہ تھی۔ اسے اس حادثے سے سخت نفرت تھی۔ اس کے لیے یہ حادثہ اس بات کی دلیل تھی کہ کوئی قوت، جس سے وہ آشنا نہ تھی، اس سے عداوت رکھتی تھی۔ اس کو اکثر اپنے والدین پر بھی غصہ آتا ہوگا کہ وہ اس کو یوں دغا دے گئے جس کا ان کو قطعاً حق نہ تھا۔

پھر اس کو اپنے والدین سے محبت تھی چاہے اس لیے کہ وہ ان کی بدولت اپنے ماحول کا مرکز اور محور تھی یا اس لئے کہ وہ تنہائی کے جہان سے اس کو محفوظ رکھے ہوئے تھے۔

جب اس نے مسلسل اس پر سوچا ہوگا تو اس کو ہر شے بے معنی اور بے مقصد نظر آئی ہوگی جس پر تکیہ نہ کیا جا سکتا تھا۔ اس کو کسی شے کی حقیقت کا یقین آتا ہوگا تو صرف اپنی ہی ذات کا۔ اس نے اپنی ذات کو حقیقت مان لیا ہوگا اور اس کی حیاتیاتی اور شخصیاتی زندگی کے لیے کمربستہ ہوگئی ہوگی اور اس مقصد کی تکمیل اور تسکین کے لیے اس نے اپنے احساسات کو چھپائے رکھنے کا تہیہ کرلیا ہوگا۔

اس نئے ماحول میں اس نئے شعوری نقطہ نظر سے جب اس کی نظر تم پر پڑی ہوگی تو اس کی توجہ تمہاری طرف کھنچی ہوگی کیونکہ اس ماحول میں تم ہی وہ واحد فرد تھے جس کی ساری شخصیت کا مظہر، دوسرے کے لیے راحت اور لطف کے سامان مہیا کرنا تھا، جس میں تم ہر دم پورے یقین، شعور اور وجد سے مصروف نظر آتے تھے۔ یہ یقین، یہ شعور اور یہ وجد دوسروں کی راحت اور لطف کے لیے، اس سے اس کے قلب و ذہن میں ہیجان اور ایک لرزا تو ضرور پیدا ہوا ہوگا کیونکہ یہ طرزِ عمل اس کی ساری شخصیت کے لیے ایک چنوتی سے کم نہ تھا۔ اس کے ساتھ ساتھ تمہاری ذات میں اس کو اپنی خود مرکزیت اور خود محوریت کے احساسات کی تسکین کا نہایت ہی اعلیٰ ذریعہ بھی تو نظر آیا ہوگا۔

لہٰذا اس کے لیے تم ہر دم خطرے کا اعلان بھی تھے اور راحت اور لطف کا وعدہ بھی۔ اس کشمکش سے وہ اپنی بے اعتنائی کے جہاں سے باہر نکل آنے پر مجبور ہوگئی ہوگی اور جب انسان بے اعتنائی کے جہاں سے نکل آتا ہے تو ہر شے کی طرح وہ بھی اپنے زوج کے لیے شعوری طور پر یا لاشعوری طور پر، تلاش میں سرگرداں ہو جاتا ہے۔ ان حالات میں انتی بھی اس کشمکش کے پس منظر میں غیر شعوری طور پر، کیونکہ شعوری طور پر زوج کی تلاش اس کے غالب احساسات کی تنقیض ہوتی، وہ تم سے اپنی آرزوؤں کی تکمیل اور تسکین کی طلبگار رہوئی ہوگی اور اس تکمیل اور تسکین کی جو بھی معاشرتی صورت بنتی ہوگی اس کو قبول کرنے سے بھی کتراتی ہوگی۔

اس طرح وہ دو مختلف قسم کے مناظرِ حیات کی یکساں کشش کے باعث اپنے مقام سے، اجرام فلکی کی طرح انحراف نہ کر سکی۔ یہ اس کی شخصیت کا قانون تھا۔

اس مقام سے حرکت ایک صورت میں ممکن ہو سکتی تھی کہ دونوں مناظرِ حیات کی کشمکش سے وہ یکساں طور پر آزاد ہو جاتی۔ یہ تو تبھی ممکن تھا کہ دونوں مناظرِ حیات اس سے اتنے دور ہو جاتے کہ ان کی کشمکش اس پر اثر انداز نہ ہوتی اور ایک تیسرا منظرِ حیات اتنے فاصلے سے اس کو اپنی طرف کھینچتا کہ اس کی شخصیت میں انتشار نہ پیدا ہوتا اور آہستہ آہستہ اس شخصیت کی صلاحیتوں کے اجزا میں دھیرے دھیرے اوصاف کی قلبِ ہیئت ہو جاتی اور قلبِ ہیئت ہوئے ہوئے اوصاف سے اس کی صلاحیتوں میں نیا آہنگ اور وحدت پیدا ہو جاتی۔

اس کام کے لیے ایک ایسے نظریہ حیات کی ضرورت تھی جو غیر انسانی تخلیق ہوتا تاکہ اس کے مقام سے اتنا دور ہوتا کہ اس کی کشش اس کی شخصیت کے انتشار کا باعث نہ ہوتی اور ایک ایسے خالق کی ضرورت تھی جو اس کے قریب ہوتا اور اس کا اعتماد حاصل کر سکتا اور اس اعتماد کی بدولت اس کی شخصیت کے اجزا کے اوصاف کا علم مہیا کرتا اور اس علم کی روشنی میں وہ اس کو ایک خاص ترتیب اور آہنگ سے اس نظریہ حیات کے مقام سے نظر آنے والے منظرِ حیات کے جزوی جلوے دکھاتا چلا جاتا۔ اس سفر کی پہلی منزل تو یہ آتی کہ وہ مناظر کی جاذبیت کی وجہ سے خود مرکزیت اور خود محوریت کے مقام سے ہٹ جاتی اور وہ منظرِ حیات اپنے جلوؤں کے باعث اس کی شخصیت کا مرکز اور محور بن جاتا۔

اس کام کے لیے بھی، زروان! تم سے بہتر انسان ممکن نہ ہوتا اگر تم ایسے منظرِ حیات سے آشنا ہوتے اور اس کا علم تم کو میسر ہوتا کیونکہ تم کئی سطحوں پر خالق ہو اور تمہاری خلّاقی کا مرکز ہمیشہ دوسروں کی ذات ہوتا ہے۔ زندگی سے تم نے ایک اور ضروری وصف بھی سیکھا ہے! آرزو کی تکمیل کے لیے منزل بہ منزل سفر کرنا اور آخری منزل کے لیے اطمینان اور سکون سے انتظار کرنا۔'' متین صاحب بولتے بولتے ستانے کی ضرورت کو محسوس کر کے خاموش ہو گئے۔

''مگر ایسا ہوسکنا اب کیسے ممکن ہو سکے گا کیونکہ میں زندگی کی ان منزلوں کی طرف لوٹ نہیں سکتا جو میں طے کر آیا ہوں۔ لوٹ کر جا بھی سکتا تو یہ مجھے قبول نہیں کیونکہ ان منزلوں پر ابھی میرا مالک سرگرداں ہوگا اور اس سے سامنا شرمندگی کا باعث ہوگا اور اس شرمندگی کو میرا ضمیر گوارا نہیں کر سکے گا۔''

''رب العلمین کے لیے یہ عین ممکن ہے کہ پچھلی منزلوں کے بچھڑے ہوئے ساتھی سفر کی کسی اگلی منزل پر پھر آ ملیں۔ انسان کو اس امکان کے لیے ہمیشہ تیار رہنا چاہیے۔'' متین صاحب نے یقین دلایا۔

زروان کے چہرے سے فکرمندی کے بادل چھٹ گئے۔ اس کی آنکھوں میں ایک نئی انوکھی روشنی تھی اور اس کی گردن میں ذرا سا تناؤ آ گیا تھا جیسے اطمینان سے اس کا سینہ لبریز ہو گیا ہو۔ اس کے سارے بدن میں حرکت کی آرزو مچلنے لگی تھی۔ اس کا سارا جسم رخصت کی اجازت کا طلب گار نظر آنے لگا۔ وہ بار بار متین صاحب کی طرف دیکھتا تھا مگر متین صاحب اپنے آپ میں ڈوبے نظر آتے تھے اگرچہ ان کی آنکھیں اس پر گڑی دکھائی دیتی تھیں۔ اس نے دوسروں کی طرف دیکھا تو وہ بھی گم سم بیٹھے تھے۔ اس نے اپنی بی بی کی طرف دیکھا۔ فردوس پر ایک عجب سرور کا عالم تھا، اس کی آنکھوں میں نور کی بارش ہوتی صاف دکھائی دیتی تھی۔ اس کے چہرے کے نقوش بڑی تیزی سے مختلف شکلوں میں ڈھل رہے تھے، ڈھل ڈھل کر مٹ رہے تھے۔ اس کو کبھی تو گمان ہوتا کہ اس کے چہرے پر نوراں کی شکل ہویدا ہوئی ہے اور کبھی اس کو اپنی ماں کی صورت نظر آتی اور کبھی فردوس بالکل انتی کا روپ نظر آتی۔ اس کا دل کئی بار اچھلا، ڈوبا۔ وہ ان مناظر میں کھو گیا۔

''بھئی فردوس! زروان کو رخصت کی اجازت دے دو نا۔ وہ کتنی دیر سے انتظار میں ہے۔'' جمیل صاحب نے اس کی سفارش کی۔

فردوس اس کی طرف متوجہ ہوئی۔ اس کی آنکھوں میں زروان کو وہ مناظر نظر آئے جو انتی کی آنکھوں میں ان لمحوں میں نظر آتے تھے جب وہ اس سے رخصت ہونے لگتی۔ اس کے دل سے شرمندگی کا ایک دریا پھوٹ بہا اور اس نے نظریں جھکا لیں۔

''زروان! اب تم آرام کرو۔ صبح سویرے ہی، پو پھٹنے سے پہلے ہی ناشتہ کرا دینا اور حاضری کا سامان باندھ لینا۔ یہاں سے پکنک کریں گے۔''

''جی'' وہ اس سے زیادہ کچھ نہ کہہ سکا وہ مشکل سے اٹھا اور چپل پہن دروازے سے باہر نکل گیا۔

اس کے جاتے ہی ان کے جذبات اور خیالات کی فضاؤں میں اندھیرا چھا گیا جیسے کہ وہی ان فضاؤں میں روشنی کا منبع تھا۔ اس پر ان کو حیرت ہوئی اور وہ نئے قمر، نئے شمس کے طلوع کے لیے دعا کرنے لگے اور دعا کی قبولیت کے لیے بے تاب ہو ہو گئے۔

تیسرا باب

ان کے اذہان کی فضاؤں میں، قلوب کی گہرائیوں میں اگرچہ تہہ در تہہ اندھیرا تابڑ توڑ برس رہا تھا مگر کمرے میں بند شمالی دروازے اور بند کھڑکیوں کے سرخ دبیز پردوں پر چاندنی رقصاں تھی۔

اندرونی اندھیروں سے جب ان کا دم گھٹنے لگا تو فردوس نے اٹھ کر شمالی دروازوں اور کھڑکیوں سے، مغربی بلوریں دیوار سے پردے ہٹا دیئے۔ کمرا چاندنی سے جگمگا اٹھا۔ آسمان کی جگمگاتی ہوئی نیلاہٹیں ان کے اندرونی اندھیروں سے نبرد آزما ہونے لگیں، ان پر چھانے لگیں۔ نیلے آسمان پر روشن اور مدھم ستاروں نے عجب آہنگ پیدا کر رکھا تھا۔ اس آہنگ نے ان کے قلوب میں ان تمام آرزوؤں کو ہویدا کر دیا جو ان کے لیے مستقبل کی آسودگی کی نشانیاں تھیں۔

آرزوؤں کی ہویدگی ان کے تاریک اندرونی جہانوں کی روشنی کا باعث ہوئی اور وہ ان کی تسکین اور تکمیل کے ذریعوں کے علم کے لیے بے تاب ہونے لگے۔

''پچھلی منزلوں کے بچھڑے اگلی منزلوں میں آ بھی ملیں، ان میں وصل و نکاح بھی

ممکن ہو جائے تو پھر بھی اندر کی تنہائی کا کیا علاج ہوگا اور تنہائی کے سفر میں روشنی کا کیا بندوبست ہوگا؟

آپ اور میں کس منزل پر بچھڑ گئے تھے مجھے یاد نہیں اگرچہ آپ سے دوبارہ ملنے کے بعد اکثر احساس ہوا کہ ہم بچھڑ گئے تھے۔ اب ملے ہیں تو اگلی منزلوں کا نشان تک نہیں ملتا۔ میں اپنے حال سے اگر بالکل ہی مطمئن نہ تھا تو غیر مطمئن بھی نہ تھا۔ میں اپنے ماضی سے آشنا تھا، اپنے حال سے آشنا تھا اور مجھے یقین تھا کہ مستقبل کس طرح کا ہوگا۔ مگر اب احساس ہوتا ہے کہ میں نہ تو اپنے ماضی سے آشنا تھا، نہ حال سے اور نہ مستقبل سے۔ اب یہ آشنائی ایک طویل رات کی طرح میرے اندر کے آفاق پر محیط ہے۔

میں محبت کی سرزمین میں بھی اجنبی نہ تھا۔ اس سرزمین میں اپنا ایک ننھا سا، حسین سا گھر تھا مگر اب اس سرزمین کی ہیئت ہی بدل گئی ہے۔ اس سرزمین میں اب میں بے گھر اور بے منزل ہوں۔

اکثر خیال آیا ہے کہ آپ میرے تنہائی کے جہاں میں ایک سیارے کی طرح تھے جس سے میں آفاق کا تعین کر سکتا تھا اور اب یکا یک وہ سیارہ اپنے مقام سے ہٹ گیا ہے اور ایک دم دار ستارہ بن گیا ہے جس سے میرے جہاں کے نظام فلکی میں ایک انقلاب آتا جا رہا ہے، ہر یاد، ہر خیال کسی اجنبی منزل کی تلاش میں سرگرداں ہو گئی ہے۔

میری تنہائی بے کراں ہو چلی ہے، مجھ پر بھاری ہو گئی، اس کی وسعتوں سے جی گھبرانے لگا ہے۔ یکا یک اپنی زندگی اور یہ سب کائنات بے معنی نظر آنے لگی ہے۔

آخر کیوں؟'' تقی بول اٹھا۔

رابعہ نے منہ موڑ کر اس کو دیکھا اور ایک لمبا سانس لیا، جیسے کہ اطمینان ہو گیا ہو کہ وہی ہوا کہ جو ہونا ہی چاہیے تھا۔

فردوس چونکی اور اس نے حیرانی سے تقی کی طرف دیکھا۔ تقی کے چہرے پر خوف اور سپردگی آپس میں نبرد آزما نظر آئے۔ اس نے گردن موڑ کر متین صاحب کی طرف دیکھا۔ ان کے ساکت جسم اور اعضا سے بے نیازی پھوٹ رہی تھی۔ صوفے کی کمر سے لگی ان کی

گردن کے خفیف سے تناؤ اور آنکھوں کی سیاہ پتلیوں کے قرار سے گمان ہوتا تھا کہ جیسے وہ گھات لگائے بیٹھے ہوں اور دیکھ رہے ہوں کہ شکارعین ان کی مرضی کے مطابق ان کے نشانے کی زد میں آتا چلا جارہا ہے۔ اس کے دل میں ایک الجھن سی ہوئی اور پھر اس کی الجھن نے ایک ہی جست میں محاربے کی صورت اختیار کر لی۔ اس کو متین صاحب پر بہت ہی غصہ آیا اور اس کے دل میں یہ ارادہ جنم لینے لگا کہ اگر انہوں نے تقی کو تسلی بخش جواب نہ دیا تو وہ ان کی شخصیت کے پرخچے اڑا دے گی۔ ارادے کی گرمی اس کو سارے بدن میں محسوس ہونے لگی، وہ اس کی گرمی میں جلنے لگی۔

عالمہ رابعہ اور جمیل صاحب کے دل میں ایک ساتھ ہی یہ خیال پیدا ہوا کہ اگر فردوس پھٹ پڑی تو بہت بڑی آفت ٹوٹ پڑے گی ان سب پر جس کا سب سے زیادہ دکھ فردوس کو ہی ہوگا۔ انہوں نے اپنی اپنی پوری شخصیت سے آرزو کی کہ پیشتر اس کے کہ فردوس کا غصہ اظہار پائے۔ متین صاحب بول پڑیں۔

''جانِ عزیز! ہر انسان اپنی صلاحیتوں کے اعتبار سے کئی مختلف شخصیتوں کا امکان ہے۔ اس کے اندر کئی شخصیتیں زندگی اور زکا کی مختلف منزلوں میں سرگرداں ہوتی ہیں۔ ان میں جو غالب شخصیت ہوتی ہے وہی معاشرے میں ظہور اور اظہار پاتی ہے اور یہ غالب شخصیت عموماً ایسی ہوتی ہے جو اس معاشرے میں قابلِ قبول نہیں تو ناقابلِ قبول نہ ہو کیونکہ معاشرہ خاندان کے ذریعے روایت کے سایے میں ایسی شخصیتوں کی نشوونما کرتا ہے جو اس معاشرے کے قرار اور اس کی بقا کی ضامن اور محافظ ہوں۔

معاشرہ اکثر و بیشتر اپنے اس مقصد میں کامیاب رہتا ہے مگر کبھی کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ ایسی شخصیتیں وجود میں آجاتی ہیں جو اپنی صلاحیتوں کے اعتبار سے اس معاشرے کے عام افراد سے اس حد تک مختلف ہوتی ہیں کہ وہ اپنے لئے نئے معاشرے، انسانی تعلقات کے نئے نظام کے لئے آرزومند ہوتی ہیں جس سے اس معاشرے میں کشمکش کی قوتیں جنم لے لیتی ہیں۔

ایسی ہی شخصیتیں معاشروں کو نئی منزلوں، نئی شکلوں، نئے مقاصد اور نئے معنی سے آشنا

کراتی ہیں۔ اگر معاشرے کی روایات اوران کے مقاصد میں نا قابلِ برداشت بُعد نہ ہوتو معاشرہ بالآخر بدلنے پر رضامند ہوجاتا ہے اگر چہ بہت کشمکش کے بعد۔لیکن اگر بعد نا قابلِ برداشت ہوتو معاشرے اوران میں ایک تصادم ہوتا ہے جس میں یا تو ان شخصیتوں کو جان دینی پڑتی ہے یا پھر معاشرے کو شکست کا منہ دیکھنا پڑتا ہے۔ دونوں صورتوں میں معاشرہ بحران کی حالتوں سے دوچار ہوجاتا ہے۔

اس عہد میں ہمارے دیس میں بدیسی حاکموں کے خلاف مغربی سیاسی اور معاشرتی فلسفے کے نت نئے خیالات کے زیرِ اثر انسانوں میں ایسے خیالات اور جذبات ترویج پائے ہیں کہ بے شمار انسان اپنے دیس کی روایت کو قبول کرنے والے معاشرے کے برعکس عمل پیرا ہونے پر اپنی صلاحیتوں کے اعتبار سے مجبور ہیں۔

مغرب کے نئے صنعتی، معاشرتی اور سیاسی نظاموں سے وجود میں آنے والے نفسیاتی ماحول سے رومانوی ادب اور مصوری کے حوالے سے ہم لوگ بھی متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکے۔ مثلاً رومانوی محبت کے تصور نے مرداورعورت کے باہمی تعلقات کی نوعیت کو اس حد تک بدل دیا ہے کہ کوئی روایتی اور روایت پسند معاشرہ اپنے اور اپنے معاشرتی اداروں اور رسوم کی شکل کو قائم نہیں رکھ سکتا۔

رومانوی محبت کا تصور مرد اور عورت کے ایک جوڑے کو معاشرے سے بالکل الگ کر دیتا ہے اور اس محبت کے زور پر وہ دونوں جس جہاں کو جنم دیتے ہیں وہ ہر معاشرے کا، چاہے وہ کسی ہی نوعیت کی بنیادوں پر قائم ہو، نقیض ہوتا ہے، یہ اس لئے کہ ایسی محبت کسی غیر کی شرکت کو قبول کرنے سے انکاری ہوتی ہے اور ایسی محبت کے لیے محبوب اور عاشق کے علاوہ ہر کوئی غیر ہی ہوتا ہے۔

سب سے بڑا ستم تو یہ ہے کہ ایسی محبت انسان کی صلاحیتوں کے جہاں کو بالکل تنگ کر دیتی ہے۔ اس حد تک کہ خود اس محبت میں پیوست عاشق ومحبوب اپنے اتحاد کے جنسی ثمر یعنی اولاد کو بھی اپنا حریف جانتے ہیں۔ لہٰذا ایسی محبت میں اولاد باہمی افتراق اور نفاق اور بالآخر فراق کا باعث بنتی ہے۔

ایسی محبت سے، اس کے لطف اور حظ کو برقرار رکھتے ہوئے، چھٹکارے کی یہی صورت ہے کہ محبت کے ایسے نظریے کو اپنایا جائے جو مرد اور عورت کو زوجین کی حیثیت سے قبول کرتا ہو اور ان کے وصل کی ایک ہی صورت کو قبول کرتا ہو جس میں دونوں اپنی اپنی شخصیتوں کو برقرار رکھتے ہوئے ایک دوسرے میں اس طرح گھل مل جائیں جیسے نین میں نیند، جیسے بطنِ زمین میں دریا۔ ایسی صورت میں اس اتحاد سے پیدا ہونے والی اولاد کی زکا اور تربیت کی آرزو ان کے باہمی رشتوں کو اور بھی مضبوط کرتی ہے۔ اس سے ایک خاندان کی بنا پڑے گی اور اس خاندان میں محبت کے رشتوں کو قائم رکھنے کے لیے معاشرے کو ایسی شکل دینے کی آرزو پیدا ہوگی جس میں انسانوں کا باہمی رشتہ ایسی ہی محبت ہوتا کہ وہ ان دو افراد کی محبت کی محافظ ہو۔

کچھ دن پہلے تم رومانوی محبت کے پرستار تھے چاہے اس کا تم کو باقاعدہ شعور تھا یا نہ تھا۔

عالمہ تمہاری زندگی کا محور تھی، تمہاری تنہائی کی شریک تھی اور اس کی محافظ تھی۔ یہ رشتہ چونکہ روایت کے سایے میں پروان چڑھا تھا اور ایک لحاظ سے ہر سطح پر زندگی کا روزمرہ بن گیا تھا اس لیے عالمہ کے لیے اس کی صلاحیتوں کے جہان کو تنگ کرتے چلے جانے کا سبب بن گیا۔ وہ اس دھرتی اور اس دھرتی کے گرد و پیش کی فطرت سے اتنی قریب ہے، اس میں پیوست ہے کہ ہر وہ رشتہ جو اس کائنات کے صبح و شام، اس کے موسموں کی گردش، ان موسموں کی گردش سے پیدا ہونے والے رنگوں سے مربوط نہیں، ان سے زندگی حاصل نہیں کرتا اس کے لیے نفسیاتی اور شخصیاتی موت کے مترادف ہے۔ اس کائنات سے زندگی حاصل کرنے والے رشتے اس کو ان انسانوں سے بھی مربوط کرتے ہیں جن کی زندگیاں اس کائنات کے اثرات سے ترتیب پاتی ہیں۔ اس کو ایسی راحت قابلِ قبول ہو ہی نہیں سکتی جس میں یہ کائنات اور اس کائنات سے زندگی پانے والے انسان شریک نہ ہوں۔ وہ تو ان حیوانوں اور ان پرندوں کو بھی اس میں شریک کرنا چاہتی ہے جو اس کائنات کی فضاؤں میں سانس لیتے ہیں۔

اس کے برعکس رومانوی محبت کسی کی بھی شرکت نہیں چاہتی اور اسی لیے رومانوی محبت کے پرستار شہروں بلکہ بڑے شہروں کا رخ کرتے ہیں جہاں بدلتے موسموں کی گردش، صبح وشام کے رنگ روزمرہ کی زندگی کے شریک نہیں ہیں، جہاں ہر انسان ایک الگ جزیرہ ہے جس کا کائنات سے کوئی نفسیاتی یا شخصیاتی رشتہ نہیں، جہاں ہر انسان ان کی محبت کا حریف ہے۔

ان حالات کے تحت جب عالمہ نے تم کو یہ بتایا ہوگا کہ جو رشتہ تمہارے والدین نے تم دونوں کے لیے مقرر کیا تھا وہ ممکن نہیں تو تمہارے اندرونی جہان میں انقلاب آیا ہوگا اور اس انقلاب زدہ جہاں میں تم بے مقام اور بے منزل ہو گئے ہو گے۔ اس میں حیرانی کی بات ہی کیا ہے۔

لہٰذا اب تمہارے لئے اس کے سوا چارہ ہی کیا ہے کہ محبت کے نئے تصور کے لیے سرگرداں ہو جاؤ اور اس وقت تک سرگرداں رہو جب تک محبت کے ایسے تصور سے آشنا نہ ہو جاؤ جو انسانوں میں دوستی کے جذبات کی زکا کرتا ہو، مرد اور عورت کے نکاح کے لازمی نتیجے کے طور پر خاندان کو جنم دیتا ہو، جس کی زندگی میں مرد اور عورت ہر سطح پر برابر کے شریک ہوں۔

اس بات کا تم کو کسی سطح پر شعور بھی ہے۔ اسی لئے تمہاری شخصیت میں صلاحیتوں کے موجودہ نظام میں انتشار آنے کے ساتھ ساتھ ایک نئے نظام کی شکل کو بنتے ہوئے میں دیکھ رہا ہوں۔

اس نئی صورت حال میں میرا تفاعل اتنا ہی ہے کہ پرانے نظام کے انتشار اور نئے نظام کی جامعیت کو اپنی شخصیت کے اثر سے ممکن بناؤں۔

اگر میں ایسا نہ بھی چاہوں تو ہو کر رہے گا کیونکہ جب تک میں اپنی شخصیت کو خود مرکزیت اور خود محوریت کے حصار میں محصور نہ کروں ایسا ہی ہوگا اور خود مرکزیت اور خود محوریت میری صلاحیتوں کے لیے موت کا پیغام ہوں گے۔ تمہیں میرے لیے اس لمحے موت تو پسند نہ ہوگی لہٰذا جو ہو رہا ہے وہ ہو کر رہے گا۔

اور...... سب سے بڑی بات تو یہ معلوم ہوتی ہے کہ ہم لوگ جو جمع ہیں وہ ایک دوسرے کے شخصی خصابت پن کا باعث ہیں اور اس رشتے سے ہم میں باہمی دوستی اور سنگت کے روابط وجود میں آئے ہیں اور ان کی نشو ونما اور زکا کے لیے ضروری ہے کہ ہم ایک دوسرے سے منسلک رہیں اور باہم مل کر ایسا کام کریں جس میں ہر ایک کی صلاحیتیں بروئے کار آ کر ثمر آور ہو سکیں۔

اس کے لیے ایسے جہاں کی تخلیق ضروری ہے جس میں انسان اس دھرتی، سورج اور چاند کی گردشوں سے وجود میں آنے والے موسموں اور ان موسموں کے زیر اثر فضاؤں میں پیدا ہونے والے رنگوں اور خوشبوؤں اور ذائقوں سے رشتوں میں مربوط ہوں جو پائیدار ہوں، خصیب ہوں۔ جس میں ایسے شہر اور ایسی شہری زندگی ہو جو ان رشتوں کو روزمرہ کی زندگی میں کارفرما ہونے کے فراواں مواقع مہیا کرتی ہو۔ جہاں انسان اپنی تنہائی کے شعور سے ہر انسان کی تنہائی کا شعور حاصل کرتے ہوئے اس کی تنہائی کا محافظ ہو اور جب اس کو اس تنہائی میں شرکت کی دعوت دی جائے تو اس دعوت کو قبول کرنے کے لیے تیار رہے۔ اس سے انسانوں میں اخوت کا رشتہ استوار ہو جائے گا۔ اس طرح تنہائی جو انسان کا بحیثیت انسان ایک لازمی وصف ہے اور جو اس کے لیے اکثر و بیشتر موت کی حلیف ہے، لہٰذا خوف اور عذاب کا باعث ہے، اس کے لیے رحمت کا دروازہ بن جائے گی جس سے وہ تخیل اور تخلیق کے جہاں میں داخل ہو سکے گا......

''وہ کیسے؟'' عالمہ اور رابعہ نے ایک ساتھ سوال کیا۔

''تنہائی میں انسان کی کوشش کے بغیر تخیل کا جہان اس پر وا ہو جاتا ہے۔ اس جہان میں ہر عمل اپنے آپ کو دہراتا ہوا نظر آتا ہے جو ایک لحاظ سے روزمرہ کی بے رنگ زندگی کا پرتو ہوتا ہے۔ اس سے بچنے کی ایک تو صورت یہ ہے کہ انسان ہر دم باہر کے جہاں میں کسی نہ کسی طرح اپنے آپ کو مصروف رکھے لیکن یہ ممکن نہیں کیونکہ وہ انسانوں سے الگ ہونے پر مجبور ہو جاتا ہے چونکہ اس کے جسم کو آرام کی، نیند کی ضرورت ہوتی ہے اور نیند کے انتظار میں چند لمحوں، اور کبھی گھڑیوں، کے لیے وہ تنہائی سے ہم کنار ہونے پر مجبور ہے۔ اس مجبوری کا

علاج یہی ہے کہ انسان تنہائی اور تخیل کے عالم کو قبول کرے، اس کو سمجھنے کے طویل سفر پر روانہ ہوجائے۔ اس صورت میں سمجھ تخلیق کے جہان کے دروازے پر دستک دیتی ہے اور انسان اگر ثابت قدم رہے تو تخلیق کے جہان میں داخل ہوجاتا ہے جہاں دہرانے والے عوامل نئے نئے رشتوں میں ڈھلتے چلے جاتے ہیں۔ ان رشتوں کا شعور انسان کو اس بات پر اکساتا ہے کہ جب وہ انسانوں کے جہاں میں، باہر کے جہاں میں لوٹ آئیں، جہاں لوٹ آنا ان کے لیے بجز دیوانگی، ہر حال میں مقدر ہے، تو انسانوں کے باہمی ملاپ سے وجود میں آنے والی طاقتوں کو تخلیقی صورتیں عطا کریں۔ اس طرح ان کے اندرونی اور بیرونی جہانوں میں ایک ہر دم نشو ونما پاتا ہوا رشتہ قائم ہوجائے گا۔ اس سے ان کی روزمرہ کی زندگی میں نت نئے رنگ اور آہنگ آتے چلے جائیں گے۔ انسان کی زندگی تنوع اور نظام کا ایک نامیہ بن جائے گی۔ یہ دوسری صورت ہے۔ تیسری صورت خود مرکزیت اور خود محوریت کی ہے۔ مگر اس میں بھی دوسروں سے واسطہ رکھنا ہی پڑتا ہے۔ اور انتی کی طرح ایک ایسے جال میں الجھنا پڑتا ہے جس سے چھٹکارے کی راہ ممکن نہیں۔''

''ہم سب کے لیے جو یہاں موجود ہیں وہ کون سا کام ہوسکتا ہے جس میں ہم سب کی مختلف صلاحیتیں اور شخصیتیں باہم تعاون کرسکیں۔'' جمیل صاحب اور تقی نے ایک ساتھ سوال کیا۔

''ایسے معاشرے اور ایسی تنہائی کی تخلیق جو زوجین کے رشتوں میں مربوط ہوسکیں۔'' متین نے جواب دیا۔

''صنعت کاری اور کاشت کاری دو ایسے مختلف اصولوں سے وجود میں آتے ہیں کہ ان میں اور ان انسانوں میں جو ان کو ممکن بناتے ہیں کسی طرح بھی اتحاد و دوستی کا رشتہ استوار کرنا ممکن دکھائی نہیں دیتا۔ اس کا حل کیسے ہوگا؟ اور اگر اس کا حل نہ ہوسکا تو ہر معاشرہ مزدور اور کاشتکار کے دو طبقوں میں بٹا رہے گا اور ان میں اپنے پیشوں کی وجہ سے دو بالکل متضاد اور متحارب ذہنوں اور قلبوں کا ظہور ہوگا۔ ان میں کسی قسم کی مودت کیسے ممکن ہوگی؟ اور ایسے معاشرے میں ہم جیسے لوگوں کا کیا کردار ہوگا؟'' عالمہ نے سوال کیا۔

''مثلاً کارخانوں میں کام کرنے والے مزدور ایک مکمل چیز کے مختلف حصوں کو الگ الگ بناتے ہیں اور ان حصوں کو مکمل صورت دینے میں ان کا کوئی ہاتھ نہیں ہوتا جس سے ان میں کسی مکمل چیز کو آغاز سے انجام تک بنانے کا احساس نہیں اور اس احساس سے جو تسکین انسان کو ہوتی ہے اس سے وہ محروم رہتے ہیں۔ ان کا پرزے بنانے کا ہر عمل آغاز و انجام سے کٹا ہوا ہوتا ہے جس سے ان میں ایک ہی عمل کو بار بار دہرانے کے سبب، بوریت کا، بے رنگی کا احساس ہوتا ہے۔ ان کے ہر عمل کا کردار مشینی بن جاتا ہے۔ اس طرح ان کے احساسات اور تصورات پر ایک میکانکی تصورِ حیات، غیر واضح طور پر ہی سہی، چھا جاتا ہے، ان کے اندر کے جہان تک میں سرایت کر جاتا ہے۔ جس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ وہ سائنسدانوں کی ہر مشینی اختراع کو قبول کرنے پر فوراً ہی راضی ہو جاتے ہیں کیونکہ وہ اسی میکانکی طرزِ فکر کا ثمر ہوتی ہے......'' رابعہ نے وضاحت کی۔ ''اس کے برعکس کسان کا ہر عمل ایک ایسے لمبے عمل کا حصہ ہوتا ہے جو آغاز سے انجام تک ایک ہی سلسلے میں مربوط ہوتا ہے۔ وہ اپنی کوششوں کے ثمر کو مکمل شکل میں دیکھتا ہے۔ درخت ہوں یا فصل، پھول ہو یا پھل وہ ان کو جنم سے موت تک ان کی تمام حالتوں میں دیکھتا ہے اور اپنے جیسے انسانوں سے بھی وہ اسی طرح واقف ہوتا ہے۔ ان کی زندگیوں میں کائنات کی ہر تبدیلی ایک معنی رکھتی ہے، وہ ماحول کی ہر تبدیلی پر نظر رکھتا ہے کیونکہ وہ اس کی محنت اور کوششوں کے ثمر کو کسی نہ کسی طرح متاثر کرے گی۔ ان کی زندگی کا آہنگ سورج اور چاند کے طلوع و غروب، موسموں کی تبدیلی سے متعین ہوتا ہے اور رات اور دن، گرمی اور سردی، بہار اور خزاں، خشک سالی اور برسات، نہ صرف اس کی دھرتی کو بلکہ اس کے جسم اور خون کی گرمی اور روانی کو بھی متاثر کرتے ہیں۔''

عالمہ نے گرہ لگائی ''مگر مزدور کی شہری زندگی میں ان مقررہ تبدیلیوں کے آہنگ کا کوئی اثر نہیں۔ وہ بند کمروں میں سورج اور آسمان کے رنگوں سے دور کام کرتے ہیں، ان کے کانوں میں مشینوں کی گھڑ گھڑاہٹ کا بے آہنگ شور بسا ہوتا ہے جس میں کسی قسم کا تنوع نہیں ہوتا جو ان کے جسم اور خون کو متاثر نہیں کرتا، ان میں رچ نہیں جاتا، ان کے خون کی گردش کو نہ تو تیز کرتا ہے اور نہ سست۔ ان کا ماحول بے جان اور بے روح ہوتا ہے جس سے ایسی تھکن ہوتی ہے جس میں نہ میٹھا میٹھا درد ہوتا ہے اور نہ ان کے پسینے میں دھرتی اور سورج کے باہمی وصل

سے پیدا ہونے والی مہک۔ ان کی تھکن میں ایک بوجھل بوجھل کیفیت ہوتی ہے جس سے طبیعت میں کبیدگی پیدا ہوتی ہے جس کا توڑ کسانوں کی طرح گیت نہیں، بانسری کی لے نہیں جو تنہائی سے پھوٹتی ہے بلکہ وہ شور ہے جو کھچا کھچ بھرے ہوئے ہوٹلوں میں، سینماؤں میں ہوتا ہے، جس سے بدن کا کھچاؤ دور تو نہیں ہوتا، ہاں، بھول ضرور جاتا ہے۔ یا اس کا توڑ ہے مختلف قسم کے نشہ آور مشروبات یا وہ کھیل جو بہت بڑے بڑے ہجوموں کے سامنے کھیلے جاتے ہیں جس سے ان میں ایک ہیجانی کیفیت پیدا ہوتی ہے جس سے تھکا ہوا مزدور اور تھک جاتا ہے۔ اس دفعہ اس کی تھکن، جسمانی نہیں ہوتی بلکہ جذباتی اور نفسیاتی ہوتی ہے۔

تھکا ہارا مزدور چالاک سیاستدانوں کا بڑی آسانی سے شکار ہو جاتا ہے جو اس کی احتجاج کی مدھم سی آواز کو ہجوموں میں، نعروں میں گم کر دیتے ہیں۔'' رابعہ نے اپنے ذاتی تجربے کی روشنی میں کہا۔

''مزدور اور کسان کے درمیاں جو بُعد ہے، جو خلا ہے، اس میں ہم جیسے لوگ، تخیل پسند علم پسند اور عقل پسند لوگ، شاعر اور فنکار بروئے کار ہیں۔ ہم اگر کوشش کریں تو کسان اور مزدور کے درمیانی بُعد اور خلا کو بھر پور کر سکتے ہیں جو دونوں کو آپس میں ہم آہنگ کرنے کا سبب بن سکتا ہے۔

اگر ہم لوگ ایسا نظامِ حیات وضع کر سکیں جس سے سائنس، شاعری اور تخلیقی فنون کی حدود مقرر کی جا سکیں اور ان حدود کے اندر وہ اس طرح کارفرما ہوں کہ اپنی اپنی حدود میں کارفرما ہوتے ہوئے بھی وہ ایک دوسرے کو خصیب کریں، جس میں میکانکی طرزِ فکر (مزدور کا طرزِ فکر) اور نامیاتی طرزِ فکر (کسان کا طرزِ فکر) ایک ایسے طبق در طبق ارتقاع پذیر ارتقائی نظام میں بندھ جائیں جس میں ارتقا کی منزلوں میں باہم تضاد نہ ہو بلکہ ان میں زوجین کا سا ربط ہوتا کہ زوجین کے نکاح سے وجود میں آنے والی ہر وحدت ایک نئی وحدت کو جنم دیتی چلی جائے۔

ایسا نظام صرف ربِ ذوالجلال و رحیم و رحمٰن سے مل سکتا ہے۔ وحی کا نظام ہی ان تمام منازل پر محیط ہو سکتا ہے جن کا میں نے ذکر کیا ہے۔ کیونکہ ربِ اعلیٰ کے پاس ہی کائنات اور

انسان کا ایسا ہمہ گیر علم ہوسکتا ہے۔

اس نظام حیات کو مزدوروں کے ذہنوں اور دلوں تک پہنچانے کے لیے میکانکی طرزِ فکر کا استعمال کرنا ہوگا اور کسانوں کے ذہن وقلب میں اتارنے کے لیے نامیاتی طرزِ فکر کا استعمال کرنا ہوگا۔ اس طرح جب ان میں منظرِ حیات کی جدت ذہن وقلب میں جاگزیں ہوجائے گی تو ان میں مودت کے رشتوں کا امکان پیدا ہوجائے گا۔

اس امکان کو حقیقت بنانے کے لیے صنعتی نظام کو بھی بدلنا پڑے گا تاکہ مزدور اور کسان ساتھ ساتھ زندگی گزاریں۔ مثلاً ضروری ہوگا کہ بڑے بڑے کارخانے نہ ہوں، مزدور کے خاندان ننھے ننھے کارخانوں کے مالک ہوں اور وہ اپنی مصنوعات کو گھر میں خاندان کے افراد کے تعاون سے تیار کریں اور جن مصنوعات کے لیے بڑے بڑے کارخانے ناگزیر ہوں ان کے بھی حصے ایسے ہی ننھے ننھے کارخانوں میں تیار ہوں اور ان کے حصے کو جب بڑی مشینوں کی صورت جمع کرنے کا وقت آئے تو یہی لوگ جنہوں نے اس کے حصوں کو تیار کیا تھا اس کو مکمل شکل دینے کے لیے جمع کئے جائیں۔

یہ اس صورت میں ممکن ہوگا جب کارخانے ملک کے ہر حصے میں دیہات کے درمیان ہوں تاکہ مزدور اپنے آباؤاجداد کے گاؤں سے الگ ہوئے بغیر اور دیہات کی زندگی میں شریک رہتے ہوئے مشینی کام کرسکیں۔ پھر ان کارخانوں کی تعمیری ساخت میں بھی ضروری تبدیلیاں کرنی ہوں گی تاکہ مزدور جب کارخانے میں کام کرے تو باہر کی کائنات کے عوامل کو دیکھ سکے، محسوس کرسکے اور اس طرح اس کا اپنی دھرتی اور اس کے گردوپیش کی کائنات سے رشتہ ٹوٹنے نہ پائے۔

ایسے کارخانوں کا تصور کریں جن کی دیواریں قدرت کے ہردم بدلتے مناظر اور مزدور کی مشینوں کے درمیان ملاپ کا ذریعہ ہوں۔ کھیتوں میں لہراتی ہوئی فصلوں، باغوں میں جھومتے ہوئے پھولوں، ان کے رنگوں کو مزدور کام کرتے ہوئے بھی دیکھ رہے ہوں، جسم پر محسوس کررہے ہوں۔ دھوپ اور سایے کے کھیل کو دیکھ رہے ہوں اور مشینوں پر کام کررہے ہوں۔

ان حالات میں نہ صرف مزدور مطمئن اور شاداں رہے گا بلکہ اس کے کام کی اوسط میں کافی اضافہ ہوگا اور سب سے بڑی بات تو یہ ہوگی کہ وہ کسان کے ماحول سے بے گانہ نہ رہیں گے اور اس ماحول میں شفاف دیواروں کے اس پار انہیں کام کرتے دیکھ کر کھیتوں، باغوں میں کام کرتے ہوئے کسان بھی مشینوں کے عمل سے آشنا ہوتے چلے جائیں گے اور ان میں مشینوں کے میکانکی عمل سے بیگانگی نہ رہے گی۔

یوں مزدور، کسان اور فنی خالقوں اور علم پسند، عقل پسند اور تخیل پسند طبقوں میں رشتوں کا ایک جال سا بچھ جائے گا بالکل اسی طرح جیسے پیوند کئے ہوئے پھلوں کے درختوں اور پودوں میں۔ وہ اپنے اپنے افعال اور اعمال سے ایک دوسرے کو خصیب کریں گے اور اس کا شعور رکھیں گے۔ اس سے طبقوں کا امتیاز مٹ جائے گا۔ معاشرے میں ایک وحدت ہوگی جو خلّاقی کی امین اور محافظ ہوگی۔''

''کتنا سہانا منظر پیش کیا ہے آپ نے۔ مگر اس کو معاشرتی حقیقت بنانے کے لیے کتنے بڑے جوکھم در پیش ہوں گے ان کا آپ نے ذکر نہیں کیا۔'' تقی نے اعتراض کیا۔

''مجھے آپ کے تخیل پر اعتماد تھا اور ہے۔ آپ خود اس کا قیام کر سکتے ہیں۔ آپ کی زندگیاں تخیل کی عمل پیرائی اور اس سے پیدا ہونے والے جوکھم سے ہم کناری کی تفسیر نہیں ہیں کیا؟''

''مگر اس دیس میں اتنے نظریے، اتنے مذاہب اور اتنی قومیں ہیں کہ ان میں نظر و قلب کی وحدت پیدا کرنے کے خیال ہی سے جی گھبرانے لگتا ہے۔'' جمیل صاحب نے امکان پسند بننے کی کوشش کی۔

''آپ صحیح فرماتے ہیں مگر ان میں ایک ایسی قوم بھی بستی ہے جو اگرچہ مختلف نسلوں سے ہے، مختلف زبانیں بولتی ہے مگر ایک ہی دین کو، ایک ہادی کو، ایک ہی رب کو، ایک ہی کتاب کو مانتی ہے اور اس قوم کی اکثریت ملک کے ایسے حصوں میں رہتی ہے جو آسانی سے الگ ملک بن سکتے ہیں۔ میرا اشارہ مسلمان قوم کی طرف ہے جو شمال مغربی اور مشرقی حصوں میں آباد ہے اور جن کے علاقوں میں صنعت کاری کا دور ابھی آیا ہی نہیں۔'' متین

صاحب نے سمجھایا۔

''اور اس قوم میں اب ایک وحدت نظر آ گئی ہے اگرچہ کچھ لوگ اس وحدتِ نظر کے مخالف بھی ہیں......

آپ کی بات دل کو لگتی ہے۔ مگر اس سلسلے میں ہمارا لائحہ عمل کیا ہو؟'' فردوس نے کہا

''ہاں، یہی تو اصل مرحلہ ہے۔'' جمیل صاحب نے صاد کیا۔

''جو کتاب اس وحدتِ نظر کا باعث ہے، اس سے جو منظرِ حیات کھلتا ہے اس منظرِ حیات کی جزئیات تک کو قبول کرنے پر مسلمانوں کو رضامند کیا جائے تاکہ جب ان کو الگ ملک مل جائے تو ان میں اب جو وحدت نظر ہے وہ قائم رہے اور اس کے قائم رہنے کے اتنے زیادہ جواز ہوں کہ اس وحدتِ نظر میں افتراق ناممکن بن جائے اور ہر فرد کے ذہن وقلب پر ایک ہی منظرِ حیات نقش ہو۔'' متین صاحب نے آخری لفظ کو اس طرح ادا کیا کہ جیسے کہہ رہے ہوں کہ اب تھک گیا ہوں۔ آرام کرنا چاہتا ہوں۔

فردوس نے ان کے مطلب کو پالیا اور بولی

''بہت لمبا سفر کر لیا ہے ہم نے، اب منزل دور نہیں۔ اب آرام کر لیں۔ صبح ہونے سے پہلے ایک نئے سفر پر روانہ ہونا ہے۔''

''تھکن تو بالکل محسوس نہیں ہو رہی۔ بدن میں تازگی کا احساس بیدار ہو رہا۔ جی چاہتا ہے کہ چاندنی کی سیر کریں۔ دیکھئے! یہ بلوریں دیوار چاندنی کی آنکھ بن گئی ہے، دور تک چاندنی کھلی ہے۔ ایسی چاندنی نجانے پھر کبھی میسر آئے، نہ آئے۔'' رابعہ بولی

''نیچے میدان میں؟ بلندیوں سے اترنے کو دل نہیں مانتا۔ عالمہ بولی۔

''تو بلندیوں پر چڑھ لیں؟'' تقی بولا۔

''ہاں! ہاں!'' عالمہ، رابعہ اور جمیل صاحب ایک ساتھ بولے۔

''مگر اوپر جانے کا راستہ ہی کہاں ہے۔''فردوس نے اعتراض کیا۔

''ہے تو۔'' متین صاحب نے یقین دلایا۔

''واقعی؟ آپ سے کچھ بھی چھپا نہیں ہے۔ کہاں سے ہے۔'' فردوس نے پوچھا۔ اس کی آواز میں خفیف سے ملال کی کیفیت جھلکتی تھی۔

''جس کمرے میں سویا تھا اس کے غسل خانے کی دیوار میں ایک چور زینہ ہے۔''

''اوہ! چور دروازے بھی آپ کی نظر سے محفوظ نہیں۔'' فردوس کی آواز میں حیرانی کے ساتھ ساتھ الجھن کی بھی جھلک تھی۔

''آیئے پھر چلیں۔''

سب متین صاحب کے کمرے کی طرف چل دیئے۔ متین صاحب سب سے آگے آگے ان کے پیچھے تقی، عالمہ اور رابعہ، پھر جمیل صاحب اور سب سے آخر میں فردوس۔ سب کے قدموں سے اشتیاق عیاں ہو رہا تھا مگر فردوس کے قدم آہستہ آہستہ اٹھ رہے تھے، وہ شاید نہ جانا چاہتی تھی۔ اس کمرے سے اس کی کتنی ہی حسین اور اداس یادیں وابستہ تھیں اور اس غسل خانے سے اس کی شرمساری کی یاد وابستہ تھی۔ اس غسل خانے نے متین صاحب کو بے لباس دیکھا تھا، یہ غسل خانہ ان کی کئی ایسی عادتوں کا راز داں تھا جس سے کوئی آشنا نہ تھا اور ہوسکتا ہے ان چھپی عادتوں میں متین صاحب کے دل کی کلید ہو۔ اس نے اپنے آپ کو اپنے خیالات کی رو سے زبردستی علیحدہ کیا۔ باقی لوگ آگے نکل گئے تھے، کمرے میں داخل ہو چکے تھے۔ وہ بھی جلدی سے کمرے میں داخل ہوگئی۔ اس نے مشرقی کھڑکی پر نظر ڈالی اور اس کے دل سے ایک آہ نکلی۔ کھڑکی کے پاس پڑی ہوئی آرام کرسی پر اندھیرا تھا، اندھیرا کرسی میں آرام کر رہا تھا۔ اس رات بھی اس پر اندھیرا تھا مگر اس رات اس میں متین صاحب دراز تھے۔ دوسرے کمرے میں پلنگ تھا جس پر اس کی ماں نے اپنی زندگی کی آخری رات گزاری تھی۔ اس کا دل بیٹھ گیا اس نے پلنگ کی پٹی کا سہارا لیا اور پٹی پر بیٹھ گئی۔ پلنگ کے سرہانے کے دائیں ہاتھ دیوار کے ساتھ سنگار میز تھی، میز کے آگے گدی دار چوکی تھی۔ آئینہ کسی کا منتظر تھا یا کسی کا ماتم کر رہا تھا، وہ فیصلہ نہ کر سکی۔ اسی دیوار کے ساتھ بائیں دیوار میں غسل خانے کا دروازہ تھا۔ اس کو محسوس ہوا کہ وہ دروازہ کسی مردے کا کھلا ہوا منہ تھا۔ اس خیال سے اس کے پیٹ میں ایک مروڑ اٹھا اور اس نے اپنے ذہن میں زبردستی

ایک دوسرا خیال ٹھونس لیا! دروازہ کسی طلسم کا دروازہ تھا جو اس کو طلسم کشائی کی دعوت دے رہا تھا۔ وہ اس خیال پر طنزاً مسکرا دی۔ مگر اس کے دل کے کسی کونے سے صدا اٹھی کہ ہوسکتا ہے کہ یہ دروازہ کسی طلسم کا دروازہ ہی ہو۔ اس صدا سے اس کے سارے جسم میں طاقت سی بھر گئی اور وہ اس طاقت کے زور پر اٹھ کھڑی ہوئی اور دروازے کی طرف چل دی۔ غسل خانے میں داخل ہوتے ہی اس کے نتھنوں میں ایک عجیب سی مگر سہانی خوشبو داخل ہوگئی۔ غسلخانے کے بائیں ایک مرمریں ٹب تھا جو پانی سے لبالب بھرا تھا۔ اس کی دیواریں بھی مرمریں تھیں اس کے سامنے کی دیوار میں ایک ننھے سے چھجے پر نہانے کے صابن اور سینٹ، اسپنج رکھے تھے۔ اس دیوار اور دائیں ہاتھ کی دیوار کے جوڑ پر ایک تنگ سا زینہ سا نظر آتا تھا جس کے اوپر سے ایک دروازے کا سا پٹ دائیں دیوار پر اوندھا رکھا تھا جس کے درمیان میں ایک جوڑ تھا۔ دروازے کے دونوں کونے باہر کو نکلے ہوئے تھے اور اس کے ایک حصے پر پاس پاس دو کھونٹیاں تھیں۔ اس نے ان کھونٹیوں کو پکڑ کر دروزے کو اٹھایا اور زینے پر رکھ کر دیکھا۔ یوں اگر دروازے بند ہوں تو کسی کو گماں بھی نہ ہوسکتا کہ اس کے پیچھے زینہ ہے۔ اس نے دروازے کو اٹھالیا اور اس کو دائیں دیوار کے ساتھ لگا دیا اور خود اس تنگ سے زینہ پر گردن جھکا کر چڑھ گئی۔ زینے کی آخری سیڑھیاں چاندنی سے منور ہو رہی تھیں۔ وہ ان سیڑھیوں سے گزر کر کوٹھے پر چڑھ گئی۔ کوٹھا بہت ہی وسیع و عریض تھا۔ اس کا فرش سفید اور سیاہ پتھروں کی چوکور اور مستطیل چوکوں سے چُنا تھا۔ چاندنی میں سفید مربعوں اور سیاہ مستطیلوں کا آہنگ بہت ہی حسین اور پر معنیٰ معلوم ہو رہا تھا۔ سب لوگ مغربی منڈیر کے ساتھ لگے نیچے کا منظر دیکھنے میں محو دکھائی دیتے تھے۔ ہلکی ہلکی پچھلے پہر کی ہوا چل رہی تھی۔ اس نے ٹھنڈی ہوا سے سینے کو بھر لیا۔ بہت پیاری لگی اس کو یہ ٹھنڈک۔ اس نے ماتھے کو ہاتھ لگایا، رخساروں کو، گردن کو چھوا۔ ان سے آگ سی نکل رہی تھی۔ اس نے پاؤں سے جوتی اتار دی اور گرم جرابوں میں ملفوف پاؤں سفید و سیاہ فرش رکھ دیئے۔ فرش نے اس کی فالتو گرمی چوس لی اور اس کو قرار آ گیا۔ اس نے جوتے دوبارہ پہن لئے اور شمالی منڈیر کی طرف چل دی۔ دور دور تک چاندنی بچھی تھی۔ مشرقی شمالی اور مغربی نیلے پہاڑوں پر سفید برف سنہری ہو رہی تھی۔ اونچے پیڑوں پر رنگ رنگ کے پھول کھلے تھے۔ ہلکی ہلکی ہوا درختوں کی شاخوں کو چھیڑتی

ہوئی چلتی تھی۔ شمال اور مغرب سے بہتے ہوئے دریاؤں سے اٹھتا ہوا جھالا دل کو گدگداتا تھا۔ دور کھیتوں میں کھڑی فصلیں لہرا رہی تھیں۔ اس نے ذہن پر زور ڈال کر کوشش کی کہ اس مقام کو ڈھونڈے جہاں اس رات اس کا گھوڑا خاموش کھڑا کھڑا بندوق کی آواز سے بدک کر مغرب کی طرف بھاگ نکلا تھا اور پھر اس نے مغرب کی طرف اس مقام کو ڈھونڈ نکالا جہاں متین صاحب گھوڑے پر ساکت بیٹھے تھے۔ اس رات کی ایک ایک یاد، ایک ایک سنسنی، ایک ایک جذبہ عود کر آیا۔ اس کے خون کا ذرہ ذرہ ناچ اٹھا اور اس کے خون کی گردش تیز ہوگئی، اس کا رواں رواں بیدار ہوگیا، خبردار ہوگیا۔ وہ اپنے خون کی موسیقی کو واضح طور پر سن سکتی تھی۔ اس کی گردن اس کے بائیں شانے کی طرف جھک گئی۔ وہ اپنے دل کی سرگوشیوں کو سننے لگی۔ وہ نجانے کب تک اپنے خون کی موسیقی کو، دل کی سرگوشیوں کو سنتی رہی کہ اس کے کانوں میں یکایک کسی کے مدھم سروں میں الاپنے کی آواز آئی اور اس نے سر بائیں شانے سے اٹھایا اور غور سے مغربی منڈیر کی طرف دیکھا۔ عالمہ آنکھیں بند کئے ایک دیہاتی گیت گا رہی تھی۔ دوسرے اس کے گرد نیم دائرہ بنائے، اس کی طرف اشتیاق سے جھکے، سن رہے تھے۔ متین صاحب کی پشت اس کی طرف تھی۔ ان کے آسودہ شانوں سے اس کو خیال ہوا کہ وہ بھی گیت میں اتنے ڈوبے ہیں کہ اس کی موجودگی کو بھلا بیٹھے ہیں۔ اس خیال سے اس کے دل کو ذرا سا ٹھوکا لگا اور اس کی آنکھیں ڈبڈبا گئیں۔ اس نے کوشش کی وہ گیت کے بول، سر، لے میں امتیاز کر سکے مگر وہ اپنے جذبات میں اس حد تک گھری تھی کہ وہ صرف لے کا اندازہ کر سکی اور بس۔ عالمہ کی آواز میں موسیقی کی مشق تو نہ تھی مگر اس میں غضب کی مٹھاس اور لوچ تھا جو پہاڑی دیہاتی نغموں کا خاص وصف ہوتا ہے۔

اس لے سے اس کی یادداشت میں ایک اور نغمہ ابھر آیا......

......بہت رات گزر چکی تھی۔ دور دور تک خاموشی ہی خاموشی تھی۔ اس رات جانور اور پرند بھی خاموش تھے، شاید ملک کے نوجوانوں کی اکثریت موت کے گھاٹ اتر چکی تھی۔ گاؤں میں سوائے بوڑھے مردوں، بوڑھی عورتوں اور خود اس کے سوا کوئی نہ تھا۔ اس دن جنگ کے ختم ہونے کا اعلان ہوا تھا۔ برسوں کے تھکے ہوئے لوگ اس رات اطمینان سے سو

گئے تھے یا شاید برسوں کی در بدر پھرتی ہوئی نیند ان پر غالب آ گئی تھی۔ جانور اور پرند بھی بے خطر ہو کر سو گئے تھے۔ ہوا سو گئی تھی۔ رات تک سو گئی تھی۔ پچھلا پہر گزرے مدتیں گزر گئی تھیں مگر سویرا نہ ہو رہا تھا۔ شاید سورج بھی آج سو رہا تھا کیونکہ اس کو جگانے والی توپیں خاموش تھیں، سو گئی تھیں۔

پھر دور بن کی اُور سے کوئی منہ کے باجے پر ایک بہت ہی مدھم مگر واضح انداز میں، بہت ہی اداس لہجے میں، کہہ رہا تھا:

''برسوں کے بچھڑے دوست، ساتھی، محبوب، بیٹے، بیٹیاں، لوٹ آئیں گے۔ نہ جانے کس حالت میں۔ مگر جس حالت میں بھی ہوں لوٹ آئیں۔ ہمیں قبول ہیں۔''

نغمہ کبھی کبھی تو یکا یک تیز ہو جاتا جیسے کہ نغمہ گر جوش میں آ گیا ہو اور پھر یکا یک نغمہ مدھم، بالکل ہی مدھم ہو ہو جاتا، جیسے نغمہ گر اداس ہو گیا ہو۔ یہ نغمہ چند ہی لمحے ابھرتا، ڈوبتا رہا۔ مگر خاموش ہونے کے بہت دیر بعد تک یہ نغمہ فضا میں منڈلاتا رہا، پناہ ڈھونڈتا رہا۔ مگر جب اس کو کہیں پناہ نہ ملی تو وہ روٹھ کر نہ جانے کہاں چلا گیا۔

وہ جب چونکی تو وہ نغمے کو پکارنے لگی، پکارتی رہی کہ لوٹ آؤ، لوٹ آؤ، میں جاگتی ہوں، میرے دل میں تمہارے لیے جا ہے مگر نغمہ رخصت ہو چکا تھا۔ کھڑکیوں کے پردوں کے اوپر کے حصے روشن ہونے لگے تھے، سورج جاگ اٹھا تھا اور اپنی غیر ذمہ دار نیند پر پریشان تیزی سے اپنا سفر طے کرتا چلا آ رہا تھا۔ اس کی آنکھوں کے پپوٹے بوجھل ہو گئے اور وہ کمبلوں کے اندر کھسکتی چلی گئی اور بالآخر سو گئی......

عالمہ کا گیت ختم ہو چکا تھا۔ اس کی آنکھیں کھلی تھیں، جگمگا رہی تھیں، اس کے ہونٹوں کے درمیان ننھا سا خلا تھا جو اس دم اس کو بہت ہی بھلا لگا۔ متین صاحب کی اب بھی اس کی طرف پشت تھی مگر ان کے شانوں میں خفیف سا تناؤ تھا جس کو دیکھ کر اس کے دل میں خوشی کی ایک لہر دوڑ گئی۔ وہ اس کی موجودگی کا احساس رکھتے تھے مگر اس سے خاموشی کے طلبگار تھے۔

اس کو خیال آیا کہ اب اچھا موقع ہے کہ وہ عالمہ کو داد دیتے ہوئے دوسروں میں شامل

ہو جائے۔

''بھئی عالمہ، تمہارا گیت تو جادو سے کم نہ تھا۔ تمہاری آواز میں ایک سادگی ہے، گہرائی ہے، لوچ ہے، مٹھاس ہے۔ غضب ہے، غضب...... کیا یہ ممکن نہیں کہ تم ہمیں، مجھے، ایک اور گیت سے نوازو۔''

''ضرور، ضرور'' دوسروں نے اس کی تائید کی۔

اس نے پھر آنکھیں بند کر لیں اور مدھم مدھم، دھیمے دھیمے سروں میں ایک لے کو اٹھایا اور اس کو ایک ہی پنچم پر قائم رکھتے ہوئے خفیف خفیف سے زیر و بم سے الاپتی چلی گئی۔ اس نے محسوس کیا کہ جیسے دنیا میں سب سے پہلا گیت جنم لے رہا ہے جس سے نہ صرف گانے والے میں بلکہ فضائے فطرت میں ایک وصفی تبدیلی آ رہی ہے اور وہ تبدیلی فضائے فطرت کی ابدی سرشت کا لازمی حصہ بننے والی ہے۔ اس نے اپنے آپ میں بھی ایک تبدیلی کو آتے ہوئے محسوس کیا۔ اس کی آرزوؤں میں سے بیم ورجا آہستہ آہستہ رخصت ہونے لگے، الوداع کہتے کہتے رخصت ہو گئے۔ اس کی آرزوئیں خود اپنی ذات میں مقصد بنتی چلی گئیں۔

نغمہ ختم ہوا تو وہ اپنے آپ سے، اپنے ماضی سے، اپنے حال سے، اپنے مستقبل سے رضامند ہو گئی تھی، وہ توقعات سے، ناامیدیوں سے بے نیاز ہو چکی تھی۔ اس نے دوسروں پر ایک سرسری سی نظر ڈالی۔ وہ اس کو نئے جہاں نظر آئے۔ اس نے اس سے اندازہ کیا کہ شاید اس نے نئی نظر پا لی تھی جس میں کئی تازہ جہاں کروٹیں لے لے کر جوان ہو رہے تھے۔ اس کا سینہ ایک انجانے، ایک ہر دم پھیلتے، جذبے سے بھر گیا۔ اس کے دل میں اپنے مہمانوں کے لیے بے پناہ محبت موجزن تھی۔ اس کا جی چاہ رہا تھا کہ دنیا کی ہر نعمت ان کو بخش دے، ہر خوشی ان کو بطورِ حق عطا کر دے۔ اس نے محسوس کیا کہ وہ خوش بختی کی، مقدر کی دیوی ہے، وہ اس لمحے جو کچھ ان کے لیے مقدر کر دیگی وہ ان کے لیے وقف ہو جائے گا۔ اس نے مقدر کے خزانے لٹا دیئے۔ اس کے تن بدن میں مسرت و انبساط خون کے ساتھ ساتھ دوڑ رہے تھے۔ اس کے گلے میں کروڑوں قہقہے تڑپ رہے تھے۔ اس نے محسوس کیا کہ اگر وہ منڈیر پر ہاتھ

رکھ دے تو وہ جاندار بن جائے گی۔ وہ اپنی اس قوت سے ڈری اور اس نے کوشش کی کہ وہ منڈیر پر ہاتھ نہ رکھے تا کہ منڈیر منڈیر ہی رہے وہ نہ چاہتی تھی کہ اس کی قوت کا دوسروں کو پتہ چلے۔ وہ دوسروں سے آنکھیں چرائے اپنی نئی قوت کو سدھانے میں لگی رہی۔

جب رابعہ نے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھا تو اس نے اپنی چونکاہٹ کو چھپاتے ہوئے، اپنی شخصیت کے پورے ارادے سے نظریں اٹھا کر اس کی طرف دیکھا۔ اس نے دیکھا کہ رابعہ بھی ایک دیوی تھی۔ اس نے عالمہ کی طرف دیکھا تو اس نے محسوس کیا کہ وہ حلم کی دیوی بن چکی ہے اور متین صاحب اور جمیل صاحب اس کو دیوتا ہی نظر آئے۔ اس نے فیصلہ کرنا چاہا کہ وہ دونوں کس وصف کے دیوتا تھے مگر پیشتر اس کے کہ وہ فیصلہ کر پاتی اس کی نظریں تقی کی طرف کھنچ گئیں۔ رعنائی اور وقار اور ایک پراسرار الم اس کی شخصیت کی گہرائیوں سے ابھرتے ہوئے نظر آئے۔ یورپ جانے سے پہلے وہ اس کی رعنائی سے تو آشنا تھی۔ اس کی رعنائی اور استغنا کالج کی لڑکیوں کا عام موضوعِ سخن تھا مگر یہ وقار، یہ الم جس میں تحمل اور تسلیم بھی صاف صاف جھلکتے تھے اس کے لیے بالکل نئے تھے۔ اس نے کبھی سوچا بھی نہ تھا کہ یہ اوصاف اس کی رعنائی کے ساتھ ہاتھ میں ہاتھ دیئے یوں محوِخرام ہو سکتے ہیں۔ یہ وقار، یہ الم، یہ تحمل اور یہ تسلیم تقی سے کیا چاہتے تھے، وہ تو رعنا اور مستغنی ہی بھلا لگتا تھا۔ یہ دونوں کیا کم ستمگر تھے۔ اب ان نئے اوصاف کا ایزاد صنفِ نازک پر کیا کیا ستم نہ ڈھائے گا۔ اس کے دل میں یکا یک بہت سا خون جمع ہو گیا۔ وہ بھرے خون کو اپنے نتھنوں میں محسوس کر سکتی تھی۔ شاید اس کا دل ہی خون ہو گیا تھا۔ یا شاید وہ ان تمام عورتوں کے دلوں کے خون کی بو سونگھ رہی تھی جو تقی کے نئے روپ کی شہیدِ ستم ہوں گی۔ وہ دل ہی دل میں اس احساس پر مسکرا دی کہ اس نے تقی جیسے نرم دل، ہمدرد اور نیک انسان کو کتنا ڈراؤنا وحشی درندہ بنا دیا ہے۔ اس نے ایک بار پھر تقی کو غور سے دیکھا۔ اس کی پہلی نظر نے دھوکا نہ کھایا تھا۔ اس کے کندھے کسی بوجھ سے جھکے ہوئے دکھائی دے رہے تھے۔ کیسا بوجھ تھا اس کے کندھوں پر؟ اس نے سوچا مگر فیصلہ نہ کر سکی۔ دوستوں کے غموں کا بوجھ، دھرتی اور دھرتی کے باسیوں کے دکھوں کا بوجھ؟ اس نے مزید سوچنے سے انکار کر دیا اور مغربی منڈیر پر جھک گئی۔ دونوں

دریاؤں کے وصل کا منظر کتنا عجیب تھا۔ ایک سفید دریا اور ایک بھورا دریا اور دونوں مل کر ایک نئے رنگ میں بہہ رہے تھے۔ ان کے سنگم پر سفید بھورا بھورا سا جھاگ چاندنی میں، وہ فیصلہ نہ کر سکی کہ اس بھورے رنگ میں چاندنی کا اثر کتنا تھا۔

اس نے نظروں کو ان پتھروں کی طرف پھیرا جہاں تمام دوپہر، سہ پہر اور شام تک متین صاحب اور جمیل صاحب نہ جانے کیا کیا باتیں کرتے رہے تھے۔ ان کے دل کی باتوں سے تو یہ پتھر، یہ دریا، دریاؤں کا جھالا اور شاید ڈوبے ہوئے سورج کی کرنیں ہی واقف تھیں۔

یہ چاندنی میں پھیلتے ہوئے مناظر ایک انسان کے ماضی، حال اور مستقبل کی طرح تہہ در تہہ، افق تا افق، ابھرتے ڈوبتے چلے گئے تھے۔

اس کے ذہن میں ایک خیال نے کروٹ لی۔ کاش وہ اپنے ماضی، حال اور مستقبل کو یونہی تہہ در تہہ، افق تا افق مربوط دیکھ سکتی۔ اس کے تخیل نے اس کو سمجھایا کہ یہ منزل ناممکن تو نہ تھی مگر بہت دور تھی جس کے لیے کوشش کے کئی جوکھم ابھی درپیش ہوں گے، جن کا تصور کرنا فی الحال مناسب نہ تھا۔ ہر مقام سے ایک خاص افق تک ہی نظر دیکھ سکتی ہے اور اس سے پرے دیکھنے کی آرزو ایک دوسرے ہی مقام سے، اگلی منزل پر پہنچ کر ہی، پوری ہو سکتی تھی اور اسی ایک مقام سے ہر افق تک دیکھ لینے کی آرزو عذاب کو آواز دینے کے مترادف ہے۔ اس عذاب کے تصور سے اس کی ریڑھ کی ہڈی کی جڑوں میں ایک شدید ٹھنڈک نے جنم لیا اور اس کی رانوں اور اس کے کولہوں اور پیڑو کے درمیانی حصے میں برفیلے پن کا شدید احساس جاگ اٹھا۔ اس احساس سے اس کو بہت کڑی اذیت ہونے لگی، اس کے جسم کا ذرہ ذرہ کٹ کٹ کر جھڑنے لگا۔ وہ پریشان ہونے لگی، اس کی شخصیت بکھرنے لگی، اس کے حواس، اس کے جذبات، الگ الگ، تنگ تنگ، دائروں میں مسدود اور محبوس ہو کر فرار کی راہ تلاش کرنے کے لیے چکر لگانے لگے۔ اس کو نہایت تنگ جگہ میں محبوس ہونے کا، بند ہو جانے کا، احساس ہونے لگا جس سے اس کے سارے جسم میں ایک ناقابلِ برداشت بغاوت کا جذبہ پھوٹ نکلنے کے لیے راہ ڈھونڈنے لگا۔ اس سے اس پر اتھاہ خوف یلغار کرنے لگا۔ وہ ان

مختلف قسم کے مگر ہم آہنگ احساسات، جذبات سے زچ ہونے لگی۔ اس نے انتہائی مایوسی کے عالم میں دعا کی کہ اس کی رانوں، کولہوں اور پیڑو کے درمیانی حصے میں آگ، چاہے دوزخ ہی کی آگ، روشن ہو جائے تاکہ وہ اس انتہائی سرد نقطے کی گرفت سے باہر نکل سکے مگر اس حصے میں سردی بڑھتی ہی چلی گئی۔ اس نے زچ ہو کر اپنے آپ کو اس سردی کے سپرد کر دیا اور اپنے آپ سے کھو گئی۔

اس سرد مقام پر گرمی کا ایک نقطہ پھیلنے لگا۔ سردی کے بیچوں بیچ گرمی کا احساس اس کے لیے شدید عذاب کی صورت اختیار کرتا چلا گیا۔ دھیرے دھیرے گرمی کا نقطہ سردی کے جہاں کو اپنی گرفت میں لیتا چلا گیا۔ گرمی اس کی رانوں میں، رانوں کے بالوں میں، پیڑو میں، کولہوں اور ان کے درمیانی حصے میں محیط ہو گئی۔ اس کے اندر زندگی کے شعور کا دوبارہ جنم ہوا۔ اس کے سارے بدن میں گرمی رقص کر رہی تھی۔ اس نے نظر کو باہر دیکھنے کا حکم دیا مگر نظر نے اطاعت سے معذرت پیش کر دی۔ وہ جھنجھلا اٹھی۔ اس کی نظر نے آنکھ سے باہر قدم رکھ ہی دیا۔ اس کو کوئی نظر نہ آیا وہ حیران ہوئی، چونک اٹھی، دوسرے لوگ زینے کی طرف جا رہے تھے۔ اس نے ان کا تعاقب کرنے کی کوشش کی، اس نے قدم اٹھایا مگر اس کے جسم نے اس کے قدم کا ساتھ نہ دیا۔ اس کی کمر میں زنجیر تھی۔ اس میں اپنے جسم کا شور جاگ اٹھا۔ اس کے کولہوں پر کسی کے ہاتھوں کی مضبوط گرفت تھی۔ اس نے سوچا کہ شاید متین صاحب کے ہاتھوں کی گرفت ہے۔ اس خیال سے اس کا رواں رواں بیدار ہو گیا اور اس کا دل بلیوں اچھل گیا۔ اس نے اپنے آپ کو اس گرفت کے سپرد کر دیا اور اپنے جسم کو اس دوسرے جسم کا سہارا دیا۔ اس جسم کی گرمی اس کے جسم کو اجنبی معلوم ہوئی۔ یہ گرمی متین صاحب کے جسم کی گرمی سے الگ تھی۔ اس کو معاً خیال آیا کہ متین صاحب تو زینے کے قریب، دوسروں کے آگے آگے تھے۔ یہ کون تھا؟ وہ اپنے پوری قوت سے اس گرفت کے اندر اس جسم کی طرف منہ کرنے کے لیے مڑی۔ ان ہاتھوں کی گرمی اس کے کولہوں اور اس کے سرین کے بالائی کونوں میں اس طرح سے دوڑی کہ اس کے حظ میں اس کا شعور لڑکھڑا گیا۔ اس نے آنکھ کھولی تو تقی کا چہرہ اس کے چہرے کو بہت غور سے دیکھ رہا تھا۔ اس کے چہرے پہ رعنائی تھی،

استغنا تھا، حلم تھا، الم تھا، تسلیم تھی۔ اس کی آنکھوں کی روشنی میں قرار کی کیفیت تھی۔

''اس پتلی سی کمر پر تمہارے خیالات سے، تخیلات سے بھرپور سر کا، جذبات کے سمندر سے بھرپور سینے کا بوجھ کیا کم ہے کہ اب تم اس پر ناممکن آرزوؤں کا بوجھ لادنا چاہتی ہو۔ جوکھم کے سفر میں ایک منزل ایسی بھی آتی ہے جب ہر بوجھ سے آزاد ہو جانے میں سلامتی کی، چین کی، منزل کی راہ ہوتی ہے۔ کچھ دنوں کے لیے اپنے آپ کو ماضی کی یادوں، حال کے حظوں اور مستقبل کی امیدوں سے آزاد کرلو، ان کو بھول جاؤ۔ اسی میں سلامتی کی راہ ہے۔''

اس کے گہرے حلم سے ادا کئے ہوئے الفاظ اس کے تنے ہوئے حواس پر ایسے لگے جیسے سردی میں ٹھٹھرے ہوئے جسم پر دوپہر کے سورج کی کرنوں سے تپے ہوئے ریتلے کناروں سے ہو کر آتی ہوئی سمندر کی لہریں۔ اس کے جسم کے ذرے ذرے میں گدگدی ہوئی اور اس گدگدی کا حظ بہت ہی انوکھا اور دلگداز تھا۔

تقی نے اس کے کولہوں سے ہاتھ اٹھا لئے اور اس کی گردن کے گرد اپنا دایاں اور بایاں بازو حمائل کر کے، اس کے بائیں شانے پر اپنا ہاتھ رکھ کے اس کو اپنی طرف نہایت آہستہ سے کھینچتے ہوئے اس سے کہا: آؤ چلیں۔ آرام اور نیند ہماری راہ دیکھتے ہیں۔ راہ دیکھتے دیکھتے تھک نہ جائیں، اداس نہ ہو جائیں، روٹھ نہ جائیں۔''

اس کے پیڑو، کولہوں اور سرین کے درمیانی حصے میں ایک گرمی کی لہر اٹھی اور اس کے قدموں کی طرف روانہ ہوگئی۔ وہ تقی کے جسم کے سہارے اس کے قدموں کے ساتھ ساتھ قدم اٹھاتی ہوئی زینے کی طرف چل دی۔ زینے کے قریب پہنچ کر تقی نے اس کے شانے سے ہاتھ اٹھا لیا، اس کی گردن سے بازو کو الگ کر لیا اور زینے کی پہلی سیڑھی پر قدم رکھتے ہوئے کہنے لگا: ''یہ زینہ ایک وقت میں ایک ہی کو گزرنے کی اجازت دیتا ہے۔ تم کو میرے بعد ہی آنا ہوگا۔''

تقی نے زینے سے اترتے ہوئے اس کو مڑ کر دیکھا۔ وہ زینے کی آخری سیڑھی سے ذرا ہٹ کر اپنے آپ میں ڈوبی کھڑی تھی۔ اس کو دیکھ بولی:

''تم چلو...... میں اپنے آپ کو اکٹھا کرلوں۔ میں اس کے لیے تنہائی چاہوں گی۔''

تقی سیڑھیوں سے اترتا ہوا اس کی نظروں سے اوجھل ہوگیا۔ وہ اس کے قدموں کی آواز کو سنتی رہی۔ اس کے قدموں کی آواز فاصلوں میں کھوگئی۔ ہر طرف خاموشی چھا گئی۔ اس نے اپنے آپ پر تصرف پالیا۔ مگر اس کے پاؤں زینے کی طرف پھر بھی نہ بڑھ سکے۔ اس کا ارادہ، اس کا شعور، نہ جانے کن گہرائیوں میں ڈوب گئے تھے۔ چاندنی، سفید اور سیاہ مربعے اور مستطیلیں اس کی نگاہ میں تھیں، چاندنی کی دمک اس کی آنکھوں کو گدگدا رہی تھی، ہوا کی سرسراہٹ اس کے کانوں میں آرہی تھی، خنکی اس کے ننگے ہاتھوں اور چہرے پر ہلکی ہلکی نیش زنی کررہی تھی۔ مگر اس محسوس کرنے والی خودی سے وہ اپنے آپ کو بے نیاز پا رہی تھی؛ اس 'خودی' اور اس کی 'میں' میں قطعاً کوئی تطابق نہ تھا، اسے کبھی کبھی خیال آتا کہ یہ محسوس کرنے والی خودی اس کی ذات سے الگ ہے۔ یا خود اس کی ذات اس خودی کی دسترس سے ماورا ہے، یہ خودی اس کی ذات کو اپنی طرف متوجہ کرنے کے لیے بے تاب تھی، فریاد کررہی تھی مگر اس کی ذات اس خودی سے قرنوں، ابدوں دور تھی۔ اس خودی میں اس بات کا بھی شعور تھا کہ متین صاحب اگر نیچے کمرے میں ہوئے تو کیا ہوگا؟ تقی کہاں ہوگا؟ کیا سوچتا ہوگا؟ رابعہ اور جمیل صاحب اس کے متعلق سوچ رہے ہوں گے؟...... اور وہ پراسرار عالمہ شاید اس کے راز سے آشنا ہوچکی تھی؟ اور کیا اس کی موجودہ حالت اس کے پراسرار دل میں ہمدردی کے جذبات کو موجزن کررہی تھی؟ یا وہ اس کی حالت سے بے نیاز تھی؟

ان خیالات کا سلسلہ اس کے تنہائی کے خلا کو پر نہ کرسکا جو اسکی خودی اور اس کی ذات کے درمیان تھا۔ اس خلا کے تصور سے اس کی خودی خوف کھانے لگی، تھرانے لگی۔ اس خودی اور ذات کی تفریق اور بُعد سے پیدا ہونے والے خلا، بلکہ قعر، کی کشش سے اس کی خودی کے اجزا آپس میں بکھرنے لگے۔ وہ چاندنی، وہ مربعے، وہ مستطیلیں، ہوا کی سرسراہٹ، فضا کی خنکی، سب اس کی خودی کی گرفت سے آزاد ہوگئے یا اس کی خودی ان کے اثر سے آزاد ہوگئی۔ کچھ نہ رہا۔ اس کی خودی ایک اتھاہ قعر میں گر گئی، قعر کی تاریکیوں میں جذب ہوگئی۔

ایک بے آفاق اندھیرا ہر طرف چھا گیا۔ وہ ایک اندھیرا بن گئی جو زمین و آسمان پر محیط تھا۔ اندھیرا سکون تھا، امن تھا؛ اندھیرا زندہ تھا؛ اندھیرا ایک ایسی زندگی تھا جس میں ذات، شعور، خودی کی تفریق نہ تھی۔ اندھیرا ازل اور ابد تھا۔ اندھیرا عدم نہ تھا، اندھیرا تخلیق کا محافظ اور منبع تھا۔ تخلیق اس کی ذات سے الگ نہ تھی اور اس کی ذات کی جڑیں اندھیرے کے قلب میں پیوست تھیں اور اس کے قلب کی دھڑکن کا آہنگ اس کی ذات سے جدا نہ تھا۔ اندھیرے کے قلب کی دھڑکن کا آہنگ اور اس کی ذات ایک تھے۔ اس کی ذات کی جڑیں اندھیرے میں پیوست تھیں اور اس کی شاخیں حواس کے جہاں میں اپنا تنفس بکھیرتی تھیں۔ تنفس کا بکھرنا شعور کی تخلیق تھا اور شعور نور تھا، حواس کے جہاں میں روشنی تھا۔ اندھیرا اور روشنی ایک دوسرے کے نقیض نہ تھے، ایک دوسرے کے زوج تھے، ایک دسرے کو نصیب کرتے تھے، ایک دوسرے کی زندگی کے ضامن اور امین تھے۔

اندھیرے اور نور کے نکاح سے اس کی ذات کی ازسرِ نو تخلیق ہوئی اور اس ذات نے اس کے شعور کو، اس کی خودی کو تخلیق کیا اور اس کی خودی اور اس کا شعور ایک خلقِ جدید تھے جس کے ماضی، حال اور مستقبل میں ایک تسلسل، ایک ربط تھا، ایسا تسلسل اور ایسا ربط جو سمندر کی لہروں میں ہوتا ہے۔

حواس کا جہاں اس پر نئے سرے سے وا ہوا۔ چودھویں کا چاند مغربی منڈیر پر کھڑا اس کو حیرت سے تکتا تھا۔ اس نے چاند کو دیکھا۔ چاند مسکرا دیا۔ اس کا دل، اس کا ذہن، اس کا تخیل کھل اٹھے۔ ان کی خوشبو الگ الگ تھی۔ مگر ان میں ایک ربط تھا، ان میں ایک وحدت تھی، کثرت نما؛ اور وہ خوشبوئیں اس کی ذات کو مسحور کرنے لگیں، اس کو وجد میں لانے لگیں۔ وجدی کیفیت حرکت کی طلب گار ہوئی۔ اس کا انگ انگ ابھینایوں میں ڈھل گیا۔ اس کے پاؤں مربعوں اور مستطیلوں کو قطع کرتے ہوئے ان کو نئی نئی شکلوں میں ڈھالتے چلے گئے۔ اس کی بانہوں نے، اس کے ہاتھوں نے، اس کی کمر کی لچک نے اس کے پاؤں کا ساتھ دیا۔ ایک رقص نے جنم لیا جو نغمے کے لیے بے تاب تھا۔ رقص کونپل سے کلی، کلی سے پھول بنا، پھول کی خوشبو نے فضا میں ہجرت کی اور نغمے کی تلاش میں پھرنے لگی۔ رقص جواں ہوا،

زوج کا متلاشی ہوا۔مگر نغمہ کہیں نہ تھا،صرف ہوا کی سرسراہٹ تھی جو نغمے کو جنم دینے سے قاصر تھی، عاجز تھی۔

چاند رقص کے وجد سے حواس کھو بیٹھا اور منڈیر پر لڑکھڑانے لگا،اس کے قدم اکھڑ گئے اور منڈیر سے نیچے گرنے لگا مگر وہ منڈیر سے چمٹے رہنے کے لئے کوشاں تھا۔ چاند کو رقص کے نظارے سے محروم ہونا گوارا نہ تھا۔مگر لڑکھڑاتے ہوئے قدم اور کانپتے ہوئے ہاتھ اس کو منڈیر سے منسلک نہ رکھ سکے اور چاند منڈیر سے گر گیا اور فضا میں ڈوبنے لگا۔

رقص کرتے کرتے وہ جنوبی منڈیر تک پہنچ گئی۔اس نے دور افق کو دیکھا، نیچے جھانکا۔ چاندنی میں ہر شے اپنے اپنے مقام پر، اپنی حیثیت کو ہر دوسری شے سے الگ کئے، قائم تھی۔ ہر شے چاندنی کے سمندر میں ایک جزیرہ بنی تھی۔

دور گھوڑوں کے فارم کے وسیع سبزہ زار میں چاندنی سبزے کا وصف بنی سو رہی تھی۔ یکا یک سبزے کے مشرقی کونے کی پستہ قد عمارت میں سے ایک سفید گھوڑا اور گھوڑے کی اوٹ میں آدھا چھپا ہوا ایک آدمی اس کو ایال سے پکڑے سبزہ زار پر نکل آئے۔ سبزہ زار کے وسط میں پہنچ کر آدمی زمین پر بیٹھ گیا اور اس نے بغل سے سپاٹ سینہ ایک نیم مدورسی شے نکالی اور اس کو فرش پر رکھ دیا اور آہستہ آہستہ اس کے سپاٹ سینے پر ہاتھ مارنے لگا۔ گھوڑے نے کبھی اگلا دایاں، کبھی بایاں، کبھی پچھلا دایاں اور کبھی پچھلا بایاں پاؤں اٹھا اٹھا کر تھاپ کا ساتھ دیا۔تھاپ تیز ہوتی گئی اور گھوڑے کے پاؤں کے اٹھنے اور زمین پر آنے کی رفتار بھی تیز ہوتی گئی۔ فضا میں اس ننھے طبل اور گھوڑے کے پاؤں میں پڑے ہوئے گھونگھروؤں کی آواز کبھی دور سے کبھی بہت ہی قریب سے آتی ہوئی سنائی دینے لگی۔ وہ اپنے رقص کو بھلا بیٹھی اور سفید گھوڑے کے رقص کو دیکھنے لگی۔ تیز ہوتی ہوئی تھاپ آہستہ آہستہ دھیمی پڑنے لگی، آدمی کے ہاتھ بہت دھیرے دھیرے فضا میں بلند ہوتے اور طبل پر آ گرتے اور اس کی لے پر گھوڑے نے دونوں اگلے پاؤں اٹھا کر رقص کرنا شروع کیا۔اس کے اگلے پاؤں فضا میں جھولنے اور پچھلے پاؤں آہستہ آہستہ زمین پر تھرکنے لگے۔ گھونگھروؤں کی جھنجھناہٹ اور طبل کی تھاپ سے ایک عجیب آہنگ وجود میں آیا جو نغمہ تو نہ تھا

مگر نغمے کا زوج ضرور تھا۔ وہ ابھی اس عجیب وغریب آہنگ کی لے میں کھوئی تھی کہ آدمی نے طبل کو الگ رکھ کے کھڑے ہو کر کمر کو زمین کی طرف جھکاتے ہوئے، ہاتھوں کو ڈھیلا چھوڑ کر جھولاتے ہوئے ناچنا شروع کر دیا۔ اس کے پاؤں اور اس کے ہاتھوں میں شاید گھونگھرو بندھے تھے کہ فضا پر ایک جھنکار تیرتی ہوئی اس کے کانوں میں آنے لگی۔ گھوڑے نے بھی اپنے رقص کی لے بدل لی اور آدمی کے ساتھ ہم آہنگ ہو کر، کبھی اگلا دایاں، کبھی بایاں، کبھی پچھلا دایاں اور کبھی پچھلا بایاں پاؤں اٹھا کر، کبھی دونوں اگلے پاؤں اٹھا کر رقص کرنے لگا۔ حیوان اور انسان کا یہ انوکھا، انوٹھا رقص اس کے دل کو لبھا لے گیا۔ وہ رقص کو قریب سے دیکھنے کے لیے بے تاب ہو گئی۔ وہ بامِ بلند کی جنوبی منڈیر سے زینے کی طرف لپکی، اتر گئی، گلی میں اک تنہا، اداس، بجلی کا قمقمہ روشن تھا، گلی کے دونوں طرف کمروں میں اندھیرا تھا۔ سانس روکے اس نے سننے کی کوشش کی۔ ہر طرف خاموشی سو رہی تھی۔ وہ دبے دبے مگر تیزی سے قدم اٹھاتے ہوئے جنوبی صحن میں نکل آئی۔ صحن کی مغربی اور جنوبی منڈیریں چاندنی میں دمکتے ہوئے سو رہی تھیں۔ اس کے قدموں کی چاپ سے، اس نے محسوس کیا کہ، منڈیریں جاگ اٹھی ہیں۔ مگر وہ چاندنی کے نزول سے پیدا ہونے والی دمک تھی جو اب صحن کی منڈیروں کی دیواروں پر بھی اترنے لگی تھی۔ وہ لمحے بھر کے لیے رکی اور منڈیروں کی بیداری کی ماہیت کو جان لینے کے بعد تیز تیز قدم اٹھاتے ہوئے گھوڑوں کے فارم کے سبزہ زار کی طرف بھاگنے لگی۔

فارم کے جنگلے کے قریب پہنچ کر وہ آہستہ ہو گئی بلکہ دبے پاؤں چلنے لگی۔ حیوان اور انسان کا رقص جاری تھا۔ اس نے آدمی کو پہچاننے کی کوشش کی مگر اس کے حافظے نے اس کا ساتھ نہ دیا اور وہ پہچان نہ سکی۔ گھوڑے کو اس نے پہچان لیا۔ اس کا نام نور تھا کہ روشنی کی طرح تیز رفتار تھا اور سفید براق تو تھا ہی۔ وہ رقص کو دیکھنے میں محو ہو گئی۔ گھوڑے کے بدن پر اور آدمی کے ماتھے پر پسینے کے قطرے چمک رہے تھے۔ رقص کی لے آہستہ آہستہ، دھیمی ہوتی چلی گئی، رقص ختم ہو گیا۔ آدمی اور گھوڑا جب رکے تو ان دونوں کے منہ اس کی طرف تھے۔ دنوں نے اس کو پہچان لیا۔ گھوڑے نے دم اٹھا اٹھا کر، لہرا لہرا کر اس کا استقبال کیا اور

آدمی کے چہرے پر حیرانی تھی اور پھر اس حیرانی میں آہستہ آہستہ خوف بھی شامل ہوتا چلا گیا۔ وہ دونوں کی حالت کو دیکھ کر ان کی طرف بڑھی۔ جب وہ ان کے بالکل قریب پہنچی تو اس نے اس آدمی کو پہچان لیا۔ وہ فارم کے رکھوالے کا بڑا بھائی دلاور خان تھا جو ان کا ملازم تو نہ تھا مگر کئی برسوں سے شہر چھوڑ اپنے بھائی کے پاس اٹھ آیا تھا۔ اس نے ایک بار پہلے اس کو دیکھا تھا جب وہ یورپ سے لوٹنے کے بعد پہلی بار فارم پر آئی تھی۔ دونوں بھائی گھوڑوں کے درمیان کھڑے آپس میں باتیں کر رہے تھے۔ اس کے بھائی نے اس کا تعارف کراتے ہوئے بتایا تھا کہ وہ قریبی شہر کے رئیسِ اعظم صداقت علی کا میر اصطبل تھا اور اس کی اچانک موت کے بعد اس کے نئی روشنی کے دلدادہ لڑکوں کی عدم دلچسپی سے تنگ آ کر اس کے پاس چلا آیا تھا۔

دلاور خان نے فردوس کو قریب آتے دیکھ کر اس کو جھک کر سلام کیا اور معذرت کرتے ہوئے بولا:

''نور کو میں نے چوری چوری سدھایا ہے۔ میرے بھائی کو اس کا کوئی علم نہیں ہے، اس کو نیند بہت پیاری ہے۔ جب وہ سو جاتا ہے تو میں نور کو لے کر سبزے پر نکل آتا ہوں......''

جب میں نے پہلے پہل نور کو دیکھا تو اس کے بدن کی کساوٹ، اس کی چال کی تمکنت سے میں اندازہ کر لیا کہ اس کو رقص سکھانا کچھ مشکل نہ ہوگا۔ اس کی چال میں اک بے نیازی اور مستی ہے، جس کو آپ نے بھی یقیناً محسوس کر لیا ہوگا...... جب میں پہلے پہل اس کو ایک رات یہاں لایا اور میں نے اپنے ننھے سے طبل پر تھاپ دی تو یہ، یقین کریں، جھومنے لگا اور پاؤں اٹھا اٹھا کر، اکڑ اکڑ کر میرے گرد ا گرد ناچنے لگا۔ کئی راتیں میں اسی طرح اس کو طبل کی تھاپ سے آشنا کراتا رہا۔ پھر ایک دن میں اپنے پاؤں میں گھونگھرو باندھ کر اس کے گرد ناچنے لگا۔ کئی راتیں تو یہ مجھے حیرانی سے دیکھتا رہا اور میرا ساتھ بالکل نہ دیا۔ مگر میں نے ہمت نہ ہاری اور طبل اور گھونگھروؤں کی لے سے اس کو آشنا کراتا رہا۔ ایک رات ایسی ہی چاندنی تھی۔ چاند مغرب میں ڈوب رہا تھا۔ اس کی کرنیں ترچھی پڑ رہی

تھیں۔اس میدان میں ان اونچے درختوں کے باعث کہیں کہیں لمبے لمبے سایے تھے۔ میں نے طبل کو چھوڑ کر پاؤں اور ہاتھوں میں گھونگھرو باندھ کر ناچنا شروع کیا اور چاندنی میں سایے کی حرکت کو دیکھ کر پہلے تو یہ ڈرا، دونوں اگلے پاؤں اٹھا اٹھا کر مجھے ڈرانے لگا مگر میں ڈرے بغیر ناچتا رہا، ناچتا رہا۔ کچھ دیر تو یہ مجھے چپکا کھڑا دیکھتا رہا۔ پھر یہ میرے گرداگرد گھومنے لگا۔ میں نے اس کو تھپکایا اور اپنی بانہوں سے گھونگھرو کھول کر اس کے اگلے پاؤں میں باندھ دیئے اور پھر ناچنے لگا۔ جب یہ میرے گرداگرد گھومنے لگا تو اپنے پاؤں کے گھونگھروؤں کی آواز سے ڈرا۔ میں نے اس کو پھر تھپکا، سہلایا اور اس کے ایک ایک پاؤں کو اٹھا اٹھا کر زمین پر ایک مختصر سی لے کے انداز میں رکھا اور رکھتا چلا گیا تو اس کا خوف کم ہوتا چلا گیا۔ پھر میں نے اس کے چاروں پاؤں میں گھونگھرو باندھ دئے، اس پر سوار ہو گیا، اس کو دلکی چلاتے ہوئے اس کو گھونگھروؤں کی آواز سے آشنا کرایا تا کہ یہ صرف ناچنے والا گھوڑا ہو کر نہ رہ جائے۔ (ایسا کرنا مالک کی امانت میں خیانت ہوتی۔) کئی مہینے کی چوری چھپے کی محنت کے بعد یہ رقص پر راضی ہوا۔ اور اب جب رات چاندنی ہوتی ہے اور اکیلے جاگتے جاگتے جی گھبرانے لگتا ہے تو اس کو تھان سے کھول کر لے آتا ہوں اور یہ اور میں ناچتے ہیں۔ میں نے دیکھا ہے اور محسوس کیا ہے (میری آنکھیں اور میرے حواس دھوکا نہیں کھا سکتے) کہ نورکو بھی اس رقص سے خوشی ہوتی ہے اور میرا احسان مند ہوتا ہے......

آج آپ نے بھی میری محنت کو پسند کیا۔ مجھے میرا اجر مل گیا، اگرچہ میں اجر کا حقدار نہ تھا۔''

''میں نے تو کچھ نہیں کہا...... پسندیدگی کا اظہار نہیں کیا۔''

''میں نے برسوں چاکری کی ہے۔ آقا کی مرضی کو کلام کے بغیر جان لینا چاکر کا فن ہے...... آپ کی خاموش پسندیدگی آپ کی آنکھوں اور آپ کے پاؤں کی جنبش سے عیاں تھی۔ اگر آپ تردید کر دیں تو میں آپ کی ناپسندیدگی کو بے چون و چرا، ایک چاکر کی طرح، قبول کر لوں گا اور اپنی اصلاح کی کوشش کروں گا۔''

فردوس نے مسکراتے ہوئے، اطمینان دلاتے ہوئے، کہا:

''تمہاری نظر اور تمہارے حواس نے دھوکا نہیں کھایا۔ اس لمحے تمہارے اور نور کے رقص سے مجھے اتھاہ فرحت ہوئی ہے میں تم سے ناراض نہیں ہوں......

مگر بابا تم راتوں کو کیوں جاگتے رہتے ہو؟''

دلاور خان کے چہرے پر اداسی چھا گئی، اس کی آنکھیں بند ہو گئیں، اس کے سارے بدن میں سے اک کپکپی سی پھوٹ نکلی۔ اس نے اپنے آپ پر قابو پانے کی بہت کوشش کی مگر ناکام رہا۔ وہ چاندنی میں کانپتا رہا۔ فردوس نے محسوس کیا کہ اس کے بدن کے ساتھ چاندنی، سبزہ زار، اونچے اونچے درخت کانپ رہے ہیں۔ نور جواب تک دونوں کو پسندیدگی کی نظر سے دیکھ رہا تھا دلاور خاں کی اداسی کو دیکھ کر اداس ہو گیا اور اس کے قریب ہو کر اس کی گردن اور شانے کے سنگم پر اپنی تھوتھنی رکھ دی۔ اس کے تنفس کی گرمی سے دلاور خان کا کانپنا بند ہو گیا۔ کچھ دیر وہ خاموش رہا۔ اس نے آنکھیں کھولیں۔ اس کی آنکھوں میں پانی کی آب روشن تھی۔ اس نے ایک دلدوز، لمبی آہ بھری اور بولا:

''بی بی! یہ ایک لمبی دکھ بھری کہانی ہے۔ آپ سن کر اپنے دل کو برا کیوں کریں۔''

''دلاور خاں! دکھ اور انسان ایک لمبے سفر کے ساتھی ہیں۔ ان دونوں میں جدائی شاید ممکن نہیں۔ اگر ممکن بھی ہو تو انسان کو شاید یہ جدائی ناگوار گزرے۔ دکھ ایک ایسا کھیت ہے جس میں سے انسان کی خوشیاں پھوٹتی ہیں، ایک ایسا باغ ہے جس میں انسان کے حسین ترین لمحے کھلتے ہیں۔ مائیں دکھ میں پلوٹھی کے بیٹے جنتی ہیں، ان کو پالتی پوستی ہیں، جوان کرتی ہیں اور دوسری عورتوں کے سپرد کر دیتی ہیں......

''میرے سوال سے تمہیں دکھ ہوا، میں جانتی ہوں۔ مگر میں یہ بھی جانتی ہوں اس دکھ کے ساتھ وہ سب حسین لمحے لوٹ آئے ہیں جو تمہاری زندگی کا عزیز ترین سرمایہ ہیں۔ ان کا حسن اک نئی نویلی، انوکھی، پھبن لے کر آیا ہے جس سے تم پہلے کبھی آشنا نہ تھے۔ اس نئی پھبن کے سہارے تم اپنے ماضی سے رضامند ہو جاؤ گے، تم ان سب کو معاف کر سکو گے جنہوں نے تمہیں دکھ دیا......''

ان دونوں کے درمیان خاموشی بہنے لگی اور وہ دونوں خاموشی کے کناروں پر کھڑے

ایک دوسرے کو تکتے رہے۔ دلاور خان کی آنکھوں کی آب ماند پڑ گئی، اس کی آنکھوں کے کناروں پر قطرے جھلملانے لگے اور اس کی آنسوؤں میں بھیگی ہوئی، مگر واضح، آواز خاموشی کے سینے پر تیرنے لگی۔

''بیٹی...... میں محسوس کرتا ہوں کہ میرے ماضی کی حسین یادوں نے، میری چھپی ہوئی، مستقبل سے وابستہ، آرزوؤں نے تمہیں ابھی ابھی جنم دیا ہے۔ مجھے اجازت دو کہ میں تمہیں بیٹی کہہ سکوں۔ تم اگر اجازت نہ بھی دو تو اس لمحے سے تم بیٹی ہو اور ہمیشہ بیٹی رہو گی، میرے لیے۔''

اس نے ایک لمبا، بہت ہی لمبا، سانس لیا، جیسے کہ وہ تمام ہوا کو اپنے سینے میں چھپا لے گا، اور بولنے لگا اور بولتا ہی چلا گیا!

''ان شمالی پہاڑوں کے اس پار ایک بلند ٹیلے پر اونچے اونچے درختوں کے سائے میں میں نے پہلی بار آنکھ کھولی۔ ہر طرف امن تھا۔ اس امن میں دن بھر کھیلتے، رات کو ماں سے شہر کی، پریوں کی، شہزادیوں کی کہانیاں سنتے میں اور میرا بھائی جوان ہوئے۔ باپ سے ٹیلے کے سائے میں اپنے کھیتوں میں ہل چلانا سیکھا۔ کھیتوں سے اتنا غلہ پیدا ہوتا کہ ہم اور ہمارے جانور پیٹ بھر کر کھا کر بھی برے وقتوں کے لیے کچھ نہ کچھ بچا لیتے۔

دن بھر محنت کرتے اور شام ہوتے ہی کھانا کھا کر، کچھ دیر باتیں کرتے کرتے رات بھر سوتے رہتے۔ زندگی ایک میدانی دریا کی طرح آہستہ آہستہ گزرتی چلی جاتی تھی کہ ہمارے امام مسجد کی بیٹی سارہ جوان ہوگئی۔ ہمارے ننھے سے گاؤں میں، جو ہر دوسرے گاؤں سے الگ اور دور تھا، ایک ہلچل پیدا ہوگئی۔ گاؤں کے نوجوان ایک دوسرے کو شک کی نگاہوں سے دیکھنے لگے، ایک دوسرے پر جاسوسی کرنے لگے۔ ان دنوں مجھے گھوڑوں سے نیا نیا عشق ہوا تھا۔ جہاں کہیں کسی منہ زور یا طرحدار گھوڑے کی خبر پاتا اس کو دیکھنے کے لیے بے تاب ہو جاتا۔ میں نے گھوڑوں کے عشق میں دور دور کا سفر کیا۔ کئی کئی دن تک گھر سے، گاؤں سے دور رہتا، لوٹ کر آتا تو سارہ ان گھوڑوں کے متعلق مجھ سے طرح طرح کے سوال کرتی اور میں اپنے عشق میں جانے کیا کیا کچھ بتاتا کہ وہ ہر دم میرے انتظار میں رہتی۔

کئی بار اس نے خواہش کا اظہار کیا کہ کاش وہ ایسی جگہ جا سکے جہاں ہزاروں گھوڑے ہوں اور وہ ان کو مسحور کر سکے۔ ایک رات جب میں ایک نئے منہ زور گھوڑے کی تسخیر کر کے گاؤں لوٹا تو چاندنی رات تھی۔ رات کافی جا چکی تھی۔ میں جب گاؤں کے قریب پہنچا تو میں نے دیکھا کہ سارہ ٹیلے کے سائے میں کھلتی چاندنی میں ناچ رہی ہے۔ اس کے ناچ میں اک عجیب جادو تھا۔ چاند آسمان پر ساکت ہو گیا، ہوا سو گئی تھی۔ کٹی ہوئی فصلوں کے ڈھیروں کے درمیان سارہ کا ہلکا پھلکا جسم اندھیری راتوں میں نیلے آسمان پر بجلی کے کوندے کی طرح لہکتا، تھرکتا تھا۔ اس رات وہ رات بھر ناچتی رہی اور میں کھیت کی منڈیر پر بیٹھا اسے دیکھتا رہا۔ صبح ہوئی تو میں نے اپنے آپ کو منڈیر پر سر رکھے سوئے ہوئے پایا۔

میرا باپ بہت سیانا تھا اس نے امام مسجد سے میرے لئے سارہ کا رشتہ مانگ لیا۔ امام مسجد کو اس سے اچھا رشتہ شاید ہی ملتا۔ ہماری شادی ہو گئی۔ سارہ ہر لحاظ سے اچھی بیوی، اچھی بہو ثابت ہوئی مگر اس کی آنکھوں میں کبھی کبھی، چند لمحوں کے لیے، اک عجب اداسی تیرتی نظر آتی۔ میں اس سے اس اداسی کا سبب پوچھتا تو وہ ٹال جاتی۔

ایک رات ایسی ہی چاندنی تھی، مگر بہت ہی پروقار اور حسین۔ اچانک میری آنکھ کھلی اور نظر سارہ کے بستر کی اُور گئی۔ سارہ بستر پر نہ تھی۔ میں حیران رہ گیا، سکتے میں آ گیا۔ دل میں لاکھوں گمان گزر گئے۔ میں اس ڈر سے بستر سے نہ اٹھ سکا کہ اگر سارہ بے وفا نکلی تو اسے قتل کر دینے کے سوا کوئی چارہ نہ ہوگا۔ اور یہ قتل برسوں میں اس پورے علاقے کا پہلا قتل ہوگا۔ اور بہت رسوائی ہوگی۔ اس کے قتل کے کے خیال سے میرا سارا بدن سن ہو گیا۔ آخر بے وفائی کے تصور سے دل میں غیظ و غضب کی اک گرم گرم لہر اٹھی اور یکا یک بستر سے اٹھ کھڑا ہوا اور تیزی سے باہر نکل گیا۔ دور دور تک دیکھا۔ سارہ کہیں نہ تھی، کوئی نہ تھا۔ ٹیلے کے مغربی کونے پر درختوں کے جھنڈ کے درمیان ایک چھوٹا سا سبزہ زار تھا جہاں بیاہ شادی کے موقعوں پر برات کو دوپہر کے وقت ٹھہرایا جاتا تھا۔ سارہ کو ڈھونڈتے میں اس سبزہ زار میں جا نکلا تو سارہ کو چاندنی میں رقص کرتے پایا۔ اس کا رقص بڑا ہی اداس اداس تھا۔ اس کو یوں رقص کرتے دیکھ میرے دل کو چرکہ سا لگا اور دل بیٹھ گیا۔ میں ایک اونچے سے درخت

کا سہارا لیے اس کو ناچتے دیکھتا چلا گیا۔ چاند مغرب کی طرف ڈوبتا چلا گیا۔ سارہ ناچتی رہی۔ جب چاند مغرب کی گہرائیوں میں ڈوب گیا تو سارہ تھک کر سبزے پر گر گئی اور سو گئی۔ میں دیر تک اس کے بھرپور، دمکتے، ابھرتے ڈھلکتے جسم کو دیکھا کیا۔ یکا یک مجھے خیال آیا کہ کہیں اس کے گرم گرم جسم کو ہوا نہ لگ جائے۔ میں اس کی طرف لپکا، اس کو اٹھایا اور گھر کی طرف لڑکھڑاتا ہوا چل دیا۔ پو پھٹ رہی تھی۔ ہلکی ہلکی ہوا کے سہارے بھینی بھینی خوشبوؤں نے بہار کی آمد کا اعلان کیا۔ میں رقص اور خوشبوؤں کے نشے میں گھر کی اُور چلتا گیا۔ مجھے آج بھی یاد نہیں کہ کب اور کیسے گھر پہنچا کیونکہ اس رات کے بعد کئی دن رات ہم دونوں بخار میں پھنکتے رہے اور بے ہوش پڑے رہے۔

بخار اترنے کے کئی روز بعد ایک دوپہر ہم دونوں گھر میں اکیلے تھے کہ باقی سب لوگ کھیتوں میں تھے۔ میں نے سارہ کو اپنی جان کی قسم دے کر پوچھا کہ اس کو کیا دکھ تھا کہ وہ کبھی کبھی بیٹھے بیٹھے یوں اداس اور بے خود ہو جاتی تھی کہ مجھے بھی اس لمحے نہ پہچانتی تھی۔ پہلے تو وہ کچھ نہ بولی مگر میرے اصرار پر اس نے اپنی بڑی بڑی آنکھیں کھول کر، چہرہ اٹھا کر، میری آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر کہا:

’’میں نے جب سے چلنا سیکھا ہے میرے دل میں سمائی ہے کہ جنوبی پہاڑوں کے اس پار کسی بڑے شہر میں جاؤں۔ اس ننھے سے گاؤں میں، اونگھتی، سائیں سائیں کرتی راتوں، اداس دوپہروں، سنسناتی سہ پہروں، حیران شاموں کی وسعتوں میں مجھے اکیلے رہ جانے کا دکھ ستاتا رہا ہے اور میرے دل میں ہر دم صدا اٹھتی رہتی ہے: تیرا مقام اس گاؤں میں نہیں، دور شہر کے بڑے بڑے باغوں کے درمیان ننھے سے، خوبصورت گھر میں ہے جہاں موسیقی کا ہلکا ہلکا شور کانوں کو سہلاتا ہو۔ جہاں سڑکوں پر گہما گہمی کے گنگناتے شور میں ہجوم کے درمیان رنگین کپڑے پہنے، کسی کے ہاتھ میں ہاتھ دیئے، اونچی عمارتوں، نت نئی چیزوں سے بھرپور دکانوں کو دیکھتے ہی جائیں، مگر اس اجنبی شہر کے تصور سے میری روح تھرا اٹھتی ہے، مگر پھر بھی میرا رواں رواں، میرے حواس، میرے کان، میری آنکھیں، شہر کی ہوا، شہر کے ماحول، شہر کے شور کے لیے بے تاب ہو جاتے رہے ہیں اور ہو جاتے ہیں۔

تمہارے گھوڑوں کی باتیں سن سن کر کچھ دیر کے لیے دل سے، خیال سے، یہ شہر کا جادو اتر جاتا، مگر تمہاری غیر حاضری میں دل مچل مچل جاتا اور قدم پہاڑوں کی اُور لپکنے کے لیے بے تاب ہو ہو جاتے۔

پھر ایک دن آنکھوں کو تمہارا چہرا مہرا، تمہارا جسم، تمہاری چال بھلی لگنے لگی، تن من میں تمہارا رنگ روپ سما گیا۔ مگر جب شادی کے بعد بھی تم گھوڑوں کے عشق میں بے بس پھرتے رہے تو میرے اندر ایک بار پھر شہر کا شور، شہر کی باس رچنے لگی اور اب تم اور شہر میرے اندر اس زور شور سے لڑتے سنائی دیتے ہیں کہ میں ڈر ڈر جاتی ہوں، راتوں کو تنہائیوں میں اٹھ اٹھ کر صدیوں جاگتی رہتی ہوں۔ بدن دکھنے لگتا ہے، تمہارے بغیر کہیں رہنے کا خیال ڈسنے لگتا ہے۔ مگر...... اس گاؤں کی فضا میں میرا دم گھٹنے لگتا ہے۔ میں اس گاؤں کے حسن سے بے خبر نہیں ہوں مگر اس کا حسن میرے لیے نہیں ہے۔ میرے اندر ایک بڑا امیدان ہے جہاں ہر لمحہ مختلف رفتار سے ہوا چلتی ہے۔ کبھی اٹھکیلیاں کرتی، کبھی دندناتی، کبھی سنسناتی ہوئی، کبھی کبھی صدیوں کے لیے ہوا سو جاتی ہے اور ویرانی دور دور تک چھا جاتی ہے۔ اور مجھے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ میں مر گئی ہوں اور صدیاں گزر گئی ہیں اور اک شہر میں سڑک بنانے کے لیے زمین ہموار کی جا رہی ہے اور زمین سے اک لاش نکلی ہے، گلی سڑی ہوئی اور میرے کانوں میں صدا آتی ہے ''یہ لاش تو ہے''۔ شہر میں ایسی حالت میں پہنچنے کے خیال سے میں لرز اٹھتی ہوں۔

چلو! ایک دن ہمت کر کے ان پہاڑوں کے اس پار جا نکلیں۔''

''اپنے ابا کی کتابیں پڑھ پڑھ کر تو دیوانی ہو گئی ہے۔ عورتوں کو کتابیں پڑھانی ہی نہ چاہئیں۔ نہ پوری ہونے والی آرزوئیں ان کے دل میں پیدا ہو جاتی ہیں اور ان کے کانوں میں سرگوشیاں کرتی ہیں اور ان سرگوشیوں کے سوا ان کے کانوں میں کوئی آواز سنائی نہیں دیتی ہے۔

ان آرزوؤں کو بھول جاؤ۔ یہ تمہیں اور مجھے، ہمیں، بہت خراب کریں گی...... بیٹیوں کی طرح پیدا ہو کر ایسی آرزوئیں مرا نہیں کرتیں...... مجھے نظر آتا ہے کہ یہ آرزوئیں مجھے بھی

اک دن لے اڑیں گی۔ مگر کچھ برسوں کے لیے ان کو رخصت کر دو۔ خدا کے لیے اپنے آپ پر قابو رکھو۔''

اس گفتگو کے بعد میں اپنے گاؤں کی فضا کو اک نئی نظر سے دیکھنے لگا، میرے اندر بیک وقت دو نظریں رہنے لگیں۔ گاؤں کی دھرتی، اس سے اگتی ہوئی فصلیں، پھول، درخت، پھل، سبزہ، جنگلی پھول، آسمان اور اس کے تارے اور چاند اور کہکشاں، اندھیری راتوں میں دمکتا ہوا نیلا آسمان اور اس کی قبا میں جڑے ہوئے تارے، سردیوں کے سورج کا دمکتا چہرہ گرم کرتا ہوا لمس خوب خوب لبھاتے، مگر اس کے ساتھ ساتھ اک دور کا منظر انہی مناظر میں سے ابھرتا ہوا اور ان مناظر پر چھاتا ہوا نظر آنے لگتا، شہر کا منظر شہر کے چمکتے ہوئے مینار و گنبد۔ کبھی کبھی گھبرا کر میں آنکھیں میچ لیتا اور میچے رہتا مگر کانوں میں شہر کا شور موسیقی بن کر داخل ہونے لگتا اور خون میں رچ رچ جاتا اور میں بے بس کھڑے کا کھڑا، بیٹھے کا بیٹھا، یا لیٹے کا لیٹا رہ جاتا۔ جسم دکھنے لگتا، دُکھن بن جاتا۔ ہل چلاتے، کھیتوں سے واپس آتے قدم رک رک جاتے، کھانا کھاتے لقمہ ہاتھ میں رہ رہ جاتا اور میں کہیں کھو جاتا۔ ان دنوں جب کبھی بھی سارہ کو بے دھیانی میں دیکھ پاتا تو اس کا سارا جسم خوشی کا روپ نظر آتا۔

اس بے دھیانی کے عالم میں ایک دن میرے کان میں ایک نئے گھوڑے کی بھنک پڑی۔ میں اس کو دیکھنے کے لیے بے تاب ہو گیا۔ میں سب کچھ بھول گیا۔ میں بہت خوش ہوا۔

ہمارے گاؤں سے بیس کوس پر ایک چھوٹی سی زمینداری ہے۔ اس زمینداری کے آس پاس کے گاؤں اس زمینداری کے مالک، مہابت خان، کے رشتے داروں اور دوستوں کی چھوٹی بڑی کئی زمینداریاں تھیں جن کا بندوبست وہی کرتا تھا۔ آدمی دلیر اور دبدبے والا تھا۔ اس کا اثر و رسوخ بدیسی سرکار کے افسروں سے بھی تھا۔ اس نے ان زمینداریوں میں پہلی بار باڑیں اور باغ لگوائے تھے۔ اچھا ناظم تھا اس لیے زمینداری کے سبب اس کو فراغت نصیب تھی۔ فرصت کے لمحوں میں وہ طرحدار اور منہ زور گھوڑوں کو حاصل کرنے اور ان کی تسخیر میں لگا رہتا۔ دور دور تک اس کے گھوڑوں کا جواب نہ ملتا تھا اور کبھی کبھی چاندنی

راتوں میں، سال میں پانچ چھ دفعہ، وہ اپنے نوکروں کے ساتھ دور دور کے گاؤں میں اپنی دھاک بٹھانے کے لیے ڈاکے ڈالا کرتا تھا۔ ڈاکے ڈالنا گھوڑوں کو تسخیر کرنے کے بعد اس کا محبوب مشغلہ تھا۔

اس زمیندار کے پاس ایک سیاہ گھوڑا لایا گیا۔ اس کو رام کرنے کی سب کوششیں ناکام ہو گئیں۔ اس پر سواری کی آرزو میں کئی بار اس گھوڑے سے گر چکا تھا، زخمی ہو چکا تھا۔ اس لیے اس کو اس سے ایک طرح کی نفرت ہوتی چلی گئی مگر وہ اس کو اپنے آپ سے جدا کرنے کے لیے بھی راضی نہ تھا۔ آخر اس نے طے کر لیا کہ جو کوئی اس کو رام کرے گا اور اس پر سواری کرے گا وہ گھوڑا اسی کو نذر کر دے گا۔

اس گھوڑے کی خبر ملتے ہی میں نے طے کر لیا کہ اس کو رام کرنا ہی زندگی کی معراج ہے۔ میں زمیندار کے سائیس سے ملا۔ میں نے گھوڑے کو دیکھا۔ ایسا خوبصورت گھوڑا میں نے پہلے کبھی نہیں دیکھا تھا۔ میں کئی دن اس سائیس کے پاس رہا۔ دن میں، رات میں، کئی کئی بار میں اس کو جا جا کر دیکھتا۔ بار بار کا دیکھنا میرے لیے عشق کی کیفیت بنتا چلا گیا۔ میں اس کو رام کرنے اور اس پر سواری کرنے کی آرزو بن گیا۔ آخر ایک چاندنی رات میں نے اس گھوڑے کو اس کے تھان سے کھول لیا اور پاس کے سبزہ زار میں اس کو لے آیا۔ چاندنی میں، پھول دار درختوں کے سائے میں، اس کی چال میں ایک عجیب مستی تھی۔ میں نے اس کی آنکھوں میں جھانکا۔ اس کی آنکھوں میں خشونت میں لپٹی ہوئی اک بڑی نازک نرمی تھی۔ میں اس کی گردن پر، اس کے ماتھے پر، اس کی تھوتھنی پر آہستہ آہستہ ہاتھ پھیرتا رہا۔ میرے دل میں جو خوف چھپا تھا وہ اس کے جسم کے لمس سے بالکل گم ہو گیا۔ میں اس کو اس طرح پیار کرتے ہوئے چاندنی کے بیچوں بیچ لے آیا۔ اس کو میں نے کھلا چھوڑ دیا اور اس سے پرے ہٹ کر سارہ کے انداز میں ناچنے لگا۔ میں اس کے گرداگرد نہ جانے کب تک ناچتا رہا۔ ایک بار میں نے کن انکھیوں سے چاند کو دیکھا، چاند مغرب کی طرف بڑی تیزی سے بڑھا جا رہا تھا۔ میں ناچتا رہا۔ ناچتے ناچتے کبھی کبھی گھوڑے کے جسم پر، اس کی گردن پر، اس کے ماتھے پر، اس کی تھوتھنی پر، اس کی کمر پر، اس کے کولھوں پر، اس کے پیٹ پر ہاتھ

پھیرتا۔ گھوڑا پہلے پہل تو ڈرا اور اس کی ٹانگوں میں حرکت مچلتی رہی مگر بعد میں وہ ساکت ہوکر مجھے ناچتے دیکھتا رہا۔ چاند مغرب میں ڈوب گیا۔ سبزہ زار پر اندھیرا چھا گیا۔ پھر یکا یک میرے دل میں سما گیا کہ یہی وقت ہے کہ اس کو ایال سے پکڑ کر اس پر کود کر جم کر بیٹھ جاؤں۔ ناچتے ناچتے اس کو ایال سے پکڑ کر میں ہوا میں کود گیا اور اس کی کمر پر آ رہا اور جم کر بیٹھ گیا۔ گھوڑے کے بدن میں ایک جھرجھری پیدا ہوئی، اس نے گردن کو میری طرف سختی سے جھٹکا دیا۔ اس کی گردن میری بانہہ پر کہنی اور پہنچے کے درمیانی حصے میں بڑے زور سے لگی۔ میں لرز گیا۔ میں نے اس کی ایال کھینچی، اس کو اپنی رانوں میں جکڑ لیا اور ایڑیاں اس کے پیٹ میں گاڑ دیں اور اس کو للکارا۔ اندھیرا لرز اٹھا۔ گھوڑا اپنی پچھلی ٹانگوں پر الف ہو گیا۔ میں نے رانوں کی گرفت کو اور مضبوط کر لیا اور ایڑیاں اس کے پیٹ میں سختی سے گاڑ دیں اور بائیں ہاتھ سے اس کے ماتھے کو آنکھوں کے درمیان سہلایا۔ گھوڑا چیختا، چنگھاڑتا، اگلے پاؤں زمین پر گاڑتا، پچھلے پاؤں اٹھاتا ہوا، پٹختا ہوا، سبزہ زار میں چکر لگانے لگا۔ میں اس پر جما رہا یا یوں کہیے کہ میں اس کے ساتھ چپکا رہا۔ آخر گھوڑا پسینے پسینے ہو کر دوڑنے لگا، دوڑتا ہوا چلا گیا۔ گھوڑا سبزہ زار سے دور کھیتوں میں سے، مربعوں کے گرداگرد پست قد منڈیروں کو، باڑوں کو، نالوں کو پھاندتا ہوا چلا گیا۔ میں فتح مندی کے جذبات میں سرشار آسن جمائے، رانوں میں گھوڑے کو دبائے، ایڑیاں اس کے پیٹ میں گاڑے، دونوں ہاتھوں میں ایال مضبوطی سے پکڑے، اس کے جسم کا ابھرا ہوا حصہ بنے بیٹھا، درختوں، کھیتوں، آفاق کو گھومتے ہوئے اور ان گھومتے درختوں، کھیتوں اور آفاق کے درمیان ابھرتے ہوئے سورج کی ترچھی کرنوں کی روشنی میں ایکا ایکی نئی نئی شکلوں کو، اپنے حجم کی حدود میں مسدود، کمہار کے پہیے پر گھومتی ہوئی، مٹی میں سے نکلتی ہوئی شکلوں کو انگڑائی لے کر، اپنے آپ کو کوشش سے اندھیرے سے نکالتے ہوئے، دیکھتا چلا گیا۔ آہستہ آہستہ رقصاں اشیا اپنے اپنے مقام پر، اپنی اپنی حدود میں قائم ہوتی چلی گئیں۔ گھوڑا روشنی میں بیدار ہوتی ہوئی باڑوں، منڈیروں، کھڑی فصلوں کو صبح کی پھیلتی ہوئی روشنی میں پھاندتا ہوا، جھومتے ہوئے درختوں میں سرسراتی ہوا کو چیرتا ہوا، انجانی منزل کی طرف سرپٹ بھاگتا چلا گیا۔ یکا یک سپاٹ میدان میں ڈھلوان سا قطعہ زمین کا آ گیا جو اوپر کی طرف بلند ہوتا گیا۔ گھوڑا

بھاگتا ہوا ڈھلوان پر چڑھ گیا اور پھر یکا یک بلندی پر پہنچ کر ایک مرتفع سطح پر ایک بڑا سا تالاب آیا اور وہ اندھا دھند تالاب کے پانی کو چیرنے لگا۔ پانی کے چھینٹے فضا میں اڑنے لگے، گھوڑے کی آنکھوں میں، میری آنکھوں میں پڑنے لگے۔ گھوڑا غرایا اور غراتے ہوئے اس نے تالاب کو پار کیا اور پھر تیزی سے نیچے اترتی ہوئی ڈھلوان پر بھاگنے لگا۔ ڈھلوان سے اتر کر وہ کھیتوں، باڑوں، منڈیروں کو پھاندتا ہوا آبادی کی طرف بڑھنے لگا۔ یکا یک کھیت ختم ہو گئے اور آبادی کے گھر نمایاں ہونے لگے اور ان گھروں میں زمیندار کی حویلی بھی صاف نظر آنے لگی۔ گھوڑے کی ٹاپوں سے صبح کی خاموش فضا گونج رہی تھی۔ حویلی کے سامنے کے میدان میں گھروں سے لوگ نکل نکل کر باہر آنے لگے۔ اتنے میں گھوڑا عین حویلی کے سامنے جا نکلا۔ مہابت خان اپنے دیوقامت ڈیل ڈول سمیت میدان میں دھاڑتا ہوا، لنگڑاتا ہوا، نکل آیا۔ گھوڑا اس کو دیکھ چنگھاڑا، اس نے اگلے دونوں پاؤں ہوا میں اٹھا دیئے اور پھر زمین پر گاڑتے ہوئے ہنہنانے لگا۔ میں نے اس کی گردن کو تھپکا اس نے گردن موڑ کر میری طرف دیکھا۔ اس کی آنکھوں میں حیرانی تھی اور احسان مندی۔ میں اس کی پیٹھ سے کود کر اتر آیا۔ مہابت خان حیرت سے کبھی گھوڑے کو اور کبھی مجھے دیکھ رہا تھا۔ میں نے مہابت خان سے اس کے اعلان کا ذکر کیا اور گھوڑے کا طلبگار ہوا۔ اس نے سر کے اشارے سے مجھے اپنے پاس بلایا اور ساتھ چلنے کا اشارا کرتے ہوئے حویلی کی طرف چل دیا۔ حویلی میں داخل ہو کر وہ مردانے کے صحن کی طرف بڑھا۔ صحن میں ایک چبوترے پر بچھی ہوئی دری اور چادر پر بڑے سے گاؤ تکیے پر وہ سر رکھ کر لیٹ گیا اور مجھے فرش پر بیٹھ جانے کا ہاتھ سے اشارہ کیا۔ وہ کچھ دیر خاموش سانس لیتا رہا اور پھر کہنے لگا:

''مجھے تمہاری کامیابی پر کوئی خوشی نہیں ہوئی مگر میں اپنے وعدے کا پاس کروں گا۔ تم گھوڑا لے جاؤ۔ دور بہت دور، لے جاؤ اسے جہاں سے اس کے متعلق مجھے کوئی خبر نہ آئے۔ نہ جانے میں اس کی خبر سن کر کیا کر بیٹھوں۔''

اس کے بعد وہ اپنے آپ میں کھو گیا۔ جب چونک کر لوٹا تو مجھ سے پوچھنے لگا کہ میں نے گھوڑے کو کس طرح رام کیا تھا۔ میں نے تمام روداد کہہ سنائی۔ سن کر کہنے لگا کہ میں ہی

گھوڑے کا صحیح حقدار تھا۔ پھر اس نے مجھ کو جانے کے لیے کہا۔ اس نے میرے پیچھے ایک نوکر کو روانہ کیا جس نے مجھے سائیس سے گھوڑا دلا دیا۔

گھوڑا لے کر جب میں گاؤں لوٹ آیا تو چاند مشرق سے نکل رہا تھا۔ درختوں کے لمبے لمبے سائے چاندنی سے مل کر عجیب عجیب شکلیں بنا رہے تھے۔ گاؤں کے سرے پر سارہ مجھے میری راہ دیکھتی ہوئی ملی۔

کچھ دنوں کے بعد سارہ اور میں اس گھوڑے پر سوار ہو کر شہر کی سمت چل دیئے۔ جب ہم ولی پور کے قرب و جوار میں پہنچے تو مشرق سے کوکتی ہوئی ایک روشن آنکھ مغرب کی طرف تیزی سے بڑھی چلی آتی نظر پڑی۔ گھوڑا، میں اور سارہ ڈر گئے۔ مجھے ایکا ایکی خیال آیا کہ یہ ریل گاڑی ہے۔ میں نے پہلے ریل گاڑی کبھی نہ دیکھی تھی مگر گھوڑوں کے عشق میں دور دور کے گاؤں کا سفر کرنے کے دوران میں نے ریل کے متعلق سن رکھا تھا۔ گاڑی کی روشن آنکھ سے روشنی کا ایک دھارا، زمین پر بل کھاتا ہوا ہمارے سامنے سے زن سے گزر گیا اور اس کے پیچھے روشنی کا ایک شہر پہیوں پر گزر گیا۔

ہم شہر میں داخل ہو گئے۔ لوگوں سے پوچھا کہ شہر میں کس کے پاس گھوڑے ہیں۔ معلوم ہوا کہ شہر کے سب سے بڑے رئیس صداقت علی کے پاس سینکڑوں ہی گھوڑے ہیں اور ان کے لیے اصطبلوں کا ایک شہر آباد ہے۔ ہم رئیس کے حضور پہنچے۔ ہمارے پہنچنے سے پہلے ہمارے گھوڑے کی خبر اس تک پہنچ چکی تھی۔ اس نے مجھے ملازم رکھ لیا۔ میں چند ہی برسوں میں اس کا میر اصطبل ہو گیا۔ گھوڑوں سے مجھے عشق تو تھا ہی مگر یہاں پہنچ کر مجھے معلوم ہوا کہ گھوڑے بھی میرے عشق کا جواب دینا جانتے تھے۔

شہر کی ہوا میں سارہ پنپنے لگی، اس کے حسن کو چار چاند لگ گئے۔ میرا اور اس کا پیار بڑھتا ہی چلا گیا۔ ہم اصطبلوں کے قریب، شہر سے ذرا نکل کر، ایک مکان میں رہنے لگے جس کے چاروں طرف سبزہ زار تھا اور اس سے پرے کھیت تھے۔ جب بھی چاندنی رات ہوتی تو سارہ آدھی رات کے بعد اٹھ کر گھوڑوں کے تھانوں میں چلی جاتی اور کئی ایک گھوڑے کھول سبزہ زار میں لے جاتی۔ گھوڑے اور وہ سبزہ زار میں کلیلیں کرتے اور پھر وہ

ان کے درمیان صبح تک رقص کرتی۔ گھوڑوں کو مسحور کرنے میں اس کو عجیب مزا ملتا۔ ان راتوں میں صبح تک رقص کر لینے کے بعد وہ دنوں خوشی کے ساتویں آسمان پر اڑتی پھرتی۔

زندگی کے دن مزے سے گزرتے رہے۔ میں اپنے کام میں مگن رہنے لگا۔ مالک کو شکار کا شوق تھا۔ اس کے ہزاروں دوست تھے، شہر اور صوبے کے افسر اس کے یہاں شکار کرنے کی خاطر دور دور سے آتے تھے۔ اس نے ایک رکھ میں ہرن پال رکھے تھے۔ ہزاروں کی تعداد تھی ان ہرنوں کی۔ سال میں دو تین بار وہ اعلیٰ افسروں کے ساتھ ان کا شکار کھیلتا تھا۔ میں بھی اکثر، بلکہ ہمیشہ، اس کے ساتھ ساتھ رہتا۔

ایک دفعہ تو سارا سال ہی افسروں اور اس کے دوستوں کی چہل پہل میں ایک ہنگامہ رہا۔ میں سارا سال مصروف رہا۔ سارہ کی طرف اتنی توجہ نہ دے سکا جس کی وہ عادی ہو چکی تھی۔ اس میں ایک نئی آرزو نے جنم لے لیا: اس کو جانوروں کی طرح انسانوں کو بھی مسحور کرنے میں مزا ملنے لگا اور وہ ان کو مسحور کرنے کے لیے نئے نئے جتن سوچتی رہتی۔

مالک کا سب سے چھوٹا لڑکا میری ملازمت سے پہلے ہی عین نوجوانی میں افرنگ تعلیم کے لیے گیا ہوا تھا۔ جب وہ لوٹ کر آیا تو ان دنوں سارہ میں مسحور کرنے کی آرزو زوروں پر تھی۔ بیسیوں ہی نوجوان اس کے حسن کے جال میں پھنس کر تڑپ رہے تھے مگر اس کی نظر کی تاب لانا کسی کے بس میں نہ تھا۔

مالک کا بیٹا بہت ہی وجیہہ اور عقیل اور دلیر تھا۔ اس کو اللہ نے سب کچھ دے رکھا تھا جس کی انسان خواہش کر سکتا ہے۔ حسن اور جوانی، رعنائی اور قوت، دولت اور اقتدار، علم اور ذہانت۔ مگر اس کے دل میں اپنے جیسے کی آرزو برسوں سے تڑپ رہی تھی۔ افرنگ میں بھی اس کو اپنا جواب نظر نہ آیا تھا۔ اس بات کا اس نے مجھ سے کئی بار، شکار پر جاتے ہوئے، شکار سے واپس آتے ہوئے، ذکر کیا تھا۔ اس کو بھی میری طرح گھوڑوں سے عشق تھا مگر میرے اور اس کے عشق میں بڑا فرق تھا۔ میرا عشق اس عشق سے کچھ زیادہ مختلف نہ تھا جو ایک مرد کو ایک عورت سے، یا ایک عورت کو ایک مرد سے ہوتا ہے۔ مگر اس کا عشق بہت ہی انوکھا تھا، غیر انسانی تھا۔ اسے گھوڑوں سے زیادہ گھوڑ پن سے عشق تھا۔ اس کے نزدیک گھوڑا رعنائی

اور بھرپور قوت کا یکتا مظہر تھا اور گھوڑے کی آنکھ ایک جہاں، ایک طلسم تھی جس میں شعور اور ناشعور ایک دوسرے سے بغلگیر ہوتے رہتے ہیں اور ان کی نیند میں بیداری کی آب ہوتی ہے۔

ہم اکثر ایک دوسرے کے ساتھ رہتے تھے۔ وہ مجھ سے عجیب قسم کی باتیں کرتا۔ وہ ذہن کی روشنیوں، دل کے اندھیروں، اجلے ریگستانوں جن میں نور ہی نور ہوتا، ایسے بنوں، جنگلوں کے متعلق جس کے اندھیروں میں انوکھے جانور ہوتے، گھنٹوں مستی کے عالم میں مجھ سے جواب کا طلبگار ہوئے بغیر، باتیں کرتا رہتا۔ پہلے پہل تو میں کچھ نہ سمجھ سکا مگر آہستہ آہستہ اس کے ساتھ رہتے رہتے مجھ پر بھی اس کے دل کی گہرائیوں، اجلی اور اندھیری آرزوؤں کا ماجرا کھلنے لگا۔ مجھے آج بھی اس کی ایک ایک بات یاد ہے۔ میں نے برسوں اس کی باتوں پر غور کیا ہے۔ میں نے لاکھوں بار چاہا ہے کہ اس کی باتوں کو بھلا دوں مگر ایسی ہر کوشش ان کو میرے دل پر نقش کرتی چلی گئی۔ اس کی زبان سے سیدھے سادھے فقرے بھی عجیب طلسم معلوم ہوتے۔ وہ جانے بوجھے لفظوں کو اتنے نئے رشتوں میں سمو دیتا کہ اکثر یہ خیال آتا کہ وہ بالکل اجنبی زبان میں باتیں کر رہا ہے۔ اس کے لفظ اپنے نئے رشتوں سمیت میری نیند میں بھی میرے خیالوں کا تعاقب کرتے۔ کبھی کبھی تو تنہائی میں مجھے احساس ہوتا کہ میں اور وہ ایک ہو گئے ہیں: میرا ذہن اس کے ذہن کا ہمزاد بن گیا ہے، اس کا دل میرے سینے میں دھڑک رہا ہے۔ راتوں کو شکار سے لوٹتے ہوئے میرے جسم کو ہوا، تارے، آسمان اجنبی معلوم ہوتے۔ وہ مجھ میں حلول کر چکا تھا۔ وہ اب بھی میرے اندر زندہ ہے، سانس لے رہا ہے۔

ایک چاندنی رات کو وہ اور میں شکار سے لوٹ رہے تھے۔ جب اصطبلوں کے سبزہ زار میں پہنچے تو رات آدھی جا چکی تھی۔ چاند اپنے پورے جوبن پر تھا۔ ہر طرف گھوڑے کلیلیں کر رہے تھے اور ان کے درمیان سارہ رقص کر رہی تھی۔ اس کے جسم سے شعاعیں پھوٹ رہی تھیں۔ اس کو دیکھ کر میرا دل ڈوب گیا۔ وہ اور میں گھوڑے روکے چاند کے ڈوبنے تک اس منظر کو دیکھتے رہے۔ ہلنے کی سکت نہ اس میں تھی اور نہ مجھ میں۔ جب اس کا

رقص ختم ہوا تو سارہ نے ہمیں دیکھا۔ چاند کی ترچھی کرنوں کی روشنی میں مجھے خیال گزرا کہ اس کے ہونٹوں کے کونوں میں، اس کی آنکھوں کی سیاہ پتلیوں میں، مسکراہٹ ناچ رہی تھی، ایسی مسکراہٹ جس میں فتح کا شعور رچا تھا۔

اس رات کے بعد کسی رات بھی میں آرام سے نہیں سو سکا۔ جب بھی چاندنی راتیں آتیں تو مجھے دل تھامے سارہ کے اٹھنے کا انتظار رہتا مگر وہ گہری نیند سوئی رہتی۔ اس کے تن بدن میں اتھاہ سکون ہوتا اور اس کے چہرے پر انجانی جنت میں آرام کرنے کا تاثر ہوتا۔ مہینوں اسی طرح گزر گئے؟ چاندنی راتیں آتی اور چلی جاتیں، سارہ رات بھر مدہوش سوئے رہتی۔ مالک کا لڑکا ہر دم کھویا کھویا رہنے لگا۔ وہ شکار پر نہ جاتا اور نہ ہی مجھ سے بات کرتا۔ وہ شہر کے ہنگاموں میں اپنے آپ کو مصروف رکھنے لگا۔

اس رات کے چھ سات ماہ بعد اس کی بہن کی شادی ہوئی اور اس کا جشن بڑی دھوم دھام سے کئی دن تک رہا۔ رخصتی کی رات چودھویں کا چاند تھا۔ ہر طرف فضا میں چاندنی تنی ہوئی تھی۔ چاندنی میں اک بے قراری تھی۔ آخر آدھی رات کو رخصتی کا لمحہ آیا، برات کے باجے دردناک نغمے چھیڑتے دولہا کے گھر کی طرف روانہ ہوئے۔ حویلی میں عورتوں نے ایک کہرام مچا دیا۔

جب رخصتی کا ہنگامہ ختم ہوا تو سارہ اور مالک کا لڑکا دونوں غائب تھے۔ کئی ماہ کی تلاش کے بعد پتہ چلا کہ مغربی پہاڑوں کے اس پار ایک پہاڑی گاؤں میں وہ دونوں رہ رہے ہیں۔ جب وہاں ان کا تعاقب کیا گیا تو وہ وہاں سے کھسک گئے۔ مالک نے بیٹے کا تعاقب کیا۔ ایک رات ہم نے ان کو ایک غیر آباد گاؤں میں ایک کچے مکان میں سوتے میں جا لیا۔ جب ہم گھر کے قریب پہنچے تو مشرق میں ستائیسویں کا منحنی سا چاند طلوع ہوا اور میرا سیاہ گھوڑا پھیکی، اداس چاندنی کو اندھیرے سے نبرد آزما دیکھ کر ہنہنایا۔ اس کے ہنہنانے سے سونے والے جاگ اٹھے۔ فضا میں دو بار گولی کا دھماکہ ہوا اور پھر ہر طرف خاموشی چھا گئی۔ جب ہم کوٹھے پر پہنچے تو دونوں دم توڑ رہے تھے۔ ہم کو دیکھ کر دونوں نے آنکھیں موند لیں اور جان دے دی۔ دونوں کے چہرے پر عجب غضب کا حسن اور ولولہ تھا اور اس ولولے میں مراقبے

کی سی کیفیت تھی جیسے کہ دونوں نے اپنی معراج کو پالیا ہو اور اب کسی شے کی آرزو نہ رہی ہو۔ میرے دل میں عجب طرح کا سکون چھا گیا جو نفرت اور غصے کے جذبات سے بالکل عاری تھا۔

بیٹے کی موت کا صدمہ مالک کو بہت تھا مگر اس میں اک شرمساری بھی تھی جو اس کو مجھ سے آنکھ ملانے سے روکتی تھی۔ اس شرمساری کے اور موت کے صدمے کے سبب اس کا دل گھوڑوں سے اچاٹ ہو گیا۔ شکار پر جانا خواب ہو گیا مگر اپنی بنائی ہوئی روایت کو قائم رکھنے کی خاطر اس نے اصطبلوں کو قائم رکھا۔ افسر آتے رہے، شکار کھیلتے رہے۔ ان کے ساتھ صداقت علی کبھی نہ گیا۔ کسی نہ کسی بیٹے کو ساتھ جانے کا حکم مل جاتا۔ میں تو بہر حال ساتھ رہتا۔ جوان اور لائق بیٹے کی موت کے ستم سال بھر سے زیادہ نہ سہہ سکا اور چل بسا۔

چند برسوں تو بیٹوں نے باپ کی روایت کو قائم رکھا، مگر ان کو گھوڑوں سے محبت نہ تھی، شکار کا شوق نہ تھا، روپے کی محبت تھی، کاروبار کی محبت تھی۔ انہوں نے گھوڑے بیچ دیئے۔ میں وہاں سے رخصت ہو آیا۔ برسوں شہر شہر کی خاک چھانتا پھرا۔ کہیں دل نہ لگا۔ بھائی نے یہاں چلے آنے کی دعوت دی تو چلا آیا۔ برسوں سے یہاں ہوں۔ جو ولی پور میں کمایا تھا وہ محفوظ ہے۔ لہٰذا روزگار کے فکر سے فارغ ہوں۔

یادیں تمام رات سونے نہیں دیتیں۔ نور سے لگاؤ ہو گیا ہے، نور زندگی میں دلچسپی کا باعث ہے......''

وہ بولتے بولتے تھک گیا تھا۔ بھولے ہوئے دکھ درد لوٹ آئے تھے۔ بھلائے ہوئے حسین لمحے ایک بار پھر جوان ہو گئے تھے۔ اسے سینہ تنگ معلوم ہونے لگا۔ وہ آہستہ آہستہ سانس لینے لگا جیسے بڑی تکلیف میں ہو۔

''میں نے یہاں آ کر اکثر سوچا ہے کہ اگر سارہ میں شہر جانے کی آرزو نہ ہوتی تو ہم اپنے ننھے سے سنہرے گاؤں میں کتنے خوش رہتے۔ کبھی خیال آتا ہے کہ کیسے خوش رہ سکتے تھے؟ گاؤں میں زندگی بہت ہی محدود ہوتی ہے۔ جلد وہ لمحہ آ جاتا جب سارہ اور مجھ میں سب باتیں ختم ہو جاتیں۔ پھر زندہ رہنے کی کشمکش رہ جاتی۔ میں دن بھر ہل چلاتا یا رہٹ کی گھومتی

نشست پر پڑا اونگھتا رہتا۔ سارہ کھانا پکاتی، کپڑے سیتی، بچوں کی (اگر ہوتے تو) دیکھ بھال کرتی اور دوپہر کو کھانا لے کر کھیتوں میں چلی آتی۔ ہم دونوں کی زندگی کے مرکز بدل جاتے، محور بدل جاتے۔ وہ بچوں میں محو رہتی، میں کھیتوں میں، بیلوں میں، کنوئیں کے بہتے پانی میں۔ دن رات میں، چند لمحے ہماری زندگی مل کر چلتی اور بس۔

کسان کی زندگی کا جہان کتنا تنگ ہوتا ہے، مجھے اکثر خیال آتا ہے۔ اس کی زندگی کائنات کی ہر حرکت کے ساتھ بندھی ہے۔ وہ زمین اور آسمان کی زندگیوں میں ایک ضروری موڑ ہے۔ اس کی زندگی کائنات کے تغیر و تبدل کے ساتھ ہم آہنگ ہے۔ صبح کے ساتھ اٹھتا ہے اور کبھی اس سے بھی پہلے، آسمان کی حالت پر نظر ڈال کر مطمئن یا پریشان ہو جاتا ہے۔ وہ دھوپ کو اپنے خون میں حل کرتا ہے اور اپنے پسینے سے زمین کو سیراب کرتا ہے۔ راتوں تاروں کی چھاؤں میں کھیتوں کی زمین کو پانی سے نہال کرتا ہے۔ اس کا سانس دھرتی کے سانس کے ساتھ مل کر اک ایسا نغمہ پیدا کرتا ہے جو زمین کو سہلاتا ہے اور وہ اس کے لیے فصلیں جنتی ہے۔ اس کی زندگی زمین کے ساتھ بندھی ہے۔ زمین مردہ ہو جائے تو وہ بھی مردہ ہو جاتا ہے۔

شہر کی زندگی میں انسان مظاہر فطرت کے اثر سے اپنے آپ کو آزاد کر لیتا ہے، تنہا ہو جاتا ہے، اس پر اندر کی زندگی کھلنے لگتی ہے۔ شہر میں ایک نئی نویلی روح ہر دم رنگ بدلتی رہتی ہے مگر یہ روح اداس کرتی ہے، بے آفاق وسعتیں انسان پر مسلط کر دیتی ہے۔

کاش شہر اور دیہات کی زندگیوں میں ملاپ ہو سکتا۔ ہم فطرت سے ہم آہنگ بھی ہوتے اور اس کے عوامل میں بندھے ہوئے بھی نہ رہتے اور ہمارے اندر اور باہر ایک ایسا ملاپ ہوتا جو مختلف فصلوں کے کھیتوں میں ہوتا ہے۔ وہ ایک دوسرے کو قوت بخشتے ہیں، ایک دوسرے کو نصیب کرتے ہیں۔ ایسا ہو سکنا کیا انسان کے لیے واقعی مشکل ہے؟''

وہ چپ ہو گیا۔ اس کو اب کچھ نہ کہنا تھا۔ اس کو قرار آ گیا تھا۔

''بابا! بڑی دانائی ہے تمہاری باتوں میں۔ کہاں سیکھی تم نے یہ دانائی۔''

''سارہ کے محبوب سے میں نے بہت کچھ سیکھا ہے۔ اس کی باتیں پہلے پہل تو میری

سمجھ میں نہ آتی تھیں۔ جب اس کو اس کا احساس ہوا تو وہ اپنی باتوں کا تانا بانا مظاہرِ فطرت کے عوامل اور گھوڑوں کی حرکات سے تیار کرنے لگا۔ اس کا علم میرے تجربے میں حل ہونے لگا مگر میرا تجربہ، افسوس صد افسوس، اس کے لیے علم کی شکل اختیار نہ کرسکا۔ شاید وہ زندگی سے بہت زیادہ حسن کا خواہاں تھا اور خود اپنے آپ سے وہ معجزوں کا طلبگار تھا مگر روزمرہ کی زندگی معجزہ نہیں۔ اس کو روزمرہ کی زندگی قبول نہ تھی۔ وہ ہر لمحے کو غیر معمولی بنا دینے پر ہر دم تُلا رہتا تھا۔ اس کی زندگی میں سارہ غیر معمولی کا روپ تھی۔ اگر اس کا باپ اس کا تعاقب نہ کرتا تو شاید وہ غیر معمولی کو روزمرہ بنانے میں کامیاب ہو جاتا۔ کبھی کبھی مجھے اس کی زندگی پر، اس کے انجام پر رشک آتا ہے۔ اس کی زندگی کو غیر معمولی بنانے کا موقع ملا اور وہ اس کے لیے جان پر کھیل گیا۔ کتنا دلیر جواں مرد تھا وہ۔

میں نے اکثر سوچا ہے کہ میری یادوں میں اس کے علم کا خون رواں ہے۔ میرا جسم میرے تجربے کا امین ہے اور میرا دل سارہ کی آرزوؤں کا محافظ ہے اور میرا ذہن اس کے محبوب کے خیالات کا روپ بن چکا ہے۔ میرے جسم، میرے دل اور میرے ذہن کی زندگیاں الگ دائروں میں بند ہیں، ان میں کوئی رشتہ نہیں۔ میں نے ان دائروں کو توڑ کر ایک کرنے کی اور ان سب میں ملاپ پیدا کرنے اور ان سے زندگی کی نئی نئی، موصل منزلوں کی تخلیق کی بہت کوشش کی ہے مگر کامیابی کا حسین چہرہ نظروں سے اوجھل ہی رہا۔ میں ایک کسان ہوں، دانا انسان نہیں بن سکتا۔ اگرچہ گاؤں میں پیدا ہوا ہوں، مجھے شہر کی ہوا لگ گئی ہے۔ دونوں میں ملاپ نہیں کرا سکا۔ میں اپنے مرکز سے ہٹا ہوا، اپنے محور سے گمراہ ایک سیارہ ہوں۔ میری زندگی ایک دم دار ستارہ ہے جس کا کوئی محور نہیں، جس کی کوئی منزل نہیں۔''

دلاور خان نے جھک کر نور کے پاؤں سے گھونگھرو کھولے، طبل اٹھایا اور فردوس سے الوداع کہے بغیر، نور کی گردن میں بانہہ ڈالے اس سے رخصت ہو گیا۔

فردوس بھی اپنے خیالات سے چونکی۔ اس کو خیال آیا کہ متین صاحب اس وقت کہاں ہوں گے۔ وہ کہاں تھے؟ اس کا دل پکار اٹھا۔ وہ سبزہ زار سے گھر کی طرف مڑی اور تیز تیز

قدم اٹھاتی ہوئی سڑک کو طے کرتی ہوئی گھر کے جنوبی صحن میں داخل ہوگئی۔ صحن میں اندھیرا تھا، کمروں کے درمیان والی گلی میں اندھیرا تھا۔ جب وہ بیٹھنے کے کمرے میں پہنچی تو بلوریں دیوار ڈوبتے ہوئے چاند کی آخری کرنوں سے دمک رہی تھی۔ کمرے میں ایک دمکتا ہوا دھندلکا سا تھا۔ اس کی نظروں نے متین صاحب کو تلاش کیا۔ وہ ایک صوفے پر، جو بلوریں دیوار کی طرف کمر کئے پڑا تھا، سوئے ہوئے تھے۔ وہ ان کے قریب گئی۔ اس نے غور سے ان کے چہرے کو دیکھا۔ ان کے چہرے کی جلد میں بہت سا خون دوڑ رہا تھا۔ شاید وہ نیند میں کچھ سوچ رہے تھے۔ وہ مسکرائی کہ یہ لوگ کیسے ہیں جو نیند میں بھی سوچتے رہتے ہیں۔

وہ کیا سوچتے ہیں، اس کو خیال آیا۔ وہ ان کے پاس زمین پر بچھے ہوئے قالین پر بیٹھ گئی اور ان کے چہرے کے اتار چڑھاؤ کو دیکھنے لگی۔ اس پر غنودگی چھانے لگی، وہ تازہ دم محسوس کرتے ہوئے بھی تھک گئی تھی۔ وہ صوفے پر متین صاحب کے سینے کے قریب سر رکھ کر ستانے لگی۔ اس کے ذہن، دل اور جسم نے اس کو نینداور مستقبل کے سپرد کر دیا۔ وہ بے خطر اور آسودہ ہو کر سو گئی۔

چوتھا باب

تقی جب سے شہر سے لوٹ کر آیا تھا وہ بدل چکا تھا۔ وہ عالمہ کے بچپن کا ساتھی، اس کا غمگسار، اس کی کھیلوں، اس کی تنہائی کا شریک، اس کے سفرِ علم کا رفیق، اس کا بے نیاز اور رعنا منگیتر، اس حد تک بدل چکا تھا کہ عالمہ کو کئی بار خیال آتا کہ شاید وہ برسوں سے بدل رہا تھا اور وہ خود اپنے خیالات، جذبات، سنسنیوں میں اتنی محو، اتنی ڈوبی، رہی تھی کہ اس کی آہستہ خرام تبدیلی کو محسوس نہ کر سکی تھی۔ مگر اس کا دل، اس کا ذہن، اس کے حواس، اس امکان کو قبول کرنے کے لیے تیار نہ تھے۔ وہ بضد تھے کہ تبدیلی یکا یک آئی ہے۔ شاید اس کی اپنی علالت کی خبر نے تقی کو حیران اور پریشان کر دیا تھا؟ متین صاحب کی صحبت نے اس کی شخصیت پر اثر ڈالا ہے جس سے اس کی شخصیت کے اجزا بکھرنے لگے تھے؟ اگر ایسا ہی تھا تو شخصیت کے

ذروں کا انتشار کب ختم ہوگا؟ ان ذروں کو پھر نئے رشتوں میں جمع کرنا ممکن ہوگا کہ نہیں؟ اگر ایسا ہوگیا تو اس میں اور تقی میں رشتے کی نوعیت کیا ہوگی؟ وہ اس کے ساتھ شادی کا رشتہ نہ رکھتے ہوئے بھی اس رشتے کو برقرار رکھنا چاہتی تھی جس کی جڑیں ان دونوں کے بچپن میں پیوست تھیں، جس میں ابھی بھی ان کے بچپن اور عہد نوجوانی کا رس رواں تھا۔ اس کا جسم، اس کا ذہن، اس کا دل، اس کی شخصیت کا ذرہ ذرہ اب بھی تقی کے جسم، ذہن، دل اور تخیل کی راہوں اور اڑانوں میں اس کا شریک تھا۔ تقی کی نظریں اب بھی اس کے جسم میں سنسنی کی کیفیت پیدا کرتی تھیں۔ اس کی آواز اب بھی اس کے دل کی گہرائیوں میں اتر اتر جاتی تھی، ان کو سہلاتی تھی۔ اس کے ہاتھ اب بھی تقی کے چہرے کو چھونے، سہلانے کے لیے مچلتے تھے۔ اس کے کان اب بھی تقی کے قدموں کی چاپ کو سن کر سارے جسم کو تقی کی طرف متوجہ کر دینے پر قادر تھے۔ تقی کو اپنی طرف متوجہ ہوکر باتیں کرتے ہوئے سن کر اب بھی اس کے پیڑو میں نئی گہرائیاں پیدا ہو جاتی تھیں، نئے چشمے ابلنے لگتے تھے۔ اس کو اب بھی محسوس ہوتا تھا کہ تقی ایک سورج ہے جس کی ساری حدت اس کے پیڑو میں اتر رہی ہے۔

مگر اس کی ذات کی گہرائیوں، وسعتوں کے آفاق سے، اس پر نازل ہوتا تھا کہ تقی اس کا زوج نہیں، اس کے جسم، اس کی جنس کا شریک اور رفیق نہیں؛ اس کو اپنے رفیق، شریک اور زوج کی تلاش کرنی ہوگی اور رات اور دن کی طرح، جو ایک دوسرے کو اپنی بغل میں لینے کے لیے ہر دم کوشاں رہتے ہیں اور لمحے بھر کے لیے کامیاب ہو کر بھی ناکام رہتے ہیں۔ شاید ابد تک انتظار کرنا پڑے۔

اس کی ساری شخصیت یہ جان لینے پر مُصر تھی کہ تقی میں اس تبدیلی کا باعث کیا تھا۔ اس کی علالت؟ اس کی اپنی درخواست کہ تقی اس کو منگنی کے رشتے سے آزاد کر دے اور اس کو اپنی بیوی بنانے کے حق سے دستبردار ہو جائے؟ متین صاحب کا خاموش اور دور رس اثر، اس تبدیلی کا سبب بن سکنے کا امکان رکھتے ہوئے بھی اس تبدیلی کا باعث نہ تھا، عالمہ کو یقین تھا۔ اس کو پچھلے کئی دن سے گمان ہونے لگا تھا کہ فردوس کی ذات، جو فردوس کی شخصیت پر بھی

ابھی وا نہ ہوئی تھی، تقی کی ذات کی تاریکیوں میں رچنے لگی ہے اور اب اس کی روشنیوں میں بھی رچا چاہتی ہے۔ فردوس کی ساری شخصیت متین صاحب کے گرداگرد رقص کرنے میں اتنی محو تھی کہ اس کو ذرہ بھر احساس نہ تھا کہ کون اس کی ذات میں ہر دم رچتا چلا جا رہا ہے۔

تقی کی ذات کا فردوس کی ذات سے سامنا اور ان دونوں کا ملاپ اور رچاؤ اس کے لیے ایک اذیت ناک اور فرحت خلق عمل تھا جس کی ایک ایک منزل کا اس کو شعور تھا مگر اس کے باوجود اس کی شخصیت میں ایک سکون آور خاموشی چھا رہی تھی، رچ رہی تھی۔ اس کو سکون آور خاموشی میں سے اپنے اندر ایک ایسی نظر پیدا ہوتے محسوس ہو رہی تھی جس سے دوسروں کی شخصیت کے نہاں خانے، ذات کی گہرائیاں، تاریکیاں، روشنیاں، وسعتیں، آفاق اس پر واضح ہو رہے تھے۔ وہ اس ہمہ گیر، تاریکی تسخیر، روشنی دوست، نظر سے ڈرنے لگی تھی اگرچہ اس ڈر میں ایک اتھاہ خوشی کا جذبہ بھی ٹھاٹھیں مارتا ہوا محسوس ہوتا تھا۔ دوسروں کی معیت میں اس کی شخصیت اس ہمہ گیر نظر کے پس منظر میں گم ہو جاتی اور اس نظر کی روشنی میں نظر آنے والے نہاں خانے اپنی عریانی سے اس کو وجد میں لے آتے تو اس کے پیڑو میں ویسی ہی حدت رچنے لگتی، ویسے ہی چشمے ابلنے لگتے، ویسی ہی گیرائیاں پیدا ہو جاتیں، جیسی تقی کے متوجہ ہو کر اس سے گفتگو کرنے سے ہوتیں۔ تقی کی گفتگو، اس کی شخصیت اور ذات اور اس نظر میں کیا رشتہ تھا کہ ان میں اتنی گہری مماثلت تھی؟

کبھی کبھی اس کو گماں گزرتا، احساس ہوتا کہ یہ نظر متین صاحب کی ذات کی نظر ہے جو اس کی اپنی ذات کی گہرائیوں سے ابھر آئی ہے؛ دوسروں کی معیت میں ان پر جو حالت طاری ہو جاتی ہے، بلکہ جو حالت وہ اپنے گرداگرد پیدا کر لیتے ہیں، ویسی ہی حالت اس کی شخصیت پر چھا جاتی ہے اور ان کے پرسکون، بے حرکت مگر زندہ، چہرے میں ابھرتی ہوئی ان کی اجلی اجلی سیاہ پتلیوں میں روشنی کی طرح رچتی ہوئی نظر اس کی آنکھوں سے بچتی ہوئی، اس کے غیر شعور کی اندھیری راہوں سے ہوتی ہوئی نظر بن جاتی ہے۔ اس معجزے پر اس کو حیرت اور جھنجھلاہٹ ہوتی کیونکہ وہ ہر شے کو اپنی نظر سے دیکھنا چاہتی تھی، اپنے روئیں روئیں سے محسوس کرنا چاہتی تھی۔ مگر پھر بھی ایسا کیوں؟ اس کیوں کا جواب اس کو کہیں سے نہ

ملتا۔ وہ رات رات بھر بستر پر کمر کے بل لیٹے جاگتی رہتی۔مگر اس جاگنے سے اس کو تھکن نہ ہوتی بلکہ اس کو صبح اٹھ کر نئی قوت کا احساس اپنی جان اور اپنے جسم میں ہوتا۔دن بھر وہ اپنے کام روزمرہ کی دلجمعی سے کرتی جس کی برسوں سے وہ عادی تھی مگر پھر بھی اس کو محسوس ہوتا کہ اس کے اندر ایک نئی شخصیت، اس شخصیت سے الگ جو دلجمعی سے روزمرہ کے کاموں میں لگی ہے، کسی سوچ میں، کسی انوکھے سفر میں سرگرداں ہے۔دونوں شخصیتیں اپنی اپنی راہ پر، اپنے اپنے سفر پر، ایک دوسری کا شعور رکھتے ہوئے، مگر بے نیاز، گامزن ہیں۔اس کے لیے یہ بالکل نیا تجربہ تھا۔

اس کو کبھی کبھی خیال آتا کہ شاید اس عورت کو بھی ایسا ہی محسوس ہوتا ہوگا جس کے پیٹ میں بچہ حرکت کرتا ہے۔مگر وہ اس خیال سے اتفاق نہ کر پاتی کیونکہ اس کا یقین تھا کہ بچے کی پیٹ میں حرکت جسم اور جذبات کو متاثر کرتی ہوگی مگر یہ دوسری شخصیت اس کے جسم اور جذبات کو متاثر نہ کرتے ہوئے بھی اس کی اتھاہ گہرائیوں اور اس کے تخیل کی وسعتوں کو، اس کی وسعتوں سے ماوراء کو بھی متاثر کرتی محسوس ہوتی تھی۔

اس کو کبھی کبھی تو یقین ہونے لگتا کہ وہ انسان کی وسعتوں، بلندیوں، پنہائیوں اور گہرائیوں سے ماورا ہوگئی ہے، انسان کے تمام امکان، اس کی تمام امکانی صلاحیتیں، اس کو عطا ہو گئے ہیں اور وہ اپنے لئے نئے جہاں، نئی کائنات کے طلبگار ہیں، اور وہ ان کو مہیا کرنے سے عاجز ہے، مگر یہ عجز اس کے اندر اداسی پیدا نہیں کرتا، مایوسی کو جنم نہیں دیتا، تنگی کا احساس نہیں دلاتا۔

اپنے اندر نئی جہت کا رچاؤ اس کے لیے اسرار بننے لگا اور اس اسرار کے تصور سے اس کو ایک سرور سا آنے لگا۔ یہ سرور ہر دم اس کا ساتھی بنا رہنے لگا۔

جب زروان اور متین صاحب کا سامنا ہوا تو اس نے محسوس کیا کہ اس کی روزمرہ کی شخصیت اس سے ہمیشہ ہمیشہ کے لیے رخصت ہوگئی ہے اور اس کی نئی شخصیت اس کی ذات میں سے افرودیتی کے جنم کی طرح ابھر آئی ہے۔ان دونوں کی گفتگو سے اس کی نئی شخصیت کے نہاں خانے اس پر کھلنے لگے، اس نئے جہاں اور اس نئی کائنات کے وہ مناظر اس پر عیاں

ہونے لگے جس کی اس کی نئی شخصیت طلب گار تھی۔

اس نئے جہاں اور کائنات کی جو راہیں اور جو مناظر اس پر عیاں ہوئے تھے ان پر تقی نہ تھا، فردوس نہ تھی، متین صاحب نہ تھے، جمیل صاحب اور رابعہ نہ تھے؛ اس کی ماں، اس کا باپ، اس کے رشتے دار، اس کے گاؤں کے لوگ، اس کے گاؤں کے جانور، اس کے گاؤں میں بدلتے موسموں میں چہچانے والے پرندے نہ تھے؛ سرسراتی ہوئی، گیت بنتی ہوئی ہوا نہ تھی، درختوں کے درمیان، درختوں کے سائے میں بل کھاتے ہوئے، آفاق میں جذب ہوتے ہوئے رستے نہ تھے۔ وہ اس جہاں میں، اس کائنات میں اجنبی تھی، اکیلی تھی؛ آغاز اور انجام سے ناآشنا تھی؛ اس کو سفر کی، منزل کی آرزو نہ تھی؛ وہ تو اس جہاں اور کائنات کے مناظر سے آشنا ہو سکنے کی، مہلت کی طلب گار تھی۔

سفید مربعوں اور سیاہ مستطیلوں سے چنے فرش پر جھولتی ہوئی چاندنی میں فردوس کا تنہا تنہا، الگ الگ، طوفان کے بعد ساحل پر لہروں کے سہارے آ پڑی ہوئی اوندھی کشتی کی طرح سفر اور منزل سے بے نیاز، اپنے آپ میں گم، وجود اس سے اس نظر کو بروئے کار لانے کا طلبگار رہا جو نظر متین صاحب کی اجلی اجلی سیاہ پتلیوں میں سے اس کے غیر شعور کی اندھیری راہوں سے ہوتی اس کی آنکھوں کا وصف بن جاتی تھی مگر وہ نظر اس سے بے اعتنا رہی اور اس کی آنکھوں کا وصف نہ بن سکی۔ اس بے اعتنائی پر اس کو حیرت ہوئی اور جھنجھلاہٹ۔ فردوس کا وجود مسلسل اس سے توجہ کا طلبگار رہا۔ فضا میں جھولتی ہوئی چاندنی، مختلف سمتوں سے آتے ہوئے سفید اور بھورے دریا، بلند درختوں کی لہراتی ہوئی پھننگیں، دور تک پھیلے ہوئے، کھڑی فصلوں سے بھرپور کھیت، دونوں دریاؤں کے ملاپ سے پیدا ہونے والا جھاگ، پتھروں سے ٹکرا ٹکرا کر اڑتا ہوا جھالا، جنوب میں اونچے اونچے درختوں کے درمیاں وسیع سبزہ زار جس میں چاندنی محوِ خواب تھی، اس کی نظر کو اپنی طرف متوجہ کرنے پر بضد تھے۔ آہستہ خرام ہوا کی سرگوشیاں اس کے کانوں میں نئی انوکھی موسیقی جگا رہی تھیں، اس کا جسم ہوا کے لمس سے پوری طرح بیدار ہو رہا تھا، متین صاحب کی پلکوں کے پیچھے چھپی ہوئی، مگر خبردار آنکھیں، اس کے تخیل کو، اس کے شعور کی عیاں اور پنہاں صلاحیتوں کو، اکسا

رہی تھیں، اس کی توجہ اتنی سطحوں پر مصروفِ عمل تھی کہ وہ فردوس کی تنہائی اور اکیلے پن کی ویرانی کا شعور رکھتے ہوئے بھی اس کی طرف متوجہ نہ ہو سکی۔

یکا یک جب متین صاحب نے اس سے کسی گیت کی فرمائش کی تو اس کے ذہن میں کوند گیا کہ وہ گیت کے ذریعے فردوس کی طرف توجہ کو مائل کر سکے گی۔ اس کی تنہائی اور اکیلے پن کی ویرانی میں شریک ہو سکے گی اور اس طرح اس ہمدردی کا اس کو احساس دلا سکے گی جس کی اس لمحے اس کو ضرورت تھی۔ اس نے اپنی پوری شخصیت بلکہ ذات کی تمام صلاحیتوں کی کارفرمائی سے گایا۔ یہ نغمہ اس نے بچپن میں ایک رات اپنے باپ کے ساتھ اپنے چھوٹے سے تانگے پر اپنی بیمار پھوپھی کی تیمارداری کر کے آتے ہوئے، نیم بیداری کے عالم میں، ایک اجنبی گاؤں میں سنا تھا۔ اس لمحے وہ گیت اس کے دل پر نقش ہو گیا اور اس کی لے اس کے کانوں میں بس گئی۔ اس گیت کو وہ کبھی بھی بلند آواز میں گانے کی جرأت نہ کر سکی جیسے کہ ایسا کرنے سے کسی کا راز افشا ہو جانے کا ڈر ہو اگر چہ اس نے اس گیت کو رات کی تنہائیوں میں کئی بار خاموشی سے تخیل ہی تخیل میں گایا تھا۔ ہر بار اس گیت کے گانے سے اس کا دل اداسی کے جال سے نکل آیا تھا۔ فردوس کی خاطر اس گیت کو گاتے ہوئے اس نے محسوس کیا کہ گیت ایک چراغ تھا جس کی روشنی میں وہ فروس کے دل میں، ذہن میں، تخیل میں جنم پانے والے خیالات، جذبات، آرزوؤں کو دیکھ سکتی تھی، ان کی نوعیت اور ماہیت کو سمجھ سکتی تھی۔ اس نے محسوس کیا کہ فردوس کو متین صاحب سے بے پناہ عشق ہے، متین صاحب کے حواس، جسم، ذہن، دل اور تخیل فردوس کی شخصیت سے بے حد متاثر تھے مگر وہ ان کی روح پر اثر انداز نہ تھی۔ متین صاحب فردوس کے عشق کا جواب عشق میں دیتے ہوئے بھی فردوس سے زوجیت کے تعلقات قائم کرنے پر راضی نہ تھے۔ اس کے ذہن نے اس کو سمجھایا کہ بالکل اسی طرح جس طرح وہ خود تقی سے زوجیت کے تعلقات قائم کرنے پر اپنی روح کو راضی نہ کر سکی تھی۔ اس کے دل نے اس سے کہا کہ فردوس کے عشق میں ایک گہرے سمندری طوفان کی سی کیفیت تھی مگر اس کے اور تقی کے تعلقات میں سورج اور ٹھٹھرتے ہوئے جسم کا سا تعلق تھا۔

اس لمحے گاتے ہوئے اس کا دل فردوس کی طرف مائل ہو گیا اور اس کا جی چاہنے لگا کہ وہ فردوس کو سینے سے لگا لے اور اس کو بتائے کہ ان دونوں کے ساتھ ایک سا واقعہ پیش آیا ہے، ان دونوں کو ایک ہی منزل سے اپنے سفر کا آغاز کرنا ہے اور ان کے سفر کا مقصد بھی ایک سا ہی ہے: زوج کی تلاش -- مگر جذبات کا زبان سے اظہار نہ کرنے کی برسوں کی عادت اس کی راہ میں حائل ہو گئی۔ جب اس سے خود فردوس نے ہی ایک اور گیت کی فرمائش کی تو اس نے محسوس کیا کہ وہ اپنے دل کی بات فردوس کے دل تک گیت کے ذریعے پہنچا سکتی ہے۔ جب تک وہ دوسرا گیت گاتی رہی وہ محسوس کرتی رہی کہ فردوس اور متین صاحب میں رشتے کی نوعیت بدل رہی ہے، فردوس کا جسم، ذہن، دل، تخیل متین صاحب کے عشق کے رشتے سے آہستہ آہستہ آزاد ہو رہے ہیں۔ جب اس نے گیت ختم کیا تو اس کے دل میں یقین پیدا ہوا کہ اب اس لمحے کے بعد فردوس اور متین صاحب عشق کے رشتوں سے آزاد ہونے کے سفر کا آغاز کر چکے ہیں۔

وہ سب کے ساتھ بامِ بلند سے اتر آئی۔ تقی اس کو اس کے کمرے کے دروازے پر الوداع کہہ کر، اپنے خیالات میں محو، اپنے کمرے کی طرف چل دیا۔ وہ دروازے پر کھڑی اس کو کمرے کا دروازہ کھولتے، داخل ہوتے، داخل ہو کر کواڑ بند کرتے دیکھتی رہی۔ جب تقی نظروں سے اوجھل ہو گیا تو اس کے دل کو ایک دھچکا سا لگا جیسے تقی کو اس کے ساتھ اس کے کمرے میں آنا چاہیے تھا اور وہ نہ آیا تھا۔ اس کو اس احساس پر حیرانی سی ہوئی۔ کیا اس کی خواہش تھی کہ تقی اس کے ساتھ کمرے میں رات بسر کرتا؟ کیسے رات بسر کرتا؟ اس نے دل سے سوال کیا اور جواب کے لیے مُصر ہوئی۔ اس سوال پر اس کو دل میں ذرہ بھر بھی شرمساری نہ ہوئی۔ ایک ہی کمرے میں پاس پاس لیٹے لیٹے ایک دوسرے کے تنفس کی لے کو محسوس کرتے ہوئے شاید اس کا سینہ بچھڑے ہوئے جذبات سے بھر جاتا اور وہ تقی کے سینے پر سر رکھے روتی رہتی، روتی رہتی۔ پھر کیا ہوتا؟ اس نے دل سے طنزاً سوال کیا۔ وہی ہوتا جو ہونا ہی چاہیے! دل نے جواب دیا۔ کیا ہونا چاہیے؟ اس نے پوچھا۔ وصل! دل نے نعرہ لگایا۔ اس نے بستر پر لیٹ کر اپنے آپ پر غور سے نظر ڈالی؛ اپنے جذبات کا، جسم کی سنسنیوں کا،

آرزوؤں کا، تخیل میں جنم لینے والے خیالات کا کڑا جائزہ لیا۔ وصل کے تصور سے اس کا روں رواں وجد میں آ گیا،اس کے جسم کا ذرہ ذرہ تقی کے لمس کے لیے مچلنے لگا،مگر کہیں دور، بہت دور یا شاید کہیں گہرائی میں چھپی ایک شخصیت اس مچلنے پر، روئیں روئیں کے وجد پر، مسکرا رہی تھی یا شاید بالکل بے نیاز کسی دور کی منزل کو دیکھنے میں مصروف تھی۔ اس کے جسم، اس کے دل، اس کی جنس نے اس کو لاکھ سمجھایا کہ اس وصل کے باوجود وہ اپنے اصلی زوج کی تلاش کو جاری رکھ سکتی ہے مگر ان کا سمجھانا اس کو قائل نہ کر سکا۔ اس تصور کو ہی اس نے اپنے جسم اور اپنے مقدر کی توہین جانا۔ مگر اس کے جسم نے، اس کے دل نے، اس کے ذہن نے، اس کے تخیل نے اس کو للکارا کہ وہ ثابت کرے کہ اس کے تن بدن میں، اس کے خون میں، تقی سے وصل کی خواہش نہ تھی، کہ وہ آئینے کے سامنے کھڑے ہو کر آئینے میں اپنی نظروں میں جھلکتی ہوئی، اپنے سینے کی پھڑ پھڑاہٹ میں چھپی ہوئی، اپنے ہونٹوں میں مچلتی ہوئی، تقی کے جسم کے گہرے لمس کی آرزو کو جھٹلانے کی جرأت کرے گی۔ اس نے اس چنوتی کو قبول کرتے ہوئے بھی اپنے آپ کو سمجھایا کہ ہر آرزو کا پورا کرنا ضروری نہیں، وصل اسی سے لازم ہے جو اس کا صحیح زوج ہو، اگرچہ وہ اس زوج سے آشنا نہیں ہے۔ وصل میں اگر وہ اپنی پوری شخصیت اور ذات سے شریک نہ ہو، جیسا کہ تقی کے ساتھ جنسی وصل میں ہوتا، تو اس کی شخصیت اور ذات میں اپنے لئے نفرت، حقارت اور کراہت کے جذبات بیدار ہو جائیں گے اور پھر ان سے پیچھا چھڑانا عمر بھر کے لیے مشکل ہو جائے گا۔

کروٹیں بدلتے بدلتے اس وصل کا خیال اس کو ستاتا رہا۔ اس کی ذات کی گہرائیوں میں اس خیال کے خلاف ایک بے پناہ جذبہ ابھرتا اور اس کی نس نس میں رچتا رہا۔ اس کو محسوس ہوا کہ جیسے وہ آرزو کر رہی ہو کہ اس کا جسم دو حصوں میں تقسیم ہو جائے، مرد اور عورت میں اور پھر ان میں جنسی ملاپ ہو۔ اس تصور میں اس کو بزدلی کی بو آئی، زوج کی غیریت سے جنم لینے والی اپنائیت ہی وصل کے رشتے کا سبب بن سکتی ہے، سبب بننا چاہیے، وہ پکارتی رہی۔

تقی اور وہ ایک دوسرے میں ہمیشہ سے اس حد تک جذب رہے تھے کہ اب ان میں

جنسی وصل کا امکان اسی صورت میں تھا کہ ان میں پہلے مکمل غیریت پیدا ہوجاتی، پھر وہ موانست کی منزلیں طے کرتے اور ایک دوسرے کو زوج کی حیثیت سے پہچانتے۔ اس کا ایک ہی مطلب تھا کہ اس لمحے اور اس کے قریبی دنوں میں وصل سے اجتناب کیا جاتا۔

مگر اس کا دل، ذہن، تخیل، جسم اس کو بار بار للکارتے رہے کہ وہ آئینے کے سامنے کھڑے ہوکر اپنی آنکھوں، اپنے پستانوں، پیڑو میں عیاں جذبات کو جھٹلانے کی جرأت کرے۔ مگر اس کو اس چنوتی کو قبول کرنے کے خیال ہی سے متلی ہوجانے کا خطرہ لاحق ہوجاتا۔ وہ دیر تک بستر میں پہلو بدلتی رہی۔

آخر وہ چنوتی کے کچوکے زیادہ دیر تک نہ سہہ سکی۔ وہ جھنجھلا کر اٹھی اور آئینے کے سامنے جا کر اس نے آئینے کے اوپر کا قمقمہ روشن کیا اور اپنے عکس کو گھورنے لگی۔ اس کا سینہ پھڑ پھڑانے لگا۔ اس کی آنکھوں میں ایک مستی تھی جس کو وہ تھکن پر محمول کرنے پر بضد ہوئی۔ اس کے ذہن نے اس سے کہا کہ بے نقاب ہوکر اپنے آپ کو دیکھنے کی جرأت کرو تو تمھیں اپنے جسم پر ہر جا وصل کی آرزو کے نشان ملیں گے۔

اس نے آہستہ آہستہ ہاتھ اٹھا کر قمیص کے پہلوؤں کے بند بٹن کھولے، گریبان کے بٹن کھولے، قمیص کو نہایت شرمساری کی حالت میں اتارا، قمیص کو آئینے کے سامنے پڑی ہوئی گدی دار چوکی پر ڈالا۔ اس نے آئینے میں نظر اٹھا کر دیکھنا چاہا مگر اس کی نگاہیں اوپر اٹھ نہ سکیں۔ اس نے اس سے پہلے کبھی بھی آئینے کے سامنے کھڑے ہونے کی ضرورت ہی محسوس نہ کی تھی۔ اس کو اپنے بدن کو آئینے میں دیکھنے کی آرزو ہمیشہ ہی پوچ معلوم ہوئی تھی۔ صرف نہانے کے لیے وہ بے حجاب ہونا جائز سمجھتی تھی۔ نہاتے ہوئے کئی بار اس نے اپنے جسم کو پیار سے سہلایا تھا۔ مگر آئینے میں اپنے آپ کو بے حجاب دیکھتے ہوئے اس کو ہول ہوا۔ اس نے جی کڑا کر کے آئینے کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر دیکھا۔ اس کی آنکھوں کی مستی اب جھولنے لگی تھی۔ حیا سے اس کا چہرہ اور اس کا بے لباس پیٹ، انگیا میں سے جھانکتا ہوا سینہ، سرخ ہوگیا۔ اسکی آنکھوں کی مستی اس کو للکارنے لگی، اس کو بالکل بے لباس ہوکر اپنے آپ کا سامنا کرنے کی چنوتی دینے لگی۔ اس نے آنکھیں بند کر کے، انگیا کے بند

کھول کر پستانوں کو آزاد کیا، شلوار کا کمر بند کھولا، اس میں سے پاؤں نکال کر پیلے جانگیے کے لچکیلے کمر بند کو دونوں ہاتھوں سے سرین سے نہایت بے دلی سے کھسکایا اور گدی دار چوکی پر بیٹھ کر بہت کرب کی حالت میں جانگیہ اتار دیا۔ اس نے لمبا سانس لیا اور پھر پھرتی سے آئینے کے سامنے تن کر کھڑی ہوگئی۔

اس نے آنکھ کھول کر آئینے میں دیکھا۔ اس کی آنکھوں کے سامنے ایک الاؤ سا بھڑک اٹھا جس سے اس کی آنکھیں چندھیانے لگی۔ اس نے آنکھوں کو بند کر کے پھر سے کھولا، آئینہ میں نظر آنے والی بے لباس صورت کو وہ پہچان نہ سکی۔ آئینے کی آب اور قمقمے کی روشنی سے اجنبی جسم کی آب و تاب پر آنکھ نہ ٹھہرتی تھی۔ اس نے اپنے حواس کو اکٹھا کیا اور مضبوطی سے ان میں یکجائی پیدا کرتے ہوئے اس نے اجنبی جسم کو دیکھا۔ اس نے محسوس کیا کہ وہ کسی اجنبی کے خلوت خانے میں اس کو بے لباس دیکھ رہی ہے۔ ذہن اور تخیل شرمساری کی تصویر بن گئے۔ راضی چہرے پر ایک آگ روشن تھی جس کی روشنی میں ایک تسلسل تھا، وحدت تھی، یکسوئی تھی، اس روشن چہرے پر اک مستی کا عالم انگڑائی لے رہا تھا۔ اس چہرے کی سیاہ چمکدار آنکھوں میں روشنی ایک وجد آور رقص میں مصروف تھی جس سے دھیمی دھمی حدت آنے کا اس کو بار بار احساس ہوتا تھا۔ اس کے گلابی رخساروں پر غضب کی نرمی اور شوخی تھی جس پر آویزوں میں جھولتے ہوئے لعل کی چھوٹوں کی روشنی ہزار فتنے جگا رہی تھی۔ اس کے ہونٹ یاقوتی روغن کی طرح دمک رہے تھے اور ان پر لعاب دہن کی آب ایک نشے کی کیفیت فضا میں بکھیر رہی تھی۔ گلال سی گردن کی پشت پر سیاہ بالوں کے ننھے ننھے کنڈل ڈوبتے سورج کے گرد بڑھی آتی ہوئی رات کا سماں دکھا رہے تھے اور گردن کے نیچے ہڈیوں کا حصار اور اس کے نیچے خوابِ خرگوش سے جاگے ہوئے مگر نیم خوابیدہ گلابی شانے، بانہوں کو انگڑائی کی درخواست کرنے کی سوچ رہے تھے۔ شہوت کی ہلکی ہلکی ہوا سے کسمساتے ہوئے گلابی مدوّر کنولوں پر مدہوش شہد کی مکھیاں اور اس کے نیچے مخملیں سیندوری پیٹ اور اس میں ناف کا نشیب...... عالمہ پر نشہ سا چھا گیا اور اس کو سردی سی لگنے لگی۔ اس نے جھک کر گدی دار چوکی سے اپنی قمیص اٹھا کر کندھوں اور کمر پر

ڈال لی۔ اس نے ایک بار پھر حواس کو جمع کیا اور آئینے میں دیکھا۔ پیڑو پر ہلکے بادامی رنگ کے چمکتے ہوئے بال روشنی میں انگڑائی لے رہے تھے اور پیڑو آہستہ آہستہ سمندر کی سطح کی طرح ہلکورے لے رہا تھا اور اس کے نیچے شفق زا رانیں اور شفق زا رانوں اور ہلکورے کھاتے ہوئے پیڑو کے درمیان ایک دوسرے کے پہلو میں محوِ خواب گلابی ہونٹ۔ اس کا سارا بدن لرز گیا، سرد ہوا اور پھر یکا یک تپ اٹھا۔ اس کے حواس جلنے لگے، اس کا ذہن چکرانے لگا مگر اس نے ہمت کر کے آخری بار اجنبی جسم کو دیکھا۔ شفق میں لپٹے ہوئے جسم سے ایک ہلکا ہلکا غبار فضا میں پھیل رہا تھا۔ اس کے نتھنوں نے، اس کے جسم پر کھڑے بالوں نے، اس غبار کے لمس کو محسوس کیا اور اس کا تنا ہو جسم ڈھیلا پڑ گیا اور وہ دھپ سے چوکی پر گر گئی۔ اس نے رانوں پر کہنیاں رکھ کر آئینے میں بیٹھی ہوئی صورت کو دیکھا۔ اس نے اپنے آپ کو پہچان لیا۔ اس نے اپنے جسم سے اڑتے ہوئے غبار کی ماہیت کو جان لیا۔ شہوت اور جنس سے اس کا آج پہلی بار مقابلہ ہوا تھا۔ ان کے جادو اور سرور سے وہ نہ چاہتے ہوئے بھی دیر تک لطف اندوز ہوتی رہی، ان سے زیر ہوتی رہی، ان پر قابو پاتی رہی، اس تھکن بڑھا لطف میں مدتوں غلطاں رہی۔ آخر اس نے شہوت اور جنس کو رام کر لیا۔ اس نے محسوس کیا کہ جیسے اس نے سفید اور سنہری، حسین اور منہ زور، گھوڑوں کو دوڑا دوڑا کر، تھکا کر، پسینے پسینے کر کے، اپنے ساتھ مانوس کر لیا ہے اور وہ اب اس کے اشاروں کے تابع ہو گئے ہیں۔

اس نے اپنی آئینے میں نظر آتی ہوئی شفق اور شہوت میں لپٹی ہوئی صورت سے سوال کیا کہ کیا وہ واقعی اپنے جسم پر تقی کے ہاتھوں کا، ہونٹوں کا، سینے کا لمس چاہتی تھی۔ اس خیال سے آئینہ دھندلا گیا اور اس کا جسم کانپنے لگا۔ اس نے پوری قوت سے، اپنی تمام صلاحیتوں کو قوتِ سماعت کے تابع کرتے ہوئے، ہمہ تن کان بن کر، جواب سننے کی کوشش کی۔ مگر اس کے کانوں میں خاموشی کے تنفس کی لے کے سوا کوئی صدا نہ آئی۔ اس نے محسوس کیا کہ ابدالآباد گزر رہے ہیں۔ مگر کہیں سے صدا نہ آئی، جواب نہ آیا۔ پھر دھیرے سے، مگر واضح طور پر اس نے سنا کہ اس کے دل، ذہن، تخیل اور جسم نے یک زبان ہو کر کہا ہے: ”نہیں!

نہیں۔'' وہ اپنے جسم کی، تخیل کی، ذہن کی، دل کی شکرگزار ہوئی اور احسان مندی سے اس کا سینہ بھر گیا اور آنسوؤں کا ایک ریلا آیا اور اس کی آنکھوں سے آنسو بہہ نکلے۔ وہ دیر تک چوکی پر بیٹھے، کہنیوں کو رانوں پر جمائے، ہاتھوں میں چہرے کو چھپائے زار وقطار روتی رہی اور اس کا سارا جسم بار بار شدتِ گریہ سے لرزلرز گیا، کانپ کانپ اٹھا۔

جب اس کا جی ہلکا ہوا تو وہ اٹھی، اس نے کپڑے پہنے اور بستر میں جا گھسی۔ وہ سردی میں دیر تک کپکپاتی رہی۔ اس نے لحاف کو اپنے گرد لپیٹ لپیٹ لیا، منہ لحاف میں دے دیا۔ اس اندھیرے میں اس کی آنکھوں کے سامنے دن کی سی روشنی پیدا ہوئی اور اس روشنی میں سے بیتے ہوئے واقعات، بھولی ہوئی یادیں، ہمیشہ یاد آنے والے مناظر، نئی وضاحت اور نئے حسن اور نئے روپ میں اس کی نظروں کے سامنے ابھرنے لگے، جیسے کہر آلود صبح میں ترچھی کرنوں کی روشنی میں ٹھٹھری ہوئی مگر خوابیدہ اشیا، انگڑائی لیتے ہوئے، اپنے اپنے مقام پر جم کر کھڑی ہوتی چلی جائیں۔

برسوں کی سوچ، مشّاق ذوق، منظّم کئے جذبات اور تخیل کی مدد سے ترتیب دیئے ہوئے یادوں کے جہاں میں شدتِ جذبات اور ہر دم بدلتی ہوئی سنسنیوں سے وجود میں آنے والے دھند لکے میں یادوں کی ترتیب کا سیاق وسباق بکھر گیا، پیش منظر کی روشن اور واضح یادیں دھندلا گئیں، ایک اجنبی کہر میں لپٹ گئیں، پس منظر کی غیر اہم یادیں اتنی روشن ہوگئیں کہ ان کے سامنے سب ماند پڑ گیا؛ جن یادوں کو سمجھا بجھا کر برسوں کی کوششوں سے خوابِ عدم کے سپرد کیا تھا وہ یکا یک خواب کی زنجیریں توڑ کر ایک وحشی رقص میں مصروف ہوگئیں، میلی کچیلی یادیں جن کو یادوں کے جہاں سے نکال دیا گیا تھا جو اس جہاں کی سرحدوں پر کسمپرسی کی زندگی بسر کر رہی تھیں اب ایک دم صدر نشین بن بیٹھیں۔

عالمہ نے لاکھ آنکھیں بند کیں، سوچ اور ذوق کو لاکھ حکم صادر کئے مگر یادوں کے جہاں میں نظام بدل چکا تھا، اس کی جگہ ایک نئے نظام نے لے لی تھی جو کسی طرح بھی شدید جدل کے بغیر اقتدار سے دست بردار ہونے کے لیے تیار نہ تھا۔ اس نے تنگ آ کر اس جہاں کو سلانے کی کوشش کی نیند کا جادو چلانے کی کوشش، مگر نیند تھی کہ اس کی پکار سے کوسوں، ابدوں

دور تھی۔طوعاً وکرہاً اس کو یادوں کے جہان کا نیا نظام قبول کرنا ہی پڑا......

بچپن میں جب اس کے شعور نے آنکھ کھولی تو اس کی ماں کے حسن نے اس کو متوجہ کیا۔اس کی ماں بہت حسین تھی۔ وہ دن چڑھے تک سوتی رہتی تھی۔خود اس کی آنکھ پو پھٹتے ہی کھل جایا کرتی تھی اور وہ اٹھ کر اپنی سوئی ہوئی ماں کے حسین خوابیدہ چہرے کو دیکھتی رہتی اور جب ہلکی ہلکی ہوا میں کوئی لٹ اس کی ماں کے چہرے پر بکھر جاتی تو اس کے رقص کو دیکھتی رہتی یا کبھی کبھی لٹ کو پکڑ کر اس سے کھیلتی رہتی۔اس کی ماں کے بال بہت ہی کالے اور ملائم تھے۔جب وہ ماں کے چہرے کو دیکھتے دیکھتے ، ماں کے چہرے پر بکھری ہوئی لٹوں سے کھیلتے کھیلتے بھوک سے نڈھال ہو کر بستر سے اترنے کی سوچنے لگتی تو اس کی ماں اپنی بڑی بڑی آنکھیں کھول دیتی اور اس کو بھوک سے نڈھال دیکھ کر مسکراتی اور اپنی نہایت سریلی اور نیند میں نیم مدہوش آواز میں ملازمہ کو پکارتی۔اس کے جسم سے بھوک کا احساس مٹ جاتا اور وہ ماں کے چہرے پر جھک جاتی اور اس کا منہ چوم لیتی اور کھلکھلا کر ہنسنے لگتی جس پر اس کی ماں اس کو اپنے سینے کی طرف کھینچ لیتی اور وہ ماں کے سخت مگر ملائم اور خوشبودار سینے پر دم سادھے لیٹ جاتی۔ جب ملازمہ ناشتہ لے آتی تو اس کی ماں بستر سے اٹھ کر، پانی میں دایاں ہاتھ بھگو کر اس کا منہ اور آنکھیں صاف کر دیتی اور پانی کا گلاس اس کے منہ کے ساتھ لگا دیتی اور وہ منہ میں پانی بھر لیتی اور پھر پانی کو اچھی طرح دانتوں میں ہرا پھرا کر، گلے میں غرارے کرتے ہوئے پلنگ کے نیچے پڑی ہوئی چلمچی میں پلنگ کی پٹی کے پاس منہ لے جا کر کلی کر دیتی۔غرارے کرتے ہوئے اس کو اپنے گلے کی آواز اتنی بھلی لگتی کہ اس کا جی چاہتا کہ وہ دیر تک غرارے ہی کرتی رہے مگر اکثر پانی اس کے گلے کے اندر اتر جاتا جس سے اس کو لمحے بھر کے لیے یہ سوچ کر کراہت ہوتی کہ میلا پانی اس کے پیٹ میں چلا گیا ہے۔اس پر اس کی ماں کھلکھلا کر ہنس دیتی اور اس کے گال پر ہلکا سا چپت لگا کر کہتی: ''پگلی''۔اس 'پگلی' کے لفظ میں اتنی موسیقی ہوتی کہ اس کا اکثر کلی کرتے ہوئے جی چاہتا کہ وہ سارا پانی نگل جائے اور پھر دیکھے کہ اس کی ماں کیا کہتی ہے۔مگر ہمیشہ وہ یہ سوچ کر کلی کر دیتی کہ اس کی ماں پگلی کی بجائے نجانے کیا کہہ دے جس میں شاید اتنی موسیقی یا شاید بالکل ہی موسیقی نہ ہو۔اس کی

ماں ناشتے کے برتن اس کے سامنے رکھوا دیتی اور اپنے ہاتھ سے ناشتے کے پہلے چند لقمے اس کے منہ میں ڈالتی۔ جب وہ ناشتہ کر لیتی تو اس کو بستر سے نیچے اتار دیتی، اس کو ہاتھ دھوتے دیکھتی اور جب وہ ماں کے کہنے پر باپ کی تلاش میں سونے کے کمرے سے باہر نکل آتی تو اس کی ماں پھر بستر پر لیٹ جاتی اور سو جاتی۔ ہمیشہ آدھ گھنٹے کی نیند کر کے وہ اٹھتی، موسم کی رعایت سے منہ دھوتی یا نہاتی۔ اس کا منہ دھونا یا نہانا ایک لمبا، پہلو دار، عمل ہوتا۔ وہ کبھی چھپ کر دروازے کی دراڑوں میں سے ماں کو منہ دھوتے یا نہاتے دیکھتی۔ منہ دھوتے یا نہاتے اس کی ماں کی حرکات میں ایک عجیب، حسین اور جادو کرتا ہوا سا ٹھہراؤ ہوتا اور ان حرکات میں ایک لے چھپی ہوتی۔ مگر وہ پکڑے جانے کے خیال سے کبھی بھی ماں کے نہانے کے عمل کو پوری طرح سے دیکھ نہ پاتی تھی۔ جب ایک دفعہ نہا دھو کر کپڑے بدل کر، اس کی ماں تیار ہو جاتی تو گھر بار کے کاموں میں اس انداز سے متوجہ ہو جاتی کہ جیسے ان کاموں میں اس کے سپرد یہی ہے کہ ان کے نتائج میں وہ حُسن کو داخل کرتی رہا کرے۔ ملازم اس کی آواز کے انتظار میں بے دلی سے کام کرتے رہتے اور جب وہ ہدایات دیتی اور ان کو کام کرتے دیکھتی رہتی تو ان کے کام کرنے کے انداز میں ایک عجیب سی محویت آ جاتی، جس میں بچپن میں اس کو حُسن نظر آتا مگر عنفوانِ شباب کے دنوں میں اس کو اس سے اکثر الجھن ہوتی۔

اس کا باپ ہمیشہ پو پھٹنے سے پہلے ہی اٹھ جاتا تھا۔ وہ باوجود کوشش کے بچپن میں کبھی اس سے پہلے یا اس کے ساتھ نیند کی آغوش سے نہ اٹھ سکی تھی۔ جب وہ اڑھائی تین سال کی ہوئی تو اس کا والد اٹھتے ہی اس کو، نیند میں مدہوش پڑی کو بستر سے اٹھا دیتا، نماز پڑھتے ہوئے اس کو اپنے سامنے مصلے پر لٹا دیتا، جب نماز سے فارغ ہو کر دعا مانگنے لگتا تو گود میں ڈال لیتا۔ نماز سے فارغ ہو کر وہ اس کو کندھے سے لگائے باہر کھیتوں میں نکل جاتا۔ سردی کے موسم میں وہ باہر لے جانے سے پہلے اس کے پاؤں میں جراب اور جوتا ڈال، گرم چادر میں لپیٹ لیتا۔ اس عمر میں اس کی آنکھ اکثر کھیتوں میں، کنوئیں کے شفاف، نالیوں میں بہتے ہوئے، صبح کی ترچھی کرنوں سے چمکتے ہوئے، پانیوں کو دیکھتے ہوئے کھلتی۔ جب اس کی آنکھ کھل جاتی تو وہ صبح کی ٹھنڈی ہوا کے بڑے بڑے گھونٹ بھرتی جاتی اور کلیاں کرتی

جاتی جس پر اس کا مدبر والد مسکرا دیتا اور پرسکون اور محبت بھری نظروں سے اس کو دیکھتا ہوا کھیتوں کے بیچوں بیچ، کبھی ان کے کنارے کنارے، راہ میں ملتے ہوئے لوگوں کو سلام کرتے، ان کے سلام کا جواب دیتے، ان کا حال پوچھتے ہوئے، اپنا اور گھر والوں کا حال بتاتے ہوئے، کھیتوں میں کام کرتے ہوئے مزارعوں سے کھیتوں کا حال پوچھتے، ان کو ہدایات دیتے ہوئے، کھیتوں سے دور، درختوں کے سائے میں پھیلتے ہوئے ایک مرغزار میں جا کر دم لیتا اور اس کو گود سے اتار دیتا اور وہ بدن سے لپٹی ہوئی چادر کو اتار کر اپنے والد کو دیتے ہوئے مرغزار میں دوڑنے لگتی۔ اس کا باپ ایک مقام پر کھڑا اس کو دوڑتے ہوئے دیکھتا رہتا اور جب سورج مشرقی افق سے اس کے باپ کے قد سے ذرا اوپر اٹھ آتا اور وہ تھک جاتی تو اس کا ہاتھ پکڑ کر واپس گھر کو چل پڑتا۔ چلتے چلتے وہ اس سے ہاتھ چھڑا کر اس سے آگے آگے دوڑتی ہوئی، دوڑتی ہوئی رک کر پیچھے مڑ کر دیکھتی ہوئی، جانے پہچانے رستوں سے ہوتی ہوئی، اپنے مزارعوں کو پکارتی ہوئی، ان کو سلام کرتی ہوئی، ان سے ان کی، اپنی ہم عمر، بیٹیوں کا حال پوچھتی ہوئی، کسی کی بیٹی کو دوپہر کے کھانے کا یا کھانے کے بعد کھیلنے کی دعوت دیتی ہوئی، گھر کی جانب رواں رہتی۔ جب گھر سے ذرا دور رہ جاتی تو رک کر باپ کا انتظار کرتی اور جب وہ اس کو آ لیتا تو اس کے بائیں ہاتھ کی شہادت کی انگلی پکڑے گھر کے دروازے کی طرف بڑھتی ہوئی گھر کے صحن میں داخل ہوتی تو صحن میں انتظار کرتے ہوئے ملازموں کو، ایک ایک کا نام لیتے ہوئے، سلام کرتی اور پھر باپ کی انگلی چھوڑ کر زنانے میں داخل ہوتے ہوئے ماں کو پکارتے ہوئے بلند آواز میں سلام کرتی۔ اس کی ماں ہمیشہ کسی اندرونی کونے میں سے اپنی موسیقی بھری آواز میں جواب دیتی!

''تم آ گئیں بیٹی! آج دن کیسا ہے؟''

اور وہ ماں کے سوال پر ہمیشہ کہتی:

''امی! امی! دن بہت ہی بھلا سا ہے۔''

یا کبھی کبھی جب بہت سردی کے دن ہوتے تو وہ جواب دیتی!

''امی! آج سورج کو بہت سردی لگ رہی تھی، اس کی تو آنکھ نہیں کھل رہی تھی۔ مگر

مجھے دیکھ کر وہ مسکرایا۔ ہاں! امی۔''

اس پر اس کی ماں ہنس دیتی تو وہ پکار اٹھتی:

''ہاں! امی۔ ابا نے بھی سورج کو مسکراتے ہوئے دیکھا۔ بلاؤں ابا کو؟''

''نہیں نہیں۔ بیٹی۔ میں یونہی چھیڑتی تھی تمہیں۔ پیاری بیٹیوں کو دیکھ کر سورج ہمیشہ ہی مسکرایا کرتا ہے۔''

ایک دن جو اس کی آنکھ کھلی تو اس نے دیکھا کہ اس کی ماں اس پر جھکی اس کو دھیرے دھیرے، مدھم مدھم، گہری گہری، پیاری پیاری، آواز میں بلا رہی تھی۔ وہ جلدی سے آنکھیں ملتی ہوئی، اٹھ بیٹھی اور حیرانی سے ماں کو دیکھنے لگی۔ اس کی ماں نہا دھو کر، نئے نویلے کپڑے پہنے ہوئی تھی۔ اس نے سوچا شاید آج وہ دیر تک سوتی رہی تھی۔ اس نے جلدی سے بستر سے اتر کر کھڑکی کھول کر باہر صحن میں جھانکا تو اس کی حیرت اور بھی بڑھ گئی کیونکہ ابھی بھی صحن کے کونوں میں اندھیرا کہیں کہیں سو رہا تھا اور صحن کی مغربی دیوار کے بلند ترین سرے پر ابھی دھوپ کا نشان تک نہ تھا۔ اس نے کھڑکی بند کرتے ہوئے ماں سے پوچھا:

امی۔ امی می۔ آپ کہاں جا رہی ہیں؟''......

اس کی ماں مسکراتے ہوئے اس کی طرف دیکھتی رہی اور کچھ نہ بولی۔ اس نے سوچا کہ شاید آج کوئی رشتہ دار آنے والا ہے۔ اس نے ماں سے سوال کیا:

''کون آ رہا ہے؟ امی!''

اس کی ماں نے کوئی جواب نہیں دیا اور مسکراتی چلی گئی۔ اس کی ماں کی مسکراہٹ اتنی پیاری تھی کہ اس کو ماں کی خاموشی اور مسکراہٹ پر غصہ بھی آ رہا تھا مگر وہ ماں سے ناراض بھی نہ ہو سکی۔ اس نے طے کر لیا کہ وہ ماں سے کچھ نہ پوچھے گی اور روزمرہ کی طرح اپنے کاموں میں مصروف ہو جائے گی۔ وہ غسل خانے میں گھس گئی۔ دانت پر منجن لگایا اور مسوڑھوں پر دائیں ہاتھ کے انگوٹھے اور شہادت کی انگلی سے آہستہ آہستہ مالش کرتے ہوئے سوچتی رہی کہ آج اس کی ماں اتنی سویرے کیوں اٹھ گئی تھی اور اس نے نئے نویلے کپڑے کیوں پہن

رکھے تھے۔ اور......اور......اس کا باپ کہاں تھا۔ اس کو حیرانی ہوئی کہ اس کو اس سے پہلے باپ کا خیال کیوں نہ آیا۔ اس خیال کے آتے ہے اس نے تہیہ کرلیا کہ وہ غسل خانے سے تبھی نکلے گی جب وہ ماں کے کپڑے پہننے اور جلدی اٹھ جانے کا راز اپنی سوچ سے معلوم کرے گی۔ لہٰذا اس نے طے کیا کہ وہ نہائے گی بھی نہیں۔ اس نے دانتوں پر جلدی جلدی سے انگلی چلائی۔ پیتل کے چمکتے ہوئے حمام سے ٹونٹی کھول کر چلو کو پانی سے بھر لیا، پانی منہ میں ڈالا، کلی کی، پھر پانی لیا اور منہ میں ڈالا، کلی کی۔ پھر وہ وہاں سے اٹھ کر صندوقوں والے کمرے میں گئی۔ اپنے لئے صندوق سے کپڑے نکالنے کے لیے گئی اس نے صدوق کھولا تو سب کپڑوں سے اوپر ہی ایک جوڑا نئے کپڑے کا رکھا تھا۔ اتنے پیارے کپڑے تھے اس کا جی چاہا کہ وہ ایک نعرہ لگائے مگر اس نے ضبط سے کام لیا۔ اس نے کپڑے اٹھا لئے اور باہر نکل آئی۔ باہر سونے کے کمرے میں اس کی ماں پلنگ کے کٹہرے سے ٹیک لگائے اس کو غور سے دیکھ رہی تھی۔ اس کے ہونٹوں پر مسکراہٹ بہت مدھم سی تھی مگر اس کی بڑی بڑی آنکھوں میں بہت سی روشنی تھی۔ اس نے ماں پر ایک نظر ڈالی اور بغیر کچھ کہے سنگار کے کمرے میں چلی گئی۔ ایک دیوان پر اس نے اپنے کپڑے پھیلا کر رکھ دیئے۔ اس کو خیال آیا کہ نئے کپڑوں کے ساتھ پرانے جوتے تو اچھے نہیں لگیں گے۔ وہ جوتوں کی الماری کی طرف بڑھی۔ الماری کو کھولا اس سے وہ جوتا نکالنے کے لیے جھکی تو خانے میں اس کی جوتی کا نیا جوڑا رکھا تھا اور اس پر جرابوں کا نیا جوڑا بھی۔ اس نے جوڑا اٹھا لیا اور دیوان کے پاس لاکر رکھ دیا۔ پھر اس نے سنگار کے کمرے پر ایک نظر ڈالی اور غسل خانے کی طرف چل دی۔ اس نے آہستہ آہستہ، سوچتے سوچتے، صابن سے مل مل کر بدن کو خوب صاف کیا، بال دھو ڈالے۔ بال دھوتے ہوئے صابن اس کی آنکھوں میں چلا گیا مگر اس نے اس تکلیف کو برداشت کیا۔ اس کی ماں اس کو ہمیشہ نہلایا کرتی تھی مگر آج اس کا دل نہ چاہتا تھا کہ وہ ماں سے مدد مانگے اور یہ بھی نہ چاہتی تھی کہ اس کے بدن پر، اس کے بالوں میں کہیں میل کا نشان بھی رہ جائے۔ اس نے آخر نہا لیا، کپڑے پہن لئے، جرابیں اور جوتی پہن لی اور سنگار کی میز کے سامنے کھڑے ہو کر اس نے کندھوں پر ماں کی طرح خشک تولیا ڈالتے ہوئے، بالوں میں خوشبودار تیل ڈالا اور بالوں کو کھول کھول کر ان میں تیل لگاتی رہی۔ اس نے کنگھی سے بالوں

کو سلجھایا۔ بالوں کا سلجھانا اس کے لیے بہت تکلیف دہ ثابت ہوا مگر اس نے ہمت نہ ہاری اگر چہ دو تین بار اس کے آنسو نکل آئے تھے۔

جب وہ بالکل تیار ہو چکی تو سنگار کے کمرے سے سونے کے کمرے میں نکل آئی۔ اس کی ماں پلنگ پر نہ تھی۔ وہ کمرے میں بڑھ گئی تو کسی نے پیچھے سے اس کو اٹھا لیا۔ اس نے مڑ کر دیکھا تو اس کی اپنی پیاری امی تھی۔ اس کی ماں نے اس کو گود میں لے کر پلنگ پر لا بٹھایا، اس کا ماتھا، اس کی آنکھیں، اس کے رخسار، اس کا منہ چوما۔ اس کی ماں کے بدن سے بہت ہی بھینی بھینی خوشبو اٹھ رہی تھی۔ اس کو نشہ سا ہو گیا۔ اس کی ماں اس کے پاس بیٹھ گئی اور اس کو پہلو سے لگاتے ہوئے بولی:

''عالمہ بیٹی۔ آج تمہاری پانچویں سالگرہ ہے اور آج تمہاری بسم اللہ بھی ہو جائے گی۔ تمہیں آج سے استاد صبح کو قرآن پڑھانے کے لیے آیا کرے گا اور سہ پہر کو تمہیں اردو پڑھانے کے لیے تمہارا ماموں زاد بھائی تقی آیا کرے گا۔ اس دن سے کئی ہفتے پہلے ہی اس کی ماں نے اس کو حرف شناسی کرانی شروع کر رکھی تھی۔ اس کو اردو کا اور عربی کا قاعدہ از بر تھا اور اس نے تختی پر لکھنا بھی سیکھ لیا تھا۔

اس نے تقی کو کئی بار پہلے بھی دیکھا تھا۔ وہ اس سے بڑا تھا۔ وہ ہمیشہ اس سے ملتے ہوئے شرما جایا کرتی تھی کیونکہ وہ اسے 'بڑی بی' کہا کرتا تھا کیونکہ عام بچوں کی طرح کھیل کود میں زمین پر بیٹھ جانا اس کو پسند نہ تھا اور عام بچوں کی طرح احمقانہ باتوں پر ہنستے چلے جانا اس کو بالکل نہ بھاتا تھا۔

کچھ دیر وہ ماں کے پہلو کے ساتھ لگی ماں کے کپڑوں اور بدن سے اٹھتی ہوئی خوشبو سے لطف اندوز ہوتی رہی۔ اتنے میں باہر سے اس کے باپ کی آواز فضا میں اٹھنے لگی۔ وہ ملازموں کو ہدایات دے رہا تھا۔ پھر اس کے باپ کی آواز ان کے قریب آتی چلی گئی۔ جب وہ بالکل قریب آ گئی تو اس کے والد نے اس کو پکارا۔ وہ ماں کے پہلو سے علیحدہ ہو گئی اور پلنگ سے اتر گئی اور ماں کا ہاتھ پکڑ کر کھینچتے ہوئے اس کو بھی پلنگ سے اٹھا لیا اور صحن کی طرف بڑھنے لگی۔ صحن کے دروازے پر اس کا باپ کھڑا کسی سوچ میں گم تھا۔ جب وہ دونوں اس

کے قریب جا پہنچیں تو اس نے باپ کے دائیں ہاتھ کی شہادت کی انگلی پکڑ لی تو اس کا باپ چونکا۔ اس نے باپ کو سلام کیا۔ باپ نے جھک کر اس کو گود میں اٹھالیا اور اس کی ماں کی طرف دیکھا۔ اس نے اپنے باپ کی آنکھوں میں اس سے پہلے اتنی روشنی کبھی نہ دیکھی تھی اور اس کی ماں کی آنکھوں میں روشنیاں بہت گہرائی میں دمک رہی تھیں۔ باپ کی آنکھوں کی تیز اور بہت سی روشنی اور ماں کی آنکھوں کی دمک اس کو بہت ہی بھلی لگی اور اس نے اس منظر کو اپنے ذہن پر نقش کر لیا۔

وہ باپ کے ساتھ باہر نکل گئی اور اس کی ماں باورچی خانے کی طرف متوجہ ہوئی۔ باہر مہمان آ رہے تھے، مرد اور عورتیں، بچے اور بوڑھے۔ اس نے پہلے کبھی اتنے لوگ اکٹھے نہ دیکھے تھے۔ اس کے ماموں اور پھوپھی کے خاندان بگھیوں میں سوار ہو کر آئے۔

وہ ہر جاننے والے اور رشتہ دار کو آداب بجالائی۔ اس کے ماموں نے اس کو گود میں لے کر پیار کیا، اس کے ماموں زاد نے اسے چپکے سے بڑی بی کہہ کر چھیڑا۔ پھر کچھ دیر بعد اس کو زنانے میں بلایا گیا اور اس کی پھوپھی نے اس کو گود میں لے کر گلے لگایا، ماتھا، آنکھیں اور منہ چوما اور گود میں بٹھائے رکھا۔ کچھ دیر بعد اس کو بھوک نے ستانا شروع کیا تو اس نے سوچا کہ اس نے آج ناشتہ تو کیا ہی نہیں۔ اس کی ماں نے بھی اس کو ناشتے کے لیے نہ کہا تھا۔

پھر اس کو مردانے میں بلایا گیا۔ جانے سے پہلے اس کی ماں نے اس کے ہاتھ دھلائے اور تولئے سے صاف کئے۔ مردانے میں دری اور قالین کے اوپر سفید چادریں بچھی تھیں۔ سب لوگ اس ترتیب سے بیٹھے تھے کہ ان کے درمیان براق سی چادر پر گاؤں کی مسجد کا امام بیٹھا تھا اور اس کے سامنے رحل پر جز دان میں بند قرآن رکھا تھا۔

وہ لوگوں کے قریب پہنچ کر ٹھٹکی مگر وہ سب کو آداب کہنا نہ بھولی۔ اس کا پھوپھا اٹھ کر اس کے قریب آیا، اس کو جوتا اتارنے کے لیے کہا۔ اس نے بیٹھ کر جوتا اتار دیا اور پھر کھڑی ہو گئی۔ اس کا پھوپھا اس کا ہاتھ پکڑ کر اس کو امام کے پاس لے گیا اور اس کے سامنے جا بٹھایا۔ ان کے درمیان قرآن اور رحل تھی۔ وہ دوزانو ہو گئی اور اس نے قرآن کو بوسہ دیا۔

امام نے جزدان کو آہستہ آہستہ کھولا، قرآن کو اس میں سے نکالا اور اس کو رحل کے دونوں ہاتھوں کے درمیان بائیں ہاتھ کے سہارے رکھ دیا۔ امام نے اس کو خطاب کیا، وہ اس کی طرف نظریں اٹھائے بغیر متوجہ ہوگئی۔ امام نے ہجے کر کے اس سے بسم اللہ پڑھوائی اور پھر بغیر ہجوں کے اس نے بسم اللہ دہرائی اور اس نے اس کی پیروی میں بسم اللہ دہرائی۔ پھر امام نے قران کو اس طرح کھولا کہ قرآن کے حروف اس کو دیکھنے لگے۔ امام نے لفظوں پر انگلی رکھتے ہوئے اس سے بسم اللہ کے ہر لفظ کے ہجے کرائے، ایک ایک لفظ کو کہلوایا اور پھر بسم اللہ کو بغیر ہجوں کے، ایک ایک لفظ کو ایک ساتھ پڑھا اور اسے دہرانے کے لیے کہا۔ اس نے دہرایا۔ پھر اس نے امام کی پیروی میں سورہ الحمد ہجے کر کر کے پڑھا۔ پھر ہجوں کے بغیر امام کی پیروی میں ایک ساتھ پڑھا۔ جب وہ ''والضالین'' پر پہنچی تو سب نے ''آمین'' کہا۔ پھر امام نے قرآن کو بوسہ دیتے ہوئے بند کر دیا، اس پر جزدان چڑھایا، رحل پر اس طرح رکھا کہ رحل کے دونوں ہاتھوں کے اوپر قرآن تھا۔ پھر اس نے ہاتھ اٹھا کر آہستہ آہستہ لحن سے عربی میں دعا پڑھی۔ باقی سب لوگوں نے بھی امام کی پیروی میں ہاتھ اٹھائے۔ جب دعا مانگی جا چکی تو سب نے اس کے باپ کو مبارک باد کہی۔ اس کے باپ نے حاضرین کا شکریہ ادا کیا۔ ان کا سب سے بوڑھا ملازم، نور دین، جس نے نئے کپڑے پہن رکھے تھے، آیا، قرآن کے سامنے دوزانو ہو کر، اس کو بوسہ دیا، دائیں ہاتھ میں قرآن کو اٹھایا، بائیں ہاتھ سے رحل کے دونوں ہاتھوں کو ملا اس کو اٹھایا، اس پر قرآن کو رکھا، دونوں پاؤں پر ہو بیٹھا اور پھر قرآن کو ہاتھوں میں لئے اٹھ بیٹھا اور امام کی طرف پیٹھ کیے بغیر پیچھے ہٹتا ہوا کمرے سے نکل گیا۔

اس کے بعد اس کا والد اٹھا اور اس کو اٹھنے کے لیے کہا۔ اس نے حاضرین کو آداب کہا اور باپ کے ساتھ اندر کے صحن میں آئی۔ اس کا باپ اس کو زنان خانے کے پاس اس کی ماں کو آواز دیتے ہوئے چھوڑ کر چلا گیا۔ اس کی ماں اس کا ہاتھ پکڑے ہوئے عورتوں میں لے گئی اور ایک ایک سے اس کی ملاقات کرائی۔ اس نے سب کو آداب کیا۔ کچھ دیر بعد ناشتہ دسترخوان پر لگ گیا۔ اس نے سب کے ساتھ ناشتہ کیا۔ دوپہر کا کھانا بھی سب کے

ساتھ کھایا۔ سہ پہر کو تقی آ گیا۔ اس نے اس کو اردو کی کتاب شروع کرائی۔ رات کے کھانے پر اس کے رشتے دار موجود تھے۔ دو دن ان کے یہاں خوب گہما گہمی رہی۔

جب وہ آٹھ سال کی ہوئی تو اس کے باپ نے اس کو ایک گھوڑے کا بچہ سواری کے لیے تحفہ دیا۔ اگلی صبح وہ حسبِ معمول باپ کے ساتھ سیر کو گئی مگر اس دن ان کے ساتھ گھوڑے کا بچہ بھی تھا۔ بھورے اور سفید رنگ کا بچہ اس کو بہت ہی خوبصورت لگا۔ جب وہ کھیتوں سے ہوتے ہوئے کھلے مرغزار میں پہنچے تو اس کے باپ نے اس کو کمر سے دونوں ہاتھوں سے اٹھا کر گھوڑے کی زین پر بٹھا دیا۔ اس نے گھوڑے کی باگیں مضبوطی سے پکڑ لیں، اس کے باپ نے اس کے پاؤں رکابوں میں ڈال دیئے اور پھر گھوڑے کے ساتھ ساتھ چلتے ہوئے اس کو گھوڑے کی سیر کرائی۔ ایک ہفتہ تک وہ اسی طرح گھوڑے کی سواری کرتی رہی۔ پھر اس کے والد نے اس کو رکاب میں پاؤں رکھ کر، زین کے شانے کو مضبوطی سے پکڑ کر گھوڑے پر چڑھنا سکھایا۔ کئی ہفتے اسی طرح سواری کرتے گزر گئے۔ پھر ایک دن جب وہ رکاب میں پاؤں رکھ کر گھوڑے پر چڑھی تو اس کے باپ نے دونوں رکابیں گھوڑے کی گردن میں ڈال دیں اور اس کو کہا کہ وہ زین میں مضبوطی سے جم کر بیٹھ جائے۔ پہلے پہل تو وہ بے رکاب سواری سے ڈری مگر چند ایک ہفتوں میں وہ اس میں بھی طاق ہو گئی۔

کچھ مہینے بعد سہ پہر کی پڑھائی کے بعد وہ تقی کے ساتھ گھوڑے کی سواری کے لیے جانے لگی۔ کبھی کبھی وہ گھوڑوں پر دور دور تک چلے جاتے اور جب گھر پہنچتے تو کھیتوں پر اندھیرا چھا رہا ہوتا۔ اس کو گھوڑے کی سواری کا ایسا چسکا پڑ گیا کہ وہ کبھی کبھی دوپہر کو بھی گھوڑے پر اکیلی دور دور تک نکل جاتی۔ کئی سال اسی طرح گزر گئے۔

ایک دفعہ جب وہ دوپہر کو اکیلی گھوڑے پر سیر کو نکلی تو وہ اپنے گاؤں سے دور نکل گئی اور اس کا گھوڑا پسینے میں شرابور ہو گیا۔ وہ خود بھی تھک گئی۔ وہ گھوڑے پر سے اتر کر ایک سوتے کے پاس، ایک سایہ دار درخت کے نیچے ستانے کو بیٹھ گئی۔ نرم نرم گھاس پر اس کا جی چاہا لیٹ جائے، وہ لیٹ گئی۔ ہلکی ہلکی ہوا چلنے لگی، اس پر غنودگی طاری ہونے لگی اور اس کی آنکھ لگ گئی۔

یکا یک ہوا گرم سی ہوگئی اور وہ گھبرا کر اٹھی بیٹھی دھوپ اس کے اوپر آ گئی تھی اس کی آنکھیں ابھی نیند سے بوجھل تھیں۔ اس کے کانوں میں کسی کے باتیں کرنے کی آواز آئی اور پھر آواز میں یکا یک تلخی سی آ گئی۔ ایک مرد کی آواز تھی اور ایک عورت کی۔ دونوں میں تلخی ہوگئی تھی۔ پھر یکا یک عورت کی آواز میں آنسو آ گئے وہ کراہتے ہوئے کہنے لگی:

''نہیں نہیں۔ مجھے چھوڑ دو۔ مجھے جانے دو۔ ہائے میں مر گئی......''

وہ ڈر گئی، اس کی آنکھوں سے نیند بھاگ گئی اور اس کا بدن سن ہو گیا اور پھر تپنے لگا۔ عورت کا کراہنا، پکارنا، دردناک ہوتا چلا گیا۔ اس کے لیے اپنی جگہ بیٹھنا محال ہو گیا۔ وہ آواز کی سمت دبے دبے پاؤں بڑھنے لگی۔ سامنے کماد کے کھیت تھے۔ فصل پکنے کو تھی۔ اس کے سارے بدن میں سخت گرم گرم لہریں اٹھ رہی تھیں۔ اس کے ماتھے اور گردن پر پسینہ آ گیا تھا۔ ہلکی ہلکی ہوا چل رہی تھی۔ ہوا جب پسینے پر لگی تو اس کو سردی سی لگنے لگی، اس کے دل کے آس پاس سرد سرد ہوا چلنے لگی۔ وہ کماد میں جا گھسی اور آہستہ آہستہ بڑھنے لگی۔ وہ لمحے بھر کے لیے چلتے چلتے کھو گئی اور جب اس نے نظر اٹھا کر دیکھا تو ایک عورت زمین پر پڑی تھی اور اس کے اوپر ایک مرد ہانپ رہا تھا۔ عورت کراہ رہی تھی۔ مرد اور عورت ٹانگوں سے ننگے تھے۔ عورت کی رانوں پر خون تھا۔ خون کو دیکھ کر اس کے تن بدن سے ایک چیخ نکل گئی۔ عورت کا کراہنا تھم گیا اور ہانپتا ہوا مرد تڑپ کر عورت سے الگ ہو گیا۔ دونوں نے حیرت سے اس کی طرف دیکھا۔ اس نے دونوں کو پہچان لیا۔ وہ اس کے گاؤں کے لوگ تھے۔ مرد کا نام رحماں تھا اور عورت کا بلکہ لڑکی کا نام ریشماں تھا۔ کچھ دیر تو وہ سکتے میں ایک دوسرے کو دیکھتے رہے۔ ٹانگوں سے ننگے مرد اور عورت، عورت کی رانوں پر خون اور سفید سفید سی رال کا منظر اس کے دماغ پر آگ کے داغ کی طرح سلگنے لگا۔ مرد کی آنکھوں میں خوف تھا، بے حد خوف۔ وہ اس کو دیکھتے ہوئے زمین پر پڑے ہوئے اپنے تہبند کی طرف ہاتھ بڑھاتے ہوئے اس سے دور ہٹنے لگا۔ جب اس کا ہاتھ تہبند پر پڑ گیا تو وہ بڑی تیزی سے اٹھا اور بھاگ کر نظروں سے اوجھل ہو گیا۔

عورت بے سدھ پڑی اس کو خوف سے اور کبھی کبھی رحم طلب نظروں سے دیکھتی رہی۔

وہ سکتے میں اس کو، اسکی ننگی ٹانگوں، ننگی رانوں، اس کے ننگے پیٹ کو، جس پر خون کے ہلکے ہلکے داغ تھے، دیکھتی رہی۔ عورت کے گندمی سے چہرے پر سرخ سرخ، روشن روشن نشان تھے اس کے کھلے گریبان سے اس کے جوان سینے پر سرخ سرخ نشان نظر آ رہے تھے اور ان نشانوں کے گرداگرد اجلد سفید پڑنے لگی تھی۔ اس کے ہونٹ سرخ تھے۔ اس کی حیرت زدہ، خوف لئے ہوئے، رحم کی طالب، آنکھیں پھیل پھیل کر بہت بڑی بڑی لگ رہی تھیں۔

عورت ایک دم کراہ اٹھی۔ اس نے پہلو بدل لیا اور اوندھی ہو کر رونے لگی، دھیرے دھیرے، اس کا سارا بدن کانپنے لگا، اس کے شانے گولی لگی کونج کی طرح پھڑک رہے تھے۔ اس کی حالت سے اس کا دل پگھل گیا اور وہ قدم اٹھاتے ہوئے اس کے قریب پہنچ گئی اور اس کی چادر اٹھا کر اس پر ڈال دی۔ مگر اس کے قدموں کی چاپ سے عورت نے تڑپ کر پہلو بدلا اور التجا آمیز نظروں سے اس کو دیکھنے لگی اور پھر اس کے قدموں پر جھک گئی۔ کچھ کہنا چاہتی تھی مگر اس کے منہ سے ایک لفظ بھی نہ نکل سکا۔ وہ اس کے پاس بیٹھ گئی۔ اس کے ذہن میں ایک خیال سما گیا تھا کہ اس عورت کو یوں خون آلود اور سفید لیس دار سیال میں لتھڑے ہوئے وہاں سے نہ ہلنا چاہیے۔ وہ خیال کے زیر اثر بھاگ کر اپنے گھوڑے کے پاس گئی۔ تھیلے میں سے پانی کی بوتل نکال لائی۔ جب وہ لوٹ کر آئی تو عورت اسی حالت میں بے سدھ پڑی تھی۔ اس نے اس کی رانیں، اس کا پیٹ دھویا اور اس کے تہبند سے اس کی رانیں اور پیٹ کو خشک کیا۔ وہ عورت اس کو حیرانی سے، احسان مند نگاہوں سے دیکھتی رہی، اور پھر ایک دم اٹھ کر بیٹھ گئی، تہبند اپنی کمر میں لپیٹ لیا۔ ''آؤ۔ میں تمہارے ساتھ چلتی ہوں، گاؤں تک۔'' اس نے اس کو تسلی دیتے ہوئے کہا۔

ریشماں بڑی مشکل سے اٹھی، تہبند باندھا، گریبان بند کیا، چادر سر اور سینے پر ڈالی۔ وہ اس کو سہارا دیتے ہوئے گھوڑے کے پاس لے آئی اور پھر ریشماں کا ہاتھ گھوڑے کی کمر پر رکھتے ہوئے بولی:

''تم گھوڑے کا سہارا لے لو۔ ہمت کرو تو تمہارا راز کسی کو معلوم نہ ہو سکے گا۔ آؤ۔''

وہ دونوں گھوڑے کے ساتھ ساتھ، آہستہ آہستہ چلتے ہوئے، باتیں کرتے ہوئے،

سویے کے ساتھ ساتھ چلتے ہوئے گاؤں کی طرف روانہ ہوئے۔ راستے میں ان کو کوئی سامنے سے آتا ہوا نہ پیچھے سے آتا ہوا ملا۔ جب وہ ایک دوسری سے جدا ہوئے تو ریشماں کی چال میں وہی انداز آ گیا جو جوان عورتوں کی چال کا معمول ہوتا ہے۔ اس دوپہر کے چند روز بعد اس کی بارہویں سالگرہ منائی گئی۔

گھر پہنچ کر اس کا جی بار بار متلاتا رہا۔ رات بھر دوپہر کا منظر اس کے دماغ کو سلگاتا رہا، جلاتا رہا۔ وہ چپکے چپکے آنکھیں بند کئے، سلگتی رہی، جلتی رہی۔ اس کو رحمے پر بہت سخت غصہ آتا رہا۔ اس کا جی چاہتا کہ وہ مرد ہوتی تو اس کو اس بری طرح سے پیٹ ڈالتی کہ وہ ہفتوں چارپائی سے لگا رہتا۔ اور اس کو ریشماں پر بھی بہت غصہ آتا رہا۔ بے وقوف عورت، کمزور عورت۔

اس نے ہر ایک سے اس واقعہ کو چھپایا، کوئی ایسی حرکت نہ کی جس سے کوئی اس کی طرف متوجہ ہوتا۔ وہ معمول کے کاموں میں حسبِ معمول مصروف رہتی۔ کبھی کبھی دوپہر کو گھوڑے پر نکل جاتی مگر کسی دوسری سمت کو۔ چند دنوں بعد ایک دن ریشماں اس کو ملی اور اس نے اس کو بتایا کہ اس کی شادی رحمے کے ساتھ ہو رہی ہے اور وہ گاؤں چھوڑ کر شہر چلے جائیں گے۔ اس نے محسوس کیا کہ جیسے ایک بڑا سا پتھر جو اس کے سینے میں تھا وہ دھواں بن اڑ رہا ہے۔

مدتوں اس دوپہر کا منظر اس کے جی کو متلاتا رہا، راتوں اس کو سلگاتا رہا، جلاتا رہا، اس کے دل و دماغ میں مرد کے خلاف آگ بھڑکاتا رہا، عورت کی بے بسی پر اس کو غصہ دلاتا رہا۔ وہ اس واقعہ کو اپنے ذہن سے، یادوں سے، مٹا دینا چاہتی تھی۔ آخر جب گاؤں کے لوگ رحمے اور ریشماں کو بھول گئے تو یہ منظر اس کے دماغ سے بھی مٹ گیا، اس کی یادوں کے جہاں سے رخصت ہو گیا۔

برسوں کے بعد آج رات یہ واقعہ پھر اس کے ذہن میں ابھر آیا۔ اس کو اپنے آپ پر، ریشماں اور رحمے پر، انسانی زندگی پر سخت تاؤ آیا اور اس نے محسوس کیا کہ اب اس واقعہ سے اس کی نجات مشکل ہے۔ اس کو اس صلیب کو قبول کرتے ہی بنی۔

اس واقعے کے بعد اس نے تقی کو، اس کی ہر جنبش ابرو کو، بلکہ پلکوں کے جھپکنے کو، اس کی آنکھوں کی چمک کو، اس کے ہاتھوں کو بہت غور سے دیکھنا شروع کر دیا۔ مگر اسے کبھی تقی میں وحشت اور بربریت کا شائبہ تک نظر نہ آیا۔ اس کے چہرے پر، اس کے جسم کی ہر حرکت میں، اس کی چال میں، ایک بھولپن، ایک معصومیت، ایک بے نیازی، اور رعنائی نظر آئی جو اس سے کسی جذبے کی طلبگار نہ ہوئی۔ کبھی کبھی تو وہ اس کو بغور کن انکھیوں سے دیکھتے دیکھتے خلا میں سرگرداں ہو جاتی، جیسے کہ تقی اس کی نظروں کے بالکل قریب آ گیا ہو، اس کی آنکھوں کے پار ہو گیا ہو۔

تقی سے اس نے مختلف زبانوں کے ادبی شاہکار انگریزی تراجم میں پڑھے، دنیا کے عظیم تصویری شاہکاروں کے عکس دیکھے، ان پر تقی سے طویل طویل گفتگوئیں کیں۔ کبھی کبھی وہ اس کے لیے مغربی موسیقی کے ریکارڈ لے آتا۔ پہلے تو اس کے کانوں کو یہ موسیقی بہت اجنبی لگی کیونکہ وہ بہت گہری اور ہمہ تن توجہ کی طالب تھی اور بعد میں اتنا گہرا استغراق اس پر طاری کر دیتی کہ اس کو کئی بار اپنے ماحول میں لوٹ آنے میں اذیت ناک کوشش کرنی پڑتی۔ اس کی زندگی، گاؤں کی زندگی اور اس موسیقی کے آہنگوں میں اتنا بُعد تھا کہ اس کو پاٹنے کے لیے اسے اپنی قوت متخیلہ کو حد امکان تک بروئے کار لانا پڑتا جس سے وہ اکثر تھک جاتی، نڈھال ہو جاتی۔ مغربی ادبی اور تصویری شاہکاروں کا تناظرِ حیات اتنا انوکھا اور ٹیڑھا محسوس ہوتا کہ اس سے نظر و فکر کا تطابق پیدا کرنے کی کوشش صلیب پر چڑھنے کے مترادف لگتی۔ یہ جہاں اس کے جہاں سے اتنا الگ، منفرد، اس کا نقیض نظر آتا کہ اس کو محسوس ہوتا کہ اس کی شخصیت دو حصوں میں بٹ گئی ہے جن میں کوئی ربط نہیں۔ اس نے بار بار چاہا کہ وہ ان دو مختلف النوع جہانوں کو ایک نئے طبق در طبق منظرِ حیات میں سمو سکے مگر ایسا کبھی بھی تو ممکن نہ ہو سکا۔ صرف متین صاحب اور زروان کے مکالمہ کے دوران میں کئی بار اس پر کوند گیا کہ یہ دونوں جہان ایک ہی مسلسل منظر میں ڈھل گئے ہیں۔

اس نے چاہا کہ وہ تمام مناظر، وہ تمام طویل گفتگوئیں، لوٹ آئیں جس میں تقی اور وہ برابر کے شریک تھے، وہ تمام کتابیں اس کے تخیل میں ابھر آئیں جس کو انہوں نے مل کر،

ایک ساتھ پڑھا تھا، دنوں، ہفتوں، ان کے پہلوؤں پر بار بار نظر غور ڈالی تھی، ان کے راز معلوم کئے تھے۔ مگر اس دوپہر کے حادثے کے نقوش اتنے واضح، اس کے رنگ اتنے شوخ، اس سے ابھرنے والے جذبات اتنے پرجوش، اور ہیجان انگیز تھے کہ کوئی منظر نہ ابھر سکا جس میں تقی اس کا شریک تھا، کوئی گفتگو یاد نہ آسکی جس میں وہ اور تقی برابر کے رفیق تھے۔ کسی ناول، کسی نظم، کسی رزمیہ، طربیہ، المیہ کی یاد اس کو اس دوپہر کے منظر سے نجات نہ دلا سکی۔ وہ تڑپ تڑپ کر، تھک کر، نڈھال ہو کر سو گئی۔ اتنی گہری نیند کہ جب اس کو فردوس نے آ کر جگایا تو فردوس نے اس سے حیرانی سے پوچھا:

''اتنی گہری نیند کیا ہمیشہ تمہیں میسر رہی ہے؟ کاش میں اتنی گہری نیند سو سکوں۔''

اس نے معذرت کی اور تیار ہونے کی فرصت چاہی۔

حصہ ہشتم

ست، چت، آنند

پہلا باب

سوشیلا سات بھائیوں کی بہن تھی۔ اس کے ماں باپ کو بیٹی کی بہت آرزو تھی۔ جب آرزو سفر کرتے کرتے تھک گئی تو وہ پیدا ہوئی۔ اس کی ماں 45 برس کی ہو چکی تھی۔ ماں باپ اور بھائیوں نے اس جنم کو پرماتما کا احسان جانا اور اس کی پرورش میں مگن ہو گئے۔ اس کے بھائی جب بھی گھر ہوتے اس کی طرف متوجہ رہتے مگر وہ تھی کہ اکثر سوئی رہتی تھی۔ سوئی ہوئی وہ بہت بھلی لگتی تھی۔ بھائیوں کا اکثر دل چاہتا کہ اس کو اٹھا لیں، اٹھائے اٹھائے پھریں مگر اس کے چہرے پر کچھ ایسی کیفیت رہتی جو کہتی تھی کہ مجھے اٹھاؤ نہیں، میں سہانے خواب دیکھتی ہوں، تمہارے پاس ایسے خواب کہاں؟

مگر جب وہ رینگنے لگی تو کوئی نہ کوئی بھائی اس کو اٹھا لیتا اور آسمان کی اُور اچھال دیتا اور پھر بانہوں میں لے لیتا۔ اس کی ماں ان کو ٹوکتی رہتی مگر اس کو کھکھلا کر ہنستے دیکھ کر، دھڑکتے ہوئے دل کے باوجود، باز رکھنے کے لیے ڈانٹتی کبھی نہ تھی۔ بچپن ہی سے اس کی آنکھوں میں دیکھنے والوں کو موہ لینے کی قوت جھلکتی تھی۔ اس کا سب سے بڑا بھائی، کئی خوبصورت بچوں کا باپ ہونے کے باوجود، اس کو گود میں لئے صبح اور شام کی پرارتھنا کرنے میں بہت لطف لیتا تھا۔

اس کے بھائی اس کے بولنے کے لیے مہینوں بے تاب رہے مگر اس نے ڈیڑھ سال کی عمر تک بول کے نہ دیا۔ وہ بھائیوں کو بے تاب، پریشان دیکھ کر مسکرایا کرتی۔ اس مسکراہٹ سے اس کے بھائیوں کو لگتا کہ وہ کہہ رہی ہے کہ بولوں گی مگر ابھی کچھ دیر لگے گی، انتظار کرو۔ اس کی آنکھوں میں سے ایسی مسکراہٹ کے ساتھ ساتھ ایسا اعتماد چھلکتا تھا کہ ان کے دلوں میں بے تابی سو جاتی اور وہ اس کی آنکھوں میں جھانکتے رہتے اور اضطراب اطمینان میں ڈھل جاتا۔ اس کے ماں باپ نے کئی ڈاکٹروں ویدوں سے مشورہ کیا تو ڈاکٹروں نے رائے دی کہ ایسا بھی ہوتا ہے کہ بچے دیر میں بولنا سیکھتے ہیں؛ ویدوں نے کہا کہ جو بچہ دیر میں بات کرتا ہے وہ بہت گیانی ہوتا ہے اور اس لئے اس کی خاص نگرانی اور اس پر خاص توجہ اور اس کو پیار کی بہت ضرورت ہوتی ہے۔

اس کا بولنا خاندان میں ایک تاریخی دن کی حیثیت رکھتا تھا۔ جب وہ اٹھارہ ماہ دو دن کی تھی تو ان کے یہاں کچھ مہمان آئے ہوئے تھے جن کے ساتھ بچے بھی تھے: ایک بہن، جو بڑی تھی اور ایک بھائی۔ بہن بھائی پر بہت رعب گانٹھتی تھی اور جب کبھی وہ رعب میں نہ آتا تو ڈانٹتی تھی اور کبھی کبھی اس کی چٹکی بھی لے لیتی تھی۔ سوشیلا ماں کی گود میں لیٹی سب کچھ دیکھتی رہی، پھر گود سے اتر آئی اور لڑکے سے کھیلنے لگی اور وہ دونوں کھیل میں گم ہو گئے۔ لڑکے کی بڑی بہن کو یہ مگن ہو جانا اچھا نہ لگا۔ کھیلتے کھیلتے لڑکا ایک ننھی سی میز سے ٹکرا گیا اور اس پر رکھی ہوئی پیتل کی ایک ننھی سی تھالی فرش پر گونج پیدا کرتی ہوئی گری۔ سب لوگ اس گونج کی طرف متوجہ ہو گئے۔ بڑی بہن نے سب کو متوجہ دیکھ کر بھائی کو ڈانٹا۔ سوشیلا کھیلتے کھیلتے رک گئی اور بڑی بہن کی طرف مڑی اور بے ساختہ کہا:

''نہ دانتو! میرے ساتھ کھیلتا، تالی کی آواز اچھی۔''

اس کی آواز سن کر بڑی بہن بہت حیران ہوئی۔ اس کا منہ کھلے کا کھلا رہ گیا۔ اپنی آواز سن کر سوشیلا کا چہرہ سرخ ہو گیا، اس کی آنکھوں سے چمک ابلنے لگی۔ اس آواز کو سن کر اس کی ماں نے دوڑ کر اس کو اٹھا لیا اور اس کا منہ چوم چوم لیا۔ اس کے بولنے کی خبر بھرے گھر میں جنگل کی آگ کی طرح پھیل گئی۔ سبھی لوگ دوڑے چلے آئے۔ سب نے پہلے تصدیق کی

اور بعد میں خوشی کا اظہار کیا۔ مہمان پہلے تو ششدر ہوئے اور جب چونکے تو مبارک دی اور روپے وارے۔ سب سے آخر میں اس کا باپ آیا۔ اس وقت مہمان جا چکے تھے اور وہ ماں کی گود میں بیٹھی دودھ پی رہی تھی۔ باپ اس کو خاموشی سے دیکھتا رہا۔ جب وہ دودھ پی چکی تو ماں کی گود سے اتر آئی۔ اس نے باپ کی دائیں ہاتھ کی انگشت شہادت کو پکڑ لیا اور کمرے کے دروازے کی طرف چلنے لگی۔ باپ نے اشارے کو سمجھ لیا اور اس کے ساتھ ساتھ آہستہ آہستہ ہولیا۔ وہ باپ کو لئے پرارتھنا کے کمرے میں جا پہنچی۔ وہاں جا کر وینا کے سامنے جا کھڑی ہوئی اور مڑ کر باپ کی طرف منہ اٹھا دیا۔ باپ نے جھک کر وینا کو اٹھا لیا۔ وہ مشرق کی طرف کھلنے والی کھڑکی کی طرف منہ کر کے قالین پر، ہرن کی کھال کے پاس بیٹھ گئی۔ مڑ کر باپ کی طرف دیکھا اور ہاتھ کے اشارے سے ہرن کی کھال پر بیٹھنے کے لیے کہا۔ باپ جب وینا کو گود میں لے کر بیٹھ گیا اور وینا کے تاروں کو چھیڑنے لگا، چھیڑتے، چھیڑتے ایک نغمہ جگا دیا تو سوشیلا بولی:

''ٹھاکر جی!......گائیں......''

اس کا باپ پہلے تو حیران ہوا اور پھر اس کا جی خوشی سے بھر گیا اور آہستہ گنگنانے لگا اور کچھ دیر کے بعد وہ گانے لگا اور گاتا ہی چلا گیا۔ اس کے گانے کی آواز سارے گھر میں بھر گئی۔ سوشیلا کی ماں اور بھائی سب پرارتھنا کے کمرے کی طرف لپکے اور دروازے پر رک گئے۔ ڈھلتے سورج کی کرنیں چھت کے مغربی روشن دان سے اتر کر کمرے کی اوپر کی فضا کو سنہرا کر رہی تھیں۔ ان کو کمرے میں پہلے تو کچھ نظر نہ آیا صرف گانے کی آواز سے کمرا گونجتا سنائی دیا۔ پھر آہستہ آہستہ انہوں نے باپ کو، باپ کے شانے کے ساتھ لگی وینا کو اور ان کے دائیں بازو کو حرکت کرتے دیکھا اور پھر ساکت بیٹھی سوشیلا کو دیکھا۔ بیٹی کے جسم کا سکون، باپ کی آواز کے جادو سے اس طرح الگ نظر آتا تھا کہ اس کے سب سے بڑے بھائی کا دل احترام سے بھرپور ہو گیا۔ باقی بھائی باپ بیٹی کو یوں مگن دیکھ بہت حیران ہوئے کیونکہ خود ان کو باپ کے ساتھ یوں قریب گھس کر بیٹھنے کا کبھی خیال ہی نہ آیا تھا کہ گھر اور باہر ان کا بہت دبدبہ تھا اگرچہ ان کی آواز میں ایک خاص طرح کا لوچ اور نرمی تھی جس سے

دل کو بہت سکون سا ملتا تھا کہ ہمدردی کا احساس دلاتی تھی۔

جب کمرے سے کرنوں کا سنہرا دھندلکا رخصت ہو گیا تو ٹھاکر جی کی انگلیاں وینا کے تاروں پر رک گئیں اور ان کی محیط ہوتی ہوئی لے گنگناہٹ میں ڈھل گئی اور پھر آہستہ آہستہ خاموش ہو گئی۔ اس خاموشی سے ایک انوکھی موسیقی نے جنم پایا۔ اتنی سندر خاموشی انہوں نے اس سے پہلے اور اس کے بعد عمر بھر کبھی نہ سنی۔ سب لوگ دروازے میں مورت بنے باپ بیٹی کو تکتے تھے۔ دونوں پُرش نہ لگتے تھے، دیوی دیوتا لگتے تھے۔ ان کا جی چاہتا تھا کہ ان کو نمسکار کریں، چرنوں میں جھک جائیں۔

ان کو لگا منوانتروں بعد ٹھاکر جی نے شانے سے وینا کو پرے ہٹایا، ہرن کی کھال پر لٹا دیا اور سوشیلا کی طرف دیکھا۔ وہ پہلے ہی ان کی طرف منہ اٹھائے دیکھ رہی تھی۔ وہ اٹھے اور جھک کر سوشیلا کو گود میں اٹھا لیا، اور دروازے پر بیوی بچوں کو مورت بنے کھڑے دیکھ کر مسکرا دیئے۔ بیوی ان کی اور لپکی کہ سوشیلا کو اپنی گود میں لے لے مگر ٹھاکر جی کی طرف سے سوشیلا کو دینے کی کوئی جنبش نہ دیکھ وہ حیران ہوئی۔ اس کو حیران دیکھ کر وہ بولے:

''باپ بیٹی کو گود میں اٹھا لے تو ایسی اچنبھے کی بات نہیں...... تمہیں یاد ہے جب کماری کا مندر بن چکا تھا اور ہر شے اپنی اپنی جگہ جما دی گئی تھی تو صرف کماری کا آسن خالی تھا۔ کماری کو اس کی رتھ سے میں اپنی گود میں اٹھا کر لایا تھا اور میں نے ہی اس کو پنڈت نین کے سپرد کیا تھا کہ وہ دیوی کو اس کے آسن پر جما دیں...... جیسا آنند اس سے مجھے ملا تھا ویسا ہی آنند میں اس سے اپنے انتر جاگتے، اپنے لہو میں دوڑتے، محسوس کر رہا ہوں......''

کچھ دیر ٹھاکر جی چپ رہے، سوشیلا کو پیار سے دیکھتے رہے۔

''مجھے اتار دیں۔''

ٹھاکر جی چونکے۔ انہوں نے اس کو قالین پر کھڑا کر دیا۔ وہ دروازے کی طرف بڑھی، بڑھتی ہی چلی گئی؟ کمرے سے باہر نکلی تو بڑے بھائی کی بیوی دور کھڑی سب کو دروازے پر جمے حیرت سے تکتی تھی۔ اس کو دیکھ کر وہ مسکرائی۔ وہ اس طرف بڑھی، اس کے دائیں ہاتھ کی انگشت کو پکڑا اور چل دی۔ اس کی بھابھی بہت حیران ہوئی کہ وہ اس لمحے سے پہلے کبھی اس

کی طرف متوجہ ہی نہ ہوئی تھی۔ وہ بھابھی کو لے کر اس کے کمرے میں چلی گئی اور اس کو بستر پر بٹھا، بستر پر چڑھ، اس کی گود میں لیٹ گئی، سوگئی، سوئی رہی۔ اس کی بھابھی کو اپنے بچوں کو گود میں سلانے سے اتنی راحت کبھی نہ ملی تھی، اس کو اپنے آپ اور سوشیلا کے بوجھ میں کوئی دوئی محسوس نہ ہوئی، وہ اور سوشیلا ایک ہوئے۔ اس رات وہ اپنی بھابھی کے ساتھ سوئی۔ اس اچانک توجہ کے سبب کوئی اس کو لینے نہ آیا۔ اس رات کے بعد اس کی بھابھی کو وہ بہت ہی عزیز ہوگئی اور اس کی زندگی میں انوٹھی سی راگنی رچنے لگی۔ اس کے خاوند نے محسوس کیا کہ وہ پھر سے جوان ہونے لگی ہے، اس کے سروپ میں ایک انوپ سا آ گیا ہے۔ وہ سوشیلا کا دل ہی دل میں بہت ممنون رہنے لگا۔

جب وہ دوڑنے لگی تو پھر اس کو کسی کی گود میں چڑھنا پسند نہ رہا۔ وہ اپنے سب سے بڑے بھائی کے سب سے چھوٹے بیٹے کے ساتھ کھیلنا بہت پسند کرتی تھی۔ وہ بھی اس کے ساتھ کھیلنا پسند کرتا تھا اور اس کو کبھی کسی طرح تنگ نہ کرتا تھا۔ ان کی دوستی پر سبھی بہت مسکرایا کرتے۔ پھوپھی اور بھتیجے کی دوستی کچھ اچرج سی تھی وہ جس کی طرف بھی دیکھ لیتی وہ خوش ہو جاتا۔

وہ بھائیوں کی دلاری تھی۔ وہ اپنے گھر کے نوکروں کے لیے دیوی تھی، جس کے گھر وہ کبھی چلی جاتی اس کے جیون میں نہ جانے کہاں کہاں سے مسرتیں در آتیں۔ اس کی کسی بھی خواہش کے اظہار کے لیے گھر والے، نوکر چاکر، خاندان کے دوست، سبھی منتظر رہتے۔ وہ بہت کم کسی خواہش کا اظہار کرتی تھی۔ ہر شے کو بہت غور سے دیکھتی۔ لگتا تھا کہ اس کے اندر اتر گئی ہے۔ ہر کوئی اس کے غور سے دیکھنے اور مسکرا دینے کو اپنے لئے کافی جانتا تھا۔ صرف جب پہلی بار اس کی پھوپھی ان کے یہاں آئی تو اس نے اس کو اتنے غور سے دیکھا کہ اس کو محسوس ہوا کہ جیسے وہ اس کے اندر اتر گئی اور اس کے شریر کا اک حصہ بن گئی ہو۔ اس کو ڈر سا لگا اور وہ ان کے سامنے سے ہٹ گئی اور جب بھی گھر میں چلتے پھرتے ان دونوں کا سامنا ہو جاتا تو وہ ادھر ادھر کھسک جاتی۔ کئی دنوں کے بعد اس پھوپھی نے اس کو دیکھ کر عجیب طرح سے مسکرا دیا۔ ان کی مسکراہٹ اس کو روک لیتی اور ادھر ادھر نہ ہونے دیتی۔ آخر ایک دن ان

کو ان کے یہاں سے رخصت ہونا تھا۔ وہ دور دور سے ان کو دیکھتی رہی، قریب جانے کو من چاہتا تو تھا مگر اس کو ہمت نہ پڑتی تھی۔ سب لوگ آہستہ آہستہ ان کے کمرے میں جمع ہونے لگے تو وہ سب کے ساتھ ان کے کمرے میں گئی ان کی ماں کے ساتھ باتیں کرتے کرتے انہوں نے اس کا نام لے کر بلایا اور اس طرح ہاتھ اس کی طرف بڑھائے کہ اس کے قدم ان کی طرف دوڑتے ہوئے اس کو ان کی گود میں کھینچ کر لے گئے۔ انہوں نے اس کو اٹھا کر گود میں بٹھا لیا اور پاس پڑے ہوئے ایک چھوٹے سے بکس کو کھولا اور اس میں سے سونے کا ایک ہار نکالا اور اس کی گردن میں ڈال دیا۔ اس ہار کے نیچے گول سا سنہرا سکہ تھا اور پھر ایسے تین سکے نکال اس کے ہاتھ میں دے دیئے اور اس کا ماتھا چوما اور بولیں: ''بھیا میرے جیتے جی تو میرے گھر کبھی آئیں۔ پرانی رسمیں کب تک نبھاتے رہیں گے۔ چندر بھان کے پتا کو تو آپ ملتے رہتے ہیں۔ دوست سمجھ کر ہی ان کے گھر آ جائیں۔ وعدہ کریں۔'' ان کے چہرے پر محبت کے آثار نمایاں ہوگئے۔ وہ بولیں ''آئیں گے نا۔ سوشیلا کو ضرور لے کر آئیں......آپ سبھی بسنت کے دنوں میں کیوں نہیں چلے آتے۔ میرے لیے وہ دن بہت یادگار دن ہوں گے۔ انکار نہ کریں۔'' اس کے باپ نے ہاں کر ہی دی۔ بسنت کے وہ دن تو اس کو ہمیشہ یاد رہے۔ ارملا نے اس کا من جیت لیا۔ وہ اس کے لیے بہن بنی، دوست بنی، سب کچھ ہی بنی۔

اس کو پڑھانے کا کئی برسوں تک کسی کو خیال نہ آیا جیسے کہ اس کو اس کی ضرورت ہی نہ ہو۔ اس کی چال ڈھال، اس کی گفتگو میں اک متانت تھی۔ جیسے کہ وہ ہر راز کو جانتی ہو۔ اس کی باتوں میں بہت سوجھ بوجھ ہوتی تھی۔ جب چھ برس کی ہوگئی تو ایک دن باپ کے کتب خانے میں اس لمحے جا نکلی جب وہ پڑھ رہے تھے۔ اس کو دیکھ کر انہوں نے کتاب میز پر رکھ دی اور اس کی طرف متوجہ ہوگئے۔ اس نے باپ کو بہت گہری نظر سے دیکھا، دیکھا کی اور پھر بولی:

''آپ جو بھی پڑھ رہے تھے مجھے بھی سنائیں۔''

باپ کو اس پر کوئی حیرانی نہ ہوئی اور کتاب اٹھا کر سنسکرت میں ایش اپنشد اس کو سنانے

لگ گیا۔ وہ گہرے انہماک سے سنتی رہی۔ اس کے صرف اٹھارہ منتر ہیں۔ یہ اپنشد سب سے چھوٹا اپنشد ہے۔ جلد ہی ختم ہو گیا۔ کچھ دیر تو چپ رہی جیسے کہ اپنشد پر غور کر رہی ہو۔ پھر بولی:

''میری زبان میں بتائیں کہ یہ مجھ سے کیا چاہتا ہے۔''

باپ اس فقرے سے چونکا تو مگر خوش بہت ہوا۔ اس نے ایش اپنشد کے معنی بیان کرنے شروع کیے۔ جب وہ بیان کر رہے تھے کہ کسی دوسرے کے مال پر نظر نہ رکھنی چاہیے تو وہ اعتماد سے بولی:

''یہ میں جانتی ہوں۔''

اس دن سے باپ نے بیٹی کی تعلیم اور تربیت میں دلچسپی لینی شروع کر دی۔ باپ بیٹی گھنٹوں کتب خانے میں کتابوں میں کھوئے رہتے، نہ کھانے کا ہوش رہتا اور نہ کسی اور بات کا؟ صرف پرارتھنا سے وہ کبھی غافل نہ رہتے۔ کبھی کبھی پرارتھنا میں بھی بیٹی کو شریک کر لیتے۔ جب کتب خانے سے نکلتے تو باہر وسیع وعریض باغ میں ٹہلتے ہوئے باتیں کرتے رہتے، کبھی چمن اور گلزار میں نکل جاتے اور ایک ایک پھول، پودے اور درخت کی پہچان بیٹی کو کراتے، جب کبھی وہ اپنی زمینوں کے انصرام کے سلسلے میں دنوں، ہفتوں، گھر سے دور رہتے تو وہ کتب خانے میں بیٹھی پڑھتی رہتی یا پرارتھنا کے کمرے میں باپ کی وینا پر بھجن گاتی رہتی۔ اس نے اپنے لیے ایک نیا جہاں آباد کر لیا تھا جس میں علم تھا، حکمت تھی، راگ تھا، ابھیناؤں کی نرت تھی۔ لگتا کہ وہ بہت مصروف ہے، اس کو بہت کچھ جلد جلد کرنا ہے۔ یوں برسوں گزر گئے۔ ایک دن باپ جب کئی ہفتوں کے سفر کے بعد گھر لوٹا اور آرام کر لینے کے بعد سوشیلا کو بلایا تو وہ گھر میں نہ تھی، کسی کو معلوم نہ تھا کہ وہ کہاں تھی۔ وہ اپنے کمرے سے نکل باغ میں آئے، اس کو ڈھونڈتے ڈھونڈتے، چمن وگلزار کے درمیانی تختے پر درختوں کے سائے میں سورج کی کرنوں کے درمیان بیٹی کو نرت کرتے دیکھا تو دیکھنے میں محو ہو گئے۔ اس محویت کے عالم میں انہوں نے محسوس کیا کہ سوشیلا ناٹیہ شاستر کی ہدایات کے مطابق نرت جگا رہی ہے۔ اس پر انہوں نے محسوس کیا کہ جیسے وہ بیٹی کے تخلیے میں مخل ہو رہے ہوں۔ وہ شرمسار سے ہوئے، چپکے سے واپس اپنے کمرے میں آ گئے۔ کافی دیر چپ چاپ

بیٹھے رہے۔ جب سوشیلا کمرے میں داخل ہوئی تو وہ چونکے اور اٹھ کر بیٹی کا سواگت کیا اور اس کو اپنے سامنے بیٹھنے کے لیے کہا۔ کچھ دیر چپ چاپ بیٹی کو حیرانی سے، پیار سے دیکھا کیئے۔

''گرو کی آ گیا کے بنا کسی وِدّیا کے نگر جانے کا موہ پالنا اچھا نہیں۔ نرت ودیا اگر تمہیں بلاتی ہے تو پھر تمہیں گرو کی تلاش کرنا ہوگی اور گرو کے چرنوں میں رہنا ہوگا، اس کی اِچھا کا پالن کرنا ہوگا......

گرو گھروں میں نہیں رہتے، بن میں کٹیا بنا کر رہتے ہیں۔ ایسے جیون کے ساتھ تمہارا شریر اور تمہارا من نباہ نہ کر سکے گا۔ نرت ودیا صرف شریر سے سوچنے سے ملتی ہے نہ کہ من کی سوچ سے۔ تمہارا من تمہارے شریر کا راجہ ہے اور اسی کو راجہ رہنا چاہیے۔ ناٹیہ شاستر پڑھ لینے سے نرت ودیا شریر میں نہیں رچتی۔ انگ انگ کی رچنا بنا نُرتیہ جنم نہیں لے پاتی......''

''تو آپ نے مجھے نرت کرتے دیکھ لیا۔ کیا میری نرت شاستر سمان نہیں تھی، اس میں کوئی الوچ تھا کوئی دوش تھا۔''

''میں یہ تو نہیں کہتا۔''

''پتا جی! نرتیہ مرے جیون کا آدرش نہیں ہے۔ اس ودیا سے میرا لگاؤ اس لیے ہے کہ میں اپنے شریر کو اپنے من کا سنگی بنانا چاہتی ہوں نہ کہ چاکر۔ مَنُش شریر اور من دونوں کے ملاپ سے روپ میں آتا ہے۔ اس روپ میں بگاڑ اسی سمے آتا ہے جب دونوں میں سنگت نہ ہو......

میں دونوں کے سمبندھ سے ایسے سنگیت کو سنسار میں لانا چاہتی ہوں جو منش کے نگر میں شانتی کو رچا دے۔ اس سنگت سے مجھے بہت شانتی ملتی ہے، میرے من میں بہت سے دیئے جل اٹھتے ہیں، من کے اندھیرے مٹ جاتے ہیں اور منش کی ورتی میں ولاس آ جاتا ہے۔ کیا یہ سب کچھ ستیہ نہیں۔ کیا چیتنیہ اور شریر میں سوہتیہ کی اچھیا دوش ہے!......''

ٹھاکر جی بہت دیر تک چپ رہے مگر بیٹی کے مکھ پر نظریں جمائے رہے۔ بیٹی کے مکھ اور اس کے انگ انگ سے سمّوہ پھوٹ رہا تھا۔ یہ سماں سُکھ برسا رہا تھا۔ وہ دیر تک اس بارش

میں بھیگتے رہے۔ سکھ کا رس ان کے روم روم میں رچ گیا۔ وہ اک جھرجھری لے کر چونکے، بیٹی کو دیکھا۔ اس پر وہی سماں تھا۔ ہمت باندھ کر بولے۔

''بٹیا!...... تمہارا ہردے دیا سن یہی ہے تو پھر وشوا اور انتریامن دونوں کا گیان تمہاری نیتی ہوگی۔ گیان مارگ بہت ہی کٹھن ہوتی ہے۔ چل سکوگی؟ اس مارگ پر کچھ دیر تو میں تمہارا ساتھ دوں گا۔ نہ جانے کب اس سنسار سے ودا ہونا پڑے۔ جو بھی ہو میں تمہارا ساتھ دوں گا۔ گیان ہی اس مارگ پر سب کچھ نہیں۔ کرم اور وچار اور چنتا میں سوہتیہ ہوگی تو آدرش اور ست میں وِوا ہو سکے گا...... تم نے سوچا ہے کہ اس مارگ پر تمہیں جیون ساتھی بھی مل سکے گا؟ کوئی نر بھی ایسی ناری کو جیون ساتھی بنانا نہیں چاہتا جو اس کی سیوا ہی کو دھرم نہ جانتی ہو، گیانی ناریاں نر کو نہ بھائیں......

یہ وشوا، یہ سنسار، یہ جگت ویدوں اور اپنشدوں کو اپنا ارتھ اور دھرم جاننے والوں ہی کا نہیں رہا۔ نہ جانے کتنے ارتھوں اور دھرموں کے پجاری اب اس وشوا کے باسی ہیں اور ان ارتھوں اور دھرموں کی چھایا ہر کسی پر پڑتی ہے اور ان کے روپ ہر من کو لبھاتے ہیں اور کوئی ہوگا جو اپنی مارگ کو بھلا نہ دے، چاہے کچھ سمے کے لیے ہی سہی اور پھر اپنی مارگ پر لوٹ ہی کیوں نہ آئے۔ اس لیے تمہیں ان ارتھوں اور دھرموں کی پہچان بھی کرنی سیکھنی ہوگی۔ اس کے لیے کئی بھاشائیں سیکھنی ہوں گی کچھ بھاشائیں تو میں بھی جانتا ہوں۔ وہ میں تمہیں سکھا دوں گا......

میں پھر کہتا ہوں ایسی نیتی اپنانا اور ایسے مارگ پر چلنا بڑا ہی کٹھن ہے۔''

باپ بیٹی کے درمیان بہت دیر تک خاموشی کا اک ساگر بہتا رہا کسی کو بھی اس ساگر کو پاٹنے کی ہمت نہ ہو رہی تھی۔ آخر بیٹی نے ہمت کی اور ہوشیار ہو کر بیٹھ گئی اور باپ کی اور منہ کر کے بولی:

''پتر! میں نے آپ کی باتیں پورے یوگ سے سنی ہیں۔ میں اس مارگ کی کٹھناؤں کو سوئیکار کرتی ہوں مگر ان کو میں اپنا ہردے پراپت کر دینے کو تیار نہیں ہوں۔ میرے ہردے کی اچھیا مجھے شکتی دیگی کہ میں اپنے آدرش کو پالوں۔ میں آپ سے اتنا چاہتی ہوں

کہ جب تک آپ جیئیں میری رکھشا کرتے رہیں۔ میں بچن دیتی ہوں کہ وہ سمے کبھی نہ آنے دوں گی کہ آپ کو میرے کسی کرم کے کارن لاج آئے۔آپ کی باتوں سے میرے من اور چیتنیہ کے ایسے کھونٹ بھی اجالا ہو گئے جن کے بھاؤ کے نیائے کی مجھے سوجھ بوجھ نہ تھی...... میں یہ تو جانتی تھی کہ مجھے کئی بھاشائیں سیکھنی ہوں گی۔ بڑے بھیا سے میں انگریزی بھاشا کی شکشا لے رہی ہوں۔ دو ایک برسوں میں مجھے میٹرک کر لینا ہوگا اور پھر کالج میں داخلہ لینا ہوگا۔اس کے لیے شہر جانا ہوگا۔کالج میں کئی دھرموں کے ماننے والوں سے بھی ملنا ہی پڑے گا۔اس لیے میں آپ سے پرارتھنا کروں گی کہ آپ مجھے اپنے مسلمان دوستوں کی بہو بیٹیوں سے ملنے جلنے کی آگیا دیں۔اور جلد ہی مجھے ان کے یہاں کبھی کبھار چائے پینے دیں، کبھی کبھار ان کو بھی اپنے یہاں بلایا کریں۔دوج بھیا کے افسر تو انگریز ہیں اور ان کو وہ اپنے جنگل میں کئی بار شکار کے لیے لا چکے ہیں۔ان کی ناریوں سے بھیا مل چکے ہیں۔بھیا کو آگیا دیں کہ وہ انگریز ناریوں سے بھی مجھے ملائیں......''

''اس میں ابھی بہت دیر لگے گی۔تمہیں ان کی بھاشا کو اسی طرح بولنا سیکھنا ہوگا جس طرح کہ وہ بولتی ہیں۔ میں کئی مہینوں سے سوچ رہا تھا کہ تمہارے لیے لنگوا فون خرید لاؤں تمہارے بھائی شِو چرن کی استری اپنے میکے سے گراموفون اور ریکارڈ لائی ہے۔تم نے سنے ہوں گے؟''

''آپ کو اس کا بھی پتہ ہے۔''

''ہاں! کیا ہرج ہے! جب نئے سنسار میں رہنا ہے تو پھر اس سنسار کے پینتروں کو بھی جاننا ہوگا۔ میں یہ جانتا ہی تھا کہ ایک نہ ایک دن تمہیں بھی ستیہ وان کے نگر جانا ہوگا، وہاں برسوں رہنا ہوگا، مگر میرے دھیان میں یہ بات نہ آئی تھی کہ وہ سمے اتنی جلدی آ جائے گا۔ اب دھیان میں بات آ ہی گئی ہے تو پھر اس کا سواگت کرنا ہی اچھا ہے......کل سے ہم دونوں اس کی تیاری کریں گے...... یہ لنگوا فون گراموفون ہی کا ایک روپ ہے اس میں کسی بھی بھاشا کے اچھے بولنے والوں کی ناد کو بند کر لیا جاتا ہے اور جب ریکارڈ بجایا جاتا ہے تو ہم ایک ایک شبد کو تمام لہجوں کے ساتھ جان سکتے ہیں۔تمہیں اردو بھی جلد ہی دوج بھابھی سے

سیکھ لینی چاہیے۔ وہ اس بھاشا کی بہت رسیا ہے۔''!

''میں نے کئی مہینوں سے اس بھاشا میں رامائن پڑھنا شروع کر دی ہے۔''

''ہوں! تو یہ بات ہے۔ تمہیں ماما کے نگر جانے کی بہت جلدی ہے...... تو چلی جائے گی تو گھر سونا سونا سا لگے گا...... تیرے جنم سے پہلے کا میرا جیون بہت سادہ تھا، زمینوں پر چلا جاتا تھا، دوسرے زمینداروں سے مل لیتا تھا، برسوں میں کبھی تمہارے ماما کے نگر جانا ہو جاتا تھا۔ گھر میں کسی سے بہت سی باتیں نہ ہو سکتی تھیں۔ گھر بار کے کتنے معاملے ہوتے ہیں۔ کتابوں سے کسی کو بھی لگاؤ نہ تھا، راگ اور چتر کاری پر کسی سے بات نہیں ہو سکتی تھی۔ میں نے بیسیوں ہی چتر اکٹھے کئے تھے مگر ان کو دیواروں پر سجانے کی ہمت ہی نہ ہوئی۔ سوچتا تھا کہ میرے سوا ان کو کون دیکھے گا اب ان کو دیوار پر لگاؤں گا۔ ایک چتر شالا بناؤں گا۔ سادھو پران ناتھ کو اپنے گھر رہنے کے لیے بلاؤں گا۔ وہ نرتیہ کے بہت بڑے گیانی ہیں۔ تم سے مل کر ان کو بہت خوشی ہوگی۔ ہم اپنے جیون کو نئی ڈگر پر ڈالیں گے۔ میں بھی تمہارے ساتھ ساتھ چلنے کی کوشش کروں گا۔ تمہیں اکیلا تو نہیں چھوڑا جا سکتا اور میں یہ بھی تو نہیں چاہتا کہ میرے اور تیرے درمیان ایسی ودیا کا ساگر بہنے لگے جس کو میں پاٹ نہ سکوں۔ جب تک تمہیں جیون ساتھی نہ مل جائے اس سمے تک میں تمہارے ساتھ ساتھ چلنا چاہوں گا۔ تمہیں پروان چڑھاتے میں نے تم سے بہت کچھ سیکھا ہے۔ اب سوچتا ہوں تو لگتا ہے تمہارے جنم سے پہلے کئی سال سویا رہا تھا اور تمہاری باتوں نے مجھے جگا دیا ہے۔ اب میں دوبارہ سونا نہیں چاہوں گا۔ مجھے پتا نہ تھا کہ میں کیا کیا کچھ کر سکتا ہوں، میرے اندر کیا کیا چھپا تھا۔ اب میں نے ان سب کو جان لیا ہے تو ان سب کی بھوک پیاس کا بندوبست کرنا میں اپنا دھرم جانتا ہوں۔ اس کام میں مجھے تمہاری سنگت ملنی چاہیے۔''

اس دن کے بعد سوشیلا کی زندگی میں آہستہ آہستہ ایک بہت بڑی تبدیلی آتی چلی گئی۔ اس گھر کے دروازے خاندن کے لوگوں کے علاوہ اور لوگوں پر بھی کھول دیئے گئے۔ گھر میں اکثر گہما گہمی سی رہنے لگی، کمروں سے مختلف قسم کا شور، موسیقی اور گھنگروؤں کی نرت میں گھل ملنے لگا۔ اس کے بھائیوں کے دوست ان کے یہاں آ کر کئی کئی دن ٹھہرنے لگے۔ ان کے

باپ نے باغ کے شمال کی طرف ایک نیا مکان بنوا دیا جہاں مہمان آ کر ٹھہرنے لگے۔ مہمانوں کے ساتھ پھر ان کی عورتیں بھی آنے لگیں۔ سوشیلا ان عورتوں سے اکثر ملتی رہتی، ان کے ساتھ ان کی بھاشا بولتی۔ جب اس نے میٹرک کا امتحان پاس کرلیا تو وہ کئی بھاشائیں بول سکتی تھی، لکھ سکتی تھی، لنگوافون کا استعمال اس نے خوب خوب کیا تھا۔ اردو، ہندی، سنسکرت اور انگریزی پر اس کو عبور حاصل ہو گیا تو زبانوں کے علم کے علاوہ اس نے دوسرے علوم بھی سیکھنے شروع کر دیئے۔ جب اس نے کالج میں داخلہ لے لیا تو اس کی استانیوں نے محسوس کیا کہ ان کا پالا کسی مبتدی سے نہیں بلکہ ایک عالم سے ہے۔ جب اس نے ایف اے کرلیا تو اس کے ماما کے نگر میں لڑکیوں کا ایسا کوئی کالج نہ تھا جہاں وہ بی اے کر سکتی۔ لہٰذا اس کو لڑکوں کے کالج میں داخلہ لینا پڑا اگرچہ وہاں کئی دوسری لڑکیاں بھی پڑھتی تھیں۔ لڑکوں کے کالج میں پہلے پہلے تو اس کو چلنا پھرنا خاصا عجیب سا لگا مگر جلد ہی اس نے اپنے ماحول پر قابو پا لیا۔ لڑکیوں اور لڑکوں نے محسوس کرنا شروع کیا کہ یہ لڑکی ان سے بہت مختلف ہے جس کو تنگ کرنا بہت مشکل ہے کیونکہ اس کی آنکھوں میں عجیب طرح کی روشنی رہتی تھی جس کا سامنا کرنا خاصا مشکل تھا اور اس کے جسم میں متانت تھی جو متوجہ تو کرتی تھی مگر شرارت پر مائل نہ کرتی۔ اس نے کبھی کسی سے بات کرنے سے گریز نہ کیا مگر اس کے جواب میں ایسی گہرائی اور گیرائی ہوتی کہ بات کرنے والے کو باتوں کو جاری رکھنے کے لیے اپنے اندر بہت تلاش کرنا پڑتی اور اس کوشش میں اکثر وہ کھو جاتے مگر ان کو ایسی حالت میں دیکھ کر وہ پوری توجہ سے انتظار کرتی کہ وہ بات جاری رکھ سکیں مگر جلد ہی باتوں کا سلسلہ منقطع ہو جاتا اور بات کرنے والے کو اجازت لینی پڑتی۔ کالج کے کتب خانے سے اس کا رابطہ بہت گہرا تھا۔ لائبریرین جلد ہی اس سے مانوس ہو گیا۔

اس کے پروفیسروں کو جلد ہی معلوم ہو گیا کہ ان کے لیکچر کتنے بے مزا اور علم سے خالی ہیں۔ وہ کالج تیاری کر کے آنے لگے اپنے مضامین کے علاوہ بھی بہت کچھ پڑھنے کی کوشش کرنے لگے۔

کالج کی مختلف مجالس میں بھی وہ آہستہ آہستہ حصہ لینے لگی۔ مباحث میں بھی شریک

ہونے لگی۔اس کی آواز میں متانت کے باوجود ایک لوچ اور نرت کی کیفیت ہوتی۔اس کے خیالات اور اس کے الفاظ میں گہری ہم آہنگی ہوتی۔ جب پہلی سالانہ بحث میں اس نے حصہ لیا تو اس کی مختصر سی تقریر خاصی جامع اور شگفتہ تھی اور تقاریر کے بعد جب مقررین نے ایک دوسرے کی تقریروں پر بحث کرنا شروع کی تو جب بھی اس کی آواز بلند ہوتی تو ہال میں سکوت طاری ہو جاتا۔ بحث ''معاشرے میں عورت کے صحیح مقام'' پر تھی۔اس کا موقف تھا کہ معاشرے کے ہر وظیفے میں عورت کو مرد کا برابر کا شریک ہونا چاہیے اور یہ کہ ہر مذہب کے ابتدائی معاشرے میں عورت برابر کی شریک رہی ہے۔ بحث میں ایک وقت ایسا بھی آ گیا کہ اس کا موقف تمام مقررین کی بحث کا مرکز بن گیا اور ہر کوئی اس سے سوال کر رہا تھا اور وہ بلا تکان، جھنجھلائے بغیر، جواب دیئے جا رہی تھی اور اس کے جوابات میں کئی مذاہب کی کتابوں کے حوالے چلے آ رہے تھے۔آخر بحث کا اختتام اس کے حق میں ہوا اور انعام اس نے جیتا۔اس دن کے بعد لڑکوں نے اس کو سوشیلا ''پنڈت'' کہنا شروع کر دیا۔

اس واقعہ کے کچھ ہفتوں بعد عورتوں کے ایک کالج میں موسیقی کا مقابلہ ہوا تو اس نے کئی انعام جیتے،عورتوں کی انجمن نے ایک رقص کا مقابلہ کرایا تو اس نے وہاں بھی کئی انعام حاصل کئے۔ جب اس کے اپنے کالج کے منتظمین نے گانے اور رقص کی محفلوں میں اس کو شریک کرنا چاہا تو اس نے یہ کہہ کر انکار کر دیا کہ اس کے پاس فرصت نہیں ہے اگر چہ وہ سب جانتے تھے کہ فرصت نہ ہونے کے علاوہ اس کو مردوں کے سامنے ناچنے اور گانے پر بھی اعتراض تھا۔عورتوں کی محفلوں میں ناچ اور گا کر وہ اپنے کالج کے لڑکوں کو بتانا چاہتی تھی کہ وہ صرف ''پنڈت'' نہیں ہے فنکار بھی ہے اور اس کے علاوہ بھی بہت کچھ۔مگر لوگوں نے اس کو ''پنڈت'' کہنے پر اصرار کیا اور وہ یونیورسٹی میں بھی ''پنڈت'' ہی مشہور رہی۔

کالج اور یونیورسٹی میں اس کا مرغوب مضمون طبیعیات تھا جس کے ماضی اور حال سے اس کو بہت گہری واقفیت تھی اور اس کے فلسفے پر اس کو بہت عبور تھا۔اس نے اس کے مروّجہ فلسفے کو اپنے لئے اس طرح ڈھال لیا کہ وہ اس کی ہندو جمالیات، اخلاقیات اور مابعدالطبیعیات سے ہم آہنگ ہو گیا تھا۔ایسا کرنے میں اس کو ان خطوط سے بہت مدد ملی جو

وہ اپنے پتا کو ہر اتوار کو لکھا کرتی تھی اور اس کے پتا جو اس کے خطوں کے جواب میں خط لکھا کرتے تھے۔ اس نے ان خطوط کو اپنی زندگی کا معمول بنالیا۔ یونیورسٹی اور اپنے کالج کی فلسفیانہ اور طبیعیاتی مجالس کی وہ خاصی سرگرم رکن تھی۔ اس حوالے سے وہ دوسرے کالجوں کی مجالس میں بھی کبھی کبھی شریک ہوتی تھی اور اسی سلسلے میں اس کی ملاقات تقی اور متین سے ہوئی۔ اس کو ان دونوں میں بھی وہ آدرش نظر آیا جو خود اس کا آدرش تھا اگرچہ وہ ان کے حصول کے لیے مختلف قسم کی راہیں اختیار کئے ہوئے تھے۔ تقی سے اس کی نوک جھوک بھی رہنے لگی تھی مگر متین صاحب نے اس کو اور طرح متاثر کیا۔ ان کا یونیورسٹی کی مجلس فلسفہ میں ایک لیکچر ہوا جس کا عنوان تھا ''مذہب بغیر وحی کے'' اس موضوع پر وہ بہت کچھ پڑھ چکی تھی اور اس کا اپنا نقطہ نظر بھی تھا۔ وہ شِوا سدھانت سے کافی متاثر تھی کہ وہ اس کے اجداد کا صدیوں سے مذہب تھا اگرچہ وہ ہندو فلسفہ کی دوسری مارگوں سے بھی واقف تھی۔ وہ کائنات کی پرم شکتی سے ملاپ اور وصال کی قائل تھی اور اس کے لیے کوشاں تھی۔

اس کے برعکس پروفیسر متین کا موقف تھا کہ انسان اپنی ذات میں ڈوب کر صرف اپنے امکانات کا شعور تو حاصل کرسکتا ہے مگر کسی ایسی اصولیات کا انکشاف نہیں کرسکتا جو تمام انسانوں اور تمام معاشروں کے لیے یکساں طور محکم اصول وضع کر سکے۔ کیونکہ انسانی ذات میں وہی اصول پنہاں ہیں جو صرف انسان کو انسان کے ساتھ ہم آہنگ کر سکتے ہیں مگر انسان کو دوسری مخلوق کے ساتھ ایک کائنات میں رہنا ہے اور ان سب میں جو اصول کارفرما ہیں ان کا انکشاف انسان کر بھی لے تو ان کی مختلف اصولیات کا انسان کی فطرت میں مضمر اصولیات سے ہم آہنگ ہونا لازم نہیں بلکہ مغرب کے مختلف علوم کے مطالعے سے یہی عیاں ہوتا ہے کہ ان کی اصولیات میں باہمی تصادم ہے اور اس تصادم میں انسان میں مضمر اصولیات کو زک پہنچتا ہے اور اس کے ساتھ دوسری مخلوق کو بھی اور زمین اور زمینی ماحول کو بھی۔ ان سب کے درمیان توازن کے لیے ان سب کی فطرت کا علم حاصل کر بھی لیا جائے اور اس کے لیے نجانے کتنے ہزار سال درکار ہوں گے، تو بھی ان سب کے درمیان آہنگ پیدا کر لینا ناممکن ہے کیونکہ ہر قسم کا علم مزید انکشافات کی روشنی میں بدلتا چلا جاتا ہے، بدلتا

چلا جائے گا، اس کے ساتھ خود انسان بھی اور اس کے ساتھ ان تمام تبدیلیوں کے اچھے برے اثرات کا معیار بھی بدلتا رہے گا۔ لہٰذا ناگزیر ہے کہ اس ہم آہنگی کا علم ان سب سے ماورا ہو۔ یہ علم کسی شے یا کسی ہستی یا کسی شکتی میں ہوگا جس میں خود شعوری بدرجہ اتم ہو اور وہ اس شعور کو مختلف قسم کی مخلوق اور کائنات تک مختلف طریقوں سے پہنچائے کیونکہ کائنات میں موجود ہر شے کی نوعیت اپنی اپنی نوع کے اعتبار سے مختلف ہے، جامد مادے سے لے کر انسان تک شکتی کی بہت سی شکلیں ہیں اور ان میں شعور کی بھی بہت سی سطحیں اور منازل ہیں۔ ہر ایک کا انتریامن الگ الگ نوعیت کا ہے۔ صرف انسان ہی ایسی مخلوق ہے جو اپنے انتریامن کی ہدایت سے انحراف کر سکتا ہے، صرف اسی کو اختیار ہے کہ اپنے کائناتی ماحول سے ہم آہنگ ہو یا متصادم۔ ایک بات تو صاف نظر آتی ہے کہ جہاں انسان نہیں ہے وہاں بنانے اور بگاڑنے کی قوتوں کے درمیان ایسا آہنگ ہے کہ کائنات میں ہر دم بناؤ زیادہ ہوتا ہے اور بگاڑ پر حاوی رہتا ہے۔ لیکن انسان کی جہاں جہاں دسترس ہے وہاں یہ عمل الٹا بھی ہو جاتا ہے: بگاڑ بناؤ پر حاوی رہے اور اشیاء میں انحطاط کی کیفیت آتی چلی جائے۔

ایسے حالات میں ناگزیر ہے کہ یہ فرض کیا جائے کہ کائنات سے ماورا اور اک خود شعور شکتی کو انسان، ہر شے پر اختیار اور قابو حاصل ہے، اگر قابو نہ ہو تو کسی شے کی فطرت یا ماہیت کا علم ممکن نہیں، چاہے قابو کی نوعیت کیسی ہی ہو: جسمانی ہو یا نظری۔

جب اس شکتی کو کائنات سے ماورا اور خود شعور مان لیا جائے تو یہ بھی جان لینا ہوگا کہ یہ شکتی ہی کائنات میں مضمر تمام شکتیوں کا منبع ہے اور چونکہ یہ منبع باشعور اور خود شعور بھی ہے اس لیے اس کو کائنات کا خالق بھی ماننا ہوگا اور جب خالق کے علاوہ اور اس سے الگ بھی بہت کچھ ہے تو لازم ہے کہ اس سب کی تخلیق کا کوئی مقصد بھی ہو۔ اور اگر مقصد بھی ہے تو خالق پر لازم آتا ہے کہ وہ اپنی مخلوق کو بتائے کہ اس کے لیے کیا مقصد طے کیا گیا ہے تاکہ مخلوق اس مقصد کی طرف رواں رہے۔ اس مقصد سے آگاہی دینے کو ہی وحی کہا جائے گا۔ لہٰذا ہر مخلوق کی وحی اس کے شعور کی سطح اور منزل کے مطابق ہوگی۔ انسان نہ صرف باشعور ہے اور خود شعوری پر قادر بلکہ خود شعوری کے قیام کے لیے اس نے زبان کو جنم دیا ہے اور شعور کے اور

خود شعوری کے تمام وظائف اس کے ذریعے سے طے کرتا ہے۔ لہٰذا لازم تھا کہ انسان پر لسانی وحی ہوتی رہتی اور جب اس وحی کو محفوظ رکھ لینے کے ذرائع انسان وضع کر لینے پر قادر ہو جاتا تو پھر اس وحی کے سلسلے کو ختم کر دیا جاتا اور انسان پر آخری وحی کو محفوظ کر دیا جاتا اور اس کو صلاحیت دی جاتی کہ وہ اس لسانی وحی کے معنی کا انکشاف کرے اور اس کو خود اسی ذریعے سے آگاہ کیا جاتا کہ وہ اس وحی کے معنی کا تعین کس طرح کرے اور اس کے معنی کے جہان میں کس طرح داخل ہو اور جب داخل ہو جائے تو اس جہان میں اپنے رشتوں کا تعین کس نہج سے کرے اور اس سوجھ بوجھ سے حاصل ہونے والے علم کا اطلاق جہانِ رنگ و بو میں کس طرح کرے۔

اس کے برعکس اگر کائنات سے ماورا کچھ نہیں ہے تو پھر کائنات میں جو نظام اور ہم آہنگی نظر آتی ہے اور تخریبی اور تعمیری عوامل میں تعمیر کو جو استعمار حاصل ہے اس کا کوئی جواز نہیں اور انسان کو کائنات کا جو علم حاصل ہوتا جاتا ہے اور جس جس شے کا علم اس کو حاصل ہوتا ہے اس پر اس کا اختیار ہو جانے کی بھی کوئی وجہ نظر نہیں آتی۔ اگر یہ سب کچھ بے معنی اور بے مقصد ہے تو حیاتِ انسانی کا بھی کوئی مقصد نہیں ہے۔ تو پھر وہ اس وحی کے معنی کا تعین کس طرح کرے اور اس کے معنی کے جہان میں کس طرح داخل ہو اور جب داخل ہو جائے تو اس جہان میں اپنے رشتوں کا تعین کس نہج سے کرے اور اس سوجھ بوجھ سے حاصل ہونے والے علم کا اطلاق جہانِ رنگ و بو میں کس طرح کرے۔

حالانکہ ہمارا مشاہدہ ہے کہ انسان بغیر مقصد کے عمل پر مائل نہیں ہو پاتا۔ اگر انسانی زندگی کو بھی بے معنی اور بے مقصد مان لیا جائے تو حیات کا سلسلہ ختم ہو جانا ناگزیر ہے کیونکہ حرکت کا کوئی جواز نہیں رہتا۔ لہٰذا اس کو صدیوں اور قرنوں پہلے ختم ہو جانا چاہیے تھا یا خود انسان ہی نے اس کو ختم کر دیا ہوتا۔ مگر حیات جاری ہے اور کائنات کی مختلف سطحوں کی تسخیر کر رہی ہے۔ لہٰذا پہلے مفروضے ہی کو صحیح ماننا ہوگا۔

اگر یہ مفروضہ صحیح ہے تو پھر وحی کسی ایک انسان کے ذریعے کسی معاشرے تک پہنچے گی اور وہ انسان تمام انسانوں میں افضل ہوگا اور اس وحی اور وحی کو لانے والے کی اطاعت ہی

میں انسان کی تمام صلاحیتوں کی زکا اور انسان کی فلاح ہوگی۔

چونکہ انسان کی جسمانی ضرورتوں کو پورا کرنے کے لیے صرف زمین ہی سے رزق حاصل کیا جاسکتا ہے اس لیے اس زمین کو کسی کی ملکیت میں نہیں دیا جاسکتا اور اس کے لیے لازم تھا کہ ایک ایسا نظام قائم کیا جائے جو نہ صرف اس رزق کی پیداوار کو بڑھائے اور اس کو تقسیم کرے بلکہ اس میں حائل عوامل اور انسانوں کو قابو میں رکھ سکے اور جب کسی خاص معاشرے میں یہ نظام جاری و ساری ہوجائے اور اس معاشرے کی رزقی ضروریات پورا ہوجانے کے بعد بھی رزقی وسائل اور رزق بچ جائے تو اس کو دوسرے انسانوں تک پہنچائے تا کہ ان کی زکا بھی ہوسکے۔لہٰذا ایک اخلاقیات کی تشکیل کے علاوہ اقدار کا ایک نظام بھی واضح کرنا ہوگا جس میں ہونے والے فیصلوں سے اس معاشرے کا ہر فرد شریک ہوسکے۔اور جب اس شرکت کے سبب معاشرے،معیشت اور سیاست میں مکمل ربط اور ہم آہنگی آ چکے تو پھر انسان اور کائنات کے باہمی تعلق کے لیے نظامِ روابط وضع کیا جائے تا کہ انسان کی ذہنی، تخئیلی اور تخلیقی صلاحیتوں کے اظہار کے طرائق اور ان کی باہمی ہم آہنگی کا نظام وضع کیا جاسکے تا کہ اس کے تحیر کو حکمت میں تشکیل دیا جاسکے ورنہ وہ کائنات کی پہنائیوں میں سرگرداں رہے گا اور یہ سرگردانی کئی قسم کے فسادات کو جنم دے گی جس سے خود اس کے نظامِ معاشرت،معیشت اور سیاست میں گڑبڑ اور بالآخر تضاد اور فساد پیدا ہونے کے خطرات وجود میں آئیں گے۔

اس کے جدی مذہب میں خود آگاہی اور الوہی شکتی میں جذب ہوجانا ہی انسان کی معراج تھا جس کے لیے کسی قسم کا معاشرتی،معاشی،سیاسی نظام بنانا لازم نہ تھا۔مگر اب اس کے سوا کوئی چارہ بھی اس کو نظر نہ آتا تھا۔

اس کشمکش میں مسدود ہوجانا اس کو کسی طرح بھی قبول نہ تھا لہٰذا اس نے مختلف ادیان کا مطالعہ شروع کیا اور ان سے اپنے دین کا تقابل بھی کرنے لگی۔اس مطالعے سے اس کے اندر جو ثقاہت پیدا ہوتی،اس سے جس قسم کی کیفیت پیدا ہوجاتی وہ اس کو اک تنگ جہان میں بند ہوجانے کا شدید احساس دلاتی اور وہ اپنے انتر کے دروازے کھولنے کے لیے بے

تاب ہو جاتی۔اس ضرورت میں شاعری اور ادب، موسیقی اور رقص اس کے کام آتے۔اس نے کالج میں فراغت کے لمحوں میں فرانسیسی بھی اتنی سیکھ لی تھی کہ اس زبان میں شعر و ادب کا مطالعہ کر سکتی تھی۔لہٰذا کئی زبانوں کے ادب و شعر اس کی رفاقت میں رہنے لگے اور اس کے تخیل میں کئی جہان آباد ہونے لگے مگر ان جہانوں کے رنگ و بو اس کی کشمکش کو محو نہ کر سکے کیونکہ وہ بھی اس سے مطالبہ کرتے تھے کہ وہ بھی اپنے شریر کے سنسار میں شانتی رچانے کے لیے اک نیا سنسار آباد کر لے جس میں کشمکش کی بجائے ہم آہنگی ہو، سنگیت ہو، نرت ہو، ولاس ہو، سندرتا ہو اور شکتی ہو۔اپنے ثقافتی ورثے میں رہتے ہوئے ایسا وشوا بنا لینا اس کو مشکل ہی نہیں ناممکن نظر آتا تھا۔اس ثقافتی ورثے میں جمال تھا، جلال بھی تھا مگر ان میں کوئی سمبندھ اور سنجوگ نہ ہو پاتا تھا۔کامنا کے لیے ارتھ الگ تھا، پرارتھنا کے لیے الگ، یوگ کے لیے الگ، دولت کے لیے الگ، اقتدار کے حصول کے لیے الگ مگر اس اقتدار کے لیے کوئی حدود نہ تھیں، ہر طرح کے کاریگر کے لیے الگ شاستر تھا مگر تمام کاریگروں کے لیے کوئی ایک دھرم نہ تھا، کوئی ایک ارتھ نہ تھا، کوئی ایک شاستر نہ تھا وید اور اپنشد صرف گیان کے لیے نور تھے۔

اس کشمکش نے اس کو دوسروں میں اتنی گہری دلچسپی لینا سکھایا جیسے کہ وہ نئے معاشرے کے بنانے میں اس کے ہونے والے ساتھی ہوں یا اس نئے معاشرے کے مخالف۔اس نے ملک کی سیاست کا بھی بغور مطالعہ کرنا شروع کر دیا۔کالج اور یونیورسٹی میں ایک نئے فلسفے کا ذکر اس کے کانوں تک پہنچنے لگا اور اس کے ساتھ چند نام: اشتراکیت، مارکسیت، کارل مارکس، اینگلز، لینن، روس، اسٹالن اور ٹراٹسکی۔پھر وہ اس فلسفے کے ماننے والوں کی ٹوہ میں رہنے لگی۔ایک دن وہ کالج کی چند ہم جماعتوں کے ساتھ باتوں میں مصروف تھی کہ کُنتی کشیپ وہاں آ نکلی۔یہ لڑکی اس کو کبھی نہ بھائی تھی کیونکہ وہ بیشتر معاملوں میں بہت بیباک بلکہ منہ پھٹ تھی۔معاشرے کے ہر ادارے پر کڑی تنقید کرتی تھی اور مذہب کا مذاق اڑاتی تھی اور کسی الوہی ہستی کی قائل ہی نہ تھی۔اس دن باتوں باتوں میں اس نے ذکر کیا کہ اس کے دوستوں نے ایک سٹڈی سرکل کی بنیاد رکھی ہے اور اس کا پہلا اجلاس اس سہ پہر کو

سیاست کے پروفیسر سرسوتی مکرجی کے یہاں ہوگا۔ جاتے جاتے کُنتی نے اس کی طرف متوجہ ہوکر کہا ''تم بھی چلوگی؟ تمہیں کہاں سے پک کروں۔'' اس کی آواز میں اس کی پوری شخصیت میں اس لمحے اتنی کشش تھی کہ اس نے جانے کا وعدہ کرلیا اور ایک چائے خانے میں ملنے کا وعدہ لے کر کُنتی چلی گئی اور جاتے جاتے اس کو ایسی نظروں سے دیکھا جس سے اس کی نظر میں کُنتی کی شخصیت بالکل ہی الگ نظر آئی اور محسوس ہوا کہ اس کی نظریں اس کو محیط کررہی ہیں۔ وہ چلی گئی تو اس کو اپنے آپ پر بہت حیرانی ہوئی۔ کچھ دیر وہ ہم جماعتوں سے باتیں کرتی رہی اور پھر جلد ہی ان سے الگ ہوگئی اور لائبریری کی طرف جانے کی بجائے گھر کی طرف چل دی حالانکہ اس کو لائبریری میں کتابیں واپس کرنی تھیں اور کچھ دوبارہ لینی تھیں۔ گھر پہنچ کر اس نے کھانا کھایا مگر توجہ دیئے بغیر کہ وہ کیا کھا رہی تھی۔ پھر وہ اپنے کمرے میں چلی آئی۔ لیٹنے کو جی نہ چاہا کتابیں الٹ پلٹ کرتی رہی۔ ریکارڈ پلیئر کی طرف متوجہ ہوئی، کوئی ریکارڈ منتخب نہ کرپائی۔ کئی ایک ریکارڈ یکے بعد دیگرے بجائے مگر جلد ہی ان کو بدل بدل دیا۔ آخر زچ ہوکر وہ ٹہلنے لگی۔ ٹہلتے ٹہلتے اس نے روی شنکر، اپنے ماموں زاد بھائی، جو اس سے چند ماہ چھوٹا تھا کو سیٹی کے ذریعے کوئی مغربی دھن گاتے سنا۔ اس کا یہ ماموں زاد خاصا مغرب زدہ تھا اور مغربی موسیقی کا بہت دلدادہ تھا۔ وہ سیٹی کے ذریعے نہ صرف دھنیں گا سکتا تھا بلکہ کئی ایک مغربی سمفنیوں کے ٹکڑے بہت خوبصورتی سے سیٹی کے ذریعے سے گا سکتا تھا۔ جو دھن وہ گا رہا تھا اس نے اس کے دل کو ایک ہلکا سا جھٹکا دیا اور وہ رک گئی اور اس نے غور سے سنا۔ دھن ایک گیت تھی۔ گیت میں بہت گہرا حُزن رچا تھا۔ اس نے دروازہ کھول کر روی شنکر کو آواز دی۔ روی شنکر یکایک چونکتے ہوئے بولا۔ ''ددی آپ آج یونیورسٹی سے جلد چلی آئیں؟ میں آپ کے کسی مطالعے میں تو حارج نہیں ہوا؟''

''ادھر آؤ ذرا!'' جب وہ اس سامنے آگیا تو اس نے اس سے پوچھا ''کیا بجا رہے تھے، آج تمہاری سیٹی بہت اداس ہے۔''

''ددی ایک امریکی حبشی سنگر ہے پال روبسن (Paul Robeson)، اس کا ایک گیت ہے Ol' Man River پچھلے مہینے ایک فلم تھی شو بوٹ (Showboat)، یہ اس کا

ایک گیت ہے۔ میں نے آج ہی اس کا یہ ریکارڈ خریدا ہے، بلکہ منگوایا ہے۔''

''مجھے سنواؤ یہ گیت!''

''آپ اور مغربی موسیقی! کیا بات ہے؟''

''کچھ نہیں...... کانوں کو دھن بھلی لگی۔ اس میں ایک مشرقیت ہے۔ ہمارے پہاڑوں میں جب رات بہت خاموش ہوتی ہے، ہلکی ہلکی ہوا چل رہی ہوتی ہے تو کبھی ایسے ہی گیت فضا پر محیط ہو جاتے ہیں۔ دل دھڑکتے دھڑکتے رک جاتا ہے اور سارا شریر کان بن جاتا ہے اور منش گیت میں ڈوب جاتا ہے، اس سے ایک ہو جاتا ہے۔''

''آج تو آپ شاعری کر رہی ہیں!''

''نہیں تو! میں تو صرف صحیح صحیح بیان کر رہی ہوں کہ کبھی کبھی کیا ہوتا ہے۔''

''شاید جیمز جین اور ایڈنگٹن نے سائنس دانوں کو بھی شاعری سکھا دی ہے۔''

''سائنس اور شاعری اور موسیقی حقیقت کی مختلف سطحوں کا صحیح صحیح بیان کرتے ہیں۔ بڑے بڑے سائنس دان اس دور میں شاعری اور موسیقی اور فلسفہ کے رسیا ہیں۔ آئن اسٹائن تو خود بھی وائلن بہت اچھا بجاتا ہے اور جیمز جین تو ''موسیقی اور سائنس'' کے نام سے ایک کتاب کا مصنف ہے...... اب باتیں نہ بناؤ پال روبسن کو سنواؤ۔''

وہ ریکارڈ لے آیا۔ اس نے بہت گہرے انہماک سے گیت کو سنا۔ اس نے محسوس کیا کہ تمام انسانیت کے دکھ اس گیت میں رچے ہیں۔ اس نے کئی بار گیت کو سنا۔ آہستہ آہستہ اس پر انکشاف ہونے لگا کہ گویے کی آواز میں ایسی گمبھیرتا ہے اور ایسی لپک ہے کہ معلوم ہوتا کہ وہ تمام کائنات پر چھا جائے گا اور اس کو آواز میں ڈھال دے گا اور صرف آواز ہی رہ جائے گی۔ اس نے زندگی میں پہلی بار جانا کہ اتھاہ دکھ کا تجربہ انسان کو دکھ کو راحت میں، مسرت میں، بدل دینے پر اکساتا ہے اور یہ کہ اتھاہ دکھ اور اتھاہ آنند کے ڈانڈے کسی سطح پر مل جاتے ہیں، ایک دوسرے میں جذب ہو جاتے ہیں۔ اس شعور نے اس کی الجھن کو ایک تیاری میں بدل دیا۔ اس نے اپنے اندر ایک توانائی کو، ایک شکتی کو انگڑائی لیتے محسوس کیا۔

''اتنے sad گیت پر بھی آپ مسکرا رہی ہیں! اس گیت میں امریکی حبشیوں کی غلامی کی ساری تاریخ سموئی ہے۔ آپ کے دل میں اس کے لیے رحم کا جذبہ نہیں جاگا۔''

وہ اس کے ثقاہت بھرے غصے پر کھلکھلا کر ہنس دی۔ اس کی ہنسی کی کھنک میں بڑا رعب تھا۔ وہ یکا یک کرسی سے اٹھ کھڑی ہوئی اور اس کے سر کو تھپکتے ہوئے بولی:

''نوجوان! تم نے گیت کے الفاظ کے حزن کو ہی سنا ہے، روبن کی آواز کی تمکنت اور شکوہ کو محسوس نہیں کیا۔ اس گیت میں بیشک امریکہ میں حبشیوں کی غلامی کے تمام دکھوں کا پورا پورا شعور رچا ہے مگر جس آواز میں یہ شعور ہم تک پہنچتا ہے وہ واضح طور پر کہتی ہے کہ ہم اپنے ماضی اور حال کے دکھوں پر آخر کار قابو پالیں گے انہی دکھوں کے باوصف اک نیا جہاں، اک نیا معاشرہ بنالیں گے جس میں دکھ نہ ہوں گے۔ اس گیت کو کبھی رات کی تنہائی میں سنو یا گرمی کی دوپہروں میں جب سب لوگ سو رہے ہوں پھر یہ گیت تمہیں اپنا آپ دکھائے گا...... گانے والے کی آواز میں ذہانت اور گہرا شعور جھلکتا ہے......''

''ددی۔ باتیں بنانا تو کوئی آپ سے سیکھے۔ کس خوبی سے آپ اپنی مسکراہٹ کو justify کر گئی ہیں؟''

''جواز پیش کرنے کی بات نہیں۔ بات کی سچائی بیان کرنا جواز پیش کرنا نہیں ہے۔ میں سائنس کی طالب علم ضرور ہوں مگر سائنس ہی میرا جہاں نہیں ہے۔ میں کئی جہانوں میں سفر کر رہی ہوں۔ آئن اسٹائن اور شروڈنگر، پلانک اور ہائزن برگ کے علاوہ کالی داس، رامبو، بادلیر، رلکے، پروسٹ، ویلری، لارنس، شیکسپیئر، ورڈز ورتھ، بلیک میرے ساتھی ہیں۔ اپنشد میرے خون میں رچے ہیں۔ میں نے ہر طبقے کی زندگی کو خاصا قریب سے دیکھا ہے، محسوس کیا ہے۔ میں یہ بھی جانتی ہوں کہ گوشت پوست کبھی ڈھلک جائے گا، بڑھاپا آئے گا اور آخر ایک دن یہ سب کچھ جل جائے گا۔ مگر اس سب کچھ کے شعور سے اداس ہو جانے اور ہاتھ پر ہاتھ رکھے ماتم کرتے رہنے کا کوئی جواز نہیں۔ انسانی دکھوں اور معاشرے کے ظلم کے باوجود مسکرانے اور کھلکھلا کر ہنس دینے کی جرأت ہی انسان کو اس ساری زندگی کو سورگ میں بدل دینے کی ضمانت دیتی ہے......''

دونوں بہت دیر تک خاموش رہے۔ پھر وہ اٹھی اور روی سے کہنے لگی۔ ''کسی کیفے میں جانا پسند کرو تو آدھ گھنٹے میں تیار ہو جاؤ۔ اتنی دیر میں بھی تھوڑا سا لیٹ لوں۔ تیار ہو کر میں تمہیں ساتھ لے لوں گی۔''

جب دونوں کیفے ڈینیوب میں داخل ہوئے تو کنتی کشیب ایک رسالہ دیکھ رہی تھی اور اس کے سامنے رکھی کافی سے ہلکا ہلکا دھواں اٹھ رہا تھا۔ رسالہ پڑھتے ہوئے، سر اٹھائے بغیر اس نے اپنی خوبصورت عینک سے جھانکتے ہوئے کہا کہ اس کو یقین تھا کہ وہ ضرور آئے گی۔ روی کا کنتی سے تعارف کرایا اور اس نے روی سے پوچھا کہ کافی کے ساتھ کچھ کھانا پسند کرے گا۔ اس نے بتایا کہ وہ صرف کافی پر ہی قانع رہے گا۔ کافی پی چکنے کے بعد وہ کیفے سے اٹھے تو اس نے گرد و پیش کو محسوس کیا۔ دیواروں اور چھت پر نیلا رنگ تھا، پردے اور روشنی نیلے رنگ کی تھی۔ اس ہلکے نیلے رنگ میں کافی سکون تھا۔

کنتی کی کار میں وہ پروفیسر مکر جی کے بنگلے پر پہنچے۔ ڈرائنگ روم میں بہت سے لڑکے اور چند لڑکیاں بیٹھے باتیں کر رہے تھے۔ بنگلے کے کسی کونے سے مغربی موسیقی ابھرتی، پھیلتی اور دوڑتی سنائی دے رہی تھی۔ تینوں بیٹھ گئے تو کنتی نے کئی لڑکوں سے ہیلو ہیلو کیا اور پھر سوشیلا اور روی کو بتاتی چلی گئی کہ کون کون تھا۔ سبھی امیر لوگوں کے بیٹے بیٹیاں تھے۔ اتنے میں ایک خوبصورت جوان، کھدر کا لباس پہنے اور شانوں پر گرم چادر ڈالے داخل ہوا۔ کئی لڑکوں نے اس کا نام لے کر کہا۔

''چندر بھان! تم نے بہت انتظار کرایا۔ کہاں تھے تم؟ ساوتری نہیں آئی؟''

''آ رہی ہے، اسی کے گھر دیر ہو گئی۔ وہاں رگھبیر داس، ہندی کے مشہور شاعر، مہمان آئے ہوئے ہیں۔ میں جب وہاں پہنچا تو محفل گرم تھی۔ رکنا ہی پڑا۔ بورژوا ہونے کے باوجود ان میں سماجی شعور کافی گہرا ہے۔ شاعری میں نہیں، باتوں میں۔ ان کو کہیں جانا تھا اس لیے ساوتری ان کو وہاں چھوڑ کر آئے گی۔''

وہ ابھی باتیں ہی کر رہے تھے کہ تیزی سے کار رکنے اور کار کا دروازہ زور سے بند کرنے کی آواز آئی اور ایک سانولی سی مگر طرحدار سی لڑکی کمرے میں داخل ہوئی اور سب

سے معذرت کرتے ہوئے پروفیسر مکرجی کے سامنے خالی کرسی پر بیٹھ گئی۔

سٹڈی سرکل کا افتتاح انٹرنیشنل کے نغمے سے ہوا جس کو چند لڑکوں اور دو لڑکیوں نے مل کر گایا۔ اس کے بعد پروفیسر نے ہندوستان کی معاشی اور سیاسی صورتحال میں مضمر انقلابی قوتوں پر ایک مقالہ پڑھا جس میں ان قوتوں کو استعمال کرنے کا ایک پروگرام پیش کیا گیا تھا۔

مقالے کے دوران سب کا انہماک اتنا گہرا تھا کہ معلوم ہوتا تھا کہ جب وہ کمرے سے نکلیں گے تو انقلاب سیلاب کی صورت میں بہہ نکلے گا مگر اس انہماک کے ساتھ سوشیلا نے سب کے اعلیٰ لباس کی طرحداری کو محسوس کیا اور اکثر کے ہاتھوں اور کلائیوں اور سگرٹ دبائی ہوئی انگلیوں کو دیکھا تو اس کے دل میں معاً خیال آیا کہ ان کے جیتے جی یا ان کے ہاتھوں انقلاب نہیں آ سکتا، اس کے لیے اور طرح کے ہاتھ اور مختلف نوعیت کی کلائیوں اور ہتھیلیوں کی ضرورت ہوگی۔ اس کو اپنی زمینوں پر کام کرنے والے کسان، ترکھان اور لوہار اور موچی کے ہاتھوں کا کھردراپن یاد آیا۔ اس ساری محفل میں صرف ایک شخص ایسا تھا جس کا انہماک اس کے جسم کے انگ انگ کے اطوار سے ہم آہنگ تھا، جس کے چہرے کی سنجیدگی اس کے مردانہ حسن کی نقیض نہ تھی۔

چندر بھان کا نام اس کے ذہن میں گونجا کیا۔ اس کے پھوپھی زاد بھائی کا بھی یہی نام تھا اور وہ بھی یونیورسٹی ہی کا طالب علم تھا مگر اس نے بچپن کے بعد اس کو کبھی نہ دیکھا تھا۔ جب بھی وہ ان کے یہاں جاتی تھی تو ارملا کی دوستی اور اس کی باتیں اس کو ہر شے سے بے نیاز کر دیتی تھیں۔ پھر چندر بھان بھی ہمیشہ گاؤں میں رہتا تھا۔ جب وہ گھر آتا تو رات ہو چکی ہوتی اور وہ بستروں میں گھسے ہوتے اور صبح ہی صبح وہ سب سے پہلے دودھ اور شہد کا ناشتہ کر کے اور کچھ سیب ساتھ لے کر چلا جاتا تھا۔ مامی کے پاس وہ ضرور حاضری دیتا تھا اور وہ رات کو بھی اس کے انتظار میں جاگتی رہتی تھیں اور صبح بھی اس کے ساتھ ناشتہ کرتی تھیں، اس وقت تک وہ پرارتھنا وغیرہ سے فارغ ہو چکی ہوتیں۔ اس کی ماں چندر بھان کی بہت مداح تھی۔ کبھی کبھار جب وہ بستروں میں گھسی باتیں کرتی ہوتیں تو مامی کے کمرے سے

اپنے کمرے، اپنی ماں کے کمرے، کی طرف جاتے ہوئے اس کے قدموں کی چاپ وہ اکثر سنا کرتی۔ اگر اس دن کمرے میں دریاں اور قالین نہ ہوتے تو وہ اس کی چاپ سے اس کو پہچان سکتی تھی کہ وہ اس کا پھوپھی زاد ہے یا کوئی اور۔ کمرے میں موجود چندر بھان کی شکل و صورت ارملا اور اس کے ماں باپ سے بالکل نہ ملتی جلتی تھی اگر چہ بعض دفعہ جب وہ کنکھیوں سے چندر بھان کو دیکھتی تو اس لگتا کہ ان سانچوں سے اس کا کوئی رشتہ ہے جنہوں نے ارملا اور اس کے ماں باپ کو صورت عطا کی تھی۔

اس کے ذہن میں ایک خیال ابھرا کہ وہ چندر بھان کو اس ماحول سے باہر دیکھنا پسند کرے گی۔ اس خیال کے شعور سے اس کے جسم میں نہایت ہی خفیف سا ارتعاش پیدا ہوا اور اس کے دل میں جذب ہو گیا۔ یہ احساس اس کو بھلا سا لگا۔

لیکچر کے بعد کچھ لڑکوں نے اور ایک لڑکی نے کئی سوال کئے اور مکر جی نے بہت ہی متانت سے ان کا جواب دیا۔ ان سوالات کے دوران کئی بار اس کے دل میں خواہش ابھری کہ وہ بھی کوئی سوال پوچھے۔ ہر بار وہ اپنے آپ پر قابو پانے کی کوشش کرتی اور کامیاب ہو جاتی۔ ایک بار پروفیسر نے جواب دیتے ہوئے اس کی طرف دیکھا اور بات کو ختم کر کے اس سے مخاطب ہوا۔

''آپ کچھ پوچھنا چاہ رہی ہیں اور اس بات کو بار بار دبا جاتی ہیں۔ پوچھ لیں شاید میں آپ کی بات کا جواب دے سکوں۔''

اپنی طرف سب کو متوجہ دیکھ کر وہ چونک گئی اور اس نے سنا کہ وہ کچھ پوچھ رہی ہے۔ وہ کہہ رہی تھی:

''میں طبیعیات کی طالب علم ہوں۔ جانتی ہوں کہ اگر کسی فیلڈ میں کوئی توانائی کھلی چھوڑ دی جائے تو ہم پہلے سے تعین نہیں کر سکتے کہ وہ فیلڈ پر کس طرح اثر انداز ہو گی۔ لہٰذا انقلاب کے ذریعے سے جن طاقتوں کو آپ معاشرے میں کھلا چھوڑنے کا پروگرام بنا رہے ہیں اس کے متعلق آپ کو کس طرح یقین ہے کہ ان سے وہی اثرات مرتب ہوں گے جن کی آپ کو توقع ہے۔ طبیعیات میں ہم پہلے سے پورے ماحول پر قابو رکھنے کا انتظام کر لیتے ہیں اور

ساتھ ہی ساتھ اثر کو ماپنے کا بھی۔ مگر انسانی معاشرے کے ماحول پر ہمارا قابو ہو ہی نہیں سکتا جب تک کہ ہم یہ یقین سے نہ جان لیں کہ کسی خاص معاشرے کے انسان میں کیا کیا قوتیں پنہاں ہیں اور ان کے مجموعی امکانات کیا کیا ہو سکتے ہیں اور ان میں سے فرداً فرداً کون سے امکانات انقلاب لانے میں مددگار ثابت ہو سکتے ہیں......''

اس کو اپنے آپ پر حیرت سی ہوئی اور اس نے ایک لمبا سانس لیا اور بولتی چلی گئی:

''لیکن انسان کے بارے میں انسان کا علم ابھی اتنا محدود ہے کہ انسان کی سائنس کا تصور بھی نہیں کیا جا سکتا۔ کچھ حیوانوں پر تجربے کئے گئے ہیں مگر ان سے جو نتائج اخذ کئے گئے ہیں ان سے ایسے اصول وضع نہیں ہو سکتے جن کا اطلاق انسانی معاشرے پر کیا جا سکے۔ اب تک جتنے بھی انقلاب آئے ہیں یا لائے جا چکے ہیں ان کے متعلق کوئی بھی یقین سے اور ایمانداری سے یہ نہیں کہہ سکتا کہ اس انقلاب زدہ معاشرے پر ایسے اثرات ہوئے ہیں جن کو انسان کی ارتقائی منازل کی بنیاد بنایا جا سکتا ہے۔ کوئی بھی انقلابی معاشرہ انقلاب کے اثرات کو ہضم نہیں کر سکا اور اس بدہضمی کے اثرات صدیوں تک رہتے ہیں اور اس معاشرے کی کئی نسلوں کو زندگی کی دوڑ میں بے اثر کر دیتا ہے۔ انقلاب فرانس کی مثال اس بات کا ثبوت ہے۔ اس معاشرے کی تاحال کوئی سمت متعین ہی نہیں کی جا سکی۔ روس کے انقلاب کے متعلق ہمارا علم بہت ہی محدود اور جستہ جستہ ہے اور اس پر اعتبار کر لینا عقل کو محبوس کئے بغیر ممکن نہیں۔ میں موجودہ معاشروں سے یقیناً مطمئن نہیں اور نہ ان پر قانع مگر پورے علم کے بغیر کسی ایسے تجربے کے حق میں بھی نہیں جس کے اثرات کو قابو میں رکھنے کے لیے پہلے سے بندوبست نہ کیا جا سکتا ہو۔''

اس کی آواز میں اتنا اعتماد تھا کہ وہ جب چپ ہو گئی تو اس کو اپنے آپ پر قطعاً حیرانی نہ ہوئی اور پورے کمرے میں کچھ دیر خاموشی سرسراتی رہی۔ اس نے محسوس کیا سب اس کی طرف متوجہ تھے صرف چندر بھان سر جھکائے کسی سوچ میں کھویا تھا۔

پروفیسر مکرجی نے سکوت توڑا اور بولے:

''بھئی آپ نے تو اتنے سوال اٹھا دیئے ہیں کہ ان کا جواب دینے کے لیے بہت

وقت درکار ہوگا۔ ایک بات تو آپ بھی مانتی ہیں کہ موجودہ معاشرہ کسی طرح بھی قابلِ قبول نہیں۔ اس میں ترامیم سے اس کی فطرت کو نہیں بدلا جا سکتا اور اس ترمیم شدہ معاشرے سے exploitation کو ختم نہیں کیا جا سکتا۔ لہٰذا اس کا مٹا دیا جانا ہی عین مناسب ہے۔''

''کسی شے کا مٹا دیا جانا بہت ہی آسان ہے لیکن اس کے بعد کچھ تعمیر کر لینا یا کر سکنا یقینی نہیں......'' سوشیلا نے گرہ لگائی۔

''آج ہم اختلاف کرنے پر اتفاق کر لیں تو بہتر ہوگا ورنہ یہ بحث شاید کبھی ختم نہ ہو۔ آپ بھی غور کریں ہم بھی غور کرتے ہیں۔ مگر ہم معاشرے کی تباہی سے خوف زدہ نہیں ہیں...... بہرحال اتنا میں ضرور کہوں گا کہ تباہی کے بعد تعمیر کے لیے صرف پرولتاریہ کی آمریت لازم ہے ورنہ تباہی کے باوجود ویسا ہی معاشرہ دوبارہ لوٹ آئے گا اگرچہ اس میں کچھ ترامیم بھی کر لی جائیں۔''

اس بات پر بحث ختم سمجھ لی گئی اور چائے، کافی اور سینڈوچ آ گئے۔ کئی لڑکے اس کے پاس آئے اور اس سے تبادلہ خیال کرنے کی پیش کش کی۔ کنتی نے اس سے کہا کہ اس کو معلوم نہ تھا کہ اس نے معاشرے کے مسائل پر اتنا گہرا غور کیا ہے۔ وہ تو یہی سمجھتی تھی کہ وہ سائنس کی طالب علم ہے مگر اس کا سائنسی علم اس کے تصورات پر اثر انداز نہیں ہے۔ اگرچہ اس نے بعض دوستوں سے سن رکھا تھا کہ اس کی دلچسپیاں طبیعیات تک ہی محدود نہیں ہیں۔

اس محفل کے کئی ہفتے بعد وہ ایک سہ پہر یونیورسٹی کی لیبارٹری سے نکل رہی تھی کہ سامنے کی سڑک پر چندر بھان چلا آ رہا تھا۔ دنوں نے ایک دوسرے کو دیکھا، دونوں ٹھٹکے اور پھر یکا یک ایک دوسرے کی طرف بڑھ گئے۔ چندر بھان نے بات کا آغاز کیا۔

''اس دن میں آپ سے بات کرنا چاہتا تھا مگر اتنے لوگ تھے اور پھر میں آپ کی باتوں پر پوری طرح گرفت بھی نہ کر پایا تھا۔ میرا ذہن کچھ اس قسم کا ہے کہ میں پہلے باتوں کو جذب کرتا ہوں اور پھر جب وہ میرے ذہن اور دل میں ابھرتی ہیں تو میں ان کی جان پہچان کرتا ہوں۔ یہ عمل بالعموم طویل ہوتا ہے۔ مگر کبھی کبھی میں فوری طور پر بھی بات کا احاطہ کر لیتا ہوں۔ مگر اس دن ایسا نہیں ہوا آپ کی باتیں اس امر کی متقاضی تھیں کہ ان کو جذب کیا

جائے اور ان کو اپنے اندر حل ہونے کی اجازت دی جائے اور پھر دل و دماغ میں ان کے اثرات کو دیکھا جائے۔

آیئے کہیں بیٹھتے ہیں۔''

وہ اسے ایک بڑے سے ریستوران میں لے گیا جس کی اوپر کی منزل بھی تھی۔ وہاں خاموشی تھی۔ کافی دیر دونوں اپنی دلچسپیوں کے بارے میں ایک دوسرے کو آگاہ کرتے رہے۔ ان کے مطالعے میں کئی مصنف اور شاعر مشترک تھے۔ دونوں نے ان مصنفین کا بھی ذکر کیا جس سے ان میں سے ایک آشنا نہیں تھا۔ چندر بھان کو مذہب میں بالکل دلچسپی نہ تھی باوجودیکہ اس کو اپنے ماں باپ کے مذہب اور اس کے مناسک میں ایک حسن کا احساس تھا۔ شام ہو رہی تو وہ دونوں اٹھے اور باہر نکلے۔ وہ اس کو گھر تک چھوڑنے کے لیے ساتھ ہو لیا۔ باتیں کرتے کرتے ایک گھر کے سامنے پہنچے تو چندر بھان نے اس کو بتایا کہ وہ اس مکان میں اپنے ایک کم عمر دوست کو ملنے کئی بار آ چکا ہے۔ جب وہ رکی رہی تو اس نے پوچھا کہ وہ رک کیوں گئی ہے۔ جب اس نے اس کو بتلایا کہ وہ بھی اسی گھر میں رہتی ہے تو اس کو بہت اچنبھا ہوا اس نے بتایا کہ اس کو کبھی خیال ہی نہ آیا تھا کہ اس گھر میں وہ بھی رہ سکتی ہے۔ اس پر اس نے بتایا کہ اس میں حیرانی کی بات ہی کیا ہے کیونکہ وہ اپنے ماموں کے یہاں رہ رہی ہے۔ اس پر وہ سوچ میں پڑ گیا۔ سوشیلا نے اس کو گھر میں داخل ہونے کی دعوت دے دی۔ وہ دونوں گھر میں داخل ہو گئے۔ انہوں نے دیکھا کہ ڈرائنگ روم میں روشنی ہے۔ سوشیلا یہ کہہ کر اندر چلی گئی کہ وہ ممانی کو بتا آئے کہ وہ آ گئی ہے۔ چندر بھان اکیلا ہی ڈرائنگ روم میں داخل ہوا۔ ڈرائنگ روم میں کچھ مہمان تھے اور سوشیلا کے ماموں ٹھاکر ستیہ وان۔ اس کے داخل ہوتے ہی سب لوگ اس کی طرف متوجہ ہوئے۔ ٹھاکر نے اس کو خوش آمدید کہا اور اس کا تعارف یہ کہہ کر کرایا کہ وہ اس کے بیٹے کے ایک عالم دوست ہیں۔ جب وہ بیٹھ گیا تو اس نے محسوس کیا کہ ایک مہمان کے ساتھ بیٹھی ہوئی خاتون کی نظریں اس پر گڑی تھیں۔ اس ادھیڑ عمر مگر خوش رو اور مدبّر عورت نے اپنے ساتھی سے کچھ کہا اور اس پر اس کے چہرے پر حیرانی اور خوشی کے ملے جلے آثار نمایاں ہوئے۔ اس نے اس کی طرف غور سے دیکھا اور

سر ہلاتے ہوئے بولا:

''میاں! شوکوٹ کے ٹھاکر شِو آنند سے تمہاری کیا رشتہ داری ہے؟ اس پر چندر بھان چونکا اور بتایا کہ وہ ان کا بیٹا ہے۔ اس پر دونوں مہمان اور ٹھاکر ستیہ وان بہت خوش ہوئے۔ اور ایک ساتھ بول اٹھے۔''

''تب تو تم اپنے ہی ہوئے۔''

پھر پنڈت کنول نارائن بولے۔

''تمہاری چال اور بیٹھنے کا اور نظریں اٹھانے کا انداز بالکل پتا جیسا ہے۔ تمہارے پتا برسوں میں جب بھی شہر آتے ہیں تو ہمارے یہاں ہی ٹھہرتے ہیں۔ ہم دونوں نے ایک ہی استاد سے سنسکرت پڑھی ہے اگرچہ وہ مجھ سے کچھ سال بڑے ہیں مگر استاد کے یہاں ان سے ملاقات ہوتی رہی اور یہ ملاقات دوستی میں ڈھل گئی۔

مجھے انہوں نے کبھی نہیں لکھا کہ تم اس شہر میں پڑھتے ہو۔ میں ان سے شکایت کروں گا۔ کبھی ہمارے یہاں آنا۔ میرے سب سے چھوٹے لڑکے کی سالگرہ اگلے مہینے کی بیس تاریخ کو ہے۔ ضرور آنا۔''

چندر بھان نے وعدہ کرتے ہوئے ان کو بتایا کہ وہ خود ہی ہوسٹل رہنا چاہتا تھا تاکہ اس کو کچھ آزادی ملے۔ کسی کے گھر رہنے سے یہ آزادی محدود ہو جاتی اور خاص اوقات کا پابند ہو جانا پڑتا۔

''ہاں میاں! نوجوانوں نے آزادی کا لفظ سن لیا ہے۔ اس تصور سے ان کو اپنے ماں باپ سے بھی زیادہ محبت ہے۔ میاں! آزادی بغیر روایت کے کوئی پھل نہیں دیتی...... بہرحال اب ملتے رہنا۔ تمہارے پتا سے تو اب ملاقات بہت کم ہوتی ہے۔''

اتنے میں سوشیلا آ گئی۔ ماموں نے دیر سے آنے کی وجہ پوچھی تو اس نے بتایا کہ وہ چندر بھان کے ساتھ چائے پینے کو چلی گئی تھی۔ اس پر اس کے ماموں اور اس کے مہمان بہت محظوظ ہوئے۔ اس پر اس نے پوچھا کہ آخر محظوظ ہونے کا سبب کیا ہے۔

اس پر اس کے ماموں نے اس کو بتایا کہ شاید اس کو معلوم نہیں ہے کہ چندر بھان کون ہے کیونکہ کچھ دیر پہلے تک خود ان کو معلوم نہیں تھا کہ وہ کون ہے۔اس پر اس نے تعجب کا اظہار کیا اور اقرار کیا کہ وہ واقعی اس کے سوا کچھ نہیں جانتی کہ وہ یونیورسٹی میں باٹنی کے بہت ذہین طالب علم ہیں۔اس پر انہوں نے مسکراتے ہوئے دونوں کا تعارف کرایا۔

چندر بھان تمہارے پھوپھی زاد ہیں۔اس پھوپھی کے بیٹے ہیں جن کا تم اکثر ذکر کیا کرتی ہو۔اس پر وہ دونوں بہت ہی حیران ہوئے۔اس پر انہوں نے چندر بھان کو بتایا کہ سوشیلا ان کی بھانجی ہے۔اس پر وہ اور بھی حیران ہوا۔اس کے چہرے پر ایسی حیرانی تھی جیسے کہ اس ہرن کے چہرے پر جو یکا یک کسی پھندے میں پھنس جائے۔

اتنے میں پنڈت کنول نارائن کی بیوی بولی:

''ٹھاکر جی! آج تو دعوت کا موقع پیدا ہو گیا ہے۔کچھ ہو جائے!''

''سوشیلا کی ممانی آجائے تو اس سے کہیں۔دعوت تو بعد میں کروں گا۔اتنے قریبی رشتہ داروں کا ایسا ڈرامائی تعارف تو شاید ہی ہوا ہو۔سنسکرت ڈرامہ میں تو ایسا منظر مجھے تو یاد نہیں پڑتا۔شیکسپیئر میں کہیں ہو تو ہو۔''

اتنے میں سوشیلا کی ممانی کمرے میں داخل ہوئی اور جب وہ بیٹھ چکی تو ٹھاکر ستیہ وان نے اس کو بتایا کہ اس کے سامنے سوشیلا کا پھوپھی زاد بیٹھا ہے اور یہ کہ دونوں ایک دوسرے کو جانتے تو تھے مگر یہ نہ جانتے تھے کہ وہ کتنے قریبی رشتہ دار ہیں۔اس پر ٹھاکرانی نے کچھ کہنا چاہا مگر اس کا منہ کھلے کا کھلا ہی رہ گیا۔اس پر پنڈت کنول نارائن، ان کی پتنی اور ٹھاکر خود کھلکھلا کر ہنس دیئے۔ٹھاکرانی کبھی چندر بھان کو اور کبھی سوشیلا کو دیکھتی تھی اور اس کی حیرانی بڑھتی ہی جاتی تھی اور ان کی ہنسی بلند سے بلند تر ہوتی گئی۔اتنے میں روی شنکر کمرے میں داخل ہوا سب کو آداب کیا اور چندر بھان کو دیکھ کر بولا۔

''آج آپ کو بہت تلاش کیا۔کہاں تھے آپ؟ بڑی ضرورت تھی آپ کی۔''

اس پر ہنسی میں اور بلندی آ گئی۔روی شنکر نے حیرانی سے چندر بھان سے پوچھا:

''یہ کس پر ہنسا جارہا ہے، کوئی مزاح کی بات آپ نے کی ہے؟ مگر آپ سے تو ایسی توقع مجھے کبھی نہ تھی۔''

''ارے بیٹے! سنو گے تو تم بھی ہنسو گے......تو سنو!...... یہ تمہارے دوست جانتے ہو کون ہیں؟......سوشیلا کے پھوپھی زاد ہیں اور یہ دونوں آج اکٹھے چائے پیتے رہے ہیں اور نہ جانتے تھے کہ ایک دوسرے کے ماموں زاد اور پھوپھی زاد ہوتے ہیں۔ یہ تو پنڈت کنول نارائن کی پتنی نے تمہارے دوست کو پہچانا۔ جب تمہاری ماتا کو یہ سب کچھ بتایا گیا تو وہ اس قدر حیران ہوئیں کہ ان کا منہ کھلا اور کھلے کا کھلا ہی رہ گیا۔''

اب سب نے ہنسنا شروع کر دیا۔ روی شنکر کے چہرے پر حیرانی اور کرب کے آثار ہویدا تھے۔ اس پر باپ نے پوچھ لیا:

''تمہارے چہرے پر تکلیف کے آثار کیوں ہیں۔ طبیعت تو ٹھیک ہے۔'' روی شنکر پھٹ پڑا۔

''مجھے جس سے پیار ہوتا ہے اس کو ددی ہتھیا لیتی ہیں۔ اب دوستوں میں بھی ان کی شرکت کو قبول کرنا ہوگا۔''

''تمہاری تو دوستی بعد کی ہے ان کی رشتے داری تو تمہارے جنم سے بھی پہلے کی ہے......تمہیں تو خوش ہونا چاہیے کہ تمہاری ددی اور تمہارے دوست میں اتنی قریبی رشتے داری نکل آئی ہے۔'' ''میرے دوست! دل کوئی مکان تو نہیں ہے کہ اس کے حجم کے مطابق اس میں محدود لوگ ہی سما سکیں۔ دل تو پوری کائنات سے بھی بڑا ہے اس میں تو کئی جہاں سما جائیں۔'' چندر بھان نے اس کو تسلی دی۔

بات ہوئی نا! آخر ہو نہ ٹھاکر شِو آنند کے پتر۔'' پنڈت کنول نارائن بولے اور پھر ٹھاکرانی سے مخاطب ہوئے۔

''بھابھی! اب کچھ ننھی سی دعوت کا سامان ہو جائے۔ باقاعدہ دعوت کا تو بھائی نے وعدہ کر لیا ہے۔''

''آپ کے لیے تو مٹھائی ہی آئے گی مگر یہ نوجوان مٹھائی کے قائل نہیں ان کے لیے تو کچھ تلنا ہی پڑے گا۔ میں ابھی آتی ہوں۔''

ٹھاکرانی چلی گئیں تو روی شنکر نے چندر بھان سے کانا پھوسی کی۔ اس پر پنڈت کنول نارائن بول اٹھے۔

''اس سمے سب کچھ بھول جاؤ۔ یہ باتیں کل کے لیے اٹھا رکھو۔ آج تو تم اپنے ریکارڈ پلیئر کو یہیں اٹھوا لاؤ اور کچھ موسیقی سنوادو۔ ہلکی پھلکی اور "Gay"......

کچھ باتیں ہوتی رہیں۔ روی شنکر ریکارڈ پلیئر اٹھوا لایا۔ ٹھاکرانی کھانے پینے کا سامان نوکروں سے اٹھوا لائیں۔

پنڈت جی بولے ''بھابھی آج تو فرش پر ہی کھانا پروسیئے۔ ڈائنگ ٹیبل کو آج کی رات بھول جائیں۔''

ریکارڈ بجتے رہے اور وہ سب کھانا کھاتے رہے۔ کھانا کھا چکے تو روی شنکر اٹھ کر چلا گیا اور چند لمحوں بعد وینا اٹھا لایا اور سوشیلا کے سامنے رکھ دی اور بولا:

''میرا دوست آپ نے ہتھیا لیا ہے۔ اس کی خوشی میں کچھ سنا دیجئے۔''

سوشیلا نے سب کی طرف دیکھا۔ ہر ایک چہرے پر فرمائش تھی اور چندر بھان کے چہرے پر اشتیاق بھی تھا۔ سوشیلا نے راگ کو اس شکل میں جگایا جو اس کی شکل مسلمانوں کے آنے سے پہلے تھی۔ اک سماں سا بندھ گیا اور اس کے ساتھ آہستہ آہستہ اس نے آواز سے وینا کی سنگت کی۔ پھر آہستہ آواز چھا گئی اور وینا آواز کی سنگت میں چلنے لگی۔ چندر بھان نے محسوس کیا کہ اس کے دل و دماغ میں ایسی کیفیت پھیل رہی ہے جس کو اس نے پہلے کبھی محسوس نہ کیا تھا۔ یہ کیفیت احساس جمال سے منفرد تھی اس میں بہت گہرائی اور بہت بلندی تھی۔ اس کو لگا کہ اس کے سارے حواس مٹ گئے ہیں اور وہ صرف ایک روح ہے جو آہستہ آہستہ بہہ رہی ہے اور بہے چلی جا رہی ہے اور منونتر کے ختم ہونے تک بہتی رہے گی۔

گانے والی نے اڑتے ہوئے پھیلے ہوئے راگ کو واپس بلانا شروع کر لیا اور فضا سے

لے نے گانے والی کے گلے میں لوٹنا شروع کر دیا۔ راگ گانے والی کے گلے میں سونے لگ گیا، سو گیا۔ وینا کے تاروں پر انگلیاں آہستہ آہستہ چلنے لگیں اور پھر رک گئیں۔ نغمہ آخری بار فضا میں چمکا اور سو گیا۔ وینا سوشیلا کے شانے سے لگی بہت ہی معصوم سی لگ رہی تھی جیسے کہہ رہی ہو کہ اس کا کوئی قصور نہیں، اس کو چھیڑا گیا تھا اور وہ جھنجھنا اٹھی تھی۔ کافی دیر تک سب پر ایک جادو سا طاری رہا۔ سوشیلا نے شانے سے وینا کو ہٹایا اور گود سے اٹھا کر قالین پر رکھ دیا مگر اس کی ایک انگلی مدھم کے تار سے ٹکرا گئی۔ سر فضا میں لپکا اور جلد ہی گھبرا کر تار میں واپس لوٹ آیا۔ اس لپکنے نے سب کو چونکا دیا۔

وینا کے قالین پر سو جانے کے بعد پنڈت جی کی پتنی نے سوشیلا کو داد دی، بلائیں لیں اور اس کے لیے دعا کی کہ اس کے من پر شِو آنند اتر آئے۔ ٹھاکر نے بھانجی کے کمال پر حیرت بھرے فخر کا اظہار کیا۔ روی شنکر نے شکایتاً کہا:

''ہمیں تو آپ نے کبھی گنگنا کے بھی نہیں دیا، کبھی کبھار وینا کی جھنجھناہٹ کانوں میں پڑ گئی تو پڑ گئی مجھے تو کبھی گمان بھی نہ گزرا تھا کہ آپ اتنی گن ونتی ہیں بس اب ہم تو مارے ہی گئے۔ کسی میدان میں ہمارے لیے کوئی مقام نہیں۔''

''نہیں! روی بھیا ایسی تو کوئی بات نہیں۔ نہ جانے آج شِو جی کیوں مہربان تھے۔ سب شِو جی کی دین ہے۔''

اس کی ممانی اٹھی اور اندر سے سیاہ رنگ لے آئی اور ایک بندی اس کے ماتھے پر لگائی اور کچھ منتر پڑھا۔

پنڈت جی جواب تک چپ تھے بولے:

اتنے گن ایک ناری میں! ہے شِو، ہے شمبھو، ہے مہادیو! تو ہی اس ناری کی رَکشا کرنا!......

پتری! تم بھی ان گنوں کا پالن کرتی رہنا۔ پرشوں کو اتنے ڈھیر سے گن مہادیو یونہی نہیں دے ڈالتے۔ ایسے پرش سے کوئی بہت کڑا کام لیا جاتا ہے اور تم تو ایک ناری ہو۔ نہ جانے تم کو کتنے جوکھم اٹھانے پڑیں۔ کس یگ میں تم نے جنم لے لیا ہے۔ کلجگ ہے، یہ

کلجگ! اس میں اتنے گن کس کارن۔'' ''کلجگ کے بعد ایک نیا منونتر شروع ہوگا۔ ایک نیا یگ آنے کو ہے۔ یہ سمے شاید دوجگوں کے درمیان آنے والی سندھیا کی ایک جھلک ہو یا ہماری ہی آتمائیں اس سندھیا میں لیجائی گئی ہوں۔'' چندر بھان بولا۔

روی شنکر نے حیرانی سے چندر بھان کی اور دیکھا، جیسے پوچھتا ہو کہ آپ کی مارکسیت کیا ہوئی، آپ کی جدلی مادیت کہاں منہ چھپائے ہوئے ہے۔ اس کی بات جیسے ان کے کانوں نے سن لی ہو اور اس کا جواب دے رہے ہوں۔

''یہ ساری باتیں، یہ فلسفہ میرے بچپن کی سمرتیاں ہیں۔ میں ان کو کیسے بھول سکتا ہوں۔ ہر سطح کے لیے اپنا علم ہے۔ جس سطح پر کچھ دیر پہلے ہم سانس لے رہے تھے اس کا علم انہی سمرتیوں کے گیان اور پرا گیا سے ہوگا۔ جب معاشرے کی شکتیوں کی بات ہوگی تو اس گیان کے لیے اور طرح کی بدھی اور سائنس درکار ہوگی۔ ان دونوں سطحوں اور دونوں گیانوں میں کوئی تضاد نہیں۔ انسان ہر دم ایسی سطح پر نہیں جیتے جس سطح پر ابھی ابھی ہم تھے۔ ان کی سطح بھوک، پیاس، ضرورتوں حاجتوں اور انحطاط پذیر اجسام کی سطح ہے اس کے لیے جدلی مادیت ہی مناسب سائنس ہے۔''

''یہاں تو سبھی باون گزے ہیں۔ ہر کوئی فلسفہ ہی بھگار رہا ہے۔ ہم جیسے سیدھے سادے پرشوں کی بدھی میں آنی والی بات بھی تو کوئی تو کرے۔'' ٹھاکر جی پکارے۔

پنڈت کنول نارائن نے گھڑی پر نظر ڈالی تو اٹھ کھڑے ہوئے اور چلنے کی اجازت چاہی۔ اجازت مل گئی تو چندر بھان کو مخاطب ہو کر بولے:

''ہم یونیورسٹی کے قریب سے گزریں گے تمہارا ہوسٹل ہمارے راستے میں ہی آئے گا۔ ہمارے ساتھ چلے چلو۔''

چندر بھان نے بھی اجازت چاہی۔ ٹھاکر اور ٹھاکرانی نے یک زبان ہو کر کہا:

''آ گیا صرف ایک شرط پر دی جاسکتی ہے کہ ملتے رہنے کا وعدہ کرو۔''

اس نے وعدہ کرلیا اور وہ پنڈت جی کی گاڑی میں سوار ہوگئے۔ وہ سب ان کو بنگلے کے

دروازے تک چھوڑنے گئے۔ ان سب نے یکا یک تھکاوٹ اور نیند کو محسوس کیا اور اپنے اپنے کمروں میں چلے گئے۔

اس رات کے بعد چندر بھان سوشیلا سے ملتا رہا، کبھی یونیورسٹی میں، کبھی ان کے گھر، کبھی پنڈت کنول نارائن کے یہاں۔ روی شنکر سے بھی چندر بھان کی دوستی گہری ہوتی گئی۔ کبھی وہ سوشیلا اور چندر بھان کے ساتھ سیر کو چلا جاتا، سنیما چلا جاتا یا کسی قہوہ خانے میں گھنٹوں بیٹھے باتیں کرتا یا سنتا رہتا۔

سوشیلا چندر بھان سے معاشرے اور انسانی تشکیل نو کے بارے میں بڑی بڑی طویل گفتگوئیں کرتی رہی۔ جوں جوں اس کا علم مارکسیت کے بارے میں گہرا اور وسیع ہوتا گیا اس کے شکوک بڑھتے رہے۔ جو علم انسان کی تمام سطحوں اور ان کے باہمی رشتوں کی توجیہہ نہ کر سکے اس کو وہ کسی طرح بھی قبول کرنے کو تیار نہ تھی۔ وہ نئے انسان کو محض معاشی یا معاشرتی انسان سمجھنے پر قانع نہ تھی۔ اس لیے کہ انسان کائنات کا سب سے اعلیٰ معجزہ تھا جس میں امکانات کے جہان بند تھے اور وہ صرف ایسا معاشرہ چاہتی تھی کہ جس میں ہر سطح کا انسان رزق اور جسمانی ضرورتوں کو اسی آزادی سے پورا کر سکے جس طرح وہ سانس کے ذریعے سے سانس لینے کے لیے آزاد تھا تا کہ وہ اپنی تخلیقی، تخیلی اور گیانی صلاحیتوں کو پروان چڑھا سکے اور اس کے باہر اور اس کے انتر کے جہانوں میں ملاپ ہو سکے اور ان کا ووا ہو سکے اور پھر ان کے ملاپ سے نئے نئے جہاں اس کے باہر اور انتر میں وجود میں آ سکیں جو علم انسان کو اپنی چھب دکھلا کر سیر کی دعوت دیں اور اس طرح ان جہانوں میں سفر کرنے سے ان کی انتر کی صلاحیتیں جاگیں اور ان کو اپنی زندگیاں نئی نئی ڈگروں اور راستوں پر چلانے کی جرأت دلائیں۔ انہی گفتگوؤں کے سبب انہوں نے یونانی ڈرامہ اور جرمن شاعروں اور ڈراما نگاروں کا مطالعہ کیا اور ان کو اپنے اپنے فلسفوں کے مطابق جانچا اور پرکھا۔ اس طرح ان شاعروں اور ڈرامہ نگاروں میں نئے نئے انجانے پہلو تلاش کئے جس سے ان کے انتر بہت بہت کوندے کوندا کئے۔ ان کوندوں کی روشنی میں نئی پہنائیوں اور بلندیوں کا انکشاف ہوتا رہا اور وہ ان پہنائیوں میں اترتے رہے اور بلندیوں پر چڑھتے

رہے۔

پھر ایک دن آیا کہ دونوں کو بتایا گیا کہ ان کے باپوں نے ان کی منگنی طے کر دی ہے۔ جس کے سبب کچھ دیر کے لیے ان کے درمیان ایک حجاب سا آیا اور ان کی ملاقاتیں کم ہوگئیں۔ پھر ان کے آخری سال کے امتحان آگئے اور وہ مطالعے میں جت گئے۔ جب نتیجہ نکلا تو دونوں اپنے اپنے مضمون میں اول آئے اور انہوں نے نئے ریکارڈ قائم کئے۔ اس کے بعد وہ جب ملے تو چندر بھان نے یورپ جانے کے عزم کا ذکر سوشیلا سے کیا، اس کا دل اس کے سینے میں لمحے بھر کے لیے تڑپا اور اس کے ذہن میں اک شعلہ سا لپک گیا جس کی روشنی میں اس نے ایک وسیع سرسبز میدان پھل دار درختوں اور رنگ رنگ کے پھولوں میں اپنے آپ کو یکا اور تنہا پایا۔ وہ اس کو اپنے ساتھ لے جانا چاہتا تھا مگر دونوں نے بہت غور وفکر کے بعد طے کیا کہ وہ یورپ سے ڈاکٹریٹ لے آئے تو پھر ایک دوسرے سے شادی کر لیں گے۔

جب اسٹیشن پر سوشیلا اس کو اپنے ماں باپ اور ماموں اور پھوپھی پھوپھا کے خاندانوں کے ہمراہ چھوڑنے گئی تو وہاں اس کی ملاقات متین سے ہوگئی۔ کسی کو چھوڑنے آئے تھے۔ کچھ دیر وہ سب ویٹنگ روم میں چائے پینے کے لیے ٹھہر گئے۔ وہ ایک الگ میز پر متین صاحب سے باتیں کرتی رہی۔ متین صاحب اس کو بہت گہرے غور سے دیکھتے رہے اور پھر یکا یک بولنے لگے اور بولتے چلے گئے۔

''چندر بھان! بہت ذہین لڑکا ہے، اس میں تخلیقی قوتوں کا بہت وافر سرمایہ ہے۔ اس کو واقعی تم جیسی لڑکی کی ضرورت تھی۔ مگر میرا خیال ہے کہ تمہارا مسئلہ ابھی تک حل نہیں ہوا۔ مارکس ازم اس معاملے میں تمہاری کوئی مدد نہیں کر سکتا۔ تمہیں اپنے تہذیبی اور دینی ورثے کا اور گہرا مطالعہ کرنا ہوگا اور بقول آنند کمار سوامی ویدوں اور اپنشدوں کو مغربی مستشرقین کی بنائی ہوئی لغتوں سے بچا کر لفظوں کے اصلی معنی کو تلاش کرنا ہوگا۔ ان مستشرقین نے جب اجنبی ویدوں کا مطالعہ کیا تو وہ اپنے انجیلی ورثے کو بھلا نہ سکے اور لغت بناتے ہوئے انجیلی تصورات اور جذبات کو ویدک الفاظ کے معنی پر مسلط کر گئے۔ اب ان الفاظ کو اس تسلط سے

آ زاد کرانا بہت ہی جوکھم کا، تھکا دینے والا کام ہے۔ مگر اس کے سوا تمہارے لئے کوئی چارہ نہیں۔ پھر اس ورثے کو انسانوں کے دوسرے ادیان سے مقابلہ کرتے ہوئے اصلی دین کی روح تک پہنچنا ہوگا اور جب اس کی روح کو پا لوگی تو پھر ایک نئے سفر کا آغاز کرنا ہوگا۔ انسان اور معاشرے اور انسان کے ارضی ماحول کی نئے اصولوں کے مطابق تشکیل کی مہم طے کرنی ہوگی اور اس میں تمہاری کوشش اس مہم کے صرف چند قدموں کی راہ متعین کرنے میں کامیاب ہو سکے گی اور اپنے بعد تمہیں اپنے جانشینوں کی تلاش اور ان کی روحانی، جذباتی، تخیلی اور جسمانی پرورش کرنی ہوگی تا کہ وہ جلد ہی تھک نہ جائیں اور تھک ہار کر راہ ہی میں بیٹھ نہ جائیں یا گمراہ نہ ہو جائیں۔ اس کوشش میں اگر کہیں میری مدد کی ضرورت ہو تو کسی جھجک کے اور Ceremony کے بغیر مجھے آواز دے دینا۔ میں ضرور تمہاری مدد کو پہنچوں گا۔''

وہ چپ ہو گئے تو ان کے درمیان خاموشی کا اک جہان حائل ہو گیا جس کو پاٹنے کی کسی نے ضرورت ہی نہ سمجھی۔ اتنے میں سب لوگ اٹھ کھڑے ہوئے اور وہ بھی چلنے کے لیے اٹھ کر کھڑے ہو گئے۔ سوشیلا کے والد نے ان کو ساتھ چلنے کے لیے کہا تو انہوں نے کہا:

''جس مشن پر مجھے اس جگہ لایا گیا تھا وہ میں نے پورا کر لیا ہے۔ اب آپ کا اور میرا ساتھ نہ جانے کب ہو۔ دل کہتا ہے کہ ایک طویل ملاقات کبھی ضرور ہوگی کب ہوگی یہ بھی اللہ ہی طے کرے گا......اللہ حافظ۔''

''پروفیسروں کے اچرچ پن کے قصے تو بہت سنے تھے مگر تمہارے یہ پروفیسر تو بہت اچرچ اور عجب ہیں۔''

''ان میں کئی اگامی گن ہیں۔ کبھی ملاقات ہوئی تو آپ کی آتما بہت خوش ہوگی۔''

اس ملاقات کے بعد یونیورسٹی کبھی نہ گئی بلکہ یونیورسٹی کے شہر بھی کبھی نہ گئی۔ اس کا سارا وقت یا اپنے گھر یا ارملا کے گھر کٹتا تھا۔ اس کا مطالعہ پہلے کی طرح جاری رہا۔ اس کے مسئلے اور اس کی کشمکش نے کئی روپ بدلے مگر اس کی نوعیت وہی رہی اور اس کے حل کی کئی صورتیں نکلیں مگر کوئی بھی صورت تسلی بخش نہ تھی۔ ویدوں اور دوسری دینی کتب پر وہ فکر اور

تدبر کرتی رہی اس کے اندر کئی بار نور نے جنم لیا مگر نور راہ دکھا تو سکتا ہے مگر اس پر چلنے کے لیے توانائی مہیا نہیں کر سکتا۔ وہ توانائی تو جذبات کے گھال میل سے جنم لیتی ہے اور اس کے جذبات میں مدت سے ایک ٹھہراؤ اور ایک سکون سا آ گیا تھا۔ وہ اپنے جذبات کا تجزیہ کر سکتی تھی مگر ان میں حرکت پیدا کرنا اس کے بس میں نہ تھا۔ اس کے لیے کسی شدید بیرونی یا اندری تجربے کی ضرورت تھی۔ اس کے لیے وہ شِو سے پرارتھنا ہی کر سکتی تھی اور وہ پرارتھنا کرتی رہی اور اپنے سنگیت سے، اپنی نرت کی راس سے شِو کا من موہنے کے لاکھ جتن کرتی رہی۔ اس کو آنند تو ملتا مگر اس آنند میں شدت نہ تھی، وہ اس کے جذبات میں اک نرت، اک آہنگ تو پیدا کرتا تھا، وہ اس کے جذبات کو حرکت میں لانے پر قادر نہ تھا۔

کبھی کبھی اس پر گھر سے باہر نکل جانے کا لپکا پڑتا جس کی مزاحمت کرنے کا اس کو جواز ہی نہ ملتا اور کبھی مشکی گھوڑی پر، اور کبھی بادامی گیروے پر اور کبھی چتکبرے گھوڑے پر باہر نکل پڑتی: کبھی گھر کے ارگرد کی پہاڑی آبادیوں، کبھی اپنی آبائی زمینوں پر آباد گاؤں میں، جب وہ ایسی حالت میں ارملا کے گھر ہوتی تو وہ اس کے گھر کے گرد اگرد حصار کیئے ہوئے پہاڑوں میں اور بنوں میں نکل جاتی۔ تنہائی کے یہ سفر اس کو جسمانی طور پر بالکل تھکا دیتے وہ واپس لوٹ آتی۔ اپنے گاؤں میں چلتے پھرتے وہ لوگوں کو کبھی فصلیں بوتے، کبھی فصلیں کاٹتے دیکھتی تو اس کو احساس ہوتا کہ اس لمحے لوگ کائنات کے نرت کے ساتھ ہم آہنگ ہیں مگر جب فصلیں کٹ چکتیں تو وہ اپنے کارندوں کو کسانوں سے بٹائی کا حصہ اس سختی سے لیتے اور کسانوں کے چہرے پر اس کے سبب ایک کرب اور غصے کی کیفیات کو دباتے دیکھتی تو وہ لرز جاتی اور اس کا جی چاہتا کہ کسان اس سختی کے خلاف شدید ردعمل کا اظہار کریں مگر ایسا کبھی نہ ہوتا۔ جب کبھی کسی تہوار منانے کے دوران وہ گاؤں میں ہوتی تو کسانوں کو اس مزے سے گاتے، ناچتے دیکھتی کہ جیسے ان کو کوئی دکھ نہ ہو، کوئی تکلیف نہ ہو، تو اس کو یہ مناظر بہت عجیب سے لگتے جیسے کہ بٹائی کے وقت کے جذبات کا کوئی وجود نہ ہو اور اگر کبھی ان کا وجود تھا تو اس لمحے ان کسانوں کے دلوں میں، ان کے ذہنوں میں، ان کا کوئی شعور نہ ہو۔ اس سے اس کے دل و دماغ میں اک حیرت اور تحیر کے جذبات انگڑائی لینے لگتے کہ انسان میں زندہ

رہنے کے لیے کتنی شدید آرزو ہے اور اس کے لیے وہ اپنے دکھوں کو کس آسانی سے، ایک خاص لمحے کے لیے ہی سہی، بھلا سکنے پر قادر ہے۔ انسان کی اس صلاحیت پر اسے ایسے مناظر دیکھنے کے بعد اک اچنبھا ہوتا اور اس اچنبھے کی بھول بھلیوں میں وہ پھرتی رہتی۔

جب وہ اپنے گھر کی قریبی پہاڑی آبادیوں میں سرگرداں پھرتی تو پہاڑی نغموں کی اداسی اس کے جی کو اچک کر لے جاتی اور وہ تڑپ تڑپ جاتی، ان ہی آبادیوں میں اس کو کبھی کبھی بہت ہی بیمار بچے، نوجوان عورتیں اور مرد نظر آتے تو وہ ان کے لباس سے اندازہ کرتی کہ ان کی مالی حالت اتنی کمزور ہے کہ وہ اپنا علاج نہیں کرا سکتے، کبھی کبھی کسی مدقوق سی جوان عورت کی آنکھوں سے جھلکتا حزن اور اس کے ساتھ اس کو قبول کر لینے کی رضامندی اس کو بغاوت پر آمادہ کرتی مگر وہاں نیلے گگن میں سنہرے، سرخ، گلابی، ہلکے سیاہ اور سفید رنگوں کے حسین لشکروں، درختوں کی شاخوں میں سرسراتی ہوئی، سیٹیاں بجاتی ہوئی ہوا کی ہلکی ہلکی موسیقی اور کبھی کبھی ڈراتی ہوئی دَھناتی دھناتی ہوئی ہوا کے طوفان کے شور میں انسانی زندگی کے دکھوں، آزاروں اور ننھی ننھی خوشیوں سے اس قدر بے اعتنائی نظر آتی کہ وہ اپنے آپ کو بالکل بے بس اور بے یار و مددگار پاتی۔ کبھی کبھار کسی پہاڑی بازار میں سے گزرتے ہوئے کسی مکان میں سے نکلتی ہوئی ہارمونیم سے اٹھتی یا ستار سے پھوٹتی ہوئی یا کسی نسوانی یا مردانے گلے سے فرار کرتی ہوئی موسیقی اس کا تعاقب کرتی تو وہ رک جاتی، کھو جاتی اور سوچتی کہ انسان اپنے تمام دکھوں اور بے بسیوں کے باوجود نغمے کو جنم دینے پر قادر ہے جو فطرت سے ابھرنے والے شوروں کو للکار سکتا ہے اور ان پر چھا سکتا ہے۔ اس احساس سے اس کا دل خوشی سے، انجانی شکتی سے، معمور ہو جاتا اور وہ لمبے لمبے قدم لیتی، شاداں شاداں اپنے سفر کو جاری رکھتی۔ مگر گھر پہنچ اپنے کمرے کی امان میں اس کو چندر بھان کی یاد اتنی تیز چبھن سے ستاتی کہ وہ بلبلا اٹھتی اور اس کا شریر چندر بھان کے شریر سے بھڑ جانے کے لیے مچل مچل جاتا اور اس ہوس پر قابو پانے کے لیے اس کو کئی کئی گھنٹے اور کبھی کبھی کئی دن لگ جاتے مگر چندر بھان کو اس کے سفر سے بلانے کی اس کو جرأت نہ ہوتی تھی۔ ایسی حالت میں اس کو شِو سے پرارتھنا کرتے اپنے کرب اور اذیت میں سے ایک سرور کے ابھرنے کا احساس ہوتا اور

وہ حیران ہوتی کہ انسان کیا مخلوق ہے کہ دکھوں اور اذیتوں سے سرور اور خوشیوں سے بیزاری کو پیدا کر سکتا ہے۔

اس مناظر کی تکرار سے اس کو کئی بار بڑی شدت سے خواہش ہوتی کہ وہ اس سنسار کو خیر باد کہے اور کسی پہاڑ کی بلندترین چوٹی کی کسی کھوہ میں بیٹھ شِو کے گیان میں گم ہو جائے اور شِو کے دل ہی میں سے ایسا علم حاصل کرے جس سے انسان کے دکھوں اور آزاروں کا مداوا ہو سکے۔ اس پر وہ مسکرا دیتی اور اپنے دل کو سمجھاتی کہ وہ مہاتما بدھ نہیں ہے اگر چہ بدھ مت کی پیش کردہ نفسیات اور مابعدالطبیعیات میں اور موجودہ طبیعیات کے فلسفے میں خاصی مماثلت ہونے کا اس کو شعور تھا اور اس کو یہ بھی شعور تھا کہ بھکشوؤں کے سنگھ کو مارکسی نظام کے لانے والے Elites میں بدلنا کچھ مشکل نہ ہوگا اور سنگھ میں شامل ان بھکشوؤں کے باہمی رشتوں کی سی صورت مارکس ازم کے معاشرتی، معاشی اور سیاسی نظام میں بھی در آئے گی۔

مگر پھر بھی کسی سطح پر وہ قائل نہ ہو پاتی کہ بدھ کی طرح انسانوں کی ہدایت اور ان کی مُوکشا کے لیے کچھ کر سکے گی اگر چہ اس کے ہردے میں کہیں سے یہ یقین ابھرتا اور پھیلتا ہوا محسوس ہوتا کہ جب چندر بھان سے اس کا وصل ہوگا تو دونوں میں کچھ ایسی شکتیوں کا ملاپ ہوگا کہ وہ دونوں ایسے ساتھی اکٹھے کر سکیں جو کسی آنے والے نئے معاشرے کی جھلک انسانوں کو اس وضاحت سے دکھا سکیں گے کہ اس کے سبب انسانوں کے اندر ایسی حرکت جنم لے لے گی کہ وہ اس معاشرے کو وجود میں لانے کے لیے کوشاں ہو جائیں گے۔ کبھی کبھی ایسے لمحوں میں اس کو خیال آتا کہ آیا کہ ان ساتھیوں میں متین صاحب اور تقی بھی ہوں گے اور اگر ہوں گے تو ان کی زندگی کی شریک کس طرح کی ناریاں ہوں گی۔

ایسے ہی خیالات میں وہ سرگرداں تھی کہ ایک دن اس کو روی شنکر کا خط ملا جس میں اس نے ذکر کیا تھا کہ وہ اپنے ایک مصور دوست کے ساتھ شِو کوٹ کی پہاڑی آبادیوں کی سیر کے لیے آنا چاہتا ہے، اس نے اجازت طلب کی تھی کہ وہ اپنے اس مصور دوست کو شِو کوٹ لے آئے تا کہ وہاں سے وہ ان پہاڑوں پر چڑھ سکے جہاں سے ہیم کشیتروں کی منظر کشی کر سکے۔ اس خط کے ملنے کے کئی دن بعد تک وہ اس کا جواب نہ دے سکی کیونکہ وہ فیصلہ نہ

کر سکتی تھی کہ وہ روی شنکر کی اس اجازت طلبی کا ذکر ارملا اور پھوپھی اور پھوپھا سے کرے۔ ان سب کی زندگیوں میں خاص طرح کا آہنگ آ گیا تھا جس میں کسی اجنبی کی آمد سے کھنڈت کا احتمال تھا۔ مگر وہ اپنے اندر روی شنکر کے دوست کے لیے سواگت کی خواہش کو جنم لیتے محسوس کرتی تھی۔ لہٰذا اس نے پہلے ارملا سے اور بعد میں اپنی پھوپھی سے روی شنکر کے خط کا ذکر کیا۔ ارملا نے اس سے کہا کہ ان کی زندگی خاصی ہی محدود ہو گئی ہے اور اس میں کسی تنوع کی ضرورت ہے، نوجوان کے آنے سے اس میں خوش کن تبدیلی آ جائے گی۔ اس کے جواب میں سوشیلا نے کہا کہ اس بات کی کیا ضمانت ہے کہ ان کی آمد سے ناگوار تبدیلی نہیں آئے گی اور وہ کسی ایسے دکھ کا سبب نہ بنے گی جس کا علاج اور جس کا مداوا ان میں سے کسی کے پاس نہ ہو۔ ''اری پگلی! تو بہت پڑھ گئی اور کچھ زیادہ ہی سوچنے لگ گئی ہے۔ یہ مصور لوگ یا تو اپنے آپ میں کھوئے رہتے ہیں یا باہر کے رنگوں میں، شکلوں میں اور دونوں کے رشتوں میں۔ ان کو اتنی فرصت کہاں کہ ہماری زندگی میں کسی طرح مخل ہوں۔ آئیں گے تو سارا سارا دن باہر رہیں گے اور جب رات کو گھر ہوں گے تو اتنے تھکے ماندے ہوا کریں گے کہ ان کو ہم میں سے کسی سے بات کرنے کا بھی دھیان نہ آیا کرے گا۔ روی کو لکھ دو کہ وہ جب چاہے چلا آئے۔ اتنے نوکر چاکر ہیں ان دونوں کا خیال رکھ لیں گے۔ شمال کی طرف کھلنے والے مہمان گھر ان کو دے دیئے جائیں گے۔ ایک کمرے میں اتنا شیشہ دیواروں میں لگا ہے کہ وہ کمرا مصور کے اسٹوڈیو کا کام دے سکتا ہے۔'' ارملا نے اس کو سمجھایا۔

اسی رات اس کے پھوپھا نے ڈرائنگ روم میں دہکتی ہوئی آگ کے شعلوں کو گھورتے ہوئے کہا:

''چندر بھان کے خطوں سے ظاہر ہوتا ہے کہ ابھی اس کے لوٹنے میں ڈیڑھ دو سال لگیں گے۔ ڈاکٹریٹ کے بعد زراعت کے نئے طریقوں کا مطالعہ تجرباتی طور پر کرنا چاہے گا۔ اس کی آواز کے لیے کان ترس گئے ہیں یہ نوجوان آئیں تو گھر میں کچھ چہل پہل رہے، کوئی ہنگامہ رہے۔ ہمارا جیون بہت آہستہ چلنے لگ گیا ہے...... رینگنے لگ گیا ہے۔ نہ جانے کب رک جائے۔

دوسرے میں یہ بھی جاننا چاہتا ہوں کہ ہمارے دیس کے نوجوان کیسے سوچتے ہیں، کیسے اس دنیا کے مسائل کا سامنا کرتے ہیں، کیسے محسوس کرتے ہیں، کیا کرنا چاہتے ہیں۔ یہی لوگ آنے والے وقتوں میں اس دیس کے حاکم ہوں گے اور اس دیس کے باسیوں کی توقعات کو پورا کرنے یا ان کے بالکل خلاف کام کرنے کے ذمہ دار ہوں گے۔ یہی لوگ مستقبل ہیں۔ اپنے مستقبل کو آنے سے پہلے دیکھ لینے میں کوئی ایسا ہرج نہیں ہے کہ مُنش اس سے بھاگتا ہو یا اس سے منہ پھیرے رکھے۔

اپنے ماموں زاد کو لکھ دو کہ جب چاہیں چلے آئیں۔ ان کو اس گھر میں بالکل آزادی کا ماحول ملے گا......

کیا یہ نہیں ہوسکتا کہ تم اور ارملا چلی جاؤ اور چندر بھان کو واپس لے آؤ۔''

''آپ بھی کیسی اچرچ باتیں کرتے ہیں۔ بیٹے کو بدیش سے واپس لانے کے لیے بیٹی جائے، بیٹے کی منگیتر جائے۔ اگر یہ دونوں چلی جائیں تو ہم یہاں کیا کریں گے اکیلے۔ پہلے بیٹے کی صورت کو ترستی ہوں، پھر بیٹی اور بہو کی شکل کو ترسوں۔ نہ جی نہ میں تو یہ سوچنے کے لیے تیار نہیں ہوں......آپ خود ہی کیوں نہیں چلے جاتے؟ بہن اور منگیتر کو وہ بہلا پھسلا کر واپس بھیج دے گا، آپ کو تو ٹال نہ سکے گا۔ آپ تو جانتے ہی ہیں کہ خطوں میں ہمیں کیسے بناتا ہے؟ کیا کیا بہانے بناتا ہے نہ آسکنے کے: ابھی میں نے یہ پڑھنا، یہ سیکھنا ہے جیسے کہ یہاں آکر پھر وہ واپس نہ جاسکے گا۔ باتیں بنانا تو کوئی اس سے سیکھے۔'' ٹھاکرانی نے اعتراض اٹھائے۔

''بیٹے کو الزام کیوں دیتی ہو۔ وہ تو ایسا نہیں ہے۔ وہ سچ ہی کہتا ہوگا۔ اس نے جھوٹ کبھی نہیں بولا۔ اس کو ہم سے پیار ہو نہ ہو، بہن سے بہت پیار ہے۔ دیکھتی نہیں ہو برسوں سے ہفتے میں دو خط آتے ہیں اس کے نام اور ہمارے نام ایک خط آتا ہے۔''

''آپ بھی بہت بھولے ہیں۔ ایک خط سوشیلا کے لیے آتا ہے اگرچہ نام ارملا ہی کا ہوتا ہے اس پر۔'' ٹھاکرانی بولی۔

''میں تو یہی کہوں گا کہ اس کے علم کی پیاس جب کم ہوگی تو وہ لوٹے گا۔''

''اس کو لکھیں جی کہ وہ جلد چلا آئے، بہو بوڑھی ہو جائے گی تو بھی اس کے علم کی پیاس نہ بجھے گی۔ بہو کب تک راہ دیکھے گی، تھک جائے گی...... آپ چلے جائیں اگلے مہینے۔ اسے لکھیں تو سہی کہ وہ چلا آئے ورنہ آپ پہنچ جائیں گے۔''

''اچھا بھئی میں ہی چلا جاؤں گا۔ مہمان آ کر جالیں تو پھر سوچیں گے کہ کب جانا ہے۔''

سوشیلا نے روی شنکر کو اور اس کے دوست کو آنے اور ٹھہرنے کی دعوت دے دی۔ چند دن بعد اس کو اطلاع آ گئی کہ وہ اگلے ہفتے پہنچ جائیں گے۔ ایک دن سہ پہر کے وقت دونوں ان کے گھر کے آنگنوں میں سے گزر رہے تھے۔

دوسرا باب

بچپن نے کبھی بھی ارملا سے رخصت نہ چاہی، جوانی نے اس کے بچپن سے کبھی حسد نہ کیا۔ اس کا بچپن اور اس کی جوانی پہلی ہی ملاقات میں ایک دوسرے کو دل دے بیٹھے، اس عمل پر کبھی بھی نادم نہ ہوئے۔ بچپن اور جوانی میں اک عجب دوستی ہوئی، دونوں میں عجیب گھلاوٹ ہوئی، بچپن پر جوانی کی طرح آتی چلی گئی؛ جوانی میں بچپن کا بھولپن اور استغنا رچتا چلا گیا۔ جب اس نے پہلی بار اس جہان کو نظر بھر کر دیکھا، اپنے سارے تن بدن سے محسوس کیا تو گہری، خاموش، نیلی تاروں بھری رات تھی۔ نیلے گگن پر سنہرے، دمکتے ہوئے، تارے تھے، دور دور تک پھیلے ہوئے، اکیلے اکیلے۔ وہ بہت دیر تک نیلے گگن، سنہرے، اکیلے، تاروں کو تکتی رہی۔ اس کو اپنا بستر، بستر پر ساتھ لیٹی ہوئی، گرم گرم، نرم نرم ماں بھول گئی، بھولی رہی، صبح تک بھولی رہی۔ کندن سے دمکتے ہوئے، نیلے گگن پر سنہرے دمکتے ہوئے، اکیلے اکیلے تارے، تارے اور وہ ایک دوسرے کو تکتے ہی رہے۔ آہستہ آہستہ تارے ماند پڑنے لگے، نیلا گگن جگمگانے لگا، اجلا ہوتا چلا گیا۔ سب تارے آہستہ آہستہ سو گئے، گم ہو گئے، آخر میں ایک تارا رہ گیا، ایک تارا اور وہ۔ اس کی ماں، اس کا باپ، پلنگ اور

میز، میز پر پڑی ہوئی نیلی بلور کی صراحی پھلوں کے رس سے بھری، اس کے پاس پڑا ہوا کانسی کا چولہا اور اس پر دھری ہوئی پیتل کی دودھ بھری پتیلی، سب کے سب سو رہے تھے۔ اس اکیلے تارے کی جھپکتی ہوئی آنکھیں بھی بوجھل ہونے لگیں، مُند نے لگیں، وہ تارا بھی سو گیا، گم ہو گیا۔ نیلا گگن سنہرا ہونے لگا۔ سنہرا گگن اس کو بہت بھایا اور وہ سو گئی۔ نیلا گگن، سنہرے، اکیلے اکیلے، تارے اُسے ایک مدت تک بہت بھایا کئے۔ جب اس نے چلنا شروع کیا اور وہ گھر کے سات آنگنوں سے باہر لے جائی جانے لگی تو تناور درخت، ان کے ہرے، ہرے سرخ، ہرے سیاہ پتے، ان کے سایوں میں کھلتے ہوئے، نیلے، سفید، سرخ، پیلے، سنہری، خاموش دھوپ میں شاخوں پر سوئے ہوئے پھول، اس کو اکیلے اکیلے، سنہرے تاروں کی طرح لبھاتے۔ جب ہلکی ہلکی ہوا چلتی اور پھولوں سے لدی ہوئی شاخیں جھولنے لگتیں تو اس کو محسوس ہوتا ہے کہ پھول جاگ گئے ہیں اور حیرانی سے اس کو دیکھ رہے ہیں۔ ان کی حیرانی پر وہ مسکرا دیتی، وہ بھی جواب میں مسکرا دیتے۔ اس مسکرانے پر وہ ان کے گالوں کو تھپک دیتی۔ کبھی کبھی وہ شاخوں کو جھکا کر ان کی پیشانیوں کو چوم لیتی۔

کبھی کبھی اپنی انا کو دھوپ میں اونگھتے یا اپنے خیالوں میں کھوئے دیکھ کر وہ چمن و گلزار سے نکل کر بن اور جنگل میں جا نکلتی۔ ہرے ہرے رستے، ہرے ہرے رستوں میں گم ہو جاتے، اونچے اونچے تناور درخت اور اونچے ہو جاتے، سنہرا نیلا گگن اس کی نظر کی پہنچ سے دور ہو جاتا۔ مگر ہمیشہ ایسا ہی نہ ہوتا۔ وہ گھومتے تھک جاتی تو سبزے پر لیٹ جاتی۔ اونچے اونچے درخت، ننھے منے ہو جاتے، نیلا سنہرا گگن اس کے بالکل قریب آ جاتا، اتنا قریب کہ وہ چاہتی تو اس کو انگلی سے چھو لیتی۔ مگر چھو لینے کی آرزو اس کو کبھی کبھی ہوتی اور تب بھی وہ چھونے کے لیے ہاتھ اٹھانے پر راضی نہ ہوتی کیونکہ اس کے بازو تھک کر سو چکے ہوتے اور ان کو ان کی مرضی کے بغیر اٹھانا اس کو گوارا ہی نہ ہوتا۔

جب کبھی وہ یوں سبزے پر لیٹے لیٹے، نیلے سنہرے گگن کو تکتے تکتے گگن سے گر کر درختوں کی پھننگوں کی طرف آنے لگتی تو وہ یکا یک چونک اٹھتی اور اس کو خیال آتا ہے کہ اگر وہ یوں اونگھتے اونگھتے سو گئی تو انا بی اس کو کیسے تلاش کر سکے گی۔ اور اگر وہ اس کو تلاش نہ کر

پائے گی تو بہت پریشان ہوجائے گی۔ انّا بی کے چہرے پر پریشانی کے گہرے آثار دیکھ کر اس کو اس پر ہمیشہ رحم آجاتا اور اس کو خیال آتا کہ وہ اگر جلد ہی سبزے پر سے اٹھ آتی تو شاید انّا بی کو پریشان ہونے سے پہلے ہی آلیتی۔

اس کی انّا بی، اس نے ہمیشہ ہی محسوس کیا، خود اس کی طرح چمن وگلزار، بن اور جنگل کی شیدائی تھی۔ گھر کے آنگنوں میں تو ان کی چال میں اک سکون، اک اعتماد، اک رعب ہوتا، ایسا رعب جس میں رعنائی کا عنصر غالب ہوتا۔ اس کے قدموں کی چاپ سے کئی بار اس نے دیکھا کہ اس کے گھر کے نوکر، چوکیدار، لمبی لمبی مونچھوں والا اصطبل کا داروغہ، چلتے چلتے ٹھٹک جاتے، بیٹھے بیٹھے چونک اٹھتے، ان کو دیکھ کر خوش اور کبھی پریشان ہوجاتے۔ مگر جب وہ اس کے ساتھ چمن وگلزار میں سنہری دھوپ میں گھومنے آتی تو ان کی چال میں ایک بے ربطی سی، اک بے اطمینانی سی، اک خوف سا آجاتا، جیسے چمن وگلزار، بن اور جنگل سے ان کو ڈر لگتا ہو۔ مگر انّا بی کا یہ نیا روپ اس کو بہت بھلا لگتا۔ وہ اپنے آپ کو انّا بی کے بہت قریب محسوس کرتی، ان کے جسم کی گرمی کو محسوس کرسکتی، ان کے لباس میں لمبے لمبے وقفوں سے آتی ہوئی باس کو اپنے نتھنوں کے آس پاس محسوس کرتی۔ کبھی کبھی اس کو محسوس ہوتا کہ یہ باس انّا بی کا دوسرا جسم ہے جو ان کے لباس میں گھٹن محسوس کررہا ہے اور اس سے نکل بھاگنے کے لیے بے تاب ہے، وہ تنگ سوراخوں سے رینگ رینگ کر نکلنے کی کوشش کررہا ہے۔ جب وہ ایک ساتھ چمن وگلزار کی طرف جانے کی بجائے بن اور جنگل میں جانکلتے تو انّا بی کی باس ان کے لباس سے نکل کر ان کے جسم سے لپٹنے لگتی۔ اس باس میں اک عجیب سا نشہ ہوتا، اک عجیب سی بھینی بھینی خوشبو ہوتی۔ اس نے ہمیشہ ہی چاہا کہ اس باس کو کسی خاص پھول کی خوشبو سے منطبق کرسکے مگر یہ باس، یہ خوشبو، کسی پھول میں نہ تھی، یہ باس انّا بی سے مخصوص تھی۔ اس خوشبو کا ہمسر اس لمحے پیدا ہوا جب اس نے اک دوپہر اونچے اونچے درختوں کے درمیان دور تک جاتے ہوئے رستے پر اکیلے چلتے چلتے محسوس کیا کہ اس کے سینے میں ایک نیا، دوسرا، دل دھڑکنے لگا ہے اور اس کی گرم گرم کُرتی اس کے سینے پر تنگ ہوگئی ہے، اس کے بدن میں ہلکی ہلکی، میٹھی میٹھی دُکھن انگڑائی لے رہی ہے۔ اس نے ارد گرد دیکھا۔ خاموشی اور دھوپ ایک

دوسری کی آغوش میں سو رہی تھیں مگر ان کے سونے کے انداز میں روز کے سے سکون کے ساتھ ساتھ اک تناؤ سا تھا۔ دھوپ دھوپ بھی تھی، اس سے ماورا بھی تھی۔ خاموشی خاموشی بھی تھی، اس سے ماورا بھی تھی۔ روز اس کی آنکھیں اس دھوپ کو دیکھتی تھیں، اس کے کان اس خاموشی کو سنتے تھے مگر آج اک نئی نظر پہلی نظر کے ساتھ مل کر، اک نیا کان پہلے کان ساتھ مل کر، اس سبزے کے درمیان اور اس سے الگ بھی، اس دھوپ اور اس خاموشی کو سبزے پر اور سبزے سے دور، بہت دور، خود اس کے اندر دیکھ اور سن رہے تھے۔ یہ باہر اور اندر کا امتیاز اس کے لیے بالکل نیا، انوکھا، ڈراؤنا، پیارا تھا۔ وہ لمحے بھر کے لیے ڈر سی گئی، چلتے چلتے اس کی پراعتماد چال میں اک بے ربطی سی آ گئی اور وہ ڈر کر رک گئی۔ اس نے سنہرے نیلے گگن کو دیکھا، بلند درختوں کے چوڑے چوڑے، پیلے ہوتے ہوئے سبز، سیاہ پتوں کو دیکھا، دور تک نظر آنے والے سبز رستے کو دیکھا، سبز رستے کے افق پر، گنجان درختوں کے پتوں کے درمیاں جھلکتی ہوئی سفید سنہری چوٹیوں کو دیکھا، درختوں کے گنجان پتوں میں چھپے ہوئے سریلے پرندوں کی لے کی اڑانوں پر کان دھرا۔ آج سنہرے نیلے گگن، پیلے ہوتے ہوئے سبز، سرخ، سیاہ پتوں، سبز رستے کے خدوخال روز کی طرح واضح نہ تھے، ان کی حدود کا امتیاز مشکل سا ہو گیا تھا، مختلف پرندوں کی مختلف سیٹیوں میں فرق محسوس نہ ہو رہا تھا۔ سب رنگ اور آوازیں ایک انوکھے سے بدن میں ڈھل رہے تھے جس کے خدوخال کا احاطہ اس کی نظر یا نظروں سے نہ ہو رہا تھا۔ اس کے بدن میں سنسنیاں نئی نئی، انوکھی انوکھی، رفتاروں سے رقصاں ہو گئیں۔ اس کے انگ انگ میں تعاون کا احساس مفقود ہو گیا۔ ہر انگ اپنی جگہ سب سے الگ، سب کا مخالف، محسوس ہونے لگا۔ وہ گھبرائی۔ اس نے اپنے چہرے پر دونوں ہاتھ پھیرے۔ اس کے ہاتھوں نے محسوس کیا کہ اس چہرے پر اک ریشمی، مخملی پن سا ہے، اس کے چہرے میں اک نئی رفتار کی گرمی ہے۔ اس کے ہاتھ اس کی گردن، اس کے شانوں، اس کے سینے، اس کے کولہوں، اس کے سرین، اس کی رانوں، پنڈلیوں کو ٹٹولنے لگے۔ اس کے ہاتھوں نے ہر انگ کو اجنبی پایا، ہر انگ نے اس کے ہاتھوں کو اجنبی پایا۔ یہ اجنبی پن اس کو اپنی طرف متوجہ کرنے لگا۔ اس نے دونوں ہاتھ سینے پر رکھ لئے۔ اس کے دل کی دھڑکن کی رفتار اس کے ہاتھوں میں انوکھی انوکھی سنسنیاں دوڑانے لگی۔ مگر ان

سنسنیوں میں پہلا سا خرام بھی موجود تھا۔

اک تیز، گرم گرم رو اس کے سر اور گردن کے سنگم سے پھوٹی اور اس کی کمر، اس کے سینے، کولہوں، سرین، اس کی ناف، رانوں، اس کی ناف اور رانوں کے سنگم میں سے اس تیزی سے گزر گئی کہ وہ تھرا گئی۔ اس نے چاہا کہ اس رو کو روک لے مگر یہ رو اس کی رانوں سے، پنڈلیوں سے، اور اس کے ٹخنوں اور ٹخنوں سے اس کی ایڑیوں اور اس کے پاؤں اور پاؤں کی انگلیوں سے ہوتی ہوئی اس سے دور ہو گئی یا اتنی قریب ہو گئی کہ وہ اس کا امتیاز، اس کا شعور، کرنے میں نا کام ہو گئی۔

یکا یک اس کو نتھنوں میں اناہی کے بدن سے رینگ رینگ کر، لمبے لمبے، وقفوں کے بعد آنے والی باس آنے لگی اور مسلسل آتی چلی گئی، اس کے گرداگرد لپٹتی چلی گئی، اس کا سارا جسم اس باس میں ڈھلتا چلا گیا، اس کا جسم باس بن گیا اور وہ خود نتھنے۔ باس اس کے نتھنوں میں اک اذیت ناک اور خوشگوار لمس بن گئی۔ یہ باس اناہی کی باس سے ملتی جلتی ہوتے ہوئے بھی اس باس سے الگ تھی، اس میں شدت اور تیزی بہت تھی، وہ باس دھیمی دھیمی اور بھینی بھینی ہوتی تھی۔

اس نشے کے عالم میں اس نے سنا کہ کوئی اس کو پکارتا ہے۔ اس نے اس پکار پر کان دھرا تو پتوں میں سرسراتی ہوئی ہوا کے سوا کچھ سنائی نہ دیا۔ ہوا ہلکی ہلکی تھی۔ اس میں بھینی بھینی باس تھی۔ اس باس میں راحت تھی، سکون تھا، اعتماد تھا، اس کے بہاؤ میں اک آہنگ تھا۔ اس کے بہاؤ کے لمس سے اس کے تن بدن میں اک آہستہ خرام اور ہمہ گیر سنسنی سی دھیرے دھیرے انگڑائی لینے لگی، بیدار ہونے لگی۔ اس آہستہ خرام سنسنی سے وہ آشنا تھی، برسوں سے۔ یہ سنسنی اس کے ہوش کے ساتھ ساتھ پیدا ہوئی تھی اور اس کے ساتھ ساتھ پھلی پھولی تھی، اس کی دوست اور ہمراز تھی۔ اس سنسنی کی بیداری تیز اور گرم گرم سنسنی کے احساس کو سلا نہ سکی، شاید سلانا چاہتی ہی نہ تھی۔ دونوں سنسنیاں ایک ساتھ اس کے سارے بدن میں محوِ خرام ہوئیں، جیسے آہستہ خرام سنسنی، تیز خرام سنسنی کو اپنی جانی پہچانی دنیا کا تعاقب کرا رہی ہو۔ یا شاید باہم سفر نے دونوں کو ایک دوسرے کی رفتار سے ہم آہنگ ہونا سکھایا کیونکہ جب

ہلکی ہلکی، سرسراتی، ہوا کے دوش پر اک نئی آواز اس تک پہنچی تو اس کے بدن سے پھوٹتی ہوئی باس بھینی بھینی بن چکی تھی، وہ اس کے لباس پر ایک دوسرے اور بوجھل لباس کی بجائے پہلے لباس کا حصہ بن چکی تھی، اس کی چال کا اعتماد نئی بے ربطی کے ساتھ مل کر ایک نئے سے آہنگ کی صورت اختیار کرتا محسوس ہو رہا تھا۔ ہوا کے دوش پر جھولتی ہوئی آواز خد و خال اختیار کرتی چلی گئی:

''اووو، ررر، می می می، لا لا لا، اور میلا۔ ارملا۔ ارملا۔'' اس آواز میں روز کی طرح کی سی الجھن، پریشانی اور ڈر نہ تھا۔ اس میں اک پیار تھا، اعتماد تھا، اک ہمدردی تھی۔ اس نے محسوس کیا کہ یہ آواز اس کے تن بدن میں رچ رہی ہے۔ یہ آواز اس کا تن بدن بن گئی، اس کا تن بدن اک نئی آواز میں ڈھل گیا۔

''انّا بی! انّا بی! رَتّا بی! رتّا بی! میں یہاں ہوں!''

اپنی آواز میں اس نے انّا بی کا نام پہلی بار سنا، یہ نام اس کو بہت ہی بھلا لگا۔ اس نام کی ناد کو اس نے جسم دینا چاہا، نیا، انوکھا، جو انّا بی کے جسم سے ملتا جلتا بھی ہو مگر اس سے الگ بھی۔ کیسا ہو؟ وہ شدتِ جذبات میں فیصلہ نہ کر سکی۔ ''رتّا بی! رتّا بی! رتّا! رتّا!'' نام کی ناد اتنی سندر، ولبھ بھی ہو سکتی ہے اس نے کبھی سوچا بھی نہ تھا۔ وہ اس ناد کے شریر کو اپنے شریر پر محسوس کر رہی تھی۔ اس جسم میں صندل کی سی ٹھنڈک اور سلاجیت جیسی گرمی تھی۔ اس نے چاہا کہ وہ شریر اس کے شریر میں مدغم ہو جائے۔ اس کی آرزو پوری ہوئی۔

''ارملا۔ ارملا۔ ارملا'' جیسے کوئی اس کے نام کا جپ کرتا ہو۔ انّا بی اس کے نام کا جپ کرتے کرتے اس کی نظر کے سامنے آ گئی اور پھر انا بی نے اس کو دیکھ لیا۔ وہ ٹھٹکی اور حیرانی سے، خوشی سے، اس کے قدم جمے کے جمے رہ گئے۔ پھر یکایک انّا بی بھی اس کی طرف دوڑی اور آ کر اس کو سینے سے لپٹا لیا۔ وہ دیر تک اس کا نام جپتی رہی۔ ''ارملا۔ ارملا۔ ارملا۔ میری، میری ارملا۔ میری اپنی ارملا۔''

انّا بی کی آواز میں بہت خوشی تھی، وہ خوشی سے پھولی نہ سما رہی تھی۔ وہ حیران سی ہوئی کہ آخر انا بی پر آج خوشی کیوں ناچ رہی ہے۔ انّا بی نے اس کو اپنے سینے سے الگ کیا اور اس

کے کندھوں پر ہاتھ جمائے اس کو سر سے پاؤں تک غور سے، بہت گہرے غور سے، دیکھنے لگیں، ان کے چہرے پر نور برس رہا تھا، ان کے چہرے کے خطوط، حسین سے حسین تر روپ اختیار کر رہے تھے۔ ان کی آنکھوں میں روشنیوں کی آتش بازی چھوٹ رہی تھی۔ روشنیاں یکا یک دھندلا گئیں۔ ان کی آنکھوں میں آنسو جھلملائے اور بہہ نکلے۔ ان کے، اس کے شانوں پر جمے ہوئے ہاتھ اس کی کمر کی طرف لپکے اور اس کو سینے سے لپٹا لیا اور اس کے سر، اس کے ماتھے، اس کی آنکھوں، اس کے رخساروں، اس کے ہونٹوں، اس کی ٹھوڑی، اس کی گردن پر ان کے صندل سے، سلاجیت سے ہونٹ رقصاں ہو گئے، دیر تک رقصاں رہے۔

اس صندلی، سلاجیتی رقص نے اس کے جسم میں دو مختلف خرام سنسنیوں کو اک نئی رفتار سے ہم سفر ہونا سکھایا۔ اس نئی رفتار میں نئی اور پرانی، دنوں رفتاریں جلوہ گر محسوس ہوئیں۔

اس رقص کے اختتام پر اناّ بی انّا بی نہ رہیں بلکہ رتّا دِدی بن گئیں

ارملا سے کبھی بھی بچپن نے رخصت نہ چاہی، جوانی نے اس کے بچپن سے حسد نہ کیا، بچپن جوانی سے کبھی دکھی نہ ہوا۔ بچپن اور جوانی اک انوکھے سفر کے ساتھی تھے جو دوستی کے باوجود ایک دوسرے سے اجنبی رہے، مگر یہ اجنبی پن ان کی دوستی کی بقا کا ضامن اور محافظ تھا۔

جب وہ پہلی بار خود اپنے قدموں سے چل کر اپنے محل کے بلند ترین اور پہلے آنگن کے برآمدے میں آئی تو صبح کے دمکتے دھندلکوں کے درمیان مشرق کے افق سے ابھرتا ہوا سنہری کلس اس کے لیے اک انجانے سفر کی دعوت بنا۔ وہ ہمہ تن استغراق بنی اس کو دیکھتی رہی تا آنکہ اس کی انّا بی اس کو ڈھونڈتی ہوئی ادھر آ نکلی اور گرم سرخ سنہری کامدار چادر میں لپیٹ کر اس کو گود میں اٹھا لے گئی۔ اس کی جدائی میں سنہرا کلس بلبلا اٹھا۔ مندر میں گھنٹیاں بج اٹھیں۔ گھنٹیوں کی آواز اس کے کمرے تک اس کا تعاقب کرتی رہی۔ گھنٹیوں کی آواز اور اس کے تن بدن میں اک عجیب سمبندھ ہوا۔ جب بھی کھیلتے ہوئے اس کے کانوں میں گھنٹیوں کی آواز آتی تو وہ کھیل بھول جاتی اور کان ان کی آواز پر لگا دیتی۔

جب اس کے ماتا پتا اور انا بی اس کو پہلی بار مندر میں لے گئے تو چار ہاتھوں والے اور ایک پاؤں اٹھا کر دوسرے پر جمے کھڑے سنہرے بت کو دیکھ کر اس کا دل کھل گیا۔ اس نے چاہا کہ وہ دوڑ کر اس سنہرے بت سے بغل گیر ہو جائے۔ اپنے ماتا پتا اور ان کے پیچھے انا بی کو آنکھیں بند کیے ساکن کھڑے دیکھ کر اس نے سنہرے بت سے بغل گیر ہونے کا خیال ترک کر دیا۔ وہ نہ چاہتی تھی کہ اس کے دوڑنے سے انا بی اور اس کے ماتا پتا اس جہان سے لوٹ آنے کے لئے مجبور ہو جائیں جہاں وہ محوِ سفر تھے۔ مگر وہ چپ چاپ نٹ راج کے سنہرے بت کو دیکھا کی۔ نٹ راج اس کو بہت بھائے، نٹ راج اسے اپنے جیسے لڑکے بالے لگے۔ اس نے سوچا کہ وہ ضرور اس سے باتیں کریں گے، اس کے ساتھ کھیلیں گے۔ اگر وہ اپنے ماتا پتا اور انا بی سے الگ کبھی تنہائی میں آئے۔

وہ ایسے مواقع کی تلاش میں رہنے لگی۔ جب بھی وہ ناشتے کے بعد باہر چمن وگلزار کی سیر کے لیے انا بی کے ساتھ آتی تو اس انتظار میں رہتی، بلکہ پرارتھنا کرتی، کہ انا بی کسی گل کے سایے میں اونگھنے لگیں تو وہ وہاں سے کھسک کر نٹ راج کے حضور پہنچے۔ کبھی کبھار وہ اپنے مقصد میں کامیاب ہو ہی جاتی۔ نٹ راج اس کو آتے دیکھ کر مسکرا دیتے اور اس کو خوش آمدید کہتے۔ کبھی کبھی اسے لگتا کہ وہ مسکراتے ہوئے اپنا اٹھا ہوا پاؤں زمین پر رکھنے والے ہیں۔ وہ ان کو روک دیتی کیونکہ وہ اس اٹھے ہوئے پاؤں کو اٹھا ہوا ہی دیکھنا چاہتی تھی۔ وہ اس اٹھے ہوئے پاؤں کو چھوتی، ہاتھوں سے سہلاتی، ادھر ادھر دیکھتے ہوئے ایک دم چوم لیتی۔ اس پاؤں میں کتنی ٹھنڈک ہوتی مگر اس ٹھنڈک میں سے اک گرمی سی پھوٹتی اور اس کے سارے بدن میں پھیل جاتی، رچ جاتی۔ وہ برسوں اس اٹھے ہوئے پاؤں سے کھیلتی رہی، دوسرے زمین پر جمے ہوئے پاؤں کی ٹانگ سے لپٹ لپٹ کر اس کے گرد گھومتی رہی۔ کبھی کبھی یوں گھومتے ہوئے اس کی کمر اٹھے ہوئے پاؤں سے چھو جاتی تو اس کو لمحے بھر کے لیے خیال آتا کہ نٹ راج اس کو پاؤں تلے دبا دینے لگے ہیں۔ وہ چونک کر رک جاتی۔ ٹانگوں سے بغلگیر ہوتے ہوئے وہ منہ اوپر کو اٹھا کر نٹ راج کے چہرے کی طرف دیکھتی۔ اسے لگتا کہ نٹ راج کہہ رہے ہوں کہ ''میں تو ایسے ہی تمہیں چھیڑ رہا تھا۔ بھلا تم جیسی ننھی

ننھی، پیاری پیاری، بٹیا کو پاؤں تلے دبانے کی کون سوچ سکتا ہے؟''

''ہوں! اس کو پاؤں تلے جو دبا رکھا ہے۔'' وہ انگلی کا اشارہ کرتے ہوئے کہتی۔

''یہ تو انسان کو برے کام کرنے کو کہتا ہے نا، اس لیے اس کو دبا رکھا ہے۔''

''سچ مچ؟''

''نہیں تو اور کیا؟''

''تو پھر میں اک چکر اور لگا لوں؟ ہاں؟ صرف ایک بار۔ ہاں؟''

وہ آنکھوں ہی آنکھوں میں اجازت دے دیتے۔ وہ جلدی سے ایک چکر لگا لیتی اور پھر جلدی سے نٹ راج کو الوداع کہتے ہوئے وہ مندر سے باہر بھاگ آتی اور دبے دبے پاؤں سے اتا بی کی طرف بڑھتی۔ وہ اکثر اتا بی کو اپنے خیالات میں گم پاتی مگر کبھی کبھی اس کو خیال گزرتا کہ وہ مکر کیے ہوئے ہیں۔ وہ قریب ہو کر غور سے ان کی بند آنکھوں کو دیکھتی۔

نٹ راج کے حضور ماتا پتا اور اتا بی کا استغراق، عجز و انکسار اور شام کے وقت دل گداز لے میں اجنبی زبان میں کچھ الا پنا اس کی سمجھ میں نہ آتا۔ نٹ راج ہمیشہ ایک ہمجولی، سہیلی، دوست اور ہمدرد ہونے کا احساس دیتے تھے۔ ان کے سامنے جھک جانے کو اس کا کبھی بھی جی نہ چاہا۔ اکثر اس کو خیال آتا کہ ان سے باتیں کرنے والا کوئی بھی نہیں۔ کیا ان کا دل نہیں چاہتا کہ کوئی ان سے کہانی کہے؟ کیا وہ یوں ایک ٹانگ پر کھڑے کھڑے اکتا نہیں جاتے، تھک نہیں جاتے؟

ایک دن جب وہ ان کے پاس گئی تو اس نے محسوس کیا کہ نٹ راج اداس ہیں۔ انہوں نے اس کی طرف دیکھا تو مگر مسکرائے نہیں، ان کی اٹھی ہوئی ٹانگ میں جنبش بھی نہ ہوئی۔ اس کے دل پر چوٹ سی لگی۔ اس نے ان کو بہلانے کے لیے وہ گیت گایا جو ایک رات، جب چاند اس کی کھڑکی کے شیشے سے نیچے اتر رہا تھا، اس نے دم سادھے ہوئے، اتا بی کو ہولے ہولے گاتے سنا تھا۔ اس کے معنی سے وہ آشنا نہ تھی مگر اس کی لے اس کو نٹ راج کی حالت کے عین مطابق معلوم ہوئی۔ اس کا گیت سن کر ان کے سارے بدن میں اک جھرجھری سی

آئی اوران کی اٹھی ہوئی ٹانگ میں جنبش ہوئی، ان کی دوسری ٹانگ کے گھٹنے میں ذرا سا خم آیا، ان کے ہونٹ ہلے، ان کی آنکھوں میں چمک پیدا ہوئی۔ وہ اپنے کارنامے پر بہت خوش ہوئی۔اس نے دوڑکران کی زمین پرجمی ہوئی ٹانگ کوتھپکا،ان کی اٹھی ہوئی ٹانگ کے پاؤں کوسہلایا۔ پاؤں کوسہلاتے سہلاتے اس کو خیال آیا کہ اس گیت سے نٹ راج کی اداسی مسکراہٹ میں کیوں بدل گئی؟ اورانّا بی آدھی رات کو یہ گیت کیوں گاتی تھی؟ کیا وہ بھی اداس تھی؟ آخر کیوں؟ نٹ راج تو اکیلے کھڑے کھڑے، اور وہ بھی ایک ٹانگ اٹھائے ہوئے،گھبرا جاتے ہوں گےمگرانّا بی سےتو بیسیوں باتیں کرنے والے تھے۔ وہ خود باتیں کرتی تھی، ماتا جی باتیں کرتی تھیں؟ باورچی باتیں کرتا تھا،اس کی بیوی، چوکیدار، جانوروں کے خدمتگار، اصطبل کا داروغہ اوراس کی پتنی۔ ہاں،تو پھر بھی وہ اداس کیوں ہوجاتی تھی،گل کے سایے میں،سنہری دھوپ میں، وہ یکا یک کھوکیوں جاتی تھی؟

ایک دن دوپہر سے ذرا پہلے وہ انّا بی اورایک نوکر کے ساتھ گاؤں میں وَسَنت اُتسَو دیکھنے کے لیے گئی۔ سبھی لوگ،لڑکے بالے،لڑکیاں، کنواریاں،عورتیں، مرد، جوان اور بوڑھے پیلے برن پہنے اُتّر پچھمی بن کے درمیان گھرے وسیع میدان کی طرف بڑھتے چلے جارہے تھے۔ میدان میں دکانیں سجی تھیں جن پر میدانی علاقوں کے لوگ چکنی مٹی کے کھلونے؛ رنگین پتھروں کے گول گول دانوں سے پروئے ہوئے ہار؛ کپڑے کی بنی ہوئی گڑیاں جو رنگدار ریشمی برن پہنے تھیں؛ میدانی پھل، میدانی کڑھائی کے ریشمی اورسوتی کپڑوں کے تھان الگنوں پر؛ میدانی کھانے اورمٹھائیاں،قرینے سے سجے تھے۔میدان کے چاروں طرف اونچے درختوں سے جھولے، جھولوں میں سجیلی کنواریاں اور ہٹیلے جوان درختوں کی پھُننگوں سے اونچی پینگ لے جانے میں کوشاں تھے۔ درختوں پر پیلے، سفید،سرخ پھول کھلے تھے،درخت پھولوں سےلدے تھے۔

انّا بی اوراس کو دیکھ کر بوڑھے، جوان اور کنواریاں مسکراتے ہوئے راہ دیتے گئے۔ لڑکیاں اور بالے ان کو دیکھ کر کھلی آنکھوں سے، پلک جھپکے بغیر دیر تک، زمین پر پاؤں جمائے، دیکھا کیے اور جب وہ ان کے قریب سے گزرے تو اپنی حیرت پر شرمسار سے ہوکر

انہوں نے نظریں پھیر لیں، کچھ اور کرنے کا بہانہ کرنے لگے۔

جب وہ میلے میں گھومتے گھومتے تھک گئی تو انّا بی اس کو اُترّ پچھمی بن میں ایک چشمے پر لے گئیں، جہاں چاروں طرف پشپ کھلے تھے: سفید سفید، لال لال، اودے اودے، پیلے پیلے۔ ان کی باس اس کو بھوک اور تھکن بھلانے پر مجبور نہ کرتی تھی۔ انّا بی نے نوکر سے توشہ دان لیا۔ دستر خوان بچھایا، کھانے چن دیئے۔ کھانے کا ایسا مزا اسے پہلے کبھی نہ آیا تھا۔ اس نے محسوس کیا کہ اس کے پیٹ میں نور بھر گیا ہے اور اس کے نینوں میں اک گرم گرم سی ٹھنڈک چھلکنے لگی ہے۔

اس نے کھاتے کھاتے، ذرا سیر سی ہوتے ہوئے، نظر اٹھا کر جو انّا بی کی طرف دیکھا تو کھاتے ہوئے ان کے جبڑے، ہونٹوں اور پلکوں، بھوؤں کی جنبش سے پیدا ہونے والا منظر اس کو بہت ہی سندر لگا۔ کھاتے ہوئے انّا بی پر اک انوٹھا سا وِلاس آ گیا تھا جو اس نے پہلے کبھی نہ دیکھا تھا۔ شاید اس لیے کہ اس نے پہلے کبھی انّا بی کو کھاتے ہوئے نہ دیکھا تھا۔ ان کے مکھ پر اک سمادھی کا سا روپ تھا، جب لقمہ ان کے حلق سے اترتا تو ان کا نرخرہ اور ان کا دھیرے دھیرے ابھرتا ڈھلکتا سینہ اک لمحے کے لیے عجیب آہنگ میں ہم سفر ہوتے۔ ان کا دایاں ہاتھ جب لقمہ اٹھا کر منہ کی طرف لے جاتا تو ان کا بازو ان کے پرسکون بدن کے ساتھ اک ایسے مسلسل بدلتے ہوئے زاویے سے اٹھتا کہ اس کو گمان ہوتا کہ شاید انّا بی نے بازو اور ہاتھ کو اس انداز سے اٹھانے کے لیے برسوں مشق کی ہو۔ لقمہ نگلنے کے لیے وہ لب وا کرتیں تو ان کے موتی سے سفید، ہموار، دانتوں کی لڑیاں بہت دمکتیں اور پھر ان پر ان کے اشوک سے ہونٹ پردہ ڈال دیتے۔ اس کا جی چاہا کہ وہ کسی طرح اپنے آپ کو بھی کھاتے ہوئے دیکھ سکے۔ کیا وہ بھی انّا بی کی طرح سندر لگتی تھی وہ یہ سوچتے سوچتے لقمے لیتی رہی۔ پھر یکا یک انّا بی کی روشن، دیپ سی آنکھیں، اس کی آنکھوں میں اتر آئیں۔ اس نے دیکھا کہ وہ دایاں کھلا ہوا ہاتھ بائیں ہاتھ کی پشت پر رکھے اس کو بغور دیکھتی ہیں۔ وہ چونکی۔ انّا بی کے اشوک سے ہونٹ کھلے، موتی سے دمکتے دانت چمکے اور اس نے سنا:

''تم کھاتے ہوئے کتنی سندر لگتی ہو۔ مانو کہ جیسے کوئی پجارن دیوی کے موہنے کو آرتی

اتارتی ہو۔''

''آپ بھی تو ایسے ہی لگتی ہیں۔ میں دیر سے بچار کر رہی تھی کہ آپ کیسی لگ رہی ہیں۔''

اس نے دیکھا کہ اناّ بی شرما گئی ہیں، اس نے محسوس کیا کہ وہ خود بھی لاج کی مارے لال ہو رہی ہے۔ وہ لاج کے مارے لال تو ہو رہی تھی مگر اس کا دل بلّیوں اچھل رہا تھا۔ جذبات کی اس ریل پیل میں دونوں نے کھانے سے ہاتھ کھینچ لیے۔ دور کھڑے نوکر نے ایک برتن میں چشمے سے پانی بھرا اور اک دوسرے برتن میں بیسن ان کے سامنے دھرا۔ انہوں نے بیسن ہاتھوں پر ملا، نوکر نے پانی ڈالا، انہوں نے ہاتھ صاف کیئے۔ نوکر نے ہاتھ صاف کرنے کو صاف ستھرا کپڑا آگے بڑھایا۔ دونوں نے ہاتھ پونچھے اور ایک ساتھ دستر خوان سے اٹھیں اور بہتے چشمے کے کنارے جا کھڑی ہوئیں۔

ننھے چمکدار کنکروں کی صورت گری کرتے ہوئے، آئینہ دکھاتے ہوئے، شفاف پانی میں ان کے عکس جھلملانے لگے۔ وہ دونوں کن انکھیوں سے اپنے اور دوسرے کے عکس کو دیکھنے لگیں، دیکھتی رہیں نہ جانے کب تک۔ پھر ہلکی ہلکی ہوا درختوں کے پتوں سے پھسلتی ہوئی، لال لال، سفید سفید پھولوں کو درختوں کی شاخوں پر، حیرت سے دیکھتے ہوئے، جھولاتی ہوئی، پانی کی سطح پر ہلکورے لیتی ہوئی، ان کے چہروں، ان کی زلفوں کو چھیڑنے لگی۔ پانی میں ان کے عکس دھندلا گئے اور وہ ایک دوسرے کے سامنے بالکل تنہا، بے دفاع رہ گئیں۔ انہوں نے ایک دوسرے کی آنکھوں میں پناہ تلاش کی، ایک دوسرے کو ہاتھ بڑھا کر سہارا دیا۔ ہاتھ میں ہاتھ دیئے وہ بہتے پانی، جھولتے لال اور سفید پھولوں، ہلتی ٹہنیوں، شور کرتے رقصاں پتوں کو حیرانی سے دیکھتے ہوئے بڑے بڑے پتھروں کو دیکھنے لگیں۔ سرسراتی ہوا کا جسم، پتوں سے چھن چھن کر آتی ہوئی، بہتے شفاف پانی پر رقص کرتی ہوئی کرنوں کا نور، لال لال سفید سفید، پھولوں کا بھولپن، ان کی بھینی بھینی خوشبو کا بھلا بھلا سا اعتماد، بڑے بڑے پتھروں کا دھیرج، امرتا، سنتتان، اچتیا، ان کے شریروں میں دبے پاؤں سے داخل ہونے لگے۔ ان کے سواگت کو ان کے حواسوں، ان کے ذہنوں، تخیلوں،

وجدانوں، عقلوں نے اپنے در کھول دیئے جیسے ان سے شنکر، شو، شمبھو مہمان ہو ہی نہ سکتے ہوں۔

ارملا نے محسوس کیا کہ بہتے پانی، ننھے کنکروں، بڑے بڑے پتھروں، درختوں، شاخوں، پھولوں، ہوا، سبزے اور دور تک جاتے ہوئے رستوں کے فرشوں میں بھی وہی شعور رچا ہے جو خود اس کے اندر مچل رہا ہے۔ اس شعور کی ہمہ گیر وحدت کی نظر سے اس نے اناّبی کی اُور نظر کی تو وہاں اک عجب سہانا منظر نظر آیا۔ ان کا تمام جسم اک گلابی سے شعلے کی صورت بہتے پانی پر اپنا عکس ڈالتے ہوئے نیلے سنہرے گگن کی طرف لپکنے کی تیاری کر رہا ہے۔ اس نے جلدی سے اناّبی کے ہاتھ میں دیئے ہوئے اپنے ہاتھ کی طرف دیکھا۔ اس کا ہاتھ اس گلابی سے شعلے کا حصہ بنا تھا۔ اس نے محسوس کیا کہ اس شعلے اور اس کے اپنے جسم میں اک تعلق تو ہے مگر لمس کا تعلق نہیں، وہ شعلہ گگن کی طرف مائلِ پرواز ہے اور اس کا جسم سبز زمین میں اپنی جڑیں دور دور تک پھیلاتا چلا جا رہا ہے، چلا جا رہا ہے، حتیٰ کہ جڑیں دور ٹھنڈے میٹھے پانی سے ہم کنار ہوگئی ہیں اور پانی کا رس اس کی جڑوں کی راہ سے اس کے جسم میں سے ہوتا ہوا، اس کے ہاتھ کی راہ سے گلابی شعلے کے روپ میں جذب ہوتا ہوا نیلے سنہرے گگن میں محوِ سفر ہو گیا ہے۔ اوپر درختوں کی پُھننگوں سے بہت اوپر پرسکون، سنہرے سنہرے، واضح واضح، آکاش میں، نیلے گگن کی اور دور دور تک سکون کا اک سمندر سو رہا ہے اور اس سمندر کے سینے پر، اس کے شریر کے اندر، گہرائیوں تک، پورب سے پچھّم تک، اتر سے دکھن تک گلابی شعلے کی چھوٹیں پھیل رہی ہیں، گلابی شعلے کی چھوٹوں کے سوا کچھ نہیں ہے، زمین سے نیلے گگن تک گلابی شعلہ ہی ہے، باقی کچھ نہیں ہے، زمین اور گگن نہیں ہیں، صرف گلابی شعلہ ہے، اور گلابی شعلہ سندر ہے، اس میں عجب، انوکھا، انوٹھا، ولاس ہے جو پُرش کے ولاس سے سراسر الگ ہے، یہ ولاس نارائنی ہی ہوسکتا ہے، یہ ولاس نارائن ہے۔

نارائن کے حضور کھڑے ہونے کے احساس سے وہ چونک اٹھی، تھرائی اور شعور کی مملکت میں لوٹ آئی۔ سنہری سبز پھننگوں سے پھسلتی ہوئی، سرخ، سفید پھولوں کو سہلاتی ہوئی، دور تک جاتے ہوئے سبز رستوں پر دوڑتی ہوئی، بہتے ہوئے پانی سے ہوتی ہوئی وہ

واپس اپنے مقام پر لوٹ آئی اور اس نے رتّا دِدی کے ہاتھ میں دیے ہوئے اپنے ہاتھ کو محسوس کیا، اس کا یہ احساس شدید ہوتا گیا، احساس دکھنے لگا۔ اس نے کوشش کر کے اپنا ہاتھ دِدی کے ہاتھ سے الگ کر لیا۔ دِدی اور اس کا جسم الگ الگ ہو گئے، اس کا اور ددی کا شعور الگ الگ ہوئے، اس نے اپنے حواس اور اپنے آنکھوں سے پرے ماحول میں کنچن بہتے پانی میں اپنے جسم، اپنے چہرے کو بغور دیکھا: اس کا چہرہ جانا پہچانا ہوتے ہوئے بھی اجنبی اجنبی سا تھا، اس میں بھولپن اور استغنا کے ساتھ ساتھ، رچا بسا ہوا تدبر سا تھا۔ اس نے کنچن بہتے پانی پر سے اپنی نظر کو پھیر لیا اور رتا ددی کے چہرے کو دیکھنے کی خاطر چہرے کو اس کی طرف پھیرا تو وہاں کچھ بھی نہ تھا، حیران ہوئی، پریشان ہوگئی۔ اس کی نظروں نے ددی کو ڈھونڈا۔ ددی پاس ہی ایک درخت کی کوکھ کا سہارا لئے اس کو بغور دیکھ رہی تھی، دیپ سی آنکھوں سے، کھوئی کھوئی نظروں سے۔ اگرچہ ان کی نظریں کھوئی کھوئی تھیں مگر ان روشن آنکھوں میں سکون تھا، ان کے چہرے اور شریر میں اک اعتماد تھا جو ان دونوں کے درمیان اک حدِ فاصل بنا ہوا تھا۔ اس حد کو عبور کرنے کی اس کے دل میں کوئی آرزو نہ تھی، کوئی چنتا نہ تھی۔

اس پر وا ہوا کہ ان دونوں کی زندگیوں کے دھارے الگ الگ، دور دور واقع بطنوں میں بسنے والے تھے مگر ان دونوں کو ایک ہی زمین کو سیراب کرنا ہوگا اور وہ زمین ان دونوں کے لیے اجنبی، بالکل اجنبی ہوگی۔ وہ زمین کیسی ہوگی؟ اس نے سوچا۔ اس سوچ نے اس کو ایک بار پھر اپنے آپ سے غافل کر دیا اور وہ دور اجنبی سرزمینوں میں سرگرداں ہوگئی، رتا ددی کو بھلا بیٹھی، بھولی رہی۔

سردی کے احساس نے اس کے حواس کو جگا دیا اور حواس کی بیداری نے اس کو اجنبی سرزمینوں سے لوٹ آنے پر مجبور کر دیا۔ اس نے پلکوں کے سایے سے نکل کر دیکھا تو ددی اس کی طرف چلی آ رہی تھیں۔ ان کے قریب آتے چلے جانے کے خیال سے اس کے شریر میں اک گرم سی رو دوڑنے لگی، اس کے خون میں رچنے لگی، ددی اس کے قریب آ گئی۔ اس کے کندھے پر ہاتھ رکھتے ہوئے اپنے بازو سے اس کے شریر کا رخ پھیر دیا اور بولیں!

''دن ڈھل رہا ہے۔ گھر پر ہمارا انتظار ہو رہا ہوگا۔ آ ؤ چلیں۔''

وہ چل دیں۔ سنہری کرنیں سبز فرش سے اوپر اٹھ چکیں تھیں، درختوں کی کمروں سے لپٹی تھیں اور خود ان کی گردنوں، چہروں اور سروں کا ہالہ کئے تھیں۔ چلتے چلتے جب گھنے درختوں کے درمیاں ننھے ننھے سے فاصلے آ جاتے تو ڈھلتے سورج کی کرنیں ان کی آنکھوں میں گھس آتیں اور ان کی نظروں کے سامنے اک سنہرا، دھندلکا بن دیتیں اور وہ لمحے بھر کے لیے رک جاتیں۔ اس نے محسوس کیا کہ جیسے کرنیں ان کا راستہ روکتی ہوں اور پرارتھنا کرتی ہوں کہ وہ انہیں تنہا چھوڑ کر نہ چلی جائیں، جیسے سورج کی بیٹیوں کو سبز راہوں پر چلنے والی شعلہ سمان ناریاں پسند آ گئی ہوں اور اب ان کی جدائی سے پریشان ہوں۔ کرنوں کے اس پیار کے خیال سے اس کے دل میں اک خوشگوار سی گدگدی ہونے لگی اور وہ کرنوں کے اس پیار کے لیے ممنون ہوئی۔ ان سے کل پھر ملنے کا وعدہ کرتی ہوئی گھر لوٹ جانے پر راضی کرتی ہوئی، تیز تیز قدم اٹھانے لگی۔ جلد ہی بھرپور میلے کے اتنے قریب آ گئیں کہ اس کا بھرپور، گھمبیر، ہم آہنگ شور ان کے قدموں پر لوٹنے لگا، لوٹتے لوٹتے بہنے لگا اور پھر شور کا ہم آہنگ سمندر ان کے چاروں طرف ٹھاٹھیں مارنے لگا۔

میلے میں کشتیوں کی طرح تیرتے پھرتے نرناریاں، بڈھے، جوان اور بچے ان کو دیکھ دیکھ کر ٹھٹک ٹھٹک کر رکنے لگے، بغور اور حیرت سے تکنے لگے ان کے پیلے پیلے برنوں پر ڈھلتے سورج کی کرنیں بہت بھلی معلوم ہو رہی تھیں۔

جب وہ عین میلے کے درمیان پہنچیں تو اس نے بہت ہی ننھے لمحے کے لیے محسوس کیا کہ میلے کا شور سو گیا ہے، گہری، اتھاہ گہری، نیند، جس سے جگانے کے لیے کرشن کو اپنی کرنا ہی پھونکنی ہوگی۔ مگر کسی کرشن نے کرنا نہ پھونکی اور میلے کی نیند اس پر بوجھ بن گئی۔ اس کے دل کی دنیا تنگ ہونے لگی اس نے اپنے پورے تن کے زور سے کرشن کی کرنا سے فریاد کی کہ وہ گونج اٹھے۔ کرنا گونج اٹھی، میلے کا شور بیدار ہو گیا، اک نئے ولولے کے ساتھ۔ اس ولولے میں اک رعنائی تھی جو اس کے تیز تیز اٹھتے قدموں میں اک سنہری سی، ریشمی سی زنجیر ڈالنے کی کوشش کر رہی تھی۔ مگر زنجیر شاید بہت نازک تھی جو اس کے قدموں کی تیزی میں

فرق نہ ڈال سکی اور وہ جوان نر ناریوں کی آنکھوں میں حیرت کو بیدار کرتی ہوئی میلے سے دور اپنے سات آنگنوں والے محل کی طرف بڑھتی ہی چلی گئیں۔ جب وہ اپنے محل کے گردونواح کی حدود میں داخل ہونے والی گھاٹی سے اتر رہے تھے تو اس نے دیکھا کہ محل کے کلس والے کوٹھے کی منڈیر سے اس کی ماں سر پر سرخ سنہری گرم چادر اوڑھے ان کی راہ دیکھ رہی ہے۔ ماں کو یوں منتظر دیکھتے ہوئے اس کے تن بدن میں اک پیار اور ممنونیت کی لہر اٹھی اور اس کے سارے بدن پر چھا گئی۔ اس نے چاہا کہ وہ اڑ کر ماں کے پاس چلی جائے اور اس کی ماں اس کو سینے سے لگا لے اور اپنی ماں کے بدن میں جذب ہو جائے۔

اس کے بچپن نے کبھی اس سے رخصت نہ چاہی اور نہ ہی اس نے کبھی سوچا کہ اس کا بچپن اس سے رخصت ہو۔ اس پر جوانی آئی تو اس آہستگی سے کہ اس کی بچپن نے کبھی محسوس ہی نہ کیا کہ وہ اس سے الگ ہے اور اس کی جوانی نے کبھی کوشش نہ کی کہ وہ بچپن کی جگہ لے لے۔ بچپن اور جوانی اس کے شریر، اس کے من، اس کے ہردے، اس کے تخیل کے سوریہ اور چندا تھے۔ وہ کبھی تصور ہی نہ کر سکتی تھی کہ سوریہ اور چندا میں سناتن سمبندھ نہیں ہے۔ اس کو سوریہ میں بچپن کا سا استغنا اور خود محویت نظر آتی تھی اور چندا میں انتخاب کی آرزو اور انتخاب کے بعد نوازش کی خواہش، جیسی کہ جوانی میں ہوتی ہے۔ اس نے استغنا اور خود محویت، انتخاب کو آرزو اور منتخب پر نوازش کی خواہش کو ایک دوسرے سے کبھی اجنبی نہ دیکھنا چاہا، وہ ان جذبوں میں دوستی، اخوت اور ہم مقصدیت چاہتی رہتی۔ اس کو یہ نعمت ہمیشہ ہی نصیب رہی اور وہ اس نعمت کے لیے ہمیشہ ہی ممنون رہی۔

کملا کی ان عنایتوں کے باوجود اس نے زندگی میں چند دکھ بھی اٹھائے مگر وہ ان دکھوں کی بھی ممنون تھی کیونکہ ان کی بدولت وہ ایسے اجنبی دیسوں میں قدم رکھ سکی تھی جن کے سمبھوگ نے اس کے من، ہردے، خون میں ایسی پریمن، ایسی آسکتی رچائی تھی کہ اس کے اندر کے جہاں میں ہر دم اک ویاسن چھایا رہنے لگا جس کے سبب سے بیتنے کے ساتھ ساتھ اک ایسے جیون ساتھی کے لیے اس کے شدھ انتر میں اُپاسنا ابھرتی چلی گئی، روپ دھارتی چلی گئی، مورت بن گئی، جس کے گرداگرد اس کی ساری شخصیت مندر سمان ہَر پت کے لیے

منتظر رہنے لگی، مگر اس انتظار میں بے تابی، الجھن، خوف، دھڑکن نام کو بھی نہ تھی۔ اس انتظار میں اک یقین، اک شانتی تھی اور کبھی کبھی تو انتظار کی کیفیت میں ایسا انّو گرھ، ایسا ولاس، ایسی شوبھا آ آ جاتی کہ اس پر اک سمّوہ طاری ہوجاتا اور اس کا جی چاہنے لگتا کہ وہ اپنے آپ کو اس سموہ کو ہر پت کر دے۔ مگر سموہ میں سے ایسی طاقت، ایسا وصف، پھوٹ نکلتا کہ وہ وبودھ کا روپ دھار لیتا اور وہ ایک بار شدھ انتر کے مندر میں ابھری ہوئی مورتی کے دوار پر کھڑی ہوجاتی اور اس کی ساری شخصیت اک اُپاسنا بن جاتی اور وہ اپنے جیون ساتھی کا انتظار کرنے، کرتے رہنے پر یقین اور اعتماد سے نئے سرے سے قائم ہوجاتی۔ لیکن اس کے ماتا پتا کے ملنے والوں، اس کے چھوٹے بھائی کے دوستوں میں، جن کا وہ اکثر گرمیوں کی چھٹیوں میں جب اس کا کالج بند ہوجاتا تھا، ذکر کیا کرتا تھا، میں کسی کی صورت اس کے من مندر میں در نہ آتی۔ وہ سب کے سب اس کے لیے محض ان راہوں کے راہی تھے جن پر اس کو کبھی بھی نہ چلنا تھا۔

جب رتا ددی نے اس کی ماں سے رخصت کی اجازت چاہی تو اس کی ماں ددی کے من کی اچھّا جان لینے کے بعد انکار نہ کر سکیں۔ ددی اس وشوا کو تیاگ دینا چاہتی تھیں۔ کیوں؟ اس نے ددی سے پوچھنے کی جرأت کر ہی لی مگر ددی مسکرا دیں اور اپنے دائیں ہاتھ کے انگوٹھے کے ساتھ والی انگلی اس کے ہونٹوں پر رکھ دی اور اپنی دیپ سی آنکھوں کو اس کے چہرے کے قریب لے آئیں۔ ان دیپ سی آنکھوں میں اتھاہ کی گہرائی تھی، جو شفاف تھی، جس میں دھندلکوں کا سایہ تک بھی نہ تھا، جس میں کسی مندر، کسی مورتی کا سوال ہی نہ تھا۔ ان نینوں میں اک الاؤ روشن تھا جس کو کسی ایندھن کی طلب نہ تھی، ضرورت نہ تھی، جو اس جگت کے ہارے ہوئے، تھکے ہوئے، ٹھٹھرے ہوئے پرشوں کے لیے لمحے بھر کی نہیں بلکہ ایک خاصی مدت کے لیے امن، سکون اور راحت کی دعوت تھی۔ اس کو اس الاؤ کے اس وصف کے تصور سے ہمیشہ ہی راحت کا احساس ہوتا رہا۔ ددی کو رخصت کرنے کے لیے وہ صبح سے دوپہر تک اُتر کے بلند پہاڑوں کی طرف ددی کے ساتھ ساتھ رہی اور جب اس کے سات آنگنوں والے گھر کا روشن کلس نظروں سے آنکھ مچولی کھیلنے لگا تو ددی نے اس کو واپس چلے جانے کے لیے کہا اور اُسے ددی کا حکم بجالانے کے سوا چارہ

ہی کیا تھا۔ اور جب وہ مڑی تو اس نے دیکھا کہ اس کے پیچھے پیچھے آنے والے ملازم کوئی بیس گز پرے، بلکہ نیچے کھڑے اس کا انتظار کر رہے تھے۔ وہ واپس اتری اور ان سے بات کئے بنا ان کے پاس سے گزر آئی اور مڑ کر بھی نہ دیکھا کہ وہ ساتھ آ بھی رہے ہیں کہ نہیں۔ اس دوپہر کی واپسی کے سفر کی تھکن آج بھی اس کے بدن کے کسی حصے میں بیدار تھی اور آج بھی اس کے من میں یہ سوال اک الاؤ کی طرح روشن تھا کہ ددی نے جگت کو کیوں تیاگ دیا اور اتر کے بلند ترین ہیم کشیتر کو اپنا آشرم بنانے کے لیے کیوں منتخب کیا۔ کیا اس سارے جگت میں کوئی نہ تھا جو ان کو اس جگت میں ہنسی خوشی رہنے پر راضی کر سکتا؟ اور اس الاؤ میں سے کبھی کبھی ایک اور سوال کی صورت ہویدا ہو جاتی! کہ خود وہ بھی ددی کی طرح جگت کو تیاگ دینے پر ایک دن تیار ہو جائے گی؟ اس سوال کی صورت سے اس کے تن بدن میں سرد ہوا سی چلنے لگتی اور وہ سوچنے لگتی کہ وہ اپنے بھائی اور بھائی کی منگیتر اور ان دونوں کی ماموں زاد، سوشیلا کے ذریعے اور خود اپنے مطالعے کے ذریعے جس رنگ برنگے جگت سے اچھی طرح سے آشنا تھی اس جگت سے نٹ راج اس کے لیے کسی جیون ساتھی کو کہیں دور سے اس کے ملاپ کو کھینچ لائیں گے؟ مگر اس کا جیون ساتھی کیسا ہوگا؟ وہ کبھی بھی اس کے روپ کا، اس کے خیالات اور جذبات کا تصور بھی اپنے تخیل میں نہ لا سکی۔ اس کا جیون ساتھی ایسا گپت تھا کہ اس اور اس کے درمیان صرف ایک آدرش حائل تھا جس میں سے اس کو اپنی صورت تو نظر آتی تھی مگر اس کے پار اس کے جیون ساتھی تک اس کی نظر نہ جا سکتی تھی۔ مگر اس کو اکثر گمان ہوتا کہ وہ اپنے جیون ساتھی کے قدموں کی چاپ، اس کے سانس کی لے، سن رہی ہے اس کے سانس کی گرمی کو اپنی گردن کی پشت پر محسوس کر رہی ہے مگر اس کی تلاش، اس کو کبھی بھی منزل پر نہ لے جا سکی۔

ددی کی رخصتی کے پانچ سال بعد اس کا بھائی چندر بھان ایم ایس سی کرنے کے بعد یورپ جانے کے لیے تل گیا۔ ماتا پتا نے دل کڑا کر کے اجازت دے دی۔ مگر اس کا دل نہ چاہتا تھا کہ وہ اس کو اجازت دے۔ مگر وہ جانتی تھی کہ دھرتی سے پھوٹنے والے پودوں، پھولوں، درختوں کے وگیان کی آرزو اس کو کبھی بھی سات آنگنوں والے مکان میں مسدود زندگی گزارنے پر راضی نہ رہنے دے گی اور آخر اس کو اس علم کی تلاش میں یورپ کی سرزمین پر لے اترے گی۔ اس نے

قدموں پر جھکے ہوئے چھوٹے بھائی کی کمر پر پیار سے ہاتھ پھیرا، اس کے کندھوں پر دونوں ہاتھ جما کر اس کو اوپر اٹھایا، اس کا سر سونگھا، اس کا ماتھا چوما، اس کے ریشمی گلابی چہرے میں ناک کی بلند اور تیز دھار فصیل کے دونوں طرف چمکتے ہوئے جھیل سمان نینوں میں جھانکا۔ ان نینوں میں اس کے لیے بے پناہ پیار، عزت، احترام تھا مگر اس کے ساتھ ساتھ مگر اس سے الگ، جدا، ہو جانے کی بڑی واضح اور روشن آرزو تھی جس کی روشنی سے اس کی آنکھیں چندھیا گئیں، دھندلا گئیں۔ اس نے آنکھوں کو پلکوں سے ڈھانپ لیا، بھائی کے شانوں سے دونوں ہاتھ اٹھا لیے۔

''ددی اس جگت میں پرانوں میں جدائی ہے۔ چاند بھی گگن سے چند دنوں کے لیے جدا ہو جاتا ہے مگر پھر اک نئے روپ میں لوٹ آتا ہے۔ تمہارا چندر بھان بھی ان پھیلے ہوئے آنگنوں میں لوٹ آئے گا کہ اس کا گگن یہی آنگن ہے۔ مگر گگن کے چندر کے لوٹ آنے کی مدت چند دنوں کی ہے مگر تمہارے چندر کو لوٹ آنے میں چند سال لگیں گے......

تم تو جانتی ہی ہو، ددی! کہ زمین سے پھوٹنے والی چیزوں سے مجھے کتنا لگاؤ ہے، ان کے جنم، ان کے پروان چڑھنے کے، مرتیو کے کارن کا وگیان حاصل کئے بغیر میں اپنے جیون سے مطمئن نہیں ہو سکتا۔ اس وگیان کی بنیاد کے بغیر نہ صرف دھرتی سے جنم لینے والے پودے، پھول، پھل، درخت، فصلیں بلکہ اس کے سینے پر چلنے والے ہر پُرش کی زندگی کو سنوارنے کی ہر آرزو کسی منزل پر نہیں پہنچ سکتی اور میں اس آرزو کو اپنے ہردے سے نکال نہیں سکتا۔ کیونکہ اس آرزو کا نام چندر بھان ہے جو ارملا کا بھائی ہے اور سوشیلا کا منگیتر ہے۔ اس آرزو کو منزل پر لے جانے کی کوشش میرا یُدھ ہے اور اس یُدھ میں کیرتی حاصل کئے بنا میں اپنے جیون کو سپھل نہیں جان سکتا......

''ددی! مجھے آشیرباد دو، مجھے آگیا دو، ودا کرو۔''

''جاؤ، چندر بھان۔ میں تو اسی دن سے اس سمے کے انتظار میں تھی جب میں نے تمہیں پہلی بار، باغ کی مٹی میں، بیج ڈالتے ہوئے بے سدھ دیکھا تھا۔ تمہارے سارے بدن میں اک بیجنو دی تھی، اک سرخوشی تھی۔ اک وجدان تھا۔

جاؤ، چندر بھان، سوشیلا اور میں تمہاری راہ دیکھا کریں گے۔''

تیسرا باب

ٹھاکر شِو آنند نے جب پہلی بار کرشن کمار پر نظر ڈالی تو ان کا دل بیٹھ ہی تو گیا۔ انہوں نے اتنا خوبصورت نوجوان پہلے کبھی نہ دیکھا تھا اور اس کے ماتھے پر اس کے لمبے بال اس طرح بکھرے تھے کہ اس کے چہرے پر اک عجیب طرح کا الم جگمگا رہا تھا، جیسے کہ تمام انسانوں کے دکھوں کا بوجھ اس نے پوری ذمے داری سے اٹھا رکھا ہو۔ اس کی بڑی بڑی آنکھوں میں روشنی بہت گہرائی میں تیرتی محسوس ہوئی۔ اس کی آنکھوں پر، گھنی بھوؤں سے احساس ہوتا تھا کہ اس کا چہرہ اک مرد کا چہرہ ہے ورنہ اس کے چہرے کے ہر عضو میں اتنی نزاکت اور نفاست تھی کہ حسین عورت کا چہرہ لگتا تھا۔ مگر اس کے شانے مضبوطی کا تاثر دیتے تھے اور اس کا فراخ سینہ جرأت اور بیباکی کا۔ اس کے سرخ و سپید چہرے پر پیار کی جھلک تھی، جیسے اس کو کوئی گھن لگا ہو، جس کے اثرات ظاہر ہونے میں ابھی دیر ہو۔ ان کا دل کرون سے بھر گیا اور ان کا جی چاہا کہ اس کو سینے سے لگا کر کہیں ''تم نے کیا غم کھائے ہیں! مجھے بتا! میں تیرے غم کا مداوا کروں''۔

وہ بھی ان سے اس تپاک سے ملا جیسے بڑی مدت کے بعد اپنے باپ سے مل رہا ہو۔ انہوں نے ان دونوں کو آرام کرنے کو کہا اور صبح ان سے باقی اہل خانہ کو ملوانے کا وعدہ کیا۔ کھانا انہوں نے ان کو ان کے کمرے میں بھجوا دیا۔

اگلی صبح ناشتے سے پہلے سب گھر والے ڈرائنگ روم میں مہمانوں کا انتظار کرنے لگے۔ کمرے میں پہلے روی شنکر داخل ہوا۔ سب کو آداب کہا اور بیٹھ گیا۔ جب اس سے پوچھا گیا کہ اس کا ساتھی کہاں ہے تو اس نے جواب دیا کہ کرشن کمار پھولوں سے، درختوں سے، ہوا سے، در و دیوار سے مل رہا ہوگا، ان کو اپنی توجہ کا یقین دلا رہا ہوگا، وہ ایک ہی ساتھ اٹھے تھے، تیار بھی ایک ساتھ ہو گئے تھے۔

''یہ دوست مرا جب بھی نئے ماحول میں داخل ہوتا ہے تو پہلے فطرت کے مظاہر سے اپنی جان پہچان کراتا ہے، پھر در و دیوار سے، انسانوں سے وہ سب سے آخر میں ملتا ہے۔ وہ

کسی شے کو انسان کی حیثیت سے شاید ہی کبھی دیکھتا ہو، وہ مصور ہی کی نظر سے دیکھتا ہے ہر شے کو، ہر جاندار کو، حتیٰ کہ انسان کو بھی۔ لیکن اس کا مطلب یہ نہیں کہ وہ انسان کو صرف کسی تصویر کا موضوع ہی سمجھتا ہے۔ وہ انسانوں سے جب بھی ملتا ہے کھل کر ملتا ہے۔ جس کسی سے کھل جاتا ہے تو پہلے ہی چند منٹوں میں، اور نہ کھلے تو برسوں میں نہ کھلے۔''

''مگر تمہارے دوست کے چہرے پر دکھ کے واضح نشان ہیں۔ کیا دکھ ہے اسے؟'' ٹھاکر جی نے پوچھ لیا۔

''اس کو بچپن سے سب کچھ میسر ہے۔ دھول پور کے مشہور تعلقہ دار خاندان سے ہے۔ سینکڑوں گاؤں ان کے اپنے ہیں، اس کو شاید ہی کسی دکھ سے واسطہ پڑا ہو۔ شاید یہی کارن ہے کہ اس کی نظریں دکھ کی کھوج میں لگی رہتی ہیں۔ اس کی تصویروں میں درخت اور گھاس بھی اداس نظر آتے ہیں۔''

''انگریزی ادب کی Melancholy۔ رومانی اداسی!'' ٹھاکر نے کہا

''قطعاً نہیں۔ اس کی لکیروں میں، اس کے حجموں میں، اس کے رنگوں میں رومانیت نام کو نہیں۔ وہ مصور کی حیثیت سے کلاسیکی مزاج کا آدمی ہے، اس کے انداز میں بہت کڑی حقیقت نگاری ہے جو شدتِ احساس اور شدتِ اظہار کے تناؤ سے وجود میں آئی ہے۔ اس کے سبب اس کی تصویروں میں ایک اٹل پن اور سنتنان کا تاثر بہت گہرا ہے، چاہے اس کی تصویر درختوں میں ہوا کے گزرنے ہی کو کیوں نہ دکھاتی ہو۔ اس کے یہاں بیتتا لمحہ بھی سنتنان کا اٹل مظہر ہے۔''

اس نے باتیں کرتے محسوس کیا کہ جیسے کرشن کمرے میں داخل ہوا چاہتا ہے اور رک گیا ہے۔ اجازت چاہتا ہے۔ اس نے نظر اٹھا کر دیکھا تو کرشن کو دروازے میں کھڑا پایا۔ وہ اٹھا اور اس کے قریب جا کھڑا ہوا۔ اس نے محسوس کیا کہ جیسے کرشن سارے منظر کو جذب کر رہا ہو۔

''آؤ، تمہیں سب سے ملاؤں۔''

''تو سب میرا ہی انتظار کر رہے تھے۔''

''ہاں! میں نے تمہاری طرف سے معذرت کر دی ہے۔''

جب روی نے ارملا سے اس کا تعارف کرایا تو وہ چونکا اور اس کے کانوں کی لویں سرخ ہو گئیں۔ اس نے ہاتھ جوڑ کر پرنام کیا۔ پھر اس کا تعارف ٹھاکرانی سے اور سب سے بعد میں سوشیلا سے یہ کہہ کر تعارف کرایا۔

''ہماری ددی کو یونیورسٹی میں سوشیلا ''پنڈت'' کہتے تھے۔ شاید ہی کوئی ودیا ہو جس سے ان کا سہلا پا نہ ہو۔ صرف مصوری ان سے واقف نہ ہو پائی۔ نہ جانے کیوں؟ شاید اس لیے کہ تم کو مصوری کرنی تھی۔''

کرشن کو دیکھ کر سوشیلا کا دل لپکا، پھر ٹھٹکا اور پھر اس زور سے دھڑکا کہ اس کو احساس ہوا کہ جیسے اس کے سینے سے نکل باہر گر پڑا ہو۔ اس کے چہرے کی نسوانی حلیمی اور اس کے جسم کے مردانہ پن میں عجب امتزاج تھا جیسے جمال و جلال بغلگیر ہو رہے ہوں اور ایک دوسرے میں سرایت کر رہے ہوں۔ اس کے شریر نے بھی اس شریر سے اک رس اخذ کیا۔ اس کے جسم میں ایک رقاص کا سا توازن اور تناؤ تھا۔ اس کی آنکھوں کی گہرائی میں تیرتی ہوئی روشنی نے اس کو تیرنے کی دعوت دی۔ اس کا شدت سے جی چاہا کہ وہ اس کے شریر کو چھوئے، اس کی انگلیوں میں ایک شکتی سی مچل مچل گئی۔ اس نے اپنے آپ کو پورے ارادے سے قابو میں کیا۔ چندر بھان کے بعد وہ پہلا آدمی تھا جس نے اس کے شریر اور دل کو اس طرح بولے بغیر متاثر کیا تھا۔

تعارف کے بعد وہ کچھ ملکی سیاست پر بات کرتے رہے اور پھر ناشتے کے لیے کھانے کے کمرے میں چلے گئے۔ کھانے کے دوران بھی کرشن کمار خاموش رہا مگر اس کے اور سوشیلا کے درمیان ایک برقی رو بہتی رہی۔ ارملا اس کو کبھی کبھی کرون ملے جذبات سے دیکھ لیتی۔ اس کی نظروں سے کرشن کو ایک تقویت ملنے کا احساس ہوتا جب کہ سوشیلا کے تنے ہوئے شریر سے اک برقی رو کے تیزی سے اس کے جسم کی طرف لپکنے اور اس کو ڈسنے کا شدید احساس ہوتا رہا۔

اس کے بعد وہ دونوں اجازت لے کر چلے گئے۔ دوپہر کے کھانے پر بھی گھر نہ آئے

شام ڈھلے لوٹے، کمرے میں ہی کھانا منگوالیا۔ کئی روز اسی طرح گزر گئے۔ صبح کو وہ بن میں، پہاڑوں میں، نکل جاتے اور شام کو لوٹ کر آتے۔ آخر کئی ہفتوں کے بعد وہ دونوں اپنے کمروں سے باہر نہیں نکلے۔ کرشن کمارا اپنے کمرے میں تصویریں بناتا رہتا یا بنی ہوئی تصویروں میں کہیں رنگ لگا دیتا، چاقو سے رنگ کی تہہ کو ہلکا کر دیتا یا چاقو سے اجسام میں سنگ تراشی کرتا جس سے شکلوں میں ایک ٹھوس پن کا تاثر بڑی شدت سے ابھر آتا۔ کبھی کبھی وہ براہ راست برش ہی سے صورت گری کرتا جس کے سبب جامد اشیا میں نزاکت اور بے ثباتی کا تاثر پیدا ہو جاتا۔ مگر اشیا کے باہمی رشتوں میں، رنگوں کے درجوں میں، ایسا تناؤ ہوتا کہ نظر آتا جیسے ہر شے رقصاں ہے اور رقصاں رہے گی۔ اس کی تصویروں میں تجرید اور تجسیم میں بہت ہی نازک سا توازن نظر آتا تھا، لگتا تھا کہ نظر بھٹکی تو توازن بگڑ جائے گا، مگر اس کی تصویریں نظر کو بھٹکنے کی اجازت ہی نہ دیتی تھیں۔ اس کی تصویروں میں سندرتا اور شکتی بانہوں میں بانہیں ڈالے ابھرتی، جذب ہوتی ہوئی محسوس ہوتی تھیں۔

وہ نیلے، سنہرے اور سرخ رنگوں کے اتنے درجے اپنی تصویروں میں استعمال کرتا کہ احساس ہوتا تھا کہ اس کی تصویروں میں رنگوں کی ریل پیل ہے، فراوانی ہے۔

ایک دن روی نے ارملا سے کہا کہ کرشن ان کی تصویر بنانا چاہتا ہے اور درخواست کرتا ہے کہ اس کو مسلسل کئی دن کچھ وقت دیں۔ وہ کچھ لمحے سوچ کر راضی ہوگئی۔ وہ اپنے وسیع و عریض باغ میں ایک کھلی جگہ دھوپ میں کھڑی ہو جاتی، چپ چاپ، اور کرشن کے ہاتھ کینوس پر چلتے رہتے۔ کئی دنوں میں کوئی چالیس گھنٹے اس کو کھڑے رکھنے کے بعد کرشن نے تصویر کو مکمل کر لیا مگر اس تصویر کو وہ کئی دن تک گھنٹوں دیکھتا رہا کہ آیا وہ اپنے تصور کے رنگوں، لکیروں، حجموں کے باہمی رشتوں میں اس عورت کو جنم دے رہا ہے کہ نہیں جس عورت کی تصویر اس کے دل و دماغ میں اک دیوی کی طرح جنم لے چکی تھی۔ اس نے محسوس کیا کہ وہ اپنی تصویر میں کچھ گھٹا بڑھا نہیں سکتا تو اس نے ارملا کو دعوت دی کہ وہ اپنی تصویر کو دیکھنے چلی آئے۔ جب وہ کمرے میں داخل ہوئی تو مشرق سے کرنیں شیشے کی دیوار سے کمرے میں داخل ہو رہی تھیں، دیوار کے جس حصے میں شیشہ نہ تھا اس کے آگے سایہ تھا، روشن روشن۔

اس حصے میں اک اکیلی تصویر رکھی تھی۔ کمرے میں داخل ہوتے ہی اس کی آنکھیں چندھیا گئیں مگر کچھ دیر بعد کمرے کے خدوخال سے اس کی نظر آشنا ہونے لگی اور پھر یکا یک تصویر سے لڑی، ٹھٹکی اور تصویر کی سطح پر پھسلنے لگی۔ برف کے میدان میں ایک پہاڑ تھا جس کی چوٹی پر بلند درختوں کے جھرمٹ کے درمیان، ہرے بھرے فرش پر، سورج کی سرخ کرنیں مرکوز ہو رہی تھیں، سورج تصویر کی حدود کے باہر کہیں تھا، کرنیں ایک سرخ جسم میں ڈھل رہی تھیں۔ جسم ارملا کا تھا، چہرہ ارملا کا تھا، آنکھیں ماتھا، ٹھوڑی، رخسار، اس کے تھے، مگر ان سب میں جو رشتے تھے ان کو وہ پہچان نہ پا رہی تھی۔ وہ ارملا بھی تھی اور ارملا سے ماورا بھی۔ اس نے محسوس کیا کہ تصویری ارملا دیوی ہے جو انسانوں کے جہان پر مسکرا رہی ہو۔ اس نے محسوس کیا کہ اوشا ارملا کے روپ میں جلوہ گر تھی۔ وہ خود اپنی تصویر کے سامنے دل ہی دل میں جھک گئی۔ اس تصویری ارملا کی آنکھوں میں بے پناہ کرون تھا جو تصویر کے سارے منظر میں رچ رہا تھا۔ اس نے محسوس کیا کہ جینا بہت بڑی نعمت ہے۔ سفید، نیلے، سرخ اور سنہرے رنگوں کے کئی درجے ایک دوسرے میں گھل مل رہے تھے، ایک دوسرے میں سرایت کر رہے تھے۔ اس کو لگا کہ اوشا کی مسکراہٹ کے کرون کی حدت سے برف پگھل جائے گی اور پہاڑوں سے اتر کر انسانوں کے جہاں کو سیراب کرے گی۔ یکا یک اس پر کھلا کہ مصور نے اس کے اندر اتر کر اس کو بہت غور سے دیکھا بھالا تھا۔ حیا کی ایک شدید رو اس کے جسم کے وسط سے پھوٹی اور اس کے پاؤں اور دماغ کی اُور لپکی۔ اس نے اپنی انتر کی آنکھ سے دیکھا کہ ہیم کشیتر میں آگ لگی ہے اور ہیم میں لہو دوڑنے لگا ہے۔ اور ہیم شعلہ بنا چاہتی ہے۔ شعلہ اس کی طرف لپکا اور اس کی نظر سے نین میں اور نینوں سے ہردے انتر میں پھیل گیا ہے۔ شدید حدت کے احساس سے وہ چونکی۔ کمرے میں کوئی نہ تھا۔ صرف اوشا اور وہ روبرو تھے۔

کمرے سے باہر نکلی تو کرشن سوریہ کی اور مکھ کئے، نین بند کئے کھڑا تھا مگر اس نے محسوس کیا کہ اس کے سر میں اک آنکھ اور بھی ہے جو کھلی ہے اور وہ آنکھ اس کو دیکھتی ہے۔ وہ ڈر گئی اور تیز تیز قدم اٹھاتے ہوئے اپنے کمرے میں چلی گئی۔ اپنے کمرے میں داخل ہوتے

ہی اس نے بہت سردی محسوس کی اور کپڑے بدلے بغیر ہی لحاف میں گھس گئی اور دیر تک کپکپاتی رہی۔ اس کپکپاہٹ پر قابو پانے کی کوشش میں اس پر غنودگی طاری ہوگئی۔ اس کی آنکھ کھلی تو سوشیلا اس کے سرہانے ایک کرسی پر بیٹھے اس کو ہمدردی سے دیکھ رہی تھی۔ اس کے جاگتے ہی وہ بولی:

''میں بہت دیر سے آپ کو کانپتے، لرزتے دیکھ رہی ہوں۔ خیریت تو ہے۔ اپنی تصویر دیکھنے گئی تھیں۔ یہ عارضہ کیا لگا لائیں؟''

''یہ مصور دلوں میں جھانکنا بھی جانتا ہے۔ میں نے اپنی تصویر سے یہی اخذ کیا ہے حالانکہ میں نے اس سے ابھی تک بات بھی نہیں کی۔''

''یہ روی بھی عجیب عجیب لوگوں سے ملتا رہتا ہے۔ اس کے سبھی دوست عجب شے ہیں۔ ایک سے ایک انوکھا۔ چندر بھان بھی پہلے اس کے دوست تھے اور اس کے گھر اس کے دوست کی حیثیت سے آیا جایا کرتے تھے۔''

کچھ دنوں کے بعد کرشن کمار نے ٹھاکر اور ٹھاکرانی کی، ان کے گھر کی، گھر کے آنگنوں کی کئی تصاویر بنا ڈالیں۔ ہر تصویر منفرد تھی۔ جانے پہچانے کو انجانا بنا دینا اس کے لیے شاید بہت آسان تھا۔ ٹھاکر اور ٹھاکرانی اپنی تصویروں سے بہت خوش تھے۔ انہوں نے کرشن سے فرمائش کی کہ وہ سوشیلا کی تصویر بھی بنائے۔ مگر جب سوشیلا سے کہا گیا کہ وہ تصویر بنانے کے لیے وقت دے تو اس نے شرط لگا دی کہ اگر صرف چار گھنٹوں کی بیٹھک میں تصویر بنا لے تو وہ وقت دینے کے لیے تیار تھی۔ آخر اک دن جب درختوں کے سائے درختوں میں چھپے تھے کرشن نے ان کے گھر کے باغ میں سوشیلا سے وقت لیا۔ وہ چار گھنٹوں میں سوشیلا کے اتنی تیزی اور پھرتی سے خاکے بناتا چلا گیا کہ اس کو گمان ہونے لگا کہ وہ شاید اس کی تصویر بنانے کا ارادہ ہی نہیں رکھتا۔ جب وہ اس کے بیسیوں ہی خاکے بنا چکا تو اس نے یہ کہتے ہوئے رخصت چاہی کہ اب وہ اس سے اس دن ملے گا جب وہ اس کی تصویر بنالے گا۔ کئی دن کے بعد وہ ناشتے پر آیا تو اس نے بتایا کہ تصویر تیار ہے اور وہ دیکھ سکتی ہے۔ تصویر شیشے کی دیوار کے بالمقابل رکھی تھی۔ تصویر کئی مختلف مناظر پر مشتمل تھی جس

میں ایک ہی صورت کی کئی عورتیں اور مرد، مختلف لباسوں میں، مختلف کاموں میں مشغول، دکھائے گئے تھے۔ ان مردوں اور عورتوں کے لباسوں اور کاموں سے ظاہر ہوتا تھا کہ یہ مرد اور عورتیں مختلف ہیولوں میں تھے۔ مختلف روپوں میں ایک ہی صورت سے تصویر میں ایک پرخوف حسن کا سماں بندھ گیا تھا۔ اُس کو تصویر میں اپنا ماضی حال اور مستقبل پابند نظر آیا، وہ کانپ گئی اور اس کے اندر غضب کا جذبہ اس شدت سے ابھرا، اس نے محسوس کیا کہ اس نے جلد ہی اپنے آپ پر قابو نہ پالیا تو وہ تشدد پر اتر آئے گی اور پھر نہ جانے وہ کیا کر بیٹھے۔ اس نے محسوس کیا کہ جیسے کسی نے اس کو بے لباس، اس کی اجازت کے بغیر ہی، دیکھ لیا ہو۔ اس کا جی چاہا کہ وہ کرشن کو ڈانٹے، وہ اپنے آپ کیا سمجھتا ہے کہ وہ لوگوں کے انتر، ان کی اجازت کے بغیر جھانکتا پھرتا ہے، اور اگر وہ بولنے کی جرأت کرے تو اس کا منہ نوچ لے۔ جذبات کی اس شدت اور اس جذبے کے تشدد پر وہ شرما سی گئی اور اپنے دل میں سخت نادم ہوئی، جھنجھلائی اور فرش پر اس زور سے قدم مارا کہ اس نے دیکھا کہ تصویر لرز رہی ہے اور یک صورت مرد اور عورتیں اس کی طرف حیرت سے دیکھ رہے ہیں اور پھر یکا یک مسکرانے لگے ہیں۔ مسکراہٹ ہنسی بنی اور ہنسی قہقہہ اور قہقہہ قہقہے۔ ہنسی اور قہقہوں نے تصویر کے تمام رشتوں کو نئے رشتوں میں ڈھالنا شروع کر دیا اور اس کی نظروں کے سامنے صدیوں کی بیتی زندگی گزرنے لگی اور اس کو کسی انجانے عمل پر اکسانے لگی۔ اس نے محسوس کیا کہ اپنے ماضی کے علم کے باوصف، بلکہ اس کے باوجود، وہ ایک بالکل نئے عمل کے سلسلے کو جنم دینے پر قادر ہو سکتی ہے جو اس کے ماضی سے آزاد ہوتے ہوئے بھی اس کے تمام رَس کو لئے ہوئے ہوگا۔ ماضی کی خوشبو سے وہ مستقبل کی روشنی تخلیق کر سکے گی، جس میں ہر شے کی نوعیت بدل جائے گی اور وہ سب اشیا ایک نئے رقص میں مربوط ہو جائیں گی، اس رقص سے ہماری زمین میں ایک نیا آہنگ پیدا ہوگا جو اس زمین کو نئی، انوکھی، انوٹھی، حلیم، کرونی رفتار دے گا جو اس جہان کے باسیوں کو نئی طرح سے جینے کے ڈھنگ سکھائے گا اور جینے کے ڈھنگ خود اس دھرتی میں نئی فصلیں، نئے پھول، پھل، نئے درخت، نئے رنگ پیدا کریں گے، جو ہواؤں کو نئے نئے انداز، نئی نئی رفتاروں سے چلنا، دوڑنا بہنا سکھائیں گے اور یہ ہوا، یہ رنگ، یہ رفتاریں گگن سے نئی قسم کی بارش اتار لائیں گے، اور یہ بارش دھرتی میں نئی نوعیت کی خوشبوؤں کو جنم دیگی،

جس کے کارن انسان اور حیوانوں میں ایک نیا سمبندھ، ایک نئی بلندی ابھرے گی اور انسان اور حیوان دونوں ایک دوسرے کے رفیق بن جائیں گے، دونوں میں تصادم کی تمام صورتیں ختم ہوجائیں گی، یہ حیوان اور انسان مہاساگر کی نیلی تہوں تک اتر جانے کے قابل ہوجائیں گے، ستاروں کی قطار سے آگے چلے جانے پر قادر ہوسکیں گے، مہاساگر اور مہا آکاش میں کئی راہیں کھل جائیں گی، انسان اور حیوان پر پراگیا کے تمام اسرار کھل جائیں گے، انسان کی کوکھ سے ایک نئی مخلوق جنم پائے گی جو اک نئے مہامنوَنتر کا آغاز کرے گی، یہ مہامنوَنتر تمام منوَنتروں سے طویل ہوگا۔ جس کے دوران میں انسان اور حیوان حکمت اور شعور اور خودشعوری کے لیے نئے جہان تخلیق کریں گے، انسان تخیل کے زور سے اولاد کو جنم دے سکیں گے اور عورت زہ کے درد سے آزاد ہوجائے گی، ہمیشہ ہمیشہ کے لیے انسان کا ہر عمل پوتر اور اگنی مان ہوگا۔

یکایک اس کے تخیل کے جہان میں بہت زور سے بجلی چمکی، بادل کڑکا، گرجا۔ وہ چونکی۔ کمرے میں اندھیرا تھا۔ شیشے سے باہر باغ میں دور دور تک گھور اندھیرے کا ساگر ابل رہا تھا۔ اور کبھی کبھی اتنے زور سے بجلی چمکتی کہ سارا کمرا روشن ہوجاتا اور اس کے کوندے میں کرشن کی تصویروں میں بے پناہ زندگی روشن ہوجاتی۔ پھر یہ روشنی لحظہ بہ لحظہ چمکنے لگی اور سیاہ بادل کڑکنے، دھاڑنے لگے اور پھر چھت پر ہزاروں ننھے ننھے پاؤں تاندیو رقص کرنے لگے۔ اس نے بار بار کی چمک میں، ہشیار ہوکر دیا سلائی کی تلاش شروع کردی تاکہ چراغ جلا سکے۔ ایک بار آکاش سے روشنی کا ایک سمندر ساز مین کی اُور لپکا، کمرے میں پڑی ہوئی بجھی ہوئی دیا سلائیاں صاف صاف دکھائی پڑیں، ایک میز پر دیا سلائی جلا کر لیمپ روشن کیا، اس کے اوپر ایک کھلے منہ کا بڑا سا فانوس رکھ دیا۔ کمرے میں کافی روشنی ہوگئی۔ اس نے چاہا کہ کمرے میں اور روشنی ہوجائے۔ اس نے کمرے کی چھت سے لٹکتے ہوئے جھاڑ کے نیچے ایک چھوٹی سی میز رکھی اور اس کے اوپر ایک کرسی اور خود اس کے اوپر چڑھ گئی اور تمام موم بتیاں روشن کردیں، جو تعداد میں چالیس تھیں۔ کمرا جگمگا اٹھا۔ اک گھور ساگر میں روشنی کا اک دِویپ عجب بہار دینے لگا۔

بادل گرجتے رہے، کڑکتے رہے، بارش برستی رہی اور ہوا کا شور بڑھتا رہا مگر اس کمرے کے تمام دروازے بند تھے۔ دیواروں پر لگی تصویریں منور تھیں۔ ایسی چتر شالا دنیا کے کسی کونے میں شاید ہی تھی۔ ہر تصویر دکھ اور سکھ، درد اور آنند، روشنی اور سائے، تاریکی اور چمک کا عجب سنگم تھی۔ اس میں حسین قدرتی مناظر تھے، ہوا میں لہراتے رنگ، سورج کی روشنی میں دمکتے سائے، بہتے دریا، سبزے میں آزاد گھومتے پنچھی پکھیرو، حسین مرد اور عورتیں نئے نئے رنگوں، قوسوں، لکیروں، جھموں اور رشتوں میں پابند، بیمار اور درد میں مجبور انسان، غربت کے ماحول میں، اندھیرے گگن تلے فریاد کناں، اداس مناظر میں روشن رنگین پرندے گگن کی اُور فرحاں فرحاں، شاداں شاداں، محوِ پرواز، ٹیڑھے میڑھے بازاروں میں اجڑے اجڑے، پستہ قد گھر، جن کی دیواریں شکستہ اور دروازے اور کھڑکیاں غربت کے ہاتھوں نوحہ کناں، اور ان شکستہ گھروں کے سایوں میں نحیف کتے اور بلیاں کسی انجانے خوف سے خائف، پریشاں، ہراساں، ہری ہری بلند فصل، کھیتوں پر اڑتے ہوئے خوش و خرم پرندے، ان کے اوپر روشنی اور اس کے اوپر نیلا سنہرا گگن، ویران، اجاڑ کھیت، کھیتوں میں حیران اداس جانور، فضا میں مغرور پرندے، گگن سے برستی ہوئی، چندھیاتی ہوئی اگنی کے رنگ، پہاڑوں سے ٹکراتے پانیوں سے اڑتا جھالا اور جھالے کے اوپر اڑتے پرندے اور پرندوں کے پس منظر میں پہاڑوں پر بلند ہوتے ہوئے بلند قامت ہوا کے زور سے جھولتے جھومتے درخت، کسی سبز بن میں ہوا کے طوفان میں جھکے درخت، پھول، درختوں میں دبکے پرندے اور اک حیران اور خوف میں گرفتار ناری جس کے بدن پر خراشوں کے نشان اور جسم پر جگہ جگہ سے پھٹا ہوا لباس اور لباس سے جھانکتا، لجاتا، سرخ وسپید، تنا ہوا بدن، اور ایک گندے، گدلے سے جوہڑ میں ننگے، مریل سے، پیلے پیلے، بچے، کمزور گائیں اور بکریاں اور ہرن، دور دور مٹی کے، گھانس پھونس کی چھتوں والے گھر، ان پر گندی میلی سی مرغیاں، کوے، کبوتر۔ ان گھروں کے باہر پھٹے حال، سوت کاتتی ہوئی، مدقوق سی، عمر سے پہلے بوڑھی ہوتی ہوئی جوان عورتیں جن کی گودوں میں مریل، بیمار، بلکتے ہوئے بچے۔

سوشیلا کا دل یکے بعد دیگرے کبھی جمال، کبھی بھیانک، کرون اور کبھی بیزاری اور

بغاوت کے شدید جذبات سے بھر بھر گیا اور تیزی سے بدلتے جذبات کی شدت سے اس کے تن بدن میں ایک نقاہت سی سرایت کرنے لگی اور اس نے اپنے اندر اتنا گھمبیر حبس محسوس کیا کہ اس نے اپنے پورے زور سے لمبے لمبے سانس لیے مگر اس کے اندر سے شدید حبس کی کیفیت نہ گئی اور وہ بے بس ہو کر بے اختیار رونے لگی اور روتی چلی گئی۔ کمرے کے باہر برکھا برسا کی اور کمرے کے اندر اس کے نین۔ وہ اپنی پوری زندگی اس طرح کھل کر اور اس طرح بے اختیار کبھی نہ روئی تھی۔ اس نے محسوس کیا کہ اس کی گہرائیوں اور اس کی بلندیوں میں، ہر جا، سیلاب گریہ پہنچ گیا اور ہر کونے کھدرے کو سیراب کر گیا ہے۔ وہ شاید گھنٹوں روتی رہی تھی کہ جب بارش تھمی اور پہاڑوں کے شانوں سے گھور گھٹائیں اٹھ گئیں اور کرنیں ایک بار پھر ہرے فرش پر اترنے لگیں تو مغرب کی کھڑکیوں سے پیلی پیلی کرنیں شرماتی ہوئی، لجاتی ہوئی، ہچکچاتی ہوئی، دبے دبے پاؤں، داخل ہو رہی تھیں۔ یہ پیلی پیلی روشنی بہت ٹھنڈی تھی۔ کمرے میں شدید سردی پھیلنے لگی اور وہ سردی سے کانپنے لگی اور اس کے دانت بجنے لگے۔ اس نے محسوس کیا کہ کسی وسیع و عریض سمندر کے ایک ننھے منے جزیرے میں وہ تنہا ہے اور ایک شکستہ سی کشتی ہے اور سمندر منہ زور ہے اور اس کے بدن پر ہلکا سا لباس ہے اور شدید سرد ہوا اس کے گرد رقص کر رہی ہے۔

اس کے دل میں ایک پرارتھنا نے جنم لیا کہ کوئی آ جائے اور اس کے لیے گرم کوٹ یا چادر اور دستانے لے آئے یا کمرے میں بہت تیز الاؤ روشن ہو جائے۔ ابھی اس کے ہونٹوں نے اس پرارتھنا کے الفاظ ادا نہ کیے تھے کہ ارملا باہر سے چٹخنی کھول کمرے میں داخل ہوئی وہ سر سے پاؤں تک گرم کپڑوں میں ملبوس تھی۔ اس کے شانوں پر، اس کی بانہوں پر گرم کوٹ، گرم چادر، دستانے، کمر بند اور موزے تھے۔ اس نے یہ سب چیزیں ایک کرسی پر رکھ دیں اور ایک دوسری کرسی پر یوں بیٹھ گئی جیسے کسی کی منتظر ہو۔ اتنے میں دو نوکر ایک ٹوکرے میں جلانے کی لکڑیاں لے آئے۔ ارملا نے اٹھ کر دروازہ کھولنے سے پہلے سوشیلا سے کہا کہ وہ فوراً گرم کپڑے پہن لے۔ جب وہ کپڑے پہن چکی تو ارملا نے دہرے دروازے کے اندرونی پٹ کھول دیئے اور پھر بیرونی پٹ۔ نوکر اندر داخل ہوئے۔ انگیٹھی

میں لکڑیاں ترتیب سے رکھیں اوران کو آگ دکھائی۔لکڑیاں پہلے آہستہ آہستہ بعد میں دھڑ دھڑ جلنے لگیں اور لکڑیوں سے شعلوں لپکنے لگے اور باتیں کرنے لگے۔الاؤ کی گرمی آہستہ آہستہ فضا میں رچنے لگی۔

کمرے میں اتی روشنیاں تم نے جلائی تھیں؟......اس طوفان میں تمہیں ڈر نہ لگا؟ میں تو بستر میں دبک گئی تھی...... یہ روی اور کرشن کہاں ہیں۔ ہمارے یہاں نہیں ہیں......اوہ! اتنی ڈھیر سی تصویریں۔ پوری چتر شالا ہے یہ کمرہ۔اب میں سمجھی تمہیں ڈر کیوں نہ لگا۔اتنے ساتھی تھے تمہارے۔تمہیں ڈر کاہے کو لگتا......تم اتنی چپ کیوں ہو؟''

ارملا اپنی کرسی سے اٹھی اور سوشیلا کا منہ اوپر کی طرف اٹھایا اور حیرانی کے لہجے میں پوچھا:

''تم روئی تھیں؟ ڈر کے مارے؟......تمہارے سارے کپڑوں میں آنسوؤں کی خوشبو بسی ہے......تم اتنی روئی تھیں، اتنے آنسو بہائے تھے تم نے......اتنے آنسو تو پرش اپنے پورے ایک جنم میں بھی نہیں بہاتا اور تم نے بہا دیئے چند گھنٹوں میں...... مجھے بتاؤ! کیا کارن ہے ان آنسوؤں کا! کیا گھور دکھ اٹھا تیرے ہردے سے! مجھے بتلا! میں تیری نند ہی نہیں، بہن بھی ہوں، سہیلی بھی، سنگی بھی، ساتھی بھی، ہم دونوں کے پرکھ بھی ایک ہی ہیں۔ بتلا سکھی! نہ چھپا! یہ آنسو گھائل کرتے ہیں!''

''میں کیا بتلاؤں! میں خود بھی تو نہیں جانتی ایسا کیوں ہوا۔بس پران گھٹے تھے اتنے کہ میں کسی کو پکار بھی نہ سکی اور شریر کی گپھاؤں سے نیر اس زور سے اچھلا اور ابلا کہ گنگا جمنا بہہ نکلی۔ پرنتو اس رونے نے میرے شریر کی دھرتی کو ایسا سپھل کیا ہے کہ میں اپنے آپ کو اتنی بھرپور پاتی ہوں، اتنی شکتی وان لگتی ہوں اپنے آپ میں کہ جانتی ہوں کہ اگر چمکتے گگن کی اُور انگلی کروں گی تو تارے اپنی جگہ سے ہل جائیں، نئی راہوں پر نکل پڑیں۔اَوش سوچتی ہوں کہ اتنی شکتی سے کیا کروں! تم ہی بتاؤ! اے سکھی! اے بہنا! کیا کروں!''

''اسے چھپائے رکھو جب تک کہ چندر بھان نہیں آجاتا ان آنگنوں میں، یا تم کسی

دوسرے کو اپنا جیون ساتھی نہیں چن لیتیں!''

''کیسی باتیں کرتی ہو۔ دل چیر دیا تم نے، اے سکھی! اے بہنا!''

''کوئی اچرج بات نہیں کی ہے میں نے۔ اگر چن لینے کا حق تمہیں نہیں دینا تھا تو شِو دیوتم سے دور، اتنے برسوں کے لیے، چندر بھان کو کیوں لے جاتے اور اس کو تمہاری یاد نے کیوں نہ ستایا کہ وہ لوٹ آتا اور تمہیں بیاہ کر گھر لے آتا اور میں تم دونوں کی آرتی اتارتی اور تم پر سے مہریں لٹاتی...... میں کہتی ہوں کہ اگر تم چاہو تو جس کو چاہو اپنے شریر کا ساتھی چُن، مَن میں بٹھا لو، ہردے میں چھپا لو، میری تم کو آ گیا ہے۔ میں ماتا پتا اور چندر بھان کو سمجھا لوں گی، تمہارے ماتا پتا اور بھائیوں کو منا لوں گی۔''

''میں سمجھ گئی تمہارا اشارہ کس کی اُور ہے۔ میں مانتی ہوں کہ کرشن کمار نے میرے شریر میں، میرے من، میرے ہردے میں گھنگور کامناؤں کو جگایا ہے مگر میں یہ بھی جانتی ہوں کہ یہ اس لیے ہے کہ میں چندر بھان کے درشن کی پیاسی ہوں اس رَس کی درشنا میرے شریر کو کھائے ہے!

سوشیلا کرشن کی نہ تو سُبھدرا بن سکتی ہے اور نہ رادھا۔ وہ اگر بن سکتی ہے تو سوشیلا۔ سوشیلا ہوں، جنم جنم سے سوشیلا ہوں، مرا رشتہ کرشن سے سنتان ہے، امر ہے...... میں چندر بھان کی منگیتر ہوں اور یگ یگ اس کا سواگت کرنے کو اپنے بستر پر اس کا انتظار کرتی رہوں گی، کرتی ہوں۔ وہ آئے گا اور ضرور آئے گا۔ کرشن کی طرح اس نے نہ جانے کس کس کبھجا کو سندرتا دینی ہے، کس کس گوپ سے کیا کیا سِکشا لینی ہے، اپنے من کی کس اپاسنا کو، کامنا کو، بندی خانوں سے چھڑانا ہے...... میں جیون کی مہا اپاسنا سے منہ موڑ کر کہیں اور نہیں جا سکتی، نہیں جا سکوں گی...... چندر بھان شاید ابھی میرے لیے تیار نہیں ہے۔ ہر فصل کے لیے یا ہر پھل کے لیے ایک خاص موسم، ایک خاص ہوا، اور ایک خاص بارش ہوتی ہے جو اس کے لیے رس زمین سے نکال کر لاتی ہے اور وہی ان فصلوں، پھلوں، درختوں کے جیون کا کارن اور ان کا رکھشک ہوتا ہے۔ چندر بھان میرے لیے وہی رس ہے مگر ابھی میرے اور اس کے شریر کے ملاپ کا سمے نہیں آیا۔ جب آ جائے گا تو ہم دونوں ایک دوسرے کی اُور

لپکیں گے اور یہ ملاپ بھرت ملاپ سے بھی سندر اور شکتی وان ہوگا...... مجھے جلدی نہیں ہے۔ میں دھرتی کی طرح برکھا کا انتظار کر سکتی ہوں۔ برکھا ضرور برسے گی، دھرتی ضرور سپھل ہوگی، دھرتی سے سبزہ، پھول، درخت اور پھل ضرور اُگیں گے، میرا جیون بگیہ بنے گا۔''

ارملا بت بنی، سوشیلا کی باتیں سنا کی۔ اس کے من کی کیاری پر برکھا برسا کی۔ اس کے من نے اس یقین پر لبیک کی اور پھر کرسی کی دونوں ہتھیوں کو مضبوطی سے پکڑ کر اٹھ کھڑی ہوئی۔

''میں چلوں گی، تھک گئی ہوں! کئی دنوں سے میرا جی اچاٹ تھا مگر اب تم نے میری سب گتھیوں کو سلجھا دیا ہے۔ جب کل اٹھوں گی تو اک نیا وشوا، ایک نیا سنسار میرے سنگ جاگے گا اور پھر ہم دونوں ایک لمبے سفر پر نکلیں گے۔''

ارملا دھیرے دھیرے کمرے سے نکل گئی۔ سوشیلا پھر کمرے میں چتروں اور اگنی کے سنگ تنہا تھی۔ وہ اٹھی اور اس نے ایک بار پھر ایک ایک چتر کو اپنے ہردے کی پوری شکتی کے ساتھ دیکھا۔ اس نے محسوس کیا اس چتر کار نے مشرق اور مغرب کے تمام چتر کاروں کے چتر دیکھے ہیں اور ان سے جو سیکھ سکتا تھا سیکھ لیا ہے اور اب صرف اس کو اپنے اسٹائل کو تکمیل تک پہنچانا ہے۔ اس کی تصویروں میں روشنی باہر سے نہیں خود چیزوں سے پھوٹتی ہے۔ خود ان کا سبھاؤ ہے۔ خود ان کا ہردے ہے۔ یہ روشنی سورج سے جذب نہ کی گئی تھی بلکہ ابتدائے آفرینش سے شِو نے اشیا میں بند کر دی تھی۔ صرف چتر کار، کلاکار اور گن ونت ہی اس روشنی کو چیزوں سے نکلوا سکتے ہیں۔ روشنی ہی تمام روپوں، بھاوؤں کا بیج تھی۔ روشنی کے بغیر کچھ بھی روپ نہیں لے سکتا۔

اس نے سوچا کہ جو کچھ اس نے چتروں میں دیکھا تھا وہ واقعی چتروں میں تھا یا خود اس کے من میں یا اس کے چیتنیہ سے اُبھرا تھا۔ اس نے فیصلہ کیا کہ وہ دونوں کے ملاپ سے وجود میں آیا تھا یا دونوں کا اوتار تھا۔ اس فیصلے کے بعد اس نے محسوس کیا کہ اس چتر شالا اور اس اگنی شالا میں اس کے لیے اب کوئی جا نہیں ہے۔ لہٰذا چتروں اور اگنی کو الوداع کہا اور کمرے سے باہر نکل گئی۔

جھاڑ کے شیشوں سے منعکس ہوتی ہوئی جلتی موم بتیوں کی روشنی، اگنی کے سایے اور چتروں کی روشنی ایک دوسرے میں جذب ہوتے رہے۔ ان کے ملاپ سے خاموشی اور لکڑیوں کے جلنے کے ہلکے ہلکے شور نے اک سنگیت کو جنم دیا جس کا رس ان تمام راگوں سے الگ تھا جن کا بیان راگ ویدوں میں درج ہے مگر اس کا رس چکھنے کو کوئی نہ آیا اور خود شِو نے اس سمے رس کو اپنے انتر میں محفوظ کرلیا۔ اب جو شِو کے ہردے میں ڈوب سکے گا وہی اس رس کو پائے گا، چکھے، گا اور وہی رس کے سواد سے شِو آنند میں امر ہو سکے گا۔

چوتھا باب

جب روی اور کرشن کمرے میں داخل ہوئے تو کمرے میں اتنی روشنی دیکھ کر حیران ہوئے۔ آتش دان میں ابھی تک آگ دہک رہی تھی اگر چہ شعلے نہ تھے۔ کمرا کافی گرم تھا۔ کرشن نے چند لکڑیاں دہکتے کوئلوں پر رکھ دیں اور ایک الماری سے اس نے چاکلیٹ پاؤڈر کا ڈبہ نکالا، کیتلی نکالی، غسل خانے سے کیتلی میں پانی ڈالا اور اس کو آگ پر رکھ دیا اور پاؤڈر کو ایک صاف چائے دانی میں ڈالا اور دو پیالیاں نکال کر میز پر رکھیں۔ پانی کھول گیا تو چائے دانی میں ڈالا۔ کچھ دیر بعد چائے دانی سے چاکلیٹ کا سیال پیالیوں میں ڈالا اور آہستہ آہستہ چسکیاں لینے لگے۔ جب گرم گرم سیال ان کی رگوں میں حل ہونے لگا تو ان کے ٹھٹھرے ہوئے جسموں میں جان سی آنے لگی۔

''جس وقت ہم کھوہ میں بیٹھے بجلیوں کو چمکتے دیکھ رہے اور بادلوں کو گرجتے، دھاڑتے سن رہے ہوں گے اس وقت ددی یہاں تھیں۔ ان کی پسندیدہ خوشبو کو میں گرم ہوا میں تیرتے محسوس کرسکتا ہوں اگر چہ وہ بہت ہی لطیف خوشبو ہے۔ صرف اسی کو محسوس ہوسکتی ہے جو ان کے ساتھ ایک ہی گھر میں برسوں رہا ہو۔ ہم اپنی محفوظ کھوہ میں ڈر رہے تھے۔ نہ جانے ان پر یہاں کیا بیت رہی ہوگی۔ بادل اور بارش کتنی یکا یک آ گئے تھے کچھ سوچنے کی فرصت ہی نہ ملی۔ اگر ہم نے ان پہاڑوں کو کئی دن پہلے نہ دیکھ لیا ہوتا تو چھپنے کی کوئی جگہ ہی نہ ملتی......

نہ جانے ددی نے کب اور کیسے یہ لیمپ اور یہ جھاڑ روشن کئے ہوں گے...... وہ سامنے والی چھوٹی میز اور کوئی ایک کرسی، شاید یہی کرسی جس پر میں بیٹھا ہوں......اس کے آس پاس وہی خوشبو چمٹی ہوئی ہے، اس میز پر رکھ کر چڑھی ہوں گی۔ کتنا جری اور دلیر ہے میری ددی کا دل اور ذہن......اور یہ ساری تصویریں بھی وہ بہت غور سے اور کافی دیر تک دیکھتی رہی ہوں گی (وہ اٹھ کر تصویروں کے سامنے چلا جاتا ہے اور ان کے سامنے چلتا پھرتا ہے) یقیناً وہ کافی کافی دیر ان تصویروں کو دیکھتی رہی ہیں ان کی قریبی فضا میں بھی وہی خوشبو رچی ہے۔

اور یہ آتش دان کے پاس لکڑیاں اتنی تو یقیناً اس وقت نہ تھیں جب ہم یہاں تھے۔ یہ اس وقت لائی گئی ہوں گی جب بارش تھم گئی ہوگی۔ جب بادلوں میں بجلی چمکنا بند ہوگئی ہوگی اور بادل خاموش ہوگئے ہوں گے......

تمہاری یہ پینٹنگز یقیناً تمہارے کام میں ایک سنگِ میل کی حیثیت رکھتی ہیں۔ یہ بہت اعلیٰ کام ہے، تمہارا......

تم نے ارملا ددی کو idealize نہیں کیا؟ اور سوشیلا ددی کو اتنا تہہ دار اور پہلودار بنا دیا ہے کہ شاید ہی کوئی عورت اتنی بھرپور شخصیت رکھتی ہو۔ تم ان سے بہت متاثر لگتے ہو اور تم ان سے بہت مرعوب ہو! کیوں ہے نا یہی بات۔"

کرشن بہت دیر تک چپ رہا مگر اس کی خاموشی بہت متحرک تھی اگرچہ بے زبان تھی۔ یکا یک وہ اپنی کرسی سے اٹھا اور بولنے لگا۔

"ارملا ہندو تہذیب کا ایک بھرپور روپ ہیں۔ کسی بھی معاشرے میں ان کو دیوی کا درجہ دیتے ہوئے انسان شاید ہی ہچکچائیں She is very wise عورتوں کو اتنا wise نہیں ہونا چاہیے۔ وہ اشیا کی، انسانوں کی حدود سے بہت گہری واقفیت رکھتی ہیں۔ مگر دیویوں کو انسانی معاشرے میں انسانوں کی طرح رہنے کا حق نہیں ہونا چاہئے۔ ان کی پوجا کی جاسکتی ہے، ان سے پریم نہیں کیا جاسکتا۔ ان کے شریر کے متعلق سوچتے ہوئے دل میں ہول اٹھتا ہے sacrilege کا احساس ہوتا ہے۔ مگر میں سمجھتا ہوں کہ وہ ہیں عورت ہی،

دیوی نہیں ہیں۔ان کو جیون ساتھی کی تلاش ہے مگر وہ اس کے لیے سرگرداں ہونے کے لیے تیار نہیں۔لگتا ہے کہ ان کو یقین ہے کہ ان کا جیون ساتھی ان کی تلاش میں یہاں آئے گا اور وہ ایک دوسرے کو پہچان لیں گے۔ یہ تمہاری دوسری ددی تو جذبات، خیالات، احساسات، تخیلات کا ایک براعظم ہیں۔ میں تو اس براعظم میں کھو جاؤں اور کبھی بھی اپنے آپ کو پا نہ سکوں گا۔ میں ان کے اندر شکتی کا بہت بڑا کارخانہ لگا دیکھتا ہوں۔عورت کو اتنی شکتی وان اور اتنی گیانی نہیں ہونا چاہیے۔ اگر عورتیں بالعموم ایسی ہونے لگیں تو ہم مردوں سے برابری چاہیں گی اور ہمارے لیے یہ بہت بڑا جوکھم ہوگا کیونکہ ہم انہیں زیادہ دیر ان کے صحیح مقام اور حق سے محروم نہ رکھ سکیں گے۔ان کی برابری کے لیے ہمیں کتنی محنت کرنی پڑے گی، تم اس کا اندازہ نہیں کر سکتے۔ اگر مستقبل میں کسی معاشرے میں ایسی عورتیں سو بھی ہوں تو اس معاشرے میں معاشرتی اور روحانی انقلاب آنا بہت ہی قرین قیاس ہوگا۔ یہ انقلاب بہت ہی خطرناک ہوگا کیونکہ مردوں کی اگلی نسل کو وہ جیسے چاہیں گی تعلیم دیں گی اور جیسی تربیت وہ اپنی برابری نافذ کرنے کے لیے چاہیں گی دیں گی۔اس طرح مردوں کا بہت بڑا طبقہ ان کے زیرِ اثر ہو جائے۔ وہ دور بہت ہی کٹھن ہوگا۔''

''ارے میاں! ہراساں کیوں ہوتے ہو۔ایسی عورتوں بہت کم ہوا کریں گی جیسے تم جیسے لوگ بہت ہی منفرد ہوتے ہیں اور ایک صدی میں چند ہی ہوتے ہیں......''

''تم نہیں سمجھتے ہم لوگ آرٹسٹ ہیں اور شاعر یا فلسفی ہو سکتے ہیں۔لہٰذا ہم جیسوں کا منفرد ہونا کوئی اچرچ بات نہیں۔مگر عورتوں کا ایسا ہونا بغیر artist & genius ہوئے بہت ہی خطرناک ہے۔ کیونکہ وہ لازماً زندگی کو اسی طرح استعمال کریں گی جیسے میرے جیسے لوگ کسی فنی مواد، ذریعے کو artistic moulding کو استعمال کرتے ہیں۔ ہمارے شہکار کبھی اتنے خطرناک نہیں ہو سکتے جتنے وہ بچے جو ان کی کوکھ سے پیدا ہوں گے اور ان کی گود میں پرورش پائیں گے bombshell ہوں گے pure dynamite۔جب انسانوں میں برابری ہوگی تو نجانے کیا کیا کچھ بدلے۔فن اور آرٹ کا تصور ہی بدل جائے اور فن کار کو بھی فنکار رہنے کے لیے ایسے کارآمد کام معاشرے کے لیے کرنے ہوں گے جن

کے ہم عادی نہیں اور نہ عادی ہو سکتے ہیں۔ اگرچہ آج تک کے تمام معاشروں نے فن کار اور کلا کار کو ایسا معاشرتی درجہ نہیں دیا کہ وہ آزادانہ اپنا کام بے خطر کر سکے مگر ہر معاشرے نے تسلیم کیا ہے کہ وہ منفرد ہے، دوسرے انسانوں سے بلند نہیں تو یقیناً الگ ہے۔ چاہے اس بات کو کہ وہ منفرد ہے ایک برا اور خلافِ اخلاق عمل سمجھا ہو۔

ایسی عورتوں کی دستبرد سے کوئی انسان اور کوئی معاشرہ بھی محفوظ نہیں...... مجھے یہ تسلیم کر لینے میں بھی کوئی باک نہیں ایسی عورتیں ایک فنکار کے شہ کاروں سے بھی بڑی ہیں۔ صرف موتسارت، بیتھوون، شیکسپیئر اور ریمبراں (Rembrandt) جیسے کلا کار ہی ان سے عظیم تر ہیں۔''

''ایسا معاشرہ ہماری زندگی میں تو وجود میں نہیں آتا۔ اس لیے مجھے کسی بات کا ڈر نہیں۔ حسین مگر کمزور عورتیں پیدا ہوتی رہیں گی اور تم جیسے کلا کار ان کے قصیدے گاتے رہیں گے اور اس طرح عام عورتیں اپنے رول سے مطمئن رہیں گی۔ نہ گھبرا میرے دوست، میرے ہمدم، عورت مرد کی رقیب نہیں بن سکتی۔''

کرشن اپنی تصویروں کے سامنے ٹہلنے لگا۔ اس نے ایک لمبا سانس لیا، جیسے کہ سوشیلا کی لطیف خوشبو کو اپنے اندر اتار رہا ہو کہ اس کے خون میں حل ہو جائے، سوشیلا کا ''کچھ'' اس کے خون کا حصہ بن جائے۔ پھر وہ یکا یک رک گیا اس تصویر کے سامنے جس میں سوشیلا مختلف صدیوں میں مردوں اور عورتوں کے روپ میں محوِ خرام تھی، مصروف تھی۔ کافی دیر تک وہ اس تصویر کے مختلف پہلوؤں پر نظریں مرکوز کئے دیکھتا رہا۔ پھر اس نے باقی تصویروں کو بغور دیکھا اور آخر میں وہ ارملا کی تصویر کے سامنے کھڑا ہو گیا۔ اس کے سینے سے بڑی شدت سے اک آہ ابھری اور اس کے منہ سے نکلی۔ روی نے اس آہ کو سنا اور اٹھ کر کھڑا ہو گیا اور کرشن کی طرف منہ کر کے اس سے پوچھا:

''کیا ہوا؟ یہ آہ کیوں؟ بہت دردناک تھی یہ۔ تمہیں کیا دکھ ہے؟''

''میں نے ان تصویروں کو دیکھا ہے۔ یہ سات آٹھ ہفتے کا کام ہے مگر میں محسوس کر رہا ہوں کہ میں اس سے اچھا کام شاید کبھی نہ کر سکوں۔ ایک انسانی زندگی میں اس سے

بہتر اور اس سے زیادہ کام ممکن نہیں ہے۔اب میں بقیہ عمر کیا کروں گا۔اپنے آپ کو دہراتا رہوں گا؟یا شاید کچھ نہ کرسکوں گا اور بھلا دیا جاؤں گا۔ باقی زندگی کو کیا کروں گا۔ کیسے گزرے گی یہ زندگی پینٹنگ کے بغیر...... بہتر ہوگا کہ مرجاؤں! پینٹنگ کے بغیر زندگی موت ہی کے مترادف ہوگی!

''کیوں واہی تباہی بکے چلے جاتے ہو۔رک جاؤ! جیوتش کے گیانی تم نہیں ہو۔ ہر تخلیقی sprout کے بعد ہر کلاکار تھک جاتا ہے،محسوس کرتا ہے کہ اس کے اندر اب کچھ نہیں رہا، وہ کچھ بھی نہیں کرسکے۔ یہ relaxation کچھ کرتے رہنے کے لیے ضروری ہے۔ فطرت کا قانون یہی ہے۔زمین ہو یا انسان کا تخیل اسے تخلیق کے ایک مسلسل عرصے کے بعد fallow پڑا رہنا لازم ہے ورنہ overcultivation کے سبب ویران ہوجائے گا۔بعض پینٹرز کی خودکشی کا یہ سبب نظر آتا ہے۔ جب ہم fallow پڑے رہتے ہیں تو بہت سے اثرات جذب کرتے رہتے ہیں اور ایک لمحہ آتا ہے کہ زمین پھر سے fertile ہوجاتی ہے اور اس کے بعد اس کو بیج ڈالنے کے لیے تیار کرنا ہی رہ جاتا ہے۔انسان زمین نہیں ہے کہ اس کے بھی fallow رہنے کے لیے ایک معین اور معلوم وقت ہو۔انسان میں صلاحیتوں کا،صلاحیتوں کے امتزاج کا بہت اختلاف ہے اس لیے ہر تخلیقی عرصے کے بعد تخلیقی طور پر غیر متحرک ہوجانا تخلیق کی نشوونما کے لیے ضروری ہے۔اس کی بے شمار مثالیں دی جاسکتی ہیں۔'' ''اس بات کے برعکس بھی مثالیں موجود ہیں کہ تخلیق کے سوتے ایسے سوکھے کہ پھر ان میں پانی عود کرنہیں آیا اور بقیہ عمر محض انتظار میں گزرگئی اور زندگی بالکل سپاٹ گزری۔ میں ایسی زندگی کا تصور بھی نہیں کرنا چاہتا۔ میں اس سے پہلے ہی مرجانا پسند کروں گا۔'' ''اے بھلے آدمی! مصوری ہی تخلیق کا واحد راستہ نہیں ہے۔انسان مصور نہ رہے پھر بھی تخلیقی انسان رہ سکتا ہے۔تخلیقی طاقتوں کی انسانی معاملات کو سلجھانے کے لیے بہت اشد ضرورت ہوتی ہے۔تم نے ابھی شادی نہیں،تمہارے بچے بھی نہیں ہیں-- چاہے وہ حرامی ہی کیوں نہ ہوں-- اس شادی شدہ اور غیر شادی شدہ بچوں کے باپ کی زندگی تخلیقی قوتوں کا مطالبہ کرتی ہے۔تمام معاشروں کی سب سے بڑی کمی یہی رہی ہے کہ مرد نے

بچوں کی تعلیم و تربیت پر بہت ہی کم وقت دیا ہے اور اگر کبھی دیا ہے تو ان لمحوں میں جب اس کی تخلیقی قوتیں تھک گئی ہوتی ہیں۔اسی لئے تو ماں کی گرفت اپنے بچوں پر، اپنے معاشرے پر کافی مضبوط ہوتی ہے اور مرد کی جب بھی گرفت ہوتی ہے تو صرف ماں کے ذریعے سے۔ مرد اور باپ اگر عورت اور ماں کو کسی خاص نوعیت کے معاشرے پر قانع رہنے پر قائل نہ کرسکیں تو پھر معاشرے میں تبدیلیاں آنے لگتی ہیں۔معاشرے میں انحطاط آتا ہی تب ہے جب عورتیں مائیں ایک معاشرے کے وجود کے جواز کی قائل نہ رہی ہوں اور دوسرے معاشرے کے لیے ان کے پاس کوئی نظری دلائل نہ ہوں کہ وہ پہلے معاشرے سے بہتر ہے۔''

''اگر تمہارا معاشرتی تاریخی تجزیہ درست بھی ہو تو میں اس سے بے اعتنا ہی رہوں گا کیونکہ مجھے اگر عشق بھی کرنا ہے تو اس لیے کہ میرے لیے ایک تخلیقی للکار ہے۔اگر کبھی میں نے شادی کی اور بچوں کا باپ بنا تو صرف اس لئے کہ میرے پاس تخلیقی قوتوں کی اتنی فراوانی ہوگی کہ میں پینٹر کی زندگی میں اعلیٰ کام کے باوجود تمام صلاحیتوں کو بروئے کار نہ لاسکتا ہوں گا۔''

''یہ تمام توانائی جو تخلیقی کاموں میں خرچ ہوتی ہے وہ جسم ہی سے پیدا ہوتی ہے ہوا سے پیدا نہیں کی جاتی اور جسم کے تقاضے مصوری سے الگ ہوتے ہیں۔تم کہو گے کہ جسم تخلیقی توانائیوں کا منبع نہیں ہے بلکہ روح ہے۔مگر روح کو بغیر جسم کے کس نے دیکھا ہے اور جب روح اور جسم کا وصال ہوتا ہے تو پھر ہی اور صرف اسی حالت میں تخلیق کرنے والے ممکن ہوتے ہیں......

اس لیے میں تم سے دست بستہ گزارش کروں گا کہ تم اس بات سے نہ گھبراؤ کہ تم آئندہ ان تصاویر سے اچھی تصاویر بنا نہ سکو گے۔کوئی بھی شخص چاہے وہ کتنا ہی خلّاق کیوں نہ ہو وہ اپنے مستقبل کے متعلق تعین سے کوئی بات نہیں کرسکتا۔تخلیق کرنے سے چند ہی لمحے پہلے ہم جان پاتے ہیں کہ ہم سے تخلیق جنم لیا چاہتی ہے۔صرف خدا ہی جانتا ہے کہ وہ کیا خلق کرے گا اور کب۔تم اور میں خدا نہیں ہیں محض انسان ہیں جن کو اس دنیا میں بہت ہی

قلیل عرصے کے لیے رہنا ہے۔ درخت بھی ہم سے لمبی عمریں پاتے ہیں، حقیر جانور بھی مگر ان کے اثرات تخیلِ انسانی کو للکارتے نہیں۔''

''حضرت افلاطون! کچھ دیر کے لیے چپ ہو جاؤ! میں خاموش رہنا چاہوں گا اور تنہا۔ تم جا کر اپنی ددیوں سے باتیں کرو۔''

''میں تمہیں تنہا چھوڑنے کے لیے بالکل راضی ہوں مگر وعدہ کرو کہ تم مر جانے قسم کی کوئی لغو حرکت نہیں کر بیٹھو گے۔''

''اچھا بھئی! اچھا! کچھ نہیں کھاؤں گا، صبح تک۔ لہٰذا کھانا بھجوانے کی تکلیف نہ دینا کسی کو۔ روی کمرے سے باہر نکل گیا۔ باہر بہت ہی شفاف فضا تھی اور ہر طرف چاندنی کھلی تھی۔ ہوا کا لمس بہت ہی خوشگوار تھا۔ درختوں میں سے ہلکی ہلکی موسیقی اتر رہی تھی۔ سانس لینے سے طاقت جذب کرنے کا احساس ہوتا تھا۔ وہ بہت دیر چاندنی میں ٹہلتا رہا۔ جب سردی بڑھنے لگی تو اس کو کسی گرم مقام پر جانے کی ضرورت محسوس ہوئی۔ اس نے اسٹوڈیو کے شیشے کی دیوار کی طرف نظر کی تو کمرا بالکل تاریک تھا اور شیشے کے آگے پردے کھنچے تھے۔ اتنے گھور اندھیارے میں کرشن کیا سوچتا ہوگا؟ اس کو کہیں سے کوئی جواب نہ ملا تو اس نے ڈرائنگ روم کی طرف قدم اٹھانے شروع کیے۔ ڈرائنگ روم میں ابھی روشنی تھی بلکہ یوں کہنا زیادہ صحیح ہوگا کہ ڈرائنگ روم جگمگا رہا تھا۔ وہ جلدی جلدی قدم اٹھاتا کمرے میں داخل ہو گیا۔

سب لوگ وہاں جمع تھے۔ سوشیلا کے والد اور والدہ بھی وہاں موجود تھے۔ وہ چونکا۔ وہ کب آئے تھے۔ اس نے سب کو آداب کیا اور پھوپھی کے پاس خالی صوفے پر دراز ہو گیا۔

''بہت تھک گیا ہوں۔ آج بجلی کی چمک اور کڑک نے بہت بہت ڈرایا۔ پہاڑ کی کھوہ میں محفوظ نہ ہوتے تو خوف سے مر گئے ہوتے۔ کیا چمکتی تھی بجلی! ایک بار تو روشنی کا ایک ساگر ہماری کھوہ کی طرف اس تیزی سے امڈ آیا کہ محسوس ہوا کہ ہمیں بھسم کر دے گا......

''اچھا تو تم اس وقت کھوہ میں چھپے بیٹھے تھے۔'' سوشیلا بولی۔

''آپ تو اس وقت کمرے میں محفوظ تھیں......''

''ایسی محفوظ کہ ڈر کے مارے جان نکل نکل گئی۔ کوئی بھی تو پاس نہ تھا اور گھور اندھیرا بس کچھ نہ پوچھو کیا بیتی! تصور ہی سے کپکپی چھڑی جاتی ہے۔''

''لیکن جب ہم آئے تو سارا کمرا جگمگا تا تھا، لیمپ روشن تھا، جھاڑ کی ہر بتی روشن تھی۔ پینٹنگز دن کے اجالے میں بھی اس قدر روشن نہ ہوں گی......آپ تو تصویریں دیکھتی رہیں، ان سے باتیں کرتی رہیں۔ ایک ہم تھے کہ سردی سے ٹھٹھر رہے تھے اور اندھیرا اور بجلی کی چمک، کڑک اور بادلوں کی گرج اور دھاڑ سے ہراساں تھے۔''

''ہاہاں ں ں ں! روشنی سے پہلے کیا تھا اس کا تم اندازہ ہی نہیں کر سکتے۔ کتنا اپنے آپ پر جبر کیا تو دیا سلائی ملی۔ اس کے بعد تو کچھ مشکل نہ تھی......تمہارا یہ مصور دوست بہت اچھا مصور ہے، میں تو اس کو بڑا چتر کار بھی کہنے کے لیے تیار ہوں...... ہے کہاں؟ تمہارے ساتھ واپس نہیں آیا؟''

''روشنیاں بجھا کر کرسی پر بیٹھا اندھیرے سے جنگ کرتا ہوگا۔ اس میں اپنی تصویروں کا سامنا کرنے کی ہمت نہیں ہے۔ ان کی عظمت کے سامنے وہ اپنے آپ کو بہت چھوٹا محسوس کر رہا تھا......!

''یقیناً وہ عظیم تصاویر ہیں۔ صلاحیتوں کا بہت بڑا ایندھن خرچ ہوا ہوگا۔ تھک گیا ہوگا بیچارا! اس کو ایک طویل آرام کی ضرورت ہے شاید۔''

''اسی آرام کی ضرورت کو موت کا آغاز سمجھ رہا تھا۔ میں نے بہت سمجھایا اسے مگر وہ بضد ہے کہ اب اس کی موت جلد ہی واقع ہونے والی ہے۔ اس کو یقین ہے کہ وہ اس سے بہتر کام نہ کر سکے گا۔''

''یہ چتر کار کون ہے جس کی باتیں ہو رہی ہیں؟'' سوشیلا کے والد نے پوچھا۔

''میرا دوست ہے۔ سات آٹھ ہفتوں سے ہم یہاں ہیں۔ اس نے ارملا ددی اور سوشیلا ددی اور سب گھر والوں کی، گھر کی، گھر کے گردونواح کی بہت سی تصویریں بنائی ہیں۔ ایک سنتان وشوا ہے جس کو اس نے جنم دیا ہے جو اندر کے وشوا سے بھی زیادہ سندر، بارعب اور شکتی وان ہے......آپ دیکھیں گے تو اک اتھاہ آنند ملے گا آپ کو۔ مگر اس کے لیے صبح کا

انتظار لازم ہے......

آپ لوگ کھانا کھا چکے؟ مجھے تو سخت بھوک لگی ہے؟''

''نہیں تو! ماموں اور ممانی آ گئے تھے۔ باتوں میں کسی کو کھانے کا دھیان ہی نہیں آیا۔ میں برتن لگواتی ہوں۔ تمہارے دوست کا انتظار نہ کر لیا جائے۔'' ارملا نے کہا۔

''نہیں! وہ آج تو غم ہی کھائے گا رات بھر، کل صبح ہو گی تو دیکھیں گے کہ مصور میاں کو کھانے کی ضرورت ہے یا وہ اس ضرورت سے بھی گزر چکے ہیں۔ اس نے مجھے یہی کہا تھا وہ کھانا نہیں کھائے گا۔''

وہ کھانا کھا کر واپس ڈرائنگ روم میں ہی لوٹ آئے۔

''مسلسل تخلیق کے بعد ایک بیزاری کا عالم آتا ہے اور طویل آرام کی ضرورت ہوتی ہے۔ ہر منوَنتر کی تخلیق کے بعد، ہم سب جانتے ہیں، کہ وشنو سو جاتے ہیں۔ جب مہادیوتاؤں کو بھی سو جانے کی ضرورت ہو تو اک چتر کار کو کیوں نہ ضرورت ہو گی۔''

''ددی! اس رات کے بعد یہ کان آپ کے سنگیت کو ترس گئے ہیں۔ ترس کھائیں۔ آج کچھ سنا دیں۔''

''یہ کس رات کا ذکر ہے؟'' ارملا ددی اور سوشیلا ددی کے باپوں نے یک زبان ہو کر پوچھا اور اس یک زبانی پر دونوں ایک دوسرے کو دیکھ کر مسکرا دیئے۔ سوشیلا اس رات کا تصور کر کے شرما گئی مگر فوراً ہی اس نے اپنے آپ پر قابو پا لیا۔ شاید ارملا کی ماں نے دیکھ لیا تھا۔

''یہ اس رات کا ذکر ہے جب ہمارے گھر چندر بھان میرے دوست کی حیثیت سے آئے ہوئے تھے اور سوشیلا ددی اور ان کو پہلی بار معلوم ہوا کہ دونوں میں کیا رشتہ ہے۔ پنڈت کنول نارائن نے چندر بھان کو ان کی چال، بیٹھنے اور آنکھیں اٹھانے کے انداز سے پہچان لیا تھا۔ دونوں یونیورسٹی میں ایک دوسرے کو یونہی سا جانتے تھے۔''

''پنڈت کنول نارائن! مدت ہو گئی ہے ان سے ملے......اب جلد ہی شہر جاؤں گا اور ان سے ملوں گا......''

تو بیٹی ہم انتظار میں ہیں۔ کچھ سناؤ۔‘‘

ارملا اٹھی اور وینا اٹھالائی اور سوشیلا کی گود میں رکھ دی۔ سوشیلا نے پیر فرش سے اٹھا لئے اور آسن جما کر صوفے پر ہی بیٹھ گئی۔ کچھ دیر اس کی انگلیاں تاروں سے اٹھکیلیاں کرتی رہیں اور پھر ایک دم مدھر دھن چھیڑ دی موسیقی کمرے پر محیط ہونے لگی۔ سب کے سانس آہستہ آہستہ بہت آہستہ چلنے لگے۔ وینا کے ساتھ ساتھ سوشیلا کی آواز بھی بلند ہونے لگی۔ وینا کی آواز اور سوشیلا کی آواز رقص کرنے لگی۔ آوازوں کے ملاپ سے، وِدا سے رس ابلنے لگا، امرت چھلکنے لگا۔

دو آوازوں کے ساتھ ایک تیسری آواز بھی سنسنانے لگی۔ ہوا شیشوں، کھڑکیوں پر دستک دینے لگی، جیسے طبلے کی ضرورت کو پورا کر رہی ہو۔ تین آوازوں کے باہمی ملاپ سے سنگیت میں اک نیا عنصر، جادو، شامل ہوا۔ اب لے کا نرت تھا اور بس! اتنے میں ایک اور آواز سنگیت میں شامل ہوگئی۔ بارش ہونے لگی، پہلے ہلکی ہلکی، پھر زور سے، بجلی چمکنے لگی، گرجنے لگی، بادل گرجنے لگے، جیسے میدانِ جنگ میں بڑے طبل بلبلا رہے ہوں۔

سنگیت میں سب آوازیں رچنے لگیں۔ بجلی کی کڑک، بادل کی گرج نے سنگیت کو ایک غیر انسانی، انسان سے ماورا، موسیقی کا روپ دے دیا۔ دھرپد میں کئی سروں کا اضافہ ہوگیا اور اک نیا راگ وجود میں آ گیا جس کا شاستروں میں کہیں ذکر نہ تھا۔

ان کو احساس ہونے لگا کہ دیوی دیوتا اس سنگیت کو سننے کے لیے گگن سے، اندر دیو کے سورگ سے، نیچے اتر آئے ہیں، صرف شو، وشنو اور برہما کائنات کی بلندیوں میں قائم رہے، شاید اس لیے کہ کائنات میں خلل نہ آ جائے۔

ایک سمے آیا کہ ایسا محسوس ہوا کہ تمام کائناتی قوتیں کمرے میں داخل ہونے کے لیے سخت کوشاں ہیں۔ یکا یک ایک خفیف سے وقفے کے لیے وینا اور سوشیلا خاموش ہوئیں اور سنگیت نے ایک پھریری لی، جیسے جون بدلی ہو۔ راگ درباری شروع ہوگیا مگر اک نئے انداز اور نئے نرت سے۔ راگ بلمپت سے درت میں آیا تو ہوا رک گئی، ساکت ہوگئی، بارش آہستہ ہوگئی جیسے کہ کائنات کی ہر شے با ادب ہوگئی ہو۔ موسیقی شدھ ناد بنی، اس سے تمام

انسانی جذبات کشید کر لئے گئے، صرف ان کے بھاؤ رہ گئے، اس کی گہرائی میں اک شفاف پن آ گیا، جیسے کہ جھیل کا تلاطم ختم ہو گیا ہو، ندی پہاڑوں کی بلندیوں سے اتر آئی ہو اور پہاڑوں کی مرتفع سطح پر پتھروں کی صورت گری کرتی بہہ رہی ہو اور پانی سے فرش پر پڑی ہر شے نظر آ رہی ہو اور ہر شے کی سطح کو پانی کی رفتار سہلا رہی ہو اور ہر شے اس سہلانے کا مزا لے رہی ہو۔ لَے کے اتار چڑھاؤ میں حدود کی وضاحت تھی، حدود کو نظر انداز کرنے کی ذرہ بھر کوشش نہ تھی بلکہ حدود کو قائم کرنے کی نمایاں کوشش جیسے کہ نیا جہاں ترکیب دیا جا رہا ہے اور اس کو حدود میں پابند کیا جا رہا ہو۔

راگ نے واپس لوٹنا شروع کیا مگر اس انداز سے کہ جو ہو چکا تھا اس کی ایک مجموعی جھلک دکھائی جا رہی تھی تا کہ پورا ویژن تخیل میں ہمیشہ ہمیشہ کے لیے نقش ہو جائے اور اس کا عکس ذہن اور دل کی گہرائیوں اور بلندیوں کو محیط کر لے۔

راگ کا سفر ختم ہوا، راگ تھم گیا مگر فضا میں اس کے اثرات دیر تک رہے۔ سننے والے دم بخود رہے۔ جیسے کہ راگ کے حصار کو توڑنے کی نہ تو ان میں خواہش ہو اور نہ ہمت۔

یکا یک طلسم ٹوٹا، کھانے کے کمرے میں کوئی چیز گری۔ روی ایک دم اٹھا اور دروازہ کھول کر دوسرے کمرے میں گیا۔ کھانے کے کمرے میں کوئی اوندھا پڑا تھا۔ روی قریب پہنچا تو لباس سے اس نے پہچانا کہ کرشن ہے۔ بدن میں سانس لینے کے آثار بالکل نہ تھے۔ روی نے زمین پر پاؤں کے بل بیٹھ کر جسم کو الٹا کیا تو کرشن کا چہرہ بالکل سفید تھا، جیسے کسی نے اس کا سارا خون نکال لیا ہو۔ اس نے گھبرا کر اس کا نام لے کر پکارا۔ اس کی آواز میں ہول اور حیرانی اس قدر تھی کہ ڈرائنگ روم سے ٹھاکر شِو آنند اور ارملا لپک کر آئے۔ دروازے سے انہوں نے دیکھا کہ کوئی فرش پر پڑا ہے اور روی اس پر جھکا ہے۔ ارملا دروازے میں ہی کھڑی رہی اور ٹھاکر بڑھے اور انہوں نے ایک نظر کرشن کو دیکھا اور انہوں نے ایک دم فیصلہ کیا کہ کرشن سکتے میں ہے۔ انہوں نے روی کو کہا کہ وہ کرشن کو اٹھا کر ڈرائنگ روم میں لے آئے۔ ارملا کو مڑے بغیر کہا کہ وہ چند کمبل لے آئے۔ جب کرشن کو ایک صوفے پر لٹا دیا گیا تو ارملا کمبل لے آئی جو اس پر ڈال دیئے گئے۔ ٹھاکر ایک بکس اٹھائے کمرے میں داخل

ہوئے۔قریب آ کرانہوں نے بکس سے شیشہ نکالا اور کرشن کی ناک کے پاس لے گئے۔ شیشہ دھندلایا،مگر بہت خفیف سا۔

''سانس تو لے رہا ہے مگر بہت ہی آہستہ۔اس کوفوری طور پر طبی توجہ کی ضرورت ہے۔ (ارملا کی طرف منہ کر کے) تم جیوتی کو بھیجو ڈاکٹر سورج نارائن کو بلالائے مگر جلدی! انہوں نے بکس سے ایک ننھی سی شیشی نکالی،ایک چمچ نکالا اور شیشی سے دوائی انڈیلی اور روی سے کہا کہ وہ کرشن کا منہ کھولے۔منہ سختی سے بند تھا۔ٹھاکر نے روی سے کہا کہ وہ اس کے قمیص کے گریبان کے بٹن کھول دے،اس نے فوراً بٹن کھول دیئے۔انہوں نے دوائی چمچ سے شیشی میں انڈیل لی۔ایک دوسری شیشی بکس سے نکالی اور روی کو کہا کہ دونوں ہاتھ ان کی طرف کرے انہوں نے شیشی سے اک سیال رس اس کے دائیں ہاتھ میں انڈیلا اور کہا کہ وہ اسے دونوں ہاتھوں میں مل لے اور پھر کرشن کے سینے کی مالش کرتا رہے۔جب تک کہ ڈاکٹر نہ آجائے۔وہ مالش کرتا رہا۔اتنے میں جیوتو وید بھی آ گیا،وہ ایک نظر کرشن کو دیکھ فرش پر بیٹھ گیا۔اس نے ایک نظر کمرے میں دوڑائی۔اس نے سوشیلا کے شانے سے لگی وینا کو دیکھا اور اس کی سمادھی کو بھی۔اس نے کچھ دیر سوچ کر فیصلہ کیا اور فرش پر بیٹھ گیا اور اس نے کرشن کے پاؤں سے جوتے اور موزے اتار دیئے اور پاؤں کی مالش کرنے لگا۔کچھ دیر مالش کرنے کے بعد اس نے ٹھاکر شِو آنند کی طرف متوجہ ہو کر کہا:

''ان کی آتما ان کے شریر سے نکل کر نہ جانے کہاں کہاں گھومتی رہی ہے۔کچھ ایسی بات ہوئی ہے کہ آتما واپس شریر میں نہیں آئی مگر آتما سے شریر کا سمبندھ نہیں ٹوٹا،جیسے کہ نیند میں نہیں ٹوٹتا۔یہ سکتے میں ہیں اور سکتے میں رہیں گے جب تک وسنت راگ ان کے کانوں میں نہ پڑے گا۔آتما کو واپس شریر میں لانے کا یہی ایک اپائے ہے...... وینا کہتی ہے کہ راگ رچے تھے۔راگ کے سنگ ان کی آتما بھی گگن کی اُور گئی تھی۔کیا راگ تھا جو بٹیا نے چھیڑا تھا؟''

''دھرپد،خیال ماروا اور اس کے بعد درباری۔''شِو آنند نے جواب دیا۔

''راگ میں تو ایسی بات نہ تھی۔ان کے بھیتر ہی کچھ بیت چکا تھا جو نہ بیتنا چاہیے تھا۔

کسی موہ میں تھے۔ موہ اور راگ میں کوئی سمبندھ، کوئی سنجوگ نہ ہو سکا...... آتما کو واپس بلانا ہے تو اب وسنت چھیڑئیے۔ دیر نہ کریں سمے بہت کم ہے۔ سمے گزر گیا تو ان کی حالت ایسی ہی رہے گی جیون بھر۔''

سوشیلا نے وسنت شروع کیا وینا پر۔

''یہ وینا کے بس کی بات نہیں، آپ کو بھی گانا ہی ہوگا۔''

وینا اور سوشیلا نے ایک دوسرے کا ساتھ دیا۔ جیوتو نے روی کو اشارہ کیا کہ وہ وہاں سے ہٹ جائے۔ وہ سوشیلا کے سامنے بیٹھ گیا۔ اس کے مکھ پر اتھاہ غم اور ایک پرارتھنا کی کیفیت تھی۔

جوں جوں راگ منزلیں طے کرتا گیا کرشن کے سینے میں پُران کی آمدورفت بڑھتی گئی، اس کے بدن میں تناؤ کم ہوتا گیا، اس کے پاؤں کی انگلیوں میں خون کی گردش تیز ہونے لگی، پنڈلیوں میں مچھلیاں پھڑ پھڑانے لگیں۔ جیوتو نے قمیص کے اندر ہاتھ ڈال کر دل کی دھڑکن کو گنا اور پھر قمیص کے بٹن بند کر دیئے اور کمبل کے سرے کرشن کے جسم نیچے دبا دیئے اور چلا گیا۔ کچھ ہی دیر میں لوٹ آیا اس کا ایک ہاتھ بند تھا اور دوسرے میں ایک پیالی تھی۔ اس نے کرشن کے جبڑوں کو دبایا اور اس کے بعد منہ کو کھولنے کی کوشش کی اور کھول لیا۔ اس نے بند بائیں ہاتھ سے ایک شیشی نکالی اور کچھ پیالی میں انڈیلا اور کرشن کے منہ میں ڈال دیا۔ کچھ دیر میں کرشن کے بدن میں لرزش ہوئی اور بدن کپکپایا اور پھر شانت ہو گیا اور اس کا سانس ایک نرت کے ساتھ چلنے لگا۔

دیوار کے شیشے سے نظر آنے لگا کہ دور پہاڑ کی چوٹی پر دھندلکا دمکنے لگا۔ راگ کا اختتام ہوا تو جیوتی ڈاکٹر کو لے کر آ گیا۔ ڈاکٹر کرشن کا کافی دیر تک معائنہ کرتا رہا۔ ''یہ اب بہت ہی گہری نیند میں ہیں یا شاید اس سے بھی اگلی منزل میں۔ کوئی صدمہ پہنچا تھا انہیں مگر ان کی organism اس صدمے کو جذب کر لینے پر قادر ہو گئی ہے۔ خود بخود تو ایسا نہیں ہوتا اور نہ ہو سکتا تھا۔ کچھ علاج آپ لوگوں نے کر لیا ہے۔ اب یہ کئی دنوں میں ہوش میں آئیں گے۔ کیا دیا تھا مریض کو۔

جیوتو مسکرایا اور بولا:

''وسنت راگ اور اس کے بعد ایک بوٹی کا رس جو اماوس کی ایک رات کو ہمارے پہاڑوں میں چمکتی ہے، جگنو کی طرح۔ آپ نے ٹھیک کہا کہ اب یہ چند دنوں میں جا گیں گے......سنترے منگوا رکھیں۔ جب ہوش میں آئیں گے تو سنترے مانگیں گے۔

سانجھ کا تارا نکلنے کو ہے۔ بٹیا کماری کے استھان جا کر پرَ ایشچت کرے کہ سمے نہ تھا اور وسنت چھیڑا۔ کچھ دان بھی کریں...... میں گھوڑے تیار کراتا ہوں۔ آپ آئیں۔ بٹیا کے ساتھ (روی کی طرف مخاطب ہوکر) آپ جائیں۔ سوشیلا اور روی تیار ہوئے اور کماری کے استھان کو جانے کے لیے آنگنوں میں سے ہوتے ہوئے پہلے آنگن پہنچے جہاں سائیس گھوڑے لیے کھڑا تھا۔ تین گھوڑے، دو ان کے لیے اور تیسرا اپنے لئے۔ گھوڑوں پر سوار ہوکر وہ استھان کی اُور چل دیئے۔ راہ میں بن تھا۔ بن میں ابھی اندھیرا تھا اگر چہ پھنگوں میں دھندلکا روشن ہو رہا تھا۔ پرندا اپنے اپنے راگ چھیڑ رہے تھے۔ ان آوازوں میں ایک آواز بہت منفرد تھی۔ لگتا تھا کہ کوئی گیاتری کا الاپ کرتا ہے۔ سبز راستوں سے وہ میدان میں جا نکلے جہاں ایک ننھی سی ندی بہہ رہی تھی۔ اس کے اوپر کاٹھ کا ایک پل تھا۔ پل پر جب گھوڑے چڑھ گئے تو ان کی چاپ فضا میں گونجی۔ ہوا میں تیزی آ گئی۔ ہوا بولنے لگی، گنگنانے لگی۔ گھوڑے پل سے اتر کر دوڑنے لگے۔ پتھریلی سطح پر گھوڑوں کی ٹاپیں گونج گئیں۔ گھوڑے پہاڑ پر چڑھنے لگے۔ وہ چڑھتے رہے، اور مناظر ان پر وا ہوتے رہے، نئے نئے سیاق وسباق میں۔ ان کا پس منظر کئی بار بدلتا رہا۔ سوشیلا کا گھر کئی بار نئے نئے مناظر اپنے جلو میں لئے نظر آیا۔ بنوں کے بیچوں بیچ ایک کنڈل سی عمارت جس کے اندر سات کنڈل تھے۔ ان کنڈلوں میں سات آنگن، ان آنگنوں میں چنار، صنوبر، شاہ بلوط کے درخت ہوا میں لہرا رہے تھے۔ اس کنڈل سی عمارت کے گرداگرد ایک وسیع باغ تھا اور باغ کے گرداگرد فصیل۔ ان سب کے عین وسط میں ایک کوٹھے کی فصیل کے اوپر ایک اور فصیل تھی اور اس پر پتھر کی دیوار میں پیوست ایک جھنڈے کا ڈنڈا تھا جس پر نیلے گگن جیسا ایک پھریرا تھا جس پر ہلال بنا تھا یہ پھریرا شِو جی کو بہت عزیز تھا۔ اس جھنڈے کے عین سامنے

بالکل اسی طرح فصیل بہ فصیل پتھر کی دیوار میں ایک سنہرا ترشول گڑا تھا، جواب کرنوں کے جھرمٹ میں چمکتا تھا۔ سات آنگنوں والا گھر بن کے درختوں کے گھیرے میں ان جیسا ہی شریر معلوم ہوتا تھا جیسے کہ دھرتی سے اگا ہو، پروان چڑھا ہو، پھلا پھولا ہو، وہ نہ درختوں سے اجنبی تھا اور نہ درخت اس سے اجنبی تھے۔ دونوں کسی انوکھے سمبندھ میں بندھے تھے، لگتا تھا کہ دونوں میں پریم کا وواہ ہے، دونوں ایک دوسرے میں پیوست تھے۔ جنوب مشرق میں نٹ راج کے مندر کا سنہرا کلس چمک رہا تھا اور کلس کے نیچے مندر کے بیرونی صحن میں ایک کنڈ میں سرخ پانی چمکتا تھا۔ بن سے دور مشرق کی طرف دور نیچے تک وسیع وعریض طاقچوں کی صورت، اترتی سیڑھیوں کی طرح کھیت اور باغ تھے جن میں تازہ تازہ گندم بیجی گئی تھی اور انگور کی بیلیں لکڑی کے طاقچوں پر اور سیب کے درخت پر سیب کرنوں کی روشنی میں دمک رہے تھے۔ مغرب کی طرف کئی ایک چھوٹے چھوٹے پہاڑی گاؤں تھے جن کے بیچ درمیان میں ایک سڑک شمال مشرق کی طرف آتی تھی اور یہ سڑک کماری کے چھوٹے سے پہاڑی قصبے میں سے گزرتی تھی۔ اس قصبے میں پکی عمارتیں تھیں، کچھ بنگلے تھے جن کی چمنیوں سے صبح کے اجالے میں ہلکا ہلکا سانولا سا دھواں اٹھ رہا تھا۔ پہاڑی حصے کی سڑکوں پر ابھی تک کوئی نہ تھا اور اس کی فضا پر دھندسی چھائی تھی۔

چڑھائی کے دونوں طرف صنوبر کے درخت تھے اور پہاڑوں کی دیواروں پر سبزہ خاصا اونچا اگ رہا تھا اور گوبند کی جھاڑیاں۔ راستے میں اب دھندسی چھا رہی تھی۔ جب وہ چوٹی پر پہنچ گئے تو ایک کھلی سطح پر گھنے دیودار کے درختوں میں ایک کنڈ اور ایک باغ کے وسط میں ایک مندر تھا۔ مندر کے کلس کے گرداگرد کرنوں کا جہاں آباد تھا۔ مندر سے گھنٹیوں کی آواز آنے لگی تھی۔ انہوں نے گھوڑوں کو بن ہی میں روک لیا اور اتر گئے۔ گھورے سائیس کے سپرد کر کے وہ دونوں مندر کی اُور بڑھے۔ قریب پہنچے تو مندر کے پیچھے سے اپنی کٹیا سے پروہت نکل کر آ رہا تھا۔ سوشیلا کو دیکھ وہ بہت خوش ہوا۔

''سوشیلا رانی آج بہت دنوں کے بعد آئی ہے۔ مہمان آئے ہوئے تھے۔ ان کو تو میں نے ان پہاڑوں میں پھرتے کئی بار دیکھا۔ روی کی طرف مخاطب ہوتے ہوئے بولا۔

آپ کے وہ چتر کارسنگی کہاں ہیں۔ ان کے من اور چیتنیہ میں شانتی نہیں۔ بہت اشانت پھرتے ہیں۔ نجانے اس جوانی میں کیا گھن لگا ہے ان کے ہردے میں۔ چہرے مہرے سے تو کسی سناتن راج پرکھوں کے پری وار لگتے ہیں۔ شِو نے نر کے شریر پر ناری کا مکھ لگا دیا ہے، پرنتو پھر بھی سندر کھشتری دِکھتے ہیں۔ ایسا مکھ اور ایسا شریر کسی آتما کو راس نہیں۔ کامناؤں میں یدھ رہتا ہے، کسی کامنا کی کرتی نہیں ہوتی۔"

"وہ کل رات سے بہت دکھی ہیں۔ سدھ بدھ کھو بیٹھے ہیں۔ جیتو کے بتانے پر ددی رات بھران کے لیے وسنت راگ گاتی رہی ہیں اور اب اسی کا پراسچت کرنے کے لیے کماری کے چرنوں میں آئی ہیں۔"

"شِو مہاراج دیا کریں تو سب ٹھیک ہو جائے گا۔ کماری سے کرون کے لیے پرارتھنا کریں۔ ارپن ہو جائے تو اچھا ہے...... آرتی کی تیاری کراتا ہوں، آپ کماری کے دوار چلیں۔"

اک بڑے سے دروازے میں سے ایک بڑے صحن میں داخل ہوئے۔ کئی ناریاں اور بالیاں اکٹھی تھیں۔ ان کی تھالیوں میں پھول اور پھل دھرے تھے۔ پروہت نے اندر سے کماری کے استھان کے دوار کھول دیئے اور سوشیلا اور روی اندر داخل ہوئے تو کھڑکیوں سے داخل ہو کر کماری کے چرنوں میں کرنیں کھیل رہی تھیں۔ چھت سے ایک بہت بڑا جھاڑ لٹک رہا تھا اور اس میں سینکڑوں موم بتیاں جل رہی تھیں۔ کماری کے چہرے پر بہت ہی انوٹھا، انوکھا اولاس تھا۔ کماری کے برن سے سندرتا پھیل رہی تھی۔ اس کے اٹھے ہوئے دائیں ہاتھ میں اتھاہ کرون تھا، اس کی آنکھوں میں عجب چمک تھی جیسے کہ وہ آنکھیں سب رازوں سے واقف ہوں اور ہر ہردے کی گہرائیوں تک ان کی نظر پہنچ رہی ہو۔ جیسے کہہ رہی ہوں، ہم سب کچھ جانتی ہیں مگر پھر بھی سچ کہنے کی جرأت ہو تو پرارتھنا کی لیے ہونٹ کھولو۔ کاٹھ کے شریر سے ایک شکتی پھوٹ رہی تھی جو دیکھنے والوں کو حصار میں لے رہی تھی۔

کرنوں نے کھیلنا بند کر دیا اور کھڑکیوں سے واپس چلی گئیں کیونکہ پروہت نے پردے کھینچ دیئے تھے۔ سوشیلا کو پروہت نے آرتی کی سونے کی تھالی دی تھالی پر ننھے ننھے

تین دیئے تھے۔سوشیلا نے آرتی اتاری اور کماری کی شان میں گیت گایا اور پھر سب ناریاں بالیاں بھی آ گئیں سب نے مل کر راس رچائی، ناچتے ناچتے صرف سوشیلا رہ گئی۔ ناریاں بالیاں سب دیوار کے ساتھ لگ کر دیکھنے لگیں کہ انہوں نے محسوس کیا تھا آج کماری کو صرف ٹھاکر کی بٹیا کا ناچ ہی پسند تھا۔اس کے من میں ایک ہیجان تھا جس پر وہ کوشش کے باوجود قابو نہ پا سک رہی تھی۔ وہ ناچتی رہی، اس کے انگ انگ سے پرارتھنا اٹھتی رہی، اس کو کماری شما کر دے؛ اس نے کرشن کو کسی طرح بھی لبھانے کی کوشش نہ کی تھی؛ اس کو تو چندر بھان ہی کو لبھانا،موہنا تھا کہ وہ سات آنگنوں والے گھر لوٹ آئے اور اس کو اس کے ماں باپ، بھائیوں سے وداکروا کر بیاہ لائے،اس کا شریر،اس کا من،اس کا ہردے،کلپنا تھا تو صرف چندر بھان کے لیے؛ کرشن کے معاملے میں وہ نری نردوش تھی،اگر کرشن کی کلپنا اس کے لیے تھی تو کماری اس کے ہردے سے اس کی اس کلپنا کو دھو دے تا کہ وہ وشواکروسن کے لیے تیار ہو سکے۔

ناچتے ناچتے اس نے محسوس کیا کہ کماری کے دائیں ہاتھ نے اشارہ کیا کہ وہ رک جائے۔ وہ رک گئی۔کماری کی نظریں اس کے نینوں میں سے اتر کر اس کے ہردے کو ٹٹولنے لگیں اور اس میں سے دکھ کی کلپنا مسل کر نکال لی۔ وہ دم سادھے کماری کی آنکھوں میں جھانک رہی تھی۔اس نے محسوس کیا کہ وہ کماری کے ہردے میں اتر گئی ہے اس سے ایک ہوگئی ہے۔ وہ اس تصور سے کانپ گئی،لرز گئی۔اس نے دیکھا کہ کماری کے ہونٹوں پر ایک ایسی مسکاہٹ تھی جو کہہ رہی تھی کہ تمہاری سب پرارتھنائیں ارپن ہوئیں۔اس کے ہردے سے ایک خیال اتنے دھیرج سے ابھرا کہ اس کے شعور میں آنے سے پہلے ہی وہ اس کے من اور اچیتنیہ پر اس طرح چھا گیا کہ اس کو لگا کہ جیسے خود کماری نے اس کے ہردے میں ڈالا ہو۔ وہ اماوس کی پہلی تین راتوں میں سے کسی ایک رات اس کے روبرو ناچے اور گائے جب تک کہ صبح نہ ہو جائے۔اس نے پورے حواس سے اقرار کیا اور وہ ضرور آئے گی اور ضرور ناچے گی،گائے گی۔

جب وہ واپس سائیس کے پاس پہنچے تو سوشیلا نے سائیس کو چلے جانے کے لیے کہا۔

وہ دونوں گھوڑوں کی راسیں تھامے آہستہ آہستہ چوٹی سے نیچے اترنے لگے، خاموش آدھا رستہ اتر آنے کے بعد سوشیلا گھوڑے پر سوار ہوگئی اور دلکی چلاتے ہوئے پہاڑ سے اتر گئی۔ روی نے بھی اس کی پیروی کی۔

اس نے دیکھا کہ دھوپ حدِ نگاہ تک ہر طرف پھیلی ہے۔ پیلی پیلی دھوپ آنکھوں کو بھلی لگی۔ فضا بالکل شفاف تھی۔ نیلا سنہرا گگن بہت ہی سندر لگ رہا تھا۔ کماری کی درمیانی سڑک پر چلتے پھرتے غریب نرناریاں بھی سندر لگتے تھے۔ اگرچہ ان کے چہروں سے بدحالی ٹپک رہی تھی۔ اکا دکا کوئی نرقیمتی لباس میں سیر کرتا دکھائی دے جاتا تھا۔ مشرق کی طرف کماری کے قصبے کے غریب لوگوں کے پستہ قد، شکستہ گھر صبح کی روشنی میں بہت ہی حقیر نظر آ رہے تھے اور اس کے دل میں بغاوت کے جذبات ابھر آئے۔ اس نے چاہا کہ یہ غریب لوگ سڑکوں پر نکل آئیں اور مطالبہ کریں کہ ان کو پیٹ بھر کر کھانے کو دیا جائے ورنہ وہ سب سے سب کچھ چھین لیں گے مگر اس کے ذہن نے فوراً ان جذبات کا رد پیش کر دیا، یہ غریب لوگ اپنے آپ کو اتنا حقیر اور کمزور جانتے ہیں کہ وہ اس بغاوت کے متعلق ابھی برسوں، صدیوں سوچ بھی نہیں سکیں گے، وہ کملا کے خلاف کچھ کہنے کے لیے تیار نہ تھے، ان کو کملا کی ہر اچھیا قبول تھی، ان کو بغاوت پر اکسانے کے لیے نہ جانے کتنی محنت کرنی ہوگی۔ کون کرے گا یہ محنت؟ اور کیوں؟ مگر بغاوت سے کبھی کچھ ہوا بھی ہے۔ صرف حاکم بدل جاتے ہیں، زندگی کے چلن میں کوئی فرق نہیں آتا۔ پہلے ان کو قائل کرنا ہوگا کہ ان کی زندگی بدلی جا سکتی ہے اور ان کے مرتیو سے پہلے اور وہ خود بھی اس بدلی ہوئی زندگی کا مزا لے سکیں گے۔ ذہن بدلنے کے بعد دل بدلے جائیں تاکہ ان کے کاموں میں استقامت آئے اور وہ ان دیکھے نتائج پر یقین رکھتے ہوئے حال میں عمل پیرا ہوں۔

اس نے سوچا کہ وہ اس کام کو کرنے کی ہمت نہیں رکھتا۔ وہ پہاڑ سے نیچے اتر چکا تھا۔ اس نے گھوڑے کو ایڑ لگائی اور جلد ہی گھر کے پہلے آنگن میں پہنچ گیا۔

سب لوگ ناشتے کے لیے ڈرائنگ روم میں ان کا انتظار کر رہے تھے۔ سوشیلا ابھی اپنے کمرے سے کپڑے بدل کر نہ آئی تھی۔ جب وہ آ گئی تو وہ ناشتے کے لیے کھانے کے

کمرے میں چلے گئے۔ ناشتہ کر چکے تو ٹھاکر شِو آنند نے خانساماں سے پوچھا۔

''رات کرشن کمار کھانے کے کمرے میں کب آئے تھے۔''

''میں برتن صاف کر کے باورچی خانے کا دروازہ بند کر کے اپنے کمرے میں جانے کی سوچ ہی رہا تھا کہ ان کو دور سے آتے دیکھا میں نے سوچا کہ وہ کھانے کے لیے آ رہے ہیں شاید۔ میں رک گیا اور روشنی میں ہو گیا تا کہ وہ مجھے دیکھ لیں۔ انہوں نے مجھے دیکھ لیا اور میری اور چلے آئے۔ میں نے سمجھ لیا کہ وہ کھانے کے لیے آئے ہیں تو میں ان کو کھلے برآمدے سے اندر کھانے کے کمرے میں لے آیا۔ جب ہم داخل ہوئے تو وینا بول رہی تھی۔ وہ اس کرسی پر بیٹھ گئے اور سوشیلا بٹیا نے گانا شروع کیا تو وہ راگ میں کھو گئے میں نے انتظار کیا کہ شاید کھانا مانگیں۔ مگر ان کے چہرے سے میں نے جان لیا کہ ان کو میری ضرورت نہ تھی۔ میں کمرے سے نکل گیا۔ اس کے بعد کیا ہوا وہ مجھے جیوتو وید کے آنے سے پتہ چلا۔

اب کیسے ہیں کرشن جی!''

''ڈاکٹر نے ان کو آرام کرنے کے لیے کہا ہے۔ ابھی تک وہ سدھ بدھ میں نہیں۔ بہت گہری نیند میں ہیں۔''

وہ واپس ڈرائنگ روم میں چلے گئے۔ اتنے میں ایک نوکر نے آ کر اطلاع کی کہ کوئی کرشن کمار سے ملنے کے لیے آیا ہے۔ کہتا ہے کہ وہ ان کے گھر کا خاص ملازم ہے اور یہ کہ اس کے مالک کماری میں ٹھہرے ہیں اور وہاں کرشن جی کو بلایا ہے۔ اس آنے والے کو اندر ہی بلا لیا گیا۔ آنے والا ملازم نہیں لگتا تھا بلکہ کسی دفتر کا بابو لگتا تھا۔ صاف ستھرے گرم کوٹ پتلون، مفلر، بوٹ موزے پہن رکھے تھے۔ آتے ہی اس نے آداب کے بعد اپنا تعارف کرایا۔

''میرا نام وریام ہے۔ میں دھول پور کے تعلقہ دار ٹھاکر وریندر سنگھ کا خاص اردلی ہوں۔ ٹھاکر جی کماری میں ''ویسٹ ویو'' میں ٹھہرے ہیں اور کرشن جی کی تین ہفتوں سے ان کو کوئی اطلاع نہیں پہنچی تھی۔ ان کی ماتا بہت پریشان ہیں۔ ان کا بیاہ مارگ شیرشہ کی بیس

تاریخ کو ہونا ہے۔''

روی نے اس کو تمام حالات سے آگاہ کیا اور اس کے ساتھ جا کر اس کے مالک کو بھی آگاہ کرنے کی پیش کش کی۔

دونوں ویسٹ ویو کی طرف گھوڑوں پر نکلے۔ وہاں پہنچ کر ٹھاکر کو سب کوائف بتلائے اور ان سے کہا کہ بہتر یہی ہوگا کہ وہ ان کے ساتھ شِو کوٹ چلے آئیں اور جب تک کرشن کمار صحت مند نہیں ہو جاتا تو وہیں رہیں۔ انہوں نے بڑے سلیقے سے انکار کر دیا کہ وہ اپنے دوست کی کوٹھی میں ٹھہرے ہیں اور وہاں سے کہیں اور منتقل ہونا مناسب نہیں ہے مگر ان کے ساتھ اپنے بیٹے کو دیکھنے کے لیے راضی ہو گئے مگر یہ کہہ روی کو رخصت کر دیا کہ وہ دوپہر کے بعد وہاں آئیں گے۔ دوپہر کو جب وہ پہنچے تھے تو ان کے ساتھ ایک انگریز ڈاکٹر تھا۔ ٹھاکر شِو آنند اور ٹھاکر ہردے ناتھ نے چوتھے آنگن میں ان کا استقبال کیا اور ان کو کرشن کمار کے کمرے میں لے گئے۔ ڈاکٹر کافی دیر تک ان کا معائنہ کرتا رہا۔ اس کے بعد اس نے روی سے تنہائی میں کرشن کمار کی جذباتی اور جنسی زندگی کے متعلق بہت سے سوال کئے اور جب اس کے اندازے کے مطابق جواب نہ ملے تو اس نے کرشن کمار کی تصاویر کو دیکھنے کی خواہش کی۔ ڈاکٹر اور روی شنکر کمرے میں گئے۔ ڈاکٹر بہت دیر تک تصاویر کو دیکھتا رہا۔ پھر اس نے اس خواہش کا اظہار کیا کہ کمرے کو اسی طرح روشن کیا جائے اور آتش دان میں آگ جلائی جائے جیسے کہ اس رات تھی جب وہ بیمار ہوا۔ تعمیل کی گئی۔ پھر ڈاکٹر نے روی شنکر سے کہا کہ وہ اس کمرے میں تنہا رہنا چاہیں گے۔ وہ وہاں سے چلا آیا اور باہر دھوپ میں ان کا انتظار کرنے لگا۔

کوئی دو گھنٹے کے بعد ڈاکٹر کمرے سے نکلا تو اس کے چہرے پر گہرے الم اور اس کو قبول کر لینے کے واضح آثار تھے جو آہستہ آہستہ معدوم ہو رہے تھے۔ ڈاکٹر کچھ دیر وہیں گھاس پر ٹہلتا رہا اور پھر رک کر روی سے مخاطب ہوا:

''تمہارا دوست بہت اچھا مصور ہے۔ کچھ لوگ اس کو عظیم بھی کہنے میں باک نہ سمجھیں گے۔ اس نے کچھ تصویریں بہت گہرے لطف میں تخلیق کی ہیں، چند ایک بالخصوص، پہاڑ پر

ایک عورت کی اور یک صورت عورتوں اور مردوں کی۔ایسی تصاویر بنانے کے لیے مصور ایک ہی وقت experience کو utter nothingness اور supreme exaltation کرتا رہا ہے۔ اس تجربے سے جانبر ہونا ممکن نہیں تو بہت مشکل ضرور ہے۔ He is a man of great guts.

''کیا یہ دونوں عورتیں موجود ہیں یا دونوں تخیلاتی عورتیں ہیں۔''

''دونوں تصاویر ماڈل کو دیکھ بنائی گئی تھیں۔''

''میرا خیال ہے کہ مریض کو بروقت صحیح دوا اور علاج میسر آ گیا تھا۔ اس کی حالت اب خطرے سے باہر ہے۔ بے سدھ نہیں ہے بلکہ بہت گہری نیند میں ہے جہاں ہندوؤں کے نزدیک خواب نہیں آتے۔ جدید نفسیات کو یہ description حقیقت کے مطابق نظر نہیں آتی کیونکہ خواب کے بغیر انسان کی موت واقع ہو جاتی ہے۔ میں اگرچہ ہندو نفسیات سے اتفاق کرتا ہوں۔ 48 گھنٹے میں مریض کو ہوش آ جانا چاہیے۔ کس نے اس کا علاج کیا تھا؟''

''ایک وید نے جس کو یہ علم اس کے پرکھوں سے ورثے میں ملا تھا۔ اس علاج میں موسیقی بھی شامل تھی۔ ''بہار کا گیت''

''موسیقی اور علاج۔ عجب بات ہے۔ کتنی فلاطونی بات ہے، جیسا بھی ہوا مریض کے لیے بہتر ہوا۔ میرا خیال ہے کہ مریض کو میری ضرورت نہیں ہے۔ موسیقی اگر ایک بار اس کو موت سے بچا سکتی ہے تو پھر اس کی صحت کو بحال بھی کر سکتی ہے۔ شاید؟ نہیں! یقیناً!......

پراچین ہندو (Wise) حکیم تھے۔ میں مریض کے لیے کچھ نہیں کر سکتا۔ اگرچہ صحت یاب ہونے کے بعد میں اس سے ملنا پسند کروں گا۔''

دونوں اٹھے اور واپس ڈرائنگ روم میں آ گئے۔ وہاں ڈاکٹر نے ٹھاکر شو آنند کو اس کے گھر کے فنِ تعمیر پر داد دی اور خواہش کا اظہار کیا کہ وہ دوبارہ، مختلف حالات میں، پیشہ ورانہ حیثیت سے نہیں، بلکہ ایسے انسان کی حیثیت سے جس کو ہندو مذہب اور فلسفے اور جمالیات میں دلچسپی ہے، ملنا چاہے گا۔ ٹھاکر نے اس کو دعوت دی کہ وہ جب جی چاہے

اطلاع کر کے چلا آئے۔ اس کے آنے سے ان کو راحت ملے گی۔ ٹھاکر وریندر سنگھ ڈاکٹر کے ہمراہ چلے گئے اور صبح آنے کا کہہ گئے۔

چند دنوں میں کرشن ہوش میں آ گیا اور ہفتے بھر میں چلنے پھرنے کے قابل ہو گیا۔ اس کے بعد باپ کے ہمراہ جانے کے لیے تیار ہو گیا۔ جس دن وہ جانے لگا تو اس نے ٹھاکر شِو آنند سے درخواست کی وہ چتر شالا میں لگی ان تصویروں کو قبول کر لیں تو انہوں نے جواب دیا۔

''یہ تمہاری امانت رہیں گی ہمارے پاس۔ یہ اسی کمرے میں اسی طرح ٹنگی رہیں گی جس طرح تم نے ان کو ٹانگا تھا۔ یہ، بقول روی، تمہارا بہترین کام ہے اس سے تمہیں محروم رکھنا کسی طرح بھی جائز نہیں ہے۔ تم اپنی پیش کش پر دوبارہ غور کر و اور سال بعد جو بھی تم کہو گے مجھے منظور ہو گا۔''

رخصت ہونے سے پہلے اس نے ارملا کا شکریہ ادا کیا کہ اس کا بہترین کام اس کی شخصیت اور سوشیلا کی شخصیت کے اثر کے سبب ممکن ہوا۔ سوشیلا سے اس نے یہ کہہ کر معافی طلب کی:

''میں نے آپ کے ساتھ جس قسم کا سلوک کیا اس کے لیے میں شرمندہ نہیں ہوں کیونکہ یہ طرزِ عمل میری پوری شخصیت کا بھرپور اظہار تھا مگر اس کے سبب جو دکھ آپ کو پہنچا (میں جانتا ہوں کہ آپ کو دکھ پہنچا) اس کے لیے معافی مانگنا اپنا فرض سمجھتا ہوں اور اگر آپ نے مجھے معاف نہ کیا تو مجھے عمر بھر شاق گزرے گا۔''

''معافی تو مجھے مانگنی چاہیے کہ میرے کارن تم نے واقعی دکھ اٹھایا اور وہ بھی بہت کٹھن۔ معاف کر دو۔ میں بھی تمہیں معاف کرتی ہوں اگرچہ جو دکھ تم سے مجھے پہنچا ہے وہ مجھے بہت عزیز رہے گا۔''

کرشن نے مسکراتے ہوئے کہا: ''معاف کیا'' ایک بار پھر آنے کی اجازت دو تو بیوی کو لے کر آؤں۔ میں چاہوں گا کہ وہ ارملا اور تم دونوں سے ضرور ملے۔''

''ضرور چلے آنا۔''

اس کے چلے جانے کے بعد اس کے پتا اس کو اماوس کی راتوں کے بعد گھر لے گئے۔

ٹھاکر نے چندر بھان کے پاس جانے کی تیاری مکمل کر لی تو دوسری جنگِ عظیم چھڑ گئی۔ ٹھاکرانی نے ان کو جانے نہ دیا۔ جنگ کے دوران بھی چندر بھان کے خط ان کو باقاعدگی کے ساتھ مگر مہینے میں ایک بار ملتے رہے۔ اس کے آخری خط میں ان کو اطلاع ملی کہ فرانس میں ہے مگر فرانس کی شکست کے بعد ان کو چندر بھان کی کوئی اطلاع نہ ملی۔ مگر پھر بھی ان کو پورا وشواس تھا کہ چندر بھان زندہ ہے اور کسی بہت اہم کام میں مصروف ہے۔

پانچواں باب

پتا کے ساتھ واپس گھر جانے کے چند ہی دنوں میں انہوں نے سوشیلا کو بتایا کہ ''میں نے تمہارے خطوں کو ہمیشہ بہت غور سے پڑھا جس کا اندازہ تم نے ان خطوں سے یقیناً لگایا ہوگا جو میں تمہیں جواب میں لکھتا رہا ہوں۔ ایک مسئلے پر میں نے بہت غور کیا اور کچھ عرصہ پہلے میں نے اس سلسلے میں بہت سے اہم فیصلے بھی کئے ہیں۔ زمین کی ملکیت اور اس سے پیداوار حاصل کرنے اور اس کی تقسیم کے بارے میں جب میں نے غور کیا تو میں اس نتیجے پر پہنچا کہ زمین کسی کی بھی ملکیت نہیں ہوسکتی، جس طرح ہوا، پانی اور رنگ، آکاش، گگن کیونکہ کسی پُرش نے اس کو پیدا نہیں کیا اور زمین پر ہل چلانے، زمین کو تیار کرنے اور اس میں بیج ڈال دینے سے ہی فصلیں، پھل، پھول پیدا نہیں ہوجاتے۔ اس کے لیے ہوائیں، بارش، موسم، زمین کی پالن ہاری، بیج اور زمین کے ملاپ سے بیج میں سے کچھ پھوٹ نکلنا کسی بھی پرش کے قابو میں نہیں اور نہ ہی وہ ان سب کے قوانین کا پیدا کرنے والا ہے جس کے کارن بیج مر جانے کے بعد دھرتی سے نئے نئے روپ میں نکل آتا ہے اور پروان چڑھتا ہے۔ اس کے لیے پرش کے ساتھ بہت آکاشی شکتیوں کی محنت اور کوشش شامل ہے۔ ہل چلانے والا، زمین تیار کرنے والا اور بیج ڈالنے والا اس میں پیدا ہونے والی فصل میں سے اتنا ہی لینے کا ادھیکاری ہے جو خود اس کی محنت اور کوشش کے سبب پیدا ہوا۔ اس کا فیصلہ حساب کی زبان

میں تو ممکن نظر نہیں آتا لیکن یہ تو شک کے بغیر کہا جا سکتا ہے کہ اس میں ہوا، موسم، بارش بیج اور زمین کی پالن ہاری کا حصہ زیادہ ہے۔ لہٰذا سوال یہ پیدا ہوگا کہ ان شکتیوں کا حصہ کسے دیا جائے۔

تمہیں یاد ہوگا کہ جس دن ہم تم نے پہلی بار باتیں کی تھیں تو ایش اپنشد میں نے پڑھ کر تمہیں سنایا تھا اور اس کے پہلے منتر ہی میں ملکیت کی بات کی گئی ہے۔ میں نے جو کچھ کہا ہے اس کے مطابق کسی بھی پرش کی ملکیت اتنی ہی ہوگی جو صرف اس کی محنت سے پیدا ہوئی۔

اس لیے میں نے فیصلہ کیا ہے:

i) میں خود ان زمینوں پر اپنے ہاتھ سے محنت کروں گا جو صدیوں سے ہماری ملکیت کہلاتی ہے۔ اس میں میرے بیٹوں میں سے جو بھی میری مدد کرے گا اس کو بھی اس کی محنت کا صلہ دیا جائے گا۔

ii) جتنی زمین ہم سب خود کاشت نہ کر سکیں گے اس کو ان لوگوں کے سپرد کر دیں گے جو اس پر کاشت کرتے ہیں اور وہ اس میں سے اتنا ہی حصہ لیں جتنا اُن کی محنت کا صلہ ہو۔ لہٰذا ان کو سمجھایا جائے کہ میں ایسا کیوں کر رہا ہوں اور اس زمین میں سے ان کا صلہ کتنا بنتا ہے۔

iii) جو کچھ ہمارے صلے سے زائد ہوگا اس کو ایک جگہ اکٹھا کیا جائے اور اس کو جنس کی شکل میں یا اس کی بازاری قیمت کی شکل میں ان لوگوں کے لیے محفوظ کر دیا جائے جو کوشش کے باوجود اتنا نہیں کما سکتے کہ وہ اپنے شریر اور من اور چیتنیہ کی ضرورتوں کو پورا کر سکیں۔

v) ایسے لوگوں کو بھی سمجھایا جائے گا کہ ان کے ساتھ جو سلوک کیا جا رہا ہے وہ کیوں کیا جا رہا ہے۔ ایسی تعلیم کے لیے ایک اسکول بھی زمینوں پر ہی بنایا جائے۔

یہ ساری باتیں میں نے تمہارے بھائیوں کو بھی بتائی ہیں اور ان میں سے بڑے چاروں نے مجھے بتایا ہے کہ وہ زمینوں سے کسی قسم کی توقع نہیں رکھتے کیونکہ وہ اپنی ملازمتوں

کی وجہ سے اس کام میں شامل نہیں ہو سکتے۔ چھوٹے تینوں نے اس میں شریک ہونے کی اچھیا کا اظہار کیا ہے۔ تینوں اس کام میں میری بہت مدد کر سکتے ہیں۔ ایک تو زراعت کی تعلیم حاصل کر چکا ہے، دوسرا اگلے سال ڈنگر ڈاکٹر ہو جائے گا اور سب سے چھوٹا دو سال میں metallurgical انجینئر ہو جائے گا۔ ہم چاروں مل کر زمینوں کے ایک بڑے حصے میں نئی ودیا کی روشنی میں کاشت کر سکیں گے اور اس کے لیے یتنتر بنا سکیں گے۔

میں نے زمینوں پر اپنے رہنے کے لیے ایک بڑا سا گھر بھی بنوالیا ہے اور اس کے لیے اتھنول (Ethanol) بجلی گھر بھی منگوا لیا ہے۔ میں چاہتا ہوں کہ اس سال اس سارے پروگرام پر عمل درآمد شروع کر دیا جائے۔ اسکول تمہارے سپرد ہوگا۔ جب چندر بھان آ جائے گا تو پھر تمہارے تینوں بھائیوں کی استریاں اس کام کو سنبھالیں گی۔ بھائیوں کے لیے استریاں بھی تم ہی تلاش کرو گی۔

اس کٹھن کام کے لیے میں نے یہ بھی فیصلہ کیا ہے کہ ہم تم اگلے مہینے سے زمینوں پر ہی رہا کریں اور اپنے مزارعوں سے، ہم تم کھل کر بات کریں گے تاکہ وہ بھی اس پروگرام کو اچھی طرح سمجھ لیں اور جب پروگرام شروع ہو تو پھر ان کا مکمل تعاون ہمیں حاصل ہو۔

یہ ننھا سا تجربہ تمہاری physics کی زبان میں کسی بہت بڑے پروگرام کا Nucleus بن سکتا ہے، بن سکے گا۔ تمہیں اس پروگرام سے اتفاق ہے؟''

آپ نے میرے دل کی بات اچک لی اور پہل کر دی۔ وِوا کے بعد میرا بھی اسی قسم کا پروگرام تھا اگرچہ بعض معاملوں میں آپ کی سوچ مجھ سے زیادہ صاف اور مربوط ہے۔ یہ بات تو میری سمجھ میں بہت پہلے آ گئی تھی کہ کوئی بھی زمین کا مالک نہیں ہو سکتا چاہے وہ کوئی ریاست یا پوری انسانیت ہی کیوں نہ ہو۔ لیکن میں اس نتیجے پر پوری وضاحت سے نہ پہنچ پائی تھی کہ زمین سے جو فصل حاصل ہو گی اس کی تقسیم کیسے ہو اور کیوں۔

اب جب آپ نے ایک مربوط پروگرام بنا لیا ہے تو پھر میں بھی اس میں شریک ہونا ضرور پسند کروں گی۔ utopia کو سماجی حقیقت بنانے کا میرا ہمیشہ سے ایک پروگرام رہا ہے۔ ارملا کے ساتھ بھی اس معاملے میں بڑی لمبی بات چیت رہی ہے۔ اس کو بھی اس پر

اتفاق ہے۔ چندر بھان کے آنے تک ہم نے ایک نئے سماج کی نیو رکھ دی ہوگی اور اس کے پہلے پھل ہمارے سامنے آ چکے ہوں گے۔ میں اب اس دن کا بے تابی سے انتظار کروں گی جس دن ہم ہریش پور پہنچیں گے۔ یہ جو پچیس دن ہیں میں ان کے دوران میں اسکول کے لیے ایک اسکیم تیار کرلوں گی۔''

اس پروگرام کے سبب ان کے گھر میں بہت سرگرمی تھی کیونکہ کچھ بہوؤں کو اس پر شدید اعتراض تھا اگرچہ اپنے خاوندوں کے دلائل کے جواب میں ان سے کچھ بن نہ پڑ رہا تھا، بن بھی کیسے سکتا تھا جبکہ اس پروگرام کے بنیادی اصول نہایت ہی واضح اور حقیقت کے عین مطابق تھے اور ان پر کسی قسم کا عقلی یا ویدک اعتراض ان سے ممکن ہی نہ تھا۔ لہٰذا ساری سرگرمی زیرِ زمین قسم کی تھی جو بھونچال نہ بن سک رہی تھی، جس کے بھونچال بن جانے کی توقع ان کو بھی نہ تھی، مگر چپ چاپ قبول کر لینے کی ہمت بھی ان میں نہ تھی۔

اس گفتگو کے بعد اٹھتے بیٹھتے حتیٰ کہ سوتے ہوئے بھی وہ تعلیم و تربیت کا ایک پروگرام سوچتی رہتی۔ دن رات وہ اس کے مختلف پہلوؤں پر سوچتی اور اپنے وسیع و عریض باغ میں دن کا بیشتر وقت ٹہلتی، خود کلامی کرتی رہتی۔ جب ان کے ہریش پور جانے میں صرف دس دن رہ گئے تو ایک رات اس نے آدھی رات کو لکھنا شروع کیا اور صبح ہونے تک اس پروگرام کا ڈھانچہ تیار کرلیا۔ دس صفحے تھے مگر ایسے دس صفحے جس نے اس کے اندر ایسی ہلچل مچا دی کہ اس کے لیے آرام کا تصور کرنا بھی محال ہوگیا۔ وہ اس ڈھانچے کے ہر پہلو پر پہلے اعتراض کرتی اور اس کی ایک ایک شق کا رد کرتی اور پھر اس رد کا رد۔ چھ دن رات اس کام میں بھی گزر گئے۔ اس کے بعد اس نے ان دلائل اور ان کے رد کی روشنی میں مفصل پروگرام تیار کرڈالا۔ پھر اس پروگرام کا تخیل ہی تخیل میں ہریش پور کے بڑے بوڑھوں، عورتوں، جوان، بچوں پر اطلاق کرتی رہی۔ یہ سب کام اس نے نو دنوں میں مکمل کرلیا۔ آخری دن وہ سارا دن سوتی رہی۔ سہ پہر ہوئی تو گرم پانی سے اشنان کیا اور اس کی ساری تھکن دور ہوگئی اور اس کو اپنے اندر شکتی کا اتنا بھرپور احساس ہوا کہ اس پر ایک وجد کا عالم چھا گیا، جس نے اس کو اس حالت میں دیکھا اس نے محسوس کیا جیسے مہا بھارت کی جنگ اس نے جیت لی ہو اور بغیر

کسی کشت وخون کے۔ اس کے پاؤں زمین پر نہ ٹکتے تھے اور لگتا تھا کہ اس نے کوئی نیا رقص ایجاد کرلیا ہے جو روزمرہ کی عام زندگی کے ہر لمحے کا روپ اختیار کرسکتا ہے۔ وہ شکتی اور سندرتا کا ایک ناممکن روپ دکھائی دی جس کے ہونے پر اعتبار نہ آتے ہوئے بھی ہر ایک کو اعتبار کرنا پڑا۔ وہ اپنے حواس کو جھٹلا نہ سکتے تھے۔

شام کو اس نے اپنے والد کو وہ اسکیم پڑھنے کے لیے دیدی۔ وہ آدھی رات تک پڑھتے رہے اور اس کے بعد وہ گہری نیند سو گئے اور صبح اٹھتے ہی انہوں نے شِو کے حضور پرارتھنا کی۔ ان کی پرارتھنا میں آنند کے ساتھ ایک شکتی کا گھال میل تھا جس پر وہ کچھ دیر کے لیے حیران ہوئے مگر بعد میں وہ اس شکتی وان آنند میں جذب ہوگئے۔

ناشتہ کرنے کے بعد ماتا پتا، بیٹا اور بیٹی اپنے گھر سے اس طرح رخصت ہوئے کہ جیسے ایک دور دراز تیرتھ پر جارہے ہوں جس سے شاید برسوں میں واپسی ہو۔ ان کے ساتھ اتنا سامان تھا کہ ہریش پور کے واسی حیران ہوئے کہ ٹھاکر کیا کرنا چاہتے ہیں۔ اس پر پورے علاقے (ہریش پور چھوٹے بڑے بارہ گاؤں پر مشتمل تھا) میں سنسنی خیز سوچ کی ایک لہر اٹھی اور سب پر چھا گئی۔ چند دن تک تو ٹھاکر اپنے نئے گھر میں سامان کو رکھوانے میں اور اس کے بعد آرام کرنے میں مصروف رہے۔ اس کے بعد انہوں نے اپنے منشی کو بلایا اور ایک دعوت کا انتظام کرنے کو کہا جس میں ہریش پور کے ہر اہم کاشتکار اور پٹہ دار کو بمع پتنی مدعو کرنے کی ہدایت کی۔ جب لوگوں کو دعوت کے بلاوے پہنچے تو ایک اور سنسنی پھیلی اور سوچ کے گھوڑے نہ جانے کن کن صحراؤں اور بنوں میں دوڑائے گئے۔ مگر کسی کی سمجھ میں نہ آیا کہ ٹھاکر کیا کرنے والے ہیں یا ان سے کس قسم کا مطالبہ کرنے والے ہیں۔ مگر ایک بات کا ہر ایک نے اپنے آپ سے اقرار کیا کہ جو ہو اس میں کسی زیادتی یا ظلم کا شائبہ تک نہ ہوگا۔ ٹھاکر نے ہمیشہ ان کے ساتھ مروج قانون اور رواج کے مطابق نہ صرف نیائے ہی کیا تھا بلکہ اس سے بھی کچھ زیادہ ہی ان کو دیا تھا۔

دعوت کے سندیسے میں اور دعوت کی رات میں 15 دن کا وقفہ تھا اور اس عرصے میں منشی اور اس کے کارندوں نے دعوت کے لیے جو سامان خریدا اس سے لوگوں کو اور اچنبھا ہوا

کہ دعوت بہت ٹھاٹ دار کیوں کی جارہی ہے۔ ان کو گمان گزرا کہ بعد میں دوسرے زمینداروں کی طرح ٹھاکر بھی دعوت کا خرچہ ان سے وصول کرے گا مگر اس کے پچھلے چالیس سال کے برتاؤ سے انہیں ایسی بات کا سوچنا بھی بے جواز نظر آیا۔ اتنے خرچ سے زمیندار بیٹے بیٹیاں بیاہتے ہیں اور یہ ٹھاکر بغیر کسی مقصد کے تو خرچ نہیں کر سکتا۔ آخر اس کا مقصد کیا تھا۔ یہ کسی کے ذہن میں نہ آ رہا تھا اور مردوں کے ساتھ ان کی پتنیاں بلانے کا ڈھنگ بھی کچھ انوکھا سا تھا اگرچہ عورتیں اس سے بہت خوش تھیں۔ آخر کوئی طے نہ کر پایا کہ مقصد کیا ہے اور وہ رات آ گئی۔

ٹھاکر منڈل پر خود ہر ایک کا سواگت کر رہا تھا اور عورتوں کے خیمے میں ٹھاکر کی بیٹی۔ جب سب مہمان آ چکے تھے ٹھاکر نے اٹھ کر کہا:

''ہریش پور کے واسیو! میں اب آپ لوگوں کے درمیان رہا کروں گا۔ اس لیے آپ لوگوں کو اپنے یہاں میں نے کھانے پر بلایا ہے۔ مجھے آپ سے کچھ نہیں لینا۔ اس لیے آپ پورا وشواس لے کر کھانا کھائیں۔ یہ خرچا میں نے اس لیے کیا کہ میں اپنی آئندہ کی زندگی کے بارے میں آپ کو بتانا چاہتا ہوں کہ میں اس علاقے میں کس طور زندگی گزارنا پسند کروں گا اور اس سلسلے میں آپ کا تعاون کس طرح سے چاہتا ہوں۔ میں پھر آپ کو یقین دلاتا ہوں کہ اس تعاون میں آپ کا کچھ خرچ نہ ہوگا اور نہ ہی اس کے لیے کوئی بیگار کرنی ہوگی۔ میں نے اپنے چالیس برس کے برتاؤ میں اس طرح کا کوئی کام نہیں کیا اور نہ آنے والے وقتوں میں ایسا کرنے کی سوچ سکتا ہوں۔ آپ سب لوگ فارغ ہو لیں اور جب مری بات سننے کے لیے آپ تیار ہو جائیں تو مجھے بتا دیں۔ تب میں اپنے من کی بات آپ سے کروں گا اور پھر اس بارے میں آپ کی باتیں سنوں گا۔

اب آپ آئیں کھانا کھائیں۔ جب سب کھا چکے تو وہیں بیٹھے بیٹھے ایک دوسرے سے اشاروں اشاروں میں باتیں ہوگئی کہ نجانے ٹھاکر کیا کہے۔ بہرحال ایک وقت آیا کہ انہوں نے طے کیا کہ اب ٹھاکر کی بات جان لینا ہی بہتر ہے۔ لہٰذا سب واپس منڈل میں آ گئے۔ ٹھاکر نے جب دیکھا کہ سب لوگ آ گئے ہیں تو اس نے بیٹی سے پوچھا کہ ناریاں

بات سننے کو تیار ہیں۔ جب وہاں سے اشتیاق کا اظہار ہوا تو ٹھا کر مسکرایا اور بولا

''اپنے من کی بات کرنے سے پہلے میں آپ سے کچھ سوالات کرنا چاہوں گا۔ تا کہ مجھے اپنی بات کرنے کے لیے زمین کے مزاج کا اندازہ ہو جائے۔

یہ بتائیں کہ اگر میں آپ سے کہوں کہ جو کچھ آپ نے میری زمینوں سے کمایا ہے وہ مجھے دے دیں تو آپ کو کیا اعتراض ہوگا اور کیوں؟''

سب نے ایک دوسرے کی طرف دیکھا جیسے کہ کہہ رہے ہوں کہ یہ تو دوسرے زمینداروں کے پیچھے چل نکلا۔ مگر سب نے سورج مکھ کی طرف دیکھا کہ تم جواب دو۔ اس نے کہا:

''ہم آپ کو آپ کا مقررہ حصہ دے دیتے ہیں اور باقی اپنی محنت کا صلہ سمجھ کر رکھ لیتے ہیں اور آپ کو بھی اس پر کبھی اعتراض نہیں ہوا۔ اس لیے اب آپ کو ہماری محنت کے کمائے ہوئے پر کوئی ادھیکار نہیں ہوسکتا۔''

''تو بات یہ بنی کہ چونکہ یہ سب کچھ آپ نے اپنی محنت سے کمایا اس لیے آپ سے نہ لیا جانا چاہیے۔ مجھے آپ سے اتفاق ہے۔

مگر یہ تو بتائیں کہ آپ کیا کرتے ہیں اور اس کے عوض جو کچھ لے جاتے ہیں کیا وہ سب کچھ آپ ہی کی محنت کا نتیجہ ہوتا ہے؟''

''جی ہاں''

'' کیسے؟ اگر زمین بنجر ہو، اس میں سیم یا تھور ہو تو آپ کی محنت سے کیا پیدا ہوگا؟ اگر وقت پر ہوا نہ چلے، بارش نہ ہو، اگر زمین بیج کی پرورش نہ کرے تو کیا ہوگا۔''

''فصل نہ ہوگی اور ہماری محنت اکارت جائے گی اور جڑ ہی ماری جائے گی۔''

''تو پھر آپ کو ہوا کی، بارش کی، زمین کی پالن ہاری کی مدد کی ضرورت رہتی ہے۔''

''ہاں!''

''اگر آپ کی فصل تیار ہو اور آندھی آ جائے بھونچال آ جائے تو آپ کی محنت اکارت

چلی جائے گی نا؟''

''بالکل۔''

تو پھر یہ سب کچھ آپ کی اپنی محنت پر بھاری ہوا۔ ہوا، بارش، زمین کی پالن ہاری کا مالک اور حاکم آپ کے ساتھ محنت کرتا ہے۔ اس کا حصہ دینا چاہیے یا نہیں، اگر نہیں تو کیوں اور اگر دینا ہے تو کتنا۔''

خاموشی چھا گئی۔ صلابت خان بولا۔

''رب تو ہر شے کا پیدا کرنے والا ہے، اس کا مالک اور حاکم۔ وہ مہربان نہ ہو تو ہماری ساری محنت کسی کام کی نہیں۔ لیکن وہ تو اپنا حصہ مانگتا نہیں۔ مانگ لے تو دینا پڑے۔ آدھے سے بھی زیادہ ہوگا۔''

مولوی سلامت علی علاقے کے سب سے زیادہ پڑھے لکھے تھے، عربی، فارسی پڑھانے کے لیے کئی زمینداروں کے یہاں جاتے تھے، بولے:

''یہی بات تو رب تعالیٰ قرآن میں کہتا ہے اور اپنا حصہ مانگتا ہے اور کہتا ہے کہ میرا حصہ تم خود طے کرو کہ کتنا بنے گا اور وہ ان لوگوں کو دے دو جو کوشش کے باوجود اتنا نہ کما سکیں کہ ان کی حاجتیں پوری ہو سکیں یا جن کا چلتا کاروبار بند ہو گیا ہے۔

آپ نے آج بات کی ہے تو مجھے خیال آیا ہے کہ ہم مسلمان اس حکم پر صدیوں سے عمل نہیں کر رہے ہیں اور دکھ اٹھا رہے ہیں۔ اللہ آپ کا بھلا کرے کیا بات یاد دلائی۔''

''میں نے تو یہ بات قرآن سے نہیں لی۔ خود سوچ بچار کر کے پائی ہے۔ قرآن جو کہتا ہے تو صحیح ہی کہتا ہے۔ مالک اور حاکم اور پیدا کرنے والے کا حق تو دینا ہی ہوگا۔ تو میری اسکیم پر مسلمانوں کو اعتراض نہیں ہونا چاہیے۔ کیا ہوا ہم چلاتے ہیں، بارش ہم برساتے ہیں، بیج کو زمین میں ہم پالتے ہیں۔ نہیں بالکل نہیں؟ کیا زمین انسانوں نے پیدا کی ہے؟''

''ہرگز نہیں!'' وریام گوجر بولا

''تو پھر ہم اس کے مالک کیسے اور کیوں بن جاتے ہیں۔''

''اس کا جواب تو ہم نہیں دے سکتے کیونکہ ہریش پور میں سب زمینیں آپ کی ہیں۔''

''آج تک تو ایسا ہی تھا۔ اسی بات سے وہ بات نکلتی ہے جو میں آپ سے کرنا چاہتا ہوں۔''

میں تمام زمینوں پر اپنی ملکیت کا دعویٰ چھوڑنے کے لیے تیار اور اپنے لئے صرف اتنی زمین رکھنے کے لیے تیار ہوں جتنی میں اور میرے پتر خود اپنے ہاتھوں کی محنت سے کاشت کر سکیں۔ اور اسی طرح میں چاہوں گا کہ بقیہ زمین بھی ان لوگوں میں تقسیم کر دوں جو اپنے ہاتھوں سے کاشت کرتے ہیں اور زمین سے سب سے زیادہ فصل حاصل کر رہے ہیں اور زمین کو کمزور بھی نہیں کرتے۔ لیکن شرط یہ ہے کہ ہر شخص جس کو خود کاشت کے لیے زمین ملے وہ اس میں سے زمین کے پیدا کرنے والے، ہواؤں کے چلانے والے، وسنت کے بعد گریشم، برکھا، شَرَد، ہیم اور شُشر ا اوش لانے والے کا حصہ نکالے کہ اس کو ان کے لیے خرچ کیا جائے جو محنت کر کے کھانا چاہتے تو ہیں مگر ان کو کام نہیں ملتا، اگر ملتا ہے تو اس سے اتنا نہیں ملتا کہ روٹی کپڑا چلا سکیں اور اگر ان کے پاس کام تھا تو بند ہو گیا ہو۔

یہ حصہ سب مل کر اکٹھا کریں گے اور سب مل کر سوچیں گے کہ اس مال کو کس طرح خرچ کیا جائے کہ اس کا پھل زیادہ سے زیادہ ہو۔

آپ لوگ میری اس بات پر اپنے پری واروں سے مل کر سوچیں اور ایک مہینے بعد بتائیں کہ آپ اس بات کو ماننے کے لیے تیار ہیں اور اس پر عمل کرنے کے لیے بھی۔

اگر آپ سب کا فیصلہ یہی ہوا کہ میری بات آپ کو قبول ہے تو پھر ہم اور آپ لوگ اس کو طے کریں گے کہ کس کس کو زمین ملے اور جو لوگ بے کار ہو جائیں گے ان کو کوئی دوسرا کونسا کاروبار یا کام دیا جائے کہ وہ پہلے کی طرح نہ صرف روٹی کپڑا حاصل کریں بلکہ اپنے بچوں کو تعلیم بھی دلائیں۔

میں آپ کے لیے اسکول بھی بناؤں گا جہاں سب کو کچھ دیئے بغیر پڑھایا جائے، نہ صرف بچوں کو بلکہ بڑے بوڑھوں کو، جوانوں کو، ناریوں کو، بچیوں کو۔ اس کے لیے میری پتری نے کہ بہت گیانی ہے آپ لوگوں کو پڑھانے کے لیے ایک بندوبست تیار کیا ہے جس

میں آپ کو ا، ب، پ سے پڑھانا شروع نہیں کیا جائے گا بلکہ خود آپ کی ان باتوں سے جو آپ لوگ چلتے پھرتے، گھر میں، کھیتوں میں، دوسروں کے ساتھ کرتے ہیں۔ بچوں کو بھی اسی طرح پڑھنا لکھنا سکھایا جائے گا کہ وہ جلد پڑھ لکھ جائیں۔ اس پڑھائی سے اس کے کھیتی باڑی کے کاموں میں کوئی کھنڈت نہیں پڑے گی۔ کھیتی باڑی، جانور پالنا اور اس سب کچھ جس کی کسانوں کو، گوجروں کو، گلہ بانوں کو ضرورت ہوتی ہے۔ ودیائیں بھی سکھائی جائیں گی۔ جب یہ بچے، نوجوان، بچیاں، ناریاں پڑھ جائیں گے تو آپ کی مدد کریں گے۔ اس طرح پڑھے لکھے بابو نہ بنیں گے اور شہر نہ بھاگ جائیں گے بلکہ یہیں رہیں گے اور دوسروں کی مدد کریں گے۔

اب آپ لوگ جو پسند کریں وہ کریں۔

رات بہت ہو چکی تھی۔ باہر چاندنی کھلی تھی۔ ہوا چلنے لگی تھی۔ اس میں ٹھنڈک تھی وہ کچھ سمے کے لیے تو بھلی لگی مگر کچھ دیر بعد ٹھنڈک بڑھ گئی اور بستر اور کھیس کی ضرورت کا احساس دلانے لگی۔ چاندنی میں ہر شے واضح اور الگ بھی نظر آئی تھی اور گرد و پیش سے مربوط بھی۔ ہندو اور مسلمان اپنے اپنے ڈھنگ سے ٹھاکر کی بات کی جانچ پڑتال کرنے لگے۔ مسلمان خوش تھے کہ ٹھاکر نے قرآن کی بات کو صحیح مان لیا ہے اور ساتھ ساتھ اس کی بات بوجھل اور پابند کرنے والی بھی محسوس ہوئی۔ لہٰذا ناگوار بھی۔ مگر دونوں احساس ایک ہی دل اور دماغ میں پروان نہ چڑھائے جاسکتے تھے۔ دونوں میں ایک کا بلیدان دینا ہی ہوگا۔ ٹھاکر کے وچار کو مان لینے اور اپنا لینے میں فائدے زیادہ تھے اور نقصان کم۔ اب ان لوگوں کو دینا ہوگا جن کو وہ حقارت کی نظر سے، رحم کی نظر سے دیکھتے تھے یا جن کی حالت پر وہ رحم کھاتے تھے اور جن سے اپنے آپ کو بہتر اور اونچا سمجھتے تھے۔ وہ بھی ان کے برابر آ جائیں گے۔ آخر اس میں نقصان بھی کیا تھا وہ ان کی وجہ سے ان کے برابر آ جائیں گے۔ اس سے تو ان لوگوں کو انکار نہ ہوگا اور اگر انکار کر بھی دیں تو بھی کیا فرق پڑے گا جب ان کے پلے سے تو کچھ جائے گا نہیں۔

اس طرح سوچتے وہ سب لوگ گھروں کو چل دیئے اور اگلا مہینہ اٹھتے بیٹھتے سوتے

جاگتے ٹھاکر کی باتوں پر وچار کرتے رہے اور یہ بھی کہ ٹھاکر کو اس میں کیا فائدہ ہوگا کہ ٹھاکر نے اپنا نقصان تو نہیں سوچا ہوگا۔ مگر پھر بھی ان کے ساتھ کسی طرح کی شرکت کا تصور تھا انوکھا اور بھلا۔ اب ٹھاکر بھی ان کے ساتھ صبح سویرے گھر سے نکلا کرے گا اور زمین تیار کر کے اس میں ہل چلایا کرے گا اور بیج ڈال کر اس کی حفاظت کیا کرے گا۔ وہ زمیندار سے کسان بن جائے گا اور اس کے پڑھے لکھے بچے بھی۔ اس کے ساتھ علاقے کے معاملوں میں فیصلوں میں اس کے برابر کے شریک ہو جانے کا خیال دل کو کس اور اڑا تا تھا کہ آنے والے وقتوں کے دھیان میں دور دور تک نکل جاتے تھے۔ مگر اس طرح وہ اپنی زندگی کے ہر معاملے میں بھی اپنی ذات میں ذمے دار ہوں گے اور کسی بات کے لیے نہ کملا کو اور نہ قسمت کو الزام دے کر کسی دکھ کو اپنے دل و دماغ سے اتار، فارغ پھر سکیں گے۔ اس ذمہ داری کے تصور سے ان کے دل میں ہول سا اٹھتا اور گھبرا جاتے اور چاہتے کہ کسی دوسرے معاملے میں اپنے آپ کو الجھا لیں مگر یہ خودمختاری، ذمہ داری اور شرکت کے تصورات ان کے اردگرد اس طرح پھرنے اور لبھانے لگے جیسے جوانی کے آنے کے ساتھ ساتھ جوان ہوتی ہوئی ناریوں کی چال، ان کے پائل کی جھنکار، ان کے کولہوں کی مٹک، ان کی مسکاہٹ، ان کے نینوں کی حیرانی، چلتے چلتے ان کے شریروں کا تناؤ۔ کبھی ان تصورات سے مکھ موڑ کر سو جانے اور سوئے رہنے کی خواہش ان کے بھیتر جنم لیتی اور کبھی ان تصورات سے گھل مل جانے کی خواہش تیز ہو جاتی۔ دن، ہفتے گزرنے کے ساتھ ان تصورات، خیالات، جذبات نے ان کے دل میں گھر کر لیا اور انہوں نے محسوس کرنا شروع کیا کہ ان کی چال میں ایک تیزی، ان کے جسموں میں ایک تناؤ آ گیا ہے اور ان کے شانوں پر بوجھ ہلکا محسوس ہونے لگا ہے؛ اب وہ عام رستوں سے ہٹ کر اجنبی راستوں پر چلنے لگے ہیں اور اجنبی راستوں پر چلنے سے ان کے دل میں ہلکی ہلکی خوشی اور ہلکے ہلکے درد کے گھلے ملے احساسات جاگنے لگے ہیں۔ ان میں ان کو مزا سا ملنے لگا۔ جب مہینے کی مدت میں چند دن رہ گئے تو کئی ایک کا دل چاہا کہ وہ ٹھاکر کے پاس چلے جائیں اور اس سے کہہ دیں کہ ان کو اس کی تجاویز منظور تھیں۔

عورتوں کا حال اس سے بھی عجیب تھا۔ ان کے کھلی آنکھ کے خوابوں میں نئے رنگ اور

نئے آہنگ آنے لگے۔ گھر کے کام کرتے کرتے ان کے ہاتھ رک جاتے اور وہ کسی خوش آئند منظر میں کھو جاتیں۔ اور پھر جاگ کر اپنے آپ پر مسکرا دیتیں، گھر سے باہر آتے جاتے ان کو لگتا کہ مردوں کی آنکھوں میں ان کے لیے ایک حجاب، ایک احترام آ گیا ہے، وہ ان سے بھی کسی اور لبھانے والی شے میں گم ہیں۔ کسی نوجوان ناری کا جوان لڑکے سے کسی کھیت، منڈیر پر، کنوئیں پر آتے جاتے آمنا سامنا ہو جاتا تو اس کو محسوس ہوتا کہ جیسے اس نے خود اپنے اوپر کوئی پردہ ڈال لیا ہو یا اپنی آگ کو راکھ میں کسی دوسرے وقت کے لیے محفوظ کر لیا ہو۔

ہر ناری کی سوچ اور بھاؤ نا میں کہیں سوشیلا کا وہ روپ سروپ بھی تھا جب وہ ان کو بتا رہی تھی کہ وہ ان کو اسکول میں خود پڑھایا کرے گی اور ان کو کئی قسم کے ایسے کام سکھائے گی جو ان کے آنے والے جیون میں بہت کام آئیں گے۔ اس کا سیدھا ستواں شریر، اس کے چہرے پر پھوٹتی شفق جیسے کہ ایک نیا دن پرانے جگت میں نکل آیا چاہتا ہو، اس کی آنکھوں کی چمک اور اس میں شفاف گہرائی، اس کی ساڑی میں سویا اس کا جوبن جیسے کہ کوئی بچہ جھولے میں گہری اور میٹھی نیند سوتا ہو، اس کے نچلے ہونٹ پر اس کے اوپر کے ہونٹ کی کمان اتنے دھیرج سے رکھی تھی کہ اس سے ان کو یہ احساس ہوا کہ جو کچھ ان ہونٹوں سے نکلے گا وہ بان نہ ہوں گے بلکہ ایسی کرنیں ہونگی جو اس کے پورے شریر کی سندرتا اور اس میں چھپی شکتی سے ان کے شریر اور ان کے ہردے اور ان کے من میں اک اجالا سا کر دیں گی۔ باتیں کرتے جب کبھی کبھی، اس کے دانتوں کی چمک سے ہونٹوں کا پردہ ذرا سا ہٹتا تو ان کے انتر احساس جاگتا کہ اندھیرا چھٹ گیا ہے اور نور کا تڑکا ہوا چاہتا ہے۔ اس کے روبرو بیٹھنے اور اس سے سیکھنے کے احساس سے ان کے اندر عجیب سی ہلکی ہلکی لہریں اٹھتیں، رویں دوڑتیں اور وہ بے تاب ہو ہو جاتیں کہ اسکول کھلے اور وہ اس کے سامنے بیٹھیں، اس کی صاف کھنکتی ہوئی آواز سنیں جو مدھر ہونے کے باوجود شکتی وان تھی اور شکتی کو ان کے اندر بھی جگاتی تھی۔

علاقے کے بالکوں، بالیوں نے اس کو پہلی بار، سفید، نیلا ہٹ مائل گھوڑے پر سوار آتے جاتے دیکھا تھا۔ کچھ بالکوں اور بالیوں نے اس کو منڈیروں پر گھوڑے کی لگام تھامے

چلتے بھی دیکھا تھا۔ چند ایک کو وہ اپنے گھوڑے پر ایسے لمحوں میں بٹھا کر خود پیدل چلتی رہی تھی۔ دو ایک کو اس نے گھوڑے پر بیٹھے بیٹھے گھوڑا روک بازو سے پکڑ کر اوپر کھینچ لیا تھا وہ اپنے گھر کی ننھی سی منڈیر پر کھڑی اس کو دیکھتی تھیں۔ ان کو اپنے آگے بٹھا کر اس نے پہلے گھوڑے کو دلکی اور پھر تیز دوڑایا تھا اور ادھر ادھر کی باتیں کر کے ان کا اعتماد حاصل کر لیا تھا۔ ایسے بالک اور ایسی بالیاں اپنے گھروں میں ماؤں اور بہنوں کو اس کے بارے میں اچھی رائے رکھنے پر اکساتے رہے اور وہ اپنے مردوں کو ٹھاکر کی بات مان لینے کے لیے طرح طرح سے راضی کرنے کی کوشش کرتیں۔

علاقے کے لوگوں نے اس مہینے میں علاقے کے گردونواح کے بہت سے زمینداروں اور ان کی جوان لڑکیوں کو ٹھاکر کے گھر آتے جاتے بہت دیکھا اور اس دلچسپی کے لیے وہ حیران تھے یکا یک یہ ٹھاکروں اور ان خاندانوں نے ان کے ٹھاکر اور اس کی بیٹی اور بیٹے میں اس قدر دلچسپی کیوں لینی شروع کر دی۔ ان لوگوں نے یہ بھی دیکھا کہ مولوی سلامت کا ٹھاکر کے گھر اکثر آنا جانا رہنے لگا۔ اس کے ان خطبوں میں جو وہ ہر صبح کی نماز کے بعد اور جمعے کی نماز کے وقت دیا کرتا تھا زمین اور اس میں پیدا ہونے والی اشیا کی تقسیم کے بارے میں قرآن کی بات وہ وضاحت سے کرنے لگا ہے۔ جب مہینے کی مدت میں چند دن رہ گئے تو اس نے جمعے کے خطبے میں نہ صرف دولت کے خرچ اور اس کی تقسیم کے بارے میں ان کو اللہ کے احکام سے آگاہ کیا بلکہ یہ بھی بتایا کہ آس پاس کے مسلمان اور ہندو زمینداروں کو ٹھاکر کی اسکیم بالکل ناگوار گزری ہے اور اس سکیم کو روکنے کے لیے کوئی شوشہ چھوڑ ینگے اور ساتھ ہی یہ بھی کہ ٹھاکر نے ان کو سمجھایا ہے کہ وہ جو کچھ کر رہا ہے اس میں ان کے خلاف کچھ نہیں ہے اور نہ اس کو کوئی غرض ہے کہ اپنی زمینوں سے وہ کس طرح فصل حاصل کرتے ہیں۔ اگرچہ اس کو تسلیم تھا کہ جب اس اسکیم پر عمل درآمد ہونے لگا اور وہ کامیاب ہوگئی تو ان کے مزارع بھی ان سے اسی قسم کا سلوک طلب کریں گے جس کو وہ رواج دینا چاہتا ہے۔ جب ان زمینداروں نے اصرار کیا کہ وہ ایسی سکیم نہ چلائے جس سے ان کو مالی نقصان ہوگا تو ٹھاکر نے جواب دیا تھا کہ اس نے کبھی ان کے اس اسراف پر اعتراض کیا جو وہ شہر میں جا کر

غیر عورتوں پر کرتے تھے۔ جب ان کی بری باتوں میں مزاحم نہیں ہوا تو اس کو ان باتوں سے منع کرنے کا حق کیسے رکھتے ہیں جن کو وہ دلائل سے اچھا ثابت کر سکتا ہے اور جن اعمال کو ہر انسان جو سوچنے کے لیے تیار ہو اچھا قرار دے گا۔ اس پر بعض نے اس کو متنبہ کیا کہ وہ حاکموں کو اس کے خلاف اکسائیں گے۔ اس کا جواب اس نے یہ دیا کہ وہ کوئی ایسا کام نہ کر رہا تھا جس کو کوئی قانون جرم قرار دیتا ہو اور جب شہادت علی نے اس کو دھونس دی کہ وہ اس علاقے میں غدر مچائیں گے تو اس نے صرف اتنا کہا کہ وہ بھی جانتے ہیں کہ اس کے علاقے کے لوگوں کی بہادری صدیوں سے مشہور ہے اور وہ اب بھی اسی بہادری کا ثبوت دیں گے بلکہ اس سے بھی بڑھ چڑھ کر کیونکہ اس کی اسکیم سے ان کے جیون پہلے سے بہت بہتر ہو جائیں گے اور وہ اپنے جیون کے لیے اب خود ذمہ دار ہوں گے۔ اس کے علاقے میں اس کی خود کاشت اراضی اس اراضی سے بہت کم ہوگی جس کا وہ مالک سمجھا جاتا ہے اور بقیہ اراضی پر اس علاقے کے بہادر لوگ اس کو کچھ دیئے بغیر کاشت کریں گے۔

اس خطبے کے بعد علاقے کے مسلمانوں نے فیصلہ کر لیا کہ وہ ٹھاکر کی اسکیم کو قبول کر لیں گے۔ جب ہندوؤں کو اس فیصلے کا علم ہوا تو انہوں نے بھی اپنے احساسات اور جذبات اور آرزوؤں کو اس فیصلے کی شکل دے دی کہ وہ ہر حال میں ٹھاکر کا ساتھ دیں گے۔

جب مہینے کی مدت گزری تو ٹھاکر نے پھر لوگوں اور ان کی عورتوں کو بلایا مگر دعوت نہ دی اور ان سے کہا کہ وہ ہر گاؤں سے اپنے نمائندوں کا انتخاب کریں جو اس کے ساتھ مل کر یہ طے کریں گے کہ کس کس کو کتنی کتنی اراضی ملے اور باقی لوگوں کی آمدنی کے لیے کیا کیا کاروبار مہیا کیا جا سکتا ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ وہ یہ بھی طے کریں گے کہ کون لوگ سب سے پہلے دوسروں کو پڑھانے کے لیے تعلیم حاصل کریں گے تاکہ ہر گاؤں میں الگ الگ اسکول کھل سکے اور ان اسکولوں میں پڑھنے لکھنے کے علاوہ جو دستکاریاں سکھائی جائیں گی اس میں کون کون مددگار ہو سکے گا۔ اس کے علاوہ وہ ان کاشتکاروں کا بھی انتخاب کریں جو اس کے بیٹے سے کاشت کے نئے طریقوں کی تعلیم لے سکیں اور پھر ان کی دوسروں کو تعلیم دے سکیں۔

ٹھا کر نے پہلے اگلے چند سال کا پروگرام بتایا جس پر وہ سب بغیر کسی چھوٹے موٹے کارخانے کے کاروبار مہیا کرنے میں کامیاب ہوسکیں گے۔ اس کے بعد جب اس کے دوسرے دو بیٹے اپنی اپنی تعلیم مکمل کرلیں گے تو پھر ڈھور ڈنگروں کی نسل کو بہتر بنانے اوران کو بڑھانے کے کام ہاتھ میں لئے جائیں گے اور علاقے کے لوہاروں اور ترکھانوں کی مدد سے ایسی مشینیں بنائی جائیں گی جو ان کارخانوں میں استعمال ہوسکیں جو کاروبار مہیا کرنے کے لیے چند برسوں میں لگانے ضروری ہوجائیں گے۔ اس کے سبب ان کے اپنے علاقے میں ہی نہیں بلکہ ساتھ کے کئی علاقوں کے لوگوں کو کاروبار مہیا کیا جاسکے گا۔

اس پروگرام کو پیش کرنے کے بعد انہوں نے زور دیا کہ وہ ان اصولوں کو کبھی نہ بھولیں جن کے کارن ان کے لیے ایک نئے جیون کا آغاز کیا جارہا تھا ورنہ جب ان کے گھروں میں وافر مال جمع ہونے لگے گا تو ان کے درمیان ایسا نفاق پیدا ہوجائے گا کہ وہ ایک دوسرے کے دشمن ہوجائیں گے اور اگر ایسا ہوا تو پھر دوبارہ ان اصولوں کے مطابق جیون بتانا مشکل ہی نہیں ناممکن بھی ہوجائے گا کیونکہ ہر ایک کے انتر شکتیوں میں ایسا یدھ ہونا شروع ہو چکا ہوگا کہ اس کو ختم کرنے کے لیے اتنی زیادہ اور مسلسل کوشش کرنی ہوگی کہ وہ اس سے تھک جائیں گے اور فساد اور مار دھاڑ کی زندگی کو ہی اپنا مقدر سمجھ لیں گے۔ ایسا وقت بہت ہی کڑا اور کٹھن ہوگا۔ اس لیے ضروری ہے کہ وہ اپنے اعمال پر اور اپنے من اور چتینہ کی بھاوناؤں پر کڑی نظر رکھیں اور اپنے مال کو بہتے پانی کی طرح بہنے دیں تا کہ ہر کوئی سیراب ہو۔ بند صرف اس وقت ضروری ہوتا ہے جب پانی تھوڑا ہو اور ضرورت زیادہ اور ایسے لوگ بہت ہوں جن کے کھیتوں تک عام حالت میں بہتا ہوا پانی پہنچ نہ سکتا ہو یعنی پانی کو روکنا اس وقت چاہیے جب بہت سے لوگوں کو فائدہ پہنچتا ہو۔ صرف اپنے لئے بند لگانا پانی کو جوہڑ اور گندگی کی شکل دینا ہے

اس پروگرام کے مطابق ہر گاؤں سے دو دو آدمی چن لئے گئے اور ایک ایسی پنچایت نے جنم لیا جو آیندہ کے لیے ان کے جیون کی ہر خوشی اور آسائش کا بندوبست کرنے کی ذمہ دار ٹھہری۔

اس پنچایت نے ایسے نوجوان چنے جو سارے علاقے کے اچار یہ کا کٹھن کام سنبھال سکیں۔ ان کی تعلیم کا بندوبست سوشیلا کے ذمے تھا۔ اسی طرح ایسے جوانوں کا بھی انتخاب ہوا جو کاشت میں اتنے اچھے تھے کہ وہ اپنی پٹہ کی زمینوں سے سب سے زیادہ فصل اگاتے تھے۔ ان کی تعلیم سوشیلا کے بھائی گوری شنکر کے ذمے تھی۔ سوشیلا نے اپنی پہلی کلاس سے یوں خطاب کیا:

''پڑھانے کے طریقے جو رائج ہیں ان سب میں ایک بات مشترک ہے اور وہ یہ کہ ہر ایک کو زبان کے حروف سے آشنائی کرائی جائے اور اس کے بعد ان سے الفاظ اور الفاظ سے فقرے بنانے سکھائے جائیں۔ لیکن یہ طریقہ اس لیے صحیح نہیں ہے آپ لوگ اپنی زبان بڑی مہارت سے بولتے ہیں اور ایک ایک لفظ کا نہ صرف مطلب جانتے ہیں بلکہ یہ بھی جانتے ہیں بعض الفاظ کا آپ کی زندگی اور آپ کے گردوپیش کی کن کن اشیاء سے تعلق ہے۔ لہٰذا اس بات کو نظرانداز کر دینا کسی طرح صحیح نہیں اور پرانا طریقہ آپ کے انتر ایسی لگن کو جنم نہیں دے سکتا کہ آپ اس زبان کو جس کو کہ بولتے ہیں لکھ پڑھ سکیں اور اس سے نئے نئے کام لے سکیں۔

لہٰذا ہم اپنے پہلے سبق کو یوں شروع کریں گے کہ آپس میں اس معاملے پر گفتگو کریں جو آج کل ہمارے علاقے کا سب سے بڑا موضوع ہے۔ زمین کی ملکیت اور اس سے پیدا ہونے والی اشیا کی تقسیم، اس کے سبب آپ لوگوں کے جیون میں کس کس طرح کی تبدیلیاں آئیں گی اور اس سے آپ کے انتر میں کیا کیا کامنائیں اور بھاونائیں جنم لیں گی۔''

پھر اس نے ایک ایک کو دعوت دی کہ وہ بتائے کہ اس نے اس بارے میں پچھلے ایک ماہ میں کیا کیا سوچا ہے۔ جب پہلے شاگرد نے اپنی بات مکمل کر لی تو اس نے اس سے پوچھا کونسی بات کو وہ چاہے گا کہ لکھا ہوا دیکھے اس نے بتایا کہ ''سب محنت کر کے کھائیں گے اور ان کی محنت کا پھل کوئی اور نہ لے جائے گا۔'' سوشیلا نے دیوار کے ساتھ لگے ہوئے سیاہ تختے پر وہ فقرہ لکھ دیا اور خود ہٹ کر کھڑی ہو گئی اور اس سے کہا کہ اس نے جو بات کی تھی اس کو لکھا دیکھے۔ دائیں طرف سے لکھا ہے۔ لہٰذا اس کے بولے ہوئے فقرے کا ایک ایک لفظ

اسی ترتیب سے لکھا گیا ہے جس ترتیب سے اس نے الفاظ بولے تھے۔ اس نے اس کو دعوت دی کہ وہ کوشش کرے کہ اپنا بولا ہوا تیسرا لفظ لکھے ہوئے الفاظ میں سے ڈھونڈے۔

''کرکے''

چھٹا

''اور''

نواں

''محنت''۔

اس کے بعد اس نے اس کو کہا کہ وہ آ کر لکھے ہوئے فقرے کی نقل سیاہ تختے ہی پر کرے۔ جوان اٹھا اور اس نے لکھے ہوئے کو دیکھ دیکھ نقل کرنا شروع کی۔ اس کے بعد اس نے کہا کہ اگلے دن کوئی دوسرا فقرہ دوسرا جوان لکھے گا۔ ہر دن مختلف لوگ فقرے کا انتخاب کریں گے اور وہ لکھے گی اور اس کے بعد وہ اس سے فرداً فرداً لفظوں کی پہچان کرائے گی اور اس کے بعد اس نے ہر ایک کو الگ الگ ایک تختی اور قلم اور دوات تقسیم کی اور کہا کہ جو کچھ لکھا گیا ہے اس کو اپنی پہلی تختی پر نقل کریں۔ اس طرح ہر روز ایک موضوع پر گفتگو ہوتی جس میں سب شاگرد شریک ہوتے وہ بھی اس گفتگو میں اسی طرح شریک ہوتی وہ کسی کی اپنی بات میں سے ایک سوال نکال لیتی اور پوچھتی۔ اس طرح ان کے ذہن اور ان کے دل اور ان کے ہاتھ ساتھ ساتھ کام کرنے لگے۔ جب تختی دونوں طرف سے بھر گئی تو اس نے اس کو دھونا اور اس پر گاچنی کا لیپ کرنا سکھایا۔ ایک ماہ میں اس کے شاگردوں نے اپنی زندگی کے ہر پہلو پر گفتگو کی اور اس گفتگو میں سے فقرے منتخب کر کے پہلے سیاہ تختے پر اور بعد میں تختیوں پر لکھے۔

اگلے مہینے اس نے مختلف زبانوں سے کہانیاں انتخاب کر کے ان کو ان کی زبان میں سنانی شروع کیں۔ بعض دفعہ وہ اسی زبان میں چھوٹی سی چیز پڑھ ان کو سناتی اور پھر اس کا ترجمہ ان کی اپنی زبان میں سناتی۔ اس طرح اس کے شاگرد کسی زبان کا کوئی لفظ پکڑ لیتے اور اس کا تلفظ اور اس کے معنی اس سے پوچھتے۔ اس کے بعد اس کو اپنی گفتگو میں استعمال

کرتے۔

دوسرے مہینے کے بعد اس نے ان میں کاپیاں بانٹیں۔ جس پر وہ خود کچھ نہ کچھ لکھ کر لاتے، کلاس میں پڑھتے اور اگر کہیں غلطی ہوتی تو سیاہ تختے پر غلط اور صحیح بات دونوں کو وہ لکھ دیتی اور غلطی کی وجہ بتلاتی۔

اس تعلیم و تربیت کے ساتھ ان کے گردوپیش کی زندگی میں بھی تبدیلیاں آتی چلی گئیں۔ کیونکہ پنچایت کے فیصلوں کے مطابق پورے گیارہ گاؤں کی اراضیات کا بٹوارہ کردیا گیا اور ہر ایک نے اپنی اپنی اراضی پر پوری محنت سے کاشتکاری شروع کی۔ رات کو گوری شنکر ان کو زمین، ہوا، درختوں، بیجوں، اور پانی کی خاصیتوں کے بارے میں بتاتا اور بعض اوقات وہ اپنی زمین کی کاشت سے فارغ ہوکر گھوڑے پر علاقے میں نکل جاتا اور زمین پر کام کرنے والوں کو ان کی ضرورت کے مطابق بعض باتیں بتاتا اور ان کے بعض مسائل بھی حل کرتا۔

جب سوشیلا کے شاگردوں نے اپنی زبان کو لکھنا پڑھنا سیکھ لیا تو اس نے ان کو حساب سکھلانا شروع کیا۔ اس کے لیے بھی وہ خود سوالات تلاش کرتے اور اس کو حل کرنے کی کوشش کرتے جب کوشش کامیاب نہ ہوتی تو وہ ان کو بتاتی کہ وہ کیوں کامیاب نہ ہوئے اور کامیاب ہونے کے لیے کن اصولوں کی واقفیت ضروری تھی۔ بعض دفعہ وہ کہانی سناتی جس میں کوئی حسابی سوال چھپا ہوتا۔ جب انہوں نے حساب میں بھی شد بد حاصل کرلی تو وہ ان کو باہر کھیتوں میں، درختوں کے جُھنڈوں میں لے جاتی اور ان کو بعض پودوں کی، درختوں، جانوروں کی پہچان کراتی، ان کی زندگیوں کے بارے میں ان کو بتاتی اور ان کو اکساتی کہ وہ خود بھی اپنے طور پر چیزوں کے متعلق نئی نئی باتیں معلوم کرنے کی کوشش کریں اور پھر ہر نئی بات کو کلاس میں اپنے ہم سبقوں کو بتائیں۔ اس طرح سب ایک دوسرے کی تعلیم میں شریک ہوگئے اور یہ شرکت کلاس سے باہر کی زندگی میں بھی برقرار رہنے لگی۔

پھر ایک دن اس نے اسکول کے ایک کمرے میں کتب خانے کا افتتاح کردیا۔ دوسرے سال اس نے اپنے شاگردوں کو انگریزی کی تعلیم دینی شروع کردی۔

اراضی کے بٹوارے کے پہلے سال کے بعد ہر ایک نے جو فصل پیدا کی اس کا باقاعدہ حساب کیا گیا بچے، جوان، بوڑھے کے لیے خوراک کا تعین کیا گیا۔ اس کے مطابق ہر ایک نے فصل میں اتنا رکھ کر باقی پنچایت کے سپرد کر دیا۔ اس کے لیے گودام پہلے ہی بنا لیے گئے تھے۔ فصل کا جتنا حصہ فروخت کر دینا طے پایا وہ فروخت کر دی گئی۔ اس سے جو رقم وصول ہوئی اس کے لیے ایک خزانہ بنانا طے ہوا اور اس سے چھوٹی موٹی دستکاری کا آغاز کیا گیا۔ اس کے لیے بھی ایک اسکول بنایا گیا جہاں ترکھان، لوہار، موچی، جولاہا، معماران بچوں، جوانوں کو کام سکھانے لگے جو ایسے کام سیکھنے پر تیار ہو گئے تھے۔ ان کی تیار کی ہوئی چیزیں اسکول کے ایک کمرے میں فروخت کے لیے رکھی جانے لگیں۔ جب بہت سی چیزیں بننے لگیں تو اس کو شہر میں فروخت کے لیے ارسال کیا جانے لگا۔ بعض لائق شاگردوں کو شہر کے ہنرمندوں کے پاس شاگرد کرا دیا گیا اور پنچایت نے ان کا خرچ اٹھایا۔

آہستہ آہستہ معمار، ترکھان، لوہار، موچی اور جولاہے کمی کمین کی بجائے ہنرمند انسان سمجھے جانے لگے۔

اس کے بعد سوشیلا کا دوسرا بھائی ستیہ کمار ڈنگر ڈاکٹری سیکھ کر ہریش پور چلا آیا۔ اس نے علاقے کے جانوروں کا شمار کرایا اور ان کو صحت کے اعتبار سے مختلف قسموں میں تقسیم کر دیا گیا۔ پھر ان کا علاج کیا گیا۔ ان کے لیے الگ عمارت بنوائی گئی جہاں یہ سب جانور رکھے جاتے تھے اور ان کی دیکھ بھال ان کے اپنے مالک کرتے تھے مگر سائنس کے اصولوں کے مطابق۔ پھر ستیہ کمار کے کہنے پر اچھی نسل کے بیل، گائے اور بھینسیں خریدی گئیں اور ان سے نسل کشی کی گئی۔ اس کے لیے بھی ایسا نظام وضع کر لیا گیا کہ ایسے جانور پنچایت کی ملکیت قرار پائیں اور گائے یا بھینس کا ملاپ پنچایت کے بیل یا سانڈ سے ستیہ کمار کی نگرانی میں کرایا جاتا اور اس کے لیے فیس لی جاتی۔ ان نئے جانوروں کی نسل سے پیدا ہونے والے جانور، ضرورت کے مطابق، کاشتکاروں کو قسطوں میں فروخت کئے جاتے مگر اہتمام کیا جاتا کہ ضرورت سے زیادہ کسی کے پاس جانور فروخت نہ ہوں۔ جب وہ وقت آیا کہ سب علاقے کی ضرورت کے جانور سب کاشتکاروں کے پاس ہو گئے تو پھر فالتو جانوروں کو دوسرے

علاقوں اور شہروں میں فروخت کر دیا جاتا۔ اس طرح ملنے والی رقم سے علاقے میں باغ لگائے گئے اور پودوں کی، پھل اور پھولوں کی نسل کشی کے لیے فارم بنایا گیا۔ پانی کی تقسیم کو عادلانہ بنانے کے لیے علاقے میں نالیوں کا ایک جال بچھایا گیا۔ کھیتوں کے درمیان اور گاؤں گاؤں کے درمیان سڑکیں بنائی گئیں تاکہ آمدورفت میں آسانی ہو؛ کھیل کے میدان بنائے گئے، کھیلوں کے مقابلوں میں جیتنے والوں کو انعام دیئے گئے۔ پھر رقم اس مقصد کے لیے جمع کی جانے لگی اور لوگوں سے چندہ بھی لیا گیا کہ پنچایت گھر بنایا جائے جس میں ہر طرح کا مواد گاؤں کی زندگی سے متعلق رجسٹروں میں درج کیا جائے۔ اس نئے جیون کو شروع کرنے کے پانچویں سال پنچایت گھر کی عمارت کی نیو ایک وسیع سبزہ زار میں رکھ دی گئی اور اس کی عمارت اس طرح بنوائی گئی کہ ضرورت پڑنے پر اس میں اضافہ ہوتا رہے۔ اس کے بعد نئے پنچ منتخب کر لئے گئے۔ ان کے فرائض کے لیے ایک لائحہ عمل تیار کیا گیا جس کی خوبیوں سے لوگوں کو آگاہ کیا گیا۔

سوشیلا نے تین سال کی محنت سے 11 مرد اور 11 عورتوں کو تعلیم سے اس طرح لیس کیا کہ وہ ہر گاؤں میں بچوں اور بچیوں کو تعلیم دے سکیں۔ عورتوں کے ذمے بچوں اور بچیوں کی تعلیم تھی اور مرد استادوں کے ذمے نوجوانوں، جوانوں اور ادھیڑ عمر کے لوگوں کو پڑھانا۔ جب یہ سب اسکول اپنے اپنے گاؤں میں شروع ہو گئے تو اس نے اپنے اسکول میں شام کے بعد ان استادوں اور استانیوں کو نئے نئے مضامین کی تعلیم کا انتظام کیا۔ تین دن عورتوں کے لیے اور تین دن مردوں کے لیے۔ اتوار کو تعطیل ہوتی۔

اس شام کے اسکول میں عربی اور قرآن مولوی سلامت علی پڑھاتے تھے اور ویدوں، اپنشدوں اور گیتا کی تعلیم وہ خود دیتی تھی۔ دونوں کی تعلیم اس نہج پر تھی کہ ان کتابوں میں اصولوں کی پہچان کرائی جائے اور ان اصولوں کی روشنی میں انسان کی زندگی کو ڈھالنے کی راہیں سمجھائی جائیں۔

مولوی سلامت علی اور سوشیلا اور اس کے والد میں خاصی گہری دوستی نے جنم لیا۔ وہ اکثر اتوار کے دن کا بیشتر حصہ اور رات کا کچھ حصہ دین کے فلسفے اور اس کے اطلاق کی

صورتوں پر بحث کرنے میں صرف کرنے لگے۔ تینوں نے باہمی گفتگو سے بہت کچھ سیکھا اور ان کی سمجھ میں ایسی باتیں بھی آ گئیں جو ان کتابوں میں ان پر واضح نہ ہوئی تھیں۔ سوشیلا اور اس کے والد نے سلامت علی سے یہ سیکھا کہ اپنشدوں کو اس نظریہ حیات کی روشنی میں سمجھا جائے جو ویدوں میں اپنشدوں کے علاوہ مذکور ہے اور دونوں کو ہم آہنگ اور مربوط کر کے دیکھا جائے۔ ویدک تعلیم اس کائنات کی ہر شے کو سمجھنے اور اس سے اس طرح لطف اندوز ہونے کی طرف مائل کرتی ہے کہ اس تعلیم کے اصول مجروح نہ ہوں، انسان کے ماحول میں جو کائنات پھیلی ہے اس کا ایک مقصد ہے انسان کے لیے نہ کہ خالق کے لیے چونکہ خالق کا اپنا ذاتی مقصد کوئی نہیں (جس کے کارن اس کے اندر کوئی تبدیلی ہو سکے) اس لیے اس ساری کائنات کو ایشور کی لیلا کہا گیا ہے۔ لیلا اس عمل کو کہا جاتا ہے جس کا کرنے والے کے لیے کوئی ذاتی مقصد نہ ہو۔ لہٰذا کائنات کا علم انسان کی زندگی اور اس کی صلاحیتوں کے امکان کو ظاہر کرتے چلے جانے کے لیے لازم ہے۔ جس چیز کا علم حاصل ہو جائے اس کو اپنے مقاصد کے لیے استعمال کیا جا سکتا ہے۔ اس لیے تسخیرِ کائنات بھی انسان کے لیے لازم ہے۔ ارتقائی اور ارتفاعی منازل ایسی ہی تسخیر سے طے پائیں گی۔ سلامت علی نے ان دونوں سے یہ سیکھا کہ قرآن کی تعلیم کو زندگی اور کائنات کے ان تمام شعبوں کے بھرپور علم سے سمجھا جائے جن کا ذکر قرآن میں ہے۔ جہاں رحم کا ذکر ہے وہاں رحم کو اس کی بھرپور شکل میں پہلے دیکھا جائے اور بعد ازاں اس کو قرآن میں مذکور سیاق و سباق میں۔ اور قرآن کی پوری تعلیم کے مقاصد کی روشنی میں باقی جذبات، تصورات، خیالات کی حدود کا تعین کیا جائے اور ان کے باہمی روابط کی بُنتی کو سمجھا جائے۔ حُسن اور حَسن کے بارے میں قرآن کی تعلیم کو سمجھنے کے لیے ناگزیر ہے ہندو جمالیات اور اخلاقیات کے فلسفے پر بھرپور نظر ڈالی جائے اور اس رچاؤ کو ہندو فنون کے مظاہر (رقص، موسیقی، سنگ تراشی اور فن تعمیر) سے سمجھا جائے۔ یہ اس لیے کہ جتنے بھی دین موجود ہیں ان میں سے ہندوؤں کے یہاں ہی ان دونوں حقیقتوں کے بارے میں بڑی تفصیل سے سب سے پہلے لکھا گیا تھا اور وہ ہم تک پہنچا ہے۔

سوشیلا، ستیہ کمار اور سلامت علی کو تعلیم دینے کا پنچایت سے کوئی معاوضہ نہ ملتا تھا۔ وہ سب اپنی اپنی اراضی پر دن کے مختلف اوقات میں کاشت اور اس سے متعلقہ کام کرتے تھے اور اس محنت سے جو فصل پیدا کرتے تھے اس سے ان کو بھی اسی حساب سے حصہ رزق ملتا تھا جس طرح دوسرے کاشتکاروں کو۔

سوشیلا ہفتے کے کسی ایک دن کسی ایک گاؤں کے اسکول میں کسی نہ کسی موضوع پر طالب علموں سے گھنٹے دو گھنٹے کے لیے گفتگو کرتی۔ طریقہ یہ تھا کہ پہلے اس موضوع کا تعارف وہ خود کراتی تھی پھر اس پر چند طالبعلم چھوٹی موٹی تقاریر کرتے تھے۔ اس کے بعد ایک عام بحث ہوتی جس میں سبھی طالب علم حصہ لیتے اور پھر ان تقاریر اور بحث کو مدنظر رکھتے ہوئے وہ موضوع کا اختصار سے احاطہ کرتی۔ موضوع بالعموم انسانوں کے باہمی رشتوں سے متعلق ہوتا۔ کبھی کبھی وہ کسی ایک اسکول کے طالب علموں کو لے کر کھیتوں میں نکل جاتی اور کھلی فضا میں وہ اشیائے فطرت کے باہمی آہنگ پر ان سے باتیں کرتی۔ کبھی کبھی کوئی طالب علم کوئی تیز سا سوال کر دیتا جس سے زیر بحث موضوع پر عجیب سی روشنی پڑتی۔ اس پر وہ پوچھ لیتی کہ یہ سوال کسی غور وفکر کا نتیجہ ہے یا یونہی سوال کرنے والے کے ذہن میں ابھر آیا تھا۔ اس پر اس کو عموماً یہی بتایا جاتا کہ سوال خود بخود ذہن میں ابھر آیا تھا۔ یہاں سے وہ انسان کی نفسیات اور اس کے امکانات کی بات کرتی اور تفصیل سے بتاتی ہے کہ انسان اپنی صلاحیتوں کے اعتبار سے حیوانات اور کائنات کی دوسری چیزوں سے کس طرح الگ اور ممتاز ہے اور مشقوں سے نہ صرف جسمانی صحت بلکہ جذبات اور خیالات اور تصورات اور تخیل کی پرورش کی جاسکتی ہے۔

جب یورپ میں جنگ لگی سرکاری افسروں نے گاؤں کے لوگوں کو پھسلایا، للچایا تو گردونواح کے زمینداروں کے بیٹے فوج میں بھرتی ہونے لگے کیونکہ ان کی زندگیوں میں کوئی سنسنی نہ تھی، کوئی جوکھم نہ تھا اور کمانے کے لیے بھی کچھ محنت نہ کرنی پڑتی۔ ان کے کاشتکاروں اور مزارعوں کے لڑکے بھی فوج میں بھرتی ہونے لگے کیونکہ ان کو اپنے گاؤں میں اپنے لئے کوئی مستقبل نظر نہ آتا تھا اور نہ ہی تعلیم کے ذرائع۔ مگر ہریش پور کے کسی گاؤں

کا کوئی آدمی بھرتی نہ ہوا کیونکہ ہر ایک کو اس نئے نظامِ معاشرت میں کوئی نہ کوئی کام سپرد تھا جس کے لیے اس کو مناسب معاوضہ ملتا تھا۔ تعلیم مفت تھی، کتابیں مفت ملتی تھیں اور استاد ایسے تھے کہ بات کو دل میں اتار دیتے تھے۔ اس نئے معاشرے میں ہر روز کوئی نیا جوکھم طے کرنا ہوتا تھا جس سے خود اس کے اپنے خاندان کی فصل میں اور لہٰذا آمدنی میں اضافہ ہوتا تھا اگرچہ اس میں وہ دوسروں کو بھی شریک کرتے تھے۔ اس شراکت کے احساس نے اس معاشرے میں آہستہ آہستہ ایک دوسرے کا ساتھی اور ہمدرد ہونے کا احساس جگایا اور پھر اس احساس کی پرورش کی۔

کبھی کبھی وہ کچھ ذہین طالب علموں کو اور ان کے استادوں کو رات کے وقت اپنے گھر کے گرد محیط باغ میں بلا لیتی، بالعموم اماوس کی راتوں میں۔ ایسے دنوں میں آسمانوں اور فضا سے کئی شکتیوں اور اسرار کے نزول کا احساس ہوتا تو وہ ان سے ایسی شکتیوں اور کائنات کے شکوہ اور قوانین کی بات کرتی اور یہ کہ انسان کائناتی طاقتوں اور شکتیوں سے اپنے لئے روحانی خوراک حاصل کر سکتا ہے اور یہ خوراک انسان میں تحیر کا اور حسن کا احساس پیدا کرنے میں بہت مددگار ثابت ہوتی ہے۔ تحیر انسان کے انتر، من اور ہردے میں کائنات میں کارفرما قوانین کی سوجھ بوجھ پیدا کرتا ہے اور اس سوجھ بوجھ سے نہ صرف کائناتی مظاہر سے آہنگ اور ربط کے اصولوں کو انسانی مقاصد کی تکمیل کے لیے استعمال کیا جا سکتا ہے بلکہ خود انسان کے انتر میں نئے نئے جہان بےنقاب کرنے اور ان کے اندر سفر کر کے ان میں کارفرما اصولوں کی سوجھ بوجھ سے ان پر قابو حاصل کیا جا سکتا ہے۔ اس قابو کرنے کے جوکھم کے دوران باہر اور انتر نئے نئے جہاں ظاہر ہونے لگتے ہیں یا ایسے جہانوں کا نظری شعور پیدا ہو جاتا ہے جس کے استعمال سے نظری امکانات کو مشہود کیا جا سکتا ہے۔ ان امکانات اور ان جانے امکانات کو مدنظر رکھتے ہوئے انسان کو اپنے حال کی زندگی کو ایسی شکل دینا ممکن ہو سکتا ہے جو نہ تو ماضی کو دہرانے کے مترادف ہو اور نہ حال کی حدود میں گم بلکہ انجانے مستقبل کے مشہود ہونے کے بعد اس سے بھی ہم آہنگ اور مربوط ہو سکنے کی صلاحیت رکھتی ہو۔

اس طرح انسان کے باہر کی کائنات اور خود اس کے انتر کے سنساروں کو تسخیر کیا جا سکتا ہے۔ یوں انسان بہت سی مادی، جذباتی، نظری شکتیوں کو ان کے فطری خولوں سے نکال کر اپنے روحانی، عقلی، جذباتی اور نظری ارتقا کا انتظام کر سکتا ہے۔ اس ارتقا کے سبب اس میں ایک مقررہ مدت کے بعد نوعی ارتقا بھی آنے لگے گا۔ انسان اپنے شعور کی وجہ سے خود شعور بھی ہے اور یہ شعور اور خود شعوری اس کو کائنات میں موجود تمام صورتوں سے بہتر سے بہتر صورت بنا دیتے چلے جانے پر قادر بنا دیتے ہیں۔ جب پہلی رات اس نے بات کا آغاز کیا تو اس نے محسوس کیا کہ الفاظ اظہار کا ذریعہ نہیں ہیں بلکہ انتر دیش میں نت نئی شوبھا، نئے اسرار، اور نرتوں، نئے سنگیت اور انوکھے، انوٹھے نرتیہ کے انکشاف کا ذریعہ ہیں۔ انتر کو جاننے کے لیے بھیتر کے مظاہر کی تھاہ تک پہنچنا لازم اور بھیتر کو اچھی طرح سے جاننے کے لیے انتر کی سیر لازم ہے۔

کبھی سوشیلا گاؤں کی ذہین لڑکیوں اور ان استانیوں کو اپنے یہاں بلاتی اور وہ باغ میں بیٹھ کپڑوں اور زیوروں کی بجائے عورت اور مرد کے تعلقات پر باتیں کرتے۔ وہ ان کو بتاتی کہ عورت ہر وہ کام کر سکتی ہے جو مرد کر سکتا ہے۔ اس میں اچھے اور برے دونوں کام شامل ہیں۔ اب فرق صرف اس لیے ہے کہ پچھلے کئی ہزار سال سے عورت پر کمانے کے ذرائع بند رہے ہیں اور اس کو صرف مرد اور بچوں کی حاجت روائی کے کام سپرد کر دیئے گئے ہیں جس کے سبب خود اعتمادی، جرأت، بے باکی اور بے خوفی کی صلاحیتیں اس میں پرورش ہی نہیں پا سکیں۔ اگر عورت کو وہی مواقع دیئے جائیں جو پچھلے دس ہزار سال سے مرد کو میسر رہے ہیں تو عورت بھی وہ سب کچھ پیدا کر دکھائے جو مرد نے پیدا کئے ہیں۔ یہ صحیح ہے کہ عورت اپنی جسمانی ساخت کے اعتبار سے بچے جننے کے لیے بنائی گئی معلوم ہوتی ہے۔ مگر ایک خاص مدت کے بعد یہ صلاحیت اس سے سلب ہو جاتی ہے اور اس عمر تک پہنچتے پہنچتے وہ ان بچوں کی پرورش بھی کر چکی ہوتی ہے جن کو وہ جنم دے چکی ہوتی ہے۔ لہٰذا اس عمر کے بعد عورت کو زندہ رہنے کی اجازت ہی نہ ہونی چاہیے یا پھر اس عمر کے بعد اس کے لیے کسی اور قسم کی زندگی کا ہونا لازم ہے ورنہ اس کی صلاحیتوں کی زکار رک جائے گی۔ لیکن اس کا یہ مطلب قطعاً نہیں کہ

وہ بچے جننے سے یکسر انکار کر دے بلکہ یہ ہے کہ اس کو آزادی اور اختیار ہونا چاہیے۔ وہ خود طے کرے کہ اس کو کتنے بچے جننے ہیں تاکہ وہ ان کی صحیح پرورش کر سکے۔

لہٰذا اس کو محض بچے جننے کی مشین یا مرد کی جنسی تسکین کا آلہ نہیں سمجھا جا سکتا۔ اس کو معاشرے کی تشکیل اور ترویج اور زکا میں مرد کے ساتھ برابر کا شریک ہونا ہی ہوگا ورنہ ایک طبقاتی جنگ جاری رہے گی۔ جس کی بنیاد جنس پر ہوگی اور یہ طبقاتی جنگ معاشرے میں کئی فساد اور بیماریاں پیدا کرے گی۔

مرد کی طرح عورت کو معاشی، ذہنی اور جذباتی آزادی ملنی چاہیے تاکہ وہ اپنی مضمر صلاحیتوں کو بروئے کار لا سکے۔ ورنہ عورتیں مرد کے بنائے ہوئے معاشرے کی جڑیں کھوکھلی کر دیں گی اور خود مردوں میں باپ بیٹے کو ایک دوسرے کے خلاف جنگ پر مائل کر دیں گی کیونکہ بچے کے پہلے چار سال ماں کی گود میں یا اس کی نگرانی میں گزرتے ہیں اور نفسیات ہمیں بتاتی ہے کہ اس عمر میں جو کچھ بچے کے ذہن اور دل میں جاگزیں کر دیا جائے وہ بقیہ عمر اس کے مطابق عمر گزارنے پر مجبور رہتا ہے (اگرچہ وہ اپنے شعور کے اور قوتِ ارادی کے بھرپور استعمال سے ایسی مجبوری سے بچ بھی سکتا ہے۔)

اسی قسم کی باتیں وہ کبھی کبھی لڑکوں اور ان کے استادوں سے بھی کرتی تھی۔ مرد اور عورت کو ان کے جسمانی اور جنسی وظائف سے الگ کر کے بطور انسان بھی دیکھنا ضروری ہے اور بطور انسان اس کے حقوق کا تعین ہونا لازم ہے اور ان حقوق کو اس کے جسمانی اور جنسی وظائف پر فوقیت حاصل ہونی چاہیے۔

لیکن اس برابری اور اس آزادی کا یہ مطلب نہیں کہ وہ تمام قوانین سے آزاد ہو گئے ہیں اور جس طرح چاہیں اپنے جسموں کو، اپنی روحوں کو اور اپنے جذبات اور خیالات اور تصورات کو استعمال کریں۔ اس لیے ایک ضروری اصول یہ ہے کہ کوئی ایسا کام نہیں کرنا چاہیے جو انسان کو روحانی، جسمانی، جذباتی اور ذہنی طور پر کمزور کر دے۔ اس صحت مندی کے لیے نفسیاتی حجاب اور عصمت کی حفاظت مرد اور عورت دونوں کے لیے ضروری ہے۔ اندرونی بندھن انسان کی صلاحیتوں میں وسعت لانے کے لیے بہت ضروری ہیں۔ ہر

کلاکار اور فنکار، ہر یوگی جانتا ہے کہ خود اپنی ذات یا کائنات کی تسخیر کے لیے ضروری ہے کہ حدود کا تعین کر لیا جائے اور پھر ان حدود کو توڑنے کی کوشش ہی نہ کی جائے بلکہ ان حدود پر محیط جہانوں کو بھرپور کرنے کی کوشش کی جائے۔

عصمت کے معنی یہ نہیں ہیں کہ کوئی مرد اور عورت جو میاں بیوی نہیں ہیں وہ ایک دوسرے کے جسم کو، جنس کو نہ چھوئیں بلکہ یہ کہ جسم اور جنس کے معاملے میں غیر مرد ہی نہیں غیر عورتوں سے بھی حجاب میں رہیں۔ حجاب سے یہ مطلب نہیں ہے کہ جسم کو لباس میں چھپا لیا جائے بلکہ یہ کہ نفسیاتی اور جذباتی طور پر اپنے آپ کو جانی پہچانی حدود کے اندر رکھا جائے اور ان حدود کی حفاظت بڑی سختی سے کی جائے۔

چھٹا باب

اس تجربے کے آغاز کے تین سال کے بعد سوشیلا کا تیسرا بھائی سدھیشور کمار metallurgy میں فارغ التحصیل ہو کر ان کی زندگی میں شریک ہو گیا۔ اس کے آنے سے گاؤں کے لوہاروں، ترکھانوں کی مدد سے کاشت کاری کے لیے نئے نئے اوزار بنائے گئے۔ پھر ان کی مدد سے چھوٹی چھوٹی فاؤنڈریاں علاقے میں لگائی گئیں جو لکڑی اور دھاتوں کے استعمال سے ایسی بہت سی کارآمد چیزیں بنانے لگیں جس سے نہ صرف علاقے کی ضرورتیں پوری ہوتی تھیں بلکہ گردونواح کے علاقوں کی ضرورتیں بھی پورا ہونے لگیں۔ علاوہ ازیں بہت سے لوگوں کو کاروبار ملا۔ بعض لوگ کاشتکاری سے فراغت کے دنوں میں ان فاؤنڈریوں میں کام سیکھتے تھے تاکہ وہ اپنے وقت کا کوئی سودمند استعمال کر سکیں۔

سدھیشور کمار بظاہر خاموش طبع انسان تھا جس کو اپنے کام سے بہت ہی لگن تھی۔ وہ خوبرو نہ تھا۔ اس کے جسم کا کوئی عضو خوبصورت نہ تھا مگر جسم کے باقی اعضا کے حوالے سے متناسب تھا۔ جو عضو دیکھنے والے کو سب سے پہلے متوجہ کرتا تھا وہ اس کا سر تھا، بڑا سا سر جس میں فراخ اور کھلا ہوا ماتھا، بھاری بھوئیں، بڑی بڑی بھوری آنکھیں جن میں چمک نام کو نہ

تھی مگر dull بھی نہیں، آنکھوں کے درمیان ایسی ناک جو اگر ذرا سی چھوٹی یا بڑی، پتلی یا موٹی ہوتی تو اس چہرے کو یقیناً مضحکہ خیز بنا دیتی، اس سر کے دونوں طرف سر سے دور ہٹے ہوئے کان جیسے قلعے کے باہر سنتری؛ چوڑے اور مضبوط شانے، جیسے کہ پہاڑوں کا بوجھ اٹھانے لیے بنائے گئے ہوں، فراخ سینہ، لمبے اور مضبوط اور طاقتور بازو جو ذرا بھی لمبے ہوتے تو گوریلے کے بازوؤں کا تاثر دیتے؛ مضبوط اور طاقتور کولہے اور ٹانگیں؛ کبھی اس کا اوپر کا دھڑ اور کبھی نچلا دھڑ ذرا سا بڑا نظر آتا۔ اس کا رنگ گندمی، مگر کھلتا اور کھلتا ہوا تھا۔ اس کے سر کے لمبے اور سیاہ اور چمکدار بال سورج کی روشنی میں اس کے چہرے اور سارے بدن کی کیفیت کو یوں بدل دیتے تھے کہ اس میں خواہ مخواہ دلچسپی لینے کو جی چاہنے لگتا۔ اس کی آواز میں بالعموم اک اکھڑ پن تھا مگر جب وہ باتوں میں مگن ہو جاتا تو اس کی آواز میں اک گھمبیرتا آجاتی اور سننے والوں کے گرد ایک حصار بناتی ہوئی محسوس ہوتی۔

عام باتوں میں اس کو قطعاً کوئی دلچسپی نہ تھی مگر جب کبھی تاریخ اور تاریخ کو بدلنے، بگاڑنے یا سنوارنے کا ذکر ہوتا اور وہ موجود ہوتا تو یکا یک اس میں ایک تبدیلی سی آجاتی اور اس کا جسم تن جاتا، اس کی آنکھوں میں روشنی ابلنے لگتی اور اس کے چہرے کا انگ انگ متحرک ہو جاتا۔ اس طرح ماحول میں یکا یک بجلی کی لہریں متحرک ہو جاتیں۔ جب پہلی بار ایسا ہوا اور ارملا چونکی تو سوشیلا نے مسکرا کر اس کو بتایا کہ تاریخ سدھیشو رکمار کا من پسند موضوع ہمیشہ سے رہا تھا اور اس معاملے میں اس کا فلسفہ بڑا دلچسپ تھا۔ ہٹلر کی فتوحات کے حوالے سے ارملا یورپ کی تاریخ کے بارے میں بات کر رہی تھی کہ یوں اعلانیہ اور لگی لپٹی رکھے بغیر کسی لیڈر نے اقتدار کے حصول سے پہلے اس طرح جھوٹ اور تشدد اور نفرت کو اقدار بنا کر پیش نہ کیا تھا اور اس کے باوجود اقتدار حاصل کر لیا تھا۔ میکیاویلی، چانکیہ کوٹلیہ، بھیشم اقتدار کے حصول کے لیے انسانی فطرت کو سامنے رکھتے ہوئے مٹسیانیائے کو پیش کرتے ہیں مگر ان کا دعویٰ یہی ہے کہ حصول اقتدار اگر مقصد ہو تو پھر انسانی فطرت بولتی ہے۔ مگر ان کے یہاں اقتدار کا حصول اعلیٰ ترین قدر نہیں ہے اور نہ وہ دوسری اقدار کے منکر ہیں۔ مگر یہ ہٹلر اقتدار اور طاقت کے حصول کو نہ صرف اعلیٰ ترین قدر قرار دیتا ہے بلکہ اس اقتدار اور طاقت کو جنگ

کے لیے استعمال کرنا اس قدر کا واحد مقصد قرار دیتا ہے اور اس کے حصول کے لیے نفرت، جھوٹ اور فریب کے استعمال کو علانیہ صحیح کہتا ہے۔ ارملا نے اس خطرے کا بھی اظہار کیا کہ وہ اقوامِ مغرب کے اذہان وقلوب سے اقدار کے شعور کو محو نہ کر دے اور اگر وہ کامیاب ہو گیا تو پھر تمام دنیا میں ہر طرف اندھیاری چھا جائے گی۔

''مگر وہ ایسا نہ کر سکے گا کیونکہ ایسا کرنے کے لیے ایسا معاشی، معاشرتی اور تکنیکی نظام اور ادارے وضع کرنے ناگزیر ہیں جن کی جڑیں، نہ صرف موجود ذرائع پیداوار اور پیداوار کے حصول کے لیے آلات کے علم میں پیوست ہوں بلکہ ان ذرائع اور آلات کے امکانی ارتقا کے گہرے شعور میں بھی ہوں۔

زمین میں جو کچھ بھی موجود ہے اس کو نکالنے کے لیے آلات کی ایجاد ناگزیر ہے اور وہی نظام ہر نظام پر حاوی آتا چلا جائے گا۔ جو بہتر قسم کے آلات اور پیداوار کی تقسیم کے لیے ایسے ادارے وضع کر سکے جس میں انسانی علم کے ساتھ ساتھ ترقی ہوتی چلی جائے اور خود انسان کی عیاں اور نہاں صلاحیتوں کی پرورش ہوتی چلی جائے۔

محض جذبات کو متاثر کر کے اقتدار حاصل بھی کر لیا جائے تو اس کا استقرار دیرپا نہیں ہوتا۔ یہی حال ہٹلر کا ہوگا کیونکہ اس نے ایسے ادارے وضع نہیں کئے اور تاریخ میں ارتقا کے اصولوں سے نہ صرف وہ واقف نہیں ہے بلکہ اس کی جدوجہد اس کے بالکل خلاف ہے۔ کمیونسٹ نظام نہ صرف دونوں لازموں کا شعور رکھتا ہے بلکہ اس نے ایسے ادارے بھی وضع کر لئے ہیں۔ مگر اس میں ایک بہت بڑی کمزوری ہے۔ اس نے انسان کے ماضی سے ایک بات نہیں سیکھی کہ انسان نہ صرف خودنگر ہے بلکہ خودگر ہے (Man makes hismelf)۔ جس کے باوصف وہ مختلف امکانات میں سے ایک کا انتخاب کرتا ہے اور اس کی حفاظت کو وہ اپنی بقا جانتا ہے۔ یہ حفاظت افراد کے تنہائی کے فیصلوں سے ممکن ہوتی ہے۔ اگرچہ ایسے فیصلے کرنے کے بعد ایسے افراد ایک دوسرے سے تعاون بھی کرتے ہیں اور کرتے رہے ہیں۔ یہ صلاحیت اپنی شدھ شکل میں انسان کی تنہائی سے جنم لیتی ہے مگر اس کے مظاہر معاشرتی ہو سکتے ہیں، ہوتے رہے ہیں مگر یہ کام کوئی ادارہ یا کوئی ریاست نہیں کر

سکتی۔ ادارے اور ریاست ایسا کرنے کے لیے صرف مناسب یا متخالف ماحول پیدا کر سکتے ہیں مگر انسان کی اس جبلی ضرورت کو اس کے دل و ذہن سے محو نہیں کر سکتے اور نہ ہی اس میں پیدا کر سکتے ہیں۔ اگر کمیونسٹ نظام اپنے آپ کو اس جبلی ضرورت سے ہم آہنگ کر لے یا کر سکے تو انسان اسی نظام کو اپنے لئے چن لیں گے۔ مگر موجودہ شکل میں اس نظام کے لیے ایسا کر لینا مجھے مشکل ہی نہیں بلکہ ناممکن نظر آتا ہے۔

لیکن ایک بات طے ہے کہ جب بھی ہٹلر اس نظام سے نبرد آزما ہوگا اس کو نہ صرف شکست ہوگی بلکہ اس کی تباہی کا آغاز ہوگا۔

کمیونسٹ نظام کی خطرناک غلطی بلکہ حماقت سے محفوظ رہنے کے لیے لازم ہے انسان کی اس تلاش آزادی کو مدنظر رکھا جائے اور جو بھی پیداوار اور اس کی تقسیم کا نظام وضع کیا جائے اس کو انسان کی اس حاجت کو مدنظر رکھتے ہوئے وضع کیا جائے ورنہ اس نظام میں بھی طبقہ وارانہ جنگ جاری رہے گی اور یہ جنگ پیداوار کی کمی کا سبب بنے گی اور یہ کمی انسان کی تلاش آزادی کے لیے دوسرے مادی جواز مہیا کر دیگی جو اس نظام کو مسلسل کھوکھلا کرتے رہیں گے اور کسی بھی crisis کے وقت کمیونسٹ انسان اس نظام کو تباہ کرنے پر تل جائے اور کامیاب بھی ہو جائے گا، چاہے ایسا ایک ہی ہلے میں ہو سکے یا کئی ہلوں میں۔

اس لیے مجھے پتا جی اور سوشیلا کے تجربے میں دلچسپی ہے اور میں ان کے ساتھ شریک ہوں۔ یہ تجربہ ایک معاشرہ بننے میں بہت طویل وقت لے گا کیونکہ اس کے لیے مادی جواز موجود نہیں ہیں۔ ملک میں پیداوار کے لیے سائنس کے علم سے تیار کردہ آلات ابھی رائج نہیں ہیں اور نہ ہی اس کا امکان ابھی نظر آتا ہے کیونکہ ابھی لوہے اور بجلی کی صنعتیں اس قابل نہیں ہیں کہ پورے ملک کی معیشت کو نہ صرف متاثر کریں بلکہ اس کو قابو میں کر لیں۔ اس کے لیے ایک صدی تو ضرور ہی لگے گی۔

میں یہ ماننے کے لیے تیار ہوں کہ اگر کسی ملک کی اکثریت کو قائل کر لیا جائے کہ زمین سے نکلنے والی دھاتوں کو پیداوار بڑھانے کے لیے استعمال کیا جائے اور ان کی مدد سے تقسیم کا ایک عادلانہ اور مساویانہ نظام قائم کیا جانا بہتر ہے تو ایسا ماحول پیدا ہو سکتا ہے جو ایسی

شکتیوں کو جنم دے سکتا ہو جو ایسے معاشرے کو مادی بنیاد مہیا کر دے۔

میں یہ بھی ماننے سے انکار نہیں کرتا کہ تمام اقدار روحانی اور غیر مادی ہوتی ہیں۔ مگر ان کو کسی بھی انسانی معاشرے میں مشہود کرنے کے لیے لازم ہے کہ ان کا مادی وسائل سے وا کیا جائے جس میں اقدار کو برتری حاصل ہو۔ اسی لیے میں نے metallurgy میں تعلیم حاصل کی۔ میری کوشش ہو گی کہ ایسے آلات بنائے جائیں جن سے ہماری زمین سے اس کو نقصان پہنچائے بغیر زیادہ سے زیادہ پیداوار حاصل کی جائے اور اس کی تقسیم ہر انسان کی ضرورت کے مطابق کرنے میں مدد دے۔ ہر ایک کو جسمانی ضرورتوں کے لیے اتنا ملنا چاہیے کہ وہ ان ضرورتوں سے اسی طرح بے خبر ہو جائے جس طرح وہ سانس کے ذریعے سے ہوا کی ضرورت سے بے خبر ہو گیا ہے۔ اس کے بعد وہ خود بخود اپنی ذہنی پرورش اور روحانی زکا کے لیے کوشاں ہو گا۔ اگر ماحول بھی سازگار ہو تو پھر اس کی کوشش ہر بار پھل لائے گی۔

ایسے ہی نظام میں پہلی بار عورت بھی اپنے آپ کو بنا سکے گی اور اس کے تعلقات مرد کے ساتھ محکوم یا کمزور ساتھی کے نہ ہوں گے۔ بلکہ برابری کے ہوں گی۔ پھر سوشیلا جیسی ناریاں معاشرے میں نایاب نہ ہوں گی اور نہ ہی ایسی ناریوں کے لیے بر نایاب ہوں گے۔

لیکن آپ نے سوچا کبھی کہ موجودہ صورت میں سوشیلا جیسی ناریاں اور چندر بھان جیسے مرد پیدا کرنے کے لیے کتنے انسانوں کی جائز ضرورتوں کا کتنی صدیوں سے خون ہوتا رہا ہے، کتنے نرناریاں چھوٹی چھوٹی ضرورتوں کے لیے تمام عمر ایڑیاں رگڑتے مرے ہیں۔ جب میں یہ سوچتا ہوں تو لرز جاتا ہوں، مجھے اپنا آپ پاپوں سے بھرپور نظر آتا ہے اور اس کے پراسچت کا کوئی مناسب طریق نظر نہیں آتا۔ یہ تجربہ جو ہم کر رہے ہیں اس سے پراسچت تو ممکن نہیں مگر کسی حد تک اس کی تلافی کا آغاز ضرور ہو سکے گا۔"

باتیں کرتے کرتے اس کے چہرے مہرے اور اس کے جسم کے بناؤ کا رنگ روپ بدلتا چلا گیا۔ اس کی آنکھوں میں روشنی تیرتی تھی، کبھی آہستہ رو اور کبھی تیز رو، اس کے چہرے پر لالی کی رویں دوڑتی تھیں اور اس کے اعضا میں ایک آہنگ، ایک نرت، ایک

راس کی کیفیت آتی چلی گئی۔ ارملا نے محسوس کیا کہ اس کے اندر ایسی شکتیاں مسدود اور پنہاں ہیں جن کو اگر آزاد کیا جا سکے تو یہ شخص سندر اور گھبرو لگے۔ ابھی وہ اس طرح کی باتیں سوچ رہی تھی کہ وہ اٹھ کر کمرے میں ٹہلنے لگا۔ اس کی چال میں ایک بھر پور شکتی کو نپے تلے انداز ے کے مطابق چھوڑنے کا احساس ہوتا تھا، جیسے اس کو معلوم ہو کہ اس کے اندر ایک شکتی کا طوفان اٹھا ہے اور اگر اس کو قابو نہ کیا گیا اور اس کو آہستہ آہستہ ایک آہنگ کے ساتھ مقررہ مقدار میں خارج نہ کیا گیا تو خود اس پر اور اگر اس کو بالکل ہی آزاد چھوڑ دیا گیا تو دوسروں پر اتیاچار ہوگا۔

اس کی اس پُر آہنگ چال اور اس چال کے ساتھ اس کے سارے شریر کا سمبندھ ارملا کو اپنی طرف متوجہ کرنے لگا۔ اس کے بعد کئی گفتگوؤں کے دوران اس کی ایسی کایا کلپ اس کو لبھانے لگی اور آخر موہنے لگی اور اس کو محسوس ہونے لگا وہ خود سدھیشور کی اس کایا کلپ کو اس کا سناتن بھاؤ بنانے میں مددگار ہو سکتی ہے۔ اس تصور سے پہلی بار اس کو بہت حیرانی ہوئی۔ جب یہ احساس ہر ملاقات کا حاصل بن گیا تو اس نے اس کا تجزیہ کرنا شروع کیا اور اس نے جانا کہ اس کی دلچسپی سرسری سی نہ تھی بلکہ اس دلچسپی کی جڑیں آہستہ آہستہ اس کے ہردے تک پھیل رہی تھیں اور پھر ایک سمے ایسا بھی آیا کہ اس نے حیرانی سے محسوس کیا کہ یہ جڑیں اس کے ہردے میں بہت گہری ہیں اور ایک درخت اس کے انتر اگ رہا ہے جس کی شاخیں اس کے شریر کے روم روم میں تھیں اور جب بھی سدھیشور کے ساتھ اس کی گفتگو، اس کے پتا کی موجودگی میں، سوشیلا کی موجودگی میں یا کبھی تنہائی میں ہوتی تو اس سے اس کے انتر ایسی ہوا چلتی کہ اس درخت کی شاخیں جھومنے لگتیں، گنگنانے اور گانے لگتیں۔ وہ خوف زدہ سی ہو جاتی اور من ہی من میں لجا جاتی۔

پھر یوں ہوا کہ وہ سوشیلا اور سدھیشور گھوڑ سواری کے لیے اپنے علاقے میں نکل دوسرے زمینداروں اور جاگیرداروں کے علاقوں سے ہوتے ہوئے کسی بن میں نکل جاتے اور وہاں سے کبھی کسی جاگیردار کی شکارگاہ میں۔ ایسی شکارگاہوں میں کھلے میدانوں کو دیکھ گھوڑے مچل جاتے اور وہ ان کو بگٹٹ دوڑنے کے لیے کھلا چھوڑ دیتے۔ ایسی دوڑ ارملا

کے اندر ایک ہیجان پیدا کر دیتی جس کی نوعیت کا پہلے پہل وہ تعین نہ کر پائی۔ایسی کئی سیروں اور دوڑوں کے بعد اس پر کھلنے لگا کہ اس کے شریر میں اک شکتی جا گی ہے، اس شکتی سے بہت انوکھا آنند اس کو ملتا ہے، اس آنند میں اک زور، اک تشدد کی کیفیت ہے؛ جیسے بن میں آگ لگی ہو اور ہر دم تیز ہور ہی ہو اور ہوا کا زور اور شور ہر لمحہ بڑھتا رہا ہو، کچھ عرصے میں یہ آگ ماند پڑ جاتی ہو۔ایک دن ایسی ہی سیر سے واپس آ کر اپنے کمرے میں لیٹنے کے بعد اس کے انتر ایک کوندا سا ہوا، اس کے انگ انگ رچنے لگا اور ایک آنند کا روپ دھارنے لگا۔اس نے محسوس کیا کہ اس آنند کی نوعیت جنسی ہے۔اس احساس سے وہ بہت خوفزدہ ہوئی۔اس کو کبھی خیال نہ آیا تھا کہ کوئی مرد اس کو اس طرح جھنجھوڑے گا۔جنس اس کو نا گوار کبھی نہ تھی مگر اس نے ہمیشہ ہی سوچا تھا کہ جنس اس کے انتر کی تمام صلاحیتوں سے ہم آہنگ ہوگی جیسے کسی راگ میں سر، مگر یہ احساس تو خود راگ بنا چاہتا تھا اور باقی تمام صلاحیتوں کو سُر بنانے پر تلا نظر آتا تھا۔مگر وہ جانتی تھی کہ کسی بھی شدید احساس سے یدھ کرنا مناسب نہیں کیونکہ اس کے کارن وہ اپنے پاؤں بڑی مضبوطی سے شریر میں، من میں، چتینہ میں اور پھر ہردے ہی میں جما لیتا ہے۔اسی لیے اس نے اس احساس کے گرد کسی قسم کا حصار بنانے کی کوشش نہ کی بلکہ سمندر کی لہروں کی طرح ساحل یا چٹان پر یلغار کرنے کی اجازت دے دی اور اپنے اہنکار کو بیدار رکھا۔بعض لہریں اتنے زور سے آتیں کہ اس کو ڈر لگتا کہ آج اس کا اہنکار اس ریلے میں بہہ جائے گا مگر ایسا کبھی نہ ہوتا۔پھر وہ اس جذبے کی یلغار کی لہروں کا بھی مزا لینے لگی اور یہ لہریں اس کے اہنکار کے ساحل کی صورت گری کرنے لگیں۔اس کو آئینے میں نظر آنے لگا کہ اس کے تن بدن میں، اس کے چہرے پر ایک نا قابل گرفت جان لپکنے، لہرانے لگی ہے۔

ارملا کے انتر کی اس تبدیلی کو سوشیلا نے اس وقت محسوس کیا جب اس کے چہرے اور تن بدن میں جان لپکنے لہرانے لگی۔اس نے اس کیفیت سے اندازہ لگا لیا کہ ارملا پر کیا بیت رہا ہے مگر وہ اپنے سدھیشور بھیا کو اچھی طرح سے نہ جانتی تھی کیونکہ وہ ہمیشہ گھر سے دور رہے تھے اور وہ خود بھی کئی سال گھر سے دور رہی تھی۔اس کے بھائی نے دوبارا اپنی تعلیم کے سلسلے کو

بدل لیا تھا، پہلے اس نے کیمسٹری میں ایم ایس سی کی تھی اور اس کے ایک سال بعد معاشیات میں ایم اے اور اس کے بعد اس نے انجینئرنگ میں داخلہ لے لیا تھا۔ تعلیم کے اس طویل سفر میں اس کا کوئی ساتھی نہ تھا۔ وہ اس کے لیے بند کتاب تھا جو پہلی بار ہریش پور آ کر اس کے لیے وا ہوئی تھی مگر وہ اس کا پوری طرح مطالعہ ہی نہ کر پائی تھی۔ اس لیے وہ فیصلہ نہ کر سکی کہ ارملا میں جو کیفیت رچی ہے اس کا انجام کیا ہوگا یا کیا ہونا چاہیے اور اس سلسلے میں وہ کیا کر سکتی تھی اور اس کو کیا کرنا چاہیے۔ اس کے تصور میں ہمیشہ ہی رہا کہ وہ ارملا کو اپنے بھائی ستیہ کمار کے لیے بیاہ کر لائے گی کیونکہ دونوں کے مزاج میں ایک سنت پن تھا، وہ دونوں دوسروں کے لیے کچھ کر کے بہت خوش ہوتے تھے اور اپنے لئے اتنی کوشش اور محنت نہ کرتے تھے جتنی دوسروں کے لیے مگر ستیہ کمار میں ارملا کی دلچسپی کچھ زیادہ نہ تھی۔ وہ اس سے مل کر خوش بہت ہوتی تھی اور اس کی روزمرہ کی زندگی میں دلچسپی بھی لیتی تھی۔ اس کے ساتھ شام کے دھندلکوں اور سویرے کے اجالوں میں سیر کرنا بھی پسند کرتی تھی بلکہ یوں کہنا زیادہ مناسب تھا کہ اس نے صبح شام ستیہ کمار کے ساتھ سیر کرنا اپنا معمول بنا لیا تھا (اس معمول میں تبدیلی تب ہوتی جب وہ خود اس کے اور سدھیشور کے ساتھ گھڑسواری کو جاتی۔) دونوں میں ایک ہمہ گیر تفہیم تھی، جیسے دونوں نے ایک دوسرے کو حدامکان تک جان لیا اور پسند کیا ہو۔ مگر اس پسند میں کوئی ہیجان نہ تھا، کوئی سرور، کوئی غلو نہ تھا۔ دونوں کے درمیان اگر کوئی رشتہ تھا تو ایسا جیسا باغ اور نالیوں کے جال میں بہتے ہوئے اس پانی کا جو باغ کو سیراب کرتا ہو۔ اس کا یہ بھائی صحیح معنوں میں مردانہ حسن اور شگفتگی کا مظہر تھا۔ گلابی رنگ اس کے چہرے پر رقصاں اس کو اکثر بھاتا تھا۔ اس کے چہرے کا ہر عضو اپنی ذات میں حسین تھا اور باقی اعضا کے ساتھ اس کا رشتہ بھی متناسب تھا، سوائے کان کے اور اس کا چہرہ مستطیل اور چوکور کا ایک عجب سا توازن لئے ہوئے تھا۔ کسی زاویہ سے اس کا چہرہ مستطیل نظر آتا تھا اور کسی سے چوکور۔ اس تاثر میں اس کے کانوں کا بہت بڑا حصہ تھا۔ اس کے کان اس کے چہرے کے مطابق چھوٹے لگتے تھے اور سر کے ساتھ لگے ہوئے تھے۔ جب وہ باتیں کرتا کرتا ان میں بھیگ جاتا تو اس کے کان اس کے سر سے ذرا سا پرے ہٹ جاتے اور جب اس کے جسم میں کسی قسم کا تناؤ آ جاتا وہ سر کے ساتھ لگ جاتے۔ پہلی صورت میں اس کا چہرہ چوکور سا لگنے لگتا

اور دوسری صورت میں مستطیل۔مگر اس کے سر کی پشت مدور تھی جس سے احساس ہوتا ہے کہ اس کے چہرے میں وسعت ہے، گہرائی ہے، جو اس کی پوری شخصیت کا آئینہ ہے۔

اس کا ماتھا، اس کے چہرے میں نہ تو تنگ تھا اور نہ فراخ، اس کی آنکھیں نہ بڑی بڑی اور نہ چھوٹی چھوٹی، اس کی آنکھوں کی پتلیاں کالی تو نہ تھیں مگر بھوری بھی نہ تھیں بلکہ ان کے امتزاج سے بنا ہوا کوئی دوسرا رنگ تھا جو کبھی ہلکا سیاہ، کبھی گہرا بھورا اور کبھی کبھی بجلی کی تیز روشنی میں گہرا نیلا لگتا جس میں سیاہی بھی رچی ہو۔اس کی ناک ستواں اس کے ماتھے کی ہی توسیع لگتی تھی، جیسے زمین سمندر کے اندر تک چلی گئی ہو۔اس کے گلابی ہونٹ نہ پتلے تھے اور نہ بھرے بھرے اور ان پر کبھی مسکراہٹ، کبھی سوال، کبھی دونوں کی ملی جلی کیفیت رقصاں رہتی۔اس کے شانے اس کے کرتے کے نیچے ہموار اور ملائم نظر آتے، وہ نہ تو تنے ہوئے اور نہ جھکے ہوئے تھے۔اس کا سینہ فراخ نہ ہوتے ہوئے بھی فراخ لگتا تھا۔اس کی کمر اور اس کے کولہے اس کے سینے اور اس کی رانوں کے ساتھ قوسیں بناتے تھے۔وہ درختوں میں چلتا ہوا ایک درخت لگتا تھا جس کی جلد بہت ملائم ہو جو نہ یوکلپٹس کی طرح بلند و بالا ہو اور نہ آرائشی سرو کی طرح پست قد۔اس کی آواز میں جھرنوں کے بہنے کی سی ہمواری تھی اور بڑی وضاحت سے وہ ہر لفظ کو اس کے پورے صوتی تلفظ سے ادا کرتا تھا۔اس کے جسم کے مجموعی طرزِ عمل سے جلدی کا یا سستی کا احساس نہ ہوتا تھا، لگتا تھا کہ وہ جانتا ہے کہ اس کو کیا کرنا ہے اور کتنے عرصے میں۔

دونوں میں سے ارملا کس کی طرف اتنی مائل ہوگی کہ اس کی بننے کا فیصلہ کرلے؟ سوشیلا کے لیے یہ ایک مسئلہ بن گیا اور دونوں میں سے کسی طرف ارملا کو جھکانے کے لیے اپنے آپ کو تیار نہ کرنا چاہتی تھی۔اس خیال میں اس کو بے انصافی اور تعصب کی بو آتی تھی اور وہ خود بھی تو نہ جانتی تھی کہ اس کے بھائیوں کا ارملا سے کس طرح کا لگاؤ ہے۔وہ لگاؤ تو محسوس کرتی تھی مگر اس کی نوعیت کا تعین نہ کر پا رہی تھی کیونکہ وہ اپنے طالب علموں اور طالبات میں بہت مصروف رہتی تھی اور اس کے بھائی بھی بہت مصروف رہتے تھے۔صرف ارملا کو فرصت ہی فرصت تھی۔وہ اس معاملے میں کسی سے تبادلہء خیال بھی نہ کر سکتی تھی کیونکہ پتا

سے اور ماتا سے اس معاملے میں بات کرتے ہوئے وہ ہچکچاتی تھی کہ اس کو حجاب سا تھا اور وہ اس حجاب کو اس وقت تک اٹھانا نہ چاہتی تھی جب تک اس کو یقین نہ ہو جائے کہ ایسا کرنے سے اس کے سوال کا جواب مل جائے گا۔ مگر اس کو جواب ملنے کی توقع نہ تھی کیونکہ اس طرح کے لوگوں سے وہ (اس کے ماتا پتا) اپنی زندگی میں کہاں ملے ہوں گے اور اس طرح کے جذبات سے آشنا ہونے کی اسے توقع ہی نہ تھی۔ ایسے لوگوں میں ایسا جذبہ جو حالات پیدا کر سکتا ہے اس کی سنگینی کا اندازہ کرنے کے لیے نہ صرف تجربے اور علم بلکہ تخیل کی جس قدر ضرورت تھی وہ اس کو اپنے سوا کسی دوسرے میں نظر نہ آتے تھے۔ وہ خود ایسی ہی صورتِ حال سے گزر چکی تھی اور اس پر قابو پا چکی تھی۔ مگر ارملا اس سے مختلف عورت تھی اور مردوں کا تجربہ اس کو بہت کم تھا، وہ نہ تو مردوں کے کالج میں پڑھی تھی اور نہ یونیورسٹی میں لڑکوں سے مسلسل ملی تھی۔ وہ تو صرف اپنے نوکروں کو، مزارعوں کو اور اپنے باپ کو جانتی تھی۔ کرشن کمار اور روی شنکر سے اس کی ملاقاتیں کچھ سرسری سی تھیں، اگرچہ کرشن کمار میں اس کو کافی دلچسپی تھی مگر اتنی دلچسپی تو ہر اس انسان کو ہو گی جس کے گھر میں کوئی آ کر یوں ہفتوں رہے، جس نے اس کی تصویر بنانے کے لیے کئی دن گھنٹوں اس کو غور سے دیکھا ہو۔

وہ چاہتی تھی کہ وہ جان سکے کہ اس کے دونوں بھائیوں کے جذبات ارملا کے بارے میں کیسے اور کتنے گہرے یا کتنے سرسری تھے۔ اس سوال کا جواب جاننے کے لیے اس نے آہستہ آہستہ وقت نکالنا شروع کیا اور دونوں کو غور سے دیکھنا شروع کیا اور گرد و نواح کے زمینداروں اور جاگیرداروں کے ہاں بھائیوں کو لے کر جانا شروع کیا مگر ارملا نے ان کے ساتھ جانے سے ہمیشہ گریز کیا اور ہر بار ایسا جواز پیش کیا کہ جس کی سچائی نہایت ہی واضح ہوتی تھی۔ وہ اپنے متعلق اور اپنے مستقبل کے متعلق سوچنے کے لیے تنہائی چاہتی تھی اور موسم ایسا تھا کہ وہ چاہتی کہ وہ ان کی زمینوں پر گھومے پھرے اور اجنبی لوگوں سے، لڑکوں، لڑکیوں، بچوں سے ملے۔

ان کے جانے کے سبب زمینداروں کے لڑکوں اور لڑکیوں نے ان کے یہاں آنا جانا شروع کر دیا اور شکار اور پکنک کے پروگرام بننے لگے۔ ان تمام کارروائیوں میں سوشیلا کی

نظریں اپنے بھائیوں پر لگی رہتیں۔ اس کو بعض دفعہ لگتا کہ وہ نئے واقفوں کے ساتھ کھل نہیں رہے اور اگر کھل رہے ہیں تو اس میں ایک پلان ہے کہ کس کو اپنا آپ کب اور کتنا دکھانا ہے اور یہ کہ اپنے تاثر کو پہلے سے متعین کیا گیا ہے مگر اس ناٹک میں خلوص کا مناسب رچاؤ بھی ہوتا تھا۔ اس کو لگتا کہ دونوں دوسرے لوگوں اور لڑکیوں میں اتنی دلچسپی لینا چاہتے تھے کہ دوسرے کو مسرت تو ہو مگر وہ ان میں اتنی دلچسپی نہ لیں کہ وہ محسوس کرنے لگیں کہ شاید کوئی وعدہ، کوئی عہد کیا جا رہا ہے۔ اس میں لبھانے کا عنصر بالکل نہ تھا مگر تفریح مہیا کرنے کی خواہش نمایاں نظر آتی۔ اس کو اس طرح لگتا کہ ان کا من اور ہر دے کسی دوسرے مگر بہت اہم کام میں مصروف ہے۔

ایک دفعہ ایسا ہوا کہ ستیہ کمار سے جاگیردار گلاب سنگھ نے فرمائش کی وہ ان کے یہاں رہے اور اگلے دن اس کے جانوروں کو دیکھے اور مشورہ دے کہ ان کی دیکھ بھال میں کیا کمی ہے اور اس کو کیسے پورا کیا جا سکتا ہے۔ اس فرمائش میں اتنا خلوص تھا کہ اس کو وہاں ٹھہرنا پڑا اور سوشیلا اور سدھیشور دونوں کو چاندنی رات میں تیس میل کا فاصلہ اکیلے ہی طے کرنا پڑا۔ سوشیلا نے مزاحاً کہا کہ جاگیردار ستیہ کمار کو ورغلا نہ لے؟ اس کے جواب میں سدھیشور نے کہا: ''جو منش ارملا جیسی لڑکی کو چاہتا ہو اسے کوئی نہیں ورغلا سکتا۔''

''آپ نے یہ کیسے کہہ دیا ہے؟ میں نے تو کبھی اس کے طرزِ عمل میں ایسی بات نہیں دیکھی کہ اس کو چاہنا کہا جا سکے۔''

''تم ستیہ کمار کو نہیں جانتی وہ اس دریا کی طرح ہے جو زمین پر بھی بہتا ہو اور زمین کے اندر بھی۔ تم نے باہر کا دریا دیکھا ہے اس میں کوئی طوفان نہیں ہے، وہ بہت ہموار بہتا ہے۔ مگر یہ باہر کا دریا بہت چھوٹا دریا ہے اور اس کے اندر بہنے والا دریا بہت بڑا ہے اور بڑا پرہول۔ اس کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ اس کا خیال ہے کہ ارملا کے لیے میرے من میں بہت گھمبیر پریم ہے اور وہ بھی میری طرف نہ صرف مائل ہے بلکہ اس کو مجھ سے بہت گہرا لگاؤ ہے......''

''میرا بھی یہی خیال ہے۔ کیا یہ بات حقیقت نہیں ہے کہ آپ کو ارملا میں بہت گہری

دلچسپی ہے اور آپ اس کو لبھانے بلکہ موہنے کے لیے اپنے شریر اور من کی ہر صلاحیت کو بھرپور طریقے سے استعمال کرتے ہیں۔''

''نہیں! یہ بات نہیں ہے۔ اس کی موجودگی میں محسوس کرتا ہوں کہ میں اپنے آپ کو پہچاننے لگ گیا ہوں، میں اپنے آپ کو Discover کر رہا ہوں، ارملا میرے لیے وہ روشنی ہے جس کے ذریعے میں اپنے انتر اتر سکتا ہوں اپنے انتر سفر کر سکتا ہوں۔ میں نے اس سفر میں اپنے اندر کئی صلاحیتیں تلاش کی ہیں جن کی مجھے اپنے مستقبل کی زندگی میں ضرورت ہوگی۔ میں نے تنہائی کے برف زاروں میں کچھ تلاش کرتے ہوئے اک عمر گزاری ہے۔ سردی نے مجھے بالکل سرد کر دیا تھا۔ ارملا کی شخصیت میرے لیے سورج کی طرح ہے۔ اس کی حرارت کو جب میں اپنے اندر رچتے پھیلتے محسوس کرتا ہوں تو ایک نیا منش مجھے اپنے اندر جنم لیتے محسوس ہوتا ہے۔ اس نئے منش کو جوان ہونے کے لیے کچھ دیر اس حرارت کی ضرورت ہے۔ اس کے بعد کیا ہوگا فی الحال میں نہیں جانتا اور میں جاننا بھی نہیں چاہتا۔ دھوپ مجھے بہت بھلی لگتی ہے، میں ابھی دھوپ میں رہنا چاہتا ہوں۔''

''مگر آپ نے کبھی سوچا ہے کہ آپ کے اس رویے کا ارملا پر کیا اثر ہوتا ہے، ہوا ہے۔ جو کچھ آپ اس کے ساتھ کر رہے ہیں، وہ زیادتی نہیں ہے، دوسروں کو اپنے مقصد کے لیے استعمال کرنا نہیں ہے۔ اگر ہے تو یہ ظلم ہے، اتیا چار ہے۔''

''میری اچھی بہنا! ناراض نہ ہو، میں جانتا ہوں کہ میں نے ارملا کو خاصا متاثر کیا ہے اور یہ کہ اگر اس کی جگہ کوئی دوسری ناری ہوتی تو بہک گئی ہوتی اور شاید میں بھی اس کے ساتھ بہک گیا ہوتا۔ مگر تم بھی جانتی ہو کہ ارملا ایک سندر ناری ہی نہیں، وہ ایک سنت بھی ہے جس نے اپنے انتر اور شریر کی ہر صلاحیت کو ایسے نظام میں ہم آہنگ کر لیا ہے کہ کوئی بیرونی اثر اس آہنگ کو نقصان نہیں پہنچا سکتا، زیادہ سے زیادہ اس آہنگ میں کچھ شامل کرے گا مگر اس شمولیت سے اک نیا آہنگ بنے گا جس کا آدرش ہمیشہ ایک ہی رہے گا۔ میں اس کے جیون مارگ کی ایک منزل کا ساتھی تو ہو سکتا ہوں مگر اس جیون مارگ کا سناتن سنگی نہیں ہو سکتا اور اس کو ایسے ہی سنگی کی تلاش ہے۔''

''نہیں بھیا! تم اس کی دیہہ میں اس طرح رچ گئے ہو جیسے پیاسی زمین میں ورشا......

''بالکل! مگر اس میں سے جو کچھ اگے گا اس کا تعین ورشا نہیں وہ بیج اور زمین کی اپنی خاصیت کرے گی، ورشا تو صرف ان دونوں کا ملاپ کراتی ہے۔ میں اس کے لیے ورشا تو ہوں مگر اس کے لیے بیج نہیں ہوں اور نہ ہی ہوا ہوں جو کسی درخت سے بیج اڑا لاتی ہے اور بھیگی زمین پر لا گراتی ہے۔ میں وہ حالات ہوں جو کسی نئے نظام کو مستقبل کے بطن سے وجود میں لاتے ہیں۔''

''اوہ! میں ایک انسان کی بات کر رہی ہوں جو ہماری پھوپھی کی بیٹی بھی ہے، کسی Productive forces کا ذکر نہیں کر رہی ہوں کہ آپ مارکسی فلسفے کا ذکر لے بیٹھیں۔''

''ایسی تو کوئی بات نہیں تھی۔ میں نے تو اس اصول کا ذکر استعارے کے طور پر سمجھانے کے لیے کیا تھا۔ میں تمہاری طرح ادب کا گیانی نہیں ہوں کہ کوئی ادبی استعارہ پیش کرتا۔ بات تمہاری سمجھ میں بھی آ گئی ہے۔ اس سمجھ کو اپنے اندر رہنے دو۔ تمہیں یہ بات سچی معلوم ہوگی۔ انسانوں کے بارے میں منطق ہی سے کام نہیں لیا جا سکتا۔ اس کے لیے speculative imagination بھی چاہیے اور یہ تم میں موجود ہے۔ اب میری باتوں کی روشنی میں ارملا کے جذبات اور احساسات کو سمجھنے کی کوشش کرو۔ میں ارملا کا بہت ہی ممنون ہوں کہ اس کے کارن میں اپنے آپ کو سمجھنے لگا ہوں۔ کچھ عرصہ گزرنے کے بعد اس کو محسوس ہوگا کہ میں اس کے لیے ایک نشہ سا تھا جس نے اس کے انتر بہت شور کیا تھا، جس نے اس کے حواس کو بے ترتیب کر دیا اور اس بے ترتیبی کے زیر اثر اس نے اپنے انتر اور باہر کچھ عجیب، دلفریب مناظر دیکھے تھے، مگر جن کا اثر اس کے ہردے، اس کے من، اس کی چیتنیہ میں نہیں رہا، صرف اس کی یادداشت میں رہ گیا ہے۔ جب یہ احساس اس کو ہوگا تو وہ مجھے معاف کر دیگی اور ہو سکتا ہے کہ وہ اس experience کے لیے میری شکر گزار بھی ہو......

میں یہ بھی جانتا ہوں کہ وہ اس سارے experience کا تمہاری طرح تجزیہ نہیں کر پائے گی مگر وہ تجزیہ کرے گی ہی نہیں کیونکہ اس کی شخصیت میں علم اور عقل کو وہ مقام نہیں

ہے جو تمہارے یہاں ہے۔ اس کے یہاں شعور عقل اور علم کا حاصل نہیں ہے بلکہ ایسے وجدان کا جو علم کا نقیض نہیں ہے۔ اس وجدان میں عقل اور علم کا کام اتنا ہی ہے کہ وہ Jumping pad بن جائیں مگر پرواز کی قوت کہیں اور سے آتی ہے۔

میری بات ان گڑھ مگر میرا خیال ہے کہ تم نے اس کو پکڑ لیا ہے۔ اب تم اس کو بہتر الفاظ دے سکتی ہو جس سے یہ بات پوری طرح واضح ہو جائے اور نکھر جائے۔''

''لیکن......''

''لیکن ویکن کچھ نہیں۔ جیون کی ندی کو بہنے دو، گدلاہٹ بھی زمینوں کے لیے نئی مٹی لے جانے کا ذریعہ ہے۔ یہ نئی مٹی پرانی زمین کو شکتی دیتی ہے۔''

''استعارے، استعارے! یہ حقیقت کے مترادف نہیں ہو سکتے۔''

''میں کب کہتا ہوں کہ ایسا ہو سکتا ہے۔ میں تو صرف اتنا ہی کہتا ہوں کہ کبھی کبھی ایسا بھی ہوتا ہے۔ حقیت اتنی ان جانی ہوتی ہے کہ اس کو فوراً ہی پہچانا نہیں جا سکتا، اس کے لیے انتظار کرنا ضروری ہے کہ وہ خود آپ کے اتنے قریب آ جائے اور اس قرب کے سبب آپ اس کو سمجھنے لگ جائیں۔

میرے اور ارملا اور ستیہ کمار کے تعلقات کی نوعیت بھی کچھ ایسی ہی ہے......''

اس گفتگو کے ختم ہوتے ہی انہوں نے محسوس کیا کہ وہ اپنے گھر پہنچ گئے ہیں۔

''سوشیلا! ہمیں اس نئے جیون کو شروع کئے چار سال ہونے کو ہیں اور ہم نے ابھی ہرلیش پور میں اپنی جڑیں نہیں اتاریں۔ ایسا لگتا ہے کہ ہم پکنک منانے آئے ہوئے ہیں اور کچھ عرصے کے بعد چلے جائیں گے۔

تم نے ابھی تک اپنے کسی بھائی کے لیے استری چنی ہی نہیں۔ ان کی شادیاں ہوں، بچے ہوں، وہ اس ماحول میں پلیں تو ان کو اس ماحول سے لگاؤ ہو، اس کو اپنا مستقبل جانیں۔ اس سے مجھ کو یقین آئے گا کہ یہ نیا جیون حقیقت ہے، ایک اچھا سا سپنا نہیں ہے۔ یہ ستیہ کمار اور سدھیشور کیوں نہیں طے کر لیتے کہ کس کو ارملا سے بیاہ کرنا ہے۔ اس بیچاری کو الجھن

میں ڈال رکھا ہے۔ایک نے اس کو موہ رکھا ہے اور دوسرے کے روبرو وہ من ہی من میں جھک جانا چاہتی ہے کہ وہ اس کا سراوپر اٹھائے اور کہے کہ وہ اس کے ساتھ جیون مارگ پر آخری سانس تک چلنے کو تیار ہے۔ان دونوں میں کوئی ایک ہمت کیوں نہیں کرتا؟ یہ ارملا ہی کیوں نہیں طے کر لیتی کہ وہ کس کے ساتھ جیون بتانا پسند کرے گی۔

تم ان کی مدد کیوں نہیں کرتیں۔ میں مانتا ہوں کہ یہ دونوں تم سے بڑے ہیں اور تمہارے لئے اجنبی ہیں مگر یہ ارملا کو تم اچھی طرح جانتی ہو،تم میں اتنی دوستی ہے، پیار ہے،تم اس کو ذرا ساٹہوکا دو تا کہ وہ کسی اُور تو بڑھے۔

میں اب زیادہ دیر انتظار نہیں کروں گا۔کوئی ایک تو بیاہا جائے۔ان دونوں کو تو کچھ دیر کے لیے چھوڑا جا سکتا ہے مگر اس گوری شنکر کے لیے تو فوراً لڑکی تلاش کر و ورنہ میں خود فیصلہ کر دونگا۔ میں نے سلامت علی سے بات کی ہے۔ کچھ لڑکیاں اس کی نظر میں ہیں۔ یہ جاگیرداروں، زمینداروں کی بیٹیاں کسی کام کی نہیں ہیں۔ یہ تو امر بیل ہیں، امر بیل۔ میں کسی کو بہو بنانا پسند نہ کروں گا۔ ہمارے اپنے علاقے میں بیس ہزار کی آبادی ہے۔اس میں دو لڑکیاں نہیں ملیں تمہیں۔''

پتاجی! آپ کو سب کچھ پتہ ہی ہے۔ارملا کے معاملات نے مجھے بہت پریشان کر رکھا ہے۔ میں نے کئی برسوں سے سوچ رکھا تھا کہ اس کو ستیہ کمار سے بیاہ لاؤں گی مگر معاملہ سدھیشور کی وجہ سے ٹیڑھا ہو گیا ہے۔وہ یہ جانتے ہوئے کہ وہ ارملا کے لیے وہ نہیں بن سکتا جو ارملا اپنے پتی کو چاہے گی کہ وہ ہو مگر پھر بھی وہ اس کی دوستی چاہتا ہے اور ارملا بھی اس سے fascinate ہوتی ہے یہ جانتے ہوئے کہ ستیہ کمار کے ساتھ اس کا جوڑ خوب خوب نبھے گا۔ بعض دفعہ میں اتنی پریشان ہو جاتی ہوں کہ میرا جی چاہتا کہ ان تینوں کی اتنی پٹائی کروں کہ وہ چیخ اٹھیں کہ وہ جلد ہی فیصلہ کر لیں کہ کون کس سے وِواہ کرے گا۔

میرا خیال ہے کہ آپ پھوپھی اور پھو پھا سے ستیہ کمار کے لیے ارملا کا رشتہ مانگ ہی لیں۔ میں چند دنوں شِوکوٹ چلی جاتی ہوں ارملا کو لیکر۔آپ بھی چلے آئیں۔ پھر جو ہو سو ہو۔''

''یہی مناسب ہے۔تم نے پہلے یہ کیوں نہ سوچا۔''

''میں کسی کی باپ تو نہیں کہ میں ان کے جیون مرن کے فیصلے کرتی۔'' میں بہن ہوں اور سہیلی۔ میں تو چاہتی تھی کہ ایسا فیصلہ ہو جس کو سب کا من سویکار کرے۔مگر ایسا ہونے میں شاید بہت دیر ہو جائے۔اب حالات کو مجبور کرنا ہی ہوگا کہ وہ کسی طور طے ہو ہی جائیں۔

جانے سے پہلے اس نے ستیہ کمار سے ساری بات کھول کر کی۔اس نے اس کی بات کو بہت غور سے سنا، اس پر غور کیا اور پھر کہنے لگا:

''کسی نے ارملا سے بھی پوچھا کہ وہ کیا چاہتی ہے؟ ہم اس کے جیون کا فیصلہ کرنے والے کون ہوتے ہیں۔

''آپ ہی نے پوچھ لیا ہوتا۔آپ کے ساتھ صبح شام سیر کو جاتی ہے۔آپ دونوں گھنٹوں کیا باتیں کرتے رہتے ہیں۔''

''باتیں! کچھ بھی نہیں۔ میں نے اس کے ساتھ کبھی ایسی ضرورت ہی محسوس نہیں کی۔ اس کے ساتھ ہم آہنگ ہو کر چلنا مجھے بہت بھلا لگتا ہے۔کھلی فضاؤں میں اس کے ساتھ چلنا اور گگن میں دو تاروں کا ہمیشہ ساتھ ساتھ چلنا مجھے ایک سا لگتا ہے۔ دونوں الگ ہوتے ہوتے بھی ایک دوسرے کو اپنے مدار میں قائم رکھتے ہیں، دونوں میں اگر فاصلہ بڑھ جائے تو دونوں ہی گگن سے نیچے گر جائیں......

''پھر بھی آپ نے اس معاملے میں ارملا سے بات نہیں کی۔کیوں؟''

''میں نے ہمیشہ یہی سمجھا کہ اس ربط میں کوئی رشتہ حائل نہیں ہوسکتا۔اگر وہ بھیا کی پتنی بننا طے بھی کرے تو بھی اس کے ساتھ یہ رشتہ تو قائم رہ سکتا اور اس رشتے کے قیام کے لیے اس سے بیاہ کرنے کا مجھے جواز نہیں ملا۔''

''کیسی باتیں کرتے ہو They are so abstract۔دوستی کے ساتھ جب جنس شامل ہو جائے تو پریم کہلاتی ہے اور اس سے بڑھ کر بیاہ کے لیے کونسا جواز آپ کو چاہیے...... میں جنس کی بات نہیں کرنا چاہتی تھی مگر آپ کے obtuseness نے مجھے مجبور

کر دیا۔ I am sorry

''ارملا، میں اور جنس!...... ہاں! میں جانتا ہوں! میں تمہارے معنی میں ارملا سے پریم کرتا ہوں۔ میں چاہتا ہوں، میں نے برسوں سے چاہا ہے کہ میں اس کی تنہائی کا محافظ بن جاؤں، اس کو فرصت مہیا کر سکوں۔ اس کے بچوں کا باپ بنوں۔ مگر اس کو میں جنسی طور پر نہیں لبھاتا بلکہ سدھیشور لبھاتا ہے بلکہ میں تو سمجھتا ہوں کہ اس نے اس کو موہ لیا ہے۔

اس لیے اس سے پریم کی بات کرنا مجھے کبھی اچھا نہیں لگا اور میں یہ بھی جانتا ہوں کہ وہ بھیا کے ساتھ باتیں کر کے بہت خوش ہوتی ہے۔''

''بھیا! تم اتنے اندھے کیوں ہو؟ محض کامنا پریم اور بیاہ کا کوئی جواز نہیں ہے اس کی تسکین کے لیے ووا کر لینا اپنے آپ کو نرک میں جھونکنے کے برابر ہے اور ارملا اور سدھیشور کی باتیں ایک دوسرے کے لیے sunbath سے زیادہ اہمیت نہیں رکھتیں بعض حالتوں میں سوریہ اشنان بڑا مزا دیتا ہے اور خون کی گردش کے لیے بھی ضروری ہو جاتا ہے۔ مگر اس کے بعد جیون کے دوسرے فیصلوں کے لیے اس کی کوئی ضرورت......!

اگر تم اس کو جنسی طور پر لبھانے کی کوشش کرتے تو ارملا انتر کے ایک بہت بڑے یدھ سے بچ جاتی۔ اس کو تمہاری اور صرف تمہاری ضرورت ہے اور تمہارے لئے اس سے بہتر استری اور جیون سنگی ممکن نہیں۔

کبھی کبھی اپنے لئے بھی اتنی کوشش اور محنت ضروری ہوتی ہے جتنی دوسروں کے لیے تم کرنے کے عادی ہو۔ اور اس معاملے میں ارملا اور تمہاری ضرورت ایک ہی ہے، تم دونوں کا ملاپ، تم دونوں کا ووا......

میں چند دنوں میں شِوکوٹ جاؤں گی۔ اس عرصے میں تم اس کو موہنے کی کوشش یہ سمجھ کر کرو کہ تم دونوں کا جیون مرن کا معاملہ آن پڑا ہے اور وقت بہت کم ہے۔ تم نے بہت دیر کر دی ہے، بھیا۔ اب تو جاگو۔ جتنے منتر یاد ہیں سب اس پر پڑھ ڈالو...... وعدہ کرو کہ تم اپنا سنت پن طاق میں رکھ کر بھول جاؤ گے۔ اس کے، اپنے جیون آنند کے لیے یدھ کرو گے۔ میں تمہاری بنتی کرتی ہوں میں ارملا کو خوش دیکھنا چاہتی اور اپنی بھاوج بھی اور تمہاری پتنی

بھی۔‘‘

’’یہ سب کچھ تو ہو جائے گا۔تم بتاؤتم چندر بھان کے لیے کیا کر رہی ہو۔وہ کہاں پھنس گیا ہے؟ اس پر کوئی آفت تو نہیں آ گئی۔فرانس کی شکست کے بعد وہ کہاں چلا گیا ہے؟ میرے بعض دوست امریکہ میں تعلیم کے لیے گئے ہوئے ہیں۔ان کے کئی امریکی دوستوں کے والد بہت بااثر ہیں اوران کا رسوخ امریکی دفتر خارجہ میں بھی ہے۔میں نے ان کو لکھا تھا کہ کوشش کریں کہ فرانس میں امریکی سفیر کے ذریعے پتہ کریں کہ چندر بھان جرمن قید میں تو نہیں ہے۔اگر ہے تو اس کی رہائی کی کوشش کرائیں۔ ہمارے ملک میں بھی امریکہ کا نمائندہ ہے۔اس تک رسائی تو ہوگئی ہے۔بات بھی ہوگئی ہے۔اس کو چندر بھان کے متعلق بتایا گیا ہے کہ وہ کوئی معمولی آدمی تو نہیں ہے۔اس کا سائنسی کام بین الاقوامی شہرت رکھتا ہے۔مجھے امید ہے کہ چند ہفتوں تک پتہ لگ جائے گا۔‘‘

’’آج بتا رہے ہو یہ بات۔میں مہینوں سے پریشان ہوں۔‘‘

’’کچھ پتہ چل جاتا تو پھر بتاتا۔اس وقت یونہی بات نکل گئی منہ سے۔میرے لیے تمہاری محبت نے بات اگلوادی ہے وقت سے پہلے۔‘‘

’’یہ ارملا کی چاپ لگتی ہے۔میں چلی۔تم جانو اور وہ۔‘‘

ارملا کو دیکھتے ہی ستیہ کمار نے مسکرا کر کہا:

’’آج ہمارے گھر کی ناریاں بہت ہی مصروف لگتی ہیں۔ابھی سوشیلا یہاں تھی مگر اس کو بہت سے کام کرنے تھے لہٰذا وہ بھی چلی گئی ہے۔اب تم ہو تو نہ جانے کس کارن ہوا کے گھوڑے پر سوار ہو۔رک جاؤ،شاید ہم بھی تمہارا ساتھ دے دیں۔جلدی ہے کیا؟‘‘

’’خود سوال کرتے اور خود ہی جواب دیئے چلے جاتے ہیں۔کسی کو بولنے بھی تو دیں شاید کسی کو وہ کچھ کہنا ہو جو آپ سوچ بھی نہ سکتے ہوں......‘‘

’’اچھا! تو یہ بات ہے۔میں اب سنوں گا اور نہیں بولوں گا۔فرمائیے۔‘‘

’’کی نامردوں والی بات، ہر بات میں رعب۔آپ مرد لوگ کسی وقت تو بھول جایا

کریں کہ آپ مرد ہیں، دھرتی پتی ہیں۔''

''وقت لگے گا بری عادتیں چھوڑنے میں، ہزاروں برس لگے ہیں ان کو پالنے میں، ان کے جواز میں نہ جانے براہمنوں کو کتنے گرنتھ بنانے پڑے، کتنی نیتیاں دیولوک سے اتارنی پڑیں۔

اب تو مردوں کے پاس یہ عادتیں ہی رہ گئیں ہیں، اس کو منوانے کے لیے وہ شردھا کہیں نہیں ہے جو نرناریوں کے انتر براجمان رہتی تھی۔''

''اوہو! ایسی شردھا نہ رہنے کا کتنا دکھ ہے ہمارے بھیا کو۔''

''دکھ بھی تو نہیں رہا، اب تو اس کی چھایا ہی رہ گئی ہے اور چھایا بھی ماند پڑنے لگی ہے۔''

''کتنی بے بسی ہے آواز میں، جیسے کسی کا سب کچھ چھن گیا ہو۔''

''چھن ہی تو گیا ہے۔ کال نے سب کچھ نروں سے چھین لیا ہے۔ برابری تو اب محنت سے حاصل کرنی ہوگی۔ من مارنا ہوگا، شریربل کو لگام دینی ہوگی۔ کتنا کٹھن کام ہے یہ۔ شردھا کتنی آسان تھی۔ اس کے بل بوتے سب کچھ آپ ہی آپ ہوجاتا تھا۔''

''یہ برابری اچھی نہیں لگتی، یہ تو ظاہر ہے۔ مگر یہ ناگوار کیوں؟ اس میں برائی ہی کیا ہے؟''

''کچھ بھی تو نہیں مگر یہ اھنکار کو ہر سمے جگائے رکھنا کہ کہیں برابری کو کوئی چوٹ نہ لگ جائے بہت تھکا دینے والا جوکھم ہے، پہاڑ پر گھاٹی کے راستے چڑھنا بہت بھیانک ہے، اھنکار کو ذرا سی اونگھ آئی اور گرے اور ہڈی پسلی چور ہوئی۔ اس نیتی کو تن من میں رچانے کے لیے جُگ چاہئیں۔''

''ایسا کٹھن رتھ نہیں ہے یہ۔ آپ تو ویراگ کے ادھیکارن، ہر سمے کیا کچھ چھوڑنے کے لیے تیار نہیں رہتے۔ نرکو ناری پر جو ادھیکار حاصل رہے ہیں ان کو چھوڑنے میں اتنا دکھ بھی کیا۔''

''کسی کے لیے، منش کے لیے، بہت کچھ ہی نہیں سب کچھ چھوڑا جا سکتا ہے مگر جو کچھ پران مارگ بن جائے اس کو جیتے جی تو چھوڑا نہیں جا سکتا۔ ہوا چلتی ہے تو اس کے سامنے بڑے بڑے درخت جھک جاتے، ٹوٹ جاتے ہیں، دریا ورشا کے کارن جب چڑھ جاتے ہیں تو سب کچھ بہا کر لے جاتے ہیں۔ جب تلک ہوا ہوا ہے اور پانی پانی ہے ایسا ہی ہوتا رہے گا۔''

''بند بھی تو باندھے جاتے ہیں اور پانی کو رام کر لیا جاتا ہے......''

''مگر ہوا کو رام نہیں کیا جا سکتا۔''

''اس لیے کہ تمام لوگوں نے اکٹھے ہو کر اس کے لیے نیتی نہیں بنائی۔ جب ایسی نیتی بن جائے گی تو وشوا کی ہر شکتی رام کر لی جائے گی۔''

''میری گیان وانی بہن کہاں کہاں پہنچی ہے۔ مانا سب کچھ مانا! برابری ہی اچھی ہے!''

''تو پھر یہ سب باتیں کیا تھیں؟''

''ہوا کو رام کرنے کے اپائے۔''

''میں ہوا ہوں؟''

''رکتی جو نہیں، شانت ہی جو نہیں ہوتی۔''

''تو لیجئے شانت ہوئی، رکی۔''

''جھیل کے پانیوں میں اچھال کبھی کبھی تو بھلا لگتا ہے مگر ہر سمے نہیں۔ پانی شانت ہو تو سب کچھ تہہ تک نظر آتا ہے اور ارد گرد کی ہر شے کی چھایا پانی میں صاف صاف نظر آتی ہے اور بھلی لگتی ہے، پیا کے نینوں میں اپنی چھایا کی طرح۔

''یہ سب باتیں کہاں چھپا رکھی تھیں۔ کبھی جھلک تک نہیں دکھلائی۔''

''میں پہلے سوچتا تھا کہ تم مہمانوں کی طرح آتی ہو چلی جاتی ہو۔ سوشیلا کی سہیلی ہو اس کے ساتھ ساجھا کچھ اچھا نہ لگتا۔ ایک ہی تو بہن ہے ہماری۔ اس کے آنند میں ساجھا کچھ جچتا

نہ تھا۔ پھر سے چھوٹی بھی تو ہے۔ بچے کے کھلونوں میں بڑوں کا سا اچھا۔ نیچ بات لگتی ہے۔

مگر اب جب دیکھتا ہوں کہ میرے اس ویراگ سے کیا کچھ تیاگنا ہوگا تو کانپ کانپ گیا۔ چاہتا تھا کہ جو کچھ میں اپنے جیون سے کرنا چاہتا ہوں اس کے لیے ایسا سنگی ملے جو میرے اندر جھانک کر سب کچھ دیکھ سکے اور جو کچھ اس کے انتر پروان چڑھ رہا ہوں، اس کو میں دیکھ سکوں اور جب ہم دونوں ایک دوسرے کو انتر باہر سے جان لیں، پہچان لیں تو پھر ساتھ ساتھ چلیں اور جب ساتھ ساتھ چلنا راس آ جائے تو وواکا ارتھ اپنا لیں۔

اب میں سمجھتا ہوں کہ میری اس نیتی میں ویراگ بہت تھا، کامنا نام کو بھی نہیں تھی۔ اس لیے کسی کو لبھا نہ سکی تھی۔ لبھائے بنا کوئی بھی کسی کے انتر نہیں دیکھتا۔ پراکرتی بھی نہ لبھائے تو منش کبھی اس کو نہ دیکھے۔ پراکرتی ایسا نہ کرے تو تمام جیو مر جائیں۔ پراکرتی لبھاتی ہے۔ یہ اُس کا ارتھ ہے، اس کا دھرم ہے اور اس لیے یہ وشوا، یہ سنسار، یہ جگت پرلایا تلک رہے گا۔ پراکرتی کا یہی دیوَم ہے۔

اس لیے میں نے بھی ویراگ کی نیتی چھوڑ، لبھانے کو اپنی نیتی بنالیا ہے کہ اس وشوا میں کچھ کرنے کے لیے یہی دھرم ہے، یہی وگیان ہے۔ جو کچھ پتا جی، سوشیلا اور ہم تینوں بھائی کرنے کے لیے نیا جیون اپنا رہے ہیں اس کے لیے لبھانا ہی نیتی ہے، موہ لینا ہی ستیہ کی کرتی ہے، ستیہ چت آنند ہے۔

یہ سماج جو ہم بنانا چاہتے ہیں بنے ہی گا تب جب سب ایک دوسرے کو لبھانا اپنا ارتھ بنالیں اور ستیہ کو موہنے کے لیے مل جل کر پرارتھ میں برابر کے سنگی بن کر گرھ کریں۔ بڑی لمبی گرھ ہوگی کئی جنم لینے ہوں گے اس گرھ کو تب جا کر کرتی کا مکھ دیکھنا ملے گا......''

ارملا نے ایک جھرجھری سی لی اور کانپ گئی مگر وہ چپ رہی، جیسے اپنے آپ پر قابو کر رہی ہو، جیسے کوئی گڈریا بھیڑیں اکٹھی کر رہا ہوتا کہ گھر جا سکے رات آنے سے پہلے۔ اس کے چہرے پر، اس کی آنکھوں میں اک سمادھی کی کیفیت چھانے لگی۔ اس کے شریر سے لالی ابلنے لگی، اس کی گردن اور گالوں سے پھوٹنے لگی، جیسے کئی دن رات سے ورشا برس رہی ہو اور جگت میں اندھیرا رہا ہو اور اب کالے کالے بادلوں کی ننھی ننھی درزوں میں سے سوریہ

کی کرنیں سویرے کی خبر لا رہی ہوں۔

''میرے گرو تو میرے آنگن میں تھے اور میں گرام گرام بَن بَن ڈھونڈے پھروں تھی۔ پرنام گرو دیو!''

''چیلی کا پرنام ارپن ہوا، اب گرو کی آ گیا بنا کہیں نہیں جائے گی۔'' وہ مسکراتے ہوئے بولا۔

''اپنے ماتا پتا کے پاس بھی نہیں؟''

''تمہارا گرو ایسا کٹھور اور نرو ہی نہیں ہے۔ پہلے گرو تو ماتا پتا ہی ہوتے ہیں۔ جب وہ اپنے ارتھ کا پالن نہ کریں تو پھر گرو کو ڈھونڈ لینا ہی دھرم ہے۔ شِو کوٹ کب جانا چاہو گی۔ کچھ دن اور رہ جاؤ یہاں۔ مجھے تم سے بہت سی باتیں کرنی ہیں۔ میں بہت دیر ویراگ بن میں کھویا رہا، اب موہ نگر کی سیر کو من مچلتا ہے۔ ست چت آنند کا دیش اسی نگر کے اس پار ہے، وہاں پہنچنے کے لیے اس نگر کے بیچ سے گزرنا ہی ہوگا۔''

شاید اگلے ہفتے تک چندر بھان کا کوئی پتہ مل جائے۔ سوشیلا نے تمہیں کچھ بتایا تھا اس بارے میں۔''

''ہاں! تمہارے ارتھ، تمہاری سمادھی، تمہارے کرم کروَن پھل لائیں اور ہمارے جیون سپھل ہوں......''

''اگلے ہفتے تک انتظار کروں گی۔ اگلے اتوار کو گھر پہنچنا چاہوں گی۔''

اتنے میں سوشیلا لوٹ آئی اور دونوں کو باتوں میں مگن دیکھ کر رک گئی اور دونوں کے مکھ پر کھلاوٹ دیکھ کر وہ بہت خوش ہوئی اور بولی: ''ہمیں بھی کوئی ساتھ لے چلے۔''

''وہاں جانے کے لیے تمہیں کسی کی آ گیا اور اچھیا کی آج ضرورت کیوں پڑ گئی۔ میں نے تو اس گھر میں جنم لیا، پروان چڑھی ہوں، رہنا تو وہاں تمہیں ہے۔ چندر بھان کے آنے کی دیر ہے۔''

''تم دونوں کب سے باتیں کر رہے ہو؟ جب میں گئی تھی تو بھیا وہیں کھڑے تھے

جہاں اب کھڑے ہیں۔"

"تبھی سے۔" ستیہ کمار نے جواب دیا۔

"کہیں بیٹھ گئے ہوتے۔"

"یہ بات دھیان ہی میں نہ آئی۔" ارملا نے جواب دیا۔

"بہت اچھے! تو پھر مجھے آ گیا دیں۔ میں تو تھک گئی ہوں۔ لیٹنے کو شریر کہتا ہے۔

"آؤ پھر۔ تم لیٹنا، میں تمہارے پاس بیٹھوں گی۔"

"تم بھیا، کسی سے کہنا کہ کچھ چٹ پٹا سا کھلائے۔ جب سے شہر سے آئے ہیں کچھ چٹ پٹا سا گھر میں بنا ہی نہیں۔"

ساتواں باب

ایک دن گوری شنکر سلامت علی کے یہاں سے اس کی بیمار گائے کو ٹیکہ لگا کر آ رہا تھا کہ اس نے محسوس کیا کہ ہوا میں بھینی بھینی خوشبو ہے۔ خوشبو نے اس کا راستہ کئی بار کاٹا تو وہ رکا۔ اس نے رک کر چاروں اور دیکھا۔ اس کے سامنے درختوں کا ایک جھنڈ تھا، درختوں سے پیلے، سفید پھول جھڑ رہے تھے۔ کچھ پھولوں کو ہوا اڑا کر جھنڈ سے پرے، نالی میں چمکتے پانی میں گرا رہی تھی اور اس نالی سے اس پار ایک لڑکی ایک چوکھٹے پر لگے ہوئے تنے ہوئے کپڑے پر جھکی کچھ کر رہی تھی۔ وہ ٹھٹکا۔ پھر اپنے آپ پر مسکرایا کہ وہ چوکھٹے کو پہچان نہ سکا۔ کینوس کو سامنے رکھ ایک اجنبی لڑکی تصویر بنا رہی تھی۔ اس نے سوچا کہ وہ سیدھا فارم پر چلا جائے اور اسی ارادے سے اس نے قدم اٹھائے اور چلنے میں کھو گیا۔ جب اس کے قدم رک گئے تو اس نے دیکھا کہ وہ نالی کو پار کر کے لڑکی کے سامنے کھڑا ہے۔ وہ بہت حیرن ہوا اور معذرت کرتے ہوئے کہا:

"میں نے آپ کو پریشان تو نہیں کیا۔ میں تو ڈنگر فارم کی طرف جا رہا تھا۔ نہ جانے

ادھر کیوں آ گیا۔ آپ کی تصویر دیکھ سکتا ہوں کیا؟''

''اتنے سوال کر ڈالے ہیں آپ نے ایک ہی سانس میں۔ میں کسی کا بھی جواب نہ دوں گی۔ میری تصویر ادھوری رہ جائے گی۔ آپ تصویر دیکھ سکتے ہیں۔''

لڑکی کی آواز میں شہر کی تہذیب صاف جھلکتی تھی۔ اس کی آواز میں اعتماد تھا، ایک آہنگ تھا، ایک نرت تھی، ایک کھنک تھی، مدھر اور گھمبیر۔ وہ تصویر بناتی رہی اور وہ دیکھتا رہا۔ تصویر کے درخت، درختوں کے چرنوں میں ہری ہری دوب، دوب میں پھلچیاں اودی اودی، نالی میں بہتا پانی، دودھیا دودھیا، چمکتا چمکتا، گھنے درختوں کے بیچوں بیچ نظر آتے ہوئے دور تک پھیلے ہوئے کھیتوں میں چند انچ اونچی نئی بوئی ہوئی فصل کے ہرے ہرے لہراتے ہوئے پتے اور جھنڈ کے درختوں میں جھلملاتے ہوئے نیلے گگن پر بکھرتا ہوا سنہرا رنگ، اس نے محسوس کیا کہ تصویر مکمل ہو چکی ہے۔ وہ کچھ دیر تصویر کے رنگوں اور رنگوں کے سایوں، ان کے باہمی رشتوں میں گھومتا رہا اور پھر کہنے لگا:

''میں نے ہمیشہ محسوس کیا ہے کہ خزاں سب سے خوبصورت موسم ہے، ہر شے شفاف نکھری ہوئی اور ایسے شدھ رنگ جو اس موسم کے بعد کبھی گگن پر نظر نہیں آتے اور اس موسم میں ہی زمین میں بیج ڈالے جاتے ہیں۔ شاید اسی لیے ہم ہندوؤں کی کتابوں میں گیان اور سمادھی کو خزاں کے موسم سے تشبیہ دی جاتی ہے۔

تمہاری تصویر میں یہ سب کچھ ہے......

تم اس علاقے میں اجنبی ہو۔ شہر کی بو باس رچی ہے تمہاری آواز میں، تمہاری اٹھان میں۔ تم دیہات میں کیا کر رہی ہو۔ تمہارا یہاں کون ہے۔''

''آپ تو مجھے نہیں جانتے مگر میں آپ کو جانتی ہوں۔ آپ گوری شنکر ہیں، علاقے کے ڈنگر ڈاکٹر اور علاقے کے زمیندار کے بیٹے اور سوشیلا دیوی کے بھائی۔ میں کئی ہفتوں سے اس علاقے میں ہوں۔ اب تو جانور اور پرندے بھی مجھے پہچانتے ہیں۔ میں نے کئی بار تصویریں بناتے ہوئے آپ کو آتے جاتے دیکھا ہے مگر کبھی آپ نے نظر اٹھا نہیں دیکھا۔ آپ اپنے آپ میں مگن رہتے ہیں۔ آج نہ جانے کیوں آپ نے نہ صرف دیکھ لیا بلکہ

پوچھ لیا ہے تم کون ہو۔ میں رام شکل کے یہاں ''سلامیتہ'' میں رہتی ہوں۔ مولوی سلامت علی ہمارے قریب ہی رہتے ہیں۔''

''مولوی سلامت علی کے یہاں تو میں کئی دنوں سے جارہا ہوں، ابھی بھی وہیں سے چلا آرہا ہوں۔ ان کی گائے بیمار تھی......شہر میں آپ کیا کرتی ہیں۔''

''ماں باپ کے پاس رہتی ہوں۔''

''میرا مطلب تھا شہر میں کیا کام کرتی ہیں۔ آپ کی تصویروں میں بڑا پختہ فن ہے، ایک پیشہ ورانہ مہارت ہے جو طویل مشق سے اور کسی سے سیکھنے کے بعد آتی ہے۔ کہاں سیکھا یہ فن آپ نے۔''

''آپ نے خواہ مخواہ ڈنگر ڈاکٹری پڑھی۔ آپ کو تو سرکاری وکیل ہونا چاہیے تھا۔ اتنے سوال کرتے ہیں آپ۔''

''انسان سوال کرسکتا ہے یا جواب دے سکتا ہے۔''

''من کی بات بھی تو کرسکتا ہے۔''

''ایسا کرنا جواب مانگتا ہے یا خود جواب ہے، کسی ان پوچھے سوال کا۔''

''آپ تو فلسفی بھی ہیں۔''

''نہیں تو۔ پتا جی اور سوشیلا فلسفی ضرور ہیں۔ میں تو سیدھا سادا انسان ہوں، آنند کا متلاشی......میرے سوال کا جواب نہیں ملا۔''

''کون سے سوال کا۔ ڈھیروں تو سوال آپ نے پوچھ لئے ہیں۔''

''یہ مصوری، آپ نے کہاں سے اور کیوں سیکھی۔''

''بقول غالب مہ رخوں کے لئے اور مہ رخوں سے۔''

''یہ غالب کون ہے۔''

''اردو کا شاعر ہے، بہت بڑا۔''

''تو آپ کو شاعری سے بھی لگاؤ ہے۔''

''کوئی بری بات ہے کیا۔''

''نہیں تو۔ یہ مصوری اور شاعری کے علاوہ بھی کسی کام سے لگاؤ ہے؟''

''ہاں! بھرپور جینے سے۔ حواس بہت بھوکے اور پیاسے ہیں۔ ان کے لیے کچھ نہ کچھ تو سامان کرنا ہی پڑتا ہے۔ آپ کو کوئی اعتراض ہے؟''

''بھرپور جینے کی آرزو پر؟ نہیں، بالکل نہیں! میں خود بھی ایسی ہی کامنا پالتا ہوں۔ تصویر بنائی تو نہیں کبھی مگر دیکھی بہت ہیں۔ ہمارے پتا نے ہمارے شہر والے گھر میں تو ایک چتر شالا بنا رکھی ہے کئی کمروں میں، دالانوں میں۔ شاعری اور موسیقی پتا جی بچپن سے ہمارے کانوں میں ڈالتے رہے ہیں۔ سنسکرت شاعری اور پراچین سنگیت......

جب کسی کو مصوری کرتے دیکھتا ہوں تو چونک جاتا ہوں کہ اس کو تو اس کے لیے فرصت ہے، ہمیں تو نہیں ہے۔ صرف کال بہلاوے کے لیے مصوری کا کوئی جواز نہیں۔ دیکھنے کے لیے نئی انوکھی آنکھیں ہوں تو پھر مصوری کرنے کا حق ہے ورنہ پھر کاشتکاری کرے۔ ڈنگر ڈاکٹری کرے۔''

''آپ اپنے آپ سے ناراض معلوم ہوتے ہیں۔ آنکھ تو آپ کے پاس بھی ہے، آپ نے نظر بھر کر میری تصویر کو دیکھا اور جان لیا کہ میری مشق کتنی پختہ ہے آپ کو پسند ہو تو پیش کروں۔''

''یہ تصویر؟''

''جی''

''یہ بہت مہنگا تحفہ ہے اور ہماری ملاقات پہلی ہے۔''

''آپ کو قبول نہیں ہے؟''

''نہیں۔ مہمانوں سے تحفے نہیں لئے جاتے۔ اور پھر آپ سے لینا تو ڈاکا ڈالنے کے مترادف ہے۔ آپ کا نام بھی تو میں نہیں جانتا۔ تحفے دوستوں سے لئے جاتے ہیں اور میں

یہ دعویٰ نہیں کر سکتا۔''

''میرا نام سنگدھا ہے۔ یہ تصویر اب آپ ہی کی ہے۔ قبول کریں یا نہ کریں۔''

''قبول ہے۔ مگر یہ تصویر آپ کے پاس رہنی چاہیے ابھی کچھ دیر۔ اپنے بچوں کو یوں گھر سے نکال پھینکنا اچھا نہیں۔ اسے کچھ دیر اور پرورش کریں......

تصویریں مصور کی اولاد ہی ہوتی ہیں۔ ان کا قرب اس کے لیے بہت ضروری ہے۔ اس کی اپنی روحانی پرورش کے لیے اور اس کے فن کی پرورش کے لیے......

جب بھی دوستی کی منزل ہم دونوں کے لیے آ گئی تو اس دن اس تحفے کو گھر لے جاؤں گا۔ وعدہ ہے......''

اب اجازت دیں۔ میرے مریض اور میرے جانور میری راہ دیکھتے ہوں گے۔''

سنگدھا کچھ نہ بولی مگر اس کی نظروں نے گوری شنکر کا اس سمے تک پیچھا کیا جب تک کہ وہ اوجھل نہ ہو گیا۔ اس کی آنکھوں سے ایک آنسو ٹپک پڑا۔ وہ پہلے حیران ہوئی اور پھر مسکرائی۔ اس نے اس کو گال پر بہہ جانے دیا۔ ہوا نے نیر کو جلد ہی خشک کر دیا۔

''یہ آنکھوں میں چمک، یہ چال میں جلدی، تن بدن میں توقع۔ مزاج تو آپ کے ٹھیک ہیں؟'' سوشیلا نے گوری شنکر سے پوچھا۔

''تم نے ٹھیک ہی دیکھا اور پڑھا ہے۔ شری مجھ پر مہربان ہے۔ میں حیران ہوں کیوں؟ مجھے ڈر لگتا ہے شری کی مہربانیوں سے۔ اگر میرے دیوم نے کچھ اور کہا تو شری مکھ پھیر لے گی۔''

''یہ رومانٹک کیوں ہو رہے ہو۔''

''تو اس کو رومانٹک ہونا کہتے ہیں۔ تمہارے رومانٹک شعر کچھ ایسی ہی باتیں کرتے تھے؟''

''میں بات کا جواب نہیں دونگی۔ بتاؤ کہ بات کیا ہے۔''

''ساتھ چلو تو تمہیں جواب مل جائے گا۔''

''ساتھ چلنے کی مجھے فرصت نہیں ہے۔ تمھیں تو پتہ ہی ہے کہ بھیا اور ارملا کی منگنی کے لیے مجھے بہت کچھ بندوبست کرنا ہے......''

''تو پھر جواب کا انتظار کرو جب تک کہ تم فارغ نہیں ہو جاتیں۔''

''یہ للکار! چلتی ہوں تمہارے ساتھ۔''

دونوں ساتھ ساتھ گھر سے نکلے اور چھٹے گاؤں اور نویں گاؤں کے درمیان نالیوں کے ایک جال کے بیچوں بیچ درختوں کے ایک جھنڈ کے بیچ ایک لڑکی ان کی طرف پیٹھ کئے دور کہیں دیکھتی تھی۔ جب وہ اس کے قریب پہنچے تو وہ مڑی اور سوشیلا کو دیکھ کر وہ لال ہوگئی، بالوں تک۔

''یہ سنگدھا ہے۔ مصور ہے۔ بہت اچھی...... یہ سوشیلا ہے، تم تو جانتی ہو۔''

سوشیلا نے سنگدھا کو اپنی طرف کھینچ لیا اور اس کا ماتھا چوما اور سر سونگھا۔

''آج کے بعد آپ دونوں سنگدھا کے گھر ملیں گے یا ہمارے گھر۔ کہاں چلنا پسند کروگی۔''

سنگدھا کو اس بات کی توقع ہی نہ تھی۔ وہ ہکا بکا رہ گئی مگر جلد ہی اس نے اپنے آپ پر قابو پالیا مگر جواب نہ بن پڑا۔

''میں حالات کو ہنکانا نہیں چاہتی۔ مگر پھر بھی ملاقات یوں ہونا بھی مناسب نہیں ہے۔ آپ کے گھر والوں کو اور ہمارے گھر والوں کو علم ہونا چاہیے ان ملاقاتوں کا، چاہے ان کا انجام کچھ بھی ہو۔

اگر آپ ہریش پور کسی کے یہاں ٹھہری ہیں تو پھر ان کو بھی میری بات سے اتفاق ہوگا۔ اور ان کو قبول ہوگا کہ آپ دونوں ان کے یہاں ملیں یا ہمارے یہاں۔ ہم پر ان کو اعتماد ہوگا۔''

''اگر مجھ سے ملنا پسند کرو تو میں دوستی کا حق ادا کروں گی......''

''آؤ پھر آپ کے یہاں چلیں۔ تمہاری تصویریں بھی دیکھیں گے......

کہاں چلیں؟''

''رام شکل کے یہاں سلامیتہ میں'' سنگدھا جواب دیا۔

''تو تم جّالا کی کیا ہوتی ہو۔ جّالا میری بہت ذہین شاگرد ہے۔''

''اس کے دادا اور میرے نانا آپس میں بھائی تھے۔''

''تو پھر بھیا آؤ چلیں۔''

جب تینوں سلامیتہ پہنچے تو گاؤں کے موڑ پر ہی مولوی سلامت علی سے ملاقات ہوئی۔

''تو تمہاری آپس میں ملاقات ہو ہی گئی۔ میں یہی چاہتا تھا۔ بلکہ میں تو اب ٹھاکر جی سے اسی لیے ملنے جا رہا تھا۔ اب کل ہی جاؤں گا۔'' مولوی سلامت علی بولے۔ مولوی صاحب بھی ساتھ ہو لئے اور کہنے لگے کہ اسکولوں کے لیے ایک مصور کی ضرورت محسوس کی جا رہی تھی۔ اس لیے سنگدھا کو کسی طرح رکھ لینا چاہیے۔ پنچایت میں بات وہ خود کر لیں گے۔ جب رام شکل کے یہاں پہنچے تو جّالا گھر کے باہر استقبال کو کھڑی تھی۔

''جّالا' تم نے بات ہی نہیں کی اور یہ سنگدھا کئی ہفتوں سے یہاں ہے۔''

''اسکول کے بعد سنگدھا کی وجہ سے گھر سے نکلنا ہی نہیں ہوا۔ ملتی تو ضرور بات کرتی۔ بلکہ میں سوچ رہی تھی کسی چھٹی کے دن آپ سے ملوں۔''

''اچھا تو پھر اتوار کو سنگدھا کو لے کر چلی آؤ۔ سارا دن ہمارے یہاں ہی رہنا......اور ماتا جی آپ بھی ان کے ساتھ ضرور آئیں۔ بہت سی باتیں کرنی ہیں۔''

''بھئی یہ تمہاری جّالا کے پتا اور بھائیوں کی روٹی کا بندوبست کون کرے گا۔''

''اس کی فکر نہ کریں۔ بس آ جائیں آپ لوگ......آج تو ہم سنگدھا کی تصویریں دیکھنے آئے ہیں۔ یہ گوری شنکر بہت تعریف کر رہے تھے۔ یہ کسی کی تعریف کم ہی کرتے ہیں۔''

وہ سب تصویریں دیکھتے رہے۔ اتنے میں رام شکل بھی آ گیا۔ گھر میں مہمانوں کی بھیڑ دیکھ کر بہت حیران اور خوش بھی ہوا۔

''اری بجّالا! آج تونے دین و دنیا کو اکٹھا کر رکھا ہے۔ کچھ کھلایا پلایا ہے یا صرف تصویروں پر ہی ٹرخاؤ گی۔ میرا بھی کچھ چٹ پٹا سامنہ کرادو۔''

''چچا آپ نے تو میرے منہ کی بات کہہ دی۔'' سوشیلا نے لقمہ دیا۔

''یہ آپ بھی سنیں سوشیلا رانی کیا کہے ہے'' رام شکل کی بیوی بولی۔

''ہم عورتوں کو بلایا ہے سارے دن کے لیے۔''

''ارے ہمارے لیے روٹی کا بندوبست کیسے ہوگا۔''

''ارے چچا یہ بھی کوئی بات ہوئی۔ سب کچھ ہوگا جیسے ہمیشہ ہوتا ہے۔ ان کو بھیج دیں۔ آپ کو بلائیں گے ایک دن اور مولوی صاحب کو بھی۔''

اس کے بعد سنگدھا کبھی ٹھاکر کے یہاں سارا سارا دن رہتی یا سوشیلا ان کے یہاں چلی جاتی اور دو پہر یا سہ پہر کو گوری اس کو لینے کے لیے چلا جاتا اور وہاں کچھ دیر تک ٹھہرتا۔ سوشیلا نے باپ سے بات کی اور وہ فوراً ہی راضی ہو گئے اور خود رام شکل کے یہاں چلے گئے ایک شام۔ اس کے بعد رام شکل کے ساتھ سنگدھا کے والد سے ملنے گئے۔ منگنی ہو گئی اور بیاہ کی تاریخ بھی چھ ماہ بعد اگلے ماگھ کے لئے طے کر لی گئی۔

اس چھ ماہ میں چندر بھان کا پتہ بھی مل گیا کہ وہ کسی جرمن یونیورسٹی میں کام کر رہا تھا اور جرمن حکومت اس کو چھوڑنے کے لیے تیار نہ تھی۔ وہ فرانس کی شکست کے وقت نازیوں کے ہتھے چڑھ گیا تھا۔ وہ اچھا سائنسدان تھا اس لیے کسی concentration camp کا باسی نہ بنا، مگر تھا وہ زیر نگرانی۔ اب اس کے سنسر شدہ خط امریکنوں کی معرفت ان کو ملنے لگے تھے اور اس کی رہائی کی کوششیں جاری تھیں۔ اس نے سوشیلا کے والد کو لکھا کہ وہ گوری شنکر کی شادی کو اس کے بغیر ہی کر لیں لیکن ارملا کا بیاہ وہ خود آ کر کرے گا۔

چندر بھان کی رہائی کے لیے کوششوں کے باوجود نازی اس کو رہا کرنے کے تیار نہ تھے۔ ان کو زرعی پیداوار کے سلسلے میں اس کی تحقیقات کی اشد ضرورت تھی۔ لہٰذا فی الحال اس کی رہائی کا امکان نہ تھا۔

سوشیلا نے کسی قوم کی شکست کے لیے اتنی دلجمعی سے پرارتھنا نہ کی تھی۔ مگر اس کی پرارتھنا تھی کہ قبول ہی نہ ہورہی تھی۔ وہ شِو کوٹ کے مہینے میں دو دو تین تین دفعہ چکر لگاتی تھی اور اس کو کہیں سے کوئی خبر نہ ملتی تھی کہ چندر بھان کب آسکے گا۔

ہٹلر کو شکست ہوچکی تھی یورپ میں جنگ بند ہوچکی تھی مگر چندر بھان کا پھر پتہ نہ لگ رہا تھا کہ وہ کہاں ہے۔

آخری خبر یہ ملی تھی کہ جب سوویت فوجیں اس یونیورسٹی ٹاؤن میں پہنچیں جہاں وہ تحقیق کررہا تھا تو چندر بھان ابھی وہیں تھا۔ سوویت فوج نے اس کو گرفتار کرلیا۔ اس کے بعد کیا ہوا معلوم نہ ہوسکا تھا۔ اس کا پتہ کرنے کے لیے ایک بار پھر امریکی حکومت کی امداد طلب کی گئی۔ اب کی بار حکومت ہند بھی برطانیہ کی حکومت کی معرفت اس کا پتہ لگا رہی تھی۔

اسی اُدھیڑ بُن میں وہ شِو کوٹ میں تھی کہ ارملا کے باپ نے فردوس، متین، تقی اور جمیل اور بیگم جمیل کو دعوت دے دی۔

حصہ نہم

پہلا باب

جب وہ شمال سے بہتے، آتے دریا کے کنارے پہنچے تو چاند مغرب میں ڈوب چکا تھا اور ہر طرف اندھیرا چھا رہا تھا، ستارے ماند پڑ رہے تھے، صبح کا تارا آسمان کے وسط میں تخت نشیں تھا۔ ہلکی ہلکی ہوا صبح کی آمد کا اعلان کر رہی تھی مگر ابھی صبح کا قافلہ دور تھا۔

بید کے درختوں کے سائے میں وہ دریا کے ساتھ ساتھ گھوڑوں پر سوار، چلے جا رہے تھے۔ ٹھاکر شِو آنند کا قاصد اور دلاور خان ان سب سے آگے آگے تھے۔ سب چپ تھے، اپنے اپنے خیالات میں محو تھے، ان کے کانوں میں رات کی گفتگو ابھی زندہ تھی، ان کی آنکھوں میں بامِ بلند پر چاندنی کا منظر اور رات کے خوابوں کے مناظر رم رہے تھے۔

گھوڑوں کی ٹاپوں میں ایک آہنگ سا تھا۔ اس آہنگ میں ہر ایک کو اماں نظر آئی۔ دلاور خان نے اپنے گھوڑے کا رخ یکا یک مشرق کی طرف بدل دیا تو اس آہنگ میں ایک کوندے کے عرصے کے لئے تبدیلی پیدا ہوئی اور پھر اک نئے آہنگ نے پہلے آہنگ کی جگہ لے لی۔ گھوڑے اب ہوا سے باتیں کر رہے تھے۔ گھوڑے اڑتے چلے گئے۔ ان کے ٹاپوں کی آواز میں آہستہ آہستہ رعب پیدا ہوتا چلا گیا۔ سنگلاخ زمین آ گئی تھی اور گھوڑے مرتفع زمین پر چڑھ رہے تھے۔ بل کھاتے ہوئے رستے اب روشن ہونے لگے۔ جب وہ سورج کے بالمقابل آئے تو سامنے دور تک ایک راستہ بل کھاتا ہوا اوپر چڑھتا نظر آیا۔ دلاور خاں اس راستے پر زین میں مڑے بغیر روانہ تھا۔ اس کے پیچھے سب۔ سنگلاخ زمین ان کے

گھوڑوں کی ٹاپوں سے گونج اٹھی اور راستے کے دونوں طرف بلند درختوں کے پیچھے بچے اور عورتیں ان کو دیکھنے کے لیے نکل آئے۔ ان بچوں اور عورتوں کی آنکھیں نیند سے بوجھل تھیں۔ گھوڑوں کی ٹاپوں سے فضا گونجتی رہی اور وہ ہر دم بدلتے تناظر پر نظر ڈالے بغیر، اپنے آپ میں ڈوبے، منزل کی طرف بڑھتے چلے گئے۔

یکا یک گھوڑوں کی ٹاپوں کی آواز مدھم پڑ گئی مگر ان کی رفتار میں فرق نہ آیا، ہوا ان کے چہروں سے اسی رفتار سے ٹکراتی اور سہلاتی ہوئی گزرتی رہی۔ تناظر اسی رفتار سے بدلتے رہے۔ فرق آیا تو ان کے اندر۔ وہ گہرائیوں میں سے تیزی سے ابھرنے لگے۔ ابھرنے کی رفتار سے پیدا ہونے والی سنسناہٹوں نے ان کو چونکا دیا۔ انہوں نے بدلتے ہوئے تناظروں پر غور کی نظر ڈالی۔ ہر طرف درخت ہی درخت تھے، ان کے گہرے سایے میں ایک بل کھاتا ہوا، سبز سبز راستہ اوپر کی طرف جاتا دکھائی دیا۔ بلندی پر لہراتے ہوئے درختوں کی پھننگیں سورج کی کرنوں سے دمک رہی تھیں۔ بڑھتی ہوئی صبح ہر طرف اپنے پھریرے گاڑ رہی تھی۔

سبز سبز راستہ جا کر ایک سبزہ زار میں گم ہو گیا۔ وسیع سبزہ زار کے بیچوں بیچ ایک پتلی سی چمکدار سفید لکیر نظر آنے لگی اور اس سے پرے ایک مرمریں سی عمارت۔ جوں جوں قریب ہوتے گئے سفید چمکدار لکیر موٹی ہوتی گئی، ندی کی صورت اختیار کرتی چلی گئی۔ ندی کے قریب پہنچے تو اس کے درمیان ایک قبر نظر پڑی۔ دلاور خان نے گھوڑے کو روک لیا اور کود کر اتر گیا۔ دوسروں نے بھی گھوڑے روک لئے اور وہ گھوڑوں سے اتر آئے، صرف عالمہ اپنے گھوڑے پر بیٹھی، قبر کو دیکھتے دیکھتے کھو گئی۔ دلاور خان کا بھائی گھوڑوں کو ایک طرف لے گیا اور دلاور خان عالمہ کے گھوڑے کی طرف بڑھا۔ اس کو اپنی طرف آتے دیکھ کر وہ چونکی، گھوڑے پر سے اتر آئی اور دوسروں کی طرف بڑھ گئی جو قبر کے پاس کھڑے فاتحہ پڑھ رہے تھے۔ وہ بھی ان کے ساتھ شامل ہو گئی۔

قبر پر تازہ تازہ پھول پڑے تھے مگر اس پر اپنا ریشمی سرپوش نہ دیکھ کر فردوس کو حیرانی ہوئی اور وہ اپنی حیرانی پر مسکرا دی۔ اس کے ملازموں میں کسی نے بارہ دری کی صفائی کی

خاطر ادھر آتے ہوئے اس کا سر پوش اٹھا لیا ہوگا، اس نے سوچا۔ اس سوچ سے وہ شرما گئی، جیسے اس سر پوش پر اس کے بدن کی تصویر اتر آئی تھی۔ وہ اپنی شرم پر بھی دل ہی دل میں مسکرا دی۔ ندی اتنی چوڑی تھی کہ اس کو پھاندنے کے لیے مہارت کی ضرورت تھی۔ عورتوں کے پھاندنے کا سوال ہی نہ تھا۔ لہٰذا سب ندی کے ساتھ ساتھ شمال کی طرف بڑھنے لگے، کچھ دور جا کر ندی کے اوپر ایک درخت کے تنے کو کھوکھلا کر کے پل سا بنا ہوا تھا۔

پل پار کر کے جب وہ بارہ دری کے پاس پہنچے تو ان کے نتھنوں میں کھانا پکنے کی بھینی بھینی خوشبو آئی۔ بارہ دری میں فرش پر دری قالین اور نیلی نیلی چادریں بچھی تھیں۔ وہ سب فرش پر بیٹھ گئے اور ان کے بیٹھتے ہی دسترخوان لگا دیا گیا۔ ناشتہ لگا دیا گیا۔ دلیہ، دودھ، شہد، انڈے، پنیر سے بنی ہوئی رس ملائی، سیب کا مربہ، رات کے پانی میں بھیگے ہوئے سفید بادام، شکر اور مکھن کے ساتھ، گاجر کا حلوہ (کھوئے کے ساتھ بریاں) چوزے کی یخنی، مکھن سے تیار کئے نانوں کے ساتھ اور آخر میں بھنے ہوئے مرغ کے قتلے۔ سبزہ و گل کے درمیان، بارہ دری کی جالیوں سے چھن چھن کر آتی ہوئی کرنوں کی ہلکی ہلکی حدت میں، جالیوں سے چھنتی ہوئی دھوپ اور سائے کی پٹیوں کی چوپٹ کو دیکھتے ہوئے، ندی کے پانی کے ہلکے ہلکے شور، نسیمِ سحری کی سرسراہٹوں کو سنتے ہوئے، جب قہوہ ان کے حلق سے اترا تو انہوں نے محسوس کیا کہ شاید زندگی کی حسین ترین منزل یہی تھی جس کی طرف مقدر ان کو پیار اور دلار سے لے آیا تھا۔ جذبات اور خیالات کی کدورتیں، جسم و جاں کی تھکنیں، قہوے کی پیالیوں سے اٹھتے ہوئے دھوئیں کے ساتھ اڑ گئیں۔ انہوں نے اپنے آپ کو نومولود بچے کی طرح معصوم پایا جو محبت کرنے والوں کے درمیاں گھرا ہو۔

ناشتے کے بعد انہوں نے سبزے پر چہل قدمی کی، بارہ دری کے جنوب میں کھلے ہوئے گلزار و چمن میں گلہائے رنگ رنگ کے حسین چہروں پر شبنم کو نسیم سحری میں جھولتے ہوئے دیکھا۔ ان کے دل انوکھی خوشیوں سے بھر گئے، ان کے اندر ماضی کی یادوں کے اور مستقبل کے حوادث کے سفر کے لیے جسم و جان میں نئی قوت پیدا ہوئی، ان کا مقابلہ کرنے کے لیے جرأت پیدا ہوئی، ان کے جوکھم سے عہدہ برا ہونے کی آرزو نے ان کی ذوات کی

گہرائیوں میں جنم لیا۔

ٹہلتے ٹہلتے جب ان کے بدنوں میں ناشتے کی حدت رچ چکی، دھوپ سبزے پر کلیلیں کرنے لگی، ہوا میں تیزی اور ہلکی ہلکی حدت آنے لگی تو دلاور خان نے ٹھاکر شِو آنند کے قاصد سے صلاح کرتے ہوئے کوچ کا اعلان کیا اور وہ گھوڑوں کی طرف بڑھے جن کے پاس دلاور خان کا بھائی کھڑا تھا۔ وہ سب گھوڑوں پر سوار ہوئے۔ دلاور خان اور ٹھاکر شِو آنند کا قاصد ان کے آگے آگے تھے۔ وہ اس راستے کی طرف لوٹ رہے تھے جس راستے سے وہ آئے تھے۔ کچھ دور نیچے جا کر راستہ دو راستوں میں بٹ گیا، ایک راستہ تو وہی تھا جس پر سے وہ صبح صبح آئے تھے اور دوسرا مشرق کی طرف سے ہوتا ہوا اوپر اٹھتا چلا گیا تھا۔ وہ نئے راستے پر روانہ ہوگئے۔ راستہ کے دونوں طرف چیل، سفیدے کے اونچے اونچے درخت تھے اور سبزے پر درختوں سے جھڑے ہوئے نوکدار پتوں اور کانٹوں کے ڈھیر تھے جو گھوڑوں کے قدموں میں مسلتے ہوئے فریاد کرتے تھے۔ معلوم ہوتا تھا کہ اس راستے سے مدتوں سفر نہ ہوا تھا کیونکہ راستے پر سبزہ اگ آیا تھا اور اس پر درختوں سے جھڑے ہوئے تازہ تازہ پھول پڑے سوتے تھے جو ان کے گھوڑوں کی ٹاپوں کو سن کر یکا یک بیدار ہوگئے تھے اور ان کے گھوڑوں کو حیرانی سے، خوف سے تکنے لگے تھے۔

پیچدار، سایہ دار، رستہ نیلے نیلے، روشن روشن، دمکتے ہوئے آسمان کی طرف اٹھتا ہی چلا گیا۔ رابعہ کو کئی بار محسوس ہوا کہ راستے کے دونوں طرف بلند ہوتے ہوئے درخت دعا کے لیے اٹھے ہوئے ہاتھ ہیں اور راستہ ان ہاتھوں کے ساتھ ساتھ ملی بانہیں تھا۔ اس کو کئی بار خیال آیا کہ یہ درخت دستِ دعا کیوں بلند کئے ہوئے ہیں۔ کیا وہ مسافروں کی آمد و رفت کے لیے دعا مانگ رہے تھے؟ یا وہ فریاد کر رہے تھے کہ اجنبی ان کی تنہائی میں مخل ہو رہے تھے۔ وہ ان سبز دمکتے ہوئے، اٹھتے ہوئے، ہاتھوں کی دعا اور فریاد میں تفریق نہ کر سکی، وہ باوجود کوشش کے ان کی دعا یا فریاد کی زبان کو نہ سمجھ سکی۔ ہوا کی سرسراہٹ بلند ہو رہی تھی، درختوں کی شاخیں جھومنے لگیں۔ فریاد کی آہ و بکا تھی یا مسافروں کے حق میں دعائے خیر، وہ امتیاز نہ کر سکی۔

اس نے جمیل صاحب کی طرف دیکھا۔ وہ اس نئے سفر سے خوش نظر آ رہے تھے، وہ اس کو اپنی طرف متوجہ دیکھ کر مسکرا دیئے۔ ان کی نظروں میں اک گہرا پیار تھا جس کی گرمی سے اس کے بدن میں اک لہر سی اٹھی اور اس نے اپنے آپ کو جواں محسوس کیا۔ اس نے جمیل صاحب سے نظریں ہٹالیں، فردوس پر نظر ڈالی۔ وہ گہری سوچ میں ڈوبی تھی مگر اس کی جبین شکنوں سے پاک تھی۔ وہ شاید کسی اجنبی مزے میں جذب تھی۔ اس نے تقی کی طرف دیکھا۔ اس کی کمر اور گردن اور شانوں کے باہمی روابط سے پتہ چلتا تھا کہ جیسے وہ شہر الم کی طرف رواں ہو جہاں اس کی تاجپوشی کی رسم ادا ہونی ہو۔ اس کے بدن سے ہویدا الم میں ایک رعنائی تھی اور بے نیازی اور تسلیم و رضامندی۔ رابعہ کے دل پر ایک چرکہ سا لگا اور اس کے دل سے اک آرزو اس کی جان کے آسمان پر ایک دم دار ستارے کی طرح روشن ہوئی، کاش وہ سولہ سترہ برس کی ہوتی اور وہ تقی کے الم کو اپنے قہقہوں کے ترنم، اپنی آنکھوں کی رقصیدہ روشنی، اپنے جوان اور کنوارے ہونٹوں کے یاقوتی روغن کی دمک، شمیم بہار میں لہراتی ہوئی سیاہ چمکدار زلفوں کی اڑان، ابھرتے، ڈھلکتے جوان سینے کے گلزار کی خوشبو، کمر اور کولہوں کی لچکیلی تانوں کے تعاون سے انبساط و فرحت کے الحان والوان میں بدل سکتی۔ یہ رعنا الم اس پر بھاری ہونے لگا اور اس نے اپنی نظر کا رخ بدل دیا۔ متین صاحب گھوڑے پر اس طرح استغراق سے بیٹھے تھے کہ اس کو گماں گزرا کہ گھوڑا اور وہ اک نئی انوکھی مخلوق کا روپ ہوں، ان کے دو قالبوں میں ایک ہی روح کارفرما ہو یا دو روحیں ایک قالب میں اس دوسرے کے ساتھ زوجیت کے رشتوں میں جذب مصروفِ عمل ہوں۔ اس عجیب الخلقت گھوڑے نما انسان یا انسان نما گھوڑے نے اس کی توجہ کو نیستی کی حد تک جذب کرلیا۔ وہ اس نئی مخلوق کی ذات کے جہاں میں سفر کرنے لگی۔ اس جہاں میں اندھیرا اور روشنی، صدا اور خاموشی، جبلت اور ارادہ، عمل اور ردعمل، جبر و اختیار، ہستی اور عدم، تخلیق و تخریب، ایک دوسرے میں اس طرح جذب تھے کہ اک مسلسل، تہہ در تہہ، طبق در طبق، مناظر کا سلسلہ آفاق تک پھیلتا نظر آیا، جس میں ہر شے اپنے مقام پر قائم، اپنی حدود میں سرگرم عمل، مگر دوسری اشیا میں واصل تھی، اس کو وصل و فراق، جذب و فصل کا یہ ہمہ گیر جہاں بہت ہی حسین، بارعب، بہت ہی قریب اور عزیز محسوس ہوا۔ اس نے چاہا کہ وہ اس جہاں پر محیط ہو جائے، اس جہاں کو

اپنے تخیل میں جذب کرلے، اس میں کارفرما قوتوں کو اپنے جسم، اپنی جاں میں، خون کی طرح، کارفرما کرے مگر اس کی شخصیت اس جہاں کے آفاق میں کھوگئی، جذب ہوگئی، نیست ہوگئی۔ وہ کہیں بھی نہ تھی، وہ کچھ بھی نہ تھی، وہ ایک خلا تھی، بےصدا، بےنشاں، تاریکی اور روشنی سے ماوراء۔ پھر یکا یک اس خلا میں روشنی، تیز، چندھیاتی ہوئی، روشنی پھیل گئی، مسلط ہوگئی۔ اس روشنی کی حدت سے خلا میں اک نئی شخصیت نے جنم لیا جو اس خلا کی پہنائیوں اور آفاق سے ابھرتی ہوئی قوتوں، توانائیوں کو اپنے اندر جذب کررہی تھی، جس میں یہ پہنائیاں اور آفاق محیط تھے۔ ان قوتوں اور توانائیوں کے زور کو ایک نظام میں مسدود کرنے کی کوشش نے اک بیداری کو جنم دیا جو آہستہ آہستہ اک مشہود صورت اختیار کرتی چلی گئی۔

دور دور تک دھوپ سنسنا رہی تھی۔ درختوں کے سایے میں بل کھاتا ہوا رستہ اب تیر کی طرح سیدھا آسمان میں پیوست تھا اور اس کے عین وسط میں سورج کی آنکھ، ان کا رستہ روکے، ان کو گھور رہی تھی۔ اس کے بدن میں سنّاہٹوں کا ایک بہت بڑا ریلا اٹھا جس سے مقابلہ کرنے کے لیے وہ زین میں مضبوطی سے جم کر بیٹھ گئی، اس نے رانوں سے گھوڑے کو کسنا شروع کیا اور ایڑیاں گھوڑے کے پیٹ میں گاڑ دیں۔ گھوڑے نے گردن موڑ کر اس کی طرف دیکھا اور پھر گردن سیدھی کر کے سرپٹ دوڑتا ہوا سورج کی آنکھ کی طرف جھپٹا۔ جب وہ زن سے دوسروں کے پاس سے گزری تو دوسروں نے حیرانی سے اس کو دیکھا جیسے اس نے ان کو حسین خوابوں سے جگا دیا ہو اور اب ان کا خواب کے جہاں میں لوٹ جانا ممکن نہ ہو۔ اس کی پیروی میں سب گھوڑوں کو سرپٹ دوڑاتے ہوئے اس کا تعاقب کرنے لگے۔ سورج کی آنکھ قریب آتی گئی اور جب اس کا گھوڑا اس کو پار کرنے کے لیے اس پر جھپٹا تو وہ تڑپ کر فضا میں بلند ہوگیا۔ اس کے نیچے ایک وسیع مرغزار پھیل گیا جس کے بیچوں بیچ ایک جھیل تھی جس میں سفید، نیلے، سرخ کنول ڈول رہے تھے اور کونجیں جو دوڑتے ہوئے گھوڑوں کو دیکھ کر پانی کی سطح پر سے پھڑ پھڑا کر اڑیں، ساری جھیل پر سایہ ہوگیا اور سورج کی آنکھ پر اک سفید پردہ پڑ گیا۔ جھیل کے کنارے چند کشتیاں ہلکی ہلکی ہوا میں ہلکورے کھا رہی تھیں اور اس جھیل سے پرے دور دور تک اشوک اور صندل اور چنار کے درختوں کی فصیل کے اندر ان کے سایے میں زعفران کے قرمزی پھول مسکرا رہے تھے۔ ان سے اوپر، بہت

اوپر، سیاہ سبز پہاڑوں پر، نیلے نیلے آسمان کے پیش منظر میں، سنہری برف جگمگا رہی تھی۔

جب وہ جھیل کے قریب پہنچے تو سرخ پھولوں سے آراستہ بلند قامت گھیر دار چنار کے درخت اور سیاہ پہاڑوں پر سنہری جگمگاتی ہوئی برف کا عکس جھیل کے سینے پر لرز رہا تھا اور اس عکس پر اڑتی ہوئی کونجوں کا سایہ کوندے کی طرح لرز لرز گیا۔

سرپٹ دوڑتے ہوئے گھوڑے دمکتے ہوئے پانی سے منعکس ہوتی چمک سے چندھیا کر ایک دم رک گئے اور پھر جھیل کے لرزاں سینے پر اپنا عکس دیکھ دیکھ کر تصویرِ حیرت بن بن گئے۔ نیلا دمکتا اسمان، سیاہ پہاڑوں پر چمکتی ہوئی سنہری برف، سرخ پھولوں سے لدے ہوئے چنار، سبزہ زار، بید کے لرزاں درخت، جھیل، جھیل میں لرزاں عکس، گھوڑے اور ان کے سوار، فضا میں اڑتی ہوئی کونجیں ایک ابدی منظر کا ازلی حصہ معلوم ہونے لگے۔

ٹھاکر شِو آنند کا قاصد اس حیرت کے عالم سے سب سے پہلے جاگا اور اپنے گھوڑے کو آہستہ آہستہ جھیل کے مغربی حصے کی طرف دُلکی چلاتے ہوئے روانہ ہوا اور اس کے پیچھے دلاور خان اور اس کے پیچھے وہ سب آہستہ آہستہ عالمِ حیرت میں کھوئے، روانہ ہوئے۔ یہ انوکھا قافلہ جس کا ہر مسافر ایک مقررہ منزل کی طرف جسمانی سطح پر روانہ ہوتے ہوئے بھی مختلف سمتوں میں خیال اور آرزو اور یادوں کی منزلوں کی طرف رواں تھا، دوسروں سے بے خبر، مگر کسی نہ کسی نفسیاتی سطح پر وابستہ۔

جھیل کے مغربی کنارے کے وسط سے ذرا آگے نکل کر ان کا راہ نما ایک قوس کی صورت شمال مغرب کی طرف ابھرتے ہوئے سرخ اور پیلے پھولوں سے لدے درختوں کی طرف چڑھنے لگا۔ ان درختوں کے درمیان پہنچ کر ان کو کوئی راستہ نظر نہ آیا مگر ان کا راہ نما اعتماد سے درختوں کے گھنے سایوں میں رچتی ہوئی کرنوں سے بنی ہوئی پٹیوں کو کاٹتا ہوا برفیلی چوٹیوں کی طرف بڑھتا چلا گیا۔ دور دور تک درخت ہی درخت تھے۔ فرش پر پتوں اور سفید پھولوں کے ڈھیر کہیں درختوں کے درمیان ننھا سا کھلا صحن سا آ جاتا جس میں دھوپ محوِ خواب نظر آتی۔ اُن کے گھوڑں کی ٹاپوں سے ہڑبڑا جاگتے، آہ و بکا کرتے ہوئے، سوکھے پتوں کا شور بھی سوئی ہوئی دھوپ کو بیدار ہونے پر مائل نہ کر سکا۔ کہیں کہیں درختوں کے درمیان کھلتے

ہوئے ننھے صحنوں کے کناروں پر درختوں کی شاخوں سے لٹکتے ہوئے ساکت، بے جان، جھولے نظر آتے ہیں جن میں جھولنے والا آس پاس کہیں نظر نہ آتا۔ جب بلند ہوتے ہوئے درختوں کے درمیان سے آسمان اور سنہری چوٹیاں نظر آنے لگیں تو درختوں کے درمیان کھلے صحنوں میں جھولتی ہوئی، قہقہے لگاتی ہوئی، ڈرکر خوف سے پکارتی ہوئی، جھولے کی اڑان کا مزا لیتی ہوئی جوان لڑکیاں، جھولتے جھولتے ان کو حیرانی اور خوف ملی بے نیازی سے دیکھتیں اور جھولا جھولاتی ہوئی لڑکیاں جھولتی ہوئی لڑکیوں کو جھولانا بھول کر، پالنوں کو فضا میں بلند کیے، ان کو حیرت سے دیکھنے لگ جاتیں۔ اس خاموش، خوابیدہ بن میں نوجوان نسوانی قہقہے جن میں مزے اور خوف کا عجیب امتزاج تھا، ایک طلسمی کیفیت پیدا کرنے لگے۔ جب نیلا آسمان بالکل قریب نظر آنے لگا تو جھولا جھولتی ہوئی لڑکیوں کو جھولا جھولاتی ہوئی لڑکیاں چھوڑ چھوڑ کر بھاگتے ہوئے بلندیوں کی طرف چڑھتے ہوئے مڑ مڑ کر ان کی طرف دیکھنے لگیں۔

ان کے پہنچنے سے پہلے ہی ان کی آمد کی خبر ان کی منزل تک پہنچ گئی۔ جب درختوں کے درمیان آبادی کے آثار ہویدا ہونے لگے تو درختوں میں چھپی ہوئی جھونپڑیوں سے نکل نکل کر بچے اور بوڑھے، عورتیں اور نوجوان لڑکیاں رنگین کپڑوں میں ملبوس ان کو تحسین ملی حیرت سے دیکھنے لگے۔ کبھی کوئی بوڑھا شِو آنند کے قاصد سے پوچھ لیتا کہ ٹھاکر کے مہمان ہیں تو وہ خاموشی سے سر ہلا دیتا۔ سیاہ گھوڑے پر جم کر بیٹھا ہوا قاصد کسی بڑی سلطنت کا سفیر با تدبیر معلوم ہو رہا تھا جو اپنے آقا کے شاہی مہمانوں کی اس کے محل کی طرف راہنمائی کر رہا ہو۔

بَن کے کنارے سے سنگلاخ رستہ ابھر آیا جو مشرق کی طرف رواں تھا۔ ان کا راہ نما اس رستے پر ہولیا۔ رستے کے دونوں طرف بچے اور بوڑھے، عورتیں اور لڑکیاں قطار در قطار کھڑے تھے۔ پھر ایک دم قطاریں ختم ہوگئیں اور رستے کے آخر میں ایک فصیل سی حائل ہوگئی۔ جب وہ فصیل کے قریب پہنچے تو ایک دروازہ کھل گیا اور وہ اس میں داخل ہوگئے۔ رستہ کچھ دور جا کر نیچے اترنے لگا اور پھر جنوب کی طرف مڑ گیا۔ تھوڑی دور جا کر رستہ پھر

مشرق کی طرف اور پھر شمال کی طرف بلند ہونے لگا۔ اس کے بعد ایک مرتفع سطح آ گئی جو بہت وسیع تھی اور جس کے تین طرف، شمال، مشرق اور مغرب میں دور دور تک پھیلے ہوئے جوار سے ابھرتے ہوئے سمندر کی طرح بلند ہوتے ہوئے جنگل کے گرد اگرد احاطہ کیے ہوئے، ان کے تخلیے، ان کی نیند کی، ان میں رچے ہوئے خوابوں کی، حفاظت کرتی ہوئی بلند برفیلی چوٹیاں تھیں۔ اس کے عین وسط میں ایک چوک تھا جس کے درمیان ایک بڑا سا تالاب تھا اور اس کے بیچ ایک فوارہ جس سے اڑتے ہوئے پانی کی دھار میں سورج کی عمودی کرنوں نے سنہرا پن پیدا کر دیا تھا۔ اس تالاب کے مشرق میں ایک مندر تھا جس کے زینے کی طرح بلند ہوتی ہوئی فصیلوں کے بلند ترین مقام پر سنہرا کلس خدائے برتر و یکتا کا اعلان کرتا ہوا معلوم ہوا۔ اور اس کے مشرق میں چوڑے، چپٹے، گھنیرے پتوں، لمبی شاخوں والے سرخ سنہری چناروں کے سائے میں، شہتوت کے درختوں کی ٹہنیوں پر دور دور تک پھیلتی ہوئی انگور کی بیلوں سے لٹکتے ہوئے انگوروں کے گچھوں کی قوسوں میں نظر آتے ہوئے گلزار و چمن و باغ میں سوئے ہوئے رنگ رنگ کے پھول، جن کے ماتھوں، ہونٹوں پر سنہری دھوپ آرام کر رہی تھی۔ تالاب کے عین سامنے شمال کی طرف ایک محل کھڑا تھا جو پہاڑ کا حصہ معلوم ہوتا تھا اور اس سے پرے برفیلے سنہری کلس اپنی عظمت وسطوت کے سنہرے اور سفید پھریرے لہرا رہے تھے۔

ان کا راہ نما تالاب کے ساتھ ہوتا ہوا ان سے آگے محل کی طرف بڑھا۔ محل کا بڑا دروازہ کھلا تھا اور اس کے اندر صحن در صحن، دائیں بائیں گل داؤدی کے چمن کے بیچوں بیچ ایک ہی زاویے پر استادہ طبق در طبق بلند ہوتے ہوئے سات فوارے، ان مرمریں فواروں کے گرداگرد، سفید، ہزار رنگ مور، چکور، سدھے ہوئے بڑ تالے، سفید، نیلے، شیرازی، کبوتر اور ہنس دھوپ میں محوِ استراحت، آسودگی اور فراغت کی دعوت دیتے نظر آ رہے تھے۔ دروازے کے اندر داخل ہو کر ان کا راہنما گھوڑے سے ایک پُر سلیقہ انداز میں اترا اور اس کی پیروی میں باقی سب لوگ بھی اترے۔ ان کے اترتے ہی خاموش قدم ملازم آ موجود ہوئے جن کے سپرد گھوڑے کر دیئے گئے۔ پھر ان کا راہنما اس صحن کو عبور کر کے دوسرے، تیسرے،

چوتھے صحن میں گیا اور پھر ساتویں کی طرف بڑھا۔ جب وہ ساتویں صحن کی دہلیز میں داخل ہوئے تو ٹھاکر شِو آنند اور ان کے ساتھ دو جوان، مگر پر وقار اور متین عورتوں نے جن کے جسموں اور چہروں سے جوانی کا روغن عیاں تھا، ان کا استقبال کیا۔ تقی نے میزبانوں کو مہمانوں سے متعارف کرایا۔ پہلے جمیل صاحب اور رابعہ سے، فردوس، عالمہ پھر متین صاحب سے، پھر سب سے آخر میں خود سے۔

سوشیلا اور فردوس کا تعارف کراتے ہوئے تقی مسکراتے ہوئے بولا ''تم دونوں رقیبوں کی طرح ایک دوسرے سے آشنا تو ہوا گر چہ اس کو قبول کرنا تمہیں پسند نہ ہو۔'' اس پر فردوس مسکرا دی اور سوشیلا نے فردوس کو سینے سے لگاتے ہوئے دوسری جوان عورت کی طرف دیکھتے ہوئے اس سے کہا: ''دیدی! میں فردوس کو بہن بنالوں؟'' ''ضرور، ضرور'' ارملا نے جواب دیا۔ اس کی آنکھوں میں گہرے حلم کا متوازن، پُرسکون، اطمینان بخش نور تھا۔ ٹھاکر فردوس اور سوشیلا کو پیار سے دیکھتے ہوئے کھل اٹھے۔ فردوس نے ٹھاکر کی طرف بغور دیکھتے ہوئے پوچھا ''آپ کو یہ نیا رشتہ پسند ہے'' تو ہنس دیئے اور بولے: ''کیسے ہوسکتا ہے؟ اب دو کی بجائے تین میرے دھیان میں کھنڈت ڈالیں گی۔''

ارملا ہنس دی اور بولی! ایسا تو نہیں، پتا جی۔ اب آپ کے دھیان گیان کے تین محافظ ہیں۔

ٹھاکر نے یکا یک مدبر ہوتے ہوئے اپنے مہمانوں سے معذرت کرتے ہوئے کہا: ''ٹھاکرائن مہمانوں کا سواگت نہ کر سکنے پر معذرت چاہتی ہیں۔ اس سمے وہ پرارتھنا میں مشغول ہوتی ہیں۔''

جب متین اور سوشیلا ''پنڈت'' کا تعارف ہوا تو سوشیلا ''پنڈت'' نے مسکراتے ہوئے ان سے کہا:

''آپ اب بھی فلسفہ اور اخلاق کا درس دیتے ہیں؟ مگر آپ کے چہرے پر بڑی زندگی ہے اور آپ کے جسم میں کھلاڑی کی سی چستی اور پھرتی نظر آتی ہے۔ فلسفہ اور اخلاق کے استاد ایسے ہی ہوا کریں تو کون فلسفہ اور اخلاق کا درس نہ لے۔''

''فلسفہ اور اخلاق کا درس دیا کرتا تھا۔ اب طبیب و جراح بننے کا ارادہ رکھتا ہوں۔ آپ کو کچھ اعتراض تو نہیں؟''

''نہیں تو۔ روح و جسم کے لیے فلسفہ و اخلاق کے ساتھ طب و جراحت کی بھی تو ضرورت ہوتی ہے۔ اس سے اچھا امتزاج کیا ہوگا۔''

''سوشیلا! متین صاحب ڈاکٹر پہلے تھے، فلسفی اور اخلاق کے استاد بعد میں بنے۔ تقی نے کہا۔

''حکمت کا تعلق انسان کے جسم اور روح دونوں سے تو ہے۔''

''سوشیلا! مہمانوں کو دم تو لینے دو، ستا تو لینے دو۔ تم تو مباحثے کے لیے ہر دم کمر بستہ رہتی ہو۔'' ٹھاکر کی بیٹی ارملا نے پیار سے سرزنش کی۔

''بیٹیو! مہمانوں کا سواگت کرنے کے یہ ڈھنگ نرالے ہیں۔ میں ٹھہرا پرانا آدمی، میں تو اپنے ہی ڈھنگ سے مہمانوں کو خوش آمدید کہوں گا...... آیئے چلیں۔''

صحن کو پار کر کے ایک لمبے اونچے چبوترے کی سیڑھیاں چڑھ کر وہ ایک برآمدے میں داخل ہوئے، اس برآمدے کے وسط میں ایک دروازے کے پٹ دو ملازم کھول کر باادب کھڑے ہو گئے۔ ٹھاکر نے ان کو اندر داخل ہونے کی دعوت دی۔ وہ سب ایک بڑے سے کمرے میں داخل ہوئے، جس کی دیواروں پر آرائشی قالین آویزاں تھے اور ان سے اوپر ہرنوں، شیروں، چیتوں کے سر نصب تھے۔ منقش چھت سے بلوریں ہزار چشم جھاڑ لٹک رہے تھے۔ وہ قالینوں سے آراستہ کمرے میں صوفوں پر بیٹھ گئے۔

ٹھاکر، ارملا اور سوشیلا آگے پیچھے داخل ہوئے تو ٹھاکر نے مہمانوں سے معذرت کر لی اور اجازت لے کر رخصت ہو گیا اور اس کے جانے کے بعد نوکر سنہری کھلے برتنوں میں پانی لئے داخل ہوئے۔ ارملا اور سوشیلا نے مہمانوں کے پاؤں اپنے ہاتھوں سے دھوئے اور سرخ ریشمی تولیوں سے ان کو صاف کیا، ان کو خوشبو لگائی۔ جب نوکر برتن لے کر جا چکے تو انہوں نے مہمانوں سے گفتگو کو دوبارہ جاری کیا۔

''ماموں جان کو میں نے بچپن سے دوپہر کے کھانے سے پہلے ہمیشہ ہی پوجا پاٹ کرتے دیکھا ہے۔ اس گھنٹے کی پوجا میں کسی حادثے کو میں نے حائل ہوتے نہیں دیکھا۔ آج کل تو ان کا گیان دھیان بہت بڑھ گیا ہے۔ کہتے ہیں دیس میں بہت بڑا انقلاب آنے والا ہے، بہت ہاہا کار مچے گی، بچپن کے ساتھی، صدیوں کے ہمسائے، ہمیشہ ہمیشہ کے لیے بچھڑ جائیں گے۔ مشترکہ جائیداد کا بٹوارہ پیار ومحبت سے ہوسکتا ہے۔ اس نئی دنیا میں بھائی بھائی محبت کو برقرار رکھتے ہوئے بھی اپنی اپنی الگ الگ دنیا بسانا چاہتے ہیں، اپنی تنہائی کی اور تخلیے کی حفاظت کے لیے اونچی دیواریں کھڑی کرنا چاہتے ہیں، اپنا گیان دھیان، اپنی محبت اور نفرت اپنے انداز میں کرنا چاہتے ہیں تو اس میں ہرج ہی کیا ہے۔ شخصیت کی آزادی اور تخلیے کی محبت، تخلیے میں محبت اور تخلیق کے بغیر اس نئے جہاں میں زندگی کا تصور ممکن ہی نہیں۔ آپ کا کیا خیال ہے؟'' سوشیلا نے بحث کا آغاز کرہی دیا۔

''اس دیس میں اکثریت ایسے لوگوں کی نہیں۔ یہ تصور ان لوگوں کا ہے جنہوں نے مغرب کے ادب، فلسفہ، سیاست اور نظام تعلیم کو اپنے آپ پر مسلط کرلیا ہے یا زیادہ سے زیادہ اس میں رنگ گئے ہیں۔ مگر اس دیس کی اکثریت گاؤں میں رہتی ہے۔ ان کی زندگی آکاش کی ہر دم بدلتی زندگی کے ساتھ ساتھ، اس کی سنگت میں، بدلتی ہے۔ آکاش کی زندگی کے نظام سے ملتا جلتا نظام ان کی زندگیوں میں جاری وساری ہے۔ وہ اس نظام سے الگ کسی نظام کا تصور کرہی نہیں سکتے۔ ان کی زندگی میں کہیں تنہائی نہیں، آزادی نہیں، تخلیے کی تخلیق نہیں۔ ان کی تخلیق دوسرے کے تعاون سے دھرتی کے سینے میں ہل چلا کر ہوتی ہے، رات کی تنہائی میں بھی مظاہرِ فطرت کے ساتھ ہم کلام ہوتے ہوئے ہوتی ہے۔ تمہارے نئے جہاں کے تصور سے ہی دیہات کا انسان اپنی ذات کی گہرائیوں میں پریشان ہے۔ اس کے تصور میں بھی نہیں آسکتا کہ دھوپ، درخت، کھیت اور دریا اور دھرتی کے درمیان نظر نہ آنے والی دیواریں کھڑی کی جاسکتی ہیں۔ نظر آنے والی دیواریں تو اس نے اکثر دیکھی ہیں، وہ اس سے آشنا ہے۔ گھر، گھر ہوتے ہوئے بھی ایک کھلا میدان ہوتے ہیں۔ گھر کے دروازے چور اور ڈاکو کے علاوہ کسی کو نہ آنے دینے کے لیے استعمال نہیں ہوتے۔ اس کے

گھر اس کو، غلے کو اور اس کے جانوروں کو بارش اور موسم کے حادثوں سے محفوظ رکھنے کے لیے ہوتے ہیں اور بس۔ وہ اس تخلیے کی حفاظت کے لیے استوار نہیں کئے جاتے۔ اور اگر بغور دیکھو تو دیہات کے انسان کو اپنی محبوبہ، اپنی بیوی سے زیادہ اپنے جانوروں سے پیار ہوتا ہے کیونکہ وہ اس کی دھرتی کے فرزند ہوتے ہیں اور اس کے ساتھ مل کر اس کی طرح جاں توڑ محنت کرتے ہیں، اس کا اور ان کا پسینہ ساتھ مل کر دھرتی کو سیراب کرتا ہے، اس سے فصلیں اگاتا ہے؛ اس کی زندگی کے مقصد کے حصول میں وہ اس کے ازلی اور ابدی رفیق ہوتے ہیں۔ محبوبہ اور بیوی اس مقصد کے حصول سے ہونے والی تھکن کو دور کرنے کا ذریعہ ہیں اور اس کی موت کے بعد اس کی زندگی کے نشان کو برقرار رکھنے کے لیے اولاد جننے کا ذریعہ ہیں اور بس۔ اس لیے اس کو تخلیے کی محبت نہیں چاہیے۔ وہ تنہائی میں چند لمحے کی جانی بوجھی باتوں کے بعد سو جاتا ہے۔ اس کو کسی محبوبہ کی یادرات بھر نہیں جگا سکتی۔ اس کو جگا سکتی ہے تو اس کے جانوروں کی گم گشتگی، ان کی چوری یا ان کی بیماری۔

لہٰذا جب آپ اس کو اس نئے جہاں کی طرف لے جانے کی کوشش کریں گے تو وہ پریشان ہو جائے گا، جھنجھلائے گا، مرنے مارنے پر تل جائے گا اور اس کی پریشانی، جھنجھلاہٹ اور مرنے مارنے کی آرزو کو نئے جہاں کے شیدائی، مغربی خیالات کے غلام، کسی طرح بھی استعمال کر سکتے ہیں، کریں گے۔ آپ کا اس پر کوئی بس نہیں تا آنکہ آپ اس دھرتی پر نظر نہ آنے والی دیواریں کھڑی کر دیں۔ مگر ان دیواروں کے اندر بھی دیہاتی انسان پریشان ہی رہے گا، امن کا دشمن ہی رہے گا۔ اگر آپ چاہتے ہیں کہ وہ باامن رہے، خوش، خالق و رازق رہے، تو اک ایسے جہاں کا درشن اس کو دکھایا جائے جہاں اجرامِ فلکی کے سفر کے ساتھ اس کی زندگی کا آہنگ مربوط بھی ہو اور اس سے آزاد بھی؛ وہ اپنے ہم جنسوں، اپنے رفیق جانوروں کے ساتھ، دھرتی کو اپنے اور اپنے ہم جنسوں اور رفیق جانوروں کے پسینے سے سیراب بھی کرے، اس میں سے آپ کے نئے جہاں کے علم اور مشینوں کی بدولت اتنا غلہ پیدا کر سکے کہ وہ خود فراغت اور بے فکری سے کھا کر، اپنے جانوروں کو کھلا کر، اپنے اور اپنے جانوروں کے لیے برے وقتوں کے لیے اندوختہ رکھتے

ہوئے شہری لوگوں کے لیے فالتو غلہ بچا سکے، وہ اپنے ہم جنسوں اور اپنے رفیق جانوروں کے ساتھ اخوت کے تعلقات استوار رکھتے ہوئے تخلیے کی زندگی کا مزا لے سکے، اپنی محبوبہ اور بیوی کے ساتھ نین میں نیند کی طرح، دھرتی میں نیر کی طرح رہنا سیکھ سکے، مظاہرِ فطرت اور مشینوں کے درمیان نامیاتی رشتے ایجاد کر سکے، کارخانوں میں میکانکی کام کرنے والے مزدوروں کی زندگی سے اپنے فطری اور نامیاتی ماحول میں رہتے ہوئے آشنا ہو سکے اور مزدوروں کو اپنی فطری اور نامیاتی زندگی کے راز میں شریک کر سکے۔ اگر ایسا نہیں ہو سکتا تو کسان اور دیہاتی انسان کو کارخانوں میں نوکر ہونے پر اکسایا جائے گا، اس کے لیے دھرتی سے نئی نئی صورتیں ہویدا کرنے کی زندگی غیر دلچسپ اور ناقابل قبول بنا دی جائے گی تاکہ کسان اور دیہاتی انسان اپنی زندگی کی کائناتی اہمیت اور نبالت کو بھول جائے اور مشینوں کی گھڑ گھڑاہٹ میں گم سم، میکانیکی انسان، مزدور بن جائے۔

اگر ایسا ہوا تو آپ اور ہم کو، جو اپنے علم اور ذوق اور تخیل پر نازاں ہیں، مشینی دور کا حدی خواں بننے پر مجبور کیا جائے گا اور انکار کی صورت میں مصلوب، محصور، مسدود، محبوس کیا جائے گا۔'' ارملا تھک کر چپ ہو گئی۔

''دیدی! آپ تو مجھے منع کر رہی تھی اور اب آپ نے اتنا لمبا بھاشن دے دیا جس سے تھکے ہوئے مہمان اور بھی تھک گئے ہوں گے اور آرام کے لیے، تخلیے کے لیے بے تاب ہو رہے ہوں گے۔'' سوشیلا نے ارملا کو جتلایا۔

''سوشیلا! تم نے دیدی کے درس کی داد نہیں دی۔ غضب کرتی ہو۔ تم نے محسوس نہیں کیا کہ اس درس سے تمہاری دیدی نے ہم کو آنکھ کے جھپکے میں ایک ایسے عالم میں پہنچا دیا ہے جہاں ہم روایتی مسلمان اور ہندو نہیں رہ سکتے، جہاں خلاّقی کی، انسانی ذات کی تمام صلاحیتوں کی واحدانی کوشش کی ضرورت ناگزیر ہے، جہاں ہمیں اپنے ادیان کے سرچشموں سے حکمت اور نور کا امرت لائے بغیر اس نئے عالم میں راہِ مستقیم کا تعین کرنا ناممکن ہوگا۔ ہم تمہاری دیدی کے ممنون ہیں کہ اس نے ہمیں ایسی چتونی دی ہے۔ ہم شاید اس ملاقات سے صحیح فائدہ اٹھا نہ سکتے اور ایک دسرے کی ذات کی گہرائیوں سے آشنا ہوئے بغیر بچھڑ جاتے؛

زندگی کے وسیع سمندر میں آوارہ لکڑیوں کی طرح ملتے ہمیشہ کے لیے بچھڑ جانے کے لیے۔ اگر ایسا ہوتا تو ایک ایسا حادثہ ہوتا جو ہم تم اپنے آپ کو عمر بھر معاف نہ کرتے۔'' تقی نے کہا اور دوسروں نے اس کو صاد کیا۔

''جب سے مجھے آپ لوگوں کے بڑے آغا کے یہاں، دھنش محل میں، اکٹھے ہونے کی اطلاع ملی میں تب سے آپ لوگوں سے ملنے کی سوچ رہی تھی۔ میں چاہتی تھی کہ اس عظیم فتنے سے، جس کی طرف پتا جی اکثر اشارہ کرتے ہیں، بچ نکلنے کی نہیں، کیونکہ اس کے لیے برسوں کی تیاری اور اک اکثریت کا تعاون چاہیے، بلکہ اس کی راکھ سے ایسی چنگاریاں بچا لینے کی کوشش کی جائے جس سے اس عالم کی راہ ڈھونڈی جا سکے جس کی ابھی ابھی میں نے تصویر کھینچی ہے۔ دیس کا بٹوارہ ہو کر رہے گا۔ شاید اس میں اس دیس کے لوگوں کا فائدہ ہو اور ہندو اور مسلمان اپنے اپنے دین کے سرچشموں سے ایسا امرت حاصل کرنے پر مجبور ہو جائیں جس کے ذائقے سے ہماری نظریں اتنی روشن ہو سکیں کہ ہم اپنی اپنی جگہ، اپنے طریقوں سے، اپنی قومی ذات کی اصل سے ہم آہنگ ہوتے ہوئے، اس عالم میں داخل ہونے کی راہیں ڈھونڈ نکالیں، جہاں کسان، مزدور، عاقل اور شاعر اور کلاکار ایک دوسرے کے تعاون سے، ایک دوسرے سے اخوت کے رشتے میں بندھے ہوئے، اس سلطنت میں داخل ہو سکیں جس کو والمیکی رام راجیہ کہتا ہے اور آپ کے فلسفی مدینۃ الفاضلہ......''

''جس کو قرآن حیاتِ جنت کا نام دیتا ہے۔'' متین صاحب نے گرہ لگائی۔

ارملا نے بات کو جاری رکھتے ہوئے کہا ''بالکل۔ مگر یہ اسی سے ممکن ہے جب کسی قوم کے گیانی، کوی، کلاکار اس نویلے لوک کا اپنے گیان میں درشن کر لیں اور اُن کے چت اس درشن سے شانت ہو کر، نہال ہو کر، اپنے وِیاکھیانوں، اپنی کویتاؤں، منتروں اور اپنی کلاؤں کے کارن اس گیان کو لوگوں کے منوں میں چتر کی طرح لکھ دیں اور اس چتر کے ورَن ان کے شریروں میں رچ جائیں۔'' ارملا نے کہا۔

''دیدی! آپ کو یقین ہے کہ یہ دیوبانی آپ کے مہمانوں کی سمجھ میں آ جائے گی؟'' سوشیلا نے سوال کیا۔

''میرا خیال ہے کہ آ گئی ہے اور اگر نہیں آئی تو ان کو اس بانی کو سمجھنے کی کوشش کرنی چاہیے کیونکہ اس بانی میں ہماری دھرتی، ہمارا دھرم، ہماری تہذیب، ہمارا من، ہمارا چت بولتا ہے۔ اگر انہوں نے سمجھنے کی کوشش نہ کی اور اس بانی میں اپنے دین کا منظر ہمارے لوگوں کے ذہن نشین، دل نشین کرنے کی، خون میں حل کرنے کی کوشش نہ کی، تو دیس کا بٹوارہ ہوجانے کے باوجود دونوں بڑی قوموں میں من کا وِرودھ، دل کی کدورت، خیال کا ڈر، کبھی بھی دور نہ ہوسکیں گے اور ہماری قومیں برسوں ایک دوسرے کو شک کی نظر سے دیکھتی رہیں گی اور اس شک کے کارن ایسے کاموں میں لگی رہیں گی جو کسی طور بھی ان کی اصلوں، ذاتوں کا پرتو نہ ہوں گے اور ان کو ایسی راہوں پر ڈال دیں گے جن سے واپس اس راہ پر آ جانا ناممکن ہوجائے گا جو ان کی اصلوں اور ذاتوں سے پھوٹتی ہے۔

دو ایک سال کی ہمیں فرصت ہے کہ ہم ایک دوسرے کے گیانیوں، کویوں کو اپنے اپنے دھرم اور تہذیب کا منظر دکھا سکیں اور اس منظر میں جذب مناظر کے رشتے اور ربط ان پر واضح کرسکیں۔ بٹوارے کے بعد یہ کام بہت ہی کٹھن ہوجائے گا بلکہ ناممکن ہوجائے گا۔

آپ لوگ رشیوں، گیانیوں، کویوں، کلاکاروں، کسانوں، زمینداروں، کارخانے داروں، سوداگروں سے دوستی کے، قرابت داری کے رشتوں میں منسلک ہیں اور ان کے ذریعے اپنی قوم کے باشعور لوگوں کو، کسانوں اور مزدوروں کو، اپنے دین کی روشنی میں، اپنے دین کے مقرر کئے ہوئے راستے کے ذریعے، اس عالم کی جھلک دکھا سکتے ہیں جہاں کسان کی دنیا، مزدور کی دنیا اور عاقل اور شاعر اور فن کار کی دنیائیں ایک ہی عالم کے مربوط، ایک دوسرے کو خصیب کرتے ہوئے، مناظر نظر آئیں۔'' ارملا نے اپنے مہمانوں پر نظریں گاڑے ہوئے کہا۔

''آپ نے بالکل درست فرمایا۔ یہی کام ہے جو اس نئے زمانے میں کرنے کا ہے اور ہم ہی اس کو کرسکتے ہیں۔ ہمیں فرصت اور فراغت، علم اور نظر، حال، ماضی اور مستقبل کا شعور میسر ہے۔

مجھے امید ہے کہ ہمارا آپ کا ملنا ہے مسیحا و خضر کے ملنے سے بھی بہتر ہوگا۔'' متین

صاحب نے سب کی طرف سے جواب دیا۔ ''تو پھر آیئے میں آپ کی آپ کے کمروں تک راہنمائی کروں۔ کچھ دیر آرام کیجئے۔ دوپہر کے کھانے پر ملاقات ہوگی۔''

ارملا اور سوشیلا مہمانوں کو ان کے کمروں تک پہنچانے کے لیے انہیں اس کمرے سے اندر کی طرف ایک برآمدے میں لے آئیں جو دونوں طرف سے بند تھا۔ ہر ایک کے لیے الگ الگ کمرے تھے مگر جمیل صاحب اور رابعہ کے لیے ایک ہی کمرا تھا۔

دوسرا باب

اپنے اپنے کمرے کے تخلیے میں، دور دور تک پھیلی ہوئی خاموشی میں، ازل سے ابد تک پھیلتے ہوئے سکون اور شانتی نے ان کے جسموں کو، ان کے اذہان کو، ان کے تخیلوں کو، ان کے جذبات کو، ان کی روح کی گہرائیوں، پہنائیوں اور وسعتوں کو نہایت آہستہ آہستہ اتنے ہمہ گیر پیار سے سہلانا شروع کیا کہ کسی کو معلوم ہی نہ ہوا کہ کب، کس طرح، وہ ایک انوکھے، انوٹھے، اجنبی، جہاں میں لے جائے گئے، ان کے اندر نئے جہاں کے تہہ در تہہ، ایک ہمہ گیر منظر میں مربوط، مناظر کے سلسلے وا ہوئے۔

انہیں تو صرف اتنا شعور تھا کہ وہ ان نئے، انوٹھے، نویلے جہانوں سے، کبھی، نہ جانے کب؟ آشنا ضرور تھے؟ یہ جہاں بطن مادر کے پرسکون، پرحیات اندھیرے کی طرح، ان کے نہاں شعور میں محوِ خواب تھے اور اب یکا یک کسی نئے سورج کے جلو میں چلنے والی ہوا کے لمس سے بیدار ہو گئے تھے۔

وہ ان جہانوں میں دھڑکتی ہوئی، نہاں و پنہاں، قوت، جس سے اس جہاں کے مظاہر کی بقا اور فنا، تخلیق اور تخریب ہوتی تھی، کو محسوس کر رہے تھے۔ یہ قوت بڑی پرہیبت ہوتے ہوئے بھی ان کو حلیم و کریم محسوس ہو رہی تھی۔ ہر شے، ماضی، حال اور مستقبل، اس قوت کا پرتو، اس کی مورت، محسوس ہو رہی تھی۔ ان کو محسوس ہوا کہ ان کی زندگی کا ہر لمحہ اس قوت کی کشش سے اس حد تک متاثر تھا کہ اس کے تخت کی طرف کشاں کشاں کھنچا چلا آتا رہا۔ اس

قوت کا تخت سنہری برف سے ڈھکی ہوئی چوٹیوں کے درمیان پھیلتے ہوئے، ابھرتے ڈھلکتے ہوئے، جنگل کے بطن میں چھپے ہوئے خلا کے دل میں آباد محل اور مندر اور ابلتے ہوئے فواروں، ہرنوں، موروں، کبوتروں، ہنسوں، پھولوں کے درمیان کہیں بچھا تھا۔ وہ اس کے مقام کا صحیح تعین کرنے سے قاصر تھے۔ ان کو کبھی کبھی خیال آتا کہ وہ تخت ارملا اور سوشیلا کے جسموں میں نہاں ہے اور کبھی خیال آتا ہے کہ وہ ٹھاکر شِو آنند کی جبیں پر متمکن ہے۔ کبھی ان کو گمان گزرتا کہ یہ محل، یہ فوارے، یہ پرندے، یہ پھول، یہ جنگل، یہ سنہری چوٹیاں اسی قوت کے روپ ہیں۔ مگر اس کا بہروپ کہاں ہے؟ کیا ہے؟ وہ سوچتے۔ کبھی ارملا کی آنکھوں کا حلم اور شانتی، کبھی سوشیلا کی مسکراتی ہوئی، چنوتی دیتی ہوئی آنکھوں کی ابھرتی ڈوبتی روشنی اور کبھی ٹھاکر کی امن فشاں روشن جبیں اور ایک آدھ بار ان کے سفر کے راہنما کی پراسرار اطاعت اور عبودیت پر اس قوت کے سروپ ہونے کا گمان گزرا۔

ان کے خیالات اور موہوم جذبات کے تار و پود نے ان کے گرداگرد ایک پُر ہیبت حلم کا ایک بے پایاں نہاں سمندر موجزن کر دیا جس کے درمیان وہ روشن سفید جزیروں کی طرح گھر گئے اور اس سمندر کی لہروں کا ہلکا ہلکا شور ان کے کانوں میں، ان کے خون میں، ان کی شخصیتوں میں رچنے لگا اور وہ نہ چاہتے ہوئے بھی اس رچنا سے حظ اٹھانے لگے۔

ان کے نہاں تخیل زار کبھی تو لامتناہی مناظر کے تناظر میں تحلیل ہو جاتے اور کبھی ایسے روشن منظروں میں مرکوز ہو جاتے جن کی ایک ایک تفصیل تیکھی اور واضح، جانی پہچانی مگر پھر بھی اجنبی، حسین مگر پھر بھی ڈراؤنی محسوس ہوتی۔ دل دھڑکتے دھڑکتے دوڑنے لگتا، دوڑتے دوڑتے ٹھٹک جاتا، رک جاتا، سو جاتا، دم توڑ دیتا۔ رگوں میں، جسم اور دماغ میں گردش کرتا ہوا خون یکا یک لاوے کی طرح گرم ہو جاتا جس سے گوشت کے بھننے کا، جلنے کا احساس ہوتا؛ احساس شعور بنتا، شعور دُکھنے لگتا، دُکھانے لگتا؛ جسم اور دماغ دھواں بن جاتے، دھواں پھر بارش کے روپ میں برسنے لگتا؛ خون بنتا، بہنے لگتا، دھیرے دھیرے، بہتے بہتے سرد ہو جاتا، جمنے لگتا؛ شریانوں، رگوں کی دیواروں پر دباؤ ڈالتا اور جسم میں تنگی کا، گھٹن کا، ناقابلِ برداشت ٹھنڈک کا احساس محیط ہو جاتا؛ ہر احساس اور شعور مٹ جاتا، فنا ہو جاتا۔

اس فنا میں سے شعور بڑی کربنا کی سے طلوع ہوتا اور احساس ایک عظیم ہمہ گیر شعلے کی طرح لپکتا اور بیرونی اور اندرونی جہانوں پر محیط ہو جاتا۔

یہ عدم اور جنم، یہ فنا اور بقا، اک پہچانی سفر کی معین منزلیں محسوس ہوتیں، جن کے قرب سے خوف اور حظ کا تفاوت اور تخالف محسوس نہ ہوتا؛ بلکہ محسوس ہوتا کہ دونوں مشابہ ہیں، ناگزیر ہیں، محکم ہیں، حسین ہیں۔

تشابہ، تحکم، تقدیر اور حسن کے شعور سے باہم ستیزہ جذبات کے مکرر جہاں میں شانتی کا سورج طلوع ہوا جس کی کرنوں نے ہر جذبے کو اس کے سروپ کی حدود میں محصور، رواں اور قانع کر دیا۔ اس حصار، اس روانی اور اس قناعت کے تعاون سے ان کے اندر ایک خصیب اور خالق قوت نے جنم پایا جس نے ان کی عیاں اور نہاں صلاحیتوں کو اپنے اپنے زوجین کی تلاش میں مصروفِ عمل کیا، زوجین کی تلاش کے سفر نے توجہ کی وحدت کی شکل اختیار کی اور توجہ نے اندر کے جہاں سے باہر کے جہاں کی طرف رخ کیا۔

رات بھر یاد اور جذبات کے طویل سفر سے حواس اس درجہ مضمحل ہو چکے تھے کہ دن کا سفر اس نے نیم غنودگی اور ایک ہمہ گیر نشے کی حالت میں کیا تھا۔ اس کے شعور میں اس گہری اور رچتی ہوئی تھکن کا مطلق احساس نہ تھا، وہ حیران تھی کہ اس کے جسم نے اس کے حواس کی اندرونی اور بیرونی جہد کو اس خوش اسلوبی سے کس طرح برداشت کر لیا تھا۔ جونہی ارملا عالمہ کو اس کے کمرے کے دروازے پر چھوڑ گئی تو اس کے جسم پر ایک عظیم غنودگی کا بوجھ آ پڑا اور اس نے بڑی کوشش سے کمرے میں لیٹنے کی جگہ تلاش کی۔ اس لمحے بڑے سے پلنگ پر بچھی ہوئی چاندنی میں اسے اک عجیب حسن نظر آیا اور وہ اس حسن کا تجزیہ کرنے کی کوشش کے متعلق سوچے بغیر اس کی طرف تیزی سے بڑھی اور اس کو اٹھا، بڑی مشکل سے پاؤں سے جوتی اتار، لحاف میں گھس گئی اور غنودگی نے اس کے حواس پر ایک دبیز چادر ڈال دی اور تھکن کی کربنا کی کے سوا سب کچھ مٹ گیا، محو ہو گیا۔ تھکن کی اذیت کا مبہم سا شعور دیر تک غنودگی کی ہر دم بلند ہوتی ہوئی لہروں کے زور پر مینارِ نور کی طرح مسکراتا رہا مگر نور کا یہ مینار بھی بجھ گیا، ڈھے گیا۔

یکا یک کسی زبردست قوت نے ایک ہی جھٹکے میں گہری غنودگی سے اس کو جگا دیا۔ اس کے کان آواز کی تلاش میں دیر تک سرگرداں رہے مگر آواز کا کہیں سراغ نہ پایا۔ اس نے کوشش کی کہ آنکھوں سے بوجھل پپوٹوں کو اٹھائے مگر کامیاب نہ ہو سکی۔ جب اس کی آنکھ کھلی تو اس کی نظر آنکھ کی پناہ کو چھوڑنے پر راضی نہ تھی۔ جب اس نے کوشش سے نظر کو دلاسا دیتے ہوئے باہر اتارا تو اس کی نظر لڑکھڑائی اور ٹامک ٹوئیاں مارنے لگی۔ ہر طرف اک اندھیرا، یلغار کرتے ہوئے، اندھیروں میں لپٹا سو رہا تھا، اس سے بے خبر، بے اعتنا۔ اس اندھیرے میں یکا یک اس کی نظر کو روشنی نے اپنی طرف جھٹکے سے کھینچا اور روشنی کے دائرے میں اس کی نظر اک ڈگڈگی پر جا مرکوز ہوئی۔ اس کے کان اس ڈگڈگی کی آواز سننے کے لیے بے تاب ہو گئے مگر ڈگڈگی بے آواز تھی۔ خیال آیا کہ اس ڈگڈگی نے اس کو غنودگی کے جہاں سے شعور کے عالم میں لا جگایا ہے اور شاید ایسی ہی ڈگڈگی سی ہو گی جس کی آواز نے مادے کے گم سم جہاں میں تہہ در تہہ غنودگی میں لپٹی پڑی سوتی زندگی کو یکا یک جگا دیا ہو گا اور اس کو انگڑائی لے کر ابد کے سفر پر چل نکلنے پر مجبور کیا ہو گا۔

آہستہ آہستہ اس کی نظر کا مرکز پھیلنے لگا۔ اس نے دیکھا کہ ڈگڈگی اک ہاتھ میں ہے اور اس ہاتھ کے بالمقابل ایک اور ہاتھ ہے اور اس ہاتھ میں شعلہ سا منجمد ہوا ابدی نیند سو رہا ہے اور اس شعلے کی طرف تاریکیوں کو چیرتی ہوئی اک کرن بڑھی چلی آ رہی ہے۔ کرن نے منجمد شے کو چھوا اور شعلے نے انگڑائی لی اور اک آگ سی اندھیرے میں جل اٹھی اور اس آگ کے شعلے اس کی طرف، اس کے سینے کی طرف، بڑھتے چلے آئے۔ اس نے ڈر کر دونوں ہاتھوں سے دل کو چھپا لیا مگر اس آگ نے اس کے دل کو آ لیا۔ اس کے دل میں اک ہر دم پھیلتی، محیط ہوتی ہوئی آگ لگ گئی۔ اس کی نظر فضا میں تھرائی اور ڈر کر آنکھ میں آ چھپی۔ دل کی آگ ہر دم آفاق کی طرف پھیلتی چلی گئی اور ہر شے کو اپنے نرغے میں لے لیا۔ مگر یہ آگ بھسم نہ کرتی تھی۔ اس آگ نے اس کے تن بدن میں اک اتھاہ قوت کو جنم دیا جو بے آفاق تھی، ہر جا تھی اور ہر لمحے تخلیق کرتی چلی جاتی تھی۔ اس آگ کی روشنی میں اس نے دیکھا کہ تمام کائنات اس کے کنول سے دل کی حدود میں محوِ استراحت ہے۔ اس نے محسوس

کیا کہ اس آگ سے اک ہر لحظہ بڑھتی ہوئی قوت اس کے روم روم میں رچ رہی ہے اور کہہ رہی ہے کہ میں کریم ہوں، رحیم ہوں، رحمٰن ہوں۔ یہ کریم النفس قوت اس کی آنکھوں کی پتلیوں میں مرکوز ہونے لگی، ہوتی چلی گئی، روپ اختیار کرتی چلی گئی۔ اس کے پلنگ کے سرہانے کے بائیں طرف، اس کی آنکھوں کے بالمقابل، اک سیاہ بھاری بھرکم ششدر رے پر اک براق سابُت کرنوں کے جال میں لپٹا پڑا تھا۔ اس بت کے چار ہاتھ تھے اور صرف دو ٹانگیں۔ اس کی تمام توجہ، اس کا سارا شعور، اس کے حواس اس عجیب وغریب ہیئت کے بت پر مرکوز ہو گئے۔ اس کی نظر اور اس کا تخیل اس بت کے انگ انگ میں گم ہو ہو گئے۔ اس بت میں اک انوکھی، اتھاہ محبت میں لپٹی ہوئی، ہیبت، سطوت تھی۔ وہ کبھی اس بت کی فراخ جبیں کو تکتی، کبھی اس کی دو انسانوں جیسی، مگر غیر انسانی حلم سے لبریز، آنکھوں میں ڈوب ڈوب گئی۔ کبھی ماتھے اور ان آنکھوں کے درمیان باجبروت آنکھ، جس میں ازل سے ابد تک کا، فنا سے فنا تک کا، علم جھلکتا تھا، آنکھ سے عیاں لامحدود استغنا کو دیکھ دیکھ لرز لرز اٹھی۔ اس کی نظر ان آنکھوں سے پھسلتی تو ہونٹوں پر پھیلتی ہوئی، شانتی بکھیرتی ہوئی، مسکراہٹ کے سامنے فرطِ احسان مندی سے جھک جھک گئی۔ اس کے پاؤں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے تیسرے اوندھے ہاتھ کے خم سے پھوٹتے ہوئے دلاسے کے نور سے اس کے سارے جسم میں امید اور رجا کی لہریں سی اٹھنے لگیں اور اس پر یہ شعور نازل ہونے لگا کہ زندگی عظیم نعمت ہے۔ اس ہاتھ کے اشارے نے اس کی نظروں کو بت کے پاؤں کی طرف متوجہ کیا۔ بائیں پاؤں کے نیچے دیا ہوا بونا اس کو انسانی زندگی کی تمام تنگیوں، ناامیدیوں، گمراہیوں اور خوفوں کا مظہر نظر آیا۔ اس بونے کو پاؤں کے نیچے بے بس دیکھ کر اس کا دل شک اور گمان اور بلَس سے آزاد ہو گیا اور اس کے اندر خیال ابھرا کہ وہ خود ایک عظیم مخلوق ہے اور تمام کائنات کی قوتیں اس کے سامنے سرنگوں ہیں، سجدہ ریز ہیں۔ اس تصور سے اس کا جسم مسرت اور شادمانی کا دیوان بن گیا۔ اس کا جی چاہا کہ وہ پلنگ سے اتر کر سارے کمرے میں رقص کرے، خوشیاں منائے۔

وہ اٹھ کر بیٹھ گئی اور اس کی نظر بت کی دوسری ٹانگ پر جا ٹکی۔ اس کے اٹھے ہوئے

پاؤں اورخم کھاتی ٹانگ میں ساری کائنات کا رقص اور وجد رچا ہوا نظر آیا۔اس رقص نما اٹھے ہوئے پاؤں میں چھپے اوراس کے توازن سے ہم آہنگ بلندیوں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے چوتھے ہاتھ کے درمیان اس کو انسانی زندگی کے تمام امکانات انگ انگ کے ابھینایوں میں رقص کرتے ہوئے نظر آئے۔

اس نے شعور کی پوری کوشش سے اپنی نظر اور اپنے تخیل کواس بت کے انگ انگ میں نہاں مگر عیاں جادو سے آزاد کیا اوراس بت پر بحیثیتِ مجموعی نظر ڈالی۔اس کی نظر اس کے پرسطوت، باجبروت، حسن میں رچے ہوئے کرم اور ترحم کا احاطہ نہ کرسکی مگر اس کی نظر اور تخیل کا عجز اس کی ذات میں اس بت کے انگ انگ کے باہمی تشابہ اور حکم کے رچاؤ کے ابرام کے خلاف بغاوت کے جذبے کو جنم نہ دے سکا۔اس کے ذہن نے اس عجز کے ابرام کو بصد خوشی قبول کیا اوراس ابرام کو اپنی ذات کا سب سے بڑا معجزہ مانا۔

اس کو اپنے تاثرات پر حیرت ہوئی مگر اس حیرت نے اس کے دل میں اک خوشی کو جنم دیا کہ وہ اس بت کے خالق کے ذہن کے آفاق میں بے خطر گھوم پھر سکتی تھی، اُس کے تخیل کی وسعتوں میں تنہا اور بے زار محسوس نہ کرتی تھی، اس کے دل کی گہرائیوں میں سے معنی کے مروارید لا سکتی تھی اوراس کی آنکھوں میں ہویدا جذبات کی قوس قزح پر جھول سکتی تھی۔اس نے اس بت پر اک بھرپور نظر ڈالی اوراس کے اعضا کے ایک ایک مدرے کو اپنے ذہن پر نقش کرلیا اوراس کے ابھینایوں سے پھوٹتی ہوئی قوت کو اپنے دل میں جذب کرلیا۔ یہ اس کے دل میں جذب ہو کر اک خیال بنی اوراس کے ذہن پر چھا گئی۔ یہ بت ارملا اور سوشیلا اور ان کے آباء کے تصورات اور جذبات، ان کی آرزوؤں، ان کی پرارتھناؤں کا مظہر ہے۔ اس خیال سے اس کے دل میں ارملا کے لیے ایک عجیب سا جذبہ پیدا ہوا جس میں اتھاہ پیار تھا، ناز کا وجد تھا، لپٹ جانے اور سینے سے لگانے کی خواہش کی گرمی تھی۔

اس جذبے کی شدت نے اس کے رگ وپے میں اک خلا سا پیدا کر دیا، جیسے کہ اس کی رگوں، شریانوں سے اس کا پرانا خون نکال لیا گیا ہو، اس خلا کے احساس سے اس کی رگوں اور شریانوں میں ناقابلِ برداشت گرم خون دوڑنے لگا۔اس کو خیال آیا کہ یہ ارملا کا خون

ہے اس خیال سے اک اذیت ناک فرحت اس کے تن بدن میں رچ گئی اور اس کی آنکھیں ارملا کو دیکھنے کے لیے، اس کے کان ارملا کی آواز سننے کے لیے، اس کے ہاتھ ارملا کے ہاتھوں، اس کے جسم کو محسوس کرنے کو بے تاب ہو گئے۔ مگر وہ ارملا کے گھر میں ابھی اجنبی تھی اگرچہ مہمان تھی۔ وہ اس گھر کے شدھ انتر کی راہوں سے ناآشنا تھی۔ لہٰذا اس نے یہی مناسب جانا کہ وہ اپنے کمرے میں ہی ارملا کا انتظار کرے۔ مگر اس کا دل انتظار پر راضی نہ تھا اور ارملا کو پکارنے لگا۔ اس نے اپنے جسم کی ہر قوت کو قوتِ سامعہ کے تابع کر دیا۔

دور کہیں شدھ انتر سے آہستہ آہستہ وینا اور گانے کی مدھم مدھم، آہستہ خرام آواز اس کے کانوں کے پاس سے ہو کر گزرنے لگی۔ یہ آواز کہاں سے آ رہی ہے؟ کہاں جا رہی ہے؟ شاید میزبان دوپہر کا پاٹ کر رہے تھے۔ اس وینا اور گانے کی ملی جلی لے میں کتنا امن، کتنی شانتی، کتنا اعتماد اور کتنا یقین تھا۔ اس کا تخیل اس آواز کے علاقے کی طرف پرواز کرنے پر مائل ہوا مگر اس آواز کے گرداگرد اک اجنبی تہذیب اور دین کا جہاں حائل تھا۔ اس جہاں میں ایک بچے کے روپ میں ہی داخل ہوا جا سکتا ہے اور ایک بچہ ہی اس جہاں کو اپنی ذات میں جذب کر سکتا تھا، اس کے شدھ انتر سے آواز آئی۔

مگر وہ ان دیواروں کے باوجود اس لے کے قریب ہونا چاہتی تھی۔ اس نے آواز کی سمت کی دیوار پر نظر ڈالی۔ اس میں ایک دروازہ نظر پڑا۔ اس نے دونوں پاؤں پلنگ سے نیچے لٹکائے، زمین پر جمائے اور آواز کی سمت، دروازے کی اور چل دی۔ اس نے دروازہ کھولا، اس کی دہلیز کو عبور کیا۔ اس دروازے کے عقب میں غسل خانہ تھا۔ اس جگہ وینا اور گانے کی لے قریب معلوم ہوتی تھی۔ اس نے پوری توجہ سے اس لے کو اپنے اندر اتارا۔ لے اس کے دل میں اتر گئی مگر لے کے بول کسی اجنبی زبان کے تھے۔ کاش وہ اس زبان سے واقف ہوتی، اس نے آرزو کی۔ اس لے میں محیط موسیقی عام کلاسیکی موسیقی سے مختلف تھی کیونکہ اس موسیقی کا جہاں بے آفاق تھا۔ اس کا پھیلاؤ لامحدود ہوتے ہوئے بھی بے نظام نہ تھا، اس نظام کے قلب میں اک عجب خود مفروضیت تھی جو جذب کی، فنا کی دعوت دیتی تھی، ایسے جذب اور فنا کی جو انفرادیت اور بقا کے نقیض نہ تھے بلکہ ان کو نصیب کرتے

تھے۔

وہ غسل خانے کی دیوار کے سہارے کھڑی اس گانے اور وینا کے آہنگ سے پیدا ہوتے ہوئے جہاں میں جذب ہوتی چلی گئی، فنا ہوتی چلی گئی۔ اس جہاں میں اور اس کے ماحول کے جہاں میں، اس کے باہر اور اندر اور شدھ انتر کے جہاں میں امتیاز مٹ گیا، وہ اک نیا جہاں بن گئی جس کا آسمان کنج کی طرح روشن تھا۔ اس کے آسمان کی نیلاہٹیں، جوانی کا روغن لئے ہوئے تھیں، ان نیلاہٹوں کے چہرے پر دن، ہزار رنگ شفق، شام اور رات بہت ہی بھلے اور سہانے دکھائی پڑتے تھے۔ جہاں آفاق روشن، تازہ اور زندہ تھے۔ جہاں دھرتی پر اڑھائی ماہ کی حاملہ حسینہ کا سا دل ستا، دلربا، دل نکھار حسن تھا۔ جہاں دھرتی اور گگن کے درمیان آکاش شفاف اور پُرنور تھا۔ جہاں درخت اور پھول اور پرندے اور جانور انسان کے اَخی تھے۔ جہاں تنہائی اور جلوس، خلوت اور جلوت ایک دوسرے سے بغلگیر تھے، جہاں سکوت اور کلام ایک انوکھے نغمے میں گھلے ملے تھے۔ جہاں ہر 'میں' ہر 'تو' میں جذب تھی۔ جہاں آفاق کی وسعتیں میلے کچیلے دھوئیں کے لمس سے پاک تھیں، جہاں دھواں اجلا اجلا تھا، تنہا تنہا، شاداں شاداں، فرحاں فرحاں، جہاں دھواں جلے ہوئے، دکھے ہوئے، دلوں سے نہیں، امن اور پیار کے ہم جلیس چولہے سے اٹھتا تھا۔ جہاں کے میلوں ٹھیلوں میں گھومنے والی خلقت میں ایک رچا ہوا آہنگ تھا جو ریل پیل میں بھی قرینے اور سلیقے کی صورت جلوہ گر ہوتا تھا۔ جہاں پر ہجوم میں شامل ہر انسان ایک دوسرے کا مشتاق تھا، جہاں کوئی کسی پر سبقت لے جانے کے لیے بیتاب نہ تھا۔ جہاں ہر انسان ایک ہی منزل کی طرف رواں تھا، جہاں راہوں کا تفاوت انسانوں میں اختلاف اور نزاع کا باعث نہ تھا۔

جہاں موسموں کی گردش باسلیقہ تھی۔ ہر موسم اپنے پیشرو کی اجازت سے آتا تھا اور کچھ دیر دونوں موسم ایک دوسرے کے جلو میں چلتے تھے اور دیر تک ایک دوسرے کو دیکھتے ہوئے جدا جدا رستوں پر چل دیتے تھے۔

جہاں دھرتی پُرش سے اور پُرش دھرتی سے خوش تھا۔ جہاں حسن اِتراتا نہ تھا، جہاں بدصورتی شرمندہ نہ تھی، دونوں ایک ایسے نظام میں سمائے ہوئے، سموئے ہوئے تھے، جو

حسن اور بدصورتی سے ماورا تھا۔ جہاں نور اور ظلمت ہم جلیس تھے، زوج تھے، نکاح کے رشتوں میں بندھے تھے۔ جہاں غیب شہود کی آنکھ میں رچتا تھا۔ جہاں نامعلوم خوف کا موجب نہ تھا اور معلوم اجنبی حسن سے معمور تھا۔

موسیقی خاموش ہوگئی، خاموشی بن گئی۔ فنا اور عدم محسوس میں ڈھل گئے۔ عالمہ کے حواس زندہ ہوگئے۔ اس نے پشت سے لگی دیوار سے رستی ہوئی ٹھنڈک کو ریڑھ کی ہڈی میں حلول ہوتے ہوئے محسوس کیا۔ وہ ٹھنڈک کے تصور سے کانپ اٹھی، اپنی کمر کو دیوار سے جدا کرلیا، مگر دیوار کی ٹھنڈک اب اس کے جسم کا حصہ بن چکی تھی۔ اس نے ارادہ کرلیا کہ پلنگ پر پڑے ہوئے مخملیں لحاف کی گرمی کی مدد حاصل کرلے مگر اس کی ٹانگوں میں سکت ہی نہ تھی، شاید ان کی قوت ابھی اس انوکھے جہاں کے سفر سے نہ لوٹی تھی۔ وہ ٹانگوں کے عدم تعاون پر دل ہی دل میں مسکرائی۔ اس نے انتظار کیا کہ ٹانگوں میں حرکت کی قوت لوٹ آئے۔ یکا یک اس کی ٹانگیں حرکت کرنے لگیں۔ شاید ریڑھ کی ہڈی سے جسم میں رچتی ہوئی ٹھنڈک کے خوف سے ٹانگیں پلنگ کی طرف بھاگ اٹھیں۔ لحاف میں داخل ہونے کے بعد اس کے جسم میں لحاف سے داخل ہونے والی گرمی اور دیوار سے حلول کرنے والی ٹھنڈک کے تصادم سے اس کے جسم کا رواں رواں سنسنا اٹھا۔ اس نے اپنی کمر کو بستر پر دائیں سے بائیں اور اوپر سے نیچے جاتے ہوئے رگڑا۔ ٹھنڈک اس کی کمر سے بھاگ کر اس کے دل کی طرف بڑھنے لگی جس سے اس کے سارے بدن پر، اس کے ذہن پر، ایک سکتہ سا چھانے لگا۔ اس سکتے کے عالم میں غنودگی کا جہاں پھوٹ نکلا۔ اس غنودگی کے جہاں میں یاد کا اک منظر کھلا۔

اک گنبد نما، مگر بیچ سے کھلے وسیع شامیانے کے تلے لوگوں کے پروں کے پروں کے درمیان ایک دائرہ نما کھلی جگہ میں لوہے کے جنگلے، بلکہ پنجرے، کے اندر ایک آدمی کھڑا تھا، یکا یک پنجرے کے کھلے دروازے میں سے ایک کے بعد دوسرا اور دوسرے کے بعد تیسرا ببر شیر داخل ہوا اور پھر چوتھا اور پانچواں ببر شیر پنجرے میں داخل ہوا۔ اس دائرے کے پستہ قد چبوترے سے ذرا ہٹ کر عالمہ اپنے باپ کی گود میں بیٹھی تھی۔ شیروں کو دیکھ کر اس پر سکتہ سا چھا گیا اور وہ اپنے باپ کی چھاتی سے لگ گئی اور جب پنجرے میں بند آدمی کے چابک کی

آواز پر شیر غرائے تو اس کی آنکھیں خوف سے بند ہوگئیں اور اس پر غنودگی چھا گئی۔ جب اس کی آنکھ کھلی تو ایک گنجا مسخرہ ایک خالی چوکھٹے میں اپنا چہرہ دیکھ کر بال بنا رہا تھا۔ اس پر وہ اپنے خوف کو بھول بھال کر کھلکھلا کر ہنس اٹھی۔ اس کے بعد وہ مسخرہ دائرے کے اندر چکر لگانے لگا۔ اتنے میں دائرے میں دو گھوڑے داخل ہوئے، ایک سفید تھا اور دوسرا سیاہ، سفید گھوڑے کی ننگی پشت پر ایک نوجوان لڑکی سوار تھی اور سیاہ گھوڑے کی ننگی پشت پر ایک نوجوان لڑکا۔ دونوں غضب کے حسین تھے۔ لوگوں پر ایک عجیب خاموشی چھا گئی۔ گھوڑے تیزی سے دائرے کے اندر چکر لگانے لگے اور وہ لڑکی اور لڑکا اپنے اپنے گھوڑوں کی کمروں پر قلابازیاں لگانے لگے، اپنے گھوڑے کی پشت سے دوسرے گھوڑے کی پشت پر قلابازی لگاتے ہوئے کود کود کر جانے لگے۔ اس کا دل دھک دھک کرنے لگا، اس کو یہ خیال ستانے لگا کہ اگر وہ گھوڑے پر سے گر گئے تو ان کو کتنی سخت چوٹ آئے گی۔ ابھی وہ سوچ ہی رہی تھی کہ وہ دونوں قلابازی کھاتے ہوئے گھوڑوں پر سے فرش پر آ رہے اور پھر گھوڑوں کے ساتھ دوڑتے کود دے اور قلابازی لگا کر اپنے اپنے گھوڑوں پر چلے گئے۔ پھر ایک اور سفید گھوڑا اور اس پر ایک نوجوان دائرے میں داخل ہوئے۔ گھوڑے دائرے کے اندر دوڑتے رہے اور وہ تینوں اپنے اپنے گھوڑوں پر قلابازیاں لگاتے رہے۔ پھر سفید گھوڑے ایک ساتھ مل کر آگے آگے اور سیاہ گھوڑا ان کے پیچھے دوڑنے لگے۔ نوجوان لڑکوں نے سفید گھوڑوں کے منہ میں لگامیں دے دیں اور لڑکی سیاہ بھاگتے گھوڑے کی پشت کے حصے پر سیدھی الف ہو کر کھڑی ہوگئی۔ نوجوان بھی اس کی پیروی میں اپنے اپنے سفید گھوڑے کی پشت کے حصے پر سیدھے الف کھڑے ہوگئے اور گھوڑوں کی باگیں ان کے ہاتھوں میں تھیں۔ دونوں سفید گھوڑے بالکل ساتھ ساتھ مل کر دوڑنے لگے، ان کی پیشانیاں اور ان کی دُمیں ایک سیدھ میں ہوگئیں اور ان کے عین سامنے سیاہ گھوڑا اور اس کی پشت پر وہ نوجوان لڑکی۔ یکا یک لڑکی قلابازی لگا کر فضا میں بلند ہوگئی اور جب وہ پاؤں کے بل نیچے اتری تو دونوں نوجوانوں کے کندھوں پر اس کے قدم تھے اور سیاہ گھوڑے کی باگ اس کے ہاتھ میں تھی۔ سارے مجمع کے منہ سے ایک ساتھ ایک آہ نکلی جیسے کوئی بڑا حادثہ ہوگیا ہو۔ لڑکی کے اس کرتب پر آہ واہ میں بدل گئی۔ گھوڑے یونہی بھاگتے رہے اور وہ نوجوان لڑکی نوجوانوں

کے کندھوں پر پاؤں جمائے سیاہ گھوڑے کی باگ ہاتھ میں تھامے دائرے کے اندر گھومتی رہی۔ یکا یک وہ ایک بار پھر قلابازی کھاتی ہوئی فضا میں بلند ہوئی۔ مجمع پر خاموشی طاری ہوگئی۔ جب مجمع کو ہوش آیا تو لڑکی سیاہ گھوڑے کی پشت پر الف کھڑی تھی۔

اس نے عمر میں اس قدر چست اور حسین لڑکی اور اتنے طرحدار حسین لڑکے نہ دیکھے تھے۔ ابھی وہ ان حسین لڑکوں اور لڑکی کے دیدار سے سیر نہ ہو پائی تھی کہ منظر بدل گیا۔ سائبان کے نیچے بڑا جال بچھا تھا۔ جال اور سائبان کی چھت کے درمیان جھولوں پر مرد اور مسخرے جھول رہے تھے، کبھی دائیں طرف کے مرد جھولتے جھولتے بائیں طرف کے خالی جھولے کے ڈنڈے کو پکڑ لیتے اور دوسری طرف چلے جاتے، کبھی اس طرف جھولتے ہوئے مرد کے سر اور گردن سے نیچے لٹکتے ہوئے ہاتھوں کو پکڑ کر جھولنے لگتے۔ پھر بینڈ نے ایک اعلان نما نغمہ چھیڑا اور حاضرین متوجہ ہوئے۔ اتنے میں ایک دلفریب حسینہ قلابازیاں کھاتی ہوئی میدان میں آئی اور جھولا جھولنے والوں کی دائیں طرف نصب سیڑھی پر چڑھنے لگی۔ جب وہ سائبان سے ذرا نیچے سیڑھی کے ساتھ نصب چبوترے پر پہنچ گئی تو دائیں بائیں جھولے کے درمیان ایک اور جھولا کھل گیا۔ وہ حسینہ ایک جھولے میں سے جھولتی ہوئی اس درمیانی جھولے سے ہوتی ہوئی دوسری طرف کے جھولے کو اڑ اڑ کر پکڑنے لگی۔ یہ کرتب بڑا ہی سنسنی خیز تھا۔ پھر بینڈ سے نیا اعلان ہوا اور نیچے تنا ہوا جال لپٹنے لگا۔ لپٹ گیا۔ بلندی پر مرد اور حسینہ اپنے اپنے خطرناک کرتب دکھاتے رہے۔ اور وہ حسینہ جھولے کے ڈنڈے پر پنڈلیوں کے سہارے الٹی جھولتی ہوئی درمیانی جھولے کے خلا میں ہوتی ہوئی دوسری طرف کے خالی جھولتے ہوئے جھولے کی طرف اڑتی ہوئی جانے لگی اور پھر وہاں سے واپس۔ ایک ایسی اڑان میں اس کا ہاتھ دوسری طرف کے جھولے سے پھسل گیا اور دھڑام سے فرش پر آ رہی۔ اور گرتے ہی دم توڑ دیا۔ یہ منظر اس کو اس لمحے برسوں کے بعد یاد آیا تھا۔ یہ تہہ در تہہ منظر اس کو کیوں بھول گیا تھا۔ شاید اس لیے کہ سرکس کا یہ منظر انسانی زندگی کی جہد، اس جہد میں پیش آنے والے خطرات اور اس کے جوکھم کی تصویر تھا؟ کیا اس کو توقع تھی کہ زندگی اک حسین خواب کی طرح ہوگی جو اس سے صرف داد کی طلبگار ہوگی اور بس؟ ابھی وہ اس

بات کا فیصلہ نہ کر پائی تھی کہ منظر بدلا۔

رات کا سماں تھا۔ بھرپور چاندنی ہر طرف سو رہی تھی۔ چاند مغرب کی طرف جھک چکا تھا۔ وہ اپنے باپ کی کمر کے ساتھ لگی اپنی سبک رفتار ٹم ٹم میں اونگھ سی رہی تھی۔ جانے پہچانے منظر، جانے پہچانے سیاق و سباق سے نظروں کے سامنے سے گزر رہے تھے۔ یکا یک فضا تھرائی۔ ایک دلدوز چیخ فضا میں ابھری اور فضا پر محیط ہوگئی۔ ان کی ٹم ٹم کا گھوڑا بدکا، چنگھاڑا، اگلے پاؤں فضا میں اٹھائے اور بگٹٹ دوڑنے لگا۔ فضا میں چیخیں ابھرتی چلی گئیں۔ اس نے محسوس کیا کہ اس کے باپ کا بدن تن گیا ہے۔ اس نے دیکھا کہ اس کا باپ اپنے پورے زور سے گھوڑے کی بھاگیں تھامے ہوئے ہے، ان کو اپنی طرف کھینچ رہا ہے، آہستہ آہستہ۔ یکا یک ان کے بھاگتے ہوئے گھوڑے کے عین سامنے زمین کے بڑے سے ابھار پر بیری کے درخت کی گھنی چھاؤں میں درخت کے تنے پر ایک کڑیل سے قد و قامت کا آدمی چابک برساتا نظر آیا اور درخت میں سے چیخیں بلند ہو رہی تھیں۔ گھوڑا بگٹٹ دوڑتا رہا، اس کا باپ پورے زور سے باگیں کھینچتا رہا اور بیری کا درخت ان کے قریب بھاگتا ہوا آتا چلا گیا۔ اس نے دیکھا کہ ترچھی کرنوں کے جال میں لپٹے ہوئے تنے کے ساتھ ایک آدمی بندھا ہے اور اس کے سانولے سے جسم سے خون بہہ رہا ہے۔ وہ غصے اور خوف سے سن ہوگئی اور پھر ایک دم پکارنے لگی۔ ''ابا! ابا! اس ظالم کو مارو! مارو! یہ بیچارے کو مارے ڈالتا ہے۔''

اس کی پکار میں اک محیط ہوتی ہوئی ہیبت اور سطوت تھی جس کے اثر سے فضا ٹھٹک گئی، سوئی ہوئی چاندنی ہڑبڑا کر جاگ اٹھی اور دوڑتا ہوا گھوڑا غراتے ہوئے ابھری ہوئی زمین کی جانب اڑتا چلا گیا۔ اس کی پکار، ٹم ٹم کی گھڑ گھڑ اور گھوڑے کی غراہٹ سے شاید وہ چابک مارتا ہوا آدمی رک گیا اور مڑ کر ان کی طرف دیکھنے لگا۔

وہ غصے سے دیوانی ہو رہی تھی۔ وہ ٹم ٹم کے فرش پر اتر گئی اور گھوڑے کو خطاب کرتی ہوئی دھاڑی!

''شیرے! پکڑ لے اس ظالم کو!''

شیرے نے جیسے اس کے حکم کو سمجھ لیا اور سرپٹ ابھری ہوئی زمین پر جا چڑھا۔ چابک

والا آدمی گھبرا گیا۔ بھاگنے لگا۔ شیرے نے اس کو جالیا، وہ لڑکھڑایا اور گر گیا اور شیرا اور ٹم ٹم اس کے اوپر سے گزر گئے۔ اک غضب ناک چیخ فضا کا سینہ چیرتی ہوئی چاندکی اور لپکی۔ شیرا پلک جھپکتے ہی اس چیخ کی سلطنت کی سرحد کو پار کر گیا۔ وہ اپنے باپ کے زانوؤں پر گر گئی اور سسکنے لگی اور سسکتے سسکتے سوگئی۔

اس منظر کی یاد برسوں اس کے ذہن میں سرگرداں رہی۔ اس کو کہیں قرار نہ ملا۔ خود اس کی سمجھ میں نہ آتا تھا کہ وہ دُکھاتی ہوئی اس یاد کو کیا کرے۔ اس کو اس رات کے بعد ہمیشہ ہی تشدد پر غضبناک قسم کا غصہ آتا اور اس کی آنکھوں کی خشمگی کے ڈر سے اس کے گاؤں کے لوگ اس کے سامنے اپنے بچوں پر بھی ہاتھ اٹھاتے ہوئے ہچکچانے لگے، اپنے آپ کو مجرم سے محسوس کرنے لگے۔

اس ایک یاد نے اس کو ہر مظلوم کا حامی اور حمایتی بنادیا۔ جوں جوں وہ بڑی ہوتی گئی اس کا ارادہ مصمّم ہوتا گیا کہ وہ انسانی معاشرے سے ظلم وتشدد کو مٹانے کے لیے اپنی سی کوشش کرگزرے گی۔ مگر کیسے؟ اس کی سمجھ میں نہ آتا تھا۔

تیسرا باب

متین صاحب کو کچھ دنوں سے مسلسل یہ احساس شدت سے ہونے لگا تھا کہ ان کی زندگی کے ٹھہراؤ اور معمول میں ایک نامعلوم، نامحسوس سی تبدیلی آرہی ہے، جس کی نوعیت کا تعین وہ مسلسل کوشش کے باوجود نہ کرپائے تھے۔ ان کا بھولا ہوا، بلکہ شاید بہت کوشش اور جہد سے بھلایا ہوا ماضی ان کے اندر، ان کی شخصیت کے گردا گرد کی فضا میں، سانس لینے لگا تھا۔ ان کو ہر دم دھڑکا سا لگا رہنے لگا کہ وہ یادیں، جن میں ان کے بچپن اور جوانی کی عصمت اور معصومیت رچی تھی، ایک دم جوان ہوکر ان کے سامنے آجائیں گی۔ ان کے ذہن اور دل پر ہر لمحہ ایک دلفریب سا خوف چھائے جاتا رہا کہ یادوں کی جوانی کی تاب وہ کیسے لاسکیں گے۔ ان کی حالت اس باپ کی سی تھی جو برسوں پہلے ننھی منی بیٹیوں کو چھوڑ اک لمبے سفر پر

پردیس چلا گیا ہو، جب لوٹ کر آیا ہو تو ننھی منی بیٹیاں جوان حسینائیں بن چکی ہوں، ان کی آنکھیں اس کو ایک اجنبی، پیار نما، جذبے سے دیکھتی ہوں اور اس جذبے میں تجسس، حیرانی، خوشی اور قرب کی آرزو اور اجنبی کے قرب سے پیدا ہونے والی حیا کی سرخی گھلی ملی ہو، ان کی کوشش ہر دم یہی رہنے لگی کہ ان جوان یادوں کی آنکھوں کے تعاقب سے اپنی آنکھوں میں عیاں جذبات کو بچائے رکھیں۔ مگر ان کے تخیل کی آنکھیں ان کی جواں یادوں کی بھرپور جوانی سے بے اعتنا نہ رہ سکیں۔ وہ کبھی کبھی چونک اٹھتے کہ ان کے تخیل کی آنکھیں ان یادوں کی جوانی کے رنگ روپ سے لطف اندوز ہونے پر مصر ہیں۔ ان کے ذہن پر گناہ، بہت شدید گناہ، کا احساس چھا جاتا، جیسے کہ کوئی باپ اپنی جوان بیٹیوں کے حسن کو نظر باز تماشائی کی نظر سے دیکھ رہا ہو۔

ان کے گھر کی پچھلی طرف ایک بہت بڑا آنگن نما چبوترا تھا جس پر ان کے اور ان کے ہمسایوں کے گھروں کے دروازے اور کھڑکیاں کھلتے تھے اور اس آنگن کے جنوب کی طرف تین لمبی لمبی سیڑھیاں اترتی تھیں۔ اس آنگن میں ہر موسم میں، موسم کے لحاظ سے، کبھی ہلکی ہلکی، کبھی تیز تیز؛ کبھی کبھی گنگناتی ہوئی، کبھی سسکیاں بھرتی ہوئی؛ کبھی اٹھلاتی ہوئی، کبھی اٹھکیلیاں کرتی ہوئی؛ کبھی ننھے ننھے گرد باد بناتی ہوئی، کبھی چلتے چلتے رک جاتی ہوئی، راہ گم کر بیٹھتی ہوئی؛ کبھی کبھی یک لخت سو جاتی ہوئی اور پھر ہڑ بڑا کر، جاگ کر جلد جلد چلتی ہوئی؛ کبھی گرم، کبھی سرد؛ کبھی خوشگوار، کبھی ناگوار ہوا چلتی رہتی تھی۔ سردیوں میں دوپہر کے وقت ان کے ہمسایوں کی عورتیں اس آنگن میں موڑھوں پر، پیڑھیوں پر، بیٹھی دھوپ میں سوت کاتا کرتیں، باتیں کرتے ہوئے بہو بیٹیوں کے بالوں میں تیل ڈالا کرتیں، ان میں کنگھی کیا کرتیں۔ گرمیوں میں دوپہر ڈھل جانے کے بعد جب صحن میں سایہ ہو جاتا ان کے چرخے سفر کرنے لگتے اور ان کے گھومنے سے پیدا ہونے والی ہلکی ہلکی موسیقی کی لے کے ساتھ ساتھ اس کی تال پر کوئی بوڑھی یا ادھیڑ عمر کی عورت کوئی قصہ، کوئی رام کہانی، کوئی دکھڑا چھیڑ دیتی اور باقی عورتیں، جوان لڑکیاں، بچیاں اس قصے کی لے پر انجانے دیسوں کے سفر پر نکل پڑتیں۔ سال میں ایک آدھ بار شرد کے دنوں میں اس آنگن میں رامائن کا کیرتن ہوتا؛ سارا

سارا دن ہارمونیم کی آواز کے پس منظر میں، کسی سال کوئی بوڑھا اور کسی سال کوئی موٹا سا، جوان سا آدمی تحت اللفظ اور ترنم کے امتزاج سے پیدا ہونے والے لحن میں رامائن سناتا، سناتا چلا جاتا۔ صرف کھانا پکانے اور کھانے کے لیے محفل برخاست ہوا کرتی تھی۔ ان دنوں میں آنگن کی آس پاس کی گلیوں میں زندگی بہت دھیرے دھیرے چلنے لگتی - شاید اس میں شرد کی صبح، دوپہر، شام اور رات کی روشن روشن، واضح واضح فضاؤں کا دخل ہو؛ شاید رامائن کے جہاں کی فضا بھی شرد کے دنوں کی فضا ہو۔ صرف برسات کے موسم میں جب بوندیاں پڑتیں، بادل گرجتے، مینہ پڑتے تو یہ آنگن غیر آباد ہو جاتا مگر اس صحن اور گگن کے درمیان کی فضا میں باتوں کی موسیقی گنگنانے لگتی یا طعنوں کے بان چلنے لگتے۔

ان کے گھر کا اصل دروازہ دوسرے محلے میں کھلتا تھا اور اس محلے کے سب گھر ان کی طرح مسلمانوں کے تھے مگر اس کو اس محلے میں سے گزرنا کبھی نہ بھایا۔ اس محلے میں صبح، دوپہر اور شام کو ہارمونیم سے نغمے نہ پھوٹتے تھے، جھانجھنوں کی پکار نہ اٹھتی تھی، گانے کی ہیجو دلے نہ اٹھتی تھی۔ وہاں تو لڑتے ہوئے بچوں کا شور ہوتا، کھڑکیوں پر پڑی ہوئی، مگر لپٹی ہوئی، چلمنوں کے سایے میں بیٹھی ہوئی سامنے کی عورتیں، لڑکیوں سے باتیں کرتی ہوئی عورتوں، لڑکیوں کی بے سر، بے تال آوازیں ہوتیں۔ سال میں دو ایک بار میلے کی ریل پیل ہو جاتی یا پھر برسوں میں ایک آدھ بار محلے کے مردوں میں گھمسان کا دنگا ہو جاتا۔ مگر ان سب باتوں میں حسن نہ ہوتا۔ اگرچہ اس بے سر، بے تال زندگی میں نہاں کڑیل پن کے احساس سے وہ ناآشنا نہ تھا: اس زندگی میں طاقت اور طاقت کے نشے اور سرور کا ظہور اس کی توجہ کو اپنی طرف کھینچتا تھا مگر اپنے آپ میں کبھی جذب نہ کر پاتا تھا -- حسن اور طاقت میں یہی فرق ہے -- اس ظہور سے اس کے اندر نئے مناظر نہ کھلتے تھے، بلکہ تاریکی پھیل جاتی تھی۔

اس کے بس میں ہوتا تو اس محلے سے وہ کبھی نہ گزرتا مگر اس کے سکول کا رستہ اسی محلے کی طرف تھا۔ جب وہ پرائمری پاس کر کے ہائی سکول میں داخل ہوا تو اس کے نئے سکول کا راستہ اس کے گھر کے پچھواڑے کی طرف سے نزدیک تھا، لہٰذا وہ اس طرف سے ہی آنے

جانے لگا۔اس آنگن سے جتنے محلے پھوٹتے تھے وہ سب کے سب ہندوؤں کے تھے۔اس کے سب دوست ہندو تھے۔وہ اپنے دوستوں میں، دوستوں کی بہنوں میں ہر دلعزیز تھا۔ان کی مائیں بھی اس پر مہربان تھیں۔اس کے دوستوں کے والد اور بڑے بھائی بھی اس سے خوش تھے کیونکہ وہ کھیل کود میں سکول کی پڑھائی کو نہ تو خود بھولتا تھا اور نہ دوسروں کو بھولنے دیتا تھا۔اس کو سکول کی کتابوں کے علاوہ دوسری کتابیں پڑھنے کا بھی شوق تھا۔ان کتابوں کی بدولت نئے نئے طلسم اس پر وا ہوتے رہتے تھے۔اسے ان کتابوں کے علاوہ کبوتر اور پتنگ بھی عزیز تھے۔صبح اور سہ پہر کے روشن آسمانوں میں اڑتے ہوئے کبوتر اور پتنگ اسے اپنے آپ سے فراموش کر دیتے تھے، وہ ان کے سہارے زمین پر قدم جمائے ہوئے آسمانوں کی سیر کر لیتا تھا۔

سال میں دو ایک بار جب اس کے ہندو دوست اپنے ماں باپ، بھائی بہنوں کے ساتھ کسی مذہبی میلے پر چلے جاتے تو آنگن سونا سونا ہو جاتا اور اس آنگن سے پھوٹنے والے محلوں پر اداسی چھا جاتی مگر اس اداسی میں بھی عجب حسن ہوتا اور یہی حسن اس کو اس آنگن سے وفادار رہنے کی تلقین کرتا۔

جب وہ صبح صبح اس آنگن سے ہوتے ہوئے اسکول کی طرف روانہ ہوتا تو ہر گھر سے دھوئیں کی طرح اٹھتی ہوئی، گانے کی بیخود آواز، پاٹ کرتے ہوئے بھجن کی لے اس کا سواگت کرتی اور دور تک اس کا ساتھ دیتی۔ جب وہ سہ پہر کو اسکول سے لوٹتا تو ستار اور جھانجھنوں سے پھوٹتی ہوئی، ان میں سے تھرک کر بلند ہوتی ہوئی، موسیقی اس کو خوش آمدید کہتی۔اس کے قدموں کے اٹھنے کی رفتار آہستہ ہو جاتی اور ستار اور جھانجھن کے نغمے اس کے قدموں پر لوٹنے لگتے، اس کی ٹانگوں کے ساتھ لپٹنے لگتے، اس سے بغلگیر ہوتے، اس کے کانوں میں سرگوشیاں کرتے۔ جب وہ سکول کا کام کرتے کرتے تھک جاتا اور شام ہو جاتی تو شام کے سینے سے بھجن ابھرنے لگتے اور وہ اپنی تھکن کو بھول جاتا۔کھڑکی پر پڑی ہوئی چلمن کو لپیٹ کر باندھ دیتا اور کھڑکی کے کواڑ کے سہارے پیڑھی پر بیٹھ جاتا اور اس کھڑکی کے جنوب مشرق میں دوسری منزل کی کھڑکی کے سامنے ستار کو سینے سے لگائے

ہوئے اس کے دوست شرون کمار کا باپ، موسم کے لحاظ سے ننگے بدن یا سفید بُرّاق سے کرتے میں ملبوس، پاٹ میں گم نظر آتا۔ وہ اگر چہ کسی سرکاری دفتر میں ملازم تھے مگر پوجا پاٹ سے کبھی غافل نہ رہتے تھے۔ وہ براہمن تھے۔ شام کی پوجا کے وقت ماتھے پر پیلے رنگ سے ترشول کا نشان بنا لیتے۔ ادھیڑ عمر کے باوجود ان کی آواز میں بڑا سوز اور گداز تھا۔ ان کی آواز کے زیر و بم میں اتنی اتھاہ گہرائی اور اتنی لامحدود بلندی ہوتی کہ اکثر اس کو گمان گزرتا کہ تال اور گگن ایک ہی تار میں پروئے گئے ہیں۔ جب پنڈت جی پاٹ ختم کر کے آنکھیں کھولتے تو اسے کواڑ کے سہارے بھجن کی لے میں گم دیکھ کر مسکرا دیتے۔ ان کی مسکراہٹ میں حلم ہوتا، کرم ہوتا اور استغنا۔ اس کو کبھی بھی محسوس نہ ہوتا کہ وہ مسکراہٹ اس سے کسی جذبے کی طلب گار ہے۔ وہ مسکراہٹ بھی چاند اور سورج اور تاروں کی طرح فطرت کا ایک مظہر تھی۔ جس میں خدائے بزرگ و برتر کی شان ہویدا تھی۔

شرون کمار کو باپ کی پوجا پاٹ میں کوئی حسن دکھائی نہ دیتا تھا اور اکثر اس کی محویت اور بھجن کی کشش کی بات سن کر اس پر ناراض ہو جاتا تھا۔ اس کو پوجا پاٹ، بھجن، کتابوں، کبوتروں اور پتنگوں سے زیادہ اس بات میں دلچسپی تھی کہ کسی طرح جلدی جلدی جوان ہو جائے تاکہ وہ اپنے بنیا دوستوں کے باپوں کی طرح کاروبار کرے، بے شمار دولت کمائے، سرکار دربار تک رسائی حاصل کرے۔ پنڈت جی بیٹے کے ان ارادوں سے پریشان تو ہوتے مگر ناراض نہ ہوتے۔

آنگن سے سیڑھیاں اتر کر، اس کے گھر کے بالکل بالمقابل شاستری رام سروپ کا مکان تھا۔ ان کا بیٹا کوئی نہ تھا۔ صرف ایک لڑکی تھی، شانتا۔ وہ اس کے سکول میں ہندی اور سنسکرت پڑھاتے تھے۔ ان کے چہرے پر ایک عجیب حزن سا ہر دم رہتا تھا۔ اس حزن میں اک رعب تھا، عظمت تھی۔ یہ رعب اور عظمت ہمیشہ اس کو اپنی طرف متوجہ کرتے مگر وہ توجہ دیتے ہوئے ہچکچاتا تھا۔ مگر اس ہچکچاہٹ کے باوجود وہ اپنی دلچسپی اور تجسس پر قابو نہ پا سکتا۔ اس کا جی چاہتا تھا کہ وہ اسکول جاتے ہوئے شاستری جی کے ساتھ ساتھ ہو لے، ان کی انگلی پکڑ لے۔ مگر کبھی بھی اس کو جرأت نہ ہوئی۔ وہ ہمیشہ ان کے گھر سے نکلنے سے پہلے ہی گھر

سے نکل پڑتا کیونکہ اس کے دوست جلدی گھر سے نکل جاتے تھے تاکہ اسکول میں استادوں سے پہلے پہنچ سکیں۔

اسکول میں بھی شاستری جی سب سے الگ اسکول کے وسیع سبزہ زار میدان میں اکیلے اکیلے ٹہلا کرتے۔ شاید ان کا کوئی دوست نہ تھا اور اگر تھا تو وہ اس کو اپنی تنہائی میں شریک نہ کرنا چاہتے تھے۔

جب وہ ہائی سکول میں نیا نیا داخل ہوا تو پہلی کلاس کے دائیں طرف کے دروازے کے شیشوں کے اس پار شاستری جی کلاس لیتے نظر پڑتے۔ کبھی کبھی کتاب اور سبق سے اس کی نظریں بھٹک کر شاستری جی کا تعاقب کرنے لگتیں۔ ان کی کلاس میں تھوڑے سے لڑکے ہوتے جن کی شکلیں کبھی بھی اس کو اپنی طرف متوجہ نہ کرتیں۔ جب وہ دوسری کلاس میں چڑھا تو اس کے بائیں دروازے کے شیشوں سے شاستری جی کلاس لیتے نظر آئے۔ اس نے اس دروازے کے پاس ہی اپنی نشست منتخب کی۔ اس کا اکثر جی چاہتا کہ وہ شاستری جی کی کلاس میں جا بیٹھے اور سنے کہ وہ کیا سبق دیتے ہیں۔ وہ سارا سال ہمت باندھتا رہا مگر شاستری جی کی کلاس کی دہلیز کو پار نہ کر سکا۔ جب تیسری کلاس میں چڑھ گیا تو اس کلاس کے عقب میں شاستری جی کلاس لیتے نظر آئے۔ آخر اس نے ایک دن طے کر لیا کہ وہ فارسی کی بجائے سنسکرت لے لے گا۔ جب دوسرے طالب علموں کے ساتھ شاستری جی کی کلاس میں پہلی بار داخل ہوا تو اس کو عجیب فرحت ہوئی جس میں خوف پنہاں تھا۔ جب رجسٹر میں نام درج کرانے کے لیے اس نے، اگلے لڑکے کے نام لکھوا کر بیٹھ جانے کے بعد، کھڑے ہو کر اپنا نام بولا تو اک جھٹکے کے ساتھ شاستری جی نے رجسٹر سے سر اٹھایا اور غور سے اس کو دیکھا اور بولے:

''میاں! اپنی اماں سے اجازت لے لی؟ آغا ثنا اللہ سے مشورہ کر لیا؟ آغا صاحب مجھے کبھی معاف نہ کریں گے کہ میں نے ان کا ایک لائق شاگرد ان سے چھین لیا ہے۔ اس لیے بہتر یہی ہے کہ اپنی اماں سے اجازت لے لو اور آغا صاحب سے مشورہ کر لو۔ مجھے تو تمہارے آنے سے بہت خوشی ہے مگر میں اس خوشی کو ناراضگی کا سبب بنانا پسند نہ کروں گا۔

بہرحال آج کا دن تم کلاس میں بیٹھو۔''

جب انہوں نے سب لڑکوں کے نام رجسٹر میں درج کر لئے تو انہوں نے لڑکوں کو کتابوں کے نام لکھوا کر رخصت کر دیا۔ جب وہ جانے لگا تو بولے: ''تم نہیں! تم سے تو بہت باتیں کرنا ہیں۔''

جب سب لڑکے رخصت ہو لئے تو وہ اپنی میز کی اوٹ میں پڑی ہوئی کرسی پر بیٹھے بیٹھے بولے:

''تم مجھے امتحان میں کیوں ڈالنا چاہتے ہو؟ میرا مطلب ہے کہ سنسکرت کیوں پڑھنا چاہتے ہو۔ تمہارے کس کام آئے گی یہ زبان۔''

کچھ دیر کمرے میں سکوت طاری رہا۔ سکوت اس پر بار ہونے لگا۔ شاستری جی کی نظریں اس پر گڑی تھیں۔ ان کے چہرے پر حزن نام کو نہ تھا۔ ان کی آنکھیں روشن تھیں، ان کے چہرے پر سکون تھا، ان کے ہونٹوں پر اک موہوم سی مسکراہٹ تھی جسے دیکھ کر اس کا دل کھل گیا اور اس کے ہونٹ وا ہوئے:

''میں شرون کمار کے پتا جی کے بھجن سمجھنا چاہتا ہوں۔''

''ہاں! پنڈت ہردے ناتھ کے منہ سے بھجن بہت ہی بھلے لگتے ہیں۔ ان بھجنوں کو سن کر دل چاہتا تو ہے کہ جانے کہ ان بھجنوں میں کون چھپا ہے، مگر بیٹے! ان بھجنوں میں جو جیون رچا ہے وہ تمہارے لیے نہیں ہے۔ ان بھجنوں کا ایشور تمہارا خدا نہیں۔ تمہارا خدا اذان میں ہے۔ اس اذان میں بڑی شکتی ہے، بل ہے، زور ہے، رعب ہے، گرفت ہے، دبدبہ ہے، عجز اور سجدے کی دعوت ہے۔ مگر ان بھجنوں میں لوچ ہے، رچاؤ ہے، بہاؤ ہے، یہ بھجن پیاسے من پر برکھا کی پہلی بوند ہیں۔ ان بھجنوں کا ایشور پنڈت ہردے ناتھ سے الگ نہیں مگر تمہاری اذان کا خدا تم سے الگ اور بہت بلند ہے۔ ان بھجنوں اور اس اذان میں بہت بڑا فاصلہ ہے؛ بہت لمبا، کٹھن، سفر ہے ان دونوں کے درمیان۔ تھک جاؤ گے اس سفر میں، میرے بیٹے!......

بہتر یہی ہے کہ تم کل سے آغا صاحب کی کلاس میں چلے جاؤ، اماں سے بات تک نہ

کرنا، کچھ دن غور کرو۔ اگر تم نے یہ فیصلہ کرلیا تو پھر میں تمہیں گھر پر وقت دیا کروں گا۔ یہی طریقہ بہتر رہے گا۔

اس کلاس میں بیٹھ کر تم اپنے ہم مذہبوں کی نظروں میں آ جاؤ گے اور تم اپنی ماں کے اکلوتے ہو۔ یہ اچھا نہیں......

اب تم جاؤ۔۔۔''

وہ وہاں سے چلا آیا اور اگلے دن آغا صاحب کی کلاس میں جا بیٹھا۔ وہ کئی دن سوچتا رہا۔ پنڈت جی کے بھجن اس کو لبھاتے رہے، رجھاتے رہے مگر وہ ان بھجنوں کے جہان میں داخل نہ ہو پایا۔ اس جہان میں داخل ہوئے بنا اس کو کل نہ پڑ سکتی تھی۔ آخر ایک شام وہ شرون کمار کے گھر کے تھڑے سے اٹھ کر شاستری جی کے گھر کی طرف چلا آیا۔ وہ ابھی ان کے گھر کے تھڑے کے قریب پہنچا ہی تھا کہ تھڑے کے اوپر کا دروازہ کھلا اور شاستری جی نے مسکراتے ہوئے پوچھا:

''کرلیا فیصلہ؟''

وہ حیران سا ہوا مگر اس کے منہ سے نکلا:

''جی! جی ہاں!''

اس کی ''ہاں'' میں اعتماد تھا، یقین تھا۔ اس کا فیصلہ اٹل تھا۔ وہ اس شام سے ہر شام کو شاستری جی کے یہاں پڑھنے کو جانے لگا۔ آہستہ آہستہ ایک ایک بھجن کا جہان اس پر کھلنے لگا۔ لفظ روشنی بنے، لے مورت بنتی چلی گئی۔ روشنی اور مورتیں۔ اذان کے بارعب جہاں میں اک نئے گھر کی دیواریں بلند ہونے لگیں، بلند ہوتی چلی گئیں، دھرتی اور گگن کا ملاپ ہوا، گگن کا نور دھرتی پر اترنے لگا۔ اذان کے جہاں میں اک رچاؤ، اک رس آنے لگا، عظمت و سطوت میں انسانی خون اور تخیل کا رنگ اور گرمی گھلنے ملنے لگے؛ باجبروت عمارات کے درمیان اور ان کے چاروں طرف سبزہ زار اور گلزار کھلنے لگے؛ سبزہ و گل نے عمارتوں کی سطوت میں اک نرمی اور گداز پیدا کر دیا۔

صبح و شام شاستری جی کے دراس پر وار ہنے لگے۔ صرف شاستری جی کی بیوی اور اس کے درمیان اک حجاب پہلے دن سے رہا اور آخر تک قائم رہا، اگر چہ اس حجاب کے اس پار وہ ایک دوسرے کے سانس کو سن لیتے اور کبھی کبھار جذبات کی شدت اور گرمی کو محسوس کر لیتے تھے۔

شانتا پہلے پہل تو اس سے بے اعتنا رہی۔ اس کو رہنا ہی چاہیے تھا۔ وہ اس سے عمر میں دس بارہ برس بڑی تھی، وہ نوخیز تھا تو اس پر بھرپور جوانی تھی۔ وہ ناک نقشے سے درست تھی مگر حسین نہ تھی۔ کپڑوں کا شوق تھا نہ رقص سے لگن۔ وہ ہر دم اپنی سہیلیوں میں مگن رہتی۔ یکا یک اس کی سہیلیاں بیاہی جانے لگیں اور وہ اکیلی اکیلی رہنے لگی۔ ایک رات اس کی آخری سہیلی بھی اپنے دولہا کے ساتھ خصت ہوگئی۔ وہ اب بالکل اکیلی رہ گئی۔ شاستری جی نے اس کے لیے بر کی بہت تلاش کی مگر لڑکے والے بہت بڑا جہیز مانگتے تھے اور شاستری جی کے پاس اتنا جہیز نہ تھا۔ اگر وہ حسین ہوتی تو شاید جہیز کی کمی لڑکے والوں کو ناگوار نہ ہوتی۔ پھر شاید اس کی بھرپور جوانی سے ہر ممکنہ ساس خائف ہو جاتی اور اپنے لڑکے کو اس کے سپرد کرنے کے تصور سے گھبرا جاتی تھی۔

وہ سکول کے ہر امتحان میں امتیاز حاصل کرتا چلا گیا، شاستری جی کے ہر سبق پر حاوی ہوتا چلا گیا؛ شاستری جی اس سے بہت خوش رہنے لگے۔ ان کے چہرے کے حزن میں اک کھلا پن سا آتا چلا گیا۔ اس کے شوق و ذوق کو دیکھ دیکھ کر شانتا کے دل میں بھی آرزو پیدا ہوئی کہ وہ اپنے باپ کے علم سے مستفید ہو۔ یا شاید اس کو کسی ساتھی کی ضرورت تھی جو اس کی تنہائی کا شریک نہ ہوتے ہوئے بھی اس کے دل کو تنہائی کے ڈنک سے محفوظ رکھے۔ وہ دونوں ایک ساتھ شاستری جی سے سبق لینے لگے۔ شاستری جی پہلے اس کو سبق دیتے کیونکہ وہ سبق میں شانتا سے بہت آگے تھا؛ پھر وہ شانتا کو سبق دیتا۔ شاستری جی اس کو سبق دیتے ہوئے دیکھ کر بہت خوش ہوتے۔ پہلے پہل تو شانتا اس سے سبق لیتے ہوئے بہت ہچکچائی، شرمائی، مگر اس کے سبق دینے کے انداز میں عجز تھا، حلم تھا اور اعجاز۔ چند ہی سبقوں میں وہ اس کے ساتھ سدھ گئی، رام ہوگئی وہ اس سے اپنے باپ کے علم کے علاوہ دوسرے علوم بھی

سیکھنے لگی۔ وہ سال بھر میں علم کی روش پر چل نکلی۔

پھر ایک دن ہولی کے دن آ گئے۔ اسکول سے چھٹی تھی۔ وہ صبح ہی صبح شاستری جی کے یہاں پہنچا اور سبق لیا۔ اس کو سبق دے کر وہ باہر چلے گئے اور وہ شانتا کو سبق دینے کے لیے شانتا کا انتظار کرنے لگا۔ شانتا آئی تو اجلے برن اس پر سنگار ہو رہے تھے۔ اس نے آموختہ سنایا، نیا سبق لیا۔ اٹھی، کمرے سے نکلی، جلد ہی واپس آ گئی اور رنگ کی پچکاری اس پر چلائی۔ اس کے اجلے کپڑے، رنگدار ہوئے۔ اسے رنگ کی توقع نہ تھی، وہ سکتے میں آ گیا۔ شانتا کا چہرہ اس کو دیکھ کر اتر گیا اور وہ یکا یک ہنسنے لگی، ہنستی ہی چلی گئی۔ اس کے کانوں کے آویزے فضا میں چمکنے، تیرنے لگے، اس کے سفید موتی سے دانتوں سے چھوٹیں فضا میں بکھرنے لگیں۔ اس کے چہرے کا گلال کمرے میں اڑنے لگا۔ اس کے سڈول جسم کی قوسیں اس کے اجلے برن میں کشش پیدا کرنے لگیں۔ اس کے ہاتھوں سے پچکاری چھوٹ کر گر گئی۔ اس نے جلدی سے اٹھالی اور چاہا کہ شانتا پر چلائے۔ مگر اس کے چہرے اور گردن، پیلی ساڑھی کے پلو کی اوٹ میں نیلی انگیا کے اوپر کے کناروں سے جھانکتے ہوئے سینے کا گلال رعب بن کر اس کے جسم و جاں پر چھا گیا۔ لمحہ بھر کو اس کے اٹھے ہوئے ہاتھ رک گئے۔ وہ ہنسے جا رہی تھی۔ اس کی آنکھوں کا نور اس کے گرداگرد جال بن رہا تھا۔ اس نے پچکاری آرام سے اس کے قدموں میں ڈال دی اور اپنے موڑھے پر آسن مار کر بیٹھ گیا۔ اتنے میں شانتا کی ماں ہاتھ میں پچکاری لئے ہوئے آ گئی۔ شانتا کو بے اختیار ہنستے ہوئے، اس کو موڑھے پر سادھو بنے بیٹھے ہوئے دیکھ کر، کپڑوں کے رنگ پر نظر ڈالتے ہوئے، بولی:

''شانتا! استاد پر رنگ ڈال دیا! برا کیا۔ استاد سے ہولی کون کھیلتا ہے۔ اس کی ماں کیا کہے گی -- اور تمہارے پتا بھی خوش نہ ہوں گے۔'' شانتا کی ہنسی رک گئی۔ اس نے ایک نظر ماں کو دیکھا اور دوسری نظر اس پر ڈالی۔ اس کے سفید، اجلے کپڑوں پر گلال اس کو ایسے لگا جیسے خون ہو۔ اس کا دل کٹ سا گیا۔ اس کے سنجیدہ چہرے کو دیکھ کر اس کو احساس ہوا کہ اس نے اتیاچار کیا ہے، دھرم کا پالن نہیں کیا، جوانی کی لاج نہیں رکھی، گرو کا اپمان کیا ہے۔ وہ دل مسوس کر رہ گئی۔ وہ یکا یک ماں کے چرنوں میں جھک گئی:

''ماتا! استاد سے کہو کہ مجھے شما کردیں۔ میں بھول بیٹھی کہ استاد پر رنگ نہ ڈالنا چاہیے
۔''

''رنگ ہی تو ڈالا تم نے، کوئی پاپ نہیں کیا۔ پہلی بار جب کپڑوں پر رنگ گرے تو اچنبھا ہوتا ہی ہے۔ اچنبھا ناراضگی تو نہیں ہوتا۔ تم اپنا جی میلا نہ کرو۔ تم ہولی ضرور کھیلو، گلال ضرور اڑاؤ، مجھ پر رنگ ضرور ڈالو۔ میں برا نہیں مانتا--

مگر سبق لینے کے فوراً بعد رنگ گرانے پر اچنبھا ضرور ہوا۔ میں کالیداس کی کویتا میں کھویا تھا شاید-- آؤ میں تم پر پچکاری چلاؤں۔''

اس نے پچکاری سے رنگ شانتا پر پھینکا اور پھر اس کی ماں پر۔ اس کی ماں مسکرادی اور لمحے بھر کے لیے ان کے درمیان سے حجاب اٹھ گیا اور وہ مسکراتے ہوئے کمرے سے نکل گئی۔ شانتا نے اپنے کپڑوں پر گرے ہوئے رنگ کو دیکھا۔ جہاں رنگ گرا تھا وہاں سے ساڑی اور انگیا اس کے بدن پر چپک گئی تھی۔ گیلے کپڑوں سے بدن کی قوسیں بے حجاب ہوگئی تھیں۔ شانتا لجا گئی۔ اس نے اس کی طرف دیکھا۔ اس کی آنکھوں میں حیرت تھی، عجیب، انوکھی۔ شاید اس کی آنکھوں میں جوانی کا تجسس نہ تھا، لڑکپن کا کھویا کھویا پن تھا، خود سُروری تھی، اس کی آنکھوں میں، ذہن اور تخیل میں بسی ہوئی کویتاؤں اور بھجنوں کا عکس تھا اور بس۔ اس سے اس کی آنکھیں اداس ہوگئیں اور اس نے مکھ پھیر لیا۔ مکھ پھیرنے سے اس کے بدن میں اک کساوٹ سی آ گئی جو اس کو بہت بھائی۔

''میری حیرت کچھ انوکھی نہیں۔ سبق اور رنگ میں بہت ہی کم وقفہ تھا۔ میرے من اور شریر نے اگر رنگ کو قبول کرنے میں دیر کی تو اس میں میرا کیا دوش۔ میں تمہارے رنگ کا سواگت نہ کرسکا تو میں اس پر نادم تو نہیں ہوں مگر اس کا مجھے افسوس ہے، رہے گا--

آؤ! ہولی کھیلیں- باہر چلیں۔''

وہ پچکاری اٹھائے ہوئے گھر سے باہر ڈیوڑھی میں نکل آیا۔ رنگ سے بھری گاگر سے پچکاری بھری اور گلی میں نکل گیا۔ لڑکے بالے، بیاہی اور کنواریاں، بوڑھے اور جوان، سبھی ایک دوسرے پر رنگ پھینک رہے تھے۔ وہ بھی ہجوم میں شامل ہوگیا اور ہولی کھیلنے لگا۔ مگر

اس کی نظریں شانتا کو ڈھونڈتی رہیں اور جب تک وہ بھی ہجوم میں شامل نہ ہوئی، اس کا دل نہ لگا۔

ہولی بیت گئی۔ ساون کے دن آئے۔ ان دنوں میں جب ہوا بند ہو جاتی، حبس ہو جاتا، چھت سے رسیوں سے لٹکے ہوئے کپڑے کے پنکھے کو ہاتھ سے کھینچنے کے باوجود جب ہوا پسینہ نہ سکھاتی، شانتا جزبز ہو کر پنکھے کی رسی چھوڑ دیتی اور فرش پر لیٹ جاتی؛ اور جب اس کی نظریں اس سے لڑ جاتیں تو اس کی آنکھوں میں لاج کی بجائے ایک لاپروائی سی جھلملانے لگتی۔ اس کے ماتھے، گردن اور انگیا سے اوپر پسینے کے کاہل قطرے نمودار ہو جاتے تو ہاتھ کی پشت ان کو صاف کر دیتی۔ اس کا ماتھا، گردن، کان اور گال دمک اٹھتے۔

برسات چلی گئی تو اس کے اور شانتا کے درمیان رنگ اور لاج کا اک سنسار آباد کر گئی۔ اس رنگ اور لاج کے سمبندھ ان میں قرب اور اجنبی پن کے جذبات نے اس کے انتر تہہ در تہہ لوک آباد کر دیے جن پر ہر دم شفق پھولی رہتی تھی۔ اس نے شانتا کے چہرے اور کسے ہوئے شریر کے ہرا بھینائے سے اک غیر شعوری دلچسپی لینی شروع کر دی۔ اس دلچسپی نے اس کے خون میں اک سرور کی کیفیت رچا دی۔ اس دلچسپی کے احساس سے شانتا کے شریر اور نینوں میں اک عجیب سا تناؤ پیدا ہوتا چلا گیا۔ جس کی ماہیت وہ کوشش کے باوجود نہ جان سکا۔ کبھی کبھار کتاب سے دونوں کی نظریں ایک ساتھ بھٹک جاتیں اور ایک دوسرے کے نینوں میں ڈوب ڈوب جاتیں اور جب واپس کتاب کے صفحے پر آتیں تو اس کو محسوس ہوتا کہ شانتا کا تنا ہوا جسم ڈھیلا پڑ گیا ہے۔ اس احساس سے اسے حیرت ہوتی۔ وہ اس کی آنکھوں کی کیفیت سے اس کے دل کی حالت کا اندزہ نہ لگا پاتا، اس کو الجھن ہوتی، مگر لمحہ بھر کی۔ آنکھوں میں ڈوب جانے اور پھر وہاں سے لوٹ آنے کا یہ کھیل اس کو بہت لبھاتا تھا؛ نجانے کیوں۔

اور پھر دیوالی آئی، گھر گھر دیئے جلے۔ سارا دن وہ دوستوں کے گھروں میں لوگوں کو جوا کھیلتے دیکھتا رہا۔ شام کو کھانا کھانے کے بعد وہ شاستری جی کے گھر آیا۔ سبق لیا۔ شاستری جی چلے گئے۔ اس نے شانتا کو سبق دیا مگر اس نے دیکھا اس کا من سبق میں نہیں تھا۔ وہ کچھ

بجھی بجھی سی تھی۔ اس کا دل پسیج گیا اور اس نے چاہا کہ وہ اس کو راضی کرے، خوش کرے۔ اس نے جیب سے کوڑیاں نکالیں اور شانتا کو دکھاتے ہوئے بولا۔

''آؤ پانسہ پھینکیں......''

شانتا نے حیرت سے اس کو دیکھا، اٹھی اور اوپر چلی گئی اور پھر جلد ہی لوٹ آئی۔ اس کے ہاتھ میں پانسہ تھا اور اس کے جھولی میں کوڑیاں۔ وہ کھیلنے لگے۔ وہ ہارتی چلی گئی۔ محلے کی کچھ لڑکیاں آ گئیں۔ سب پانسہ پھینکنے میں مشغول ہو گئے۔ وہ مسلسل جیتتے چلا گیا۔ لڑکیاں ہار کر چلی گئیں۔ رات کافی گزر گئی۔ ہلکی ہلکی ہوا چلنے لگی۔ ہوا خنک تھی۔ گلی کی بیٹھکوں کے دروازے اور کھڑکیاں بند ہونے لگے۔ شانتا نے بھی اٹھ کر دروازے اور کھڑکیاں بند کر دیں اور وہ پانسہ پھینکتے رہے۔ شانتا ہارتی رہی۔ سب کچھ ہار گئی۔ وہ تھک گئی اور وہیں فرش پر بچھی ہوئی دری پر بڑی چادر پر لیٹ گئی۔ لمبے لمبے سانس لیتی رہی۔ اس کے چہرے پر گلال اڑ رہا تھا۔ اس کا سینہ ابھر ڈھلک رہا تھا۔ اس کی نیلی ساڑھی اور سرخ انگیا اس پر بہت پھب رہی تھیں۔ اس کی آنکھوں میں چمک تھی اور وحشت۔ اس کے ہونٹوں پر مسی کا رنگ کھل رہا تھا۔ اس کے بال اس کی عرق آلود پیشانی پر بکھرے تھے۔

''متی، او متی، تم نے دوسرے مت میں جنم کیوں لیا! اگر ایسا نہ بھی ہوتا تو پھر بھی تم مجھ سے عمر میں بہت چھوٹے ہی ہوتے۔ میرا تمہارا کیا ساتھ۔ پھر تم میرے گرو بھی تو ہو۔ گرو کی آ گیا کا پالن چیلے کا دھرم ہے۔ مگر تمہاری آ گیا میرے من کی اچھّا نہیں۔ میرے من کی کلپنا تمہارے من کی آ گیا نہیں۔ مجھے جیون ساتھی کی تلاش ہے اور تم ہوا بھی بالک، اگرچہ میرے گرو ہو۔ کاش تم بالک نہ ہوتے، میرے گرو نہ ہوتے، پتا کے شاگرد نہ ہوتے -- تم کیا کیا نہ ہوتے! تم ٹھہرے بالک، تمہیں ناری کے من کی کیا خبر! تمہارے ہونٹوں پر ابھی بچپن سو رہا ہے اور میرے ہونٹ پیا نام جپیں۔ میری سکھیاں جا بسیں پیا کے ہردے میں اور میں بندھی ہوں ابھی پتا کے دوارے۔ تم بڑے ہو بھی جاؤ تو تمہاری ماں کو تمہاری ضرورت ہوگی۔ تمہارے سوا ان کا ہے کون! ان کی خدمت کرنا تمہارا دھرم ہے۔ ان کے چرنوں میں میرے لیے کوئی جا نہیں۔

تمہارے اور میرے درمیان کتنے ساگر ہیں اور میرے پاس صرف پیار کی نیّا ہے جس کے برتے پر یہ ساگر طے نہ ہوں گے۔

میرے من کی اگنی کے لئے تمہارے پاس صندل نہیں۔ اس اگنی سے تمہیں ہم کنار کرنا اتیاچار ہوگا، ادھرم ہوگا، یہ اتیاچار کر بھی لوں، اس ادھرم کا کرم کر بھی لوں تو تو من کا میت اور شریر کا سنگی نہیں بن سکے گا۔ تو نہ جانے کس کا میت بنے گا۔۔‘‘

شانتا نے اک آہ بھری اور مکھ پھیر لیا۔

اس کے سارے بدن میں اک آگ سی بھر گئی تھی۔ اس کا روم روم جاگ گیا تھا، تن گیا تھا، یدھ پر تُل گیا تھا۔ اس کے قلب و ذہن میں جو موہوم جذبات اور خیالات کئی ماہ سے سرگرداں تھے اور اب شکل اور جسم اختیار کیا چاہ رہے تھے۔ اس کے ہاتھ شانتا کو چھونے کے لیے بے تاب ہو رہے تھے۔ شانتا کے سانس کی لے اس کے بدن میں اک بے پناہ، لامحدود طاقت کو جنم دے رہی تھی، اس کے سینے کا زیر و بم اس کے سینے میں اک طوفان اٹھا رہا تھا۔ شانتا کی آنکھوں کی لجائی ہوئی بے باکی اس کی آنکھوں میں اک جلن سی پیدا کر رہی تھی۔ اس کی عرق آلود پیشانی پر سوئی ہوئی لٹ اس کو پیشانی کی طرف مائل بہ کرم کر رہی تھی۔ اس کی رانوں کا سکونِ بے کراں اور اس کے کھڑے پاؤں کے ناخنوں کا روغن اس کے رونگٹوں کو چھیڑ تا تھا جیسے کہ وہ بینا کے تار ہوں اور جھنجھنا اٹھنے پر بے تاب ہوں۔

مرد، عورت اور تنہائی کے سیاق و سباق اور رشتے سے وہ، اپنے مطالعے کے ذریعے ذہنی طور پر، آشنا تو تھا۔ اس کے کانوں میں اس کے ان ہم جماعوں کی باتیں گونجنے لگتیں جنہیں آوارہ اور لچر سمجھتے ہوئے وہ منہ لگانا پسند نہ کرتا تھا۔ مگر شانتا محض ایک عورت نہ تھی اور وہ مرد نہ تھا، ایک بالک تھا۔ شانتا اس کے لیے لافانی دیویوں کا روپ تھی، بہن تھی، مستقبل کے اندھیروں میں نور کا مینار تھی۔ وہ اس کے قرب میں اپنے آپ کو محفوظ سمجھتا تھا۔ وہ اس کے لیے سایہ دار درخت بھی تھی اور ہلکی ہلکی، نرم نرم، پیاری پیاری، گرمی کا منبع بھی۔ وہ اس کے لیے ٹھنڈی ہوا بھی تھی اور سردیوں کا سورج بھی۔ ماں کے پاس بھی وہ اپنے آپ کو محفوظ پاتا تھا مگر اس کی ماں اس کی ہم سفر نہ تھی۔ علم کی روش پر اس کی پیرو نہ تھی۔ اس کی ماں اور

شانتا میں بہت سی باتیں مشترک تھیں۔ دونوں ایسی فضا اور ماحول تھیں جو اس کو پسند تھے، وہ دونوں اس کی ہر بات میں دلچسپی لیتی تھیں، اس کا کوئی فعل ان کے لیے ناپسندیدگی کا باعث نہ تھا۔ مگر دونوں میں بہت سی باتیں مختلف تھیں اور وہ ان اختلافات سے کسی طرح بھی ناراض نہ تھا۔ طبیعتوں کا اختلاف اس کو دونوں سے قریب رکھے ہوا تھا۔ اس کی ماں کی نظریں، اس کے جسم کے غیر شعوری ابھینائے، اس سے کسی ایسے عمل کے طالب نہ تھے جو اس کے بس میں نہ ہوتا۔ وہ اک دریا تھی جو بہے جانے پر قانع تھا۔ مگر شانتا ایک گلشن تھی جو اس سے خبر داری، حفاظت اور توجہ کا طلبگار تھا۔ وہ کبھی بھی اپنے آپ کو اس گلشن کا مالی نہ سمجھ سکا۔ اس کی سمجھ میں نہ آتا تھا کہ وہ اس گلشن کی بقا کے لیے کیا کر سکتا ہے۔ کبھی کبھی وہ اپنی بے بسی پر نادم ہو جاتا اور جھنجھلا اٹھتا۔ اس نے کئی بار کوشش کی کہ آس پاس، سکول جاتے ہوئے، سکول سے آتے ہوئے راہ گیروں میں، سکول کے استادوں میں ایسے آدمی کو تلاش کرے جو شانتا کے گلشن کا مالی بن سکتا ہو۔ مگر کوئی بھی اسے اس قابل نظر نہ آتا۔ اگرچہ وہ اپنے آپ کو اس گلشن کا مالی سمجھنے پر کسی حالت میں بھی قائل نہ کر سکا مگر اس کو صاف نظر آتا تھا کہ اس گلشن کو اس کے وجود کی، اس کی توجہ کی ضرورت ہے۔ اس کی سمجھ میں نہ آتا تھا کہ وہ شانتا کے لیے کیا تھا۔ بھائی؟ اس نے اپنے دوستوں کی بہنیں دیکھیں تھیں، ان کے اور ان کے بھائیوں کے تعلقات کی نوعیت پر غور کیا تھا مگر اس کے اور شانتا کے تعلق کی نوعیت بالکل الگ تھی۔ اس تعلق میں انتہائی لگاؤ کے بیچوں بیچ بے اعتنائی کا اک سمندر تھا اور اس سمندر میں اک براعظم تھا انتہائی لگاؤ کا۔ وہ ایک دوسرے کے لیے ضروری تھے۔ اس کو اس بات کا شدت سے شعور تھا کہ شانتا کو محض دولہے کی ضرورت نہ تھی۔ اس کا دولہا خود اس جیسا ہونا چاہیے تھا یا شاید خود اس کو اس کا دولہا ہونا چاہیے تھا مگر وہ اس کا دولہا کیسے بن سکتا تھا۔ وہ قد کاٹھ میں شانتا سے چھوٹا تھا اور اس کے قد کاٹھ تک پہنچنے میں اس کو برسوں چاہئیں تھے۔ تب تک وہ کیسے انتظار کر سکتی تھی۔ اور اگر وہ انتظار کر بھی لیتی اور وہ اس کا سنگی ہو بھی جاتا تو اس کا دولہا بنتے ہوئے اس کا دل بیٹھ جاتا اور وہ مارے لاج کے مر ہی جاتا۔ وہ اپنے متعلق شانتا کا دولہا بننے کا تصور لاکھ کوشش کے باوجود بھی نہ کر سکتا تھا۔ وہ شانتا تھی شکنتلا نہ تھی اور وہ دُشیانت نہ تھا اور عین ممکن تھا کہ مقدر نے ان کے ملاپ کا کوئی فیصلہ ہی نہ کیا ہو۔ اور وہ

رام بھی تو نہ تھا کہ شانتا اس کی بڑی بہن ہوتی۔ وہ متین تھا اور وہ شانتا تھی اور ان دونوں کے درمیان شانتی کا رشتہ نہ تھا۔ اس کو کبھی کبھی احساس ہوتا کہ شانتا پیاسی دھرتی ہے اور وہ محض اک بوند۔ ایسی دھرتی کے لیے تو اک ساگر چاہیے تھا۔

اس نے اپنے آپ کو اپنے جذبات اور خیالات سے اک جھٹکے سے جدا کیا۔ شانتا کے جسم پر اک نظر ڈالی۔ اس کے جسم پر گہری تھکن کے آثار واضح تھے۔ اس نے محسوس کیا کہ وہ بیٹھے بیٹھے تھک گیا ہے اور اس کی ریڑھ کی ہڈی میں قوتِ برداشت ختم ہوا چاہتی ہے۔ وہ موڑھے سے رینگ کر اتر گیا اور فرش پر کمر لگا کر لیٹ گیا۔ اس کی کمر کو آرام ملا۔ اس نے لمبا سانس لیا۔ شانتا نے مڑ کر اس کی طرف دیکھا۔ مگر اس کو اس کی طرف نظر کرنے کی ہمت نہ ہوئی۔ ان دونوں میں اک بازو کا فاصلہ تھا مگر یہ فاصلہ اس پر بھاری نہ تھا۔ اس کے سانس میں اک لے کی کیفیت سی آ گئی اور اس کے سانس کی لے شانتا کے سانس کی لے میں گھلنے لگی۔ شانتا کے سانس کی لے میں اک طول تھا اور خود اس کی لے اس کے مقابلے میں ننھی سی تھی۔ طویل لے نے ننھی سی لے کو گود میں لے لیا اور اس کو جھولانے لگی۔ کچھ دیر میں اس نے محسوس کیا کہ طویل لے کے سوا کچھ نہ تھا۔ اس کو حیرت ہوئی۔ وہ کہاں تھا؟ اس کے سانس کی لے کہاں تھی؟ وہ اس طویل لے میں گم ہو گیا۔ ایک دم اس کی کمر میں اک ہاتھ پڑا اور اس کو کھینچ کر لے گیا۔ اس کی جان ہی نکل گئی، اس کے حواس گم ہو گئے۔ آہستہ آہستہ، مدتوں بعد، طویل لے بیدار ہوئی۔ اس کا سارا جسم ابھرتی ڈھلکتی لہر پر جھول رہا تھا۔ اس نے محسوس کیا کہ اس کے سینے کے نیچے فرش نہ تھا۔ اس کے نتھنوں میں بھینی بھینی خوشبو سرایت کرنے لگی۔ اس کے ماتھے اور سر کو گرم گرم، مگر ملائم ہوا چھیڑنے لگی۔ اس کو ہوش آنے لگا۔ اس کو اپنے جسم کے روم روم کا احساس ہونے لگا۔ اس نے اپنے اور شانتا کے جسم میں امتیاز محسوس کرنا شروع کیا۔ اس کا دایاں گال اور سر شانتا کے سینے اور ٹھوڑی کے درمیان تھے۔ شانتا کے سینے کی دھڑکن اور گرمی اس کو بھلی لگی۔ اس کے سینے میں گدگدی سی ہو رہی تھی۔ شانتا کے سینے اور پیٹ کا زیر و بم اس کے بدن میں سنسنیاں سی دوڑانے لگا۔ اس کے دل پر خوف سا طاری ہونے لگا اور اس نے چاہا کہ وہ شانتا کے سینے سے اتر آئے۔ اس نے

آہستہ سے اپنے دونوں ہاتھ مضبوطی سے فرش پر ٹکائے اور پھر دایاں اور بایاں پاؤں پنجوں کے بل فرش پر جمایا اور اٹھنے کی کوشش کی سوچنے لگا کہ ایک دم شانتا نے اس کو بانہوں میں جکڑ لیا۔ اس نے محسوس کیا کہ اس کے جسم میں آگ سی لگ گئی ہے اور ہر دم نا قابل برداشت ہوئی جا رہی ہے۔ اس کے سینے میں انیّاں سی چبھنے لگیں۔ اس کے ہونٹ شانتا کی گردن اور سینے کی درمیانی جلد کو چھو رہے تھے۔ اس نے چاہا کہ دانت اس کی گردن میں گاڑ دے مگر اس کے ذہن نے اس خیال کو عمل بنانے سے انکار کر دیا۔ وہ اس کی بانہوں میں بے بس ہو گیا۔ جسم کی آگ اس کے لیے بالکل بے قابو ہو گئی۔ اس کا دل سینے میں تڑپنے لگا۔ اس کا سینہ تنگ ہوتا چلا گیا۔ اس کی ریڑھ کی ہڈی پگھلنے لگی، گرم گرم، کھولتا ہوا پانی بن کر بہہ گئی۔ اس کا دماغ اک شعلہ بن گیا اور ہر طرف آگ ہی آگ تھی۔ وہ گرمی کی شدت سے بے ہوش ہو گیا۔ وہ دھڑ دھڑ جلتی آگ تھا، دور دور تک پھیلی ہوئی۔

اس کو ہوش آیا تو شانتا کا چہرہ اس پر جھکا تھا۔ کچھ دیر میں اس نے محسوس کیا کہ وہ شانتا کی گود میں لیٹا ہے اور اس کا ہاتھ اس کے سینے کی مالش کر رہا ہے۔ اس کے ہاتھ کی مالش میں اک زندگی بخش ٹھنڈک محسوس ہونے والی گرم گرم نرمی تھی۔ جب اس نے آنکھیں اس کی آنکھوں میں ڈالیں تو وہ مسکرا دی۔ اس کی مسکراہٹ میں خزاں کے چودھویں کے چاند کی سی ٹھنڈک تھی۔ شانتا نے اس کے سینے پر سے ہاتھ باہر کھینچ لیا اور اس کی قمیص کے بٹن بند کر دیئے۔ پھر وہ اسی ہاتھ سے اس کے چہرے کو سہلانے لگی، اس کے ماتھے سے بکھرے ہوئے بالوں کو ہٹانے لگی۔ اس نے محسوس کیا کہ وہ شانتا کی گود میں ایک بیٹے کی طرح پڑا ہے۔ اس نے ہلنا چاہا تو اس نے اس کو سینے سے لگا لیا اور ایک دم اٹھ کر کھڑی ہو گئی۔ ''تم تو بالکل ہلکے پھلکے ہو۔ میں تو تمہیں کندھے سے لگائے گھنٹوں ٹہل سکتی ہوں۔'' اس نے کوشش کی کہ وہ اس کے بازوؤں سے نکل آئے۔ شانتا نے اس کو فرش پر اتار دیا اور اس کے کندھوں پر اپنے دونوں ہاتھ جما کر اس کو دیکھنے لگی۔ اس کی نظر میں اک استغنا کی کیفیت تھی، اس کی آنکھوں میں اک اتھاہ سکون تھا، اس کی آنکھوں کی روشنی میں اک تسلسل تھا، اک ٹھہراؤ تھا۔ اس نے اپنے آپ کو شانتا کے جسم کی گرمی سے آزاد محسوس کیا۔ اس نے چاہا

کہ وہ اپنے کندھوں کو اس کے ہاتھوں کی گرفت سے آزاد کر لے۔ شانتا نے ہاتھ اس کے کندھے سے اس کی گردن کی پشت کی طرف پھسلا دیئے اور آہستہ آہستہ اس کو سینے سے لگا لیا۔ اس کا سر اس کے سینے کی چوٹیوں کی درمیانی وادی تک بمشکل پہنچتا تھا۔ اس کے جسم سے اک پیاری پیاری، نرم نرم سی ٹھنڈک اس کے بدن میں داخل ہونے لگی، جس سے اس کو سرور آنے لگا۔ پھر شانتا نے اس کی ٹھوڑی کے نیچے دائیں ہاتھ کی شہادت کی انگلی کا سہارا دے کر اس کا منہ اوپر کو اٹھایا اور جھک کر اس کی پیشانی اور اس کی آنکھوں کو چوم چوم لیا۔ اس نے محسوس کیا کہ وہ اس لمحے سے شانتا کے گلشن کی حفاظت کے فرائض سے سبکدوش کیا جا رہا تھا۔ شانتا نے اپنا منہ اس کی پیشانی سے اٹھا لیا، اس کو اپنے سینے سے جدا کیا اور اس کو بغل میں لے کر دروازے کی طرف چل دی، دروازہ کھولا، ڈیوڑھی میں لے آئی، باہر کا دروازہ کھولا، اس نے حیرت سے اس کی طرف دیکھا، باہر ویران گلی کو دیکھا، سامنے آنگن میں ہلکی ہلکی ہوا میں اڑتے ہوئے کاغذ کے ٹکڑوں کو دیکھا۔ اپنے گھر کی طرف نگاہ کی۔ اس کے کمرے میں روشنی تھی۔ اس نے شدت سے محسوس کیا کہ اس کی ماں اس کی راہ دیکھ رہی ہے، اس کا انتظار کر رہی ہے۔ وہ جلدی سے تھڑے کی سیڑھیوں سے اتر گیا، گلی کو پار کر کے صحن کی طرف لپکا، گھر کے دروازے پر پہنچ کر اس نے مڑ کر دیکھا تو شانتا ابھی دروازے میں ساکت کھڑی تھی۔ اس کو گھر کے دروازے پر کھڑے دیکھ کر شانتا نے دروازہ بند کیا، بیٹھک کی روشنی بجھ گئی اور جب اس کی ماں سیڑھیوں پر سے اتر کر نیچے آ رہی تھی تو شانتا کے گھر کی اوپر والی منزل کے ایک کمرے کے روشندان کے شیشے جگمگا اٹھے۔ اس نے شانتا کے گھر کی روشنی کی طرف سے منہ پھیر لیا، دروازہ کھلا تو وہ ماں سے کچھ کہے بغیر گھر میں داخل ہوا، سیڑھیاں چڑھ کر اپنے کمرے میں آیا، کپڑے بدلے اور چادر تان کر لیٹ گیا۔ اس نے ڈیوڑھی کا دروازہ بند ہونے کی آواز سنی، ماں کے سیڑھیاں چڑھنے کی تھپ تھپ سنی، اوپر دروازہ بند ہونے کی، کنڈی لگنے کی آواز سنی، ماں کے قریب آتے ہوئے قدموں کی چاپ سنی۔ اسے یاد نہیں آ رہا تھا کہ اس نے بتی گل ہونے کو محسوس کیا یا نہیں۔ شاید وہ بتی گل ہونے سے پہلے ہی سو گیا تھا۔

اتنی لمبی اور گہری نیند وہ شاید ہی پہلے کبھی سویا ہو اور شاید ہی اس کے بعد۔ اس کی ماں نے اس رات کے متعلق کبھی بھی اس سے سوال نہ کیا، واضح طور پر، نہ اشارے کنائے سے؛ جیسے کہ وہ رات اس کے لیے کوئی معنی نہ رکھتی تھی یا وہ اس کے معنی سے آشنا ہونا ہی نہ چاہتی تھی۔

وہ رات کتنی لمبی، کتنی کربناک وطربناک، کتنی حسین اور پرشوکت تھی۔ اس رات تقدیر نے اس سے ایک نیا عہد و پیمان باندھا تھا اور رحمت وعنایت کے کتنے دروازے اس پر وا کئے تھے۔ وہ رات اس کی نئی زندگی کا کتنا پرشکوہ افتتاح تھی۔

اگلے دن جب وہ شانتا کے گھر کے سامنے سے گزرا تو اس کا سینہ پھیل گیا اور وہ تمام رات اس کے اک کونے میں سما گئی، سو گئی۔ کئی ہفتے وہ ایک بے کنار، بے نور، پرسکون، دلدار، ہمدرد، ساگر کے سینے پر ایک سنسان جہاز کے کسی ایسے کونے میں لذت میں چور، شعور سے بےخبر ساگر کے ہلکے ہلکے تھپیڑوں کو جہاز کی دیوار سے ٹکراتے ہوئے سنتا رہا۔ کبھی کبھی اس کو محسوس ہوتا کہ کہیں دور، بہت دور، ہوا کا تیز طوفان اٹھا ہے اور لحہ بہ لحہ اس کی طرف یلغار کرتے ہوئے، بڑھا چلا آ رہا ہے، اس کے سارے تن بدن میں سنسنی سی دوڑ جاتی اور وہ اپنی بےبسی پر قابو پانے کی کوشش کرتا مگر طوفان قریب آتے آتے یکا یک سو جاتا؛ گہری، بہت گہری نیند۔ جہاز کے جس کونے وہ پڑا ہوتا وہاں سے ایک درز میں سے نیلے آسمان پر ایک بہت مدھم سا تارا چمکتا دکھائی دیتا۔ اس مدھم سے تارے کے سہارے وہ زندگی کی رو کی سمت اور رفتار کا تعین کرتا رہا۔ ایک دن اس نے اپنے آپ کو جانی پہچانی گلیوں میں سے گزرتے ہوئے اچانک محسوس کیا تو اس کو تعجب سا ہوا۔ اس نے لمحے بھر کے لیے سوچا کہ وہ اس لمحے سے پہلے کہاں تھا؟ وہ کہاں گیا ہوا تھا؟ کیا واقعی وہ ان گلیوں سے دور، بہت دور، اجنبی ساگر پر ہفتوں ڈولتا رہا تھا؟ اس کو یقین ہوتے ہوئے بھی یقین نہ آتا تھا۔

اس شام جب وہ سبق لینے کے لیے پہنچا تو شاستری جی نے اس کو بتایا کہ اسی صبح شانتا کے لیے ایک بہت ہی اچھا بر آیا تھا۔ جب شانتا سبق لینے کے لیے آئی تو وہ پہلی سی شانتا نہ تھی۔ اس میں اضطراب اور تناؤ نہ تھا۔ وہ شانتی کی مورت تھی۔ اس کی نظریں، اس کا جسم،

اس سے کسی جذبے کی طلبگار نہ تھے۔ لمحے بھر کے لیے اس دل پر چوٹ پڑی مگر وہ سنبھل گیا۔اس کو سکون آ گیا۔

چند ماہ میں شانتا سسرال سدھاری۔اس کا دولہا حسین تو نہ تھا مگر ایک سجیلی متانت اس کے چہرے اور جسم سے ہویدا تھی۔رخصتی کی رات شانتا نے اس سے کہا: ''متی! میرے ماتا پتا کا خیال رکھنا۔اب تم ان کے لیے شانتا بن جانا۔'' اور جواب میں شاستری جی بولے:

''متی تو شانتی کا روپ ہے اور یہی روپ اس پر سجتا ہے۔''

اس رات شاستری جی بہت خوش تھے۔ان کے چہرے سے حزن ہمیشہ کے لیے ڈھل گیا۔شانتا کی ماں نے بھی اس کے شانوں پر بانہہ رکھتے ہوئے کہا:

''تم تو ہمارے لئے لکشمی بن کر آئے ہو۔اتنے اچھے بر کی ہمیں آس نہ تھی۔ایشور کی بہت کرپا ہے۔اب صرف اک دکھ ہے۔شانتا کی جگہ لینے کے لیے کوئی بہو اس گھر میں نہ آئے گی۔''

''متی کے لیے تو بہو آئے گی۔'' شاستری جی نے پتنی کو تسلی دیتے ہوئے کہا۔

''آپ کا شاگرد تو ضرور ہے مگر میری کوکھ کا جنا تو نہیں۔اس کی پتنی جس کی بہو ہوگی اس کی ہی ہوگی۔ یہ لاکھ ہمارا سہی مگر اس کی پتنی ہماری بہو ہونا کیسے پسند کرے گی۔آپ دونوں ٹھہرے ودوان اور میں بیچاری اکشر سے عاری۔ رامائن بھی تو نہیں پڑھ سکتی کہ بڑھاپے کے کٹھن دن کٹیں۔''

''تو متی سے پڑھنا سیکھ لے۔'' شاستری جی نے مسکراتے ہوئے کہا۔

''بڈھے طوطے کو پڑھتے کس نے سنا ہے۔'' اس نے آہ بھری

''تو اچرچ کو چرچ کرو۔اگر شانتا کی سی کھلنڈری پڑھ سکتی ہے تو تم کیوں نہیں؟''

''ایسے لیکھ کہاں!''

''تو شانتا سے پڑھ لینا۔''

''اب شانتا کے بچوں کو کھلانے کی آس ہے اور بس۔''

شانتا کی رخصتی کے بعد شاستری جی کے پڑھانے کے شوق اور اس کے پڑھنے کے ذوق میں اک عجیب سی تیزی آتی چلی گئی ؛ جیسے کہ سنسکرت ادب کی گھپاؤں اور بلندیوں میں شانتا بار بار چھب دکھلا کر گم ہو ہو جاتی ہو اور ان کو ڈر ہو کہ اگر تعاقب میں کوتاہی کر گئے تو شانتا ان سے ہمیشہ ہمیشہ کے لیے چھوٹ جائے گی، اس کا سراغ نہ مل سکے گا۔ شانتا اس کے لیے عقل و وجدان کا نور بن گئی اور اس نور سے اس کے مطالعے کے جہان کا کونہ کونہ منور ہوتا چلا گیا۔ اس جہاں میں نظر آنے والی ہر صورت کے خط و خال، ہر سنائی دینے والی لے کا زیر و بم اور ارتقا کا شعور اک دُھن سی بنتا چلا گیا، نا قابلِ برداشت ہوتا چلا گیا۔ وہ ہمہ تن دعا رہنے لگا کہ شانتا سسرال میں ہی رہا کرے اور شاستری جی کو بھی ساتھ ہی لے جائے تا کہ وہ سبق کے روشن جہاں سے روزمرہ کی تاریک رات کے سینے پر سر رکھے سو جائے اور روشن جہاں کی جزیات کو بھول جائے مگر وہ اس جہان کے حسن اور لذت کے احساس سے بھی محروم نہ ہونا چاہتا تھا جو حسن کے احساس سے اس کے جسم میں پیدا ہوتی تھی۔

ایک آدھ سال میں شانتا کا شاستری جی کے یہاں آنا کم ہوتا چلا گیا اور خود اس سے بھی اس کا سامنا کبھی کبھی ہی ہوتا کیونکہ شانتا جب بھی میکے آتی تو وہ سکول میں ہوتا اور جب وہ سکول سے لوٹتا تو وہ واپس سسرال جا چکی ہوتی۔ پھر ایک دن شاستری جی اور ماتا کو شانتا اپنے سسرال کے شہر میں لے گئی۔ ان کا مکان برسوں بند رہا۔

اس کا رشتہ اس آنگن سے کٹ گیا اور وہ اس راہ سے سکول قریب ہونے کے باوجود نہ گزرتا۔ وہ پنڈت ہردے ناتھ کے بھجن سننے کے لیے کبھی کبھار کھڑکی کے کواڑ کے ساتھ ٹیک لگا بیٹھتا تو بھی اس کے شعور کو بھجن کی لے محیط نہ کر پاتی۔

جب اس نے میڈیکل کالج میں داخلہ لیا تو اس نے آنگن کی طرف کی کھڑکی کبھی نہ کھولی اور اس طرف کا دروازہ بھی ہمیشہ ہمیشہ کے لیے بند کر دیا۔

ارملا کومل کر اس کا دل بے تابی سے چاہنے لگا کہ وہ اپنے جدی مکان میں ایک بار جائے اور آنگن کی طرف کی کھڑکی کھول کر، کھڑکی کے کواڑ کے ساتھ ٹیک لگا کر، پیڑھی پر بیٹھ کر، صبح کے بھجن سنے۔ آنگن کی طرف دروازہ کھول کر آنگن میں بیٹھی ہوئی عورتوں اور

لڑکیوں بالیوں سے کہے کہ ''میں لوٹ آیا ہوں، تمہاری کشش مجھے واپس لے آئی ہے۔''
مگر اس گھر میں اب اس کا کون ہوگا؟ اس گھر کے در و دیوار سے اس کا رشتہ کٹ چکا ہوگا۔ اس کے وجود کے آثار اس کے در و دیوار سے مٹ چکے ہوں گے اور اس آنگن میں بیٹھنے والیاں شاید اس کو پہچان بھی نہ سکیں۔ اس کا دل نہ مانا اور اس نے عہد کیا کہ وہ اس نئے سفر کے اختتام پر اپنے آنگن سے ملنے ضرور جائے گا، اس کی جنوب میں کھلنے والی کھڑکی میں پیڑھی ڈال کر اور کواڑ سے ٹیک لگا کر ضرور بیٹھے گا، بھجن سنائی دے یا نہ دے۔

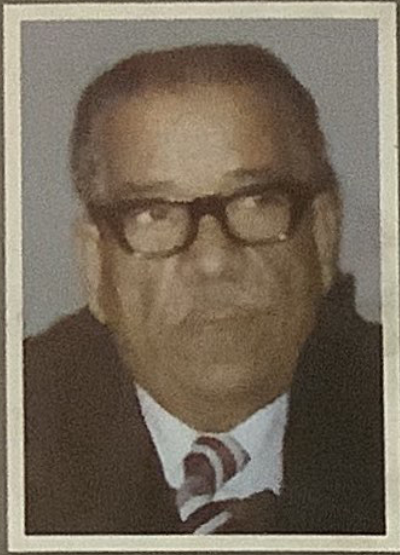
جب وہ دل سے وعدہ کر چکا تو وہ پلنگ پر سیدھا ہو کر آرام سے لیٹ کر کھانے کے بلاوے کا انتظار کرنے لگا، شاید اس کے بچپن کی یادوں کی روح ارملا کی مورت میں ڈھل جائے۔

''ہمارے دور میں کون ہے جو کائنات میں بے گھر نہیں، تنہا نہیں، اجنبی راہوں میں، اجنبی دیسوں کی طرف مہاجر نہیں۔ کوئی نہیں جانتا کہ پناہ کہاں ملے گی..... انسان اسی وقت سے اس کائنات میں بے گھر ہے جب وہ جنت سے نکلا۔ سانپ آج بھی اس کے ساتھ ساتھ لگا ہے۔ انسان کی راہ میں سانپ پھن پھیلائے کھڑا ہے۔ اس کے منہ سے تیز اور تند ہوائیں گرد باد بنا رہی ہیں۔ جو بھی اس گرد باد میں پھنس گیا وہ راہ سے بھٹک گیا۔''

خوشبو کی ھجرت ایسے ہی مسافروں کی سرگزشت ہے جو اجنبی راہوں پر اجنبی دیسوں کی اُور نہ صرف اس ایمان کے ساتھ محوِ سفر ہیں کہ ایک جنت نشان زندگی ان کی منتظر ہے بلکہ وہ اس حیاتِ ارضی کو جنت نشان بنانے کا حوصلہ بھی رکھتے ہیں۔

اس ناول کے افراد کردار نہیں بلکہ شخصیات ہیں جو خود آگاہ اور خودنگر ہی نہیں بلکہ خودگر بھی ہیں۔ ہر فردِ حیات کا ایک مختلف وژن رکھتا ہے۔

ناول میں تہہ در تہہ اور طبق در طبق مناظر ہیں جو حیات اور فطرت کو اتنے متنوع رنگوں میں ہمارے سامنے پیش کرتے ہیں کہ تمام ناول طلسم کا ایک حیرت خانہ نظر آتا ہے۔ اس میں دھرتی اور آکاش میں کامل سمبندھ ہے اور دھرتی کے تمام رنگ سانس لیتے محسوس ہوتے ہیں۔ اس ناول میں نثر کے اتنے مختلف لحن اور آہنگ ہیں کہ ان پر موسیقی کا گمان ہوتا ہے۔



■ صلاح الدین عادل قلمی نام ہے شیخ صلاح الدین کا جو انھوں نے ناول خوشبو کی هجرت کی اشاعت کے لیے اختیار کیا تھا۔ شیخ صلاح الدین اس حلقہء یاراں کے اہم رکن تھے جو ناصر کاظمی کے گرد جمع تھا۔ وہ بیسویں صدی کی پچاس اور ساٹھ کی دہائی میں لاہور کے علمی اور ادبی حلقوں کی ایک اہم شخصیت تھے۔ شیخ صاحب نے مشہور ادبی مجلّہ سویرا کی ادارت کے فرائض بھی انجام دیے۔ ان کی کتاب ناصر کاظمی: ایک دھیان قارئین سے داد تحسین پا چکی ہے۔ اس ناول کے بعض ابواب اور اجزا راوی، سویرا، محراب اور تخلیقی ادب میں شائع ہو چکے ہیں اور 1985 میں ایک ناولٹ ’مصائب و آفات کو امام کیا شائع ہوا جو اس ناول کے ایک حصے کی توسیعی شکل ہے۔ اس کے علاوہ سویرا میں ان کے مضامین ’تخلیق کا ہنر‘ اور ’نسائیت کا چراغ‘ چھپ چکے ہیں۔ ناصر کاظمی، انتظار حسین اور حنیف رامے کے ساتھ ان کے دو مکالمات ’خوشبو کی ہجرت‘ اور ’رفتار کا بدن‘ اور سلیم الرحمان اور صلاح الدین محمود کے ساتھ ’عبداللہ حسین سے بات چیت‘ سویرا میں شائع ہو چکے ہیں۔ شیخ صلاح الدین نے تراجم بھی کیے جن میں مائیکل پولانژی کی کتاب مطالعۂ انسان کا اور حنا ارنٹ اور اڈولف پورٹمان کے مضامین کے تراجم قابلِ ذکر ہیں جو ماہنامہ نصرت میں شائع ہوئے۔